مقالاتِ سلیمان

(حصہ اول)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

جملہ حقوق محفوظ

إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

سلسلۂ دار المصنفین

(۹۶)

مقالاتِ سلیمان

(تاریخی)

حصہ اوّل

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اُن تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے،

مُرتّبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم۔ اے

در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع گردید

(سنہ ۱۹۶۶ء)

(کتبہ اقبال احمد)

۷۸۶

فہرست

مقالاتِ سُلیمان

(تاریخی)

شمار	مضمون	صفحہ
	عرضِ مُرتب از سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے	۱-۲۴
۱	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی	۱-۹۸
۲	سُلطان ٹیپو کی چند باتیں	۹۹-۱۱۱
۳	خلافت اور ہندوستان	۱۱۲-۱۸۴
۴	ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی،	۱۸۵-۲۴۳
۵	بدنصیب کشمیر اور عدلِ شاہجہانی کا نقش سنگی،	۲۴۴-۲۵۱
۶	ہندوکش عالمگیر کے عہد کی دو عجیب کتابیں،	۲۵۲-۲۵۷
۷	لاہور کا ایک فلکی آلات ساز	۲۵۸-۲۶۱
۸	لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان،	۲۶۲-۲۷۷

شمار	مضمون	صفحہ
۹	نالندہ کی سیر،	۲۷۸-۲۹۲
۱۰	تاج محل اور لال قلعہ کے معمار،	۲۹۳-۳۴۵
۱۱	استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک اور یادگار،	۳۴۶-۳۴۷
۱۲	مُلا خیر اللہ مہندس کے چند نئے رسائل،	۳۴۸-۳۵۲
۱۳	قنوج	۳۵۳-۳۷۶
۱۴	سندِ معافی جزیہ،	۳۷۷-۳۷۹
۱۵	خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ ہند از منۂ وسطیٰ آل انڈیا ہسٹری کانگریس منعقدہ مدراس دسمبر ۱۹۴۴ء	۳۸۰-۴۰۳
	ہندی الاصل اور ہندی النسل مسلمان سلاطین،	۴۰۴-۴۴۸

فہرست مضامین

مقالاتِ سُلیمان

جلد دُوم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
دیباچہ: از شاہ معین الدین احمد ندوی	۱ - ۲	ہندوستان میں کتبِ حدیث کی نایابی کے بعض واقعات	۷۴-۸۰
ہندوستان میں علم حدیث	۱-۵۵	رُباعی	۸۱-۱۱۰
فرنگی محل اور علمِ حدیث	۵۵-۶۴	محمد بن عمر الواقدی اور سیرت میں علمائے مستشرقین کی ایک نئی غلطی	۱۱۱-۱۳۸
ہندوستان میں علمِ حدیث کی تاریخ کے گم شدہ اوراق	۶۵-۷۳		

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
پھر واقدی (امام زہری پر الزام)	۱۳۹-۱۶۵	رومن کیتھولک تاریخ کی	۳۰۶-۳۱۸
سنت	۱۶۶-۱۸۳	چند من گھڑت کہانیاں	
پھر بحث سنت	۱۸۴-۱۹۶	مرزا بیدل کیا عظیم آبادی نہ تھے؟	۳۱۹-۳۳۱
(کچھ اور اختراعات والزامات)		حکیم سنائی کے سنینِ عمر	۳۳۲-۳۴۱
عرب و امریکہ	۱۹۷-۲۳۴	حجاز کے کتب خانے	۳۴۲-۳۶۸
اسلامی رصد خانے	۲۳۵-۲۶۵	سفر گجرات کی چند یادگاریں	۳۶۹-۳۹۶
کتب خانۂ اسکندریہ	۲۶۶-۲۸۸	انڈیا آفس لائبریری میں	۳۹۷-۴۰۷
اسلامی ہندوستان کا عہدِ آخر	۲۸۹-۳۰۵	اردو کا خزانہ	
اور علومِ جدیدہ ،		کتب خانہ حمیدیہ بھوپال	۴۰۸-۴۱۴

فہرست

مقالات سلیمان (مذہبی)

جلد سوم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
علوم القرآن		مصادر القرآن	۱۲
۱ - ۳۸		الواحد والتثنیہ والجمع فی القرآن	״
مسائل متعلقۂ قرآن	۲	معربات القرآن	۱۳
علوم متعلقۂ قرآن	۳	الوجوہ والنظائر فی القرآن	״
جوامع علوم القرآن	۴	اعراب القرآن	۱۴
رسوم القرآن	۶	معانی القرآن	۱۶
تجوید القرآن	۷	اعجاز القرآن	۱۷
قرأت القرآن	۸	مجاز القرآن	۱۸
علل القرأت	۱۰	تشبیہ القرآن	۲۰
معرفۃ الوقف والابتداء	״	امثال القرآن	״
مفردات القرآن	۱۱	امثلۃ القرآن	۲۱
غریب القرآن	״	بدائع القرآن	״

مضمون	صفحہ
ہجاء القرآن	۲۲
النقط والشکل فی القرآن	۲۴
اجزاء القرآن	۲۵
مقطوع القرآن وموصولہ	۲۶
عدد آی القرآن	"
احکام القرآن	۲۸
اسماء القرآن ۳۹ - ۶۳	
نام کی ضرورت	۳۹
نام کا تناسب	۴۰
دیگر صحف انبیاء کے نام	۴۱
قرآن مجید کے اور دوسرے نام	۴۴
قرآن مجید کے مخصوص نام	۴۶
فرقان	"
مصحف	۵۲
قرآن	۵۵
مکررات القرآن ۶۴ - ۸۳	
تکرار قصص	۶۷
فرائض وعقائد کی تکرار	۷۰
لفظی تکرار	۷۳
ارض حرم (قرآن مجید کی نظر میں) ۸۴ - ۱۱۶	
عبادت گذاروں کا مسکن	۱۰۶
مسلمانوں کی ملکیت	۱۰۸
دارالامن	۱۱۰
ظالم کی سزا	۱۱۴
ارض حرم کا دارالسلطنت بننا	۱۱۵
پیغام امن یعنی محبت الٰہی اور مذہب اسلام ۱۱۷ - ۱۴۷	
مخالفین کی نکتہ چینی	۱۱۷
المرء من احب	۱۴۱
صلائے عام	۱۴۷
القرآن والفلسفۃ الجدید ۱۴۸ - ۱۶۳	

مضمون	صفحہ
مسئلۂ ارتقاء اور قرآن مجید ۱۶۴ - ۱۷۴	
ایمان بالغیب ۱۷۵ - ۱۹۱	
قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات ۱۹۲ - ۲۰۶	
آزر	۱۹۲
مریم بنت عمران	۲۰۴
اخت ہارون	۲۰۵
اساطیر الاولین ۲۰۷ - ۲۱۶	
لفظی تشریح	۲۰۹
معنوی تشریح	۲۱۰
مواقع	۲۱۲
خلاصہ	۲۱۵
تذکار نزول القرآن ۲۱۷ - ۲۵۳	
صیام رمضان	۲۱۹

مضمون	صفحہ
شب قدر	۲۲۲
اعتکاف	۲۲۵
قیام رمضان	۲۲۷
حقیقت صوم	۲۲۹
روزہ	۲۳۶
روزہ کی تاریخ	۲۳۸
روزہ کی حقیقت	۲۴۱
لیلۃ القدر	۲۴۳
روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب	۲۴۷
ایام صیام پر نظر ثانی ۲۵۴ - ۲۷۵	
جمع قلت کے قواعد	۲۵۵
کیا قرآن میں مہینہ بھر کے روزہ کا حکم نہیں ہے	۲۶۲
۳۰ - ۲۹ دنوں کے روزے حدیثوں میں	۲۶۶
چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش	۲۶۹
تواتر عمل کا انکار	۲۷۳
سیرۃ نبوی کی تدلیس	۲۷۴
لفظ صلوٰۃ قرآن شریف میں ۲۷۶ - ۲۸۳	

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
خلیل اللہ کی بشریت ۲۸۴ - ۳۰۵		**تحریم شراب** ۳۵۱ - ۳۶۵	
انبیاء کے اوصاف کمالی	۲۸۴	**حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے** ۳۶۶ - ۳۸۸	
اوصاف کمالی کے علم کے طریقے	۲۹۱		
حضرت ابراہیمؑ کی بشریت	۲۹۵	**آیت استخلاف** ۳۸۹ - ۴۰۱	
صحابہؓ میں شانِ ابراہیمی کے جلوے	۳۰۲		
ہر نبی نذیر و بشیر ہے	۳۰۳	استخلاف	۳۹۲
جمال و جلال کے پرتو	۳۰۵	الارض	۳۹۴
ذبحِ عظیم ۳۰۶ - ۳۱۲		تمکین دین	۳۹۷
		تبدیل امن	۳۹۸
قربانی کا اقتصادی پہلو ۳۱۳ - ۳۲۱		عبادت الٰہی	۳۹۹
		قرآن پاک کا تاریخی اعجاز ۴۰۲ - ۴۰۷	
سود اور صحف انبیاء ۳۲۲ - ۳۳۵			
		اسلام ۴۰۸ - ۴۱۵	
سود اور زبور	۳۳۱		
سود اور انجیل	″	**جبر و قدر** ۴۱۶ - ۴۱۹	
سود اور قرآن مجید	۳۳۳		
قیامت ۳۳۶ - ۳۵۰			

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتّب

اُستاذی المحترم حضرت مولانا سید سُلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فن میں بڑی بوقلمونی تھی، وہ نہ صرف ایک عالمِ دین تھے، بلکہ سیرت نگار بھی مفسر بھی محدث بھی متکلم بھی، ادیب بھی، شاعر بھی نقاد بھی، اور مورخ بھی تھے، مگر وہ اپنے اُستاذ علامہ شبلیؒ کے اس قول کو برابر نقل فرماتے رہتے کہ اصلی فن تو تفسیر، حدیث اور علمِ کلام ہے، ادب و تاریخ تو علمی دسترخوان کی محض چٹنی ہے، جو زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے دسترخوان پر ہوتی ہے، اسی طرح ادبی و تاریخی مضامین محض علمی ذائقہ بدلنے کے لئے لکھے جاتے ہیں، اُن کا عمل اسی پر رہا، اُن کی عزیز اور بیش قیمت زندگی سیرۃ النبیؐ لکھنے میں صرف ہوئی جس کا شمار اس وقت اسلامی دنیا کی مقبول ترین کتابوں میں ہے، اس شاہکار کے مرتب کرنے میں انھوں نے اس کا اہتمام رکھا کہ اس میں کلام پاک اور حدیث کے علاوہ کسی اور چیز کا حوالہ نہ آئے، چنانچہ انھوں نے اس کتاب کے تقریباً تین ساڑھے تین ہزار صفحات لکھے ہوں گے، لیکن اُس کو کلام پاک کی آیتوں اور حدیث کی روایتوں ہی سے مزین کیا ہے، حتی الوسع کسی مُصنف اور کسی تصنیف کا سہارا نہیں لیا ہے، وہ جب کلام پاک کی آیتوں کی تفسیر بیان فرماتے، یا کسی حدیث کی روایت کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا کی لذیذ ترین نعمتیں اُن کے پاس سمٹ کر آگئی ہیں، اُن کا محبوب مشغلہ درسِ قرآن دینا تھا، وہ برابر اُس کا درس دیتے رہتے، کبھی ایسی جگہ ہوتے جہاں درس کا اہتمام

نہ ہو سکتا تو کوئی ایک آدمی بھی مل جاتا تو اُس کا درس شروع کر دیتے، اس درس کو سنتے وقت احساس ہوتا، کہ ان میں علم کی غیر معمولی بصیرت اور بصارت کے ساتھ فکر و نظر کی کتنی بڑی گہرائی اور رفعت نگاہی اور باریک بینی بھی ہے، اُن کو ڈاکٹر اقبال نے بجا طور پر علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد کہا ہے،

وہ اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر جب کبھی ادب و تاریخ کے کسی پہلو پر قلم اُٹھاتے، تو اُن کی فکر و نظر کے جلوے اس میں بھی دکھائی دیتے، اُن کے ادبی مضامین کا مجموعہ "نقوشِ سلیمانی" ہے، جو بہت مقبول ہوا، اُن کی کتاب "خیام" اُن کی ادبی تحقیقات کا ایک شاہکار ہے، اسی طرح "عرب و ہند کے تعلقات"[1] اُن کی تاریخی تحقیقات کا ایک ایسا مایۂ ناز سرمایہ ہے جس پر خود فنِ تحقیق کو ناز ہو سکتا ہے، وہ جب کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس عالمِ رنگ و بو سے ہٹ کر کسی اور عالم میں پہونچ گئے ہیں، جہاں ہر طرف صرف تلاش و تجسس تحقیق و تدقیق اور محنت و ریاضت ہی کی نیرنگیاں کار فرما ہیں، اور ان ہی کی بہار آفریں قوس و قزح میں گم ہو کر اپنی تحریر کو قلم بند فرما رہے ہیں، اُن کی ہر تصنیف اور اُن کا ہر مقالہ اس کی کھلی شہادت ہے، اُن کا سنجیدہ اور تحقیقاتی رنگ اُن کا اصلی اسلوب بیان ہے جس سے اردو زبان کو بڑا وزن اور وقار حاصل ہوا،

اگر اُن سے پوچھا جاتا کہ کیا تاریخ ان کا محبوب موضوع ہے تو صاف فرما دیتے ہرگز نہیں لیکن اربابِ نظر اُن کو بہت بڑا مورخ بھی سمجھتے رہے، اور جب تک اردو زبان قائم ہے، نہ صرف اُن کی مشہور کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" زندۂ جاوید بن کر رہے گی. بلکہ اُن کے تاریخی مقالات کی اہمیت بھی اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے برابر باقی رہے گی، اُن کو مورخانہ فکر و نظر کا جو عطیہ قدرت کی طرف سے ملا تھا، اس کی بدولت تاریخ کے علاوہ وہ جو چیز بھی لکھتے، اس میں مورخانہ تجسس

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ محی سعید الحق دیسنوی نے کیا، جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۳ء کے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوا،

کے ساتھ مورخانہ تجزیہ کا رنگ خود بخود پیدا ہوجاتا جس سے اُن کی کتابوں اور تحریروں میں ایک امتیازی شان پیدا ہوجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کی کتابیں ہر طبقہ میں غور اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور دارالمصنفین کی تو وہ راس المال ہیں؛

اُن کے تاریخی مقالات میں بھی بڑا تنوع ہے، اس وقت ناظرین کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے، اُس میں صرف وہ مقالات ہیں، جو ہندوستان کی تاریخ کے کسی پہلو پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے، ان میں سے جو بھی مضمون جب لکھا گیا، اُس کی حیثیت قطب نما کی ہوگئی تھی، زیرِ نظر کتاب کا پہلا مضمون "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی" ہے، یہ ۱۹۱۸ء کے معارف میں ایک سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا، اور بہت شوق سے پڑھا گیا، اس مضمون کی اشاعت کے اکیس سال بعد راقم نے اس کا انگریزی ترجمہ کرکے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن بھیجا، تو اس رسالہ کے اڈیٹر نے اس کو بہت پسند کیا، اور شکریہ کے ساتھ دو قسطوں (اکتوبر ۱۹۳۸ء و اکتوبر ۱۹۳۹ء) میں شائع کیا، پھر ۲۴ سال کے بعد ۱۹۶۵ء میں اس کا بنگالی ترجمہ مولانا غلام محی الدین اڈیٹر آج ڈھاکہ نے کیا، اس موضوع پر اب بہت کچھ تحقیقات ہو چکی ہیں، ڈاکٹر سید عبد اللہ اورنٹیل کالج لاہور نے "ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ" کے نام سے پوری کتاب لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری پائی ہے، انھوں نے اپنی کتاب کے تعارف میں اعتراف کیا ہے کہ

> "جب ۱۹۲۸ء میں میرے مخدوم پرنسپل محمد شفیع صاحب اور استاذ محترم پروفیسر محمد اقبال صاحب نے انفرڈیٹیالہ اسکالر کی حیثیت سے مجھ سے اس مضمون پر کچھ لکھنے کی فرمایش کی، تو میں دبی پرشاد سائل کی کتاب آثار شعرائے ہنود کے سوا کسی ماخذ سے واقف نہ تھا، جب اس سلسلہ میں میں نے جستجو سے کام لیا، تو معلوم ہوا کہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اس موضوع پر ایک طویل سلسلۂ مضامین معارف ۱۹۱۸ء میں سپرد قلم کر چکے ہیں، جنھیں میں نے اپنے لئے ایک مستقل ماخذ کے طور پر

استعمال کیا،.. .. ..اس امر کا اعتراف کیا جاتا ہے، کہ میں نے ان مضامین سے بے حد مدد لی ہے
جس کے لئے میں جناب سید صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں"

مقالہ "خلافت اور ہندوستان" اُس وقت لکھا گیا جب ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کے مسلمان بہت ہی پُر آشوب دور سے گذر رہے تھے، پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصاً ترکی پر سخت وقت آیا، اُس کے حصے بخرے کئے جا رہے تھے، ترکی کا سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا، اتحادی فتح کے غرور اور نشہ میں خدا کی خدائی کی شکست و ریخت میں مصروف تھے، اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے، اس وقت ہندوستان کے دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانوں پر کھیل کر ایک خلافت کانفرنس قائم کی جس میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے ایسی تنظیمی قوت پیدا کر دی کہ پورا ہندوستان اُس کی آواز پر اٹھتا بیٹھتا تھا، اس تحریک میں سید صاحب بھی پیش پیش ہو کر ترکی کی حمایت میں زبان و قلم اور دعوت و اشاعت سے لڑتے رہے، وہ مولانا شوکت علی اور محمد علی کے ساتھ ایک وفد میں لندن بھی گئے، اور وہاں خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اور اُن کے مذہبی مطالبات کی وضاحت کی، پروفیسر مارگولیتھ اور ایک اطالوی مستشرق سے مسئلۂ خلافت پر علمی نبرد آزمائی بھی ہوئی، اور اس مسئلہ پر مشہور انگریزی مجلہ فارن افیئرز میں ایک مدلل اور جامع مضمون لکھا جس کی تعریف مولانا محمد علی نے بار بار کی، وہاں سے واپسی کے بعد خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام" اور "خلافت اور ہندوستان" کے عنوان سے دو اہم مضامین معارف کے کئی نمبروں میں لکھے جن کو مختلف ناشروں نے علیحدہ علیحدہ رسالوں کی صورت میں بھی شائع کیا، اُن سے تحریک خلافت کو بڑی مدد ملی، ہندوستان اور خلافت جس وقت نظر سے لکھا گیا ہے، اور اس میں جو تاریخی معلومات ہیں، ان سے ناظرین اب بھی مستفید ہو سکتے ہیں،

مضمون "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" معارف کی کئی قسطوں میں شائع ہوا عیسائیوں اور غیر مسلموں کے اس پروپگنڈہ سے کہ ہندوستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا خود مسلمان متاثر ہو چلے تھے لیکن جب حضرت سید صاحب کا یہ مضمون معارف میں شائع ہوا، تو مسلمانوں کو ایسا محسوس ہوا کہ اُن کی جھکی ہوئی گردنیں یکایک خوشی بلکہ فخر سے اٹھ گئی ہیں، کیونکہ اسی مضمون کے ذریعہ سے اُن کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اسلام سلاطین کی تلواروں سے نہیں پھیلا، بلکہ اُس کی ترقی اُن ہی طرقوں سے ہوئی جس سے دنیا میں ہر داعی مذہب کی ہوئی ہے، ہوتی ہے، اور ہوگی، اس مضمون میں جو تاریخی صداقتیں پیش کی گئی ہیں، اُن سے وہ تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں، جو معاند مورخوں اور عیسائی مبلغوں نے پھیلا رکھی تھیں، خواجہ حسن نظامی مرحوم نے تو اس مضمون کو رسالہ کی صورت میں شائع کرکے بڑی کثرت سے تقسیم کرایا، جو ہر جگہ شوق سے پڑھا گیا،

"لاہور کا ایک فلکی آلات ساز" میں ہندوستان کے اصطرلاب اور اُن کے صناعوں کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں، اُن سے حضرت سید صاحب کے ذوق کے تنوع کا اندازہ ہوگا، اُن کو علم ہیئت سے بھی کچھ دلچسپی تھی، مارچ وجون ۱۹۰۹ء کے رسالہ الندوہ لکھنؤ میں اسلامی رصدخانے کے عنوان سے جو مضمون نکلا، وہ آج بھی اپنی مفید معلومات کی وجہ سے لائق مطالعہ ہے، اسی دلچسپی کی وجہ سے حضرت سید صاحب نے لاہور کا ایک فلکی آلات ساز" میں عہد مغلیہ میں جو اصطرلاب بنائے گئے، اُن سے متعلق پرمغز اور دلچسپ معلومات فراہم کئے ہیں، اس مضمون سے جرمنی کے ڈاکٹر فان کلیوبر نے بڑی دلچسپی لی، اور جب راقم کا کیا ہوا اس کا انگریزی ترجمہ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں شائع ہوا، تو شکاگو یونیورسٹی کے ایک لائق فاضل نابیا ایٹ نے اس کو غور سے پڑھا، اور جنوری ۱۹۳۶ء کے اسلامک کلچر میں اس پر ایک استدراک لکھا،

اس کتاب کا ایک بہت ہی اہم مقالہ "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" ہے، جو ۱۹۳۳ء میں الہند

میں ادارۂ معارفِ اسلامیہ کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر اقبال کی صدارت میں پڑھا گیا، اس میں پہلی دفعہ پوری تحقیق اور سند کے ساتھ یہ بتایا گیا، کہ تاج محل اور لال قلعہ کا معمار نادرالعصر استاد احمد لاہوری (المتوفی ۱۰۵۹ھ) تھا، تاج محل کی تعمیر ۱۰۵۱ھ میں ہوئی، یعنی استاد احمد کی وفات سے نو برس پہلے ختم ہو چکی تھی، اور دہلی کا لال قلعہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہو کر احمد کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۰۵۸ھ میں تکمیل پایا، لال قلعہ کی تعمیر میں استاد احمد کا بھائی استاد حامد، اور اس کا لڑکا لطف اللہ مہندس بھی شریک رہا، اس مضمون میں استاد احمد کے لڑکوں کا بھی ذکر ہے، جو تعمیر، ہندسہ اور ریاضیات میں ماہر تھے، انگریز مورخوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی تھی کہ تاج محل کو ایک طالوی معمار نے تیار کیا، لیکن اس مقالہ کے بعد یہ غلط فہمی جاتی رہی، ۱۹۵۱ء میں دہلی کے مشہور اخبار اسٹیٹسمین کے کچھ انگریز کالم نویسوں نے پھر بحث چھیڑ دی، کہ تاج محل کے معمار ہندوستان کے نہیں، بلکہ یورپ کے تھے، راقم نے حضرت سید صاحب کے اس محققانہ مضمون کا حوالہ دے کر انگریز کالم نویسوں کی رائے کی تردید کی تو حکومتِ ہند کے آثارِ قدیمہ کے ڈائرکٹر نے بھی تائید کی کہ تاج محل کا معمار ہندوستانی مہندس نادرالعصر استاد احمد لاہوری تھا، راقم نے اس مضمون کے بھی انگریزی میں ترجمہ کرنے کی عزت حاصل کی، جو جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی جلد ۳۴ حصہ اول و دوم ۱۹۴۸ء میں چھپا، گو اس کے اڈیٹر نے فارسی ٹائپ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی فارسی عبارتوں کو حذف کر دیا، جس سے اصل کی شان باقی نہیں رہی، اردو کا یہ مضمون تمام مورخوں کے لئے قیمتی ماخذ بن گیا ہے۔

مقالہ "قنوج" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عرب جغرافیہ نویس اور سیاح سندھ میں جس قنوج کا ذکر کرتے ہیں، وہ کوئی علٰحدہ قنوج نہ تھا، بلکہ وہی قنوج ہے جو موجودہ فرخ آباد کے ضلع میں واقع ہے، اور جو کسی زمانہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی راجدھانی تھی، عربوں نے سندھ کی سمت میں جس قنوج کا ذکر کیا ہے اس سے مقصود سلطنتِ قنوج کا آخری سرحدی مقام تھا، اس کو ثابت کرنے کیلئے

حضرت سید صاحب نے جس غیر معمولی تلاش و تفتیش کا ثبوت دیا ہے وہ مقالہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا، یہ ادارہ معارف اسلامیہ کے تیسرے اجلاس دہلی میں پڑھنے کے لئے لکھا گیا تھا لیکن حضرت سید صاحب اس میں شرکت نہ کرسکے، اس لیے وہاں پڑھا نہ گیا، تو معارف میں شائع کر دیا گیا، اس کا انگریزی ترجمہ جناب سید ابو عاصم ام اے ال ال بی نے کیا جو اکتوبر ۱۹۴۳ء کے اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا،

مقالہ ہندی الاصل اور ہندی النسل مسلمان سلاطین، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے ایک توسیعی لکچر کے لئے لکھا گیا تھا، لیکن وہاں پڑھا نہ جاسکا، یہ کراچی میں انجمن ترقی اردو کے ایک جلسہ میں ڈاکٹر محمد حسین کی صدارت میں پڑھا گیا، جو اُس وقت حکومت پاکستان کے وزیر تھے، اس میں دہلی، سندھ، ملتان، کشمیر، گجرات، اور دکن کے ایسے سلاطین کا ذکر ہے، جو یا تو ایک طرف سے بیرونی اور دوسری طرف سے ہندی ہیں، یا جو باپ اور ماں دونوں طرف سے ہندی ہیں، اس مقالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ایسے فرمانرواؤں نے دوسرے بادشاہوں کے مقابلہ میں ہندوستان کی کسی طرح کم خدمت نہیں کی، اس کی تفصیلات ناظرین کے لئے دلچسپ بھی ہیں، اور پُر از معلومات بھی،

اس کتاب میں کچھ ایسے مضامین بھی ہیں، جو بہت مختصر ہیں لیکن اُن سے حضرت سید صاحب کی بالغ نظری اور باریک بینی کا اندازہ ہوگا، ان کا معمول تھا کہ جب کہیں جاتے تو وہاں کے قابلِ ذکر تاریخی مقامات اور کتب خانے کی سیر ضرور کرتے، اور وہاں جوہری بن کر اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیتے، ۱۹۱۶ء میں سرنگاپٹم تشریف لے گئے، تو اُن کے قلم سے "سلطان ٹیپو کی چند باتیں" کے عنوان سے کچھ سطریں نکل پڑیں، جن میں اُن کے کچھ چشم دید مشاہدات اور کچھ تاریخی حقائق ہیں، اسی طرح ۱۹۳۵ء میں بہار کے مشہور تاریخی مقام نالندہ (ضلع پٹنہ) کی سیر کی تو اپنے مضمون "نالندہ کی سیر" میں اس کی تاریخ کے ساتھ بودھ زمانہ کے تمام آثار، مثلاً اُس کی آٹھ خانقاہوں، سنگی مندر، رصد خانے اور عجائب خانہ سے متعلق مفید معلومات فراہم کیں، اور اسی مختصر مضمون میں یہ بتایا ہے کہ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ

نالندہ کی خانقاہ مسلمانوں کے زمانہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی لیکن یہ صحیح نہیں، کیونکہ کھدائی سے جو عمارتیں نکلی ہیں، وہ برباد کی ہوئی نہیں ہیں، البتہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ محمد بختیار خلجی کے حملۂ بہار کے وقت نالندہ کی حالت ایسی منتشر اور پراگندہ ہوئی کہ پھر اُس کا شیرازہ نہ بندھ سکا،

حضرت سید صاحب نے جب جب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے کتب خانے کی سیر کی، تو ان کی جوہر شناس نگاہیں کچھ ایسی کتابوں پر پڑیں جن سے انھوں نے قیمتی تاریخی معلومات حاصل کئے، جیسا کہ ان کے دو چھوٹے مضامین "ہندوکش عالمگیر کے عہد کی دو عجیب کتابیں" اور "سند معافی جزیہ" سے ظاہر ہوگا"

ہندوستان کی عمومی تاریخ کی تدوین و ترتیب کے متعلق حضرت سید صاحب کا خاص نقطۂ نظر ان کے اُس خطبۂ صدارت سے ظاہر ہوگا، جو انھوں نے دسمبر ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے شعبۂ تاریخ ہند از منہ وسطیٰ (۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶ء) میں دیا، یہ خطبہ اس کتاب میں ناظرین خود ملاحظہ کریں، اس میں حضرت سید صاحب نے بڑے دکھ کے ساتھ فرمایا ہے کہ پالٹکس کے کھیل سے اس ملک کا علم تاریخ بھی بچا ہوا نہیں، انگریزوں نے مسلمانوں کی تاریخ الٹ پلٹ کر کچھ ایسی سمجھائی اور پڑھائی کہ جو دل اُن سے ٹوٹے، وہ اب تک نہ جڑ سکے، اور پھر اسی دکھ اور درد کے ساتھ فرمایا کہ اب گو نہ وہ فاتح رہے، اور نہ وہ مفتوح، مگر زمانہ کے تطاول سے اُن کے زمانہ کے پیدا شدہ جذبات کے سوکھ جانے والے درخت کو پانی دے دے کر ہرا کیا جا رہا ہے، اسی لئے اس کانگریس کے مورخوں کو مخاطب کر کے فرمایا:-

"مجھے یہ کہنا تھا کہ تاریخ کے فن کو قوموں کے پھوٹ اور میل میں بہت کچھ دخل ہے اسلئے وہ لوگ جنکی نظریں اس ملک کا مستقبل ہے اور جنکے ہاتھوں میں اس کے مستقبل کا بنانا یا بگاڑنا ہے اُن کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہئے اور اس حالت میں جب کہ ہم سب کو معلوم ہے، کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اسی طرح جلتا

اور بڑھتا، اور پھیلتا، اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے"،
اور پھر آخر میں اپنے دل کی گہرائیوں سے فرمایا:۔

"ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے، اور کیوں مستقبل کے لئے یہ کوشش جاری رہے، کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہو سکے"۔

حضرت سید صاحب کے حکم سے راقم نے اس خطبہ کا انگریزی ترجمہ کیا، جو اجلاس میں پڑھا گیا، پھر اس کانگریس کی روداد میں شامل کیا گیا، یہ خطبہ اسی زمانہ میں مدراس کے اخبارات ہندو اور دکن ٹائمس، پھر کلکتہ کے اسٹار آف انڈیا اور مارننگ نیوز میں بھی شائع ہوا، دار المصنفین میں ہندوستان کی تاریخ کی تدوین و ترتیب کا جو سلسلہ جاری ہے، اس کے لئے یہ مشعل راہ بنا ہوا ہے،

اس خطبہ کے دینے سے پہلے بھی حضرت سید صاحب کو برابر اس کا دکھ رہا کہ اسکولوں کالجوں میں تاریخ ہند کی تعلیم سے فوائد کے بجائے نقصانات پہونچ رہے ہیں، اگست سنہ ۱۹۳۲ کے معارف کے شذرات میں تحریر فرمایا:۔

"سرکاری مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم کا اضافہ بظاہر علم کے اضافہ کے لئے ہے مگر درحقیقت یہ اقوام ہند میں قدیم اختلافات و نزاعات کے اضافہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے حالانکہ ہندوستان کو آگے چلنا ہے تو پیچھے پھر کر دیکھنا نہیں چاہئے آج اس بحث سے کہ سلطان محمود کا حملہ ہندوستان پر جائز تھا یا ناجائز اور شہاب الدین غوری نے کتنے مندر غارت کئے، اور عالمگیر نے ہندوؤں پر کیا کیا ظلم کئے، سوراج کی منزل میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا، کیا ہمارے ہم وطن اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے"؟

اسی شذرات میں یہ بھی فرمایا:۔

"ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند کی کتابوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی ہی باتیں جمع کی جاتی ہیں، جن سے ان دونوں قوموں (مراد ہندو مسلمان) کے جذبات میں مزید اشتعال پیدا ہو، اور اس کا اتفاق آیندہ مشکل سے بڑھ کر محال ہو جائے، حالانکہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی بھی کمی نہیں جن کے پڑھنے سے ان دونوں قوموں کے درمیان اختلاط و محبت کے جذبات پیدا ہوں، مگر بازاری قدردانی کے تابع مصنف و کتب فروش اپنی ذاتی عارضی کامیابی کے مقابلہ میں ملکی اور قومی بھلائی کی قیمت کی پروا نہیں کرتے"

معارف کے ان شذرات کو پڑھ کر پونہ سے حضرت سید صاحب کے ایک دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر نے ان کو لکھا کہ ان تلخیوں کو دور کرنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانانِ ہند کی صحیح اور اصلی تاریخ کا حقہ معاصرین اور متاخرین کے لئے درست کریں، یہ کہن سے نئی بوتلیں بھریں، شرابِ طہور کو جدید کاسوں (مزاجھا کافورًا) انڈیلیں۔ (دیکھئے معارف نومبر ۱۹۳۲ء) حضرت سید صاحب نے اس کے جواب میں معارف کی اسی اشاعت ہی میں تحریر فرمایا، کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ **ہندوستان کی ایک محقق تاریخ لکھنا آج مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے**، دارالمصنفین اس کے لئے اپنے مقدور بھر سب کچھ کرنے کو تیار ہے، لیکن ضرورت ہے کہ دوسرے دردمند اہلِ علم بھی ہمارے کاموں میں حصہ لیں اور اپنی سعی و تحقیق سے ممنون فرمائیں، اور پھر ایک بزم تاریخ ہند کی تشکیل کی، اور اس میں شرکت کرنے کے لئے پروفیسر شیخ عبدالقادر پونہ، پروفیسر محمد حبیب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر ہارون خاں شروانی حیدرآباد دکن، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، اسماعیل کالج بمبئی، مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی، مولف تاریخ گجرات احمدآباد، ڈاکٹر محمد ناظم محکمۂ آثار قدیمہ دکن، پروفیسر سید عبدالقادر، اسلامیہ کالج لاہور، حکیم سید شمس اللہ قادری حیدرآباد دکن، مولوی سید ہاشمی فریدآبادی، مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مؤلف حیاتِ جلیل، مولوی

اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی، مؤلف آئینۂ حقیقت، علامہ عبداللہ یوسف علی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ لاہور سے اپیل کی،

یہ اپیل بڑی گرمجوشی کے ساتھ سُنی گئی، اور مختلف سمتوں سے خطوط آئے، کہ یہ کام ضرور شروع کیا جائے لیکن اس کے شروع کرنے میں جو دقتیں تھیں، اُن کی طرف حضرت سید صاحب نے دسمبر سنہ ۱۹۳۴ء کے معارف میں تو یہ لکھ کر توجہ دلائی، کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور سلاطین اسلام کی بادشاہی و حکومت اور مسلمانوں نے اس ملک کو جو ترقی دی، اور یہاں جو تمدن پیدا کیا، اُن سب کی ایک مفصل اور مکمل تاریخ کی ضرورت تاریخی علمی، قومی، سیاسی ہر حیثیت سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے، لیکن یہ کام اس قدر اہم ہے کہ اس کو صرف شخصی ہمت سے انجام دینا مشکل ہے، ارباب نظر کی نگاہیں اس کے لئے برابر دارالمصنفین پر پڑ رہی ہیں، دارالمصنفین نے اب تک اس خدمت کے انجام دینے سے اس لئے پہلو تہی کی، کہ اس کے لئے گراں قدر مصارف کی ضرورت ہے، جس کے لئے دارالمصنفین کا موجودہ سرمایہ کافی نہیں" حضرت سید صاحب نے اس کام کے سلسلہ میں بتایا کہ تاریخ ہند کے غیر مطبوعہ قلمی نسخے حاصل کئے جائیں، تاریخ ہند پر انگریزی میں جتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، وہ خریدی جائیں، جن قلمی نسخوں کا حاصل کرنا ممکن نہ ہو، اُن کے مطالعہ کے لئے مصنفین سفر کریں، پھر کتاب کی ترتیب و تدوین کیلئے لائق اشخاص کی خدمات مناسب معاوضہ پر حاصل کی جائیں،

ان کا خیال تھا کہ تاریخ ہند کی تدوین پندرہ حصوں میں کی جائے جن میں عربوں، غزنویوں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں، لودیوں، مغلوں کے علاوہ، دکن، گجرات، مالوہ، خاندیس، کشمیر، ملتان، جونپور، بنگال، حیدرآباد، مرشدآباد، عظیم آباد، اودھ، روہیلکھنڈ، میسور، اور ارکاٹ، وغیرہ کے مسلمان فرماں رواؤں کی تاریخ قلمبند کی جائے لیکن انھوں نے زیادہ تر علمی، ثقافتی اور تمدنی تاریخ لکھے جانے پر زور دیا،

سنہ ۱۹۳۴ء کی ارزانی کے زمانہ میں حضرت سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ یہ کام سترہ ہزار میں پورا ہوجائیگا، اس اپیل پر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے ایک سال تک پچاس روپیہ ماہوار دینے کا وعدہ فرمایا، اور خان بہادر مولوی محمد حسین خاں صاحب سابق ڈپٹی اکونٹنٹ گورنمنٹ آف انڈیا، وسابق فنانس منسٹر رامپور نے پانچ سو یکمشت عطا کیا، اسی قلیل رقم سے حضرت سید صاحب نے کام شروع کردیا، اور جن اصحاب سے حضرت سید صاحب نے قلمی اعانت کی اپیل کی تھی، انھوں نے خاموشی اختیار کرلی، خود مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی کو احمدآباد سے دارالمصنفین بلایا گیا، کہ یہ کام جاری ہوجائے، اور مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کو ہندوستان کی تمدنی تاریخ لکھنے کو کہا گیا،

راقم اس زمانہ یعنی سنہ ۱۹۳۴ء میں علی گڈھ سے تعلیم سے فارغ ہوکر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں پروفیسر محمد مجیب کی نگرانی میں تاریخ ہند پر کچھ کام کرنے چلا گیا تھا، ۱۴ دسمبر سنہ ۱۹۳۴ء میں حضرت سید صاحب نے ایک مکتوب میں کچھ اور باتوں کے علاوہ یہ تحریر فرمایا،

"دارالمصنفین میں تاریخ ہند کا کام شروع کردیا گیا ہے، تم کو تاریخ ہند سے دلچسپی رہی ہے، اور یہ ذوق تم نے اپنے والد مرحوم سے وراثت میں پایا ہے، ان سے مجھکو بڑا لگاؤ تھا، ان کی جوانی کی موت بھلائی نہیں جاتی،[1] اس لگاؤ کی بنا پر تمھاری طرف میری نظر برابر اٹھتی رہی، دارالمصنفین پیسے کمانے کی جگہ نہیں، اس لئے یہاں تم کو بلانے میں تامل رہا، کیونکہ اور نوجوانوں کی طرح تم کو بھی اچھی ملازمت حاصل کرنے کا حوصلہ ہوگا، لیکن تم پسند کرو، تو یہاں آجاؤ، اور تاریخ ہند کے کاموں میں حصہ لو، ابھی بلاشرط آؤ، میری طرف سے بھی کوئی شرط نہیں، تم یہاں آکر کچھ دنوں رہو، یہاں کے کاموں میں تمھارا جی لگے، اور تم یہاں رہنے پر رضامند ہوجاؤ"

---

[1] راقم کے والد بی، اے، پاس ہونے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد کرلئے گئے تھے، لیکن اس عہدہ پر مامور ہونے سے پہلے وفات پاگئے،

تو دارالمصنفین اپنی بساط کے مطابق تمھاری کچھ مالی خدمت بھی کر دے گا لیکن جو زیادہ سے زیادہ خدمت کرسکتا ہے اس کا اندازہ تم کو پہلے سے ہے، ......" (حضرت سید صاحب نے اس خط میں ہر جگہ آپ لکھا تھا، لیکن راقم نے اس کو تم بنا دیا ہے)

اس مکتوب نے میری زندگی کا رُخ بدل دیا، حضرت سید صاحب کا شاگرد بننے کی بڑی آرزو تھی، یہ آرزو پوری ہوتی نظر آئی اس لئے جنوری ۱۹۳۵ء میں جامعہ ملیہ دہلی سے دارالمصنفین چلا آیا، اس سے پہلے بھی یہاں کئی بار آچکا تھا، لیکن اس مرتبہ اس کی سرزمین جنت ارضی اور اس کی ہر چیز زندگی سے معمور نظر آئی، شاید اس لئے کہ یہاں پوری زندگی گذارنی تھی، حضرت سید صاحب بھی میرے آجانے سے خوش تھے،

دوسرے دن اُن کی میز کے قریب جاکر بیٹھا تو انھوں نے تاریخ ہند کی اسکیم بتاکر فرمایا کہ تم ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے فوجی نظام پر مواد جمع کرو، عرض کیا کہ یہ میرے لئے دشوار اور خشک موضوع ہے، فرمایا کہ دشوار گذار راہیں طے کرنے کے بعد ہی تحقیق کے رموز سے واقف ہوگے، حکم تھا اس لئے تعمیل میں لگ گیا، لیکن میرے کام کی رفتار بہت سُست رہی، اور سچ تو یہ ہے کہ چار پانچ سال تک حضرت سید صاحب کی نگرانی میں قلم پکڑنا سیکھتا رہا، اور جب کچھ کام کرنا سیکھا تو ۱۹۴۱ء میں یکایک صحت خراب ہوگئی، اور کئی سال تک پریشان رہا، میری علالت کی داستان دکھ بھری ہے، اور یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حضرت سید صاحب کی دعاؤں کی بدولت صحت ہوگئی، انھوں نے بہت سی دعائیں ورد کرنے کے لئے لکھ بھیجیں، اور ایک بار یہ بھی تحریر فرماکر دل بڑھایا کہ

".....تم ہر وقت یاد آتے ہو، تم کو اللہ تبارک تعالیٰ دارالمصنفین ضرور واپس بھیجے گا، ابھی تم سے بہت کچھ کام لینا ہے، میں تمھارے لئے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں عجل اللہ"

شفاء کہو، ہاں بھائی، مولانا (یعنی مولانا اشرف علی تھانویؒ) نے بھی تمہارے لئے دعا کی، یہ بھی پوچھا کہ کیا بیمار ہیں، پھر دعا فرمائی، مولانا عبدالماجد نے تمہارے لئے تعویذ بھیجی ہے، جو بھیج رہا ہوں......"

اسی خط میں لکھا کہ

"تم جب سے گئے ہو تاریخ ہند کا کام بالکل رُکا ہوا ہے، تم آؤ تو پھر یہ کام شروع ہو"

حضرت سید صاحب کے اس قسم کے شفقت آمیز خطوط دوا اور علاج سے زیادہ موثر ثابت ہوئے، تاریخ ہند کے کام رُک جانے کی وجہ یہ ہوئی، کہ مولانا ابوظفر ندوی مرحوم تاریخ سندھ اور پھر غزنویوں اور غوریوں پر ایک جلد لکھکر احمد آباد چلے گئے، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ہندوستان کی تمدنی تاریخ پر کچھ ابواب بہت اچھے لکھے تھے، لیکن پھر اُن کا اشہب قلم دوسرے میدان کی طرف چل نکلا، تو اس طرف متوجہ نہیں ہوئے، ملک کے جن اصحاب قلم سے اس اسکیم میں شرکت کرنے کی امید تھی، انھوں نے پہلوتہی کی، صرف دارالمصنفین کے اندر ہی یہ کام محدود ہو گیا، اور رفقا دوسرے کاموں میں لگے ہوئے تھے، اس لئے یہ راقم ہی تاریخ ہند پر کچھ خامہ فرسائی کرتا رہا،

۱۹۴۴ء تک آتے آتے اپنی صحت کی خرابی کے باوجود ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام پر کام کسی طرح ختم کیا، حضرت سید صاحب نے اگست ۱۹۴۴ء کے معارف کے شذرات میں یہ لکھ کر میری ہمت افزائی کی،

"دارالمصنفین کی مجوزہ تاریخ ہند کے متعدد حصے تکمیل پا چکے ہیں، اس سلسلۂ تاریخ کا اہم مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان تمدنی، صنعتی علمی، اور فنی کارناموں کو دیکھا جائے، جن سے یہ معلوم ہو کہ ہندوستان کی تعمیر میں ان کی کوششوں کو کہاں تک دخل ہے، اس ضمن میں ایک پوری جلد ہندوستان میں مسلمانوں کی فوجی و عسکری تنظیم پر ہے، جس کو ہمارے

رفیق سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ایم اے نے کئی سال کی تلاش و محنت میں ترتیب دیا ہے،
یہ کتاب ابھی اُن کے قلم سے پوری ہو کر ختم ہوئی ہے"۔

یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں ختم ہونے کو تو ہو گئی تھی، پھر بھی اُس کے بعض ابواب میں اضافہ کی ضرورت تھی، اس لئے اُس کی طباعت و اشاعت میں عجلت نہیں کی، اسی اثنا میں میری پہلی اہلیہ کی اچانک وفات، گھر کے اور بزرگوں اور سرپرستوں کی المناک موت سے میری صحت اور بھی زیادہ بگڑ گئی، اور دنیا میرے لئے تنگ اور تاریک ہو گئی، تاریخ ہند کا کام بھی بالکل رُک گیا، دارالمصنفین ۱۹۴۷ء عیسوی تک اس سلسلہ میں مولانا ابوظفر ندوی صاحب مرحوم کی صرف ایک کتاب تاریخ سندھ شائع کر سکا، جو بہت پسند کی گئی، مولانا ابوظفر ندوی صاحب نے غزنویوں اور غوریوں کی جلد کی طباعت رکوا دی، کہ اس میں وہ مزید اضافہ کرنا چاہتے تھے۔

علاج کے مختلف مراحل طے کر کے ۱۹۴۷ء کے اگست میں دارالمصنفین لوٹا تو حضرت سید صاحب اس وقت بھوپال میں تشریف فرما تھے، انھوں نے ایک مکتوب میں مورخہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ میں تحریر فرمایا،

"میں بہت خوشی سے تمہارا احاطہ دارالمصنفین میں خیر مقدم کرتا ہوں، میرے ساتھ دارالمصنفین کے تمہارے احباب بھی بے چینی سے تمہارے منتظر تھے، بے شبہ تمہارے علاج میں بہت روپیہ خرچ ہوا لیکن

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اللہ تعالیٰ تم کو صحت و عافیت کے ساتھ تادیر دارالمصنفین کی خدمت کا موقع دے، اب تم سے اور برادرم شاہ معین الدین ہی سے ساری امیدیں وابستہ ہیں، تم لوگوں کو دارالمصنفین کے چراغ کو ہر طرح روشن رکھنا ہے، اور ہاں بھائی اب پورے عزائم کے ساتھ تاریخ ہند کے

سلسلہ کو بھی جاری رکھو، اللہ تبارک تعالیٰ پورا فرمائیں۔ آمین"

اس محبت نامہ نے حوصلہ بڑھایا، اور تاریخِ ہند کے کاموں میں منہمک ہو گیا، حضرت سید صاحب کے حکم سے ۱۹۴۸ء میں راقم کی کتاب بزم تیموریہ اور ۱۹۴۹ء میں بزم صوفیہ شائع ہوئیں، اُن میں حضرت سید صاحب کو بزم صوفیہ زیادہ پسند تھی، اور یہی پسندیدگی میری محنت کا اصلی صلہ تھا، انھوں نے اس پر ایک مقدمہ بھی لکھنے کی خوشخبری دی تھی، لیکن وہ حج کے لئے تشریف لے گئے، اور وہاں سے آکر بمبئی میں علیل ہو گئے تو اُن ہی کے حکم سے اُس کی اشاعت میں تاخیر نہ کی گئی، اور شائع کر دی گئی، بزم تیموریہ میں حضرت سید صاحب کا ایک دیباچہ بھی ہے، لیکن اس کی اشاعت کے بعد ایک گرامی نامہ مورخہ ۳۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء میں تحریر فرمایا:-

"خوشی ہوئی کہ تمھاری کامیاب تصنیف بزم تیموریہ اہلِ ذوق کو پسند آرہی ہے، مجھکو پہلے بزم تیموری پسند نہیں تھی، کیونکہ میں اُن کو عیش و تنعم کا دلدادہ، شراب و کباب کا متوالا، حسن و عشق کا پرستار، نقش و تصویر اور سرود و ساز کا دمساز ہی سمجھتا رہا، لیکن جو تصویر تم نے کھینچی ہے، وہ نہایت عمدہ ہے، اور مصور کے کمالات تعریف کے مستحق ہیں،

اور جب بزم صوفیہ چھپ کر ان کے پاس پہونچی تو انھوں نے یہ تحریر فرما کر محض اپنی شفقت و محبت کا اظہار کیا:-

"تمھاری یہ کتاب انشاء اللہ مفید ثابت ہوگی، کیونکہ اس کا انداز اصلاحی ہے، اور بابرکت بھی ہے، مصنف کے لئے باعث خیر اور موجب اجر ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ

تاریخِ ہند کے سلسلہ کی تکمیل کے لئے جس سرمایہ کی ضرورت تھی، وہ اب تک کہیں سے نہیں ملا، اور نہ کسی گوشہ سے قلمی اعانت حاصل ہوئی، ۱۹۴۹ء میں حضرت سید صاحب بھوپال سے اپنے وطن دیسنہ تشریف لائے، تو اُن کے ساتھ کافی دنوں تک رہنے کا موقع ملا، وہ تاریخِ ہند

کے کاموں کی سُست رفتار سے بددل تھے لیکن ان کو تمام مجبوریوں اور مشکلوں کا بھی احساس رہا، ایک روز فرمانے لگے:۔

"میں تو چراغ سحری ہوں، شاہ معین الدین صاحب دارالمصنفین کے اور کاموں میں لگیں گے، اب تم ہی کو تاریخ ہند کے سلسلہ کو مکمل کر کے ان کے چھپوانے کا بھی انتظام کرنا ہے"

ان فقروں کے بار سے دب کر رہ گیا، اسی سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ اب سیاسی واقعات کی کھتونی کے بجائے مسلمانوں کے دور کے تمدنی، ثقافتی، علمی، معاشرتی، اقتصادی وغیرہ حالات پر لکھنے کی زیادہ ضرورت ہے، اسی دوران گفتگو میں یہ سوال آگیا کہ کیا ہندوستان کے سلاطین اسلام کے نمایندے تھے، حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ وہ نمایندے نہ تھے، اور دلائل میں وہی باتیں کہیں جو انھوں نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے شعبۂ تاریخ ہند ازمنۂ وسطی کے خطبۂ صدارت میں کہی تھیں، جو اس کتاب میں شامل ہے، یعنی یہ کہ اُن کی حکمرانی کا طرز اور فرماں روائی کا اصول خالصۃً اسلامی نہ تھا، اور نہ اُن کے سپہ سالار اور فاتح اپنے مفتوحہ علاقوں کے ساتھ اسلامی طریقہ کا پورا پورا برتاؤ کرتے تھے، اُن کے صلح و جنگ، فتح و غنیمت اور محاصل و مداخل کے اصول بھی اسلامی نہ تھے، راقم نے مودبانہ طور پر عرض کیا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ اسلام کے نمایندے نہ تھے، لیکن غیر مسلم انہی کی تاریخ کو اسلامی تاریخ سمجھتے ہیں، ہمارے صوفیہ، علما اور صلحا کے کارناموں کو وہ ہماری مذہبی سرگرمیاں سمجھکر پڑھنے کے لئے تیار نہیں، اس کے علاوہ یہ سلاطین اسلام کے نمایندے تو نہ تھے لیکن انہی کی وجہ سے یہاں علما، صلحا اور مشائخ کو قدم جمانے کا موقع ملا، اور گو اُن کے درباروں کی فضا اسلامی نہیں رہی، لیکن انہی کے سہارے اس سرزمین میں اسلام پھل پھول سکا، اور گو انھوں نے تبلیغ اسلام کی کوئی کوشش نہیں کی، لیکن ان ہی کی بدولت مبلغین اسلام کی کوششیں بارآور ہوتی گئیں، اور گو وہ اوامر و نواہی کے تو زیادہ پابند نہیں رہے، لیکن جہاں حمیت اسلام کا سوال پیدا ہوتا، یا

اُن کی دینی غیرت ضرور بروے کار آجاتی، حضرت سید صاحب نے مجھکو روکتے ہوئے فرمایا جو کچھ کہتے ہو صحیح ہے، اس سے اختلاف نہیں، ایک زمانہ تھا کہ میں بھی شاہانِ اسلام کو اسلام کا نمایندہ اور اس کی شان و شوکت کا حامل سمجھتا تھا، اور ان کی مدح و ستایش کیا کرتا تھا، اب جب سے یہ نکتہ حل ہوا کہ اکثریت ان میں اُن کی ہے جن پر بدنام کنندۂ نکونامے چند کی مثل پوری ہوتی ہے، تو ان کو اسلام کا نمایندہ سمجھنے سے دل ہٹ گیا، لیکن یہ دینی جذبہ ہے اور ذوقی بات ہے، ذوق بھی یکساں ہمیشہ نہیں رہتا، یہ بھی بچہ، جوان، اور بوڑھا ہوتا ہے، میں نے بچپن میں ناول بہت پڑھے، مگر مشغلۂ علمی کے بعد یہ حال ہوگیا کہ ان کے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا، اس کے یہ معنی نہیں کہ اب افسانے اور ناول نہ لکھے جائیں، لکھے جائیں گے، اور وہ پڑھے جائیں گے، اور لکھنے والوں کو مبارک باد بھی ملے گی یہی حال اب سلاطین کی تاریخ کا ہے، وہ ضرور لکھی جائے، اور آخر میں مجھکو مخاطب کرکے فرمایا کہ انشاء اللہ تم بھی بوڑھے ہوگے، تو تمھارا ذوق جوان ہوگا،

حضرت سید صاحب کی یہ گفتگو برابر یاد آتی ہے، اسی زمانہ میں انھوں نے اصرار کرکے میری دوسری شادی کرادی تاکہ میری زندگی میں میری تنہائی کی وجہ سے جو غمناکیاں اور تلخیاں ہیں، وہ دور ہوجائیں، میری اس نئی زندگی کے لئے انھوں نے جو دعائیں فرمائیں، وہ میری زندگی کا بہت ہی بیش بہا سرمایہ ہیں،

جون ۱۹۵۰ء میں حضرت سید صاحب بھوپال سے دارالمصنفین تشریف لائے، تو اُس وقت وہ کچھ ایسی ذہنی پریشانیوں میں مبتلا ہوگئے، جن سے نہ صرف اُن کی بلکہ دارالمصنفین کی زندگی کا بھی رُخ بدل گیا، اس مرتبہ دارالمصنفین آکر یہاں سے جو تشریف لے گئے تو دارالمصنفین کے گلی تاج کو پھر کسی نے چاندنی رات میں نہیں دیکھا،

مارچ ۱۹۵۳ء میں حضرت سید صاحب پاکستان ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت کے بعد ڈھاکہ

سے کراچی جاتے ہوئے ہندوستان بھی آئے، اور اپنے داماد سید حسین صاحب قائم مقام کلکٹر فتح پور (یو۔پی) کے یہاں ٹھہرے، دارالمصنفین سے ایک مختصر قافلہ اُن سے ملنے گیا، یہ راقم بھی ساتھ تھا، یہ ہم لوگوں کی آخری ملاقات تھی، جہاں دارالمصنفین کے اور تمام کاموں کی تفصیل پوچھی، وہاں تاریخ ہند کے سلسلہ کا بھی ذکر آیا، کام کچھ آگے نہ بڑھا تھا، پھر بھی حوصلہ افزائی کی خاطر مجھ سے فرمایا کہ اب یہ کام تو تم ہی کو انجام دینا ہے، اسی زمانہ میں معارف میں ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک" کے عنوان سے میرا ایک سلسلۂ مضمون جاری تھا، فرمایا یہ دلچسپ چیز ہے، اس کو کتاب کی شکل میں شائع کر دینا، آج کل ایسی چیزوں کی ضرورت ہے، یہ ہمت افزا فقرے میری محنت کے اصلی ثمرتھے،

۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو حضرت سید صاحب کی رحلت کی خبر ملی تو ایسا معلوم ہوا کہ اب میری علمی زندگی کا بھی خاتمہ ہوگیا، کیونکہ وہ دارالمصنفین سے دور بھی رہے تو بھی دارالمصنفین میں چلتے پھرتے اور ہماری کاموں کی نگرانی کرتے نظر آتے، اور ہم جو بھی تحریر لکھتے خیال چھایا رہتا، کہ اس پر اُن کی نظرِ احتساب ضرور پڑیگی وہ خامیوں کی گرفت کریں گے، اور خوبیوں کو دیکھ کر حوصلے بڑھائیں گے، ان کے وصال سے ایسا معلوم ہوا کہ علم و فضل و کمال کا سایہ ہم پر سے جاتا رہا، حوصلے پست ہوگئے، قلم کی رفتار رک گئی لیکن جب اُن کی وصیت کا خیال آتا تو از سرِ نو حوصلہ پیدا ہوتا،

۱۹۵۴ء میں راقم کی ایک کتاب بزمِ مملوکیہ شائع ہوئی، جس سے اس سلسلہ کا کام کچھ تو آگے ضرور بڑھا لیکن یہ خاطر خواہ نہ تھا، "ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام" ختم تو ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی اس کو طبع کرانے میں تامل تھا کیونکہ اس کی بعض باتیں اب بھی تشنہ تھیں، اس اثنا میں لانا سید ابوظفر صاحب ندوی اپنے خطوط میں اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے ہر طرح کی ہمت دلاتے رہے، اور ایک جلد "گجرات کے سلاطین کی تمدنی تاریخ" لکھ کر بھیجی لیکن مئی ۱۹۵۵ء میں اُن کا یکایک انتقال ہوگیا، تو میری بڑھی ہوئی ہمت پھر چھوٹ گئی، ان سے مفید مشورے ملتے رہتے، اور ان سے

قلمی اعانت کی بھی امید رہتی، انھوں نے غزنویوں اور غوریوں پر جو جلد لکھی تھی، اس پر نظر ثانی بھی نہ کر سکے،

۱۹۵۵ء ہی میں میری ایک اور کتاب "ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک" شائع کی گئی جس سے کچھ تھوڑا کام اور آگے بڑھا، ڈاکٹر سید محمود صدر مجلسِ انتظامیہ دارالمصنفین سابق وزیر امورِ خارجہ حکومتِ ہند کو تاریخ ہند سے شغف رہا ہے، میری درخواست پر انھوں نے دارالمصنفین کے اس سلسلہ کی تدوین میں دلچسپی لی، اور اس کی دس جلدوں کی جلد از جلد اشاعت کا ایک پروگرام بنوایا، اور مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات حکومتِ ہند کے سامنے پیش کیا گیا، اس کو دیکھ کر انھوں نے پسند فرمایا تو ان سے مالی امداد کی بھی درخواست کی گئی، اس وقت حکومت ہند کی وزارتِ تعلیمات کے سکریٹری جناب خواجہ غلام السیدین تھے، انھوں نے مفید مشورے دیئے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی وزارت کی طرف سے ابھی مالی امداد کی منظوری ہونے نہیں پائی تھی، کہ وہ رحلت فرما گئے، اُن کے بعد اُن کی وزارت کے جانشین جناب ہمایوں کبیر صاحب نے اس پروگرام سے دلچسپی لی، اور اپنی علم دوستی سے اپنی وزارت کی طرف سے مالی امداد دلائی جن سے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک حسب ذیل چھ کتابیں شائع ہو سکیں (۱) ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام (۲-۳) ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد اوّل و دوم (۴) گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں (۵) ہندوستان کے سلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، (۶) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، ان میں "ہندوستان عربوں کی نظر میں" جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین نے اپنی نگرانی میں رفقاے دارالمصنفین مولوی ضیاء الدین اصلاحی اور حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی سے تیار کرائی، اور اُس کے مسودہ کی نظر ثانی کرنے میں اپنا کافی وقت صرف کیا، ان کو بھی اب لگن پیدا ہوگئی ہے کہ اس سلسلہ کا کام خاطر خواہ

طور پر آگے بڑھے، اُن کے کام کا دائرہ الگ ہے لیکن ناظم دارالمصنفین کی حیثیت سے وہ میری ہمت برابر بڑھاتے رہتے ہیں، "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے" میں ایک باب خطاطی پر لکھ کر اس جلد کی تکمیل میں مدد بھی پہونچائی ہے،

ان جلدوں کی تدوین کے سلسلہ میں مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے پاس پہونچکر ان سے قلمی اعانت کا خواستگار ہوا لیکن پروفیسر محمد مجیب جامعہ ملیہ کے علاوہ کہیں سے تعاون حاصل نہ ہوسکا، البتہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند سے جب جب ملنے کا موقع ملا تو اس کام کو جاری رکھنے کی ہمت برابر بڑھاتے رہے، اور اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا

وائس پریسیڈنٹ

انڈیا

نئی دہلی

مورخہ ۱۶ ار دسمبر ۱۹۶۳ء

....

السلام علیکم:۔ مطبوعاتِ دارالمصنفین کی دو جلدیں (ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے) مجھے ملیں، جستہ جستہ دیکھ رہا ہوں، بہت خوب کام ہے، اس عہد کی تمدنی تاریخ پر بہت اچھی اور تفصیلی معلومات کا ذخیرہ ہے یہ دونوں کتابیں آپ جس مستعدی اور یکسوئی سے اپنے استاد مرحوم کے تفویض کردہ کام کی تکمیل کر رہے ہیں، اس پر بے ساختہ دل سے صدائے آفرین نکلتی ہے، مُبارک ہو"

والسلام

مخلص "ذاکر حسین"

اس گرامی نامہ کے سرنوشت میں ڈاکٹر صاحب نے مجھکو جن الفاظ سے یاد کیا تھا، وہ میرے درجہ سے زیادہ ہے، اس لئے اُن کو حذف کر دیا ہے،

فروری ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے حکومت ہند کی وزارت تعلیمات کی طرف سے پچاس ہزار کی گرانٹ کا اعلان فرمایا، اُس کے ساتھ شرط یہ تھی کہ یہ گرانٹ اُس وقت مل سکے گی، جب دارالمصنفین اتنی ہی رقم اپنی علمی سرگرمیوں میں صرف کرنے پر تیار ہوگا، دارالمصنفین اس کے لئے تیار ہوگیا، اس میں سے پندرہ ہزار کی جو پہلی قسط ملی تو اُس سے دارالمصنفین کی اور کتابوں دین رحمت اور صاحب مرأۃ المثنوی کے ساتھ تاریخ ہند کی حسب ذیل جلدوں کی طباعت واشاعت ممکن ہو سکی؛ (۱) مقالات سلیمان (۲) ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں: (۳) تاریخ سلاطین کشمیر (۴) عہد مغلیہ ہندو مسلمان مورخین کی نظر میں جلد اول

ان جلدوں کی اشاعت کے بعد یہ لکھنے میں خوشی ہو رہی ہے، کہ دارالمصنفین میں حضرت سید صاحب نے بزم تاریخ ہند میں جو شمع جلائی تھی، وہ اگر بہت فروزاں اور روشن نہ ہو سکی، تو مدھم بھی نہ رہی، اور اگر اُس کے سرمایہ میں علامہ شبلیؒ کی بیش بہا کتاب مضامین عالمگیر اور اُن کے وہ قیمتی مضامین مثلاً ہمایوں نامہ، تزک جہانگیری، مآثر رحیمی، زیب النساء، ہندوستان میں اسلامی تمدن کے اثرات، بھاشا زبان، اور مسلمانوں کی علمی بے تعصبی، اور تحفۃ الہند وغیرہ بھی شامل کر لئے جائیں، جو دارالمصنفین کی طرف سے مقالات شبلی میں شائع ہو چکے ہیں، تو یہ سرمایہ خاطر خواہ کہا جا سکتا ہے، مضامین کو چھوڑ کر اس کی پوری فہرست ناظرین کے ملاحظہ کے لئے اس وقت قلم سے خود بخود نکل رہی ہے،

(۱) مضامین عالمگیر از علامہ شبلی نعمانیؒ (۲) عرب و ہند کے تعلقات از مولانا سید سلیمان ندویؒ (۳) مقالات سلیمان جو اس وقت ناظرین کے ہاتھ میں ہے؛ (۴) ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں از مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم (۵) رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی (۶) مقدمہ رقعات عالمگیر

از سید نجیب اشرف ندوی (۷) تاریخ سندھ از مولانا سید ابو ظفر ندوی (۸) گجرات کی تمدنی تاریخ، مسلمانوں کے عہد میں، از مولانا سید ابو ظفر ندوی (۹) مختصر تاریخ ہند از مولانا ابو ظفر ندوی، (۱۰) ہندوستان کی کہانی، از مولانا عبدالسلام قدوائی (۱۱،۱۲) ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد اول و دوم (۱۳) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے (۱۴) تاریخ سلاطین کشمیر از ڈاکٹر محب الحسن مترجمہ علی حماد عباسی ام اے، راقم نے حسب ذیل کتابیں لکھیں، (۱۵) بزم تیموریہ (۱۶) بزم صوفیہ (۱۷) بزم مملوکیہ، (۱۸) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک (۱۹) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام (۲۰) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، (۲۱) ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر (۲۲) ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں (۲۳) عہد مغلیہ ہندو مسلمان مورخین کی نظر میں جلد اول،

ان میں سے حضرت سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات ہندوستانی اکیڈمی کے لئے لکھی لیکن وہ دارالمصنفین ہی میں لکھی گئی، اس لئے وہ دراصل اسی کا کارنامہ ہے، پھر اپنے مقالات کے علاوہ ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں، رقعات عالمگیر، مقدمہ رقعات عالمگیر، تاریخ سندھ، مختصر تاریخ ہند، بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ہندوستان کی کہانی، اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارناموں کے بیشتر ابواب اپنی خاص نگرانی میں لکھوائے، اُن کی رحلت کے بعد تاریخ ہند پر راقم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے، اور اب جب کہ اتنی جلدیں شائع ہو چکی ہیں، تو جو جلدیں اب تک نہ لکھی جا سکی ہیں، اُن کے لکھنے اور لکھوانے کی فکر دامن گیر ہے، اور ہر قسم کی مجبوریوں اور دشواریوں کے باوجود حوصلہ کم ہونے کے بجائے بڑھا ہوا ہے، دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت سید صاحب کی وصیت کو پورا کرنے کی توفیق اور برکت عطا فرمائیں کیونکہ یہی اپنی حقیر زندگی کا مشن بن گیا ہے،

حضرت سید صاحب کے مقالات کو موجودہ ذوق کے مطابق اوٹ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، کیونکہ راقم کو اُن کی تحریروں سے ایسا حُسنِ عقیدت ہے کہ ان میں ترمیم و اضافہ کرنا یا حواشی میں کچھ نوٹ لکھنا سوءِ ادب تصور کیا، حوالے میں کہیں کہیں کتاب کے صفحے نہیں دیئے گئے ہیں جس کے اندراجات ناظرین کے لئے ذیل میں کئے جا رہے ہیں،

ص ۷، تذکرہ خوشنویساں ص ۹۰، تزک جہانگیری صفحہ ۶۵، نولکشور پریس،	ص ۱۶۴، دیکھو تاریخ فرشتہ تاریخ ملیبار ص ۳۷۳
ص ۵۱ ہندوستان میں علوم کی ترقی مسلمانوں کے زمانہ میں، ص ۷۷ ،	ص ۲۳۱ کامل ابن اثیر واقعات ۱۵ھ ص ۲، ۵۵، ۵۶
ص ۹۸ فرشتہ ذکر بہمن شاہیہ ص ۳۳۳ نولکشور پریس	ص ۲۰۴ کتاب الہند بیرونی ص ۵۶،
ص ۱۱۳ بلاذری فتح سندھ ص ۴۷، ۴۴۴،	ص ۲۰۴ تحفۃ الکرام جلد سوم ص ۱۳۵،
ص ۱۲۰ تاریخ الخلفاء، سیوطی ص ۴۶۰،	ص ۲۱۴ ابن بطوطہ جلد دوم اردو ص ۷
	ص ۲۲۷ عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۸۰، ۲۸۱

ص ۵۳ سے ص ۶۲ تک ہندو فارسی شعراء کے ذکر میں جو فارسی اقتباسات ہیں وہ زیادہ تر صبح گلشن ۔۔ مرتبہ نواب سید علی حسن خاں صاحب سے لئے گئے ہیں،

آخر میں مولوی عبدالباری مصحح دارالمصنفین کی محنت کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے، انھوں نے اس مجموعہ کے مسودہ کو نقل کرنے میں پوری دلچسپی لی، اُن کو حضرت سید صاحب کی تحریروں سے بڑی عقیدت ہے، کہا کرتے ہیں کہ وہ جب حضرت سید صاحب کی کوئی تحریر پڑھتے ہیں تو اُن کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی لذیذ مٹھائی کھا رہے ہیں۔

ہیچمدان!

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دارالمصنفین، ۲۴ر اگست ۱۹۶۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا قلم نصف صدی تک رواں رہا، اس طویل مدت میں انھوں نے مستقل تصانیف کے علاوہ مذہبی علمی تاریخی، اور ادبی مختلف موضوعوں پر سیکڑوں مقالیں لکھے، جو علوم و معارف کا گنجینہ ہیں، اُن کا بڑا حصہ معارف میں شائع ہوا، اور کچھ الندوہ الہلال اور دوسرے اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوئے۔

سید صاحب رح جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتے تھے، اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑتے، اور تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے جس موضوع پر بھی لکھا ہے، معلوم ماخذوں کے لحاظ سے اس میں اضافہ کی بہت کم گنجائش چھوڑی ہے، اور بعض چیزوں میں تو اُن کو اولیت کا درجہ حاصل ہے، اور انھوں نے آیندہ لکھنے والوں کے لئے نئی راہ کھول دی ہے، یہی خصوصیت اس مجموعے کے مضامین میں بھی ہے، رُباعی واقدی پھر واقدی، سُنّت، پھر سُنّت خاص طور سے تلاش و تحقیق کا شاہکار ہیں، اور عرب امریکہ میں تو ان سے پہلے کسی سیاح قلم کا قدم نہ پہنچا تھا،

ان مضامین میں اگرچہ بڑا تنوع ہے لیکن ان کا مرکزی نقطہ اسلامی علوم و فنون، اور اسلامی تاریخ و تہذیب کی مرقع کشی اور اسکی تحقیق و تنقید ہے، اس لئے ان میں کثرت کے باوجود

ایک طرح کی وحدت ہی، اُردو میں اُس کے معلم اول مولانا شبلیؒ تھے، سید صاحبؒ نے اُس کو کمال تک پہنچا دیا، اور ان دونوں کی تصانیف اور طریقۂ تحقیق نے ایک مستقل مکتبِ فکر قائم کر دیا، اور اس موضوع پر لکھنے والوں نے انہی کے نقشِ قلم کی تقلید کی، اگر تنہا انہی کے تصانیف اور مضامین پڑھ لئے جائیں، تو مذہب اسلام، اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ و تہذیب کے تمام اہم پہلو سامنے آجائیں گے، اس اعتبار سے یہ مضامین مسلمانوں کی علمی تاریخ کا بیش بہا خزانہ ہیں، کل مضامین کئی جلدوں میں آئیں گے، اس کی پہلی جلد جو اسلامی ہند سے متعلق مضامین پر مشتمل ہی، گذشتہ سال شائع ہو چکی ہی، زیر نظر دوسری جلد علمی مضامین پر مشتمل ہی، باقی حصے بھی انشاء اللہ آئندہ شائع ہوتے رہیں گے، وما توفیقی الا باللہ،

کتابوں کی ترتیب اشاعت کا ایک تو پُرانا سادہ طریقہ ہے، دوسرا تصحیح و تحشیہ وغیرہ، یعنی ایڈٹ کرنے کا جدید طریقہ، ہم نے سید صاحب کی سُنت پر عمل کیا ہے، انھوں نے مولانا شبلی کے مقالات اور خود اپنے ادبی مقالات کا مجموعہ نقوش سلیمانی پُرانے سادہ طریقہ سے شائع کیا، ہمارے لئے ایڈیٹ کی "بدعت حسنہ" کے مقابلہ میں "سُنت سلیمانی" زیادہ قابلِ تقلید تھی،

معین الدین احمد ندوی

۱۷ مارچ ۱۹۶۰ء

دارالمصنفین اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

اس سے پہلے مقالات سلیمان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، پہلا مجموعہ تاریخ ہند سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے اور دوسرا غیر مذہبی علمی و تحقیقی مضامین پر۔ زیر نظر تیسرا حصہ اس حیثیت سے مذہبی ہے کہ اس کے مضامین مذہب سے متعلق ہیں لیکن ان سب کی شان علمی و تحقیقی ہے، اس میں خالص مذہبی مضامین بھی ہیں، کلام مجید کے بعض احکام کے حکم و مصالح کی وضاحت و تشریح بھی ہے، غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب بھی ہے، اور موجودہ دور کے خود ساختہ مجتہدین کے اجتہادات کی تصحیح بھی ہے، اور بعض جدید نظریات اور ان کے متعلق کلام مجید کے بیانات میں تطبیق بھی ہے، اس حیثیت سے یہ حصہ رنگا رنگ مذہبی مضامین کا گلدستہ ہے، اس کے بیشتر مضامین کسی نہ کسی پہلو سے کلام مجید سے متعلق ہیں، اس لیے ان کو مقالاتِ قرآنی بھی کہہ سکتے ہیں، دو مضمون "القرآن والفلسفۃ الجدیدۃ" اور "مسئلۂ ارتقا، اور قرآن مجید" مصنف کے ابتدائی دور کے ہیں، جو بعد کے ذوق سے مختلف ہیں، ان کو اسلیے شامل کر لیا گیا کہ اس سے مصنف کے ابتدائی ذوق اور بعد کی تبدیلی کا اندازہ ہو سکے۔

فقیر معین الدین احمد ندوی

۱۶ صفر ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۹۷۱ء۔ دار المصنفین اعظم گڈھ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد

میں

ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی

اس سے پہلے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلیمی اور علمی تعلقات کی داستان شروع کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور عربوں کے تعلقات پر گفتگو کی جائے، عربوں کا سندھ پر جو حملہ پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا تھا لیکن ان دونوں قدیم العہد قوموں میں اس سے صدیوں پہلے دوستانہ روابط قائم تھے، ہندوستان آرین قوم کی قدیم نسل ہے تو عرب سامی قوم کی صحیح اور اصلی یادگار ہے یہ دونوں ملک ایک سمندر کے دو متقابل ساحل ہیں، اس کا ایک ہاتھ آریاورت کے دامن کو چھوتا ہے تو دوسرا ارض مقدس کو پابوس ہے، ساحلی مقامات فطرۃً تجارتی ہوتے ہیں یہی پہلا رشتہ ہے جس نے ان دونوں قوموں کو باہم آشنا کیا، عرب تاجر آج سے ہزاروں برس پہلے ہندوستان کے ساحلی مقامات تک آتے تھے، اور یہاں سے خاص یہاں کی پیداوار اپنے ملک کو لیجاتے تھے، اور ان کے ذریعہ سے تمام مغربی ممالک میں یہ چیزیں پھیل جاتی تھیں، مشرق و مغرب یا ہندوستان اور یورپ کی درمیانی کڑی اہل عرب ہی تھے، اُن کے سامان تجارت میں زیادہ تر مسالہ، خوشبو کی چیزیں، کپڑے، تلوار، اور بعض جڑی بوٹیاں اور پھل داخل تھے چنانچہ عربی میں ان چیزوں کے نام سنسکرت میں ہیں، مثلاً مشک (موشکا) کافور (کپور) صندل (چندن) قرنفل (کنکشمہ پھل) فلفل (پپلی) زنجبیل (زرنجابیرا) نارجیل (ناریل) موز (موشہ) کاذی (کیوڑا) سنسکرت کے لفظ ہیں،

تلوار کو عربی میں ہند کہتے ہیں، عود ہندی، قسط ہندی، تمر ہندی اپنی نسبت خود ظاہر کرتے ہیں

یہ تجارتی تعلقات بحری راستوں سے تھے، اس لئے کشتی اور جہاز رانی کے بعض اصطلاحات بھی ہندی الاصل ہیں، مثلاً بارجہ، دبیرجہ، بیڑہ، ذونیج، ڈونگی، بلیج، بلیق، (جہاز کا سقف) ہوری (چھوٹی کشتی)، جوش (کشتی کا رسا) وغیرہ یہ الفاظ عرب سیاحوں کے سفرناموں میں عام طور سے مستعمل ہیں

قبل از اسلام کچھ عرب تاجروں نے بحرین سے نکل کر بحر روم کے سواحل پر اقامت اختیار کرلی تھی، اُن کو یہود کنعانی، اور آرامی اور یونانی فینیقین کہتے ہیں، تجارتی کاروبار کے سبب سے اس قوم کو حافظہ کے استحکام اور اعانت کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اس طرح فن کتابت کی ایجاد کا اُن کو خیال پیدا ہوا،

ان کے بحری راستہ کی مغربی منزل یونان تھی، اور مشرقی منزل ہندوستان، چنانچہ ان دونوں سروں پر اُن کی ایجاد نے حسن قبول حاصل کیا،

علمائے فن کتابت نے تمام دنیا کے خط اور طرز تحریر کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے، خط یونانی یہ یورپ کے تمام خطوط کا پدر اعلیٰ ہے، خط عبری جس سے سامری وغیرہ خط پیدا ہوئے، خط مسند جس سے سبائی و حمیری و حبشی خطوط نکلے ہیں، اور خط آرامی جس سے چھ خط پیدا ہوئے، ہندی فارسی قدیم، عربی مربع، تدمری، سریانی نبطی، اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ قدیم ہندوستان نے علوم کی ابجد عربوں ہی سے سیکھی، [۱]

عرب و ہند کے سیاسی تعلقات کا آغاز براہ راست نہیں، بلکہ ایرانیوں کی وساطت سے ہوا، یہ تفصیل [۲] کا موقع نہیں، اجمالاً بیان کیا جاتا ہے کہ عرب و ایران کی سیاسی معرکہ آرائیوں کا ایک مدت سے سلسلہ جاری تھا، بنوشیبان ایرانیوں سے نبرد آزما تھے، کہ آفتاب اسلام طلوع ہوا،

---

[۱] تاریخ الادب ج ۱ ص ۵ شائع کردہ جامعہ مصریہ (مصری یونیورسٹی) [۲] تفصیل عرب و ہند کے تعلقات میں ملے گی، جو لاہور میں شائع ہوئی،

اسلام کا معجزہ سمجھئے، یا بخت واتفاق کا اثر کہئے کہ عربوں نے میدان جنگ میں ایرانیوں کو شکست دی،
چنانچہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ آج عرب نے اپنا انصاف فارس سے لیا،
حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں انہی شیبانیوں نے مملکت ایران پر تاخت کی، اور ایران کی کمزوری
کا اچھی طرح امتحان کر کے بارگاہ خلافت کو واقعات کی اطلاع دی، اور امداد کے لئے فوجیں طلب
کیں، یہ پہلا دن تھا کہ مسلمان اور ایرانیوں میں سیاسی تعلقات پیدا ہوئے،

حضرت عثمانؓ کے عہد یعنی سنہ ۳۰ھ میں ایرانیوں کا خاتمہ ہوگیا، ایران کی حکومت کی آخری
حد سندھ سے آکر مل جاتی تھی مسلمانوں کو خوف تھا کہ دریا کے راستہ سے سندھ سے ایرانیوں کو
کمک پہونچے گی، اور براہ راست ادھر عرب سے خود مرکز پر حملہ ہو سکتا ہے، اس بنا پر ان کو سندھ پر فوج کشی
کرنی پڑی، اس کے بعد حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے زمانہ میں بھی یہاں متواتر حملے ہوتے رہے
لیکن مستقل اور پائدار فتح ولید کے عہد حکومت میں حاصل ہوئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں
کی آبادی اچھی خاصی قائم ہوگئی تھی، کیونکہ تاریخوں میں اس حملہ کی وجہ یہ لکھی ہے، کہ ہندوؤں
نے مسلمان عورتوں کو زبردستی گھر میں ڈال لیا تھا، اس زمانہ میں عراق کا گورنر حجاج تھا، عورتوں
نے حجاج کی دہائی پکاری، پرچہ نویسوں کے ذریعہ سے یہ خبر جب اس کو پہنچی، تو اس ملک کی فتح
اور اسلام کی عزت برقرار رکھنے کے لئے بے قرار ہوگیا، اور آخر اپنے اٹھارہ سال کے نوجوان بھتیجے
محمد بن قاسم ثقفی کی سپہ سالاری میں اس نے ایک فوج روانہ کی، جس نے سندھ فتح کر لیا، اور رفتہ
رفتہ دائرۂ فتوحات ملتان تک پہنچ گیا،

اس زمانہ میں مسلمانوں میں صرف دینی اور ادبی علوم رائج تھے یعنی قرآن، تفسیر، حدیث،
فقہ اور شعر و ادب، چنانچہ سندھ کے نو مسلموں نے ان فنون میں کامل دستگاہ پیدا کی، رجال
کی کتابوں میں سندھ کے متعدد علماء اور محدثین کے نام ملتے ہیں، ابو معشر نجیح السندی، سندھ کے

ایک غلام زادہ تھے، اپنے آقاؤں کے ساتھ سندھ سے عرب گئے، وہاں آزادی پائی، اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی، اور بعد میں اسی نسبت سے وہ معروف و مشہور ہوئے چنانچہ ابومعشر نجیح مدنی کہلاتے ہیں، فنِ مغازی و سیر میں وہ کمال پیدا کیا کہ امام الفن کہلائے زبان سے سندیت نہ گئی، عربی مخارج ٹھیک ادا نہیں کر پاتے تھے، تاہم شاگردوں کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا، ۱۷۰ھ میں جب وفات پائی، تو خود خلیفہ ہارون رشید اس نومسلم سندھی عالم کی نمازِ جنازہ کا امام تھا،

ایک اور بزرگ رجاء السندی ہیں، جو عرب کے بجائے ایران پہونچے اور اسفرائنی ہوکر مشہور ہوئے یہ فنِ حدیث کے باکمال استاد تھے، مشہور محدث حاکم اُن کے حق میں کہتے ہیں، رکن من ارکان الحدیث اور نہ صرف یہ خود بلکہ ان کے خاندان میں اور بہت سے حفاظِ حدیث پیدا ہوئے، ۲۲۱ھ میں وفات پائی،

ابوعطاء السندی ایک ادیب گذرا ہے جس کے فضل و کمال ادبی کا شاہد صرف یہ واقعہ ہے کہ ابوتمام نے حماسہ میں اُن کے عربی اشعار داخل کئے، سندھی بن شاہک ایک سندھی بغداد پہنچ کر بغداد کے پل پر فروکش ہوئے تھے، اُن کی نسل سے کشاجم پیدا ہوا، جو عربی کا مشہور شاعر گذرا ہے، ابونصر فتح بن عبداللہ السندی ایک سندھی غلام تھے، تعلیم پاکر نکلے، تو الفقیہ المتکلم بن گئے،

یہ ان بزرگوں کے حالات تھے، جنھوں نے اپنا ملکی مذہب بدل دیا تھا، ایسے لوگ جو اپنے مذہب پر قائم رہ کر مسلمانوں کے ساتھ علمی و تعلیمی کاروبار میں شریک ہوئے، ہندوستان کے وہ پانچ چھ اطبا بھی ہیں، جن کے نام، حالات، اور کارنامے ہماری علمی بزم کی پارینہ داستان بن گئے ہیں، وہ اسی سندھ کے تعلق سے بغداد کے دربارِ خلافت تک پہنچے تھے، ابن ندیم اور

ابن ابی اصیبعہ نے سنسکرت کی بہت سی طبی اور فلسفیانہ کتابوں کے نام گنائے ہیں، جو اُن کے ذریعہ سے عربی زبان میں منتقل ہوئی ہیں، اس سے ہم کو یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ یا تو مسلمانوں کی مفتوحہ مملکت میں عربی زبان ہندوؤں کے علمی طبقہ تک پہنچ چکی تھی، یا مسلمان یہاں آکر ان کی زبان میں مہارت حاصل کر چکے تھے، یا بیچ کی کڑی ان دونوں کے درمیان فارسی ہوگی،

تاریخ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی علمی سفارتیں اس زمانہ میں ہندوستان آتی رہی ہیں یحییٰ برمکی نے ایک شخص کو ہندوستان بھیجا تھا کہ یہاں جو دوائیں پیدا ہوتی ہیں، ان کو تلاش کرکے لائے، نیز اہل ہند کے عقائد اور مذہب وغیرہ کی تفصیل لکھ کر لائے، چنانچہ یعقوب کندی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس رپورٹ کی ایک نقل ۳۷۰ھ تک یعنی ابن ندیم کے زمانہ تک موجود تھی، اس تحریر پر سنہ کتابت ۲۴۹ھ مرقوم تھا، علامہ مرتضیٰ زیدی نے ملل ونحل میں لکھا ہے کہ سندھ کے ایک راجہ نے خلیفہ ہارون رشید کو لکھا تھا کہ اگر اسلام کا مذہب عقل ودلیل پر قائم ہو تو کسی عالم کو مناظرہ کے لئے یہاں بھیجا جائے، چنانچہ پہلے ایک فقیہ بھیجا گیا، اُس نے مناظرہ کے وقت فلسفیانہ اصطلاحات سے لاعلمی ظاہر کی، وہ واپس آیا، اور معمر بن عباد بغداد کا مشہور متکلم اس خدمت کے لئے نامزد ہوا، اس واقعہ سے یہ صریحی نتیجہ مستنبط ہوتا ہے، کہ یہاں عربی زبان اور فلسفہ نے ایک حد تک فروغ پالیا تھا،

جاحظ نے کتاب البیان والتبیین میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ منکہ وغیرہ حکمائے ہند جو بغداد پہونچے تھے، ان سے ابوالاشعث معمر نے دریافت کیا کہ اہل ہند کے نزدیک بلاغت کی تعریف کیا ہے، یہ یاد رہے کہ اہل عرب زبان آوری اور بلاغت میں کسی کو اپنا حریف نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے ہاں اس فن پر ایک رسالہ ہے لیکن ہم اس کا ترجمہ اچھا نہیں کرسکتے، اور نہ ہم کو اس فن میں مہارت ہے، ابوالاشعث کا بیان ہے کہ

مجھکو وہ رسالہ ملا وہ لے کر میں مترجمون کے پاس گیا، اوران سے اُن کا ترجمہ کرایا، تو اس میں یہ لکھا تھا" اس کے بعد جاحظ نے اس رسالہ کا خلاصہ نقل کیا ہے، یہ واقعہ بتاتا ہے کہ عربوں کی حکومت ہند کے زمانہ میں حاکم و محکوم کے علمی و تعلیمی تعلقات کیا تھے، سنسکرت سے عربی میں جو کتابیں ترجمہ کی گئیں، وہ آج کل کے مترجمین کی طرح ناول اور قصہ کہانی کی کتابیں نہ تھیں، بلکہ تمام تر علمی اور فلسفیانہ کتابیں تھیں، انگریزی زبان سو برس سے ہندوستان میں رائج ہے، ہر صوبہ میں کالجوں اور اسکولوں کی تعداد گذشتہ زمانہ سے بہت زیادہ ہے، ہر سال جو طلبہ اُن سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں، اُن کی تعداد ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے، تاہم انگریزی علوم کو اپنی مادری زبانوں میں منتقل کرنے کی ہمت نہیں پڑتی، اور ایک شور برپا ہے کہ ہماری زبان میں انگریزی کے لئے اصطلاحات نہیں ملتے، لیکن جو تعلیم عربوں کے عہد حکومت میں یہاں جاری تھی وہ اس لائق بنا دیتی تھی کہ اپنی مادری زبان سے وہ غیروں کی زبان میں ترجمہ کرسکتے تھے، اور مسلمان اُن کے لئے اصطلاحات وضع کرسکتے تھے، طب ہیئت اور حساب، یہ تین علوم سنسکرت سے عربی زبان میں منتقل کئے گئے، جن کے لئے سینکڑوں اصطلاحات کی ضرورت پڑی ہوگی، اب بھی سنسکرت کے چند اصطلاحی الفاظ عربی میں موجود ہیں "جیب" اور "اوج" یہ دونوں ریاضیات کی اصطلاحیں ہیں، جیب کی اصل جیوا، اور اوج کی اوچ ہے، قبۂ ارین، اصطلاح ہیئت میں اس نقطہ کو کہتے ہیں، جو خط نصف النہار اور خط استوار کو تقاطع کرتا ہے، اس لفظ کی تاریخ عجیب وغریب ہے، یہ لفظ اصل میں "اجین" ہے، جو صوبہ مالوہ کا مشہور شہر ہے، منجمان ہند نے اس کو نقطۂ تقاطع فرض کیا تھا، عربی میں اجین ازین ہوگیا، بعد میں نقطہ اڑ کر ارین رہ گیا،

خلیفہ معتصم کے بعد حکومت عباسیہ میں ضعف آگیا، اور یہ دور دراز علاقہ مرکز خلافت

سے الگ ہوگیا، اس کے بعد سلطان محمود کے حملوں تک سندھ اور ملتان کی اسلامی تاریخ تاریک رہتی ہے، مسلمان سیاح جو ہندوستان میں اکثر گذرتے رہتے تھے، اُن کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ملک مختلف ریاستوں میں منقسم ہوگیا تھا، جن میں کچھ ہندو تھیں، کچھ اسماعیلی تھیں کچھ خالص مسلمان تھیں، اور یہ نہایت امن وامان اور دوستانہ طریقہ سے زندگی بسر کرتی تھیں سلطان محمود کا ہندوستان پر حملہ اصل میں انہی اسماعیلیوں کے استیصال کے لئے شروع ہوا تھا، قدیم عرب سیاحانِ ہند جو غزنوی حملوں سے پہلے ہندوستان آئے، اور جن کے سفرنامے موجود ہیں، یہ بزرگوار ہیں،

سلیمان تاجر ۲۲۵ھ اور ابوزید سیرانی ۲۴۲ھ، یہ جنوبی دکن اور جزائر ہند سے گذرے تھے، ابوالحسن مسعودی ۳۰۳ھ میں ہندوستان آیا، ابواسحاق اصطخری ۳۴۰ھ میں اس ملک میں آیا، ابودلف مسعر ینبوعی چوتھی صدی ہجری کے اواسط میں چین ہوکر کشمیر ملتان، سندھ اور کولم پہنچا، چوتھی صدی کے آخر میں بشاری مقدسی ہندوستان آیا، اُس نے ہندوستان کو پانچ صوبوں میں منقسم کیا ہے، مکران، توران، سندھ، ملتان، قنوج، ہندوستان کا سب سے واضح جغرافی بیان ابوریحان بیرونی کی کتاب الہند میں ملتا ہے، اس نے پنجاب اودھ اور بنگال کے ممتاز شہروں کے نام لکھے ہیں، ان کا طول بلد اور عرض بلد بیان کیا ہے، بنگال وبہار کی جانب پاٹلی پتر (پٹنہ) اور مونگیر کا نام لیتا ہے۔ ان کے علاوہ نیپال، سنگلدیپ، سندھ، اور ہمنت پہاڑ یعنی ہمالیہ کا ذکر کرتا ہے،

ان سیاحوں نے ملتان، منصورہ، کھنبایت، کے حالات لکھے ہیں، ایک سیاح جنوبی ہند کے ایک راجہ کا ذکر کرتا ہے، جس نے عرب تاجروں اور سیاحوں کی مدد سے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کرایا تھا، مسعودی نے کھنبایت کے ذکر میں لکھا ہے کہ یہاں کا

راجہ مسلمانوں سے بہت مالوف اور ہمیشہ ان سے مذہبی مناظرے کرتا رہتا ہے، ایک اور سیاح ملتان کی یہ حالت بتاتا ہے۔ کہ یہاں ہندو مسلمانوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، اب تک ہماری علمی مجلسوں میں صرف بیرونی کا نام اس لحاظ سے ممتاز ہے۔ کہ اس نے ہندوستان آکر یہاں کے علوم سیکھے، حالانکہ تاریخ میں اور بھی لوگ ایسے ملتے ہیں، محمد بن اسماعیل تنوخی کی نسبت ابن صاعد لکھتا ہے،

الذی دخل الی الهند وصدر	یہ وہ شخص ہے، جو ہندوستان گیا، اور
عنها بغرائب من علوم النجوم	وہاں سے علم ہیئت کے عجیب غریب
ومنها حرکات الاقبال والادبار	مسائل لے کر واپس آیا، منجملہ اس کے
	حرکت اقبال و ادبار کا مسئلہ ہے،

بطلیموس کی مجسطی سے پہلے حکماے ہند کے ذریعہ سے کتاب سندہند پہنچی، سندہند سب سے زیادہ مقبول ہوئی، حکماے ہند سے یہ کتاب دو عرب نژاد عالموں نے ۱۵۶ھ میں پڑھی تھی، ایک ابراہیم بن حبیب فزاری جو حضرت سمرہ بن جندب مشہور صحابی کے خاندان سے تھے، دوسرے یعقوب بن طارق، مولانا ے مرحوم نے اسی کانفرنس کے ایک سالانہ اجلاس میں تراجم کا مضمون پیش کیا تھا، اور صرف اُن کے نام لکھ کر رہ گئے، اور آگے اُن کا حال کچھ نہ معلوم ہوسکا لیکن اب کچھ تو بیرونی کی کتاب الہند اور کچھ سینور کرلو نلینو جو اٹلی میں پلرمُو یونیورسٹی کا پروفیسر ہے، اس کے اس لکچر سے جو اُس نے عربوں کے علم ہیئت پر مصر کی یونیورسٹی میں عربی زبان میں دیا تھا، یہ عقدے تمام تر حل ہوگئے،

(۱) پہلی کتاب سندہند جس کو غلطی سے متاخرین نے السند والہند لکھا ہے، اصل سنسکرت نام برہمسپھٹ سدھانت ہے، قدیم علماے عرب نے اس کا آخری جزو سدھانت لیکر

سند ہند کر دیا، بعد کے لوگوں نے سند ہند بڑھا کر السند والہند کر دیا، یہ کتاب ۶۲۸ء مطابق ۶ھ میں برہمگپتا نے راجہ دیا گھر مو کا کو لکھ کر پیش کی تھی، یہی دیا گھر ہے، جو عربی کتابوں میں ملک نیغر ہو گیا ہے،

سدھانت کی تعلیم نہ صرف بغداد کے احاطۂ علمی میں محدود رہی، بلکہ مسلمانوں کے فیضانِ علم کے ساتھ ساتھ اسپین تک پہنچ گئی تھی، عبداللہ بن احمد سرقسطی المتوفی ۴۳۵ھ ہندسہ ہیئت کا امام تھا، اس نے اس کی غلطیاں دکھائیں اور اسکی تصحیح و تردید پر ایک رسالہ لکھا، ابن صاعد اندلسی نے عبداللہ بن احمد کے اعتراضات کے جوابات دیئے اور سدھانت کے طریقہ کو صحیح بتایا، ابن صاعد اندلسی کی تصنیف طبقات الامم قرونِ وسطیٰ کی علمی تاریخ ہے جس میں تمام دنیا کی علمی قوموں کے علوم و فنون کی تاریخ لکھی ہے، ۴۶۲ھ مطابق ۱۰۷۰ء میں اس نے وفات پائی، علوم کی تاریخ میں مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی ہیں کتاب الفہرست ابن الندیم کے بعد اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں، اور باوجود اسکے کہ اس کے حوالے اکثر عربی کتابوں میں آتے ہیں، تمام دنیائے اسلام میں اسکے صرف تین نسخے دستیاب ہوئے، ایک کتبخانہ لندن میں دوسرا کتب خانہ لیڈن میں اور تیسرا دمشق کے ایک کتب فروش کے پاس ملا، اس تیسرے نسخہ کو تصحیحات ضروری کے بعد بیروت کے ایک عیسائی نے ۱۹۱۲ء میں شائع کیا، چونکہ مولانا مرحوم کے مضمون تراجم لکھتے وقت یہ کتاب عالمِ طبع میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس مختصر تفصیل کے ساتھ اس کتاب سے چند باتیں اور بڑھا دینی ہیں،

ابن صاعد لکھتا ہے کہ ہندوستان کی تصنیفات بعد مسافت کے سبب ہم اہلِ اندلس تک بہت کم پہونچی ہیں، صرف تین کتابیں پہونچی ہیں، ایک "سند ہند" ہیئت و نجوم میں، دوسری موسیقی میں، جس کا ہندی نام نافر (؟) ہے، تیسری اخلاق میں کلیلہ و دمنہ، علوم میں حساب الغبار یعنی علم ارقام اسی لئے اہل عرب اُن کو ارقامِ ہندیہ کہتے ہیں، عربوں سے اہل یورپ تک یہ ارقام پہنچے، وہاں ان کا نام ارقامِ عربیہ ہے،

اب ہم اس عہد میں پہونچ گئے ہیں جب عربوں کا آفتابِ اقبال ڈوب چکا تھا، ترک و مغلوں،

اور پٹھانوں کا نیا دور شروع ہو رہا تھا اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ ہمارے مضمون کا پہلا حصہ ہے دوسرا حصہ اب شروع ہوتا ہے،

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو قوم وہ تھی جو ہر غیر قوم کے سایہ تک سے گریز کرتی تھی، اور اس کو ملیچھ ناپاک اور نجس ہستی تصور کرتی تھی، کیا اس وقت میں کوئی یہ خیال کر سکتا تھا، کہ کسی زمانہ میں ہندو قوم بھی اس قدر رواداراور وسیع الخیال ہو جائے گی کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ مل کر کام کرے گی، اس کی زبان سیکھے گی، اس کے علوم و فنون پڑھے گی، اس کے تمدن و معاشرت کو اختیار کرے گی، اور اس کے ساتھ شاگردی واستادی کا رشتہ قائم کرے گی، لیکن ننوا دو سو برس ہی کے اندر ان خیالات میں بڑا تغیر آگیا، اور اب وہ مسلمان سلاطین کی نوکریاں کرنے لگے، اور درباروں میں مسلمان اربابِ کمال کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے لگے، یہی ابتدائی بے تعصبی ہندوؤں کی موجودہ تعلیمی ترقی کا زینہ ہے،

اگر مسلمانوں کا درمیانی دور جس نے سو دو سو برس کے اندر اندر ہندوؤں کو اپنی قدیم تنگ خیالی کے بدلنے پر مجبور کیا، اور دوسری قوموں کے علوم و فنون سیکھنے کی اُن میں ترغیب پیدا کی، ہندوستان میں قائم نہ ہوا ہوتا، تو کیا یہ ممکن تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے اوّل یوم سے وہ انگریزی تعلیم کا آغاز کر دیتے، اور ساٹھ ستر برس کے اندر اندر تمام ہندوستان میں ایک غیر قومی زبان کی تحصیل کیلئے مدارس مکاتب پاٹ شالے اور کالج کھل جاتے گوہر مقصود کی تلاش میں سمندروں میں بے محابا سفر کرتے، ان کو سو دو برس تو صرف اپنی نفرتِ قومی، اور تعصبِ مذہبی کے مٹانے میں صرف ہوتے اور اس اثنا میں مسلمان کہیں سے کہیں جا نکلتے،

ہندوؤں پر مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ مسلمانوں سے پہلے ہندو دھرم کے مطابق تعلیم ہندوؤں کے ایک مخصوص طبقہ تک محدود تھی، حکم تھا کہ وید کا کوئی فقرہ اگر کسی شودر

کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پلا دیا جائے، برہمنوں کے علاوہ ہندوؤں کے دیگر طبقوں میں یا تو علم مطلق نہ تھا، یا بہت ہی کم تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ مذہبًا ان کو تعلیم کے حاصل کرنے کی مطلقًا اجازت نہ تھی، لیکن مسلمانوں نے ہندوستان آکر تعلیم کو ہندوؤں کے ہر طبقہ تک عام کر دیا، برہمنوں سے لیکر کھتری، کایستھ، بنیے، اور اُن سے بھی نیچے درجوں تک علم اُتر آیا، آج ہندوستان میں برہمنوں سے زیادہ نہیں تو برہمنوں کے برابر غیر برہمن ہندو بھی تعلیم سے بہرہ اندوز ہیں، اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں بھی یہی حال تھا، کہ برہمنوں سے زیادہ کایستھ اور کھتری تعلیم یافتہ تھے،

ہندوؤں پر مسلمانوں کا تیسرا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ ان کے تعلیمی علوم و فنون میں وسعت پیدا کی، قدیم ہندوستان کے شیشۂ وقار کو صدمہ پہنچائے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد سے پہلے ہندوستان میں جن علوم کی تعلیم رائج تھی، ان کی فہرست نہایت مختصر تھی، نصابِ تاریخ سے یہاں کے مدارس ہمیشہ خالی رہے، جغرافیہ کا وجود یہاں برائے نام تھا، فلسفہ، حکمت، اقلیدس، ہیئت، طب، شاعری، موسیقی وغیرہ علوم ہندوستان میں پہلے سے موجود تھے، لیکن اُن کی تعلیم اولًا تو مخصوص لوگوں کو ہوتی تھی، دوسرے یہ کہ ان علوم کے متعلق دنیا کی دوسری قوموں کی جو تحقیقات تھی، اس سے یہاں سرتاپا ناواقفیت تھی، مسلمان علماء نے ان کے نصابِ تعلیم کو ان فروگذاشتوں سے پاک کیا،

مسلمانوں میں ہندوستان کا سب سے پہلا علمی فاتح بیرونی ہے، وہ سلطان محمود کے زمانہ میں ہندوستان آیا، یہ مسلمانوں کی ہندوستان میں عملداری کا آغاز باب تھا، اور ضرورت تھی کہ ہندوؤں نے خلافتِ بغداد کو دوسری صدی ہجری میں جو علمی قرض دیا تھا، وہ مع سود کے واپس کر دیا جائے، بیرونی کتاب الہند کے پہلے باب میں لکھتا ہے :-

"اجنبی ہونے کے سبب سے مجکو ہندو علمائے ہیئت کی پہلے شاگردی اختیار کرنی پڑی"

"لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد جب میری زبان دانی کی واقفیت بڑھ گئی تو میری حیثیت استاد کی ہوگئی، چونکہ ہیئت و ریاضیات میں مجکو کامل مہارت حاصل تھی، میں خود اُن کو تعلیم دینے لگا، پنڈتوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تعجب سے پوچھتے تھے کہ تم نے یہ باتیں کس پنڈت سے سیکھی ہیں، اُن کو یقین نہیں آتا تھا کہ کسی دوسری قوم کا آدمی بھی علوم و فنون میں ان کا ہمسر ہوسکتا ہے، وہ مجکو جادوگر سمجھتے تھے، اور بحرالعلوم" کہتے تھے"

ہندو پنڈتوں کی واقفیت کے لئے اس نے عربی زبان سے حسب ذیل کتابیں سنسکرت میں ترجمہ کیں، رسالہ اصطرلاب، مجسطی، اقلیدس کے مقالے، علاوہ ازیں ہندو پنڈتوں کے سوالات کے جواب میں بھی اُس نے کئی رسالے لکھے، ہندوستان ہیئت دانوں نے ہیئت کے متعلق سوالات کئے تھے، ۱۲۰ صفحوں میں اُس نے اُن کے جوابات لکھے، ایک رسالہ اس کا اس بحث پر ہے کہ اعداد کے اندراج جو عربی زبان میں ہیں، وہ باعتبار ہندی کے زیادہ صحیح طریقہ پر مقرر ہوئے[1]

مسلمانوں کی فتوحات نے ہندوستان میں جب وسعت حاصل کی تو ہندو پنڈتوں کو اُن کے اندرونی حالات کے دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ بھوجو برہمن نام بنارس کا ایک باشندہ قاضی رکن الدین کی خدمت میں پہنچا، اور ان سے مسلمانوں کے علوم کی تکمیل کی، قاضی صاحب نے بھوجو سے سنسکرت سیکھی، اور اُس کی مدد سے ابنرت کنڈ (حوض حیات) نام ایک کتاب کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا[2]

سلطان زین العابدین جو ۸۲۶ھ میں تخت کشمیر پر جلوہ آرا ہوا تھا، اور جس کے آثار سلطنت

---

[1] فہرست تصنیفات بیرونی در آثار باقیہ [2] جامع القصص العربیہ فی الاخبار الہندیہ ص ۱۱۵ مطبوعہ فرانس (عربی)،

پر شہنشاہ اکبر نے اپنی حکومت کی بنیادیں کھڑی کی تھیں، اُس نے ہندوؤں کے لئے بہت سی عربی اور فارسی کتابوں کے ترجمے ہندی میں کرائے، فرشتہ کی عبارت یہ ہے :-

"وفرمود تا اکثرے از کتب عربی وفارسی، بزبان ہندی ترجمہ کردند"[1]

سری بھٹ نامی ایک بید کو طبابت کی تعلیم دلا کر اپنے دربار میں یہاں تک ممتاز کیا، کہ وہ سیاسی معاملات میں بھی دخیل ہوگیا، فرشتہ لکھتا ہے :-

"وسلطان بجہت طبابت سری بھٹ راکہ طبیبے حاذق بود تربیت کرد"[2]

ہندوؤں کو مسلمانوں سے جو بُعد تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ کوئی ہندو مسلمان بادشاہوں کے دربار میں نوکری تک قبول نہیں کرتا تھا، رسوم وعادات کی یہ بندشیں سب سے پہلے دکن میں ٹوٹیں، مسلمان سلاطین نے ہندو فاضلوں کی قدر افزائی شروع کی، اور اس بہانہ سے وہ رفتہ رفتہ مسلمانوں سے مانوس ہونے لگے،

شہزادہ محمد تغلق کے دربار میں گنگو نامی ایک برہمن خدمتِ منجمی پر ممتاز تھا حسن بہمنی جو دکن میں بہمنی حکومت کا بانی ہوا ہے، وہ اس منجم کا نہایت ممنونِ احسان تھا، اس تقریب سے دکن کے برہمنوں کو بہمنی حکومت کے ساتھ موانست پیدا ہوئی، اور بالآخر تمام دفاترِ سرکاری کے وہ مالک بن بیٹھے، فرشتہ میں ہے :-

"مشہور است کہ پیش ازیں برہمنان پیرامون عہدہ وعمل شہریاران اسلام نمی گردید (نوکری) ودر قرایا وزوایا دسواحل انہار بکسب انواع علوم خصوص علم نجوم اشتغال داشتہ متوکلانہ (گاؤں) زندگی می کردند، وملازمت اہلِ دنیا خصوص مسلمانان را مزیل حسنات دانستہ شقاوت ابدی تصور کردہ پیرامون عہدہ وعمل نمی گردیدند واگر احیاناً بعضے از ایشاں

---

[1] فرشتہ ص ۳۴۴، نولکشور [2] فرشتہ ص ۳۴۲،

بوسیلۂ طبابت ونجوم ووعظ وقصہ خوانی درصحبت ارباب جاہ می بودند بانعام واحسان ایشان مخصوص گشتہ، قلادۂ نوکری درگردن نمی اندازند، اوّل کسے کہ از فرقۂ برہمن در دور سلاطینِ اسلام نوکری کرد، گانگو پنڈت بود تا حال کہ ۱۰۱۵ھ است، بخلاف سائر ممالکِ ہند خصوصاً دفتر بادشاہان دکن و نویسندگی ولایت ایشان بہ برہمنہ مرجوع است[۵۱]"

شاہی دفتر کی زبان عموماً فارسی تھی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اہل کار فارسی زبان اب سیکھنے لگے تھے، ابراہیم عادل شاہ جو ۹۴۲ھ میں دکن کی عادلشاہی حکومت کا فرمانروا ہوا تھا، اُس نے فارسی زبان بھی دفتر سے برطرف کر دی،

"دفتر فارسی برطرف کردہ ہندوی کرد وبرہمنہ را صاحب دخل گردانیدہ[۵۲]"

شمالی ہندوستان کی نسبت مشہور یہ ہے کہ سب سے پہلے سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں، یہاں ہندوؤں نے فارسی پڑھنی شروع کی تاریخوں کے پڑھنے سے یہ صاف نظر آتا ہے کہ ہندو رعایا کی تعلیم کے لئے اس سے پہلے کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا تھا، بلکہ جو طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم ان میں مدتوں سے متوارث چلا آتا تھا، اس میں کوئی دخل نہیں دیا گیا اپنے طور پر درس وتدریس کے جو انتظامات ان میں جاری تھے، اس کو علی حالہ باقی رکھا گیا، مسٹر لا اپنی کتاب "پروموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ دی محمڈن پیریڈ" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

ابھی وہ دن دور تھا، جب کہ ہم مسلمان سلاطین کو ہندو اور مسلمان دونوں رعایا کی تعلیم کی برابر سرپرستی کرتے ہوئے اور ایک ہی جوش کے ساتھ مسلمانوں کے علاوہ

---

[۵۱] فرشتہ جلد ۱ ص ۷۰، [۵۲] فرشتہ جلد ۲ ص ۳۰۔

دوسری قوموں کے علوم کو ترقی دیتے ہوئے پائیں، سب سے پہلے مسلمان فاتح کے ہندوستان میں قدم جمنے کے ایک صدی یا دو صدی بعد تک ہندوؤں کی تعلیم اور اُن کے علوم اپنے (قدیم) راستہ پر اپنے حامیوں کی اعانت سے چلتے رہے"

مگر بعض قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فارسی تعلیم کا رواج ان میں اس سے پہلے پیدا ہو چکا تھا سلطان فیروز شاہ تغلق جو ۷۵۲ھ میں تخت نشیں ہوا تھا کانگراہ کی فتح کے موقع پر جوالا مکھی کی سیر میں اس کو ایک چھوٹا سا کتب خانہ ملا تھا، پنڈتوں کو بلا کر چند کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا، تاریخ فرشتہ کی عبارت یہ ہے،

"بادشاہ علماے آن طائفہ را طلب کردہ، بعضے ازاں کتب را ترجمہ فرمود"

(تاریخ فرشتہ جلد ا ص ۱۴۸)

بہرحال مورخین کا مطلب یہ ہے کہ باقاعدہ اور عمومیت کے ساتھ ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا رواج سلطان سکندر لودی کے زمانہ سے ہوا، سلطان لودی نے ہندوؤں کے نشان کی جگہوں میں مساجد، مدرسے، اور بازار قائم کئے، سپاہیوں کو تعلیم پر مجبور کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں بھی عام طور پر فارسی تعلیم رائج ہو گئی، فرشتہ شہادت دیتا ہے،

بعد فرخندہ او علم رواج یافت و امراء وارکان و سپاہیان بکسب فضائل اشتغال نمودند و کافران بخواندن و نوشتن خط فارسی کہ تا آن زمان درمیان ایشان معمول نبود پرداختہ "

اس کے بعد شیرشاہ کا زمانہ آتا ہے، اس نے ہندوؤں کے ساتھ نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا، بہت سے ہندوؤں نے فارسی پڑھ پڑھ کر دکن کی طرح شمالی ہندوستان میں بھی دفاتر سرکاری میں نوکریاں حاصل کیں، راجہ ٹوڈرمل جو اکبر کے نورتن میں شامل ہے وہ شیرشاہ

ہی کا تربیت کردہ تھا، اور اسکے محکمۂ مالگزاری کا دیوان تھا،

تیموریوں کے زمانہ میں ہندوؤں کی تعلیمی ترقی درجۂ کمال تک پہنچ گئی، گو اس کی تفصیلات نہ ملیں لیکن استقصائے جزئیات سے یہ نتیجہ واضح طور سے نمایاں ہوتا ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم اُن کے زمانہ میں گھر گھر پھیل گئی،

فارسی تعلیم کے علاوہ سنسکرت اور دیگر مذہبی علوم کی تعلیم کے لئے ملک کے مشہور شہروں میں بڑی بڑی درسگاہیں تھیں، جہاں دور دور سے طلبہ آآ کر شریک درس ہوتے تھے، یہ درسگاہیں ٹھٹھ، ملتان اور خصوصاً بنارس میں زیادہ تھیں سلاطین تیموری بھی ان علوم کی دستگیری میں کمی نہیں کرتے تھے، درباروں میں اُن کو مسلمان فضلائے عہد کے پہلو بہ پہلو جگہ ملتی تھی، ابوالفضل نے آئین اکبری کے ہندو فضلاء کے حسب ذیل نام لکھے ہیں :۔

مہادیو، بھیم ناتھ، نارائن، شیوجی، مادھو، رام چندر، سری بھٹ، مادھو سرستی، جدروپ، بشن ناتھ، مدسودن، رام کشن، نارائن اسرم، بلبھدر، مصر، ہرجی سور، باسدیو مصر، دامودر بھٹ، باہن بھٹ، رام تیرتھ، بدھ نواس، نرسنگھ، گوپی ناتھ، برم اندر، گوپی ناتھ، بجی سین سور، کشن پنڈت، نہال چند، بھٹاچارج، کاشی ناتھ، دیوی برہمن، دیوی برہمن نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا،

اکبری دربار میں فن مصوری و نقاشی کے جو ماہرین تھے، ان میں مسلمان استادوں کو چھوڑ کر حسب ذیل ہندو اساتذہ تھے :

وسونت کمار، دساون، کیشو لال، مکند، مادھو، جگن مہیش، کھیم کرن، تارا، ساونلا، ہری بنس، رام،

لے : ثمر عالمگیری ص ۸۰،

جس طرح اس عہد میں سنسکرت سے فارسی میں کتابیں ترجمہ کی گئیں، بعض کتابوں کا عربی و فارسی سے سنسکرت میں بھی ترجمہ کیا گیا، مرزا الغ بیگ کی زیچ، علم ہیئت کی آخری اور مستند کتاب ہے، مسلمان اور ہندو فضلا، کی ایک مشترک مجلس نے اس کا سنسکرت میں ترجمہ کیا، ہندو علما میں سے کشن، جوتشی، گنگا دھر، مہیش، اور مہانند اس مجلس کے ممبر تھے،

جہانگیر نے بھی ہندو فضلا، کی قدردانی میں کمی نہیں کی، اس کے عہد میں جدروپ گوشائیں نہایت مشہور ہیدانت تھا، وہ پاپیادہ اس کے جھونپڑے تک جاتا، اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا، راستہ چلتے کسی سنیاسی کا نام سنتا، تو اس کی ملاقات کو اتر پڑتا، ایک دفعہ وہ سفر کر رہا تھا، کہ ناگاہ ایک مقام پر اس کو بہت سے جوگی نظر آئے، تزک میں لکھتا ہے:-

"درہمیں منزل شب شیورات واقع شد جوگی بسیار جمع آمدہ بودند،...... بادانایان ایں طائفہ صحبتہا داشتہ شد"

رائے منوہر لال ولد رائے لون کرن لڑکپن سے جہانگیر کے زیر سایۂ عاطفت تعلیم پاکر جوان ہوا تھا، فارسی زبان کی شاعری اور خوشخطی میں سلیقۂ خاص پیدا کیا[1]، راجہ سورج سنگھ نے ایک ہندو شاعر کو دربار میں پیش کیا، جہانگیر اس کے چند ہندی اشعار سن کر نہایت محظوظ ہوا، اور ایک ہاتھی اس کو عطا کیا[2]، اس کے دربار کا مشہور نقاش بشن داس تھا، جس کو جہانگیر نے ایران بھیجا تھا[3]،

داراشکوہ کا دربار ہندو فضلا، اور شعراء سے بھرا رہتا تھا، وہ خود بھی ہندوؤں کے علوم و فنون میں مہارت رکھتا تھا، اس لئے ہندو علماء کو عزیز رکھتا تھا، اس کے دربار کا گویا ملک الشعراء ایک برہمن چندربھان نامی تھا، اس کا تخلص برہمن تھا، فارسی میں دلپسند شعر کہتا تھا، اس کا دیوان

---

[1] تذکرہ خوشنویساں [2] تزک جہانگیری، [3] ایضاً ص ۲۸۵،

فارسی اب تک موجود تھا، داراشکوہ کے قتل کے بعد بنارس میں آکر سکونت اختیار کر لی تھی، جہاں اُس نے ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی،

اس مضمون میں بدنصیب عالمگیر کا نام کسی دوستانہ حیثیت سے تو بار نہیں پا سکتا تھا لیکن دشمنانہ انداز میں بھی کیا کسی رسمِ محبت کا سراغ لگ سکتا ہے، مآثر عالمگیری میں ہے،

"بعرض خداوند دین پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھہ و ملتان خصوص بنارس برہمنان بطالت نشان در مدارسِ مقررہ بتدریس کتب باطلہ اشتغال دارند و راغبان و طالبان از ہنود و مسلمانان مسافتہاے بعیدہ طے نمودہ جہت تحصیل علوم شوم نزد آن جماعت گمراہ می آیند، احکام اسلام نظام بناظمان کل صوبہ جات صادر شد کہ مدارس و معابد بے دینان دستخوش انہدام سازند و بتاکید اکید طور درس و تدریس و رسم شیوع مذہب کفرانیان براندازند"۔ (ص ۸۱)

اس عبارت سے جہاں عالمگیر کی تنگدلی ظاہر ہوتی ہے، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے تمام صوبوں میں اُن کے مدارس قائم تھے، غالباً ان مدارس کے توڑنے کے احکام اسی اصول پر مبنی ہوں گے جس کی مثال ہم کو اس روشن عہد حکومت کی تعلیمی پالیسی میں نظر آتی ہے،

محمد شاہ کے زمانہ میں راجہ جے سنگھ والی جے پور نے دلی، بنارس اور اجین میں رصدخانے قائم کرائے، ملا خیر اللہ مہندس رصدخانہ دلی کے منتظم خاص تھے، بنارس کا رصدخانہ اب تک موجود ہے، اور ہندوؤں کے تہواروں میں، اور شادی بیاہ کی تاریخوں میں اس سے اب تک مدد لی جاتی ہے،

جے سنگھ نے مسلمان علماء کو جمع کر کے عربی زبان کی چند مشہور ہیئت کی کتابوں کا ہندی

میں ترجمہ کرایا[۱]،

اس تمام عہد میں ہندوؤں کی تعلیم روز بروز ترقی کرتی گئی، فارسی دانی کا ذوق، علوم عربی کی تحصیل کا شوق، شاعری کا مذاق، خطاطی، خوشنویسی، حساب وغیرہ کی تعلیم نہایت عام ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس عہد میں یہ نظر آتا ہے کہ ہر شریف ہندو کچھ نہ کچھ لکھا پڑھا تھا یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں کتابوں کے جمع کرنے اور کتب خانوں کے قائم کرنے کا شوق نہ تھا، کانگڑہ کی فتح میں مسلمانوں کو جو کتب خانہ ملا تھا اس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے لیکن اس عہد میں مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو شرفا میں کتب خانوں کے قائم کرنے کا شوق پیدا ہو گیا، تاریخی حوالوں کو چھوڑ کر آج ہندوؤں کے جو قدیم شریف گھرانے موجود ہیں، وہاں عربی اور فارسی کتابوں کی چند فرسودہ جلدیں کس میرسی میں پڑی ہوئی ملیں گی بڑے بڑے ہندو امرا کے ایوانوں میں دیگر سامان آرائش کے ساتھ ساتھ کتب خانہ کا وجود بھی لوازم ریاست سے سمجھا جاتا تھا، لاہور، دلی، لکھنؤ، پٹنہ اور ڈھاکہ میں ایسے بکثرت گھرانے ملیں گے، پٹنہ میں اس وقت تو ایک ایسے قدیم ہندو رئیس موجود ہیں، جن کے ہاں عربی کتابوں کے نوادر نسخے اب تک موجود ہیں، اور ان کو اس قدر عزیز ہیں کہ وہ ان کو جدا نہیں کر سکتے، راجہ شتاب رائے ناظم بہار کے خاندان میں اس قسم کا ایک نادر کتب خانہ موروثی چلا آتا ہے،

اوپر جو کچھ کہا گیا، وہ جنوبی اور شمالی ہندوستان اور کشمیر کے متعلق تھا، آیندہ سطور میں اس خطۂ ہند کے متعلق ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، جو آج ہندوستان کا سرتاج اور مایۂ فخر و ناز ہے، یعنی بنگال!

بنگالی زبان آج اپنی ثروت اور تمول کے لحاظ سے تمام ہندوستان کی زبانوں میں سب

---

[۱] سبحۃ المرجان آزاد،

زیادہ دولت مند ہے لیکن یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس کی ترقی کا آغاز بنگال میں مسلمانوں کی ابتدائے حکومت سے ہوتا ہے، اس سے پہلے یہ زبان کاغذ کے ایک صفحہ کی بھی مالک نہ تھی، بنگالی زبان کی سرسبزی اور شادابی کی آج دھوم ہے، لیکن مسلمانوں سے پہلے اس زمین میں ایک تخم بھی بویا نہیں گیا تھا،

اس دعوے کے ثبوت میں ہم اپنی تحقیقات کے بجائے ایک فاضل بنگالی مورخ کی تاریخ "ترقی علوم در ہندوستان" کے اقتباسات پیش کرتے ہیں :-

"سلاطین بنگال کی کوششیں صرف مسلمانوں کی تعلیم کی ترقی تک محدود نہیں رہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی دیرینہ بیدار مغزی کو ایک نئے راستہ پر علوم کو ترقی دینے میں جس کے ساتھ بنگالی بولنے والے لوگوں کو خاص طور سے دلچسپی ہونا چاہئے، متوجہ کیا، ان لوگوں کو یہ بات بے جوڑ معلوم ہوگی کہ ان کی زبان اپنی علمی سطح تک پہنچنے میں خود ان کی نہیں بلکہ ان مسلمانوں کی ممنون ہے، جن کی ابتدائی توجہ اس کی طرف صرف اس کی ندرت کی بنا پر اور اس بنا پر تھی کہ اس کو اُس سنسکرت زبان سے تعلق ہے، جو اس وسیع ہندو آبادی کا محبوب خزانہ ہے جس کے ساتھ اُن کو بہت زیادہ تعلق ہے،

سب سے پہلے مہابھارت اور رامائن کی رزمیہ نظموں نے بنگال کے مسلمان سلاطین کو اپنی طرف متوجہ کیا، جن کے اشارہ سے اُن کا بنگالی یعنی ملکی زبان میں ترجمہ ہوا، مہابھارت کا سب سے پہلا ترجمہ ناصر شاہ والی بنگال (۱۲۸۲ء تا ۱۳۲۵ء) کے حکم سے ہوا، جو صوبہ کی دیسی زبان کا بہت بڑا مربی تھا، اور جس کو شاعر اعظم ودیاپتی نے اپنی نذر دے کر زندۂ جاوید بنا دیا، (اپنی ایک نظم میں) سلطان غیاث الدین

کا بھی ذکر کرتا ہے، جس سے غالباً غیاث الدین ثانی والی بنگال (۱۳۶۷ء،

۱۳۷۳ء) مراد ہے،

.....یہ مشکوک ہے کہ بنگال کے کسی مسلمان بادشاہ یا ہندو راجہ[۵] کانس نراین نے کرتی دلس کو بنگالی میں رامائن ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اگر پچھلی روایت صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں ہی کی نظیروں نے اس کارنامے کے انجام پر اس کو آمادہ کیا،

سلطان حسین شاہ، بنگالی زبان کا بہت بڑا مربی تھا، مالادھر باسو کو اسی نے بھاگوت پران کے بنگالی ترجمہ پر مقرر کیا، حسین شاہ کا ایک سپہ سالار پرگل خاں نامی ہے، پرگل خاں اور اس کے بیٹے نے اپنے نام کو اس بنا پر بقائے دوام بخش دیا ہے کہ انھوں نے مہا بھارت کا ٹکڑا بنگالی میں ترجمہ کرایا،

پرگل خاں روزانہ شام کو اپنے محل پر گلبو رواق نشینی میں اپنے اہل دربار کو جمع کرتا تھا کہ مہا بھارت کے بنگالی ترجمہ کو مترجم یعنی کویندرا پرمیشور کی زبان سے سنیں، پرگل خاں کے زیر اہتمام اس رزمیہ نظم کا ترجمہ "استری پرو" تک پورا ہوا، اس کے بعد چھوٹے خاں جو اس کا چاٹگام کی گورنری پر جانشیں ہوا، اس نے سریکرن نا ندی شاعر کو مقرر کرکے اس کام کو جاری رکھا، اور "اشومیدھ پرو" کا ترجمہ کرایا،

مسلمان امراء کے اشارہ سے بنگالی میں سنسکرت اور فارسی کتابوں کے ترجمہ کرنے کی مثالیں شاذ نہیں ہیں، انھوں نے سنسکرت کے عشاق برہمن اور ہندو

---

[۵] مسلمانوں کے عہد میں چند سال کے لئے یہ بنگال کا راجہ بن بیٹھا تھا، اس کا بیٹا تخت نشیں ہو کر مسلمان ہو گیا تھا،

راجاؤں کے اس مغرورجذبہ کوجس سے وہ بنگالی زبان کو دیکھتے تھے، بدل دیا۔ مسلمان امرا کی تقلید میں بنگالی مصنفین کی ہمت افزائی، اور درباروں میں بنگالی شعراء کے رکھنے کا ہندو راجاؤں میں عام رواج ہوگیا، اس زمانہ سے کتنے ممتاز بنگالی شعراءٔ اور مصنفین نے ہندو راجاؤں کے درباروں کو آراستہ کردیا، جس کے سبب سے بنگالی مقبولیت عام میں بلند سطح تک ترقی کرگئی اور ان باتوں کی جو اپنے پاؤں اس صوبہ میں گاڑ رہی تھیں حریف بن گئی۔[۵۰]

الغرض رفتہ رفتہ عربی اور فارسی زبان کی تعلیم بنگالی شرفاء کا طغرائے امتیاز بن گئی خصوصًا اُن خاندانوں کے لئے جن کو حکمرانوں کی نیابت اور سرکاری عہدوں پر سرافرازی کا موروثی حق ہوگیا تھا، مہاراجہ سوبرجوکنترا اچارجی ٹاکی، مہاراجہ جتیندر موہن ٹاگور، اور مہاراجہ ناداکرشنا کے خاندان بنگال میں عربی اور فارسی علوم وادبیات کے مربی تھے، اور اُن کے فرزندان علوم میں عالمانہ مہارت رکھتے تھے، راجہ رام موہن رائے بانی فرقہ برہمو سماج اور راجہ کشب چندر سین، جنھوں نے آخر زمانہ میں بنگالی قوم میں مصلح اعظم کا درجہ پایا ہے، علوم اسلامیہ کے واقفین میں ان کا شمار ہے، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی ندوہ کے اجلاس مدراس (۱۹۱۷ء) میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"بنگال کے جدید دور ترقی کا سنگ بنیاد راجہ رام موہن رائے کے قابل ہاتھوں سے رکھا گیا، یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے پٹنہ میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، گذشتہ موسم سرما میں کلکتہ کے ایک نامور بنگالی بابو نے مجھ سے کہا کہ ان کے باپ اور چچا کے زمانہ تک کلکتہ سے بکثرت بنگالی عربی پڑھنے پٹنہ جایا کرتے تھے، چنانچہ اُن کے چچا نے ۱۵ برس میں علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی۔"

---

[۵۰] پریموشن آف لرننگ ان انڈیا، ڈیورنگ دی محمدن پیریڈ، ص ۱۰۷ - ۱۱۱

گرش چندر گھوش نے قرآن مجید، تذکرۃ الانبیا، اور مشکوٰۃ کا بنگالی میں ترجمہ کیا،
انہی اسباب کا اثر ہے کہ بنگالی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ خصوصاً آداب سلطنت
اور کارروائی ہائے مقدمہ کے الفاظ بکثرت ہیں، اور اب رفتہ رفتہ ان کی جگہ انگریزی لے رہی ہے،
تاہم بنگال کی ڈیڑھ دوسو برس کی انگریزی حکومت کے بعد بھی ان الفاظ کا اب تک بنگالی میں
رواج پذیر رہنا، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس زبان میں ان مفاہیم کے لئے سرے سے الفاظ
ہی نہ تھے،

بنگال کے بعض ممتاز خاندانوں کا سرنام اب تک فارسی ہے، مثلاً ملک، عہدہ دار،
سرکار، موزمدار، اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کو اپنے حاکم وقت کی زبان سے کس درجہ
محبت تھی،

یہ معلوم کرکے تعجب کی انتہا نہ رہے گی کہ مرہٹی زبان کے بنانے میں بھی مسلمانوں کے زبان و قلم
نے سب سے زیادہ کام کیا ہے، مرہٹوں کو طرز و آداب شاہی سیکھنے کے لئے مسلمانوں ہی کا دست نگر
ہونا پڑا، ابتداءً مرہٹی زبان ایک وسیع ملک کی جہانداری کی قوت نہیں رکھتی تھی، اس لئے
ناچار انہی مسلمانوں اور برہمنوں کا اس کو ممنون ہونا پڑا، جنہوں نے فارسی زبان پڑھی، اور
سیکھی تھی، مرہٹہ راجاؤں کے فرامین آج بھی تم پڑھو تو آدھے سے زیادہ اس میں اصلی یا
بگڑے ہوئے فارسی و عربی الفاظ کی آمیزش پاؤگے، تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ مرہٹہ آج قدیم
مرہٹی زبان کے لٹریچر کو سمجھنے سے اپنے کو عاجز پاتا ہے،

آداب و قواعد سلطنت، کاغذات سرکاری، صنعت و حرفت، خانگی زندگی ہر ایک چیز
میں اس کی زبان کا اصلی راس المال عربی و فارسی زبان کے الفاظ ہیں، ہمارے دوست شیخ
عبدالقادر صاحب ایم اے، پروفیسر الفنسٹن کالج بمبئی جو مرہٹی زبان و ادب میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، وہ

مرہٹی زبان کی ایک ڈکشنری لکھنے والے تھے، جس سے بیک دفعہ یہ نظر آجاتا کہ عدالت، کتب خانہ، مدرسہ بازار، کارخانہ، ہر جگہ مرہٹی کے آلات تخاطب عربی و فارسی الفاظ ہیں، حلوائی کی دوکان سے بڑھئی اور لوہار کے مکان تک چلے جاؤ آلات کے نام اور تہذیب و تمدن کے الفاظ کا ماخذ مسلمانوں ہی کی زبان کو پاؤ گے تاریخ کے لیے لفظ مرہٹی میں نہ تھا اب اس کو باکھر کہتے ہیں، اس زبان کے محققین کا بیان ہے کہ کھبر کی تحریف ہی باکھر سمجھیے؟ خبر!

بیسیوں ہندو خاندان وہاں آباد ہیں جن کا سرمایۂ امتیاز یہ ہے کہ عہد قدیم میں اُن کا خاندان فارسی کا خدمت گذار تھا، اور اب تک اُن کا خاندانی سرنام وہی فارسی زبان کا لفظ ہے مثلاً پھڑنیس یعنی فردنویس، چٹ نیس یعنی چٹھی نویس، کلہ دار یعنی قلعہ دار، پوت دار، یعنی پوتھی دار، ایک قسم کے مرہٹہ سپاہی کا نام "سلہ دار" تھا، اس کی اصل سمجھیے سلحدار، تگائی تم جانتے ہو؟ تم جس کو تقاوی بولتے ہو، آج کل دکن میں مرہٹوں اور برہمنوں کی زبانوں پر حسب ذیل عہدوں کے نام عام طور سے جاری ہیں،

مقدم	چودھری	فوجدار	سب انسپکٹر
معاملہ دار	تحصیلدار	تاجر	ناظر
کارکن	محرر	سرستہ دار	سررشتہ دار
دیوان	سکریٹری		

ملک دکن اور مہاراشٹر کی تقریب سے ہم نے حیدرآباد کا ذکر نہیں کیا سبب یہ ہے کہ اس مجسمہ عدل وانصاف ریاست نے اپنی ہندو رعایا کی تعلیمی و علمی ترقی میں جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ ایک مضمون کے ضمن میں نہیں، بلکہ ایک کتاب کے سیکڑوں صفحات میں اُن کا تذکرہ ہونا چاہیے، صرف ایک حیدرآباد کی اسلامی ریاست نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ جو کچھ کیا، اور کر رہی ہے تمام ہندوستان کی ہندو

ریاستوں نے مل کر بھی اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ اتنا نہیں کیا، اس وقت موضوع سخن صرف علمی اور تعلیمی حالات ہیں، اس لئے صرف اسی زاویۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ علاوہ عام تعلیم کے جس کی بدولت ریاست کے تمام تر دفاتر پر ہندو اہل کار قابض رہے ہیں، اعلی تعلیم کے لحاظ سے بھی ہر عصر میں یہاں ہندو اہلِ قلم مصنفین اور شعرا موجود رہے ہیں، اس بیان کی تصدیق کتب خانۂ آصفیہ کی مطبوعہ فہرست کی دو جلدوں میں ملے گی،

منشی لچھمی نرائن شفیق مصنف بساط الغنائم و تاریخ دکن، لالہ گردھاری لال مصنف تاریخ دکن، رائے منا لال مصنف تاریخ دکن، لالہ لچھمی نرائن مصنف چمنستان شعرا، راجہ گردھاری پرشاد باقی صاحب دیوان و مثنوی، مہاراجہ چندو لال شاداں، صاحبِ کلیات، نند رام مصنف سیاق نامہ، جگناتھ نجومی مصنف تقویم التواریخ، حکیم رائے بجو لال تمکین، صاحب دیوان و مصنف مجربات، رتن لال مصنف تخطیط البلاد، وغیرہ کے سیکڑوں نام گنائے جا سکتے ہیں، اور عجب نہیں کہ کوئی حیدرآبادی قلم ان سے بھی بہتر اشخاص کے نام پیش کر سکے،

بہار، اودھ، صوبہ آگرہ اور دلی کے متعلق بےخطر کہنا چاہئے کہ یہاں ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے برابر برابر تھی، ان ممالک کے بے شمار ہندو فضلا کے نام تذکروں میں محفوظ ہیں، فقط ایک لکھنؤ میں ہندو شعرا کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہوئی ہو گی، لکھنؤ کے کشمیری ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا رواج انتہائی عروج پر تھا، لکھنؤ میں راجہ الفت رائے الفت، کالی پرشاد اخلاص، لالہ چندا آتش، راجہ گنگا پرشاد بدر، منشی خیالی رام خیالی، بختاور سنگھ راقم، میکو لال آلفت، رام سہائے رونق، میڈو لال نزار، راجہ جیالال گلشن، راجہ کالکا پرشاد موجد منشی الممالک، جوالا پرشاد وقار،

دیگر اضلاع اودھ و الہ آباد میں منن لال آفرین الہ آبادی، رائے امر سنگھ خوشدل ناگپوری

گوکل چند ہند فرخ آبادی، راجہ مدن سنگھ موزوں اٹاوی، رائے گلاب رائے گلشن سندیلوی سکھن لال موجد بدایونی، لالہ بیج ناتھ مشتاق بریلوی، لالہ رام بخش مطیع قنوجی، لالہ بالمکند شہود ناگپوری، منشی ایشری داس آرام فرخ آبادی، اندرمن اورنگ آبادی (علی گڑھ)۔

آگرہ میں چندر بھان برہمن، شیورام حیا، رائے منوہر ولد رائے لون کرن،

عظیم آباد پٹنہ میں لالہ اوجاگر الفت، راجہ پیارے لال الفتی، راجہ بہادر راجہ، راجہ رام نرائن موزون، مینی پرشاد دل وغیرہ فارسی زبان کے مشہور شاعر، سخن فہم، انشا پرداز اور فاضل گذرے ہیں،

الہ آباد کے مشہور ہندو لیڈر مالوی جی اگر اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہے کہ ممالک متحدہ کے ہندوؤں کے سب سے پہلے لیڈر جو اسی شہر الہ آباد میں آپکے ہم پیشہ تھے، اور جن کی کوشش سے آپ "پالیٹکس" کے لفظ سے گوش آشنا ہوئے ہیں، وہ عربی اور فارسی علوم کے ایک بہت بڑے ہمہ داں فاضل تھے یعنی پنڈت اجودھیا ناتھ، وہ ایک طرف کانگرس کے پلیٹ فارم پر لکچر دیتے تھے، تو دوسری طرف اپنے گھر میں بیٹھ کر متنبی اور عرفی کا درس دیتے تھے،

پنجاب بھی مسلمانوں کے تعلیمی اثر سے خالی نہیں، مل سیالکوٹی متخلص بہ وارستہ جو فارسی کے مشہور لغت مصطلحات الشعرا، کا مصنف ہے، وارستہ کھتری شاگرد ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، منشی بچھمی نرائن دہیر گنج دی لاہوری پنجاب کے نامور ہندو فضلا ہیں، بچھمی نرائن کو معقولات میں بھی بہت بڑی مہارت حاصل تھی، مصطلحات فارسی کی تحقیق میں وارستہ نے ۳۰ برس ایران میں گذارے تھے،

دلی میں منشی مادھو رام منشی، رائے منوہر لال منوہر، مرزا راجہ کدارناتھ نسیم، مرزا کوذرہ دکھینے گا، راجہ گوپال ناتھ غلام، پورن لال رنگین، بہادر سنگھ دلخوش، لالہ جنی داس ذرہ،

شیو سنگھ بیجان، لالہ نرائن داس بیخود، سکھ راج سبقت، منشی گوہر لال تفتہ وغیرہ سیکڑوں فضلا، گذرے ہیں[1]۔

دیہاتوں میں تعلیم کا طریقہ وہی تھا جو مدت دراز سے ہندوستان میں جاری ہے، گرو جی دیہات کے زمینداروں کے ہاں نوکر ہوتے تھے، یا تمام گانوں کی طرف سے اُن کو تنخواہ ملتی تھی، لڑکے کسی کچے مکان کے برآمدہ میں یا سایہ دار درخت کے نیچے لپی ہوئی زمین پر بیٹھ جاتے تھے، ہاتھ میں لکڑی کا سیاہ رنگا ہوا تختہ ہوتا تھا، اس پر کھریا کی سفید روشنائی سے لکھتے تھے یا کھریا مٹی کے ڈھیلے سے زمین پر لکھتے تھے، ہندی لکھنا پڑھنا اور پہاڑا اور حساب اُن کو سکھایا جاتا تھا، یہ گویا پرائمری تعلیم تھی،

عام تعلیم تو یہیں ختم ہو جاتی تھی، جو لڑکے آگے بڑھنا چاہتے تھے، وہ یا سنسکرت اس کے بعد سیکھتے تھے، اور پنڈت بنتے تھے، اور یا سرکاری زبان فارسی کی تعلیم حاصل کر لیتے تھے، قصبوں میں فارسی کے مکتب ہوتے تھے، ہندو اور زیادہ تر مسلمان "میاں جی" پڑھاتے تھے، فارسی کی ابتدائی تعلیم میں بول چال، خط و کتابت، اور اخلاقی حکایات کی کتابیں داخل ہوتی تھیں، ہندو مسلمان لڑکے ایک ساتھ نہایت میل جول، اور یک جہتی کے ساتھ پڑھتے تھے، گلستاں، بوستان، یوسف زلیخا، انشائے خلیفہ، بہار دانش، اخلاق ناصری، انوار سہیلی، سکندر نامہ، شاہنامہ وغیرہ کتابیں داخل درس تھیں، خوشخطی اور فارسی نویسی سکھائی جاتی تھی، فرامین اور دیگر مراسلات سرکاری اور خط شکست کے پڑھنے کی عادت دلانے کے لئے پرانے لیے خطوط کا ایک طومار "میانجی" اپنے پاس رکھتے تھے، جس میں سو دو سو خطوط لمبے جڑے ہوتے تھے، مکتب کے طالب العلم ان کو پڑھتے تھے، اس کو اسکول کی تعلیم سمجھنا چاہیئے۔

---

[1] یہ تمام نام مختلف فارسی تذکروں سے التقاط کئے گئے ہیں،

اس کے بعد یا تو لڑکے نوکری کر لیتے تھے، اور تکمیل کے لئے مشہور اساتذہ کی خدمت میں بڑے بڑے شہروں میں چلے جاتے تھے، ان سے فارسی کی اعلیٰ تعلیم، شاعری، علوم، اور کچھ عربی کی کتابیں پڑھتے تھے، بعض بعض طلبہ تمام علوم مروجہ کی تکمیل کرتے تھے،

ابوالفضل نے آئین اکبری میں اپنے زمانہ کا نصاب تعلیم یہ بتایا ہے، اخلاق، ریاضیات، حساب، زراعت، اقلیدس، مساحت، ہیئت، رمل، قواعد مال، آئین سلطنت، طب، طبعیات، الٰہیات، اور تاریخ، ہندوؤں کو ان علوم کے علاوہ دیاکرن (سنسکرت صرف و نحو) ویدانت (ہندو تصوف و اخلاق) پاتنجلی (ہندو فلسفہ) بھی پڑھنا پڑتا تھا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس تعلیم کی بدولت تمام سلطنت آراستہ و مرصع ہوگئی تھی، اس کو اس عہد کے کالج کی تعلیم سمجھنا چاہئے،

سطور بالا میں تحصیل کمال اور طلب علم کے لئے جابجا اساتذہ کی خدمت میں سفر کا جو نقشہ میں نے کھینچا ہے، فارسی تذکروں کے پڑھنے سے یہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے، ذیل میں منشی لچھمی نرائن دبیر کے حالات تعلیم کی چند سطریں ایک فارسی تذکرہ سے نقل کرتے ہیں:-

"جد و پدرش در دہلی بوکالت امرائے عالمگیری و محمد شاہی عز امتیاز داشت۔ دبیر در طفلی از مولوی شیخ محمد گرفت در سن دوازدہ سالگی بشوق نظم و نثر در مجلس استفادۂ سراج الدین علی خان آرزو جا گرفت و برائے تحصیل صرف و نحو نزد لالہ ٹیک چند بہار می رفت بعد رشد خدمت علمائے اسلام را التزام نمود و مشغول کشت علم طب و دیگر علوم عقلیہ بود (در ۱۲۰۵ھ مرد)

ہندو اور مسلمان طلبہ ان اساتذہ کی خدمت میں جس محبت و یک جہتی کے ساتھ مل کر تعلیم پاتے تھے، اور "استاد بھائی" بن کر جو رشتہ اتحاد باہم قائم کر لیتے تھے وہ آجکل کے شاندار ایوانوں کے

تاریخی زمانہ میں مفقود ہے، محمد حفیظ خاں المتوفی ۱۱۹۷ھ ایک نامور استاد تھے، اُن کے شاگردان باخلاص کے نام سنیئے، امیر ابوالحسن، منشی لچھمن سنگھ، میر کلن، قادر بخش، پنڈت لچھمی رام، محمد اسمٰعیل، لالہ سکھرام، منشی کشن سنگھ، محمد تقی، منشی محبوب رائے، دیکھا، "منشی محبوب رائے" کتنا پیارا نام ہے، کیا یہ ہندو مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی عملی دلیل نہیں،

لالہ جنی داس ذرہ دلی کے ایک مشہور معلم تھے، جن کے مکتب میں ہندو مسلمان لڑکے پڑھتے تھے، ہندوستان کے خاتمۃ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے استاد فارسی منشی سوہن لال تھے، اور مولانائے مرحوم کے تلامذہ میں چھ بہاری لال کایستھ تھے، مولانا کے ایک تلمیذ رشید گواہی دیتے ہیں کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ مولانا کے دوسرے رشید تلامذہ اُن کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے[۱]،

تمدن ہند کا مصنف موسیو لیبان اپنی کتاب کے تیسرے باب میں ہندوؤں کے علوم و فنون پر حسب ذیل تنقید کرتا ہے :-

"ہم نے تمدن عرب میں جتنے باب علوم و فنون پر لکھے ہیں، اُن کی توقع اس کتاب میں نہیں ہوسکتی، چونکہ عربوں نے یونان و روم کے قدیم علمی ذخیرے کو خود بہت ترقی دی، اور اس کے بعد اس کو یورپ کے دارالعلوموں تک پہنچایا، اس لئے ہمیں ان کے زمانۂ حکومت کی علمی ترقیوں میں ایک خاص دلچسپی تھی، اور اس وجہ سے ان ترقیوں کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا تھا، ہندوستان کے علوم کی یہ حالت نہیں ہے، برخلاف اس کے اُن کے علوم کے متعلق جو قدیم رائے تھی، اس میں بہت کچھ ترمیم ہوگئی ہے، اور ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ ان کے علمی خیالات ان اقوام سے لئے گئے ہیں، جن کے ساتھ

---

[۱] خطبۂ صدارت ندوہ مدراس ۱۹۱۷ء از مولانائے شروانی،

اُن کو تعلق پیدا ہوا، اور خود ہندوؤں نے اس میں کچھ اضافہ نہیں کیا، بس کسی خاص زمانہ کے ہندی علوم کی تحقیقات کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم ان اقوام کے علوم کی تحقیق کریں جن کا تعلق اس وقت ہند سے تھا، اور یہ ایک ایسی بحث ہے جو ہماری کتاب کے مقاصد سے خارج ہے، جو کچھ ہم ہندوؤں کی دماغی حالت کے متعلق لکھ چکے ہیں، اس سے آسانی سمجھ میں آئے گا کہ انھوں نے کیوں ان علوم میں جو انھیں باہر سے حاصل ہوئے، کوئی ترقی نہیں کی، ہندو دماغ جو فلسفہ میں نکتہ رس اور فنون میں تیز فہم ہے، اس خاصیت سے جس کا نام مادۂ تحقیق ہے، اور جس کے اوپر علوم کا دار و مدار ہے، بالکل عاری ہے، ہمیشہ سے ہندوؤں میں اصلی علوم کی کمی رہی ہے، ان میں دوسروں کی تحقیقات کو حاصل کر لینے کا تو پورا مادہ ہے لیکن اس درجہ سے یہ کبھی آگے نہ بڑھ سکے، وہ دو قومیں جن سے ہندوؤں نے اپنے علوم اخذ کئے، یونانی اور عرب معلوم ہوتے ہیں، یہ نہیں معلوم ہو کہ یونانی علوم ہند میں کیونکر پہونچے لیکن شمال وغربی ہند کی عمارات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہندوستان کے تعلقات بیکٹریا کے ساتھ مدت دراز تک قائم رہے، بہت ہی قرین قیاس ہے کہ اسی ذریعہ سے یونانی علوم ہند میں آئے، "وراہ مہر" جو نہایت قدیم ہندو مہندس ہے، اور جو اجین میں چھٹی صدی عیسوی میں تھا، اپنی ہیئت کی کتاب میں یونانی اصطلاحیں استعمال کرتا تھا، اور یونانیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، عربوں کا علم کس طرح ہند میں آیا، اس کا سمجھنا زیادہ آسان ہے، سنہ مسیحی سے بہت پہلے عربوں کے تجارتی تعلقات ہندوستان سے قائم تھے، اور عرب ہی مشرق اور مغرب کے باہم ملنے کے ذریعہ تھے، اس کے بعد جب مسلمانوں نے تمام قدیم دنیا کو فتح کر لیا تو یہ تعلقات مثل سابق کے قائم رہے، اور ہمیں عربی مورخین سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے بغداد کے

دربار میں متعدد ہندو علما موجود تھے، اس سے بھی مابعد زمانہ میں جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت حاصل کی تو علمائے اسلام علوم کو برابر ملک میں پھیلاتے رہے، مثلاً گیارہویں صدی عیسوی میں البیرونی نے جس کا زمانہ محمود غزنوی اوّل فاتح ہندوستان کا ہے تمام ملک میں سفر کیا، اور علوم عربی کو جو اس وقت بہت وسیع ہو گئے تھے، کیونکہ ان میں نہ صرف قدیم دنیا کے علوم موجود تھے، بلکہ خود عربوں کی تحقیقات شامل ہو گئی تھی، ہندوستان میں پھیلایا، گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے کہنا چاہئے کہ ہندی علوم سے مراد عربی علوم ہیں، پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندی علوم جن کی ابتدا پانچویں صدی عیسوی میں آریہ بھٹ کی ریاضیات سے ہوئی، اور پھر ساتویں صدی میں برہم گپت نے اس پر اضافہ کیا، اس زمانہ سے لے کر آج تک انہی مسائل سے بحث کرتے ہیں، جو ہند میں ان دو ذریعوں سے آئے، اس وقت ہمارے پاس ہندو علوم کی مشہور تصانیف موجود ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے خود ان علوم میں زیادہ ترقی نہیں کی، کسی زمانہ میں خیال کیا جاتا تھا کہ ہندوؤں کا علم ہیئت بہت کچھ کامل ہے، اور قدیم ہے، لیکن اب یہ خیالات قائم نہیں رہے، اور ان پر بحث کرنا بے فائدہ ہوگا، اگر ان تصانیف میں کوئی نیا مسئلہ بیان کیا گیا ہے، تو محض اشارۃً اور بلا دلیل، مثلاً آریہ بھٹ چند سطروں میں زمین کی محوری حرکت روزانہ کا ذکر کرتا ہے لیکن کسی قسم کا ثبوت نہیں دیتا، اسی طرح بارہویں صدی عیسوی میں بھاسکر چاریہ نے اس طریقۂ حساب کی طرف جس کو کیلکیولس کہتے ہیں، اشارہ کیا ہے، لیکن اس سے آگے نہ بڑھا،

جو کچھ اوپر بیان ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے علوم میں کسی قسم کی جدت نہیں پیدا کی، جب اُن کی ذاتی تحقیقات کچھ نہیں ہے تو پھر اُن کے علوم سے بحث کرنا

اور محض ایسے مسائل پر ذکر نا جو عربوں اور یونانیوں کی تحقیقات سے لئے گئے ہیں، محض لاحاصل ہے، اگرچہ ہندو علوم میں کم ہیں لیکن عملی طور پر انھوں نے بہت بڑی ترقی کی"۔

عبارتِ بالا میں عربوں سے مانسیو موصوف کی مراد "مسلمان" ہیں، یہ غلط اصطلاح دوسرے یورپین مصنفوں کی زبان و قلم پر بھی چڑھی ہوئی ہے، ہندوستان کے ساتھ قدیم عرب تعلقات کا جو ذکر مصنف نے کیا ہے، اس سے اس کا اشارہ اس زمانہ قبل اسلام کی طرف ہے، جب مشرق و مغرب یا ہندوستان و چین اور روم و یونان کے درمیان عرب تاجر سفیر اور متوسط کی خدمت انجام دیتے تھے، یورپ کا مال یہی ہندوستان اور چین لے جاتے تھے، اور وہی ہندوستان کی مصنوعات کو یورپ کے ہاتھوں میں دیتے تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ قدیم ہندوستان، قدیم عرب کے تمدن سے کسی نہ کسی قدر متاثر ہو،

اس تاثر کے آثار و علامات ہندوستان کے سنگی کتبات اور تحریری اوراق دونوں میں ملتے ہیں، ہندوستان کی پرانی سے پرانی تحریر اس وقت وہ خطوط اور کتبے (انسکرپشن) ہیں، جو مگدھ (بہار) کے موریہ خاندان کے راجہ اسوکا (۲۵۳ ق م) کے مذہبی فرامین کی صورت میں ہندوستان کے پورے طول و عرض میں پشاور سے گجرات و دکن تک پہاڑوں پر اور لاٹوں پر کندہ ملتے ہیں، محققین فنِ خط (کیرکٹر) کا بیان ہے کہ ہندوستان کا یہ قدیم خط سامی خطوط کی شاخ آرامی خط سے ماخوذ ہے، لیکن خطوط کی زبان پالی ہے، یعنی قدیم بہار کی زبان جو بودھ کی مذہبی زبان تھی،

تمام آرین تحریریں بائیں سے دائیں طرف لکھی اور پڑھی جاتی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے

کہ یہ کتبے سامی تحریروں کی طرح داہنے سے بائیں طرف لکھے ہوئے ہیں، اور اسی طرح سے پڑھے جاتے ہیں، یہ اس بات کا دوسرا ثبوت ہے کہ ہندوستان کا قدیم سرمایۂ تحریر اپنے وجود و بقا میں عربوں کا ممنون کرم ہے۔[1]

ہمارے دعویٰ کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ عجیب تر اور نادر تر وہ دستاویز ہے جو مہابھارت[2] کی عدالت عالیہ سے ہم کو مل سکی ہے، ستھیارتھ پرکاش کے گیارہویں سمولاس میں سوامی دیانند لکھتے ہیں:۔

"مہابھارت میں جب کوروں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوں کو اس کے اندر پھونک دینا چاہا تو بدر جی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا، اور یدھشٹر نے اسی عربی زبان میں اُن کو جواب دیا"۔

سوامی جی کا بیان اگر صحیح ہے کہ ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہم ملچھیوں کی زبان کسی زمانے میں اس قدر "مقدس" بھی تھی کہ دیوتاؤں کے بڑے بڑے اوتار اُس کو بولتے تھے، اور اس میں ایک دوسرے سے راز کی باتیں کہتے تھے،

بہرحال یہ قصے تو تاریخ کی یاد سے پہلے کے ہیں، خدا جانے اب کی بدگمان دنیا ان کہانیوں کو سچ بھی مانے گی یا نہیں، اس لئے ہم کو وہ داستان چھیڑنی چاہئے جو تاریخ کے ہوش کی باتیں ہیں مسلمانوں کے آفتاب دولت نے ہندوستان کے افق سے طلوع ہو کر ملک میں جو روشنی پھیلائی، ہم چاہتے ہیں کہ تاریخ کے منشوری شیشہ کے ذریعہ سے اس کی تحلیل کر دیں تاکہ ہر صاحب بصیرت کو نظر آجائے کہ واقعہ کیا ہے، مسلمانوں نے ہندوستان آکر جن علوم کو پھیلایا، اور جس تعلیم کو

---

[1] تاریخ الادب ج ۱ ص ۵، شائع کردہ جامعہ مصریہ (اجپشین یونیورسٹی) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۲۴ ص ۱۵۹، طبع ۱۱۔ [2] پہلا پرب ادھیاے ص ۱۴۷

رائج کیا، ترتیب وار ہم اس کی تشریح کرنی چاہتے ہیں، اس کی بہتر اور آسان صورت یہ ہے کہ اس عہد کے ہندو مصنفین کا جائزہ لیا جائے، اور دکھایا جائے کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں اُن کی کیا تعداد تھی، کیا حیثیت تھی، اور کیا نوعیت تھی، اس پچھلے زمانہ کی تعلیمی حالت کی تشریح کے لئے اُس کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں،

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ مسلمانوں کے عہد سے پہلے ہندوستان میں مصنفین موجود تھے اور اُن کی خاصی تعداد تھی، اُن کی ابتدار بودھ مت کے زمانۂ عروج سے ہوتی ہے، قدیم ہندوستان میں کہیں کہیں جو مدارس قائم تھے، اُن کا ذکر چینی سیاحوں نے کیا ہے، وہ اسی مذہب کی درسگاہیں تھیں، شنکرآچاریہ نے بدھ اور جین مت کو مٹاکر جب ویدک دھرم کا دوبارہ پرچار کیا، اور سنسکرت نے بدھ والوں کی پالی کو ہٹاکر خود اُس کی جگہ لینی شروع کی، تو اس جوش و ہیجان نے طبیعتوں کو تصنیف و تالیف کی طرف رجوع کیا، اور سنسکرت زبان جو پہلے صرف عاؤں بھجنوں اور منتروں پر مشتمل تھی، وہ علوم و فنون پر بھی حکمراں ہوئی، تاہم مذہبی کتابوں سے قطع نظر کرکے اس کا خالص سرمایہ تحریری اتنا بھی نہیں جو چند الماریوں کی زینت بن سکے، ہر علم پر تھیالوجی اور افسانوں سے ملی جلی دو تین کتابیں تھیں، اس دعویٰ کی دلیل سنسکرت دان علمائے اسلام[1] اور مستشرقین یورپ[2] کے بیانات ہیں، اور سنسکرت کی سرزمین کی موجودہ پیداوار[3] علمی ذخیرہ، مسلمانوں نے اُن کو بتایا کہ افسانہ اور کہانی سے الگ کرکے علوم و فنون پر خالص علمی کتابیں بھی لکھی جاسکتی ہیں، اکثر قدیم تصنیفات صرف برہمنوں کی ملکیت تھیں، وسعت تعلیم نے برہمنوں کو چھوڑکر ہندوستان کے دوسرے طبقوں کو بھی یہ علمی آزادی بخشی، اوّلاً جیسا کہ ہر نئی چیز کا

---

[1] بیرونی کی کتاب الہند اور ابوالفضل کی آئین اکبری کا دفتر سوم [2] مثلاً تمدن ہند، انسائیکلوپیڈیا، لفظ انڈیا [3] دکن کالج پونہ میں سنسکرت کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے، مذہبی کتابوں اور مکرر نسخوں کو ملاکر ۵۰۰ کتابوں کی تعداد ہے،

قاعدہ ہے مسلمانوں کی زبان سیکھنا برہمنوں نے ناجائز قرار دیا تھا، اشلوک بنائے گئے کہ مسلمانوں کی زبان سیکھنا، اور جینیوں کے مندر میں جانا مست ہاتھی کے آگے پڑ جانے سے زیادہ خطرناک ہے[1]، تاہم جیسا کہ ہم نے اوپر بہ تفصیل بیان کیا ہے کہ رفتہ رفتہ یہ تعصب ہندوؤں سے کیونکر دور ہوا، اور سینکڑوں برس کے بعد سکندر لودی کے زمانہ سے فارسی تعلیم نے اُن میں عام اشاعت پائی، اسلامی علوم میں سب سے پہلے ہم تاریخ کا ذکر کرتے ہیں،

ہندو مؤرخین

تاریخ وہ فن ہے جس کی طرف قدیم ہندو دماغ نے کبھی توجہ ہی نہیں کی، لیبان تو کہتا ہے کہ اُس کے لئے ہندوؤں کا دماغ ناموزوں معلوم ہوتا ہے[2]، آریہ ورت انسانیت کا نہایت قدیم گہوارہ ہے، اگر یہاں انسانوں کے پچھلے تاریخی کارناموں کو محفوظ رکھنے کی لیاقت ہوتی تو بہت سے قدیم عقدے آج ہمارے لئے پیچیدہ نہ ہوتے، ہندوستان کی پرانی داستان سننے کے لئے ہم کو یونان اور چین کے سیاحوں کے پاس جانا پڑتا ہے، خود ہمارے گھر میں اپنی دنیا کی پچھلی زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، ویدوں کے کہنہ اوراق، منو شاستر کے قانونی دفعات، مہا بھارت کے رنگین صفحات، رامائن کی پُر درد کہانیاں اور اپنشد کی پیاری پیاری باتیں اُن میں سے کوئی چیز قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ہم کو پتہ نہیں دیتی،

آغازِ عالم سے زمانہ اسلام تک ہندوستان میں جو سیاسی انقلابات ہوئے، ملک کے صوبہ صوبہ پر جو حکمراں فرماں روائی کر رہے تھے، بڑے بڑے جو عالم فاضل اور پنڈت پیدا ہوئے

[1] ستیارتھ پرکاش سمولاس ۱۱، [2] تمدنِ ہند ص ۳۳۹)

اُن کے تاریخی حالات کا آج پتہ لگانا چاہو، صحیح تاریخ ولادت، وفات اور سوانح حیات جاننا چاہو تو قیاس کے سوا کوئی روشنی تمھاری رہ نمائی نہ کر سکے گی، پرانوں سے صرف رشیوں اور منیوں کے کچھ کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، لیکن وہ تاریخ نہیں،

لیکن اسی غیر تاریخی ملک میں جب مسلمانوں کا قدم آتا ہے، تو یہاں کا زمین و آسمان بدل جاتا ہے "آریہ ورت کا ذرّہ ذرّہ چمک اٹھتا ہے، مسلمان سلاطین امرا، علما، شعرا، اور دوسرے اکابر رجال کو چھوڑ کر مسلمان مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے خود ہندو راجاؤں، پنڈتوں، شاعروں اور امیروں کے حالات اس قدر لکھے ہیں کہ بہ آسانی دعوی کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہزارہا سال جو ہندو قوم پر گذرے، اس زمانہ کے (میتھالوجیکل) تمام ہندو علما اور امرا کی فہرست جتنی طویل بنائی جاسکتی ہے، مسلمانوں کی آمد کے بعد صرف آخری ۵۰۰ برس کے عرصہ میں اس سے دو چند بلکہ سہ چند بڑی فہرست مع احوال تاریخی پیش کی جاسکتی ہے، صرف تیموریوں کے زمانہ میں جو ہندو امرا اور علما گذرے ہیں، اُن کے حالات و بیانات دو تین جلدوں میں سما سکتے ہیں، ہندو فارسی شعرا کے نام و سوانح باایں ہمہ قومی بیگانگی ہمارے فارسی تذکرے جو خاص مسلمانوں کے قلم سے نکلے ہیں، اس قدر سنا سکتے ہیں کہ آپ سنتے سنتے گھبرا اٹھیں گے،

آج یورپ کے دعوائے آزادی و مساوات کے شور و ہنگامہ نے دنیا کو چھا لیا ہے، ممالک مفتوحہ میں اشاعت تعلیم کی یہ کثرت ان کا بیان ہے کہ صرف ہمارے دور حکومت کی خصوصیت ہے، ہم کہتے ہیں بجا ہے، اور درست ہے، جاؤ اور انگریز قلم کی تصنیفی فہرست کا ایک ایک ورق پڑھ ڈالو، ان کی انسائیکلوپیڈیائیں الٹ ڈالو، ان کی تاریخ اور تذکروں کو چھان ڈالو، اس تفحص، اس تلاش اور اس محنت کے بعد ہم کو بتاؤ کہ مغرور انگریز قلم کے آب حیات نے تمھارے

کتنے علما، فضلا اور شعرا کے نام زندہ کئے ہیں، اور کتنے اس قابل سمجھے گئے ہیں کہ حکمراں قوم اپنی شاہی زبان میں، اور اس پریس کے عہد میں اُن کے تذکرے لکھے[1] پھر کیا ظالم، بُت شکن، اور میچھ مسلمانوں کی یہ علمی آزادی و مساوات نہ سمجھی جائیگی کہ انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوموں کے فضلا کو ایک نظر سے دیکھا، اور اس حکمراں قوم نے اپنی شاہی زبان کے علمی دربار میں دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی،

علاوہ ازیں مسلمانوں کے تاریخی ذوق نے ہندوؤں میں اس فن کی تعلیم و ترقی کا وہ جوش پیدا کیا کہ آج بھی اگر یورپ اور ہندوستان کے کتب خانوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک بڑا گراں قیمت سرمایہ فراہم کیا جاسکتا ہے، ہمارے سامنے تو اس وقت یورپ اور ہندوستان کے مادی کتب خانے نہیں، صرف حیدرآباد، بانکی پور، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، اور لندن کے کتب خانوں کی فہرستوں کے معلومات ہیں تاہم انھوں نے ہندو زبان کے فارسی مصنفین کے (جو عہد اسلامی کی علمی و تعلیمی کوششوں کے نتائج عملی ہیں) حالات بہم پہنچائے ہیں، وہ کس قدر حیرت افزا ہیں، سب سے پہلے ہم کو اس عہد کے ہندو مورخین کا تذکرہ کرنا ہے،

راج ترنگنی | پیش نظر مواد جہاں تک ہماری اعانت کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے پہلی تاریخ جو کسی ہندی قلم نے لکھی، وہ کشمیر کی تاریخ راج ترنگنی ہے، یہ کتاب ہندی میں سلطان زین العابدین والی کشمیر کے زمانہ میں لکھی گئی تھی[2] (سلطان ۸۲۶ھ میں تخت نشین ہوا تھا) مصنف کا نام کلہانا ہے، اکبر جب کشمیر گیا ہے تو یہ کتاب اس کے دربار میں پیش کی گئی، اور اس کے حکم سے اس کا فارسی میں ترجمہ ہوا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس میں کشمیر کے متعلق پانچ ہزار برس کا حال لکھا ہے، والیانِ کشمیر کے درباروں میں تاریخ نویسی کا خاص

---

[1] گذشتہ تاریخ سے بحث نہیں بلکہ زمانۂ رواں کا سوال ہے، [2] تاریخ فرشتہ نولکشور ج ۲ ص ۳۴۴،

عمدہ تھا، اور یہ کتاب اسی کوشش کا ثمرۂ نورس تھی،[۵]

اصل متن کتاب فرانس اور ہندوستان میں چھپ گئی ہے، اور فارسی نسخہ بھی مطبوع ہے،

لال جی داس | بابالال گرو شاہجہاں کے زمانہ میں ایک عارف جوگی تھے، شہزادہ داراشکوہ انہی کا مرید تھا، لال جی داس بابالال گرو کا چیلا تھا، بابا کا سنہ پیدایش ۱۰۱۴ھ ہے، ۱۰۵۹ھ تک وہ زندہ تھے، لال جی داس نے ۱۰۵۸ھ میں گرو کے حالات و ملفوظات کو فارسی میں جمع کیا، گورنمنٹ کلیکشن لائبریری میں اس کا ایک نسخہ ۱۴ سنہ جلوس عالم شاہی کا لکھا ہوا موجود ہے،

نبوالی داس | شہزادہ داراشکوہ کا میرمنشی تھا، بعضوں نے اس کا نام بھوانی داس لکھا ہے، کتب خانہ آصفیہ کے فہرست نویس نے ولی رام گوسائیں داراشکوہی نام بتایا ہے، نبوالی اور بھوانی تو کتابت کی تصحیف ہے، ولی اس کا تخلص نام میں داخل ہوگیا ہے، اُس نے شاہانِ دہلی کی تاریخ لکھی ہے، کتاب کا نام راجاولی ہے، کتاب مستند ہے، اور بہت سی معتبر کتابوں میں اُس کے حوالے ہیں، اُس کے قلمی نسخے اکثر کتابخانوں میں موجود ہیں،

رائے بندرابن | رائے بہارا مل کا لڑکا تھا، بہارا مل نے ۲۰ سنہ جلوس شاہجہانی میں حسنِ خدمات کے صلہ میں رائے کا خطاب پایا تھا، داراشکوہ نے اُس کو اپنا دیوان مقرر کیا تھا، اس کے بیٹے بندرابن کو عالمگیر نے تربیت دی، اور رائے کا خطاب بخشا، بندرابن نے لب التواریخ کے نام سے ایک بہترین کتاب یادگار چھوڑی ہے،

ایسر داس | قوم ناگر، پٹن کا باشندہ تھا، وہ خود کہتا ہے کہ بچپن سے ۳۰ سال کی عمر تک وہ قاضی شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب المتوفی سنہ ۱۰۹۶ھ کی خدمت میں حاضر ہوکر تحصیل علم

---

[۵] آئین اکبری نولکشور جلد ۲ ص ۱۸۱ [۵۲] دکن کالج لائبریری کیٹلاگ ص ۱۹۹،

کرتا رہا ہے، امرا و اعیانِ دولت جو قاضی صاحب کی خدمت میں آیا کرتے تھے، اُون کے مُباحثات اور گفتگوؤں کو بغور سنتا تھا، اور اُن سے فوائد حاصل کرتا تھا تکمیلِ علم کے بعد ایسر داس شجاعت خاں حاکم گجرات کی وساطت سے جودھپور کا امین مقرر ہوا، وہ ہاتھ جو تیس برس تک صرف قلم سے مانوس رہا تھا تلوار کے قبضہ سے بھی مانوس ہو گیا، اُس نے میدانِ جنگ میں کامیابی حاصل کی، بادشاہ کی طرف سے میرٹھ میں اُس کو جاگیر عنایت ہوئی، اور دو بست و نیم صدی افسر مقرر ہوا، عہد عالمگیری کے امن و امان میں ہمارا یہ فوجی افسر پھر وہی ۲۰ سال کا جوان طالب علم نظر آتا ہے، اور فتوحاتِ عالمگیری نام ایک بڑی تصنیف اپنی یادگار چھوڑتا ہے،

بھیم سین کایستھ | رگھو نندن داس اس کے باپ کا نام تھا ۲۳ سنہ جلوس شاہجہانی (۱۰۵۹ھ) میں بُرہان پور دکن میں پیدا ہوا تھا، اس کا ایک عزیز بھگنداس عالمگیر کے دربار میں دیوان تھا، اور دیانت رائے کے خطاب سے ممتاز تھا، بھیم سین نے بندیلہ کے حاکم راؤ دلپت کی سرکار میں نوکری کی، راؤ دلپت دکن کی لڑائیوں میں نہایت کارآمد سردار ثابت ہوا تھا، عالمگیر نے راؤ کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنا دیا،

بھیم سین گو کایستھ تھا لیکن قلعۂ نالڈرک کی قلعہ داری اُس نے نہایت خوبی سے کی، سنہ ۱۱۲۰ھ میں نوکری سے مستعفی ہو کر اپنے وطن میں گوشہ نشین ہو گیا، اور اب موقع آیا کہ تلوار کے بجائے قلم کا حق ادا کرے، دلکشا کے نام سے عہد عالمگیری کی تاریخ لکھی ہے، جو اب تک موجود ہے،

نرائن کول عاجز | باشندۂ کشمیر اپنی تصنیف کے دیباچہ میں لکھتا ہے، کہ ایک مدت سے شرفاے کشمیر کا تقاضا تھا کہ اُن کے وطن کی ایک تاریخ لکھدوں، بالآخر بزرگانِ وطن

کے اصرار سے مجبور ہوکر میں نے یہ بار امانت اٹھالیا، اسی زمانہ میں عارف خاں کشمیر کے دیوان اور نائب صوبہ دار کے حکم سے ملک حیدر نے سنسکرت سے کچھ مواد فراہم کیا تھا، وہ میرے حوالہ کیا گیا، میں نے اُس کو دیکھا، تو قابلِ اصلاح نظر آیا، بالآخر اصل سنسکرت سے مقابلہ کرکے اُسکو بھی اپنی کتاب میں شامل کرلیا، ۱۱۲۲ھ میں تاریخ کشمیر تکمیل کو پہونچی،

منشی ہیرامن گردھرداس | معتمد خاں کے منشی تھے، معتمد خاں نے بھائیوں کی لڑائی میں عالمگیر کا ساتھ دیا تھا، امن و امان کے بعد ۱۰۷۰ھ میں وہ گوالیار کا حاکم مقرر ہوا، منشی ہیرامن نے اس تقریب سے اسی زمانہ میں گوالیارنامہ کتاب لکھی جس میں راجہ بکرماجیت کے ۲۳۲ برس بعد سے لیکر معتمد خاں کی حکومت کے زمانہ تک گوالیار کی تاریخ مرتب کی،

جسونت رائے | جسونت رای ولد بھگوررائے ولد سندرداس منشی، لاہوری فارسی زبان کا فاضل اور شاعر تھا، پہلے پردل خاں کے یہاں نوکر تھا ۱۱۴۸ھ میں کرنال گیا، اور نواب سعادت اللہ خاں کے دربار میں رسائی پیدا کی اور ایک جیّد قصیدہ پیش کیا، نواب نے قدردانی کی، اور جسونت رائے نے وہیں سکونت اختیار کرلی، اور سعیدنامہ کے نام سے نواب سعادت اللہ خاں اور اُن کے خاندان کی تاریخ لکھی،

منشی ٹھاکر لال | ولد بھوج داس کایستھ، ماتر ضلع برہان پور کا رہنے والا تھا ۱۱۲۵ھ میں اس نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام "دستور العمل شہنشاہی" رکھا، اس میں اُس نے ہندوستان اور دکن کے واقعات بطور فہرست ترتیب دیئے ہیں،

منشی سوجان رائے کھتری | یہ شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ میں تھا، خلاصۃ التواریخ کے نام سے ایک نہایت ضخیم اور مفصل تاریخ ابتدائے عالم سے لے کر شہنشاہ اورنگزیب کے عہد تک لکھی، اور اس کوشش اور محنت سے لکھی کہ وہ مستند کتابوں کی فہرست میں داخل ہے، منشی موصوف اپنے کو

پٹیالہ کا رہنے والا بتاتے ہیں، اس کتاب کا قلمی نسخہ حیدرآباد اور لندن کے کتب خانہ مشرقی میں موجود ہے
۱۱۰۰ھ میں وفات پائی،

بندرابن داس | بندرابن داس بہادر شاہی، بہادر شاہ اول کے درباری متوسلین میں تھا، ۴۲ جلوس عالمگیری مطابق ۱۱۱۵ھ میں اُس نے لب التواریخ نام کتاب لکھی، اس میں ہندوستان کی تاریخ آریوں کے قدیم زمانہ سے لیکر عہد عالمگیری تک ترتیب دی ہے، عربی آمیز فارسی عبارت اس خوبی سے لکھی ہے کہ ایرانی قلم کا اس پر دھوکا ہوتا ہے، مقدمہ میں اپنے ماخذ گنائے ہیں، واقعات کا نہایت استقصار کیا ہے، اس کتاب کا ایک نادر نسخہ ۱۲۳۸ھ کا لکھا ہوا، دیسنہ (بہار) کی اصلاح لائبریری میں موجود ہے،

جگجیون داس | ولد منوہر داس باشندۂ گجرات، محمد معظم شاہ کی سرکار میں ڈاک کا مہتمم تھا، چونکہ خفیہ سرکاری کاغذات اس کی نظر سے گذرتے تھے، اس لئے اُس کو واقعات کے جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا، ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ اول نے لاہور کے دربار میں باریابی بخشی، اور وقائع نگاری کی خدمت پر اس کو مامور کیا، ۱۱۲۰ھ میں اس نے اپنی محنتوں کا ثمرہ منتخب التواریخ کے نام سے لکھ کر پیش کیا، اُس کے صلہ میں دربار شاہی سے خطاب و خلعت و انعام حاصل ہوا،

کامراج | ولد نین سنگھ بھیپوند ضلع اٹاوہ اس کا وطن تھا، شہزادہ محمد اعظم کی سرکار میں مالوہ میں اس کو حاضری کا موقع ملا، اعظم الحرب کے نام سے اس نے شہزادہ کی لڑائیوں کے حالات لکھے، کامراج دیباچہ میں لکھتے ہیں: کہ بہت سے واقعات خود شاہی وقائع نگار نے اس کے لئے بہم پہنچائے، مصنف نہایت اخلاص اور عقیدت مندی کے ساتھ اپنے کو تیموری دربار کا پشت سے نمک خوار بتاتا ہے،

کشن چند اخلاص کھتری | شاہجہان آبادی، شاگرد مرزا عبدالغنی قبول کشمیری، اس کا باپ جیون داس

فارسی کا شاعر تھا، کشن چند نے ہمیشہ بہار کے نام سے ١١٣٦ھ میں تذکرۂ شعراء لکھا، اس میں اکبر سے لیکر محمد شاہ کے عہد تک کے فارسی شعراء کے حالات و سوانح ہیں، یہ تذکرہ اس قدر مستند ہے کہ علامہ آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ کی تالیف میں اس کو اپنا ماخذ قرار دیتے ہیں، اور علانیہ اس سے استفادہ کا اعتراف کرتے ہیں، اس کتاب کے نسخے بانکی پور اور حیدرآباد کے کتب خانوں میں ہیں،

لال رام | باپ کا نام دولہ رام اور دادا کا نام رائے کنجن، رائے کنجن، عالمگیر کے عہد حکومت میں کسی عہدہ پر ممتاز اور رائے کے خطاب سے مشرف تھا، دولہ رام بھی رائے کے خطاب سے مخاطب اور عہدہ دارانِ شاہی میں داخل تھا، خود لالہ رام محمد شاہ کی سرکار میں نوکر تھا، ١١٤٥ھ میں تحفۃ الہند ایک مستند تاریخی کتاب لکھ کر دربار شاہی میں تحفۃً پیش کی،

خوشحال چند | کسی زمانہ میں شاہ عالمگیر کے شاہی دربار کا دیوان تھا، ١١٦٤ھ اسکی تاریخ وفات ہے، اس کی وفات کے بعد اس کی جگہ اس کے بیٹے کو ملی، تاریخ نادر الزمانی خوشحال چند کی بہترین تصنیف ہے،

میرلال خوشدل | یہ غالباً دکن کا باشندہ ہوگا، قطب شاہیۂ دکن کی اس نے منظوم تاریخ لکھی ہے، زمانۂ وجود معلوم نہیں، دسویں صدی ہجری کے آخر میں یا گیارہویں صدی کے اول میں اس کو ہونا چاہیے، قطب شاہیہ کا زمانہ حکومت یہی ہے، یہ کتاب بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے،

مہاراجہ کلیان سنگھ | کلیان سنگھ کا دادا رائے ہمت سنگھ دہلی کا ایک کایستھ، امیر الامراء صمصام الدولہ کی سرکار میں دیوان تھا، اس کے بیٹے شتاب رائے نے بڑا عروج حاصل کیا، دربار شاہی سے ممتاز الملک مہاراجہ شتاب رائے بہادر منصور جنگ کے نام سے مخاطب تھا، اور سلطنت کی طرف سے صوبہ بہار کا ناظم (گورنر) مقرر ہوا تھا، خود بھی فاضل تھا، اور فضلائے وقت کا قدرداں بھی تھا، ١١٨٧ھ میں

اُس نے وفات پائی، تو اس کا لڑکا انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر تہور جنگ
کے نام سے صوبہ کی نظامت (گورنری) پر مامور ہوا، یہ بھی اپنے باپ کی طرح علم دوست تھا،
خلاصۃ التواریخ اس کی تصنیف ہے، جس میں امیر تیمور سے لے کر اپنے زمانہ تک کے حالات
لکھے ہیں، اس کی دوسری تصنیف واردات قاسمی ہے، جو نظامت بنگالہ کی تاریخ ہے،

شیوداس لکھنوی | شیوداس نے شاہنامۂ منور کلام کے نام سے فرخ سیر (۱۱۲۴ھ) اور
محمد شاہ (۱۱۳۱ھ) کے زمانہ تک کے حالات لکھے ہیں، دربار شاہی میں یہ بہت دنوں
تک منشی (سکریٹری) کے عہدہ پر ممتاز رہا ہے،

روپ نرائن | ولد ہری رام کھتری متوطن سیالکوٹ، اس نے ۱۱۲۹ھ میں ہندوؤں
کے مقدس مقامات کے حالات و کیفیات لکھی، کتاب کا اصلی نام برج مہاتم اور تاریخی نام مخزن العرفان ہے،

رائے چترمن | قوم کائستھ سکینہ، اس نے وزیر الممالک غازی الدین خان کی فرمائش سے ہندوستان
کی تاریخ لکھی، اور اس کا نام چار گلشن رکھا، یہ کتاب چار گلشنوں پر منقسم ہے، گلشن اول
بادشاہان ہند کے حال میں، گلشن دوم صوبوں کے حال میں، گلشن سوم دہلی سے چاروں
طرف بڑے بڑے شہروں تک جو سڑکیں گئی ہیں، اُن کی پیمایش، اور ایک ایک منزل کا حال
(یہ باب اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے) گلشن چہارم میں ہندو فقیروں اور جوگیوں کے حالات
اور سلسلے، ۱۱۷۳ھ میں یہ کتاب اتمام کو پہونچی،

درگاداس | باپ کا نام شیوشنکر داس، سفینۂ عشرت ایک فارسی تذکرہ کا مصنف ہے،
۱۱۷۵ھ میں یہ تذکرہ تالیف پایا، عجب نہیں کہ یہ حزیں کا شاگرد ہو،

انندروپ | ضلع نارنول (مدراس) کا ایک برہمن تھا، کھالوجی بھونسلا کے دربار میں کچھ
دنوں نوکر رہا تھا، نصیر الملک نصیر جنگ کے معاملہ میں ناگپور سے الہ آباد آیا، یہاں اُس نے ۱۱۲۲ھ میں

میزان دانش لکھی، جو جگ کے اعتبار سے چار حصوں میں منقسم ہے،

منالال | ولد بہادر سنگھ اُس نے شاہ عالم کے دورِ حکومت کی تاریخ لکھی ہے، کتاب کا آغاز سنہ ۱۱۸۵ھ سے شروع ہوتا ہے، جب شاہ عالم نے الہ آباد سے دلی کا رُخ کیا ہے،

رائے کیول رام | ولد رگھوناتھ داس اگروال، اطراف دلی میں قصبہ کسنا اس کا وطن تھا، سنہ ۱۱۸۴ھ میں اُس نے تذکرۃ الامرا نام ایک کتاب لکھی، دیباچہ میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب شاہی روزنامچوں اور وقائع ناموں سے مرتب کی گئی ہے،

دلپت رائے | مخاطب بہ راؤ دلپت سنگھ، اس کا مولد احمد آباد گجرات ہے، اس کا باپ گلاب رائے یہاں متصدی تھا، دلپت رائے عربی، فارسی، سنسکرت، پراکرت اور بھاکا زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، ۵۰ برس کی عمر میں جے نگر (جے پور) آیا، اور مہاراجہ مادھو سنگھ کے حکم سے ملاحت مقال لکھنی شروع کی، اور سنہ ۱۱۸۲ھ میں مہاراجہ کے مرنے کے بعد اس کو تمام کیا،

بندرابن خوشگو | قوم ویش، باشندہ متھرا، اپنے زمانہ کے مشہور اساتذہ سخن کا شرفِ تلمذ اسکو حاصل تھا، سراج الدین علی خان آرزو، مرزا عبدالقادر بیدل، محمد افضل سرخوش، اور شیخ سعد اللہ گلشن کی صحبتیں اٹھائی تھیں، نظم و نثر دونوں میں کمال حاصل تھا، سفینۂ خوشگو اور تذکرۃ المعاصرین دو تذکرے لکھکر، نواب عمدۃ الملک امیر خان کی سرکار میں پیش کئے، نواب نے قدر دانی کی، اور دو روپیہ روزانہ وظیفہ مقرر کیا، نواب کی وفات کے بعد ترکِ دنیا کرکے عظیم آباد پٹنہ میں اقامت اختیار کی، سنہ ۱۱۷۰ھ میں وفات پائی، کتب خانہ بانکی پور میں اس تذکرہ کا جو نسخہ ہے، وہ علامہ آزاد بلگرامی کا مملوکہ ہے، اور انہی کی فرمایش سے سنہ ۱۱۸۳ھ میں نقل کیا گیا ہے، گل رعنا کے موئف نے اس تذکرہ سے فائدہ اٹھایا ہے،

پنڈت کرشنانند | پنڈت انند گھن کا بیٹا تھا، اُس نے تاریخ شاہان ہند کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس کا متعین زمانہ نہیں معلوم لیکن سنہ ۱۸۰۳ء یعنی تقریباً سنہ ۱۱۷۳ھ میں موجود تھا،

سنگھ | قوم کھتری، اس نے سکھ فرقہ کی تاریخ سنہ ۱۱۷۸ھ سے اپنے زمانہ تک لکھی ہی، اس کو اس کتاب کی تالیف میں لالہ عجائب سنگھ سے بہت مدد ملی، کتاب کا نام رسالہ نانک شاہی ہی سنہ تالیف معلوم نہیں.

رگھوناتھ | غالباً مرہٹہ ہے اُس نے سنہ ۱۷۶۴ء میں حالاتِ مرہٹہ کے نام سے مرہٹوں کی تاریخ لکھی

شیو پرشاد | نواب فیض اللہ خاں روہیلہ کی سرکار میں نوکر تھا، سنہ ۱۱۹۰ھ میں اس نے تاریخ فیض بخش کے نام سے روہیلہ پٹھانوں کی تاریخ لکھی،

تکمند رائے | اُس نے راجہ ہلکر کے سیاسی خطوط کا فارسی میں ترجمہ کیا، ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، خطِ ہولکر نام ہے، سنہ ۱۱۹۰ھ تالیف ہے،

موہن لال انیس | ولد رائے تولارام قانون گو، قوم کایستھ، باشندۂ لکھنؤ، فارسی شاعری میں مرزا فاخر مکین کا شاگرد تھا، انیس الاخبار کے نام سے سنہ ۱۱۹۳ھ میں اس نے مرزا مکین اور اُن کے تلامذہ کا ایک دلچسپ تذکرہ لکھا، اس تذکرہ میں مرزا مکین کے چند ہندو شاگردوں کے بھی حالات ہیں،

ہرنام سنگھ | ولد کورداس سنگھ، ملانوہ، نواح لکھنؤ کا باشندہ سرسوتی برہمن تھا، بچپن ہی عین الدین خان حاکم بریلی کے زیرِ سایہ رہا، تاریخ سعادت جاوید اس کی بہترین یادگار ہے، عین الدین خان کا زمانۂ حکومت بریلی سنہ ۱۱۹۵ھ سے سنہ ۱۱۹۹ھ تک ہے،

رنچھورجی | ولد امرجی دیوان رنچھورجی نے سنہ ۱۸۲۴ء مطابق سنہ ۱۱۹۷ھ میں تاریخ سورت لکھی اس میں جوناگڑھ اور ناگر قوم کے حالات درج کئے ہیں،

لچھمی نرائن شفیق | لاہور وطن تھا، اس کا دادا عالمگیر کے ساتھ مہم دکن میں گیا، اور اورنگ آباد دکن میں سکونت اختیار کر لی، اس کا باپ رائے منسارام نواب آصف جاہ کا دیوان تھا، لچھمی نرائن شفیق ان ہندو فضلاء میں سے ہے جن کی قابلیت اور علم پر زمانہ فخر کر سکتا ہے، علامہ آزاد بلگرامی کا شاگرد، اور عالیجاہ بہادر کے سلک ملازمین میں داخل تھا، تاریخ کا ذوق استاد آزاد سے وراثت میں پایا تھا، چنانچہ اس فن میں اس کی متعدد تالیفات ہیں، گل رعنا اور شام غریبان دو شعراء کے تذکرے ہیں، ۱۲۰۴ھ میں حقیقتہائے ہندوستان لکھی، خلاصۃ الہند بھی اسی کی تصنیف ہے، تواریخ آصفی، اس کی پانچویں تالیف ہے، لیکن سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف بساط الغنائم ہے، جس میں اُس نے مرہٹوں کی تاریخ قلمبند کی ہے،

ہرسکھ رائے، | جیون داس کا بیٹا اور بسنت رائے کا پوتا، قوم کھتری، وطن لاہور، اس نے اپنے ماموں سری نارائن کے مشورہ سے ۱۲۱۲ھ میں مجمع البحار لکھنی شروع کی، اور ۱۲۲۰ھ میں اس کو اختتام کو پہنچایا، اس سے چند سال پیشتر ۱۲۱۱ھ میں زبدۃ القوانین نام ایک نہایت کارآمد اور پُر معلومات کتاب لکھ چکا تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا،

منشی مُنالال | ولد منشی بہادر سنگھ، دفتر خالصۂ شاہی کے منشی تھے، شاہ عالم کے روزنامچہ لکھنے پر مامور تھے، یہ روزنامچہ شاہی، کتب خانۂ بانکی پور میں موجود ہے، اس سے منشی موصوف کی لیاقت تحریر اور قوت مشاہدہ ثابت ہوتی ہے، روزنامچہ کا آخری ورق شاہ عالم کے صحیفۂ حیات کے اختتام (۱۲۲۱ھ) پر تمام ہوتا ہے

رائے امرسنگھ خوشدل | ولد جیون رام کائستھ، اصلی وطن کڑہ مانک پور تھا، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں سکندر غازی پور کا ناظم (حاکم اعلیٰ) تھا، امر سنگھ نہایت لائق اور فاضل تھا، تعلیم سے فارغ ہو کر مہاراجہ اجیت سنگھ، راجۂ بنارس کی سرکار میں نوکر ہوا، اور آخر سرکار کمپنی کی طرف

سے علی گڈھ کا ناظم مقرر ہوا، اس نے تاریخ فرمان روایانِ ہنود لکھی ہے، جو آغاز سے لیکر سلطان علاء الدین غوری کے زمانہ پر ختم ہوئی ہے، اس کی دوسری تاریخی تصنیف بزمِ خیال ہے جس میں خاص مشاہدات اور احوال موجودہ کی بنا پر، اپنے ملک کے حالات لکھے ہیں، اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ۱۲۱۰ھ تک ساتھ ساتھ انگریزوں کے حالات بھی لکھا گیا ہے، ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی،

دولت رائے | منشی دولت رائے کائستھ، بہاول خان المتوفی ۱۲۲۴ھ بانی ریاستِ بہاولپور کے مصاحبِ خاص تھے، بہاولپور کا خاندان عباسی ہے، اس مناسبت سے مرآۃ دولتِ عباسیہ کے نام سے بہاولپور کی تاریخ لکھی، ۱۸۵۰ء میں یہ کتاب چھاپی گئی تھی،

رائے بھگوان داس | کائستھ متخلص بہ ہندی، ولد دولت داس ساکن کالپی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی، مولوی سید یوسف سہارنپوری سے تحصیل علم کی، نواب آصف الدولہ کی سرکار میں معزز عہدہ پر ممتاز ہوئے، پھر معتمد الدولہ مہاراجہ ٹکیت رائے نائب دیوانِ شاہ اودھ کے مصاحبوں میں داخل ہوگئے، دو تذکرے اُن کی علمی زندگی کی یادگار ہیں، حدیقۂ ہندی اور سفینۂ ہندی، حدیقہ میں گذشتہ شعراء اور سفینہ میں معاصرین کے حالات ہیں، اس کی تالیف کا زمانہ ۱۲۱۹ھ ہے،

موہن سنگھ | موہن رائے ہولکر کی سرکار میں ملازم تھا، عربی و فارسی علوم میں بہرۂ وافر رکھتا تھا، آقا کی فرمائش سے وقائع ہلکر کے نام سے ملہر راؤ ہلکر (ریاست اندور) کے حالات لکھے، ۱۲۲۳ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی،

منشی چھترمل | ولد رائے پران چند، اُس کی سب سے نادر تصنیف تو دیوان پسند ہے جس میں مالیاتِ ہند پر اُس نے بحث کی ہے لیکن اسکی تاریخی تصنیف عمارات آلاکبر ذ نام سے معلوم ہوتا ہے

کہ اکبرآباد کی عمارتوں کا حال ہوگا، اس کی پہلی تصنیف ۱۲۲۵ھ کی لکھی ہوئی ہے، اس سے زمانہ معلوم ہو سکتا ہے،

بساون لال شاداں | بلگرام کا باشندہ، امیر الدولہ محمد امیر خان کے دربار میں نائب میرمنشی تھا، اور اسی کے حکم سے ۱۲۴۰ھ میں امیرنامہ لکھا، یہ درحقیقت امیر خاں کی سوانحعمری ہے،

سندر لال کول | ولد نوبت رائے، متھرا کا باشندہ، دفتر خالصہ میں میرمنشی تھا ۱۲۴۳ھ میں اس نے گل بے خزاں لکھی، جو چار ابواب پر منقسم ہے، تین پہلے ابواب میں دہلی، متھرا، اور بندرابن کے حالات ہیں، اور چوتھے میں افسانہ ہے،

منشی سداسکھ لال | متخلص بہ نیاز، نجف خاں کے زمانہ میں یہ آگرہ کے سررشتہ دار تھے، ۱۲۲۴ھ میں ۶۵ برس کی عمر میں دلی چھوڑکر الہ آباد آگئے تھے، مرزا قتیل، میر تقی و خواجہ میر درد وغیرہ کے معاصرین میں تھے، الہ آباد میں منتخب التواریخ نام ایک کتاب لکھی، سر ہنری ایلیٹ اپنی تاریخ میں اس کا حوالہ دیتا ہے،

بہادر سنگھ | ہزاری مل کا بیٹا اور لچھمن چند کا پوتا تھا، اصل وطن گو شاہجہان آباد تھا لیکن الہ آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی، یہاں عربی، فارسی اور ہندی کی تاریخی کتابوں سے مواد فراہم کرکے یادگار بہادری کے نام سے تمام دنیا کی تاریخ لکھی، اس کا سال اختتام ۱۲۴۹ھ ہے،

رتن سنگھ | منشی الملک فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ زخمی، جائے پیدائش لکھنؤ، قوم کائستھ، اس کا خاندان تین پشت سے دربار اودھ میں معزز عہدوں پر ممتاز تھا، رتن سنگھ بہت بڑا فاضل اور علامۂ وقت تھا، اس کے اصلی کمالات فلسفہ کے زیر عنوان ظاہر ہوں گے، اس کا دادا راجہ بھگوان داس آصف الدولہ کا ایام شاہزادگی میں آتالیق تھا، اور عہد حکومت میں دیوان تھا، رتن سنگھ نے منجملہ اور تصنیفات کے سلطان التواریخ نام کتاب شاہان اودھ کی تاریخ میں لکھی، ۱۲۵۰ھ میں

ساٹھ برس کی عمر میں یہ کتاب اُس نے ختم کی،

رام سیتا سنگھ | متخلص بہ فکرت، اس نے منشی سیتل سنگھ بیخود کے حالات میں حقیقتہائے بیخود کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۸۴۳ء میں چھپ کر شائع ہوئی،

پنڈت کشن نرائن | مؤلف نظارۃ السند، فن تاریخ میں ہے، زمانہ نہیں معلوم لیکن ایشیاٹک سوسائٹی میں اس کا جو نسخہ ہے، وہ ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے،

لالہ سیتل چند | آگرہ میں رہتے تھے، غدر سے بہت پہلے مدرسہ آگرہ میں مدرس تھے، انھوں نے تعریف العمارات کے نام سے نہایت محنت، کاوش اور تحقیق سے اکبرآباد آگرہ کی ایک ایک عمارت کا حال لکھا، اور اُس کے نقشے شامل کئے، یہ کتاب نہایت مفید اور پُر از معلومات ہے،

منشی مہتاب سنگھ | قوم کایستھ، متوطن کانپور، مؤلف تاریخ ہزارہ، اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے،

گردھاری لال | مؤلف تاریخ ظفر دکن، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، حال وسنہ نہیں معلوم فلسفی کے لقب سے مشہور تھے،

راجہ کندن لال | اپنے زمانہ کے مشہور فاضل تھے فلسفی کے لقب سے مشہور تھے، دلی وطن تھا، ۱۲۳۷ھ میں قسطاس لکھی، اُن کی ایک تاریخی تصنیف تنقیح الاخبار ہے جس میں زیادہ تر خود اپنے حالات لکھے ہیں،

اوپر، ہم ہندو مورخوں کا تذکرہ ہوا، اُن کے زمانوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ صرف ڈھائی سو برس کی مدت کے اندر پیدا ہوئے ہیں، یہ تعداد ابھی بہت کچھ بڑھ سکتی ہے کیونکہ ہندوستان کے سینکڑوں ہزاروں ذاتی کتب خانوں کے معلومات حاصل کرنے کے

ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں، بہت سی ایسی کتابیں ہیں، جو جاہل خاندانوں کی غفلت کی نذر ہوگئی ہیں، تاہم اتنی مختصر تعداد سے بھی ہم کو تسلی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ اس اسکولوں اور کالجوں کے دور میں سوا سو برس کے اندر انگریزی کے ہندو مورخین اتنے بھی پیدا نہ ہوسکے،

پھر اس نکتہ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے، آج انگریزی تاریخ کی کچھ کتابیں جو بنگالی یا دکنی برہمن مصنفوں کے قلم سے نکلی ہیں وہ صرف یونیورسٹیوں کے سہارے پر لکھی گئی ہیں، کہ وہ کورس میں داخل ہوسکیں، اور ان سے کچھ تاجرانہ منافع حاصل ہوں لیکن گذشتہ شاہی زمانہ کے مصنفوں کی یہ حالت نہ تھی، ان کا محرک یا محض شوقِ علمی تھا، یا سلاطین اور امرائے ملک کی قدر شناسی،

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ بایں ہمہ آج کل تاریخ کی جو کتابیں ہندوستانیوں نے لکھی ہیں، یا لکھی جارہی ہیں، وہ زیادہ تر کتابوں کی ورق گردانی اور اگلے مصنفوں کی دانائی کے ساتھ نقل صورت ہی، وہ صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کے بعد نہیں، بلکہ محض کتب خانوں کی الماریوں کی تلاش کے بعد لکھی گئی ہیں، وہ دنیا کی وسیع فضا میں چل پھر کر نہیں، بلکہ بلند ایوان لائبریریوں کے قید خانوں میں بیٹھ کر ترتیب پائی ہیں، اپنی آنکھوں سے مشاہدۂ حقائق اور استنباطِ نتائج کی بنا پر نہیں لکھی گئی ہیں، بلکہ صرف اپنی دماغی محنت و کاوش اور کتابی تلاش و تفحص کی مدد سے، لیکن جن اگلے، ہندو مورخوں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے، اُن کی تصنیفات زیادہ تر مشاہدۂ فطرت، معائنۂ حقیقت اور مطالعۂ واقعات کے نتائج ہیں،

ان مصنفین کے حالات پر، ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہی، کہ ان میں زیادہ تر ایسے تھے، جو شاہی دفاتر کے ذمہ دار افسر تھے، ان میں بہت سے دفتر شاہی کے منشی، وقائع نویس، دیوان تھے، اُن کی نگاہ سے سلطنت کا کوئی راز چھپا نہ تھا، سیاسی، انتظامی، اور مالی ایک

ایک جزئی واقعہ پر اُن کو عبور تھا، اس لئے وہ جو کچھ دیکھتے تھے، وہی لکھتے تھے، اور یہی سبب ہو کہ اُن کو اپنے تاریخی اوراق کے مُرتب کرنے کا سب سے بہتر موقع ملتا تھا،

ہندو فارسی شعراء

محکوم قوموں کو حاکم قوم کی زبان سے کسی طرح استغنا نہیں ہو سکتا، مسلمانوں کے عہد حکومت میں فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی، اور اب انگریزی ہے، اس زمانہ کے طرزِ حکومت کے لحاظ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ فارسی زبان کے سیکھنے کے لئے محکوم قوم کو کبھی مجبور نہیں کیا گیا، اور آج جس معاشی مجبوری سے ہم کو انگریزی پڑھنی پڑتی ہے کل بھی یہی حالت تھی، بہرحال کسی سبب سے بھی ہو سکندر لودھی کے زمانہ سے ہندوؤں کو فارسی کی جانب توجہ ہوئی، اور اس میں اس درجہ انھوں نے ترقی کی کہ ایک انگریز مورخ کے بقول "ہندوؤں اور مسلمانوں میں فارسی زبان دانی میں کوئی فرق نہیں رہا[1]"

آج بھی انگریزی تعلیم اسی سُرعت اور تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے، جہاں تک گذشتہ اور موجودہ زمانہ کے مقابلہ سے ثابت ہوتا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بایں ہمہ نظم و اہتمام، جد و جہد، سعی و کوشش اور زرپاشی و اسراف، جدید تعلیم کا وہ نتیجہ نہیں پیدا ہوا، جو پہلے پیدا ہوا، یہ ممکن ہے کہ مکتب اور تعداد کے لحاظ سے آج کل کی سرکاری زبان کے جاننے والے زیادہ ہوں لیکن کیفیت اور اثر کے لحاظ سے گذشتہ تعلیم زیادہ مفید کارآمد اور موثر تھی، اس کے

[1] "ہندوستان میں علوم کی ترقی مسلمانوں کے زمانہ میں" مسٹر لا نے یہ قول نقل کیا ہے،

اسباب میرے خیال میں حسب ذیل ہیں،

۱- تعلیم مفت تھی، صرف طلب نہ تھی،

۲- اساتذہ شفیق باپ اور مرشد کی حیثیت رکھتے تھے، آج کل کی طرح "اجرت گیر اور پیشہ ور معلمین" نہ تھے،

۳- زبان تعلیم سے نہیں، بلکہ اہلِ زبان کی صحبت اور مجلس سے حاصل ہوتی ہے، اس زمانہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی معاشرت، صحبت اور سوسائٹی میں کوئی امتیاز نہ تھا، روز و شب کی صحبتیں رہتی تھیں، مجلسیں تھیں، ایک سوسائٹی تھی، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کو فارسی زبان باتوں باتوں میں آجاتی تھی، اسی کا یہ اثر ہے کہ اب تک اسکولوں اور کالجوں میں ہندو طلبہ فارسی کو سہل و آسان سمجھکر اختیار کرتے ہیں، اور سنسکرت کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دیتے ہیں، گو رفتہ رفتہ قومی تعصب کا رنگ اب تعلیمی تفریق و امتیاز بھی پیدا کرتا جاتا ہے،

بہرحال یہ واقعہ ہے، جس کی کوئی تکذیب کی جرأت نہیں کرسکتا۔ کہ ادبی حیثیت سے فارسی تعلیم نے ہندوؤں پر جو اثر ڈالا، وہ انگریزی تعلیم باایں ہمہ گیری نہ ڈال سکی، سو ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں کتنے ایسے انگریزی کے باکمال شاعر گذرے ہیں، جن کا نام تاریخ کے صفحات میں زندگی حاصل کرسکا ہے یا کرے گا، جو ام کم سامنے ہیں، اُن کی تعداد ۵ یا ۶ سے زیادہ نہیں اور یہ بھی زیادہ ہے، لیکن دیکھو کہ صرف تیموریوں کے آخر زمانہ میں صرف دو ڈھائی سو برس کے اندر فارسی زبان کے کتنے ایسے ہندو شعراء گذرے جن کے نام اب تک ہمارے تاریخی تذکروں کیلئے فخر و مباہات کے باعث ہیں، جن کے اشعار سن سن کر اہلِ زبان سر دھنتے تھے، اور مزے لیتے تھے، آج انگریزی کے دو تین ہندوستانی شاعر ہیں جنکی اہلِ زبان نے کچھ تعریفیں کردی ہیں

یا ان کو کوئی انعام مل گیا ہے، فرنگی مدح وستایش کے گیت گاتے گاتے ہماری زبانیں خشک ہو گئیں، لیکن ذرہ اپنے اسلاف کو دیکھو کہ اُن کے کیا کارنامے تھے؟ میں نے چند فارسی تذکروں کو سامنے رکھ کر حسب ذیل اشخاص کا انتخاب کیا ہے، ان کی ترتیب زمانہ اور دور پر نہیں، بلکہ حروف تہجی پر ہے، ان میں سے ہر ایک نے سلاطین زمانہ اور ابناے عصر سے اپنی زبان آوری کی داد آج سے بہتر طریقہ پر پائی تھی،

اس احتیاط کی بنا پر کہ تذکرہ نویسوں کے اصلی الفاظ محفوظ رہیں، اور زیادت و نقص اور کمی و بیشی کا شبہہ نہ ہو، اصل عبارت فارسی ہی کا اس مقام پر نقل کرنا زیادہ مناسب ہے،

آرام | منشی ایشری داس، قوم کایستھ، در زمرۂ منشیان سرکار امیر الامرا نواب غضنفر جنگ رئیس فرخ آباد، انسلاک داشت نظم و نثر فارسی بفصاحت و بلاغت مشتمل بر لطائف و صنائع و بدائع لفظی و معنوی می نگاشت، از نثرش بعض وقائع و سوانح بنظر گذشته حق آنست کہ بکمال لطف و خوبی می نگاشت، در مدح نواب عماد الملک نیز نظام الملک آصف جاہ باستیصال سورج مل جاٹ گفتہ،

بفر کوکبۂ بختی ممالک ہند | سزد کہ باج ز خوارزم و زختن گیرند
شہان زصولت آن جم وقار آصف جاہ | رکاب توسن شاہنشہ زمن گیرند
جوان و صاحب بخت جوان نظام الملک | کہ باد ہمت از و مردم دکن گیرند
برید گردن بلوے فتنہ ساز نخست | چنانکہ صبح سر شمع در لگن گیرند

آفریں | چمن لال، قوم کایستھ، ساکن الہ آباد، در رنگینی و مضمون آفرینی سحر کاری می نمود،

مبارک باد مرغان چمن را | نواسنجان رنگین انجمن را
کہ عید نو بہار آمد طرب جوش | نوی گل کرد دوران کہن را

اخلاص | کالی پرشاد، قوم کائستھ، متوطن حوالی لکھنو، مشق نظم و نثر فارسی از مولوی احسان اللہ ممتاز امامی می نمود، بعد مرگش کلام منظوم و منثور را و پریشان گردید، قصیدہ در مدح محمد علی شاہ اودھ بر شتۂ نظم کشیدہ کہ بصنعت توشیخ از ہشت جا محمد علی شاہ بادشاہ زماں خلد اللہ ملکہ برآوردہ و از خزانۂ شاہی ہزار روپیہ بجائزہ بردہ،

الفت | راجہ الفت رائے بخشی ممالک اودھ، دستگاہش بر اصناف نظم و قصیدہ و غزل و رُباعی و مثنوی قوی بسکہ موزوں طبع بود.

نیست اہل آسماں را بر درت بے اذن بار ... می کند گردوں طواف روضات لیل و نہار
ہر چہ ناممکن بود آید ز تو بر روے کار ... از غبار در گہ عرش احترامت آشکار

الفت | لالہ اُجاگر، قوم کائستھ، عظیم آبادی است، برای اصلاح سخن بخدمت میر محمد علیم سمرقندی می رسید،

درآمد شام غم در سینۂ حسرت نام ہمانی ... ز داغ دل کشیدم بے تکلف پیش او خوانی

الفتی | راجہ پیارے لال قوم کائستھ از موزونان عظیم آباد است، مثنوی نیرنگ تقدیر و دیوان اشعارش مطبوع طباع، میر منشی بادشاہ اکبر ثانی بود و ابابب کمال طریقۂ الفت و خلق مرعی می نمود،

چون غنچہ جز سکوت نباشد بیان ما ... پیچیدہ شد زبان سخن در دہان ما
اندیشۂ مآل نیامد ز ما درست ... در دست دیگریست چو سود و زیان ما
در دشت پر بلای جنوں نیست الفتی ... جز موج ریگ اشک روان کاروان ما

امانت | لالہ امانت رام، از شاگردان مرزا بیدل و در اندازِ سخن سنجی بہنجار استاد خود مائل،

نمی گردد بلند از خاک ہم با دمزار ما ... کہ بنشیند مبادا بر دل خوبان غبار ما

شکر للہ نقش پای مہ جبینے یافتم　　　آرزوے سجدہ می کردم زمینے یافتم

اندرمن | پسر کنول رام، مولدش قصبۂ اورنگ آباد، از اعمال علی گڈھ، استفادۂ علم فارسی از شیخ نظام الدین سکندر آبادی کردہ در موزونیِ طبع و سخن سنجی نام برآوردہ، ہر چند در عین جوانی نابینا شد، مگر قوتِ حافظہ اش چنداں افزود کہ سائر نظم و نثر خودش نوک زباں بود،

صد جلوہ در کرشمۂ آن ماہ پارہ است　　　ایں ماہ نو ز ابروی او یک اشارہ است

انس | لال چند کایستھ، لکھنوی، از و دیوانے مختصر یادگار، سنہ ۱۲۶۳ھ

روحِ جمشید بر در شک برمے نوشیِ ما　　　کہ لب یار بود مایۂ بے ہوشیِ ما

جامے رحم است خدارا نتواں کرد دریغ　　　ہست وابستۂ تیغ تو سبکدوشیِ ما

انیس | موہن لال، شاگرد مرزا فاخر مکین، نام پدرش رائے تولا رام کائستھ؛ صاحبِ دیوان فارسی،

بدر | رائے گنگا پرشاد بہادر، از زمرۂ کایستھانِ فہیدہ و سنجیدۂ شہر لکھنو است بحضور واجد علی شاہ عہدۂ سررشتہ دار در علم سیاق و سباق سر بر می آرد،

می کنم سجدۂ بتے کہ کند　　　ہر نفس دعوے خدائیہا

از خمِ طرہ اش معاذ اللہ　　　من و اندیشۂ رہائیہا

برہمن | چندر بھان اگرہ در سرکار دارا شکوہ منشی داشت، بعد قتلِ وے ترکِ نوکری اندہ بشہر بنارس رفت بسنہ ۱۰۷۳ھ مرد

کنم رسا دو دلی بند دیدہ مژگاں داشت　　　بمشت خس نتواں بست راہ طوفاں را

بہار | ٹیک چند کلامش دل پسند، تتبع زبان فارسی بدرجۂ قصوی رسانیدہ، کتاب بہار عجم (لغت) و جواہر الحروف از وست، از ارشد تلامذۂ سراج الدین علی خان آرزو،

جانبِ او دل ببالِ اضطرابم می پرد　　　ذره‌ام بے طاقتی تا آفتابم می پرد

بہجت | لکھن لال صاحب دیوان بہجت،

تفتہ | منشی گوہر لال تفتہ، برہمن، خیلے پرگوست، کلام منظومش بسیار، پنج دیوانِ شعرِ اردو، ابیات ہر یکے ازان قریب سیزدہ ہزار، کل ۲ ۵ ہزار،

چند گوئی کہ نشان نیست ز خونین کفنان　　　نگر این لالہ کہ مینی ز شہیدانِ تو نیست

تمنا | لکھن لال کایستھ، از شکوہ آباد است، دیوان و مثنویش ہمگی ۱۵ ہزار بیت است،

ثاقب | مہاراجہ شیو پرشاد... جی گوپال سنگھ بہادر، از کایستھان سری باسپت است، پدرش منشی بینی پرشاد، سررشتہ دار دیوان عام سلطانی اودھ بود، شیو پرشاد در سرکار باردولی شہزادہ صاحب جنرل فریدون قدر مرزا ہزبر علی اودھ بود، تاریخ اودھ کہ نام تاریخی او دفتر ثاقب و نسخۂ تاریخ دہلی کہ نام تاریخش حقیقت تیموریہ تالیفِ آن سخندان و مجموعہ نادرات الثاقب و مثنوی مجزبہت از منظوماتِ آن است،

حیا | شیو رام اکبرآبادی کایستھ، پدرش بھگوتی مل از متصدیانِ سرکار نواب اسد خان وزیر عالمگیر بادشاہ، مشق شعر و سخن از مرزا بیدل می نمود، نسخۂ گلگشت بہارارم بطرز حیا ز عنصر مرزا بیدل مستعدی تمام نگاشتہ، سنہ ۱۱۴۴ھ وفات یافت،

بیاد چشم تو داریم سے پرستیہا　　　رسانده ایم بگردون دماغ مستیہا

خوشدل | رائے امر سنگھ ولد جیون رام کایستھ، از کٹرہ مانک پور، جیون رام در سرکار وزیر الممالک نواب ابو المنصور خان صفدر جنگ در زمان نواب شجاع الدولہ، بہ نظامت سرکار غازی پور، مامور گردید، رائے امر سنگھ بعد تحصیل علوم و فنون اولاً در سرکار مہاراجہ جیت سنگھ راجہ بنارس و آخر در سرکار انگریزی بداؤن علی گڑھ کامران گشت در سنہ ۱۲۲۵ھ درگذشت،

بہار دانش نظم و نسخۂ تاریخ فرماں روایانِ ہنود تا سلطان علاء الدین غوری ازوے یادگار است'
اشعار دیوانش تخمیناً پنج ہزار است

گرم است بسکہ کہ نالۂ آتش فشانِ ما　　سوزد بہ رنگِ شمع زباں در دہانِ ما

خیالی | منشی خیالی رام لکھنوی در نظم و نثر فارسی قدرتش علی وجہ الکمال و تالیفاتش کہ زاید
از یک صد از انجملہ شرح اعجاز خسروی، در ۱۲۸۹ھ بگذشت، قصیدہ در مدحِ واجد علی شاہ
وصفت نور منزل نوشتہ کہ از حروف اوائل مصاریع اولی سنہ ہجری و از حروف اوائل
الفاظ آخر سنہ فصلی و از مصاریع ثانیہ سنہ عیسوی و سمت ہندی،

خاموش | رام صاحب المتوفی ۱۲۲۹ھ اُس کے فارسی دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی
کلکتہ میں ہے،

راقم | بختاور سنگھ لکھنوی، بشیریں گفتاری از ممتازانِ گروہ ہندو، پسرش جواہر سنگھ
جوہر از پدر خود خوشگو،

رحمتی | کنور سکھراج سنگھ بہادر، خلف کنور ہیرالال ضمیر، پسر راجہ پیارے لال الفتی،

گر ہجرش دل بسوو ازدہ غمناک شود　　جامۂ صبر بہ بیتابیِ من چاک شود

رفعت | میکولال لکھنوی، طبعش بشعر و سخن مائل و مشق این فن از مولوی نذیر احمدی نمود'

رفیق | داتارام، طبعش با موزون توام ولب و لہجہ اش باخوش بیانی ہمدم،

نگارِ من بہ رخِ خویش چوں نقاب گرفت　　فتاد شور کہ امروز آفتاب گرفت

رونق | منشی رام سہائے لکھنوی، نظم و نثر فارسی بلطافت می نوشت، ۱۲۹۰ھ وفات دیوان
شعر و مثنویات ازوے یادگار غزلے نوشتہ در چہار بحر،

زار | منشی مینڈولال در شہر لکھنو، در نظم و نثر فارسی شاگردانش بسیار، دیوان فارسی در سائل

عروض معنی و بحر العلوم و ہفت صحیفہ بطرز پنج رقعہ و نادر بازار بہ تتبع مینا بازار و جاوید بہار،

سبقت | سکھراج پدرش بلازمت عمدۃ الملک بہادر وزیر بادشاہ عالمگیر معزز است، از مستعدان روزگار بود، و در علوم ادبیہ و حکمیہ و حساب و طب و تصوف از اقران گوے سبقت برد، بر انواع نظم و معما و تاریخ قدرت داشت، شاگرد بیدل، در سرکار سید حسین علی خان کار دیوانی و میر سامانی سرانجام دادہ بمنصب پانصدی رسیدہ، جنگ نامۂ حسین علی خاں قریب ہفت صد اشعار از وے یادگار،

سروری | راے منبی دھر، نواسۂ بخشی الممالک راجہ لال جی بہادر، نظم و نثر فارسی را پیش مولوی احسان اللہ مشق رسانید،

نام معنی و سخن امروز سروری ست مدح آں سرور و شیداے سرورم

شاداں | مہاراجہ چندولال دیوان دولت آصفیہ حیدرآباد، نزدش مجمع اہلِ کمال مطلع ارباب سخن، در ہر شب مجلسِ شعر و سخن برپا می ساخت، در فن شعر پایۂ بلند داشت (فارسی دیوان چھپ گیا، یہ مہاراجہ کشن پرشاد کے پردادا تھے، ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی)

شفیق | منشی لچھمی نراین کھتری اورنگ آبادی شاگرد مرزا آزاد، دو تذکرۂ شعراء وارد، گل رعنا و شام غریباں، صاف گو، خوش بند است، اصلش از لاہور است، پدرش بھوانی داس ہمراہ عالمگیر وارد دکن گردید، در اورنگ آباد سکونت گزید، شفیق در سلکِ ملازمانِ عالیجاہ خلف نظام علی خان منتظم گردید، در ۱۲۰۰ھ مرد،

شوق | منشی دولت راے بنیرہ راجہ بھولا ناتھ، از زمرۂ منشیان بیت الانشاء شاہی اودھ ممتاز، قصیدۂ بلیغہ گفتہ، در صنعت عکس و سجع درو سے گفت، بہ ہمراہی شاہ واجد علی مع اہلِ و عیال کلکتہ بیامد، در ۱۲۷۰ھ مرد،

از حسنِ فروغ از درِ حسنِ تو جہاں را داغ تو چراغ است دلِ پیر و جواں را

شہر | لال بالمکند ماکپوری، در ۱۲۵۰ھ بگذشت، طبع نکتہ سنجی و نظم گوئے داشتہ،

مکن اشکِ مرا بندِ راہِ مژگانِ تر رحمے | بریں طفل غذا پرورده خونِ جگر رحمے

صاحب رام | سخن سنج فارسی در تاریخ گوئی ملکہ داشت، در عہدِ سلطنت شاہ غازی الدین حیدر علم شہرت می افراشت، در تاریخ وفات غازی الدین حیدر بادشاہ کہ در مقام نجف شہر لکھنؤ مدفون است، می گوید،

چوں رفت شہ زمن ز دنیا | ماتم دلِ خاص و عام گرفت

از روئے بکا و آہ گفتم | حیدر بہ نجف مقام گرفت

ضیائی | راجہ گوبند بخش ضیائی، المتوفی ۱۲۴۵ھ (ان کا نہایت عمدہ ۱۲۴۳ھ فارسی دیوان کتب خانۂ آصفیہ میں ہے)

عشرت | جے کشن از براہمۂ کشمیر، در سخن طرازی سلیقہ اش نیکو، در تے بملازمت نواب نجم الدولہ امیر خان دیوانِ خالصہ شریفہ تقانون گوئی تمام خطۂ کشمیر سرافراز،

دشت از لالہ بسکہ رنگین است | پائے دیوانہ دست گلچین است

گلشن | راجہ جیالال بہادر، خوش فکر صاحبِ دیوان، بدیوان انشائے ابوالفتح محمد علی شاہ اودھ سر دفتر نشیاں،

گلشن | رائے گلاب رائے سندیلوی، شاگرد قتیل، در ریاست اودھ متعہد عہدہائے جلیلہ، در استعد علمی بے عدیل، در فنون سپہ گری، فاقد المثال، تذکرۂ شعرا ضخیم و دیوانے جسیم، یادگار،

آنکس کہ از زبانِ تو حرف جفا شنید | گویا پیامِ خضر ز آبِ بقا شنید

مشتاق | لالہ بیج ناتھ بریلوی،

مطیع | لالہ رام بخش قنوجی،

ممتاز | لالہ سیتل داس، در نازک خیالی ممتاز بلب و لہجہ اہل زبان پرداز بود،

منشی | منشی مادھورام شاہجہان آبادی، در سرکار نواب لطف اللہ خان بن سعد اللہ خان شاہجہانی بعہدۂ انشار امتیاز داشت، رفتہ رفتہ امیر الانشار معز الدین جہاندار بن بہادر شاہ مشرف

نمی رسد بمیان صنم ز باریکی	ہزار بار بدقت شگافتم مو را

منشی | لالہ فتح چند برہان پوری، کایستھ، طبع نظم دار د وخوشگو است،

نیست آسائش بمنزل جان از خود رستہ را	ہر قدم دام است نقش پا شکار جستہ را

بسکہ از شرم تو در پرواز رنگ گلشن است	رشتہ نظارہ بندہ در ہوا گلدستہ را

منوہر | رائے منوہر لال از امرائے سلطنت اکبر بادشاہ است، طبع متین ورائے رزین داشت،

رباعی

روزے کہ سموم حشر افزوں گردد	در آتش غم چو چہرہ گلگوں گردد

ما در دوزخ چناں بذوقے سوزم	کز رشک دل بہشتیاں خوں گردد

موجد | سکھن لال بدایونی

چہ شکیبم چہ کنم چوں بزنم سر بر سنگ	مدتے شد کہ ز جاناں خبرے پیدا نیست

موجد | کالکا پرشاد لکھنوی بموزونی طبع ورسائی ذہن امتیاز داشت و خط نستعلیق خوشتر و شیریں می نگاشت باصطلاحات و محاورات زبان فارسی بخوبی ماہر،

رسائی نیست تا سر منزل او کفر و ایماں را

کہ دیر و کعبہ سنگ رہ بود گبر و مسلماں را

موجی | لالہ موجی رام،

موزون | راجه رام نرائن عظیم آبادی، پدرش بدیوانی سرکار نواب مهابت جنگ عزت داشت بعدهٔ این عهدهٔ موروثی رسید، در جنگ بامردی نهاد، دیوانِ اشعارش، شاگرد شیخ محمد علی حزین، ۱۱۷۵ھ،

موزون | راجه مدن سنگه آبادی، پدرش راجه جگت سنگه، دستِ توسل، بدامنِ دولت نواب غازی الدین خان آویخت و بمنصب سه هزاری و بخطاب راجگی و بعهدهٔ دیوانی نواب ممدوح، مدن سنگه در سرکار نواب آصف جاه دکن مستوفی الممالک بود و در عهد ناصر جنگ منصب هزاری و علم و نقاره و خطاب راجگی یافت ڈمور بحراست قلعه مصطفی نگر گردید، تا آنکه افواج انگریزی محاصره دیورش برآن قلعه نمود، راجه تا توانست پائے برجا ماند، بصدمه تفنگ بعمر ۵۰ سال ۱۱۷۹ھ جان داد، در نظم و نثرِ فارسی استعدادے نیکو داشت،

کرد گلشن جلوهٔ رنگین یار آئینه را   می رسد عرض قدمبوس از بهار آئینه را

نفاذ | پنڈت جی گوپال کشمیری، از آشنایانِ قاضی محمد صادق اختر بوده شاگرد قتیل

واثق | کهتری بود، به برکت صحبت مولوی عبدالله بن مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی مشرف باسلام شده به محمد اخلاص خان مخاطب گردید، و بملازمت اورنگزیب رسید و بوکالت بعضے امرا، می شناخت، نظم و نثر فارسی چنان خوبتر می نوشت که اورنگزیب زبان بحسنت و آفرین می کشود، در جوانی میل بشعر و شاعری داشت، بعد ازان بافادهٔ علوم و فنون طبیعت گماشت ۱۱۴۳ھ مرد،

محتسب می کشی از دستِ تو مشکل شده است
شیشهٔ مے به بغل آبلهٔ دل شده است

وفا | پنڈت دیاناته ولد مست رام کشمیری، شاگرد مرزا علی اکبر عارف شیرازی می نمود،

وقار | مدیرالدولہ، منشی الممالک راجہ جواہر لال بہادر محکم جنگ امیرالانشائے امجد علی و واجد علی شاہان اودھ، باوجود چندیں اقتدار حرف درشتے نسبتِ کسے نگفتہ، در نظم و نثر فارسی صاحب استعداد است، دیوانش مطبوع،

ہندو | شیو سنگھ لکھنوی

ہندو | گوکل چند، قوم کھتری فرخ آبادی،

ہندو ادبائے فارسی

ہندو ادبائے فارسی اس کثرت سے گذرے ہیں کہ ان کا شمار بھی حیطۂ امکان سے باہر ہے، ان میں بہت سے اچھے لکھنے والے انشا پرداز تھے، اور ایسے بھی تھے، جو محض دفتری ضرورت کے مطابق اس زبان میں نوشت و خواند کر سکتے تھے، ہندوؤں کے دوسرے فرقوں کی بہ نسبت کایستھ ذات کے لوگوں نے فارسی زبان کی تحصیل میں کثرتِ تعداد کے لحاظ سے زیادہ ناموری حاصل کی لیکن اصل زبان دانی اور جوہرِ سخن کے لحاظ سے برہمنوں نے زیادہ کمال پیدا کیا خصوصاً آخر زمانہ میں کشمیری برہمنوں نے جس طرح آجکل بنگالیوں کی انگریزی زبان کو "بابو انگریزی" کہتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں کایستھوں کی فارسی "اُڈلالاؤں کی فارسی" مشہور تھی،

دفاتر میں زیادہ تر ہوتے تھے، محکمۂ انشا (سکریٹریٹ) اور مال کے صیغے تمامتر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے، آخر زمانہ میں انشا کے اعلیٰ افسر بھی ہندو ہونے لگے تھے، جن کو عموماً میر منشی اور از روئے خطاب "منشی الممالک" کہتے تھے، ان عہدوں پر جو ہندو سرفراز ہوتے تھے، وہ فارسی زبان کے

لائق ادیب ہوتے تھے، بادشاہ کی طرف سے ہر قسم کے احکام و فرامین ان ہی کی زبان و قلم سے ادا ہوتے تھے، وقائع نویسی کی خدمت پر بھی زیادہ تر مامور ہوتے تھے،

ہندو ادبا کے یہ فرامین نشآت اور رقعات جب زیادہ جمع ہو جاتے تھے، اور اُن کی مقبولیت عام ہو جاتی تھی، تو وہ بطور کتاب کے یکجا جمع کر دیئے جاتے تھے، ان میں سے بعض مجموعے اس درجہ مقبول اور پسندیدہ ہوتے تھے کہ وہ طالب علموں کے نصاب تعلیم میں داخل کرئے جاتے تھے چنانچہ نشآت برہمن، انشائے مادھورام، نشآتِ جواہر مل خطاط، خیالاتِ نادر، دستور الصبیان وغیرہ اسی قسم کی کتابیں ہیں،

اس واقعہ کا بتکرار اظہار کیا جاچکا ہے، کہ ہندوؤں نے فارسی تعلیم لودھیوں کے زمانہ سے شروع کی، چنانچہ فارسی کا سب سے پہلا ہندو ادیب بھی اسی زمانہ میں ہم کو ملتا ہے،

پنڈت ڈونگر مل | ایک بزرگ لکھتے ہیں کہ پنڈت ڈونگر مل سکندر لودی کے زمانہ میں تھے، اُن کی فارسی زبان دانی پر مسلمان بھی تعجب کرتے تھے کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہتے تھے، چنانچہ ان کا یہ ایک شعر اربابِ تذکرہ نقل کرتے ہیں،

دل خوں نشدے چشمِ تو خنجر نشدے گر   رہ گم نشدے، زلفِ تو ابتر نشدے گر

ٹوڈرمل | کھتری تھا، شیرشاہ کے عہد میں فارسی تعلیم حاصل کی، اور دربار تک رسائی پائی، شیرشاہی کاروبار کے انقلاب کے بعد اکبری نورتن میں شامل ہوا، جہاں مال کا صیغہ اس کے ہاتھ آیا، ٹوڈرمل فارسی کا خوشخط کاتب بھی تھا تذکرۂ خوشنویساں میں ہے،

"نویسندۂ چابکدست و خطوط بخوشخطی و نیکی می نوشت"

اس عہد کے دیگر ادبا کا تذکرہ اس لئے قلم انداز کرتے ہیں کہ ان کا ذکر دوسری سلسلوں میں آچکا ہے،

رائے منوہر لال | رائے لون کرن کا خلف الرشید تھا، شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے آغوش تربیت میں پل کر جوان ہوا، اور فارسی زبان میں یہ سلیقہ پیدا کیا کہ اہل تذکرہ اسکی تعریف و توصیف میں طب اللسان ہیں

چندر بھان برہمن | اس کا ذکر پہلے بھی گذر چکا ہے، یہ عہد شاہجہانی کا سب سے بڑا ہندو ادیب تھا، یہ پنجابی برہمن تھا، لاہور میں پیدا ہوا تھا، ملا عبد الکریم کی شاگردی میں اسکے فضل و کمال نے نشو و نما حاصل کیا تھا، فارسی زبان کا شاعر تھا اور برہمن تخلص کرتا تھا، اسکا فارسی دیوان اب تک کتب خانوں میں موجود ہے، فارسی ادب میں بڑی دستگاہ حاصل کی تھی، افضل خاں امیر الامرائے شاہجہانی نے اس کی لیاقت و قابلیت کو دیکھ کر اس کو اپنا منشی خاص (پرائیویٹ سکریٹری) بنایا، ۱۰۴۸ھ میں افضل خاں نے وفات پائی، تو دربار شاہی کے سلک ملازمین میں داخل ہوا، اور دربار شاہجہان کا وقائع نویس یعنی شاہی تاریخ و روزنامچہ کا چیف ایڈیٹر مقرر ہوا، اس عہدۂ جلیلہ کے باعث وہ روزانہ بارگاہ شاہی میں حاضر ہوکر، ہر روز کے مرتبہ واقعات و حالات سناتا تھا، ۱۰۵۵ھ میں چندر بھان نے چہار چمن برہمن لکھ کر نوروز کے موقع پر سرہند میں دربار شاہجہانی میں نذر گذرانی، اس کی لیاقت ادب دانی کو دیکھ کر شہزادہ داراشکوہ نے جو خاص طور پر ہندوؤں کے جوہر کمال کا قدرداں تھا، اس کو اپنے اعیان دربار میں داخل کرلیا، اور اپنا میر منشی (چیف سکریٹری) مقرر کیا، داراشکوہ کی تباہی کے بعد، حوادث زمانہ سے تنگ آکر بنارس میں گوشہ نشیں ہوگیا، اور وہیں ۱۰۷۳ھ میں راہی عدم ہوا، تذکرۂ عمل صالح کا مصنف اس کو اپنے زمانہ کے فضلائے ادب میں شمار کرتا ہے، اس نے اپنے رقعات و منشآت کا مجموعہ بھی فراہم کیا، اس کا نام منشآت برہمن ہے، خوشخطی میں آقا عبدالرشید کا شاگرد تھا،

ہرکرن داس | ولد متھراداس، قوم کنبوہ، باشندۂ ملتان، ۱۰۳۰ھ میں زندہ تھا، فارسی علم و ادب میں جو دستگاہ اس نے حاصل کی تھی، اس کی شہادت یہ ہے کہ وہ امرائے جہانگیری میں سے

اعتبار خاں صوبہ دار اکبرآباد کا میر منشی تھا، انشاے ہرکرن کے نام سے اُس نے فارسی ادب کی ایک کتاب لکھی تھی، جو اب تک بعض کتب خانوں میں موجود ہے،

واقی کھتری | امراے عالمگیری میں سے ایک کا وکیل (ایجنٹ) تھا، اس کے نظم و نثر اور ادب فارسی کی یہ دھوم تھی، کہ شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک بلند پایہ ادیب تھا، احسنت و آفرین کہتا تھا،

شیورام کایتھ | اکبرآباد کا باشندہ تھا، اُس کا باپ نواب اسد خاں وزیر عالمگیر کا متصدی تھا، مرزا بیدل کا شاگرد تھا، مرزا کی چہار عنصر کا جواب گلگشت بہار ارم کے نام سے اُس نے لکھا تھا، ۱۱۴۳ھ میں وفات پائی،

کنور پریم کشور | راجہ جگل کشور کا پوتا، شاعر، بلیغ گو، سخن فہم، خوشنویس تھا، چند مثنویوں کا مصنف ہے،

منشی لچھمن سنگھ | قوم کے بقال تھے، نہایت ہوش مند، عاقل، اور عربی و فارسی کے ادیب تھے، ایرانیوں کی صحبتیں، اٹھائی تھیں، اور مشہور ایرانی انشا پردازوں کے طرز پر لکھتے تھے، صاحب تذکرۂ خوش نویساں لکھتا ہے،

"مرد دانا قابل، در علم و ہنر فارسی و عربی و عبارت پردازی خیلے مہارت داشت و درصحبت مرزایان ایران بسیار ماندہ دل و دماغ دیگر پیدا کردہ و طور انشا بردیۂ طاہر وحید و طاہر دکھنی و جلالا اختیار کردہ،"

خوشخطی میں محمد حنیفا خاں کے خط شفیعہ میں مرزا آغا کے شاعری میں میر شمس الدین فقیر (المتوفی ۱۱۸۱ھ) کے شاگرد تھے، شعلۂ آہ وغیرہ اُن کی تصنیفات ہیں، ظہوری کے اشعار ان کی نوک زبان رہتے تھے:

پنڈت لالہ لچھمی رام | ذوالفقارالدولہ مرزا نجف خان (المتوفی ۱۱۹۹ھ) جو شاہ عالم کا وزیر تھا، اُس کی سرکار میں یہ ملازم تھا تذکرۂ مذکور کا مصنف اُس کی نسبت لکھتا ہے،

"منشی بے نظیر بود، در علم عربی و فارسی و انشا پردازی و مصوری نصیب وافر داشت

..... ایں چنیں انسان باسلیقہ و صاحب کمال کم پیدا می شد"

خوش وقت رائے شاداب | کھتری، یہ ایک مشہور اور معزز خاندان کا فرزند تھا بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا آخر اس درجہ کمال حاصل کیا. کہ اپنے زمانہ کے کبار علما ر میں سمجھا جانے لگا، تذکرۂ مذکور میں ہے.

"از ابتداے عمر طبع را بتحصیلِ علم و ہنر راغب و مائل داشت و در اندک زماں در جمیع علم و ہنر آراستہ شد، در خصائل نیکو از ہمچشمانِ خود سبقت بردہ در خوشنویسی کمال داشت. ایں چنیں شخص دریں قوم صاحب استعداد و فیاض و قدرشناس کم شدہ باشد"

رائے پریم ناتھ | اس کا خاندان ایک مدت سے شاہی دفتر کا عہدہ دار چلا آتا تھا، یہ خود شاہ عالم کے سرکاری دفتر کا مالک کل تھا، خوشخطی و ادب دانی میں اپنے زمانہ کا استاد گنا تھا، شاگردوں کا بڑا مجمع اس نے یادگار چھوڑا،

سکھ رام داس | ولد نیلکنٹھ، زمانہ متعین نہیں، آمدنامۂ بدیع اس کی ایک تصنیف ہے، دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اطرافِ لکھنؤ کا باشندہ تھا، اور عہد شاہی میں قانون گوئی کے عہدہ پر مامور تھا،

بینہ نراین | ولد جین رائے، قوم کھتری، عرف سودھی، پنجاب کا رہنے والا تھا، فرخ سیر کے عہد میں، محکم سنگھ اس کو منشی (سکریٹری) کے عہدہ پر سرفراز کرکے اپنے ساتھ مارواڑ لے گیا،

اثنائے سفر میں اس کو محمد طاہر کشمیری کی کتاب "ہوش افزا" ملی، اس نے اس کو بغور پڑھا، اور اس کی بنا پر اس کو قدیم ہندو عہد کے عجائبات، اور مذہبی معجزانہ قصص کو فارسی زبان میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ رامائن مہا بھارت، بھاگوت، ہری بنس وغیرہ سے انتخاب کرکے سنہ ۱۱۲۵ھ سے گلشن اسرار ربانی کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی، جو سنہ ۱۱۳۴ھ میں اختتام کو پہنچی،

منشی موہن لال منعم | اکبر ثانی کے عہد میں تھے، اُن کی تین مثنویاں مثنویات منعم کے نام سے فارسی میں موجود ہیں، یہ ترتیب ان کا نام بہار عشق، شاہرخ، اور دلبر جہاں ہے، اور غالباً یہ تینوں افسانے ہیں، شاہرخ اور دلبر جہان کو اس نے اکبر ثانی کے نذر کیا تھا،

کشن سنگھ | ولد رائے پران ناتھ کھتری، قوم منکل، ساکن سیالکوٹ، یہ فارسی زبان کا ایک چابک دست انشا پرداز تھا، تاریخ کروشی اور غریب الانشا وغیرہ کتابوں کا مصنف ہے، غریب الانشا سنہ ۱۸۱۵ء میں اس نے لکھی،

بنوالی داس ولی | آپ اس سے ہندو مورخین کی بزم کمال میں مل چکے ہیں، اس کا ادبی کارنامہ یہ ہے، کہ بھاشا زبان سے ایک ناٹک "پربودھ چندر رودیا" کا فارسی زبان میں ترجمہ کرکے شراب شیراز کے متوالوں کو ہندوستان کی "رام رنگی" کا متانہ بنایا، سنہ ۱۰۷۳ھ میں موجود تھا،

درتی چند | سنہ ۱۱۳۷ھ میں اس نے گیان ہزار نامہ کے نام سے فارسی زبان میں ایک افسانہ لکھا، دیوان غلام محمد خاں جو بہادر شاہ اول کے عہد میں ایک امیر تھا، اس کا مربی اور محسن تھا،

شنبھو لال | یہ مہاراجہ جیت سنگھ والی بنارس کا منشی (سکریٹری) تھا، سنہ ۱۱۹۷ھ میں اس نے مفتاح خزائن نام کتاب لکھی، جو بہت سے خطوط کا مجموعہ ہے، جن میں سے بعض نہایت اہم ہیں،

منشی تھوری مل تمکین | بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں فارسی کا یہ ایک مشہور ادیب تھا، اس کے پوتے پران چند سرشار ولد بخت مل نے اپنے دادا کے فارسی خطوط اور رقعات کو گلدستۂ فیض کے نام سے ایک رسالہ کی صورت میں مرتب کیا، یہ خطوط ۱۱۲۹ھ کے زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں،

منشی سجن رائے پوری | شجاع الدولہ کے عہد میں ۱۱۶۷ھ میں راجہ رائے پور کے دربار میں نوکر تھے منشی تخلص تھا، اور نظم کے بھی منشی تھے، فن انشاء پر انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے، انشائے نیاز نامہ نام رکھا ہے، کتاب کے تین حصے کئے ہیں، (۱) عرائض (۲) رقائم (۳) تحریرات متفرق،

منشی جسونت رائے | عالمگیر ثانی کے عہد میں تھے، گلشن بہار کے نام سے انھوں نے ایک چمن ادب کھلایا ہے، مختلف لوگوں کے خطوط اس میں جمع کئے ہیں، جن میں بکثرت سیاسی اور جنگی معلومات ہیں، شاعر بھی تھے، منشی تخلص کرتے تھے، اور اسی نام سے ایک دیوان فارسی بھی چھوڑا ہے، ۱۱۷۰ھ میں تھے،

منسا رام | منشی تخلص تھا، سرزمین پنجاب کے مجنون و لیلیٰ، ہیرا اور رانجھا کا افسانۂ حسن عشق نظم کرکے اہل فارس کو سنایا، ۱۱۵۷ھ میں یہ نغمہ سرائے محبت، سرائے فانی سے کوچ کر گیا،

عوض رائے | مسرت تخلص، قصیدۂ مسرت کہہ کر شاہ عالم کے دربار میں پیش کیا، اس میں کمال یہ کیا ہے کہ ہر شعر میں بادشاہ کو نئے طور سے خطاب کیا ہے، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اس کا قلمی نسخہ ہے،

نہال چند لاہوری | یہ ایک افسانہ کا جس کا نام مذہب عشق ہے، مصنف ہیں، مذہب عشق میں نام و نشان نک ہیں، اس لئے اس ادیب کے حالات نامعلوم ہیں،

لالہ بھوپت رائے | فن بلاغت کی ایک کتاب دستور شگرف کا مصنف، تصنیف تو حیدرآباد (دکن) بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں قلمی موجود ہے، لیکن صاحب تصنیف کا تذکرہ مفقود ہے، حیدرآباد کا نسخہ سنہ ۱۱۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے،

لالہ بھیک رائے | فیض آباد کا باشندہ تھا، اس نے سعدی کی گلستاں میں پھول کھلائے یعنی اس کی شرح لکھی، جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود ہے،

منشی ایشری داس | کایستھ، امیر الامرا نواب غضنفر جنگ والی فرخ آباد کے منشی تھے، ایک فارسی تذکرہ کا مصنف اُن کی نسبت لکھتا ہے،

"نظم ونثر فارسی بہ فصاحت و بلاغت مشتمل بر لطائف و صنائع و بدائع لفظی و معنوی می نگاشت، از نقش بعض وقائع و سوانح بنظر گذشتہ، حق آنست کہ بکمال لطف و خوبی می نگاشت"

منشی ٹیک چند بہار | ان کا تذکرہ آگے آئے گا، یہاں صرف اس حیثیت سے اُن کو جگہ ملی ہے کہ یہ بوستان سعدی کے شارح اور بہار بوستان کے مصنف ہیں،

آنند رام | زمانہ متاخر کا ایک فارسی ادیب ہے، سنہ ۱۱۵۹ھ کے قریب میں اس دنیا سے چل بسا، لیکن اس کے چمنستان کی بہار اب تک باقی ہے، یہ ایک فارسی افسانہ ہے، سنہ ۱۲۹۴ھ میں یہ کتاب چھپ چکی ہے،

ماتا پرشاد | صحیفۃ الشوق نام ایک فارسی افسانہ کا مصنف ہے، اس کا قلمی نسخہ سنہ ۱۲۸۲ھ کا لکھا ہوا کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے،

دین دیال | عجیب القصص معروف بہ شبستان عشرت، ایک افسانہ فارسی زبان میں اس نے لکھا ہے، سنہ ۱۲۹۶ھ میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے،

امر سنگھ | رامائن امر پرکاش کے نام سے فارسی میں پاربتی. مہادیو. رام چندرجی، اور راجہ بسرت کے قصوں کو نظم کر گیا،

سیالکوٹی مل | اس کا ذکر آگے آتا ہے، یہ زمانۂ متاخر کا بہت بڑا ادیب تھا، صفاتِ کائنات کے نام سے فارسی علم بلاغت میں اس کی ایک کتاب ہے، جو ۱۲۹۵ھ میں چھپ گئی ہے، اس کی دوسری کتاب رجم الشیاطین ہے، جو سراج آرزو کی تنبیہ الغافلین کا جواب ہے، یہ دونوں کتابیں ادبی مطارحات پر مشتمل ہیں،

لچھمی نرائن | باپ کا نام مانی رام، سراج الدین آرزو کا شاگرد تھا، لاہور اپنا وطن چھوڑ کر دلی میں آکر ڈیرے ڈالے، دُرانی کے حملوں نے دلی سے نکال کر بریلی اور اورنگ آباد کی سیر کراتے ہوئے لکھنؤ پہنچا یا، یہ فارسی کا نامور انشاپرداز تھا، اس کے فارسی رقعے بہت مشہور ہیں، ۱۱۸۵ھ میں اس نے ان رقعوں کو ترتیب دیکر رقعات لچھمی نرائن نام رکھا،

لچھمی نراین | یہ حاجی پور (بہار) کا رہنے والا تھا، عالمگیر کے عہد میں شہزادہ بیدار بخت کی سرکار میں پیشکاری کے عہدہ پر تھا، اور سہ صدی منصب رکھتا تھا، ۱۱۰۸ھ میں اُس نے شاہنامہ کا انتخاب کیا، اس انتخاب کے دیباچہ کا پہلا شعر یہ ہے،

شکر و سپاس نعمت و منت خدائے را ۔۔۔ پروردگارِ خلق و خداوند کبریا

راجہ رام نرائن | لچھمی نرائن کا لڑکا، عظیم آباد. پٹنہ میں اُس نے بڑا سیاسی عروج حاصل کیا تھا، اور مدت تک اس کا خاندان معزز رہا، شیخ حزین کا شرف تلمذ اس کو حاصل تھا، خود صاحب ادب اور ادبائے زمانہ کا مربی تھا، نواب قاسم کی معرکہ آرائی کا نشانہ بنا تھا، وسیع النظر اور کتب بینی کا شائق تھا،

کیول رام | شاہ عالم کے عہد میں تھا، اور اودھ کے بیت الانشاء میں منشی تھا، ۱۱۹۷ھ

میں منشی کیول رام نے پچاس جز میں فن انشار پر ایک کتاب لکھی۔ اور طلسماتِ خیال اس کا نام رکھا،

پنڈت کرپان دھان	پنڈت جی کا جنم پتہ معلوم نہیں، مثنوی دلپسند کے مصنف ہیں،

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ۱۲۴۳ھ کا لکھا ہوا اس کا قلمی نسخہ موجود ہے،

منشی خیالی رام	لکھنو وطن، خیالی تخلص، نظم و نثر فارسی کے استاد، واجد علی شاہ

کے دربار سے تعلق تھا، اُن کی تصنیفات کی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ ہے، امیر خسرو کی سب سے مشکل کتاب اعجاز خسروی کی شرح لکھی،

منشی مادھو رام	دلی کے رہنے والے تھے، اور فارسی زبان کے استاد تھے، انشائے مادھو رام

اُن کا نتیجۂ فکر ہے جس میں بادشاہوں، شہزادوں، اور امرار کے نام خطوط ہیں، یہ پہلے نصاب فارسی میں داخل تھا،

ذیل کی سطروں میں چند اور نشآت کا نام نقل کرتے ہیں، اُن کے مزید حالات سے واقفیت نہ ہوئی،

کامتا پرشاد	انشائے بے نقط کا مصنف،
منشی کالی رائے	انشائے تمیز کا مصنف، اس انشار میں ایک خاص صنعتِ بدیع (ترک

حرف مسلسل) ملحوظ ہے،

دولت رام	کتاب کا نام انشائے دولت رام،
منشی جے سنگھ رائے	انشائے راحت جان کا مصنف ہے، اس کتاب میں سخاوت و عدالت وغیرہ

مختلف عنوانات پر مضامین ہیں،

ہر سہائے	انشائے ہر سہائے اس کی کتاب کا نام ہے، اس میں منشی گری کے قوانین نظم و نثر فارسی

میں بیان ہوئے ہیں،

منشی ہر نراین | دہلی کے باشندہ تھے، خیالات نادر اُن کے فارسی رقعات کا مجموعہ ہے،

لالہ نوندرائے | دستور الصبیان کے نام سے فارسی مکتوبات کے جامع ہیں،

پچھمی داس | پچھمی داس بن نرائن داس رقعات نظامیہ اس کا سرمایۂ کمال ہے چھپ گئی ہے،

خوشحال رائے | دستور الامتیاز کے نام سے قوانین انشا کا مدون ہے نسخہ موجودہ کتب خانۂ آصفیہ ۱۲۰۳ھ کا نقل کیا ہوا ہے،

نندرام | باپ کا نام ہیرانند، قانونچۂ انشا اس کی تالیف ہے، موضوع کتاب نام سے ظاہر ہے، قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے،

رام سنگھ | گلشن عجائب انشا میں اس کی کتاب ہے، نسخہ موجودہ آصفیہ ۱۲۲۳ھ کا چھپا ہوا ہے،

کشنا جی پنڈت | شاید دکھنی ہوں، ان کی نادر الانشا قلمی آصفیہ میں ہے،

رنچھور داس | جونپور کا رہنے والا تھا، دقائق الانشا کا مؤلف ہے،

(۲)

ہندو لغت نویس

کسی زبان کے جاننے کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اس زبان کی عبارت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے، اور اس میں لکھ پڑھ سکتا ہے، یہ تو نہایت ادنیٰ درجہ ہے، اصلی زبان دانی یہ ہے کہ وہ اہلِ زبان کی طرح اس زبان پر قابو رکھتا ہو، اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کے ماخذ و اشتقاق کا علم اور غلط و صحیح کی تمیز اور خواص کے طرز ادا، ترکیب الفاظ، ادائے مطلب اور محاورات پر اس کو دسترس ہو، ہندوستان میں جو ہندو ادبائے فارسی گذرے ہیں، غور کرنا چاہیئے کہ

کیا اُن کی واقفیتِ زبان، ہماری آج کل کی بیرونی زبان کی واقفیت کے معیار سے کچھ بلند تر تھی یا نہیں،

اکبر کے زمانہ تک فارسی زبان کے چھوٹے بڑے ۴۳ سے زیادہ لغت موجود تھے لیکن یہ تمامتر قدماء اور اہلِ زبان کے لکھے ہوئے تھے، جو اہلِ ہند کے ضروریات کے مطابق نہ تھے، بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جن کو ایک صاحبِ زبان لغت نویس مشکل اور قابلِ حل نہیں سمجھتا، حالانکہ غیر زبان دان کے نزدیک وہ سخت مشکل اور قابلِ حل ہیں، لغات سے زیادہ محاورات کا معاملہ سخت ہے، اہلِ زبان اُن کے ایک ایک نکتہ کو جانتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ تمام دنیا ان کو اسی طرح سمجھ لے گی، حالانکہ دوسری قوموں کو جن کی وہ زبان نہیں ہی مرحلہ دشوار نظر آتا ہے، غرض یہی اسباب تھے کہ جن کی بناپر ہندوا دباے فارسی کو، فارسی زبان کے لغات لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی،

ٹیک چند بہار| قوم کا کھتری، سراج الدین علی خاں آرزو اکبرآبادی کے ارشد تلامذہ میں تھا، فارسی زبان کی گرہ وبند پر اُسے کامل عبور تھا، اہلِ زبان کی مدت تک صحبتیں اٹھائی تھیں، اُس نے فارسی زبان کے کئی لغت لکھے، بہارِ عجم، نوادر المصادر اور جواہر الحروف وغیرہ، زیادہ مشہور بہارِ عجم ہے، اس کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے کہ بدو طفولیت سے ۳۵ سال کی عمر تک فارسی زبان کی تحقیق و کاوش میں لگا رہا، ۲۰ برس متصل اس نے لغت کی تالیف و ترتیب میں بسر کیے، اور سات دفعہ خود اپنے ہاتھ سے مسودہ کانٹ چھانٹ کر صاف کیا، یہ عمر کی آخری کمائی تھی، اور اسی پر جان دی، بہار کے شاگرد منشی اندرمن نے آٹھویں دفعہ مرتب کیا، اور خطبہ اور خاتمہ لکھ کر شاہ عالم کے زمانہ میں ۱۱۶۲ھ میں ختم کیا، بہارِ عجم اس قدر مقبول ہوئی کہ تمام اربابِ علم میں متداول ہوگئی، اور لوگ اس کی سندیں پیش کرتے ہیں،

ہر فارسی داں اس کے نام سے واقف ہے، محاورہ کے لئے اس نے اہل زبان کے شعر سند میں پیش کئے ہیں،

سیالکوٹی مل وارستہ | نام سے زیادہ یہ اپنے تخلص کے ساتھ مشہور ہے، شیخ حزیں پر سراج آرزو نے جو اعتراضات کئے تھے، ان کے جواب میں رجم الشیاطین اس نے لکھی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل زبان اور اساتذۂ فن کے مناظرات اور رد وکد میں جو صاحب نظر حملہ آور انہ اور خصوصًا مدافعانہ حصہ لے، وہ کس درجہ اس زبان پر عبور کامل اور وقوف تام رکھتا ہوگا، وارستہ نے اسی فارسی زبان کے عشق میں ایران تک کی خاک چھانی، اور کامل تیس برس اس ملک میں بسر کئے، اس سفر کے نتائج میں مصطلحات الشعرا اور صفات کائنات ہیں مصطلحات الشعرا گو صرف ۴۰۰ صفحے کی ضخامت کا لغت ہے لیکن پندرہ برس کی محنتوں کا صلہ ہے، وارستہ دیباچہ میں لکھتا ہے:

"اکثر محاورات غریبۂ فارسی زبانان در اشعار فصاحت بار دیدم بتحقیق آں کمر سعی مستحکم بربستم ہر چند گرد کتب لغات گردیدم نفحۂ حلِ معانی بعضے ازاں نشنیدم ناچار رجوع بزباندانانِ ایران دیار آوردم و پانزدہ سال دریں تلاش بسر بردم، انچہ از زبان آن جماعت شنیدم بروسے انتفاع جمہور سخن پردازاں خواستم، در حیز کتابت آوردم"

پنڈت گنگا بش | حال نہیں معلوم، اس نے فرہنگِ شیر و شکر کے نام سے عربی و فارسی الفاظ کا لغت لکھا ہے،

کاشی راج کھتری | لغت پنجابی کے نام سے فارسی زبان میں لغت لکھا ہے، اس کا قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے،

گردھاری لال | دکن کا باشندہ ۱۲۴۱ھ میں گنج اللغات فارسی کے نام سے کتاب لکھی

قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے۔

فرہنگ آنندراج — اس فرہنگ کا ذکر اس سلسلہ میں مناسب نہ تھا، کہ اولاً تو یہ ایک مسلمان کی تصنیف ہے، اور ثانیاً یہ کہ مسلمانوں کے عہد حکومت کے بعد لکھی گئی ہے لیکن صرف اس لئے اس کا تذکرہ مقصود ہے کہ اس سے اداے احسان کا موقع پیدا ہو، فرہنگ آنندراج چالیس پچاس برس ہوئے کہ مدراس کے ایک ہندو راجہ آنندرام کی فرمائش سے ترتیب پائی، یہ فارسی زبان کا سب سے ضخیم اور مطول لغت ہے، جو کئی جلدوں میں، اور لمبی تقطیع کے کئی ہزار صفحات میں تمام ہوا ہے، اس میں صرف خالص فارسی الفاظ نہیں ہیں جیساکہ دیگر لغت نویسوں نے کیا ہے، بلکہ اُن عربی الفاظ کو بھی لے لیا ہے، جو فارسی میں مستعمل ہیں، مصنّف کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ راجہ نے اس پر ہزاروں روپیے صرف کئے ہیں، اس کے لئے دور دور سے کتابیں منگوائیں، کتب خانہ قائم کیا، مصنّف کا وظیفہ مقرر کیا، اور خود چھپوا کر شائع کیا،

اس موقع پر ایک نکتہ کی بات ہم کہنا چاہتے ہیں، اگرچہ ہندوستانیوں نے انگریزی پڑھکر مرہٹی، بنگالی، اور اردو میں انگریزی ڈکشنریاں آج بھی لکھی ہیں لیکن درحقیقت انھوں نے اس میں صرف مترجمی کی خدمت انجام دی ہے یعنی کسی مستند انگریزی ڈکشنری کو سامنے رکھ کر اُس کے مقابل کے معنی اپنی زبان میں لکھ کر خانہ پُری کر دی ہے، لیکن جو خدمت کہ ٹیکچند بہار اور وارستہ نے اپنے زمانہ کی سرکاری زبان کی ادا کی، اور مثل ایک اہل زبان کے بذات خاص تحقیق وکاوش سے شعرار کے کلام پڑھ کر، ایرانیوں کی صحبتیں اٹھا کر، خود اہل زبان سے ملاقات اور چھیڑ چھاڑ کرکے انجام دی، اس کی نظیر اب تک تو پرانے "منشی" کے نوجوان "مسٹر" نہ دکھا سکے"

منشی کامتا پرشاد | نادان تخلص، وطن دکن ہوگا، انھوں نے فارسی قواعد کی کتاب "ہفت گل" لکھی، آصفیہ میں اس کا نسخہ ہے،

مینڈو لال | زار تخلص، بہارِ علوم کے نام سے فارسی قواعد کی کتاب تصنیف کی، قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے،

مُترجمین

دو مختلف قوموں کے متضاد عناصر کو مُتحد کرنے کے لئے بہترین کیمیا وہی مسالہ دونوں قوموں کے لٹریچر کو متحد کر دیتا ہے، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے صبح امید لکھنو کے پہلے نمبر میں اس مقصد پر بڑا زور دیا ہے، ہم کہتے ہیں کہ ہاں اس جدید زمانہ میں از سرِ نو کوشش کی ضرورت ہو لیکن پرانے عہد کے بزرگوں نے اپنے دورِ عمل میں اس خیال کو پیشِ نظر رکھا اور انکو کامیابی ہوئی، اس وقت میرا موضوعِ سخن یہ نہیں ہے، کہ مسلمانوں نے کیا کیا، بلکہ یہ ہے کہ اُس عہد کے ہندوؤں نے کیا کیا،

اس خیال کی اصلی کامیابی ملک کے مترجم طبقہ کے ہاتھ میں ہے، جو ایک قوم کے خیالات کو دوسری قوموں کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے کہ ان دونوں میں کچھ بیر نہیں، بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں، اگرچہ ترجمہ کا سلسلہ مسلمانوں کے آغازِ عہد سے قائم تھا لیکن وہ صرف علمی ذوق کا نتیجہ تھا، قوموں کی باہمی بے گانگی اور اجنبیت کا دور کرنا اس کا مقصد نہ تھا،

اکبری عہد میں حکومت کی خواہش کے مطابق مسلمان علما اور ہندو پنڈتوں نے مل کر رامائن، مہابھارت، سنگھاسن بتیسی، لیلاوتی، نلدمن، تاجک، ہری بنس، اتھربن وید

وغیرہ کتابوں کا ترجمہ کیا، وہ پنڈت جو ان میں سے بعض کتابوں کے ترجمہ میں شریک غالب رہے، یہ تھے، گنگادھر بھٹ، مہانند، کشن جوشی بھاون، افسوس ہے کہ ان ناموروں کے حالات نہیں معلوم،

اب وہ زمانہ بھی آیا جب کہ بادشاہوں کی خوشی کے لئے نہیں، بلکہ اپنی خوشی کے لئے فارسی داں ہندو پنڈتوں نے اس کام کو ازخود انجام دینا شروع کیا،

گردھرداس | قوم کایستھ، متوطن دہلی، شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں تھا، سنہ ۱۰۳۲ھ میں اس نے رامائن کا ترجمہ فارسی نظم میں کیا، یہ کتاب برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے،

بنوالی داس | ولی تخلص، شہزادہ داراشکوہ کا میر منشی (چیف سکرٹری) تھا، سنہ ۱۰۷۳ھ میں اس نے بھاکا سے پربودھ چندرودیا نام ایک افسانہ کا فارسی میں ترجمہ کیا،

پنڈت لچھمی نرائن | انھوں نے شنکر آچاری کی پوتھی، اپرو کھا نبوتی کا ترجمہ حدائق المعرفت کے نام سے فارسی میں کیا،

منشی لچھمن لال | جہاں ظفر کے نام سے رامائن کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا،

امر سنگھ | رامائن امر پرکاش کے نام سے بادتی، مہادیو، رام چندر، راجہ دسرتھ کے حالات زبان دانانِ فارس کو سنائے،

پنڈت امرناتھ | شیدا تخلص، چاروں بیدوں کے مطابق دنیا کے جو احوال تھے، وہ فارسی میں خیالات شیدا کے نام سے بیان کئے ہیں، یہ کتابیں کتب خانہ آصفیہ میں ہیں،

رام پرشاد | اودھ کا باشندہ تھا، نواب ناظم محمد داراب خاں کا خزانچی تھا، اس نے سنہ ۱۲۲۰ھ میں نواب مذکور کی فرمائش سے امت چندر کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا، اور مخزن العرفان اس کا نام رکھا،

گوپال | خلف سری گوبند، اُس نے سری بھاگوت دادھیا تھماراین کا ترجمہ فارسی میں کیا، ۱۸۲۵ء کا لکھا ہوا نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے،

انندگھن گوشائیں | متخلص بہ خوش۔ اُس نے پوتھی کاشی کھنڈ اس کو فارسی زبان میں منتقل کیا، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں جو نسخہ ہے وہ ۱۲۰۱ھ کا لکھا ہوا ہے،

انندکنوار | حالات نہیں معلوم، پوتھی موچھ دھرم گیان ساگر کا قلمی نسخہ جو اُس نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا سوسائٹی مذکور کے کتب خانہ میں ہے،

زورآور سنگھ | اُس نے پوتھی بیاارنہہ کو فارسی زبان میں منتقل کیا،

مرلی دھر | پوتھی سری بھاگوت کا فارسی میں مترجم، قلمی نسخہ سوسائٹی میں ہے،

راؤ دیت سنگھ | اہلِ تاریخ کے سلسلہ میں اس کا حال گذر چکا ہے، مہاراجہ جگت سنگھ والی اودے پور کی سرکار میں نوکری کے زمانہ میں اُس نے ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا، بادۂ شیرازہ کو سفالِ ہندی میں بھر کر ملک کے سامنے پیش کیا یعنی دیوانِ حافظ کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا،

(۷)

علومِ عقلیہ کے ہندو علماء

علومِ عقلیہ سے میری مراد طبیعیات، الٰہیات، ریاضی، ہیئت، طب، وغیرہ جملہ علومِ حکمت ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان بھی ان ممالک میں سے ایک ہے جن کو علومِ عقلیہ کا جنم بھوم کہنا چاہیئے، یہ بحث دوسری ہے، کہ یہ علوم یہاں پیدا ہوئے جیسا کہ اہلِ ہند کا دعویٰ ہے، یا سکندر کے بعد یونانیوں کے ذریعہ سے یہ علوم یہاں منتقل ہوئے، جیسا کہ اہلِ یورپ

کا بیان ہے، بااین ہمہ یہ ماننا پڑے گا، کہ اہل ہند نے ان علوم میں کافی دستگاہ حاصل کرلی تھی، اور ریاضیات و ہیئت میں ایک حد تک استادی کے رتبہ کو پہونچ گئے تھے،

ہندوؤں کے دماغ کو ریاضیات سے ہمیشہ ایک خاص مناسبت رہی ہے، مسلمانوں کے عہد حکومت میں علوم عقلیہ کے جو ہندو نامورہیاں پیدا ہوے، ان میں مہندسین اور علمائے ریاضیات کی تعداد زیادہ ہے،

بیرونی کے ذریعہ سے جن برہمنوں نے عربوں کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا تھا، افسوس کہ ان کے حالات ہم کو نہیں معلوم اور نیز بعد کی صدیوں میں جن ہندو بزرگوں نے ادھر توجہ کی، اُن کے نام سے بھی ہم واقف نہیں، تاہم اتنا معلوم ہے کہ سنسکرت میں عربوں کی تحقیقات عقلی کی کافی آمیزش موجود ہے، چنانچہ تمدن ہند کا فرنچ مصنف شہادت دیتا ہے، "کہ گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے کہنا چاہئے کہ ہندی علوم سے مراد عربی علوم ہیں، پس ہم کہہ سکتے ہیں، کہ ہندی علوم جن کی ابتدا پانچویں صدی عیسوی میں آریہ بھٹ کے ریاضیات سے ہوئی، اور پھر ساتویں صدی میں برہم گپت نے اُن پر اضافہ کیا، اس زمانہ سے لیکر آج تک انہی مسائل سے بحث کرتے ہیں، جو ہند میں (یونانی اور مسلمان) ان دو ذریعوں سے آئے"

عہد اکبری کے ہندو علمائے معقولات

ابوالفضل تنہا مورخ ہے جس نے اپنے بادشاہ کے عہد کے جزئی سے جزئی واقعہ کو قلم انداز نہیں کیا، آئین میں "دانش آموزان دولت" کے عنوان سے ہر فن کے ۱۴۲ علما کے نام لکھے ہیں، اس کاغذی دربار میں بلا تفریق ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے اکابر علم اور اساطین فلسفہ دوش بدوش بٹھائے گئے ہیں" شناسائے عقلی کلام" کے عنوان میں ابوالفضل نے اپنے زمانہ کے حسب ذیل اشخاص کے نام لکھے ہیں،

نارائن، مادھو بھٹ، سری بھٹ، بشن ناتھ، رام کشن، بلبھدر مصر، باسدیو مصر

باہن بھٹ، بدیا تواس گورہی ناتھ، گوپی ناتھ، کشن پنڈت، بھٹا چارج، بھاگیرت، کاشی ناتھ بھٹا چارج،

جن ہندو پنڈتوں نے مرزا الغ بیگ کی زیج جدید جو مسلمان علمائے ہیئت کی تحقیقات اخیر کا مجموعہ ہے مسلمان علماء کی زیر نگرانی فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا تھا، اُن کے نام یہ ہیں، کشن جوتشی، گنگا دھر جیتس، مہا آنند،[1]

جے سنگھ کے رصد خانے

مسلمان سلاطین نے دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں اُن کے تمدن نے فروغ پایا، تحقیقات فلکیہ کی تکمیل کے لئے رصد خانے قائم کئے، ۱۹۰۹ء کے الندوہ میں میں نے متعدد نمبروں میں ان رصد خانوں کے حالات و تحقیقات، کی تفصیل لکھی ہے، اس وقت سلسلۂ سخن کے طور پر یہ کہنا ہے کہ ہندوستان میں متعدد مسلمان سلاطین نے رصد خانے قائم کرنے چاہے، فیروز شاہ بہمنی، اور شاہجہاں نے کام کو شروع کرایا لیکن مختلف وجوہ سے ناتمام چھوڑنا پڑا، یہ مہم درحقیقت محمد شاہ کے عہد حکومت کے لئے اُٹھ رہی تھی،

راجہ جے سنگھ سوائی کچھواہا امبیر کا راجہ تھا، اورنگزیب عالمگیر اور اس کے جانشینوں کے ایام سلطنت میں ایک فوجی افسر کی حیثیت سے نمایاں عزت حاصل کی، محمد شاہ کے عہد میں وہ آگرہ اور مالوہ کا گورنر مقرر ہوا، اس نے اپنی ریاست کا نیا مرکز جے پور کے نام سے آباد کیا، اور اب اسی نام سے یہ پوری ریاست موسوم و معروف ہے، جے سنگھ ایک نہایت علم دوست، اور عالم راجہ تھا، عربی علوم و فنون میں وہ اچھی دستگاہ رکھتا تھا، اور علم ہیئت سے اس کو ایک خاص ذوق تھا،

راجہ جے سنگھ نے الغ بیگ کی زیج جدید ملا چاند اکبری کی تسہیلات اور ملا فرید شاہجہانی

---

[1] آئین اکبری، آئین تصویر خانہ،

کی زیج شاہجہانی کے اصول پر زیج محمد شاہی ترتیب دی، اور بادشاہ کے حضور میں پیش کی، یہ وہ زمانہ تھا، جب اہل یورپ کے فضل و کمال کی طرف اہل ہند کی نگاہیں اُٹھ رہی تھیں، بادشاہ کے حکم سے مسلمان، برہمن اور فرنگی علمائے ہیئت جمع کیے گئے، اور دلی میں ایک جدید رصد خانہ کی تعمیر کا کام ۱۱۳۷ھ میں شروع ہوا، مرزا امیر اللہ مہندس اس کے مہتمم تھے، اس رصد خانہ میں بعض آلات ایسے تھے، جو سمرقند کے الغ بیگی رصد خانہ میں استعمال ہو چکے تھے، اور بعض بالکل نئے تھے اور خود ان کے ایجاد کردہ تھے،

راجہ نے اس غرض سے کہ رصد خانہ کی تمام تحقیقات پوری اتریں، اور ان کی تصدیق ہوتی جائے، رصد خانۂ دہلی کے نمونہ پر جے پور، متھرا، بنارس اور اجین میں بھی رصد خانے بنوائے، دلی اور بنارس کے رصد خانوں کی ٹوٹی پھوٹی یادگاریں تو اب تک باقی ہیں، اور میں نے دیکھی ہیں، باقی شہروں کا حال معلوم نہیں،

بہرحال ان رصد خانوں میں ہندو مسلمان اور فرنگی علمائے ہیئت نے سات برس تک کام کیا، اور اس کے بعد کچھ لوگ پادری مینویل کی ماتحتی میں، یورپ بھیجے گئے، وہاں سے یہ علمی جماعت جو معلومات لے کر آئی، اُن کا اپنے اصول کے مطابق یہاں مقابلہ کیا گیا، یہ مشرق کا پہلا رصد خانہ ہے جس نے مغربی تحقیقات کی موافقت کی، اس رصد خانہ کی تحقیقاتِ فلکی سے زیج محمد شاہی تیار کی گئی، جو تین مقالات پر مشتمل ہے، اوّل در معرفتِ سنین، دوم در معرفتِ طالع ہر وقت، سوم در معرفت رفتار سیارات و ثوابت،[۵۱]

راجہ نے اس راہ میں ایک اور اہم خدمت انجام دی، عربی زبان کی مستند علم ہیئت کی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کرایا، اور اس پر ہزاروں روپے صرف کیے،[۵۲]

---

۵۱ مقدمۂ زیج محمد شاہی ۵۲ سبحۃ المرجان آزاد بلگرامی،

بہادر خاں والی ٹکاری احتشام الدولہ، مبارز الملک راجہ خان بہادر نصرت جنگ، ہمارے اس عہد کے ہندو دوست سمجھتے ہوں گے کہ یہ کسی مسلمان امیر کا نام ہوگا لیکن اُن کو سننا چاہیئے کہ یہ مہاراجہ ستر جیت سنگھ راجہ ٹکاری (صوبہ بہار) کے فرزندار جمند کا نام ہے، یہ راجہ غدر سے ۳۰ برس پہلے تھا، راجہ مذکور تمام علوم وفنون عربی و فارسی میں ماہر تھا، اس کا دربار مسلمان اور ہندو فضلائے عصر سے بھرا ہوا تھا، اس زمانہ میں مولانا غلام حسین جونپوری ایک نامور ریاضی داں تھے، وہ بھی اس راجہ کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے، مولانا راجہ کے فضل و کمال کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں :۔

"چنانچہ فنے از فنونِ متداولہ وعلمے از علومِ متداولہ مطروح نشدہ کہ در ذات شریف آں یگانہ جمع نیامدہ باشد"

راجہ نے ایک دن اپنی بزم علم میں تذکرہ کیا، کہ روز بروز علم کا فقدان ہورہا ہے اور اس کے متعدد وجوہ ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ علوم و فنون کی زیادہ تر کتابیں عربی زبان میں ہیں جن سے فارسی خواں فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس لئے مناسب ہے، کہ فارسی میں ایک ایسی جامع کتاب لکھی جائے، جو ہر قسم کے اصول و فروع پر مشتمل ہو، تین سو برس ہوے کہ علامہ عبدالعلی برجندی کے زمانہ سے اس وقت تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، اس تقریر کے بعد راجہ نے مولانا غلام حسین کو حکم دیا کہ اس مجوزہ تصنیف کا کام شروع کریں،

مولانائے موصوف نے جامع بہادر خانی کے نام سے ایک ایسی مکمل اور جامع کتاب ریاضیات پر فارسی میں لکھی، جس سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب شاید عربی میں بھی نہ ہوگی، اس کو علوم ریاضیہ کی انسائیکلو پیڈیا کہنا زیادہ موزوں ہوگا علم ہندسہ، علم الابصار، علم المناظر، علم حساب، جبر و مقابلہ، جومیٹری، علم ہیئت، علم آلات رصد و قواعد رصد وغیرہ اصلی ابواب کے تحت میں

بیسیوں فروعی مباحث اور فصول ہیں، پوری کتاب لمبی اور چوڑی تقطیع کے ۱۴۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اور ہر صفحہ میں ۲۵ لمبی اور باریک سطریں ہیں، ۱۲۴۳ھ میں شروع ہوئی، اور ۱۲۴۹ھ میں تمام ہوئی اکبرثانی کا یہ زمانہ تھا، کتاب میں جہاں کہیں ستاروں کے طلوع وغروب کا وقت دیا گیا، ہی قلعہ نکاری کے مطالع ومغارب کے حساب سے دیا ہے، مصنف جا بجا قدیم تحقیقات کو یورپ کے جدید معلومات سے موازنہ بھی کرتا گیا ہے،

راجہ رتن سنگھ زخمی | قوم کایستھ، سکینہ، ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوا، اس کا خاندان تین پشتوں سے دربار اودھ کے معزز عہدوں پر ممتاز چلا آتا تھا، لکھنؤ کی درسگاہوں کے آغوش میں اس کے فضل وکمال نے نشو ونما پایا، عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور کسی انگریزی زبان سے واقفیت تھی، علم ہیئت میں اس کو استادی کا رتبہ حاصل تھا، فارسی شعروسخن سے بھی ذوق رکھتا تھا، کچھ دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی، اس کے بعد اودھ میں اپنے خاندانی عہدہ پر ممتاز ہوا، محمد علی شاہ کے زمانہ میں دیوان شاہی مقرر ہوا، اور فخرالدولہ دبیرلملک ہوشیار جنگ کے خطاب سے مخاطب ہوا،

۱۲۵۳ھ میں محمد علی شاہ کے حکم سے ہیئت میں حدائق النجوم نام ایک جامع کتاب فارسی زبان میں لکھی، جو ۵۰ جز میں جاکر ختم ہوئی ہے، جدید مغربی تحقیقات کو پرانے عربی معلومات سے اس نے پیوند دیا ہے، یہ کتاب اپنے باب میں نہایت مستند اور معرکۃ الآرا سمجھی جاتی ہے، اور ارباب علمائے اسلام میں ہیئت کی اعلیٰ کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے،

روپا نرائن | ۱۱۲۹ھ میں وفات پائی، علم ہندسہ میں شش جہات نام ایک کتاب لکھی، جو اس فن میں نہایت وقیع خیال کی جاتی ہے، قلمی نسخہ موجود ہے،

اندمن | منشی ٹیک چند بہار کا شاگرد تھا، اصل وطن حصار تھا، لیکن توطن شاہجہان آباد میں

اختیار کرلیا تھا، بہارِ عجم کو اسی نے آخر میں مرتب کیا تھا، ریاضیات میں اس کو ید طولیٰ حاصل تھا، عربی وفارسی کا عالم تھا، ۱۱۰۸ھ میں دستور الحساب نام کتاب علم الحساب (میتھمٹکس) میں تالیف کی، کتبخانہ بانکی پور میں اس کا قلمی نسخہ ہے، کتاب، اخیر میں تمام ہوئی ہے،

میدنی لل | قوم کایستھ، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں تھا، علوم عقلیہ کا واقف کار تھا، ۱۰۸۰ھ میں بدائع الفنون کے نام سے ریاضیات میں ایک عمدہ کتاب لکھی، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں،

رام پرشاد | عظیم آباد پٹنہ وطن تھا، علم ہندسہ میں مفتاح الناظرین اس کی تالیف ہے، ۱۲۵۰ھ میں اس کی یہ کتاب کلکتہ میں چھپی تھی،

دیوان کانجی | یہ بھی عظیم آباد پٹنہ کے باشندے تھے، ریاضیات و ہندسہ میں خزانۃ العلم ان کی کتاب ہے، ۱۸۳۷ء میں یہ کتاب کلکتہ کے چھاپہ خانہ میں طبع ہوئی تھی،

رام منوں لال فلسفی | علوم حکمت اور فلسفہ میں ممتاز و معروف تھے، شاعر بھی تھے فلسفی تھے، اور فلسفی بننے کے مدعی تھے، اس لئے فلسفی تخلص کرتے تھے، اُن کے بیٹے کندن لال نے اپنی ایک تصنیف میں اپنے خاندان کا حال لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم وکمال کا پورا مطلع تھا، شاہجہاں کے زمانہ سے اس خاندان میں علم و دولت ساتھ ساتھ تھی، سندیلہ کے برہمن تھے، راے منوں لال کی نسبت لکھا ہے،

"پدر فقیر راے منوں لال فلسفی تخلص کہ در علوم حکمیہ یادگار حکماے سلف بودند و صاحب تصانیف کثیرہ"

راے منوں لال پہلے نواب فیض اللہ خاں کی سرکار میں تھے، اس کے بعد نواب آصف الدولہ کے دربار میں گئے، اور یہاں سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی میں آئے، اور غالباً یہیں کسی قدر انگریزی

حاصل کی، ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی، اور گیارہ کتابیں مختلف علوم و فنون میں اپنی یادگار چھوڑیں، گلستان ارم، بوستان حیرت، شارستان نور، دیوان اشعار، تنقیح الاخبار جغرافیہ، یہ کتابیں ادب و تاریخ میں ہیں، خالص فلسفہ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

سدید الاستخراج، کتاب احکام، عجائب در علم حساب، ہیئت، حکمت انگریزی، مفردات طب،

کندن لال اشکی، یہ اسی اموربا کا فرزند تھا، باپ اور چچا کے زیر عاطفت عربی، اور فارسی علوم کی تحصیل کی، ۲۲ سال کی عمر تک بریلی، رامپور، دہلی، اور بنارس کی درسگاہوں میں عمر گذاری، سنسکرت میں سری کب اندرجھا کے شاگرد تھے، کچھ سال ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں بسر کئے، اور آخر نواب منتظم الدولہ ناظم الملک مہدی علی خان کی وساطت سے محمد علی شاہ اودھ کے دربار میں پہونچے، چار صدی منصب پایا، دفتر انشار میں کسی عہدہ پر ممتاز ہوئے، منتظم الدولہ کی وفات کے بعد خدمت سلطانی سے مستعفی ہو کر بنارس میں گوشہ نشینی اختیار کی،

کندن لال عربی اور نیز اسلامی علوم میں استادی کا درجہ رکھتے تھے، حدیث و فقہ پر بھی اُن کی نظر تھی، فلسفہ و ریاضیات سے اُن کو خاص ذوق تھا، ہیئت میں انھوں نے زیچ اشکی ترتیب دی، فلسفہ میں حکمت ہندیہ، اکسیر سعادت، اور قسطاس تین کتابیں فارسی زبان میں لکھیں، اخیر کتاب درحقیقت تمام علوم و فنون کی انسائیکلو پیڈیا ہے، کندن لال نے اس کو چار حصوں پر منقسم کیا ہے، پہلے حصہ میں ہندوؤں کا فلسفہ ہے، دوسرے میں یونانیوں کا، تیسرے میں عربوں کے علوم اور چوتھے میں یورپ کی جدید سائنس، کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی علم و فن سے بے گانہ ہے، کتاب ۱۲۲۵ھ میں مطبع محمدیہ لکھنؤ میں چھپی،

انتظاماتِ مالی

اس فن پر ہندو مصنفین کی تین کتابیں ملی ہیں، جن کا ذکر بہ ترتیب آتا ہے، اس فن پر اُن کی توجہ اس لئے مبذول ہوئی، کہ زیادہ تر یہ عہدے ان ہی کے زیر اقتدار رہتے تھے،

چھتر مل | ولد رائے پران چند اُس نے اس فن میں ایک نادر کتاب یادگار چھوڑی ہے، جس کا نام دیوان پسند ہے، دیوانِ زراعت، محاصل زراعت کے اعلیٰ عہدہ دار کو کہتے تھے، دیوان پسند یعنی وہ کتاب جو ہر دیوان کے لئے اس کے ادائے فرائض میں معین ہے، مصنف نے باب کے لئے اس میں دستور کا لفظ پسند کیا ہے، دیوان پسند چار دستوروں پر منقسم کیا ہے،

۱- دربیان درستی زمین ہائے کاشتکاری وتعین جمع سرکار و بعضے حساب در پیداواری اجناس (۲) سیاق وشمار و بعضے انتظام مہمات (۳) مزروعہ و بعضے وست (۴) مالی و ملکی دستاویزات معاملہ،

دیباچہ میں مصنف اپنی معاملہ فہمی اور انتظامی مہارت پر بے انتہا فخر کرتا ہے، زمانۂ جو نہیں معلوم، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اس کی یہ تصنیف ۱۲۲۵ھ کی لکھی ہوئی ہے،

جگیت رائے | حالات و زمانۂ وجود نہیں معلوم، سیاق یعنی کاغذات و حسابات مالی کے قواعد ترتیب میں سیاق فارسی اس کی تصنیف ہے،

مدن لعل | مجموعۂ سیاق (فارسی) کا مصنف، یہ دونوں رسالے قلمی کتب خانۂ آصفیہ میں ہیں،

تند رام | سیاق نامہ (فارسی) کتب خانۂ آصفیہ میں ۱۸۷۹ء کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے،

نجوم

بیربل | یہ نہیں معلوم کہ یہ کون بیربل ہے، رسالہ نجوم فارسی میں اس کی تصنیف ہے،

خوش وقت رائے | ولد بھوپت رائے، خاص النجوم کا مصنف،

سداسکھ کول | باپ کا نام کیول رام کول کاشف الدقائق، نجوم میں اس کی تصنیف ہے،

جواہر سنگھ | جواہر افلاک، وجواہر ادراک کا مصنف،

یہ تمام قلمی رسالے کتب خانہ آصفیہ میں ہیں،

(۸)

طب اور دیگر علوم متفرقہ

ہندوؤں کے یہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے طب میں دو کتابیں مشہور تھیں، چرکا اور سشرت کی کتابیں، مسلمانوں کا علم، طب، عرب، یونان، ایران، اور ہندوستان کے تجربات کا خلاصہ تھا، اور خود انھوں نے بہت کچھ اس پر اضافہ کیا تھا، اس لئے یہ نیا علم طب ہندوستان کے قدیم طب پر امتیاز خاص رکھتا تھا، ہندوستان کے علم طب میں مسلمانوں کی آمد کے بغیر جو ترقیاں رونما ہوئیں، وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) حاکم قوم اپنے علوم وفنون کو محکوم قوم کے علوم وفنون سے بہت بالا دست سمجھتی ہے، اور اس سے استغنار برتتی ہے، چنانچہ اسی علم طب کے متعلق دیکھئے، کہ گذشتہ کونسل میں جب بعض ممبروں نے دیسی طب کی سرکاری حمایت اور اس کو مستند تسلیم کرنے کا رزولیوشن پیش کیا، تو بے اتفاقی کے ساتھ رد کر دیا گیا لیکن مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ایسا نہیں کیا، ہندی

علم طب کی بیسوں کتابیں انھوں نے اپنی زبان میں منتقل کیں، اور اپنا علم طب ہندوستان میں پھیلایا،
خاص اہل ہند کے مزاج اور طبیعت کا خیال کرکے خود انہی کے علم طب کو فارسی میں منتقل کیا، اور
شاہی حیثیت سے اس کو مستند قرار دیا، سلطان سکندر لودی سے خواص خان ایک درباری امیر
نے عرض کی کہ جہاں پناہ! یونانی طب ہندوستان کی آب و ہوا کے موافق نہیں ہے، حکم ہوا کہ
سنسکرت سے ہندی طب کو فارسی میں منتقل کیا جائے، چنانچہ میاں ہوہ بن خواص خان نے
اس کام کو انجام دیا، اور کتاب کا نام معدن الشفا، سکندر شاہی رکھا، قاسم فرشتہ نے اکبری عہد
سے پہلے اختیاراتِ قاسمی کے نام سے ہندی علم طب کو زندہ کیا، ہندوستان میں اس وقت
فارسی میں جو علم طب ہے، اور خصوصاً خاندانی اطباء کے سفینوں میں اور مجربات ناموں میں
سیکڑوں نسخے اور دوائیں ہندوستان زاہیں، اسی طریقہ سے بیدوں نے مسلمانوں کے سیکڑوں
نسخے، دوائیں، اور اصول علاج اپنے ہاں لے لئے، اور اس طرح مل ملاکر ایک ایسا طرز علاج رائج
ہوا، جو ہندوستان کے حالات کے مطابق تھا،

(۲) پہلے بیدوں میں وہ دوائیں، متداول تھیں، جو ہندوستان میں پیدا ہوتی تھیں،
طب اسلامی نے تمام دنیا میں جو دوائیں، جڑی بوٹیاں زیر تجربہ آچکی تھیں، اُن کو ہندوستان میں
رواج دیا، اُن کے فوائد و منافع لوگوں نے سیکھے، مفردات کے ذخیرہ کو بیحد بڑھا دیا،

(۳) دواؤں کی ترکیب میں عرق، معجون، قیروطی، سفوف وغیرہ مختلف طریقوں
کو پھیلایا،

(۴) چیچک وغیرہ متعدد بیماریاں جن کو یہاں وہم پرستی سے دیوتاؤں، دیبیوں اور
بھوت پریت کا اثر سمجھا جاتا تھا، اور اس لئے ان کا طبی علاج نہیں کیا جاتا تھا، ان کو لائق
علاج بتایا، چیچک کی بیماری پر سب سے پہلی کتاب عربوں ہی نے لکھی،

اب ہم ذیل میں بعض ہندو طبیبوں کا حال لکھتے ہیں۔

ہندو اطبّار

یہ سلسلہ اس قدر پھیلا کہ اہلِ بزم گو زبان سے تو نہ کہیں لیکن ان کے تیور سے پہچانتا ہوں کہ وہ گھبرا اٹھے ہیں لیکن،

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

پچھلی داستان میں ہم طب تک پہونچے تھے، اب ہماری کہانی کا سلسلہ آگے چلتا ہے، اور عہدِ اسلامی کے بعض ہندو طبیبوں کا حال سناتے ہیں؛

دربارِ شاہی میں مسلمان اطبّا کے ساتھ ہندو طبیبوں کا رہنا بھی ضروری تھا، چنانچہ ہندو علمار کے مختلف طبقوں میں سے جو طبقہ شاہانِ اسلام کی جانب پہلے رجوع ہوا، وہ ہندو طبیب تھے، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندو اطبار میں سے جس سے ہم پہلے واقف ہوئے، وہ سری بھٹ ہیں،

سری بھٹ یہ حکیم سلطان زین العابدین (۸۲۶ھ) والیٔ کشمیر کے دربار میں تھا، بادشاہ نے اس کی خود تربیت کی تھی، فرشتہ میں ہے،

"سلطان بجہت طبابت سری بھٹ را کہ طبیبِ حاذق بود تربیت کرد"[۱]

اطبائے عہدِ اکبری اکبر کے عہدِ حکومت کے نامور ہندو اطبا کے چند نام ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھے ہیں، جو یہ ہیں، مہادیو، بھیم ناتھ، نراین، سیوجی، افسوس کہ ان کے حالات ہم کو نہیں معلوم،

---

[۱] فرشتہ ذکر بہمن شاہیہ، ج ۲ ص ۱۷، نولکشور،

سکھراج | اس کا باپ اسد خاں وزیر عالمگیر کی سرکار میں تھا، سکھراج علاوہ دیگر علوم عقلیہ کے فن طب میں کامل دست گاہ رکھتا تھا، سید علی حسین خاں کی سرکار میں پانصدی منصب پر ممتاز تھا،

منشی لچھمی نراین گنجاوی | ان کا ذکر زمرۂ شعراء میں بھی گذر چکا ہے، یہ بھی مسلمان طبیبوں کی درسگاہ سے فنِ طب کے ماہر بن کر نکلے تھے، ان کا خاندان عالمگیری و محمد شاہی درباروں کے متوسلین میں تھا،

منشی رام پرشاد عظیم آبادی | خلف گنگا پرشاد، گو طبیب تھے، لیکن طبابت کا پیشہ نہیں کرتے تھے، کمپنی کے زمانہ میں پٹنہ کی صدر امینی قبول کرلی تھی، پنڈت دیا رام کی فرمائش سے ۱۲۴۷ھ میں معیار الامراض نام ایک کتاب فنِ طب میں تالیف کی، جس میں سر کے بال سے پاؤں کے ناخون تک کی کل بیماریوں کے قوانین کلیہ لکھے ہیں، یہ کتاب اسی زمانہ میں چھپ بھی گئی تھی،

رائے منوہر لال فلسفی | المتوفی ۱۲۴۳ھ دیگر علوم عقلیہ کے ساتھ طب کا بھی ماہر تھا، مفرداتِ طب میں اس کی ایک تصنیف ہے، علوم عقلیہ کے ذیل میں اس کا نام آچکا ہے،

لالہ سوہن لال | سوہن لال سندیلوی رائے منولال کا بھائی تھا، فارسی کا ادیب اور طب میں یگانۂ عہد تھا، اس کا بھتیجا کندن لال قسطاس کے خاتمہ میں لکھتا ہے،

"عمویم لالہ سوہن لال کہ طبیبِ حاذق و ادیب کامل بودند"

بچولال تمکین | حیدر آبادی، اس نے اپنے طبی مجربات دو جلدوں میں لکھے ہیں، یہ دونوں جلدیں قلمی کتبخانۂ آصفیہ میں ہیں،

پنڈت لالہ چند | اس کی ایک تصنیف کحل الابصار کا ایک قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مخصوص آنکھ کی بیماریوں کے علاج میں ہے،

جیاناتھ | اس نے ویدک سے باکا ہوی کالی کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، قلمی نسخہ

آصفیہ میں ہے،

منشی مہتاب نرائن، | ضروری الطب کا مصنف ہے، اس کا موضوع ادویہ کے خواص ہیں،

یہ ان ہندو طبیب مصنفوں کی مختصر فہرست ہے، جنھوں نے فارسی زبان کو اپنے اظہار خیال کا آلہ بنایا، بیسیوں مصنفین اس کے علاوہ ہیں، جنھوں نے اسلامی طب کو ہندی مرہٹی بنگالی، اور تلنگی میں منتقل کیا، تلنگی کی بعض طبی کتابوں کے نام کتب خانہ آصفیہ کی فہرست میں موجود ہیں یہ اسی وسعت کا اثر تھا، کہ شہروں کو چھوڑ کر دیہات اور قصبوں تک کے ہندو بنیے طبی دواؤں کے بڑے بڑے عطار بن گئے، اور عرب وایران و ترکستان کی دوائیں، اُن کی دکانوں پر بکنے لگیں، اور زمانہ کی شدید مخالفتوں کے باوجود اُن کے آثار اب تک باقی ہیں،

اخلاق وتصوّف

اس مضمون پر مفصل بحث تو ایک مستقل عنوان" اسلام کا اثر ہندو مذاہب پر" میں ہوگی، یہاں علمی حیثیت سے صرف چند ہندو مصنفین کا تذکرہ مقصود ہے، جنھوں نے ان مسائل پر اظہار خیال کیا ہے،

بابا نانک | جو سکھ فرقہ کے بانی ہیں، وہ فارسی میں بہت اچھی دستگاہ رکھتے تھے، اُن کے گرنتھ میں فارسی کے سیکڑوں اشعار اور الفاظ ہیں، اور مولوی رومی اور حافظ وغیرہ صوفی شعراء کے تو وہ دلدادہ تھے، فارسی میں اُن کی دو کتابیں تصوف میں ہیں، الہٰی نامہ اور طلب ایک اور مناجات بحر طویل میں ان کی ہے، یہ تینوں رسالے آصفیہ میں ہیں،

راس تی داس | عالمگیر ثانی کے عہد میں تھے، محیط معرفت تصوف میں اُن کی کتاب ہے، ۱۸۶۵ء میں چھپ بھی گئی ہے،

لال جی داس | بابا لال گرو (دارا شکوہ کا مرشد) چیلا تھا، بابا لال کے ملفوظات ۱۰۶۳ھ میں اُس نے فارسی میں جمع کئے ہیں، گورنمنٹ کلکشن لائبریری میں ۱۱۷۱ھ جلوس عالم شاہی کا لکھا ہوا نسخہ موجود ہے،

بھیرو مل | رسالہ علم جوگ فارسی کا مصنف،

بشن سنگھ | شیو پران فارسی میں اس کی تصوف پر تصنیف ہے، یہ دونوں نسخے قلمی آصفیہ میں ہیں،

رائے کھن لال | اخلاق نامہ فارسی منظوم کا مصنف، اس کا قلمی نسخہ موجودہ آصفیہ ۱۱۹۳ھ کا لکھا ہوا ہے،

سوامی بیاس | شارق المعرفۃ کے نام سے جوگ نسبت کا فارسی ترجمہ کیا، حال و زمانہ نہیں معلوم،

ان کے علاوہ اکبری دور کے ان خدا پرستوں کے نام بھی ملاحظہ ہوں جن کو ابوالفضل نے خدیوشناس، خداوند باطل اور خوانائے نقلی مقال کی فہرست میں جگہ دی ہے، یعنی مادھو سرستی، مدھوسودن، بابا ناراین آسرم، بابا کپور، بھان چند، ہرجی سور، دامودر پرت، رام تیرتھ، نرسنگھ، پرم اندر، آدت، رام بھدر، جی سین سور، اور جہانگیری دور میں جدروپ گسائیں، اور دوسرے ہندو صوفیہ تھے، جن کا ذکر تزک میں متعدد مقامات پر کیا ہے،

موسیقی

فن موسیقی کے جاننے والے اس کثرت سے اس عہد میں پیدا ہوئے ہیں کہ استقصا بھی مشکل ہے، شاہان ہند کی فیاضیوں نے اس فن کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، ہندوستان میں یہ فن نہایت قدیم زمانہ سے ہے، اور اس میں اس کی استادی مسلّم ہے لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد

ایران و توران کی موسیقی نے مل کر ایک نیا عالم پیدا کر دیا، پٹھانوں کے عہدِ حکومت میں بھی اس فن کے جاننے والے ہندو موجود تھے، اور سلاطینِ دہلی کا دستِ کرم اُن کو دار الحکومت کی طرف ہمیشہ کھینچتا رہتا تھا، جہاں خسرو کے سے ہمہ داں سے ان کو مقابلہ کرنا پڑتا تھا، ان میں سے سب سے مشہور نایک گوپال تھا، اس کے فنِ موسیقی میں بارہ سو [۱۲۰۰] شاگرد تھے، جو اس کے جلو میں ساتھ ساتھ چلتے تھے، وہ اسی شان سے سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا تھا[1]،

کشمیر ایک مدت سے فنِ موسیقی کا گہوارہ ہے، لیکن کیا آپ کو علم ہے کہ یہاں کس دایۂ کرم نے اس کی پرورش کی، سلطان زین العابدین شاہ کشمیر (سنہ ۸۲۶ھ) وہ خود اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا، اور موسیقی دانوں کا مُربی تھا، ایران اور ہندوستان کے موسیقی دان اس کے دربار میں کھچے چلے آتے تھے، فرشتہ کہتا ہے :-

"آوازۂ وجودِ او چوں انتشار یافت، سازندہا و گویندہا کہ در علمِ موسیقی یگانۂ زماں بودند، از اطراف و نواحی روے بکشمیر نہادند، چنانکہ کشمیر از کثرتِ ہندیاں این فن رشکِ ملکِ فرنگ شد" (۳۴۳ جلد دوم)

بودی بٹ (شاید صحیح دیوی بٹ ہو) وہ ایک طرف فارسی کا ادیب تھا، تمام شاہنامہ اس کو بر زبان تھا اور دوسری طرف فنِ موسیقی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، بادشاہ کے نام کی مناسبت سے زین نام اُس نے اس فن میں ایک کتاب لکھ کر دربار میں پیش کی، بادشاہ نے اس کو نہایت پسند کیا، اور اس کے حال پر نوازش فرمائی،

ہندوستان کی موجودہ موسیقی کی نسبت میں نے کہا ہے کہ وہ تنہا ہندوستان کا نہیں ہے، بلکہ مسلمان بادشاہوں کی خوش مذاقی نے ایران و توران و ہندوستان کو ملا کر ایک کر دیا تھا، علاوہ

---

[1] شعر العجم میں راگ درپن کے حوالہ سے امیر خسرو گوپال کا حال پڑھئے، (جلد دوم ص ۱۲۵)

قیاس کے ابوالفضل کی اس عبارت سے بھی یہ اشارہ سمجھنا چاہئے

"نادرہ کارانِ ہندی و ایرانی و تورانی وکشمیری از مرد و زن عشرت افزائے

بزم ہمایوں" (آئین ۱۸۳)

دربارِ اکبری میں مسلمان اساتذۂ فن کے ساتھ حسب ذیل ہندو مشاہیر کے نام بھی ہم دوش بدوش پاتے ہیں، بابا رام، سورداس، اور رنگ سین، میاں تان سین، اور میاں چندا کو جو چاہے سمجھیے[1] میاں تان سین کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ایک ہزار برس میں کوئی اس کے برابر پیدا نہیں ہوا،

مسلمانوں نے تو ہندوؤں کی موسیقی پر راگ درپن چندر کا، اور مدھیا نایک سنگار وغیرہ کئی کتابیں لکھی ہیں، مگر بھوپت رائے کے علاوہ جس نے ۱۹ سنہ جلوس محمد شاہی میں رسالہ علم موسیقی لکھا، اس فن کے دوسرے ہندو مصنف کا نام ہم کو نہیں معلوم،

ذیل میں چند نام اخیر زمانہ کے استادوں کے آثار شعرائے ہنود سے اضافہ کرتے ہیں،

پنڈت اجودھیا پرشاد | کشمیری لکھنوی، حیرت تخلص، استاد جرأت کے شاگرد تھے، کئی دیوان اور مثنویاں اُن سے یادگار ہیں، فنِ موسیقی میں اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد تھے، ۳۵ برس کی عمر میں سنہ ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی،

مٹھن لال | دہلوی ولد بخشی سلطان سنگھ کایستھ، فارسی و سنسکرت و طبابت و شاعری کے علاوہ موسیقی کے ماہر تھے، ایک خاص ساز کے موجد ہیں،

روشن لال | شوق تخلص، موسیقی کے استاد تھے،

تلسی داس | دہلوی، تصمیم تخلص، سنسکرت کے عالم تھے، اور فارسی سے واقف تھے، فقیرانہ

---

[1] لفظ میاں نومسلم ہونے کی علامت کو ظاہر کرتا ہے،

بسر اوقات کرتے تھے، طبابت کے علاوہ فنِ موسیقی کے استادِ یگانہ تھے، دلی کے شاہزادہ مرزا قادر بخش طاہر اپنے تذکرۂ گلستانِ سخن میں لکھتے ہیں ۔

"زبانِ فارسی سے بقدرِ ضرورت آگاہ، اور کتبِ ہنود علی الخصوص فنِ موسیقی کی پوتھیوں سے صاحبِ انتباہ، ستار بجانے میں ہوش سر سے اور جان تن سے نکال لیتا تھا، میں نے اُس کے نغمۂ دلنواز کو اپنے کانوں سے سُنا ہے، اور اس کیفیت سے حظ وافر اٹھایا ہے، گاہ گاہ ریختہ کی طرف التفات کرتا تھا"

موسیقی ہندوستان کی چیز تھی، لیکن مسلمانوں نے اپنا سرمایہ ملا کر اس کو اپنا کر لیا، ہندو موسیقی داں بھی ان کا تلمذ خوشی سے قبول کرتے تھے، اس اخیر عہد میں استاذنا المرحوم مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی کے بڑے بھائی مولانا **عنایت رسول** صاحب چریا کوٹی جو اپنے وقت کے جامع فاضل تھے، بلکہ بعض حیثیات سے کہا جاسکتا ہے، کہ ہندوستان کی خاک نے اُن کی نظیر نہیں پیدا کی، وہ علاوہ دیگر علوم کے فنِ موسیقی کے بھی ماہرِ یگانہ تھے، اور علمی حیثیت کے علاوہ عملاً بھی اُس کو جانتے تھے، اُن کے کئی ہندو شاگرد اس فن میں اب تک موجود ہیں، اور اُن کے نام کی عظمت کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہیں،

مصوّری

ہندوستان میں سنگ تراشی تو یقیناً قدیم زمانہ سے موجود تھی، اور اس کی بہترین زندہ مثالیں بودھوں اور جینیوں کی عمارتوں اور معبدوں میں مل سکتی ہیں، الیورا اور اجنٹا وغیرہ کے غارات تک دنیا کے لئے تماشائے حیرت ہیں لیکن شبیہ کشی، طرّاحی، اور رنگ آمیزی اور مصوّری کی نسبت نہیں کہا جاسکتا، کہ ہندوستانِ قدیم نے اس فن کو کہاں تک سیکھا تھا،

اور نہ کسی ہندی مصور کا نام معلوم ہے جس نے اس فن میں کمال حاصل کیا ہو،

مسلمانوں کی آمد کے بعد دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح اس فن میں بھی ہندوؤں نے کمال پیدا کرنا شروع کیا، اور چند روز میں یہ حال ہو گیا کہ بقول ابوالفضل ہندوستان کے صفحۂ خیال میں بھی جس نقشِ کمال کا تصور نہ ہوا ہو گا وہ واقعاً ہو گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہنشاہ اکبر جیسے ہند پرست کے عجائب خانہ میں قدیم ہندوستان کی صنعتِ مصوری کی کوئی یادگار نہ تھی ابوالفضل کی عبارت یہ ہے :-

"ہند درا چہ گویم کہ تصویر ایں معنی (مصوری میں کمال) بہ صفحۂ خیال نکردہ بود، ہمانا از اقالیم جہان کمتر نشان دہند" (ص ۷۷)

یعنی جس ہندوستان کو اس فن کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا، اب دنیا میں بہت کم اس فن میں کوئی اس کا حریف نکلے گا۔ دربار اکبری کے مشہور ہندو مصورین کے نام یہ ہیں:-
کیسو لعل، مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیمکرن، تارا، سانولہ، ہربنس، اور رام بساون، ایک ہندو مصور کی نسبت ابوالفضل لکھتا ہے :-

"بساون در طراحی و چہرہ کشائی و رنگ آمیزی و مانند نگاری و دیگر کارہاے ایں فن یگانۂ زمانہ شد" (ص ۷۷)

دسونتھ ایک کہار کا بچہ تھا، اس کو اس فن سے فطری مناسبت تھی، وہ محل شاہی کی دیوار پر ادھر اُدھر بچپن سے لکیریں کھینچا کرتا تھا، ایک دن اکبر کی نظر اس پر پڑ گئی، جوہر قابل پا کر خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کے سپرد کیا، تھوڑے ہی زمانہ کی تعلیم میں وہ اس فن کا بے نظیر استاد ہو گیا،
جہانگیر تمام شاہانِ تیموری میں اس فن کا سب سے بڑا مربی اور قدردان تھا، بشن داس اس کے دربار کا مشہور مصور تھا، خود بادشاہ تزک میں اس کی تعریف میں لکھتا ہے :

"بشن داس مصورے کہ در شبیہ کشی از یکتایانِ روزگار است"

۲۰ سنہ جلوس میں جہانگیر نے خان عالم کو عراق بھیجا تھا، بشن داس کو بھی اس کے ساتھ بھیجا کہ شاہ عباس صفوی اور اس کے دربار کی تصویریں کھینچ کر لائے، یہ تصویریں اس قدر عمدہ کھینچی گئی تھیں کہ جن لوگوں نے ان اشخاص کو دیکھا تھا، وہ کہتے تھے کہ اصل سے سرمو فرق نہیں، خود بادشاہ بھی بشن داس کے اس کارنامہ کو تزک میں فخریہ لکھتا ہے، اور مصور کے قلم کو داد دیتا ہے،

عبدالرحیم خانخاناں کا کتب خانہ ایک عجائب خانہ تھا، اس عجائب خانے کی سب سے حیرت انگیز چیز ایک ہندو مصور مادھو تھا، (شاید یہ وہی ہو جس کا نام ایک دفعہ اوپر بھی آیا ہے) جس کی نسبت مآثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے، کہ مصوری، طراحی اور شبیہ سازی میں نادرۂ روزگار تھا، اور اس کتب خانہ کی اکثر باتصویر کتابیں اسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں،

محمد شاہ کے زمانہ میں گوردھن دلی میں ایک مصور تھا، آنند رام مصنف مرآۃ الاصطلاح[۱]، اس کی نسبت لکھتا ہے کہ:-

"نرگس کی ایک پتی پر پورے شہر کی تصویر وہ کھینچتا تھا،

افسوس کہ ان استادوں کو تاریخ کی زندگی نصیب نہیں ہو سکی، اس لئے بجز ان لوگوں کے جو سلاطین اور امرا کے دامن سے لپٹے رہتے تھے، اور دل کے نام تک تاریکی کے پردہ میں گم ہیں، ورنہ سینکڑوں اساتذۂ وقت ہوں گے، جن کو گو قسمت نارسائی ہو گی لیکن دست و دماغ کی نارسائی کے وہ شاکی نہ ہوں گے،

اخیر زمانہ کے چند ہندو طبیب

پورن سنگھ | قوم کائستھ، دہلی وطن، سعادت یار خاں رنگین کے شاگرد تھے، اور پورن تخلص کرتے تھے،

---

[۱] قلمی نسخہ پٹنہ خدا بخش خاں لائبریری میں ہے، نہایت نادر کتاب ہے،

علم سنسکرت اور طبابت ہندی میں مہارتِ کامل رکھتے تھے، مگر بد مزاجی اور وارستگی کے سبب بیماروں کی طرف کم التفات کرتے تھے، فارسی میں بھی دخل تھا،

لالہ کھیم نرائن کھتری | مہاراجہ ٹکیت رائے لکھنوی کے رفقاء میں تھے، اخیر عمر میں نوابی کے بعد کلکتہ جاکر رہ گئے تھے، فارسی کے شاعر تھے، طب میں بہت اچھا دخل رکھتے تھے، مولوی حفیظ الدین شہید کے شاگردوں میں تھے،

مٹھن لال | قوم کایستھ سکسینہ، ولد بخشی سلطان سنگھ دہلوی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے، ایک لغت کے مصنف ہیں، طبابت میں شہرت رکھتے تھے،

تلسی داس | سادھو تھے، فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، دلی وطن تھا، قلعہ کے شہزادوں سے ارتباط رکھتے تھے، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، حکیم تخلص تھا، طب ہندی میں امام تھے، اور مجربات بیدک سے اکثر امراض مزمنہ کا علاج کرتے تھے، کشتوں کے استعمال میں اور جذام اور وجع مفاصل وغیرہ کے علاج میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، موسیقی میں کمال پیدا کیا تھا، فارسی زبان سے واقف تھے،

سکھانند | قوم کایستھ، دلی وطن تھا، شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد، شاعری کے علاوہ فنِ طبابت میں "وحید العصر" تھے،

(معارف از جنوری تا دسمبر ۱۹۱۸ء)

سلطان ٹیپو کی چند باتیں

کچھ چشم دید مشاہدات اور کچھ تاریخی حقائق

اللہ اکبر! سو ڈیڑھ سو برس میں مسلمان کیا سے کیا ہو گئے! ایک زمانہ تھا کہ ہر مسلمان سپاہی فرمانروائی کے لئے پیدا ہوتا تھا! اور اب یہ حال ہے کہ ہمارے بادشاہ اور سلاطین بھی محکومی اور غلامی کے لئے پیدا ہو رہے ہیں، ابو مسلم خراسانی ایک شخص تھا جس نے بنو امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ دیا، عبدالرحمٰن تنہا عباسیوں سے بھاگ کر اندلس میں قدم رکھتا ہے! اور ڈھائی سو برس کے لئے ایک عظیم الشان حکومت قائم کر دیتا ہے، یعقوب صفار ایک ٹھٹھیرا ہاتھ میں تلوار لے کر کھڑا ہوتا ہے، تو عباسیوں کی دل بادل فوج میں ہل چل پڑ جاتی ہے،

خود ہندوستان میں دیکھو کتنے سپاہی دم کے دم میں تاج و تخت کے مالک بن گئے، غلاموں کے نخاس سے چند روپیوں میں خرید کر آئے، سپاہیوں میں داخل ہوئے، اور آگے بڑھ کر منصب وزارت تک پہنچے، اور پھر وہ بادشاہ تھے، تیموریوں سے پہلے کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے تیموریوں کے آخر عہد میں ٹونک، بھوپال، رام پور وغیرہ ریاستیں انہی مسلمان سپاہیوں کی تلواروں کی پیدا کی ہوئی ہیں، اور کتنی ریاستیں جو اس عہد میں پیدا ہوئیں، ناموافق آب و ہوا میں پرورش نہ پا سکیں انہی میں جنوبی ہندوستان کی دو نامور ریاستیں کرناٹک اور میسور ہیں،

کرناٹک تو انگریزوں کی دوستی کے باوجود مٹ گیا لیکن میسور اب تک زندہ ہے لیکن وہ

اسلامی ریاست کے بجائے ایک ہندو ریاست ہے، یہ ریاست درحقیقت پہلے سے ایک ہندو ریاست تھی، سلطان ٹیپو کا باپ حیدر علی ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے اس ریاست کی فوج میں داخل ہوا، چند ہی روز میں غیر معمولی جنگی قابلیت کی بنا پر مناصب میں ترقی کر تا گیا، سپاہیوں میں بے نہتا ہر دلعزیزی اس کو حاصل ہوگئی، یہ دیکھ کر دیگر ارکان ریاست ڈر گئے، اور آخر حیدر علی کی معزولی کی تدبیریں ہونے لگیں لیکن یہ پھندا الٹ کر انہی کی گردنوں میں پڑ گیا، اور راجہ عملاً معزول ہوگیا، حیدر علی نیابتہً اس کی جگہ فرمانروا ہوا،

یہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی پُراسرار تاریخ کے آخری ابواب تھے، اس وقت یورپ کی سرزمین میں نپولین کی آتش فشانی زلزلہ ڈال رہی تھی، انگریز یورپ اور ہندوستان دونوں ملکوں میں فرانسیسیوں سے برسرپیکار تھے، حیدر آباد اور کرناٹک نے انگریزوں کا اور میسور نے فرانسیسیوں کا ساتھ دیا، باہم وہ وہ معرکہ آرائیاں ہوئیں کہ اگر قسمت انگریزوں کے پرچم پر سایہ افگن نہ ہوتی، تو آج ہم کو یونین جیک سارے ملک پر لہراتا نظر نہ آتا،

بہرحال حیدر علی اور سلطان ٹیپو دونوں باپ بیٹوں نے بمشکل ۳۵ برس حکومت کی ہوگی لیکن ان ۳۵ برسوں میں اُن کیلئے ہر برس کا ختم کرنا گویا رستم کا ہفتخوان طے کرنا تھا، ایک طرف کرناٹک، دوسری طرف حیدرآباد، تیسری طرف مرہٹے، چوتھی طرف انگریز، ایک بہادر بیک وقت ان چار پہلوانوں سے نبرد آزما تھا، کبھی کبھی ایسا ہوتا، کہ ان میں سے کوئی ٹوٹ کر ادھر آجاتا، لیکن پھر رشوت پا کر الگ ہو جاتا، اور اُدھر چلا جاتا، علاوہ ازیں اندرونی سازشوں کا جال الگ بچھا ہوا تھا، جس میں یہ اسلامی سلطنت پھنسی ہوئی تھی۔

ان تمام فتنوں کے باوجود جن سے ایک بڑی سے بڑی سلطنت بھی بمشکل عہدہ برآ ہوسکتی ہے، حیدر علی اور ٹیپو اُن پر کیوں کر غالب آسکے، وہ اُن کی تاریخِ زندگی کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے،

جب ہم ان کی حکومت کی تاریخ پڑھتے ہیں، تو ہم پر حیرت واستعجاب کا عالم طاری ہو جاتا ہے، ایسے دور میں جب کہ اس کا ایک ایک دن، اور ایک ایک رات گردشِ آسمانی کے نذر تھی، کیوں کر وہ اتنے بڑے انتظامات اور اصلاحات ملک میں رائج کر سکے، اگر صرف اُن کے جنگی کارناموں ہی پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان کے جنگی شعبہ بالکل یورپین طرز کا تھا، فوج میں فرانسیسی بھی تھے، جس کا نظام یورپین تھا، اور تمام سپاہی جدید قواعد اور جدید اسلحے سے لیس تھے، توپوں اور بندوقوں کے ڈھالنے اور گولی بارود کے بنانے کے کارخانے بھی تھے، اور وہ اتنے کامیاب تھے، کہ ۳۰ برس کی جنگ میں ان کو کبھی غیروں کا دست نگر ہونا نہ پڑا،

ہندوستان کے اس نپولین کے فرانس کے نپولین سے براہِ راست تعلقات تھے، نپولین میدان مارتا ہوا یورپ سے مصر تک چلا آیا تھا اور خیال تھا کہ اب وہ ہندوستان میں داخل ہی ہونا چاہتا ہے کہ دفعۃً دونوں کے بخت واقبال نے کنارہ کشی اختیار کر لی، اس موقع پر ایک خاص واقعہ یاد آگیا،

انگریزوں نے سلطان ٹرکی کے پاس ایک سفیر بھیجا تھا، کہ سلطان ٹیپو کے نام ایک فرمان لکھوا لائے، کہ وہ فرانسیسیوں کا ساتھ چھوڑ دے، چنانچہ سفیر مذکور سلطان کا ایک خط لایا، جس میں فرانسیسیوں کی دغابازی، نپولین کی شرارت، فرنچ لوگوں کی مذہب سے نفرت، اور ان کا اتحاد، اور سلطان کا انگریزوں کو اپنا دوست سمجھنا، اور ٹیپو کو ہدایت دینا کہ وہ بھی انگریزوں کا دوست بن جائے، اور مصر پر فرانسیسیوں کے قبضہ کو اسلام کی عداوت اور دین کے لئے ایک بڑے خطرہ کا سبب سمجھنے وغیرہ کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا تھا، ٹیپو نے بھی سلطان کے اس خط کا بہت مفصل جواب دیا[1]،

---

[1] خاندان میسور کے ایک عالی ہمت نے اپنے خاندان کی ایک ضخیم تاریخ فارسی زبان میں ہندوستانی

بہرحال اس خط میں جو نقشہ کھینچا گیا تھا، اس کو سامنے رکھ کر اس وقت کی جنگ کا نقشہ دیکھا جائے، تو عبرتوں اور بصیرتوں کا عجیب و غریب ذخیرہ مورخ کو نظر آتا ہے،

میسور کی اس اسلامی حکومت کا دارالسلطنت شہر سرنگاپٹم تھا، ۱۹۱۲ء میں مجھ کو مدارس ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کی غرض سے بنگلور جانا پڑا، تو میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور کانفرنس سے فرصت پاکر میسور، سرنگاپٹم، اور گرڈھ آم پور کی بھی سیر کی، اور ان تمام مقامات کو جہاں بڑے بڑے سیاسی انقلابات رونما ہوئے تھے، عبرت کی آنکھوں سے دیکھا، میں نے دوران سیر میں اس ندی کو بھی عبور کیا، جو دکن اور میسور کی حد فاصل تھی، مجھے وہ سلسلۂ کوہ بھی نظر آیا جس کے دامن میں ٹیپو کی فوج پناہ گیر تھی، اور جب موقع پاتی تھی، پہاڑ کو قطع کرکے کمپنی کی فوج پر بجلی بن کر گرتی تھی، اور وہ اس اچانک حملہ سے گھبرا جاتی تھی، میں ایک پہاڑ پر بھی چڑھا، جو گرڈھ آمبور کے قریب تھا، اور جس پر ٹیپو کے جنگی استحکامات کے نشانات تھے، پتھر کی وہ دو عظیم الشان چٹانیں بھی دیکھیں، جن کو بجائے خود پہاڑ کہنا چاہیے، اور وہ اس طرح آکر ایک دوسرے سے مل گئی تھیں: کہ ایک قلعہ سا بن گیا تھا، اُن کے دہانے پر ایک بڑا سوراخ تھا، جس میں ایک آدمی سکڑ کر داخل ہو سکتا تھا، اندر نہایت کشادہ جگہ تھی، بیچ بیچ میں گولی چلانے کے لئے سوراخ تھے؛

اسی کے دامن میں وہ عظیم الشان معرکہ پیش آیا تھا، جس میں کرناٹک اور حیدرآباد کی قسمت کا فیصلہ ہوا تھا، یعنی ارکاٹ کے چندا صاحب اور حیدرآباد کے محی الدین خان دونوں نے فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر انور الدین خان شہامت جنگ نواب ارکاٹ کے خلاف

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۱) اور انگریزی مواد سے لکھوائی ہے، اور نہایت اہتمام سے سرکاری طور پر شائع ہوئی ہے، یہ دونوں خط بعینہٖ اس میں درج ہیں، بڑی تقطیع پر چھپی ہے، کارنامہ حیدری نام ہے،

فوج کشی کی، ۱۱ شعبان ۱۱۶۲ھ کو فریقین میں وہ معرکۂ جنگ برپا ہوا جس میں انور الدین خاں نے میدان کارزار میں شہادت پائی، اس میدان میں جہاں نواب شہید نے شہادت پائی تھی ایک بڑا چبوترہ بنا دیا گیا ہے، قریب ہی ایک فرسودہ مسجد ہے، جس پر حسب ذیل کتبہ ہے،

"میر مقدر عز شانہ، منبع جود و کرم ساخت مسجد بہر طاعت فی المثل بیت الحرم
گفت رضوانم بگو تاریخ این عالی بنا ختم شد از فضل رب، مسجد کبیت محترم

۱۱۲۰ھ ۱۱۲۰ھ

محمد قانع کتبہ ابو تراب باہتمام میر محمد حسین عرف سید کریمی"

یہاں سے سرنگا پٹم جانے کا اتفاق ہوا، سرنگا پٹم کا قلعہ عجیب موقع پر تعمیر ہوا ہے، کاوری ندی میں ایک جگہ دو شاخیں ہو گئی ہیں، کچھ دور کے بعد یہ شاخیں مل کر پھر ایک ہو گئی ہیں، اس طرح بیچ میں ایک جزیرہ سا ہو گیا ہے اسی جزیرہ پر سرنگا پٹم کا قلعہ بنایا گیا ہے، چاروں طرف سے دریا سے گھرا ہوا ہے جس وقت میں اس کی سیر کے لئے گیا تھا، دریا کی موجیں آ آ کر قلعہ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں، سلطان ٹیپو کی زندگی کا آخری کھیل یہیں ہوا، وہ کمپنی کی فوج کے مقابلہ میں اسی قلعہ میں محصور ہو گیا تھا، فوج کی گولہ اندازی سے قلعہ کی ایک طرف کی دیوار میں رخنہ پڑ گیا، سلطان کے نوکروں نے غداری کی، اور دشمن کو پوشیدہ طور پر اس کی اطلاع دیدی، بیچارہ سلطان اسی معرکہ میں ۱۷۹۹ء میں کام آگیا،

پورے صوبہ مدراس میں سلطان ایک ولی اور خدا رسیدہ کی حیثیت سے مانا جاتا ہے، لوگ فرط احترام سے اس کا نام نہیں لیتے، سلطان شہید کہہ کر یاد کرتے ہیں، سلطان شہید، اس کی ماں اور حیدر علی تینوں کی قبریں اسی سرنگا پٹم میں ایک ویران باغ کے اندر ہیں، صدر دروازہ پر ایک نقارہ خانہ ہے، جہاں صبح و شام اب تک نقارہ بجتا ہے، روضہ ایک متوسط درجہ کا بنا ہوا ہے،

اس کا دروازہ چھوٹا ہے جس کے اوپر اور پہلو میں اشعار کندہ ہیں، دروازہ کے اندر قدم رکھتے ہی پہلو بہ پہلو تین قبریں نظر آتی ہیں، خود سلطان شہید ٹیپو کی، حیدر علی کی اور فخر النساء بیگم یعنی سلطان ٹیپو کی ماں کی، پہلی قبر پر سرخ چادر، اور دوسری اور تیسری پر سیاہ چادر پڑی ہوئی ہے، سامنے قرآن پاک رکھا ہے، سُرخ چادر دیکھ کر سلطان ٹیپو کی شہادت کا پورا منظر میری نگاہوں کے سامنے آگیا، آنکھیں نم ہوگئیں، جذبات میں تلاطم پیدا ہوگیا، اور خون میں ہیجان آگیا، اور زبان نے فرخی کے الفاظ میں شیر میسور کے خاکی جسم کو اس طرح خطاب کیا،

خیز شاہا! کہ رسولانِ شہان آمدہ اند | دشمنے[۵۱] روے بنا داست دریں شہر دیار
کہ تو اند کہ برانگیزد ازیں خواب ترا | خفتنی خفتی کز خواب نگردی بیدار
خفتنِ بسیار اے خواجہ خوے تو نبود | ہیچ کس خفتہ ندیداست ترا زیں کردار
یکدمک بار دگر در خانہ بباید نشست | تا بہ بیندے[۵۲] روی تو عزیزان و تبار
بحصار از فزع و بیم تو رفتند شہاں | تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بہ حصار

روضہ کے اندر میں نے قدم رکھا اور اوپر نگاہ اٹھی تو ان شعروں پر نظر پڑی،

در شاہے کہ شہرا لاسلام | باب شیرے کہ کسرالاصنام
اوست سلطانِ دین و ہم دنیا | بندۂ بارگاہِ او[۵۳] د غلام"
بسم اللہ الرحمن الرحیم | اللہ محمد ابوبکر عثمان علی،
زہے گنبدے کز شکوہ بنا | فلک زیر دستش بود در علو
تو خواہی مہ و خواہ خورشید خواں | فلک داغ گردید از رشک او
بود شمسہ اش نور چشم فلک | قمر یافتہ نور تعلیم از د

---

۵۱ یہ مصرع دوسرے شعر کا ہے، ۵۲ سکتہ قدما کے یہاں جائز ہے، ۵۳ مشکوک،

ترا دش کناں بحرِ رحمت زخاک | گردہے زکر دبیاں گر داد
سحرگہ پے کسبِ فیض و شرف | گذشتم ازیں خواب گاہِ بگو
چو ایں مضجعِ تازہ آمد بچشم | نمودم چو روحانیاں جستجو
کہ ایں شاہ آسودہ را نام چیست | چہ تاریخِ رحلت نمود است او
یکے زاں میاں گفت تاریخ و نام | کہ حیدر علی خاں بہادر بگو

(سنہ ۱۱۹۵ھ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقبرہ حیدر علی خاں کے مرنے کے بعد غالباً خود سلطان ٹیپو نے بنوایا تھا، اور جب وہ شہید ہوا تو اس کو بھی اسی میں دفن کیا گیا، دروازہ کے داہنی طرف کی دیوار پر یہ شعر بعد کو لکھے گئے ہیں :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم | رب الرحیم السلطان الکریم
ٹیپو سلطاں شہید شد آگاہ | خونِ خود ریخت فی سبیل اللہ
بود ذی قعدہ بست و ہشتم آن | شدہ در روز شنبہ حشر عیاں
بیرساانش بہ نیم ماہ بگفت | نورِ اسلام و دین زدنیا رفت

تاریخ کشتہ گشتنِ سلطان حیدری | ٹیپو بوجہ دینِ محمد شہید شد

چوں آں مرد میداں نہاں شد زدنیا | یکے گفت تاریخِ شمشیر گم شد

روحِ قدسی بعرش گفت کہ آہ | نسلِ حیدر شہید اکبر شد

ان اخذت مصر کما قد ذکروا　　　السرنج فتن اخذت دبہا

مصیبۃ ما مثلہا ازخہتا　　　ذہب عزالرومؓ والہند کلہا

سالِ تاریخ او شہید بگفت　　　حامی دین شہ زمانہ برفت

عربی کے شعروں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ نپولین نے مصر کو اور انگریزوں نے سرنگاپٹم ساتھ ہی ساتھ فتح کیا، اس توافق کو کیا کہا جائے،

سرنگاپٹم میں ایک مسجد بھی نظر آئی، اس کی تعمیر بھی متوسط ہی درجہ کی تھی، اور ویران پڑی تھی، اس کی محرابوں پر چند شعر لکھے تھے، ان میں سے اول سے کے شعر یہ ہیں:۔

گر حضرتِ سلیماں اندر زمانِ ماضی　　　تعمیر کرد مسجد نامش شما واقصیٰ

مانند زرچو جویا گشتم برائے تاریخ　　　طاعت سرائے ثابت ہاتف نمود القا ۱۲۲۵ھ

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مسجد فتح سرنگاپٹم کے بعد بنی ہے،

وہاں کی تعمیرات میں دو چیزیں عجیب نظر آئیں، ایک پل جو پتلا سا لمبا بنایا گیا ہے، اور ہلانے سے ہلتا ہے، دوسری دولت دریا باغ کی رو کار، یہ ایک عمارت ہے جس کا طرزِ تعمیر ہندوانہ ہے، دروازے پست ہیں، جن میں کواڑ نہیں لگے ہیں، بہت زیادہ بلند بھی نہیں ہے، مجھکو تو ایسا معلوم ہوا کہ لکڑی کی عمارت ہے، سامنے کے رُخ کی دیوار مصور ہے، اس پر سلطان ٹیپو کی مختلف حالتوں اور معرکوں کی تصویریں بنی ہیں کوئی جنگ کا مرقع ہے، اور سلطان گھوڑے پر سوار ہے، کسی میں بزمِ رقص وسرود برپا ہے، اور وہ اس میں بیٹھا ہوا ہے، کسی میں جانماز پر بیٹھا تلاوتِ قرآن میں مصروف ہے، آخری تصویر اس وقت

سلہ ہکذا الایخفی ما فیہ،

کی ہے، جب وہ میدانِ جنگ میں زخمی پالکی پر بیٹھا ہوا ہے، اور فوج کو بڑھا رہا ہے، ایک طرف فرانسیسی، اور میسور کی ہندوستانی فوج ہے، دوسری طرف انگریزی، اور ہندوستانی لشکر ہے، دونوں طرف فوجوں کا پرا لگا ہوا ہے، نمک حرام وزیر ہاتھ جوڑے سلطان کے آگے ہے، لیکن آنکھوں کا اشارہ دشمنوں کی طرف ہے، بڑا دردناک نظارہ ہے،

اسی سفر میں مدراس کی سرکاری لائبریری میں ایک بڑا پُر درد مرقع میں نے دیکھا، لائبریری کے ایک ستون کے پاس ایک گول سطح پتھر پر یہ مرقع ہے جس میں نظر آتا ہے کہ ایک طرف کمپنی کے فاتح افسر کھڑے ہیں، دوسری طرف سلطان شہید ہے، اور صلح کی ضمانت میں شہزادوں کو اُن افسروں کے سپرد کر رہا ہے، اور پیچھے کچھ بیگمات کھڑی رو رہی ہیں، فاعتبروا یا اولی الابصار،

حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی چند سالہ حکومت جس پریشان حالی، پراگندگی، اور افراتفری میں ختم ہوئی، اس سے یہ امید رکھنا کہ اُن کے نظام سلطنت، اصلاحات، اور رعایا پروری وغیرہ کے متعلق کوئی مفصل معلومات ملیں گے، بیکار ہے تاہم جہاں میدانِ جنگ میں اُن کی بہادری اور دلیری کے کارنامے ملتے ہیں، وہاں درباروں میں اُن کے لطف و احسان، بے تعصبی، اور رحم دلی و انصاف کے بکثرت واقعات بھی ملتے ہیں، عام طور سے مشہور ہے کہ یہ دونوں نہایت بے رحم، سفاک، سنگ دل، متعصب اور ہندوؤں کے دشمن تھے، لیکن ان زبانی روایتوں کی جو بار بار کی تکرار سے واقعہ بنتی جا رہی ہیں، کوئی اصلیت نہیں ہے، اور نہ تاریخی سند سے اُن کا کوئی تعلق ہے، لیکن اس زمانہ میں جب تاریخ کا معصوم ہاتھ پالیٹکس کا جہنمی آلہ بن

سکتا ہے، کوئی عجیب بات نہیں،

ہمارے ہم وطن ہندو دوست جو عالمگیر کے بعد ٹیپو کا نام لینے کے عادی ہیں، کبھی پولیٹکل میدان سے نکل کر تاریخ و تحقیق کی راہ اختیار کریں گے، تو اُن کو خود اپنے پچھلے خیالات پر ہنسی آئے گی، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہندوؤں کا زبردستی ختنہ کرا کے مسلمان بنا لیتے تھے، لیکن پریچنگ آف اسلام کے مصنف مسٹر آرنلڈ بمبئی گزیٹیر جلد ۲۲ کے حوالہ سے ان بادشاہوں کے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کرنے کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

> انہی حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے جو ہمارے زمانہ سے بہت قریب گذرے ہیں اس بات میں شہرت حاصل کی کہ انھوں نے بہت سے ہندو خاندانوں اور ہندو رعایا کے بعض حصّوں کو زبردستی مسلمان کر لیا، حالانکہ ان کا مسلمان ہونا، ان بادشاہوں کے عہد سے پہلے کا واقعہ ہے، جس کے تاریخی حالات ہم تک مطلق نہیں پہونچے"؛

اس سفر مدراس میں اس واقعہ کی حقیقت ظاہر ہوئی، وہاں میرے دوستوں نے مجھ سے بیان کیا، کہ جنوبی ہند خصوصاً سواحل کی بے شمار ہندو قومیں عموماً برہنہ رہتی ہیں، اور کپڑا پہننا بے دینی سمجھتی ہیں، آج بھی اُن کا یہی عالم ہے، اور جابجا اُن کے مرد عورت، بچے عریانی کے طبعی لباس میں نظر آتے ہیں، سلطان شہید نے اُن کو زبردستی کپڑا پہننے کا حکم دیا تھا جس کی سختی سے تعمیل کی گئی ہو گی، اس کو انھوں نے جہل کی وجہ سے ظلم پر محمول کیا، اور سمجھا کہ اُن کو کپڑا پہنا کر مسلمان بنا لیا گیا ہے، حالانکہ اس واقعہ کا اُن کے مسلمان بنا لینے سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے، آج اُن قوموں کے جسم پر جو کپڑا نظر آرہا ہے، وہ سلطان ٹیپو کے اسی حکم

کا فیض ہے،

یہ تاویل معقول ہو یا غیر معقول. لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر بنظر انصاف دیکھا جائے توحیدر علی اور ٹیپو تعصب اور مذہبی عناد کا مجسمہ نہیں. بلکہ محبت آشتی . اور بے تعصبی کے فرشتے نظر آئیں گے، اُس کے متعلق اگر ہم خود کچھ کہیں گے، تو اُس کو مذہبی اور قومی طرفداری پر محمول کیا جائے گا،اس لئے بہتر ہے کہ ہم اس موقع پر ان جدید تاریخی اکتشافات کو پیش کردیں جو ابھی بمبئی کرانیکل نے شائع کئے ہیں ، اور اُن کو ہمارے الہ آباد ی معاصر لیڈر نے ۱۲ جنوری ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے،

"ٹیپو کی تصویر ہمارے سامنے اس طرح کھینچ رگئی ہے کہ وہ ایک سخت مطلق العنان بادشاہ تھا جس کو کوئی اسے پوری طرح خوش نہیں کرسکتی تھی جس قدر ایک غیر مسلمان کا خون جس کا اگر بس چلتا تو ہندو مذہب کو جنوبی ہند سے معدوم کردیتا،لیکن اب ہم نے ایسی سندیں پالی ہیں کہ جن کا تعلق شرینگر مٹھ[۱] سے ہے ،جو ان باتوں کو بے قدر ٹھہراتی ہیں ، جو پہلے مصنفین ہمارے طالب علموں کو اس موضوع سے متعلق سکھاتے رہے ہیں، یہ مراسلات جو شنکراچاریہ کے جانشینوں کے مذہبی دفتر اور حیدر علی کے اور سلطان ٹیپو کے درمیان ہوئے ہیں، اس امر کے مستحق ہیں کہ اُن کو علٰحدہ چھاپا جائے ، اور اُن کی توضیح کی جائے، ان مراسلات کی کی روشنی میں یہ ممکن ہو جاتا ہے ، جیسا کہ ضروری ہی ہے، کہ ان تعلقات کا ایک صحیح

---

[۱] ہندوستان سے بودھ مذہب کو ہٹا کر ویدک دھرم کو ہندوستان میں جس ہندو مصلح اور مبلغ نے رواج دیا وہ شنکراچاریہ تھے، ان کے نام سے ہندوستان کے چاروں گوشوں میں چار مٹھ قائم ہیں، سرنگیر مٹھ جنوبی ہند میں ہندوؤں کا عظیم الشان مذہبی مرکز ہے،

شیشۂ تصویر میں فیصلہ کیا جائے، جو مسلمان بادشاہوں اور ان ہندو رہناؤں کے درمیان تھے جن کا زمانہ بہت زیادہ نہیں گذرا، ہم ان ہندو مذہبی مقدسین کے شکر گذار ہیں جنھوں نے ٹیپو کے ۳۰ خطوط کے جانچنے اور ترجمہ کرنے کی اجازت دی ہے، اُن میں سے ہر خط اس قدر عزت کی شہادت دیتا ہے، جو اس "مطلق العنان" بادشاہ کی نظر میں ان مذہبی ہندو رہناؤں کی تھی، بعض خطوط میں یہ مسلمان بادشاہ ہندو پروہت سے درخواست کرتا ہے کہ اس کی اور اس کی سلطنت کے لئے دعائے خیر کرے، اور اس کو برکت دے، یہ تحریری یادداشتیں ایک اور لحاظ سے بھی نہایت اہم ہیں، یہ نہ صرف اس بات کی مستحکم دلیل بیان کرتی ہیں، کہ ہندوستان میں ان دونوں مذہبوں کے پیروؤں کے باہمی تعلقات کم خوشگوار نہ تھے، بلکہ یہ بھی کہ ان دونوں کے درمیان صلح کی شکست غیر مذہبی اسباب سے ہوتی تھی، جو مذہبی سمجھوتوں پر سبقت لیجاتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک ہندو کسی مسلمان سے متفق نہ تھا تو اسی بنا پر جس بنا پر وہ خود اپنے ہم مذہب سے مختلف تھا، اگر مرہٹوں نے مسجدوں کو نقصان پہنچایا، تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی مقامات ہیں، بلکہ اس بنا پر کہ یہ وہ عمارتیں ہیں جن کو دشمن عزیز رکھتے ہیں، مرہٹوں نے ہندوؤں کے مندروں کو بھی اسی زور اور قوت کے ساتھ توڑا جو انھوں نے مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی میں ظاہر کی، شرنگری مٹھ کا سوامی ٹیپو سے مرہٹوں کے اس وحشیانہ پن اور سفاکی کی شکایت کرتا ہے، جو مٹھ کے لوٹنے میں انھوں نے دکھائی، اور بادشاہ سے دیوتا کی مورتی کی دوبارہ درستی کے لئے روپیہ اور سامان کی درخواست کرتا ہے، جس کو مرہٹوں نے توڑ دیا تھا، ٹیپو نہ تو اس درخواست کو ٹھکراتا ہے اور نہ کافروں کی مذہبی جنگ وجدال پر خوشی ظاہر کرتا ہے،

ٹیپو اپنے شاہی جواب میں سنسکرت کا ایک ٹکڑا اقتباساً نقل کرتا ہے،

"وہ تبسم اور ہنسی ہوتے ہیں، لیکن آنسو کاٹیں گے،

اور اپنے مسلمان عہدیداروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ نقد اور غلہ ٹھ کی دوبارہ تعمیر اور مرمت

اور ان کے پوجا پاٹ کے لئے سامان کر دیں"

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ہندو قوم جب جوان ہو گی تو مسلمان سلاطین کی نسبت اپنے طفلانہ خیالات پر اس کو خود ہنسی آئے گی، کیا اس کی جوانی کا وقت آپہنچا؟

(معارف، فروری ۱۹۱۸ء)

خلافت اور ہندوستان

خلافتِ راشدہ، امویہ اور عباسیہ

آج کل مسئلۂ خلافت نے ہندوستان میں جو اضطراب اور ہیجان پیدا کر رکھا ہے، کوتاہ بین سمجھتے ہیں کہ یہ صرف موجودہ زمانہ کی آزادی طلبی اور جنبش سیاسی کی ایک لہر ہے، اس مضمون میں یہ دکھانا ہے کہ خلافتِ اسلامیہ سے ہندوستان کا تعلق کس قدر پرانا اور گہرا ہے، اور ہمیشہ سے اس کو آستانۂ خلافت سے کس درجہ عقیدت مندی اور ارادت رہی ہے، اور سلاطینِ ہند خلفائے اسلام کو کسی عظمتِ دینی اور وقعتِ مذہبی کی نگاہ سے دیکھتے تھے،

خلافتِ راشدہ | عرب اور ہندوستان کا تجارتی تعلق تاریخ کی عمر سے بھی زیادہ قدیم ہے، اسلام جب عرب کی سرزمین میں رونما ہوا، تو اس کے آس پاس کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان بھی غیر متأثر نہیں رہا، تحفۃ المجاہدین کی روایت کے مطابق سواحلِ ہند تک اسلام کی مصالحانہ دعوت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پہونچ چکی تھی، ملیبار کے راجہ نے مذہب اسلام کی تحقیق کے لئے عرب میں جو وفد بھیجا تھا، وہ خلافت اولیٰ یعنی حضرت ابوبکرؓ صدیق کے عہدِ خلافت میں مدینہ پہنچا تھا، اور وہاں سے پرتوِ اسلام سے منور ہوکر ملیبار واپس آگیا تھا، یہ روایت اگر صحیح ہو تو ہندوستان و خلافت کے باہمی تعلق کا یہ پہلا دن تھا،

سندھ کا علاقہ ایران کے زیر اثر ہونے کے باعث، ایران کے فتح ہونے کے بعد خود بخود مسلمانوں

کے زیر اثر آگیا، اس سے کہ سواحل مسلمان تاجروں اور مسافروں کے رہ گذر اور سیستان و بلوچستان کے علاقے مسلمان فوجوں کے معسکر تھے، بہر حال حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت سے ہندوستان اور خلافت اسلامیہ کے درمیان ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہوگیا، جو آج تک بدستور باقی ہے،

عہد بنو امیہ: خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ جب خلافت اسلامیہ کے مالک ہوئے تو مسلمانان سندھ نے بھی دوسرے ملک کے مسلمانوں کی طرح اون کو خلیفہ تسلیم کیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اموی جب مسند آرائے خلافت ہوئے، تو انھوں نے یہاں کے رؤسار کے نام دعوت اسلام کے خطوط لکھے، چنانچہ اون کی ذاتی نیکی، زہد و اتقا، اور عدل و انصاف کو دیکھ کر بہت سے راجہ مسلمان ہو گئے، اور عربوں کے جیسے اپنے نام انھوں نے رکھنے شروع کئے،[۱]

آغاز خلافت راشدہ سے لے کر خلفائے بنی امیہ کے اخیر عہد تک دربار خلافت کی طرف سے جو لوگ وقتاً فوقتاً نائب ہوکر، یہاں آتے رہے، اُن کے نام حسب ذیل ہیں،

شمار	نائبین خلافت	خلفار	سنہ
۱	حکیم بن جبلۃ العبدی	حضرت عثمانؓ	
۲	حارث بن مرہ عبدی	حضرت علیؓ	۳۹ھ
۳	مہلب بن ابی صفرہ	امیر معاویہؓ	۴۴ھ
۴	عبداللہ بن سوار العبدی	〃	
۵	راشد بن عمرو الجدیدی الازدی	〃	
۶	سنان بن سلمۃ الھذلی	〃	
۷	زیاد المنذر بن جارود العبدی		

[۱] بلاذری، فتح سندھ

شمار	نائبینِ خلافت	خلفاء	سنہ
۸	عبید اللہ بن زیاد الباہلی	״	
۹	سعید بن اسلم الکلابی		
۱۰	مجاعہ بن سعر التمیمی		
۱۱	محمد بن ہارون النمری		
۱۲	عبید اللہ بن نبہان		
۱۳	محمد بن القاسم الثقفی		
۱۴	یزید بن ابی کبشۃ السکسکی	سلیمان بن عبدالملک	
۱۵	حبیب بن مہلب	״	
۱۶	عمرو بن مسلم الباہلی	حضرت عمر بن عبدالعزیز	
۱۷	جنید بن عبدالرحمٰن المرّی	ہشام بن عبدالملک	
۱۸	تمیم بن زید العتبی		
۱۹	حکم بن عوانہ کلبی		
۲۰	منصور کلبی،		

عہدِ خلافت عباسیہ اس کے بعد بنو عباس کا دور شروع ہوا، بنی امیہ کے اخیر عہد میں تمیم کی نیابت کمزور اور ضعیف ثابت ہوئی، اور مسلمانوں کو اس کے دور میں سخت تکلیفیں پہنچیں، محفوظ نام ایک شہر بسا کر اس میں محصور رہے، لیکن بنو عباس کے تخت نشیں ہونے کے ساتھ مسلمانوں میں از سر نو قوت پیدا ہوئی، خلیفہ منصور عباسی نے مغلس عبدی کو یہاں نائب بنا کر بھیجا، اور اس نے خلیفہ کے نام سے سندھ میں منصورہ شہر آباد کرایا، اُس کے بعد اُس کے دوسرے نائب موسیٰ بن کعب تمیمی نے نئے سرے سے

سے خلافتِ عباسیہ کی قوت کو یہاں نمایاں کیا، منصورہ کی مرمت کرائی، یہاں کی جامع مسجد کو وسیع کیا، خلیفہ مامون کے عہد میں بشر بن داؤد یہاں کا نائب مقرر ہوکر آیا، لیکن وہ یہاں آکر باغی ہوگیا، اس کی سرکوبی کے لئے غسان بن عیاد دوسرا نائب بھیجا گیا، غسان کے بعد آل برمک میں سے موسیٰ بن یحییٰ یہاں نائب ہوکر آیا، یہاں اُس نے شہر بیضا آباد کیا، خلیفہ معتصم آخری طاقت ور عباسی خلیفہ ہے، اس کے عہد میں موسیٰ برمکی کا بیٹا عمران نائب مقرر ہوا، اس کے بعد خلفائے عباسیہ کے سیاسی ضعف نے ہندوستان کو سیاسۃً مرکزِ خلافت سے الگ کردیا، تاہم مذہباً وہ ہمیشہ خلفائے عباسیہ کا مطیع و فرماں بردار رہا، اور انہی کے نام کے خطبے یہاں پڑھے جاتے تھے،

خلفائے عباسیہ کے عہد میں جو نائبینِ خلافت وقتاً فوقتاً یہاں آئے اُن کے نام بہ ترتیب یہ ہیں:-

شمار	نائبینِ خلافت	خلفاء
۲۱	مغلس عبدی	خلیفہ منصور
۲۲	موسیٰ بن کعب تمیمی	"
۲۳	ہشام بن عمر تغلبی	"
۲۴	عمرو بن حفص	
۲۵	داؤد بن یزید بن حاتم	
۲۶	بشر بن داؤد	خلیفہ مامون
۲۷	غسان بن عیاد	"
۲۸	موسیٰ بن یحییٰ برمکی	"
۲۹	عمران بن موسیٰ برمکی	خلیفہ معتصم

خلیفہ معتصم کے بعد سیاسی حیثیت سے سندھ کی حیثیت ایک خودمختار ریاست کی ہوگئی، ملک کا بڑا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تاہم وہ ملک کے چھوڑنے پر مجبور نہیں ہوئے، سندھیوں نے مسلمانوں کی مسجدوں کو ہاتھ نہیں لگایا، اور ان کی مذہبی آزادی کو برقرار رکھا، اور مذہباً وہ ہمیشہ خلفاے بغداد کے ماتحت رہے، چنانچہ وہ جمعہ کے خطبہ میں خلیفۂ وقت کا نام لیتے تھے، مورخ بلاذری جس نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی ہے، فتوح البلدان میں شہادت دیتا ہے،

ثم ان اھل الھند غلبوا علی السندان	پھر اہلِ ہند، سندان پر غالب آگئے لیکن
فترکوا مسجدھا للمسلمین	وہاں کی مسجد کو مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا،
یجمعون فیہ ویدعون للخلیفۃ	جس میں وہ جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں اور
(فتوح السند)	خلیفہ کے لئے دعا کرتے ہیں،

اس کے بعد سندھ کی تاریخ پر ایک سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے، صرف مسلمان سیاحوں کے متفرق بیانات سے اس پردہ میں کبھی کبھی کوئی روزن ہوجاتا ہے، جس سے اندر کا ایک آدھ حال ہم کو معلوم ہوجاتا ہے، اس سے بہرحال یہ بات پایۂ وثوق کو پہونچتی ہے کہ مسلمانوں کی جو کچھ آبادی

.. ..

.. .. یہاں رہ گئی تھی، وہ برابر کسی نہ کسی خلافت کے دامن سے اپنے کو وابستہ سمجھتی رہی، بعد کو یہاں کے مسلمانوں میں دو فرقے ہوگئے تھے، ایک اہلِ سنت اور دوسرے باطنیہ شیعہ، اہلِ سنت کا مرکز بدستور خلافت عباسیہ تھی لیکن باطنی شیعہ مصر کے فاطمی سلاطین کو اپنا خلیفہ جانتے تھے، بشاری مقدسی جو چوتھی صدی میں ہندوستان آیا تھا، منصورہ پایۂ تخت سندھ کے حال میں لکھتا ہے،

واما المنصورۃ فلیھا سلطان	منصورہ میں ایک مستقل بادشاہ ہے جو

من قریش یخطبون للعباسی	نسلاً قریشی ہے، یہاں کے مسلمان خلیفہ
(صفحہ ۴۸۵ مطبوعہ یورپ)	عباسی کا خطبہ پڑھتے ہیں،

ملتان کے تذکرہ میں کہتا ہے،

واما بالملتان فیخطبون للفاطمی	لیکن ملتان میں خلیفہ فاطمی کے نام کا
ولا یحلون ولا یعقدون الا	خطبہ پڑھتے ہیں، اور اسی کے احکام
بامرہ وانہ ابدا رسلھم وھدایاھم	کی تعمیل کرتے ہیں، یہاں کے مسلمانوں
تذھب الی مصر،	کے ایلچی اور تحائف ہمیشہ مصر جاتے
	رہتے ہیں،

جو مسلمان افغانستان کی راہ سے ہندوستان آئے، اُن میں سب سے پہلا نام سلطان محمود غزنوی کا ہے، سلطان کی سیاسی طاقت اور فوجی قوت کا یہ حال تھا کہ وسط ایشیا میں اس سے کوئی بڑی طاقت اور قوت موجود نہ تھی، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑا طاقت ور مسلمان حکمران تھا، اور فوجی و سیاسی حثییت سے خلافت عباسیہ درحقیقت بزرگوں کی مقدس ہڈیوں کا ایک ڈھانچ رہ گئی تھی لیکن تم کو معلوم ہے کہ یہ دنیا کا طاقتور انسان اس ڈھانچ سے کتنا ڈرتا تھا، اور اپنی پوری جنگی قوت وطاقت کے باوجود وہ خلیفہ عصر القادر باللہ کی اطاعت کو اپنے لئے کتنا ضروری سمجھتا تھا، ہر نئی کامیابی کا اطلاع نامہ دیوان خلافت میں معمولاً بھیجا جاتا تھا کسی نئے ملک پر قبضہ و تصرف کرنے کے لئے اوسی دربار سے باقاعدہ اجازت چاہتا تھا، دربارِ خلافت سے فتوحات کے موقع پر اُس کے لئے جو خلعت آتے تھے، اُس کی خوشی کسی نئے ملک کی فتح سے کم اس کو نہیں ہوتی تھی، اس کو دنیا کی بڑی سے بڑی عزت، بڑی سے بڑی عظمت اور بڑا سے بڑا فخر حاصل تھا تاہم اس کی سب سے بڑی عزت، سب سے بڑی عظمت اور سب سے بڑا فخر یہ تھا،

کہ ایوانِ خلافت سے اس کو یمین الدولہ کا خطاب عطا ہو، سلطان نے گو ایران و ترکستان کے تمام ممالک اپنے زور بازو سے حاصل کرلئے تھے لیکن وہ اُس وقت تک ان ممالک کا جائز بادشاہ نہ ہو سکا، جب تک ۴۱۵ھ میں خلیفہ نے اس کے لئے فرمان جاری نہ کیا، چنانچہ طبقاتِ اکبری اور تاریخ فرشتہ وغیرہ کی عبارت ہے،

"خلیفۃ القادر باللہ عباسی القائم بسلطان محمود نوشتہ لوائے خراسان و ہندوستان و نیمروز و خوارزم فرستاد"

خود سلطان کا لقب جو محمود سے پہلے کسی دوسرے بادشاہ نے اختیار نہیں کیا تھا، اور سب سے پہلے محمود ہی کے لئے یہ بادشاہی کے استعمال میں آیا، یہ بھی خلیفہ کی جانب سے اس کو عطا ہوا تھا، ہندوستان کے باطنی اسماعیلیوں کے استیصال پر خلیفہ نے اس کو کہف الدولہ والاسلام (سلطنت اور اسلام کی جائے پناہ) کا خطاب دیا،

۴۱۰ھ میں ہندوستان کی عظیم الشان فتح پر دربارِ خلافت میں اُس نے جو عریضہ بھیجا، اُس کی کیفیت سُنو،

"سلطان در ۴۱۰ھ فتح نامہ کہ مشتمل بود بر جمیع فتوحات کہ او را در ممالکِ ہندوستان روے نمودہ بود، بہ بغداد فرستاد، خلیفہ القادر باللہ عباسی آں روز مجلسے عظیم ساختہ فرمود تا آں فتح نامہ را بر روس منابر پیش خلائق بآواز بلند بخوانند و مردم بواسطہ اعلائے معالم اسلام شکرہا کردہ و زبان بستایش سلطان محمود کشادہ نصرت و ظفر او از حق سبحانہ تعالیٰ مسئلت نمودند آں روز در بغداد آنچناں سرور و خوشحالی انتشار یافت کہ گوئی کیے از عیدہائے مقررۂ اسلام است" (فرشتہ)

سلطان پر سب سے بڑی عنایت خلیفہ کی یہ تھی کہ اُس نے لکھا کہ تم جس کو اپنا ولی عہد بناؤ

میں بھی اس کو قبول کروں گا" اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ سلاطین کی جانشینی کا مسئلہ بھی خلفاء کے ہاتھ میں تھا،

سلطان محمود کے دو بیٹے تھے، امیر مسعود اور امیر محمد، سلطان امیر محمد کو چاہتا تھا،
"تا بجدے کہ از خلیفۂ عباسی التماس نمود کہ اسم امیر محمد را بر سلطان مسعود مقدم
نویسد"[1]

لیکن ایسا نہ ہوسکا، سلطان محمود کے بعد امیر مسعود بادشاہ ہوا، اور امیر محمد نے بھائی سے شکست کھائی، امیر مسعود کو دربار خلافت سے جلال الدولہ جمال الملۃ کا خطاب پہلے ہی عطا ہوچکا تھا؛

تخت نشینی کے بعد خلیفہ قادر باللہ نے اس کے تقرر سلطنت کی منظوری کا فرمان اور خلعت بھیجا، سلطان اوس وقت نیشاپور میں تھا، اہل نیشاپور نے اپنے شہر کے لئے اس حسن اتفاق کو عزت اور فخر کا موجب جانا، تمام شہر آراستہ کیا گیا، اور فوجی جلوس کے ساتھ علماء و مشائخ کے حلقہ میں آکر قاصد نے فرمان پیش کیا، سلطان نے بے حد مسرت کا اظہار کیا، اور اہل دربار کو انعامات تقسیم کئے،

خلیفہ قادر باللہ کی وفات کے بعد جب قائم بامر اللہ خلیفہ ہوا، تو نئے خلیفہ کی طرف سے بیعت لینے کے لئے سلطان کے پاس دوسری دفعہ قاصد آیا، خلیفہ نے سلطان کو جن شرائط کے ساتھ سلطنت موجودہ پر بحال رکھا، اور سلطان نے جن الفاظ میں خلیفہ کی اطاعت و بندگی کا عہد کیا، وہ اصل خطوط تاریخوں میں اب تک محفوظ ہیں[2] اور پڑھنے کے قابل ہیں، ان میں خلیفہ نے سلطان کو عدل و انصاف کی تاکید کی ہے، اور سلطان نے لکھا ہے کہ اگر میں کسی حال میں ان شرائط سے تجاوز کروں تو مجھ پر خدا کا عذاب ہو، اور میری بیویاں مجھ پر حرام ہوجائیں،

---

[1] تاریخ آل سبکتگین بیہقی ص ۵۱ ۔ ۲۵۳ ۔ مطبوعہ کلکتہ؛

غزنوی سلاطین کے بعد غوریوں کا دور آتا ہے، اس خاندان میں سے بھی اکثر سلاطین نے دربارِ خلافت سے خطابات حاصل کئے ہیں، جو تاریخوں میں مذکور ہیں،

افسوس ہے کہ ہمارے ہندوستانی مؤرخین نے اس قسم کے واقعات بہت کم قلمبند کئے ہیں، اور خود عرب مورخین نے یہ واقعات شاذ ونادر ہی لکھے ہیں، ۵۷۵ھ میں الناصر لدین اللہ خلیفہ تھا، (یہ زمانہ ہندوستان میں غوریوں کی حکومت کا تھا) اُس نے خبر رسانی اور جاسوسی کے محکمہ کو اس قدر وسعت دی تھی کہ دنیائے اسلام کا کوئی گوشہ اُس کے خبر رسانوں اور جاسوسوں سے خالی نہ تھا، مورخین نے اس کے عجیب وغریب حالات لکھے ہیں، منجملہ اس کے ایک ہندوستانی تاجر کا قصہ سننے کے لائق ہے، ہندوستان میں ایک تاجر کے پاس ایک طوطا تھا جس کو "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد" سکھایا گیا تھا، تاجر نے یہ نادر تحفہ دربارِ خلافت کے لئے مناسب سمجھا، چنانچہ وہ یہ تحفہ لے کر بغداد روانہ ہوا، اتفاق سے جب وہ بغداد پہنچا تو طوطا مر گیا، سخت حیران ہوا کہ طوطا کیا جائے اسی اثنا میں ایک شخص نے فراش کے بھیس میں اس کے پاس پہنچا، اور طوطے کو طلب کیا، تاجر رونے لگا، اور واقعہ بیان کیا، فراش نے کہا کہ ہم کو یہ معلوم ہو چکا تھا تم وہ مرا ہی طوطا دیدو، لیکن یہ بتاؤ کہ اس تحفہ کے انعام میں تم خلیفہ سے کتنی رقم کی اُمید رکھتے تھے، اُس نے کہا کہ مجھے ۵۰۰ اشرفیوں کی توقع تھی، فراش نے کہا "یہ ۵۰۰ اشرفیوں کا توڑا ہو یہ خود خلیفہ نے تمہارے پاس بھیجا ہے، جب تم ہندوستان سے اس ارادہ سے نکلے تھے، تب ہی خلیفہ کو اس کی اطلاع مل چکی تھی"[1]

علامہ سیوطی خلیفہ الناصر کے حال میں لکھتے ہیں:۔

کان النّاصر قد ملاء القلوب	ناصر نے لوگوں کے دلوں کو اپنے خوف و دبدبہ

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی،

هيبة دخيفة فكان يرهبه	ہیبت سے مرعوب کر دیا تھا، اس سے
اهل الهند و مصر كما كان	ہندوستان اور مصر کے لوگ ویسے ہی
يرهبه اهل بغداد فاحيٰ	ڈرتے تھے، جیسے بغداد والے، اس نے
هيبة الخلافة وكانت	خلافت کی اوس ہیبت و جلال کو
قد ماتت بموت المعتصم،	زندہ کیا، جو معتصم کے مرنے سے مر گیا تھا،

سلطان شہاب الدین غوری بڑے جاہ و جبروت کا بادشاہ تھا، لیکن اُس کے تاج فخر کا طُرّہ یہ ہے کہ وہ قسیم امیر المومنین اور ناصر امیر المومنین (امیر المومنین کا مددگار) تھا، (طبقات ناصری ص ۱۱۴ و ۱۲۶) قطب مینار دہلی اور مسجد قطبی کے دروازہ پر سلطان کے نام کے جو کتبے ہیں ان میں سلطان کے یہ القاب پتھروں پر منقوش ہیں،

ہندوستان کے خود مختار سلاطین میں سلطان شمس الدین التمش کا نام پہلے آتا ہے جس نے باقاعدہ ہندوستان کی مملکت کو ایک مستقل سلطنت کے قالب میں ڈھال دیا، وہ ۶۰۷ھ میں تخت نشین ہوا تھا، ۶۲۶ھ میں خلیفہ نے اس کو خلعت بھیجا، اس کے یہ معنی تھے کہ ایوان خلافت نے ہندوستان کے استقلال اور خود مختاری کو تسلیم کر لیا، سلطان نہایت ادب و احترام کے شرائط بجا لایا، اور اس کو اس خلعت سے اس قدر خوشی ہوئی کہ اس کے لئے تمام دار السلطنت میں جشن منایا گیا، سلطان نے افسروں کو انعام دیا خلعت تقسیم کئے، صاحب طبقات اکبری کا بیان ہے (ص ۶۰)

"در ۶۲۶ھ رسولانِ عرب جامۂ خلافت جہت سلطان شمس الدین آوردند، سلطان آنچہ شرط اطاعت و ادب بود، بجا آوردہ، جامۂ دار الخلافت پوشیدہ واز پوشیدن آں خلعت فرحت وبہجت بے نہایت در احوال سلطان محسوس می شد

سلطان اکثر امرا را خلعتہا داد...... و در شہر قبہا بستند و کوس شادیانہ زدند"

خلیفہ کا نام ہندوستان کے مورخوں نے نہیں لکھا ہے، مگر یہ زمانہ مستنصر باللہ کا تھا، شمس الدین التمش کا لقب بھی ناصر امیر المومنین (امیر المومنین کا مددگار) تھا، اور یہی لقب اوس کے سکوں پر منقوش پایا جاتا ہے، اسی زمانہ میں الناصر لدین اللہ نے وفات پائی اور مستنصر باللہ نے مسند خلافت کو زینت بخشی سلطان شمس الدین التمش، سلطانہ رضیہ، سلطان ناصر الدین محمود اور سلطان علاء الدین محمد کے سکوں پر خلیفہ مستنصر باللہ کا نام سلطان کے پہلو بہ پہلو کندہ ہے بلکہ ان سلاطین کے بعض ایسے سکے بھی ہیں جن پر صرف خلیفہ کا نام منقوش ہے، رضیہ کے سکہ پر رضیہ کے بجائے یہ الفاظ کندہ ہیں" المستنصر امیر المومنین" مستنصر باللہ کے بعد آخری خلیفہ بغداد مستعصم باللہ جلوہ آرائے خلافت ہوا، سلطان علاء الدین ابو المظفر مسعود، سلطان ناصر الدین ابو المظفر محمود، سلطان غیاث الدین بلبن، سلطان معز الدین کیقباد، سلطان جلال الدین فیروز شاہ، سلطان رکن الدین کیکاؤس کے سکوں پر خلیفہ مستعصم باللہ کا نام کھدا ہوا ملتا ہے،

خلافت اور ہندوستان کا تعلق سب سے زیادہ محمد شاہ تغلق کے زمانہ حکومت میں نمایاں نظر آتا ہے، سلطان جس طرح اپنے اور کارناموں میں بے مثال اور عدیم النظیر معلوم ہوتا ہے اسی طرح اس مسئلہ خلافت میں بھی اس کا اعتقاد اور طرز عمل تمام سلاطینِ اسلام میں بے مثال ہے، سب جانتے ہیں کہ معتصم باللہ کے عہد میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی خلافت عباسیہ کا پیراہن تار تار ہوگیا تھا، اس کے بعد مصر میں دوبارہ خلافتِ عباسیہ نے از سرنو ایک دوسری زندگی حاصل کی، چونکہ پہلے زمانہ میں آمدورفت کے طریقے اس قدر آسان نہ تھے، اس لئے ایک ملک میں دوسرے ملک کی خبریں سالہا سال کے بعد پہونچتی تھیں، اس لئے خلافتِ بغداد

کی تباہی کے بعد ہندوستان میں کئی سال تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مسلمانانِ عالم نے خلافت کا دوبارہ کیا نظام قائم کیا ہے، چنانچہ تاجروں اور مسافروں کی زبانی اس کی تفتیش ہوتی رہتی تھی، اس موقع پر ہم خود کچھ کہنا نہیں چاہتے، بلکہ ایک معاصر مورخ کے بیان کو لفظ بلفظ نقل کر دیتے ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ضیاء برنی لکھتا ہے:۔

درخاطر افتاد کہ سلطنت و امارت	سلطان کے دل میں آیا کہ خلیفہ عباسی
سلاطین بے امداد خلیفہ کہ از آلِ	کی اجازت کے بغیر سلطنت و حکومت
عباس بود، درست نیست و ہر بادشاہے	جائز نہیں، جن بادشاہوں نے خلفاے
کہ بے منشاے خلفاے عباسی بادشاہی	عباسی کے فرمان کے بغیر حکومت کی ہے
کردہ است و یا بادشاہی کند متغلب	یا آیندہ کریں، وہ غاصب تھے، اور
بودہ است و متغلب بود: و از خلفاے	غاصب ہوں گے، سلطان خلیفہ عباسی
عباسی سلطان بیاتتبع می کرد	کے حالات دریافت کرتا رہتا تھا،
تا از بسیار مسافران شنید کہ خلیفہ	یہاں تک کہ بہت سے مسافروں
از آل عباس در مصر بر خلافت	سے اس نے سنا کہ خلیفہ عباسی مصر
متمکن است، و سلطان محمد با عوان	میں متمکن ہے، سلطان نے یہ سن کر
و انصار دولتِ خود با آں خلیفہ کہ در	خود مع تمام ارکانِ دولت کے خلیفہ
مصر است بیعت کردہ، و در سر	مصر کی بیعت کی، اور ایک وفد کے
کدو داری عرض داشت بجانب	ساتھ خلیفہ کی خدمت میں عرضداشت
خلیفہ سوار می کرد و از ہر باب چیزہا	بھیجا کرتا تھا، اور اس میں تمام باتیں
دراں می نوشت و چون در شہر آمد	لکھا کرتا تھا، جب دار السلطنت میں

نماز جمعه و نماز اعیاد را در توقف داشت
و از سکه نام خود در کنانید و فرمود
تا در سکه نام و لقب خلیفه نویسند
در اعتقاد خلافت آل عباس مبالغها
کرد، که در تحریر و تقریر نتوان گنجانید
(ص ۴۹۲)

پہنچا تو جمعہ اور عیدین کی نماز خلیفہ
کے جواب آنے تک) بند کرا دی،
اور سکہ سے اپنا نام مٹا کر خلیفہ کا نام
اور لقب کندہ کرایا، سلطان کو
خلفائے عباسیہ کی خلافت کے
ساتھ اس قدر عقیدت تھی کہ تقریر
و تحریر میں وہ نہیں سما سکتی،

۷۴۴ھ میں حاجی سعید صرصری کی سرکردگی میں مصر کے دربار خلافت سے سلطان کے لئے خلعت اور لوائے سلطنت اور فرمان آیا، سلطان نے تمام ارکان دولت، علماء، سادات اور مشائخ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا، سواری سے اتر کر فرمان و خلعت کو سر پر رکھا، قاصد خلافت کے پاؤں کو بوسہ دیا، تمام شہر میں جشن منایا گیا، جمعہ و عیدین کی نمازیں شروع ہوئیں اس کے بعد سلطان اور خلیفہ کے مابین نامہ و پیام اور تحفہ تحائف برابر جاری رہے، ابن بطوطہ مغربی جو اسی زمانہ میں ہندوستان آیا تھا، وہ بھی شہادت دیتا ہے کہ سلطان کو خلیفۂ وقت کے ساتھ حد درجہ عقیدت تھی، اور بہت سے واقعات اور وفد خلافت کے حالات لکھے ہیں،

منجملہ اون کے ایک واقعہ یہ ہے جس سے معلوم ہوگا کہ سلطان کو خاندان خلافت سے کس درجہ عقیدت تھی، اور اس سے عام ہندوستانی مسلمانوں کی عقیدتمندی کا اندازہ لگایا جائے، خلیفہ مستنصر باللہ کے سلسلہ کا ایک عباسی خلیفہ زادہ جس کا نام غیاث الدین تھا کسی سبب سے بغداد سے ترکستان چلا آیا تھا، اور وہاں حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہما کے مزار پر سالہا سال مجاور رہا، جب سلطان کی عقیدت مندی کا آوازہ پھیلا، تو غیاث الدین نے

ترکستان سے اپنے دو سفیر سلطان کے پاس بھیجے، بغداد کے جو لوگ ہندوستان میں مقیم تھے انہوں نے خلیفہ زادہ کی صحیح النسبی کی شہادت دی، سلطان نے عریضہ بھیجا، اور بڑی منت سے خلیفہ زادہ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی، جب خلیفہ زادہ ہندوستان کی سرحد پر پہنچا تو وہاں کے امرار کو استقبال کے لئے بھیجا، جب سرستی تک سواری پہونچی تو قاضی القضاۃ صدر جہان کمال الدین غزنوی اور دوسرے علما استقبال کے لئے آئے، اور جب دلی کے قریب مسعود آباد میں موکب ہمایوں پہنچا، تو خود سلطان اکابر دربار کو ساتھ لے کر استقبال کے لئے نکلا، اور ایک معمولی آدمی کی طرح پیدل چل کر خلیفہ زادہ کی رکاب تھامی، اور عرض کیا کہ "اگر میں خلیفہ ابو العباس..... کی بیعت نہ کر چکا ہوتا تو آپ کی بیعت کر لیتا" خلیفہ زادہ نے جواب دیا کہ "میں بھی اُن ہی کی بیعت پر ہوں" غرض بڑے تزک و احتشام کے ساتھ یہ سواری دلی پہنچی اور ایک ایوانِ شاہی قیام و سکونت کے لئے خاص کیا گیا، اور "مخدوم زادہ" خطاب دیا گیا، جب خلیفہ زادہ دربار میں آتا تو سلطان تخت شاہی سے اٹھ کر تعظیم دیتا اور اپنے برابر تخت پر بٹھاتا، اسی اثنا میں یہ واقعہ پیش آیا کہ غزنی کا ایک امیر جس سے مخدوم زادہ کا دل صاف نہ تھا، دلی آیا، سلطان نے اُس کے رہنے کے لئے جو مکان متعین کیا، وہ مخدوم زادہ کے قبضہ میں تھا، مخدوم زادہ نے اس کو اپنی توہین سمجھا، اور فوراً وزیر سے آکر کہا کہ "سلطان سے کہہ دو کہ اس کے تمام ہدایا اور نذرانے میرے پاس بدستور رکھے ہیں، وہ واپس منگوالے" اتنا کہا، اور آزردگی، اور کبیدہ خاطری کے ساتھ دربار سے اٹھ کر چلا آیا، سلطان نے جب یہ سُنا تو اُس کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے، دوڑا ہوا مخدوم زادہ کی اقامت گاہ پر آیا، اور عام آدمیوں کی طرح اجازت لے کر سواری سے اُتر کر پیادہ اندر داخل ہوا اپنے قصور کی معافی چاہی، مخدوم زادہ نے معاف کر دیا، لیکن سلطان کے اس جوشِ عقیدت کو دیکھو، عرض کرتا ہے، اے گوہر کانِ خلافت! مجھے اس وقت تک اپنی

برأت کا یقین نہ آئے گا جب تک پائے مبارک میری اس حقیر گردن پر نہ ہو، خلیفہ زادہ نے کہا مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا۔" لیکن سلطان کسی طرح راضی نہ ہوا، اور زبردستی اپنا سر زمین پر ڈال دیا، آخر ایک امیر نے خلیفہ زادہ کے پیر کو اٹھا کر آہستہ سے سلطان کی گردن پر رکھ کر اٹھا لیا، سلطان نے کہا کہ اب مجھے حضور کی خوشنودی اور رضامندی کا یقین آیا، ابن بطوطہ اس واقعہ کو لکھ کر کہتا ہے کہ "یہ ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے جو کسی بادشاہ کے متعلق سننے میں نہیں آیا۔"

بادشاہوں کے مذاق کا اندازہ دربار کے شعراء کی زبان سے ہوتا ہے مشہور شاعر بدر چاچ سلطان کے دربار کا شاعر تھا، اس کے قصائد کا دیوان ہر جگہ ملتا ہے تم اس کا کوئی صفحہ کھولو، سلطان وقت کی مدح کے ساتھ ساتھ خلیفۂ وقت کی تعریف و ستائش تو ہم پاؤ گے، شاید خشک تاریخی واقعات سنتے سنتے طبیعت گھبرا اٹھی ہو بدر چاچ کے یہ چند اشعار کچھ دیر کیلئے مجلس کا رنگ بدل دیں گے شروع سے چلو۔

او شہنشاہ شریعت بود و منشورش کتاب (آنحضرت صلعم، قرآن) — این زماں قائم مقام او امام اکبر است (خلیفہ)

شاہ ابن احمد ابو العباس امیر المومنین — آنکہ آل دودۂ عباس را سر دفتر است

آفتاب شرع و ملت آسمان ملک و دیں — آنکہ بر تخت خلافت را جمالش زیور است

آنکہ از جان بیعت فرمان او بر دل نوشت — بادشاہ شرق و غرب عالم بحر و بر است

بو المجاہد ظل حق سلطان محمد کز جلال — دود شمع بزم او شمع روان اخضر است

مولی امیر المومنیں سلطان محمد شاہ دیں — ہم بر و آب آتشیں ہم فردا را ریختہ

چوں از خلیفہ شاہ را منشور آمد بالوا — شد باز نور والضحیٰ بر فرق طرہ ریختہ

شاہ محمد آں ولی عہد خلیفۂ زماں — کو چار امام چار میں شہر علوم را درست (حضرت علی)

جب سلطان کے نام خلیفہ نے مصر سے فرمان سلطنت اور خلعت بھیجا، تو شاعر نے اس تقریب میں حسب ذیل قصیدہ دربار میں پیش کیا،

جبریل از طاق گردوں آبشرؤا گویاں رسید | کز خلیفہ سوے سلطاں خلعت و فرماں رسید

شاہ را بر کل عالم حکم مطلق داد امام | ایں خبر در ہفت کشور بر ہمہ شاہاں رسید

جاہ حاسد را چو چاہ یوسفی بے آب کرد | خلعت مصری کہ از کنعان بہ ہندستاں رسید

ملک را بازو قوی شد، دیں سرفرازی نمود | شرع را حرمت فزوں شد رونق ایماں رسید

راست عید مومناں آمد کہ در سالے دو مہ | از امیر المومنیں خلعت روے سلطاں رسید

ہم بتاریخ ماہ از سال ہفصد شد فزوں | زیں سفر ماہ محرم سابق شعباں رسید

یعنی محرم ۷۲۶ھ میں سابق شعبان یعنی رجب پہنچا، رجب قاصد کا نام تھا،

درد اسلامی کہ در سر داشت شاہنشاہ عصر | از ولی المسلمیں ایں درد را درماں رسید

آسمان تا خلعت عباسیاں در بر کشید (سیاہ) | شاہ مشرق را چو مہ یک نوبت چہلاں رسید (سلطان)

سلطان نے سفراے خلافت کی پیشوائی کس طرح کی اس کا حال سنو۔

باستقبال فرمانے کہ از پیش امام آمد | برہنہ پا و سر کردہ چو ایاں شد ز اسلامش

خلائق پیش دیس پویاں ملائک گرد حق گویاں | ز جزع شہ شدہ غلطاں گہر بر نقرۂ خامش (اشک، رخسارہ)

گہ از شکر و ثناے حق شکر می ریخت یاقوتش (لب) | گہے بر لعل می بارید مرواریدہا دامش (قطرہاے اشک، چشم)

چو شہ پوشید خلعت را بہ رنگ مردم دیدہ (سیاہ) | میان روز می دیدیم شب را با مہ تامش

ز آئینہا کہ شد بستہ ندیدم یک سر موے | سر ہر قبہ را فرقے ز ہفتم طاق تا بامش

امیر المومنین فرمود تا ہر جمعہ بر منبر | بہ ہفت اقلیم می خوانند شاہنشاہ اسلامش

ایک اور قصیدہ میں کہتا ہے۔

دوش آں زماں کہ خسرو زریں قباے خور (آفتاب) | در می کشید خلعت عباسیاں ببر (سیاہ)

یعنی رسید خلعت و فرمان سلطنت | از حضرت خلیفہ بدار اے بحر و بر

والی عصر احمد عباس، امام حق، | دارائے دہر، وارثِ پیغمبرِ بشر
این جشن شادیست کہ از حضرتِ امام | آوردہ اند خلعت و فرمانِ معتبر
مضمونش آنکہ درکنف حفظ شاد باد | بر روے خاک آبی و بادی خشک و تر
اقلیم ترک و روم و خراسان و چین و شام | ماموراِ مرشاہ بد و نیک و خیر و شر
القاب شہ کہ بر سر منبر برد خطیب | سلطان شرق و غرب شہنشاہ بحر و بر
خلعت برنگ مردمک چشم داد امام | تا نور شرع در دلِ مردم کند اثر

جشن خلعت کی تقریب میں لکھا ہے،

بلے جہان خرم آباد آنچنان شاہیست | کہ او متابع امر خلیفہ دنیاست
ابو الربیع سلیمان، خلیفہ برحق | کہ آستان درش آسمان عز و علاست
امام اثبت احمد کہ خسرو ہندش | بجان غلام و بتن چاکر و بدل مولاست

اس اخیر شعر کو پھر پڑھو، سلطان ہند خلیفہ برحق کے ادنیٰ غلام و چاکر ہونے پر فخر کرتا ہے،

بتن متابع شرع محمد مرسل | بدل متابع امر خلیفہ دنیا
ابو الربیع سلیمان عہد مستکفی | مدار شرع نبی شمع دودۂ خلفا
امام حق کہ شد اورا محمد تغلق | بدل غلام و بتن چاکر و بجان مولا
آن بندۂ خلیفہ در پیش تخت بخت | نائب ہزار خاقان، حاجب ہزار قیصر
شاہ محمد لقب حیدر احمد نسب | زان با امام زمان بیعت او استوار
حاکم روے زمین سلطان محمد شاہ دین | اے امامت بر ہمہ آفاق والی ساختہ
کبریائے بخت تو نہ طارم شش روزہ را | گوشۂ دہلیز دارالملک دہلی ساختہ

غرض تمام قصائد اسی قسم کے اعترافات اور خلافت کی عقیدت مندی سے معمور ہیں، سلطان نے خرم آباد کے نام سے ایک قلعہ مع مسجد تعمیر کرایا تھا، اس پر جو کتبے لگائے گئے تھے، اُن میں ایک خلیفہ کے نام کا تھا،

می کند از کتابہائے درت نظم مدح خلیفہ را تکرار
آں امام بحق کہ گردش بطوع شاہ عالم بہ بندگیش قرار

سلطان محمد تغلق کو مسئلہ خلافت سے جو عقیدت خاص تھی، اس کا اثر یہ ہے کہ اس چھوٹے سے مضمون میں بھی اوس کے بیان کی وسعت اتنی پھیل گئی، بہرحال اس تمام داستان کو سمیٹ کر اُن کے ترتیبی نتائج پر نگاہ ڈالو،

۱- ادنیٰ مسلمانوں کو چھوڑ کر سلاطین تک خلافت کے باب میں کیا اعتقاد رکھتے تھے،

۲- ہر مسلمان بادشاہ جو اطرافِ عالم میں کہیں حکمران ہو اُس کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ خلیفۂ وقت کا مطیع و فرماں بردار ہو، بلکہ اصلی حکومت درحقیقت خلیفۂ عصر کی ہوتی ہے اور دیگر سلاطینِ زمانہ اُس کے نائب اور قائم مقام کی حیثیت رکھتے ہیں،

۳- جب تک خلافت و بیعتِ امام نہ ہو جمعہ و عیدین تک روا نہیں،

اس سے معلوم ہوگا کہ آج کل علماء نے جو فتوے دیئے ہیں، وہ محض سیاسی نہیں بلکہ اُن کی مذہبی حیثیت ہے، اور یہ خودسر و مجنوں و گستاخ مسلمان آج سے پہلے بھی ہندوستان کی سرزمین میں موجود تھے،

اسی زمانہ میں ایک اور مسلمان سپاہی سرزمین دکن میں ایک نئی قوت کی تعمیر میں مصروف تھا، اس نئی قوت کا نام سلطنتِ بہمنیہ تھا، علاء الدین حسن کی سعی و کوشش سے آخرکار بہمنی سلطنت دکن میں قائم ہوگئی لیکن تم کو معلوم ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کے مراسم تاجپوشی

کیونکر انجام پائے،

"در مسجد بادشاہ قطب الدین صبح روز جمعہ ۲ ربیع الثانی ۷۴۸ھ تاج شاہی بر سرا رکاو گذاشتند وچتر سیاہ کہ نشان خلفائے عباسی بود تیمناً وتبرکاً بر سرش گرفتند"

(فرشتہ جلد اول ص ۲۷۷)

دلی میں محمد تغلق کی وفات کے بعد فیروز شاہ تخت نشین ہوا، اور اوپر سُن چکے کہ اس وقت دکن میں بہمنی سلطنت قوت پکڑ رہی تھی، اور اس لئے دلی اور دکن میں رقابت پیدا ہوگئی تھی، خلیفہ نے سلطان کو ہندوستان کی حکومت کا فرمان اور خلعت بھیجا، اور لکھا کہ سلاطین بہمنیہ کے ساتھ رفق ومدارات کا برتاؤ کرے، فرشتہ کی عبارت ہے،

"در ماہ ذیحجہ سنہ مذکور (۷۵۷ھ) خلعت ومنشور خلیفۂ عباسی مصر الحاکم[۱] بامر اللہ ابوالفتح بن ابی ربیع سلیمان متضمن تفویضِ ممالک ہندوستان وسفارش بادشاہان بہمنیہ دکن آمد، (ج ۱ ص ۱۴۶)

۷۶۰ھ میں علاء الدین حسن نے وفات پائی، اور اس کا بیٹا سلطان محمد تخت نشین ہوا، اس کے لئے خلیفہ معتضد باللہ عباسی نے غالباً ۷۶۱ھ یا ۷۶۲ھ میں خلعت اور بہمنیہ کے خطبہ وسکہ کی منظوری کا فرمان بھیجا، سلطان خلعت کو سر پر رکھ کر تیا منگاۃ تک لایا، اور شادیانے بجوائے، گویا یہ بہمنیہ خاندان کی فرمان روائی اور دکن کی خود مختاری کا دربارِ خلافت کی طرف سے اعلان تھا، ظاہر ہے کہ اس اعلان سے فیروز شاہ کے اقتدار شاہی میں کس قدر تزلزل آگیا ہوگا، اسلئے

---

[۱] فرشتہ نے حاکم بامر اللہ ابوالفتح بن ابی ربیع سلیمان نام غلط درغلط لکھا ہے ۷۵۷ھ میں معتضد باللہ ابوالفتح ابوبکر بن ابی الربیع سلیمان خلیفہ تھا، حاکم بامر اللہ ابوالعباس احمد بن ابی الربیع سلیمان تھا جس نے ۷۵۳ھ میں وفات پائی،

ضرورت تھی کہ دربارِ خلافت کی طرف سے ہندوستان خاص کی بادشاہی کا خاندان تغلق سے متعلق ہونا ظاہر کردیا جائے، چنانچہ اس کے بعد ہی خلیفہ نے فیروز شاہ کے لئے دوسرا فرمان اور خلعت بھیجا، اس کا اثر یہ ہوا کہ فیروز شاہ کی سلطنت میں سکون اور قرار پیدا ہوگیا، چنانچہ خود اس کے دربار کا مورخ ضیاء برنی لکھتا ہے[۵]

" مقدمہ نہم در بیان آنکہ از حضرت امیرالمومنین خلیفۂ عباسی دو کرّت خلعت اولی الامری ومنشور اذن ولوار بادشاہی بر سلطان عصر و زمان فیروز شاہ السلطان رسید و بادشاہی واولوالامری خداوند عالم بدان استحکام گرفتہ

در مدت شش سال ... دو کرّت از امیرالمومنین خلیفۂ عباسی منشور اولوالامری و خلعت بادشاہی ولواے سلطنت بدو رسید حق جل وعلیٰ بادشاہ دین پرور و دین پناہ ارا در عزت داشت منشور خلعت و فرستادگان امیرالمومنین توفیق بخشید و شرائط حرمت مراحم امیرالمومنین بانحاء ابلغ بجا آورد، وہم چنیں دانست کہ منشور وخلعت امیرالمومنین از آسمان منزل شدہ است واز درگاہ مصطفیٰ صلعم رسیدہ، عرضداشتے با تحفہ وہدایا در نہایت تواضع، بندگی امیرالمومنین روان کرد"

اس فرمان وخلعت کے آنے کا اثر کیا ہوا اُس کو سنو،

از میامن مناشیر و برکات خلعہائے خلیفۂ عباسی جمعات واعیاد وعامۂ اہل اسلام تزاید پذیرفت واز تاثیرات اذن و اجازت عم زادۂ مصطفیٰ صلعم فیض آسمانی دریں دیار متواتر منزل می گردد، وابواب بلاہائے آسمانی از قحط و دبا مسدود گشتہ است واز حسن اعتقاد دین پروری و دین پناہی بادشاہ اسلام شرطنا تہ از ممالک و کلی

[۵] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۹۰، کلکتہ۔

دفع شدہ است ودلہائے خواص وعوام اہل مملکت باطاعت وانقیاد واخلاص ودولتخواہی درگاہ گردانید وامن وامان تمام پیدا شد وتشتت وتفرق وتردد وترس از باطنہا رفتہ

تم نے اس اثر کو دیکھا صرف ایک کاغذ کی چند سطروں نے پورے ملک کے ہیجان میں سکون پیدا کر دیا، بادشاہ کا مذہبی وقار اس کی مسلمان رعایا کے دلوں میں پیدا ہوگیا، لوگوں میں مذہبی سرگرمی آگئی، باغیوں کی سازشوں کا جال دفعۃً ٹوٹ گیا،

علامہ سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ خلیفہ المستعین باللہ عباسی کے عہدِ خلافت میں ۸۱۶ھ میں غیاث الدین اعظم شاہ بن سکندر شاہ بادشاہ ہندوستان نے خلیفہ کے پاس قاصد بھیجا، اور فرمان حکومت کی درخواست کی، اس نام کا بادشاہ نہ دلی میں نظر آتا ہے، اور نہ دکن وبنگالہ[1] میں، یہ وہ زمانہ ہے جب تیمور کے حملوں سے ہندوستان چور چور تھا، اور ملک میں کوئی باقاعدہ حکومت قائم نہیں تھی ممکن ہے کسی امیر نے اس موقع سے خلیفہ کا فرمان حاصل کرکے فائدہ اٹھانا چاہا ہو،

۸۳۹ھ میں سلطان محمود خلجی نے مالوہ میں اپنی ایک مستقل حکومت قائم کی، اور اجین کے قریب منڈو کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور چونتیس[۳۴] سال نہایت عدل وانصاف اور شہرت ونیک نامی کے ساتھ حکومت کرکے ۸۷۳ھ میں وفات پائی، سلطان کی فتوحات اور کارناموں نے گو بڑی وسعت حاصل کی تاہم ابھی شاہانہ اعزاز واحترام کے سب سے بڑے رتبہ سے وہ محروم تھا یعنی دربارِ خلافت سے اس کو استقلال وخود مختاری کا فرمان نہیں ملا تھا، ۸۷۰ھ میں آخر وہ دن بھی آگیا، مستنجد باللہ خلیفۂ عباسی نے مصر سے شرف الملک حاجب کے ساتھ خلعت شاہانہ اور فرمان سلطنت

---

[1] بنگالہ میں سلطان غیاث الدین بن سکندر شاہ ایک بادشاہ گذرا ہے، مگر اس کا زمانۂ وفات ۷۷۵ھ ہے، اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون بادشاہ تھا، میں نے کسی امیر کا شبہ ظاہر کیا ہے، مگر اس کے لئے کوئی سند میرے ہاتھ میں نہیں،

کے لئے بھیجا، سلطان نے مع اہلِ دربار کے اس کا استقبال کیا، اور خلعت پہنا، اور منبروں پر سلطان کے نام کے ساتھ خلیفہ کا نام بھی خطبہ میں پڑھا گیا،

اس واقعہ کے چند روز کے بعد سلطان نے خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑا جلوس ہے، اور میں بھی یہی خلعت پہنے ایک گھوڑے پر سوار اس جلوس میں شریک ہوں، حاجب نے کہا کہ گھوڑے سے اُتر جائیے، اُتر گیا، آگے بڑھا تو ایک ابلق رنگ گھوڑا آسمان سے نیچے اُترا، حاجب نے مجھ کو اُس پر سوار کیا، اور اب دیکھتا ہوں کہ دلّی کے دروازے پر ہوں، ایک عرب نے آگے بڑھ کر کہا کہ آپ اندر تشریف لیجائیے، اندر جا کر دیکھا تو دربار لگا تھا تخت پر کچھ عرب سیاہ کپڑے پہنے بیٹھے تھے، جن کا رنگ میرے خلعت ہی کے رنگ کا تھا، اوسی عرب نے مجھ سے کہا کہ یہ خلفاے عبّاسیہ ہیں، یہ منصور ہیں، یہ رشید ہیں، میں نے سلام کیا، انھوں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے، عرب نے کہا یہ ہمارا دوست محمود شاہ ہے[۱]

یہ خواب ایک معمولی واقعہ ہے لیکن اس کے نقل کر دینے سے مقصود یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوگا کہ سلاطینِ ہند کے دل و دماغ اور نفسیات پر خلفاے اسلام کا کس درجہ اثر تھا، اور اُن کو خلافتِ اسلامیہ سے کس درجہ عقیدت تھی،

چند صفحے پہلے ہندوستان کے قدیم مورخوں کی کوتاہ قلمی کی شکایت قلم سے نکل چکی ہے کہ وہ تاریخوں میں اپنے اپنے عہد کے اس قسم کے واقعات کو عام اور معمولی سمجھ کر قلم انداز کرتے آئے ہیں، انھیں یہ گمان نہ تھا کہ مسلمانوں پر ایک زمانہ آئے گا جب یہی عام اور معمولی واقعات محتاجِ ثبوت و تصدیق ہو جائیں گے لیکن ایک عیسائی مورخ ایڈورڈ ٹامس Edward Thomas کی کوششیں ہم مسلمانوں کے شکریہ کی مستحق ہیں، جس نے بہت حد تک ہمارے بزرگوں کے ادھورے کارناموں کو پورا کر دیا ہے. ایڈورڈ ٹامس آج سے پچاس برس پہلے انگلستان میں

---

[۱] یہ پورا واقعہ تاریخ گجرات ظفر الوالہ میں ہے صفحہ ۲۰۴، مطبوعہ لندن،

ایک مشہور مستشرق گذرا ہے، اس نے ۱۹۳۸ء میں سلاطین ہند کی تاریخ اُن کے عہد کے سکوں کے نقوش اور کتبات سے مرتب کی ہے، اس نے سلاطین اور بادشاہوں کے سکے فراہم کئے ہیں ان کے کتبے پڑھے ہیں، اور ان پر پوری بحث کی ہے، میں نے پہلے اس کتاب کے ایک ایک کتبہ کو پڑھا اور پھر ان تمام کتبوں کو عہد بعہد کی ترتیب سے یکجا اکٹھا کیا، ان کتبوں کو پڑھ کر سخت حیرت ہوئی کہ جو باتیں تاریخ کے کرم خوردہ اوراق میں بہت کم ملتی ہیں، وہ ان سونے چاندی کے پتروں میں کس بہتات کے ساتھ موجود ہیں

(۱) ان میں سے ہر سکہ اور ہر کتبہ پر ہندوستان کے سلطان وقت کے نام کے ساتھ بالکل برابر خلیفۂ وقت کا نام بھی ثبت ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کی طرح ہندوستان کے تمام سلاطین عملاً یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ مستقل بادشاہ نہیں ہیں، بلکہ ان کی حیثیت اپنی مملکت میں خلیفہ کے ایک نائب اور قائم مقام کی ہے، چنانچہ آپ خود سکوں میں اس کی تصریح پائیں گے، دیکھو نمبر ۱، ۲، ۴، ۸، ۷،

۲- یہ دیکھ کر اور حیرت ہوتی ہے کہ نہ صرف سلاطین دہلی خلفا سے عقیدت رکھتے تھے، بلکہ اطرافِ ہند میں دہلی کی مرکزی سلطنت سے ہٹ کر جو حکمراں بھی اپنی مستقل اور خود مختار حکومتیں قائم کرتے تھے، وہ بھی ہزاروں کوس دور پڑے ہوئے خلیفہ کی اطاعت سے باہر نہیں ہوتے تھے، چنانچہ سلاطین گجرات، مالوہ، اور شرقی و بنگالہ کے سکوں سے آپ کو اس کا اندازہ ہوگا،

۳- ایک اور لطیف تر بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے سکوں پر سلاطینِ وقت کے بجائے صرف خلفاے عصر کے نام ہیں، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سلاطین کی نیت یہ تھی کہ وہ خلفا کے مقابلہ میں اپنے کو مجازی بادشاہ بھی کہلانا پسند نہیں کرتے تھے،

۴ - یہ ایک عجیب بات یہ ہے کہ بعض سکوں پر سنسکرت خط میں "سری ہمیرا" اور "سری خلیفہ" اور "سری تُلیفہ" منقوش ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نامسلمان رعایائے ہند تک کو یہ سمجھانا منظور تھا کہ ملک کا اصل حکمراں خلیفہ ہے، انگریز محقق کہتے ہیں کہ "ہمیرا" امیرالمومنین کی اور "تُلیفہ" خلیفہ کی خرابی ہے،

(۵) ان سکوں میں ایک اور بات آپ پائیں گے جب کسی خلیفہ کا متعین نام و لقب نہیں معلوم ہوا ہے تو صرف مطلق خلیفہ یا امیرالمومنین کا لفظ لکھ دیا ہے، اور اگر کوئی ایسا زمانہ آیا ہو کہ کوئی خلافت قائم نہیں ہوئی، تو خلفائے اربعہ کے نام لکھدیئے گئے ہیں مثلاً نمبر ۴۶ میں کہ یہ بغداد کی تباہی کا زمانہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہر حال کسی نہ کسی قسم کی خلافت کا ذکر وہ ضروری سمجھتے تھے،

۶ - یہ سکے معزالدین غوری سے لیکر بہ ترتیب ابراہیم شاہ سکندر لودی تک کے ہیں، اس کے بعد تیموریہ سلطنت شروع ہوتی ہے، اور مصر میں خلفائے عباسیہ کا بھی خاتمہ قریب قریب ہو جاتا ہے، ان میں ہر سکہ "ہندوستان اور خلافت" کے دعوی کے لئے دلائل کا ایک دفتر ہے،

ذیل میں ہم بہ ترتیب ان سکوں کو درج کرتے ہیں،

سلاطینِ ہند کے سکوں کے کتبے

(۱)

الله	لا اله الا الله	ابوالمظفر محمد	محمد بن سام
محمد رسول الله	الناصر لدین الله السلطان	بن سام	هو الذی ارسل
السلطان المعظم	الاعظم غیاث الدنیا	غزنة فی شهور سنة	رسوله علی الدین
معز الدنیا والدین	والدین ابوالفتح	اثنی وتسعین وخمسمائة	کله ولو کره المشرکون

(۲)

هُوَ الذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق
لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون
لا اله الا الله محمد رسول الله السلطان
المعظم غیاث الدنیا والدین ابو الفتح
محمد بن سام
ضرب هذا الدرهم فی بلدة غزنة سنة
ست وتسعین وخمسمائة الناصر لدین الله
السلطان المعظم معز الدنیا والدین
ابو المظفر
محمد بن سام

(۳)

السلطان الاعظم   لا اله الا الله
معز الدنیا و   محمد رسول الله
الدین ابو المظفر   الناصر لدین الله
محمد بن سام   امیر المومنین
(ہندی میں) سری ہمیر   سری محمد سام پرتھوی

(۴)

قطب مینار دہلی کا کتبہ

السلطان المعظم شہنشاہ الاعظم مالک رقاب
الامم مولی ملوک العرب والعجم سلطان
السلاطین فی العالم غیاث الدنیا والدین
معز الاسلام والمسلمین محی العدل فی
العالمین علاء الدولة القاهرة ملک الملة
الطاهرة جلال الامة الباهرة شهاب الخلافة
باسط الاحسان والرأفة فی الثقلین ظل الله
فی الخافقین الحامی لبلاد الله الراعی
لعباد الله محرز ممالک الدنیا ومظهر
ممالک الدنیا ومظهر کلمة الله العلیا
ابو المظفر محمد بن سام قسیم امیر المومنین
خلد الله ملکه

(۵)

مسجد قطبی کے شمالی جانب کے داخلہ کے دروازہ پر
تاریخ ۵۹۲ھ

بسم الله الرحمن الرحیم
یدعوا الی دار السلام ویهدی من یشاء
الی صراط مستقیم فی شهور ثنتی وتسعین
جرت هذه العمارة العالی امر السلطان المعظم

معزالدنیا والدین محمد بن سام ناصر امیر
المومنین،

(۶)

السلطان المعظم لا اله الا الله
معزالدنیا والدین محمد رسول الله
ابوالمظفر الناصر لدین الله
امیرالمومنین
محمد بن سام ضرب هذا الدینار
لا اله ببلدة غزنة فی شهور
سنة ثلث وستمایة

(۷)

لا اله الا الله السلطان المعظم
محمد رسول الله عبده مولانا تاج الدین
الناصر لدین الله یلدز السلطانی
امیرالمومنین
ضرب هذا الدرهم ببلدة غزنة
فی شهور سنة عشر وستمایة

(۸)

القادر (ہندی میں)

لا اله الا الله ابا کتیک
محمد رسول الله محمدا واتر زیپا
یمین الدوله فی محمود
و
امین الملة
بسم الله
ضرب هذا الدرهم بمحمود پور
سنة ثمان عشرة واربعمایة

(۹)

فی عهد الامام لا اله الا الله
المستنصر محمد رسول الله
امیرالمومنین

(۱۰)

ہندی میں
متنصر ابتد سری خلیفہ

(۱۱)

السلطان المعظم لا اله الا الله
شمس الدنیا والدین محمد رسول الله
ابوالمظفر التمش المستنصر بامرالله
السلطان ناصر امیر امیرالمومنین
المومنین اثنین وثلثین وستمایة

(١٢)

السلطان المعظّم ضرب

شمس الدنیا والدّین نکور

ابو المظفّر التمش محمد رسول اللہ

القطبی للاذ الشمس

بزمان امیر المومنین ثمن و ستمایۃ

(١٣)

قطب مینار کی دوسری منزل کے دروازہ پر

امر باتمام ھذہ العمارۃ الملک المؤید

من السماء شمس الحق والدّین ایلتمش

السلطانی ناصر امیر المومنین

(١٤)

تیسری منزل کے دروازہ پر

امر بھذہ العمارۃ فی ایام الدولۃ السلطان

شہنشاہ المعظّم

مالک رقاب الامم مولی ملوک الترک

والعرب والعجم شمس الدنیا والدین

معز الاسلام والمسلمین ذو الامن

والامان وارث ملک سلیمان ابوالمظفر

ایلتمش ناصر امیر المومنین

(١٥)

فی عہد الامام السّلطان الاعظم

المستنصر باللہ ناصر الدنیا والدّین

امیر المومنین ابوالمظفر محمود شاہ

بن سلطان

(١٦)

رضیہ کے سکوں پر

المستنصر امیر المومنین

(١٧)

السّلطان الاعظم لا الٰہ الا اللہ

علاء الدنیا والدّین محمد رسول اللہ

ابوالفتح النّاصر لدین اللہ

محمد بن السّلطان

بسم اللہ ضرب امیر المومنین

ھذا الدینار بلدۃ غزنۃ فی شہور ثلاث عشرۃ

ستمائۃ

(١٨)

النّاصر جلال الدنیا والدین

لدین الله   منکبرنی

امیرالمومنین   بن السلطان

(۱۹)

الناصر لدین الله   العادل الاعظم

امیرالمومنین   چنگیز خان

(۲۰)

سیف الدنیا والدین   لا اله الا الله

ابوالمظفر الحسن   محمد رسول الله

قرلغ   المستنصر بالله

امیرالمومنین

هذا الدرهم فی شهور سنة ثلث وستمائة

(۲۱)

السلطان الاعظم   فی عهد الامام

جلال الدنیا والدین   المستنصر

امیرالمومنین

ملکة ابنة التمش السلطان

مهرة امیرالمومنین

ضرب هذه الفضة بلکنوتی سنة

...

(۲۲)

السلطان الاعظم   فی عهد الامام

معز الدنیا والدین   المستنصر

ابوالمظفر   امیرالمومنین

بهرامشاه بن السلطان

ناصر امیرالمومنین

ضرب بحضرة دهلی فی سنة ثمان وثلثین وستمایه

(۲۳)

السلطان الاعظم   فی عهد الامام

علاء الدنیا والدین   المستنصر امیرالمومنین

ابوالمظفر مسعود شاه

بن السلطان   ضرب دهلی

(۲۴)

السلطان الاعظم   فی عهد الامام

علاء الدنیا والدین   المستعصم امیر

ابوالمظفر مسعود شاه   المومنین

بن السلطان

ضرب سنة احدی واربعین وستمایه

...

(۲۵)

ہندی میں

سری شیفہ سری سلطان سری علاؤ دین

(۲۶)

السلطان الاعظم فی عہد الامام

ناصر الدنیا والدین المستعصم امیر المومنین

ابو المظفر محمود

بن السلطان

ضرب ہذہ الفضۃ بحضرۃ دہلی

فی سنۃ اربع وخمسین وستمائۃ

(۲۷)

السلطان الاعظم فی عہد الامام

ناصر الدنیا والدین المستعصم امیر المومنین

ابو المظفر محمود بن

السلطان

خمسین

(۲۸)

السلطان الاعظم الامام

غیاث الدنیا والدین المستعصم

ابو المظفر امیر المومنین

بلبن السلطان

ضرب ہذہ السکۃ بحضرت دہلی

فی سنۃ ثمانین وستمایۃ

(۲۹)

کتبہ جامع مسجد گڑ ہکتیسر ضلع میرٹھ

مبنی ہذہ العمارۃ فی عہد السلطنۃ (؟)

السلطان الاعظم شہنشاہ المعظم

غیاث الدنیا والدین

ابو المظفر بلبن السلطان ناصر امیر المومنین

سنۃ اثنی وثمانین وستمایۃ

(۳۰)

السلطان الاعظم الامام المستعصم

معز الدنیا والدین امیر المومنین

ابو المظفر کیقباد

السلطان

ضرب ہذہ الفضۃ بحضرۃ دہلی

فی سنۃ سبع وثمانین وستمائۃ

.....٥.....

(۳۱)

السّلطان الاعظم الامام

جلال الدنیا والدین المستعصم

ابو المظفر فیروز شاه امیر المومنین

السّلطان

ضرب هذه الفضة بحضرة دهلی

فی سنة احدی وتسعین وستمایة

(۳۲)

السّلطان الاعظم الامام

رکن الدنیا والدین المستعصم

ابو المظفر امیر المومنین

کیکاؤس

سلطان بن سلطان بن سلطان

ضرب هذه الفضة بحضرة لکهنوتی

فی سنة خمس وتسعین وستمائة

(۳۳)

السّلطان الاعظم السّلطان الاعظم

رکن الدنیا والدین جلال الدنیا والدین

ابو المظفر فیروز شاه

ابراهیم شاه السلطان ناصر امیر المومنین

بن

ضرب هذه الفضة بحضرة دهلی

سنة خمس وتسعین وستمایة

۳۴

السّلطان سکندر الثانی

علاء الدنیا والدین یمین الخلافة

ابو المظفر ناصر امیر المومنین

محمد شاه

السلطان

ضرب هذه السکة بحضرة دهلی

سنة تسع سبعمایة

(۳۵)

محراب قطب دہلی پر مورخہ ارشوال ۷۱۰ھ

حضرت علیا خدایگان سلاطین مصطفی جاالصانع

لامرالله المخصوص بعنایة

اکرم الاکرمین

علاء الدنیا والدین غوث الاسلام والمسلمین

معز الملوک والسّلاطین ابقا لنوبتا ئید الرحمان

ابو المظفر محمد شاه السلطان

سکندر ثانی یمین الخلافة ناصر امیر المومنین

خلد الله ملکه

بنا این خیرات سنت جماعت است عمارت فرمود

(۳۶)

الامام الاعظم السلطان ابن السلطان

خلیفة رب العالمین الواثق بالله

قطب الدنیا والدین امیر المومنین

ابو المظفر مبارک شاه

ضرب هذه السکة بقلعة قطب آباد

فی سنة ثمان عشر وسبع مائة

(۳۷)

السلطان الاعظم اسکندر الزمان

قطب الدنیا والدین یمین الخلافة

ابو المظفر مبارک شاه ناصر امیر المومنین

السلطان بن السلطان

ضرب هذه الفضة بحضرة دهلی

فی سنة سبع عشر وسبع مائة

......

(۳۸)

الامام الاعظم السلطان ابن السلطان

خلیفة رب العالمین الواثق بالله

قطب الدنیا والدین امیر المومنین

ابو المظفر مبارک شاه

ضرب هذه السکة بحضرة دار الخلافة

فی سنة ثمان عشر وسبعمایة

(۳۹)

الامام الاعظم مبارک شاه

قطب الدنیا والدین السلطان بن السلطان

ابو المظفر الواثق بالله

خلیفة الله امیر المومنین

ضرب هذه الفضة بحضرة دار الخلافة

فی سنة سبع عشر وسبعمائة

(۴۰)

السلطان الاعظم خسرو شاه

ناصر الدنیا والدین السلطان الواثق

ابو المظفر بخیر الرحمن ولی

امیر المومنین

ضرب هذه الفضة . . . . . .

. . . . . . عشرين وسبعماية .

(۴۱)

السّلطان لاعظم خسرو شاه

ناصرالدنیا والدین السّلطان

ولی امیرالمومنین

(۴۲)

السلطان الغازی سکندر الثانی

غیاث الدنیا والدین یمین الخلافۃ

ابوالمظفر ناصر امیرالمومنین

(۴۳)

السُّلطان الغازی. تغلق شاه

غیاث الدنیا والدین السُّلطان

ابوالمظفر ناصر امیرالمومنین

ضرب هذه السکۃ بحضرة دهلی

فی سنۃ احدی وعشرین وسبعمایۃ

(۴۴)

السلطان الغازی تغلق شاه السلطان

غیاث الدنیا والدین ناصر امیرالمومنین

ابوالمظفر

ضرب هذه السّکۃ بقلعۃ دیوگیر

فی سنۃ احدی وعشرین وسبع مایۃ

(۴۵)

السُّلطان الاعظم الامام

شمس الدنیا والدین المستعصم

ابوالمظفر امیرالمومنین

فیروز شاه السُّلطان

ضرب هذه الفضۃ بحضرة لکهنوتی

سنۃ عشرین وسبعمایۃ

(۴۶)

الامام السُّلطان الاعظم

المستعصم شمس الدنیا والدین

امیرالمومنین ابوالمظفر بهادر شاه

السلطان بن السُّلطان

ضرب هذا . . .

(۴۷)

الامام السُّلطان الاعظم

المستعصم غیاث الدنیا والدّین

امیرالمومنین ابوالمظفر بہادر شاہ

ضرب ہذہ الفضۃ بحضرۃ لکھنوتی

سنۃ احد عشر وسبع مایۃ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں خلافتِ عباسیہ درہم برہم ہو گئی تھی، اور خلافت مصر قائم نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس عہد کے سکوں میں خلفاے اربعہ کے نام ملتے ہیں،

(۴۸)

ابوبکر لا الہ الا اللہ

المجاہد محمد

فی رسول اللہ

سبیل اللہ

محمد بن تغلق شاہ

۷۲۹ھ

ضرب ہذہ السکۃ بدار الاسلام

فی سنۃ سبع وعشرین وسبع مایۃ

ایک اور ایسا ہی سکہ اسی کتبہ کا ۷۳۰ھ تک ملتا ہے، جو ستگاؤں میں مضروب ہوا تھا،

(۴۹)

ضرب ہذا الدینار فی زمان الامام

الخلیفتی الدہلی المستکفی باللہ

فی شہور سنۃ امیرالمومنین

احدی واربعین ابوالربیع سلیمان

وسبعمایۃ خلد اللہ خلافتہ

(۵۰)

خلیفۃ اللہ المستکفی باللہ

فی شہور ۷۴۳ھ

(۵۱)

الامام الاعظم خلیفۃ اللہ فی العالمین

المستکفی باللہ

امیرالمومنین

ضرب ہذہ السکۃ دولت آباد

سنۃ اربع واربعین وسبعمایۃ

(۵۲)

فی زمان الامام العباس احمد

امیرالمومنین خلد ملکہ

الحاکم بامر اللہ

(٥٣)

خليفة الله المستكفي بالله

في شهور سنة ٧٤٢

(٥٤)

الله المكفي والخليفة المستكفي

في شهور سنة ٧٤٢

(٥٥)

الحاكم بامر الله ابو العباس احمد

سنة ٧٤٣

(٥٦)

واثق بتائيد يزداني فيروز سلطاني

ضربت هذه السكة

في زمان الامام ابو العباس الامام ابو العباس

احمد خلد ملكه

(٥٧)

السلطان الاعظم في زمن الامام

سيف امير المومنين امير المومنين

ابو المظفر ابو الفتح

فيروز شاه السلطاني خلدت خلافته

خلد ملكه

ضربت هذه السكة بحضرة ....ين وسبعمائة

(٥٨)

١- السلطان الاعظم سيف امير المومنين ابو المظفر فيروز شاه

السلطاني خلد ملكه

٢- ضربت هذه السكة في زمن الامام امير المومنين

ابي الفتح المعتضد بالله خلد ملكه

(٥٩)

١- السلطان الاعظم سيف امير المومنين ابو المظفر فيروز شاه

السلطاني خلد ملكه

٢- في زمن الامام امير المومنين ابي عبد الله

خلدت خلافته ضرب هذه

(٦٠)

فيروز شاه سلطاني

نائب امير المومنين

(٦١)

فيروز شاه سلطاني ضرب بحضرت دهلي

الخليفة امير المومنين خلدت خلافته

(٦٢)

فيروز شاه سلطاني خلد ملكه

الخليفة ابو الفتح خلدت خلافته

(٦٣)

الخليفة ابو عبد الله خلدت خلافته ٧٨٤

(٦٤)

فيروز شاه سلطاني

ابو العباس احمد

(۶۵)

فیروز سلطانی
خلیفۃ ابوالفتح

(۶۶)

فیروز شاہ
ابوعبداللہ خلدت خلافتہ

(۶۷)

شاہ فی زمن الامام
فتح خان فیروز امیر المومنین
خلد اللہ ابوالفتح
ظلالہ وجلالہ المعتضد باللہ
خلد خلافتہ

(۶۸)

السلطان الاعظم فی زمن الامام
فیروز شاہ ظفر امیر المومنین
بن فیروز شاہ ابوعبداللہ
السلطانی خلدت خلافتہ

(۶۹)

فیروز شاہ ظفر السلطانی .... دھلی

الخلیفۃ امیر المومنین خلدت خلافتہ

(۷۰)

فیروز شاہ ظفر سلطانی
ضرب بحضرت دھلی
الخلیفۃ ابوعبداللہ خلدت خلافتہ ۷۹۱

(۷۱)

فیروز شاہ ابوعبداللہ
ظفر ابن خلدت خلافتہ
فیروز شاہ

(۷۲)

فیروز شاہ ظفر الخلیفۃ ابوعبداللہ
السلطان خلد خلافتہ

(۷۳)

تغلق شاہ نائب
سلطانی امیر المومنین
ضرب بحضرت دھلی ۷۹۰

(۷۴)

تغلق شاہ ابوعبداللہ
سلطانی ۷۹۰

(۷۵)

ابوبکر شاہ — الخلیفۃ ابو
بن ظفر بن — عبد اللہ
فیروز شاہ — خلدت خلافتہ ۷۹۱
سلطانی

(۷۶)

ابوبکر شاہ
ظفر بن فیروز شاہ سلطانی
نائب امیر المومنین ۷۹۱

(۷۷)

ابوبکر شاہ — نائب امیر المومنین
ظفر بن فیروز شاہ — خلدت خلافتہ
سلطانی — ۷۹۲

(۷۸)

محمد شاہ فیروز شاہ سلطانی
ابو عبد اللہ خلدت خلافتہ
ضربت بحضرۃ دھلی سنہ ۷۹۰

(۷۹)

السلطان الاعظم ابو الحامد محمد شاہ فیروز شاہ سلطانی
فی زمن الامام امیر المومنین خلدت خلافتہ ۷۹۳

(۸۰)

سلطانی — الخلیفۃ
فیروز شاہ — ابو عبد اللہ
محمد شاہ — خلدت خلافتہ ۷۹۳

(۸۱)

محمد شاہ
ضربت بحضرۃ دھلی
نائب امیر المومنین ۷۹۲

(۸۲)

السلطان الاعظم — فی زمن امیر المومنین
ابو المجاہد — خلدت خلافتہ
محمد شاہ — ۸۱۸(؟)
فیروز شاہ سلطانی

(۸۳)

سکندر شاہ محمد شاہ سلطانی
الخلیفۃ ابو عبد اللہ خلدت خلافتہ

(۸۴)

السلطان الاعظم — فی زمن الامام
ابو المحامد محمود شاہ — امیر المومنین

محمد شاہ فیروز شاہ خلدت خلافتہ
سلطانی

(۸۵)

محمود شاہ محمد شاہ سلطانی

الخلیفۃ ابو عبد اللہ خلدت خلافتہ
۷۹۶

(۸۶)

محمود شاہ سلطان

ضربت بحضرت دھلی نائب امیر المومنین
۸۱۳

(۸۷)

نصرت شاہ سلطانی

نائب امیر المومنین

(۸۸)

فی عہد السلطان الغازی المتوکل

علی الرحمان مبارک شاہ سلطان

فی زمن الامام امیر المومنین خلدت

خلافتہ ۸۳۵

(۸۹)

مبارک شاہ

سلطان ضربت بحضرۃ دھلی

نائب امیر المومنین سنہ ۸۳۳

(۹۰)

السلطان ابو المحامد محمد شاہ فرید شاہ خضر شاہ
سلطانی
فی زمن الامام امیر المومنین خلدت خلافتہ
۸۴۶

(۹۱)

سلطان محمد شاہ بن فرید شاہ بحضرت دھلی

الخلیفۃ امیر المومنین خلدت خلافتہ

(۹۲)

سلطان عالم شاہ بن محمد شاہ بحضرۃ دھلی

الخلیفۃ امیر المومنین خلدت خلافتہ ۸۵۳

(۹۳)

عالمشاہ

نائب امیر المومنین ۸۵۳

(۹۴)

المتوکل علی الرحمان فی زمن امیر المومنین

بہلول شاہ سلطان خلدت خلافتہ

بحضرت دھلی

(۹۵)

بہلول شاہ سلطان بحضرت دھلی

الخلیفۃ امیر المومنین خلدت خلافتہ

(۹۶)

بهلول شاه السلطان

نائب امیرالمومنین ۸۷۷

(۹۷)

المتوکل علی الرحمٰن فی زمن امیرالمومنین

سکندر شاه

بهلول شاه سلطان

بحضرت دهلی خلدت خلافته

(۹۸)

سنه ۹۰۵

المتوکل علی الرحمٰن سکندر شاه بهلول شاه

امیرالمومنین خلدت خلافته

(۹۹)

المتوکل علی الرحمٰن فی زمن امیرالمومنین خلدت خلافته

ابراهیم شاه سلطان

(۱۰۰)

ابراهیم شاه سلطان

امیرالمومنین خلدت خلافته

(۱۰۱)

ابراهیم شاه سکندر

امیرالمومنین خلدت خلافته ۹۲۶

سلاطینِ بنگاله

(۱۰۲)

سُلطان الاعظم یمین خلیفة الله

فخرالدنیا والدین ناصر امیرالمومنین

ابوالمظفر مُبارک شاه السلطان

ضربت هذه السکة بحضرت جلال

سنارگاؤن

سنة سبع وثلثین وسبع مائة

(۱۰۳)

السلطان الاعظم سکندر الزمان

علاء الدنیا والدین المخصوص

بعنایة الرحمٰن

ابوالمظفر علی شاه ناصر امیرالمومنین

السلطان

ضربت هذه الفضة السکة فی البلدة فیروزآباد

سنة اثنی اربعین وسبعمائة

(۱۰۴)

السلطان الاعظم یمین الخلافۃ

اختیار الدنیا والدین ناصر امیر المومنین

ابو المظفر غازی شاہ

السلطان بن السلطان

ضرب ہذہ السکۃ بحضرۃ جلال شاد گاؤں

سنۃ احدی وخمسین سبعمائۃ

سلاطین مالوہ

(۱۰۵)

الخلیفۃ امیر المومنین خلد اللہ خلافتہ ۸۴۰

ابو المظفر محمود شاہ خلجی

ضرب بحضرت شادی آباد

(۱۰۶)

بہمنیہ دکن

السلطان الاعظم سکندر الثانی

علاء الدنیا والدین یمین الخلافۃ

ابو المظفر بہمن شاہ ناصر امیر المومنین

السلطان

(۱۰۷)

جونپور

نائب	بار بکشاہ
امیر المومنین بشہر جونپور	السلطان
سنہ ۸۹۲	

اس آخری سکہ کے معنی پر ذرا تامل کرو، سلطان باربکشاہ جونپور میں امیر المومنین کا نائب" نمبر ۶۳ میں فیروز شاہ دہلی میں اپنے کو امیر المومنین کا نائب کہتا ہے، اس کے بعد تغلق شاہ (۷۷) ابو ظفر بن فیروز شاہ (۷۹) محمد شاہ (۸۴) محمود شاہ (۸۹) نصرت شاہ (۹۰) مبارکشاہ (۹۲) عالم شاہ، (۹۶) بہلول شاہ سب اپنے کو مستقل بادشاہ و سلطان نہیں، بلکہ اپنے کو خلیفہ وقت کا محض نائب کہتے ہیں، ملوک و سلاطین کے اس اعتقاد پر عام مسلمانوں کی عقیدہ کو قیاس کرنا چاہئے، اور سمجھنا چاہئے کہ آج خلافت کا جو شور و غل ہے، وہ بے حقیقت نہیں ہے، بلکہ اس کی پشت پر ایک تاریخ ہے،

نمبر ۶ سکہ بنگالہ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۸۹۵ء صفحہ ۳۰ میں چھپا ہے، یہ بنگالہ سلطنت کا پہلا بادشاہ تھا، ۷۴۰ھ سے ۷۵۹ھ تک اس کا زمانہ ہے،

خلافت آلِ عثمان

گذشتہ صفحات میں مسئلۂ خلافت اور تیموریوں سے قبل کے ہندوستان کے تاریخی پہلو نمایاں کئے گئے ہیں، اور آغازِ خلافت سے مصر کی آخری عباسی خلافت تک کے واقعات لکھے گئے ہیں، اب اس کے بعد وہ وقت آتا ہے، جب ایک طرف سلطان سلیم پہلا خلیفۂ عثمانی مصر، شام و عرب کو اپنے احاطۂ اقتدار میں لاتا ہے، اور دوسری طرف فرزندانِ تیمور ہندوستان کی مغربی سرحد میں قسمت آزمائی کرتے ہیں، اسی اثنا میں اُدھر سلطان سلیمان اعظم قسطنطنیہ کے تخت پر قدم رکھتا ہے، اور اِدھر بابر ہندوستان کا میدان جیت لیتا ہے، ۹۲۳ھ میں مصر و شام وغیرہ عثمانی اقتدار میں داخل ہوئے، ۹۲۶ھ میں سلطان سلیم نے وفات پائی، اور سلطان سلیمان اس کا جانشین ہوا، اور ۹۳۲ھ میں بابر ہندوستان کے فرمانروائے مطلق کی صورت میں ظاہر ہوا۔

عثمانی اور تیموری دونوں خاندان نسلاً ترک تھے، دونوں اپنا سلسلۂ نسب چنگیز اور ہلاکو سے ملاتے تھے، نویں صدی ہجری کے وسط میں تیمور اٹھا، اور ایشیا میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی، بایزید یلدرم اس وقت یورپ کے خرمنوں پر برق و صاعقہ بن کر گر رہا تھا، عین اس وقت طرابزون کی یونانی ریاست کی دعوت پر ۱۴۰۲ء میں تیمور بایزید کے مقابلہ کو نکلا، اب بایزید کو دفعۃً اپنے رُخ کو مغرب سے مشرق اور یورپ سے ایشیا کی طرف موڑنا پڑا، اور اس میں اس کو ناکامی ہوئی، اور تیموریوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مرگیا، سلطنت عثمانیہ اس جھٹکے سے جو اُسی کے ایک ہم خاندان اور ہم مذہب فرمانروا کے ہاتھ سے اس کو لگا تھا، بہت جلد سنبھل گئی، تاہم دونوں خاندانوں میں ایک رقابت کی صورت پیدا ہو گئی، ترکانِ عثمان تو اس اتفاقی حادثہ کو

فوراً بھول گئے، مگر تیموریوں سے اپنے بانیِ خاندان کے اس فخر و ناز کے کارنامہ کا نشہ ایک مدت تک اتر نہ سکا، اور اخیر اخیر تک آلِ عثمان کے جاہ و حشم، زور و قوت، نیکی و شہرت کا حریفانہ کانٹا اُن کے دلوں میں چبھتا رہا،

اس حکایت کو یہیں ناتمام چھوڑ کر ناظرین کی عنانِ توجہ اب دوسری جانب موڑتا ہوں، یہ وہ زمانہ تھا، جب اندلس کے مسلمانوں کا خاتمہ کرکے اسپینوں اور پرتگالیوں کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے تھے، قسطنطنیہ اور مصر کے راستہ پر مسلمانوں کے مضبوط قبضہ کے باعث وہ مشرق خصوصاً ہندوستان کیلئے ایک نئے راستہ کی تلاش میں تھے (اسوقت یورپ اور ہندوستان کی تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی) اسپینی ملاح تو ہندوستان کے سُراغ میں بھٹک کر نئی دنیا (امریکہ) پہونچے، لیکن پرتگالی واسکوڈی گاما کے زیرِ ہدایت افریقہ ہو کر ہندوستان کے سواحل پر نمودار ہوگئے، اور پھر بار بار کی آمد و رفت سے اس تمام بحری راستہ پر قبضہ مالکانہ جما لیا، جہاں جہاں بیچ میں مسلمانوں کی بحری تجارتی منڈیاں ملیں اُن کو تہ و بالا کر دیا،

اکتشافِ ارضی اور توسیعِ تجارت کے نام سے یہ بحری لٹیرے بحرِ ہند میں ادھر ادھر اپنے جہازی گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے، عرب اور ہندوستان کے ساحلی مقامات اُن کی لوٹ مار سے برباد ہو رہے تھے، ساحلوں اور جزیروں میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا، اور مسجدیں ٹوٹ کر کلیسا بن رہی تھیں، موپلہ جو عرب، مصر اور ہندوستان کے درمیانی بیوپاری تھے، اور کالیکٹ (مدراس) اُن کا مرکز تھا، اُن کے تجارتی کاروبار توڑے پھوڑے جا رہے تھے، کالیکٹ کے راجہ کو اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو عرب آنے جانے سے روک دے اُس نے اس کو نامنظور کیا، اور اُسکی خاطر اس کو لڑائی لڑنی پڑی، پرتگالیوں نے کوچی (ساحلِ ہند) پر قبضہ کیا، اور مسلمانوں کو قتل کیا، اور مسجد کو کلیسا بنالیا، پھر رفتہ رفتہ عرب کے سواحل پر عدن، ہرمز، بریم وغیرہ کو اور ہندوستان کے سواحل میں سے گوا، چیول، دابل، دیو،

اور دمن وغیرہ کو تاخت وتاراج کرنے لگے، ۹۱۵ھ میں کالیکٹ پر حملہ کرکے شہر کو لوٹ لیا، اور وہاں کی جامع مسجد کو جلاکر خاک سیاہ کردیا، یہی حال انھوں نے عرب کے ساحلی شہروں کا کر رکھا تھا، حاجیوں کے جہازات اُن کے حکم اور اجازت اور محصول کے بغیر ہندوستان کے ساحلوں سے جنبش نہیں کرسکتے تھے[۱]۔

بہرحال یہ پردرد داستان بہت طویل ہے، اور کبھی فرصت سے سننے کے قابل ہے، اس وقت ہندوستان کی مرکزی حکومت لودیوں کے کمزور ہاتھوں میں تھی، دکن اور گجرات میں طوائف الملوک حکمراں تھے، انہی بیچاروں نے مل ملا کر اپنی بحری قوت کو یکجا کیا، عرب کی طرف سے مصر کی آخری عباسی خلافت کے قائم مقام سلطان قانصو غوری نے اپنے جہازات بھیجے سلطان محمود گجراتی، سلطان محمود بہمنی، سلطان یوسف عادل شاہ اور راجہ ملیبار نے بھی اپنے بیڑوں کو شامل کیا، لیکن بدقسمتی سے اس متحدہ قوت نے بھی اُن سے شکست کھائی، یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ سلطان سلیم نے مصر و عرب کی حفاظت کا بار اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھالیا،

سلطان سلیم اپنے اعلانِ خلافت کے بعد صرف تین برس زندہ رہا، ۹۲۶ھ میں سلطان سلیمان اعظم اس کا جانشین ہوا، جس نے اپنے باپ کی مذہبی بلند حوصلگیوں کے خواب کو پورا کردیا، دنیائے اسلام کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان نے بھی اس کی خلافت، اور

---

[۱] یہ واقعات ہندوستان کی انگریزی تاریخوں میں یورپین تاجروں کی آمد ہند کی تمہید میں مذکور ہیں لیکن دوسری طرف کا بیان تم بنگال و گجرات اور یمن کی پچھلی تاریخوں میں پڑھ سکتے ہو، اس وقت یافعی سلاطین (تاریخ بنگالہ) ظفر الوالہ (تاریخ گجرات عربی) تاریخ گجرات میرابوتراب فارسی، اور کتاب روح الروح فی الفتوح (قلمی تاریخ یمن موجودہ کتب خانہ دارالمصنفین) میرے پیشِ نظر ہیں،

مذہبی عظمت کو تسلیم کیا، اس کا اثر سب سے پہلے گجرات کے سلاطین پر پڑا جن کے عرب اور دیگر ممالکِ اسلامیہ سے براہِ راست تعلقات تھے،

گجرات کے ایک محدث و عالم محمد بن عمر آصفی الغانی جن کی آمد و رفت مکہ معظمہ میں رہا کرتی تھی، اور جو سلاطین گجرات کے درباروں میں بھی معزز تھے، انھوں نے عربی میں ظفر الوالہ کے نام سے گجرات کی ایک تاریخ لکھی ہے، اور جس کو گورنمنٹ آف انڈیا شاید اب اپنی بدبختی سمجھے کہ اس نے چھاپ کر شائع کیا ہے، اس تاریخ میں گجرات کے بلکہ ہندوستان کے مایۂ ناز محدث شیخ علی متقی مہاجر صاحبِ کنز العمال کے حالات میں ہے کہ جب وہ ہندوستان چھوڑ کر عرب گئے اور سلطان سلیمان کے کانوں تک اُن کی شہرت پہونچی تو سلطان نے اُن سے دعا کی آرزو کی، اس تقریب سے شیخ محمد آصفی سلطان سلیمان کا نام اپنی زبان پر لاتے ہیں، اور اس کے بعد لکھتے ہیں:-

وکان فی وقتہ سلطان الاسلام	اس وقت ترکی کا بادشاہ اسلام کا
علی الاطلاق والخلیفۃ للہ	سلطان علی الاطلاق تھا، اور تمام دنیا
فی الآفاق وھو سلیمان خان[1]	میں خدا کا خلیفہ تھا، اور وہ سلیمان تھا

علامہ قطبی نہروالی (گجراتی) نے جو مکہ میں سلطان گجرات کے مدرسہ میں مدرس تھے اپنی تاریخ اعلام بیت اللہ الحرام میں چھپ گئی ہے، بیسیوں جگہ سلیمان اور اس کے بعد کے سلاطین کو خلفاء، اور امراء مومنین کہہ کر خطاب کیا ہے،

سلاطین گجرات نے پرتگالیوں کی نئی توپوں اور جہازوں کے سامنے اپنے کو بے دست و پا پاکر آخر آستانۂ خلافت کی طرف رجوع کیا، ہندوستان کے سمندروں میں یہ حوادث اور سانحے پیش آرہے تھے کہ اس کے میدانوں میں بابر اپنی بارہ ہزار کی جمعیت سے آموجود ہوا،

---

[1] ص ۳۱۷

اور دم کے دم میں لودیوں کی بساط الٹ کر ہندوستان کا بادشاہ بن گیا،

تمھیں معلوم ہے کہ آل تیمور اور آل عثمان باہم حریف کی حیثیت رکھتے تھے لیکن انصاف بالائے طاعت است و مذہب بالاے سیاست، اس ناگواری کے باوجود شاہان تیمور اس قبلۂ اسلام کو تو نہیں چھوڑ سکتے تھے، جہاں آل عثمان کے نام کا خطبہ ہر ہفتہ پڑھا جاتا تھا، اور نہ حرمین کے حقوق و فرائض کو بھلا سکتے تھے جن کی حفاظت و خدمت گذاری اب سلاطین عثمان کے تاج قیصری کا طرہ تھی، اور اس حجاز کی آمد و رفت بند نہیں کر سکتے تھے، جہاں ہر سال اُن کے امرا، اور رعایا جوق درجوق خلیفۂ عثمانی کے زیر سیادت ادائے حج کے لئے جاتے تھے، اور بالآخر اگر اُن کو خود توفیق ملتی تو وہ منبر کے نیچے بیٹھ کر اپنے نام کا نہیں بلکہ قسطنطنیہ ہی کے سلطان کے نام کا خطبہ سنتے، اس لئے وہ کسی نہ کسی طرح سلاطین عثمان کی مذہبی برتری اور امامت کبریٰ کے ماننے پر مجبور تھے،

۹۳۲ھ میں بابر نے ہندوستان کے تخت پر قدم رکھا لیکن تم کو معلوم ہے کہ اس عظیم الشان کامیابی کے بعد شہنشاہ ہند نے اپنا پہلا فرض کیا محسوس کیا؟ ترکستان کے علما کو انعامات بھیجے، اور حرمین اور مزارات متبرکہ میں جو خلیفۂ عثمانی کے زیر سیادت تھے، نذر و فتوحات ارسال کئے، مورخ بدایونی کی عبارت ہے،

"بمکۂ مدینۂ مقدسہ و مزارات متبرکہ نذرہا ارسال داشت"

بابر نے ایک نیا خط ایجاد کیا تھا جس کا نام خط بابری" پڑ گیا تھا، اس خط میں خاص اپنے قلم سے قرآن مجید کا ایک نسخہ لکھ کر مکۂ معظمہ تحفہ بھیجا،

۹۳۷ھ میں بابر نے وفات پائی، اور ہمایوں نے تخت حکومت پر قدم رکھا ایک قدیمی شاہزادہ نے بھاگ کر سلطان گجرات کے یہاں پناہ لی، اس تقریب سے ہمایوں کو گجرات پر حملہ کرنے کا موقع ہاتھ آیا، اب گجرات دونشانوں کے بیچ میں تھا، خشکی کے راستہ سے ہمایوں

حملہ آور تھا، اور دریائی راستہ سے پرتگالی سواحل کو برباد کر رہے تھے، سلطان گجرات نے پرتگالیوں کے مقابلہ میں آستانۂ خلافت سے جو امداد طلب کی تھی، وہ روانہ ہو چکی تھی، سلیمان پاشا کی قیادت میں ترکی جہازات کا بیڑا عرب کے سواحل پر نمودار ہوا، اور یمن کے سواحل کے انتظامات سے فارغ ہو کر سنہ ۹۴۲ھ میں ہندوستان کے بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا، یہاں پہونچ کر اس نے پرتگالیوں کا قلع قمع شروع کر دیا، لیکن پاشا نے غلطی یہ کی کہ اپنے طرز سے ہندوستانیوں پر یہ ظاہر کیا کہ وہ گویا ہندوستان کی فتح کے ارادہ سے آیا ہے، گجرات کے سلطان نے یہ دیکھ کر اپنی امداد و اعانت اور رسد کا انتظام موقوف کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان پاشا اپنے افسروں، توپوں، اور دوسرے سامان جنگ کو چھوڑ کر یمن واپس چلا گیا، پرتگالیوں نے پھر سر اٹھایا، ادھر ہمایوں کی فوجیں بڑھتی چلی آتی تھیں، سلطان نے پرتگالیوں سے صلح کر کے گجرات کے بہت سے بنادر اُن کے حوالہ کر دیئے،

"مورخین کی تاریخ عالم میں ہے کہ" اس زمانہ میں سلاطین عثمانیہ ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے تھے، ۱۵۳۶ء (مطابق سنہ ۹۴۲ھ) میں دہلی کے سلطان سکندر کا بیٹا ہمایوں کی شکایت لے کر قسطنطنیہ سلطان کے پاس پہنچا، بہادر شاہ گجراتی کے دربار سے ایک سفیر پرتگیزوں کے مقابلہ میں اعانت طلبی کے لئے حاضر ہوا جنھوں نے کچھ دنوں پہلے دیو (دیپ) کا بندر بہادر شاہ سے چھین لیا تھا، سلطان نے مصر کے پاشا کو حکم دیا کہ وہ جہازوں کا بیڑہ لے کر ہندوستان جائے، اور وہ بندرگاہ اُن سے واپس لے لے لیکن اس سے پہلے کہ جہازات روانہ ہوں، یہ خبر پہونچی کہ بہادر شاہ پرتگیزوں کے ہاتھ سے مارا گیا، بادشاہ نے اپنا خزانہ گجرات سے مکہ معظمہ کو منتقل کر دیا تھا، اُس کے مرنے پر وہ قسطنطنیہ بھیج دیا گیا، ۱۵۴۶ء (مطابق سنہ ۹۵۰ھ) میں ہندوستان کے ایک بادشاہ علاء الدین کی طرف سے ایک سفیر قسطنطنیہ اس غرض سے آیا کہ پرتگیزوں کے مقابلہ میں سلطان کی امداد حاصل کرے، ۱۵۵۱ء (مطابق سنہ ۹۵۸ھ) میں پیری رئیس (ترکی کپتان) نے مسقط اور ہرمز پر قبضہ کر لیا، اور اُس کے

نائب مراد نے اسی جزیرہ کے سامنے پرتگیزوں سے ایک جنگ کی، اور ناکام رہا، ۹۵۳ھ (مطابق ۱۵۴۷ء) میں سیدی علی نے خلیج فارس میں بصرہ کے قریب اُن کا پھر مقابلہ کیا، اور شکست کھائی، اور بالآخر گجرات کے بندر میں پناہ لی۔[۱]

اس تاریخ کے مصنفین نے ان چند سطروں میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا، گجرات کی تاریخوں میں یہ بیانات مفصل موجود ہیں لیکن اُن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، صرف اتنا کہنا ہے کہ بہادر شاہ گجراتی کے پاس جو بھاری توپ خانہ تھا، وہ انہی ترکوں کا عطیہ یا متروکہ تھا، رومی خاں اور توپخانہ کے دوسرے تجربہ کار افسر سب ترک تھے، اور انہی لوگوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں توپ سازی کا فن رواج پذیر ہوا، بہادر شاہ نے ہمایوں اور پرتگیزوں کی دوہری آگ میں پھنس کر جان دی، اس کا ارادہ تھا کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر جائے، اسی لئے اُس نے اپنا خزانہ اپنے معتبر افسروں کی معرفت مکہ معظمہ بھیج دیا تھا، اسی اثنا میں پرتگالیوں نے بعض قلعے بنائے تھے، اُن سے نامہ وپیام کو رہا تھا، ان کے پاس تنہا بعض درباریوں کو لے کر جہاز پر چلا گیا، انھوں نے دھوکے سے موقع پاکر مار ڈالا، رحمہ اللہ

بہادر شاہ کے بعد ۹۴۵ھ میں محمود شاہ، گجرات کا بادشاہ ہوا، اس کے زمانہ میں سلطان سلیمان نے سلیمان پاشا کو بیڑہ دے کر پھر ہندوستان سے پرتگیزوں کے نکالنے کو بھیجا، سلیمان پاشا کے بیڑے کو شکست ہوئی، اس کی وجہ ظفرالوالہ کے مصنف نے تو یہ بتائی ہے کہ پاشا امرائے گجرات سے مشورہ نہیں لیا کرتا تھا، اس لئے انھوں نے رسد بند کردی تھی لیکن روح الروح[۲] کے مصنف کا

---

[۱] ہسٹورنیس ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲۴، ص ۴۰۴، [۲] یہ یمن کی دسویں صدی ہجری کی تاریخ ہے، اس کا پورا نام کتاب روح الروح ما بعد المائۃ التاسعۃ من الفتن والفتوح ہے، مصنف کا نام عیسیٰ بن لطف اللہ ابن مطہر یمنی ہے، اس کتاب کا قلمی نسخہ دارالمصنفین میں ہے۔

بیان ہے کہ ہم نے بعض ثقات سے سُنا ہو کہ پاشا کو ہندوستان کے بادشاہوں نے بہت سے روپے دیئے کہ واپس چلا جائے، بہر حال پاشا جب قسطنطنیہ واپس گیا، تو اس سے جواب طلب ہوا سلطان نے غضب ناک ہو کر کہا ۔

ماارسلتک الا لاخراج الفرنج	میں نے تجھ کو ڈیپ سے فرنگیوں کو
من الدیو ونصرہ لصاحبہا	نکالنے کے لئے بھیجا تھا، ہندوستان
لاسلاطۃ علی المسلمین بالہند	میں مسلمانوں پر بادشاہ بنا کر نہیں
(ظفر الوالہ ص ۹۲۵)	بھیجا تھا،

بہادر شاہ گجراتی کا وزیر آصف خان جو نہایت لائق و فاضل اور محدث تھا سلطان کی طلب پر اڈریانوپل حاضر ہوا، دربار میں پہنچ کر سلطان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا، سلطان نے بھی اس کی بڑی عزت و توقیر کی، اور دریافت کیا کہ تمھاری کیا آرزو ہے، جس کو میں پوری کر سکتا ہوں خان نے ہندوستان کے وقار کو صدمہ نہیں پہنچایا، صرف ہندوستان واپس جانے کی اجازت چاہی، اور حرم محترم میں کوئی اعزازی عہدہ حاصل کیا، سلطان نے سب سے دلچسپ سوال یہ کیا کہ تمھاری مملکت کی بربادی کا سبب کیا ہوا؟ خان نے فلسفۂ تاریخ سے اس کا عمدہ جواب[۳] دیا،

سیدی علی رئیس (کپتان) جس کا اس سے پہلے ترکی بیڑے کے افسروں میں ذکر آچکا ہے وہ بھی ان لوگوں میں تھا جو بیڑے کو لے کر قسطنطنیہ واپس نہ جا سکے تھے، سیدی علی نے خشکی کا راستہ اختیار کیا، وہ پورے ہندوستان کو ناپ کر افغانستان و ایران و ترکستان ہو کر قسطنطنیہ واپس گیا، اور مرآۃ الممالک کے نام سے اپنا سفرنامہ مرتب کیا، اس کا ترجمہ جرمن اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوا ہے، انگریزی میں پروفیسر ومیبری نے اس کا ترجمہ کیا ہے، مگر پروفیسر موصوف نے

---

[۱] کتاب مذکور واقعات سنہ ۹۴۵ھ [۲] ظفر الوالہ ص ۲۰۷ ،

اس ترجمہ کے حواشی میں سخت غلطیاں کی ہیں، اسی نسخہ کا ترجمہ کارخانہ، وطن لاہور نے کیا ہے جو اور زیادہ مسخ اور غلط ہے، سفر یورپ میں روم میں ایک ترکی ادیب رؤف احمد بے اڈیٹر اخبار استقلال قسطنطنیہ سے ملاقات ہوئی، موصوف نے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ قسطنطنیہ میں اصل سفرنامہ چھپ گیا ہے، میں نے باصرار اس کتاب کی اُن سے خواہش کی لیکن اب تک یہ آرزو پوری نہیں ہوئی، بہرحال اس وقت یہی اردو ترجمہ میرے پیش نظر ہے، سیدی علی نے اس سفرنامہ میں ہمایوں اور ہندوستان کے دوسرے بادشاہوں سے ملاقات کا حال لکھا ہے، جس سے اُس زمانہ کے ہندوستان کا مسئلہ خلافت سے تعلق ظاہر ہوگا،

سیدی علی کا بیان ہے کہ

"جب وہ بلوچستان کے بندر گوادر پر پہنچا، تو وہاں کے حاکم نے ہمارے جہاز پر آکر ہمارے بادشاہ (سلطان) کی نسبت اظہار عقیدت مندی و وفاداری کیا، اور وعدہ کیا کہ آیندہ کبھی ہمارا بیڑا اس جانب سے گذرا تو وہ پچاس ساٹھ کشتیاں سامانِ رسد وغیرہ نذر کرنے کے علاوہ ہر قسم کی امداد دینے کو تیار رہے گا" (ص ۲۳)

سورت میں مسلمان ہمیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے، کیونکہ وہ ہمیں کفار کے ہاتھوں سے بچانے والا خیال کرتے تھے، اور ہم سے یوں مخاطب ہوئے، ..... کہ ہم صدق دل سے دعائیں کر رہے تھے کہ خداوند کریم اپنے فضل وکرم سے عثمانی بیڑے کو گجرات میں پہنچا دے اور عثمانی سلطنت کے اس علاقہ کو مامون و محفوظ کرکے ہمیں ہندوستانی کفار کے پنجہ سے نجات دلائے" (ص ۲۹)

احمد آباد پہنچ کر وہاں میں نے سلطان اور اس کے وزیر اور عماد الملک اور دیگر ارکانِ سلطنت سے ملاقاتیں کیں، سلطان میری سندیں دیکھ کر بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا،

اور ہمارے بادشاہ کی نسبت عقیدتمندی کا اظہار کیا، ..... ایک روز جب میں عماد الملک سے ملنے اس کے محل میں گیا، تو وہاں ایک پرتگالی سفیر ملا جس نے عماد الملک کو مخاطب کرکے کہا کہ سلطان ٹرکی کے ساتھ ہم لوگ کوئی مخالفت نہیں کرسکتے، ہم لوگوں کو اُن کی ضرورت ہے، علاوہ ازیں وہ دنیاے اسلام کے بادشاہ ہیں"

(ص ۳۳)

سیدی علی گجرات سے چل کر سندھ آیا، وہاں اس وقت خانہ جنگی برپا تھی، شاہ حسین کو جب اُس کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو نہایت تعظیم سے استقبال کیا، اور اس کو خلعت فاخرہ دیا، اور عسکر النیب اُس کی جماعت کا نام رکھا، اور سلطان معظم کی خدمت میں مراسلہ بھیجا، (ص ۳۷)

سب سے زیادہ دلچسپ بیان وہ ہے جب ترکی امیر البحر بادشاہ ہمایوں کے دربار میں حاضر ہوا اور سلسلۂ گفتگو سلطنت عثمانیہ کی وسعت تک پہونچ گیا، تو بالآخر تیموری شہنشاہ کو سلطان آل عثمان کی خلافت اور دینی پیشوائی کا اپنی زبان سے اقرار کرنا پڑا، سیدی علی نے کہا کہ "چین تک میں ہمارے سلطان کا نام خطبہ میں پڑھا جاتا ہے، ہمایوں نے اپنے وزراء کی طرف دیکھکر کہا کہ "بیشک سلطان ٹرکی ہی بادشاہ کہلانے کے مستحق ہیں اور سطح زمین پر یہی اس عزت کے مستحق ہیں، ہمایوں نے دوسرے موقع پر دریافت کیا کہ خان کریمیا بھی سلطان ٹرکی کا ماتحت ہے" اور جب اس کا جواب اس کو اثبات میں ملا تو اُس نے کہا کہ "اگر یہ سچ ہے تو پھر خان کو اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کا کیونکر حق ہوگا" امیر البحر نے کہا کہ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے بادشاہ کے سوا کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہے، کہ وہ جس کو چاہے خطبہ کا اختیار بخشے" امیر البحر کا بیان ہے کہ درباریوں کے چہروں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے دعوے سے متفق ہیں، اور سب نے مل کر سلطان کے حق میں دعاے خیر کی، (ص ۴۶)

نیک دل ہمایوں کی بادشاہی ہندوستان میں چند سال سے زیادہ قائم نہ رہی، ۹۴۷ھ سے لیکر ۹۶۲ھ تک آوارہ گرد سفر حجاز کے شوق میں ارا مارا پھرا، ہندوستان کے تخت پر اب شیر شاہ سوری کا قبضہ تھا، اس نے چند سال میں اپنے دانشمندانہ نظم ونسق سے ہندوستان کو امن وامان کی بہشت بنادیا، شیر شاہ کے دربار میں سید رفیع الدین محدث ترکستان کے ایک عالم تھے، ان کے آباء واجداد حرمین میں درس دیا کرتے تھے، ۹۵۱ھ میں مارواڑ سے واپسی میں محدث موصوف نے بادشاہ سے سفر حرمین کی اجازت چاہی تاکہ بطریق سلف وہاں اپنی زندگی وہ درس وتدریس میں صرف کرسکیں، شیر شاہ نے جو جواب دیا اُس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:۔

"مجھے اس میں مضائقہ نہ تھا لیکن میں نے آپ کو ایک خاص مصلحت کی بنا پر روک رکھا ہے، اور وہ یہ ہے کہ امید ہے کہ بفضل خدا چند روز میں ہندوستان کا میدان کفر کے کانٹوں سے پاک ہوجائے گا، چند قلعے جو باقی ہیں، وہ بھی تھوڑی سی توجہ میں فتح ہوجائینگے، اس کے بعد آرزو یہ ہے کہ دریائے شور کو عبور کرکے قزلباشوں (ایران کی صفوی حکومت کے طرفدار جو مذہباً متعصب شیعہ تھے، اور جن کی ترکوں سے متواتر لڑائیاں ہوئیں) تک پہنچوں، جو حجاج وزائرین بیت اللہ کو جانے نہیں دیتے، اور مذہب اسلام میں جنھوں نے نئی بدعت پیدا کی ہے، اور اُن سے جنگ کروں اور وہاں سے تم کو اپنا وکیل وقاصد بناکر سلطان روم کی خدمت میں بھیجوں تاکہ میرے اُن کے درمیان دینی برادری کا رشتہ قائم ہوجائے، اور اُن سے درخواست کرکے کہ مکۂ معظمہ یا مدینۂ منورہ میں سے ایک کی خدمت کا فرض میرے لئے حاصل کرو، اس وقت سلطان روم اودھر سے اور میں اِدھر سے بڑھوں، اور قزلباشوں کو بیچ سے اکھاڑ کر پھینکوں، سلطان جب اودس پر حملہ کرتے ہیں تو یہ بھاگ کر ادھر چلے آتے ہیں، اور اُن کی مراجعت کے بعد

پھر بدستور اپنی جگہ پر پہونچ جاتے ہیں، لیکن اب اگر ہم دونوں مل کر دونوں طرف سے اُن کو گھیریں تو ہندوستان کی کثرت فوج اور ترکوں کے آتشبار توپخانہ کے مقابلہ میں قوت قزلباشوں میں معلوم، جہاں تک میں نے غور کیا، اس سفارت کے لئے تم سے بہتر شخص مجھ کو دوسرا نظر نہیں آتا، اور اسی سبب سے تم کو سفر کی ابھی اجازت نہیں دیتا[۱]،

شیر شاہ کے اس معترفانہ بیان کا جو اُس کے دلی خیالات کا آئینہ ہے بغور پڑھو، تم کو لفظ لفظ سے معلوم ہوگا کہ وہ سلطان عثمانی کا کس عقیدتمندی کیساتھ نام لیتا ہے، اُنکی مذہبی پیشوائی کو تسلیم کرتا ہے، اُنکی دینی برادری کا دعوی کرتا ہے، اور حرمین میں سے ایک کی خدمت کے لئے اُن سے التماس کرتا ہے، افسوس کہ شیر شاہ کو مُہلت نہ ملی، اور اُس کے ایک سال کے بعد ۹۵۲ھ میں باروت سے جل کر اس جہانِ فانی کو وداع کہا،

۹۶۲ھ میں اوس کے ناخلف جانشینوں نے ہندوستان کا تخت کھودیا، اور ہمایوں پھر ہندوستان کا بادشاہ بن کر سامنے آگیا لیکن تین ہی برس کے اندر اس کو اکبر کے لئے اپنی جگہ خالی کردینی پڑی،

کون نہیں جانتا کہ اکبر ایک نئے مذہب کی بناڈالنے کا خواب دیکھا کرتا تھا، اس کے لئے سب سے پہلا زینہ امامت و خلافت کا دعوی تھا، چنانچہ رجب ۹۸۰ھ میں ایک محضر تیار کیا گیا جس میں اکبر کو "خلیفۂ عصر اور امام زمان" تسلیم کیا گیا تھا، اور قرآن پاک کی آیت اور احادیث سے "امام عادل" کی اطاعت فرض بتائی گئی تھی، اور آخر میں اس کو مختلف فیہ مسائل میں اجتہاد کا رتبہ بخشا گیا تھا، اس محضر میں اکبر کے لئے حسبِ ذیل خطابات لکھے گئے تھے،

---

[۱] تاریخ بدایونی جلد اول ص ۳۷۰،

حضرت سلطان الاسلام، کہف الانام، امیرالمومنین ظل اللہ فی العالمین کلمۂ طیبہ کے بجائے لاالٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ درباریوں کا کلمہ قرار پایا، محضر مذکور پر علماء سے زبردستی دستخط کرائے گئے، اکبر کی بدنامی کی خبریں دور دور تک پھیلیں، والی توران نے اکبر کو طعن آمیز خط لکھا قطب الدین خاں نے برسر دربار کہا کہ ولایت کے بادشاہوں کو مثلاً سلطان روم وغیرہ کو جب اس کا حال معلوم ہوگا تو ہماری کس قدر بدنامی ہوگی، اکبر نے جھنجھلا کر کہا کہ "تو سلطان روم کی طرف سے غائبانہ اُن کا حمایتی بن کر آیا ہے تاکہ یہاں سے نکلنے پر وہاں تیری عزت و منزلت ہو، جایئے وہیں تشریف لیجایئے" اکبر کے اصل الفاظ بدایونی میں یہ ہیں :-

"تو برائے خاطر خوندکارِ روم غائبانہ از جانب او ایں درشتی می کنی وجائے از برائے خود دقتہ کہ ازینجا بروی پیدا کردہ تا اعتبار یابی ہمانجا برو"

(جلد ۲ ص ۲۷۴)

تم نے فریقین کی اس سخت و درشت گفتگو کو سُنا، اور اس کا مطلب سمجھا برائے خدا مجھے یہ بتاؤ کہ جو مطلب میں سمجھتا ہوں، یا سمجھنا چاہتا ہوں، اگر وہ غلط ہے، تو اس دعوائے امامت و خلافت و تجدید دین کی مخالفت کو سلطان روم کی خاطرداری وہی خواہی و جانب داری کے الزام سے کیا تعلق ہے ؟

- اس اکبری جاہ و جلال و نصرت و اقبال کے عالم میں حج کے راستہ کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ ہندوستان کے صدر مذہبی نے یہ فتوی دیدیا کہ چونکہ خشکی کا راستہ قزلباشوں نے اور دریا کا راستہ فرنگیوں نے بند کر دیا ہے، اس لئے فریضۂ حج ساقط ہوگیا ہے، ہندوستان کے بندروں سے حجاز کو جہازات کا جانا بغیر اس کے ممکن نہ تھا، کہ فرنگیوں سے اجازت (قول) کا

لہ یہ سلاطین عثمانیہ کا مذہبی لقب تھا،

عار اٹھایا جائے، تخت آگرہ کا امام عادل یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اور کچھ نہ کر سکتا تھا، امرائے اکبری کے بڑے بڑے ارکان خانخاناں، مرزا عزیز کوکہ، شیخ عبدالنبی، مخدوم الملک، اعتماد خاں، سلطان جہاں سب اسی ذلت کے ساتھ گئے، اور واپس آئے[۱] لیکن مجھے کچھ اور کہنا ہے تیموری دربار کے یہ امرائے نامدار اور علمائے ذوی الاقتدار سفر حج کے لئے گئے لیکن سمندر کے اُس پار پہنچ کر موسم خلیل کے سب سے بڑے اسلامی مجمع میں منبر خطابت سے جو موج ہوا بلند ہوئی کیا انھوں نے اس میں سلاطین آل عثمان کا نام سُنا یا آگرہ کے خلیفۂ عصر اور امام زماں کا؟

مرزا عزیز کوکہ، اکبر کا رضاعی بھائی تھا، دربار کا امیر کبیر تھا لیکن ساتھ ہی نہایت ہی سیدھا سادھا، دیندار نیک اعتقاد تھا، جب ۱۰۰۲ھ[۲] میں یہ ہندوستان سے چلا تو مکہ جہاز میں جا کر لگا جس پاشا والی یمن نے نہایت شان و شوکت سے اس کا استقبال کیا اور مرزا نے ہندوستان کے تحفے اور ہدیے پاشا کے سامنے پیش کئے[۲]،

مدت سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ سلطنت تیموری ہر سال ہندوستان کی طرف سے ایک امیر حاج مقرر کر کے اوس کے ساتھ، چار لاکھ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی خدمت گذاری کے لئے بھیجا کرتی تھی، اکبر نے بھی اس رسم کو جاری رکھا، یہ روپیہ عموماً گجرات کے خزانہ سے بھیجا جایا کرتا تھا، اسی لئے گجرات کی تاریخوں میں اس کا بکثرت ذکر ہے، شوال ۹۸۶ھ میں جب اکبر اجمیر میں تھا، خواجہ احرار کی اولاد میں سے خواجہ محمد یحییٰ کو میر حاج بنا کر اور چھ لاکھ روپیہ ساتھ دے کر مکہ معظمہ روانہ کیا[۳]، ۹۸۷ھ میں میر ابو تراب میر حاج بنائے گئے، اور لاکھوں روپے نقد و سامان اُن کو دیئے گئے، کہ شریف مکہ کے مشورہ سے وہاں علما و مشائخ

---

[۱] دیکھو فرشتہ تاریخ ملیبار [۲] کتاب روح الروح قلمی واقعات سنہ ۱۰۰۲ھ [۳] بدایونی جلد ۲ صفحہ ۲۶۷،

اور فقرا میں تقسیم کر دیئے جائیں۔[۵۱]

اکبر کے بعد جب جہانگیر نے عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی تو سلطان روم نے آتم نام ایک سفیر اس کے دربار میں بھیجا، لیکن صرف اس شبہہ پر کہ درباریوں نے اس کی شناخت نہیں کی، اوس کو قبول نہیں کیا، چنانچہ خود تزک جہانگیری میں لکھتا ہے :-

"آتم نام حاجی ما ورا النہری کہ مدتہا در روم بود خالی از معقولیت و معرفتے نیست، خود را ایلچی خوندکار (سلطان روم) گفتہ در آگرہ ملازمت کرد، کتابت مجہولی نیز داشت، نظر با حوال و اوضاع او کردہ ہیچ کس از بندہاے درگاہ تصدیق بایلچی بودن او نکردند، از زمانے کہ حضرت صاحب قرانی (تیمور) فتح روم کردہ وایلدرم بایزید حاکم آنجا زندہ بدست افتاد و بعد از گرفتن پیشکش و تحصیل مال یکسالہ کل ولایت روم قرار دادند، کہ بدستور ملک مذکور را بتصرف باز گذارند، دریں اثنا ایلدرم بایزید وفات یافت ملک را بہ پسرا و موسی چلپی مرحمت کردہ خود معاودت فرمودند تا حال از جانب قیاصرہ آنجا باوجود چنیں احسانے کس نیامدہ وایلچی نفرستادند، الحال چہ گونہ باور تواں کرد کہ ایں شخص ما ورا النہری فرستادہ خوندکار باشد اصلا ایں سخن معقول من نیفتاد، ہیچ کس بر صدق دعوی او گواہی نداد بنا برایں فرمودم کہ ہر جائی خواستہ باشد بہ رود" (ص ۶۹ تا ۷۰)

اس عبارت سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خاندانی رقابت کا شعلہ اب تک تیموری شہزادے کے سینے میں بھڑک رہا ہے، بہرحال ترکوں نے رشتہ برادری جوڑنے کے لئے اپنی پیش قدمی ظاہر کر دی،

---

[۵۱] تاریخ گجرات ابوتراب ص ۹۶، کلکتہ،

جہانگیر کی اس خشکی اور ترشروئی کی تلافی اُس کے نیک دل اور زود آشنا بیٹے شاہجہاں نے کردی ۱۰۴۹ھ میں جب سلطان محمد رابع بغداد کی فتح کے لئے عراق آیا ہوا تھا، ظریف نام ایک قاصد کو گرانبہا تحائف دے کر عراق روانہ کیا، سلطان نے نہایت عزت و محبت سے قبول کیا، اور ارسلان آقا ایک ترکی قاصد کو اُس کے جواب میں نہایت عمدہ خاصہ کے دو گھوڑے مع مرصع طلائی ساز و سامان کے اور مروارید باف عبا دے کر شاہجہاں کے پاس بھیجا، ارسلان آقا کے پہونچنے سے پہلے ٹھٹھ اور ملتان کے صوبیداروں کے نام احکام بھیج دیے گئے تھے، کہ منزل بہ منزل عزت و تکریم سے اسکو پہنچاتے جائیں اور ملتان کے خزانہ سے دس ہزار روپیہ اسکو سفر خرچ دیے جائیں، (خافی خاں واقعات ۱۰۴۹ھ)

مراۃ احمدی نام گجرات کی ایک تاریخ ہے، مصنف صوبہ گجرات کا دیوان تھا، اس لئے تمام سرکاری کاغذات تک اس کی رسائی تھی، ذیل میں شاہجہاں کی فیاضیوں کے، اور سلطان روم اور حرم محترم کی بجا آوری خدمات کے واقعات اس کے مختلف صفحات سے لے کر یکجا کر دیئے جاتے ہیں،

۱۔ شاہجہاں نے ۱۰۴۷ھ میں دیوان خواجہ جہاں کو حرمین کی اجازت دی، پانچ لاکھ روپیے تاجپوشی کی نذر مانی گئی تھی، ازاں جملہ فی الحال ۲ لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ کا مال حسب مذاق اہل عرب احمد آباد اور سورت سے خرید کر، خواجہ صاحب کے ساتھ بھیجنے کا حکم متصدیان صوبۂ گجرات کے نام صادر ہوا، حکیم مسیح الزمان بھی رخصت حج لے چکے تھے، حکم میں لکھا تھا کہ سارا مال انہی کی رائے سے تقسیم ہوگا،

۲۔ ۱۰۶۴ھ میں حکیم ابو القاسم حکیم الملک کو اجازت حج و زیارت ملی، اور متصدیان گجرات کے نام حکم صادر ہوا، کہ ۶۰ ہزار کا اسباب منجملہ رقم نذر دی جائے،

۳- ۱۰۸۵ھ میں احمد آباد کے کاریگروں سے خوشبودار عنبر کی ایک قندیل نہایت خوبصورت سات سو تولہ کے وزن کی بنوائی گئی، صناعوں نے مرصع کاری سے جواہر بے بہا قندیل میں جوڑ دیئے تھے، سارے جواہرات میں الماس کا ایک دانہ نہایت پاکیزہ تھا، ایک لاکھ قیمت تھی، اور قندیل کا سارا خرچ ملاکر ڈھائی لاکھ صرف ہوئے تھے، یہ قندیل بحکم حضور روضۂ نبوی کے لئے بنائی گئی تھی، ۱۰۸۵ھ میں تیار ہوگئی، ناظم صوبہ نے سید احمد سعید کے ہمراہ حضور میں بھجوادی، بادشاہ نے ملاحظہ فرماکر بہت پسند کی، اور حکم فرمایا کہ سید مذکور کے ہمراہ قندیل مدینہ طیبہ بھیجی جائے، متصدیان احمد آباد کے نام حکم ہوا کہ ایک لاکھ ۵۰ ہزار روپئے کا اسباب حسب مذاق عرب خرید کر سید صاحب کے سپرد کیا جائے تا عتبات کے مستحقین میں صرف ہو، اور یہ رقم اسی مد میں لکھی جائے، مگر تقدیر کہ ہوا کچھ ایسی چلی کہ جہاز پھر پھرا کر سورت واپس آگیا،

۴- ۱۰۸۶ھ میں فراست خاں نواب ناظر محل شاہی کو حرمین کی اجازت ہوئی، چلتے وقت ۵۰۰ اشرفی زاد راہ دیا گیا، اور ایک لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ کا مال واسباب احمد آباد سے

. . . . دلایا گیا، کہ اُن میں سے ۵۰ ہزار کا مال شریف مکہ زید بن محسن کو اور ۵۰ ہزار کا سادات علماء و فضلاء و گوشہ نشینان مکہ معظمہ کو، اور ۵۰ ہزار کا مدینہ طیبہ کے فقراء و مساکین کو تقسیم کیا جائے،

۵- اسی سال سلطان محمد خاں والی روم کے ایلچی سید محی الدین (از اولاد شیخ عبدالقادر جیلانی) کے سورت میں وارد ہونے کی خبر متصدی بندر کی تحریر سے حضور میں گذری، ایک خلعت اور فرمان گرز بردار کے ساتھ ایلچی کے پاس بھیجا گیا، اور ۱۰ ہزار روپیے خزانہ سورت میں ایلچی مذکور کو سفر خرچ کے دیئے گئے،

۶۔ ۱۰۶۱ھ میں ایلچی رخصت ہوا، حاجی سعید احمد کے ہمراہ سورت آیا، حاجی صاحب بار دیگر تنزیل مذکور پہنچانے کو مامور کئے گئے تھے، متصدیان بندر سورت کو تاکید کی گئی کہ ایک لاکھ روپئے کا اسباب حسب مذاق اہل عرب حاجی مذکور کو بغرض تقسیم مستحقین مکہ معظمہ سپرد کیا جائے،

۷۔ متصدی بندر سورت کی عرضداشت سے حضور میں دریافت ہوا کہ فرمانروائے روم سلطان محمد خاں کا ایلچی ذو القدر آقا برادر وزیر اعظم صالح پاشا مع نامۂ وپیام ۲۹ر صفر ۱۰۶۳ھ کو وارد سورت ہوا، حکم ہوا کہ بارہ ہزار روپیہ ایلچی مذکور کو خزانہ سورت سے دیئے جائیں،

۸۔ اسی زمانہ میں قلت غلہ سے بے نوایان مکہ معظمہ کی محتاجی اور تکالیف حضور میں گذری، سُن کر بادشاہ نہایت متاسف ہوا، ۱۶ر جمادی الثانیہ ۱۰۶۴ھ میں خواجہ صالح کا انتخاب ہوا، خلعت سے سرفرازی دے کر حرمین شریفین کی اجازت اُن کو دی گئی، چلتے وقت ایک لاکھ روپئے کا مال واسباب حسب مذاق عرب سورت سے اُن کے حوالہ کیا گیا کہ ازانجملہ ایک حصہ شریف مکہ کو، دوسرا صلحا وفضلاء کو اور تیسرا مدینہ طیبہ کے زاویہ نشینوں کو دیا جائے،

کارخانۂ ملتان میں ایک جانماز مطابق نمونۂ مسجد نبوی بنوائی گئی تھی، اگرچہ حضور کے پسند خاطر نہ تھی تاہم خواجہ صاحب کے ساتھ مدینہ منورہ بھیجی گئی،

یہ ایک سرکاری افسر کے روزنامچہ کے سادہ واقعات ہیں، خافی خاں کے حوالہ سے اس سفارت کے واقعہ کی کسی قدر تفصیل لکھی جاتی ہے،

۱۰۶۶ھ میں بندر سورت کے متصدی نے عرضی گذرانی کہ سلطان محمد خان قیصر روم

کی طرف سے ذوالفقار آقا خط اور تحائف لے کر وارد ہوا ہے، حکم ہوا کہ گرز برداروں کے ساتھ بندر سورت کے خزانہ سے ۱۲ ہزار روپیہ سفر خرچ دے کر روانہ کیا جائے، اور ۵ ہزار سلطان پور اور نذربار کے فوجدار اور ۱۲ ہزار برہان پور کی دیوانی سے اور ۵ ہزار اجین کی دیوانی سے اور ۱۲ ہزار اکبرآباد کے خزانہ سے ادا کئے جائیں، اور یہ بھی حکم ہوا کہ اس کے علاوہ صوبہ دار اپنی طرف سے بھی اُس کی خدمت کریں، اس طرح منزل بہ منزل طے کرتے ہوئے سفیر جب دارالحکومت کے قریب پہنچا، تو حکم ہوا کہ لشکر خاں بخشی اور طاہر خاں کو اُس کے استقبال کے لئے جائیں، اور اپنے ساتھ لاکر حضور میں پیش کریں، سفیر نے قیصر کا خط اور دو گھوڑے جن کے ساز طلائی تھے، اور زین میں موتی ٹنکے تھے، اور گرز مرصع کار جو اس ملک کے سلاطین کا خاص ہتھیار ہے پیش کیا، بادشاہ نے خط کو باعزاز تمام لیا، اور سفیر کو ۲۰ ہزار روپئے نقد اور سا گجہ (عطر) کے تین پیالے، اور ایک طلائی پاندان عطا کیا، اور ایک سرکاری مکان میں جہاں جملہ سامان مہیا تھے اتارنے کا حکم دیا، اسی درمیان میں شہزادہ سلیمان شکوہ کی شادی رچی، اس جشن کی تقریب سے ۲۰ ہزار روپئے سرکار سے، ۲۵ ہزار شاہزادہ کی طرف سے اور ۱۵ ہزار ملکۂ دوراں نواب بر قدسیہ کی جانب سے مع دو سر جڑاؤ اساانوں کے کل تقریباً ایک لاکھ روپیہ نقد و جنس سفیر کو مرحمت ہوا، قائم بیگ ایک ملازم جو ترکی و عربی بولتا تھا نگراں مقرر ہوا، ایک مرصع خنجر جس کے قبضہ میں بیش بہا موتی، اور ایک گراں قیمت لعل جڑا ہوا تھا، اور جس کی قیمت ایک لاکھ تھی، اور ایک مرصع کمر بند جس کی قیمت ۴ ہزار تھی، اور دو ہزار تھان سادہ اور زری کے کپڑے بنگالہ، احمد آباد، اور برہان پور کی ساخت کے جن کی لاکھ روپیہ قیمت تھی، اور ۵۰ تولے عطر جہانگیری جس کی قیمت اس زمانہ میں ۴ ہزار سے زیادہ تھی، اور دوسرے تحائف سلطان کے لیے اس کے حوالہ کیے گیے، اور علامی سعد اللہ خان وزیر کا لکھا ہوا سلطان کے نام ایک عربی خط دیا گیا،

سفیر موصوف سے یہ سن کر کہ قسطنطنیہ میں آجکل طاعون ہے، بادشاہ نے سو دانے موتیون کی تسبیح جس کا نام زہر مہرہ کا تھا، اور جو ہمیشہ بادشاہ کے بازو پر بندھی رہتی تھی، تحائف میں داخل کر دی، سفیرون کے ساتھ خان جہان ایک امیر کو احمد آباد اور سورت سے ایک لاکھ روپیے کا مال دے کر مکہ معظمہ روانہ کیا، کہ ان مین ایک تہائی شریف مکہ کو دیا جائے، اور باقی حرم کے علمار اور مستحقین میں تقسیم کیا جائے، ملتان کے شاہی کارخانہ میں مسجد نبوی کے عرض وطول کے برابر ایک نہایت عمدہ قالین تیار کرایا گیا تھا، وہ بھی ساتھ کر دیا گیا،

ناظرین! تم نے تاریخوں میں والی توران اور دارائے ایران کے درباروں سے بھی بارگاہ تیموری میں قاصد اور سفرا آتے ہوئے دیکھے ہیں، کیا اس اعزاز، اس مسرت، اس فیاضی اور اس عقیدت کا سماں بھی وہاں تم کو نظر آیا، اس فرق مراتب کی تم کوئی صحیح توجیہ سوا اس کے کیا کرسکتے ہو کہ یہ خادم الحرمین الشریفین کی بارگاہ کا قاصد تھا، اور جو کچھ اس کے ساتھ کیا گیا، اور سلطان کے حضور میں جو کچھ بھیجا گیا، اور حرمین کے لئے جو تحائف قاصد کے ساتھ ارسال کئے گئے، وہ شاہ جہاں کا ولولۂ دین پرستی اور جوش مذہبی تھا،

ناظرین کو حسرت ہوگی کہ یہ شاہی مراسلات اگر آج تاریخوں میں محفوظ ہوتے، تو کس قدر بیش قیمت چیز ہوتی، لیکن میں انھیں تسلی دیتا ہوں کہ اگر مورخین نے اُن کی قدر و قیمت کو نہیں پہچانا تو ہمارے ادیبوں اور منشیوں نے اُن کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر لیا تھا، سلاطین اور شہزادوں کے خطوط و مراسلات کا ایک بڑا قلمی مجموعہ موسوم بہ فیاض القوانین[1] اس وقت میرے سامنے ہے، اور اس میں یہ تمام مراسلات موجود ہیں، ان میں والیان توران کے معاملات کے متعلق دوستانہ سفارشین اور جوابات ہیں، شاہجہان اپنے عربی خط مورخہ شعبان ۱۰۶۱ھ

---

[1] یہ نادر مجموعہ ہمارے مخدوم نواب حسام الملک مولوی سید علی حسن خان کا مملوکہ ہے، مولانا شبلی

میں سلطان کو حسب ذیل القاب سے یاد کرتا ہے:۔

"الی من الیہ مآب الشوکۃ وآیات الحشمۃ رفیع المکان منبع الشان بسمو المرتبۃ سماء دعلو المرتبۃ بیضاء معلی الویۃ السیاسۃ باسط الریاسۃ مشید ارکان الشریعۃ الحنفیۃ و موید احکام الملۃ الحنیفیۃ، مقاتل الشرار الزنج مقاتل الافرنج عالی الحضرۃ سامی الرتبۃ، سلالۃ خواقین الروم، ناصر الملهوف والمظلوم مورد الطاف الکریم المفضال، مهبط اعطاف الکبیر المتعال، شمسا للرفعۃ والعزۃ والبسالۃ والعظمۃ والشان، السلطان محمد خان لازالت شموس سلطنۃ ثابتۃ عن الزوال واقمار دولتہ علی الکمال"

سلطان محمد خاں کی طرف سے شعبان ۱۰۶۳ھ میں اس کا جواب شاہجہاں کے نام بھیجا گیا جس میں اولاً شاہجہاں کے لئے حسب ذیل القاب ہیں،

"بجانب عالی حضرت، معالی منقبت، گردوں رفعت، فریدوں شوکت، خورشید اضاءت جمشید نباہت، دارا درایت، عطارد فطنت، مشتری کیاست، مسند آرائے سلطنت ممالک ہند، فرمانروائے اقلیم سند، مظہر الطاف جلی و خفی، حارس حوزۂ کابلستان و غزنین، جالس اورنگ، اقلیم نصرت آئین، المختص بمزید عنایۃ الملک المستعان ابوالمظفر شہاب الدین، محمد صاحبقران ثانی بادشاہ غازی"

آگے چل کر سلاطین آلِ عثمان کے مفاخر میں لکھا ہے:۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۰) مرحوم نے مضامین عالمگیر میں جب سے اس کا حوالہ دیا ہے، اس کی متعدد نقلیں انگلستان اور ہندوستان کے مشہور کتب خانوں نے حاصل کی ہیں،

"بر علم عالم آرائے ایشان (شاہجہان) مخفی و مستور نیست کہ حضرت حق فیاض مطلق این دودمان عظیم الشان، آل عثمان را کہ بلطف ربانی و عون سبحانی محفوظ بادہ برائے احیائے مراسم دین مبین و احکام شرع متین بر پا دیا بر جا کردہ، واجداد وامجاد ما کہ سلاطین پاک گوہر اند و خواقین معدلت گستر ند، ازین قدر عہد بعید و زمان مدید تا حال بتقدیم مساعی جمیلہ و خدمات دینیہ جزیلہ موصوف اند و باعانت و امداد ضعفا مشہور و معروف"

اس کے بعد لکھا ہے کہ والی توران نے ہماری بارگاہ میں آپ کی سختی و تعدی کی فریاد کی ہے :-

"برائے قطع رگ نزاع و جدل و حل عقدۂ سخت اشکال بے محل بصوب درگاہ پناہ و خلافت دستگاہ، تضرع نامۂ گلہ گویانہ او آمدہ"

اس لئے میں نے وہ محبت نامہ لکھا :-

"بموجب حمیت دینیہ و رافت نوعیہ و ہمت ملکیہ، در باب منزل و اشتی ملتمس او (والی توران) مکتوب محبت اسلوب ارسال داشتہ"

سفیر کی نسبت لکھا ہے کہ

"تبلیغم بوسۂ قوائم پایۂ سریر خلافت مصیر ما سرفراز کردہ شد"

سلطان کا یہ خط ۱۰۶۶ھ میں ہندوستان پہنچا، شاہجہاں کو اس خط کا عالم لہجہ پسند نہ آیا، اور سلطان کو ایک اور دوسرا شکایت آمیز فارسی خط لکھا، جس کے القاب یہ ہیں :-

بحشمت نصاب، عظمت مآب، بہرام صولت، مشتری سیما، کیواں منزلت بغیہ

ضیا، مزین، جاہ وجہاں بانی محسن بساط کامرانی، رافع الویہ دین مبین، ناصب اعلام شرع متین، محارب اشرار زنگ، مجادل فجار فرنگ، عالی حضرت فلک رفعت فرمانروائے بلاد روم حامی ملہوف ومظلوم، المخصوص بوفور لطف الکریم المنان سلطان محمد خان"

میں نے ان خطوط کے القاب اس لئے نقل کئے ہیں کہ تاریخوں میں کتب انشا میں ابوالفضل کے دفتروں میں فرمانروایان توران اور شاہان ایران کے نام خطوط درج ہیں، ان کو پڑھ کر آسانی سے ہمارے ناظرین فیصلہ کر سکتے ہیں، کہ ان میں برادرانہ اور مساویانہ طرز خطاب ہے تو ان میں فرق و امتیاز، بزرگی کی نگہداشت، اعلائے دین و نشر جہاد اور دیگر خدمات مذہبی کا اعتراف و تسلیم بھی ہے۔

شاہجہاں کے پرامن عہد کی تفصیل میں صفحات کچھ زیادہ لگ گئے لیکن بہرحال وہ ضروری تھے، اب عالمگیر کا عہد آتا ہے، اس کے زمانہ میں دلی اور قسطنطنیہ کے تعلقات واضح نظر نہیں آتے، . . . .

. . . . لبتہ دستور قدیم کے مطابق کبھی ہندوستانی امرا، اور علما، اور میر حاج کی معرفت، اور کبھی شرفائے مکہ کے وکیلوں کی معرفت حرمین کی اعانت اور امداد کی رقم برابر جاری ہے ۱۱۶۲ھ میں میر عزیز بدخشی نے جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ نذر دے کر بھیجا گیا تھا، وہیں انتقال کیا،

(مرأة احمدی)

عالمگیر کے بعد ہندوستان کی تیموری طاقت کا زوال ہونے لگا، تاہم سنہ ۱۲۰۱ھ کے ایک ہندوستانی حاجی ساکن مرادآباد شہادت دیتے ہیں کہ محمد شاہ کے زمانہ تک دستور قدیم

جاری رہا،[1]

اس موقع پر میں ایک اور مسئلہ بھی صاف کر دینا چاہتا ہوں، وفد خلافت لندن کے ایک مضمون کے جواب میں پروفیسر مارگولیوتھ نے لکھا تھا کہ تیموری سلاطین خود خلافت کے مدعی تھے، پروفیسر موصوف کو ہماری فارسی تاریخوں کے مبالغہ آمیز آداب و القاب شاہانہ سے دھوکا ہوا حقیقت یہ ہے کہ ان چاپلوس اور خوشامدی سرکاری تاریخ نویسوں نے اس بلند و اہم لفظ کی اس قدر مٹی خراب کی ہے کہ ان کے مذاق سلیم پر افسوس آتا ہے، اُن کی زبان میں اس لفظ کے معنی صرف "سلطنت اور بادشاہی" کے رہ گئے تھے، اس لئے یہ لفظ نہ صرف اکبر و جہانگیر و شاہجہاں و عالمگیر کے لئے وہ استعمال کرتے ہیں، بلکہ عام شاہزادوں، بلکہ ایران کے شیعی سلاطین صفوی، بلکہ ایک عیسائی بادشاہ تک کے لئے استعمال کرنے میں انھوں نے دریغ نہیں کیا ہے اور نہ اس احمقانہ خیال کو کون دل میں جگہ دے سکتا ہے، کہ جن کے نام ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں میں کبھی سُنے بھی نہ گئے ہوں، وہاں کی ریاست دینی کا اُن کو دعویٰ تھا، یہ تخیل ہندوستان کے تیموری سلاطین کے حاشیۂ گمان میں بھی نہ تھا، اُن کی کوششوں کا جولانگاہ جو کچھ تھا، وہ ہندوستان اور صرف ہندوستان تھا،

لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا سکتا، کہ ہندوستان میں جب تک تیموری سلطنت پُر زور رہی، یہاں کی مسجدوں میں سلاطین ٹرکی کے نام کا خطبہ نہیں پڑھا گیا، اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی، مقامی سلاطین کے نام اس کے لئے کافی تھے، مگر جیسے جیسے ملک کے مختلف گوشوں سے اُن کا اثر ہٹنے لگا، اور مختلف اطراف اور صوبے انگریزوں، فرانسیسیوں، پرتگیزوں اور جو

---

[1] واقعات الحرمین قلمی موجودہ کتب خانہ نواب نور الحسن خاں مرحوم لکھنؤ،

کے ہاتھوں میں یا مقامی نوابوں کے قبضہ میں جانے لگے سلطان ٹرکی کا نام وہاں کی مسجدوں اور محرابوں میں رونق کا باعث ہونے لگا[1] ۱۱۷۵ھ میں یعنی آج سے ۱۶۲ برس پہلے دکن کے ایک بزرگ سید قمرالدین اورنگ آبادی حج سے واپسی میں سیلون پہونچے تھے، میر آزاد بلگرامی اُن کے حوالہ سے سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں کہ

"ساحلی مقامات میں ڈچوں کی حکومت ہے، اور اندرون ملک میں ہندو راجہ ہے، یہاں کے مسلمان پادشاہ ہند اور سلطان روم کے نام کا خطبہ پڑھتے ہیں، لکونہ خادماً للحرمین الشریفین"

اس وقت ہندوستان کی بساط پر جو یورپین شاطر اپنی اپنی قسمت کے پانسے ڈال رہے تھے، اُن سب کو معلوم تھا کہ اس ملک کے مسلمانوں کے دلوں میں سلطان کی عقیدت کا کتنا گہرا نقش ہے، اور بحیثیت خلیفۂ اسلام ان کی اطاعت کو وہ کس قدر فرض جانتے ہیں، چنانچہ اس عہد کے انگریز و فرانسیسی دونوں قوموں کے کھلاڑی اپنی بازی کی جیت کے لئے سلطان ہی کے نام سے پانسے ڈالنے لگے، دونوں نے اپنی کامیابی کا ذریعہ یہ سمجھا کہ وہ اپنے کو سلطان اور خلیفۂ اسلام کا دوست اور حلیف اور دوسرے کو مخالف اور دشمن ثابت کریں، فرانسیسیوں نے اس باب میں جو کوششیں کی ہیں، ان کا کسی قدر بیان علامہ جبرتی کی تاریخ مصر (جلد ۳) میں ہے، انگریزوں کی کوششوں کی روداد ایک انگریزی تاریخ میں موجود ہے، جو ۱۸۰۰ء میں سرکاری کاغذات کی مدد سے مرتب کی گئی ہے، اس کتاب کا عنوان یہ ہے، A Review of the origin...... progress and Result

---

[1] چنانچہ سرسید اپنے مضمونِ خلافت مطبوعہ تہذیب الاخلاق میں اپنی ذاتی واقفیت سے لکھتے ہیں کہ شاہ عالم کے بعد مسجدوں میں سلاطینِ روم کے نام خطبوں میں لئے جانے لگے،

-of the decisive war with the late Tipu sultan

نیز حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی فارسی تاریخ کارنامۂ حیدری میں یہ مراسلات درج ہیں، چار سال ہوتے ہیں کہ معارف (فروری ۱۹۱۶ء) کو ان خطوط کے انکشاف کا فخر سب سے پہلے حاصل ہوا ہے، ٹیپو سلطان کے تعلقات براہ راست سلطان سے قائم تھے، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے راستہ سے (غالباً موسم حج کے تعلق سے) باہم خط وکتابت جاری تھی، اس زمانہ میں ارل آف مارننگٹن (مارکوئیس آف ولیسلی) ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ہندوستان کے گورنر جنرل تھے، اور مسٹر اسپنسر قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر تھے، انگریزوں نے سفیر مذکور کی وساطت سے سلطان ٹیپو کے نام، ۲۰ ستمبر ۱۷۹۸ء کو سلطان سلیم ثالث کے دربار سے ایک خط حاصل کیا، خط عربی زبان میں کئی صفحوں میں ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ "فرانسیسی بڑے غدار ہیں، بے دین ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، اور انگریز ہمارے دوست اور مددگار ہیں، اس لئے فرانسیسیوں سے کوئی تعلق نہ رکھو، اور انگریزوں سے صلح کر لو، ۱۶ جنوری ۱۷۹۹ء کو یہ خط سلطان ٹیپو کے پاس بھیجا گیا، اور اس کے ساتھ گورنر جنرل مذکور نے ایک خط خود اپنی طرف سے لکھا جس کے حسب ذیل فقرے عبرت افزا ئے چشم بصیرت ہیں،

"آپ کے لئے بہتر ہے کہ تمام مذاہب کے دشمن اور خلیفۂ اسلام پر حملہ کرنے والے فرانسیسیوں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر کے اپنا جوش اسلامی دکھائیں، اور امید ہے کہ جب آپ نامۂ سلطانی کو پڑھیں گے، تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ فرانسیسیوں نے مسلمانوں کے مسلّم خلیفہ کی توہین کی ہے، اور ان پر حملہ آور ہوئے ہیں، اور بے وجہ اس ملک (مصر و شام) میں ظالمانہ جنگ شروع کی ہے، جس کی ہر مسلمان عزت کرتا ہے، اور جس کو

مذہبِ اسلام کی یادگاروں کا خزینہ سمجھتا ہے "

سلطان ٹیپو نے سلطان سلیم کے اس خط کا نہایت مختصر جواب عربی میں لکھ کر بھیجا جس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:۔

" اُس خدا کی حمد جس نے اسلام کو بڑے بڑے سرداروں کی نگہبانی سے زینت بخشی، اور جس نے مذہب کی بنیاد کو برگزیدہ بادشاہوں کے نظم ونسق سے مضبوط کیا، درود وسلام ہو اُس کے پیغمبر محمدؐ پر، اور اُن کے آل واصحاب پر جو خیرالانام علیہ السلام کے طریقہ کے مددگار تھے، بعد ازیں: وارثِ مرتبۂ سلیمانیہ جامع رموزِ حکمتِ لقمانیہ، مظہرِ قدرتِ الٰہیہ، موردِ کراماتِ غیر متناہیہ، مجمعِ علوم وحکم، کانِ بلندی ہمت، مقدمۂ شکر فتح وظفر، منتخب کتاب قضا و قدر، تری اور خشکی کے بادشاہ، دنیا میں خداوند تعالیٰ کے خلیفہ سلطان روم، خدا اُن کی حکومت، خلافت کو ہمیشہ قائم رکھے، کی جناب میں گذارش ہے کہ نامۂ عالی نہایت اچھے وقت میں پہونچا، اور اس کے مضامین سے آگاہی ہوئی جس میں کہ فرانسیسی قوم کی بُرائیاں اور اہلِ اسلام کے ساتھ اُن کی دشمنی اور اُن کا یہ ارادہ کہ دنیا سے تمام مذاہب کو اُکھاڑ پھینکیں، اور انگریزوں کی حمایت اور جناب عالی کا یہ عزم کہ حضور خود بیچ میں پڑ کر ہمارے اور اُن کے درمیان تصفیہ کرا دیں، اور جناب کا یہ حکم کہ ہمارے اُن کے درمیان جو وجوہِ مخالفت ہیں، اُن کو ہم بیان کریں مندرج تھا آستانۂ والا پر مخفی نہیں کہ ہماری غرض خدا کے راستہ میں جہاد اور دینِ الٰہی کے سررشتۂ امور کو درست کرنا ہے، یہ آپ نے صحیح فرمایا ہے کہ فرانسیسی قوم میں دینداری نہیں، اور ہم اُن کی بُرائیوں سے بہت اچھی طرح واقف ہیں لیکن آج کل انگریز ہم سے لڑنے آئے ہیں، اور انھوں نے سامانِ جنگ

تیار کیا ہے، اس بنا پر ہم پر بلکہ تمام مسلمانوں پر اُن سے جہاد فرض ہے، آستانۂ والا سے امید ہے کہ خاص اوقات میں ہمارے لئے دعا فرمائیں، اور اپنی دعا اور محبت سے ہماری مدد فرمائیں، اسی کی جناب سے درخواست ہے اور خدا ہمارے اور آپ کے لئے کافی ہے،
اور ہم نے اس سے پہلے سید علی محمد اور مدارالدین کی معرفت اس سے پہلے خط لکھا ہے، جس میں بہ تفصیل اپنی باتیں بیان کی ہیں، اور نیز ایک دوسرا خط یوسف وزیر کی وساطت سے مدینہ منورہ کی راہ سے ارسال کیا ہے، ان خطوط سے ہمارے دلی خیالات بہ تشریح و تفصیل جناب والا پر واضح ہوں گے، درود ہو پیغمبر محمد پر اور اُن کے نیک آل و اصحاب پر،"

کیا اس خط کے بعد بھی مسئلۂ ہندوستان و خلافت عثمانیہ" میں کوئی شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے،
۱۲۱۳ھ میں ادھر انگریزوں نے سرنگا پٹم پایۂ تخت میسور پر قبضہ کیا، اور سلطان ٹیپو نے شہادت پائی، اور ادھر مصر کو فرانسیسیوں نے فتح کر لیا، سلطان شہید کے مزار واقع سرنگاپٹن (میسور) کی دیوار پر متعدد عربی و فارسی کے اشعار و قطعات تاریخ کندہ ہیں جن میں سے دو ایک شکستہ عربی شعروں کی حسب ذیل عبارت ہے،

ان اخذت مصر کما قد	اگر مصر فتح کر لیا گیا، جیسا کہ لوگ
ذکروا والسرنج فتن	بیان کرتے ہیں، اور سرنگاپٹن بھی
قد اخذت،	فتح ہو گیا،
مصیبۃ ما مثلہا ارختہا	تو ایک ایسی مصیبت ہے، جس کی نظیر نہیں، میں نے اس واقعہ کی تاریخ یہ کہی ہے،

ذھب عنہا الروم والھند — کہ روم اور ہندوستان کی تمام عزت

کلتھا، — خاک میں مل گئی،

اس مختصر لیکن عالمگیر اسلامی اخوت سے متاثر عبارت میں روم اور ہندوستان کے تعلقات کی کس قدر واضح تشریح ہے،

۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۶ء تک کی جنگ کریمیا میں برطانیہ نے اپنے مشرقی مقبوضات کی خاطر ٹرکی کا ساتھ دیا، لیکن ٹرکی کو بہت جلد اس اعانت کی تلافی کا موقع مل گیا، ۱۸۵۷ء کے غدر میں کریمیا کی انگریزی فوج اپنے ساتھ مسلمانانِ ہند کے نام دربار سلطانی سے ایک فرمان لائی، جس میں خلیفۂ اسلام کی حیثیت سے سلطان عبد المجید نے مسلمانوں کو برطانوی حکومت کی اطاعت کی نصیحت کی تھی، افسوس ہے کہ مجھے اس فرمان کی عبارت ابتک نہیں ملی ہے، تاہم یہ اس قدر مشہور واقعہ ہے کہ ہندوستان سے ہزاروں میل دور رہنے والے مسلمان بھی اس سے ناواقف نہیں ہیں، چنانچہ مصطفیٰ کامل پاشا نے اپنی تصنیف مسئلہ مشرقیہ جلد اول ص ۲۱ میں اور تونس کے اخبار الصواب (۴ر فروری ۱۹۲۱ء) نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے،

موجودہ دیسی اسلامی ریاستوں میں حیدرآباد سے بڑی کوئی اسلامی ریاست نہیں ہے، یہ نہیں معلوم کب سے لیکن یہ واقعہ ہے کہ مکہ مسجد سے لے کر چھوٹی چھوٹی مسجدوں تک میں ہر ہفتہ جمعہ کے خطبہ میں حضور نظام سے پہلے سلطان کا نام لیا جاتا ہے، مکہ مسجد میں یہ نظارہ بھی پیش آتا ہے، کہ نمازیوں کی صف میں خود فرماں روائے مملکت نظام موجود ہوتا ہے، اور اس کے سامنے خطیب خادم الحرمین الشریفین کے لئے دعائے خیر کرتا ہے، اور پیچھے سے ہزاروں زبانیں ایک ساتھ آمین پکارتی ہیں،

روم وروس کی جنگِ پلونا میں ہندوستان کے عام مسلمانوں نے بلکہ مسلمان والیانِ ملک
نے بڑی فراخ حوصلگی سے چندے دیئے تھے، اس تقریب سے ہماری اسلامی ریاست بھوپال
نے بھی اپنا فرض ادا کیا تھا، ۱۲۹۶ھ میں نواب شاہجہان بیگم نے گراں قدر مالی امداد سلطان
کی خدمت میں پیش کی تھی، اسی کے ساتھ نواب سید صدیق حسن خان مرحوم نے بھی اپنی جدید
تصنیف تفسیر فتح البیان کا ایک نسخہ پیشگاہ سلطانی میں ہدیہ بھیجا تھا، ان ہدایا کے جواب
میں بارگاہ سلطانی سے جو فارسی فرمان مورخہ ۸ ربیع الاول ۱۲۹۶ھ بمہر خیر الدین پاشا صدرِ
اعظم آیا تھا، اس کی نقل اس وقت میرے سامنے ہے، اصل فرمان نواب صاحب مرحوم کے خاندان
میں اب تک موجود ہے، اس فرمان کے حسبِ ذیل اقتباسات بڑے مدعا کے ثبوت کے لئے
کافی ہیں،

"بعد از ورود اخلاص شعار، بدربار شوکت قرار خلافتِ اسلامیہ، امتثالاً لامر ظلّ اللہ
الثانی، (سلطان) کہ بر وقت امتِ محمدیہ اقدم فرائض است و تشرف یافتن بہ مسند
جلیل وکالت خلیفہ پیغمبر آخر الزمان صلعم ...... در اثنائے ایں سرور، ارادۂ سنیۂ حضرت
خلافت پناہی شرف صادر بودہ ...... حصول التفات جہاں درجات حضرت خلافت
پناہی برحق ...... : فلہذا امتثال امر مطاعِ خلافت پناہی کردہ ام و بنامۂ ہمایوں"

۱۸۷۲ء میں نواب کلب علی خان والی رامپور حج کو گئے، تو سلطان کی طرف سے
ان کا شاہانہ استقبال ہوا، ۱۸۷۷ء کی جنگ روس میں نواب صاحب نے ڈیڑھ لاکھ روپیے
نذر بھیجے، سلطان نے اپنے سفیر حبیب حسین آفندی کی معرفت اُن کو فرمان اور تمغہ بھیجا[1]،

خلافتِ عثمانیہ کی مخالفت میں فتنہ پردازی کا آغاز ۱۸۹۷ء کی جنگ روم و یونان سے
ہوا، چونکہ اس وقت برطانیہ کی ہمدردی و اعانت یونان کے شامل حال تھی، اس لئے مقربانِ بارگاہ

---

[1] اخبار الصنادید جلد دوم ص ۱۶۴

کو حصولِ خوشنودی کی فکر ہوئی، سرسید اور اُن کے ساتھ چند اور خطاب یافتوں نے انکارِ خلافت میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا، پائنیر ان مستند مفتیوں کی تحریروں کا دارالاشاعۃ بنا، اسی زمانہ میں بمبئی کے مسلمانوں نے فتح یونان کی خوشی میں جشن منایا، سرسید یہ دیکھ کر غصہ سے آگ بگولہ ہوگئے، چند پرزور مضمون لکھ کر اس فتنہ سے مسلمانوں کو بچانا چاہا، لیکن وہ نہ بچے اور اس دہکتی ہوئی آگ میں کود ہی پڑے، اس زمانہ کے مستند علماء نے، اسلامی اخبارات نے اور عام مسلمانوں نے سرسید اور اُن کے رفقاء کی اس تحریک کو نفرت اور غصہ کی نظر سے دیکھا، مدتوں رسائل و اخبارات میں اس پر گرم اور تند بحثیں ہوتی رہیں، اور جمہور اسلام کا فیصلہ سرسید اور اُن کے معزز رفقاء کے خلاف رہا،

دسمبر ۱۸۹۹ء کے علی گڑھ میگزین میں مولانا شبلی مرحوم نے ایک ناتمام مضمون مسئلۂ خلافت پر لکھا، جس میں سرسید اور عام مسلمانوں کی نزاع آراء کا حوالہ دیکر تاریخی حیثیت سے یہ بتانا چاہا، کہ ترکوں سے پہلے بڑے بڑے سلاطین اسلام میں پیدا ہوئے لیکن عباسیوں کے مقابلہ میں کسی نے دعوائے خلافت نہیں کیا، یہ اس مضمون کا ماحصل ہے، اس واقعیت تاریخی سے کس کو انکار ہے، اصل سوال تو یہ تھا کہ عباسیوں اور دیگر قریشی قوتوں کے فقدان کی حالت میں تابعین دستولی و ذی اقتدار سلاطین ترکی کا دعویٰ قابلِ تسلیم ہے یا نہیں، مولانا نے اس کے متعلق ایک حرف نہیں لکھا، اور خود اس مضمون کی ناتمامی اور ایک مختصر نمبر کے بعد مضمون کے دوسرے نمبروں کی اشاعت کا التوا اس کی دلیل ہے، کہ ایک ہی نمبر سے اُن کو معلوم ہوگیا کہ، کہ کشفِ حقیقت کے بجائے سے اور زیادہ الجھنوں کے پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے، آج کل اس مضمون کی طرف بار بار ہماری توجہ منعطف کرائی جاتی ہے، لیکن اولاً تو ہم ایک کے سوا کسی دوسرے کو معصوم عن الخطا نہیں جانتے، دوسرے ایک ناتمام اور خارج از بحث مضمون کی بنا پر، اسی مصنف کی زندگی بھر کے

کارناموں پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا ہے ۱۸۸۲ء کی جنگ روم و روس میں اپنے شہر سے ہزاروں کا چندہ بھیجا، پھر اسی شوق و ولولہ میں ٹرکی کا سب سے اوّل سفر کیا، اور اس کے لئے مدتوں معتوب رہے، اور ان پر الزام لگایا گیا، کہ وہ سلطان عبدالحمید کی طرف سے اتحاد اسلامی کے مبلغ بن کر آئے ہیں، لیکن ان کا یہ حال رہا کہ آخر وقت تک وہ ترکوں کے نام پر سر دھنتے رہے ۱۸۹۲ء کی یہ مثنوی جو قسطنطنیہ میں بیٹھ کر جشن عید کے موقع پر لکھی تھی، علی گڑھ میگزین کے مضمون کے ساتھ ملا کر پڑھنے کے قابل ہے،

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید | مرحبا نائب خلافت رسید
داغ نہ جبہہ خورشید و ماہ | حضرت خاقان خلافت پناہ
شاہ فلک کوکبہ عبدالحمید | ایدہ اللہ بنصر مزید
زیب و طراز ہمہ عالم توئی | سایۂ یزدان بجہان ہم توئی
جملہ بدانند کہ در غرب و شرق | ہست ترا تاج خلافت بفرق
تازگی بدر و حنین از تو ہست | زیب و طراز حرمین از تو ہست
جز تو کہ ہست اے شہ انجم سپاہ | آنکہ بود شرع نبی را پناہ
قرۂ دین نبوی از تو ہست | بازوے اسلام قوی از تو ہست
شرع بجاہ تو چو شد ارجمند | باد بفرمان تو چرخ بلند

قسطنطنیہ کے قیام میں رسم سلاملق کا نظارہ دیکھا تھا، خطبہ میں جب سلطان کا نام آیا، تو اس کا اثر علی گڑھ میگزین کے مضمون کے مصنف پر ہوتا ہے،

"خطیب نے جب سلطان کے مقصورہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بڑے جوش سے یہ کہا کہ

اللّٰھُمَّ انصر ھذا السُّلطان السُّلطان بن السلطان الخاقان بن الخاقان السلطان الغازی

عبد الحمید خاں

تو میرے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، اور دیر تک دل کا یہ حال تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا، خطیب نے پہلے صحابہ کا نام پڑھا، اور سلطان کا نام آیا تو ایک زینہ اُتر آیا، تاکہ ظاہر ہو کہ سلطان اگرچہ ظل اللہ ہیں تاہم اُن کا رُتبہ حضرت صدیق و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کچھ نسبت نہیں رکھتا،" (مکاتیب ج ۱ ص ۱۶)

جنگِ بلقان میں اگرچہ انھوں نے بہت کچھ کہا، لیکن صرف ایک شعر اُن کے عقیدۂ دلی کا آئینہ ہے،

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے،

عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

پچھلی جنگ میں اُن کی وفات سے چند روز پیشتر ترکوں نے جنگ میں شرکت کی تھی، شہر کے چند وفا داروں نے اُن کے مکان پر ایک جلسہ کا اعلان کیا، اور جب لوگ جمع ہوگئے تو اُن کو اطلاع کی، اور مرضی دریافت کی، اس وقت بسترِ موت پر اُن کی زبان سے یہ دلسوز فقرہ نکلا کہ "آہ! میں تو اپنے کو اس لائق بھی نہیں سمجھتا کہ میری کھال سے ترک اپنے جوتوں کا تسمہ بنائیں"

سنہ ۱۹۱۱ء میں شملہ میں ایک سرکاری مشرقی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اثنائے ملاقات میں برن صاحب چیف سکریٹری صوبہ متحدہ نے مولانا سے دریافت کیا کہ اب مسلمان مذہبی حیثیت سے حکومت برطانیہ کو کیا جانتے ہیں، مولانا نے کہا کہ "آپ کو خبر نہیں کہ وہ خطبوں میں "السُّلطان ظل اللہ فی الارض" پڑھتے ہیں، برن صاحب نے فرمایا کہ "ہاں، مگر اس سے تو مراد سلطان ٹرکی ہیں

مضمون کا خاتمہ ذیل کے دو اقتباسوں پر ہوتا ہے، مشہور انگریزی رسالہ "دی سینیٹ" نے نومبر ۱۹۱۵ء کے نمبر میں "سلطان اور اُس کے رفقار" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا اُس کا ایک نقرہ حسب ذیل ہے،

"سلطان سلطنتِ برطانیہ کا رفیق ہے، جو مشرقی جنگ کے وقت انگلستان کا مددگار ہوگا، سلطان فقط فرماں روا ہی نہیں ہے، بلکہ تاجِ برطانیہ کی سات کرور مسلمان رعایا کا مذہبی پیشوا ہے"

یہ سات کرور مسلمان رعایا ہندوستان ہی کے مسلمان تو نہیں ہیں؟ مسٹر ملنبٹ سے بڑھ کر ٹرکی اور مشرق کی تاریخ کا ذاتی واقف کار انگریزوں میں نہیں، وہ اپنی تصنیف مستقبل اسلام میں جس کا اردو ترجمہ میر اکبر حسین صاحب الہ آبادی مرحوم کے قلم سے ہوا ہے، حسب ذیل نقرہ ہے،

"حنفیوں کے علاوہ سلطان کو مالکی و شافعی بھی جو پہلے خلافتِ عثمانیہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اب صدق دل سے خلیفۃ الاسلام تسلیم کرنے لگے ہیں، ...... اور ہندوستان کے مسلمان ہر جگہ ان کے لئے مساجد میں علانیہ دعائیں مانگتے ہیں"

سب کے آخر میں مسئلہ کا فیصلہ اسی رأی العیان واقعہ سے ہو جاتا ہے، کہ مدتوں سے ہماری مسجدوں کے منبر و محراب انہی سلاطین عظام کے ناموں سے گونج رہے ہیں، وللہ الحمد

منقول از معارف

دسمبر ۱۹۲۰ء و اکتوبر ۱۹۲۱ء

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی؟

ہمارے آریہ دوستوں کو تعجب ہی کہ ایک ہزار سال کے اندر ہندوستان میں جہاں ایک بھی کوئی مسلمان نہ تھا، سات کروڑ مسلمانوں کی تعداد کیونکر پیدا ہوگئی۔؟ لیکن کیا اُن کو کبھی اس پر بھی تعجب آیا ہو کہ ہندوستان جہاں کبھی ویدک دھرم مطلق نہ تھا، ہندوستان قدیم کی کروڑوں پرانی قومیں کیونکر اس دھرم میں آگئیں، پھر بودھ مذہب نے اسی سرزمین میں ویدک دھرم کو کیونکر شکست دی؟ اور بعد ازیں ویدک دھرم نے بودھ مذہب کو آگ، تلوار اور زبان سے کیونکر نیست و نابود کر دیا؟ یہ سب پُرانی باتیں ہیں، اُن کو جانے دیجئے، چند صدیاں پہلے یہاں ایک عیسائی بھی نہ تھا، مگر اب یہاں نصف کروڑ کے قریب عیسائی آبادی پیدا ہوگئی ہے، اور روز بروز پیدا ہوتی جارہی ہے، یہ کیونکر؟

عیسائی مشنریوں نے تمام دنیا میں یہ پھیلا رکھا ہے کہ مسلمانوں نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب پھیلایا ہے، حالانکہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے، کہ رومی سلاطین نے عیسائی مذہب کی اشاعت میں کیا کیا نہ کیا، اسپین، پرتگال، روس، ہولینڈ نے خصوصًا، اور یورپ کی عام سلطنتوں نے اس کے لئے کیا کیا راہیں نہ اختیار کیں، اور خود ہندو راجہ دھرم کی خاطر کیا کیا نہ کر گذرے، اسی طرح اگر بعض مسلمان بادشاہوں سے ایسی باتیں سرزد ہوئیں، تو صرف وہی سرزنش اور

ملامت کے مستحق کیوں ہیں ؟

تمام دنیا کے مذاہب میں سے صرف اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے یہ فلسفہ دنیا میں ظاہر کیا ہے کہ مذہب یقین کا نام ہے ، اور یقین تلوار کی دھار اور نیزہ کی نوک سے پیدا نہیں کیا جا سکتا ،

لا اکراہ فی الدین	مذہب میں کوئی زبردستی نہیں ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ ہوتی ہے :-

افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مومنین ،	اے پیغمبر ! کیا تو لوگوں کو مجبور کریگا کہ وہ ایمان والے ہو جائیں ،

خدا نے فرمایا پیغمبر کا کام جبر و اکراہ نہیں ، بلکہ صرف دعوت اور تبلیغ ہے ،

لست علیھم بمصیطر	اے پیغمبر تو ان کافروں پر حاکم بنا کر نہیں بھیجا گیا ۔
فانما علیک البلاغ	اے پیغمبر ! تجھ پر صرف تبلیغ ہی فرض ہے ،

قرآن نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس کے مذہب کی تبلیغ دنیا میں کیونکر کی جائے ،

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ،	اپنے رب کے راستہ کی طرف تو لوگوں کو دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا اور ان سے مناظرہ کر ، تو اس طریقہ سے جو بہترین ہے ،

اگر یہ سچ ہے کہ اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا تو کارلائل کے اس سوال کا کیا

جواب ہے؟ کہ "اگر محمد نے تیغ زن سپاہیوں کے زور سے اسلام کو پھیلایا، تو پہلے اُن تیغ زن سپاہیوں کو کس تلوار سے مسلمان بنایا"، اس اصول کی بنا پر تو چاہیئے تھا کہ ان ملکوں میں اسلام کا سایہ بھی نہ پڑتا، جہاں تلوار نے اس کا ساتھ نہیں دیا، حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ ملک حبش پر مسلمانوں نے اُس کے اس احسان کے بدلہ میں کبھی تلوار نہیں اُٹھائی کہ اس نے ایک دفعہ اسلام کے ابتدائی سخت مصیبت کے ایام میں مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی تاہم آج وہاں نصف آبادی مسلمان ہے، افریقہ کے اُن خطوں میں جہاں مسلمان سپاہیوں کا گذر بھی نہیں ہوا تھا، وہاں حلقہ بگوشانِ اسلام کی اتنی بڑی تعداد کیونکر نظر آتی ہے؟ چین پر مسلمانوں نے فوج کشی نہیں کی مگر تین چار کروڑ مسلمان وہاں کہاں سے آگئے، جزائر ملایا مسلمان سلاطین کی تاخت وتاراج سے ہمیشہ محفوظ رہے، مگر آج وہاں چار کروڑ مسلمان کس طرح پیدا ہوگئے، سیام، انام، اور مشرق اقصیٰ کے دوسرے ملکوں اور جزیروں میں جہاں کسی مسلمان سپاہی کا قدم بھی نہیں پہنچا، اسلام کا قدم وہاں کیونکر پہونچ گیا؟ ترک و تاتار نے تو خود مسلمانوں پر تلوار چلائی تھی، اُن پر تلوار کس نے چلائی، اور اُن کو کس نے مسلمان بنایا؟

دوسرے ملکوں کو جانے دو، خود ہندوستان کو لو، یہاں اسلامی فتوحات کا سیلاب درۂ خیبر سے ہو کر آیا، اور پنجاب سے کبھی آسام تک پہونچ گیا، مگر درحقیقت اُن کی قوت کا مرکز صوبہ آگرہ، دہلی، اودھ، بہار، اور دکن رہا، مگر دیکھو کہ یہی وہ مقامات ہیں، جہاں آج بھی مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ کم ہے، یعنی آٹھ سو برس کے بعد بھی وہاں پندرہ فی صدی سے زیادہ نہ بڑھ سکے، برخلاف اس کے جہاں اُن کا اقتدار حکومت زیادہ مضبوط نہ تھا، وہاں وہ حیرت خیز کثرت رکھتے ہیں، بنگال، کشمیر اور سندھ جیسے دور دست اطراف میں اُن کی تعداد اپنے ہمسایوں سے افزوں ہے،

دکن پر مسلمانوں کا ہمیشہ قبضہ رہا بہمنی سلطنت پوری قوت سے مسلط تھی، اُس کے بعد پانچ اسلامی سلطنتیں معاصرانہ قائم ہوئیں، اور اس وقت بھی دکن کے بڑے رقبہ پر ایک اسلامی سلطنت حکمران ہے، تاہم وہاں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ کم ہے،

سب اہل تاریخ جانتے ہیں کہ راجپوتانہ کی ریاستوں کو کلی طور سے کوئی مسلمان بادشاہ زیر نہ کرسکا، انگریزوں کے عہد تک وہاں کے ہندوؤں کے ہاتھوں میں مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ کے لئے تلواریں تھیں، مگر بایں ہمہ وہاں کی کوئی ریاست آج ایسی نہیں، جہاں تھوڑے بہت مسلمان نہ ہوں، سیلون اور برما پر کبھی مسلمانوں نے قبضہ نہیں کیا، مگر وہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے،

ان گذشتہ واقعات کو بھی جانے دو، انگریزی عہد کے "پُرامن" زمانہ کو سامنے لاؤ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی بے نیام "تلوار" ہمیشہ کے لئے کند ہوگئی ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد کی پہلی مردم شماری سے لے کر ۱۹۲۱ء کی مردم شماری تک کی ہر دہ سالہ تعداد کو دیکھو کہ مسلمان ستر اسی برسوں میں پانچ کروڑ سے سات کروڑ کے قریب کیونکر پہونچ گئے، ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد یہاں پانچ کروڑ ستر لاکھ تھی، ۱۹۰۱ء میں ۶ کرور ۲۵ لاکھ ہوگئی، اور ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں ۷ کروڑ ستر لاکھ ہوگئی، تیس برس کے عرصہ میں ایک کروڑ مسلمان کس محمود اور عالمگیر کی تلوار کی فتوحات ہیں، اور آج بھی ملک کے ہر گوشہ میں نئے مسلمانوں کا جو اضافہ ہو رہا ہے، وہ کس جابرانہ قوت کا اثر ہے،

ہمارے آریہ دوستوں کو ہندوستان میں اسلام کی اشاعت پر سخت استعجاب اور حیرت ہے اور اس کے اسباب و وجوہ کے جاننے کے لئے سخت بے چینی ہے، اور بے خبری یا تعصب سے وہ کبھی اس کا بڑا سبب غزنوی کی تلوار کو اور کبھی عالمگیر کے مظالم کو قرار دیتے ہیں، ذیل کے

صفات میں ہم اُن کے سامنے سے حقیقت کا پردہ اُٹھانا چاہتے ہیں تاکہ انھیں معلوم ہو کہ ہندوستان میں اسلام کی ترقی انہی طبعی طریقوں سے ہوئی ہے، جن سے دنیا میں ہر داعی مذہب کی ہوئی ہے، ہوتی ہے اور ہوگی،

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کا سب سے پہلا اور قدیم سبب عربوں اور ہندوؤں کا تجارتی میل جول تھا، عرب تاجروں اور سواحلِ ہند کے سوداگروں میں باہم تعلق نہایت قدیم زمانہ سے قائم تھا، بلکہ اس کا آغاز اسلام سے بہت پہلے ہو چکا تھا، البتہ اسلام کے بعد عرب قوم کی تنظیم نے ان تعلقات کو اور زیادہ مستحکم اور مضبوط کر دیا، اب عرب تاجر پہلے کی طرح صرف رومی مال و اسباب اور عربی مصنوعات و پیداوار ہی ہندوستان میں نہیں لانے لگے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنی سب سے بڑی دولت اور اپنی سب سے قیمتی متاع جو عرصہ میں اس پیغمبر عربیؐ کے وسیلہ سے ان کو ملی تھی، وہ بھی رفتہ رفتہ اپنے ساتھ لانے لگے، اور یہاں سے اب وہ صرف مسالوں، خوشبوؤں، تلواروں، اور کپڑوں کا سامان ہی نہیں لے جانے لگے، بلکہ نو مسلموں کی کچھ تعداد بھی اپنے ساتھ لیجانے لگے، ملیبار، سندھ، گجرات، کچھ، کوکن، سواحل بنگال، اور جزائر ہند کی قوموں نے ان کو فرشتۂ رحمت سمجھ کر قبول کیا، عربی سفرناموں اور جغرافیہ کی کتابوں میں ان مقامات کے نام اور حالات بکثرت مذکور ہیں،

ملیبار میں موپلا اور نوایت انہی عرب تاجروں کی یادگار نسل ہیں، اور یہی ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے سب سے پہلے داعی اور مبلغ ہیں، انھوں نے جس آہستگی، سکون، اور خاموشی سے اس فرض کو انجام دیا عیسائی مشنری اور انگریزی مورخین تک ان کی اس قابلیت کے مداح اور ستائشگر ہیں،

ہندوستان میں اسلام کے داخلہ کا دوسرا راستہ سندھ ہے، سندھ کا علاقہ مدت دراز سے

شاہانِ ایران کا باجگذار تھا، اور جاٹ اور میڈ ی قوم کے لوگ ان کی فوج کے سپاہی تھے، اس کے بعد جب ایران کا تخت مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، تو گذشتہ سلطنت کے ترکہ کے طور پر سندھ کے تعلقات اُن کو ہاتھ آئے، اور اس وقت سے لے کر محمد قاسم فاتح سندھ کے زمانہ تک والی عراق اور رایانِ سندھ کے درمیان صلح وشکست کے واقعات پے درپے پیش آتے رہے، محمد قاسم کے فتوحات کی وسعت جو بلوچستان اور کراچی سے لے کر ملتان تک تھی بہت جلد ختم ہوگئی، یعنی اس نے سو برس کا زمانہ بھی نہیں پایا ہے لیکن اسلام کے مذہبی فتوحات کا سیلاب بدستور جاری رہا،

ہندوستان میں اسلام کی آمد کا تیسرا مشہور راستہ درۂ خیبر کا ہے، جدھر سے وہ اپنی پیدائش سے چار سو برس کے بعد محمود غزنوی کی تیغ خاراشگاف کے سایہ میں داخل ہوا،

ہمارے آریہ دوستوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہندوستان مذہبی حیثیت سے پہلے بھی ویسا ہی تھا جیسا آج ایک زمانہ سے وہ نظر آتا ہے، کہ ویدک دھرم نام ایک برہمنی مذہب کو ہر باشندۂ ہند کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے، عرب میں اسلام کی پیدائش اور ہندوستان میں بودھ مذہب کا زوال ساتھ شروع ہوا، تاہم اس کو مٹتے مٹتے بھی ایک زمانہ لگ گیا، عرب مسلمان جب ملیبار، سیلون، سندھ گجرات اور کوکن وغیرہ میں آئے ہیں، تو اُن کا مقابلہ ویدک دھرم کے ہندوؤں سے نہ تھا، بلکہ بودھ مت اور جین مت کے پیرووں سے تھا، اس وقت ترکستان سے کابل تک اور پنجاب و کشمیر سے سندھ تک بودھ مت اور گجرات وغیرہ ادھر کے ساحلی علاقوں میں جین مت غالب[1] تھا، اور ملیبار اور مدراس کے اطراف میں ویدک دھرم یا برہمنی مذہب کے پیرو لوگ نہ تھے، بلکہ زیادہ تر

---

[1] اس بیان کی تصدیق کے لئے دیکھو الیٹ کی "تاریخ سندھ" ص ۵۰۴ سے ۵۰۷ تک، الیٹ نے عرب سیاح اور جغرافیہ نویسوں کے بیانات کے ساتھ چینی سیاحوں کے بیانات اور دوسرے دلائل یکجا کر دیئے ہیں،

ہندوستان کے پُرانے باشندے تھے، جن کو درۂ خیبر سے آنے والے مغرور برہمنوں نے ہندوستان سے نکال دیا تھا، یا وہ خود سے بھاگ کر دور دست علاقوں میں چلے گئے تھے،

ہندوستان کے حدود میں اسلام کا پہلا قدم جنوبی ہند میں پڑا، بیان کیا جاتا ہے کہ ملیبار کے راجہ نے شق القمر کا معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا یعنی ایک رات اُس کو چاند شق ہو کر دکھائی دیا، اُس نے ادھر اودھر لوگوں کو تحقیق حال کے لئے بھیجا، بالآخر معلوم ہوا کہ عرب دیس میں ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے، اور اُس نے یہ معجزہ دکھایا ہے، راجہ یہ سُن کر مسلمان ہو گیا، اور عرب چلا گیا، ایک روایت میں ہے کہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پہونچا، دوسری روایت میں ہے کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں پہنچا، اور بالآخر یمن میں اُس نے انتقال کیا، اور وہیں مدفون ہوا،

ملیبار اور اس کے اطراف میں جو پُرانی قوم آباد ہے، اُس کو نایر کہتے ہیں، یہ عام ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں، اور ان میں قدیم وحشت اور بربریت کے بہت سے اثرات پائے جاتے ہیں، اور اُن میں کوئی صحیح اور بانظام مذہب ایسا نہ تھا، جو اسلام کا مقابلہ کر سکتا، اُن کو عام برہمن نہایت ذلیل سمجھتے ہیں، اور اُن سے چھوت کرتے ہیں، تاریخ تحفۃ المجاہدین میں ہے کہ اگر کوئی اونچی ذات کا ہندو ان سے چھو جائے، تو جب تک وہ غسل نہ کرے، کھا نہیں سکتا، اگر کھالے تو سردار اس کو اپنی برادری سے نکال کر، نہیں نیچ ذاتوں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا، اور اس کی بقیہ عمر غلامی میں گذرتی تھی، یا وہ بھاگ کر دوسری جگہ چلا جاتا تھا، ایک کنوئیں سے دوسرا پانی نہیں پی سکتا تھا، پاس بیٹھ نہیں سکتا تھا، آج بھی ان اطراف میں بالکل یہی حالت ہے، ہم آپ روز سنتے ہیں کہ مدراس میں برہمن اور نان برہمن کی لڑائیاں برابر جاری ہیں،

اسی طرح یہاں کی عورتوں پر یہ ظلم ہے کہ وہ بیک وقت چند شوہروں کی تابعدار ہیں

اور ہر ایک کی خوش دلی ان کا فرض ہے، اس افسوسناک واقعہ کا امیر خسرو نے ایک شعر میں ذکر کیا ہے، میر جمال الدین حسین انجو نے اپنے لغت میں لفظ ملیبار کے تحت میں ان کی اس رسم کو بیان کیا ہے[۱] غیر قوموں میں شادی کرنے سے بھی ان کو چنداں باک نہ تھا،

الغرض جب مسلمان تاجر ادھر آئے، تو ان مظلوم فرقوں کو اچھا خاصا ایک امن کا سایہ ہاتھ آیا، مسلمان تاجروں نے ان کو نوکر رکھا، اُن سے تعلقات بڑھائے، ان کی عورتوں سے شادیاں کیں، نیچ قوم کے لوگ اور نیز ذات سے خارج لوگوں نے بھاگ بھاگ کر اسلام کے دامن امن میں پناہ لینی شروع کی، اور یہی لوگ جب مسلمان ہو کر دوسرے مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کر لیتے تھے، تو دوسرے ہندو بھی ان کی عزت میں کمی نہیں کرتے تھے، یہ دیکھ کر یہاں کی ادنیٰ قوموں کو اور بھی اسلام کی طرف رغبت ہوئی،

یہی حال اس ملک کا آج بھی ہے، اگر ان اطراف میں دفعۃً پرتگیز نہ پہونچ گئے ہوتے تو یہ پورا علاقہ دائرۂ اسلام میں آگیا ہوتا، لیکن پرتگیزوں نے یہاں آکر اور دریا سے عربوں کی تجارت کا راستہ روک کر اُن کو تباہ کر دیا، اور آبادی کے مسلمانوں کو عرب و مصر سے اپنے تعلقات کے توڑ دینے پر مجبور کر دیا، بالآخر عیسائیوں نے غلبہ پایا، اور اس وقت سے ان مقامات میں اسلام کی جگہ عیسائیت نے لے لی ہے، چنانچہ تمام صوبوں سے زیادہ وہاں عیسائیت کو فروغ ہے، اور روز بروز وہاں صلیب پرستوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، اور ٹراونکور اور کوچین کے علاقوں کے لوگ تو گویا پورے کے پورے عیسائی ہو گئے ہیں،

ذیل میں ہم تحفۃ المجاہدین (جو علاقۂ مالابار کی تنہا تاریخ ہے) کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، جن سے حقیقتِ حال ظاہر ہو گی،

---

[۱] فرشتہ جلد دوم ص ۳۷۲، نو لکشور،

"ہندوستان کے مغربی ساحل کے بندرگاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر کثرت آتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نئے شہر آباد ہوگئے ہیں، اور مسلمانوں کی تجارت سے ان میں آبادی بڑھ گئی ہے، اور مکانات کثرت سے بن گئے ہیں، یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں، باوجودیکہ یہ سردار اور ان کی سپاہ بت پرست ہیں مگر وہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کے شعائر کا بہت کچھ پاس و لحاظ کرتے ہیں،.... بُت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے اس لئے اور تعجب پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں ان تاجروں کی مدد سے اس علاقہ کی آبادی کا کتنا حصہ اسلام کا حلقہ بگوش ہوچکا تھا،

"بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے، کیونکہ اُن کے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہوجانا انہی مسلمان تاجروں کی بود و باش کا نتیجہ ہے،

اس اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان اطراف کے ہندو راجہ کیوں عرب تاجروں کی اس قدر عزت کرتے تھے، اور اُن کے کاروبار میں کوئی دخل نہیں دیتے تھے۔

نائر قوم کے لوگ اپنے ایسے ہم قوموں سے جو بُت پرستی چھوڑ کر مسلمان ہوجاتے ہیں، مزاحمت نہیں کرتے، اور نہ اُن کو دھمکیاں دے کر ڈراتے ہیں، بلکہ وہ اُن کے ساتھ ایسی ہی عزت کا برتاؤ کرتے ہیں، جیسے اور مسلمانوں کے ساتھ خواہ وہ نو مسلم کیسی ہی نیچی ذات سے مسلمان ہوا ہو۔[۱]

---

[۱] تحفۃ المجاہدین کا نسخہ میرے سامنے نہیں، کچھ تو فرشتہ نے ملیبار کی تاریخ میں نقل کیا ہے، مگر یہ

اس اقتباس نے اس راز کا پورا پردہ کھول دیا کہ ان نیچ ذات کے لوگوں کے اسلام لانے کا سبب کیا تھا،

عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے ہندوستان کے جن حصوں کا حال لکھا ہے، وہ وہی ہیں جو عرب تاجروں کے بحری گذرگاہ تھے، وہ خلیج فارس کے بندرگاہوں سے جن میں مشہور سیراف اور بصرہ ہے، سندھ آتے تھے، اور یہاں سے سمندر کے کنارہ کنارہ کوکن اور گجرات کے سواحل سے گذرکر، مدراس کے سواحل پر پہونچتے تھے، اور یہاں سے لنگر اٹھا کر مشرقی بنگال اور آسام کو عبور کرکے چین کی راہ لیتے تھے، راستہ میں مالدیپ، سیلون، جاوا، سماٹرا، سنگاپور، اور دوسرے جزائر کی طرف بھی نکل جاتے تھے، چنانچہ اُن کے یہی تجارتی رہ گذر اُن کی اشاعتِ اسلام کی کوششوں کے مرکز تھے،

سواحلِ ہند پر سندھ سے لیکر حدودِ چین تک وہ متعدد ہندو راجاؤں اور سلطنتوں کے نام گناتے ہیں، مگر یہ نام کچھ تو ان قدیم سلطنتوں اور شہروں کے معدوم یا گمنام ہوجانے سے کچھ عربی میں تلفظ بدل کر، کچھ کتابوں کے نسخوں اور کاتبوں کے ہاتھوں سے کچھ سے کچھ ہوکر بالکل غیر معروف ہوگئے ہیں، ان سلطنتوں یا ملکوں میں سے چند مشہور نام یہ ہیں، جن کو تمام جغرافیہ دانوں اور سیاحوں نے بالاتفاق نقل کیا ہے،

سلطنتِ بلہرا، جرز، طافن، کش بین، اور رہمی، ان کے علاوہ مانڈا اور موگا وغیرہ کے علاقے آتے ہیں، ہندوستان کے مستشرق مورخین مثلاً الیٹ ہاٹ، رینا ووغیرہ نے ان ناموں کی اصل نکالنے میں بڑی دیدہ ریزی کی ہے، ان کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہے: کہ بلہرا کی اصل بلبھ راے ہے جو

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۳) اقتباسات ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب "دعوتِ اسلام" کے صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳ سے یہاں نقل کئے گئے ہیں،

مالوہ کے حکمراں خاندان کا نام تھا، عربوں نے بھی اس کو شاہی لقب ہی بتایا ہے، جزر تو ظاہر کہ گجر یعنی گجرات ہی، طافن کی نسبت ان خصوصیات کی بنا پر جو عربوں نے بیان کی ہیں رنیاؤ کی رائے ہے، کہ وہ اورنگ آباد دکن ہے لیکن طاقن کا وہ حل نہیں کرسکا، میری رائے ہے کہ طافن نہیں، یہ لفظ طاقن ہے، چنانچہ اس کا املا طاکن بھی رنیاؤ نے پایا ہے، اور طاقن اور طاکن، واکھن یا دکن، یا دکھن کی خرابی ہے، کشن بن کو ٹاڈ کچ بھوج (عربی میں ج ش سے بدل جاتی ہی) اور رنیاؤ میسور بتاتا ہے، اور رہمی راج کو مشرقی بنگال قرار دیتا ہے[1]

عربوں نے سب سے زیادہ بلہرا یا بلبھ راے کی سلطنت کا ذکر کیا ہے، اور اس کے دارالسلطنت کا نام وہ مانکیر (مانگیر یا مانگیر) بتاتے ہیں، اور کمکم نام ایک علاقہ بھی وہ اس میں شامل کرتے ہیں، کمکم غالبًا کوکن ہے، سب سے پہلا عرب سیاح جس کا سفرنامہ زمانہ کے دست برد سے محفوظ ہے، وہ عراق کے تاجر سلیمان سیرافی کا ہے، اس نے اپنا سفرنامہ تیسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) کے شروع میں لکھا تھا، فرانسیسی مستشرق ریناڈ (Reinaud) نے اس کو مع فرنچ ترجمہ اور حواشی کے ۱۸۴۵ء میں سلسلۃ التواریخ کے نام سے شائع کیا ہے،

اس نے اپنا سفرنامہ انھی راستوں سے کیا ہے، جن کا ذکر ابھی اوپر گذرا، وہ بیان کرتا ہے کہ ہندوستان اور چین کے لوگ بلا اختلاف یقین رکھتے ہیں کہ دنیا میں چار بادشاہ سب سے بڑے ہیں، سب سے بڑا وہ عرب کے بادشاہ (خلیفۂ بغداد) کو سمجھتے ہیں، کہ وہ سب سے دولت مند، سب سے زیادہ باجاہ و جلال ہے، اور وہ سب سے بڑے مذہب

---

[1] دیکھو الیٹ جلد اول کے تاریخی اور جغرافی ضمیمے، ان ناموں کی تصحیح اور تحقیق ایک دلچسپ موضوع ہے لیکن اس کے لئے اور موقع ہے،

کا بادشاہ ہے، جس سے بڑی کوئی چیز نہیں، اس کے بعد خاقان چین، بعد ازیں قیصر روم، پھر راجہ بلہرا، سوراخ کئے ہوئے کانوں[۵۱] والے آدمیوں کا بادشاہ، راجہ بلہرا، تمام ہندو راجاؤں سے زیادہ معزز ہے، اور گو ہندوستان کا ہر راجہ اپنی سلطنت میں مستقل ہے، مگر اس کی بزرگی کو تسلیم کرتے ہیں، بلہرا کے راجاؤں کی عمریں بڑی ہوتی ہیں، بلہرا کی رعایا کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اس لئے بڑی ہوتی ہیں، کہ وہ عربوں (مسلمانوں) سے محبت رکھتے ہیں، تمام راجاؤں میں راجہ بلہرا سے زیادہ عربوں (مسلمانوں) سے زیادہ محبت رکھنے والا کوئی دوسرا نہیں، اور اسی طرح اس کی رعایا بھی محبت رکھتی ہے[۵۲]،

کیا یہ سمجھا جائے کہ کوکن میں مسلمانوں کی زیادہ بود و باش، اور اسلام کی اشاعت بلہرا کے راجاؤں کی اسی بے تعصبی کا نتیجہ ہے؟ گجرات کے راجہ کی نسبت اس کا بیان ہے کہ "وہ عربوں (مسلمانوں) کا دشمن ہے، با ایں ہمہ وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ عرب کا بادشاہ (خلیفہ بغداد) دنیا میں سب سے بڑا بادشاہ ہے، اور ہندو راجاؤں میں اس سے زیادہ اسلام کا کوئی دشمن نہیں[۵۳]" اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ "طاقن (یا دکھن) کا راجہ بھی عربوں (مسلمانوں) سے راجہ بلہرا ہی کی طرح محبت رکھتا ہے[۵۴]"

"چین والے داڑھی نہیں رکھتے، اور وہ قدرۃً بھی اس سے محروم ہیں، لیکن ہندوؤں کی لمبی لمبی داڑھیاں ہوتی ہیں، مونچھیں بھی نہیں ترشواتے[۵۵]"...........

---

[۵۱] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ادھر کے لوگ کانوں میں بالا پہنتے تھے، [۵۲] سفر نامہ سلیمان تاجر مطبوعہ پیرس ۱۸۱۱ء ص ۲۶ و ۲۷، [۵۳] ایضاً ص ۲۸

[۵۴] ایضاً ص ۲۸ [۵۵] ایضاً ص ۵۵،

[library stamp]

"......چین اور ہندوستان کے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بدوہ (بدھ) کے مجسمے اور بت (بُت کی اصلیت بھی بدھ یعنی بودھ ہے) ان سے باتیں کرتے ہیں، حالانکہ باتیں اُن کے پجاری کرتے ہیں[1]، اور ان دونوں ملکوں کے لوگ جانور کو قتل کر کے کھاتے ہیں، اہلِ چین میں خود اپنا کوئی مذہب نہیں ہے، ان کا مذہب ہندوستان سے آیا ہے، اور وہ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان ہی نے یہ بدھ کے مجسمے اُن کے لئے بنائے ہیں، اور ہندو ہی اصل مذہب والے ہیں، اور یہ دونوں قومیں تناسخ کی قائل ہیں، صرف مذہب کی فروعی باتوں میں ان کا اختلاف ہے[2]......اور جہاں تک علم ہے، ان دونوں قوموں کے لوگوں میں کوئی مسلمان نہیں ہے، اور نہ کوئی عربی بولتا ہے[3]"

اس اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، کہ اسلام کا مقابلہ برہمنی دھرم سے نہیں لیکن بدھ مت سے تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ہندوستان کے جن علاقوں سے وہ گذرا ہے، وہاں کوئی نو مسلم ہندو اس کو نہیں ملا ہے، البتہ عرب تاجروں کی نو آبادیاں اس کو ملتی جاتی ہیں، جیسے دکھن اور کوکن کے علاقوں میں،

عرب تاجروں اور سیاحوں نے جزائرِ ہند میں سے "دیبجات" یعنی دیپ کے جزیروں کا جن سے اُن کی مراد سرندیپ، سندگلدیپ، اور مالدیپ ہیں، بہت ذکر کیا ہے، خصوصاً سرندیپ (سیلون) جہاں ایک پہاڑ پر اُن کے اعتقاد کے مطابق حضرت آدم اور حوا کے نقشِ قدم ہیں، لوگ جو ادھر سے گذرتے تھے، اُن کی زیارت کو جاتے تھے، سلیمان تاجر نے ان جزائر کے اثنائے ذکر میں کسی مسلمان آبادی کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن سلیمان

---

[1] سفرنامہ سلیمان تاجر مطبوعہ پیرس ۱۸۱۱ء ص ۵۵ [2] ایضاً ص ۵۰ [3] ایضاً

کے بعد اس کے سفرنامہ کا ایک اور عرب تاجر ابو زید سیرافی نے تتمہ لکھا ہے، جو تیسری صدی ہجری کے وسط میں غالباً لکھا گیا ہے، اس میں سرندیپ کے بیان میں یہ پوری تصریح ہے، کہ عرب تاجروں نے یہاں آباد ہونا شروع کر دیا ہے[۱]

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی کے شروع میں بزرگ بن شہریار ایک ایرانی مسلمان جہاز ران نے سالہا سال کے بحری سفروں کے بعد خود اپنے چشم دید اور دوسرے جہاز رانوں سے سنے ہوئے واقعات عجائب الہند کے نام سے قلم بند کئے ہیں، اور مطبع بریل لیڈن نے اس کو چھاپا ہے، اس کتاب میں جا بجا مسلمانوں کی نو آبادیوں کے تذکرے ملتے ہیں، ایک ہندو جہاز ران کا حال ملتا ہے، جو مسلم تھا، اور اسی جہاز رانی سے اس نے بڑی دولت کمائی تھی، اس نے حج کیا تھا[۲]، اتنے زمانہ میں زیمور یعنی ملیبار و کالی کٹ کے راجہ کے ملک میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہو گئی تھی کہ ان کے لئے ایک مسلمان قاضی جس کو ہنرمن کہتے تھے، راجہ کی طرف سے منتخب[۳] کیا جاتا تھا،

جاوا میں بھی ہم کو اس عہد میں مسلمان تاجر ملتے ہیں، اور اس طرح کہ وہاں کے راجہ کے دربار میں مسلمان درباری رسوم و آداب سے معاف کئے جاتے ہیں[۴]، سندگا پور کے راجہ کے دربار میں بھی مسلمان ملتے ہیں[۵]، بمبئی کے قریب بھی مسلمان ملتے ہیں[۶]، ناگیر کے علاقہ میں ایک مسلمان کو ایک درخت ملتا ہے، جس کے پتوں پر کلمۂ طیبہ لکھا ہوتا ہے[۷]، پتوں پر لکھا ہو یا نہ ہو، مگر اس سے دلوں پر کلمۂ طیبہ کا آغاز نقش تو ثابت ہوتا ہے، انڈمان کے جزیرہ میں حضرت سلیمانؑ کا مقبرہ دکھائی دیتا ہے[۸]

---

[۱] تتمہ سفرنامہ سلیمان تاجر۔ [۲] عجائب الہند ص ۱۰۔ [۳] ایضاً ص ۱۴۳۔ [۴] ایضاً ص ۱۵۴۔ [۵] ایضاً ص ۱۵۷۔ [۶] ایضاً ص ۱۵۲۔ [۷] ایضاً۔ [۸] عجائب الہند ص ۱۳۴۔

عجائب الہند کی روایت کے مطابق تو ہندوستان کے جزیروں میں سے سب سے پہلے سرندیپ میں اسلام کا نور چمکا، عرب جغرافیہ نویسوں نے اس جزیرہ کے لوگوں کے جو مذہبی حالات لکھے ہیں، اُن سے یہ قطعاً ثابت ہوتا ہے، کہ یہاں کے باشندے بودھ مت کے پیرو تھے، بزرگ بن شہریار لکھتا ہے، کہ ہندوستان کے پجاریوں، عابدوں اور زاہدوں (یعنی جوگیوں اور بھکشوؤں) کی کئی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک بیکور (بیکوڑا) ہیں، اور اُن کی اصل سرندیپ سے ہے، اور یہ مسلمانوں سے بہت محبت رکھتے ہیں، اور اُن کی طرف اُن کا میلان بہت ہے، اور گرمی میں یہ ننگے رہتے ہیں، صرف چند انگل کی دھجی کمر میں باندھتے ہیں، اور جاڑوں میں چٹائی اوڑھتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو کپڑے پہنتے ہیں، اُن کے یہ کپڑے مختلف رنگ برنگ کے ٹکڑوں کو سی کر بنائے جاتے ہیں، اور اس سے اُن کا مقصود اپنا امتیاز اور شہرت ہے، اور بدن پر مُردوں کی ہڈیاں جلا کر اُس کی راکھ ملتے ہیں، اور داڑھی کے بال منڈاتے ہیں لیکن بدن کے اور حصوں کے بال ویسے ہی چھوڑ دیتے ہیں، اور گلے میں کسی مردہ کی کھوپڑی لٹکائے رہتے ہیں، اور غیرت اور تواضع کے لئے اسی میں کھاتے اور پیتے ہیں،

"اہلِ سرندیپ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا حال (غالباً عرب تاجروں کی زبانی) معلوم ہوا تو انھوں نے اپنا ایک ہشیار آدمی تحقیق کی غرض سے عرب روانہ کیا، جب وہ وہاں پہنچا تو حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، حضرت عمرؓ نے اُس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال بتایا، اور باتیں بتائیں، وہ لوٹ کر آیا، تو مکران (قریب بلوچستان) میں اس کا انتقال ہو گیا، اس کے ساتھ اس کا رفیقِ سفر غلام تھا، وہ صحیح سلامت سرندیپ پہونچا، اور وہاں کے لوگوں کو سب حال سنایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضرت ابوبکرؓ کی جو کیفیت سُنی تھی، وہ بتائی، اور حضرت عمرؓ کے واقعات ان کو سُنائے اور

منجملہ اُن کے یہ بھی کہا کہ وہ بھی پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں، مسجد میں سوتے ہیں، اور نہایت خاکسارانہ زندگی بسر کرتے ہیں، اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو یہ تواضع اور محبت کرتے، اور یہ میلان خاطر رکھتے ہیں، وہ اسی سبب سے ہے[۱]

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بدھ مت کے پیرؤں کو اسلام کے ساتھ ایک خاص مناسبت پیدا ہوگئی تھی، اور جس چیز کو وہ تلاش کرتے تھے، وہ ان کو اس مذہب میں ملتی تھی،

اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ عرب تاجروں کے ساتھ درویشوں کی کوششیں بھی شامل ہوگئی تھیں، چنانچہ اُن کی کوشش سے سراندیپ کے بعد اسلام کا نور ملیبار کے علاقہ میں چمکتا نظر آتا ہے، تاریخ فرشتہ میں تحفۃ المجاہدین کے حوالہ سے یہ قصہ منقول ہے، کہ ہجرت کی دو صدیاں گذر چکی تھیں، ہر مذہب کے تاجروں اور سوداگروں کا یہاں گذر تھا، کہ عرب وعجم کے چند مسلمان فقراء کا گذر ہوا، جو سراندیپ حضرت آدم وحوا کی قدمگاہ کی زیارت کو جارہے تھے، باد مخالف کی جھپٹ سے وہ ملیبار کے ساحل پر پہونچ گئے، شہر کدنکلور (گرانگانور) میں جاکر وہ اترے، وہاں کا راجہ جس کو سامری (زمورن) کہتے ہیں، وہ نہایت عقلمند تھا، وہ ان بزرگوں کی صحبت سے مستفید ہوا، اور ہر قسم کی گفت گو درمیان میں آئی، منجملہ اُن کے مذہب کی بحث بھی آئی، ان درویشوں نے اپنا مذہب اسلام بتایا، زمورن نے کہا کہ ہمارے ملک میں جو یہود ونصاریٰ اور ہنود ہیں، جو تمہارے مذہب کے مخالف ہیں، اور دنیا کی سیاحت کئے ہوئے ہیں، ان سے سُنا ہے کہ عرب وعجم اور ترکوں کے ملکوں میں یہ مذہب پوری طرح پھیلا ہوا ہے لیکن اب تک مجھ کو مسلمانوں کی صحبت نہیں ملی ہے، اپنے پیغمبر کا کچھ احوال بیان کرو، ایک درویش نے جو علم وصلاح سے آراستہ تھا، تقریر شروع کی، اور آپ کے معجزات کو اس خوبی سے بیان کیا کہ راجہ متاثر ہوگیا، اور کلمۂ طیبہ ادا کرکے

---

[۱] عجائب الہند مطبوعہ لیڈن صفحہ ۱۵۶ - ۱۵۷،

مسلمان ہوگیا لیکن اپنے مذہب کو مخفی رکھا، اور مسلمانوں کو بھی تاکید کی کہ وہ اس راز کو فاش نہ کریں، اور یہ درخواست کی کہ سرندیپ سے واپسی میں پھر ادھر ہی سے تشریف لیجائیے، واپسی میں راجہ بھی حیلہ سے درویشوں کے ساتھ چھپ کر روانہ ہوگیا، اور ملک کو اپنے وزیروں کے سپرد کرگیا، راجہ عرب پہونچ کر مرگیا، اور مرتے وقت وصیت کی کہ چونکہ ہم سب کا مقصود ملیبار میں دین اسلام کی اشاعت ہے، اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ تجارت اور بیوپار کے ذریعہ سے وہاں آمدورفت کیجئے، اور وہاں قیام کیجئے، مکانات بنائیے تاکہ لوگ دین محمدی کی طرف رجوع کریں، اور اس کے بعد اُس نے اپنے مُہری خطوط اپنی زبان میں لکھکر حوالہ کئے کہ ملیبار جاکر وہاں کے حاکموں کو دکھائیے، چنانچہ یہ لوگ ملیبار واپس آئے، یہاں کا حاکم خط دیکھکر مہربان ہوا، اور یہاں اسلام کی اشاعت کی پہلے کدنگلور (کرانگانور) میں مسجد بنائی، پھر کولم میں مسجد بنی، پھر تو بائی، سدادی، گنذآرید(؟)، جالیٹ (کالی کٹ) باکنو، منگلور اور کانجرکوٹ میں مسجدیں بنائیں اور یہاں مسلمانوں کی عزت ہونے لگی،"[۵۱]

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی کے شروع میں مشہور مورخ اور سیاح مسعودی بغداد سے ہندوستان آیا تھا،[۵۲] وہ ہندوستان کے جنوبی ساحلی شہروں میں کھنبایت، تھانہ، گجرات، یا دکھن، راجہ بلہرا، یا بلہب رائے کی سلطنت اور اُس کے دارالسلطنت مانکیر اور زمورزمین لا (یا ملیبار) کے راجہ کا ذکر کرتا ہے مسلمانوں کی محبت و عداوت کی حیثیت سے وہ ہندو راجاؤں کی نسبت وہی خیالات کسی قدر اضافہ کے ساتھ بیان کرتا ہے، جن کو سلیمان تاجر اپنے سفرنامہ میں اُس سے ساڑھے چھپن برس پیشتر ظاہر کرچکا تھا، اس عرصہ میں ان علاقوں میں اسلام بہت

---

[۵۱] تاریخ فرشتہ بحوالہ تحفۃ المجاہدین جلد ۲ ص ۳۷۰، نولکشور، [۵۲] مروج الذہب مسعودی ج ۱ ص ۳۷۶، طبع پیرس،

کچھ آگے بڑھ گیا تھا،

مسعودی کی شہادت ہے کہ سندھ اور ہند کے تمام راجاؤں میں سوا راجہ بلہرا کے راج کی طرح اور کسی راج میں مسلمانوں کی اتنی عزت نہیں، اسلام اس راجہ کی حکومت میں معزز اور محفوظ ہے، اور ان کے ملک میں مسلمانوں کی مسجدیں اور جامع مسجدیں بنی ہوئی ہیں، جو آباد ہیں، یہاں کے بادشاہ چالیس چالیس اور پچاس پچاس برس حکومت کرتے ہیں، یہاں کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اسی عدل اور مسلمانوں کی عزت کرنے کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہیں[51] گجرات کا راجہ مسلمانوں سے اب تک وہی نفرت رکھتا ہے، دکھن کے راج میں مسلمانوں کی عزت ویسی ہی ہے، وہ راجہ صلح پسند ہے[52]

مسعودی سنہ ۳۰۴ھ میں زیمور کے ملک میں اپنا آنا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ "یہاں خالص اور مخلوط النسل مسلمانوں کی جن کو یہاں "بیسر" کہتے ہیں، دس ہزار کی آبادی ہے، یہ سیراف، عمان، بصرہ، اور بغداد اور دوسرے شہروں کے وہ لوگ ہیں، جو یہاں آباد ہوگئے ہیں، اور یہیں انھوں نے شادی بیاہ کر لیا ہے، اور یہیں سکونت اختیار کر لی ہے، اور ان میں بعض نامی تاجر ہیں، جیسے موسیٰ بن اسحاق، اور آج کل یہاں مسلمانوں کا رئیس (ہنرمند) ابوسعید معروف ابن زکریا ہے، اور بیسر وہ مسلمان کہلاتے ہیں، جو ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں[53]"

اس اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کی تعداد عہد بعہد ترقی کرتی جاتی ہے، اور اُن کی ترقی کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسی ملک کے لوگوں میں شادی بیاہ شروع کر دیا ہے، ابن سعید مغربی پانچویں صدی میں ملک مراکش میں بیٹھ کر جغرافیہ فلکی کی ایک کتاب ترتیب دیتا ہے، اس کے بیچ بیچ میں، کہیں کہیں جنوبی ہندوستان کے شہروں کے نام لیتا ہے،

---

[51] مروج الذہب مسعودی ج ۱ ص ۳۰۲، [52] ایضاً ص ۳۰۴، [53] ایضاً جلد ۲ ص ۸۶،

اور ان شہروں کی اسلامی آبادیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمان گو پنجاب میں داخل ہو گئے ہیں، لیکن بقیہ ہندوستان اب تک ان کے حملوں سے سرتا سر محفوظ ہے، تاہم ابن سعید مغربی کہتا ہے کہ "تھانہ گجرات کا آخری شہر ہے، اور ہندوستان کے اس ساحل پر سب کفار آباد ہیں، جو بتوں کو پوجتے ہیں، لیکن وہ اپنے ساتھ مسلمانوں کو بھی بساتے ہیں" کھنبایت (گجرات) کے متعلق ابن سعید کہتا ہے کہ "وہ ہندوستان کے ساحلی شہروں میں سے ہے، جہاں تاجر جایا کرتے ہیں، اور وہاں مسلمان آباد ہیں" کولم (مدراس) کے متعلق بیان کرتا ہے کہ "کولم سالے والوں ملک کا آخری شہر ہے، سمندر کے کنارے واقع ہے، یہاں مسلمانوں کا ایک محلہ ہے، اور اُن کی ایک جامع مسجد بھی ہے"

اس بیان کے کم و بیش سوا سو برس کے بعد ابن بطوطہ ہندوستان آتا ہے، اور محمد تغلق سلطان دہلی کی طرف سے سفیر ہو کر چین روانہ ہوتا ہے، وہ دہلی سے دولت آباد (دکن) ہو کر کرناٹک (معبر) کی راہ سے ملیبار، کولم اور کالی کٹ پہنچتا ہے، جہاں سے اس زمانہ میں جہازات چین ہو کر روانہ ہوا کرتے تھے، جہاز تباہ ہوتا ہے، اور ابن بطوطہ واپس آکر جزائر مالدیپ، سراندیپ (سیلون) اور جاوہ وغیرہ کی سیر کرتا ہے، اور پھر ملیبار آکر خشکی سے کنارہ کنارہ بنگال سے آسام ہو کر چین چلا جاتا ہے،

ابن بطوطہ ان تمام راستوں میں جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادیاں ملتی ہیں، یا مسلمان افراد سے ملاقاتیں ہوتی ہیں، ان سب کا تذکرہ کرتا ہے، لیکن اب یہ صاف نظر آتا ہے، کہ مسلمان تاجروں کے ساتھ ساتھ مسلمان صوفیہ اور فقراء کے دستے بھی ملتے جاتے ہیں، اور چونکہ ان فقراء کی ظاہری حالت ہندو جوگیوں اور بدھ بھکشوؤں سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے،

---

[۱] تقویم البلدان ابوالفداء مطبوعہ پیرس ۱۸۴۰ء ص ۳۵۹، [۲] ایضاً ص ۳۵۰، [۳] ایضاً ص ۳۶۱

اس لئے عوام میں اُن کے ساتھ گرویدگی اور عقیدت نمایاں ہے، اور اس کا اثر اسلام کی اشاعت پر جو کچھ پڑ سکتا تھا وہ ظاہر ہے،

اس وقت سلطان دہلی کی حکومت اگرچہ گجرات، کرناٹک اور دکھن تک پہونچ چکی تھی، تاہم ابھی ساحلی علاقوں میں اثر بہت کم تھا، اور جنوبی صوبوں میں ہندو امرا، بدستور فرماں روا تھے، کبھی کبھی جب وہ مجبور ہوتے تھے، تو سالانہ خراج ادا کر دیتے تھے، مگر عرب تاجر اور عجمی صوفیہ برابر اپنے کاروبار میں لگے رہتے تھے، ابن بطوطہ دولت آباد اور ساگر ہو کر کھنبایت پہنچا ہے، گو یہ بندرگاہ سلطنت دہلی سے اب ملحق پاتا ہے، مگر یہاں کی تمام تجارت، کاروبار اور اثر و اقتدار تاجروں اور جہازرانوں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے، ایک نو مسلم ہندو الیاس نامی ناخدا ہے مسلمانوں کی ہر طرف کثرت ہے، تاجروں کی بنائی ہوئی مسجدیں اور صوفیہ کی خانقاہیں آباد ہیں، کہتا ہے کہ "عمارات اور مساجد کی حیثیت سے یہ بہترین شہر ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے اکثر باشندے دوسرے ملکوں کے تاجر ہیں، تو وہ ہمیشہ عمدہ مکانات اور خوبصورت مسجدیں بناتے رہتے ہیں، اور اس میں باہم مسابقت کرتے ہیں، عالیشان عمارتوں میں شریف سامری کا محل ہے، اس کے پہلو میں عظیم الشان مسجد ہے، اور ملک التجار گازرونی کا مکان ہے، اور اس کے پہلو میں بھی مسجد ہے،..... شہر میں حاجی ناصر دیار بکری صوفی کی خانقاہ ہے، دوسری خواجہ اسحاق کی ہے، جہاں لنگر قائم ہے[1]،

اس شہر میں اسلام کی آبادی اور ترقی کے اس معیار کو دیکھو جو اب اس سوا سو برس میں اس کو حاصل ہو گئی، اب ہندو نو مسلم بھی جہازراں بن کر دہی اعزاز و دولت حاصل کر رہے ہیں، خانقاہیں آباد ہیں، اور لنگر خانے جاری ہیں، ابن بطوطہ کھنبایت کے بعد کاوی اور گندھار پہنچا ہے جہاں

---

[1] ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۲۸ - ۱۲۹، مطبوعہ خیریہ مصر،

ایک ہندو راجہ جالنسی حکمراں ہے؟ تاہم مسلمان یہاں آباد ہیں، اور بعض راجہ کے دربار میں داخل ہیں، یہاں کا ناخدا ابراہیم چھ جہازوں کا مالک ہے، یہاں ہمارا مسافر جاگر نامی جہاز پر سوار ہوتا ہے فوقہ (یا گوگا) نام شہر میں داخل ہوتا ہے، یہاں کا راجہ ڈنگول ہندو ہے، تاہم یہاں مسلمان ملتے ہیں، ایک مسجد ہے جو حضرت خضر کی طرف منسوب ہے، اور حیدری فقرار کی ایک جماعت مع اپنے شیخ کے یہاں گوشہ نشین ہے، یہاں سے سنگاپور پہنچتا ہے، دیکھتا ہے کہ یہاں ہندو راجہ ہریب کی ماتحتی میں ایک اسلامی ریاست سلطان جمال الدین ہنوری کی قائم ہے مسلمانوں کا آباد کردہ شہر رونق پذیر ہے، اور عظیم الشان جامع مسجد ہے، جو بغدادی مسجدوں کا مقابلہ کر رہی ہے یہ ناخدا حسن کی بنوائی ہوئی تھی، اور سلطان جمال الدین ہنوری اسی ناخدا کا بیٹا تھا،

جزیرہ کے پاس ایک چھوٹا سا جزیرہ اور ہے، ہمارا سیاح جب وہاں قدم رکھتا ہے کیا دیکھتا ہے کہ ایک بتخانہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ایک جوگی مراقبہ میں مصروف ہے، آنکھیں بند ہیں، ابن بطوطہ نذر پیش کرتا ہے، وہ قبول نہیں کرتا، اور الٹا خود کئی اشرفیاں اس کو دیتا ہے، اور ایک اونٹ کے بالوں کی بنی ہوئی عبا نذر کرتا ہے، اور ابن بطوطہ کے ہاتھ سے تسبیح لے کر اس کو ملتا اور سونگھتا ہے، اور پھر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر اشارہ کرتا ہے، اور پھر قبلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں دیدہ سیاح ان اشاروں سے پالیتا ہے، کہ یہ جوگی کے بھیس میں کسی مسلم صوفی کی روح ہے، جو باشندگان جزیرہ کے خوف سے اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے ہے، چلتے وقت رازدان سیاح جوگی کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے، اس کے رفقائے سفر معترض ہوتے ہیں، اس پر جوگی ابن بطوطہ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے، اس کو چومتا ہے، اور مسکرا دیتا ہے، اور واپسی کا اشارہ کرتا ہے، اور چپکے سے چند اور اشرفیاں ہدیہ دیتا ہے، باہر آکر ابن بطوطہ جوگی کے راز کو اپنے ہمراہیوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ مسلمان ہے، [1]

---

[1] ابن بطوطہ جلد ۲ ص ۱۳۱ و ۱۳۲ مطبوعہ مطبع خیریہ مصر،

سنگاپور ہی لوٹ کر وہ ملیبار آتا ہے، دیکھتا ہے کہ اس ملک میں چھوٹے بڑے بارہ[۱] راجہ حکومت کرتے ہیں، ملک آباد ہے، ہر طرح امن وامان ہے، مسلمانوں کی بڑی عزت ہے، مگر ہندو مسلمانوں کے ساتھ کھاتے نہیں، اور نہ اپنے گھروں کے اندر آنے دیتے ہیں، راستہ میں دیکھتے ہیں تو ہٹ جاتے ہیں، مسلمان مسافروں کے لئے ہر جگہ سرائیں ہیں، ہر جگہ مسلمانوں کی آبادیاں ہیں، جن شہر میں سب سے پہلے وہ داخل ہوا، اس کا نام ابی سرور بتاتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ ساحل پر بندرگاہ ہے، اور یہاں کے مسلمان چودھری کا نام شیخ جمعہ ہے، یہ دولت مند اور بڑا مخیر ہے، اپنی تمام دولت غریبوں اور محتاجوں پر صرف کرتا ہے، آگے بڑھ کر پاکنور میں وہ داخل ہوتا ہے، کہتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی ایک جماعت ہے، یہاں کے مسلمان چودھری کا نام حسین سلاط ہے، اور یہاں قاضی اور خطیب بھی ہیں، اور حسین کی بنوائی ہوئی ایک جامع مسجد بھی ہے، اور یہاں کے راجہ کا نام باسدیو ہے، اس کے پاس تیس جنگی جہاز ہیں، اور ان کا کپتان مسلمان ہے، اس کے بعد وہ منگرور پہنچتا ہے، یہاں فارس اور یمن کے مسلمان تاجر وں کو ملتے ہیں، یہاں کے راجہ کا نام رام دیو بتاتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس شہر میں چار ہزار مسلمان ہیں، عام رعایا گو ان کے خلاف ہے، مگر راجہ تجارت کی مصلحت سے اُن سے صلح رکھتا ہے، یہاں کے مسلمان قاضی کا نام بدرالدین کرنائی ہے، اور وہ یہاں درس بھی دیتا ہے،

بعد ازیں شہر ہیلی میں داخل ہوتا ہے، یہاں ایک عالیشان جامع مسجد ہے، جس کی وجہ سے یہ شہر ہندوؤں اور مسلمانوں کے نزدیک متبرک ہے، جہاز والے اس کی نذریں مانتے ہیں، خطیب حسین اس کا متولی ہے، اور حسین وزان یہاں کا چودھری ہے، اس مسجد میں طالب علموں کی ایک جماعت ہے، جن کو مسجد کے خزانہ سے وظیفے ملتے ہیں، اور اس کے متعلق ایک مطبخ ہے، جس سے مسافروں کو اور غریب مسلمانوں کو کھانا ملتا ہے، یہاں مقدشوا (افریقہ) کے ایک درویش سے

---

[۱] ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۱ و ۱۳۲ مطبوعہ مطبع خیریہ مصر،

ملاقات ہوئی، جو ہمیشہ روزہ رکھتے ہیں، پھر یہاں سے جرپٹن یا گرپٹن پہنچا، یہاں بغداد کے ایک عالم سے ملاقات ہوئی، ان کا ایک بھائی یہاں بڑا تاجر تھا، یہاں کے راجہ کا نام کویل ہے یہاں سے فارس عمان اور یمن کو جہازات جاتے ہیں، یہاں سے وہ پٹن گیا، یہ بھی راجہ کویل ہی کی علداری میں ہے، راجہ کویل کے باپ کی بنوائی ہوئی ایک جامع مسجد ہے، اور ایک عالیشان تالاب بھی ہے، جس میں مسلمان نہاتے اور وضو کرتے ہیں، یہ تالاب راجہ کویل ہی کے بزرگوں میں سے کسی نے بنوایا ہے، اور وہ مسلمان تھا، اس کے اسلام کا ایک عجیب قصہ لوگوں نے سنایا، اس جامع مسجد میں ایک خاص قسم کا درخت ہے، کہتے ہیں کہ ہر موسم خزاں میں اس سے ایک پتہ گرتا ہے، جس پر دست قدرت سے لا الہ الا اللہ لکھا ہوتا ہے، یہ پتہ جب گرتا ہے، تو آدھا مسلمان لے لیتے ہیں، اور آدھا ہندو راجہ کے خزانہ میں جمع ہوتا ہے، اور سخت بیماریوں میں اس سے شفا حاصل ہوتی ہے، راجہ مذکور یہ کرامت دیکھ کر مسلمان ہو گیا، اور اس پر ایک جامع مسجد اور تالاب بنوا دیا، اس کے بعد راجہ کی اولاد مسلمان نہ ہوئی، اور اس نے اس درخت کو اکھڑوا دیا، خدا کی قدرت اس کے بعد یہ درخت پہلے سے بھی زیادہ شاندار طریقہ سے اُگ آیا، اور راجہ فوراً مر گیا،

یہاں سے یہ پٹن پہنچا، یہ بھی بندرگاہ ہے، اور سمندر کے کنارے ایک مسجد ہے، جس میں مسلمان ٹھہرتے ہیں، کیونکہ یہاں کوئی مسلمان نہیں، یہاں کے باشندے برہمن ہیں، جو ہندوؤں میں عالی مرتبہ ہیں، اور وہ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں، اور اسی لئے یہاں مسلمان نہیں ہیں، یہ ایک جامع مسجد بھی جو باقی ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ ایک برہمن نے اس کی چھت خراب کر دی تو اس کے گھر میں آگ لگ گئی، جس میں وہ خود اس کی اولاد اور گھر کا تمام اثاثہ جل گیا،

اس وقت سے ہندو اس مسجد کو متبرک سمجھتے ہیں، اور اُس کو ڈر سے نہیں چھوتے، اس کے بعد یہاں سے نکل کر پندرینا پہنچا، یہاں مسلمانوں کے تین محلے ہیں، اور ہر محلہ میں ایک مسجد ہے، اور ساحل پر جامع مسجد ہے، اور عجب پُر بہار ہے، یہاں کا قاضی اور خطیب عمان کا ایک آدمی ہے، اُس کا بھائی بڑا فاضل ہے،

اس کے بعد کالی کٹ میں داخل ہوا، یہاں کا راجہ ہندو ہے، اور سامری (زمورن) نام ہے، یہ دنیا کے بڑے بندرگاہوں میں سے ہے، چین، جاوا، سیلون، مالدیپ، یمن، اور فارس کے جہازات آتے ہیں، یہاں کا ملک التجار ابراہیم شاہ بندر ہے، یہ بحرین کا باشندہ ہے، قاضی کا نام فخرالدین ہے، اور یہاں کی خانقاہ کے سجادہ نشین شیخ شہاب الدین گازرونی ہیں، جن کی فتوحات کی کوئی حد نہیں،[۱]

کالی کٹ سے کولم جانا ہوتا ہے، یہاں مسلمان تاجروں کی بڑی جماعت ملتی ہے، علماء بھی ہیں، اور مسلمانوں کا رئیس محمد شاہ بندر ہے، ایک تاجر کی بنوائی ہوئی ایک جامع مسجد بھی ہے، یہاں مسلمان معزز اور محترم ہیں، یہاں کے راجہ کا نام تیر دری ہے، یہ مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا ہے، اور اُن کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آرہا ہے،

سیلون (سرندیپ) اور مالدیپ کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں، اب ان پر چند صدیاں گذر چکی ہیں، ہمارا سیاح اب مالدیپ پہنچا ہے، دیکھتا ہے کہ ان جزیروں میں صرف مسلمان ہی مسلمان ہیں، اور وہ نہایت نیک اور پابند مذہب اور باایمان ہیں، یہاں ایک عورت سلطانہ خدیجہ بنت صلاح صالح بنگالی حکمران ہے، یہاں کے لوگوں کے مسلمان ہو جانے کا واقعہ یہ ہے، کہ پہلے یہ سب کافر تھے، یہاں ہر سال سمندر سے ایک عجیب بلا آتی تھی، اس کا دستور تھا کہ ایک کنواری لڑکی بلیدان دی جاتی تھی، ایک دفعہ یہ واقعہ پیش آیا، لڑکیوں پر قرعہ پڑا،

---

[۱] یہ تمام اقتباسات ابن بطوطہ جلد ۲ ص ۱۳۴، ۱۴۰، ۱۴۰ میں ہیں، ص ۱۴۳،

ایک بڑھیا کی لڑکی کا نام نکلا، بڑھیا سخت بے قرار ہوئی، اتفاق سے اس بڑھیا کے یہاں بربر کا ایک مسلمان ٹھہرا تھا، وہ حافظِ قرآن تھا، مسلمان نے کہا گھبراؤ نہیں، میں اس کی تدبیر کرتا ہوں اس رات کو وہ مسلمان، عورت بن کر بت خانہ میں گیا، لوگ صبح کو گئے کہ اس کی لاش اٹھالائیں دیکھا کہ وہ زندہ تلاوتِ قرآن کر رہا ہے، یہ کرامت دیکھ کر لوگ سخت متحیر ہوئے، بادشاہ کو خبر ہوئی، وہ بھی آیا، سب نے اسلام قبول کیا، اور اس نے وہاں رہ کر سب کو اسلام کے آداب و احکام کی مالکی مذہب کے مطابق تعلیم دی، ایمان کی جامع مسجد پر اب تک یہ عبارت کتبہ میں منقوش ہے کہ سلطان احمد شنورازہ، ابوالبرکات بربری مغربی کے ہاتھ پر اسلام لایا۔[1]

یہ قصہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ جزیرہ مالدیپ آج بھی مسلمانوں سے آباد ہے اور ایک مسلمان سلطان زیرِ حفاظت برطانیہ حکمراں ہے، ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں یہاں مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار تھی، یہاں کے مسلمانوں میں عربی النسل بکثرت ہیں، اور بودھ مت کے نومسلموں کی بھی تعداد کثیر ہے، جو کہ اصلی باشندے ہیں، اسی کے قریب سرندیپ جس کو سیلون اور لنکا بھی کہتے ہیں، واقع ہے، یہاں بھی اسلام نے اپنا پورا دخل پیدا کر لیا، ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں یہاں دولاکھ مسلمان تھے[2] یہاں اسلام ابھی اپنی پُرامن رفتار ترقی سے چل رہا تھا کہ زمانہ نے تاریخ کا ورق الٹ دیا، اور مسلمانوں کا زوال اور مسیحی یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا، پندرہویں صدی عیسوی میں پرتگیزوں نے اور پھر ڈچوں نے آکر اسلام کا بیڑا غرق کر دیا، اور اس وقت سے ان جزائر میں اور جنوبی ہند میں اسلام کی جگہ عیسائیت نے لے لی، اور وہ منظر آج بھی آپ کے سامنے ہے۔

صفحاتِ بالا میں ہندوستان میں اسلام کے داخلہ کے تین راستوں میں سے ایک راستہ کا نقشہ دکھایا گیا ہے، اور صدی بصدی اس کی ترقی کی تصویر کھینچ دی گئی ہے، دیکھو کہ اس تصویر

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۰۵ تا ۲۰۶ [2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سیلون اور مالدیپ کا مضمون۔

میں خون کی سُرخی کہیں نہیں جھلکتی، بلکہ اسلام اپنی سادگی، مساوات اور حقانیت سے اپنا راستہ خود صاف کرتا گیا ہے، اور نیچ ذات اور معمولی لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرتا ہوا بادشاہوں اور راجاؤں کے قلوب تک پر قابض ہو گیا ہے، ان عرب تاجروں اور درویشوں کے ہاتھوں میں محمود اور عالمگیر کی تلوار نہ تھی، اُن کے ذریعہ سے جو اشاعت اسلام ان اطراف میں ہوئی، اس کے طریقے حسب ذیل تھے،

۱۔ عرب تاجروں نے خود آکر اپنی نو آبادیاں قائم کیں، یہاں کی نو مسلم عورتوں سے انھوں نے شادیاں کیں،

۲۔ نیچ ذات کے ہندو اور نابرہمن جو برہمنوں کے دباؤ، ظلم اور ترفع اور غرور سے نالاں تھے، انھوں نے اسلام میں آکر عزت پائی،

۳۔ تاجروں کی فیاضی اور انسانیت نوازی نے غریبوں اور محتاجوں کو اپنے دامن میں پناہ دی،

۴۔ جو لوگ ذرہ ذرہ سی باتوں پر اپنی ذات سے خارج کر دیئے جاتے تھے، وہ اسلام کی برادری میں داخل ہوتے گئے،

۵۔ بہت سے لوگ اپنے بچوں کو غربت کے مارے عربوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے، وہ اُن کو لیکر اسلام کی تربیت دے کر اپنی اولاد کی طرح پال کر جوان کرتے تھے،

۶۔ اسلام کی روحانی طاقت کی عجیب و غریب نشانیاں اُن کی نگاہوں سے گذریں جس نے اُن کو اسلام کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا،

۷۔ علما اور درویشوں نے اپنی روحانی کشش کے جلوے دکھائے،

ہندوستان میں اسلام کے داخلہ کا دوسرا راستہ سندھ ہے پہلی صدی ہجری یا ساتویں صدی عیسوی میں شمالی

ہندوستان پر تین سلطنتیں محیط تھیں، سندھ جس کی ایک حد سمندر تھی، اور دوسری حد بلوچستان، اور تیسری پنجاب کے اندر ملتان کے بعد تک، اور چوتھی موجودہ صوبہ متحدہ کے کنارہ تک ملتان کے کچھ بعد پنجاب کا جو علاقہ رہ جاتا تھا، اس کا نام عربوں کی اصطلاح میں چھوٹا کشمیر تھا، اور اس کے بعد موجودہ بڑا کشمیر تھا، اور ادھر موجودہ صوبہ متحدہ میں قنوج (اودھ) کی سلطنت شروع ہو جاتی تھی، غرض اس حد بندی سے یہ واضح کرنا ہے کہ سندھ کا علاقہ اس زمانہ میں موجودہ سندھ سے بہت وسیع تھا، عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے اپنے زمانہ کے سندھ کی حد بندی یہ کی ہے کہ اس کے ایک طرف سمندر، دوسری طرف بلوچستان، تیسری طرف کشمیر، اور چوتھی طرف قنوج کی حکومت ہے،

اس قطعۂ زمین میں جو قومیں آباد تھیں اُن کے حسب ذیل نام تھے:-

(۱) مید، یہ قوم دریائے سندھ جس کو عرب نہر مہران کہتے تھے، اس کنارہ پر آباد تھی، اس قوم کا نشان سندھ میں اب تک ہے،

(۲) جاٹ جس کو عرب زط کہتے تھے، یہ دریا کے اس کنارہ پر بستے تھے، یہ دونوں قومیں آپس میں ہمیشہ دست و گریبان رہتی تھیں،

(۳) ٹھاکر، جن کو عرب اپنے تلفظ میں تاکر اور جمع کی صورت میں تکاکرہ بولتے تھے یہ راجپوت تھے، اور سلطنت کے امرا اور فوج کے سپہ سالاروں میں اُن کا شمار تھا،

ان کے علاوہ برہمن تھے، بھاٹیہ اور سومری وار یسی اور سودھا قومیں آباد تھیں،

ہم اس حقیقت کا اوپر کی سطروں میں اظہار کر چکے ہیں کہ جس وقت مسلمان ہندوستان میں آنے لگے ہیں، اس ملک کا تنہا مذہب ویدک دھرم یا برہمنی نہ تھا، بلکہ زیادہ تر بودھ مت تھا، اس لئے آج کل کے آریہ سماجی دوستوں کا شور و غل اور ہنگامہ و فریاد اور اپیل، واتفکار اور اہل علم اصحاب

کی نظروں میں مضحکہ انگیز ہے، اس سلسلہ میں ہم اس سے بھی زیادہ ایک دلچسپ نظریہ کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، بودھ مت کے خلاف سب سے زیادہ پُرجوش جہاد جس نے کیا وہ نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) کے شنکراچاریہ جی ہیں، لیکن تم بتا سکتے ہو کہ بودھ مت کی بت پرستی کے خلاف اس ہندی مجدد میں یہ جوش و ولولہ کہاں سے آیا، شنکراچاریہ جی جنوبی دکن میں پیدا ہوئے ملیبار میں نشو و نما پائی، اور یہ وہ مقامات تھے، جو اسلام کے نعرۂ توحید سے گونج رہے تھے، اور جہاں بت پرستی کے خلاف مسلمان واعظین کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اس بنا پر جس طرح شمالی ہندوستان میں کبیرداس اور گرونانک وغیرہ پہلے اور دیانند جی بعد کو پیدا ہوئے، جنھوں نے اسلام کی توحید سے بت شکنی کا سبق سیکھا، ٹھیک اسی طرح تیسری صدی ہجری کے عرب تجار اور واعظین سے جو اس علاقہ میں اس وقت پھیلے ہوئے تھے، شنکراچاریہ جی نے بت شکنی کا فیض حاصل کیا،

سندھ میں مسلمان پہلی صدی کے آخر میں یعنی آٹھویں صدی عیسوی کے بالکل شروع میں آئے، اور ہندوستان سے بدھ مت کا پورا زوال نویں صدی میں اور اوس کے بعد ہوا ہے، ہمارا خیال ہے، کہ ہندوستان میں بدھ مت کا زوال ویدک دھرم کے پرچار سے زیادہ، اسلام کی فتوحات اور اس کی تبلیغ و اشاعت سے ہوا ہے، مسلمان جب بنگال پہنچے ہیں، تو وہاں ویدک دھرم نہیں بودھ مذہب تھا، اور اسی طرح سندھ کا وسیع علاقہ مسلمانوں کے داخلہ کے وقت برہمنوں کا نہیں بودھ مت کا پجاری تھا، ہم کو وہاں بودھ پور نام ایک شہر ملتا ہے،[1] نو وہیار نام ایک خانقاہ یا معبد ملتا ہے، جو خاص بودھ لوگوں کی خانقاہ اور دارالتعلیم کو کہتے ہیں، اور ان کے پجاریوں کا نام ہم سمنی سنتے ہیں، جو خاص بودھ علماء کا لقب تھا، اور جو برہمن کے حریف مقابل تھے، الیٹ[2] صاحب بھی اپنی تاریخ ہند میں لکھتے ہیں:-

---

[1] چچ نامہ ترجمہ الیٹ ص ۱۴۲، [2] چچ نامہ ترجمہ الیٹ ص ۱۵۰، ج ۱

"چونکہ بودھ مت سندھ میں اس وقت مسلمہ طور پر رائج تھا جب مسلمانوں کو پہلے پہل ہندوستانی توہم پرستی سے سابقہ پڑا، اس لئے لازمی طور پر اس نام (بد) کا ماخذ لفظا بودھ ہے، نہ کہ فارسی لفظ بد (بت) جو کہ غالباً خود بھی لفظ بودھ کی محرف شکل ہے۔

.... بہت سے آثار اس بات کے موجود ہیں کہ بودھ مت اس عہد میں وادی سندھ میں پھیلا تھا، نہ صرف مخصوص طور پر چینی سیاحوں کے تذکرے اور ابن خرداذ کا بیان اس کی تائید کرتا ہے، بلکہ عرب مصنفین کے چند ضمنی اشارات وتلمیحات بھی ہیں جن میں خاص طور پر کوئی تذکرہ برہمنوں اور بودھوں کا بحیثیت ایک دوسرے کے حریف ہونے کے نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں کا امتیاز باہمی (خصوصاً طرزِ عبادت، ایصالِ ثواب، قصص مذہبی) عام طور پر اس قدر نازک ہے کہ ناواقف اور مغرور بدیسیوں کی توجہ مشکل سے ادھر منعطف ہو سکتی تھی، چنانچہ جہاں کہیں پجاریوں کا تذکرہ ہے، عموماً ان کو "سمنی" کہا گیا ہے، سلطنت کا ہاتھی سپید ہوتا تھا، جو ایک نہایت معنی خیز بات ہے، ایک ہزار برہمن (پجاری) جس نام سے کہ ان کا عربی کتابوں میں تذکرہ ہے، اور جو چاہتے تھے، کہ اپنے قدیم مذہبی معتقدات، اور رسم و رواج کو قائم رکھیں، ان کو محمد بن قاسم نے خلیفۂ وقت کی اجازت سے فرمان دیا تھا، کہ وہ اپنے ہاتھوں میں کچکول لے کر ہر صبح کو در بدر پھر کر اپنی روزی حاصل کریں اور یہ ایک مخصوص مذہبی رسم ہے، جو بدھ پجاریوں میں جاری ہے، اور سب سے آخر یہ کہ مجسمے بنا کر یا کسی اور طور پر اپنے فاتحوں کی جسمانی یادگار قائم کرنا، یہ تمام امور بدھوں کے خصائص طبعی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، نہ کہ برہمنوں کے ان اثباتی دلائل کے علاوہ منفی شہادت بھی اس امر سے پیدا ہوتی ہے، کہ کوئی تذکرہ ستی، جنیو، گئو پوجا،

اشنان (اشنان) ہون پجاریوں کے ہتھکنڈوں، اور دوسرے پیشوایانہ تحکمات، جوگیانہ نفس کشی، یا دیگر رسوم و اعمال جو برہمنی مذہب کے خصوصیات ہیں، ان تحریرات میں نہیں ہیں[۱]۔"

اسی سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گا کہ اہل سندھ اس قدر روادار، بے تعصب، علوم و فنون میں ماہر، سیر و سیاحت اور دوسری قوموں سے ملنے جلنے میں کیوں اس قدر آزاد تھے، بغداد کے دربار میں جو حکما تھے، وہ یقیناً یہی سندھ کے بودھ مت والے تھے، اور یہی ایران تک پھیلے، سندھ اور ایران بری اور بحری دونوں راستوں سے باہم قریب قریب ہم سرحد ہیں، اسی لئے سندھ کے راجاؤں اور ایران کے بادشاہوں میں آپس میں لڑائیاں جاری رہتی تھیں، کبھی یہ اُن پر حملے کرتے رہتے تھے، اور کبھی وہ اُن پر حملہ آور ہوتے تھے، کبھی بلوچستان، اور مکران کے علاقے سندھ میں شامل ہو جاتے تھے، اور کبھی سندھ کی سرحدیں سلطنت کسریٰ کے حدود میں آجاتی تھیں، اس تعلق سے ایران کی فوج میں سندھ کی متعدد قومیں سپاہیانہ خدمات انجام دیا کرتی تھیں، ان میں تین قوموں کے نام آتے ہیں، اساورہ، سیابجہ[۲]، اور زط، زط تو جاٹ ہے، اساورہ شاید کہ سوار کی جمع ہو، اور سیابجہ، سیاہ بچہ (کالا) کی شاید خرابی ہو، بہرحال اساورہ کی قومیت کا حال یقینی طور سے نہیں معلوم، مگر سیاہ بچہ اور جاٹوں کے ساتھ اُن کے میل جول اور خلا ملا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی شاید سندھ ہی کے رہنے والے ہوں، اور خصوصاً اس بنا پر کہ یہ عربوں اور ایرانیوں کی لڑائی میں یہ ایرانیوں سے الگ ہو کر مسلمانوں کے شریک حال ہو گئے تھے،

بہرحال سندھی قوموں میں سب سے پہلے جاٹوں میں اسلام پھیلا ہے، یہاں تک کہ صحابہ کرام

---

[۱] الیٹ جلد اول ص ۵۰۴، ۵۰۶ سنہ ۱۸۶۷ء،

[۲] بلاذری ذکر اساورہ ص ۳۷۴ – ۳۷۳،

کے زمانہ میں تو نومسلم جاٹ اپنا بودھ مذہب چھوڑ کر عراق جا کر بسنے لگے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود جو کوفہ میں رہا کرتے تھے، وہ ایک روایت میں کہتے ہیں کہ "ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا جو صورت شکل میں بالکل جاٹ معلوم ہوتے تھے"[1] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے غالباً ۳۲ھ کے قریب میں وفات پائی ہے،

یہ قبائل چونکہ یزدگرد شاہ ایران کی فوج میں تھے، اس لئے اُن کو مسلمانوں کے دیکھنے اور ملنے کا بکثرت اتفاق ہوا ہوگا، یزدگرد کے مقابلہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ مسلمانوں کی فوج لئے بڑھے تھے کہ سیاہ (کالا، شاید ہندوستانی پہلے بھی کالے کہلاتے ہوں) نے جو اسواری تھا، اور اپنی جماعت کا سردار تھا، اسلام کی کامیابی اور کمک کو دیکھ کر حضرت ابوموسیٰؓ کو یہ پیغام بھیجا کہ "ہم لوگ بھی تمہارے مذہب میں داخل ہونا چاہتے ہیں، مگر اس شرط پر کہ ہم تمہارے دشمن ایرانیوں سے تو تمہارے ساتھ مل کر لڑیں گے لیکن اگر تم میں خود باہم لڑائی ہو تو فریقین میں سے کسی کا ساتھ نہ دیں گے، اور اگر عرب ہم سے لڑیں تو ہماری حفاظت تم پر فرض ہوگی، اور ہم کو نہ دینی ہوگی نیز ہم کو اجازت ہوگی کہ ہم جہاں چاہیں، قیام کریں، اور جس قبیلہ سے چاہیں اتحاد کرلیں، اور ہمارے وظائف درجۂ اعلیٰ کے ہوں"

حضرت ابوموسیٰؓ نے جواب دیا کہ ہم نومسلموں کے لئے صرف ایک ہی شرط جانتے ہیں کہ اُن کے اور تمام مسلمانوں کے حقوق ہر طرح برابر ہوں گے" لیکن انھوں نے اس مجمل شرط کے قبول کرنے سے انکار کیا، حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو کہلا بھیجا کہ "اُن کی یہ سب شرطیں مان لی جائیں" چنانچہ اس کے بعد یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ آکر مل گئے، اور انہی کے ساتھ سیاہ بجہ اور جاٹ لوگ بھی شریک ہوگئے، یہ لوگ عراق میں آکر اعرب قبائل کے ساتھ مل کر آباد ہوئے، اور

---

[1] ترمذی ابواب الامثال،

یہ سندھی قوموں میں اسلام کا پہلا داخلہ تھا، اس کے بعد اس قبیلہ کے اور لوگ جو سواحل پر مویشی چراتے تھے، وہ مسلمان ہو گئے،

یہ سندھی قومیں چونکہ بہادر اور جنگ جو تھیں، اس لئے اسلامی فوجوں میں اُن کو خاصہ درجہ حاصل ہوگیا، اور اکثر امانت اور اعتماد کی جگہوں پر اُن کا پہرہ بٹھایا جاتا تھا، حضرت علیؓ کے عہد میں بصرہ کا خزانہ اسی سپاہیوں کی نگرانی میں تھا، اور وہ حضرت علیؓ کے طرفداروں میں تھے، (دیکھو طبری)، ان لوگوں نے مسلمان ہو کر اپنے نام اسلامی رکھ لئے تھے، بصرہ کی اس محافظ فوج کے سردار کا نام ابوسلمہ تھا جو جاٹ تھا اور نہایت صالح تھا، امیر معاویہؓ نے غالبًا رومیوں کے مقابلہ کے لئے عراق سے بہت سے جاٹوں اور سیاہ بچوں کو لیجا کر شام کے ساحلی شہروں میں اور انطاکیہ میں بسایا تھا، اور اسی طرح ولید بن عبدالملک اموی نے بھی اپنے عہد میں ان جاٹوں کو انطاکیہ میں لیجا کر آباد کیا تھا[۵۱]،

عراق میں آبادی اور عربوں سے میل جول کے بعد جاٹ مسلمان نہ صرف سپاہی ہی رہے بلکہ ان میں سے بعض خاندانوں نے علمی ترقیاں بھی کیں، اس حقیقت کے اظہار میں کوئی شرم نہیں، بلکہ یہ اسلام کے فخر کا نشان ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ جن کے پیرو آج اسلام کے بیشتر ممالک میں ہیں، اور جن کی فقہ پر آج مصر و ٹرکی اور افغانستان کی سلطنتوں کا دار و مدار ہے، وہ ایک جاٹ تھے[۵۲] کیا دنیا کا کوئی مذہب اس مساوات اور رواداری کی مثال پیش کرسکتا ہے، اور اپنے نومعتقدوں کو یہ رتبہ اور یہ اعزاز بخش سکتا ہے، کہ وہ امام اعظم کا لقب حاصل کرسکے، امام ابوحنیفہ کی ولادت سنہ ۸۰ھ میں ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا

---

۵۱ یہ پوری تفصیل فتوح البلدان بلاذری باب امر الاساورہ والزط میں مذکور ہے، ۵۲ ابن خلکان ترجمہ نعمان بن ثابت، ج ۲ ص ۰۲،

خاندان فتح سندھ سے پہلے اسلام لا چکا تھا بعض مورخین نے یہ لکھا ہے کہ یہ خاندان کابل سے آیا تھا،

مسلمانوں نے سندھ پر باقاعدہ حملہ ۹۳ھ میں شروع کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب عراق میں حجاج بن یوسف ثقفی کی گورنری تھی، اور اس کے ماتحت ایران میں اس کا ہفتدہ سالہ بھتیجا محمد بن قاسم ثقفی والی تھا، او پر گذر چکا ہے کہ عراق اور جزائر ہند کے درمیان عربوں کی تجارت قائم تھی، اور اُن کے جہازات سوداگری کے مال واسباب لدے ہوئے آتے جاتے رہتے تھے، سندھ کے سواحل بیچ کے رہ گذر تھے، ان سواحل پر خانہ بدوش قبائل آباد تھے، جو بحری ڈاکے ڈالا کرتے تھے، مالدیپ میں بعض مسلمان تاجر تھے، جو مع اہل وعیال وہاں رہا کرتے تھے اتفاق سے ان تاجروں نے وفات پائی، مالدیپ کے راجہ نے مناسب سمجھا کہ اُن کی بیوی بچوں کو عراق بھیج دیا جائے، چنانچہ یہ مسلمان خواتین ایک جہاز پر سوار کرا کے بھیجی گئیں، جب یہ جہاز سندھ کے کناروں پر پہنچا تو سندھ کے دریائی ڈاکوؤں نے اس کو لوٹ لیا، اور مسلمان خواتین کو نہایت بے رحمی سے جیا کرنے لگے، انہی خاتونوں میں سے کسی معصوم کی زبان سے یہ درد بھری چیخ نکلی "اے حجاج! مدد!" بچے کھچے مسافر جب عراق پہونچے تو اس سانحہ کا حال حجاج کو معلوم ہوا، اُس نے اُسی وقت دیوانہ وار پکار کر کہا :- اے خاتونو! ٹھہرو، میں آیا"

اُسی کے ساتھ ایک اور واقعہ بھی سامنے رکھ لو، سندھ کا برہمن راجہ چچ جو ایک بلند حوصلہ راجہ تھا، بلوچستان اور مکران پر اُس نے پے بہ پے حملے کئے تھے، یہ اسلام سے کچھ پہلے کی بات ہے اسلام کے بعد مسلمانوں کی طرف سے ان حدود میں جو فوج متعین تھی اس میں سے ایک عرب سردار محمد علافی یا علانی نام، پانچ سو عربوں کے ساتھ ایک مجرم کی حیثیت سے اسلامی فوج سے نکل کر راجہ چچ کے ساتھ ہو گیا تھا، اور اکثر معرکوں میں اُس کے ساتھ رہا، اور اس وقت بھی

جب اسلامی فوج سندھ کے قریب آچکی تھی، اور اب راجہ چچ کا بیٹا راجہ داہر حکمران تھا وہ برابر اس کے ساتھ رہا،

غرض یہ آتشگیر مسالہ تو پہلے سے موجود تھا، ان مسلمان خواتین کے لوٹے جانے کے واقعہ نے حجاج ثقفی کو برافروختہ کر دیا، اس پر بھی اُس نے ملامت کے ساتھ راجہ داہر کو لکھا کہ ان مسلمان خواتین کو عزت اور حرمت کے ساتھ واپس بھیج دو، راجہ نے یہ کہکر ٹالا کہ "ان ڈاکوؤں پر میرا قابو نہیں" ناچار مسلمانوں کو خود براہ راست ان ڈاکوؤں کی تنبیہ کرنی پڑی، حجاج نے ایران سے محمد بن قاسم کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، اور ادھر سمندر کی راہ سے اُس نے اسلحہ اور سامان روانہ کئے، ہندوستان پر مسلمانوں کے ابتدائی حملہ کے یہ اسباب ہیں، ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے، کہ جس کو اس جذبہ سے موسوم کیا جائے کہ وہ دیوانہ وار تلواریں سونت سونت کر ہندوستان کی سرحد پر اس لئے بڑھ آئے، کہ وہ ہندوؤں کو بزور شمشیر مسلمان بنا ڈالیں،

گو الیٹ صاحب کو نظر نہیں آتا، مگر کم از کم مجھے تو سندھ کی سب سے پہلی پُرانی اسلامی تاریخ جو عام طور پر چچ نامہ کے نام سے مشہور ہے، (اور جس کے دوسرے نام تاریخ السند اور منہاج المسالک ہیں) کے مطالعہ سے یہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے، کہ سندھ میں بودھوں اور برہمنوں کے درمیان اختلاف اور مخاصمت برپا تھی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ دونوں مذاہب بعض گھرانوں میں اس طرح بھی پھیلے ہوئے تھے، کہ ایک بھائی ہندو ہے تو دوسرا بودھ ہے، اسی بنا پر سندھ کے راجاؤں کے حالات پڑھ کر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے، کہ راجہ چچ ہندو برہمن تھا، اس نے چھوٹے چھوٹے بودھ راجاؤں کو لڑبھڑ کر مٹا دیا، یا باجگذار بنا لیا تھا یہ[1]

---

[1] چچ نامہ الیٹ ج ا ص ۱۴۲ و ۱۵۱

راجہ آغاز ہجرت کے وقت سندھ میں فرماں روا تھا، اس کے بعد راجہ چندر اُس کا بھائی راجہ ہوا، بودھ مت کا پرجوش پیرو تھا، اور جن لوگوں نے اپنا مذہب پہلے چھوڑ دیا تھا، ان کو زور اس نے بودھ بنایا[۱] ہندو برہمنوں نے یہ دیکھ کر سر اُٹھایا، ناچار وہ معرکوں میں نکلا، مگر کامیاب نہیں ہوا، اُس کے بعد چچ کا بیٹا راجہ داہر اس کی جگہ بیٹھا، یہ مجھے ہندو برہمن معلوم ہوتا ہے،

تاریخی قیاسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت جب مسلمان سندھ کی سرحد پر پہنچے، ملک میں ان دونوں مذہبوں کے اندر جنگ برپا تھی، اور بودھ برہمنوں کے مقابلہ میں اپنے کو بے دست و پا پاکر مسلمانوں کی طرف صلح و محبت کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ عین اُس وقت جب محمد بن قاسم کی فاتح فوج شہر بیرون یا نیرون میں پہنچتی ہے، تو وہاں کے لوگوں نے اپنے سمینوں (بودھ پجاریوں) کو پیش کیا، اور معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے سفراء عراق میں خاص حجاج کے پاس بھیج کر امان حاصل کر لی ہے، چنانچہ نیرون کے لوگوں نے محمد کا شاندار استقبال کیا، اس کے لئے رسد کا انتظام کیا، اور اپنے شہر میں داخل کیا، اور صلح کی پوری پابندی کی، اس کے بعد جب اسلامی فوج نہر سندھ کو عبور کرکے ہندوستان پہنچتی ہے، تو پھر سمینہ[۲] بودھ لوگ صلح کے قاصد بنتے ہیں[۳]، اس طرح سیوستان میں ہوتا ہے کہ سمنی لوگ (بودھ) نیچے راسے اپنے راجہ کو چھوڑ کر بخوشی مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں، اور اُن کو قبول کرتے ہیں

---

[۱] چچ نامہ ایلیٹ ص ۱۵۲، و ۴۳ [۲] یہاں پہنچ کر ذرا ہم کو لفظ سمینہ پر ایک لحظہ ٹھہرنا ہے، سب سے پہلے یہ لفظ مجھ کو علم کلام کی کتابوں میں نظر آیا، ذکر المعتزلہ زبیدی، ملل و نحل شہرستانی، کتاب البدء والتاریخ للبلخی و للمقدسی میں یہ لفظ ملا لیکن اس کی حقیقت سے ناواقف رہا، اس کے بعد جب سندھ کی تاریخ پڑھی تو اس میں یہ لفظ بار بار آیا، اور معلوم ہوا کہ یہ عربی زبان میں بودھ مت کے پیرووں کا نام ہے، اصل میں یہ سنسکرت لفظ ہے، ایلیٹ صاحب کہتے ہیں، کہ یہ سنسکرت لفظ "سرامنا" ہے، جس کے معنی پجاری جوگی

کاکا کوئی مشہور عقلمند اور سیاست داں آدمی تھا، جاٹ وُسا اس کے پاس جا کر مشورہ کرتے ہیں کہ کیا مسلمانوں کی فوج پر شبخون مارا جائے، وہ جواب میں کہتا ہے: "اگر تم ایسا کر سکو تو بہتر ہے، مگر سُنو کہ ہمارے پنڈتوں اور جوگیوں نے جنتر دیکھ کر یہ پیشینگوئی کر دی تھی کہ اس ملک کو ایک دن مسلمان فتح کر لیں گے، لوگ اس کی بات نہیں مانتے، اور نقصان اٹھاتے ہیں" کاکا نے کہا تم خوب جانتے ہو کہ میرا ارادہ اور عزم مشہور ہے لیکن بودھوں کی کتابوں میں پیشینگوئی پہلے ہی لکھی جا چکی ہے، کہ ہندوستان کو مسلمان فتح کریں گے، اور میں بھی یقین رکھتا ہوں کہ درحقیقت ایسا ہی ہونے والا ہے"، اُس کے بعد کاکا محمد بن قاسم کے پاس چلا جاتا ہے، اور جاٹوں کے ارادوں سے اُس کو آگاہ کرتا ہے، اور اپنی کتابوں کی پیشینگوئی اُس کو سناتا ہے، محمد بن قاسم اس کو بعزت تمام لیتا ہے، اور اس کو اُس کے ساتھیوں کو انعام و اکرام اور خلعت سے سرفراز کرتا ہے، "راجہ داہر کے بہت سے مخالف افسر (غالباً بودھ) خود آکر اطاعت کرتے ہیں"[۵۱]، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے بودھوں نے ایک طرف مسلمانوں کو اور دوسری طرف برہمنوں کو تولا، تو اُن کو مسلمان بہتر نظر آئے، اور دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے، کہ اس سے پہلے ترکستان و افغانستان کے بودھوں کے ساتھ مسلمانوں نے جو حُسنِ سلوک کیا، ان لوگوں نے جس کثرت اور سرعت کے ساتھ اسلام کو اختیار کیا، اس کا اثر ملک کے بودھوں پر بھی پڑا،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۹) یا زاہد کے ہیں، اور خاص طور پر بودھ مت کے معتقدوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، اور قریب قریب اسی نام سے یونانی مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے بھی اُن کا تذکرہ کیا ہے (ج ا ص ۵۰۶) ۵۳ بلاذری ص ۴۳۰ و ۴۳۸ طبع بریل لیڈن میں دو واقعے میں پہلا واقعہ چچ نامہ میں بھی ہے،

۵۱ چچ نامہ الیٹ ص ۱۰۶، ایضاً ص ۱۹۰، ۱۹۱-۱۹۲ و ۱۹۴،

محمد بن قاسم ایک ایک شہر کو فتح کرتا جاتا تھا، اور نقباے اسلام لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے جاتے تھے، محمد بن قاسم نے اعلام اعلان کر دیا تھا، کہ جو چاہے اسلام کو قبول کرکے ہمارا بھائی بن جائے اور ہمارے برابر حقوق حاصل کرے، اور جو چاہے اپنے کیش و مذہب پر قائم رہ کر اطاعت اختیار کرلے، لوگ جوق جوق آرہے تھے، اور اپنی خواہش کے مطابق یا مسلمان ہورہے تھے، یا ذمی بن رہے تھے، خود محمد بن قاسم کی فوج میں اس وقت چار ہزار نومسلم جاٹ تھے[1] بودھوں کا ایک سردار اکرام اور منصب پاتا ہے[2] نیرون میں بدھ معبد کے مطابق نومسلموں کے لئے جامع مسجد بنتی ہے، اور ایک امام مقرر ہوتا ہے[3] سیوستان اور سیسام کے قلعے جب فتح ہوتے ہیں، تو وہاں کے لوگ اسلام قبول کرتے ہیں، بت خانوں کی جگہ مسجدیں تعمیر ہوتی ہیں، امام و موذن مقرر ہوتے ہیں، خطبے پڑھے جاتے ہیں[4]

اب ٹھاکر بھی اسلام کی اطاعت کی طرف مائل ہوتے ہیں، محمد بن قاسم ان کی پوری عزت کرتا ہے، ان کو اکرام و انعام و جاگیر سے خوش کرتا ہے، موکا نام ٹھاکر آتا ہے تو اس کو وہ ابھگی کا چتر دیتا ہے، یہ پہلا چتر ہے، جو مسلمان کسی ہندو راجہ کو عطا کرتے ہیں[5]

ہم کو ایک سندھی پنڈت کا نام ملتا ہے، جو راجہ داہر کے دربار میں پورا رسوخ رکھتا تھا، وہ مسلمان ہو جاتا ہے، اور یہ درجہ حاصل کرتا ہے، کہ اس کو "مولانا اسلامی" کا خطاب ملتا ہے، اور محمد بن قاسم کی طرف سے وہ راجہ داھر کے دربار میں سفیر بن کر جاتا ہے، مولانا اسلامی جب دربار میں قدم رکھتے ہیں، تو پہلے کی طرح راجہ کی ہندوانہ بندگی نہیں بجالاتے ہیں، راجہ پہچانتا ہے، اور اس گستاخی کی وجہ دریافت کرتا ہے، مولانا فرماتے ہیں: اے راجہ! جب میں

---

[1] بلاذری ص ۴۳۸ [2] چچ نامہ ص ۷، [3] ایضاً ۷۱ [4] ایضاً ص ۱۵۸ [5] ایضاً ص ۱۶۴

[5] ایضاً ص ۱۶۵،

تیری رعایا تھا تو مجھ پر واجب تھا کہ تیری تعظیم بجالاؤں، مگر اب جب میں مسلمان ہوگیا ہوں، اور اسلام کے بادشاہ کی رعایا ہوں تو مجھ سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ میں اپنا سر ایک کافر کے سامنے جھکاؤں گا،" راجہ یہ سُن کر آگ ہوگیا، اور کہا کہ اگر تم قاصد بن کر نہ آئے ہوتے تو تمھاری گردن اُڑا دیتا،" مولانا نے کہا "ایک میرے قتل سے عربوں کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچ سکتا، لیکن وہ میرے قتل کا تم سے انتقام لیں گے، اور جرمانہ وصول کرلیں گے"[۱]

دیکھو تو ایک نو مسلم پنڈت کو اپنے اسلام پر کتنا غرور اور اپنے مسلمان بھائیوں کی امداد و اعانت پر کتنا بھروسا اور عام مسلمانوں کے ساتھ اپنے حق اور رتبہ کی برابری پر کتنا یقین ہے،

پھر نظر آتا ہے کہ بھاٹیہ ٹھاکر اور غزنی کے جاٹوں نے اسلام کی رضامندانہ اطاعت اختیار کرلی ہے،[۲] محمد بن قاسم امرائے سندھ کے نام عام اعلان کرتا ہے کہ جو چاہے مسلمان ہوکر ہمارا بھائی بن جائے، اور جو چاہے اپنے مذہب پر قائم رہ کر امن و امان حاصل کرے، اس اعلان کو پڑھ کر سیسار کا راجہ داہر کے وزیر نے اپنے خاص معتمدوں کو بھیج کر امان حاصل کی، اور اُس نے اپنے اخلاص کے ثبوت میں ان مسلمان خواتین کو جو جہاز میں لوٹ لی گئی تھیں، دربار میں لاکر حاضر کیا،[۳]

برہمن آباد وغیرہ کے فتح ہوجانے کے بعد غالباً برہمنوں نے یہ دیکھ کر کہ اُن کے حریف بودھوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر کس قدر فوائد حاصل کئے ہیں، انھوں نے بھی اپنا ایک وفد مرتب کیا، اور محمد بن قاسم کے دربار میں پہونچے، محمد نے اُن کی قدر کی لیکن برہمنوں نے یہ شرط پیش کی کہ ہندوستور کے مطابق ہمارا قومی درجہ تمام دیگر ذاتوں سے بلند رکھا جائے

---

[۱] چچ نامہ الیٹ ج ۱ ص ۱۲۵ [۲] ایضاً ص ۱۶۷ [۳] ایضاً ص ۱۶۶،

محمد بن قاسم نے اُن کے ان دعوی کی سچائی کی تحقیق کی، اور جب اُس کو اُس کے متعلق تشفی ہوگئی، تو اُس نے اُن کا اعزاز کیا، اور اُن کو تمام عہدوں پر سرفراز کیا، برہمنوں نے اس کا خاص شکریہ ادا کیا، اور گانوں گانوں میں جاکر نئے حکمراں کے عدل و کرم کے گیت گائے، اور اپنے ہم مذہبوں کو اطاعت اور فرماں برداری پر آمادہ کیا، اور جو مساوات حقوق عربوں کی بدولت پیدا ہوتی تھی، اس کی ہر جگہ جاکر تعریفیں کیں۔[1]

باایں ہمہ محمد نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا، کہ وہ فاتح سے زیادہ ایک مبلغ ہے، چنانچہ اس نے برہمنوں میں بھی عام اعلان دیا کہ جو چاہے اسلام اختیار کرے اس سے جزیہ معاف ہوگا: مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی طرح اس پر زکوٰۃ فرض ہے) اور جو اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنا چاہے وہ بخوشی رہ سکتا ہے،

"بعضے از ایشاں بر اقامت معاودت نمودند و بعضے دل برگزیدہ نہادند و در کیش اسلاف می رفتند"

چچ نامہ کا یہ فقرہ ہے اس کے ساتھ یہ ہے :-

ان میں جو مسلمان ہوگئے تھے، وہ غلامی اور جزیہ وغیرہ سے آزاد رہے، اور جو اپنے مذہب پر قائم رہے، اُن کے تین درجے قائم کئے گئے، اعلیٰ طبقہ یعنی امراء کے لئے ۴۸ درم، متوسط طبقہ کے لئے ۲۴ درم اور نیچے طبقہ کے لئے ۱۲ درم ٹیکس مقرر ہوا، اور یہ حکم دیا گیا، کہ جو لوگ مسلمان ہوجائیں وہ اس سے معاف کئے جائیں، (لیکن اُن پر مسلمانوں کی طرح جزیہ کے بجائے ڈھائی فیصدی زکوٰۃ ضروری واجب ہوگی جس کی مقدار جزیہ سے زیادہ ہی رہی) چنانچہ جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ

---

[1] چچ نامہ ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۸۶، ۱۹۱ ایڈیشن ۱

جزیہ سے معاف ہوئے، اور جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر رہے، انھوں نے جزیہ دیا لیکن اُن کی زمینیں اور جائدادیں اُن سے نہیں لی گئیں، بلکہ علی حالہا اُن کے ہی قبضہ میں رہنے دی گئیں؛[۱]

کیا اس اقتباس سے یہ پوری طرح واضح نہیں ہوتا کہ فاتح سندھ نے اپنے مذہب کی اشاعت میں کبھی بھی تشدد اور سختی کا استعمال نہیں کیا، بلکہ اُس نے ہر مذہب کو جائز آزادی عنایت کی جزیہ کی رقم جو وصول کی گئی وہ حد درجہ معمولی ہے، یعنی زیادہ سے زیادہ ۴۸ درم، اور کم سے کم ۱۲ درم موجودہ انگریزی سکوں کے مطابق، گویا اس نے امرا سے سالانہ دس روپئے، متوسط طبقہ سے سالانہ پانچ روپیے اور غربا سے سالانہ ڈھائی روپئے لیے اور اس سے زیادہ بڑھ نہیں سکتا تھا، اس کے مقابلہ میں دیکھو کہ مسلمانوں سے جو رقم وصول کی جاتی تھی، وہ فی شخص مقرر نہ تھی، بلکہ اُس کی آمدنی کے اعتبار سے ڈھائی فی صدی لی جاتی تھی، جو دس روپیہ سالانہ سے بہت زیادہ ہو جاتی تھی، اس پر بھی اگر ہمارے آریہ دوست یہ کہیں کہ اسی جزیہ کے سبب سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا، تو اُس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہندوؤں کی نگاہوں میں اُن کا مذہب خود اس قدر کم رتبہ تھا، کہ اُن کے امرا کے نزدیک دس روپئے سالانہ، متوسطین کے نزدیک پانچ روپیے سالانہ، اور غربا کے نزدیک دو روپیہ آٹھ آنہ سالانہ بھی اُن کے دھرم کی قیمت سے زیادہ گراں تھا، تو یہ مسلمانوں کا قصور نہیں،

محمد بن قاسم نے سندھ سے فراغت کر کے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ہندوؤں کے سامنے اپنے مذہب کی تبلیغ کی، چنانچہ یہی ملتان میں اُس نے کیا، مگر کسی ایک کو بھی اُس نے اسلام کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، سندھ کے محدود رقبہ کے باہر سندھ سے متصل جو ایک حقیقی ہندوستان

---

[۱] چچ نامہ ص ۱۸۲ الیٹ ج ۱

یعنی قنوج کی سلطنت تھی، محمد نے اپنے داعی وہاں راجہ کے دربار میں بھی بھیجے، چنانچہ ایک ہزار دستہ کی حفاظت میں اُس نے راجہ قنوج کے پاس اپنے مبلغ بھیجے کہ اسلام کا ہدیہ قبول کرو، مگر اُس نے بدقسمتی سے انکار کیا،[1] محمد کچھ اور آگے کارروائی کرنا چاہتا تھا، مگر اُس کو موقع نہ ملا، اور دربارِ خلافت کی طلب پر وہ واپس گیا، جب وہ یہاں سے جانے لگا تو اہلِ سندھ نے اس کا بڑا ماتم کیا، اور اس کے مجسمے بنا بنا کر یادگار قائم کی،[2]

ہم صفحاتِ بالا میں اپنے ناظرین کو سندھ کے علاقہ کی سیر کرا رہے تھے، اب بھی ہم وہیں ہیں، محمد بن قاسم کی فتوحات ۹۳ھ میں اور اُس کے بعد ہوئی تھیں، یہ خلیفہ ولید بن عبد الملک کا زمانہ تھا، اس کے بعد ۹۶ھ میں سلیمان بن عبد الملک خلیفہ ہوا، اور ۹۹ھ میں اُس نے وفات پائی، اُس کے انتقال کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؓ خلیفہ ہوئے، جنھوں نے ۱۰۱ھ میں اس عالم کو الوداع کہا، اسی سے فرشتہ وغیرہ مصنفین کی غلط بیانی ثابت ہوتی ہے، جنھوں نے لکھا ہے کہ خلیفہ عبد الملک نے محمد بن قاسم کو سندھ سے پکڑوا کر اس لئے بانواعِ عقوبت قتل کرڈالا کہ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کی جن لڑکیوں کو حرم سرائے خلافت کے لئے بھیجا تھا، انھوں نے محمد بن قاسم سے انتقام لینے کے لئے خلیفۂ وقت عبد الملک سے جاکر یہ جھوٹی شکایت کی، کہ "اے خلیفہ! اب ہم تیرے کام کی نہیں: کہ محمد بن قاسم اس سے پہلے ہماری عصمت دری کر چکا ہے"، یہ سن کر خلیفہ بہت برہم ہوا، اور اُس نے حکم دیا کہ ابن قاسم کو سندھ سے گرفتار کر کے لایا جائے، اور اس جرأتِ رندانہ کے پاداش میں اس کا سر قلم کر دیا جائے، لیکن بلاذری، طبری وغیرہ عرب مورخین نے اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کیا ہے، سندھ عبد الملک کے بعد فتح ہوا ہے، اور ابن قاسم خلیفہ سلیمان کے حکم سے گرفتار ہوا ہے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حجاج کی اس سازش میں کہ سلیمان خلیفہ نہ ہو،

---

[1] چچ نامہ ص ۲۰۰، [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۰،

ابنِ قاسم بھی شریک تھا، اس لئے جب سلیمان خلیفہ ہوا، تو اُس نے شرکائے سازش کو پوری سزا دی، چونکہ فارسی تاریخوں کی بدولت فتوحات سندھ کے سلسلہ میں یہ کہانی لوگوں میں عام طور سے پھیلی ہوئی ہے، اس لئے بعض رفقائے دارالمصنفین کو ہم نے ہدایت کی ہے، کہ وہ ایک مستقل مضمون میں اس واقعہ کی تنقید کریں،

بہرحال محمد بن قاسم نے خلیفہ سلیمان کے عہد میں جب سندھ کو چھوڑا ہے، تو وہاں اسلام کو کافی رونق ہو چکی تھی، اور جیسا کہ پہلے ہم نے لکھا ہے وہاں کے بودھوں اور برہمنوں دونوں میں اسلام پھیلنا شروع ہو چکا تھا، خلیفہ سلیمان کے بعد جب حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے محمد بن قاسم کے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہا، معلوم ہے کہ حضرت عمر ابنؒ عبدالعزیز نہایت دیندار، زاہد، متقی، عدل پرور اور منصف خلیفہ تھے، ان کے سہ سالہ عہدِ خلافت میں اسلام نے وہی رونق حاصل کر لی تھی، جو خلافتِ راشدہ کے دور میں اسے حاصل تھی، خلیفۂ اسلام حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے عدل و انصاف، زہد و اتقا، اور حسن سیرت و حُسن کردار کے افسانے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے تھے، اور حکومتِ اسلام کی غیر مسلم رعایا اسلام کے اس زندہ پیکر کو دیکھ کر اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھی،

سندھ کی غیر مسلم رعایا بھی اسی اثر میں دبی تھی، اور اس کی کشش سے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتی چلی جاتی تھی، خود خلیفۂ نے سندھ کے راجاؤں کے نام خطوط لکھے، اُن کو اسلام کی دعوت دی، اس دعوت کو کامیابی حاصل ہوئی، اور بعض راجاؤں نے خوشی خوشی اسلام کو قبول کیا،

بلاذری طبع یورپ ص ۴۴۰ میں اور کامل ابن اثیر طبع یورپ جلد ۵ ص ۴۰ میں ہے،

فکتب الی الملوک (ملوک السند)	حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سندھ کے
یدعوھُم الی الاسلام والطاعۃ	راجاؤں کو خطوط لکھے جن میں ان کو

علیٰ ان تملکھم ولھم ما للمسلمین	اسلام اور اطاعت کی دعوت دی،
وعلیھم ما علیھم وقد کانت	اس شرط پر کہ ان کی حکومتیں قائم رہینگی
بلغتھم سیرتہ ومذھبہ	اُن کے اور مسلمانوں کے تمام حقوق
فاسلم جیشہ والملوک و	مساوی ہوں گے، ان لوگوں کو
تسموا باسماء العرب،	اس سے پہلے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ
	کے اخلاق اور مذہب کا حال معلوم
	ہو چکا تھا، اس پر داہر کا بیٹا جے شبہ
	(راجے شیا) اور دوسرے راجہ
	مسلمان ہو گئے، اور انھوں نے اپنے
	نام عربوں کے سے رکھے،

پہلے زمانہ میں ایک بادشاہ کے تبدیلِ مذہب کا، جو اثر رعایا پر پڑتا تھا، وہ سب کو معلوم ہے، اس بنا پر سندھ کے ان راجاؤں کے قبولِ اسلام سے ان کی رعایا میں اسلام کی خاطر خواہ اشاعت ہوئی ہوگی،

سنہ ۱۰۷ھ میں خالد قسری عراق کا والی اور اس کی طرف سے جنید سندھ کا نائب مقرر ہوا، جنید نے سنہ ۱۰۷ھ میں کسی غرض سے چاہا کہ ایک فوج لے کر جے شیا کے ملک کو عبور کرے، راجہ کو خوف ہوا کہ وہ کہیں اس بہانہ سے ہمارے ملک پر قبضہ نہ کرلے، اس لئے اُس نے آگے بڑھ کر روکا، اور کہا کہ ہم لوگ مسلمان ہیں، اور مجھے اس مرد صالح (حضرت عمر بن عبد العزیزؓ) نے یہاں کا والی بنایا تھا، آخر طرفین نے ضمانت پیش کی، پھر مورخین لکھتے ہیں، کہ راجہ مرتد ہو کر لڑنے پر آمادہ ہو گیا، اور باہمی ضمانتیں ایک دوسرے کو واپس کر دی گئیں، راجہ گرفتار ہو کر مارا گیا، اس کے بھائی حج نے

چاہا کہ کسی طرح وہ بھاگ کر عراق نکل جائے، اور گورنر عراق خالد قسری کے سامنے اپنا مقدمہ اور جنید کی غداری کا واقعہ پیش کرے، لیکن جنید نے اس کو بھی دھوکے سے قتل کروا دیا[1]،

میرا خیال ہے کہ راجہ کے نقض عہد کرنے سے اُس کے کفر و ارتداد پر استدلال صحیح نہیں ہو سکتا اگر ایسا ہوتا تو جے سنگھ کو کسی طرح عراق جا کر اپنا مقدمہ پیش کرنے کی جرأت نہ ہوسکتی، بلکہ جنید نے اپنی کارروائی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ اختراع کیا ہوگا، واقعہ یہ ہوگا جیسا کہ اس قسم کے واقعات حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے بعد دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی پیش آئے، کہ ظالم امرا اور حکام اس بنا پر کہ غیر مسلموں کے مسلمان ہو جانے سے جزیہ کی رقم کم ہو جاتی ہے، ایسا کرتے تھے کہ وہ نومسلموں سے بھی جزیہ کا مطالبہ کرتے تھے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس خلافِ شریعت رسم کا قطعی سدباب کر دیا، اس پر افسروں نے شکایت کی کہ خزانہ خالی ہو رہا ہے، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داعی اور ہادی بن کر آئے تھے محصل اور ٹیکس وصول کرنے والے بن کر نہیں آئے تھے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے ۱۰۱ھ میں وفات پا جانے کے بعد رفتہ رفتہ پھر وہی بدعت شروع ہوگئی، خالد القسری والی عراق کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دل سے مسلمان نہ تھا، اس کی ماں نصرانیہ تھی، اور اس کا خود میلان مجوسیت کی طرف تھا، ایسی صورت حال میں اس کی ذات سے اسلام کو جو بھی صدمہ نہ پہنچا ہو وہ کم ہے، اور آخر میں اسی لئے وہ ۱۲۰ھ میں معزول کر دیا گیا،

خلفائے بنی امیہ سے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے بعد کسی اور خلیفہ کے متعلق معلوم نہیں کہ اُس نے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کی کوشش کی ہو، یا تو خود بخود اسلام نے اپنا راستہ آپ صاف کیا، یا طالبین حق نے خود آگے بڑھ کر دستگیری کی، اور اسلام کی اشاعت ہوئی، یا

[1] کامل ابن اثیر وغیرہ واقعات ۱۰۷ھ

علما، مشائخ اور تجار نے اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کیا، تاہم ملک سندھ میں اسلامی مرکز کے قیام نے اس کے اطراف میں اسلام کی روشنی پہنچانے میں بڑا کام کیا، منصور کے عہد میں سندھ کا شہر گندہار فتح ہوا، اور وہاں بت خانہ کے بجائے مسجد تعمیر ہوئی، تو حکم الٰہی سے وہاں بڑی سرسبزی وشادابی ہوئی، اور خوب غلہ پیدا ہوا، اس پر وہاں کے باشندوں نے مسجد کو بڑے خیر وبرکت کی چیز سمجھا، اور اس کو بڑا متبرک قرار دیا[1]، بنو عباس کے عہد فرماں روائی کے ساتھ اسلام میں عقلی معرکہ آرائیوں نے نئے برگ وبار پیدا کئے، اور مخالفینِ اسلام کے اعتراضات کے جواب میں کتابیں تصنیف ہونے لگیں، اور سلطنت نے ہر طرح اس کام میں مصنفین کی مدد کی،

علم کلام کا پہلا بانی واصل بن عطاء ہے، ۸۰ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۱ھ میں وفات پائی، بصرہ جو ہندوستان کا بندرگاہ تھا، اس کا مسکن تھا، اسلام کی پہنا ے سلطنت میں جو غیر مسلم فرقے تھے، ان میں ایک ہندوستان کا فرقۂ سمنیہ بھی تھا، آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ عرب سمنیہ، بودھ کے پیرووں کو کہتے تھے، جو خدا کی مستقل ہستی کے قائل نہ تھے، جہم ابن صفوان جو فرقۂ جہمیہ کا بانی ہے، اس سے ان بودھ مت والوں سے مناظرہ ہوا، بودھیوں نے کہا کہ اشیا کے علم ومعرفت کے تمھارے پاس صرف پانچ ذریعے ہیں، یعنی حواس خمسہ، یہ بتاؤ کہ تم کو اپنے خدا کا علم ان میں سے کس حاسہ کے ذریعہ سے ہوا، جہم نے کہا، ان میں سے کسی سے نہیں، بودھیوں نے کہا تو پھر خدا مجہول ہے، یعنی اُس کے وجود پر یقین کیونکر ہوا، جہم کوئی جواب نہ دے سکا، اور اس نے واصل کو یہ اعتراض لکھ کر بھیج دیا، واصل نے جواب میں لکھا کہ انسان کے پاس علم ومعرفت کے علاوہ ایک چھٹا ذریعہ بھی موجود ہے، اور وہ دلیل ہے، ان سے پوچھو کہ دیوانہ اور ہشیار میں، زندہ اور مردہ میں کوئی فرق ہے، یا نہیں، ہاں

---

[1] بلاذری طبع یورپ ص ۴۴۵،

کہنے سے چارہ نہیں، اور یہ فرق صرف دلیل سے معلوم ہوتا ہے، جہم نے بھی یہی جواب جا کر، بودھ والوں کو دیا، انھوں نے کہا، یہ تمھارے دماغ کی بات نہیں، جہم نے اقرار کیا، اور اُن کو واصل کا پتہ دیا، چنانچہ یہ حق کے طالب واصل کے پاس گئے، اور اس سے گفتگو کی، اور اسلام کی حقانیت پر اُس کے دلائل سُن کر مسلمان ہو گئے،[۱]

سندھ کے راجاؤں کو جیسے جیسے اسلام سے واقفیت ہوتی جاتی تھی، ان کا میلان اس کی طرف بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ہم کو ہندوستان کے ایک ایسے راجہ کا بھی علم ہے، جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیت اطہار سے غایت درجہ عقیدت تھی، منصور عباسی کی خلافت میں جب ساداتِ علویہ نے خروج کیا، اور اُن کو کچھ کچھ کامیابیاں ہونے لگیں، تو محمد علوی کے فرزند عبداللہ اشتر نے اپنے باپ کے حکم سے سندھ کا رُخ کیا، اس وقت سندھ میں عمر بن حفص ایک عرب والی تھا، اُس نے عبداللہ بن اشتر کا نہایت دھوم دھام سے استقبال کیا، اور سندھ میں عباسیوں کے بجائے علویوں کی حکومت کا اعلان ہو جانے والا تھا، سپید علم بن چکے تھے، کہ دفعۃً علویوں کو شکست ہوئی، اور ساری تجویز خاک میں مل گئی، عبداللہ نے کہا کہ اے عمر! اب میری جان تمھارے ہاتھ میں ہے، عمر نے کہا گھبرائیے نہیں، یہاں سندھ کے راجاؤں میں سے ایک بڑا راجہ ہے، جس کے پاس بڑی قوت ہے، اور اس کے ساتھ وہ اشد الناس تعظیماً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کو نہایت سخت عقیدت ہے، ہم اس سے معاہدہ کر کے اس کے پاس چلے جاؤ، پھر تمھارا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے گا،

[۱] شرح کتاب الملل والنحل یحییٰ زبیدی، ترجمۂ واصل، تراجم معتزلہ کا یہ حصہ ڈاکٹر آرنلڈ نے ذکر المعتزلہ کے نام سے الگ رسالہ میں چھپوایا ہے، دیکھو رسالہ مذکورہ ص۲۱ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن،

چنانچہ عبداللہ نے ایسا ہی کیا، اس نے اُن کو بڑی عزت و تکریم سے لیا، اور وہاں وہ شاہانہ تزک و احتشام سے رہنے لگے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اُن کے چار سو طرفدار زیدی بھی اُن کی خدمت میں چلے گئے، منصور کو یہ معلوم ہوا تو عمر کو سندھ کے مشرق سے ہٹا کر افریقہ کے مغرب میں والی بنا کر بھیج دیا، اور اہل بیت کی خاطر راجہ نے منصور جیسے پرشکوہ بادشاہ کی خفگی برداشت کی، عبداللہ مع اپنے دس ہمراہیوں کے اتفاقاً نئے والی کے ہاتھ گرفتار ہو گئے[۱۵]، مگر اُن کے سینکڑوں ہمراہی غالباً وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔

خلفائے عباسیہ کے آغازِ عہد میں علماء میں دو مقابل کے حریف گروہ تھے، ایک محدثین جو اپنے عمل اور نمونہ سے لوگوں میں دین کی روح پھونکتے تھے، اور دوسرے متکلمین جو اپنے زورِ بیان، قوت استدلال، اور مخالفین کے معترضانہ خیالات کی تردید کر کے لوگوں کو قبولِ حق کی دعوت دیتے تھے، خلیفہ ہارون رشید پہلے گروہ کا حامی تھا، مگر اتفاقاً بعض واقعات ایسے پیش آئے جنھوں نے ہارون کو بالآخر متکلمین کی طرف بھی ملتفت کر دیا،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سندھ اور ہندوستان کے بودھی راجاؤں میں اسلام کی طرف جو رجحان پیدا ہو رہا تھا، دربار کے بودھ پرست پنڈتوں کو اس کی روک تھام کی بڑی فکر رہا کرتی تھی، منجملہ ان راجاؤں کے ایک راجہ کا ذکر ہے کہ اس نے اپنا میلان اسلام کی طرف ظاہر کیا تھا، اور اُس کے دربار کے پنڈت نے اُسے سمجھانا چاہا، یہ واقعہ دو طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے، ایک یہ کہ پنڈت نے راجہ کو سمجھایا کہ یہ مذہب دلیل و برہان کا نہیں، بلکہ صرف تلوار کی قوت سے پھیلتا ہے، چنانچہ راجہ نے ہارون رشید کو لکھا کہ تم ایک ایسے گروہ کے سردار ہو جو انصاف پسند نہیں، وہ صرف تقلیدی مذہب رکھتے ہیں، اور تلوار سے غلبہ پاتے ہیں، اگر تم کو اپنے مذہب

---

[۱۵] کامل ابن اثیر واقعات ۱۵۱ھ،

کی صداقت کا یقین ہے تو کسی کو میرے پاس بھیجو کہ میں اس سے مناظرہ کروں، اگر حق تمہاری طرف ہوا تو میں مسلمان ہو جاؤں گا، اور اگر حق میری طرف ہوا، تو تم کو میرا مذہب قبول کرنا ہوگا، ہارون نے یہ خط پاکر ایک محدث کو سندھ روانہ کیا، راجہ نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی، مناظرہ شروع ہوا، پنڈت نے راجہ کی طرف سے محدث موصوف کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ بتاؤ تمہارا خدا قادر علی الاطلاق ہے یا نہیں، محدث نے جواب دیا بے شک ہے، پنڈت نے کہا تو کیا وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ اپنے مثل آپ پیدا کرے، ؟ اگر کر سکتا ہے تو وہ قادر علی الاطلاق نہیں ہوا، محدث نے یہ لفظی گورکھ دھندے سن کر کہا کہ یہ کلامی مباحث ہیں، جن میں پڑنا ہم بدعت سمجھتے ہیں، پنڈت نے راجہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ حضور نے دیکھ لیا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ ثابت ہوا، راجہ نے پھر ہارون رشید کو لکھا کہ پہلے تو صرف لوگ یہ کہتے تھے، کہ اسلام دلیل اور برہان کا مذہب نہیں، اور مجھے ان کے کہنے کا یقین نہ تھا، اب تو بداہتہً معلوم ہو گیا کہ وہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں، سچ کہتے ہیں، اور مجھے یقین ہو گیا کہ تمہارا مذہب غلط ہے، ہارون کے پاس یہ خط پہنچا تو اس پر قیامت گذر گئی اور نہایت دلتنگ ہوا، اور اہل دربار سے کہا کہ کیا اب اس دین کا کوئی ایسا حامی نہیں، جو اس کی طرف سے لڑ سکے، لوگوں نے عرض کی کیوں نہیں بہت ہیں، پوچھا وہ کون ہیں، جواب دیا وہی لوگ جن کو حضور والا نے دین میں بحث و جدال سے روک دیا ہے، خلیفہ ہارون رشید نے ان کو حاضر ہونے کا حکم دیا، وہ آئے تو اس نے راجہ کا اعتراض اُن کے سامنے رکھا، اُن میں سے ایک نوعمر متکلم نے آگے بڑھ کر کہا کہ یہ سوال ہی غلط ہے، جو مخلوق ہوگا وہ حادث ہوگا، اور جو حادث ہوگا، وہ قدیم کے مثل نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ سوال کہ خدا جو قدیم یعنی ازلی و ابدی ہے، وہ اپنا مثل پیدا کر سکتا ہے یا نہیں، ایسا ہو جیسے کوئی یہ سوال کرے کہ خدا اپنے کو عاجز یا جاہل بنا دینے پر قدرت رکھتا ہے یا نہیں؟ خلیفہ ہارون رشید اس نوعمر متکلم کا جواب سن کر بہت خوش ہوا، اور حکم دیا کہ اسی کو راجہ کے دربار میں بھیجا جائے، درباریوں نے

عرض کی کہ ممکن ہے کہ وہاں اور بھی کچھ مشکل سوالات پیش ہوں جن کا جواب یہ نوعمر متکلم نہ دے سکے اسلئے کسی تجربہ کار کو بھیجنا چاہیئے، چنانچہ معمر ایک مشہور متکلم کا انتخاب ہوا، اور اس کو مناظرہ کے لئے ہندوستان بھیجا گیا، پنڈت معمر کی شہرت سُن چکا تھا، اُس نے خیال کیا کہ اگر معمر صحیح وسالم راجہ تک پہنچ گیا، تو پھر خیریت نہیں، اس لئے اُس نے راستہ ہی میں زہر دے کر اس غریب کا کام تمام کرا دیا[1]

اس واقعہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہندستان کے بعض راجاؤں نے ہارون رشید کو لکھا کہ اپنے ہاں سے اسلام کا کوئی عالم ہمارے یہاں بھیجئے جو مجھے اس مذہب سے باخبر کرے، اور ہمارے پنڈت سے مناظرہ کرے، ہارون نے ایک محدث کو بھیجا، پنڈت نے راستہ ہی میں کسی کو بھیج کر جانچ لیا، کہ یہ کس قابلیت کا آدمی ہے، محدث صاحب جب دربار میں پہنچے تو راجہ نے سب پنڈتوں کو جمع کیا، اور مناظرہ شروع ہوا، ایک پنڈت نے پوچھا کہ تمھارے مذہب کی صداقت کی کیا دلیل ہے؟ محدث نے ایک سلسلۂ سند سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث بیان کی کہ یہ مذہب سچا ہے، پنڈت نے کہا تو تم نے جس شخص سے یہ قول نقل کیا، اس کو کیونکر جانا کہ وہ اپنے دعوائے نبوت میں صادق تھا، محدث صاحب نے اس کے ثبوت میں قرآن پاک کی چند آیتیں تلاوت کیں، پنڈت نے کہا تم نے کیونکر جانا کہ یہ خدا کا کلام ہے، محدث صاحب یہ طرز گفتگو و بحث سُن کر خاموش ہوگئے، راجہ نے باعزاز تمام اُن کو واپس کر دیا، اور ہارون کو لکھا کہ کسی متکلم کو بھیجئے جو اصل مذہب کی صداقت کی دلیلیں ہمارے سامنے پیش کر سکے، ہارون نے خلدہ نام ایک متکلم کو بھیجا، ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ پنڈت نے اُس کے پاس بھی آدمی بھیج کر امتحان لیا. کہ وہ کس قابلیت کا آدمی ہے، اور ڈر کر راستہ ہی میں اُس کو زہر دلوا دیا، اور وہ مر گیا،[2]

---

[1] ذکر المعتزلہ یحییٰ زبیدی طبع حیدرآباد ص ۳۲، [2] ایضاً ص ۳۵،

اس واقعہ سے مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ اسلام ہندوستان میں آہستہ آہستہ اپنے اثرات پھیلا رہا تھا، اور لوگوں میں یہ خیالات پیدا ہورہے تھے کہ یہ آخر یہ مذہب کیا ہے؟ اور کہاں تک یہ سچا ہے؟ غرض اسلام بھی ہندوستان کا ایک قابلِ وقعت مذہب بن گیا۔ اور اسی لئے جب کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں کو سندھ کے کسی علاقہ سے بے دخل کیا تو اکثر مسجدوں کا احترام قائم رکھا، اور وہاں کے مسلمانوں کے جمعہ و جماعت میں خلل نہیں ڈالا، مامون المتوفی ۲۱۸ھ کے عہد میں ایک مسلمان افسر نے سندان واقع کچھ کو فتح کر لیا، اور پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہندوؤں نے اس کو واپس لے لیا تو وہاں کی مسجد کو علیٰ حالہٖ باقی رکھا، اور اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، وہاں جتنے مسلمان رہ گئے تھے، وہ اس میں نماز ادا کرتے تھے، اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے[۱]

ہارون رشید اور مامون کے زمانہ میں سندھ کے جو حکما اور اطبا بغداد گئے تھے، اُن میں بہت سے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، البتہ ایک شخص صالح بن بہلہ ہندی نے اسلام ضرور قبول کر لیا تھا، آج کل کے محققوں نے صالح کے عربی نام کو الٹ پھیر کر ہندی نام کے قریب کرنا چاہا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ یہ کسی ہندی نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے، مگر اس نکتہ پر اُن کی نظر نہیں پڑی کہ یہ ہندی نہیں خالص عربی نام ہے، جو اس ہندی حکیم نے مسلمان ہونے کے بعد اختیار کر لیا تھا، ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبار میں ابراہیم بن صالح کے علاج کے سلسلہ میں صالح کی جو گفتگو نقل کی ہے، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا، صالح کہتا ہے کہ "اے امیرالمومنین! تو اما م ہے، اگر ایسا ہو (یعنی خدانخواستہ اگر ابراہیم کی اس شب میں موت ہو جائے) تو میرے تمام غلام خدا کی راہ میں آزاد اور میری تمام سواریاں خدا کی راہ

---

[۱] بلاذری طبع یورپ، ص ۴۴۶،

میں وقف، اور میرا تمام مال و اسباب مسکینوں کے لئے صدقہ، اور میری سب بیویوں پر تین طلاقیں واقع ہوں[1]" کیا یہ کسی غیر مسلم کی گفتگو ہو سکتی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سندھ میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے وِدّوان پنڈت اور پڑھے لکھے لوگ بھی اسلام کے اثر سے متاثر تھے،

اس زمانہ میں مسلمانوں میں صرف دینی اور ادبی علوم رائج تھے، یعنی قرآن تفسیر، حدیث، فقہ اور شعر و ادب، چنانچہ سندھ کے نومسلموں نے ان فنون میں کامل دستگاہ پیدا کی، رجال کی کتابوں میں سندھ کے متعدد علما، اور محدثین کے نام ملتے ہیں، ابو معشر نجیح السندی، سندھ کے ایک غلام زادہ تھے، اپنے آقاؤں کے ساتھ سندھ سے عرب گئے، وہاں آزاد ہو گئے، اور انھوں نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی، کچھ دنوں کے بعد وہ اسی مدینہ کی نسبت سے مشہور ہوئے اور اب ابو معشر نجیح بجائے سندی کے مدنی کہلاتے ہیں، فنِ مغازی و سیر میں انھوں نے وہ کمال پیدا کیا، کہ امام الفن کہلائے لیکن زبان سے سندیت نہ گئی، عربی صحیح مخارج سے ادا نہیں کر سکتے تھے، تاہم شاگردوں کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا، ۱۷۰ھ میں انھوں نے جب وفات پائی، تو فرمانروائے وقت خلیفہ ہارون رشید اس نومسلم سندھی عالم و امام فن کی نماز جنازہ کا امام تھا،

ایک بزرگ رجاء السندی ہیں، جو عرب کے بجائے ایران پہونچے، اور اسفرائینی ہو کر مشہور ہوئے یہ فنِ حدیث کے باکمال استاد تھے، مشہور محدث حاکم اُن کے بارے میں کہتے ہیں، رکن من ارکان الحدیث، یہ نہ صرف خود محدث اور حافظ حدیث تھے، بلکہ اُن کے خاندان میں اور بہت سے حفاظ حدیث پیدا ہوئے، ۲۲۱ھ میں وفات پائی،

ابو عطاء السندی ایک ادیب گذرا ہے جس کے فضل و کمال ادبی کا شاہد صرف یہ واقعہ ہے

---

[1] طبقات الاطبا، طبع مصر ج ۲ ص ۳۴،

کہ ابو تمام نے حماسہ میں اُن کے عربی اشعار داخل کئے، سندھی بن شاہک ایک سندھی بزرگ بغداد پہنچکر بغداد کے پل پر فردکش ہوئے تھے، اُن کی نسل سے کشاجم پیدا ہوا جو عربی کا مشہور شاعر گذرا ہے، ابو نصر فتح بن عبداللہ السندی، ایک سندھی غلام تھے، تعلیم پاکر نکلے، تو الفقیہ المتکلم بن گئے، [۱]

خاص ہندوستان میں جہاں اسلام کی سلطنت نہ تھی، وہاں مسلمان تاجر موجود تھے، وہ بھی اپنے فرض (دعوت و تبلیغ اسلام) سے غافل نہ تھے، ہندوستان میں کشمیر، ملتان اور کابل کے بیچ میں ایک شہر عسیفان نام کا تھا، (معلوم نہیں اس کا اصلی لفظ ہندی تلفظ کیا ہے؟ تاہم اپنے جغرافیائی حدود کے لحاظ سے وہ پنجاب ہی کا کوئی شہر ہو سکتا ہے) وہاں ایک بڑا بدخانہ (بودھ خانہ یا بتخانہ) تھا جس کا وہاں کا راجہ معتقد تھا، اور اُس کے پجاریوں کو وہ بہت کچھ نذرانے دیا کرتا تھا، اتفاق سے راجہ کا بیٹا بیمار پڑا، راجہ نے تمام پجاریوں کو بُلا کر کہا کہ تم سب مل کر اُس بڑے بُت سے التجا کرو کہ وہ میرے بیٹے کو اچھا کر دے پجاری تھوڑی دیر کے بعد آئے، اور اطلاع دی کہ ہم سب نے اس سے التجا کی، اور اُس نے کہا ہے کہ یہ اچھا ہو جائے گا لیکن لڑکا اُس کے بعد ہی مر گیا، راجہ کو اپنے مذہب سے سخت نفرت ہو گئی، بُت خانہ کو ڈھا دیا، بودھ کی مورت کو توڑ دیا، پجاریوں کو قتل کر ڈالا، اُس کے بعد اس کے ملک میں جو مسلمان تاجر تھے، اُن کو بلوایا، ان تاجروں نے اس کے سامنے توحید پیش کی، راجہ مسلمان ہو گیا[۲]، ممکن ہے کہ اس واقعہ کا اثر اُس کی رعایا پر نہ پڑا ہو، اور وہ اسلام سے متاثر نہ ہوئی ہو، یہ واقعہ معتصم باللہ المتوفی ۲۲۷ھ کے عہدِ حکومت کا ہے،

اسی طرح اسلام آہستہ آہستہ اپنا راستہ آپ صاف کرتا چلا جاتا تھا، سندھ میں ساوندری نام ایک مقام تھا، خدا جانے اب ہے یا نہیں، یہاں کے باشندوں نے محمد بن قاسم کے زمانہ میں

---

[۱] دیکھو انساب سمعانی لفظ "سندی"، [۲] بلاذری ص ۴۴۶،

اسلام نہیں قبول کیا تھا، مگر ایک شرط پر محمد بن قاسم نے اُن سے صلح کر لی تھی، اور وہ یہ تھی کہ مسلمان جب اُن کے پاس سے گذریں تو وہ اُن کی مہمانی کریں، اور اُن کو راستہ بتا دیں، اُس کے ڈیڑھ سو برس کے بعد بلاذری فتوح البلدان میں لکھتا ہے کہ "آج ساوندری کے تمام باشندے مسلمان ہیں[1]" بلاذری نے اپنی یہ کتاب ۲۵۵ھ میں لکھی تھی،

ہندی میں مذہب اسلام پر پہلا رسالہ

تیسری صدی کے آخر میں منصورہ سندھ کے پایۂ تخت میں عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز حاکم تھا، کشمیر بالا وزیریں کے بیچ میں الرا کا راجہ تھا، جو ہندوستان کے تمام راجاؤں میں بڑا تھا، اس کا نام مہروگ اور اس کے باپ کا نام رائگ تھا، ۲۷۰ھ میں اُس نے منصورہ کے حاکم کو لکھا کہ میرے پاس کسی ایسے شخص کو بھیج دیجئے جو مجھے ہندی زبان میں اسلام کی شریعت آکر سمجھا دے، منصورہ میں ایک عالم عراق کے باشندے تھے، جو نہایت ہشیار، سمجھدار اور شاعر تھے، اور ہندوستان میں مدت تک رہ جانے کے باعث یہاں کی زبانوں کو اچھی طرح جانتے تھے، اور اُن میں شعر تک کہتے تھے، عبداللہ بن عمر حاکم منصورہ نے اُن کو بلوا کر، راجہ کی خواہش سے اُن کو مطلع کیا، انھوں نے ایک قصیدہ میں اسلام کے تمام ضروری مسائل کو لکھ کر نظم کر دیا، اور اُس کو راجہ کے پاس بھیج دیا، راجہ یہ قصیدہ سُن کر بہت خوش ہوا، اور عبداللہ کو لکھا کہ اس قصیدہ کے مصنف کو اُس کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ وہ عراقی عالم راجہ کے پاس گئے، اور تین برس اُس کی خدمت میں رہے، جب وہ راجہ کے یہاں سے لوٹ کر آئے تو عبداللہ نے راجہ کا حال پوچھا، انھوں نے اوس کے حالات بیان کئے، اور کہا کہ میں نے اس کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ دل اور زبان دونوں سے مسلمان ہو چکا تھا، لیکن حکومت چھن جانے کے خوف سے وہ برملا اپنے اسلام کا اعلان نہیں کرتا،

---

[1] بلاذری ص ۴۳۹

ہندی میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ

عالم عراقی نے بیان کیا کہ راجہ نے مجھ سے خواہش کی کہ ہندی زبان میں میں اُس کو قرآن پاک کا ترجمہ سنایا کروں، چنانچہ سورۂ یٰسین (بائیسواں پارہ) تک میں نے اس کو ہندی میں ترجمہ کر کرکے سنایا، ایک دفعہ قرآن کی یہ آیت آئی،

قال من یحیی العظام وھی رمیم	کہنے لگا کون ان سڑی گلی ہڈیوں میں
قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ	پھر جان ڈالے گا، کہہ دو وہی اُن میں
وھو بکل خلق علیم،	جان ڈالے گا جس نے ان کو پہلے
	پیدا کیا، اور وہ سب بنانا جانتا ہے،

جب میں نے راجہ کو اس آیت کا ترجمہ سنایا، تو وہ ایک سونے کے تخت پر جس میں بیش قیمت جواہرات لگے تھے، بیٹھا تھا، اُس نے سُن کر کہا، پھر اس کو دہرایا، میں نے پھر دہرایا، وہ دفعۃً تخت سے اترا، اور چند قدم چل کر ایک نم زمین پر جو پانی چھڑکنے سے تر تھی، اپنے گال رکھدیئے، اور خوب رویا، یہاں تک کہ اُس کا چہرہ خاک آلودہ ہوگیا، اور بے اختیار بول اٹھا کہ "یہی وہ پہلا اور ازلی معبود ہے، جس کا سا کوئی نہیں"، انھوں نے کہا کہ راجہ نے ایک گھر بنالیا ہے، اور یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اس میں ایک خاص غرض کے لئے تنہائی چاہتا ہے، مگر وہ اس میں چھپ کر درحقیقت نماز پڑھتا ہے[1]،

تیسری صدی جب ختم ہورہی تھی اور چوتھی صدی کا آغاز تھا کہ عراق کا سیاح مسعودی سندھ اور ملتان میں داخل ہوا، اس وقت سندھ کے تمام سیاسی روابط اور تعلقات بغداد کی مرکزی حکومت سے منقطع ہوچکے تھے، اور خود سندھ میں عربوں کی دو تین خود مختار ریاستیں پیدا ہوگئی تھیں، اور باقی اسلامی مقبوضات پر ہندو راجہ دوبارہ قابض ہوگئے تھے، مگر وہ مسلمانوں

---

[1] عجائب الہند بزرگ بن شہریار ناخدا مصنفہ ۳۰۰ھ طبع لیڈن ص ۲،

کے مذہبی رسوم سے بالکل تعرض نہیں کرتے تھے لیکن مسلمانوں سے اُن کی سیاسی معرکہ آرائیاں قائم رہتی تھیں، وہ قنوج کی سلطنت کا ذکر کرتا ہے، اور اس کے حدود یہ بتاتا ہے کہ شمال میں ملتان اور جنوب میں مانکیر (دکن) ہے اور کہتا ہے کہ "اس سلطنت کے شمال میں امیر ملتان اور جو اس کے ساتھ مسلمان ہیں، اُن سے لڑائی رہتی ہے"

ملتان میں بنو اسامہ بن لوئی بن غالب ایک عرب قریشی خاندان کی حکومت ہے" اس کے پاس بڑی فوج اور قوتِ مدافعت ہے، اور مسلمانوں کی سرحدوں میں سے ایک سرحد ہے، اور اس سلطنت میں ایک لاکھ کے قریب گاؤں آباد ہیں، یہاں ہندوؤں کا ایک بڑا بت خانہ ہے، جس کی زیارت کو دور دور سے ہندو آیا کرتے ہیں، اور اس پر نذر و نیاز چڑھایا کرتے ہیں، اور بڑی دولت اس میں جمع ہوا کرتی ہے، جب کوئی راجہ ملتان پر حملہ کی تیاری کرتا ہے، تو امیر ملتان دھمکی دیتا ہے کہ تم حملہ کروگے تو میں بتخانہ تباہ کر دوں گا، اس ڈر سے حملہ آور واپس چلے جاتے ہیں"

اس کا بیان ہے کہ "سندھ میں بھی اس وقت ایک اسلامی ریاست قائم ہے، جس کا صدر مقام منصورہ ہے، اور میرے جانے کے وقت عمر بن عبداللہ (یہی وہ عبداللہ ہے جس نے راجہ الرا کے پاس عراقی عالم کو بھیجا تھا،) حکمراں تھا، اور اسی کے دربار میں ایک وزیر عرب امیر اور وہاں کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ حمزہ سے بھی ملاقات ہوئی، یہاں سادات علویین کی بڑی تعداد ہے، ان کے علاوہ عرب اور اسلام کے بعض اور مشہور خاندان بھی آباد ہیں، منصورہ کا شاہی خاندان بنو عمر بن عبدالعزیز کہلاتا ہے، یہ عمر بن عبدالعزیز اموی نہیں بلکہ ہبار بن اسود قریشی کی نسل سے عمر بن عبدالعزیز نام ایک دوسرے شخص کی اولاد ہیں"[1]

۳۰۳ھ میں وہ کھنبایت بھی جاتا ہے، جہاں مسلمانوں کی معتدبہ تعداد آباد تھی، اور

---

[1] مروج الذہب مسعودی طبع یورپ ج اول ص ۳۷۴ - ۳۷۷،

جہاں کا راجہ مناظرہ کا بڑا شائق تھا، اور جب کوئی مسلمان اُس کے پاس پہونچتا تھا تو اس سے مباحثہ کرتا تھا، [۱]

مسعودی کے تقریباً ۵۰ برس کے بعد بشاری مقدسی بیت المقدس کا ایک مسلمان عالم ہندوستان کی سیاحت کو آتا ہے، ۳۷۵ھ کے گرد و پیش میں وہ اپنا سفرنامہ ترتیب دیتا ہے، وہ سندھ کی سلطنت کو کئی حصوں میں منقسم پاتا ہے، وہ اُس کی آس پاس کی سلطنتوں، اور حکمرانوں کا بھی ذکر کرتا ہے، ملتان اور منصورہ کی اسلامی ریاستیں اس کے زمانۂ قیام میں بدستور قائم تھیں، صرف اس قدر فرق تھا، کہ ملتان کی اسلامی ریاست کا مذہب اسلامی شیعہ تھا، جس کے تعلقات براہِ راست مصر کے اسماعیلی فاطمی خلفاء کے ساتھ قائم تھے، اور منصورہ کے بادشاہ اہلِ سنت تھے، اور جو خلفائے بغداد کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے، بشاری مقدسی نے بھی ملتان کے بت خانہ کا ذکر کیا ہے، اور اُس کی مورت کی جو کیفیت لکھی ہے اس سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا، کہ یہ بودھ ہی کی مورت تھی، اور یہ بودھوں کا معبد تھا،

بشاری ویہند نام ایک شہر کا نام لیتا ہے، اور اس کی بڑی تعریف کرتا ہے، ابوالفدا بیرونی کے حوالہ سے تقویم البلدان میں ویہند کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ گندھار کا پایۂ تخت ہے، اور یہ وادی سندھ میں واقع ہے" اور ادریسی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ "گندھار اور نہر والہ (قریب احمد آباد گجرات) کے درمیان پانچ منزلوں کی مسافت ہے" وینسنٹ اے اسمتھ صاحب دی ارلی ہسٹری آف انڈیا (ج ۱ ص ۳۴۵) میں اوہند نام کے دارالسلطنت کو دریائے سندھ پر جگہ دیتے ہیں، اور لکھتے ہیں، کہ مسلمانوں کے ۸۷۰ء میں کابل فتح کر لینے کے بعد دارالسلطنت اوہند کو منتقل ہو گیا، جو دریائے سندھ پر واقع تھا، اور یہ ہندو شاہیہ خاندان کا پایۂ تخت ہوا" بہرحال چوتھی صدی کے آخر میں بشاری

---

[۱] مروج الذہب مسعودی طبع یورپ ج اوّل ص ۲۵۴،

کا بیان ہے کہ یہاں گو آبادی کا بڑا حصہ غیر مسلم ہے، مگر یہاں تھوڑی سی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے اور اُن کی الگ ایک ریاست ہے[۵۱]

قنوج جس سے مراد غالباً وہ شمالی ہند کی پوری سلطنت ہے، جس کا پایہ تخت قنوج تھا اور جس کے حدود اس زمانہ میں کشمیر، پنجاب، سندھ اور گجرات تک پھیلے تھے، بشاری کہتا ہے "یہاں بھی مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے، سلطنت گو ہندوؤں کی ہے، اور غلبہ انہی کو حاصل ہے، مگر ایک چھوٹی سی الگ ریاست مسلمانوں کی بھی ہے[۵۲]" پھر لکھتا ہے "یہاں گوشت بہت ملتا ہے اور بہت سستا ملتا ہے، یہاں مسلمانوں کی زیادہ تر غذا گیہوں ہے" اور یہاں علماء اور مسلمان معززین بھی ہیں، اور جامع مسجد بھی ہے، جو شہر پناہ کے اندر واقع ہے[۵۳]"

منصورہ کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ سندھ کا پایۂ تخت ہے، دمشق کے مثل ہے، ...... جامع مسجد بہت بڑی ہے، جو پتھر اور اینٹ سے بنی ہے، جیسی عمّان کی جامع مسجد ہے، ساکھو کے ستون ہیں" اور چار دروازے ہیں، .... یہاں کے باشندوں میں اسلام کی بڑی تازگی ہے" اور علم بھی ہے، آبادی بہت ہے، تجارت کی گرم بازاری ہے، ..... غالب تعداد کفار کی ہے" دیبل (موجودہ کراچی) میں بھی وہ مسلمانوں کی تعداد کم بتاتا ہے، اسی طرح بنتلی کی نسبت بھی کہتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی تعداد تھوڑی ہی ہے[۵۴]

وزیر مہلبی جس نے چوتھی صدی ہجری میں اپنا جغرافیہ لکھا ہے، اُس نے سندھ کے شہروں میں بیرون نام شہر کو جو دیبل اور منصورہ کے بیچ میں تھا، اور منصورہ سے پندرہ فرسنگ دور تھا، خالص اسلامی آبادی بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ "یہاں کے باشندے مسلمان ہیں بعض لوگ مشہور

---

۵۱ احسن التقاسیم لمعرفۃ الاقالیم بشاری مطبوعہ لیڈن ص ۴۸۵، ۵۲ ایضاً، ۵۳ ایضاً ص ۴۸۰،

۵۴ احسن التقاسیم لمعرفۃ الاقالیم بشاری ص ۴۷۹،

مسلمان فلسفی اور ریاضی داں البیرونی کو جو بو علی سینا کا ہم پلّہ تھا ، اور جس نے ہندوؤں کے علوم پر سب سے مستند کتاب لکھی ہے ، اور سنسکرت کا بڑا عالم تھا یہیں کا رہنے والا بتایا ہے۔[۵۱]

عام سندھ کی مذہبی حیثیت کے متعلق بشاری کا بیان ہے کہ

"یہاں کی عام رعایا بت پرست ہے ، یہاں واعظوں کا نام و نشان نہیں ، اور نہ وعظ گوئی کی یہاں اہمیت ہو ، یہاں کے مسلمان عام طور سے اہلحدیث ہیں ، یہاں کے قاضی ابو محمد منصوری کو میں نے داؤدی ، مذہب (ظاہری) کا پیرو پایا ، یہ اپنے مذہب کے امام تھے ، اور یہ درس بھی دیتے تھے ، اور اُن کی چند تصنیفیں بھی ہیں ، اور ملتان کے لوگ شیعہ ہیں ، .... بایں ہمہ ملک دوسرے فقہا کے پیرؤں سے خالی نہیں ہے ، امام ابو حنیفہ کے پیرو شہروں میں پائے جاتے ہیں ، لیکن یہاں مالکی حنبلی ، اور معتزلہ نہیں ہیں ، اُن کے عقائد اور طریقے اچھے ہیں"[۵۲]

قصدار یا قزدار نام ایک مشہور شہر ہندوستان کی افغانی سرحد پر ملتان سے بیس منزل کی مسافت پر واقع تھا ، محمود غزنوی نے چوتھی صدی کے اختتام پر اس کو فتح کیا ، لیکن محمودی فتوحات سے پہلے وہ شہر محمدی فتوحات میں داخل ہو چکا تھا ، غالباً چوتھی صدی کے وسط میں ایک معتزلی متکلم و مناظر ابو الحسن علی بن لطیف جب یہاں پہونچے ہیں ، تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں خارجی مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے ، اُن کی مسجد بھی ہے ، بعض اہل حرفہ بھی ہیں ، خوارج کا ایک امام بھی ہے ، شہر میں بڑا امان ہے ، چوری کا نام و نشان نہیں ،[۵۳]

ان اقتباسات سے ظاہر ہوگا کہ اس سے پہلے کہ محمود غزنوی کی تلوار ہندوستان کی فضا میں

---

۵۱ تقویم البلدان ابو الفدا طبع یورپ ص ۳۴۸ ؛ ۵۲ بشاری ص ۴۸۱ ؛ ۵۳ معجم البلدان یاقوت رومی طبع مصر جلد ۷ ، ص ۸۰

غیظ و غضب کی بجلی بن کر گرے، ہندوستان کے متعدد گوشے اسلام کے نور سے روشن ہو چکے تھے اُور اسلامی تمدن، اسلامی مذہب، اسلامی طور طریقے پھیل چکے تھے، یہاں تک کہ ان میں فرقہ بندیاں شروع ہو گئی تھیں، اور اسلام کا یہاں کے معتبر اور مستند مذاہب میں شمار ہونے لگا تھا، اور مسلمانوں کی تعداد کسی قدر کم سہی، مگر اس کا سلسلہ دریائے سندھ سے لیکر ایک طرف قنوج تک اور دوسری طرف ملتان کشمیر اور قصدار تک پھیل چکا تھا، اور یہاں کے راجاؤں میں اس کی طرف خاصہ میلان پیدا ہو گیا تھا،

(باقی)[1]

(معارف جنوری و مئی و اگست ۱۹۲۴ء)

---

[1] افسوس ہے کہ یہ محققانہ مضمون نامکمل رہ گیا، اور پھر مصنفؒ کو اس کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا،

"مرتب"

بدنصیب کشمیر

اور

عدلِ شاہجہانی کا نقشِ سنگی

آج کل اخبارات میں مسلمانانِ کشمیر کی مظلومی کی داستانیں پڑھ کر دل دہل جاتا ہے کہ یہ ملک کے اُن باشندوں کا حال ہے جو وہاں کی ۹۵ فی صدی آبادی پر قابض ہیں، اور یہ مسلمان باشندے عموماً باہر سے آئے ہوئے نہیں، بلکہ زیادہ تر خود اصل ملک کے باشندے ہیں، اور انھوں نے صرف یہ جرم کیا ہے کہ اپنے مذہب کو بدل ڈالا ہے،

یہ ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ اس ۹۵ فیصدی آبادی کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں، اُن کے اوقاف وعمارات کا کوئی خبرگیراں نہیں، اُن کی بعض بعض مسجدیں دفاتر سرکاری اور حکام کے سکونتی مکانات کا کام دیتی ہیں، محصولوں اور ٹیکسوں کی کثرت نے مسلمان کاشتکاروں کو مفلوک الحال بنا رکھا ہے مختلف صنعتوں اور پارچہ بافی کے اکثر کاریگر مسلمان ہیں، مگر وہ خود اپنی کمائی سے اپنی دولت نہیں حاصل کر سکتے، کل کا قصہ ہے کہ ایک سرکاری کارخانہ کو بند کر کے سیکڑوں مسلمانوں کو بیکار کر دیا گیا، حضرت شاہ ہمدانؒ کی خانقاہ کی بے حرمتی، اور اس کے ایک حصہ کے انہدام کے واقعات اخبارات میں آچکے ہیں، کشمیر تیموریوں کے عہد میں دنیا کی جنت بن گیا تھا مگر آج کوئی جا کر دیکھے کہ یہ جنت دوزخ بن گئی ہے، اور لاکھوں آدمی وہاں سے اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر

پنجاب کے مختلف شہروں میں آباد ہو گئے ہیں

سلطان زین العابدین والی کشمیر نے جس عدل وانصاف، بے تعصبی، اور رواداری سے اس ملک پر سلطنت کی، اُس کا حال تاریخ کے اوراق بتائیں گے لیکن تیموریوں نے جس شان سے اس "خطۂ کشمیر جنت نظیر" کی تربیت، پرورش اور نشوونما کی تھی، اکبر جہانگیر اور شاہجہاں کے کارناموں کا کوئی صحیفہ نہیں جس میں اُس کے آیاتِ باہرات نہ ہوں،

لیکن آج ہم جو چیز اُس کی دلیل اور شہادت میں پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ کاغذی تحریر اور تاریخی دفتر نہیں، بلکہ سنگی نقش ہے، جس کو پڑھ کر کشمیر میں تیموریوں کے عدل و انصاف کے کارنامے "نقش فی الحجر" ہو جائیں گے،

تیموریوں کے عہد میں اس خطہ پر جن صوبیداروں نے حکومتیں کیں، اُن میں سب سے مشہور اور نامور ظفر خاں ہے، کشمیر میں ظفر خاں سے پہلے جو صوبیدار تھا، اُس نے بہت سی بدعتیں رائج کی تھیں، ظفر خاں نے بحکم شاہجہانی ان تمام بدعتوں کا ازالہ کیا،

ظفر خاں پہلے پہل ۵ سنہ جلوس شاہجہانی میں اپنے باپ کی طرف سے نائب ہو کر کشمیر کا صوبیدار مقرر ہوا، ایک سال کے بعد اپنے باپ کی وفات پر وہ اس خطہ کا مستقل صوبیدار بنایا گیا، اور ۱۲ سنہ جلوس تک اس عہدہ پر فائز رہ کر معزول ہوا، اور تربیت خاں وہاں کا صوبیدار ہوا، ۱۵ سنہ جلوس میں کشمیر میں قحط پڑا، شاہجہاں نے وہاں کے فاقہ زدہ باشندوں کی اعانت میں کوئی کمی اٹھا نہیں رکھی، مگر بادشاہ کو معلوم ہوا کہ تربیت خاں سے اس کا انتظام بن نہ آیا، اسلئے ناچار پھر کشمیر کی صوبیداری کا قرعۂ فال ظفر خاں کے نام پڑا، مآثر الامراء (ج ۲ - ص ۵۹۷) میں بعینہٖ ظفر خاں مذکور ہے،

"چوں بعرض رسید کہ تربیت خاں صوبہ دار کشمیر با وصف صدور تاکید دار سال

زرِ نقد باحوالِ مساکین آنجا کہ دراں سال قحط رو دادہ بود، چنانچہ بایدمی پرداخت، مرتبۂ ثانی خان مذبور بصوبہ داری کشمیر دستوری یافت"

سنہ جلوس میں جب شاہجہاں خود کشمیر گیا، اور دیکھا کہ خان مذکور نے رعایا کی خاص ہر دلعزیزی حاصل کرلی ہے (در جائزۂ حُسن سلوکے کہ رعایا و سکنۂ آنجا از خود راضی داشتہ) اس کا مرتبہ و اعزاز بڑھایا، سنہ جلوس میں ظفر خان یہاں سے علیحدہ ہوکر صوبہ ٹھٹھ کا صوبہ دار مقرر ہوا، اور بالآخر دارا شکوہ کے فتنہ میں ہر طرف سے کنارہ کش ہو کر لاہور میں اقامت گزیں ہوا، اور یہیں سنہ ۱۰۷۳ھ میں پیوند خاک ہوگیا،

ظفر خاں کی علمی و ادبی خدمات کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں، یہاں صرف اس کے اُن انسانی خدمات کا تذکرہ مقصود ہے، جو اُس نے اہلِ کشمیر پر اپنے عہدِ صوبہ داری میں کئے، اُس نے شاہجہاں سے ایک فرمان حاصل کیا، جس کے رو سے اس کو جدید اصلاحات کا پورا اختیار حاصل ہوگیا، پھر اس غرض سے کہ یہ فردِ اصلاحات اگر کاغذی صورت میں سرکاری دفاتر میں رہی، تو ممکن ہے کہ آئندہ صوبہ دار اس کو کام میں نہ لائیں، اور رعایا اس سے ناواقف ہو کر اس سے اجرا اور بحالی کا کوئی مطالبہ نہ کرسکے، بنا بریں ظفر خاں نے اس فرمان شاہی کو سری نگر کشمیر کی جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کے باہر کی طرف ایک سیاہ پتھر پر کھدوا کر نصب کرا دیا، تاکہ ہر آئندہ و روندہ کی اس پر بے تامل نظر پڑسکے،

ہم شکر گذار ہیں کہ غلام احمد صاحب ایک قدردان معارف نے پونچھ (کشمیر) سے اس فرمان کی ایک بعینہٖ نقل ہمیں عنایت فرمائی ہے، جو حسب ذیل ہے، ساتھ ہی ساتھ فارسی سے ناواقف اصحاب کے لئے اس کا اردو ترجمہ بھی بالمقابل کردیا گیا ہے،

اللہ اکبر

ترجمہ فرمان شاہجہانی	نقل فرمانِ سعادت نشان حضرت

سلیمان مکانی صاحبقران ثانی کہ تاریخ
ہشتم اسفندیار من ماہ الٰہی حسب الالتماس
کمترین خانہ زاداں احسن اللہ المخاطب
بہ ظفر خاں در باب برطرف نمودنِ بدعتہا
کہ در زمان صوبہ داران سابق در بلدۂ
دلپذیر کشمیر شدہ بود باعثِ خرابی
رعایا و سکنۂ ایں دیار بود، شرف
ورود یافتہ،

اس فرمان کی نقل جس کو شاہجہانی
۸ اسفندیار ماہ الٰہی کو احسن اللہ مخاطب
بہ ظفر خان کی درخواست پر ان خرابیوں
کو جو اس کے پیشرو صوبہ دار کشمیر کے
عہد صوبہ داری میں پیدا ہوگئی تھیں،
دور کرنے کے لئے لکھا ہے،

چوں ہمگی ہمت والانہمت مصروف
و معطوف بر فاہیت خلق است بنا
بریں بعضے امور کہ در خطۂ دلپذیر کشمیر
باعثِ آزار آن دیار می شد حکم
فرمودیم کہ برطرف باشد از جملہ ایں
مقدمات یکے آنست کہ

چونکہ ہماری تمامتر توجہ خلق کی بہبودی
کی طرف منعطف ہے، اس لئے علاقہ
کشمیر کی بعض کارروائیوں کے متعلق جو
اُن کے لئے تکلیف دہ ہیں، کہ ہم حکم
دیتے ہیں کہ

وقت چیدن زعفران مردم را بہ عنف می
بردند کہ زعفران بچینند و قلیلے نمک بعلت
اجورۂ آن باں مردم می دادند، ازیں
جہت باں جماعۃ آزار بسیاری رسد
حکم فرمودیم کہ تکلیف چیدن زعفران

(۱) زعفران کے جمع کرنے وقت لوگوں
کو زبردستی پکڑ کر مزدوری کے لئے لے
جاتے تھے، کہ زعفران چنیں، اور اس
کی اجرت میں تھوڑا سا نمک دیتے
تھے، اس سبب سے اُن لوگوں کو سخت

بہ کسے نہ کشید وآنچہ تعلق بخالصۂ شریف
داشتہ باشد، مزدوران را راضی ساختہ
اجورۂ واقعی بدہند وآنچہ تعلق بجاگیردار
داشتہ باشد، گل زعفران بجنس حوالہ
جاگیردار نمایند تا بہر طریقے کہ بخواہند
بچینند

مصیبتوں کا سامنا تھا، ہم حکم دیتے
ہیں کہ اب اس کام کے لئے کسی پر
زبردستی نہ کی جائے جو خالصہ شریف
(یعنی شاہی) سے متعلق ہو، اُن کے
مزدوروں کو راضی کرکے معقول اُجرت
دیں اور جو جاگیردار سے متعلق ہو، اُس کو
اس کو اسی حالت میں اس کے حوالہ
کر دیا جائے کہ جس صورت سے چاہے
اُسے چنوائے،

(۲) مقدمۂ دیگر آنست کہ در زمانِ بعضے
از صاحب صوبہائے کشمیر بر سر خردار
سالے دو دام بعلت ہیزم می گرفتہ اند
در عمل اعتقاد خاں چہار دام بآں علت
بر سر خروارے گرفتہ می شد، چوں ازیں
جہت آزار بسیار نیز برعایا می رسید بنا بریں
حکم فرمودیم کہ بالکل رعایا را از طلب ایں
وجہ معاف دارند وبعلت ہیزم ہیچ چیز
نگیرند،

(۲) بعض والیانِ صوبہ کشمیر کے عہد میں
ہر خروار پر ۲ دام لکڑیوں کے عوض لئے
جاتے تھے، اور اعتقاد خاں نے ۴ دام
اسی غرض سے وصول کئے چونکہ اس
سے رعایا کو سخت تکالیف کا سامنا
کرنا پڑتا ہے، اس لئے ہم نے حکم
دیا کہ اس کو سرے سے معاف کر دیا
جائے اور لکڑی کے عوض کوئی
چیز نہ لی جائے،

(۳) مقدمۂ دیگر آنست کہ دہے کہ جمع

(۳) ایک بات اور یہ ہے کہ جن دیہات

آں زیادہ از چہار صد خروار سالے بود
باشد، ازاں دو گوسفند حکام آنجا ہر سالہ
می گرفتہ اند[1]، اعتقاد خاں در ایام
صاحب صوبگی خود بجائے گوسفند
بر سر ہر گوسفندے شصت و شش
دام می گرفتہ چوں ازیں جہت نیز
بر رعایا آزار تمام می رسید، بالکلیہ حکم
فرمودیم کہ برطرف باشد، نہ گوسفند
بگیرند و نہ نقد باین علت و رعایا را از
گرفتن این وجہ معاف دارند،
(۴) دیگر اعتقاد خاں در ایام
صاحب صوبگی خود سراسری نمودہ
بر سر ہر ملاحے خواہ جوان خواہ پیر
خواہ خورد سال ہفتاد و پنج دام
می گرفت و معمول قدیم آں بودہ کہ
بر سر جوانے شصت و شش دام و

کی جمع ۴ سو خروار سے زائد ہو، اس
سے افسر ہر سال دو بکرے وصول
کرتے تھے، اعتقاد خان نے اپنے عہد
صوبہ داری میں ہر بکری کے دام ۶۶
دام وصول کرنے شروع کئے، اور
چونکہ یہ بھی رعایا کی تکلیف کا موجب
تھا، اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اُسے
بھی بالکل برطرف کر دیا جائے، نہ
بکریاں اور نہ نقد لیا جائے، رعایا کو
ہر قسم کے مطالبہ سے بری رکھا جائے
(۴) اعتقاد خاں اپنے زمانہ صوبہ
داری میں کسی قسم کے خیال کے بغیر
تمام ملاحوں[2] پر خواہ وہ جوان ہوں
بچے ہوں یا بڈھے، ۷۵ دام وصول
کرتا تھا، حالانکہ دستور قدیم یہ تھا
کہ جوان سے ۶۶ دام، بڈھے سے ۱۲ دام

---

[1] معارف: ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آج کل اُس کے بجائے ساٹھ بکریاں لیتے ہیں، اور موجودہ حکام اس کا کوئی انسداد نہیں کرتے،

[2] معارف: کشمیر میں عموماً امراء اور اہل سیاحت کشتیوں میں رہتے ہیں اور اُن کی وہاں بڑی آمد ہے، اور اب تک یہی حال ہے،

بہ سر پیرے دوازدہ دام و بر سر خورد
سالے سی و شش دام می گرفتہ اند،
حکم فرمودیم کہ دستور سابق را معمول
داشتہ بدعتے کہ اعتقاد خاں کرد،
برطرف دانند و بمقتضاے آں عمل
نکنند،

(۵) مقدمۂ دیگر آنست کہ صاحب
صوبہا در وقت میوہ در ہر باغ
در ہر باغچہ کہ میوۂ خوبے کہ گمان داشتہ
اند، کسان خود را تعین می نمودہ اند
کہ آن میوہ را بجہت آنہا محافظت نمایند
و نمی گذاشتہ اند کہ صاحبان آں
باغہا و باغچہا آن میوہ را متصرف شوند
ازیں جہت آزار بسیارے بآں جماعہ
رسیدہ، چنانچہ بعضے ازاں مردم درختہا
میوہ را دور ساختہ اند، حکم فرمودیم
کہ ہم صاحب صوبہ قرق میوۂ باغ و
باغچہاے نکنند،

می باید کہ حکام کرام و دیوانیان

اور بچے سے ۳۶ دام لئے جاتے تھے،
اس بنا پر ہم نے حکم دیا کہ اعتقاد
خاں نے جو بدعت شروع کی تھی
اس کو موقوف کرکے دستور قدیم
کے مطابق محصول وصول اور عمل
کیا جائے،

(۵) صوبہ داروں کا دستور رہا ہے کہ
فصل میوہ میں جن جن باغوں میں
اچھے میوے ہوتے تھے، اُن میں اپنے
آدمی حفاظت کے لئے مقرر کردیتے
تھے، اور ان باغوں اور باغچوں
کے مالکوں کو، اُن سے مستفید ہونے
کا کوئی موقع نہ ملتا تھا، اس وجہ سے
رعایا کو سخت پریشانی ہوتی، اور اسی
وجہ سے بعض مالکانِ باغ نے اپنے
درختوں کو کاٹ ڈالا ہے، ہم نے حکم
دیا کہ کوئی صوبہ دار کسی باغ یا باغچہ
کے میوہ پر قبضہ نہ کرے،

موجودہ اور آیندہ کے حکام کرام

کفایت فرجام و عمال حال و استقبال
صوبہ کشمیر این حکام جہاں مطاع را
مستمر و ابدی دانند و تغیر و تبدیل بقواعد
آن راہ نہ دہند، و ہرکس کہ تغیر و تبدیل
را راہ دہد بلعنت خدا و بغضب بادشاہی
گرفتار خواہد شد تحریراً فی تاریخ بست و
ششم آذر ماہ الٰہی،

عمال اور دیوانوں کو ہمارے ان شاہی
احکام کو دائمی و ابدی سمجھنا چاہئے اور
اُن میں کوئی تغیر و تبدیل نہ کریں اور جو شخص
ایسا کرے گا، اس پر خدا کی لعنت اور
بادشاہ کا غضب نازل ہوگا،
مکتوبہ ۲۶ آذر ماہ الٰہی

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۲۴ء)

ہندوکش عالمگیر کے عہد

کی

دو عجیب کتابیں

جامعہ ملیہ کی پُر اصرار دعوت پر مجھے ایک ہفتہ کے لئے جامعہ آنا پڑا، اور اسی تقریب سے میں نے اس کے کتب خانہ کی سیر کی، ارباب جامعہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے آٹھ برس کی مختصر مدت میں اپنے دوسرے شعبوں کے ساتھ اپنے اس شعبہ یعنی کتب خانہ کو بھی قابل قدر حد تک وسعت دی، اس وقت اس کے کتب خانہ میں کم وبیش آٹھ ہزار کتابیں ہیں، جن میں عربی، فارسی، انگریزی، اور اردو کی کتابیں داخل ہیں، جو قرینہ کے ساتھ آلماریوں میں رکھی ہیں، اور مرتب ہیں، ان میں ڈھائی سو کے قریب عربی اور فارسی کی قلمی کتابیں ہیں، جن کی ہنوز ترتیب کی نوبت نہیں آئی تھی، میں نے اپنے مختصر قیام میں ان کتابوں کو دیکھا، اور ان میں بعض ایسی کتابیں پائیں جو مختلف حیثیتوں سے قدر کے قابل تھیں، منجملہ ان کے دو کتابیں مجھے نہایت عجیب معلوم ہوئیں کہ ان کا کوئی نسخہ اب تک میری نظر سے نہیں گذرا تھا،

ان دونوں کتابوں کی ندرت اور قدر کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اس اورنگزیب عالمگیر کے عہد کی تصنیف ہیں، جس کو اُس کے دشمن اور مخالف ہندوکش، ہندو علوم وفنون کا برباد کرنے والا، ہندو مذہب کو تباہ کرنے والا، ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے والا مشہور کرتے رہے ہیں، لیکن

دوسری شہادتوں اور دلیلوں کے ساتھ آج یہ دو مردہ خاموش کتابیں زندہ اور گویا شاہد ہیں جو علی الاعلان یہ گواہی دیتی ہیں، کہ اس مرحوم بادشاہ پر یہ تمام الزام تہمت ہیں،

ان میں سے ایک کتاب کا نام "مت اچھرا" اور دوسری کا نام "رد کفر" ہے، یہ دونوں کتابیں اپنے عہد کے دو مخالف اور متضاد منظروں کو پیش کرتی ہیں، پہلی کتاب ایک پکے ہندو کی تالیف ہے اور دوسری ایک نومسلم ہندو کی، پہلی کتاب کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو اُن کے اُن کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اور دوسری کا بت پرست ہندوؤں کو اسلام کا راستہ دکھانا؛ ان دونوں کتابوں کی زبان فارسی ہے، جو اس زمانہ میں تمام ہندوستان کی ادبی اور علمی زبان تھی،

امت اچھرا

یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۱۲۴ صفحوں میں ہے، کتاب کا یہ نسخہ فرخ آباد میں ۱۴ رفروری ۱۸۴۷ء مطابق ۹ ربیع الاول ۱۲۶۳ھ کو اختتام کو پہنچا ہے، کاتب کا نام سید کلام الدین شاہ قادری ساکن فرخ آباد ہے، کاتب مذکور نے یہ نسخہ قاضی محمد غلام محی الدین خان "سر رشتہ دار محکمۂ کچہری صدر امین اعلیٰ" کے لئے لکھا ہے، جیسا کہ اس کے آخر میں بیان ہے،

کتاب کی فارسی زبان خاصی ہے، جابجا اصطلاحات ہندی اور سنسکرت کے استعمال کئے ہیں، افسوس ہے کہ یہ نسخہ بے حد غلط ہے، دیباچہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جاک بلک (اور خاتمہ میں جاگ دلگ ہے) نام رکھیسر(؟) نے بکرماجیت کے زمانہ میں اس کتاب کو اشلوک میں لکھا تھا، اس کا نام "سمرت جاک بلک" مشہور ہو گیا تھا، چونکہ وہ بہت مشکل کتاب تھی، اس لئے گوشائیں بکیانیر(؟) نے اُس کو نئے سرے سے مرتب کیا، اور اس کا خلاصہ کیا، اور مت اچھرا نام رکھا، اسی خلاصہ کا سلطان اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ میں لعل بہاری ولد کاہید سنگھ نے جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا،

اور جو اورنگزیب کے درباری امیر اللہ وردی خاں کا متوسل تھا، ۱۰۹۰ھ میں سوبھا سکر پنڈت کی مدد سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تا کہ سنسکرت سے ناواقف اس کو سمجھ سکیں، اور فائدہ اٹھائیں، یہ سوبھا سکر پنڈت سنسکرت کے بڑے ماہر تھے، اسلام آباد عرف منجھولی واقع سرکار گورکھپور کے باشندہ تھے،

کتاب کا موضوع جیسا کہ دیباچہ میں ہے "احکام و مذاہب وا وامر و مناہی (نواہی) ہنود" ہے، کتاب تین مقالوں پر منقسم ہے، اور ہر مقالہ میں متعدد فصلیں ہیں،

مقالۂ اول :- "در آچارا دھیائے کہ آں را بزبانِ عرب عبادت گویند" اس میں ۲۹ فصلیں ہیں،

مقالۂ دوم :- "در بیوہارا دھیائے کہ عبادت از معاملات باشد" اس میں ۵۴ فصلیں ہیں،
مقالۂ سوم :- "در پرائشچت ادھیائے کہ آں را کفارت (کفارہ) خوانند" اس میں ۰ے فصلیں ہیں،

فصلوں کی تفصیل تو مشکل ہے، مگر اس تعبیر و تفسیر سے صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانے کے "روشن خیال" ہندوؤں کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے شاستر کو اسلامی فقہ کے نمونہ پر تیار کریں، جس طرح آج ہمارے محکوم روشن خیال اپنی اسلامی فقہ کو انگریزی قانون کی صورت میں ڈھالنے کے لئے بے قرار ہیں،

اس کتاب کے دیباچہ میں "ہندو کش عالمگیر" کو جن القاب و آداب سے یاد کیا گیا ہے، وہ آج ہمارے ہندو بھائیوں کے پڑھنے کے لائق ہے،

"اکنوں کہ دریں عہد بادشاہِ خلافت پناہ، عادل، مظفر، مؤید ظل اللہ، سلیمان بارگاہ، مظہر الطافِ الٰہی، مطلعِ انوارِ بادشاہی، مجسم داد و کرم، قامعِ آثارِ جفا و ستم، بر داشتۂ حضرت

منان، گماشتۂ ایزد سبحان، خورشید برج خلافت مشتری آسمان سلطنت ظل ظلیل سبحانی،
واسطۂ انتظام انسی و جانی. شیرازۂ نسخۂ اسلام، ماحی بدعت کفر و ظلام، مالک ہفت
اقلیم، زینت افزائے تخت و دیہیم، وارثِ ملک سلیمانی، فروغِ دودمانِ صاحب قرانی،
خسرو فلک اقتدار، بادشاہ خورشید اقتدار، سلطان بن سلطان، خاقان زمین و
زمان، مجیب، فرمانروایان حال و ماضی، ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر
بادشاہ غازی، خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کہ دورش چوں دور قدح پُر نشاط، و زمانش مانند
ایام شباب پر سرور و انبساط، روز بازار فضل و دانش است، ہندی نژادانِ فارسی
دوست را نظم و نثر از حد بیشتر است۔"

غور کیجئے کہ یہ کتاب سرکاری حیثیت سے نہیں لکھی جا رہی تھی، اور نہ بادشاہ کے دربار میں پیش کئے جانے کی غرض سے ترجمہ کی جا رہی تھی، مگر با ایں ہمہ ان جذبات کا ادا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس عہد کے ہندو اس کو کیا سمجھ رہے تھے، اور آج اس کو کیا سمجھ رہے ہیں،

آگے چل کر وہ اپنا اور اپنے آقا کا کس محبت اور منت شناسی کے جذبہ کے ساتھ ذکر کرتا ہے:۔

"پیش نہاد خاطر احقر العباد لعل بہاری ولد رائے پرمانند کا ہید سنگھ متوطن بھوج پور
من مضافات سرکار شاہ آباد عرف قنوج متعلق بہ صوبہ اکبر آباد کہ رگ و پے ایں تربیت
یافتہ یک خاندان والا دودمان عز و علا نواب سپہر جناب خورشید القاب، عالمیان مآب،
رکن السلطنت العظمی، اعتضاد الخلافۃ الکبری، سزاوار است آں عبوتی، چراغ دودمانِ
سلجوقی، مہبطِ الطاف بادشاہی، منظور انظار خلیفۂ الٰہی نواب اللہ وردی خاں عالمگیر
شاہی است"

کیا یہ سطریں آج انقلاب روزگار کی تصویریں نہیں؟

۲- ردّ الکفر

دوسری کتاب کا نام "ردّ الکفر بحجۃ القوی" ہے، اس کتاب پر قاضی محمد ولد قاضی محمد باقر کی ملکیت کی مہر ہے، اور معلوم نہیں، کہاں سے جامعہ میں آگئی ہے، اس کا مصنف نومسلم ہندو ہے، اس کا پہلا نام ہرکشن تھا، اور اسلامی نام عبدالقوی ہے، وہ سامانہ کا رہنے والا تھا، جو پنجاب میں ایک مقام ہے، مقدمہ میں وہ عالمگیر کا ذکر اور اس کتاب کی کیفیت اس طرح لکھتا ہے:-

بندۂ فقیر حقیر عبدالقوی ساکن سامانہ بخدمت اہل اسلام التماس می دارد کہ قبل ازیں نام فقیر ہرکشن بود، ایمان آورد، بر دین حضرت رسالت پناہ محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلم کہ حق است وکفر باطل، کفر را روساختہ اسلام را حق شناختہ نام خود را عبدالقوی نہاد .... شوال سنہ از دور خلافت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی، ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی صدقہ کہ صدق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ وعدلہ کہ عدل حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہٗ حلمہٗ کہ حلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ وشجاعتہ کہ شجاعت حضرت شاہ مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ خلد اللہ ملکہ دعمرہ وسلطنۃ درخاطر رسید کہ مردماں کہ در کفر اند (عبارت غلط ہے) وکفر در قلم باید آورد تا کذب کفر و صدق اسلام معلوم گردد، واگر مسلمان بخواند، سلامتی ایمان است، اگر کافر بخواند در باب ایمان خداے تعالیٰ خوب خواستہ باشد مسلمان شود، نام این کتاب ردّ الکفر بحجۃ القوی (مصنف کے نام کی تلمیح ہے۔) نہادہ شد، امید کہ این نسخہ کمترین بندگان بدست ہر مسلمان کہ برسد کیفیت این رسالہ منتشر گرداند، سعادت دارین یا بد بطرف دلائل دعوئ نظر کند

بر طرف املا و انشا نظر کند، اگر خطا شدہ باشد اصلاح بدہد، ایں نیز ثواب اینان شد!"

اس رسالہ کی زبان معمولی ہے، ۲۹ حقیقتوں پر یہ کتاب مشتمل ہے، آخر سے کچھ نا تمام ہے، ہر حقیقت کے تحت میں ہندوؤں کے مختلف عقائد و رسوم کو لے کر اُس کی تفصیل کی ہے، اور اس کی خرابیاں دکھائی ہیں، اور اُس کے مقابل میں اسلام کی خوبیاں بتائی ہیں،

بہر حال اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایسے نومسلم ہندو ہوتے تھے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ عالمگیر کے زمانہ میں دلائل کے زور کے بجائے تلوار کے زور سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا جاتا تھا،

(معارف: جون ۱۹۲۹ء)

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز

ناظرین کو یاد ہوگا کہ چند ماہ پہلے ہم نے اپنے شذرات میں جرمنی کے ڈاکٹر فان کلیوبر کے ایک خط کا ذکر کیا تھا جس میں موصوف نے اپنے ایک فلکی کرہ کے بنانے والے ضیاالدین محمد کا حال دریافت کیا تھا، ذیل میں ہم پہلے موصوف کا خط درج کرتے ہیں، اور اُس کے بعد اُس کے متعلق جو کچھ پتہ لگ سکا ہے، اس کو حوالۂ قلم کرتے ہیں، اس سلسلہ میں اگر کوئی صاحب علم کچھ نئے معلومات پیش کریں گے تو ہمارے شکریہ کا باعث ہوگا،

نقل خط ڈاکٹر فان کلیوبر

"جناب محترم! میرا قصد ہے کہ ایک عربی کرہ کے متعلق جو برلن کے عجائب خانہ میں ہے، کچھ لکھوں، اس کرہ پر ایک تحریر ہے جس میں بنانے والے کا نام، تاریخ اور مقام درج ہے، اس تحریر کا عکس اس خط کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں،" چاہتا ہوں کہ اس کے بنانے والے کے متعلق تفصیلات معلوم کروں کہ یہ کون شخص ہے؟ کیا کوئی معروف مہندس یا منجم ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے،؟ اس کا زمانہ کیا تھا؟ اُس نے اور بھی ایسے کرے تیار کئے ہیں،؟ اس کا کوئی تعلق آپ کے ملک کے رئیس جے سنگھ سوائی سے تو نہیں تھا، جو خود بڑا نجومی تھا:؟

یہاں جو کتابیں مجھے مل سکیں، ان میں ان باتوں کا پتہ نہ چل سکا لیکن بعض

ہندوستانی دوستوں نے بتلایا کہ اگر آپ کو لکھوں تو ضرور کچھ سراغ لگ سکے گا، میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ براہِ کرم اپنی معلومات سے مجھے مستفید فرمائیں، مجھے بڑی ہی خوشی ہوگی، اور یقین ہے کہ ایشیائی تمدن سے ہماری محبت اور شغف میں اس سے اضافہ ہوگا، اپنی سیاحتوں میں میں خود بھی اس تمدن کا دلدادہ بن چکا ہوں،

آپ کا فان کلیو بر"

ضیاء الدین محمد اسطرلابی ہمایونی لاہوری

اسطرلابی | عربی علم ہیئت کی درس گاہوں میں جو آلات فلکی عام طور سے استعمال کئے جاتے تھے، ان میں سب سے مشہور کرہ   اور اسطرلاب ہیں، ان میں سے کرہ کی ضرورت صرف تعلیم میں پیش آتی ہے، وہ روزمرہ کے استعمال کی چیز نہیں، مگر اسطرلاب سے چونکہ آفتاب کا ارتفاع اور دوسرے ستاروں کا اندازہ لگاتے ہیں، اس لئے یہ ہیئت اور فلکیات کے عالموں، منجموں اور جوتشیوں کے روزانہ استعمال میں آتا ہے، اور اس لئے یہ زیادہ متداول ہے، اور اسی بناپر آلات فلکی کے بنانے والوں کا لقب بھی متاخرین میں اسطرلابی مشہور ہوگیا ہے، کرہ کی نسبت کردی" شخصیت کے بجائے شکل کی نسبت میں اصطلاحاً مستعمل ہے، اس لئے وہ کاریگر اور صناع کے نام کے لئے غیر موزوں قرار دیا گیا ہے، اور "اسطرلابی" چونکہ اصطلاح میں کسی شکل کا نام نہیں، نہ ہیئت کی کسی اور اصطلاح سے متصادم ہے، اس لئے اس آلہ کی طرف انتساب سے فلکی آلات کے بنانے والے کا لقب بنایا گیا ہے،

ہمایونی | یہ ہمایونی ہمایوں کی طرف منسوب ہے، جو آلِ تیمور کے سلسلہ میں ہندوستان کے تیموری فاتح بابر کا جانشین تھا،

سلاطین آل تیمور کو علوم ہئیت سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، تیمور کے پوتے مرزا الغ بیگ المتوفی ۸۵۳ھ نے سمرقند میں مشہور رصد خانہ قائم کیا، جس میں اس عہد کے مشہور علماے ہئیت قاضی زادہ رومی، غیاث الدین جمشید اور علی بن محمد قوشجی نے تحقیقات کیں، اور اس میں جو زیچ لکھی گئی، اس کا نام زیچ الغ بیگی رکھا گیا، بابر نے اپنی تزک میں اس رصد خانہ کے کھنڈروں کا ذکر کیا ہے،

بابر کا بیٹا ہمایوں جس کے نام کی طرف اصطرلاب کی نسبت ہے، نجوم و ہئیت کے علوم کا ماہر و عالم تھا، مُلا بدایونی نے منتخب التواریخ میں جو ۱۰۰۴ھ کی تالیف ہے، ہمایوں کے حال میں لکھا ہے،

"و در علوم نجوم و ہئیت و سائر علوم غریبہ بے نظیر"

(جلد اول ص ۴۶۰ کلکتہ اڈیشن)

فرشتہ میں ہے :-

"و در علم ریاضی علم مہارت می افراشت، و اکثر صحبتش با علماء و فضلاء بودہ ہمہ وقت در مجلس او مسائل علمی مذکور می شد"

(جلد اول، مقالہ دوم ص ۲۲۳ نولکشور پریس اڈیشن)

بادشاہ نے ہئیت کا یہ فن علامہ الیاس اردبیلی سے سیکھا تھا، جو ہئیت کے تمام فنون اور رصد بندی میں ماہر تھے۔ (ان کا حال بدایونی نے منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۳۱ مطبوعہ کلکتہ میں لکھا ہے)

عراق و ایران کے قیام کے زمانہ میں حکمت و ہئیت کے علوم کے دو نامور عالم، ایک وہی الیاس اردبیلی مذکور اور دوسرے شیخ ابو القاسم جرجانی بادشاہ کے ساتھ تھے، اور اس وقت بھی جب بادشاہ ہندوستان کا تخت کھو کر آوارۂ غربت تھا، ان دونوں دانشوروں سے

قطب شیرازی المتوفی ۷۱۰ھ کی فاضلانہ کتاب درۃ التاج کا جو فارسی میں حکمت نظری و عملی پر مشتمل ہے، درس جاری تھا، (مآثر رحیمی ص ۱۲۶ جلد ۱ کلکتہ واکبرنامہ دفتر اول ص ۲۴۲ نولکشور پریس)

اکبرنامہ میں ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے، ہمایوں ایران کے سفر کے دوران میں جب تبریز پہنچا تو بیک محمد آختہ بیگی نام اپنے ایک نوکر سے کہا کہ یہ پرانا شہر ہے یہاں کرہ تلاش کرو، کرہ فارسی میں گھوڑے کے بچھڑے کو کہتے ہیں، خوش فہم نوکر نے آقا کے اس حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ چند بچھڑے لے کر خدمتِ شاہی میں حاضر ہوا، بادشاہ اس غول بیابان کو دیکھ کر ہنس پڑا، ابوالفضل نے اس واقعہ کو ان لفظوں سے شروع کیا ہے،

"چوں بہ تبریز نزول فرمودند از انجا کہ توجہ اقدس باصطرلاب وکرہ وسائر آلات رصدی درجۂ کمال داشت .... (ص ۲۴۱ نولکشور)

خود بادشاہ علماء کی طرح ہیئت وریاضی کا درس دیتا تھا، بادشاہ کے مصاحب خاص نورالدین ترخان سفیدونی (المتوفی ۹۹۴ھ) نے جو اس فن کے ماہر تھے، بادشاہی سے اس فن کا درس حاصل کیا تھا، بدایونی میں ہے:-

"ملا نورالدین ترخاں نوری سفیدونی جاگیردار سفیدون از توابع سندھ اور علوم ہندسی وریاضی ونجوم وحکمت ممتاز واز اجلۂ مصاحبان ہمراز بادشاہ مغفرت پناہ بود" (ج ۳ ص ۱۹۷)

مآثر الامراء (جلد اول ص ۴۰۸ کلکتہ) میں مولانا نورالدین ترخاں کے حال میں ہے:-

"مولانا بفضل وکمال وشجاعت وسخاوت اتصاف داشت وبہ ہیئت وہندسہ واصطرلاب شوق مند بود........ وصحبتش باجنت آشیانی (ہمایوں) کوک گشتہ

از جملہ ندیمان و مجلس نشینان بزم ہمایونی گردید...... گاہے پادشاہ از و استفادہ علوم می کرد، دگاہے او از علم ریاضی خصوص اصطرلاب از جناب ہمایونی کہ دریں فن مہارت تمام داشت استفادہ می نمود"

بادشاہ کو ہیئت و فلکیات سے جو ذوق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ترکی امیرالبحر جو سلطان سلیمان خاں کی طرف سے گجرات کے بندر سے پرتگیزوں کو نکالنے آیا تھا، اور جس کا جہاز تباہ ہوا، اور اس کو بالآخر خشکی کی راہ یعنی ہندوستان ایران اور عراق سے اپنے ملک کو واپس جانا پڑا، اس نے اپنے سفرنامہ مرآۃ الممالک میں ہمایوں سے ملاقات کے سلسلہ میں اس کے نجوم و فلکیات کے شوق کا تذکرہ کیا ہے، ہمایوں چاہتا تھا، کہ ترکی امیرالبحر جو خود بھی فلکیات کا ماہر تھا، وہ ہمایوں کے پاس سے نہ جائے، مگر امیرالبحر مذکور نے جانے پر اصرار کیا، اس پر بادشاہ نے اس شرط پر رخصت دی کہ

"برسات کے تین مہینوں کے گذرنے کے بعد جن میں راستے ناقابلِ گذر ہوتے ہیں، میں جا سکتا ہوں، اس اثنا میں چاند اور سورج کے گرہنوں کا حساب کرتا رہوں، اور وہاں کے نجومیوں کو آفتاب کی گردش اور خطِ استوا کے نکات کے پڑھنے میں مدد دوں"

..... میں کام میں مصروف ہو گیا، اور نجومی مشاہدات ختم کئے"

(باب ہشتم ترجمہ مرآۃ الممالک پروفیسر دیمبری)

ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم جس نے ہمایوں کے حال میں ہمایوں نامہ لکھا ہے، اس میں ایک موقع پر مذکور ہے، کہ ہمایوں نے خود ایک شادی کے لئے اصطرلاب اٹھا کر ستاروں کی گردش معلوم کر کے تاریخ سعید مقرر کی،

"غرض کہ بعد از چہل روزہ در ماہ جمیدالاول ۹۴۸ھ در مقام پاتر روز دوشنبہ

یعنی روز بود کہ اسطرلاب را حضرت بادشاہ بدستِ مبارک خود گرفتہ اند و ساعت سعد را اختیار کردہ" (ص ۵۳ لندن)

ہمایوں کو ریاضیات اور آلاتِ ریاضی سے اس قدر انس تھا کہ اس کے رفیق سپہ سالار بیرم خانخاناں نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، اس میں اصطلاب سے تشبیب کی ہے،

مطلع قصیدہ کہ درباب اصطرلاب گفتہ[۱]

آں چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار | آں مدرکز میانہ شہابش کند گذار
باآن کہ می کند بہ مہ و خور برابری | آمد بجاں ز حلقہ بگوشانِ شہریار
تا روز بخشم کوکب آفتاب را | چوں مہچۂ لوائے شہنشاہ نامدار
پیوستہ آسمانِ زمیں زیر حکم اوست | ہمچوں نگینِ خاتمِ شاہِ جم اقتدار
برکف نہادہ خوانِ زری پر زاشرفی | تا بر قدوم اشرفِ شاہاں کند نثار
شاہ بلند قدر ہمایوں کہ از شرف | بر درگہش سپہر نہد روے افتخار

اس قصیدہ میں چرخ، محور، مدار، بدر، شہاب، ماہ، خور (آفتاب) حلقہ، آفتاب، آسمان، زمین، شرف، سپہر اسی فن ہیئت اور اصطرلاب کے اصطلاحات ہیں،

عام طور سے مشہور ہے کہ ہمایوں کتب خانہ کے زینہ سے گر کر مرا تھا، واقعہ یہ ہے کہ پرانی دلی میں شیر شاہ نے شیر منڈل کے نام سے ۹۴۸ھ میں بہت بلند سہ منزلہ ایک عمارت بنوائی تھی، اس کی تیسری منزل پر ایک برجی بنی ہے، جو تمام علاقوں سے اونچی[۲] ہے، بادشاہ نے اس عمارت کو غالباً اس لئے کتب خانہ بنا دیا تھا، کہ یہ اونچی عمارت اپنی بلندی کے سبب سے کسی قدر رصد خانہ کا کام دے، جس شام کو وہ گرا ہے اس شام کو خیال تھا کہ ستارۂ زہرہ طلوع ہوگا، بادشاہ وہاں

---

[۱] بدایونی ج ۳ ص ۱۹۲ کلکتہ، [۲] آثار الصنادید سر سید مرحوم ص ۱۵، نامی پریس کانپور،

ریاضی دانوں کے ساتھ مباحث میں مصروف تھا، اور سر شام زہرہ کے طلوع کا انتظار تھا کہ مغرب کی اذان ہوئی، بادشاہ بیٹھ کر اٹھنا چاہتا تھا کہ زینہ سے پھسل کر گرا، اور زخمی ہوا، اور اس زخم سے جانبر نہ ہوا، اکبر نامہ میں ہے،

"وآخرہاے روز بالاے بام کتبخانہ رفتہ..... جمعے از ریاضی داناں را طلب فرمودہ وآن شب نظارۂ طلوع زہرہ بود می خواستند ملاحظہ فرمائید"[۱]

اس بادشاہ کے تمام کام فلکیات اور نجوم کے اصول پر ہوتے تھے، دربار کے دنوں میں کاموں کی تقسیم بھی علم نجوم کی مناسبت سے تھی، غیاث الدین خوندمیر نے ہمایون نامہ میں اور ابوالفضل نے اکبر نامہ میں ان دنوں کی تقسیم اور اُن کے مناسبات نجومی کی پوری تفصیل کی ہے، دربار[۲] اور خیمہ و خرگاہ کی ترتیب بھی فلکیات ہی کے اصول سے ہوتی تھی، دربار کے نئے خیمے ایسے بنوائے تھے، جو یونانی ہیئت کے نو دن آسمانوں کی پوری نقل تھے، ہر آسمان میں جو ستارے ہیں اُن کے نمونے اس میں بنے تھے،

ہمایوں کو اس قسم کے اختراعات سے بڑی دلچسپی تھی، ایک "بساط نشاط" بنایا تھا، اس بساط میں فلکی دوائر اور کرات عناصر بنائے تھے، پہلا جو فلک اطلس کی طرف منسوب تھا، سپید تھا، دوسرا کبود، تیسرا زحل کی مناسبت سے سیاہ، چوتھا مشتری کی مناسبت سے صندلی، پانچواں مریخ کے تعلق سے لال، چھٹا آفتاب کی مناسبت سے سنہرا، ساتواں زہرہ کے سبب سے سبز، آٹھواں عطارد کے تعلق سے سوسنی، نواں چاند کی مناسبت سے سفید، اس کے بعد اربعہ عناصر کے نقشے تھے، اُن میں سے کرۂ خاک میں ساتوں اقلیموں کے نقشے تھے، نجوم کے قاعدہ سے ہر روز کے ستارہ کا جو رنگ اہل نجوم نے خاص کیا ہے، اس دن وہی رنگ پورے دربار کا ہوتا تھا، اسی طرح

[۱] اکبر نامہ نولکشور پریس اڈیشن، ص ۳۹۹ و مآثر رحیمی جلد اول ص ۶۰۹، کلکتہ، [۲] دیکھو الیٹ کی تاریخ ہند جلد ۵ ص ۱۱۶،

بارہ برجوں کا ایک خیمہ بھی بنوایا تھا، کئی جگہ رصد خانوں کے بنانے کا ارادہ کیا، اور بہت سے آلاتِ رصد ترتیب دیئے تھے [۱] انہی آلاتِ رصد میں سے ایک اصطرلاب بھی ہے،

مارچ و مئی ۱۹۰۹ء میں یعنی آج سے چوبیس پچیس برس پہلے الندوہ میں میں نے "مسلمان اور علم ہیئت" پر ایک مضمون لکھا تھا، اس میں سب سے پہلی دفعہ میں نے ضیاء الدین ہمایونی اصطرلابی کا ذکر کیا تھا، اس سلسلہ میں میں نے لکھا تھا :-

"ہندوستان میں اصطرلاب کا رواج ہمایوں نے دیا، ہمایوں علم ہیئت میں نہایت ماہر تھا، اس نے ایک خاص طرز کا اصطرلاب بنایا تھا جس کو اصطرلاب ہمایونی کہتے ہیں، چنانچہ ندوہ کے کتب خانہ میں جو ایک قدیم اصطرلاب ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے، "عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اصطرلابی، ہمایونی لاہوری سنہ ۱۰۵۹ھ [۲]"

افسوس ہے کہ میرے اس مضمون میں اس بیان کا حوالہ مذکور نہیں، اس وقت ہر چند میں نے اس کے حوالے جابجا کتابوں میں تلاش کئے، مگر اب تک کامیابی نہیں ہوئی، اسی اثناء میں غلام حسین جونپوری الموجود سنہ ۱۲۵۰ھ نے جامع بہادر خانی میں لکھا ہے، کہ "صناعان متاخرین" نے اصطرلاب میں یہ اصلاحیں کی ہیں [۳] کیا عجب کہ ان متاخرین سے اسی ہمایونی اصطرلاب کی طرف اشارہ ہو،

ہمایوں کی خدمت میں جو صناع فلکیات کے یہ آلے اور نقشے اور کرے بناتے تھے، ان کے نام تاریخوں میں جگہ نہیں پا سکے ہیں، صرف ایک ملا منصور وہروی کا نام آئین اکبری میں ہے، کہ

---

[۱] اکبرنامہ دفتر اول، ص ۲۹۷ [۲] الندوہ، مارچ ۱۹۰۹ء ص ۴۴،

[۳] جامع بہادر خانی ص ۵۰۱ کلکتہ،

"از پرستاران جنت آشیانی (ہمایون) بود .... اسطرلاب و کرہ و مسطرے چند
چنان برساخت کہ کار دیدگان را بشگفت درآورد"

(ج ۱ ص ۳۱ نولکشور پریس اڈیشن)

ضیاء الدین اور اس کا خاندان | ضیاء الدین اور اس کے خاندان کا کوئی پتہ ہم کو اب تک تاریخوں اور تذکروں سے نہیں چلا ہے، لیکن ضیاء الدین اور اس کے باپ قائم محمد کے بنے ہوئے کرؤں اور اصطرلابوں پر اُس کے نام و نسب کا جو سلسلہ لکھا ملتا ہے، اس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ضیاء الدین کا پردادا "الہداد" ہمایوں کے عہد کا صناع تھا، اور جو ہمایونی طریق کے کرے اور اصطرلاب تیار کرتا تھا، ضیاء الدین اور اس کے باپ قائم محمد کے حسبِ ذیل مصنوعات کا پتہ ہم کو مل سکا ہے،

قائم محمد کا بنایا ہوا ایک اصطرلاب کلکتہ میں قاضی عبید الباری[1] کے پاس ہے، اس اصطرلاب پر حسبِ ذیل کتبہ ہے :-

(۱)

"عمل قائم محمد بن عیسیٰ بن الہداد اصطرلابی ہمایونی سنہ ۱۰۳۴ھ"
اسی اصطرلاب کے دوسرے گوشہ پر ہے :-
"سنہ ۲۱ جلوس جہانگیری"

اس کا بنایا ہوا ایک کرۂ فلکی بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں ہے، اس پر یہ عبارت

---

[1] یہ کلکتہ کے ایک پرانے خاندان کی یادگار ہیں، ان کے اصطرلاب کی اطلاع پروفیسر محفوظ الحق پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے بھیجی ہے،

درج ہے:۔

(۲)

"صنعۃ اقل العباد قائم محمد بن عیسیٰ بن الہداد اسطرلابی لاہوری ہمایونی ۱۰۴۷ھ"

کرہ کی دوسری جانب یہ عبارت کندہ ہے،

تمت ایں کرہ مکمل شتمل بیک ہزار و بست و دو کواکب ثوابت کہ جمیع ازاں چہل وہشت صورت مرصودہ نمودہ اند، اہل (؟) علماء و حکماء تنجیم، چنانچہ مرصود رصد مرزا الغ بیگ است، و بر تقویم ہر کوکب ثابتہ سہ درجہ زیادہ کردہ ایم، بحساب حکماء علماء این فن تا بایں تاریخ ۱۰۴۷ھ"

یہ کرہ خالص پیتل کا بنا ہوا ہے، ہر کوکب کے پاس چاندی کی کیل ہے، اور ہر برج کی شکل بھی بنی ہوئی ہے، اور برجوں کے پاس اس طرح سے جڑی ہیں، کہ ان کی شکلیں متوہم ہو جاتی ہیں،

قائم محمد کے بیٹے ضیاء الدین محمد کے بنائے ہوئے حسب ذیل کروں اور اصطرلابوں کا حال ہم کو معلوم ہوا ہے، جن کو ہم سنہ کی ترتیب سے نیچے درج کرتے ہیں،

۱۔ اس کی بنائی ہوئی سب سے قدیم صنعت ایک فلکی کرہ ہے، جو اس وقت پھلواری ضلع پٹنہ میں مولوی یوسف صاحب رضوی کے پاس ہے، یہ کرہ خالص پیتل کا ہے، اور ہر ستارہ کے پاس چاندی کی ایک کیل گڑی ہے، تین پاؤ پختہ وزن ہے، اس خاندان میں یہ کرہ ۱۲۳۳ھ سے چلا آرہا ہے، کرہ پر حسب ذیل عبارت[1] نقش ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ ابن ملا الہداد اسطرلابی ہمایونی

---

[1] اس کرہ کی واقفیت کے لئے ہم مولوی سید احمد عروج ہاشمی صدر منزل مندرو پٹنہ کے ممنون ہیں،

لاہوری فی سنہ ۱۰۵۸ھ"

۲۔ اس کے بعد اُس کی بنائی ہوئی دوسری چیز ایک اصطرلاب ہے، جو اس وقت ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں ہے، اس اصطرلاب پر نام و تاریخ اس طرح ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اصطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۵۹ ہجری،

۳۔ اسکا بنایا ہوا دوسرا اصطرلاب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ (حبیب گنج ضلع علی گڑھ) میں ہے، اس کی عبارت اور تاریخ یہ ہے:۔

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۶۴ ہجری"

۴۔ اسی سال کا بنا یا ہوا اس کا کرہ رام پور میں ایک حکیم صاحب کے پاس تھا، اور جواب طبیہ کالج علی گڑھ میں ہے، اس کا حلقہ ٹوٹ گیا ہے مگر کرہ سالم موجود ہے، اس پر یہ عبارت ہے،

عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۶۴ھ"

۵۔ اس کی چوتھی فلکی یادگار وہ کرہ ہے، جس کا حال ڈاکٹر کلوبر نے ہم کو لکھ کر اس کے فوٹو کے ساتھ بھیجا ہے، یہ بڑی کرہ ہے جو اس وقت جرمنی کے پایۂ تخت برلن کے عجائب خانہ انسانی میں ہے، اس پر کتبہ یہ ہے،

عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۷۰ ہجری،

اس کے بعد سنہ ۱۰۷۴ھ کے بنائے ہوئے اُس کے چار اصطرلابوں کا حال ہم کو معلوم ہے، جو اس

وقت یورپ اور ہندوستان میں موجود ہیں،

۶۔ ایک مولانا ابوبکر صاحب جونپوری (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کے پاس ہے نسبتہً چھوٹا ہے، اس پر عبارت یہ ہے:۔

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن شیخ اللہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری

فی سنہ ۱۰۴۰ ہجری،

۷۔ دوسرا ریاست رام پور کے شاہی کتب خانہ میں ہے، اس کے حروف کہیں کہیں سے گھس گئے ہیں، جو پڑھے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں[۱]:۔

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ اللہداد......

فی سنہ ۱۰۴۲ ہجری،

۸۔ اس سنہ کا تیسرا اصطرلاب وہ معلوم ہے، جو ۱۹۳۱ء کے ایرانی فنون کی نمائش منعقدہ لندن (پرشین آرٹ اگزبیشن) میں پیش ہوا تھا، اور جس کا ذکر نمائش مذکور کی مطبوعہ فہرست ص ۱۹۳ میں موجود ہے، اس پر یہ عبارت کھدی تھی[۲]،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ اللہداد اسطرلابی ہمایونی

فی سنہ ۱۰۴۲ ہجری"

فہرست مذکور کے مرتب نے اللہداد کے نام کے پڑھنے میں غلطی کی ہے، اس ہندوستانی نام کو جو "اللہ" اور "داد" کا مجموعہ ہے، اور جس کے معنی عطیۂ الٰہی کے ہیں، "الحداد" پڑھا گیا، جس کے معنی عربی میں لوہار کے ہیں، اور پیتل کی صناعی کی مناسبت سے شاید یہ الحدّاد موزوں سمجھا گیا ہے، مگر یہ صریحاً تحریف ہے،

---

[۱] اس اطلاع کے لئے ہم مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتب خانہ شاہی رام پور کے

۹ - اسی سنہ کا بنا ہوا اس کا چوتھا اصطرلاب جو بہت بڑا ہے، بانکی پور لائبریری میں ہے، عبارت یہ ہے:-

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی ۱۰۷۴ھ"

نتائج | اوپر کے معلومات اور کتبوں کی بنا پر حسب ذیل نتیجے برآمد ہوتے ہیں:-

ان لوگوں کا وطن لاہور (پنجاب) تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے، ضیاء الدین، اس کا باپ قائم محمد، اس کا باپ ملا عیسیٰ، اس کا باپ ملا شیخ الہداد، کتبوں کی عبارت اور لفظ "ملا" کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صفتِ علم سے آراستہ تھے، بدایونی میں ایک شیخ الہداد لنگرخانی لاہوری کا حال ان لفظوں میں ہے:-

"منسوب بمحلہ ایست از لاہور (محلہ لنگرخان لاہور کا ایک محلہ ہے) در اکثر علوم متداولہ ماہر و متبحر..... و بدرس مشغول است، ہرگز بخانۂ ارباب بے مروت دنیا نرفتہ و از ملوک حاجت نخواستہ و مدد معاش نگرفتہ، عمرش قریب بہشتاد است"

(جلد سوم، ص ۱۵۴)

بدایونی نے اپنی کتاب ۱۰۰۴ھ میں لکھی ہے، اس حساب سے ان شیخ الہداد کی پیدائش تقریباً ۹۲۴ھ ہوتی ہے، اور ہمایوں کی حکومت کا زمانہ ۹۳۷ھ سے ۹۶۳ھ تک ہے، اس بنا پر یہ ہمایوں کے سامنے پچیس تیس برس کے جوان ہوں گے، تاہم اُن کو وثوق کے ساتھ ضیاء الدین کا پردادا شیخ الہداد نہیں کہا جا سکتا،

ضیاء الدین اور اس کے بزرگوں کے ناموں کو سلاطین کے ناموں کے ساتھ ملانے سے یہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۹) ممنون ہیں۔ ؎۱۵۳ اس کی اطلاع بھی ہم کو پروفیسر محفوظ الحق نے دی ہے،

نسبت پیدا ہوتی ہے،

١- شیخ الہداد	١- بادشاہ ہمایوں (٩٣٧ھ / ١٥٣٠ء - ٩٦٣ھ / ١٥٥٥ء)
٢- ملا عیسیٰ	٢- بادشاہ اکبر (٩٦٣ھ / ١٥٥٥ء - ١٠١٤ھ / ١٦٠٥ء)
٣- قائم محمد	٣- بادشاہ جہانگیر (١٠١٤ھ / ١٦٠٥ء - ١٠٣٦ھ / ١٦٢٦ء)
	٤- بادشاہ شاہجہاں (١٠٣٦ھ / ١٦٢٦ء - ١٠٦٨ھ / ١٦٦٥ء)
٤- ضیاء الدین محمد	٥- بادشاہ عالمگیر (١٠٦٨ھ / ١٦٥٧ء - ١١١٨ھ / ١٧٠٦ء)

ان میں سے دو کی تاریخیں ہم کو ملی ہیں، اور وہ دونوں اس قیاس کے مطابق ہیں، قائم محمد کے پہلے اصطرلاب کی تاریخ ١٠٣٤ھ، ٢١ سنہ جلوس جہانگیری ہے، اس کے دوسرے کرہ کی تاریخ ١٠٤٧ھ اس سے ثابت ہے، کہ اس نے جہانگیر اور شاہجہاں کا زمانہ پایا ہے،

ضیاء الدین کے پہلے کرہ پر ١٠٥٨ھ اور آخری کروں پر ١٠٧٤ھ منقوش ہیں، جن سے اس کے عمل وصنعت کا زمانہ کم از کم سترہ برس تو بالیقین ہے،

ان لوگوں کا اس کثرت سے آلات بنانا یہ ثابت کرتا ہے، کہ یہ لوگ علمائے مدرسین یا علم ہیئت کے عام شائق و ماہر نہ تھے، بلکہ پیشہ ور کاریگر تھے، ایک ایک سال میں کم از کم چار چار اصطرلاب یا کرے بناتے تھے، جیسا کہ ١٠٦٤ھ میں اس کے ایک اصطرلاب اور ایک کرہ کا اور ١٠٧٤ھ میں اس کے چار اصطرلابوں کا پتہ ہم کو معلوم ہے،

ڈاکٹر کلوبر کا یہ شبہہ کہ ضیاء الدین یا اس کے کرہ کو راجہ جے سنگھ سوائی کے رصدخانہ سے تو کوئی تعلق نہ تھا بے بنیاد ہے، اس رصدخانہ کی تعمیر محمد شاہ کے حکم سے راجہ جے سنگھ رئیس جے پور و صوبہ دار آگرہ و مالوہ نے ١١٣٧ھ مطابق ١٧٢٤ء میں کرائی تھی، یعنی برلن کے کرہ کی ساخت کے چھیاسٹھ برس بعد، اور ضیاء الدین کے پہلے بنائے ہوئے کرہ (موجودہ پھلواری ضلع پٹنہ) کی ساخت کے ٧٩ اناسی برس بعد،

(معارف اگست ١٩٣٢ء)

(۲)

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اگست ۱۹۳۳ء کے معارف میں لاہور کے ایک فلکی آلات ساز کے
عنوان سے میرا ایک مضمون چھپا تھا جس میں ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہ داد
اسطرلابی ہمایونی لاہوری اور اُس کے بزرگوں کے حالات اور ان کے بنائے ہوئے اسطرلابوں
کی کیفیت اور پتے لکھے گئے تھے،

اس مضمون میں ضیاء الدین اور قائم محمد کے اسطرلابوں کا ذکر تھا اور اس وقت تک عیسیٰ اور
الہ داد کے اسطرلابوں کا پتہ مجھے نہیں چلا تھا تاہم میں نے قرائن سے جو باتیں لکھی تھیں، وہ بعد کی
تحقیق سے درست ثابت ہوئیں،

اب ضیاء الدین محمد کے چچا مقیم اور دادا مُلا عیسیٰ اور پردادا شیخ الہ داد کے اسطرلابوں کا سراغ لگا ہے،
جس سے اس خاندان کے سارے افراد کا سلسلہ پورا ہوجاتا ہے،

الہ داد | شیخ الہ داد کو میں نے خود آلات ساز مانا تھا، اور ہمایوں کا معاصر فرض کیا تھا، ہمایوں کا زمانہ
۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء تک ختم ہوجاتا ہے، الہ داد کا بنایا ہوا کوئی اتنا پرانا اسطرلاب تو نہیں ملا ہے، لیکن
۱۹۳۴ء کے سفر حیدرآباد میں مجھے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں الہ داد کا بنایا ہوا
ایک اسطرلاب ملا جس پر صناع کا نام اور تاریخ یہ درج ہے،

”صنعت استاد الہ داد اسطرلابی لاہوری فی ۹۷۵ھ“

یہ اصطرلاب ہمایوں کی وفات کے تیرہ برس بعد کا بنا ہوا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ عمل تیرہ برس
کے لڑکے کا نہیں ہوسکتا، اس لئے وہ ہمایوں کا ضرور معاصر ہے، اور یہ بھی ثابت ہوا کہ الہ داد خود
بھی آلات ساز تھا، کسٹر میوزیم ہمبرگ میں الہ داد کے پوتوں کا بنا ہوا ایک اسطرلاب ہے جس کے

سنہ ۱۰۱۰ھ کی تاریخ ثبت ہے، اور شکاگو کے ایک میوزیم میں اللہداد کے بیٹے کا بنایا ہوا اسطرلاب سنہ ۱۰۱۳ھ کا ہے[1] اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہداد کی یہ عمر تھی کہ سنہ ۱۰۱۳ھ میں اس کا بیٹا عیسیٰ اور سنہ ۱۰۱۰ھ میں اس کے پوتے اور عیسیٰ کے بیٹے فلکی آلات کی کاریگری کے لائق ہو چکے تھے، بنا بریں سنہ ۹۷۵ھ اللہداد کے بڑھاپے کی تاریخ ہے، اور وہ ہمایوں کا معاصر تھا جس نے ۵۰ برس کی عمر میں سنہ ۹۶۳ھ میں وفات پائی ہے،

ملا عیسیٰ

میرے گذشتہ مضمون کے انگریزی نسخہ پر جو اسلامک کلچر حیدرآباد (اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء) میں چھپا تھا، ایک لائق فاضل نابیا اباٹ (Nabia Abbott) نے شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) سے ایک استدراک اسی رسالہ کے جنوری سنہ ۱۹۳۷ء ص ۴۴ میں لکھا ہے جس میں فلکی عجائب خانہ شکاگو (Adler Planetarium and Astronomical museum) کے دو اصطرلابوں کا ذکر کیا ہے، موصوف ہی کے حوالہ سے مجھے ایک ضروری کتاب کا علم ہوا، ایک انگریز محقق روبرٹ ٹی گنتھر (Robert T. Gunther) ناظم مجموعات لیوس ایونس (آشمولین میوزیم) اوکسفورڈ نے دنیا بھر کے اسطرلابوں پر دو جلدوں میں (The Astrolabes of the world) نام ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ہندوستانی اسطرلابوں کے باب میں چند ایسے نئے اسطرلابوں کا ذکر ہے، جن کو میں نے نہیں دیکھا، اور اس لئے اُن کا ذکر میرے مضمون میں نہیں آیا، یہ کتاب انگریزی میں سنہ ۱۹۳۲ء میں یونیورسٹی پریس آکسفورڈ میں چھپی ہے، اور اس وقت میرے پیش نظر ہے، ان دونوں میں ملا عیسیٰ بن اللہداد کے بنائے ہوئے اسطرلابوں کے حوالے ہیں،

گنتھر نے ملا عیسیٰ کے جس اسطرلاب کا حوالہ دیا ہے (جلد ا ص ۱۸۰ نمبر ۶۸) اس کا علم موصوف کو سرپرسی ویبسٹر سے نومبر سنہ ۱۹۲۳ء میں ہوا، افسوس ہے کہ اس کے بننے کی تاریخ ان لوگوں نے نہیں

---

[1] ان اصطرلابوں کے حوالے آگے آتے ہیں،

دی ہے، اور نہ اس کا فوٹو گنتھر نے چھاپا ہے، نقش کا انگریزی ترجمہ جو دیا گیا ہے، اس سے اس کی اصلی عبارت یوں بنتی ہے،

"صنعت اضعف العباد عیسیٰ بن اللہ داد اسطرلابی لاہوری ہمایونی"

لیکن جیکا گو کے مذکورۂ بالا فلکی عجائب خانہ میں عیسیٰ کا بنایا ہوا جو اصطرلاب ہے، اس پر یہ عبارت مع تاریخ درج ہے،

"صنعت اضعف العباد عیسیٰ ولد اللہ داد سنہ ۱۰۱۳ھ"

(اسلامک کلچر جنوری سنہ ۱۹۳۷ء ص ۱۴۴)

عیسیٰ کے پوتے ضیاء الدین محمد کا بنایا ہوا سنہ ۱۰۶۹ھ کا ایک اصطرلاب لاہور سے الجیریا (الجزائر) پہنچا، اور جولائی سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک فرانسیسی ال یونس نے خریدا، اس کا ذکر گنتھر نے کیا ہے، (جلد ا ص ۲۰۸، نمبر ۷) اس میں ضیاء الدین نے اپنے دادا کے نام کے ساتھ "حافظ" لکھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہ حافظ قرآن بھی تھے،

لفظ اسطرلابی ہمایونی کا اضافہ بھی انہی عیسیٰ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے، جیسا کہ گنتھر کے ان سٹھویں اسطرلاب سے ظاہر ہے،

عیسیٰ کے دو بیٹے محمد مقیم اور قائم محمد

سب سے پہلے گنتھر ص ۲۰۸ نمبر ۹۹ نقش ۹۰ کا ذکر ضروری ہے، اس کے عضادہ پر نسخ میں یہ عبارت لکھی ہے،

تمت بایدی اضعف العباد

ابنا عیسیٰ ابن اللہ داد

سنہ ۱۰۶۸ھ فی بلدہ دار الخلافہ

لاہور صانہ اللہ عن آفات الدھر

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسیٰ کے دو بیٹے تھے، اور دونوں مل کر بھی کام کرتے تھے، ان دونوں بیٹوں کے نام قائم محمد اور محمد مقیم تھے، جیسا کہ اُن کے اسطرلابوں کے نقش سے معلوم ہوتا ہے،

قائم محمد | قائم محمد بن مُلا عیسیٰ بن الہداد کے چند اسطرلابوں کا ذکر میرے پہلے مضمون میں ہے، قائم محمد کا بنایا ہوا اسطرلاب کلکتہ میں قاضی عبید الباری کے پاس ہے، جس پر حسب ذیل نقش ہے،

"عمل قائم محمد بن عیسیٰ بن الہداد اسطرلابی ہمایونی سنہ ۱۰۲۴ھ"

(سنہ ۲۱ جلوس جہانگیری)

قائم محمد کا بنایا ہوا ایک فلکی کرہ مشرقی کتب خانہ پٹنہ میں ہے، اس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے:-

"صنعۃ اقل العباد قائم محمد بن عیسیٰ بن الہداد اسطرلابی ہمایونی سنہ ۱۰۴۷ھ"

محمد مقیم | یہ قائم محمد کا بھائی اور ملا عیسیٰ کا بیٹا ہے، میرے پہلے مضمون میں اس کے کسی اصطرلاب کا ذکر نہیں، نہ مجھے ابھی تک ہندوستان میں اس کے بنائے ہوئے اسطرلاب یا کرہ یا کسی اور آلہ کا پتہ چلا ہے، مگر گنتھر نے اپنی کتاب میں محمد مقیم کے بنائے ہوئے ایک کتبہ کا ذکر کیا ہے اور اس کا فوٹو دیا ہے، یہ اسطرلاب خدا جانے کس طرح ہندوستان سے یورپ پہونچ گیا، ال ایونس نے اس کو جولائی سنہ ۱۹۰۹ء میں کارنیڈن پارک، بشپ والٹفرڈ میں خریدا تھا، اور اس کا فوٹو اوکیانوجیکل جرنل سنہ ۱۹۱۱ء نقش ۵ نمبر ۲ میں چھپا تھا، اور اس فوٹو کو گنتھر نے بھی چھاپا ہے، نمبر ۷، اس پر یہ عبارت ہے،

"صنعت اضعف العباد محمد مقیم ابن عیسیٰ ابن الہداد اسطرلابی ہمایونی۔

لاہوری ۱۰۵۳ھ"

اس کا دوسرا اسطرلاب برٹش میوزیم میں ہے، اس پر محمد مقیم لاہوری ۱۰۷۰ھ کندہ ہے (دیکھو گنتھر نمبر ۸)

ضیاء الدین محمد | یہ قائم محمد کا بیٹا ہے، اس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے اسطرلاب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بہت ملتے ہیں، ان میں سے چند کا ذکر میں نے اپنے پہلے مضمون میں کیا ہے، نابیاٹ نے شکاگو کے مذکورہ بالا عجائب خانہ فلکی میں اُس کے ایک اسطرلاب کا حوالہ دیا ہے، جس پر اُس کا نام یوں لکھا ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد ابن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن ملا اللہ داد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی ۱۰۵۰ھ ہجری"

ضیاء الدین کا بنایا ہوا دوسرا اسطرلاب ہندوستان سے شمالی افریقہ کے ملک الجزائر میں پہنچا، اور جولائی ۱۹۱۱ء میں ال ایونس نے اس کو خریدا، اس کی صحیح عبارت جس کو گنتھر نے غلط لکھا ہے، یا وہ بے ترتیب نقل ہوئی ہے، حسب ذیل ہے،

"عمل اضعف العباد ضیاء الدین محمد ابن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ. ابن شیخ اللہ داد اسطرلابی ہمایونی لاہوری ۱۰۶۹ھ"

نمبر ۱، پر گنتھر نے ایک اور اسطرلاب کا ذکر کیا ہے، جس کے اوپر اس کے بیان کے مطابق حسب ذیل کتبہ ہے،

"عمل محمد بن عیسیٰ بن اللہ داد اسطرلابی ہمایونی لاہوری"

اس پر ایک طرف ۱۰۴۴ھ ہے، اور دوسری طرف ۸ جلوس شاہجہانی درج ہے، اس کو بھی ڈاکٹر ال ایونس نے ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو خریدا ہے، نابیاٹ نے لکھا ہے اور میں اس سے

متفق ہوں کہ محمد کے پڑھنے کے بعد کوئی نقطارہ گیا ہے، یعنی یا تو محمد مقیم ہے، یا قائم محمد ہے، یہ کوئی تیسرا نام نہیں ہے،

اسی طرح گنتھر نے ایک اسطرلاب پر قاسم محمد بن ملا عیسیٰ بن الہداد پڑھا ہے، (ص ۲۱۰) یہ بھی غلط ہے، نابیا صاحب کی رائے درست ہو کہ صحیح قرأت قائم محمد ہے، میں نے پہلا مضمون لکھتے وقت رام پور کے اسطرلابوں کے کتبے منگوائے تھے، تو وہاں کے ایک اسطرلاب پر بھی قاسم کھنچا ہوا تھا، شو راخ سے بچانے کے لئے ئم کی کشش سم بنا دی گئی تھی، وہ بھی حقیقت میں قائم تھا،

(معارف ستمبر ۱۹۳۷ء)

نالندہ کی سیر

صوبہ بہار کے قصبہ بہار شریف کے آس پاس چند میل کے فاصلہ تک بودھ زمانہ کے بے شمار آثار پائے جاتے ہیں، ان میں سے کچھ کھود کر منظر عام پر لائے گئے ہیں، اور کچھ اب تک زمین کے نیچے دبے ہیں، ان دریافت شدہ قدیم آثار میں سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ وہ بودھ خانقاہ یا درسگاہ ہے، جو ہندوستان کے پرانے سفرناموں اور یادداشتوں میں نالندہ کے نام سے مشہور ہے،

یہ مقام قصبہ بہار اور راجگیر کے بیچ میں واقع ہے، اور میرے وطن سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے، دور دور سے بلکہ یورپ و امریکہ تک سے لوگ ان آثار کو دیکھنے آتے ہیں، لیکن باایں ہمہ قرب مجھے اب تک اس کی زیارت کا موقع نہیں ملا، اور سعدی کا یہ طعن مجھ پر صادق آرہا تھا:-

"سبحان اللہ دوراں باخبر و نزدیکاں بے بصر"

اس دفعہ جب مئی و جون میں وطن میں قیام کا اتفاق ہوا، تو وطن کے کئی نوجوان عزیز اس کو دیکھنے گئے، اور واپس آکر اس کے بعض حالات بیان کئے، اس گفتار نے "دیدار" کا شوق پیدا کیا، میرے عزیزوں میں ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب گو بوڑھے نہیں، مگر جوان بھی نہیں، تاہم

ارادہ اور عزم جوانوں کا رکھتے ہیں، انھوں نے تحریک کی، اور شاہ محمد قاسم صاحب بیرسٹر رئیس قصبہ بہار و متولی وقف ریاست مغربی بیگم نے اپنی کار بھیج کر سفر کی مشکل حل کی، تو اب کیا عذر ہو سکتا تھا، سید عبد الحکیم صاحب اور برادرم سید عبد القیوم صاحب جو میرے ہر دینی کام کے اعزازی ذمہ دار ہیں، ساتھ ہوئے، اور صبح سویرے یہ مختصر قافلہ سفر کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا، ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ موٹر کو وہ افتاد پیش آئی جس کو اہل منطق کی اصطلاح میں مغالطۂ عامّہ اور دو کہتے ہیں، یعنی پنکچر جو ہر موٹر کو ہر وقت پیش آسکتا ہے،

نالندہ کا رقبہ اور دفتر خیال ہوا کہ اس جاترے کے لئے یہ شگون اچھا نہیں ہوا، مگر عزم درست تھا، اس لئے پیادہ ہی آگے بڑھ گئے، خدا نے مدد کی، اور شوفر نے پہیہ جلد بدل لیا، پون گھنٹے کے سفر کے بعد بی بی لائٹ ریلوے اسٹیشن نالندہ آیا، یہاں سے مقام مذکور تک جو بہت قریب ہے سڑک جاتی ہے، چنانچہ چند منٹ کے بعد ہم نالندہ کے سامنے تھے، ڈسٹرکٹ بورڈ نے سڑکیں بنوادی ہیں نالندہ کے سامنے محکمۂ آثار کی طرف سے نالندہ سے برآمد شدہ اشیا کے لئے ایک مختصر بنگلہ مع احاطہ و باغ بنوایا گیا ہے، اس کو گویا نالندہ کی قدیم اشیا کا عجائب خانہ سمجھیے، اس میں نالندہ کے آثار گھر کا دفتر ہے، نالندہ کی سیر کے ہر شائق کو پہلے اس دفتر میں جا کر چار آنے کا ٹکٹ خریدنا چاہئے اور اس کو لے کر نالندہ کے کھنڈروں میں قدم رکھنا چاہئے،

عجائب خانہ یہ ایک بنگلہ ہے، جس کے دو کمروں میں نالندہ کی زمین سے نکلی ہوئی چیزیں قرینہ سے رکھی گئی ہیں، میں نے یہاں سُنا کہ عمدہ اور قیمتی چیزیں کلکتہ میوزیم میں بھیج دی گئی ہیں، یہاں کمروں میں زیادہ تر بودھ کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں رکھی ہیں جو دھات کی بنی ہوئی ہیں، مٹی کی مہریں، چند سکے، بخوردان، لوہے کے قفل، تانبے کے برتن، اینٹیں جن پر عبارتیں کھدی ہیں، اور بعض جانوروں کے مجسمے بھی ہیں، مٹی کے بدھنے جیسے مسجدوں میں ہوتے ہیں، ان کی بھی

خاصی تعداد ہے، اس سے پتہ چلا کہ مذہبی عبادت گاہوں میں اس قسم کے بندھنوں کا ہونا ہندستان کی پرانی بات ہے، پتھروں اور پتروں پر کھدے ہوئے وہ سندات بھی ہیں جن کو لکھ کر راجاؤں نے گانوں اور جائدادیں اس خانقاہ پر وقف کی تھیں، جس چیز کو دیکھ کر سب سے زیادہ تعجب ہوا، وہ تلواروں اور دوسرے آہنی ہتھیاروں کا وجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لڑائی اور حفاظت کا بھی سامان تھا،

بڑاگانوں | نالندہ اب نام پڑا ہے، ان آثار کی دریافت سے پہلے اس گانوں کا نام بڑاگانوں تھا جس کو عام طور سے بڑگانوں کہا جاتا ہے، جو اس دیار کے مشہور رئیس جناب چودھری ظہور الحق صاحب مرحوم کی زمینداری میں واقع ہے، یہاں بڑے بڑے اونچے ٹیلے تھے، جن پر اتنی مٹی جم گئی تھی، کہ ان میں بے خطر کھیتی ہوتی تھی، اس مقام سے بہت کم فاصلہ پر وہ گانوں ہے جو آج بھی جینیوں کا مرکز ہے، اور اس میں اُن کی عمارتیں ہیں، ان ٹیلوں اور گانوں کے بیچ میں پیپل کا بڑا درخت ہے، جس کے چاروں طرف احاطہ کھنچا ہے، اس احاطہ کے اندر اس درخت کے نیچے بودھ کی ایک بہت بڑی مورتی جو سیاہ پتھر کو کاٹ کر بنائی گئی ہے، زمین پر مدت سے رکھی ہوئی ہے، اس کا نام عام طور سے تلیا بھنڈار مشہور ہے، اس احاطہ سے باہر میدان میں گانوں کی جانب ایک دوسری مورتی کھڑی ہے،

نالندہ کی تلاش | چین کے ایک بودھ سیاح نے جو ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں ہندستان آیا تھا، نالندہ نام ایک عظیم الشان بودھ درس گاہ کا ذکر کیا تھا، اس کی جائے وقوع انہی اطراف میں ظاہر کی تھی، قدیم آثار کے بعض یورپین شائق گھومتے پھرتے ادھر بھی آنکلے، ان مورتیوں کو دیکھ کر انھیں ان ٹیلوں کے اندر آثار قدیمہ کے مخفی خزانہ کے دفن ہونے کا خیال ہوا، سب سے پہلے مسٹر براڈلے (Braadley) نے جو اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں بہار کے ڈپٹی مجسٹریٹ تھے،

جنرل کنگھم (Cunningham) کی میعت میں ان آثار کی تفتیش کی، پھر آثار قدیمہ کے دوسرے شائقین آتے رہے، اور کھود کھود کر یہاں سے چھوٹی موٹی چیزیں لے جاتے رہے،

کھدائی

بالآخر روز بروز یہ خیال راسخ ہوتا چلا گیا کہ نالندہ کی خانقاہ مٹی کے انہی ڈھیروں کے نیچے ہے، حکومتِ ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ نے ۱۹۱۵ء میں ادھر توجہ کی اور کھدائی کا کام شروع کر دیا، کھدائی جیسے جیسے زیادہ نیچی اور گہری ہوتی گئی، خانقاہ مذکور کی دیواریں اور بنیادیں جوں کی توں نکلنی شروع ہو گئیں، حکومت نے اس کام کی تکمیل کے لئے اپنے خزانہ سے ۲۵ ہزار سالانہ منظور کئے، یہ مقررہ رقم اس پر برابر خرچ ہوتی رہی، اور ہر سال کچھ نہ کچھ نئے آثار برآمد ہوتے چلے گئے، چنانچہ اس وقت (یکم جولائی ۱۹۳۲ء) تک پہلو بہ پہلو گیارہ عمارتوں کی بنیادیں، اور دیواریں برآمد ہو چکی ہیں،

یہ عمارت دراصل بودھوں کی خانقاہ تھی، جس میں بودھ مت کے پجاری، فقیر، اور پیشوا رہتے تھے، اور ان کی موجودگی کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس کی حیثیت خانقاہ کے علاوہ درسگاہ کی بھی ہوتی گئی،

نالندہ کے متعلق قدیم بیان

نالندہ کی قدیم تاریخ کے متعلق مہامہوپادھیا گوری شنکر ہیراچند اوجھا نے اپنے خطبات موسومہ "قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" میں حسبِ ذیل حالات بیان کئے ہیں :۔

"نالندہ کے دارالعلوم کی بنا مگدھ کے راجہ شکرادتیہ نے ڈالی تھی، اس کے بعد کے راجاؤں نے بھی اس کی کافی رعایت کی، اس جامعہ کے قبضہ میں ۲۰۰ سے زیادہ مواضع تھے، جو مختلف راجاؤں کے عطیے تھے، ان ہی مواضعات کی آمدنی سے اس کا خرچ چلتا تھا، یہاں دس ہزار طالب علم اور ڈیڑھ ہزار اتالیق رہتے تھے، دور دراز ممالک سے

بھی طلبہ تحصیل علم کے لئے آتے تھے، چاروں طرف اونچے اونچے دہار اور مٹھ بنے ہوئے تھے

بیچ بیچ میں مدرسے اور دارالمناظرے تھے، اس کے چاروں طرف بودھ علماء اور

مبلغین کی سکونت کے لئے چو منزلہ عمارتیں تھیں، خوشنما دروازوں، چھتوں، اور

ستونوں کی شان دیکھ کر لوگ حیرت میں آجاتے تھے، وہاں کئی بڑے بڑے کتب خانے

اور چھ بڑے بڑے ادارے تھے، طلبہ سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی تھی، اس کے

برعکس انھیں ہر ایک ضروری چیز کھانا، کپڑا، دوا، کتابیں، مکان وغیرہ مفت دیئے

جاتے تھے، اونچے درجوں کے طلبہ کو ایک بڑا کمرہ اور نیچے درجوں کے طلبہ کو ایک چھوٹی

کمرہ دیا جاتا تھا[۱]

اس جامعہ میں بودھ ادبیات کے علاوہ وید، ریاضیات، نجوم، منطق، ویاکرن، طب

وغیرہ مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی، وہاں سیاروں اور فلکی عجائبات کے مشاہدے

کے لئے رصد گاہیں بنی ہوئی تھیں، وہاں کی آبی گھڑی گرد و نواح والوں کو وقت بتلاتی تھی،

اس جامعہ میں داخل ہونے کے لئے ایک امتحان دینا پڑتا تھا، یہ امتحان بہت سخت ہوتا

تھا، اور کتنے ہی طلبہ ناکام رہ جاتے تھے، پھر بھی دس ہزار طلبہ کا ہونا حیرت کی بات ہے

اس کے فارغ التحصیل طلبہ مستند عالم سمجھے جاتے تھے، ہرش نے اپنے دارالسلطنت کی

تقریب میں نالندہ سے ایک ہزار علماء مدعو کئے تھے، مسلمانوں کے زمانہ میں اس یادگار

اور فیض بار جامعہ کی ہستی خاک میں مل گئی، (ص ۱۷۶)

نالندہ کی تباہی | اچھا صاحب نے آخری سطر میں جو بات لکھی ہے، وہ اتنی ترمیم کے ساتھ صحیح ہے

کہ نالندہ کی خانقاہ یا درسگاہ مسلمانوں کے زمانہ میں نہیں بلکہ محمد بختیار خلجی کے حملۂ بہار کے وقت

---

[۱] بیل بدھسٹ ریکارڈس آف دی ویسٹرن ورلڈ ج ۲ ص ۱۶۷، ۱۶۸

اثنائے جنگ میں ایسی منتشر اور پراگندہ ہوئی کہ پھر اس کا شیرازہ نہ بندھ سکا، اس حملہ کی کیفیت قاضی منہاج سراج نے طبقات ناصری میں ۶۴۱ھ میں ایسے شخص سے سُن کر لکھی ہے جو بختیار خلجی کے ساتھ اس جنگ میں شریک تھا عبارت یہ ہے:۔

یک دو سال بریں منوال بداں حوالی
و ولایت می دوانید تا استعداد حصار
بہار کرد، ثقات رواۃ چنیں روایت
کردند کہ با دویست برگستوان بدر
قلعۂ بہار رفت و مناقصہ جنگ پیش
برد.....

چوں بدر حصار وصول افتاد جنگ
پیش بردند، ...... چوں محمد بختیار
خود را بقوت و دلیری در تنورہ[۱]
دروازہ آن حصار انداخت و قلعہ را
فتح کرد، و غنائم بسیار بدست آوردند
بیشتر ساکنان آن موضع برہمنان بودند
سرہا تراشیدہ داشتند، ہمہ کشتہ شدند
در آنجا کتب بسیار بود چوں آن کتب در نظر اہل اسلام

محمد بختیار خلجی ایک دو سال اسی طرح
بہار کے اطراف میں گھوڑا دوڑاتا رہا،
یہاں تک کہ بہار کے حصار کی تیاری
کی، معتبر راویوں نے بیان کیا کہ
دو سو زرہوں (زرہ پوشوں) کے
ساتھ بہار کے قلعہ کے دروازہ پر گیا
اور ناگہانی طور سے لڑائی شروع کر دی

جب حصار کے دروازہ تک پہونچے
کا اتفاق ہوا، ...... محمد بختیار نے
اپنے کو بہادری و دلیری کے ساتھ اس
حصار کے دروازہ کے شگاف میں ڈال
دیا، اور قلعہ کو فتح کر لیا، اور بہت سا
مال غنیمت ہاتھ آیا، اس مقام کے
زیادہ تر رہنے والے برہمن (بودھ عالم)
تھے، سر کے بال منڈے ہوئے یہ سب

۱؎ کذا، شاید کہ در تنورہ باشد بمعنی شگافتہ و چاک "س"

آمد، جماعتے را طلب کردند، کہ تا از معانی آن کتب علامے باز دہند، جملہ کشتہ شدہ بودند، چوں معلوم شد، تمامت آں حصار و شہر مدرسہ بود و بہار بلغت ہندوی اسم مدرسہ باشد، چوں آن فتح برآمد باغنائم بسیار بازگشت،

(۱۴۷-۱۴۸۔ کلکتہ اڈیشن)

مارے گئے، اور وہاں کتابیں بہت تھیں جب وہ کتابیں مسلمانوں کو نظر آئیں تو کچھ لوگوں کو طلب کیا، جو ان کتابوں کے مطلب سے خبر دیں، سب ہی مارے جاچکے تھے، معلوم ہوا کہ یہ پورا حصار اور شہر مدرسہ تھا، اور بہار ہندوی زبان میں مدرسہ کا نام ہے، جب یہ فتح ہوگیا تو بہت سے مال غنیمت کے ساتھ واپس پھر گیا،

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حملہ آوروں کو اس حصار کا مدرسہ یا درسگاہ ہونا پہلے سے معلوم نہ تھا، نہ انھوں نے عمارتوں کو برباد کیا اور نہ کتابوں کو غائباً نقصان پہنچایا، عمارتوں کے نقصان نہ پہونچنے کی شہادت تو آثار آج بھی دے رہے ہیں، تمام دیواریں ہال، کمرے اور کمروں کے اندر کے خشتی چبوترے، بعینہ موجود ہیں، البتہ جو چیز نہیں ہے، وہ چھتیں ہیں چھتوں کا کہیں وجود نہیں،

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ برآمد شدہ عمارت اس طرح سہ منزلہ ہے کہ ایک منزل تو زمین کے برابر ہے، دوسری زمین کے اوپر ہے، اور تیسری اس کے اوپر ہے اور ان میں ہر منزل کی بنیاد نئے بڑے بڑے پتھر رکھ کر اس طرح اس پر کھڑی کی گئی ہے، کہ ہر منزل دوسری منزل سے بے تعلق اور بغیر کسی جوڑ کے ہے، اگر ممکن ہو تو ہر منزل کو دوسری منزل سے علحدہ کرکے اس طرح اکھاڑ سکتے ہیں، کہ نیچے کی منزل کو ذرہ سا بھی نقصان نہ پہنچے، ہر منزل کی نالیاں

اور بڑے بڑے پرنالے الگ الگ ہیں، محکمۂ آثار قدیمہ کے محقق کہتے ہیں، کہ یہ تینوں منزلیں مین راجاؤں کے زمانہ میں الگ الگ بنی ہیں، اور بہت دوسرے قرائن سے یہ ثابت کیا گیا ہے، کہ یہ مقام مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی متعدد بار ویران اور آباد کیا جا چکا ہے، چنانچہ نالندہ کے بعض اندرونی سنگی دروازوں کے آگ لگائے جانے کے آثار بھی پائے جاتے ہیں، غالبًا بودھوں کے دشمن ہندو برہمنوں نے اس کے مٹانے کی کوششیں بار بار کی ہیں،

اس درس گاہ کے بند ہو جانے کی وجہ غالبًا یہ ہوئی ہوگی، کہ محمد بختیار خلجی کے قبضۂ بہار کے بعد وہ زمین اور جائدادیں جو نئے فاتحوں کے ہاتھوں میں آئیں، وہ پھر بطور وقف باقی نہ رہیں، جس کی آمدنی سے یہ درسگاہ چل رہی تھی، اور چونکہ بودھ دھرم کے ماننے والے اس ملک میں باقی نہیں رہے تھے، اس لئے ان اوقاف کے دوبارہ اجراء کے لئے ہندو رعایا کی طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی ہوگی،

طبقات ناصری کی عبارت بالا میں "برہمن" سے مقصود ہندو برہمن نہیں ہیں، بلکہ بودھ مذہب کے لکھنے پڑھنے والے عالم مراد ہیں، بہار کا لفظ اصل "وہار" ہے، جس کے اصلی معنی مدرسہ کے نہیں، بلکہ خانقاہ ومعبد کے ہیں، اور چونکہ وہ درس وتدریس کے کام میں بھی آتا تھا، اس لئے اس سے درس گاہ کا مطلب سمجھنا بھی درست ہی،

نالندہ کا زمانہ چینی سیاح فاہیان (Fahian) جو ۴۰۵ء اور ۴۱۱ء کے درمیان ہندوستان میں آیا تھا، اپنے سفرنامہ میں نالندہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا، لیکن دوسرا مشہور چینی سیاح یان چنگ (Yanchang) جس نے ۶۳۰ء اور ۶۴۵ء کے درمیان ہندوستان کا

۱؎ یہ حالات تمام تر نالندہ کے مختصر رہنما (گائڈ) بزبان انگریزی مصنفہ ایم. ایچ. قریشی قائم مقام سپرنٹنڈنٹ محکمۂ آثار قدیمہ پٹنہ سے لئے گئے ہیں،

سفر کیا تھا، کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس مقام کے حالات بیان کرتا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ نالندہ کی مشہور خانقاہیں سنہ [illegible] اور سنہ [illegible] کے درمیانی زمانہ میں تعمیر ہوئی تھیں،

نالندہ کے بانی: یان چنگ کی روایت ہے کہ پانچ سو تاجروں نے ایک لاکھ طلائی سکوں کے معاوضہ میں یہ زمین خرید کر گوتم بدھ کو پیش کر دی تھی، اور اس نے تین ماہ تک وہاں شریعت کی تبلیغ کی، یان چنگ ہی کا بیان ہے کہ نالندہ کی پہلی خانقاہ سکرادتیا (Sakraditya) نامی اس ملک کے ایک قدیم راجا نے تعمیر کرائی تھی، اور اس کے بعد پانچ دوسرے راجاؤں نے جن میں سے چار سکرادتیا کی اولاد میں تھے، اور پانچواں وسط ہند کا ایک راجا تھا، اصلی خانقاہ کے شمال، جنوب اور مشرق کی جانب دوسری خانقاہیں تعمیر کرائیں،

نالندہ کے مشائخ: یان چنگ کے زمانہ میں اس خانقاہ میں بودھ مذہب کے کئی ہزار مشائخ رہتے تھے، جن کی اعلیٰ لیاقت کا شہرہ دور دور پھیلا ہوا تھا، اس خانقاہ کا رئیس رہبان سیلا بھدرا تھا،

نالندہ کے موجودہ آثار: نالندہ کے آثار میں اینٹ کی قدیم عمارتوں کے کثیر التعداد کھنڈر ہیں، جو دو ہزار فٹ لمبے اور سات سو فٹ چوڑے خطہ میں پھیلے ہوئے ہیں، مغرب کی جانب ایک قطار اسٹوپا کی ہے، جن میں سے بعض بہت بڑے اور اکثر بالکل چھوٹے ہیں، اس قطار کے مشرق میں ایک سلسلہ خانقاہوں کا ہے، جن میں سے متعدد خانقاہیں محکمۂ آثارِ قدیمہ نے کھود کر باہر نکال لی ہیں،

سب سے بڑا اسٹوپا[1]: یہ ایک عظیم الشان مربع عمارت ہے، جس کے گرد متعدد چھوٹے چھوٹے اسٹوپے ہیں، ان میں سے اکثر دو دو اور تین تین ایک کے اوپر ایک بنے ہوئے ہیں، کھدائی کے سلسلہ میں دیکھا گیا، کہ سب سے بڑا اسٹوپا بھی پہلے چھوٹا تھا، بعد میں متعدد اسٹوپے، اس کے اوپر اور چاروں طرف

---

[1] بودھیوں کی قبروں، اور یادگاروں پر زمین سے اوپر تک جیسے منارے کھڑے کئے جاتے تھے، ان کو اسٹوپا کہتے ہیں،

تعمیر ہوتے گئے، چنانچہ اس وقت اس کے اوپر سات اسٹوپے ایک پر ایک بنے ہوئے ہیں، ان میں سے پہلے کے تین اسٹوپے اس تودے کے اندر مدفون پائے گئے تھے، وہ سب بارہ فٹ مربع نیچے دفن تھے، بقیہ چار اسٹوپوں کی عمارتیں زیادہ وسیع ہیں، اور ان پر جانے کے لئے شمالی رُخ پر چوڑی چوڑی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں، ان میں سے چوتھا اسٹوپا سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ اچھی حالت میں ہے، اس میں خوبصورت طاقوں کی قطاریں بنی ہوئی ہیں، اور گوشوں کے میناروں پر گوتم بدھ اور بودھ مذہب کے مشاہیر کے مجسمے ہوئے ہیں، چونکہ اصلی اسٹوپا ہر اضافہ کے بعد وسعت اور بلندی میں بڑھتا گیا، اس لئے اس کی سطح بھی رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی، اور بہت سے چھوٹے چھوٹے اسٹوپے اس کی سطح کے نیچے کھود کر برآمد کئے گئے ہیں، جن میں سے بعض کا ایک حصہ اور بعض بالکل زمین کے اندر غائب ہو گئے تھے، اس اسٹوپا کے شمالی مشرقی گوشہ پر ایک بلند چبوترہ ہے، جس پر متعدد چھوٹے چھوٹے اسٹوپے بنے ہوئے ہیں، اور اس کے ایک گوشہ میں ایک معبد کی مربع عمارت ہے، اس میں اوالوکیتشور کا ایک کھڑا مجسمہ ہے، جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ یہی وہ اصلی اسٹوپا ہے جس کی نسبت یان چانگ نے لکھا ہے کہ وہاں گوتم بدھ نے تین ماہ قیام کرکے اپنے مذہب کی تبلیغ کی تھی،

اصلی اسٹوپا کے جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا عبادت خانہ ہے، جس میں ایک سنگی مجسمہ ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بودھ مذہب کے مشہور عالم اور فلسفی ناگ ارجن کا مجسمہ ہے،

اس اسٹوپا کے مشرق جانب دو خانقاہوں کے کھنڈر ہیں، اور اس کے بعد شمال مشرق کی طرف ایک بڑی خانقاہ ہے، جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ ممتاز ہے،

خانقاہ نمبر ۱ | اس بڑی خانقاہ کی ڈیوڑھی کے شمالی مغربی گوشہ میں ایک کتبہ تانبے کی تختی پر کھدا ہوا پایا گیا ہے، یہ کتبہ بنگال کے پالا خاندان کے تیسرے فرماں روا دیوپال کا ہے، جو نویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں حکومت کرتا تھا، اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سماترا کے راجہ

سری بالاپوتر دیو نے ایک خانقاہ نالندہ میں تعمیر کرائی، اور اپنے ملک کے پانچ گاؤں دیوپال کو دیئے جس کے معاوضے میں دیوپال نے راجہ گریہا (موجودہ راجگیر) اور گیا کے ضلعوں کے چند گاؤں جو سرنگر (یعنی پٹنہ) کی قسمت میں واقع تھے، اس خانقاہ کی نگہداشت اور جو راہب نالندہ میں آئیں، اُن کے آرام و آسایش کے لئے دیدیئے،

نالندہ کی کھدائی سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ مقام متعدد بار ویران اور آباد ہوا چنانچہ جس مقام پر یہ خانقاہ واقع ہے، وہاں زمین کی ۹ تہیں برآمد ہوئی ہیں، جو ایک دوسرے کے نیچے دبی ہوئی تھیں، ان میں سے ہر تہ پر پختہ فرش اور مسمار شدہ دیواروں کے نشانات پائے گئے ہیں،

قیاس ہے کہ خانقاہ کا زیریں حصّہ جس کے حجرے مغرب، جنوب اور مشرق کی جانب دکھائی دیتے ہیں، راجا دیوپال کے عہد میں تعمیر ہوا تھا، خانقاہ میں راہبوں کے لئے حجرے ہیں جن کے سامنے ایک چوڑا برآمدہ ہے، اور اس کے آگے ایک کھلا ہوا مستطیل صحن ہے جس کے وسط میں مشرق کی طرف خانقاہ کا خاص معبد واقع ہے، متعدد حجروں کو کھودنے سے ایک قدیم تر خانقاہ کے آثار ملے ہیں، جو دیوپال کی تعمیر کردہ خانقاہ سے پانچ فٹ نیچے دبی ہوئی تھی، خانقاہ کے خاص معبد میں پہلے گوتم بدھ کا ایک عظیم الشان مجسمہ نصب تھا، جس کی ٹانگوں کے آثار اب تک موجود ہیں، مشرقی برآمدہ میں بھی چند ٹوٹے ہوئے سنگی مجسّمے پائے گئے ہیں، جن میں سے ایک "تین دنیاؤں جنت، دوزخ اور زمین کے فاتح" ترلوکیا دونجے کا مجسمہ ہے، صحن کے وسط میں مستطیل شکل کا ایک ٹھوس اور بہت بلند چبوترہ ہے،

خانقاہ کے زیریں اور بالائی حصّہ کے درمیان تقریباً چودہ فٹ کا فرق ہے، زیریں حصّہ تک پہونچنے کے لئے چوڑی چوڑی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں، اسی حصّہ میں دو کمرے بھی ہیں، جن کی

چھتیں قبہ دار ہیں، مسلمانوں کی فتح سے قبل محرابی چھتوں کی یہ پہلی مثالیں ہیں، یہ نہیں معلوم ہو سکا، کہ یہ کمرے کس غرض سے تعمیر کئے گئے تھے، کیونکہ اُن کے اندر کوئی چیز نہیں ملی، کمروں کے سامنے برآمدہ میں سنگ تراشی کے چند دلچسپ نمونے ملے ہیں، ان میں ایک سنگی لوح بھی ہے، جس پر گوتم بدھ کی زندگی کے آٹھ خاص واقعات درج ہیں، یعنی پیدائش، انوار و تجلیات کا ظاہر ہونا، آسمان تراپاسر یما سے نزول کرنا، بندروں کا پیالۂ شہد پیش کرنا، پاگل ہاتھی نالاگیری کو رام کرنا، بنارس کے سبزہ زار غزالان میں پہلا خطبہ، معجزہ، سراوستی اور مہا پرنیروان،

خانقاہ نمبر ۴ | بڑی خانقاہ کے نیچے مغرب جانب ایک دوسرا زینہ ہے، جو ایک قدیم تر خانقاہ کو جاتا ہے، اس عمارت کی ایک نمایاں شے وہ روشندان ہے، جس کا ایک حصہ ابتک باقی ہے، نالندہ کی کسی دوسری عمارت میں ایسا روشندان نہیں ملا ہے، اس خانقاہ کے شمالی نصف حصہ کے کھودنے سے معلوم ہوا کہ اس کی سطح کے نیچے غالباً راجہ دیوپال کے عہد کی بنی ایک اور خانقاہ بھی، اس دوسری خانقاہ کے شمالی برآمدہ میں کمار گپت (۴۱۳ء تا ۴۵۵ء) کا ایک طلائی سکہ ملا ہے، جس پر ایک تیر انداز کی تصویر بنی ہوئی ہے، اور جو نالندہ کے قدیم ترین آثار میں سے ہے، اس خانقاہ کے جل کر برباد ہو جانے کا ثبوت اس کی جلی ہوئی چوکھٹوں اور اینٹوں سے ملتا ہے،

خانقاہ نمبر ۵ | خانقاہ نمبر ۴ کے ایک جنوبی مشرقی حجرہ سے ایک زینہ خانقاہ نمبر ۵ کو اترتا ہے، جس کے حجروں کی صرف مشرقی قطار ابتک برآمد کی گئی ہے،

خانقاہ نمبر ۶ | اس میں حجروں کی دو قطاریں ہیں، جو ایک دوسرے کے پیچھے واقع ہیں، اس خانقاہ میں پختہ اینٹوں کے دو صحن ہیں، ان میں سے ایک صحن اس قدیم تر خانقاہ کا ہے، جو پہلے تعمیر ہوئی تھی، اور جس کے مسمار ہو جانے کے بعد یہ دوسری خانقاہ بنائی گئی، بالائی صحن میں دو چولھے پائے گئے ہیں جن پر راہب کھانا پکاتے تھے، اس خانقاہ کے صحن میں بھی دوسری خانقاہوں کی طرح ایک کنواں ہے،

خانقاہ نمبر ۶ یہ خانقاہ جس مقام پر واقع ہے، وہاں دو خانقاہیں اس سے قبل آباد تھیں جن کے کھنڈر اس خانقاہ کے نیچے کھودنے سے پائے گئے ہیں،

خانقاہ نمبر ۷ خانقاہ نمبر ۶ کے شمال میں خانقاہ نمبر ۷ واقع ہے، جس کی کھدائی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے،

سنگی مندر نمبر ۲ خانقاہ نمبر ۷ کی پشت پر یعنی مشرق جانب ایک مسمار شدہ سنگی مندر ہے، جس کی دیواروں پر باہر کی جانب سنگ تراشی کے نہایت خوبصورت نمونے بنے ہوئے ہیں، ان میں مختلف اشخاص مثلاً شیو اور پاروتی، کارتیکیا مع اپنے طاؤس کے اور گوتم بودھ کی جو قلم دوات لئے بیٹھا ہے، تصویریں بنی ہوئی ہیں، ان کے علاوہ مختلف مناظر کی تصویریں بھی ہیں،

مندر سے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر شمال مغرب کی جانب ایک بہت بڑا اسٹوپا ہے، جو اسٹوپا کی قطار کے شمالی سرے پر تانی دہرا ہر کے تودے کے نیچے دفن ہے، اس اسٹوپا کا صرف ایک حصہ ابھی کھود کر نکالا گیا ہے، تودے کی جڑ میں مشرق جانب گوتم بودھ کا ایک کھڑا ہوا مجسمہ ہے، اسی سے ملی ہوئی ایک چہار دیواری ہے جس کے اندر گوتم بدھ کا جو مقامی طور پر بنک بھیرو کے لقب سے مشہور تھا ایک عظیم الشان مجسمہ ہے،

نالندہ کا اخیر دور نالندہ کی شہرت تمام قرون وسطیٰ میں دور دور پھیلی ہوئی تھی، مگدھ (موجودہ صوبہ بہار) کو جو شہرت بودھ مذہب کے مرکزی مقام کی حیثیت سے حاصل تھی، اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ چین کے شہنشاہ واتی یا یا دین نے ۵۳۹ء میں ایک وفد مگدھ کو اس غرض سے بھیجا کہ وہ اس مذہب کی کتابیں جمع کرکے کسی فاضل سے ان کا ترجمہ چینی زبان میں کرائے مگدھ کے راجہ نے جو اس وقت غالباً جیو تیا گپت اول یا کمار گپت سوم تھا، شہنشاہ کی خواہش کو بخوشی منظور کیا، اور فاضل پرمارتھا کو اس کام پر مقرر کیا، یہ وفد کئی سال تک ہندوستان میں قیام کرکے پرمارتھا کو لے کر چین کو واپس ہوا، پرمارتھا اپنے ساتھ اپنی مترجم کتابوں کا

ایک بڑا ذخیرہ لیتا گیا تھا، آٹھویں صدی کے بعد بھی جب مگدھ کا سیاسی انحطاط شروع ہوگیا تھا، اُنند کی سابق شہرت بدستور قائم رہی، اور پالا خاندان کے فرماں روا اس کی سرپرستی کرتے رہے، تیرھویں صدی میں محمد بختیار خلجی کی فتح مگدھ کے بعد ان خانقاہوں میں درس وتدریس کا سلسلہ بند ہوگیا۔

رصد خانہ کا نشان نہیں | گوری شنکر ہیراچند اوجھا جی نے اوپر کے اقتباس میں یہاں کے رصد خانے کا ذکر کیا ہے، مگر اس درس گاہ و خانقاہ کے جو آثار اب تک نکلے ہیں، ان میں رصد خانہ کا کوئی نشان نہیں ہے، معلوم نہیں یہ کس سند سے انھوں نے لکھا ہے

بعض تعمیری خصوصیات | میں نے اور میرے رفقا نے ان تمام مقامات کی سیر کی، اس وقت تک پہلو بہ پہلو گیارہ عمارتیں نکلی ہیں، جو تعمیر کے لحاظ سے ہو بہو ایک ہیں، عام طرز یہ ہے کہ بیچ میں وسیع صحن، صحن میں اینٹوں کا فرش، صحن کے بیچ میں ایک کنواں، صحن کے چاروں طرف اینٹ کے پایوں پر سائبان، سائبان کے پیچھے کہیں چھوٹے اور کہیں بڑے مسلسل کمرے، بڑے کمروں میں ادھر ادھر دیوار کے قریب دو لمبے چبوترے جو سونے کے کام میں آئیں، اور چھوٹے کمروں میں ایک چبوترہ، چبوتروں کے پاس دیوار میں ایک طاق، جس کے اندر چور الماری کی طرح، دیوار کے اندر ہی اندر لمبا جوف یا خول، ہمارے رہنما نے ہم کو بتایا کہ یہ طالب علموں کے رہنے کے کمرے ہیں، یہ چبوترہ ان کے سونے کے لئے، اور یہ طاق اور الماری کتابوں کے رکھنے کے لئے،

یہ تمام عمارتیں اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں، یہ اینٹیں آج کل کی مروجہ اینٹوں سے لمبائی چوڑائی میں ڈیوڑھی، اور موٹائی میں آدھی ہیں، دو اینٹوں کے بیچ میں جو مسالہ لگایا گیا ہے، وہ اتنا کم ہے کہ معلوم بھی نہیں ہوتا، تاہم اتنا مضبوط ہے کہ ہزارہا سال کے بعد بھی اسی طرح موجود ہے، یہاں کی ایک عمارت کے ایک مقام میں دو ایسی چیزیں نظر آئیں جو اب تک ہندستان کی قبل

انا اسلام عمارتوں میں کہیں اور مجھے نظر نہیں آئیں، ایک یہ کہ ایک چھوٹا سا کمرہ مخروطی شکل کی لداؤ چھت سے پاٹا ہوا جس کو ہم گنبد کا بہت ہی ادنیٰ خاکہ کہہ سکتے ہیں، دوسری یہ کہ اس مختصر کمرہ میں اندر جانے کے دروازے کے اوپر لداؤ پاٹن جس کو ہم محراب کے تخیل کا سنگِ بنیاد کہہ سکتے ہیں، یہ محراب ایک پوری اینٹ کو، دوسری پوری اینٹ سے دبا کر بنانے کے بجائے، اس طرح بنائی گئی ہے جس طرح مسلمانوں میں بغلی قبریں اینٹوں سے پاٹی جاتی ہیں، یعنی دروازے کے دونوں طرف ایک ایک اینٹ کی قطار رکھی، پھر اس پر دوسری قطار اس کو دباتے ہوئے ذرا آگے نکال کر رکھی، پھر اس پر تیسری، اس پر چوتھی، دروازہ کے دونوں پہلو دونوں طرف سے آہستہ آہستہ ملتے گئے، یہاں تک کہ آخر جا کر ایک نقطہ پر مل گئے، اور گویا محراب کی شکل پیدا ہو گئی،

(معارف فروری ۱۹۳۵ء)

تاج محل اور لال قلعہ کے معمار

ہندوستان کے ارباب کمال میں خدا جانے کتنی ہستیاں ہیں جو گمنامی کے پردہ میں اس طرح چھپی ہیں کہ آج ہزار تلاش اور جستجو پر بھی اُن کا سُراغ نہیں لگتا، اس ملک میں تاریخ نویسی کا رواج بہت کم تھا، گو مسلمانوں کے آنے کے بعد تاریخ کی کچھ کچھ روشنی یہاں پھیلنے لگی، پھر بھی بادشاہوں کے ایوانِ تاریخ سے باہر بدستور اندھیرا چھایا رہا، شاعروں نے البتہ اپنے تذکروں کی محفل میں شمع جلائی، مگر اُس کی روشنی اتنی مدھم ہے، کہ خود اُن کی صورتیں بھی اس سے پہچان میں اچھی طرح نہیں آتیں، روحانی بزرگوں کے مزاروں پر بھی چراغ جلائے گئے ہیں، مگر اُن سے بھی برکات اور کرامات کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا، اگر ملا بدایونی، شاہ عبدالحق دہلوی، اور آزاد بلگرامی نہ ہوتے تو جو کچھ بھی معلوم ہے، وہ بھی ہم کو معلوم نہ ہو سکتا،

لاہور کے جس مہندس خاندان کا حال آج ہم کو سنانا ہے، افسوس ہے کہ تاریخوں میں نام کے سوا اس کے کسی رکن کا حال بھی مجھے معلوم نہیں ہوا، حالانکہ اُن کی بنائی ہوئی عمارتیں تاج آگرہ، لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی ہمیشہ سے مشہور روزگار رہیں، مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن باکمالوں نے فن کی ندرت کا یہ کمال دکھایا ہے، کاغذ کے پرانے اوراق میں بھی ان کا نام و نشان نہیں ملتا،

شاہجہاں کی تاریخوں میں اُس کے سالِ ششم میں روضۂ تاج محل کے بننے کا پورا حال ایک ایک چیز کی پیمائش کے ساتھ لکھا ہے، مگر جن نادرہ کار مہندسوں، نقاشوں، اور طراحوں نے اس کا خاکہ کھینچا، اور جن معماروں نے اس کو بنا کر تیار کیا، ان عزیبوں کے نام تک بھی ان اوراق میں جگہ نہ پا سکے، اور آج کل کے محققین بڑی چھان بین کے بعد بھی اُن کا پتہ لگانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے،

اس خاندان کے بعض ارکان کے نام مصنف کی حیثیت سے بعض کتب خانوں کی فہرستوں میں مذکور ہیں، مگر ان میں بھی نام کے سوا کچھ اور نہیں، اور نہ ان افراد کے باہمی تعلق کا ذکر ہے، بلکہ اُن کی حیثیت بیگانہ افراد انسانی کی ہے،

دیوان مہندس کا نسخہ پورے دو برس ہوئے، کہ ایک کرم فرما نے بنگلور سے مجھکو اطلاع دی کہ اُن کے پاس مہندس نام ایک شاعر کا فارسی دیوان ہے، اور دریافت کیا کہ آپ اس شاعر سے واقف ہیں، میں نے لکھا کہ آپ وہ نسخہ مجھے بھیج دیں، تو میں اپنی رائے ظاہر کروں، موصوف نے بڑی مہربانی فرماکر نسخۂ مذکور میرے پاس بھیج دیا، میں نے اس شخص کی تلاش میں اکثر تذکرے دیکھے لیکن کہیں کچھ پتہ نہ چلا، مگر خوش قسمتی سے خود اس دیوان میں شاعر کی ایک مثنوی مل گئی، جس میں اُس نے اپنے خاندان کا مختصر حال خود لکھا ہے، اس کو پڑھ کر میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ معماروں اور انجینیروں کی طرف سے پہلی آواز تھی جس میں تاج اور لال قلعہ کے بنانے کا دعویٰ کیا گیا تھا،

اس مثنوی سے نہ صرف شاعر کی، بلکہ شاعر کے باپ اور بھائیوں کے حالات بھی معلوم ہوئے، اور اس کے دوسرے قصائد اور اشعار سے یہ بھی قیاس میں آیا، کہ اس باکمال خاندان کی گمنامی کا سبب کیا ہو سکتا ہے،

---

[1] بعض تذکروں میں مہندس کے بیٹے ریاضی کے ضمن میں مہندس کا نام مذکور ہے،

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مہندس ہے، مہندس کے معنی علم ہندسہ جاننے والے یعنی انجینیر کے ہیں، اور اس کا یہ دیوان چند قصیدوں بعض مثنویوں اور بہت سی غزلوں پر مشتمل ہے، اور یہ سب فارسی میں ہیں،

دیوان کا کوئی دوسرا نسخہ مجھے نہیں ملا، زیر نظر نسخہ چھوٹی تقطیع کے ۷۰ صفحوں پر حاوی ہے، دیوان کے حصۂ غزل کے خاتمہ کی تاریخ اتمام ۷ شہر ذی الحجہ بوقت شب تحریر یافت" لکھا ہوا ہے، دیوان کے خاتمہ پر اس کتاب کی خریداری کی تاریخ لکھی ہے،

"بتاریخ بستم رمضان المبارک ۱۱۵۵ھ، دیوان مہندس خرید شد بسرکار نواب ابراہیم خان بہادر"

اور کتاب کے اندر بعض تاریخی قطعات ہیں جن میں سب سے آخری تاریخ ۱۱۰۶ھ کی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ اگر یہ "۷ شہر ذی الحجہ ۴۷ سنہ" ہے تو وہ یقیناً ۱۱۴۷ھ ہے، ورنہ میرا شبہہ اس بنا پر کہ یہاں صرف ۴۷ سنہ لکھا ہے، اور سیکڑہ نہیں لکھا ہے، یہ ہوتا ہے، کہ یہ سنہ ہجری نہیں، بلکہ سنہ جلوس ہے، اب ۱۱۰۶ھ کے بعد اور ۱۱۵۵ھ کے بیچ میں ایسا بادشاہ جس کو جلوس کا ۴۷ واں سال نصیب ہوا ہو، اورنگزیب عالمگیر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، ۴۷ سنہ جلوس عالمگیری ۱۱۱۵ھ کے مطابق ہے،

اس نسخہ کے صفحۂ اول پر عمدہ جلی نستعلیق سے این کتاب سر(کار) نواب بہادر..... لکھا ہے، باقی حروف کٹ گئے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نسخہ کی تقطیع پہلے بڑی تھی، جلد بندی کے وقت کچھ حاشیہ کاٹ دیا گیا ہے، اس کے نیچے "این کتاب سرکار نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ بکتاب خان (بکتاب خانہ) داخل شد" اس پر ایک مہر بھی تھی، جو کسی نے مٹا دی ہے،

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مہندس ہم سن چکے، اور وہ اپنے باپ کا نام احمد معمار بتاتا ہے، معمار احمد کا پیشہ ہے، نام کا جزو نہیں اس کے ایک قطعہ میں اس کا شاہی لقب "نادر العصر" مذکور ہے، اس شاعر کی بعض اور تحریریں بھی ہم کو دستیاب ہوئی ہیں، جن میں وہ اپنے باپ کو لزوماً "استاد احمد لاہوری" لکھا کرتا ہے، اب ان ٹکڑوں کے جوڑنے سے احمد کا پورا نام اور لقب "نادر العصر استاد احمد لاہوری" ثابت ہوتا ہے،

نادر العصر استاد احمد لاہوری | اس نادر العصر کے حالات کا سراغ تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا، البتہ قلعۂ دہلی کی تعمیر کے سلسلہ میں مورخوں نے کہیں کہیں اس کا نام لیا ہے، محمد صالح کنبوہ نے عمل صالح میں جو شاہجہاں کی معاصر تاریخ ہے، شاہجہان آباد کے عمارات و قلعہ کی تعمیر کے بیان میں اس کا نام ان لفظوں میں لیا ہے،

"از شب جمعہ بست و پنجم ذی حجہ مطابق نہم اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس مطابق ایک ہزار و چہل و ہشت[۱] ہجری در زمان محمود و آوان مسعود استاد احمد و حامد[۲] سرآمد معماران نادرہ کار بسرکاری غیرت خان صوبہ دار آنجا بد صاحب اہتمام ایں کار مطابق طرح بدیع و نقشۂ تازہ کہ بہیچ وجہ نظیر آن در شش جہت دنیا

---

[۱] اس مطبوعہ نسخہ میں جس کی تصحیح ناظم آثار قدیمہ سرکار نظام مولوی غلام یزدانی صاحب نے کی ہے، یہ سنہ لفظوں میں چہل و ہشت کے بجائے "ہشتاد و چہل" چھپ گیا ہے، جو قابل تصحیح ہے، [۲] اسی طرح یہ بھی تعجب انگیز ہے کہ اس مطبوعہ نسخہ میں حامد کا نام حذف ہوگیا، متعدد قلمی نسخے دیکھے سب میں احمد کے ساتھ حامد کا نام بھی ہے، کتب خانہ حبیب گنج کے نسخہ $\frac{32}{24}$ کی عبارت یہ ہے:

"موافق ۱۰۴۸ھ در زمان محمود و آوان مسعود، استاد احمد و حامد سرآمد معماران نادر کار ..... مطابق طرح تازہ و نقشۂ بدیع" "ورق ۲۰۷"

بہ نظر نظارگیاں زیادہ بود از رنگ ریختہ" (جلد ۳ ص ۲۰۸ کلکتہ)

مدرسہ دیوبند کے کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب تاریخ شاہجہاں کے نام سے ہے جس کا نمبر ۴۴۳ ہے، اس میں چند صفحے باب قلعۂ شاہجہان آباد کے عنوان سے شاہجہان آباد اور شالامار باغ کی تعمیر کے حالات میں ہیں، اس سلسلہ میں حسب ذیل عبارت ہے :-

"بحکم اشرف بعد از پنج ساعت از شب جمعہ بست وپنجم ذی الحجہ مطابق اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس شاہجہانی موافق سنہ ہزار وچہل وہشت ہجری کہ مختار دانشوران انجم وافلاک بود، استاد احمد استاد حامد کہ معماران ماہر بودند، و در کار عمارت سر آمد بسرکاری غیرت خاں برادرزادہ عبداللہ خاں فیروز جنگ کہ ناظم صوبہ دہلی و اہتمام تاسیس عمارت مذکور باو مفوض شد، مطابق طرحے کہ در پیش گاہ خلافت مقرر گشتہ بود......"

شاہجہانی و عالمگیری عہد کے امرار کے خطوط کا ایک ناقص اور بے نام ونشان پرانا مجموعہ ہے،[۵۱] اس کے ایک خط میں نواب جعفر خاں کو سرائے باغ اور قلعہ حسن ابدال کی تعمیر کے متعلق کچھ لکھا گیا ہے، اس سلسلہ میں استاد احمد معمار کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے :-

"..........بدرگاہ سلاطین سجدہ گاہ معروض داشتہ حقیقت حسن سلوک کار دانی محمد مومن مذکور واستاد احمد معمار کہ در طراحی و وقوف کار عمارت و معاملہ شناسی استعداد تمام دوستی یکساں دارد"

عمدۃ الملک نواب جعفر خاں مختلف مناصب جلیلہ کے بعد ۱۹ سنہ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۵ھ میں پنجاب کا صوبہ دار، ۲۱ سنہ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۷ھ میں شاہجہاں کا وزیر اور

---

[۵۱] یہ مجموعہ مولوی عبداللہ صاحب چغتائی (اسلامیہ کالج لاہور) کی ملک میں ہے،

۱۰۰۰ھ میں عالمگیر کا وزیر ہوا، اور ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی، یہ خط غالباً پنجاب کی صوبیداری یا وزارت کے عہد میں اس کو لکھا گیا ہوگا، کیونکہ جیسا آگے معلوم ہوگا کہ اس کے دو ہی برس بعد ۱۰۵۹ھ میں احمد وفات پا چکا تھا،

سرسید مرحوم نے اپنی قابل قدر کتاب آثار الصنادید میں استاد احمد اور حامد کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ "یہ اپنے فن میں بے نظیر" اور ہندسہ و ہیئت "میں ثانی اقلیدس اور رشک ارشمیدس تھے"

بہرحال ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ استاد احمد عہد شاہجہانی میں "سرگروہ معماران ادرہ کار" تھا، اور اس کو عمارتوں کا نقشہ اور خاکہ بنانے اور تعمیرات کے دوسرے کاموں میں کمال دستگاہ حاصل تھی،

تاج محل کے حالات میں بعہد انگریزی آگرہ میں ایک فارسی رسالہ خدا جانے کس نے لکھا ہے؟ اس کے قلمی نسخے عموماً ملتے ہیں، اس میں حالات کے ساتھ ساتھ عمارات کی تصویریں بھی ہیں، شروع میں ممتاز محل کی وفات کی افسانہ نما کیفیت لکھی گئی ہے، اور پھر اس میں تاج محل کی تعمیر کا ایک ایک خرچ اور اس کے ایک ایک پتھر کی قیمت .... اور اس کے ایک ایک کاریگر کے نام مع تعیین تنخواہ لکھے ہیں، جو زیادہ تر سنی سنائی حکایتوں، اور فرضی اعداد پر مشتمل معلوم ہوتا ہے، اس رسالہ میں کاریگروں میں سب سے پہلا نام "استاد عیسیٰ نادر العصر نقشہ نویس ساکن روم" لکھا ہے، اس کتاب کے مختلف نسخے دیکھے، اور سب میں ناموں کا کچھ نہ کچھ اختلاف پایا، اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس میں ہندو کاریگروں تک کو ساکن روم و بلخ و قندھار و سمرقند لکھا ہے، جامعہ علی گڈھ، حیدرآباد، بھوپال، ندوہ، اور دار المصنفین کے کتب خانوں کے نسخوں میں اللہ ان کے علاوہ اور بھی اسکے جو نسخے نظر سے گذرے ہے، ان میں بھی یہ شتر گربگی موجود ہے، "استاد نادر العصر" تک تو نام صحیح ہے، جو اسی احمد معمار کا شاہی لقب تھا، مگر اس میں "عیسیٰ نقشہ نویس ساکن روم" کا نام

اضافہ ہے، یا یہ کہ استاد نادر العصر اور عیسیٰ ساکن روم دو نام ہیں، جو ایک میں مل گئے ہیں، اس کتاب تاج میں امانت خاں شیرازی کے سوا جس کا ذکر تاریخوں اور تذکروں کے علاوہ خود تاج کے کتبوں میں ہے، جن کاریگروں کی فہرست دی گئی ہے، اور جو تنخواہیں لکھی گئی ہیں، وہ تمامتر محتاجِ ثبوت ہیں، لیکن تعجب ہے تاج کے مورخینِ حال نے ان کو بیچون وچرا تسلیم کرلیا ہے، بہرحال تاج کے معماروں میں سے جو نام اب سب سے زیادہ اہم سند رکھتا ہے، وہ یہی نادر العصر استاد احمد ہے، جس کا نام اس مضمون میں سب سے پہلی دفعہ پیش کیا جارہا ہے،

لطف اللہ کے بیان سے اس کے باپ احمد کے کچھ اور حالات بھی معلوم ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ احمد معمار آج کل کا کوئی اناڑی راج نہ تھا، بلکہ وہ باقاعدہ ہندسہ (انجینیرنگ) ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، یونانی ریاضیات فلکی کی سب سے اونچی کتاب مجسطی کا ماہر تھا، اور اقلیدس میں خواجہ نصیر طوسی کی مشہور کتاب تحریر اقلیدس کا عالم تھا، لطف اللہ ایک مثنوی میں اپنے خاندانی حالات کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے،

شاہجہاں داور گیتی ستاں — روشنیٔ دودۂ صاحب قِراں
عرش بریں قبۂ خرگاہِ اوست — رشکِ فلک سدۂ درگاہِ اوست
احمد معمار کہ در فنِّ خویش — صد قدم از اہلِ ہنر بود بیش
واقفِ تحریر و مقالاتِ آں — آگہِ اشکال و حوالاتِ آں
حالِ کواکب شدہ معلومِ او — سرِ مجسطی شدہ مفہومِ او
از طرفِ داورِ گردوں جناب — نادرِ عصر آمدہ اورا خطاب
بود عمارت گرآں بادشاہ — داشت دراں حضرت فرخندہ راہ۔

ان اشعار سے نادر العصر احمد معمار شاہجہانی کے فضل وکمال کا پورا اظہار ہوتا ہے، اور معلوم

ہوتا ہے کہ وہ شاہجہاں کا مشہور عمارت گر تھا، اب اس کے بعد وہ اشعار آتے ہیں جن میں اس عظیم الشان حقیقت کا انکشاف ہے، جو اب تک مستور و مخفی تھی، یعنی یہ کہ یہی وہ ممتاز ہستی ہے، جس نے ممتاز محل کا روضہ اور دہلی کا لال قلعہ تعمیر کیا، کہتا ہے،

آگرہ چوں شد مضرب رایاتِ شاہ | بس کہ بر د بود عنایاتِ شاہ
کرد بحکمِ شہِ کشور کشا | روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شہِ انجم سپاہ | شاہ جہاں داورِ گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر | کرد بنا احمد روشن ضمیر

ان دو کے علاوہ عہدِ شاہجہانی کی دوسری عمارتیں بھی اس نے بنائی تھیں، چنانچہ کہتا ہے :-

ایں دو عمارت کہ بیان کردہ ام | در صفتش خامہ رواں کردہ ام
یک ہنرا ز گنج ہنرہائے اوست | یک گہرا ز کانِ گہرہائے اوست

اس کے بعد اس کی وفات کا ذکر کیا ہے،

چوں نبود عالمِ فانی مقر | کرد سوے عالمِ باقی سفر

اس مثنوی کے شروع میں شاہجہاں کا ذکر زمانہ موجودہ میں کیا گیا ہے،

عرش بریں قبۂ اخرگاہِ اوست | رشکِ فلک سدۂ درگاہِ اوست

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی شاہجہاں کی زندگی میں لکھی گئی ہے، اور اسی کے عہد میں تاج محل اور قلعۂ دہلی کی تعمیر کا یہ دعوی کیا گیا ہے، اس سے زیادہ ثبوت اور کیا درکار ہے،

استاد حامد | استاد احمد کے ساتھ اس کے بھائی استاد حامد کا نام بھی ذکر کے قابل ہے، یہ بھی معماری، ہندسہ، اور دیگر علوم ریاضی میں سربرآوردہ تھا، اور قلعہ کی تعمیر میں احمد کا شریک تھا،

سرسید مرحوم اپنی قابلِ قدر کتاب آثار الصنادید میں قلعۂ شاہجہانی کے بیان میں لکھتے ہیں کہ:

(طبع اول ص ۳۲) "اچھی سے اچھی ساعت دیکھکر استاد حامد اور استاد احمد معماروں نے کہ اپنے فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور ہندسہ ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشکِ بزرمیدس تھے اس قلعہ کی پا ور کھی"

طبع دوم میں یہی عبارت ان لفظوں میں ہے،

"استاد حامد اور استاد احمد جو اپنے فن میں یکتا تھے، اس قلعہ کو بنواتے تھے" (طبع دوم نامی پریس ص ۲۸)

دہلی کے بڑے بوڑھوں کی زبانی یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ جامع مسجد دہلی بھی اسی استاد حامد نے جس کا مشہور نام "استا حامد" ہے بنائی ہے، اور اس کے بنانے میں اس کا دوسرا شریک "استا ہیرا" تھا،

استاد حامد کا نام قلعۂ دہلی کے بعد جو ۱۰۶۸ھ میں بنا، مانڈو کے ایک سیاحتی کتبہ میں جس کی تاریخ سنہ ۱۰۸۱ھ ہے، جیسا کہ آگے آئے گا، لکھا ہوا ملتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ تک زندہ تھا، دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان کے ایک واقفکار (سید مرتضیٰ علی صاحب ہیڈ کلرک دفتر کمانڈر انچیف دہلی) کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ یہ استاد حامد اور استاد احمد دونوں بھائی تھے، استاد حامد کے نام سے کوچۂ "استاد حامد" دہلی میں اب تک دریبہ اور جامع مسجد کے درمیان موجود ہے، اور ان کی اولاد دہلی میں سکونت پذیر ہے، اور "لاہوری والے" کہلاتے ہیں، اور آج کل وہ سادہ کاری کا کام کرتے ہیں، الغرض یہی وہ دو کاریگر ہیں، جنھوں نے قلعۂ معلیٰ اور اس کے حیرت انگیز عمارات دیوان عام و دیوان خاص، غسلخانہ اور دوسرے محلاتِ شاہی بنائے، اس تعمیر میں ایک تیسرا نام احمد کے بیٹے لطف اللہ کا شامل ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا،

استاد احمد کی تاریخ وفات | اس دیوان کے آخر میں استاد احمد معمار کی وفات کی دو تاریخیں بھی درج ہیں

(۱)

در زمانِ سعید شاہجہاں | شاہ عالم پناہ جم مقدار
نادر العصر رفت و گفت خرد | شد بفردوس احمد معمار

"دال کے بغیر استاد"

(۲)

آن نادرِ عصر زینتِ دہر — چون رفت بسوے ملکِ سرمد
تاریخِ وفاتِ او خرد گفت — محمود العاقبت شد احمد

ان دونوں قطعوں کے ہر چوتھے مصرع سے ۱۰۵۹ھ کے اعداد نکلتے ہیں، روضہ کی تعمیر ۱۰۵۰ھ میں یعنی احمد کی وفات سے نو برس پیشتر ختم ہو چکی تھی، اور دہلی کا قلعہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہو کر احمد کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۰۵۸ھ میں تکمیل پایا تھا، ممکن ہے کہ استاد احمد روضہ کو ختم کر کے قلعہ کی تعمیر میں شامل ہوا ہو، یا روضہ کا اصلی تعمیری کام ختم کر کے شروع ہی سے قلعہ کی تعمیر میں مصروف ہوا ہو۔

استاد احمد نے ان تعمیری یادگاروں کے علاوہ اپنی تین جسمانی یادگاریں بھی چھوڑیں، اور ان کو بھی تعمیر و ہندسہ و ریاضیات کی بہترین تعلیم دی، اور غالباً اُس کے پیشِ نظر یہ چیز تھی کہ ریاضیات کی اعلیٰ درجہ کی جو کتابیں اب تک صرف عربی زبان میں ہیں، اُن کو فارسی میں منتقل کیا جائے، تاکہ وہ علوم فارسی دانوں کی دسترس میں آسکیں، چنانچہ ۱۰۵۰ھ میں یعنی جس سال روضہ تمام ہوا ہے، اور قلعہ دہلی کی تعمیر جاری تھی، اُس نے اپنے منجھلے بیٹے لطف اللہ کو عبدالرحمٰن صوفی کی صور الکواکب کے ترجمہ کا حکم دیا۔

احمد معمار کی تین اولادیں لطف اللہ کی جس مثنوی کے کچھ ابتدائی اشعار اوپر نقل کئے گئے ہیں، اس میں احمد معمار کی وفات کے ذکر کے بعد اس کے ان تین باکمال فرزندوں کے نام لئے گئے ہیں،

بس سہ پسر ماند ز مردِ سترگ — زاں سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ

دیوان کے اس نسخہ میں رشیدی کی جگہ کاتب نے "رشد" لکھا ہے، مگر اُس کی تصنیفات میں اُس کے نام کے ساتھ "رشیدی" لکھا ملتا ہے، اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ اسی لفظ کو اسی طرح پڑھنے

سے شعر صحیح ہو سکتا ہے، پھر عطار اللہ کی تعریف میں کہتا ہے:-

نادر عصر خود و مشہور شہر   عالم و علامۂ و دانائے دہر

مرد ہنر پرور و استاد فن   فاضل و دانشور و حبر زمن

مخزن علم آمدہ تالیف او   گنج ہنرہاست تصانیف او

نزد ہی از آب روان پاک تر   نظم خوشش غیرت سلک گہر

اس آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عطار اللہ شاعر بھی تھا، اور غالباً اس کے نام کے بعد "رشیدی" اس کا تخلص ہے، اس کے بعد شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ اس نے تمام تر اپنے اسی بڑے بھائی سے تعلیم پائی ہے،

منکہ سخن پرور و دانش ورم   بندۂ آن حبر سخن پرورم

منکہ ربودم زجہاں گوئے علم   از چمنش یافتہ ام بوئے علم

منکہ شدم آگہ سر نہاں   از دم او یافتہ ام قوت جاں

اس کے بعد لطف اللہ اپنے کو احمد معمار کا منجھلا بیٹا بتاتا ہے اور اپنی تعریف آپ کرتا ہے:

ثانی آں برسہ برادر منم   ہندسہ یک فن بود از صد فنم

گر ہندس بقلم از شہ است   نام من دل شدہ لطف اللہ است

لطف اللہ اپنا نام اور ہندس شاہی خطاب بتاتا ہے، اور یہی اس کا تخلص بھی ہے، اس کے بعد اپنے سب سے چھوٹے بھائی نور اللہ کا نام لیتا ہے،

ثالث آں برسہ بہادر بال   آمدہ نور اللہ صاحب کمال

پھر کہتا ہے کہ ہم تینوں بھائی معمار اور انجینیر ہیں،

ما ہمہ معمار و عمارت گریم   ما ہمہ استاد و سخن پروریم

اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی نوراللہ کی نظم و نثر کی تعریف کرتا ہے، اور تعمیری مہارت فن کی بنا پر معمار کا موروثی لقب اسی کے لئے مخصوص کرتا ہے،

لیک بود قصر کلامش عجب — زان شدہ معمار مرا ورا لقب
گرچہ کم است سال وی از سال من — بیش بود حال وی از حال من
نثر وے از نظم گہر بار تر — نظم ز نثر آمدہ ہموار تر
دیدہ ز نور سخنش پر ضیا — طبع ز لطف سخنش پر صفا
گنج ہنر آمدہ در مشت او — ہفت قلم راندہ سہ انگشت او
گرچہ منم بے سخن استاد فن — آن یک و این یک بود استاد من

اسی آخری شعر کا شاید یہ مطلب ہو کہ میں اپنے سب سے چھوٹے بھائی کا استاد ہوں، اور بڑا بھائی میرا استاد ہے، اس مثنوی کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے،

گرچہ مرا ہست مہندس لقب — ہندسہ زان ہر سہ برادر طلب

اس سے ثابت ہوا کہ ہندسہ اور عمارت گری کے فن میں یہ تینوں بھائی مہارت رکھتے تھے،

الغرض احمد معمار کے ان تین باکمال بیٹوں کے نام بہ ترتیب یہ ہیں، :

۱- عطاء اللہ رشیدی نادر العصر

۲- لطف اللہ مہندس

۳- نوراللہ معمار

ابھی حال میں (جولائی ۱۹۲۵ء میں) لطف اللہ کی ایک اور تصنیف سحر حلال کا پتہ چلا، یہ مختصر رسالہ مدرسہ محمدی مدراس کے کتب خانہ میں ہے جس کا نمبر ۲۶۸۲ ہے، اس کا

دوسرا نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے،

اس رسالہ میں بھی لطف اللہ نے اپنے باپ اور اس کے تینوں بیٹوں کا حسب ذیل عبارت میں جو بصورتِ معمہ ہے، تذکرہ کیا ہے:-

"احمد معمار والد مملوک داوار سہ ولد دارد، اوّل عطا، اللہ سلمہ اللہ سالک مسالک علم..... عالم و عامل و علامۂ عصر..... رسالہا در علم اعداد مسطور کردہ...... وولد دوم اوسط ہر سہ مملوک درگاہ کردگار و اسم مملوک حامل دو کلمہ آمد کلمۂ دوم اللہ.... وکلمۂ اوّل لام وطا و معادل عدد عطا و ولد سوم در مسالک علم و عامل.......... واسم او ہم دو کلمہ دارد، کلمۂ دوم اللہ................ وکلمۂ اوّل معادل مطادر......"

احمد معمار کے بڑے بیٹے کا نام عطا اللہ تو صاف ہے، منجھلے بیٹے کے جو مصنّفِ کتاب ہے، نام کا دوسرا جزء اللہ اور پہلا جز لام اور طا، اور ایک ایسا حرف ہے جس کا عدد لفظ عطا کے برابر ہے یعنی ۸۰ جو حرف، ف کا عدد ہے، یہ سب مل کر "لطف اللہ" ہوتا ہے،

چھوٹے لڑکے کے نام کا بھی دوسرا جزء اللہ اور پہلا جز مطار کا مساوی العدد اور "و" ہے مطار کا عدد ۵۰ ہے، جو حرف ن کا معادل ہے، حرف ن کو واؤ اور ر سے ملانے سے پورا نام "نور اللہ" نکلتا ہے،

ان تینوں باکمالوں کے نام مختلف عمارتوں کے کتبوں کے گوشوں میں لکھے ہوئے ملتے ہیں، لیکن اگر دیوان مہندس کا یہ نسخہ ہاتھ نہ آتا، تو اس خاندان کے ان مختلف افراد کے یہ باہمی تعلق کا واقعہ دنیا سے پوشیدہ رہتا،

نور اللہ معمار | یہ استاد احمد کا سب سے چھوٹا لڑکا اور لطف اللہ مہندس کا سب سے چھوٹا بھائی ہے، اس کی

کی کوئی تصنیف اب تک نہیں ملی ہے، مگر ہندسؔ کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی معماری کے فن میں امتیاز رکھتا تھا، کہتا ہے،

لیک بود قصرِ کلامش عجب　　زاں شدہ معمار مراد را لقب

سب بھائیوں میں سے معمار کا موروثی لقب اسی کو حاصل تھا، اس کے علاوہ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا خطاط تھا اسی لئے ہندسؔ نے اس کی نسبت کہا ہے،

گنج ہنر آمدہ در مشتِ او　　ہفت قلم راندہ سر انگشتِ او

یعنی وہ خط کے ساتوں قلموں میں ماہر تھا، ہندسؔ کے بیان کی شہادت آج بھی دنیا میں موجود ہے، دلی کی شاہجہانی جامع مسجد میں بیرونی محرابوں کے اوپر کی دیوار میں مسجد کے بنائے جانے کی جو تاریخ طویل فارسی نثر عبارت میں بخط نسخ تحریر ہے، وہ اسی باکمال کی انگلیوں کا معجزہ ہے، چنانچہ کتبہ کے آخر میں بسمت شمال ایک گوشہ میں کتبہ نور اللہ احمد لکھا ہوا ہے، عطاء اللہ رشیدی | عطاء اللہ رشیدی احمد معمار کا سب سے بڑا لڑکا، اور لطف اللہ ہندس یعنی احمد کے منجھلے بیٹے کا استاد ہے، ہندسؔ کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بہت سی کتابوں کا مصنف بھی تھا، کہتا ہے :-

مخزنِ علم آمدہ تالیفِ او　　گنج ہنرہاست تصانیفِ او

سحرِ حلال میں بھی اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ ہیں،

"سالک مسالک علم و عامل و علامۂ عصر رسالہا در علم اعداد مسطور کردہ"

اس کی ان متعدد تصنیفات میں سے ہم کو تین کا علم ہے، اور یہ تینوں علم اعداد یعنی حساب ہی میں ہیں، ان میں سے ایک کا نام بیج گنت اور دوسرے کا نام خلاصۂ راز ہے، بیج گنت سنسکرت کا لفظ "دیجا گنیتا" ہے، جس کے معنی علم جبر و مقابلہ کے ہیں، یہ سنسکرت میں

بھاسکر چاریا کی تصنیف ہے، عطاء اللہ نے فارسی میں اُس کا ترجمہ کیا، اُس کے نسخے برٹش میوزیم، میونک یونیورسٹی اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی لائبریریوں اور کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد میں ہیں، اس میں مصنف اپنا نام عطاء اللہ رشیدی بن احمد نادر" بتاتا ہے، رسالہ کا آغاز اس شعر سے ہے،

اول ز ستائش الٰہی گوئیم　　پس نعت رسول او کما ہی گوئیم

یہ شعر میرے خیال میں فیضی کے جواب میں ہے، فیضی نے سنسکرت کی حساب کی مشہور کتاب لیلاوتی کا جو ترجمہ اکبر کے زمانہ میں کیا ہے، اس کے آغاز میں یہ شعر لکھا ہے، جو سراسر خوشامد ہے،

اول ز ثنائے بادشاہی گوئیم　　وانگہ ز ستایشِ الٰہی گوئیم

رشیدی گویا اس کے جواب میں کہتا ہے،

اول ز ستایشِ الٰہی گوئیم　　پس نعتِ رسول او کما ہی گوئیم

ندوۃ العلماء لکھنؤ اور کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد کے نسخے میری نظر سے گذرے ہیں، دیباچہ میں ہے،

"اما بعد! می گوید بندۂ محتاج بخداوند قادر عطاء اللہ رشیدی ابن احمد نادر کہ بتوفیق الٰہی در سنہ اربع واربعین والف ہجری (۱۰۴۴ھ) مطابق ہشتم سال جلوس حضرت صاحبقرانی بر اورنگ سلطنت وجہانبانی کتاب جبر و مقابلہ ہندی موسوم بہ بیج گنت تصنیف بھاسکراچاریج صاحب لیلاوتی را کہ در علم حساب کتابی است بحقائق رائقہ و مفاتح است بدقائق فائقہ و محتویست بر فوائد بلند و مطالب ارجمند کہ در لیلاوتی مذکور نیست، و در ہیچ نسخہ فارسی و عربی مسطور نہ، از زبان ہندی بفارسی آوردم و دیباچۂ کتاب را بکتابۂ دعاے دولت حضرت خاقانی، وارثِ ملکِ سلیمانی

مرتقی مدارج عز و جلال .... ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحب قرانی ثانی شاہجہاں
نامی بادشاہ غازی ...."

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب جو لیلاوتی کے مصنف بھاسکراچاریہ کی دوسری کتاب کا ترجمہ ہے، شاہجہاں کے آٹھویں سال جلوس ۱۰۴۴ھ میں مکمل ہوئی ہے۔ اسعیدیہ کا نسخہ محمد شاہ کے زمانہ میں ۱۱۴۵ھ میں منقول ہوا ہے، ندوہ کے نسخہ کا نمبر کتب خانہ میں نمبر ۶۵ ریاضی ہے، برٹش میوزیم اور میونک یونیورسٹی کی لائبریریوں کی فہرستوں میں اس نسخہ کا مختصر حال درج ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں بدر الحساب کے نام سے بیج گنت کا ایک اور ترجمہ موجود ہے، جو ۱۱۰۵ھ میں برہان پور میں کیا گیا ہے،

عطاء اللہ رشیدی کی دوسری کتاب خلاصۂ راز کا نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں ہے، اس میں اُس نے اپنا نام یہ لکھا ہے "عطاء اللہ بن اُستاد احمد معمار" اس کا آغاز اس شعر سے ہے،

شکر بے حد بواحد ازلی ... حمد بے حد بفرد لم یزلی

رسالہ کا موضوع حساب، مساحت اور جبر و مقابلہ ہے، زبان فارسی نثر ہے اور رسالہ کی تقسیم دس بابوں پر ہے، رسالہ کے دیباچہ میں شاہجہاں بادشاہ اور شاہزادہ دارا شکوہ کی ستائش ہے، اور رسالہ شاہزادہ کے نام سے معنون ہے، دارا شکوہ ۱۰۶۹ھ میں قتل ہوا ہے، اس سے سمجھنا چاہئے کہ یہ رسالہ اس سے پہلے تالیف پا چکا تھا،

اس کی تیسری کتاب خزینۃ الاعداد ہے، جو علم حساب، الجبرا اور عملی اقلیدس میں ہے، مقدمہ میں اُس نے بیان کیا ہے کہ اُس نے یہ کتاب مبتدیوں اور سرکاری مالی دفتروں کے ملازموں، تاجروں، اور مذہبی عالموں کے لئے لکھی ہے، اس رسالہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے،

"الحمد للہ الذی جعل الشمس ضیاءً والقمر نوراً قدر منازل ...."
"مؤلف این رسالہ و مترجم این مقالہ المفتقر الی رحمۃ اللہ الفقیر الحقیر عطاء اللہ"

رسالہ میں ایک مقدمہ، دو مفتاح، دس باب، ایک کشکول، اور ایک خاتمہ ہے، کتاب کا نام (خزینہ) تاریخی ہے، جس سے ۱۰۶۶ھ نکلتا ہے، جیسا کہ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے،

زتاریخ اتمامش آگہ شوی | چون نام دے آری توان در حساب

یہ نادر نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے جس کا نمبر ۱۰۰ اے ہے[1]

عطاء اللہ رشیدی جیسا کہ اس کے بھائی لطف اللہ نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے، شاعر بھی تھا، اور رشیدی تخلص کرتا تھا، مگر اس کا کوئی شعر ہم تک نہیں پہنچا ہے، بجز اس کے کہ لطف اللہ کے ہاتھ کی ایک کتاب صور صوفی کا جو اصل نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں ہے، اس کے آخر میں ایک صفحہ پر عطاء اللہ کے قلم کی ایک مشق ہے، جس میں آفتاب اور سہا کے تناسب سے کچھ فقرے لکھے ہیں، اور آخر میں یہ شعر درج ہے،

عطاء اللہ کہ گر نامش نبی ہیچ | ز غیرت ہیچ افتد در خم و پیچ

عطاء اللہ کے یہ تو علمی کارنامے ہیں، لیکن اس کا ایک عملی کارنامہ بھی دنیا میں موجود ہے، اور وہ شہنشاہ عالمگیر اورنگزیب کی محبوب بیوی ملکہ رابعہ دورانی کا مقبرہ ہے، جو اورنگ آباد دکن میں واقع ہے، یہ مقبرہ تمامتر روضۂ تاج محل کی نقل ہے، خیال ہوتا ہے کہ چونکہ اس کے باپ احمد معمار نے تاج کا روضہ بنایا تھا، اس لئے قرین قیاس سمجھا گیا کہ اس کا خلف الرشید اس نقش اول کا

---

[1] فہرست کتب عربی و فارسی و اردو کتب خانہ جامعہ بمبئی مرتبہ شیخ عبدالقادر، فاضل مرتب نے عطاء اللہ ابن احمد کو اس رسالہ کا مصنف ظاہر کرنے کے باوجود اس کا سال تصنیف "خزینۃ الاعداد" کے دونوں جزوں کے اعداد کو گن کر ۱۱۶۴ھ ظاہر کیا ہے، جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں، کیونکہ یہ تاریخ مصنف کی زندگی کے بہت بعد ہے، لیکن اگر نام کے دونوں جزوں کے اعداد لئے جائیں، اور ۱۱۶۴ھ صحیح ہو تو پھر یہ کسی دوسرے عطاء اللہ کا رسالہ سمجھا جائے گا،

بہترین نقش ثانی تیار کر سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ آگرہ میں جو سامان تعمیر شاہجہاں کے عہد میں مہیا ہو سکتا تھا، وہ اورنگ آباد دکن میں عالمگیر کے عہد میں میسر نہیں آ سکتا تھا، پتھر اور اینٹ کے فرق کے علاوہ جو نزاکت، لطافت اور تناسب روضہ کی خصوصیات ہیں، اُن کی نقل اتاری نہ جا سکی،

رابعہ دورانی کے مقبرہ کے صدر دروازہ پر پیتل کا پتھر چڑھا ہوا ہے اس پر ایک طرف یہ عبارت لکھی ہے:۔

"ایں روضہ منورہ در معماری عطاء اللہ بعمل ہیبت رائے طیار شدہ ۱۰۶۱ھ"

لطف اللہ مہندس | احمد معمار کے دوسرے بیٹے لطف اللہ مہندس کی اس وقت متعدد یادگاریں دنیا میں باقی ہیں، اور کہنا چاہئے کہ یہی وہ سپوت ہے جس کے ذریعہ اس کے باپ کا نام دنیا کو معلوم ہو سکا۔ سندیلوی نے اپنے تذکرہ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۸ھ کی تصنیف ہے، مہندس کے بیٹے امام الدین ریاضی کے تحت میں مہندس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے،

"مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است ایشاں ہم بگفتن اشعار میل تمام داشتند و مہندس تخلص می کردند و در علم ریاضی مثل ایں ہر دو پدر و پسر در بلاد ہند نبودند"

(نسخہ قلمی دار المصنفین ۱۵۳)

اور سفینۂ خوشگو میں ہے:۔

"خلف ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوریست کہ قلعۂ ارک دار الخلافہ شاہجہان آباد بتجویز و صواب دید او بنا یافتہ"

یہی فقرہ حسین قلی خاں کے نشتر عشق میں ہے، اس کی سات تصنیفات کے نام ہم کو معلوم ہو سکے ہیں، جن کے نسخے اس وقت ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، لیکن ان تصانیف کے علاوہ اس کی عجیب و غریب یادگار اس کا ایک آہنی کتبہ ہے، جو سلاطین مالوہ کے

پایہ تخت مانڈو میں وہاں کے مشہور بادشاہ ہوشنگ غوری (۸۰۸ھ تا ۸۳۸ھ) کے مقبرہ کے دروازے کے داہنے ہاتھ پر لگا ہوا ہے، یہ ۶۰ انچ لمبا اور ۲۰ انچ چوڑا کتبہ ہے، جس میں بخط خفی حسب ذیل عبارت چار سطروں میں منقوش ہے،

۱- بتاریخ نہم ربیع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری

۲- فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاذ احمد معمار شاہجہانی،

۳- (خواجہ جادورائے، و استاد شیورام رائے و استاد احمد)

۴- بجہت زیارت آمدہ بود،

اثریات ہند کے ماہر جناب ظفر حسن صاحب بی اے، (محکمۂ آثار قدیمۂ ہند) نے مانڈو کے کتبات پر انگریزی میں جو مقالہ لکھا ہے اس میں یہ کتبہ سترہویں پلیٹ پر چھاپ دیا ہے، اور وہ اس وقت میرے سامنے ہے،

غالباً ان معمار سیاحوں کے لئے اس کتبہ کے یہاں لگانے کا محرک یہ امر ہوا ہے کہ یہاں اکبر بادشاہ نے اپنے سفر و گذر کی تاریخیں ثبت کرائی ہیں، انہی کو دیکھ کر ان معماروں نے بھی اپنا یادگاری کتبہ لگا دیا ہے،

اس کتبہ سے متعدد باتوں پر روشنی پڑتی ہے،

۱- اس عہد کے استادانِ تعمیر دوسری عمارتوں کو بھی فن کی حیثیت سے دیکھنے کے لئے جایا کرتے تھے،

۲- ہندو مسلمان باکمالوں میں فن کی یک جہتی کا رشتہ خاصہ مستحکم اور مضبوط تھا،

۳- ہندو شاہی معماروں کے ناموں کے ساتھ خواجہ اور استاد کا ہونا کیسا عام تھا، خواجہ جادورائے اور استاد شیورام کبھی کیسی عزت کے الفاظ تھے،

۴۔ لطف اللہ مہندس گو شاعر و مصنف تھا، تاہم اس میں اس کے موروثی فن تعمیر کا ذوق اتنا تھا کہ وہ دوسرے معماروں کے ساتھ کسی عمارت کے دیکھنے کے لئے سفر کی زحمت گوارا کرسکتا تھا،

لطف اللہ کی جن سات کتابوں کے نام ہم کو ملے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ صور صوفی

۲۔ رسالہ خواص اعداد

۳۔ شرح خلاصۃ الحساب

۴۔ منتخب الحساب

۵۔ تذکرۂ آسمان سخن

۶۔ دیوان مہندس،

۷۔ سحر حلال،

پہلی کتاب ہیئت میں اور بعد کے تین رسالے علم حساب میں ہیں، اور دوسری کو چھوڑ کر کہ وہ عربی میں ہے، بقیہ چھ کی زبان فارسی ہے جن میں سے تین اول الذکر اور آخری نثر میں ہیں اور چوتھی اور پانچویں دو کتابیں نظم میں، اب ذیل میں ہم ہر ایک تصنیف پر مختصر تبصرہ کرتے ہیں،۔

۱۔ صور صوفی مشہور مسلمان ہیئت داں عبدالرحمٰن الصوفی المتوفی ۳۷۶ھ نے ستاروں کے اشکال و صور پر جو بلند پایہ تصنیف صورالکواکب کے نام سے لکھی تھی، لطف اللہ نے ۱۰۵۰ھ میں اپنے باپ احمد معمار کے حکم سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کی عمر کا پہلا کام ہے، کتاب کا دیباچہ کسی بادشاہ کے نام کے بجائے خود اس کے باپ کے نام نامی سے مزین ہے، اور اس میں یہ نوجوان مصنف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی محنت کا بہترین صلہ یہ ہے کہ اس کا باپ اس کے اس کام کو دیکھ کر خوش ہوا، اس کتاب کا اصل مسودہ جو خود لطف اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مسلم یونیورسٹی

لائبریری نمبر ۳۱ فارسی علوم) میں موجود ہے، دیباچہ کی عبارت یہ ہے:-

"رخشندہ ترین کواکبے کہ از مشرق طبع بز فلک ظہور آمد حمد مبدعے و شکر مخترعے .....

اما بعد اچنیں گوید محتاج الی اللہ الغادر الغفار لطف اللہ بن احمد الناد رالمعمار مد اللہ ظلہ علی رؤس الاولاد بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد کہ چوں اشارۂ آنحضرت بسوے ایں فقیر حقیر شد کہ کتاب عمدۃ الاسلام قدوۃ الانام مولانا عبدالرحمٰن بن صوفی افاض اللہ علیہ شآبیب الغفران و اسکنہ فرادیس الجنان کہ در معرفت نجوم ثابتہ کتابیست متعدد رسالہ ایست کافیہ بجہت عموم فائدۂ کلام و سہولت فہم مرام بعبارت فارسی سادہ ترجمہ کردہ آید تا بر ترغیب خاطر فارسی خوانان حقیقت طلب باعث تر شود کمر اطاعت بر میان جان بستہ دست را بنوشتن نگاریں کرد، امید کہ بایں ہجیۂ مرضیہ من در عقبی ماجور، و ترجمۂ من در دنیا مقبول باشد و طالبان ایں فن ازیں ترجمہ مستفید شوند، چنانچہ از اصل ایں داگر خطاے باشد، اصلاح فرمایند، الحمد للہ والمنہ کہ در فرصتے اندک ہمگی بوجہ احسن و شایستہ میسر شد و سنہ یکہزار و پنجاہ ہجری اتمام پذیرفت، امارحسن و شایستہ تر دقتے کہ از نظر مبارک والد بزرگوار من بگذرد بعین عنایت و چشم کرمت نگاہ کنند و قبول فرمایند"

خاتمہ کی عبارت :-

...... ہزار در ہزار حمد ایزد را دار کہ ترجمۂ کتاب صور صوفی حسب الحکم قبلۂ صورت و معنی کعبۂ ظاہر و باطن، خداوند حقیقت و مجاز ابو یم المسمی باحمد المخاطب بنا در العصر سلمہ اللہ تعالی من بلیات الزمان و آفات الدہر بآخر رسید و اتمام پذیرفت"

بقلم شکستہ رقم لطف اللہ کہ مؤلف ایں رسالہ و مترجم ایں مقالہ است کتاب باتمام رسید الحمد للہ علی نعمائہ والصلوٰۃ علی انبیائہ لاسیما علی محمد وآلہ واصحابہ اجمعین، واغفرلی و

"والدی بحرمتہم یا ارحم الراحمین"

کتاب کے آخری صفحہ پر آفتاب اور سہا کی مناسبت سے کچھ فقرے مشق کئے گئے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی یادگار کے طور پر اس گھر کے ارکان نے محفوظ رکھا تھا، یہ مشق میرے خیال میں اُس کے بھائی عطاء اللہ کے قلم سے ہے، کہ آخر میں ایک شعر میں جو اوپر عطاء اللہ کے حال میں نقل کیا جا چکا ہے، اس کا نام لکھا ہے،

۲- رسالہ خواص اعداد، یہ فارسی میں علم حساب پر سات صفحوں کا رسالہ ہے، اور چار مقالوں پر منقسم ہے، اس میں اعداد کے خواص اور قیمتوں پر بحث کی گئی ہے، اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں ایک مجموعہ کے اندر ہے، جس میں دو رسالے لطف اللہ کے ہیں، اور تیسرا عطاء اللہ کی وہی خلاصۂ راز ہے، جس کا ذکر اوپر آ چکا (نمبر ۱۶۳۴۳) اس کا آغاز یہ ہے:

"الحمد للہ...... می گوید فقیر لطف اللہ متخلص بہ مہندس"

اس کا دوسرا نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن میں نظر سے گذرا ہے، نسخہ جدید الخط ہے، ۱۲۷۷ھ میں نقل ہوا ہے، آغاز یہ ہے:

"الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین،
اما بعد! می گوید فقیر لطف اللہ متخلص بہ مہندس ابن استاد احمد لاہوری کہ ایں رسالہ ایست مختصر در علم ارثماطیقی (ارثماطیقی) یعنی خواص اعداد، بدان اسعدک اللہ فی الدارین،

اس رسالہ کا کوئی خاص نام نہیں معلوم ہوتا، کتب خانہ سعیدیہ میں اس کا نام رسالہ ارثماطیقی مندرج ہے، اور اسی نام سے یہ رسالہ خاندان دیوان مدراس کے کتب خانہ میں بخط مولوی محمد غوث شرف الملک موجود ہے،

۳۔ شرح خلاصۃ الحساب، علم حساب میں بہاء الدین محمد بن حسین آملی المتوفی سنہ ۱۰۳۰ھ کی مشہور عربی تصنیف خلاصۃ الحساب کی ممزوج شرح ہے، اس کی شرحیں متعدد علماء نے لکھی ہیں، جن میں خود اس کے معاصر عصمۃ اللہ سہارنپوری کی عربی شرح جو سنہ ۱۰۷۰ھ میں لکھی گئی ہے، بہت مفصل ہے، اور چھپ بھی چکی ہے، اور جس کا نام انوار خلاصۃ الحساب ہے، دوسری یہ لطف اللہ مہندس کی ہے، اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے، (نمبر ۱۰۶، مخطوطات عربی) اس میں مصنف کا نام لطف اللہ المتخلص بالمہندس بن الاستاذ احمد المعمار لکھا ہے، اور اس کا آغاز ان لفظوں سے ہے الحمد للہ الواحد الفرد الصمد، یہ نسخہ ایک خاص حیثیت سے ممتاز ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا، اس کتاب کا دوسرا نسخہ ہندوستان میں رام پور کے کتب خانہ میں ہے (نمبر ۴۵ ریاضی) اس نسخہ کے صفحات کی تعداد ایک سو بیس[۱۲] ہے،

۴۔ منتخب:۔ یہ بہاء الدین آملی کی مذکورۂ بالا تصنیف خلاصۃ الحساب کا فارسی ترجمہ اور خلاصہ ہے، انگلستان اور ہندوستان میں اس کے متعدد نسخے ہیں، دو نسخے انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہیں، تیسرا برٹش میوزیم لائبریری میں، چوتھا کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں[۱]، پانچواں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں، چھٹا جامعہ ملیہ دہلی میں اور ساتواں کتب خانہ دیوان مدراس میں بخط سید محمد قاسم مکتوبہ سنہ ۱۲۱۰ھ ہے، اس رسالہ کا منتخب نام تاریخی ہے، اس سے سنہ ۱۰۹۲ھ کی تاریخ نکلتی ہے، مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب خاندانِ وزارت کے رکن رکین میر محمد سعید بن میر محمد یحیٰی آتی فرمایش سے لکھی گئی ہے،

اس کا آغاز اور دیباچہ حسب ذیل ہے،

---

[۱] برٹش میوزیم کے نسخہ کا نمبر ۱۶۷۴۴ اور انڈیا آفس کے نسخہ کا نمبر ۲۲۵۳ اور نمبر ۲۲۵۴ اور آصفیہ باب ریاضیات فارسی کا نمبر ۱۱۱ ہے،

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین،

اما بعد! می گوید فقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار لاہوری غفر اللہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ کہ کتاب حساب را کہ تصنیف است از محقق و تحریر مدقق شیخ بہاء محمد بن حسین عاملی (آملی) رحمۃ اللہ علیہ مشتمل بر قواعد شریفہ و فوائد لطیفہ باشارات خلاصۂ دودمان سیادت، منتخب خاندان وزارت میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ ادام اللہ اقبالہ و ضاعف اجلالہ ترجمہ کردم کہ چوں آن نسخہ خلاصہ نام داشت، ایں نسخہ را منتخب نہادم، ...... تاریخ تالیف ایں رسالہ است و این رسالہ بنا بر ترتیب کتاب مرتب است بر مقدمہ و ابواب"

آخر میں ایک حسابی مسئلہ کا حل نظم میں ہے، جس کا خاتمہ ان دو شعروں پر ہے:-

منکہ ہستم فقیر لطف اللہ   بہندس شہیر در افواہ
خاکپائے ہنر وران کبار   پور استاد احمد معمار

انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ نمبری ۲۲۵۴/۵ ۳ر شعبان ۱۱۴۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اور حیدرآبادی نسخہ کی تاریخ ۱۲۴۳ھ ہے، اور کتب خانہ میں اس کا نمبر ۲۱۱ ریاضیات فارسی ہے، مسلم یونیورسٹی کا نسخہ سبحان اللہ خاں لائبریری میں ہے، اس کا نمبر ۵۱۱/۳ ہے، اور وہاں اس کا ترجمۂ خلاصۃ الحساب ہے، اور کتابت کا سال ۱۰۳۹ھ ہے، جامعہ ملیہ کے نسخہ کا نمبر ۹، سلسلۂ مخطوطات ہے، اور تاریخ سے خالی ہے،

۵- آسمانِ سخن:- دولت شاہ سمرقندی کا فارسی شعرا کا تذکرہ جو ۸۹۲ھ میں تالیف پایا ہے، با ایں ہمہ اغلاط دلچسپ ضرور ہے، اور اسی نے اہل سخن کی محفلوں میں اس کا تذکرہ رہا کیا ہے یہ کتاب فارسی نثر میں ہے، اور سات طبقوں پر منقسم ہے، اکبر کے زمانہ میں قاضی کرانی

نام ایک شاعر نے اس کو نظم کر ڈالا، اور سات طبقوں کے بجائے اس کو دس طبقوں میں مکمل کیا، لطف اللہ مہندس نے فائضی کے نسخہ میں دو اور طبقوں کا اضافہ کرکے اس کو ۱۲ طبقوں میں پورا کر دیا، اور بارہ برجوں کی مناسبت سے اس کا نام "آسمان سخن" رکھا،

یہ تمام واقعات لطف اللہ مہندس نے کتاب کے دیباچہ میں ذکر کئے ہیں، اس کا نسخہ شاہ اودھ کے کتب خانہ میں تھا، ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتب خانہ کی فہرست میں ص ۱۰۶ پر اس کتاب کا ذکر کیا ہے، اب کسی اور کتب خانہ میں اس کا نشان نہیں ملتا، معلوم نہیں گردش چرخ نے اس آسمانِ سخن کو کس خاک میں ملا دیا، لطف اللہ مہندس کے اس اضافہ میں کل ۲۵۰ بیتیں تھیں، ایک ایک بیت میں ایک ایک شاعر کا بیان تھا، اس کا پہلا شعر یہ تھا،

نخست شکر خدائے کہ آسمانِ سخن | بیا فرید محیط نہ آسمانِ کہن

فہرست مذکور میں ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کے بارھویں طبقہ کے ۱۳ شعر نقل کئے ہیں، ان شعروں میں شاہجہانی شعرا کے نام نظم کئے گئے ہیں، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے دورِ اکبری کے بعد جو دو طبقے بڑھائے تھے، ان میں سے پہلے میں جہانگیری عہد کا اور دوسرے میں شاہجہاں کے زمانہ کے سخنوروں کے نام ہوں گے، وہ ۱۳ شعر یہ ہیں،

وحید دہر امانی ابن مہابت خاں | ولے بخان زمان است شہرۂ دوراں
دگر یگانہ ظفر خاں تخلص احسن | ربودہ گوئے سخن از سخنوراں در فن
دگر وحید زمن آشنا عنایت خاں | بود بحر سخن آشنا عنایت خاں
دگر وحید زمن شادمانِ غم پرور | بیان شادی و غم در کلام او مضمر
دگر سخنور کشمیر محسن فانی است | بقائے نام وے از دولت سخندانی
مہ سپہر سیادت یگانہ میر عماد | کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد

لبیب عصر محمد حسین آشوب است | سخنورے کہ سخنہائش جملہ مرغوب است
دگر وحید زمان است طالبائے کلیم | کہ شعر او ید بیضا است نزد طبع سلیم
دگر فرید جہاں قدسی محمد خان | بعہد شاہ جہاں گو ربودہ از اقران
الٰہی ہمدانی است در سخن استاد | سخنورے است کہ داد سخنوری می داد
لبیب از منہ اتی نخواند ہیچ کتاب | ز فیض حق شدہ مفتوح بر رخش صد باب
دگر وحید زمن باقیا ترانۂ او | خوش است ہمچو غزلہای عاشقانۂ او
فصیح از منہ فنا کہ چوں غزل می گفت | چو عندلیب غزلخواں در و گہری سفت

نویں شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے یہ داد سخن عہد شاہجہانی (۱۰۶۸ھ) کے بعد دی ہے،

۲- دیوان ہندس یہ پورا دیوان چھوٹی تقطیع کے چھیانوے (۹۶) صفحوں میں ہے، سب سے پہلے دیوان کے شروع میں دس صفحوں میں چار قصیدے ہیں، پہلا نعت میں ہے، دوسرا داراشکوہ کی مدح میں، اور تیسرا شاید داراشکوہ کے بیٹے سلیمان کی مدح میں ہے، اور چوتھا کسی معشوق کا سراپا ہے، اس کے بعد نئی بسم اللہ سے غزلیں شروع ہوتی ہیں، جو حروف تہجی پر مرتب ہیں، یہ گیارہویں صفحہ سے شروع ہو کر ص، ۸۰ پر تمام ہوتی ہیں پھر نئی بسم اللہ کے بعد سے مثنوی شروع ہوتی ہے، جس میں اس نے اپنے خاندان کا احوال لکھا ہے پھر ایک دو مختصر مثنویاں اور چند قطعے ہیں، جن میں سے دو چار قطعے تاریخی ہیں، پہلے نعتیہ قصیدہ کی تشبیب بہت پُرزور ہے،

خسرو دہر چو بنشست برا در نگ عمل | رستم روز در اقلیم شب افگند خلل
رومی روز برافراختہ رایت بمصاف | زنگی شب سپر انداخت ہنگام جدل

کیمیا ساز بود است گر این عالم نو   مس شب را بزر روز چرا کرده بدل
روز افزوده و شب کاستہ زان روی کہ مہر   کرده آئینہ ایام ز سیماب صیقل
سنگ از تربیت مہر شود لعل و کنون   اخگر از تربیتش لعل شود در منقل
وقت آنست کہ در قافلہ از فیض ہوا   آب زمزم شود اکنون نم بادل
وقت آنست کہ واعظ چو نہد مجلس وعظ   صورت شیشہ شود نسخۂ واعظ بہ بغل

اس قصیدہ کے آخر میں شاعر نے اپنا اور اپنے باپ کا نام اور اپنے مشاغلِ درس و تدریس کا ذکر کیا ہے،

دل دانا سے مرا فخر بعلم است و بفضل   جاہل است آنکہ نبازد بحلی و بحلل
باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم   جہل ازین علم تو بہتر کہ نیاید بعمل
عمر در درس بسر بردی و در آخر کار   ہیچ حاصل نشد از مدرسہ جز بحث و جدل

داراشکوہ کے مدحیہ قصیدہ میں اپنی مدح خود ان شعروں میں کرتا ہے،

مہندسم کہ کنم صورت فلک تصویر   کشم بروے زمین گر خطوط پرکاری
چناں بلند نہادم اساس قصر خرد   کہ بر سپہر زنم طعنۂ نگوں ساری
چناں منیر شود شیشۂ عمارت من   کہ نور مہر بود نزد نور او تاری
دمے کہ من بعمارت گری شوم مشغول   فلک مصالح کار آورد بسرباری
بدستیاری لطف شہ بلند اقبال   بلند پایہ زمن گشت قدر معماری
سپہر مرتبہ داراشکوہ دریا دل   کہ ہمچو ابر کفش می کند گہرباری
بعہد دولت تو راجہ ہای کوہستاں   ز فرق خویش نہادہ کلاہ جباری
بیک نگاہ کہ کردی بسوی کوہستاں   گرفتہ پست و بلندی کوہ ہمواری

ان اشعار میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کا پتہ موجودہ تاریخوں میں نہیں چلا،

لطف اللہ مہندس کے اکثر اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نام ونمود کا حریص اور معماری جیسے پیشہ سے اپنے کو بلند سمجھتا ہے، چنانچہ اس قصیدہ میں وہ کہتا ہے،

شہا اگرچہ عمارت گریست پیشۂ من | دگرچہ نیست ضمیرم ازیں ہنر عاری
کنوں کہ ملک دلم شد خراب عشق بتاں | تو خود بگو کہ چہ نسبت مرا بمعماری

غزلوں کا عام انداز وہی ہے جو اس عہد کے دوسرے ملا شاعروں کے کلام میں ہے، زبان میں کہیں کہیں ہندیت ہے، اس کے مقطعوں میں خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس میں مہندس کی مناسبت سے کوئی بات ضرور پیدا کرتا ہے، مثلاً

مہندس اگرچہ آگہ بود زیں پیش | فرامش کرد قانونِ شفا را
باشد ز فلک مہندس آگاہ | با آنکہ نشستہ بر زمین است
ای مہر بے مہر در چشم مہندس بے رخت | از حضیض خاک تا اوجِ ثریا آتش است
رو مہندس بعلم یک دو شکل | ایں ہمہ افتخار بے معنی است
اے مہندس رو کہ در علم نقطہ | احتیاج مسطر و پرکار نیست
بال حرف زمیں بگو مہندس | تا کے ز فلک کنی حکایت
از مہندس مپرس سرّ فلک | کیں معما ز ہیچ کس نکشود

ذیل کے مقطعوں میں اس مہندس کے لفظ سے کتنا لطیف استدلال کیا ہے :-

در حقِ من گمانِ خطائی بری خطاست | ہرگز شنیدۂ کہ مہندس خطا کند
تا کے شکلِ زمیں خواہی کشید | رو مہندس صورت افلاک کش

کہنہ شد آسمان ھندس خیز تا بناہاے نونہادہ شود

حسب ذیل غزل اُس کے بہترین کلام میں سے ہے،

یاراں ہلالِ عید برآمد نظر کنید ماہِ صیام رفت مغاں را خبر کنید

یاراں دگر بکوریِ مفتی و محتسب امروز خاک میکدہ کحلِ بصر کنید

آنکس کہ از برآمدنِ مہ خبر کند او را باحترام دہن پُر شکر کنید

اکنوں رسید کوکبۂ عیش و انبساط اے درد و غم ز مملکتِ دل سفر کنید

گر در من و نگار ھندس شود حجاب دستش گرفتہ زود ز محفل بدر کنید

ذیل میں اس کے دیوان کے وہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن سے اس کے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، اس کا نام :-

باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم جہل ازیں علم تو بہتر کہ نیاید بعمل

خواہم کہ کشم بادہ چو لطف اللہ احمد تا چند کشم محنت دور قمری را

ہیچو لطف اللہ احمد کو ستِ دانش میزدم چوں شدم عاشق بجہل خویش کردم اعتراف

ان شعروں میں خود لطف اللہ ھندس کا، اور اس کے باپ احمد کا نام ہے۔ لاہور اس کا وطن تھا،

کے بود آمدنِ قاصد فرخندہ پیام مدتے شد کہ ز لاہور نیامد خبرے.

ہندسہ و منطق و حکمت میں اس کو غلو تھا،

بر منِ ہیچ مداں کشف شد از فیض ازل راز سربستہ کہ بر ہندسہ داں مشکل بود

صرف در منطق و حکمت شدہ ایں عمر عزیز لیک آں نکتہ نخواندم کہ در و حاصل بود

معماری و ھندسی میں نامور تھا،

لطف اللہ معمار ھندس شد استاد گر کار در ایت نکند پس چہ کند کس

درس و تدریس کا بھی شغل تھا،

عمر در درس بسر بردی و در آخر کار ‌‌‌‌ ‌ ہیچ حاصل نہ شد از مدرسہ جز بحث و جدل

کسی شاہزادہ کے نام ایک مثنوی ہے، جس سے مراد غالباً داراشکوہ ہے کہ شہزادہ بلند اقبال" کے نام سے وہی مخاطب تھا، اس میں وہ کہتا ہے،

لطفِ شہ می کند دگاری ‌‌‌‌ ‌ ورنہ آگہ نیم ز معماری

خواندہ ام یک دو نسخہ از ہر باب ‌‌‌‌ ‌ ہیئت و ہندسہ و نجوم و حساب

نہ نویسم ز بیم بے ادبی ‌‌‌‌ ‌ کہ چہا خواندہ ام من از عربی

. . . .

لطف شہزادۂ بلند اقبال ‌‌‌‌ ‌ گر شود بندہ را معاون حال

خدمت بندہ را بفرماید ‌‌‌‌ ‌ کہ از و علم رفتہ باز آید

گر یکے از مقربانِ بساط ‌‌‌‌ ‌ در دمِ عیش و در زمان نشاط

ایں سخن از مقیم ایں درگاہ ‌‌‌‌ ‌ برساند بسمعِ حضرت شاہ

آنچہ باید کردگار کریم ‌‌‌‌ ‌ نہ کہ اجرِ قلیل اجرِ عظیم

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ داراشکوہ کے توسط سے شاہجہاں تک پہنچنا چاہتا ہے، کہیں کہیں غزلوں کے مقطع میں بھی ادھر اشارہ ہے،

ہاں مہندس بندۂ شاہ بلند اقبال باش ‌‌‌‌ ‌ آنکہ گر فرمان دہد جمشید فرماں بر شود

ایک مثنوی میں کسی ایسے خانوادۂ وزارت کے کسی رکن کی مدح کرتا ہے جس کو سیادت کی عزت بھی حاصل تھی،

اخترِ برجِ حشمت و جلال ‌‌‌‌ ‌ گوہرِ درجِ دولت و اقبال

نیرِ آسمانِ بینائی — آفتابِ سپہرِ دانائی
منبعِ جود و مخزنِ احسان — مظہرِ فیض و معدنِ ایقان
زبدۂ دودمانِ مصطفوی — نخبۂ خاندانِ مرتضوی
امرا را شرف امارتِ او — وزرا را شرف وزارتِ او
امرا از امارتش منصور — وزرا از وزارتش دستور
آبِ شرع است سیفِ مسلولش — دستِ عدلست رمحِ مصقولش

میرا خیال ہے کہ اس مدح کا موضوع وہی ہستی ہے جس کے نام پر شاعر نے اپنی کتاب منتخب الحساب لکھی ہے، یعنی "خلاصۂ دودمانِ سیادت منتخبِ خاندانِ وزارت میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ ادام اللہ اقبالہ وضاعف جلالہ"

لطف اللہ اور اس کے بھائیوں کی تصانیف سے یہ ہویدا ہے کہ ان لوگوں کو شاہجہاں کے بعد جس سے تعلق رہا ہے، وہ شاہزادۂ داراشکوہ ہے، چنانچہ لطف اللہ کے بھائی عطاء اللہ رشیدی نے اپنا رسالہ خلاصۂ راز شہزادۂ موصوف ہی کے نام سے معنون کیا ہے، لطف اللہ کے اس دیوان کے اکثر اشعار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اسی شہزادہ کے دربار میں رسوخ و اعتبار حاصل تھا، نعت کے بعد جو پہلا قصیدہ اس دیوان میں ہے، وہ اسی کی مدح میں ہے،

بدستیاریِ لطفِ شہِ بلند اقبال — بلند پایہ زمن گشت قدرِ معاری
سپہر مرتبہ داراشکوہ دریادل — کہ ہمچو ابر بکفش می کند گہرباری

اسی کی ایک غزل کا ایک مطلع ہے،

گر بادشہ بلطف نظر بر گدا کند — بر بادشہ نظر بعنایت خدا کند

اسی کی دوسری غزل کا مطلع ہے،

اے شاہ زمن بیا و بنگر — در دلِ من بیا و بنگر

ایک پوری غزل مدح میں ہے،

اے زجود تو کامرانیِ دہر — در وجودِ تو پاسبانیِ دہر

بخدا اے خدا یگانِ زماں — تو زیبا خدا یگانیِ دہر

دہر را مدح تو وظیفہ بود — گوش کن بر وظیفہ خوانیِ دہر

تو زیبا است خلعتِ شاہی — ز تو پیدا است کامرانیِ دہر

باشد از لطفِ تو ہندس شاد — اے ز لطفِ تو شادمانیِ دہر

ان موقعوں پر لفظ لطف کا لطف اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں،

ایک اور مدحیہ غزل سنیے جس کے مطلع میں دادا، بیٹا اور پوتا تینوں کے نام یکجا ہیں،

دارا شکوہ، شاہجہاں بانیِ جہاں — بروے مبارک است سلیمانیِ جہاں

شاہجہاں، دارا شکوہ بن شاہجہاں، اور سلیمان شکوہ بن دارا شکوہ بن شاہجہاں،

پروردگار باد نگہبانِ دولتت — زانرو کہ کار تست نگہبانیِ جہاں

تا ز آب و آتش است نشاں در زمانہ ات — روشن ز خاکِ پائے تو پیشانیِ جہاں

اے بانیِ جہاں کہ جہاں در ثنائے تست — یک لحظہ گوش دار ثنا خوانیِ جہاں

تا کے ہندس است پریشاں چو زلفِ یار —
اے از تو دور گشتہ پریشانیِ جہاں

ایک قطعہ ہے :۔

دولتِ جاوید و بختِ سرمد و ملکِ دوام — ہمعنان و ہمدم شاہ بلند اقبال باد

از کفِ دستش زر و گوہر برد دربارگاہ — تا ابد دریا و کان زین فیض مالامال باد

می کند احسان او در ماندگان ایا دری — یادہ آوراایزد ذوالمجد والافضال باد

دوسرا قطعہ :-

ثناخوانِ ترا شاہا چہ حاجت مدحِ جم گفتن — بجام بادہ حاجت نیست مت جامِ سر مدرا
چو می خواہد کہ باشد بانیٔ قصرِ ثنائے تو — بکارِ خشت وگل مگذار لطف اللہ احمد را

اس قطعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معماری کے پیشہ کو اپنے سے کم درجہ جانتا تھا، داراشکوہ نے اس سے اپنا محل بنوایا ہے، اس کی تاریخ نکالتا ہے،

چو بنا کردہ قصرِ جاہ و جلال — ظلِ حق بادشاہ عالی ملک
شبہۂ ایں عمارتِ والا — تا نت چوں ہر حوالیِ ملک
گفت معمار، قصرِ تاریخش — قصرِ داراشکوہ والی ملک

اس مصرع سے تاریخ بناء ۱۰۰۰ھ نکلتی ہے، اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ داراشکوہ کا یہ قصر اسی شاعر معمار نے بنایا تھا، داراشکوہ نے کوئی کنجی بنوائی ہے، اس کی تاریخ لکھی ہے،

چوں طیار شد ایں کلیدِ ظفر — بفرمانِ دینِ پرورِ حق پژوہ
پے سال تاریخ انجام وے — خرد گفت "مفتاح داراشکوہ"

"مفتاح داراشکوہ" سے ۱۰۶۶ھ نکلتے ہیں، جس کے ایک سال کے بعد داراشکوہ کی تاریخ کا صفحہ بدل جاتا ہے، داراشکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کی کدخدائی کی تاریخ یہ لکھی ہے،

کدخدا گشت باقبالِ بلند — پورِ دارائے زماں شاہ زمیں
در زمانے کہ مراداتِ جہاں — بود در دست چو در دست نگیں

گفت جبرئیل امین تاریخش — بسلیماں شدہ بلقیس قرین

آخری مصرع سے ۱۰۷۱ھ نکلتے ہیں،

اوپر کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا اور اُس کے خاندان کا تمام تر تعلق داراشکوہ سے تھا، اس تاریخ سے اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ پیدا کرنا بہت آسان ہے، یعنی یہ کہ اُس کو داراشکوہ سے جس قدر وابستگی ہوگی، اسی قدر عالمگیر کے دربار سے اس کو دوری ہوگی، داراشکوہ کے مدحیہ قصیدہ میں کچھ ایسے شعر بھی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں داراشکوہ کے حریف مقابل یعنی اورنگ زیب پر طعن وتعریض ہے، مثلاً

زہیبتش نہ تواں یافت نیم قطرۂ خوں — ہزار بار دل خصمش ار بشفاری

بزخم تیر کہ زد در دلِ معاندِ او — ربودہ رنگِ دلم را سپہر زنگاری

دراں دیار کہ بخت حسود تست بخواب — ندیدہ دیدۂ مردم بخواب بیداری

مدام باد ہوا خواہ دولت تو بعیش — نصیب خصم تو جاوید باد خونخواری

ان اشعار میں "خصم" اور "معاند" اور "حسود" سے غالباً اورنگ زیب ہی کی طرف اشارہ ہے، اس بنا پر ۱۰۶۸ھ کے انقلاب میں جب "شاہزادہ بلند اقبال" کی جگہ اورنگ زیب عالمگیر زیب اورنگ شاہی ہوا، تو اس شخص کی کس مپرسی محتاج بیان نہ ہوگی، لطف اللہ کے دیوان میں ایک قطعہ بند غزل ہے،

شہا گوش بر داد خواہی نداری — بحالِ گدایاں نگاہے نداری

رقیباں بقتلم نوشتند فتوی — دگر نہ تو ہرگز گناہے نداری

جہاں سربسر خیر خواہ تو باشد — ولے ہمچو من خیر خواہے نداری

نیاری صبا سوے بلبل پیامے — مگر سوے گلزار راہے نداری

فہندس ازاں رو نداری دفا کہ — کہ چوں زاہداں خانقاہے نداری

میرے خیال میں اس غزل کا خطاب اورنگزیب ہی کی طرف ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اس کو دارا شکوہ کے عہد میں اس گلہ و شکایت کا موقع نہ تھا، ورنہ زاہدوں کی خانقاہ پر تعریض کی حاجت تھی،

اوپر کے اشعار میں مہندس نے اپنی تعمیری عمارت فن کا بھی جا بجا اظہار کیا ہے کہتا ہے، ع

بلند پایہ زمن گشت قدر معماری

ایک جگہ فخریہ کہتا ہے:۔ ع

ما ہمہ معمار و عمارت گریم

ایک جگہ کہتا ہے کہ "میرے بنائے ہوئے نقشے آفتاب کی طرح روشن ہوتے ہیں"

چناں منیر شود شبیہ عمارت من　　　　که نور مهر بود زنور او تاری

دمے کہ من بعمارت گری شوم مشغول　　　　ملک مصالح کار آورد بسر یاری

مگر بایں ہمہ یہ نہیں معلوم کہ اس کی بنائی ہوئی عمارتیں کون ہیں، اوپر کے ایک تاریخی قطعہ سے دارا شکوہ کے ایک محل کے بنانے کا حال معلوم ہوتا ہے، تذکرہ سفینۂ خوشگو، اور نشتر عشق حسین قلی خاں میں ۱۲۹۵ھ میں مہندس کے بیٹے ریاضی کے حال کے ضمن میں ہے،

" ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوری است کہ قلعۂ ارک دار الخلافہ شاہجہان آباد بتجویز و صواب دید او بنا یافتہ" (خوشگو)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعۂ دہلی کی شاہجہانی عمارت کی تعمیر میں یہ بھی اپنے باپ اور چچا کے ساتھ شریک تھا، سحر حلال میں یہ اپنی نسبت لکھتا ہے،

" مملوک ہوا دار ولد احمد معمار گو ہر عمر را در کارگاہ و گل کاسد کردہ .....

اس فقرے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر کا بڑا حصہ عمارت گری میں صرف ہوا،

۷۔ سحرِ حلال: یہ فارسی رسالہ علمِ اخلاق میں ہے، اور صنعت غیر منقوطہ میں لکھا گیا ہے، اسی لئے مصنف کا نام لطف اللہ کے بجائے "ولد احمد معمار" لکھا گیا ہے، اس کے شروع کی عبارت یہ ہے:۔

"اللہ علا اسمہ در اول کلام حمد کردگار آورد م، مالک ملک اعلام واحد صمد سلام....."

حمد و نعت کے ۹ صفحوں کے بعد دو صفحوں میں "مدح داور کامگار دام اللہ ملکہ" کے عنوان سے بادشاہِ عصر کی تعریف ہے، ممدوح کا نام حسب ذیل صورت معمہ میں ہے:۔

"اسم اکرم او حاصل، دو کلمہ آمد، کلمہ اول، سرِ عدل (ع) دلِ داد (الف) و دلِ علم (ل) و میرا مراد (م) کلمۂ دوم:۔ سرِ گل (گ) و دلِ سرد (ر) و در سرِ گل و دلِ سرو دہ (ی) در آمدہ، مالک عالم و صمد سلام ہموارہ سر داد و را محور سمائے کرم و گل او را محسود و رحم ارم دارا د"

اس صورتِ معمہ سے جو نام نکلتا ہے، وہ عالمگیر ہے، تعجب ہے کہ دارا شکوہ کے مداح نے عالمگیر کی مدح کیونکر لکھی، شاید اس اخلاقی رسالہ کو عالمگیر کے نام سے پیش کر کے اس کی ہمدردی اپنی طرف مائل کرنی چاہی، جو معلوم نہیں کہ ہوئی یا نہیں،

بادشاہ کی مدح کے بعد "مدح رسالہ و حال محمد صلے اللہ عالہ" کے عنوان سے تین صفحوں میں اپنا اور اپنے رسالہ کا حال لکھا ہے، جس کا اقتباس درج ذیل ہے،

"مملوک ہوا دار ولد احمد معمار رسالہ کہ مدا وا دکل مدامع اہلِ حال آمد........

حاصل سطور معدودہ کردہ در درگاہ سالار کامگار دام اللہ ملکہ آوردہ..........

ما مول کہ در حال سعد..... در مطالعہ والا در آمدہ معلوم ہر کہ اکرم گردد...........

سرور املوک ہوا دار ولد احمد معمار گو ہر عمر را در کارگاہ وگل کاسد کردہ ... .

مسئول کہ ہر کس در مسالک علم .... اطلاع دارد، رسالۂ مملوک ہوادار اصلاح و ہذا محمد معاد والد مملوک داد ارسہ ولد دارد، اوّل عطار اللہ سلمہ اللہ سالک مسالک علم و عمل و راحل مراحل صعود و کمال عالم و عامل و علامۂ عصر کہ در او علم و عمل آمدہ حصر، رسالہا در علم اعداد مسطور کردہ، حامل صحاح و کسور، دو ولد دوم اوسط ہر سہ مملوک درگاہ کردگار و اسم مملوک حامل دو کلمہ آمد، کلمۂ دوم "اللہ" علا اسمہ کلمۂ اوّل لام و طا، معادل عدد عطا، و ولد سوم ہو مسالک علم و عمل و مراحل صعود و کمال مسا ہم عطار اللہ آمد و اسم ہم دو کلمہ دارد، کلمہ دوم "اللہ" علا اسمہ و کلمۂ اوّل معادل عدد عطا و دو رار اصلح اللہ حالہ حفص اللہ آمالہم معلوم اہل علم گردد کہ اسم رسالہ دال سحر حلال آمد..... معلوم اہل کمال کہ سحر حلال را کہ در ماہ محرم الحرام مسطور کردہ سال رسم سحر حلال طلم اہل حال و معلوم اہل کمال را سوال کردم صدا در داد کہ سحر حلال در دل اہل حال آمد و در سِر لوح کمال"

اس آخری فقرہ سے اس رسالہ کی تصنیف کی تاریخ ۱۲۰۰ھ نکلتی ہے،

اس تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس میں مختلف اخلاقیات کو سرعنوان بناکر مدح و ذم لکھا گیا ہے، مثلاً مدح عدل، مدح سماع، محرم امساک، محرم حسد، محرم طول امل محرم حرص و طمع، محرم کسل مدح کد، مدح علم، مدح و لداد حال اہل دل ہوس وصل و لداد حصول وصل و لداد محرم ہوس و دوام وصل، مدح دل، مدح سرود کام اہل دل، اسی پر رسالہ ختم ہو گیا ہے،

اس رسالہ کے دو نسخوں کا مجھے علم ہے، پہلا رسالہ مدرسہ محمدی مدراس کے کتبخانہ کا جس کا نمبر ۲۶۸ ہے، اس نسخہ کو غلام عبدالقادر المخاطب بہ قادر عظیم خان نے ۱۲۲۱ھ میں نقل کیا ہے جو مدراس کے ایک مشہور علمی خاندان کے رکن تھے[1]، یہ نسخہ ۲۹ صفحوں میں ہے،

---

[1] اس خاندان کے نوجوان رکن جناب محمد غوث صاحب ایم اے حیدرآباد دکن کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے لئے اس رسالہ کے اقتباسات میری فرمائش پر نقل کرکے بھیجے،

دوسرا نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہو جس کا نمبر اس کے کٹیلاگ میں جلد ۱۰ ہے اور صفحہ ۱۱ اُس کو ابھی ابھی ہمارے مخلص دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر (پونہ) نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔[1]

(۳)

امام الدین الریاضی | یہ لطف اللہ مہندس کا بیٹا اور استاذ احمد کا پوتا ہے،
ریاضیات کے اس ریاض علم کا یہی وہ نونہال ہے جس کے تذکرہ کی خوشبو بارہویں صدی کے اہل تذکرہ کی محفل تک پھیلی ہے، خوشگو نے اپنے سفینہ میں حسین قلی خان عظیم آبادی نے اپنے نشتر عشق میں کشن چند اخلاص نے اپنے ہمیشہ بہار میں اور احمد علی خان سندیلوی نے اپنے مخزن الغرائب میں اُن کے حالات لکھے، اور اُن کے فارسی اشعار نقل کئے ہیں، اور اسی ضمن میں اُن کے بعض بزرگوں اور عزیزوں کے احوال کی طرف بھی اشارات کئے ہیں، سفینۂ خوشگو میں ہے:۔

"مولوی امام الدین ریاضی تخلص خلف ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوریست کہ قلعۂ ارک دار الخلافۂ شاہجہان آباد، بتجویز وصواب دید او بنا یافتہ و از عہد جد خود بدار الخلافہ سکونت دارد، در جمیع علوم رسمی یگانہ و منفرد بود، خصوص در ریاضیات تصانیف معتبر دارد، وبا ایں ہمہ قناعت در ریاضت را زیور حال و مآل خود ساختہ، بدرس و افادت مشغولی داشت، درین جزو زمان از مغتنمات بودہ، اگرچہ بنا بر اشتغال علمی بفکر سخن کم می پرداخت لیکن سلیقۂ بسیار درست داشت، و در جواہائے پائے کم نمی آورد، و درسال ہزار و صد و چہل و پنج رحلت کرد، و امروز ملا ابو الخیر موسوف بخیر اللہ برادر

[1] اس کیٹلاگ کے فاضل مرتب نے اس رسالہ کا مصنف لطف اللہ کے چھوٹے بھائی نور اللہ کو ظاہر کیا ہے، یہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہے:

اعیانی او...... (اس کے بعد خیر اللہ کی رصد بندی کا تذکرہ ہے، جس کا ذکر اس کے حال میں آئے گا)

پھر مولانا ریاضی کے چند فارسی اشعار کا انتخاب کیا ہے،

حسین قلی خاں عظیم آبادی نشتر عشق میں لکھتے ہیں:۔

" مولانا امام الدین نام خلف مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری است کہ قلعۂ ارک شاہجہان آباد برای وے بنیاد شدہ، تدۃ العمر خود، در شاہجہان آباد گذرانیدہ چون وے بعلم ریاضی تفوق برابنائے جنس داشت و در ورع و پرہیزگاری بے مانند بود، لہذا تخلص خود، ریاضی می کرد، وگاہ گاہے بفکر بہ تلاش سخن ہم می گماشت ......

درسنہ یک ہزار و یک صد و چہل و پنج بگل چینی ریاض جناں شتافت،

حسین قلی خاں نے اُن کی تاریخ وفات کا یہ قطعہ لکھا ہے،

بگفتہ عاشقے با آہ دل سوز　　　　برفتہ چوں امام الدین ز دنیا

بدیع و صرف و معنی و ریاضی　　　　شدند از وای بے او بے سر و پا

کشن چند اخلاص نے اپنے تذکرہ ہمیشہ بہار[1] میں اُن کا تذکرہ بڑے اخلاص کے ساتھ چند صفحوں میں لکھا ہے، جس کی ایک ایک سطر سے اس کی عقیدت مندی اور نیازمندی کا اظہار ہوتا ہے، خصوصاً اُن کے زہد و استغنا اور سلاطین و امراء کے درباروں سے اُن کی بے نیازی کی تعریف کی ہے، ابتدائی سطریں یہ ہیں،،

..... اصل وطن ایشاں دار السلطنت لاہور است و جد شریف آں دانائے اسرار کوفی والٰہی آمدہ، در دار الخلافہ شاہجہان آباد اقامت گزیدہ، والد شریف ایشاں مولوی

---

[1] اس کا نسخہ بانکی پور لائبریری میں نظر سے گذرا،

لطف اللہ مہندس کہ ایشاں ہم گاہے گاہے میل بشعر می کردند و مہندس تخلص می فرمودند، در علم ریاضی خیلے ید علیا داشتند"

پھر چند صفحوں میں اُن کے زہد و اتقار کے حالات لکھے ہیں، اور اُن کے شاعرانہ کمال کے ایک دو واقعے نقل کئے ہیں،

احمد علی خان سندیلوی نے تذکرۂ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۸ھ میں لکھی گئی ہے، ذرہ سے لفظی تغیر سے وہی کچھ لکھا ہے جو اخلاص نے بیان کیا ہے، چنانچہ اس میں ہے،

مولانا امام الدین ریاضی اصل وطن ایشاں بلدۂ لاہور است، جدش توطن در دہلی اختیار کردہ پدرش مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است، ایشان ہم بگفتن اشعار میل تمام داشتند و مہندس تخلص می کردند، و در علم ریاضی مثل این ہر دو پدر و پسر در بلاد ہند نبودہ اند"

ہر چند مولانا ریاضی بگفتن شعر توجہ نداشت، روز و شب بہ تدریس مشغول بود،

تذکرۂ صبح گلشن میں ہے،،

"ریاضی امام الدین فرزند مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری کہ قلعہ ارک شاہجہان آباد بصواب دید رائے رزینش بنیاد گرفتہ، ریاضی متوطن شاہجہان آباد گردیدہ از شہر تدۃ العمر بیروں نرفتہ اہر علوم درسیہ بودہ و در سبق علم ریاضی از معاصرین قصب السبق ربودہ در عبادت و ریاضت و ورع و زہد عدیل خود نداشتہ"

تاریخ علمائے ہند میں یہ سطریں ہیں:۔

" ملا امام الدین دہلوی در اصل لاہوری است ریاضی داں بود کہ بدہلی توطن گرفتہ شرحے مختصر بہ تشریح الافلاک مصنفہ بہاء الدین عاملی در سال یازدہ صد و سہ ہجری نوشتہ کہ بنام التصریح فی شرح التشریح شہرت دارد"   (ص ۲۶۲ نولکشور)

عام طور سے اس کی یہی تصنیف تصریح جو بہاء الدین آملی کے مشہور متن تشریح الافلاک کی شرح ہے، لوگوں میں مشہور ہے، حالانکہ اس سے پہلے عصمت اللہ سہارنپوری نے ۱۰۸۶ھ میں اس کی مفصل شرح لکھی ہے، جس کا نام باب تشریح الافلاک ہے، اور جو چھپ بھی گئی ہے تاہم علم ہیئت میں عربی درس گاہوں کی سب سے ابتدائی اور مختصر ترین کتاب یہی ہے، اسلئے بہت مقبول ہوئی، مصنف نے دیباچہ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے،

"اما بعد فیقول العبد الضعیف امام الدین بن لطف اللہ المہندس اللاہوری ثم الدہلوی" (دیباچۂ تصریح)

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان گو در اصل لاہور کا رہنے والا تھا، مگر بعد کو شاید شاہی تعمیرات کے تعلق سے دہلی آکر آباد ہو گیا تھا،

امام الدین نے اپنی اس تالیف (تصریح) کا سنہ دیباچہ میں ۱۱۰۳ھ لکھا ہے، ہم کو معلوم ہے کہ لطف اللہ کم از کم ۱۰۹۳ھ تک زندہ تھا کہ اوس کی تصنیف منتخب اسی سال تالیف پائی ہے، اور اس کے گیارہ برس کے بعد اس کا بیٹا تصریح لکھتا ہے، اس سے یقینی طور سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ ہی کے عہد میں بیٹا علوم و فنون کی تکمیل کر چکا تھا، یا کر رہا تھا، اس سے ہم کو یہ قیاس کرنے کا حق ہوتا ہے کہ غالباً اس نے اپنے باپ ہی سے علوم ریاضی کی تعلیم حاصل کی ہوگی، تذکروں میں اس کی تاریخ وفات ۱۱۴۵ھ (سنہ خمس واربعین ومائۃ والف) لکھی ہے،

تصریح کے دیباچہ میں ہے کہ "یہ شرح اوس نے بھائیوں اور دوستوں کی فرمایش سے لکھی" اس سے مراد اس کے شاگردوں کی جماعت ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ وہ خود بھی درس و تدریس کے موروثی پیشہ میں مشغول تھا، چنانچہ سندیلوی نے تصریح بھی کی ہے کہ

"روز و شب بہ تدریس مشغول بود"

رام پور کے کتب خانہ میں اس کی کتاب تصریح کے دو نادر نسخے ہیں جن میں سے ایک کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تصنیف کی تاریخ سے بارہ برس کے بعد ۱۱۱۵ھ میں لکھی گئی ہے اور دوسرے کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ۱۱۲۰ھ میں اس نسخے سے منقول ہے، جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، پہلے نسخہ کا نمبر ۱۵، اور دوسرے کا ۱۶ (فنِ ہیئت) ہے،

مصنف نے اپنی شرح پر حواشی بھی لکھے تھے، چنانچہ رام پور کے نسخہ نمبر ۱۶ پر مصنف کے یہ حواشی موجود ہیں، ہمارے استاذ مولانا حفیظ اللہ صاحب سابق مدرسِ اعلیٰ مدرسہ عالیہ رامپور و دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے تصریح پر جو حاشیہ اپنے قیام رامپور کے زمانہ میں ۱۳۱۰ھ میں لکھا تھا، اور جو مطبع مجتبائی دہلی میں چھپا ہے، اوس کے آخر میں محشی نے تصریح کی ہے کہ انھوں نے شارح کے ان حواشی سے جو اس کے ہاتھ کے نوشتہ نسخہ سے منقول ہیں استفادہ کیا ہے، (خاتمہ حاشیۂ تصریح، مطبوعہ مجتبائی دہلی)

امام الدین نے دو اور کتابوں پر بھی حاشیے لکھے ہیں، جن میں سے ایک قاضی زادہ رومی کی مشہور فلکی تصنیف شرح چغمنی پر ہے، نواب اودھ کے زمانہ میں علی بخش خاں کے مطبع علوی میں مقبول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خاں بہادر ثابت جنگ قبول کے زیر اہتمام شرح چغمنی کا جو نسخہ متعدد علماء کے حواشی اور تعلیقات کے ساتھ چھپا ہے، اُن میں ایک امام الدین الریاضی بن لطف اللہ المہندس الدہلوی" کے حاشیہ کے بھی منقولات اور حوالے ہیں، چنانچہ کتاب کے خاتمہ میں حاشیہ کا ذکر ہے[1]،

امام الدین کا دوسرا حاشیہ خود اس کے باپ کی کتاب شرح خلاصۃ الحساب پر ہے،

امام الدین بھی اپنے باپ کی طرح فارسی کا شاعر تھا، اور ریاضی اُس کا تخلص تھا، کشن چند اخلاص اور سندیلوی کا بیان ہے کہ گو مولانا ریاضی کو اپنے درس و تدریس

[1] کتب خانہ ندوۃ العلماء فنی نمبر ۱۷۱

سے شعر گوئی کی فرصت نہیں ملتی تھی تاہم انھوں نے طالب آملی کے ایک مطلع کا جس کا جواب نہیں ہو سکتا تھا، ایسا جواب لکھا جو بڑے بڑے شعرا کی قدرت سے باہر ہے، طالب کا مطلع تھا،

بتن بو یا کند گلہائے تصویر خیالی را | بپا بیدار سازد خفتگان نقشِ قالی را

اخلاص اور سندیلوی کہتے ہیں کہ اس کا جواب شاعروں سے اب تک نہیں ہو سکا تھا، یہاں تک کہ میاں ناصر علی کو اُن کے دوستوں نے اس زمین میں کچھ کہنے کی فرمایش کی، تو صاف کہا کہ "ایں زمیں را طالبا بر دچیزے کہ ماندہ است درد است" مرزا صاحب جیسے "شاعر غرا" نے جب اس غزل کا جواب لکھا، تو سپر ڈال دی، اور قالی اور نہالی کا مطلع نہیں لکھا بلکہ یہ مطلع کہا کہ

"تکلف نیست در گفتار رندلاابالی را | جنانت دوست می دارم کہ عاشق شعر حالی را"

لیکن مولانا ریاضی نے اُس کا جواب برجستہ لکھ دیا،

رگِ گل کرد آں گُل چہرہ ہر تارِ نہالی را | ازیں اندیشہ گلہا داغ شد بر سینہ قالی را

مولانا کا مطلع جس نے سُنا اُس نے کہا:

"ظاہراً ایں زمیں در دو صاف داشت یکے را طالبا برد و دومی تا حال در جواہر خانہ قضا و قدر پنہاں بود کہ نصیب مولانا شد"

ان تذکروں میں اُن کے یہ چند شعر نقل کئے ہیں:

عنقا خدنگ حسرتِ گُمنامی نست | در قیدِ نام بود اگر چہ نشاں نداشت
رفتی، ورفت لشکرِ دل در رکاب تو | بشہرم بزنگ مجلس تصویر جاں نداشت
روشن دلیم و خاک نشینی عیار ماست | سیماب وار کشتہ شدن اعتبار ماست
آزادہ ایم مطلب ما ترکِ مطلب است | باز آمدن زحاصلِ ہر کار کار ماست

ما خارِ غم بسینہ چو ماہی نہفتہ ایم گلزار عشق داغِ دل خانخاناست
دریا دل است اُو نم از ما دریغ داشت خشک و تری بپائی گل فسوس خار ماست

زعشق یار چہ گویم کہ حالِ من چون است غم بدور خطش از احاطہ بیرون است
ندانم ار چہ شدی سنگدل کہ بیمار است بجاں رسید و نپرسی کہ حالِ و چون است

ساتویں شعر میں دیکھئے کہ ریاضی کی جھلک دور، خط اور احاطہ میں موجود ہے، سفینۂ خوشگو میں دو شعر اور ہیں، :

پایۂ عشق بلندی ز سرِ دار گرفت ہر کہ دریافت چوں منصورسری سردار است
یوسفستانِ معانی است ریاضی سخنت چاک پیراہن نظم تو عجب بازار است

امام الدین ریاضی نے تصریح کے دیباچہ میں جو چند لفظ لکھے ہیں، اُن سے اور کشن چند اخلاص کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تربیت کے دامن میں ریاضیات کے کئی مستعد شاگرد پل کر جوان ہوئے، اخلاص کے تذکرہ ہمیشہ بہار میں ہے :

"دیکے از شاگردان ایشان بمجسطی شرح فارسی نوشتہ خیلے بتفصیل"

پھر لکھا ہے :۔

"عزیزے در حق بعضے از شاگردان ایشاں گفتہ" ع

توئی در ہر فنے چوں مردِ یک فن

اس کے بعد ہے :۔

"شاگردان ایشاں در ریاضی تصانیف رائقہ فائقہ دارند"

خیر اللہ بن لطف اللہ | لطف اللہ مہندس کا یہ دوسرا لڑکا ہے، اس کا پورا نام ابوالخیر المخاطب خیر اللہ خاں مہندس ہے، محمد شاہ کے عہد میں اُس نے اپنا نام روشن کیا، اور لفظا المخاطب ہوگیا ہے"

کہ بادشاہ کے دربار تک اس کو رسائی حاصل تھی، اپنے باپ کی طرح یہ بھی اپنے امام کے ساتھ ھندسہ لکھتا ہے، غالباً اُس نے تعلیم اپنے بڑے بھائی امام الدین سے پائی ہوگی، جس نے ۱۱۴۵ھ تک زندگی پائی ہے، تصریح کے دیباچہ میں امام الدین نے لکھا ہے کہ "اُس نے اپنے دوستوں اور بھائیوں کی فرمایش سے یہ شرح لکھی ہے" عجب نہیں کہ ان بھائیوں میں اس کا یہ بھائی بھی ہو کشن چند اخلاص کے تذکرہ ہمیشہ بہار میں امام الدین ریاضی کے ذیل میں ہے" یکے از شاگردان ایشاں بجیلی شرح فارسی نوشتہ خیلے بتفصیل ...." آگے معلوم ہوگا، کہ یہ شاگرد خود اُس کا بھائی خیر اللہ ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خیر اللہ اپنے بھائی امام الدین کا شاگرد تھا، اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ میں راجہ جے سنگھ نے بادشاہ کے حکم سے دہلی، جے پور، بنارس اور اجین میں جو رصدخانے قائم کئے تھے، اُن کا بانی اور نگراں کار یہی نادرۂ روزگار تھا، آج سے پچیس چھبیس برس پیشتر میں نے یہ بات قیاساً لکھی تھی[1] لیکن بحمد اللہ کہ آج اُس کے ایک معاصر تذکرہ نویس بندرابن خوشگو المتوفی سنہ ۱۱۷۰ھ کی معاصرانہ شہادت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی، خوشگو اپنے تذکرہ سفینۂ خوشگو میں جس کا قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں نظر سے گذرا، امام الدین ریاضی کے حال میں لکھتا ہے: :

"وامروز ملا ابو الخیر معروف بخیر اللہ برادر اعیانی وے در ہیئت و ہندسہ واکثر علوم یگانۂ روزگار است، چنانچہ راجہ دھیراج جے سنگھ سوائے زمیندار عنبیر، در ایں ایام خیال رصد بستن در پیش داشتہ، قریب بست لک روپیہ در بست سال صرف ایں کار نمودہ باستصواب ابو الخیر مذکور است و حق آنست کہ ذات او برزمانہ منت است......"

(سفینۂ خوشگو نمبر ۲۵ ص ۱۲۳)

---

[1] الندوہ سنہ ۱۹ میں مضمون اسلامی رصد خانے،

دلّی میں اس رصد خانہ کے کام کے علاوہ ریاضیات کا درس بھی دیا کرتا تھا، (دیباچہ تقریب التحریر) چنانچہ اس کے شاگردوں میں سب سے پہلا نام اس کے بیٹے محمد علی کا ہے،

اس کی ایک معنوی یادگار انڈیا آفس لائبریری لندن اور کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر حیدرآباد دکن میں اور دو بانکی پور کے شرقی کتب خانہ میں ہیں، اُن میں سے ایک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہے، اور چوتھے کا ذکر علامہ غلام حسین جونپوری نے جامع بہادر خانی میں کیا ہے،

۱۔ تقریر التحریر، یہ خواجہ نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کی "تحریر اقلیدس" کا فارسی ترجمہ ہے، محمد شاہ کے زمانہ میں ۱۱۴۴ھ میں یہ ترجمہ جیسا کہ کتاب کے دیباچہ میں تصریح ہے، اس نے ختم کیا، کتاب کا آغاز ان فقروں سے ہے،

"شکر است مر خدا ے را کہ از دست ابتدا بسوے او دست انتہا دیدست، دست اختیار ہمہ چیز ہا"

نواب سالار جنگ بہادر (حیدرآباد دکن) کے کتب خانہ میں اُس کا جو نسخہ ہے، اس میں مترجم کا نام ابو الخیر بن لطف اللہ مہندس اور انڈیا آفس کے نسخہ (نمبر ۲۳۶) میں "خیر اللہ خاں بن لطف اللہ مہندس" درج ہے، جیسا کہ اس کی فارسی فہرست (جلد اول ص ۱۲۳۴) سے معلوم ہوتا ہے، اس حیدرآبادی نسخہ میں کتاب کا نام صاف "تقریر التحریر" ہے، لیکن انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں اس کا نام "ترجمہ تحریر اقلیدس" لکھا ہے، حالانکہ یہ نام نہیں ہوسکتا، "تقریب التحریر" جس کا نام آگے آتا ہے، اور جس کا نسخہ بانکی پور اور علی گڑھ کی لائبریریوں میں ہے، اُس کے دیباچہ میں مصنف کے فرزند نے بھی اس کا نام "تقریر التحریر" بتایا ہے، جو بجائے خود اور دوسری تصنیف کے نام کی مشابہت سے بھی نہایت موزوں ہے، انڈیا آفس کے نسخہ کی کتابت کی تاریخ یکم رجب ۱۱۹۴ھ ہے، اس کے پہلے صفحہ پر ایک حاشیہ ہے، جس میں مذکور ہے، کہ یہ نسخہ راجہ سندارام پنڈت نے مسٹر جیمز ڈاسن

کے لئے لکھنؤ میں تیار کیا تھا تعجب ہوگا کہ کبھی ہمارے بزرگوں کی ریاضی کی تصانیف سے استفادہ کے انگریز شائقین علم بھی مشتاق تھے، حیدرآبادی نسخہ کو کسی شیخ احمد نے ۱۲۴۵ھ میں لکھا ہے،

۲ - تقریب التحریر، یہ خواجہ طوسی کی دوسری کتاب "تحریر مجسطی کا فارسی خلاصہ ترجمہ مع شرح ہے مصنف کا نام اس میں "ابوالخیر المعروف بہ خیر اللہ المخاطب بہ خیر اللہ خان، المتخلص بالمہندس ابن لطف اللہ ہے، کتاب کا آغاز یہ ہے،

"ثنائے کہ از اندازۂ ہندس خرد بیرون است، شایان صانعی کہ خالق سبع سماوات"

(فہرست کتب خانۂ مشرقی بانکی پور جلد یازدہم ص ۰۰)

مصنف نے اس کے دیباچہ میں یہ بیان کیا ہے کہ تحریر اقلیدس کے ترجمہ کے بعد اس نے یہ کتاب محمد شاہ (۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء - ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء) کی تخت نشینی کے اخیر ثلث (۱۱۶۱ھ) میں تالیف کی، اس کی شرح میں اس نے مولانا عبد العلی برجندی کی شرح تحریر مجسطی سے مدد لی ہے، کتاب کا عام انداز یہ ہے کہ پہلے خواجہ طوسی کے عربی متن کا ایک فقرہ ہے، پھر اس کا فارسی ترجمہ، پھر حسب ضرورت برجندی کی عربی شرح اور پھر خود خیر اللہ کی فارسی شرح ہے،

اس کا ایک نسخہ بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں ہے، ۲۲ رشوال ۱۲۵۱ھ کتابت کا سال ہے، کتاب کا نمبر ۵۰۰، ریاضیات فارسی ہے، اور دوسرا مسلم یونیورسٹی) لائبریری (نمبر ۹ علوم فارسی) میں ہے) فہرست میں اس کا نام ترجمہ مجسطی لکھا ہے، دو نسخے نظر سے گذرے ہیں،

کتاب کا آغاز اس طرح ہے،

یارب آساں کن بفضل شامل خود فتح باب پس بلطف کامل خود ساز انجام کتاب

"قال الفاضل الکامل، المحقق والعامل الماہر المدقق استاذ الکل فی الکل عالم العلوم

باکمل الشارح المترجم بالفارسیۃ ابو العلوم العربیۃ ابو الخیر المعروف بخیر اللہ المخاطب
بخیر اللہ خاں سلمہ الرحمن المتخلص بالمہندس ابن لطف اللہ غفر اللہ لہما الحمد للہ رب العالمین
...... البعد .... پوشیدہ نماند کہ چوں در سالف زماں ترجمۂ تحریر اقلیدس کہ از محقق
طوسی، با زیادت شرح بعض مقدمات بزبان فارسی برائے عموم فیض اتفاق افتادہ بود
و بتقریر التحریر موسوم گردیدہ، خواست کہ برائے اتمام خدمت عباد اللہ ترجمۂ تحریر مجسطی کہ ہم
از ان مدقق است با یراد بعض فوائد مرقوم سازد، چنانکہ بفضل الٰہی جل جلالہ و عم نوالہ مسودۂ آن
کتاب عظیم النفع در ثلث اخیر مدت سلطنت شاہ خلائق پناہ، انجم سپاہ، فردوس آرامگاہ
محمد شاہ بادشاہ غازی علیہ الرحمہ و الرضوان فراغ دست دادہ بود، و بتقریب التحریر
مسمی شدہ، بسبب عدم دریافت قدر دانی ارکان در حیز تعویق افتادہ بود، بہ
ترغیب بعض دوستان طالب این فن در اواسط سنہ احد جلوس بادشاہ عالمگیر
احمد شاہ بہادر، از مسودہ اتفاق شروع بمبیضہ افتاد در سنہ یک ہزار و یکصد و شصت
و یکم ہجری مقدسہ صلعم"

علی گڈھ کا نسخہ جا بجا سے کرم خوردہ ہے، اور بانکی پور کا نسخہ اچھا اور محفوظ ہے، اوپر کی عبارت دونوں نسخوں کی تطبیق سے درست کی گئی ہے، خاتمہ کی عبارت دونوں میں یہ ہے:

"بعد از بیان سعی در حل این کتاب و وصف خوبی ہائے آن اعتذار سہو و خطا و طلب
دعائے خیر ختم بر صلوٰۃ و سلام حضرت رسالت پناہ را ...... فارغ شدم از تحریر
این شرح و تصحیح آن روز یک شنبہ اوائل ذی قعدہ سنہ نہصد و ہشت و یک
ہجریہ نبویہ ...... بن لطف اللہ مہندس بن احمد،

"سنہ نہصد و ہشت و یک" سراسر تحریف ہے، یہ حقیقت میں "ہزار و یک صد و شصت و یک" سنہ ۱۱۶۱ھ

ہوگا کہ یہی سال محمد شاہ کی وفات کا ہے، اور اس نسخہ کے آغاز میں تصریح ہے کہ اس وقت بادشاہ ممدوح کی وفات ہو چکی تھی، گویا کتاب کا مسودہ محمد شاہ کی زندگی میں تیار ہو چکا تھا، مگر ارکان سلطنت کی ناقدردانی سے یہ پڑا رہا۔ بالآخر شاہ مرحوم کی وفات پر ریاضی کے شائقین کے اصرار سے احمد شاہ کے پہلے سال جلوس میں اس کا یہ مبیضہ تحریر میں آیا،

۳- حاشیہ بر شرح بیست باب در معرفت اسطرلاب "بیست باب در اسطرلاب" خواجہ نصیر طوسی کا ایک مشہور رسالہ ہے، اس کی شرح علامہ عبدالعلی برجندی نے ۸۹۰ھ میں لکھی، اس پر خیراللہ مہندس نے یہ حاشیہ لکھا ہے، یہ حواشی بانکی پور لائبریری کی شرح بست باب کے نسخہ نمبر ۱۰۴۵ کے کناروں پر لکھے ہوئے موجود ہیں، اس پر محشی کا نام حسب ذیل تحریر ہے،

"خیر المہندسین ابوالخیر منجم المخاطب بخیر اللہ خاں مہندس"

اس نسخہ کی کتابت کا سال ۲ رجمادی الاخری ۱۱۶۵ھ ہے، (فہرست کتب خانہ مذکورہ ج ۱۱ص ۶۲) جو مصنف کی زندگی کا زمانہ ہے،

۴- شرح زیچ جدید محمد شاہی، راجہ جے سنگھ سوائی بانی جے پور، صوبہ دار آگرہ و مالوہ (المتوفی ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء) نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حکم سے دہلی، جے پور، اجین، بنارس، اور متھرا میں رصد خانے قائم کئے تھے، اور جن کے بنانے میں علاوہ دوسرے ہندو مسلمان اور انگریز ہیئت دانوں کے یہ خیراللہ مہندس بھی شریک تھا، ان رصد خانوں کی تحقیقات خود راجہ کے نام سے زیچ محمد شاہی کے عنوان سے ۱۱۴۰ھ میں تصنیف ہوئی تھی خیراللہ نے اس زیچ کی ایک شرح لکھی جس میں جابجا اس نے تشریحات اور استدلالات میں اپنے ذاتی مشاہدوں کا ذکر کیا ہے، اس شرح مذکور کا حوالہ علامہ غلام حسین جونپوری نے اپنی مشہور تصنیف جامع بہادر خانی میں دیا ہے،

" مرزا خیراللہ مہندس در شرح زیچ محمد شاہی دعوی فرمودہ است، کہ ماہ را

خارج المرکز شمس بلکہ مدارات جمیع حوامل را بشکل بیضوی یافتہ ایم"

۵۔ شرح زلالی و شرح حافظ و شرح سکندر نامہ، خیر اللہ کو اپنے خاندان کے موروثی جوہر سخنوری سے بھی حصہ ملا تھا، اس ذوق کا یہ اثر تھا کہ اس نے دیوان زلالی، اور دیوان حافظ کی شرحیں لکھیں، ان شرحوں کا ذکر اس کے بیٹے نے تقریب التحریر کے دیباچہ میں کیا ہے،

اسی قسم کی اس کی ایک اور کتاب سکندر نامہ کی شرح ہے یہ دو جلدوں میں تمام ہوئی ہے اور عجیب تر یہ ہے کہ پرانے زمانہ میں وہ چھپ بھی چکی ہے، اس کی دوسری جلد جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانہ میں نظر سے گذری، یہ مطبع شرف المطابع دہلی میں ۱۲۶۵ھ میں طبع ہوئی تھی، اس میں مصنف کا نام و لقب "مرزا خیر اللہ خاں مہندس خیر اشارحین" لکھا ہے،:

محمد علی ریاضی بن خیر اللہ مہندس | خیر اللہ مہندس نے اپنی ایک جسمانی یادگار بھی چھوڑی جس کا نام محمد علی ہے، یہ بھی اپنے خاندان کی موروثی علوم ریاضی و ہندسہ کا امانت دار تھا، اور اسی لئے "الریاضی" کے لقب سے مشہور ہوا، اس کے باپ نے اپنی کتاب تقریب التحریر مسودہ کی حالت میں چھوڑی تھی، اور مبیضہ کا صرف دیباچہ لکھا تھا کہ وہ دوسری کتابوں کی تصنیف اور طلبہ کے درس و تدریس میں مصروف ہو گیا، محمد علی نے اس کتاب کو صاف کر کے اشاعت و استفادہ کے قابل بنایا، چنانچہ اس کتاب پر خود محمد علی نے ایک دیباچہ بڑھایا ہے، جس میں یہ واقعہ درج کیا ہے،:

"می گوید بندۂ خاکسار ذرۂ بے مقدار الراجی الی ارحمۃ ربہ القوی محمد علی الریاضی آنکہ چوں والد این احقر العباد بر تحریر اقلیدس شرح مبسوط متنی کہ مسمّی بتقریر التحریرات بزبان فارسی نوشتند ...... خواستند کہ بہ تحریر کتاب مجسطی کہ مشکل ترین کتب علم ہیئت است یا براہین ہندسی و دورین رصد بے نظیرے کہ دست فکر ہر کس از ریاضی دان

بدامن مطلبش نمی تواند رسید و زور خیال وہر کیے از ہیئت دان لشکر معانیش نتوان جنبانید۔ نیز شرح بزبان فارسی یا فوائد دیگر بنویسند کہ برائے ہر طالبے بکار آید .... و در آخر سلطنت فردوس آرام گاہ محمد شاہ مسودہ آن تمام تحریر یافت و بسبب بعضے از موانع کہ شغل مطالعۂ کتب دیگر باشد و عدم فراغ از دیگر امور مبیضۂ آن در حیز تعویق افتاد الحال من بے بضاعت عاکف زاویۂ جہالت خصوصًا در علم ریاضی کہ دراں ریاضت معتد بہ نکردہ و آشنائے پیدا نساختہ و از بوئے ریاض ریاضی نبودند ؟ والد گرامی خواست کہ آن مسودہ را مبیضہ نویسد بحسب آنچہ در خاطر فاتر این ناقص درآید تن را ...."

اس کے بعد خیر اللہ کے مبیضہ کا دیباچہ ہے، جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے، اس کے بعد محمد علی کی یہ عبارت ہے:

"من مترجم می گویم کہ ایں اخبار شارح بہ مبیضہ ساختن تا نوشتن دیباچہ بودہ بود، از آں سبب بعضے از مشاغل اتفاق نیفتاد، چنانچہ ساختن شرح زلالی و شرح خواجہ حافظ و درس کتب ریاضی ایں حقیر فقیر خواست کہ تا ایں محنت ضائع نشود، جرات در نوشتن مبیضہ نمود، والا چہ نسبت خاک را با عالم پاک ....."

محمد علی ریاضی، احمد معمار کے سلسلۂ نسل کی آخری کڑی ہے، جس کا حال ہمیں معلوم ہو سکا ہے، اور اسی نام پر اس خاندان کے تذکرہ کا خاتمہ ہوتا ہے جس نے کم از کم سو سو برس تک لاہور اور دہلی میں تعمیرات و ہندسہ و ریاضی کی زندہ جاوید خدمتیں انجام دیں،

اس تفصیل کے بعد ضرورت ہے کہ لطف اللہ مہندس کی اس مثنوی کو مسلسل یکجا نقل کر دیا جائے جس میں اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کا اور خود اپنا حال لکھا ہے تا کہ اب ناظرین کو اسکی

خاندانی حیثیت کے واضح ہو جانے کے بعد اس کی صداقت بیان کا پورا وثوق ہو جائے، اور معلوم ہو جائے کہ تاج اور لال قلعہ کی عمارتوں کا اصل معمار اور مہندس کون تھا،

شاہجہاں دادرِ گیتی ستاں — روشنیٔ دودۂ صاحب قراں
عرش بریں قبۂ خرگاہ اوست — رشک فلک سدۂ درگاہ اوست
احمد معمار کہ در فنِ خویش — صد قدم از اہلِ ہنر بود بیش
واقف تحریر و مقالاتِ آں — آگہ اشکال و حوالاتِ آں
حالِ کواکب شدہ معلوم او — سرِ مجسطی شدہ مفہوم او
از طرف دادرِ گیتی جناب — "نادرِ عصر" آمدہ اورا خطاب
بود عمارت گرِ آں بادشاہ — داشت دراں حضرتِ فرخندہ راہ
آگرہ چو شد مضربِ رایاتِ شاہ — بس کہ برو بود عنایاتِ شاہ
کرد بحکمِ شہِ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکمِ شہِ انجم سپاہ — شاہجہاں دادرِ گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر — کرد بنا احمد روشن ضمیر
ایں دو عمارت کہ بیاں کردہ ایم — در صفتش خامہ رواں کردہ ایم
یک ہنر از گنجِ ہنرہاے اوست — یک گہر از کانِ گہرہاے اوست
چوں نبود عالم فانی مقر — کرد سوے عالمِ باقی سفر
پس سہ پسر ماند ز مرد سترگ — زاں سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ
نادرِ عصر خود و مشہور شہر — عالم و علامہ و داناے دہر
مرد ہنر پرور و استادِ فن — فاضل و دانشور و حبرِ زمن

مخزنِ علم آمدہ تالیفِ او — گنجِ ہنرہاست تصانیفِ او
نثرِ وے از آبِ رواں پاک تر — نظمِ خوشش غیرتِ سلکِ گہر
منکہ سخن پرور و دانش ورم — بندۂ آں حبرِ سخن پرورم
منکہ ربودم ز جہاں گوئے علم — از چمنش یافتہ ام بوئے علم
منکہ شدہ آگہِ سرِ نہاں — از دمِ او یافتہ ام قوتِ جاں
ثانیِ آن ہرسہ برادر منم — ہندسہ یکفن بود از صد فنم
گرچہ مہندس لقبم از شہ است — نامِ من دل شدہ لطف اللہ است
ثالثِ آں ہرسہ برادر بسال — آمدہ نور اللہ صاحب کمال
ما ہمہ معمار عمارت گریم — ما ہمہ استاد و سخن پروریم
لیک بود قصرِ کلامش عجب — زاں شدہ معمار مر اورا لقب
گرچہ کم است سالِ وی از سالِ من — بیش بود حالِ وی از حالِ من
نثرِ وے از نظم گہر بارتر — نظم ز نثر آمدہ ہموارتر
دیدہ ز نورِ سخنش پُرضیا — طبع ز لطفِ سخنش پُرصفا
گنجِ ہنر آمدہ در مشتِ او — ہفت قلم راندہ سہ انگشتِ او
گرچہ منم بے سخن استادِ فن — آں یک و دیں یک بود استادِ من

گرچہ مرا ہست مہندس لقب
ہندسہ زاں ہرسہ برادر طلب

(معارف فروری، مارچ، اپریل ۱۹۳۶ء)

(۴)

استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک اور یادگار

زیب النسا بیگم کے دربار کی ایک اور تصنیف

شاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی شہزادی زیب النسا بیگم کے علمی دربار کی جو یادگاریں اب تک معلوم تھیں، اُن میں ایک اور تصنیف کا اضافہ ہوا ہے، یہ استاد احمد معمار کے پوتے اور ہیئت کی مشہور درسی کتاب تصریح شرح تشریح الافلاک کے مصنف مُلا امام الدین ریاضی بن مُلا لطف اللہ مہندس لاہوری کا معانی و بیان میں ایک رسالہ ہے جس کا نام بیانیہ ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ نواب سید علی حسن خاں مرحوم (بھوپال ہاؤس لکھنو) کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا،

رسالہ کی زبان فارسی ہے، اور اس میں اکثر عربی اور بعض فارسی اشعار سے مثالیں دی گئی ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اُس نے اپنی طالب علمی میں یہ رسالہ لکھا تھا، اور یونہی پڑا تھا، جب اُس کی خبر شہزادی کو معلوم ہوئی تو اُس نے اس کو دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا، اس حکم کی تعمیل میں سنہ ۱۱۰۷ھ میں یہ رسالہ صاف کیا گیا،

دیباچہ کی عبارت یہ ہے :-

"حمد منزہ ازانست کہ ذات و صفاتش از مونت تشبیہ و تمثیل بے نیاز است، . . .

اما بعد چنیں گوید افقر عباد اللہ الغنی امام الدین الریاضی بن لطف اللہ المہندس اللاہوری ثم الدہلوی کہ در خلال از منۂ تحصیل دآذانہ اکمال و تکمیل قواعد چند کہ اساس علم بیان رفیع البنیان است تحریر نمودہ لیکن بسبب اشتغال بعض امور ما مورہ نقل آن از مسودہ بمبیضہ بمقتضائے وقت نمی نمود تا آنکہ الحال چوں سنہ الف و مایہ سبع ہجری مطابق سنہ سی و جلوس امیر کبیر بسیار بخش الکم پذیر ا اورنگ زیب بہادر عالمگیر ایں معنی بعرض جناب عالیان آب بادشاہزادۂ ذو القدر الرفیع فیاض جہاں ملکۂ دوراں حافظۂ قرآن قرۃ العین خلیفۃ الرحمن نواب قدسیہ القاب زیب النساء بیگم سلمہا اللہ تعالیٰ و ابقی اظلال رافتہا علی العالمین خصوصاً رسید حکم جہاں مطاع عالم مطیع شرف صدور و عز ورود بخشید کہ آں را مرتب و مہذب سازد تا بشرف مطالعہ لامعۂ طبع مشرق باشراقات انوار الٰہی مشرف شود، فان وقع فی حیز القبول فہو منتہی المقصود و اقصی المامول لہذا سمعاً وطاعۃً بانیان ایں امر و امتثال ایں حکم پرداختہ مہذب و مدوّن ساختہ، بہ بیانیہ موسوم نمود،،

اس نسخہ کی کتابت ۱۲۴۵ھ میں ہوئی ہے،

مصنف کے الفاظ "بسبب اشتغال بعض امور ما مورہ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو کوئی بادشاہی عہدہ بھی ملا ہوا تھا۔

(معارف مئی ۱۹۳۷ء)

(۵)

ملا خیر اللہ مہندس کے چند رسائل

اُستاد ملا احمد معمار جس نے لال قلعہ، جامع مسجد دہلی اور تاج محل کی عجائب روزگار عمارتیں تعمیر کی تھیں، اُس کے اور اُس کے فاضل نامور فرزندوں اور اخلاف کے احوال پر میں نے جو مقالہ کچھ سال پہلے ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور کے جلسہ میں پیش کیا تھا، اور جو بعد کو معارف میں چھپ کر شائع ہوا، وہ بظاہر اس قدر مکمل تھا کہ اس میں اضافہ کی گنجائش نہ تھی، لیکن چونکہ تلاش و تفحص کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس لئے اُن میں سے بعض کی کچھ اور تصنیفات دستیاب ہوئیں، اور اُن کی بنا پر اُن کے متعلق مزید معلومات کا اضافہ ہوا، چنانچہ مضمون مذکور کے چھپنے کے بعد ملا لطف اللہ مہندس کی تصانیف میں ایک نیا رسالہ بیانیہ ندوہ کے کتب خانہ[1] میں ملا جو فارسی زبان میں فصاحت و بلاغت کے فن میں مصنف نے شاہزادی زیب النساء کے لئے تصنیف کیا تھا، خیال آتا ہے کہ معارف میں اس پر ایک مختصر مضمون حوالۂ قلم ہو چکا ہے، ندوہ ہی کے کتب خانہ میں حُسن اتفاق سے لطف اللہ کے بیٹے مرزا خیر اللہ مہندس کے رسالوں کا ایک قلمی مجموعہ[2] کئی سال ہوئے نظر سے گذرا تھا، جس کی یادداشت اسی وقت میں نے لے لی تھی، لیکن اس کو مکمل اس لئے نہ کر سکا کہ دل و دماغ اب ان مباحث کی طرف راغب نہیں

---

[1] نواب صدیق حسن خان کی کتابوں میں [2] واحد علی سندیلوی کی کتابوں میں۔

اور طبیعت پر کوئی اور رنگ غالب ہوتا جارہا ہے، مگر ظاہر ہے کہ مدت کا چڑھا ہوا رنگ ایک دم زائل بھی نہیں ہوسکتا، چنانچہ ابھی ایک صاحب نے "مضامین سید سلیمان ندوی" کے نام سے میرے بیس پچیس مضمونوں کا ایک مجموعہ چھاپا ہے، اس میں یہ مقالہ نظر آیا، تو خیال ہوا کہ اس کا تتمہ بھی لکھ کر چھاپ دیا جائے، کہ تحقیق کا میدان ایک قدم اور وسیع ہو جائے

رصد خانۂ محمد شاہی کے نگراں ملا خیر اللہ ہندس کے رسائل کا یہ مجموعہ تین رسالوں پر مشتمل ہے، پہلا طب میں ہے، دوسرا تصوف میں، اور تیسرا نجوم میں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ مرزا موصوف نہ صرف ہندسہ اور تعمیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے، بلکہ وہ طبیب بھی تھے، صوفی بھی تھے، اور منجم بھی، اب ذیل میں تینوں رسالوں کا تھوڑا تھوڑا حال لکھا جاتا ہے،

۱۔ پہلے رسالہ کا نام السبع الثوابت ہے، یہ طب میں ہے، اور عربی زبان میں ہے، دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اُن کے کسی معاصر طبیب نے السبع السیارات کے نام سے سات مسئلوں کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا تھا، اسی لئے اس کا نام السبع السیارات رکھا تھا، مرزا خیر اللہ نے اس کے جواب میں السبع الثوابت کے نام سے یہ رسالہ لکھا ہے، رسالہ میں جن سات مسئلوں پر بحث ہے، وہ یہ ہیں: درد سر کی حقیقت، دوائے معتدل کے معنی، تبلغ اخلاط کی تعریف، اخلاط کی تعداد، مرکب اور مفرد اعضاء کے بیان میں، کھوپڑیوں کے کچھ حصہ میں کیا کھوکھلا پن ہے، اور طبعی عمر کی حقیقت،

رسالہ کی تالیف کی تاریخ سنہ ۱۱۱۹ھ لکھی ہے،

۲۔ دوسرے رسالہ کا نام الرسالۃ القدسیہ فی مذہب الصوفیہ الحقیقیہ ہے، یہ تصوف

لے پتہ :۔ شفیق احمد، سکونت کلاں، بہار شریف پٹنہ، اور محمد سلیمان اشرف نمبر ۶۸ بنیا پوکھر، روڈ، کلکتہ، نمبر ۱۴،

میں وحدۃ الوجود کی تحقیق میں ایک عربی رسالہ ہے، جس میں اس مسئلہ کے باب میں چند شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، رسالہ کی تاریخ تالیف ۱۱۵۰ھ ہے،

۳- تیسرے رسالہ کا نام مدخل ہے، یہ فارسی نظم میں نجوم کا رسالہ ہے، اس رسالہ سے ظاہر ہے کہ مرزا موصوف شاعر بھی تھے، اس رسالہ کے شروع میں، اس رسالہ کے نظم کرنے کے سبب میں اپنے خاندان کا کچھ حال لکھا ہے، جو درج ذیل ہے،

فی سبب نظم الرّسالۃ

بندۂ ذرہ وار خیر اللہ — کہ نہ دارد بہ اہلِ دنیا راہ
لیکن از محض فضلِ لطف و عطا — شاہ والا نژاد بحر سخا
بازوے داور زمین و زماں — وارثِ حاکم مکین و مکاں
مرشد فیض بخش، دیں پرور — قبلۂ اہلِ حق بلند اختر

دوسرے شعر میں "لطف و عطا" میں ایک خاص لطف ہے، لطف اللہ مہندس اس کے باپ کا، اور عطاء اللہ اُس کے چچا کا نام تھا،

تیسرے اور چوتھے شعروں میں غالبًا ولی عہد سلطنت یا کسی شہزادہ کے نام کی طرف اشارہ ہے، یہ نظم ۱۱۵۰ھ میں لکھی گئی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، یہ زمانہ محمد شاہ کا ہے، اس لئے اُس کے شاہزادوں میں سے کسی کی طرف اشارہ ہوگا، اس وقت اس کے شہزادوں کے نام پیشِ نظر نہیں، اس لئے تعین نہ کرسکا،

اس کے بعد ایک مختصر "باب فی معرفۃ اصل المؤلف والتاریخ" کے عنوان سے ہے، جس میں مؤلف نے اپنے بزرگوں کا حال بتایا ہے،

یہ ہندس شہیر در افواہ	والد این فقیر لطف اللہ
کسب این علم از پدر فرمود	نادر العصر آن کہ احمد بود
ہست از علم این حقیر نحیف	در ریاضی رسالہاے شریف
در ریاضی ہمین برادر من	چند تصنیف ہست در ہر فن
ہم ازین ذرہ دار تصنیفات	ہست کز رنج جہل دادنجات
در ہزار است و یک صد و پنجاہ	نظم این چند گوہر دلخواہ

پہلے شعر میں مصنف نے اپنے باپ لطف اللہ مہندس کا نام لیا ہے، دوسرے میں اپنے دادا نادر العصر احمد کا نام بتایا ہے، پھر اپنی اور اپنے بڑے بھائی کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، بڑے بھائی کا نام نہیں بتایا ہے، مگر مقالہ کے گذشتہ نمبر میں اس کا نام مذکور ہے یعنی ملا امام الدین مؤلف تصریح الافلاک،

اس مجموعہ کے آخر میں ہے،

"از تصانیف نادر العصر متکلم عالمیان مرزا ابوالخیر عرف خیر اللہ غفرلہ ذنبہ بقلمہ"

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط اسی کے دست و قلم کا ہے،

کل تصنیفات کی تاریخوں کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۲۵ھ سے ۱۱۶۵ھ تک تقریباً چالیس برس تک اس کا قلم مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تصنیف میں رواں رہا ہے، چنانچہ ذیل میں اس کی تصنیفات کے سنین لکھ دیئے جاتے ہیں،

۱-	الرسالۃ القدسیہ	۱۱۲۵ھ
۲-	السبع الثوابت	۱۱۱۹ھ
۳-	شرح زیج محمد شاہی	۱۱۴۰ھ کے بعد
۴-	مدخل فی النجوم	۱۱۵۰ھ
۵-	تقریب التحریر	۱۱۶۱ھ
۶-	حاشیہ شرح بست باب	۱۱۶۵ھ

اب تک تو ہمیں یہ معلوم تھا کہ یہ خاندان پہلے لاہور میں تھا، پھر یہ دلی چلا آیا لیکن اس مجموعہ میں مرزا خیر اللہ مہندس کے نام کے ساتھ بانگرموی لکھا ہے، بانگرمئو کا نپور کے پاس موجودہ ضلع اناؤ کے حدود میں ایک بستی ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ مرزا خیر اللہ کا تعلق بانگرمئو سے کیونکر پیدا ہوا، کیا یہ مان لیا جائے کہ دلی کے احمد شاہی یا نادر شاہی ہنگامہ سے گھبرا کر یہ پورب کے امن کے مقام میں چلا آیا تھا، مگر یہ بہت ہی مشکوک بات ہے،

امام الدین کا تتمہ امام الدین ریاضی بن ملا لطف اللہ مہندس بن ملا احمد معمار کی تصنیفات کے ذکر میں حاشیہ شرح چغمینی کا ذکر آیا ہے، امام الدین نے اپنی کتاب تصریح میں اپنے اس حاشیہ کا خود حوالہ دیا ہے (دیکھیے تصریح ص ۱۲ و ۲۴ مطبوعہ مجتبائی)

امام الدین نے تصریح میں (ص ۱۵ مجتبائی) اپنے ایک اور رسالہ کا نام لیا ہے جس کا ذکر گذشتہ مضمون میں نہیں آیا ہے، اور وہ اضافہ کے قابل ہے، زمین کے کروی ہونے پر زمین کی سطح پر بڑے بڑے اونچے پہاڑوں اور گہرے غاروں کی بنا پر اعتراض کیا گیا ہے، اس کے جواب میں محقق طوسی اور قطب شیرازی نے کہا ہے کہ دنیا کے بہت سے پہاڑ کی اونچائی کی نسبت زمین سے ایسی ہے، جیسے ایک ہاتھ کے کرے کے قطر کو جو کے عرض کے ساتویں حصہ سے، اس لئے وہ لحاظ کے قابل نہیں، محقق رومی نے شرح چغمینی کے حاشیہ میں جواب پر اعتراض کیا ہے، امام الدین نے اس کے جواب میں یہ رسالہ لکھا ہے،

(معارف ستمبر ۱۹۵۰ء)

قنوج

بعض عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے سندھ کے علاقہ میں ایک شہر کا نام قنوج بتایا ہے، ایک خیال تو یہ ہے کہ قنوج ایک ہی ہے، جو اودھ میں موجودہ کانپور کے پاس موجودہ فرخ آباد کے ضلع میں واقع ہے، اس کے علاوہ سندھ میں کوئی دوسرا قنوج نہ تھا، اور ان عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے جنھوں نے سندھ میں کسی قنوج کا ذکر کیا ہے، غلطی کی ہے، دوسرا خیال یہ ہے کہ ان جغرافیہ نویسوں نے سندھ میں ایک قنوج کا ذکر اس طرح متعین طور سے کئی دفعہ کیا ہے، کہ اس میں غلط بیانی کا گمان نہیں ہو سکتا،

ایلیٹ صاحب نے جب سے اُن عربی جغرافیوں کے اقتباسات انگریزی میں جمع کر دیئے ہیں جن میں سندھ کے قنوج کا بھی ذکر ہے، ہندوستان کے یورپین مورخوں نے بھی اس کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے، اور اس وقت سے یہ بحث الجھی ہوئی چلی آتی ہے، ونسنٹ اسمتھ صاحب نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جرنل جولائی ۱۹۰۸ء میں قنوج کی تاریخ پر ایک فاضلانہ مضمون لکھا ہے، اس میں بھی یہ غلط بحث موجود ہے، وہ فرق کے لئے سندھ کے شہر مذکور کا نام قِنّوج بہ کسر کاف و تشدید نون اور اودھ کے قنوج کو بفتح قاف و تخفیف نون لکھتے ہیں، بمبئی گزیٹیر میں قنوج سندھ کے حالات جو عربوں نے لکھے ہیں، وہ قنوج اودھ میں ملا دیئے گئے ہیں، راورٹی صاحب نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جرنل سنہ ۱۸۹۲ء میں گزیٹیر کی اس غلطی کی تصحیح کی ہے،

تاریخ ایسٹ کے محشی پروفیسر ڈوسن صاحب اس غلطی کو سمجھتے تھے، مگر وہ اُس کی تہ تک نہ پہونچ سکے "عرب و ہند کے تعلقات" لکھتے وقت میں بھی متردد تھا، اور اُس وقت سے ابتک اُس کی تحقیق میں لگا تھا، اتنی کاوش کے بعد اب حقیقت کی تصویر زیادہ صاف دکھائی دیتی ہے، اور یہی تصویر اب میں دوسروں کو دکھانا چاہتا ہوں، اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ عربی جغرافیوں اور تاریخوں کے اُن سارے حوالوں کو جن میں قنوج کا نام آیا ہے، ترتیب سے ایک جگہ کر دوں،

اشتباہ کی بڑی وجہ ابوزید سیرانی کا سفرنامہ ہے، جس نے تیسری صدی ہجری کے وسط میں لکھا ہے، (۲۶۴ھ)

وقوم یطھرون التخاییل و	اور کچھ لوگ نظر بندی اور شعبدہ بازی
ویبدعون فیھا ذالک	کرتے ہیں، اور اس میں نئی نئی باتیں
بقنوج خاصۃ وھُو بلدٌ	کرتے ہیں، اور یہ فن خاص طور سے
عظیم فی مملکۃ الجوز،	قنوج میں ہے، جو جوز کی سلطنت میں
(ص ۱۲۷)	میں بڑا شہر ہے،

اُس نے قنوج کو جوز میں قرار دیا ہے، جوز کوئی ملک نہ تھا، یہ کتاب ۱۸۱۱ء میں پیرس میں فرنچ ترجمہ کے ساتھ چھپی ہے، اڈیٹر نے اس کی دوسری قرأت "جزر" کی ہے، اور جزر کے بادشاہ کا نام بار بار اس کتاب میں آیا ہے، اس سے ادھر دھیان گیا کہ یہ جوز بھی جزر ہے، اور اس سے مراد صوبہ گجرات ہے،

پھر بشاری مقدسی نے ۳۷۵ھ میں اپنے سفرنامہ "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" میں سندھ کے سلسلہ میں قنوج کا نام لیا ہے، اور اُس کی کیفیت لکھی ہے، اور بتایا ہے کہ "اب اس شہر پر

مسلمانوں کا قبضہ ہے، یہاں جامع مسجد ہے، اور گوشت سستا بکتا ہے" ظاہر ہے کہ یہ وصف اودھ کے قنوج پر صادق نہیں آتا، اس لئے خیال ہوا کہ یہ قنوج نام کا دوسرا شہر تھا، جو سندھ میں واقع تھا، پھر چونکہ قنوج کا ذکر محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ کے سلسلہ میں بھی ۹۲ھ میں چچ نامہ میں آیا ہے، خیال ہوتا تھا کہ محمد بن قاسم کی نظر اودھ کے اس قنوج تک کہاں پہونچی ہوگی، جو سیکڑوں میل سندھ سے دور تھا، اس لئے اس سے مقصود قنوج نام سندھ ہی کی کوئی چھوٹی موٹی ریاست ہوگی، لیکن پوری تحقیق اور فکر و تلاش نے اب حقیقت کا پردہ چاک کردیا ہے،

علی بن حامد بن ابی بکر کوفی کی فتوح السند میں جس کے فارسی ترجمہ کا مشہور نام چچ نامہ (۶۱۳ھ) ہے، کئی جگہ قنوج کا نام اور ذکر آیا ہے، فتوح السند کی تالیف کی تاریخ نہیں معلوم ہے، لیکن اس کا یہ فارسی ترجمہ سلطان التمش کے حریف و ہمسر امیر قباچہ والی سندھ کے زمانہ میں ۶۱۳ھ میں کیا گیا ہے، ابھی تک گو اس کی عربی اصل اہلِ علم کو نہیں مل سکی ہے، لیکن اس کے طرز تحریر اور سلسلۂ روایت اور عربی اشعار سے یہ بات ثابت ہے کہ اصل کتاب پرانے زمانہ میں عربی میں لکھی گئی تھی، مترجم کو یہ عربی کتاب اچھ کے قاضی اسماعیل ابن علی بن موسیٰ ثقفی کے کتب خانہ میں ملی تھی، اس قسم کی فتوحات کی کتابیں عرب مصنفوں نے تیسری صدی ہجری یعنی نویں صدی عیسوی کے اوسط میں لکھی ہیں، چنانچہ فتوح البلدان کا مصنف احمد بلاذری بھی اسی زمانہ میں تھا، اس نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی ہے،

چچ نامہ میں قنوج کا نام تین دفعہ آیا ہے، پہلی دفعہ اس وقت آیا ہے جب سندھ میں چچ اور اس کے حریف اکھم میں لڑائی ہوتی ہے، اور اکھم شکست کھا کر رائے قنوج سے مدد طلب کرتا ہے،

" دران وقت ملک ہندوستان یعنی کنوج، سیار بن رائے بدل رائے بود،

اکنوں نوشتہا فرستادہ وازوے مدد خواست"

(ص ۱۹ نسخہ قلمی دارالمصنفین)

اس عبارت میں ہندوستان کی تعبیر کنوج سے کی گئی ہے، یعنی کنوج کے راجہ کو ہندوستان کا راجہ کہا گیا ہے، اس کے بعد سیوستان کا راجہ بھاگ کر قنوج کے راجہ کے پاس جاتا ہے،

"پس دستہ ملک سیوستان بنزدیک شاہ کنوج رفتہ بود ودران عہد ملک ہندوستان بارانسی بود و کنوج درتحت فرمان سیہرس بن راسل بود"

(چچ نامہ قلمی ص ۲۳)

بارانسی بنارس اور کنوج قنوج ہے، جس سے اس سلطنت کے مرکزی شہر معلوم ہوگئے، اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب سنہ ۹۲ھ میں محمد بن قاسم ثقفی سندھ کو فتح کرکے قنوج کی طرف توجہ کرتا ہے:۔

"پس ابوحکیم شیبانی را با دہ ہزار سوار بقنوج فرستاد تا مثال دار الخلافت بدعوت اسلام دمال وخزانہ بیت المال بروے عرض دارد و با وے بیعت کند، وخود با لشکر بر سرحد کشمیر کہ پنج ماہیات گویند بموضعے کہ پدر داہر چچ سیلائچ درخت صنوبر یعنی بید را نشان کردہ بود، وداع نمودہ بود، آنجا رسید وآں حد را بتجدید تعیین کردند راے قنوج دران وقت جیتل راے بود چوں لشکر باوداپور رسید، ابوحکیم شیبانی بفرمود تا زید ابن عمرالکلابی را بیاوردند، پس گفت اے زید! ترا برسالت راے ہرچند جیتل بباید رفت، وفرمان مطاوعت اسلام بدیشان رسانید وگفت کہ از دریاے محیط تا حد کشمیر راے ملوک کہ ہست تحت اقتدار وتمکین اسلام شد وامیر عماد الدین (محمد بن قاسم) والا لشکر کش عرب۔ کنندہ کفار است مطاوعت نمودند، وبعضے در ربقۂ اسلام آمدند

وباقی برخود مال تعین کردند تا بخزانہ دار الخلافت تسلیم کنند، راے ہر چند گفت و جواب داد

کہ ایں ولایت قریب یکہزار و شش صد سال است کہ در قبضۂ و تصرف ما است و در ایالت فرمان

ہیچ مخالفے را زہرہ نبودہ است کہ در ذیل حدود ما را بسپرد و با پیران مخاصمت انگیختہ

و در دست تصرف و تعرض در مملکت ما زوے، و از شما مارا چہ نہیب، کہ اینا مقالات محالات

کہ در خاطری اندیشی، (ص ۱۰۱)

اس عبارت میں پنج ماہیات کی اہمیت البیرونی کے خیال میں پنج ماریعنی پنج آب ہے

جس کو عربوں نے عموماً سرحد کشمیر قرار دیا ہے،

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ قنوج کی ایک مستقل مضبوط سلطنت تھی، جو سندھ سے

باہر ہندوستان میں تھی لیکن دونوں کی سرحدیں پنجاب میں ملتی تھیں، اور یہ بھی ثابت ہوا کہ محمد بن

قاسم ثقفی کے حملہ کے پہلے ہی سے ان دونوں سلطنتوں میں فوجی امداد و اعانت کے مراسم قائم

تھے یعنی سندھ کے راجہ قنوج کے راجہ سے کمک مانگا کرتے تھے، اس پہلو کو سامنے رکھکر قنوج

کی طرف محمد بن قاسم کی پیش قدمی کا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے،

سفرنامۂ ابوزید سیرافی موجود ۲۶۴ھ میں ہے،

وللهند عبّاد واهل علم يعرفون	اور ہندوستان کے عابدوں اور علم
بالبراهمة وشعراء يغشون الملوك	والوں کو برہمن کہتے ہیں، اور ہندوستان
ومنجمون وفلاسفة وكهان	میں شاعر ہیں، جو راجاؤں کے دربار
واهل زجر للغربان وغيرها	میں رہتے ہیں، اور منجم اور فلسفی، اور
وبها سحرة وقوم يظهرون	کاہن اور کوّوں وغیرہ سے فال
التخاييل ويبدعون فيه و	نکالنے والے اور اس میں جادوگر ہیں

ذٰلك بقنوج خاصّة وهُوَ	اور کچھ ایسے لوگ ہیں، جو نظر بندی اور
بلدٌ عظیمٌ فی مملکۃ الجوزر	شعبدہ بازی کرتے ہیں، اور اس میں
(ص ۱۲۶- پیرس)	نئی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں، اور یہ فن
	قنوج میں خاص کر ہے، جو جوز کی
	سلطنت میں بڑا شہر ہے،

اس کے بعد وہ عبارت آتی ہے جو غلط فہمی کا سب سے بڑا سبب ہے، یہ شامی سیاح بشاری مقدسی کا بیان ہے، یہ ۳۷۵ھ میں ملتان اور سندھ آیا تھا، اس نے اپنے سفرنامہ میں جس کا نام احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ہے، قنوج کا ذکر چار جگہ کیا ہے، اور ہر جگہ نیا مغالطہ پیدا کیا ہے، سب سے پہلے "اقلیم السند" کو پانچ بڑے صوبوں میں بانٹا ہے، اور اسی کے ساتھ مکران کا ایک نام اور بڑھا کر چھ کر دیا ہے، کہتا ہے،

فاولها من قبل کرمان مکران	سندھ کا آغاز کرمان کی طرف سے
ثمّ طوران ثمّ السند ثمّ ویهند	مکران ہے، پھر طوران، پھر سندھ
ثمّ قنوج ثمّ ملتان،	پھر ویہند، پھر قنوج پھر ملتان،
(ص ۴۷۴- لیڈن)	

شیراز میں ایک عالم سے جس نے ہندوستان کی سیاحت کی تھی، وہ ملا تھا، اس کی زبانی یہ بیان نقل کرتا ہے:-

واما قنوج فانها القصبة ایضاً	لیکن قنوج تو وہ بھی پایۂ تخت ہے، اور
ومن مدنها قدار، اباد، بهاره،	اس کے شہروں میں سے قدار، اباد،
بادد، وجلین، اودہ، زهوهر	بہارہ، بارد، وجلین[1]، اودھ، زہوہر،

---

[1] کیا لبادر، یعنی لاہور؟ [2] کیا اجین،

برهيروا، (ص ۴۷۷)	برہیرواہے،

وہند اور ملتان کے بیچ میں قنوج کی نسبت یہ لفاظی کرتا ہے،

قنوج قصبة كبيرة لها ربض	قنوج بڑا شہر ہے، اس میں حصار
ومدينة بها لحوم كثيرة	کی چار دیواری ہے، وہاں گوشت
ومياه غزيرة وبساتين	بہت، پانی بہت، باغ شہر کے ار د
محيطة ووجوه حسنة وماء	گرد، خوبصورت لوگ، پانی اچھا،
صحيح وبلد فسيح متجر ربيح	شہر کشادہ، تجارت نفع بخش، اور
وكل صبيح وموز رخيص إلا	ہر چیز اچھی، کیلے سستے، لیکن وہاں
أنها كثيرة الحريق قليلة	آگ بہت لگا کرتی ہے، آٹا کم پیدا
الدقيق، أكلهم الأرز ولبسهم	ہوتا ہے، اُن کی خوراک، چاول
الأزر وبناء خسيس وصيف	اور لباس دھوتی ہے، مکان بہت
بغيض، منها إلى الجبال أربعة	معمولی، اور گرمی بہت سخت، شہر سے
فراسخ والجامع في الربض	پہاڑ تک چار فرسنگ، اور جامع مسجد
رخيصة اللحم والنهر يتخلل	شہر پناہ کے اندر ہے، ..... دریا شہر
البلد، أكثر طعام المسلمين	کے اندر سے بہتا ہے، اور مسلمانوں کی
الحنطة وبها علماء وأجلة	خوراک گیہوں ہے، اور وہاں علما او
(ص ۴۸۰)	ر اکابر ہیں،

اس کے بعد قنوج کے متعلق اس کا آخری بیان یہ ہے،

والغلبة بقنوج وبيهند للكفار د	اور غلبہ قنوج اور ویہند میں ہندوؤں

للمسلمین سلطان علی سل تھا؛ کو ہے، اور مسلمانوں کا ایک حاکم

(ص ۴۸۵) الگ ہے،

ویہند کے متعلق یقینی طور سے معلوم ہے کہ وہ قندھار اور دریاے سندھ کے بیچ میں پشاور سے تین منزل جنوب میں واقع تھا، اور ایک سلطنت کی مستقل راجدھانی تھی، سلطان محمود نے سنہ ۳۹۲ھ میں پشاور لینے کے بعد اس کو فتح کیا تھا[1] بشاری نے ویہند کے بعد قنوج کو جگہ دی ہے، مگر اس سے مقصود شہر قنوج نہیں، بلکہ قنوج کی سلطنت ہے، جس کے کنارے پنجاب، سندھ، اور مالوہ تک پھیلے تھے، قنوج کے اندر جن شہروں کے نام شیراز کے ایک سیاح نے بشاری کو بتائے تھے، اُن میں ایک شہر کی صورت تو صاف ہے، یعنی اُجین جو ہمارا اجین (مالوہ) ہے، دوسرے شہر کی صورت کچھ دھندلی سی ہے، اور وہ ادرھت ہے، میرے خیال میں اس کی جگہ دہے یعنی اودھ یعنی اجودھیا یا ایودھیا جس کو مسلمانوں نے اودھ بنالیا تھا،

مشکلات کو حل کرنے کے لئے ایک بات صاف کرلینی چاہئے، پرانے ہندوستان میں راجدھانیوں کی بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، اور دائرۂ حکومت یا حدود سلطنت کے نام یا تو راجدھانیوں کے نام بعینہٖ رکھے یا پکارے گئے ہیں یا ان حکمران خاندانوں کے نام پر اُن کے نام رکھے گئے ہیں، اُن کی مثالیں پچھلی تاریخوں میں بھی ملتی ہیں، اور اب بھی تمام ریاستوں کے ناموں میں یہی طریقہ رائج ہے، اور بمبئی، مدراس، بنگال، اور بہار کی مثالیں انگریزی علاقوں میں پائی جاتی ہیں،

ایک بات اور ذہن میں رہے، بشاری بڑا محتاط سیاح ہے، اُس نے اپنا سفرنامہ بڑی احتیاط سے لکھا ہے، اس کی احتیاط ہی کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس نے ہندوستان کے حال میں صاف صاف لکھ دیا ہے، کہ باوجود لوگوں سے تحقیق اور دریافت کے میں ہندوستان کے وصف میں کمت

---

[1] گردیزی ص ۷۰ برلن

کی ذمہ داری نہیں لیتا، کہتا ہے،

ومع ھذا فلا اضمن عن وصفه — باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کے

ما اضمن من غیرہ ولا اصف — بیان کی ذمہ داری نہیں لیتا، جو اس

الا امصارہ ولا استقصی — کے علاوہ دوسرے ملکوں کی لیتا ہوں

فی شرحه لما روی کفی — اور میں صرف اس کے شہروں کا حال

بالمرء کذبا ان یحدث بکل — بیان کرتا ہوں، اور اس کی ساری

ما سمع ولقوله صلعم لیس — تشریح نہیں کرتا، کیونکہ حدیث میں

الخبر کالمعاینة ولولا — ہے کہ انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے

خشیة ان یختل ھذا الاصل — یہ کافی ہے کہ جو کچھ سنے وہ بیان کردے

ویبقی من الاسلام صدر — اور اس لئے کہ سننا دیکھنے کے مانند

لاعرضنا من الکلام فیه — نہیں، اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ یہ اصل

(ص ۴۷۵) — یعنی اسلامی ملکوں میں سے کسی کا

حال چھوٹنے نہ پائے ٹوٹ جائیگی

تو میں ہندوستان کا بیان چھوڑ دیتا

اس ملک کے جغرافی بیان کے متعلق اس نے تصریح کی ہے کہ اس کو اصطخری فارسی کے جغرافیہ سے نقل کیا ہے، (ص ۵،۴) یا دوسرے سیاحوں سے سن کر اور پوچھ کر لکھا ہے، اس لئے قنوج کی جائے وقوع کی نسبت اس کا بیان اعتبار سے خارج ہے،

مگر اتنا صحیح ہے کہ تیسری صدی کے خاتمہ پر عرب جہازرانوں کے کانوں تک قنوج کا نام پہونچ چکا تھا، بزرگ بن شہریار نا خدا جو تیسری صدی کے خاتمہ پر تھا، قنوج کا نام لیتا ہوا

ایک عرب سیاح کی زبانی بیان کرتا ہے:-

ان بقنوج من بلدان الہند	ہندوستان کے شہروں میں قنوج
من تاخذ الفوفلۃ بین شفریھا	میں ایسے لوگ ہیں، جو ڈلی کو اپنے دونوں
فتکسرھا قطعًا من شدۃ	ہونٹوں میں لے کر اس زور سے دباتے
ماتضغطھا،	ہیں کہ وہ ٹوٹ جاتی ہے،

(عجائب الہند ص ۲)

سنہ ۳۰۳ھ میں مسعودی ہندوستان آیا، اس نے گو یہ غلطی کی ہے کہ قنوج کے راجہ کو سندھ کے بادشاہوں میں شمار کیا ہے، مگر اس کی توجیہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں قنوج کی سلطنت سندھ تک تھی، اس لئے قنوج کے راجہ کو سندھ کے راجاؤں میں شمار کیا ہے؛ اس ایک بات کے علاوہ مسعودی کا سارا بیان بہت کچھ غلط فہمیوں کو دور کرنے والا ہے،

مسعودی نے قنوج کا ذکر تین موقعوں پر کیا ہے، پہلے باب (ص ۸۰، ۱) میں ہے،

ونیاویہ (بلھرا) من ملوک	اور وہ بلہرا کا حریف
الہند ممن لا بحرلہ بُؤدرہ	ہندوستانی راجاؤں میں سے جس کے
صاحب مدینۃ القنوج وھذا	پاس سمندر نہیں، بورہ قنوج کا راجہ ہے،
الاسم سمۃ لکل ملک یلی	اور یہ بورہ لقب ہر اس راجہ کا ہوتا ہے
ھذہ المملکۃ ولہ جیوش	جو اس ملک پر راج کرتا ہے، اور اس
مرتبۃ علی الشمال والجنوب	کی فوجیں اتر، دکھن، پورب اور پچھم
والصبا والدبور لانہ من	ہر رخ پر رہتی ہیں؛ کیونکہ ہر رخ پر اس
کل وجہ من ھذہ الوجوہ	کے اس سے کوئی نہ کوئی لڑنے والا ہے،

یلقاہ ملک محاب لہٗ،

(طبیع لیڈن)

یہ بورہ عجب نہیں کہ بھوج رائے کا عربی تلفظ ہو جو قنوج کے مشہور راجہ بھوج رائے کے بعد یہاں کے راجاؤں کا موروثی لقب قرار پاگیا تھا،

اس کے بعد مسعودی[1] قنوج کا دوبارہ ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے،

ملک قنوج بن ملوک السند بوؤرۃ	سندھ کے راجاؤں میں سے ایک قنوج
ھذا الاسم کل ملک یلی القنوج	کا راجہ بورہ ہے، اور یہ بورہ ہر اُس راجہ
وھناک مدینۃ یقال لھا بوؤرۃ	کا لقب ہے، جو قنوج پر راج کرے اور
باسم ملوکھم وقد صارت	یہاں ایک شہر بھی اسی کے نام سے ہے
الیوم فی حیز الاسلام وھی	جس کا نام بورہ، وہاں کے راجاؤں کے
من اعمال المولتان ومن	نام سے ہے، اور وہ آج کل اسلام کی
ھذہ المدینۃ یخرج احد	حکومت میں داخل ہے، اور وہ ملتان
الانھار التی اذا اجتمعت کانت	کے علاقوں میں شامل ہے، اور اسی شہر
نھر مھران السند ...... وبوؤرۃ	سے ان دریاؤں میں سے ایک دریا
ھذا الذی ھو ملک القنوج ھو	نکلتا ہے، جن کے مل جانے سے دریائے
ضد . البلھرای ملک الھند	سندھ بنتا ہے، ....
	اور یہ بورہ جو قنوج کا راجہ ہے، وہ ہندوستان
	کے راجہ بلہرا کا مخالف ہے،

---

[1] ص ۳۷۲ جلد اول لائیڈن،

مسعودی کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ قنوج کی سلطنت سندھ سے ملی تھی، اور سندھ کا علاقہ مسعودی کے بیان کے مطابق کشمیر سے ملا ہوا تھا، (ص ۴، ۳) گویا پنجاب کا علاقہ بھی سندھ ہی میں شمار ہوتا تھا، اب وہ کہتا ہے کہ یہاں یعنی سندھ کے پاس اس راجہ کے نام بھوج رائے کے نام سے ایک شہر بھی آباد تھا، یعنی اس کا نام بھی بھوج رائے ہے، اور یہ اُن پانچ دریاؤں میں سے کسی ایک کے دہانے پر واقع ہے، جن سے مل کر دریائے سندھ بنتا ہے، ان پانچ دریاؤں میں سے ہر ایک دریا موجودہ پنجاب میں ملتا ہے، اس سے ظاہر ہے، کہ وہ موجودہ پنجاب میں دریائے ستلج کے کنارے جو ہندوستان خاص اور پنجاب کی طبعی سرحد ہے کہیں بستا ہوگا، اور وہ بھوج رائے یا قنوج کی سلطنت کا اس سمت میں آخری شہر ہوگا، اور اس لئے وہ حکمراں خاندان کے نام پر بھوج رائے اور راج دھانی کی حکومت کی نسبت سے قنوج کہلاتا ہوگا، جیسے آج بھی حیدرآباد، میسور، بڑودہ، بھوپال، رام پور وغیرہ ہماری ہندوستانی ریاستوں کا ہر شہر، اس کے والی یا اس کے پایۂ تخت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس سے بشاری مقدسی کے اس بیان کی مشکل کہ سندھ کے شہروں میں سے ایک کا نام قنوج ہے حل ہو جاتی ہے، اور قنوج میں مسلمانوں کی آبادی، جامع مسجد، اور گوشت کی کثرت کی توجیہ بھی ہو جاتی ہے، کیونکہ مسعودی کے بیان کے مطابق ۳۰۰ھ میں یہ شہر ملتان کی اسلامی عمل داری میں داخل ہو چکا تھا،

مسعودی کے دوسرے بیان سے ہمارا خیال اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے، وہ قنوج کی سرحدوں کا حال یہ بتاتا ہے:

فاما مملکۃ بؤودہ وھو ملک	لیکن بورہ کا راج، اور وہ قنوج کا
القنوج فان مسافۃ مملکتہ	راجہ ہے، تو اس کے راج کی وسعت
نحو من عشرین ومائۃ فرسخ	ایک سو بیس فرسنگ لمبائی میں، اور

في مثلها فراسخ سندية الفرسخ
ثمانية اميال بهذا الميل وهذا
الملك الذي قدّمنا ذكره
فيما سلف ان له جيوشاً اربعة
على مهاب الرياح الاربع كل
جيش سبع مائة الف وقيل
تسع مائة الف فيحارب بجيش
الشمال صاحب المولتان ومن
معه في ذالك الثغر من المسلمين
ويحارب بجيش الجنوب البلهرى
ملك المانكير وبالجيوش الباقية
من يلقاه من كل وجه من
الملوك ويقال ان ملكه يحيط
في معمّر ما ذكرنا من المسافة
من المدن والقرى والضياع
مما يدركه الاحصاء والعدد
الف الف وثمانية مائة الف قرية
بين اشجار وانهار وجبال ومروج
(ص ۴، ۳)

اتنی ہی چوڑائی میں سندھی فرسخ سے ایک
فرسنگ اس میل سے ۸ میل کے برابر ہے،
اور یہ راجہ جس کا میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں
کہ اس کی چار فوجیں ہوا کے چاروں رُخ
پر ہیں، ہر فوج کی تعداد سات لاکھ اور
کہتے ہیں کہ ۹ لاکھ ہے تو وہ اتر کی فوج
سے ملتان کے امیر اور جو اس کے ساتھ
اس سرحد میں مسلمان ہیں، اُن سے
لڑتا ہے، اور دکھن کے لشکر سے وہ
راے مانکیرہ کے راجہ سے مقابلہ
کرتا ہے، اور باقی فوجوں سے جس طرف
سے کوئی حملہ آور آئے، اُس کا سامنا
کرتا ہے، اور کہتے ہیں، کہ اس کی
سلطنت کی اُس وسعت میں جس
کا ذکر میں نے کیا، شہر، گاؤں،
دیہات کی تعداد، جو گنتی میں آئی
ہے، اٹھارہ لاکھ ہے، درختوں کے جھنڈ
اور دریاؤں اور پہاڑوں اور سرسبز میدانوں
کے درمیان،

بلہرا تو معلوم ہو چکا ہے کہ شمالی گجرات وکاٹھیا واڑ کا راجہ ولبھ راے ہے، اور مانکیر جو کبھی مہا نگر سمجھا جاتا تھا اب مان کھیڑ ہے، جو ولبھ راے کی راج دھانی تھی، اور جو موجودہ پونہ کے قریب تھا، اب عرب سیاحوں کے قنوج راج کی دو حدیں معلوم ہوگئیں، یعنی اتر کی سمت میں وہ ملتان کی حکومت سے مل جاتا تھا، اور دکھن میں ولبھ راے کی سلطنت سے، اور اس کی وسعت میں اٹھارہ لاکھ شہر اور دیہات آباد تھے، جن میں جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں اور سرسبز میدانوں کے سلسلے تھے،

ابن حوقل بغدادی اوسی زمانہ کا مشہور سیاح ہے، اوس نے ۳۳۱ھ / ۹۴۳ء میں بغداد سے اپنا سفر شروع کیا، اور ہندوستان آیا، اوس نے اپنی کتاب میں چار دفعہ قنوج کا نام لیا ہے (ص ۱۴، ۱۶، ص ۲۲، و ۲۸۶ میں)

عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں میں یہی سب سے پہلا شخص ہے، جس نے قنوج کو مملکت ہند کا پایہ تخت بتایا ہے، ص ۱۴، اور ص ۱۶ میں اوس نے ہندوستان کی لمبائی اور چوڑائی لکھی ہے اور بتایا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین کی لمبائی مکران (بلوچستان) سے شروع ہو کر (منصورہ) اور سندھ ہوتے ہوئے قنوج تک، اور پھر اس کے آگے بڑھ کر تبت تک چار مہینوں کا راستہ ہے' (ص ۱۶)

اس بیان سے واضح ہوگیا کہ شہر قنوج مکران یعنی بلوچستان سے تبت اور کوہ ہمالیہ کی سمت میں کئی مہینوں کے راستہ پر واقع تھا، اور ظاہر ہے کہ یہ شہر سندھ کے اندر نہیں تھا، بلکہ وہ لامحالہ وہی قنوج تھا جس کو ہم اب بھی قریب قریب اسی مسافت پر جانتے اور پہچانتے ہیں،

ابن حوقل ص ۲۲ میں تیسری دفعہ قنوج کا نام لیتا ہے، اور کہتا ہے کہ

وھذہ مدن الھند التی عرفتھا ۔۔۔ اور یہ ہندوستان کے وہ شہر ہیں جن کو

دلیھا بواطن واماکن کفرزان	میں نے جانا اور اس کے اندرونی
وقنوج فی المفاوز وھی کلمطہ	مقامات ہیں، جیسے فرزان، اور قنوج
دادھشت فی اقطار نائیۃ ؤ	جنگلوں اور صحراؤں میں اور وملطہ
اماکن سحیقۃ لا یصل الیھا	کی طرح اور بڑے بڑے دور اطراف
تاجر الا من اھلھا لانقطاعہا	اور بعید مقامات ہیں، جہاں وہاں
وکثرۃ الآفات المقطعۃ	کے باشندوں کے سوا کوئی تاجر نہیں
لقاصدھا،	پہنچ سکتا، کہ وہاں کے جانے والوں
	کو بڑی بڑی آفتوں کا سامنا
	کرنا پڑتا ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ قنوج سندھ سے اتنی دور اور جنگلوں اور صحراؤں کے اندر واقع تھا، کہ مسلمان تاجر وہاں تک پہنچ نہیں سکتا تھا،

ابن حوقل نے ص ۲۰۰ پر آخری دفعہ قنوج کا ذکر کیا ہے،

اصطخری سنہ ۳۴۰ھ میں ہندوستان آیا تھا اس نے اپنی کتاب مسالک الممالک میں اپنے پیش روں اور ہم عصروں کی فیاضی سے فائدہ اٹھایا ہے، اوس نے قنوج کا بیان تقریباً ابن حوقل سے لیا ہے، چنانچہ قنوج کا نام دو دفعہ لیا ہے، ایک دفعہ وہ دنیا کی سلطنتوں کے مشہور دار السلطنتوں کے سلسلہ میں کہتا ہے،

ومملکۃ الھند منسوبۃ الی	اور ہندستان کی سلطنت اوس
الملک المقیم بقنوج،	راجہ کی طرف منسوب ہے، جو قنوج
(ص ۹ لائیڈن)	میں رہتا ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں قنوج راج کی اہمیت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ملک ہند کا پایۂ تخت اکیلے اسی کو بتایا جا رہا ہے، آگے بڑھ کر مصنف دنیا کے ملکوں کی مسافت اور پھیلاؤ کا حال لکھتا ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان کا نام لے کر کہتا ہے،

واما ارض الهند فان طولها	لیکن ہندوستان کا ملک تو اس کا طول
من عمل مكران فی ارض المنصورة	منصورہ اور بدھ اور باقی سرزمین سندھ
والبدهة و سائر بلاد السند	میں مکران کی عملداری سے شروع ہوکر
الی ان تنتهی الی قنوج ثم	قنوج پر ختم ہوتا ہے، پھر اس سے آگے
تجوزه الی ارض التبت نحو	بڑھ کر تبت تک چار مہینوں کی راہ ہے
من اربعة اشهر وعرضها من	اور اس کا عرض بحر فارس سے قنوج
بحر فارس علی ارض قنوج نحو من	کے ملک تک تین مہینوں کی راہ،
ثلاثة اشهر، (ص ۱۱)	

یہ وہی ابن حوقل کی آواز بازگشت ہے، اور اس نے بھی قنوج کی مسافت وہی لکھی ہے،

۳۷۲ھ میں گورگانان واقع ترکستان قریب فاریاب میں بیٹھ کر ایک مصنف نے حدود العالم من المشرق الی المغرب کے نام سے فارسی میں دنیا کا ایک جغرافیہ لکھا تھا، ۱۹۳۰ء میں یہ کتاب لینن گراڈ روس میں چھاپی گئی تھی اب ۱۳۵۲ھ میں طہران میں دوبارہ چھپی، یہی نسخہ میرے پیش نظر ہے، اس میں صوبہ سرحد اور پنجاب کے شہروں کے متعلق بعض معلومات بالکل نئے ہیں، مصنف کا نام گو معلوم نہیں، مگر چونکہ ترکستان اور ہندوستان کی تجارتی آمد و رفت برابر قائم تھی، اس لئے یہ معلومات تاجروں کی زبانی مصنف کو حاصل ہوئے ہوں گے،

میرے علم میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں لاہور اور جالندھر کا نام آیا ہے، اور قنوج کے متعلق

بھی بعض نئے بیانات اس میں پائے جاتے ہیں، گجرات اور کاٹھیاوار کے شہروں کے نام لیکر کہتا ہے:

"واندریں ہمہ پادشاہ بلہراسیت وازپس ایں پادشاہ قنوج است...... قنوج شہرے بزرگ ست ومستقر رائے قنوج است...... وبیشتر از ملوک ہند طاعت او دارند وایں رائے ہنتراز خویشتن کس را نہ بیند وگویند کہ اورا صد وپنجاہ ہزار سوارات و ہشت صد پیل کہ بروز حرب برنشیند" (ص ۴۳) لہور شہریست با ناحیت بسیار و سلطانش از دستِ امیر ملتان است، واندرو بازارہا وبتخانہا است واندرو درخت چلغوزہ و بادام و جوز ہندی بسیار است وہمہ بت پرستند واندروے ہیچ مسلمان نیست، رامیان شہرے است بر سر تلے عظیم، واندروے اندکے مسلمانان اند وایشان را سالاری خوانند، ودیگر ہمہ بت پرستان اند، وآنجا بردۂ ہندو وجاز ہندوستان افتد بسیار وسلطان وے از قبل امیر مولتان است...... جالندھر شہریست بر سر کوے اندر سرد سیر واز وے جامہا بسیار خیزد سادہ ومنقش واندر میان رامیان وجالندھر پنج روز راہ است وہمہ راہ درختان ہلیلہ وبلیلہ وآملہ وداروہا است کہ ہمہ جہاں ببرند وایں شہر از حدود رائے قنوج است ...سلابور شہرے بزرگ است با بازارہا وبازرگانان و خواستہا و پادشاہ ازاں رائے قنوج است، ودرمہائے ایشاں گوناگون است کہ داد وستد ایشاں بدوست...... وہر یکے را وزنے دیگر است واندر بت خانہائے بسیار است، ودانشمندان ایشاں برہمن اند...... برھیون شہریست چوں رباطے و ہر سالے اندروے چہار روز بازار تیز باشد واز آنجا بقنوج نزدیکست حدود رایست واندروے سی صد بتخانہ است واندروے آبے است کہ گویند کہ ہر کہ خویشتن را بداں آب بشوید، ہیچ آفتش نرسد وہر گہ کہ بہترے از ایشاں بمیرد، وہمہ کہترے کہ اندر

سایۂ او باشند خویشتن بکشند و پادشاہ ایں شہر بر تخت نشیند و ہر جا کہ دو آن تخت را برکتفہا ہمی برند بسے مرد تا آنجا کہ او خواہد، میانِ ایں شہر و تبت مقدار بیخ روزہ راہ است اندر عقبہاے سخت، ہیتال ناحیتے است بہ نزدیکی قنوج میان شان کوہ عظیم و ناحیتے خرد است ولکن مردمان جنگی و مبارز و پادشاہے او از ملوک اطراف است و میان راے قنوج دشمنیست ....

دہہند (و ہیند) شہرے بزرگ ست و پادشاہے وے جیپال (جیپال) است و ایں جیپال اندر طاعت راے قنوج است، و اندر و مسلمان اند اندک و جاز ہاے ہندوستان بیشتر بدیں ناحیت افتد، از مشک و گوہر جامہاے باقیمت، قشمیر شہرے بزرگ است بانعمت و بازرگانان بسیار و پادشاہ وے راے قنوج راست و اندر وے بتخانہاے بسیار است کہ ہندوان آنجا بزیارت آیند،

(از صفحہ ۴۳ تا ۴۹ حدود العالم، طہران)

حدود العالم کی ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اُس زمانہ میں یعنی ۳۷۲ھ میں قنوج کی حکومت دکھن کی طرف ولبہ راے کی حدود حکومت سے جاکر ملتی تھی، اور اتر طرف پنجاب کے شہر جالندھر سے گذر کر لاہور سے کترا کر کشمیر اور موجودہ سرحدی شہروں تک پہنچ کر وہیند پر جاکر ختم ہوتی تھی، لاہور کا ہندو راجہ اُس زمانہ میں ملتان کے مسلمان امیر کا ماتحت تھا، غرض قنوج اور سندھ کی سرحدیں پنجاب میں آکر مل جاتی تھیں، اس کے علاوہ کوئی دوسرا قنوج نہ تھا، اور اس کے جس مقدس دریا کا ذکر ہے، وہ یقیناً گنگا ہے جس کے ساحل پر قنوج آباد تھا،

مصر کے فاطمی وزیر مہلبی نے تقریباً ۳۸۶ھ میں جغرافیہ کی کتاب "عزیزی" لکھی ہے، اور

اور چونکہ اس زمانہ میں سندھ کی ریاستیں مصری فاطمیوں کی نگرانی میں داخل ہو چکی تھیں، اور مصر اور سندھ کے درمیان برابر سفیر آتے جاتے رہتے تھے، اس لئے اس کو قنوج کی پوری واقفیت تھی وہ کہتا ہے،

قنوج ہندوستان کے دور ترین شہروں میں ہے، ملتان کے پورب ہے، ملتان اور قنوج کے بیچ میں دو سو بیاسی فرسنگ کی مسافت ہے، اور وہ ہندوستان کا پایۂ تخت اور سب سے بڑا شہر ہے، لوگوں نے اس کا حال بیان کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیا ہے کہتے ہیں کہ اس میں جوہریوں کے تین سو بازار ہیں، اور اس کے راجہ کے قبضہ میں ڈھائی ہزار ہاتھی ہیں، ان میں سونے کی کانیں بھی ہیں[۵]

اب اس کے بعد غزنوی دور شروع ہو جاتا ہے، اور سبکتگین اور پھر محمود غزنوی کے حملے ہندوستان پر پے در پے ہونے لگتے ہیں، اس سلسلہ میں قنوج نام کا کوئی شہر پنجاب یا سندھ کے علاقہ میں نہیں آتا، اور نہ اس کا کوئی ذکر کسی طرح ہوتا ہے، البتہ اودھ کے مشہور قنوج کا نام بار بار آتا ہے یہاں تک کہ ۴۰۹ھ میں محمود اس کو فتح کر لیتا ہے، ابوریحان البیرونی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا، کتاب الہند میں قنوج کا ذکر بار بار کیا ہے، مگر اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قنوج سے کون شہر مقصود ہے، اور وہ کہاں تھا،

ص ۱۱ میں محمد بن قاسم والے قنوج کا نام وہ اس طرح لیتا ہے،

لما دخل محمد بن قاسم ارض	جب محمد بن قاسم سندھ کی سرزمین میں
السند من نواحی سجستان	سیستان کی طرف سے آیا، اور شہر
وافتتح بلد بمہنوا وسماہ منصورۃ	بمہنوا کو فتح کیا، اور اس کا نام منصورہ
وبلد مولتان وسماہ معمورۃ	رکھا، اور مولتان کو فتح کر کے اس کو

[۵] تقویم البلدان ابوالفداء ص ۳۰۰ (پیرس)

واوغل فی بلاد الهند الی مدینة کنوج و وطئ ارض القندهار وحل دد کشمیر	معورہ کے نام سے موسوم کیا، اور ہندوستان کے شہروں میں کنوج تک چلا گیا، اور قندھار کے ملک اور کشمیر کے حدود تک پہنچا،

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی مراد وہی کنوج یا قنوج ہے، جس کا ذکر اس نے بارہا کیا ہے، ص ۲۰۸ میں وہ کہتا ہے،

ثم یستعمل فی مدّدیش اعنی واسطة المملکة وهی ماحول قنوج فی جهاته ویسمی ایضًا ادجاوت	پھر مددیش یعنی بیچ کے ملک میں اور وہ قنوج کے چاروں طرف کے شہر ہیں، اور ان کو آریہ ورت بھی کہتے ہیں،

ص ۹۷ میں ہے:-

ویسمونها مددیش ای واسطة الممالک وذلک من جهة المکان لانها فیما بین البحر والجبل وفیما بین الحر والصرد وفیما بین حدیها الشرقی والغربی ومن جهة الملک فقد کان کنوج مسکن عظمائهم الجبابرة الفراعنة ...... وبلد کنوج موضوع علی غرب نهر گنگ	اور اس کا نام مددیش یعنی بیچ کا ملک ہے، اور یہ نام اس کی جائے وقوع کے لحاظ سے ہے، کیونکہ وہ دریا اور پہاڑ کے بیچ میں، اور گرم اور سرد ملکوں کے درمیان میں، اور اس کے مشرقی اور مغربی حدود کے وسط میں، اور بادشاہی کے لحاظ سے تو کنوج اُن کے بڑے بڑے جبروت والے راجاؤں کا مسکن ہے،...... اور شہر کنوج دریائے گنگا کے

کبیرجداً واکثرہا الآن خراب	مغربی کنارہ پر ہے، بہت بڑا شہر تھا،
معطل لزوال مقر الملک عنہ	لیکن اس وقت اس کا بڑا حصہ ویران
الیٰ بلد باری وھو فی شرق	ہے، کیونکہ پایۂ تخت وہاں سے ہٹ کر
گنگ وبینھما مسیرۃ ثلثۃ	اب شہر باری میں آگیا ہے، جو گنگا
ایام او اربعۃ،	کے پوربی کنارہ پر ہے، اوران دونوں
	کے بیچ میں تین یا چار دن کی راہ ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ قنوج راج، مدھ دیش یعنی بیچ کا ملک تھا، اس کا دوسرا نام آرجا فرت یعنی آریہ ورت تھا، اور شہر قنوج گنگا کے مغربی ساحل پر تھا، جو اب محمود کے حملہ کے بعد ویران تھا،

۳۶۷ھ سے غزنوی بادشاہوں اور ہندوستان کے راجاؤں میں صلح و جنگ کے تعلقات شروع ہوتے ہیں، ۳۶۷ھ میں سبکتگین نے ہندوستان کے سرحدی شہروں پر حملہ کیا، اور شاہیہ خاندان کے حکمرانوں سے اس کا واسطہ پڑا، سبکتگین کے بیٹے محمود نے ۳۹۹ھ میں اجین، گوالیار، کالنجر، دہلی، اجمیر، اور قنوج کے راجاؤں کی متحدہ فوجوں کو شکست دے کر شاہیہ کا خاتمہ کر دیا، اور اس کے چند سال کے بعد ۴۰۹ھ میں قنوج تک پہونچ گیا، راجہ نے صلح کی، اور اپنا پایۂ تخت قنوج سے اٹھا کر گنگا کے شرقی کنارہ پر جا کر بسایا، اور باری اس کا نام رکھا، اسی زمانہ کے مسلمان مصنف عبد القادر بغدادی المتوفی ۴۲۹ھ نے اپنی کتاب الفرق بین الفرق میں فخریہ لکھا کہ "اب بحمد اللہ ملتان سے لیکر قنوج تک اسلام کی عملداری ہے"[۱]،

ہمارے بعض بزرگوں نے تو قنوج کو اتنا پرانا بتایا ہے کہ سکندر کے زمانہ میں موجود تھا، اور راجہ پورس جس نے سکندر کا مقابلہ کیا تھا، وہ یہیں کا راجہ تھا، جیسا کہ سکندر نامہ میں کہتے ہیں :۔

---

[۱] ص ۲۷۲،

بقنوج خواہم شدن سوے خور　　　خدایا بودم دراں راہ دور

حالانکہ قنوج سکندر کے وقت میں تھا ہی نہیں، البتہ نظامی کے زمانہ میں وہ ہندوستان کا مرکز دوبارہ بن گیا تھا، سکندر نامہ ۵۸۴ھ میں لکھا گیا ہے، اور اس کے چھ برس بعد ۵۹۰ھ میں شہاب الدین غوری نے قنوج کو دوبارہ فتح کیا ہے،

قنوج کی تاریخ کے واقف کار جانتے ہیں، کہ قنوج پر تین مختلف دور گذرے ہیں، اس کا نام تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ چھٹی صدی عیسوی میں آتا ہے، ۶۰۶ء سے ۶۴۷ء تک یہاں کا مشہور راجہ ہرش شمالی ہند کا سب سے بڑا طاقت ور بدھ راجہ گذرا ہے،

محمد بن قاسم نے سندھ پر ۷۱۱ء (مطابق ۹۲ھ) میں حملہ کیا، اور ۷۱۲ء میں پورے سندھ پر قبضہ کرلیا، اس لئے محمد بن قاسم نے قنوج کے جس راجہ سے خط و کتابت کی، اور حملہ کی دھمکی دی، وہ راجہ ہرش کے سلسلہ کا راجہ ہوگا، چچ نامہ میں اسی عہد کے قنوج کے چند راجاؤں کے نام آئے ہیں، پہلا سیار بن رائے بدل رائے، دوسرا سیہرس بن راسل اور تیسرا ہرچند رجیتل رائے، محمد بن قاسم نے اس آخری راجہ کو خط لکھ کر اسلام کی دعوت دی تھی،

راجہ ہرش کے بعد کے راجاؤں کے نام تاریخ ہند کے صفحات سے گم ہیں، اس لئے یہ نام ان خالی جگہوں کے بھرنے کے لئے کام میں آسکتے ہیں، البتہ ناموں کی تصحیح کا مرحلہ باقی رہ جائے گا،

اب اس کے بعد ۸۱۶ء کے قریب بھیلمان کے گرجر پرتھار قوم کے راجہ ناگ بھٹ نے قنوج فتح کرلیا، اور کئی صدیوں تک اس کی اولاد اس پر حکمراں رہی، اس کا پوتا بھوج رائے ہوا جس نے ۸۴۰ء (۲۲۵ھ) سے ۸۹۰ء (۲۷۷ھ) تک قنوج پر حکومت کی،[۱] اور یہی وہ راجہ ہے جس کا نام عربوں

۱؎ قدیم تاریخ ہند ونسنٹ اسمتھ ترجمہ جامعہ عثمانیہ ص ۲۷۵،

نے بورہ رکھا ہے،

ابوزید سیرانی نے جو ۲۶۶ھ میں تھا، قنوج کے متعلق جو فقرہ لکھا ہے اس کی دو قرائتیں ہیں، ایک وھو بلد عظیم فی مملکۃ الجوز، اور دوسری فی مملکۃ الجزر، ایک صاحب کی رائے ہے الجوز کو الحوز پڑھا جائے، اور اس کو بھوج کا عربی تلفظ قرار دیا جائے، کیونکہ یہ زمانہ قنوج میں بھوج کی حکومت کا تھا، میری رائے میں اگر جزر پڑھا جائے اور اس سے گوجر مراد لیا جائے تو بھی صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ راجہ گرجر پرتھار تھے، جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے،

بہرحال اس کے بعد مسعودی نے ۳۰۰ھ ۹۱۲ قنوج کے راجہ کو بورہ یعنی بھوج رائے کے نام سے یاد کیا ہے، بھوج اول کے بعد مہندر پال نے اور اس کے بعد اس کے بڑے بیٹے بھوج دوم نے چند سال ۹۱۰ء تک سلطنت کی، اور ۹۱۰ء سے ۹۴۰ء تک بھوج دوم کے بیٹے مہیپال نے حکومت کی، مگر عربوں نے ان سب کو بھوج رائے ہی کہا،

قنوج کا راجہ راجیہ پال جس کو سلطان محمود سے پالا پڑا، اسی نسل کا راجہ تھا جس کو عتبی نے غلطی سے رائے جےپال لکھا ہے[۱]،

۱۰۹۰ء سے کچھ پہلے قنوج کے یہ گرجر پرتھار راجہ ختم ہو گئے، اور گھرواڑ قبیلہ کے راجہ چندر دیو نے قنوج کو فتح کر کے نیا راج کھڑا کیا، ۵۹۰ھ ۱۱۹۴ میں سلطان شہاب الدین غوری نے جس راجہ سے لڑ کر قنوج چھینا تھا، وہ اسی گھرواڑ خاندان کا تھا، اس کے بعد قنوج نے اپنی اہمیت ایسی کھوئی کہ نام کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہا،

---

[۱] ترجمہ ونسنٹ اسمتھ ص ۸۰۵،

اس سارے طول بیان کا نتیجہ یہ ہے کہ شہر قنوج ایک ہی تھا، جواب بھی ہے، اور جو ہندوستان کی سب سے بڑی راجدھانی تھی، اور عربوں نے سندھ کی سمت میں جس قنوج یا بورہ کا ذکر کیا ہے، اس سے مقصود سلطنت قنوج کا آخری سرحدی مقام تھا، جس کو اسی لئے بھوج رائے بھی کہتے تھے، جیسے آج بھی سلطنت حیدرآباد کے کسی مقام کو حیدرآباد یا نظام یا بڑودہ کے کسی سرحدی مقام کو بڑودہ یا گیکواڑ کہتے ہیں،

(معارف مارچ ۱۹۴۳ء)

سند معافی جزیہ

ہندوستان کی اسلامی سلطنت میں غیرمسلمان ذمی رعایا سے جزیہ کے نام سے جو ٹیکس وصول ہوتا تھا، اس کی نسبت انگریز مورخوں نے اور اُن کی دیکھا دیکھی ہندو مصنفوں نے جو بے سروپا باتیں پھیلا رکھی ہیں، ان کا جواب بارہا دیا جاچکا ہے، اب ہم کو ایک نئی دستاویز ہاتھ آئی ہے، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ یہ کوئی ایسا ٹیکس نہ تھا جو ظلم سے لگایا جاتا تھا، اور کبھی معاف نہیں ہوتا تھا، بلکہ ایسے لوگوں سے جو غریب ہوتے تھے، عموماً معاف کردیا جاتا تھا، بلکہ ہندوستان کے عام کاشتکاروں سے جو زیادہ تر غریب طبقہ ہے، اکثر معاف کردیا جاتا تھا،

چند سال ہوئے کہ جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب ملی، جس کا نام نگارنامہ ہے، اور جس کے مصنف کا نام منشی لال چند ہے، گو تاریخ نہیں معلوم، مگر قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالمگیر کے زمانہ یا اس کے چند دنوں بعد کی تصنیف ہے، اس کتاب کی تالیف کی غرض، دفاتر کے منشیوں کو سرکاری فرامین کی تحریر کے نمونوں کی تعلیم ہے، اس میں ایک تحریر کاشتکاروں کے معافی جزیہ کی سند کی نقل ہے، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ کس طرح لکھی جاتی تھی، اور رعایا کو دی جاتی تھی،

سندِ مذکور کی اصل عبارت مع ترجمہ یہ ہے:-

سندِ جزیہ معافی کشا ورزان فلاں	کاشتکاروں کے معافی جزیہ کی سند

دیوان با تقابہ محفوظ باشد چون درین ولا
بعرض اقدس ارفع رسید کہ زمینداران کہ
کسب ادار قوت او و قوت عیال او
زیادہ نباشد بموجب دستور شرعی از وجزیہ
نباید گرفت، لہذا از زیرہ رعایا کہ کسب
زراعت دارند و مدار قوت و تخسم و
دگاو آنہا برہمہ فرض است طلب جزیہ
موجب تفرقہ آنان می شود، اگر مطابق
شرع شریف حکم صریح در باب عدم اخذ
جزیہ آں جماعہ صادر گردد، بفراغ بال
کسب پیشہ خود کہ آبادی ملک وامان رعیت
است مشغول باشند واز کشاکش سوار پیادہ
فوجداران واخذ جزیہ خلاصی یابند، حکم جہاں
مطاع صادر می شود کہ موافق شرع انور
بجز ارعان علت اخذ جزیہ مزاحم نشوند
و از تعلقہ داران وچودھریاں وقانون گویان
وطرف داران واہل حرفہ و دیگر ساکنان
قصبات و قریات مطابق شریعت مطہر جزیہ
باز خواست نمایند، چنانچہ درین.

فلاں دیوان باتقابہ محفوظ و سلامت ہیں،
چونکہ اس وقت بادشاہ سلامت کو اطلاع
دی گئی ہے کہ ان زمینداروں سے جن
کی کمائی ان کی اور ان کے اہل عیال
کی گذر اوقات سے زیادہ نہیں ہوتی
اصول شریعت کے مطابق جزیہ نہیں لینا
چاہیے اس لئے غریب اور معمولی رعایا
سے جو زراعت پیشہ ہیں اور اُن کی
معاش بیج اور بیل کا بہم پہونچانا سب
پر فرض ہے جزیہ مانگنا اُن کی پریشان حالی
اور انتشار کا سبب ہوگا، اگر اس گروہ سے
جزیہ نہ لینے کا حکم صریح حسب حکم شریعت
صادر کیا جائے تو وہ فارغ البالی کے
ساتھ اپنے پیشہ میں جو ملک کی آبادی
اور رعایا کے امن وامان کا سبب ہے مشغول
رہیں گے، اور پولیس کے سوار اور تحصیل کے
پیادوں سے اور جزیہ سے نجات پائیں گے،
اسلئے بادشاہ سلامت کا حکم صادر ہوتا ہے
کہ شریعت کے مطابق کاشتکاروں سے

باب یادداشت واقع درست شدہ و
شرح آن درضمن رقم یافتہ بنا براں قلمی
می گردد، کہ آں وزارت پناہ در تعلقہ
دیوانی خود موافق یرلیغ قضا جریان
بعمل آرند و بمزارعاں بجہت اخذ جزیہ
متعرض نشوند، و معاف شناسند،

جزیہ لینے کے لئے مزاحمت نہ کریں، اور تعلقہ
داروں، چودھریوں، قانون گویوں، مزداروں
اہل پیشہ اور قصبات اور دیہات کے دوسرے
باشندوں سے شریعت کے مطابق جزیہ طلب
کریں، چنانچہ اس کے مطابق ایک یادداشت
مرتب کی گئی، اور اس کی تفصیل اس ضمن میں
لکھدی گئی، اس لئے لکھا جاتا ہے کہ آپ اپنے
دیوانی کے تعلقہ میں اس واجب العمل فرمان
پر عمل کریں، اور کاشتکاروں سے جزیہ لینے
کے لئے تعرض نہ کریں اور اُن کو معاف سمجھیں،

(معارف اکتوبر ۱۹۳۷ء)

......०≍०......

خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ ہند ازمنۂ وسطیٰ

(۱۲۰۶ء - ۱۵۲۶ء)

آل انڈیا ہسٹری کانگرس منعقدہ مدراس دسمبر ۱۹۴۴ء عیسوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رفیقو! ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی مجلس میں اس کرسی پر مجھے جگہ دی، آپ نے اس انتخاب سے اپنے دستور کی کئی دفعوں کو توڑا ہے، آپ نے یہ کرسی ایسے شخص کو دی ہے جس کو آپ کی یونیورسٹی برادری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں، بلکہ اس نے آپ کے اسکول اور کالج میں ایک منٹ کے لیے بھی قدم نہیں رکھا، اور وہ سرتاپا مشرقی درس گاہوں کا پروردہ اور نمایندہ ہے، اس لئے اس اعزاز کے لئے اس کا انتخاب آپ کی رواداری اور دل کی بڑائی کا بہت بڑا ثبوت ہے، آپ نے اس طرح میرا حوصلہ بڑھایا ہے، جس کا دل سے شکرگذار ہوں، اور اس کو اس کے لئے نیک فال سمجھتا ہوں کہ شاید آیندہ علمی اور تعلیمی کاموں کے انجام دینے میں مشرقی اور مغربی تعلیموں کے فرق و امتیاز کی خلیج بیچ میں نہ آئے گی، اور ہماری نظر کسی بڑے علمی اور تعلیمی مقصد کو پورا کرنے میں اصل مقصد پر رہے گی، مغربی و مشرقی طرز و انداز کے اختلاف پر نہیں،

اب ہم زمانہ کے دوسرے موڑ پر پہونچ گئے ہیں، جہاں ہم کو اپنی زبان سے محبت ہونی چاہیئے

اور اپنی دیسی ہندوستانی زبان میں کام کرنے والوں کے ساتھ اشتراکِ عمل ہونا چاہئے، اور شاید آج کا دن اس مقصد کے اعلان کے لئے موزوں ہے،

اصل موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے ہندوستان کی عمومی تاریخ کے ایک خاص نقطۂ نظر کے متعلق ہم کو کچھ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ہم جس چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں ہمارے خیال میں اب تک کسی جماعت کی طرف سے اس کی غلطی کو واضح نہیں کیا گیا، اور نہ اس کی غلطی پر ابھی تک ٹوکا گیا ہے، ہماری مراد اس سے وہ غلط قسم کا فرقہ دارانہ رنگ ہے، جو ہماری تاریخ پر ایک زمانہ سے چھایا ہوا ہے،

پالیٹکس کے کھیل سے اس ملک کا علم تاریخ بھی بچا ہوا نہیں، بلکہ صاف کہنا چاہیے کہ یہی وہ بیج ہے، جس سے ہندوستان کا مشہور کھیل پھوٹ پیدا ہوتا ہے مسلمانوں کی حکومت کی بڑائی اور اچھائی کی بھی بہت سی باتیں کہی جا سکتی تھیں، مگر اُن کے بعد اس ملک میں جو حکومت آئی، اُس کے زمانہ میں تعلیم کا سررشتہ پورا کا پورا غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھا، ان لوگوں کے ہر جتھے کی ہر طرف سے یہ کوشش تھی کہ اپنے راج کی بڑائی کو ہر ہندوستانی کے دل میں بٹھا دے، اور ساتھ ہی ایک ایسا کرتب کریں جس سے اُن کے دل کے شیشے ٹوٹ کر پھر جڑنے نہ پائیں، تعلیم کے سارے مضمونوں میں اس کام کے لئے تاریخ کے سوا کوئی اور چیز مناسب نہ تھی، چنانچہ انھوں نے اس ملک کی لئے تاریخ کی جو کتابیں شروع سے آخر تک لکھیں، اور پڑھائیں، ان میں یہی بات سو سو طرح سے الٹ پلٹ کر سمجھائیں، اور پڑھائیں کہ جو دل اُن سے ٹوٹے تھے وہ پھر اب تک جٹ نہ سکے،

آج سے کوئی پندرہ ۱۵ سولہ برس پہلے اسی مدراس کے ایک شہر ترچناپلی میں ہندو مسلمانوں کے ایک ملے جلے جلسہ میں جس کے صدر ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج تھے، میں نے کہا تھا کہ وہ زمین جس میں

ہندو مسلمانوں کی پھوٹ کا درخت جتنا اور بڑھتا ہے، دہ C سے شروع ہونے والے دو مکان ہیں یعنی کالج اور کورٹ، میری بات کو ہنسی اور دل لگی نہ سمجھئے، بلکہ سوچئے کہ میرا کہنا کہاں تک سچ ہے، پچھلی بڑی جنگ یعنی انٹیگو چیمسفورڈ ریفارم اسکیم کے بعد سے تعلیم کا کام خود ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں آگیا ہے، جس میں سے ایک تاریخ بھی ہے، اب ہندوستان کی تاریخ اکثر یونیورسٹیوں میں ہندوستانی ہی پڑھاتے ہیں، اور ہندوستانی ہی کورس کی کتابیں بناتے ہیں، اور تاریخ کے مختلف دور کے بادشاہوں کے حالات کی تحقیق پر کتابیں لکھاتے ہیں، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اب چلنے والے گونئے ہیں لیکن اُن کے چلنے کا راستہ ابھی تک وہی ہے، جس کو ان کے پہلے پُرانے بدیسی چلنے والے بنا کر چھوڑ گئے ہیں، حالانکہ ضرورت یہ ہو کہ اب نیا ڈگر بنایا جائے، اور علم کے قافلہ کے چلنے والوں کے لئے نئی راہ نکالی جائے، جو پھوٹ کے بجائے میل کی منزل مقصود کو جاتی ہو،

اس فن کے جاننے والے جانتے ہیں کہ تاریخ ایک کچی دھات ہے، اس کچی دھات کو مختلف مسالوں سے جوڑ کر جیسی شکل آپ چاہیں بنا سکتے ہیں، اور اپنی ہمدردی اور بیدردی سے اس کو جس طرح چاہیں رنگ کر دکھا سکتے ہیں، دو تین جزئی باتوں کو ملا کر کلیہ بنا لینا اس فن کا آج کل سب سے آسان چٹکلہ ہے، پرانے زمانے میں تاریخ ایک معصوم فن تھا، جس کا مقصد واقعات کا ریکارڈ تیار کرنا تھا، اور بس، مگر آج کل یہ فن سب سے زیادہ بدنام فن ہو گیا ہے، اور قوموں کی چرب زبانی، اختلاف بیانی، اور واقعات کی توجیہ اور تشکیل کرکے اس کو جدا جدا رنگ دینے کے سبب سے کسی چیز کی تاریخ آج ایک ہی طرح بیان نہیں کیجا سکتی ہے، کچھ نہ سہی پچھلی جنگ ہی کی تاریخ مختلف لڑنے والی قوموں کی زبانوں سے ایک ہی طرح پڑھ کر دیکھ لیجئے، یا اسی لڑائی میں ایک ہی واقعہ کی روایت مختلف ملکوں کے ریڈیو میں سُن لیجئے، کہ اس زمانہ میں تاریخ کی حقیقت کیا سمجھی گئی ہے، اور اس سے کیا مصرف لیا جا رہا ہے،

بہرحال مجھے یہ کہنا تھا کہ تاریخ کے فن کو قوموں کے پھوٹ اور میل میں بہت کچھ دخل ہے اسلئے وہ لوگ جن کی نظر میں اس ملک کا مستقبل ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اس مستقبل کا بنانا یا بگاڑنا ہے، ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے، اور اس حالت میں جب کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے، تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اسی طرح پلتا، اور بڑھتا، اور پھلتا اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے،

مسلمانوں میں دو مصنف ایسے گذرے ہیں، جنھوں نے ہندوستان کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنایا، جن میں پہلا گو نسل میں ترک تھا، مگر اس کا دل ہندوستان کی مٹی سے بنا تھا، میری مراد امیر خسرو سے ہے، جنھوں نے فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں ایک نئی زبان اور نیا تمدنی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی، اور سب سے پہلے اسی ملی جُلی زبان میں شاعری کی بنیاد رکھی، اور موسیقی کی ایک نئی لے ہندی اور ایرانی سے ملاکر پیدا کی، انھوں نے اپنی فارسی مثنوی "نہ سپہر" میں ایک مستقل باب ہندوستان کی خوبیوں پر لکھا ہے، اور یہاں کے ملکی باشندوں کے علم، آرٹ، اور ہنر کی تعریف میں اپنی شاعری کا پورا جوہر دکھایا ہے،

دوسرے شخص میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں، جن کی وفات کو ابھی ۱۶۳ برس گذرے ہیں، ان سے بڑا ہندوستان کا کوئی مسلمان مورخ اور عربی کا شاعر اس ملک میں پیدا نہیں ہوا، یہ ہندی کے بھی شاعر تھے، بلکہ خاندانی شاعر، انھوں نے سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان عربی میں لکھ کر ہندوستان کی زمین کو آسمان بنادیا، اور ہر حیثیت سے اُسکی اتنی بڑائی کی ہے کہ اس کو رشک جہان بنادیا ہے، مسلمان مورخوں کے لئے اُن کے بزرگوں کا یہ طریقہ اُن کی تقلید کے قابل ہے،

جس عہد کی تاریخ پر ہم آج کی مجلس میں کچھ کہہ سُن رہے ہیں، اس پر ہندوستانی اہل قلم کے ہاتھوں سے کئی اچھی اچھی کتابیں شائع ہو کر اہل نظر کے سامنے آگئی ہیں، خاص کر ہماری یونیورسٹیوں

میں تاریخ کے کام کرنے والوں کے ذریعہ کافی لٹریچر پیدا ہو رہا ہے مگر اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جو کسی یونیورسٹی سے کسی ڈگری کے حاصل کرنے کے لئے لکھا گیا ہے، اب تک عموماً طلبہ یا ایسے اساتذہ جنھوں نے اپنی طالب علمی کا زمانہ فوراً ہی ختم کیا ہے، ایک مقررہ مدت کے اندر ڈگری دینے والوں کے خیالات سے متاثر ہو کر اس عہد پر کتابیں لکھتے رہے ہیں، جن میں انھوں نے کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ باتیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اسی لئے اُن میں سے بعض کی تحقیق میں گہرائی، رائے میں پختگی، اور دلیلوں میں وزن نہیں، ان میں کچھ ایسے بھی ہیں، جنھوں نے فارسی نہ جاننے کے باوجود دوسروں پر بھروسہ کرکے اپنی تحقیقات کی ساری عمارت فارسی کی ادبی کتابوں پر کھڑی کر دی ہے، اور بعض ایسے بھی ہیں، جنھوں نے مسلمان حکمرانوں کے مذہب کے اصول و قوانین کا گہرا مطالعہ کئے بغیر کسی دوسرے کی رائے کا حوالہ دے کر یا کسی کے قول کو نقل کرکے اپنے خیال کے مطابق نتائج اخذ کرلئے ہیں، یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات میں اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اسلامی فقہ کے نکتے میکڈانلڈ کی کتاب کے ذریعہ سے بتائے جاتے ہیں، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ ہیوز کی ڈکشنری آف اسلام سے پیش کیا جاتا ہے، مسلمانوں کی حکومت، بادشاہی، اور مالیات کے نظریے آرنلڈ اور اگلائی نڈیز (Aghnides) کی عینک سے دیکھے جاتے ہیں،

اس غلط طریق کار کا نتیجہ یہ ہے کہ اب گو نہ وہ فاتح رہے ہیں اور نہ مفتوح، مگر زمانہ کے تطاول سے اُن کے زمانہ کے پیدا شدہ جذبات کے سوکھ جانے والے درخت کو پانی دے دے کر ہرا کیا جاتا ہے، اور ہم تحقیق کے نام سے اپنے پیشروؤں کی غلطی کی غلط پیروی میں مصروف ہیں،

یورپین مستشرقین نے اسلامی علوم و فنون کی جو خدمت کی ہے، اس کا اعتراف ہے مگر مذہبی، شرعی اور نقلی معاملات میں ان کی تحقیق یا رائے یا قول پر کسی حال میں بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا،

اس لئے مسلمان فرمانرواؤں کے کسی رویہ یا پالیسی کو اُن کے مذہب کی روشنی میں اگر دیکھنے کی کوشش بھی کیجائے، تو مذہبی معلومات کا ماخذ اور سرچشمہ خود مسلمان علماء و فقہا کی ادبی تخلیق، مستند اور معتبر کتابیں ہونی چاہئیں، لیکن زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ان کتابوں کا سمجھنا ممکن نہ ہو تو پھر ایسے موضوع اور مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ ہی نہ کیا جائے، نیت خواہ کتنی ہی اچھی اور صاف ہو، مگر مذہبی مسائل کی غلط تعبیر اور ملکی امور میں اُن کی غلط تطبیق سے بعض اوقات ایسے مضرت رسان پہلو پیدا ہو جاتے ہیں، جن سے ایک طرف تو حقیقت کا خون ہوتا ہے، اور دوسری طرف قوموں کے جذبات میں تلخی پیدا ہوتی ہے یہاں پر ہمارے دوستوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین مسلمان ضرور تھے لیکن وہ اسلام کے نمائندے نہ تھے، وہ اسلام کے نام لیوا بن کر گو حکومت کے تخت کو جلوہ دیتے تھے، مگر اُن کی حکمرانی کا طرز اور فرمان روائی کا اصول خالصۃً اسلامی نہ تھا، وہ مذہباً نو مسلم اور نسلاً ترک، پٹھان یا ہندو تھے، اس لئے ایک یا دو یا کئی نسل سے مسلمان ہونے کے باوجود، اسلام کی صحیح تصویر نہ تھے، اور نہ ان کی سیاست اسلامی سیاست تھی، اور نہ اُن کی حکومت ٹھیک اسلامی طرز کی تھی، اور نہ اُن کے سپہ سالار، اور فاتح، اپنے مفتوحہ ملکوں کے ساتھ اسلامی طریقہ کا پورا پورا برتاؤ کرتے تھے، اس بحث کے سمجھنے کے لئے سلطان علاء الدین خلجی اور قاضی مغیث الدین کی کی وہ طویل گفتگو پڑھئے، جس کو برنی نے فیروز شاہی میں لکھا ہے، یا محمد شاہ تغلق کی ان خونریزیوں پر ایک نظر ڈالی جائے، جس کے مقتولین میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تخصیص نہ تھی، غور کیجئے کہ محمد بن قاسم ثقفی کی عربی فوج نے ۹۲ھ میں جب بودھوں کے بلاوے پر سندھ میں قدم رکھا، تو پہلے ہی دن ان عربوں نے ہندوؤں کی حیثیت شرعی کو متعین کر لیا، اور ان کو وہی حیثیت دی، جو ان سے پہلے صحابہ نے اہلِ فارس کی قرار دی تھی یعنی شبہ اہلِ کتاب جس کے معنی یہ ہیں کہ دو باتوں کے سوا یعنی نکاح اور ذبیحہ کے علاوہ اور تمام امور میں ان کے ساتھ اہلِ کتاب کا برتاؤ کیا جائیگا،

نیز یہ کہ یہاں کے مندروں کی حیثیت ایران کے آتشکدوں کی ہے، جس طرح صحابہ نے آتشکدے نہیں توڑے، اسی طرح مصالحت ہو جائے، تو یہ مندر بھی توڑے نہیں جائیں گے، چنانچہ سندھ اور ملتان میں چوتھی صدی تک اسلامی حکومتوں کے باوجود یہ مندر اسی طرح قائم رہے، مورخ بلاذری نے یہ حالات لکھے ہیں، اور اکثر عرب سیاحوں نے اُن کی کیفیت بیان کی ہے،

لیکن افسوس ہے کہ ترک سیاحوں نے جوش جہاد کے علاوہ صلح و جنگ اور فتح و غنیمت اور محاصل و مداخل کے سارے اسلامی اصولوں کو فراموش کر دیا، اور ان کے ان کاموں کی ذمہ داری شریعت اسلام پر رکھی جاتی ہے، حالانکہ اسلامی اصولوں سے ذمیوں کے معاملات کا فیصلہ ایک حد تک باہمی معاہدات کی دفعات پر ہے، اور نیز یہی فقہی مسئلہ ہے کہ پرانے مندر توڑے نہ جائیں گے، اس قسم کے غلط ملط مباحث سے ہندوستان کے مسلمان سلاطین کی تاریخ ایک زمانہ سے جھگڑے کی چیز بن کر رہ گئی ہے، یا تو اُن کی اور اُن کے مذہب کی تصویر بہت ہی بُری اور بھیانک دکھائی جاتی ہے، یا پھر دوسری طرف اُن کی حمایت اور مدافعت میں ہر قسم کا زور صرف کیا جاتا ہے، یا پھر دونوں گروہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرتے ہیں، کچھ محققین ایسے بھی ہیں جو کسی سلطان کی حکومت کی تاریخ لکھتے وقت اُس کی خوبیاں بھی ظاہر کرتے ہیں، اور اس کی بُرائیاں بھی دکھاتے ہیں، مگر اُن میں ایسے مصنفوں کی تحریریں گمراہ کن ہوتی ہے، جو چند خوبیاں محض اسلئے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان خوبیوں کی آڑ میں وہ بڑی سے بڑی بُرائیوں کا زہر پھیلانے میں کامیاب ہوں، اور وہ مخالف نکتہ چیں کے الزام سے بھی بچے رہیں، حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ بغیر تصنع کے حق کو حق، اور باطل کو باطل کہدیا جائے،

غرض مسلمان سلاطین کی تاریخ لکھتے وقت یہ بات ہم سب کے سامنے رہنی چاہیے کہ وہ مسلمانوں کے بادشاہ ضرور تھے لیکن اسلام کے مذہبی پیشوا اور صلحا نہ تھے، جن کا ہر فعل اور عمل بڑا یا

اور کمزوریوں سے بالاتر ہوتا، اس لئے انھوں نے اگر اپنی سیاست میں کوئی ناروا اور نامناسب رویہ
اختیار کیا تو آج ہم کو اس کے لئے نہ معذرت نامہ پیش کرنے کی ضرورت ہے نہ شرم سے سر جھکانے کی،
وہ کونسی قوم ہے جس کے بادشاہ اور کشورکشا ہر معیار پر ہر زمانے میں پورے اترے، اور ہر اعتراض
سے پاک گذرے، اچھوں اور بروں سے تاریخ کا کوئی دور خالی نہیں رہا، اس لئے شخص کی بحث میں
مذہب کو درمیان میں لانا غلطی ہے، حالانکہ غلطی اس قسم کے موقعوں پر ہندو ہندوستان اور عیسائی
ہندوستان کے دور کے بیان میں کبھی زیر عمل نہیں آتی، تاریخ کا مقصد پروپیگنڈا نہیں، بلکہ وہ حکومتوں
کی کہانی اور قوموں کی سوانح عمری ہے، اور اسی حیثیت سے ان واقعات کا تذکرہ کرنا چاہئے،
انگلستان کی تاریخ کیا لڑائیوں کا دنگل نہیں، رومن فتوحات سے موجودہ متحدہ اینگلوسکسن حکومت
تک کیا وہاں قوموں کی جنگیں نہیں ہوئیں، کیا اسکاٹ لینڈ، دیلیز، آئرلینڈ اور انگلینڈ کے درمیان
بڑی بڑی خونریزیاں نہیں ہوئیں، مگر اب اُن کی تاریخ لکھتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ
واقعات اس انداز میں بیان نہ ہوں کہ پچھلے سوئے ہوئے فتنے پھر جاگ جائیں، انگلستان اور فرانس
جو آج ڈیڑھ سو برس سے اتحادی ہیں، کیا اُن کی تاریخ کی زمین دونوں قوموں کے خون سے رنگین
نہیں، تاہم گذشتہ ناگواری کے اظہار میں قلم اس قدر محتاط رہتا ہے، کہ موجودہ خوشگواری کے
شیشہ میں بال بھی آنے نہیں پاتا، اسی طرح پرانے ہندوستان کے راجاؤں کے عہد میں کس قدر لڑائی
بھڑائی اور ایک دوسرے کے راج کے لینے دینے میں نہیں گذرا، پھر بھی بودھ، جین، ویدک، برہمنی،
آریائی، اور سیتھین، اور یہاں کی قدیم باشندہ قوموں کی لڑائیوں کے بیان میں مورخوں نے اپنی قلمی
لڑائیوں کا سلسلہ نہیں چھیڑا ہے، حالانکہ ان میں سخت مذہبی اختلافات بھی تھے، اور یہ صحیح قدم ہے،
اسی طرح کا مصالحانہ قدم اسلامی تاریخ کے اس دور کے میدان میں بھی رکھنا چاہئے، میری یہ
تمہید گو لمبی ہو گئی، اور ممکن ہے کہ اس بیان میں کہیں کہیں سختی بھی آگئی ہو، مگر جس درد سے یہ باتیں کہی

گئی ہیں، امید ہے کہ اسی دردسے سُنی بھی گئی ہوں گی، اور ہمارے مورخ دوستوں کی توجہ کے قابل ٹھہریں گی، اس مجلس سے بہتر اور کونسا موقع اس درد کے اظہار کا ہوسکتا تھا،

اب ہم ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، جو ہمارے پیش نظر ہے، اس عہد کی تاریخ لکھنے میں سب بڑی دقت یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ کا سرمایہ ہمارے پاس بہت کم ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تیموریوں کی طرح اس زمانہ کے بادشاہوں نے اپنے عہد کی تاریخ نویسی کو سرکاری کام نہیں قرار دیا تھا، بلکہ عموماً اہلِ تاریخ اس کام کو اپنے شوق سے انجام دیتے تھے، گو وہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کے دامن سے ضرور لپٹے تھے تاہم وہ اس کام کے لئے متعین نہ تھے، آج کل قوموں کی تاریخ کی نقش آرائی میں خون ہی کا رنگ درکار نہیں، بلکہ اس زمانہ کے تمدن، اقتصاد، تعمیر، معاشرت، علم و فن اور طریق جنگ وغیرہ کے ایسے معلومات کی بھی ضرورت پڑتی ہے، جن سے اس قوم کی پوری تصویر کھڑی ہوجائے لیکن اس زمانہ کے پُرانے مورخوں نے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تاریخیں لکھیں، اس لئے جو مسائل اُن کے نقطۂ نظر سے اہم تھے، وہ ہمارے لئے غیر اہم ہیں، اور جن مسائل کو ہم ضروری سمجھتے ہیں، اُن کو انھوں نے غیر ضروری سمجھ کر یا تو نظر انداز کردیا ہے، یا بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھا ہے تاہم اگر آج کل کے لکھنے والوں کے حوصلے بلند اور ارادے اچھے ہوں، تو ان ہی معاصر تاریخوں سے اپنی ضرورت کا اچھا خاصا مواد فراہم کرسکتے ہیں، میرے استاد مولانا شبلی مرحوم فرمایا کرتے تھے، کہ وہ اپنی تحقیق میں چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے جمع کرکے مٹھائی تیار کیا کرتے ہیں، اگر اسی طرح صبر، محنت، اور استقلال کو راہ دے کر کوئی ریسرچ کرنے کی کوشش کرے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہر موضوع پر اس کو ہر قسم کے معلومات نہ ملتے جائیں، مگر موجودہ دور کے محققین کے مشاغل اس قدر گوناگوں ہیں، اور محنت کے بھی وہ ابھی زیادہ عادی نہیں ہوئے ہیں، اس لئے اُن کی کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ معاصر تاریخوں میں جو واقعات اور تفصیلات فارسی

زبان میں سیدھے سادھے طریقے پر درج ہیں، وہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق انگریزی، اردو، اور ہندی زبان میں تھوڑی تنقید اور نکتہ چینی کے ساتھ منتقل کر دیں، اسی طرح انگریزی، اردو، اور ہندی میں لٹریچر فراہم ہو کر ان زبانوں کی خدمت ہو جاتی ہے، یا اوسط درجہ کے علم اور تاریخی مذاق رکھنے والے اور یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے تو کتابیں حاصل ہو جاتی ہیں، مگر ان تحقیقات سے صحیح معنوں میں گذشتہ عہد کی قوموں کی موجودہ نسلوں کی نہ ذہنی پیاس بجھتی ہے اور نہ وہ اپنے ماضی کی صحیح تصویر دیکھ کر اپنے مستقبل کو امید افزا پاتے ہیں کیونکہ ماضی اگر شاندار ہو تو مستقبل کو شاندار بنانے میں حوصلہ بڑھتا ہے، اور قومی خودی پیدا ہوتی ہے، اس لئے کسی قوم کو نقصان پہنچانے کا ایک کارگر حربہ یہی ہوتا ہے کہ اس کا ماضی خود اس کے سامنے بہت ہی برے اور نفرت انگیز طریقے پر پیش کیا جاتا ہے جس سے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اپنی تمام تاریخی اور تمدنی روایات سے رفتہ رفتہ متنفر ہو جاتی ہے، اتفاق سے اس قسم کے حربے سے فائدہ اٹھانے کے لئے معاصر تاریخوں میں ہر طرح کا مسالہ موجود ہے،

یہ معاصر فارسی تاریخیں عہد سپہ گری میں ایرانی مذاق کے مطابق لکھی گئیں، اس زمانہ میں سب سے بڑا ذاتی وصف سپہ گری میں کمال حاصل کرنا تھا، ہر فرد اپنا جوہر میدان جنگ میں دکھانا فخر سمجھتا تھا، اہل قلم اہل سیف کی طرح لڑائی کے میدان میں شریک نہ ہو سکتے تھے، تو اپنی سپہ گری کے سارے جذبات کاغذ کے صفحات پر منتقل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی لئے اُن کی ساری تاریخیں جنگ و جدل، اور معرکہ آرائی کا مرقع ہیں جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کی تاریخ محض کشت و خون کی داستان ہے، مورخوں کے ان ذاتی رجحانات کی بنیاد پر تاریخ کے بہت سے اہم رُخ پردے پڑ گئے ہیں، اور اب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے سلاطین نے لڑنے بھڑنے کے سوا کوئی اور کام ہی نہیں کیا، انگریزی داں طبقہ پر یہ خیال سر ایچ ایم ایلیٹ کی تاریخ ہند کے ذریعہ سے ع

بھی زیادہ گہرے طور پر منقوش ہوا، ہنری ایلیٹ کا یہ احسان ناقابلِ فراموش ضرور ہے کہ اس نے غیر معمولی تلاش و جستجو سے ہندوستان کی کمیاب اور نادر عربی جغرافیوں اور فارسی تاریخوں کا پتہ لگا کر اُن کے انگریزی ترجمے اور اقتباسات اپنی مذکورۂ بالا کتاب میں محفوظ کر دیئے ہیں، اور آج بہت سے محققین کے لئے وہ ہدایت کا چراغ ہے، مگر یہ کہنا پڑے گا کہ ایلیٹ نے ان ترجموں میں دیانت داری سے کام نہیں لیا، جن کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اس نے اپنی کتاب میں شامل کئے ہیں، ان میں جابجا علمی، تمدنی، عمرانی اور غیر سیاسی تفصیلات کچھ نہ کچھ ضرور ہیں لیکن ان کو اُس نے قصداً حذف کر دیا ہے، اب فارسی سے ناآشنا اور ایلیٹ کی کتاب کو اپنا گائیڈ بنانے والا محقق مسلمان سلاطین کے عہد کو صرف خون آلود اور خون آشام پاتا ہے، جس کے ذہنی اثرات مدتوں کی تحقیق و کوشش کے بعد بھی مشکل سے مٹ سکیں گے، ایلیٹ شروع انگریزی عہد کا آدمی ہے، اور یہ ایک گونہ سرکاری حیثیت بھی رکھتا ہے، اور اس نے اپنے کام کا مقصد چھپا کر نہیں رکھا ہے، اُس نے صاف طور سے یہ ظاہر کر دیا ہے، کہ اُس کے پیش نظر تمامتر یہ ہے کہ اپنے اگلے پیشرو اور حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر، اپنی قوم کے عہد حکومت کی روشنی دکھائے تاکہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھ کر، اُس کو اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج ہمیشہ پیش کیا کریں،

(دیباچہ ص ۲۲)

ابھی عرض کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تاریخیں ایرانی ذوق کے مطابق لکھی گئی ہیں، مختلف مؤرخوں نے تاریخیں لکھ کر زیر نظر عہد کے سیاسی واقعات تو مسلسل اور مربوط طریقہ پر مرتب کر دیئے ہیں، لیکن ان ایرانی مذاق کے مورخوں نے بادشاہی درباروں سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی، اُن کے نزدیک بادشاہ کا دربار ہی ساری دنیا تھی، عرب اور ایرانی مورخوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے، عرب مؤرخ دربار کا مؤرخ نہیں ہوتا، بلکہ زمانہ کا مؤرخ ہوتا ہے، اسی لئے اُسکی

تاریخ کی تقسیم، بادشاہوں کے نام پر نہیں، بلکہ سال پر ہوتی ہے، طبری، ابن اثیر، ابو الفدا وغیرہ مورخوں نے اسی طرز پر اپنی تاریخوں کی بنیادیں ڈالی ہیں، عرب کا مورخ نہ صرف بادشاہوں کی جنگ و صلح کے واقعات زیر تحریر لاتا ہے، بلکہ ضمناً اس زمانہ کے تمدنی، علمی، اور معاشی حالات بھی ضرور قلم بند کرتا جاتا ہے، گو ان میں ترتیب نہیں ہوتی، ایک ابن بطوطہ کو دیکھ لیجئے، کہ مغرب اقصٰی کے اس سیاح کے ہاتھوں محمد تغلق کے عہد کا جتنا واضح اور روشن مرقع ہمارے سامنے موجود ہے، وہ اس دور کے کسی اور سلطان کی حکومت کا نہیں، ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں بہت سے سیاسی واقعات ایسے بھی لکھے ہیں، جن کا فارسی تاریخوں میں بہت کم پتہ چلتا ہے لیکن تحقیقات نے ان کی صحت و درستی کو ثابت کر دیا ہے، معبر یعنی کارومنڈل میں حسن کیتھلی کی اسلامی ریاست کا اس نے ذکر کیا ہے، اس کا ثبوت آثار قدیمہ کے سکوں نے بہم پہنچایا، اور حیدر آباد کے حکیم شمس اللہ قادری نے ۱۹۲۵ء میں سلاطین معبر کے نام سے اس پر ایک اچھا مقالہ لکھا ہے، ملتان کے مدرسہ کا نام صرف ابن بطوطہ نے بتایا ہے، سندھ کے سومری بادشاہوں کی حقیقت بھی ابن بطوطہ سے معلوم ہوئی، ہندوستان اور چین کی بحری تجارت کا حال اور جہازوں کی آمد و رفت کی کیفیت بھی اسی سے معلوم ہوئی، بنگال کا نقشہ اس نے فارسی کے دو حرفوں میں کھینچا ہے، جہنم پر از نعمت، ترکستانی ترکوں نے بھی اس کو یہی لقب دیا تھا، ملیبار میں اسلامی آبادیوں کا ذکر اسی نے کیا ہے، سندا پور یعنی گوا کی عرب اسلامی سلطنت کا حال اسی سے معلوم ہوا، ہونور احاطہ بمبئی کے عرب سلطان کی داستان اسی نے سنائی، ملیبار اور جزائر کے ہندو راجاؤں کے قصے اسی سے معلوم ہوئے،

محمد تغلق نے چونکہ مصر کے عباسی خلیفہ سے تعلق پیدا کر لیا تھا، اس لئے ہندوستان اور مصر کے درمیان سفیروں، سیاحوں، اور علماء کی آمد و رفت کا دروازہ کھل گیا تھا، اور اس راہ سے اس زمانہ کے ہندوستان کی تاریخ کا بہت سا سامان عرب مورخوں کے بھی ہاتھ آیا، چنانچہ اس عہد کے

مصری مورخ ابن فضل اللہ المتوفی ۷۴۹ھ (۱۳۴۸ء) نے اپنی مسالک الابصار فی ممالک الامصار میں اس زمانہ کے ہندوستان کے جو تمدنی وتجارتی اور اقتصادی اور فنی حالات لکھے ہیں، اس عہد کی پوری فارسی تاریخ میں نہیں مل سکتے، کیا ہندوستان کی کسی فارسی تاریخ میں آپ یہ کہیں مل سکتا ہے، کہ ان سلاطین کے زمانہ میں ہندوستان کی تعلیم کا کیا حال تھا، اور کتنے مدارس قائم تھے، لیکن ابن فضل اللہ کا بیان سنئے جو لکھتا ہے کہ محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دلی میں ایک ہزار مدرسے ... ، شفاخانے اور دو ہزار خانقاہیں تھیں، یا وہ مشہور شاہی مدرسہ جو فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں دلی میں شاہانہ فیاضی سے قائم ہوا تھا، وہ کیسا تھا، اس کی تعلیم کیا تھی، کون کون بڑے بڑے مدرسین تھے، فارسی کی لفاظانہ انشا پردازی میں اس کا بیان گو برنی نے صفحوں میں کیا ہے، مگر اس کا حاصل کچھ نہیں، بدر چاچ اور مطہر کڑہ اس عہد کے دو شاعروں نے اس مدرسہ کا جو ذکر اپنے قصائد میں کیا ہے، اسکو پڑھکر اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے ہم آج بے قرار ہیں مگر نہیں کر سکتے،

مسالک الابصار کے بیان کا یہ حصہ جو ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہے، فرانسیسی، اور انگریزی میں ترجمہ ہو گیا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ عرب مورخ کی نگاہ میں کتنی وسعت ہوتی ہے، ابن فضل اللہ کے بعد مصر کے دوسرے مورخ قلقشندی المتوفی ۸۲۱ھ نے اپنی کتاب صبح الاعشیٰ فی کتابۃ الانشا میں اس حصہ کو نقل کر دیا ہے، اور ہماری اکاڈیمی نے چودہ برس ہوئے کہ اس کا ترجمہ معارف دسمبر ۱۹۲۰ء میں شائع کر دیا ہے، اس عہد کے عرب سوانح نگاروں نے بھی آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے اکابر کے حالات میں اپنے زمانہ کے ہندوستانی بادشاہوں کو بھی جگہ دی ہے، جیسے ابن حجر مصری نے الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ میں شوکانی یمنی نے البدر الطالع فی قرن التاسع میں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے متعدد سلاطین فضل وکمال کے لحاظ سے اہل علم میں شمار کئے جانے کے لائق تھے،

اگر ہر دور میں ایک ابن بطوطہ، ایک ابن فضل اللہ اور ایک ابو العباس احمد قلقشندی ہوتا، تو آج ہندوستان کے زیر نظر عہد کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی، جو آج نظر آتی ہے، تیموریوں کے

مقابلہ میں سلاطین دہلی کا زمانہ عام طور سے اہم نہیں سمجھا جاتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس عہد کے سارے حکمراں ادنیٰ درجہ کے تھے، یا ان کا نظام سلطنت اتنا مکمل اور مرتب نہ تھا جیسا کہ ان کے بعد کے فرمانرواؤں کا تھا، بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ ان کی سیاسی سطوت، اور تمدنی عظمت کی صحیح تصویر پیش کرنے والا کوئی مورخ پیدا نہیں ہو سکا، اور نہ خود ان سلاطین نے اپنے شاندار ملکی، جنگی اور کلچرل کارناموں کو باضابطہ تحریر میں لانے کی کوشش کی، اگر اس دور میں کم از کم کوئی ابوالفضل، کوئی عبدالحمید لاہوری، کوئی عبدالباقی نہاوندی، اور کوئی محمد کاظم بھی پیدا ہو جاتا، تو ان سلاطین کی تاریخ ویسی پرشکوہ اور باوقار معلوم ہوتی جیسی وہ درحقیقت تھی، موجودہ دور کے محققین کا اب یہ فرض ہے کہ اس زمانہ کے تاریخی سرمایہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں، اور مورخین کے گذشتہ تغافل کی تلافی کریں، اس عہد کا جو کچھ تاریخی لٹریچر ہے، وہ زیادہ تر یورپ یا کسی اور جگہ کے کتب خانوں میں قلمی نسخوں کی شکل کی میں زینت و آرائش کی خاطر رکھ چھوڑا گیا ہے، ان کتب خانوں میں بیٹھکر جو کوئی بھی ان قلمی نسخوں کے کے ذریعہ سے اچھے اور بُرے، صحیح و غلط معلومات فراہم کر دیتا ہے، ہم انہی پہ اکتفا کر لیتے ہیں، ان کی حقیقی اور غیر حقیقی تعبیر و تصریح پر ہم کسی قسم کی روشنی ڈالنے سے بالکل قاصر رہتے ہیں، اگر غیر مطبوعہ لٹریچر طبع اور شائع ہو کر سہولت سے ملنے لگے، تو محققین کا کام بہت ہی آسان اور ہلکا ہو جائے،

ہم بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے ممنون ہیں کہ اس کی طرف سے بہت سی کتابیں شائع ہو گئی ہیں، علی گڈھ کے اساتذہ نے بھی مفید کتابوں کا اضافہ کیا ہے، آگرہ یونیورسٹی، لاہور اورینٹل کالج اور حیدرآباد کے کچھ اصحاب قلم نے بھی بعض قلمی نسخوں کو محنت کے ساتھ اڈٹ کر کے تاریخ ہند کے شائقین کو مرہونِ منت کیا ہے، مگر پھر بھی بہت سا ایسا لٹریچر ہے، جس کے نہ ملنے کی وجہ سے محققین کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں ہیں، اس لئے اگر خود کانگریس یا تاریخ کا کوئی ادارہ ایسا قائم ہو جائے کہ ان کتابوں کا پتہ لگائے، اُن کی نقلیں اور فوٹو بہم پہونچائے، یا ان کو اڈٹ اور شائع کر کے اہل تحقیق

سکے ہاتھوں تک پہنچائے، تو ایک بڑی کمی پوری ہو جائے، مثلاً غلاموں کے عہد میں حسن نظامی نے تاج المآثر میں بعض غلام سلاطین کے حالات لکھے ہیں لیکن اس کی عبارت آرائی کی وجہ سے اس کو تاریخی اہمیت نہیں دی جاتی ہے، اور یہ کہکر اس کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے، کہ اس میں واقعات کم اور الفاظ کا طومار زیادہ ہے، شاید اسی لئے یہ اب تک نہیں چھپ سکی ہے اس میں گو واقعات کم ہوں، مگر اس کی سطروں کے درمیان بعض ایسی ضروری چیزیں مل جاتی ہیں جن سے اس زمانہ کے بعض تمدنی، کلچرل، اور عمرانی پہلو واضح ہو جاتے ہیں، جس طرز کی عبارت اس میں استعمال ہوئی ہے، اس سے اس زمانہ کے علمی اور انشا پردازانہ ذوق کا بھی اندازہ ہوتا ہے اس کے شائع ہونے سے اس عہد کے تاریخی اور علمی حالات کا جائزہ لینے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور مل سکتی ہے، التتمش کے زمانۂ حکومت میں آداب الحرب والشجاعہ لکھی گئی، جو اس عہد کے حربی و فوجی معلومات کے لئے ایک بیش قیمت ماخذ ہے، اورینٹل کالج لاہور نے اس کا کچھ حصہ شائع کیا ہے، اگر اس کے مکمل نسخہ کی کمی غیر معمولی طریقہ پر محسوس ہو رہی ہے، اسی زمانہ میں محمد عوفی نے التتمش کے دربار میں رہ کر جامع الحکایات ولوامع الروایات لکھی، جو گو قصوں اور کہانیوں پر مشتمل ہے لیکن ان سے بعض اوقات بہت سی تاریخی اور معاشرتی تفصیلات واضح ہوتی ہیں، ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں طبقات ناصری، تاج المآثر، اور جوامع الحکایات کے مولفوں کے علاوہ کبیر الدین ابن تاج الدین عراقی کا بھی نام لیا ہے، جس نے علاء الدین خلجی کی فتوحات کی تاریخ لکھی تھی، لیکن اس کتاب کا اب تک کہیں پتہ نہیں چل سکا ہے، تیموریوں کے آخری دور کے ہندو مورخ سجان رائے نے اپنی خلاصۃ التواریخ میں عزالدین خالد خانی کی کتاب تاریخ فیروز شاہی کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے متعلق بھی اب تک کسی کتب خانہ میں کوئی پتہ نہیں چلا، خالد خانی کی ایک دوسری تصنیف دلائل فیروز شاہی کا ذکر فرشتہ نے کیا ہے، مگر وہ اقسام حکمت علمی و عملی میں ہے، تاریخ

فیروز شاہی کے مؤلف شمس سراج عفیف کی ایک کتاب مناقب سلطان محمد کا بھی پتہ ہے، ایک نامعلوم مصنف کی ایک اہم کتاب سیرت فیروز شاہی کا واحد نسخہ خدا بخش خاں کے کتب خانہ پٹنہ میں موجود ہے، مگر اب تک کسی اہل علم یا ادارہ نے اس کو شائع کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی ہے، امیر تیمور کی طرف دو کتابیں تزک تیموری اور ملفوظات تیموری منسوب ہیں، دونوں ایک ہی چیز ہیں، مگر بمبئی کے مطبوعہ نسخۂ تزک تیموری اور ایلیٹ کے اقتباسات ملفوظات تیموری میں بڑا اختلاف ہے، ملفوظات تیموری مترجمہ ابو طالب حسینی کو تو جعلی بتایا گیا ہے، لیکن اس کی تحقیق اب تک نہیں ہوئی ہے، کہ بمبئی کا مطبوعہ نسخہ تزک تیموری مستند ہے، یا غیر مستند، لودیوں کی کسی معاصر تاریخ کا پتہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے، طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، واقعات مشتاقی، اور تاریخ داؤدی سے اس خاندان کی تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں، مگر یہ تمام کتابیں تیموریوں کے دور میں لکھی گئیں، اسی طرح یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے، کہ سوریوں کے زمانہ میں اُن کی حکومت کی کوئی تاریخ مُرتب نہ ہوئی ہوگی، یا تو اس عہد کی معاصر تاریخیں نظروں سے اوجھل کہیں پڑی ہیں، یا تلف ہو گئی ہیں،

تیموریوں کے دور میں سوریوں کے حالات تاریخ شیر شاہی (مؤلفہ عباس خاں شروانی) مخزن افغانان (مؤلفہ نعمت اللہ) اور تاریخ داؤدی (مؤلفہ عبداللہ) میں لکھے گئے، عباس خاں شروانی کی تاریخ شیر شاہی ایک اہم اور مفید تاریخی لٹریچر ہے جو اگر چھپ کر محققین کے ہاتھوں تک پہنچ جائے تو ایک مفید کام ہو،

بابر کی تاریخ کے لئے خود اُس کی تزک بابری اور اُس کے خالہ زاد بھائی مرزا حیدر دوغلت کی تاریخ رشیدی اہم کتابیں ہیں تزک بابری کے انگریزی ترجمہ کو جن مفید حواشی اور تشریحات کے ساتھ اے، اس، بیورج نے شائع کیا ہے، اس کے احسان کی گراں باری ہمیشہ رہے گی، اس کے اور بجل

ترکی نسخہ کی تو نہیں مگر اس کے فارسی ترجمہ کے طبع ہونے کی پھر بھی ضرورت ہے، جو عبدالرحیم خانخاناں نے اکبر کے لئے کیا تھا، تاریخ رشیدی میں وسط ایشیا کے مغلوں اور خصوصاً چغتائیوں کے حالات زیادہ ہیں، مگر یہ کتاب ہندوستان میں لکھی گئی، اور بابر اور ہمایوں کے متعلق بعض مفید معلومات فراہم کرتی ہے، مسٹر ڈینیسن راس نے اس کا انگریزی کا ترجمہ کرکے اس کتاب کے اوریجنل فارسی نسخہ سے محققین کو قدرے بے نیاز کر دیا ہے، مگر ترجمے خواہ کتنے ہی معتبر اور مستند ہوں صرف ان ہی پر بھروسہ اور اعتماد کرنا تحقیق کے اعلیٰ معیار کو کم کرنا ہے، بعض اوقات ان ترجموں کی غلطیوں اور کمزوریوں سے واقعات کے استنباط اور نتائج کے اخذ کرنے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، اُن کا ہلکا سا اندازہ مسٹر ہوڈی والا کی کتاب Studies in Indo Muslim History کے مطالعہ سے ہوگا، اس کتاب میں مسٹر ہوڈی والا نے الیٹ کی جو غلطیاں دکھائی ہیں، اُن کو پڑھنے کے بعد محققین کو الیٹ پر شاید اعتماد کلّی باقی نہ رہا ہوگا، اسی طرح تاریخ یمینی، طبقات ناصری، اور تاریخ فرشتہ کے انگریزی ترجمہ پر جو نکتہ چینیاں ہوتی رہی ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ترجموں کو زیادہ اہمیت تحقیق کے سلسلہ میں نہیں دیجا سکتی ہے،

حضرات! مجھ سے پہلے شاید اس کرسی سے آپ کی توجہ اس بات کی طرف دلائی گئی ہوگی کہ مرکزی حکومتوں کے ساتھ ساتھ مختلف صوبوں میں جن خاندانوں نے حکمرانی کی، ان کی تاریخ نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے، اول تو صوبوں کے والیوں ہی کے مختلف کارناموں کی اتنی تفصیلات ہیں، کہ ان کو قلم بند کیا جائے تو ہر صوبہ کی علحدہ علحدہ تاریخ ہوگی، پھر مرکزی حکومتوں کی حریف یا جگذار ریاستیں تو مستقل تاریخ کی مستحق ہیں، احسن آباد گلبرگہ کے بہمنی خاندان، بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین، تلنگ کے قطب شاہی بادشاہوں برار کے عماد شاہی حکمرانوں، اور بیدر کے برید شاہی والیوں نے جنوبی ہندوستان کی سیاست، معاشرت، تمدن، اور آرٹ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں، مالوہ

اور منڈو میں خلجی، برہان پور میں فاروقی خاندان اور گجرات میں مظفر شاہی حکمرانوں کے کارنامے فراموش نہیں کئے جا سکتے ہیں، گجرات کی خود مختار سلطنت اپنی علمی و تجارتی و بحری ترقیوں میں دلی کی مرکزی سلطنت سے کہیں بڑھ کر ہے، اسی طرح بیجانگر کی تاریخ بھی ہماری توجہ کی مستحق ہو، اور یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں، کہ اس ہندو سلطنت کی جنگی طاقت میں مسلمان سپاہیوں کو بھی خاص حیثیت حاصل تھی، ٹھٹھہ اور سندھ میں ایک اور التمش کے حریف حکمرانوں تاج الدین یلدوز اور ناصرالدین قباچہ کا دربار دہلی کے دربار سے کم پرشکوہ اور پُروقار نہیں رہا۔ ناصرالدین قباچہ کے بعد یہاں خاندان جام کی حکومت قائم ہوئی، تو اس کے تاریخی واقعات بھی گوناگوں رہے، ملتان کے لنکاہ سلاطین کی حربی عظمت اس دور میں اس لئے تھی کہ اُن کی حکومت ایک اہم سرحد پر واقع تھی، جنت زار کشمیر کے بادشاہوں کے حالات تاریخی لٹریچر کے لئے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں،

مذکورۂ بالا حکومتوں اور فرماں رواؤں کی تاریخ کی تدوین کے لئے ابھی حال ہی سے ہمارے موجودہ محققوں نے اپنی علمی جدوجہد کا ثبوت دینا شروع کیا ہے، عثمانیہ یونیورسٹی کے بعض اساتذہ دکن کی بعض حکومتوں خصوصًا بہمنی خاندان کے مختلف کارناموں کو روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، احمد آباد کی اینگلو ورنیکولر سوسائٹی گجرات کے اسلامی دور کی بھی تاریخ لکھا رہی ہے، سر جدوناتھ سرکار کی نگرانی میں بنگال کے ابتدائی مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کی ترتیب کی ۔۔۔ بھی خبر ملی ہے، ان مختلف خاندانوں اور ریاستوں کی تاریخی تحقیقات میں ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے، کہ ان کے ماخذ کی بڑی کمی ہے، خصوصًا معاصر تاریخوں کا پتہ تو بالکل نہیں ملتا، ان کی تاریخ زیادہ تر ایسی کتابوں میں ملتی ہے، جو تیموری دور میں لکھی گئیں،

فرشتہ نے بہمنی خاندان کی تاریخ کے ماخذ میں حاجی محمد قندھاری کا بہمن نامہ، ملا داؤد بیدری کی تحفۃ السلاطین، اور ملا عبدالکریم سندھی کی سوانح محمود گاواں کا ذکر کیا ہے، فرشتہ نے

شاہ خورشاہ ایک مورخ کا نام بھی لکھا ہے، جس نے ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں عراق سے آکر ہندوستان میں وقائع قطب شاہی لکھی تھی، مگر ان تمام کتابوں کا کہیں پتہ نہیں، گجرات کی ایک معاصر تاریخ محمود شاہی ہے، جو ۸۶۳ھ سے ۹۱۷ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، گجرات کے مظفر شاہ ثانی کے معاصر مانڈو پر بھی ایک نا معلوم مؤلف کی کتاب ہے، جو شاید اسی زمانہ میں لکھی گئی، مگر یہ دونوں کتابیں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں، ان دونوں کتابوں کے علاوہ گجرات کے مظفر شاہی خاندان کی معاصر تاریخوں کا حال معلوم نہیں، مالوہ کی تاریخ پر صرف ایک کتاب تاریخ ناصر شاہی کا پتہ ملتا ہے، جس میں مالوہ کے حکمراں ناصرالدین عبدالقادر شاہ کی حکمرانی کے واقعات ۹۰۶ھ سے ۹۱۶ھ تک کے درج ہیں، مگر یہ بھی ابھی تک قلمی نسخہ کی شکل ہی میں ہے، عادل شاہی، برید شاہی، عماد شاہی حکومتوں، برہان پور کے فاروقی خاندان، سندھ، کشمیر، ملتان، بنگال اور جونپور کے سلاطین کی بھی معاصر تاریخیں نہیں لیکن معاصر ماخذ نہیں ملتا ہے، تو بعد کی لکھی ہوئی مستند تاریخوں ہی سے فائدہ اٹھا کر مختلف صوبوں اور ریاستوں کے واقعات قلم بند کرنے چاہئیں، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ غیر مطبوعہ مخطوطات کو چھاپ کر زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔

حضرات! زیر نظر عہد کی تاریخ کی ترتیب میں شعراء کا کلام اور علماء و صوفیہ کی تصانیف بھی قیمتی ماخذ ہو سکتی ہیں، ہم اپنی تحقیقات میں زیادہ تر سلاطین اور فرمانرواؤں کے واقعات کو تحریر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر تاریخ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا نام نہیں، ہر زمانہ میں ملک کی عام علمی، تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی کیفیات کا جائزہ لینا تاریخ کا اہم موضوع ہے، چنانچہ پیش نظر دور کے شعراء میں سے ناصری خراسانی، محمد عوفی، امیر روحانی، سمرقندی، ابوالفرج رونی، تاج الدین دبیر، شہاب مہمرہ، امیر فخر الدین، عمید تولکی، بدر چاچ، مطہر کڑہ، خسرو

حسن سجزی، عبید، اعز الدین، خالد خانی اور شمس الدین وغیرہ کے کلام کا استقصاء کیا جائے، تو اس عہد کی نہ صرف علمی ترقیوں کا اندازہ ہوگا، بلکہ اُن کے اشعار کے درمیان بہت سے تاریخی واقعات کی بھی جھلک نظر آئے گی، مگر افسوس ہے کہ ان میں سے بہت کم ایسے خوش نصیب شعراء ہیں، جن کا کلام اور دیوان چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہونچ سکا ہے، اسی وجہ سے ان کی تحریروں کے ذریعہ سے کسی قسم کی تحقیق کرنے کی اب تک کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے، امیر خسرو کی نظمیں چھپ گئی ہیں، تو اُن سے تحقیقات کے سلسلہ میں مدد بھی لیجارہی ہے،

صوفیۂ کرام کی تصانیف ہندوستان کے اسلامی عہد کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی تاریخ کیلئے ایسی ضروری ہیں، کہ اُن کے بغیر تینوں پہلوؤں کی تصویر واضح نہیں ہو سکتی ہے، ہندوستان کے اسلامی دور میں دو قسم کی بادشاہت ساتھ ساتھ قائم تھی، ایک تو تخت و تاج کے حکمرانوں کی، اور دوسری خانقاہ کے بوریانشینوں کی، ایک توپ و تفنگ سے مملکت کو اپنے زیر نگیں کرتے تھے، تو دوسرے اپنے بلند اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کے ذریعہ سے ذہن و قلب کو تسخیر کرتے تھے، اور آج یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں میں کس کے اثرات زیادہ غالب رہے، مگر اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج بھی ان صوفیۂ کرام کی تصانیف ذہن کی پراگندگی کو سکون، قلب کے انتشار کو اطمینان، اور گمراہوں کی کج روی کو ہدایت بخشنے میں کامیاب اور موثر ہیں، چنانچہ اُن کی تصانیف کو بجا طور سے اسلامی دور کا ایک بیش قیمت خزانہ کہا جا سکتا ہے، اور اس دور کے مذہب، اخلاق، اور معاشرت میں ان صوفیائے کرام نے جو انقلابات پیدا کئے، اُن کو صحیح طور سے سمجھے بغیر اس عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی ہے، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، خواجہ شہاب الدین علی ہمدانیؒ، خواجہ نظام الدین احمد بدایونیؒ، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، ابو علی قلندرؒ، ضیاء الدین نخشبیؒ، خواجہ رکن الدین عماد کاشانیؒ، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، خواجہ گیسو درازؒ، شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، محمد غوث گوالیاریؒ

میر خورد دہلویؒ، عبداللہ شطاریؒ وغیرہ کی تصنیفات، مکتوبات اور ملفوظات میں اگر تلاش کیا جائے تو زیر نظر عہد کی تاریخ کے لئے بہت سے مواد فراہم ہو سکتے ہیں، اور اُن سے اخلاق و معاشرت کے رخ بہت اچھی طرح روشن ہو سکتے ہیں، مگر ان تصانیف کی طرف تاریخ ہند سے دلچسپی لینے والے محققین کی کی توجہ بالکل نہیں رہی ہے، اس لئے اُن کی نظریں بھی سلاطین کے میدانِ جنگ کے کشت و خون ہی تک محدود رہی ہیں،

ان صوفیۂ کرام کے ساتھ علمائے نے بھی ہندوستان کو ذہنی اور علمی حیثیت سے مالامال کیا، زیر نظر دور میں عرب اور وسط ایشیا کے اربابِ کمال سے ہندوستان علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا، ان علمائے نے اس عہد کی مختلف زبانوں میں جو تصانیف کی ہیں اُن کے مقدمہ یا خاتمہ میں اپنے زمانہ کے بادشاہوں کا کچھ نہ کچھ نام و نشان اور حال بھی لکھا ہے، خواہ وہ کتاب کسی فن پر لکھی گئی ہو جیسے نصاب الاحتساب، فتاوٰی تاتارخانی، تفسیر تاتاری، تفسیر بحر مواج دولت آبادی (طب) معدن الشفاء سکندری (تصوف) عین الحیوٰۃ، ترجمہ امرت کنڈ، باراہی سنکھا بھٹ بن اراہ مہر کی کتاب ہیئت کا فارسی ترجمہ ملا عبدالنبی احمد نگری کی دستور العلماء وغیرہ،

حضرات! ابتک ہمارے موجودہ محققین کی جماعت، زیر نظر عہد کے سلاطین کے سیاسی، حربی، اور ملکی کارناموں کی تفصیلات لکھنے میں منہمک رہی ہے، اس دور کے حکمرانوں کی مختلف تعمیرات کی جیتی جاگتی یادگاروں کا مطالعہ کرکے یورپین اہل قلم ان کے اس آرٹ اور فن کے کمال کی داد دیتے رہے ہیں، مگر اس زمانہ میں علوم و فنون تعلیم، تمدن، معاشرت، رفاہ عام کے کام، زراعت، حیوانات، صنعت و حرفت اور تجارت میں جو ترقیاں ہوئیں، اُن کا استقصا صحیح طور پر نہیں ہو سکا ہے، اس عہد کے علوم و فنون کی ترقی پر کلکتہ یونیورسٹی کے ایک اہل علم نے اپنی کتاب Promot-ion of learning in India during The mohamm-adan rule

کے چند ابواب میں روشنی ڈالی ہے، پٹنہ یونیورسٹی کے ایک لکچرر نے اس دور کے دو چار شعراء کے حالات لکھے ہیں، لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے امیر خسرو پر ایک کتاب لکھی ہے، ناگپور یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے "ہندوستان کے عہد مغلیہ سے پہلے دور کی فارسی" کے نام سے ایک کتاب پیش کی ہے، مگر پھر بھی اس عہد کے ادب و شاعری کی صحیح تصویر سامنے نہیں آسکی ہے، تعلیمی نصاب اور تعلیمی ادارے کا ہلکا سا خاکہ ہماری اکاڈمی کی ایک تالیف "اسلامی درس گاہیں" سے مل جاتا ہے، ہماری جماعت ندوۃ العلماء کے سابق ناظم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم نے بیس برس کی عرق ریزی سے عربی میں دس جلدوں میں فتح سندھ سے لے کر آخر اسلامی عہد تک ہندوستان کے علماء، و مشائخ و شعراء و مورخین کے حالات جمع کئے ہیں، جو بڑا نادر سرمایہ ہے، یہ اگر چھپ جائے تو محققین کی عمروں کا بہت بڑا حصہ ان معلومات کی تلاش و محنت میں ضائع ہو جانے سے بچ جائے، صرف اس کا ایک حصہ جو آٹھویں صدی ہجری سے متعلق ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوا ہے، مگر افسوس کہ پوری کتاب حلیۂ طبع سے محروم ہے، ابھی حال میں ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے "ہندوستان میں اسلامی نظام تعلیم و تربیت" پر ایک پُر از معلومات کتاب اردو میں لکھی ہے، جس میں شروع سے لے کر اس وقت تک تعلیم و تربیت کے اصول اور طریقوں اور تصنیف و تالیف اور کتابوں کی فراہمی وغیرہ کے حالات لکھے ہیں، زیر نظر عہد کی عام معاشرتی، اقتصادی، اور تجارتی تفصیلات کا ایک اچھا خاصا خلاصہ ڈاکٹر کنور اشرف کے قلم سے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی اشاعت Life and con-dition of people of Hindustani $\frac{1206}{1526}$ میں پیش کیا گیا ہے، ڈاکٹر اشتیاق کی کتاب سلاطین دہلی کے نظام سلطنت پر قابل تحسین ہے،

اس عہد پر جتنی کتابیں بھی پائی جاتی ہیں، اُن میں مختلف تمدنی پہلوؤں کو یا چند پیراگراف

یا زیادہ سے زیادہ ایک باب میں لکھ کر ختم کر دیا جاتا ہے، حالانکہ ان میں سے ہر پہلو پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے، لیکن اب تک اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے لئے کافی لٹریچر اور مواد موجود نہیں، بلکہ محض اس لئے کہ اس کی تحقیق و تدقیق میں غیر معمولی محنت، تلاش، جستجو، اور دقتِ نظر کی جو ضرورت ہے، وہ ہمارے نزدیک محققین کی جماعت میں ابھی پیدا نہیں ہو سکی ہے، اس لئے ہمارے ماضی کے تمدن کا صحیح اور روشن رُخ پیش نہیں ہو سکا ہے، اور ہمارے سامنے گذشتہ تاریخ کے زیادہ تر واقعات ایسے ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد دکھ اور رنج پہنچتا ہے،

اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنی شبلی اکیڈمی کی طرف سے آج سے چودہ[14] برس پہلے اردو میں ایک مکمل تاریخ ہند لکھوانے کا فیصلہ کیا، جس کی تقسیم دس بارہ جلدوں میں کی گئی تھی، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی تمدنی و تعمیری ترقی میں مسلمانوں نے کیا کام کیا، بحمد اللہ کہ یہ کام شروع کر دیا گیا ہے، اور اس وقت تک اس کی تین جلدیں مرتب ہو چکی ہیں، تمدنی کارناموں کی ایک جلد الگ تیار ہوئی ہے، ممکن ہے کہ اسی موضوع پر کئی اور جلدیں لکھی جائیں[1]،

خدا کا شکر ہے کہ اب اہلِ ہند کو اس ضرورت کا عام احساس ہو رہا ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انڈین ہسٹاریکل سوسائٹی کی بنیاد اسی غرض سے رکھی ہے، بنارس میں بھارت اتہاس پریشد اسی لئے قائم ہوئی ہے، اور ہم نے خوشی سے یہ بھی سنا کہ اس ہسٹاریکل کانگریس نے بھی جس میں ہم آپ جمع ہیں، ایک تاریخ ہند لکھوانے کا فیصلہ کیا ہے، اور اس کے لئے ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست نے شاہانہ امداد دی ہے، امید ہے کہ یہ تینوں سلسلے کامیابی کے ساتھ اپنے فرض کو انجام دیں گے، مگر ضرورت اصلی یہ ہے کہ جس کا اظہار تقریر کے آغاز میں کیا گیا تھا، اسی کی یاد دہانی

[1] اس خطبہ کے لکھنے کے بعد دار المصنفین سے تاریخ ہند پر حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور ابھی

تقریر کے اختتام پر کہا جائے، کہ اب اس کے بعد ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے، اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزار کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے اور کیوں مستقبل کے لئے یہ کوشش جاری رہے، کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہو سکے،

ہندوستان کے مورخو! تم ہندوستان کی صرف تاریخ نہ لکھو، بلکہ اپنے کارناموں سے ہندوستان کی نئی تاریخ بھی بناؤ، نیک ارادہ سے اٹھو، خدا تمھاری مدد کرے گا،

(معارف اپریل ۱۹۴۵ء)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۲) اور شائع ہوں گی، جو زیر ترتیب ہیں،

(۱) تاریخ سندھ از مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مرحوم (۲) بزم تیموریہ (۳) بزم مملوکیہ (۴) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک (۵) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، (۶) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، (۷) ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر (۸) ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں (۹) عہد مغلیہ ہندو اور مسلمان مورخین کی نظر میں از سید صباح الدین عبد الرحمٰن (۱۰) گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمان حکمرانوں کے عہد میں، از مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مرحوم (۱۱ و ۱۲) ہندوستان عربوں کی نظر میں ۱ و ۲ (۱۳) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے

(مرتب)

ہندی الاصل و ہندوی النسل مسلمان سلاطین

چار پانچ سال کی بات ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن نے مجھ سے یونیورسٹی میں توسیعی لکچر دینے کی خواہش کی تھی، اس تقریب سے میں نے اس مضمون کو تیار کیا تھا، ایک سال تو مضمون کی عدم تکمیل کے سبب بیتا، اس کے بعد ملک کے انقلابی حالات نے ایسی صورتیں پیدا کیں کہ یونیورسٹی کے تقاضے کے باوجود افسردہ دلی نے نقل و حرکت سے باز رکھا، اور یہ مضمون یونہی اہمال و تغافل کے جزودان میں پڑا رہا، اب جب اتفاق سے میرا کراچی آنا ہوا تو ان اوراق پر نظر ثانی کورس لئے دل چاہا کہ اس میں سندھ اور ملتان کے نومسلم بادشاہوں کے تذکرے تھے، اور جن کے لئے یہ سرزمین مناسب نظر آئی اس مضمون کے لکھنے اور اسے دائی حناک تیار کرنے میں میرے عزیز برادرزادہ مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی ریسرچ سکالر گجرات ورناکولر سوسائٹی احمد آباد نے میری مدد کی ہے جس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔

دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو شہرت عام کی بنا پر لوگ مسلّم سمجھنے لگتے ہیں لیکن جب تحقیق کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے تو حقیقت کے رُخ سے پردہ اٹھ جاتا ہے، اور صداقت کا روشن چہرہ صاف نظر آنے لگتا ہے، چنانچہ تاریخوں میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، مثلاً سندھ کے مسلمان عرب

فاتح محمد بن قاسم ثقفی کو خلیفہ کے حکم سے کھال میں سی کر، دار الخلافہ بغداد روانہ کرنا، اثنائے راہ میں اس کی وفات اور راجہ داہر کی دو لڑکیوں کا انجام بے بنیاد واقعہ ہے، اسی طرح سلطان محمود غزنوی کا سومنات مندر میں گرز، مورتی کے سر پر مارنا، خزانہ کا دستیاب ہونا بھی ایک کہانی ہے ٹھیک اسی قسم کی یہ بات بھی مشہور ہے کہ ہندوستان میں جتنے مسلمان بادشاہ ہوئے وہ سب غیر ملکی تھے، حالانکہ خاص ہندو نسل کے مسلمان بادشاہ تقریباً ہندوستان کے ہر صوبہ میں ہوئے، اور انھوں نے اپنے نمایاں کارناموں سے ملک کو بڑا فائدہ پہنچایا، مثلاً کشمیر، ملتان، سندھ، گجرات، دکن، دہلی وغیرہ آج کی مجلس میں انہی سلاطین کا تذکرہ کرنا ہے، جو خالص ہندی یا مخلوط ہندی النسل ہیں، اور بتانا ہے کہ ان لوگوں نے سلطنت یا کر ہندوستان کے دوسرے بادشاہوں سے ہندوستان کی کسی طرح کم خدمت نہیں کی، یہاں پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ لفظ ہندوستان پرانے معنی میں بولا جا رہا ہے، جو ہندوستان اور پاکستان دونوں کو شامل ہے،

تقریر کے موضوع بحث یعنی "ہندی الاصل اور ہندوی النسل سلاطین" سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ ہندوستان کے مسلمان شاہی خاندان، سب کے سب غیر ملکی نہ تھے، بلکہ ہر صوبہ میں ایسے مسلمان بادشاہ اور اُن کے خاندان گذرے ہیں، جو اپنی اصل و نسل کے لحاظ سے ہندی یا ہندوی تھے، اس لئے تمام مسلمان شاہی خاندانوں کو غیر ملکی سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں، دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ اسلام نے اپنی سیاست میں وہ راستہ اختیار نہیں کیا، جس پر دوسری قومیں گامزن ہیں، جنھوں نے اصل و نسب اور قومیت کو حاکمیت اور محکومیت کا معیار قرار دے لیا ہے، اسلام کی نظر میں قومیت اور وطنیت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے، اس کا منتہائے نظر زندگی کا ظاہری اور باطنی اسلوب وہ ہے جس کو اصطلاح میں "دین" کہتے ہیں جب کبھی کسی غیر مسلم نے معتقدات اسلام اور قانون اسلام کی زندگی کو قبول کیا ہے، تو اُس کیلئے

ترقی کی غیر محدود وسعتیں پیدا ہوگئی ہیں، یہاں تک کہ باطنی حیثیت سے ایک نومسلم کبھی علم اور دین کی امامت اور پیشوائی کے درجہ کو پہنچ گیا ہے، تو دوسری طرف سلطنت اور حکومت کے تخت اس کے لئے بارہا بچھائے گئے ہیں،

سلاطینِ ہند کی تقسیم | ہندوستان میں ابتداے اسلام سے برٹش حکومت کے اختیار لینے تک چار قسم کے سلاطین حکمراں رہے، اوّل وہ جن کا وطن ہندوستان نہیں، بلکہ غیر ملک تھا، جیسے قطب الدین ایبک شمس الدین التمش، دوسرے وہ جن کی ولادت تو ہندوستان میں ہوئی، مگر اُن کے والدین ہندی نسل کے نہ تھے، جیسے معز الدین کیقباد، بغرا خاں وغیرہ، تیسرے ایسے سلاطین جو مخلوط النسل ہیں یعنی اُن کے باپ تو غیر ہندی ہیں لیکن اُن کی مائیں ہندی نسل کی ہیں، جیسے فیروز شاہ تغلق، جہانگیر، اور شاہجہان وغیرہ، چوتھے وہ فرماں روا جو ہر حیثیت سے ہندی ہیں، یعنی اُن کے باپ اور مائیں دونوں ہندی نسل کی ہیں، اور ان کی ولادت بھی اسی ملک میں ہوئی ہے مثلاً ظفر خاں گجراتی، قطب الدین لنگاہ (ملتان) وغیرہ میری تقریر کا تعلق ان میں سے صرف دو آخری قسم کے سلاطین سے ہے، ایک وہ جو والدین کے لحاظ سے، ایک طرف سے بیرونی، اور دوسری طرف سے ہندی ہیں، اور دوسرے وہ جو باپ و ماں دونوں طرف سے ہندی ہیں،

ان سلاطین کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، اور تقریباً ہندوستان کے ہر صوبہ میں وقتاً فوقتاً ایسے بادشاہوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں، اور انھوں نے انتظامِ مملکت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا ہے، ان میں سے بعض خاندان ایسے ہیں جنھوں نے دو سو برس ہندوستان میں استقلال کے ساتھ سلطنت کی، اور اپنی بہترین یادگاریں چھوڑیں، ہم ان سلاطین کا تذکرہ دہلی کے مرکز سے شروع کرتے ہیں،

ان نومسلم سلاطین میں سے جنھوں نے دہلی کے تختِ حکومت پر قدم رکھا، پہلا نام خسرو خاں

کا ہے، خسرو خاں پٹن (گجرات) کا رہنے والا، مذہب کا ہندو اور ذات کا بھڑواڑ (گڈریا) تھا، سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں مالوہ کی لڑائی میں قید ہوکر دہلی آیا، اور مسلمان ہوا، اور اس کا اسلامی نام "حسن" رکھا گیا، سلطان کے حاجب ملک شادی نے اس کی پرورش کی، قطب الدین خلجی کے عہد میں اُس نے بہت نمایاں کام انجام دیئے، جن کے صلہ میں اُس کو "خسرو خاں" کا خطاب ملا، ۷۱۸ھ میں قطب الدین خلجی نے اس کو چتر و دورباش دے کر معبر (کرناٹک) روانہ کیا، وہ دیوگیری ہوکر تلنگانہ پہنچا، اور فتحیاب ہوکر پتنی چلا گیا، اور کامیابی حاصل کرکے معبر میں برسات کے سبب سے مقیم ہوگیا،

اس جنگ میں ایک ہزار بیس ہاتھی چھ درم کے برابر ایک ہیرا اور بے شمار دولت اُس نے حاصل کی، اور اب اُس نے خود مختاری کا خواب دیکھنا شروع کیا، دوسرے ترکی افسروں نے اس کو گرفتار کرکے ڈاک کے ذریعہ سات دن میں دہلی پہنچا دیا، لیکن قطب الدین نے اس کی چرب زبانی سے متاثر ہوکر اپنے بڑے بڑے افسروں کو خسرو خاں کی شکایت پر قتل کرڈالا، اور اس کو گجرات کا ناظم بنا دیا، اور پھر نائب ملک کا بھی عہدہ دیا،

خسرو خاں نے آہستہ آہستہ ہم قوم بھرواڑیوں کی ایک فوج تیار کی، اور ایک دن موقع پاکر بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ حضور کی خدمت سے فرصت نہیں ملتی، اگر حکم ہو تو اپنے رشتہ داروں کو محل میں بلا لیا کروں، بادشاہ نے اجازت دیدی، اُس نے اس بہانے سے رات کے وقت بھرواڑوں کا ایک دستہ اندر بلالیا، اور اُن کے ہاتھ سے دھوکہ سے قطب الدین کو قتل کرا کے خود بادشاہ بن بیٹھا، بڑے بڑے امراء کو عہدے دے کر اپنا طرفدار بنا لیا، اور جو ساتھ دینے پر راضی نہ ہوئے اُن کو قتل کرڈالا، اور اس طرح خسرو خاں ہندوستان کا بادشاہ اور مسلمانوں کا سلطان بنا، اور چار ماہ چند دن سلطنت کی، یہ بڑا حوصلہ مند اور ہوشیار اور چالاک شخص تھا، اُس نے چند ہی مہینوں میں

چالیس ہزار فوج جمع کر لی تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کی قوم نے جو بالکل جنگلی تھی، عام مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، خسرو خاں اپنی جنگی مصلحتوں کو مدِ نظر رکھ کر اُن کی ان غلطیوں کو نظر انداز کرتا رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عام مسلمانوں کی ہمدردی حاصل نہ کر سکا، اور اس سے خلجی امراء میں سے بہت سے لوگ ناراض ہوگئے، انہی میں سے ایک محمد جونا تغلق بھی تھا جس کا باپ ملک غازی تغلق دیبالپور سندھ کا حاکم تھا، خسرو خاں نے محمد جونا تغلق کو داروغۂ اصطبل کا عہدہ دیا تھا لیکن وہ خسرو خاں سے خوش نہ تھا، موقع کا منتظر رہا، اور ایک دن موقع پا کر دلی سے بھاگ کر اپنے باپ کے پاس چلا گیا اور خسرو خاں کی قوت و جمعیت اور مسلمانوں کی ناراضگی اور امراء کی نا اتفاقی کے سارے احوال سے مطلع کر کے لڑائی کا مشورہ دیا، اس لڑائی میں خسرو خاں مارا گیا، اور دہلی پر ملک غازی کا قبضہ ہو گیا، اور تغلق سلاطین کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا، لیکن یہ تغلق کون تھا ؟

تغلق | ایک ترکی لفظ ہے، جس کے معنی پہاڑی کے ہیں، یہ پشتو لفظ رہیلہ کے مرادف ہے، تغلق کے متعلق سب سے قدیم بیان ابن بطوطہ کا ہے، وہ لکھتا ہے کہ "شیخ رکن الدین قریشی ملتانی سے میں نے سُنا ہے کہ تغلق ترک قوم کے قبیلہ قرونہ سے تھا، اور یہ لوگ ترکستان اور سندھ کے بیچ کے پہاڑوں میں رہتے تھے" لفظ قرونہ کی نسبت آٹھویں صدی کا مشہور سیاح مارکو پولو اس طرح تشریح کرتا ہے، "کہ قرونہ ان لوگوں کو کہتے ہیں کہ جن کے باپ تاتاری اور ماں ہندی ہوں[1]" ان لوگوں کا پیشہ لوٹ مار اور قزاقی ہے، جہاں یہ چلے جاتے ہیں، اس ملک کو بے چراغ

---

[1] بعض لفظ اپنے اندر تاریخ کا خزانہ رکھتے ہیں، اوپر کی چند سطروں میں تین نام آئے ہیں، قزاق، بربر، جٹ، یہ تین قوموں کے نام ہیں، مگر قوموں کے ان ناموں میں ان قوموں کی تاریخی صفات نے قوم کے معنی کے بجائے قوم کی صفات کا جامہ پہن لیا ہے، قزاق، قازاق کی صورت میں روس کے ایک مسلمان قبیلہ کا نام ہے، جن کا پیشہ لوٹ مار تھا، اس سے قزاق ڈاکو کے معنی پیدا ہو گئے، بربر شمالی

کرڈالتے ہیں، ان کا سردار نکودار ہے، جو چغتائی کا بھتیجہ ہے''۱؎ دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو قرونہ کا تومان (دس ہزار کا لشکر) مغلوں کے لشکر کے ساتھ ہوتا تھا لیکن بعد میں انھوں نے لوٹ مار اپنا پیشہ بنا لیا، مشہور ہے کہ اصل میں یہ لوگ چین کے شمال میں قردن چیدن یا فیدن ایک پہاڑ کے پاس رہتے تھے،

خلاصۃ التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ "سلطان کا باپ تغلق ایک ترک سلطان غیاث الدین بلبن کے غلاموں میں سے تھا، اور اس کی ماں پنجاب کی قوم جٹ سے تھی" بہرحال خلاصۃ التواریخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرونہ کے لفظ سے ابن بطوطہ کے راوی شیخ قریشی نے یہی مراد لی ہے، ادم مارکوپولو کا بیان بھی صحیح معلوم ہوتا ہے، اور صاف صاف یہ پتہ چلتا ہے کہ تغلق قوم کا نام نہ تھا بلکہ شخص کا نام تھا، اس خیال کی تصدیق بعض سکوں سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ غیاث الدین کے ایک سکہ پر ہے،

"السلطان الغازی غیاث الدنیا والدین المظفر تغلق شاہ السلطان ناصر امیر المومنین"

اور اس کے لڑکے کے سکہ پر

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۸) افریقہ کا قبیلہ ہے، جو آوارہ گرد وحشی تھا، رومیوں نے اس نام کو صفت بنا کر بربر ازم (اور بربریت کو وحشت اور عدم تمدن کے معنی میں مشہور کر دیا، جٹ سندھ کا قبیلہ تھا، جو غیر متمدن اور جنگجو اور نوشت و خواند سے عاری تھا، اسی سے ہندوستان میں جٹ کی اصطلاح پیدا ہوئی، ہو سکتا ہے کہ جٹ اور جاٹ ایک لفظ ہوں، پنجابی میں بیچ کا لفظ الف اکثر گر جاتا ہے، جیسے کھاٹ سے کھٹ وغیرہ ۱؎ جٹ کے نام سے پنجاب سے زیادہ سندھ کے لوگ واقف ہیں، کہ انھوں نے سندھ کی جنگی تاریخ میں کافی حصہ لیا ہے، اور ان کا اصل پیشہ شتربانی ہے جس سے وہ کبھی کبھی جہانبانی تک پہنچے،

"المجاہد فی سبیل اللہ محمد بن تغلق شاہ[۱]"

نقش ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تغلق شخص کا نام ہے، خاندان کا نہیں، اب یہ تغلق نام یا تو خود ملک غازی غیاث الدین کا ہے یا اس کے باپ کا، اور اغلب یہی ہے، کہ خود اس کا نام تھا،

فرشتہ لکھتا ہے کہ میں جب لاہور گیا، تو اہلِ علم سے اس معاملہ کی تحقیقات کی لیکن کسی نے تغلق کے متعلق صحیح اور قابلِ وثوق بات نہیں بتائی، البتہ یہ بات کہی کہ "عام طور پر مشہور ہے کہ غیاث الدین تغلق کا باپ ملک تغلق بلبن کے غلاموں میں سے تھا، اُس نے کسی پنجابی جٹ لڑکی سے شادی کرلی تھی، جس سے غیاث الدین تغلق پیدا ہوا، جٹوں کا تعلق مسلمانوں سے بہت پرانا ہے، عرب اُن کو زط اور زدط کہتے ہیں، اور سندھ میں اُن کی بڑی آبادی تھی، ان تمام بیانات سے جو ایک دوسرے کی تائید میں ہیں، یہ ثابت ہوتا ہے کہ تغلق گو نسلاً خود ترک تھا، مگر اس کی بیوی پنجاب کے کسی جٹ کی لڑکی تھی، جس کے بطن سے غیاث الدین تغلق پیدا ہوا، اور اُس کے بعد اُس کے خاندان نے ۷۲۰ھ سے ۸۱۵ھ تک پچانوے ۹۵ برس حکومت کی،

غیاث الدین کے اصلی نام کا پتہ نہیں چلا، تخت سلطنت پر قدم رکھنے سے قبل اس کو ملک غازی کہتے تھے، اس کے ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں، غالباً ابتدائے جوانی میں خراسان سے سندھ آیا، پہلے کسی سوداگر کا ملازم ہوا، پھر الغ خاں خلجی کے لشکر میں سپاہی بن گیا، اور جب کچھ دست ہوئی، اور گھوڑا بہم پہنچ گیا، تو سواروں میں داخل ہوا، اور اپنی بہادری سے سب کے دل پر سکہ جما لیا، اور اس طرح درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے میر اخور (داروغۂ اصطبل) ہوگیا، جو اس عہد میں بہت بڑا عہدہ تھا، اور صرف وفادار امیروں کو اس پر ممتاز کیا جاتا تھا، اور اس زمانہ میں چونکہ مغلوں کا

---

[۱] یہ دونوں سکے میرے برادر زادہ مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورناکیولر سوسائٹی کے پاس ہیں،

بڑا نازور تھا، اس لئے سرحدی علاقے مخصوص وفادار امیروں کے حوالے کئے جاتے تھے، چنانچہ ملک غازی کو بھی دیوپال پور کا علاقہ سپرد ہوا، جو آج بھی مونٹ گمری (پنجاب) کے ضلع میں بیاس (ندی) کے پرانے شکم پر پاک پٹن سے ۲۸ میل مشرق کی طرف واقع ہے، وہ عرصہ تک اسی جگہ رہا، اور اس کا بڑا لڑکا محمد جونا جس کے نام پر شہر جونپور یوپی میں بسایا گیا، ہے، پایہ تخت دہلی میں رہتا تھا، قطب الدین کے بعد نومسلم امیر خسرو خاں گجراتی اپنے آقا کو دھوکے سے قتل کرکے تخت پر بیٹھ گیا، تو جیسا اوپر گذرا، ملک غازی تغلق نے لڑکر اس سے سلطنت چھین لی، اور سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے یکم شعبان ۷۲۰ھ کو تخت پر بیٹھا، اور چند سال بڑی شان وشوکت سے سلطنت کرکے ربیع الاول ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۴ء میں چھت گرنے سے وفات پا گیا، چالیس دن کے بعد اس کا بڑا لڑکا فخر الدین محمد جونا تخت نشین ہوا، اور پورے پچیس برس حکومت کرکے دق کی بیماری میں مبتلا ہو کر ۷۵۲ھ میں مرگیا،

سلطان فیروز شاہ تغلق ملک تغلق کے ساتھ اس کے دو بھائی ابوبکر اور سپہ سالار رجب بھی تھے، ملک تغلق (۷۵۹ھ ہجری) دیوپال پور کا حاکم تھا، اس نے جب اپنے بھائی سپہ سالار رجب کی شادی کرنی چاہی تو رانا مل بھٹی کی لڑکی کا انتخاب کیا، ملک سعد الملک شہاب عفیف کو منگنی کے لئے راجہ کے پاس بھیجا، جو ضلع ابوہر کا حاکم تھا، اور بھٹیوں کا ملک انہی کے زیر اثر تھا، اس لڑکی کا نام "نائلہ" تھا، کچھ ردو کد کے بعد نسبت قرار پا گئی، اور پھر جلد دونوں کا نکاح ہوگیا، جب نائلہ رجب کے گھر آئی تو اس کا نام "کدبانو" رکھا گیا، چند سال کے بعد (۷۰۶ھ ۔ ۷۱۲ھ) کدبانو کے بطن سے ..... فیروز شاہ پیدا ہوا، ملک تغلق نے بڑی خوشی منائی، اور لوگوں کو انعام و اکرام سے مالامال کیا، اس بیان سے معلوم ہوا کہ فیروز جو آگے چل کر فیروز شاہ کے نام سے پہلے سندھ میں تخت نشین ہوا، ماں کی طرف سے بھٹی تھا، جو پنجاب کا ایک مشہور قبیلہ ہے، اور بہت سے اکابر

کے ناموں کیساتھ خاندانی لقب کی حیثیت سے اب بھی مستعمل ہے،

فیروز شاہ جب سات برس کا ہوا (۷۱۹ھ) تو سپہ سالار رجب کا انتقال ہوگیا، اس کے چچا ملک تغلق نے اس کی پرورش کی، اور اپنے بچوں کے ساتھ مثل اپنی اولاد کے اس کو پالا اور رکھا، ملک تغلق نے جب ۷۲۵ھ میں وفات پائی تو اس کی عمر ۱۶ برس کی تھی، ملک تغلق کے بعد سلطان محمد تغلق کی تخت نشینی سے اس کو بڑا فائدہ یہ ہوا، چونکہ دونوں تقریباً ہم سن تھے، اور ساتھ کھیلے ہوئے تھے، اس لئے وہ اس کو اپنا بھائی سمجھ کر اس کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا، اور چونکہ خود بھی غایت درجہ فرمانبردار، بہی خواہ اور نیک بخت تھا، اس لئے سلطان کی نظر عنایت اس پر ہمیشہ رہی،

محمد شاہ نے تخت نشیں ہوکر فیروز کو نائب امیر حاجب کا عہدہ بخشا، اور نائب باربک کے خطاب سے سرفراز کیا، اس وقت بارہ ہزار سوار اس کے زیر فرمان تھے۔ انتظامی امور کے سبب سلطان نے دہلی کے چار حصے کرکے ہر ایک پر ایک سردار مقرر کیا تھا، انہیں سے ایک حصہ کا افسر فیروز تھا،[۱]

فیروز شاہ کو شکار کا بڑا شوق تھا، اور اس فن کا وہ بڑا ماہر تصور کیا جاتا تھا، فارغ اوقات میں اکثر شکار کھیلتا، سفر میں بھی جب فرصت ملتی، تو اس کا شغل رکھتا، چنانچہ سفر گجرات کے وقت ہم اس کو شکار میں مشغول پاتے ہیں، ۷۴۶ھ میں جب وہ گجرات آیا ہے، تو شکار کھیلنے میں رات ہوگئی، اور شب باشی کے لئے تنہا وہ ایک قصبہ میں پہونچا، جس کو تھاسیر (یا تھاسرہ) کہتے ہیں، جو راجپوت قبیلہ ٹانک کے قبضہ میں تھا، قصبہ کے ایک پٹیل سہارن نامی نے اپنے گھر میں مہمان اتارا، سہارن کے دوسرے بھائی کا نام سادھو تھا، عالم سرور میں شہزادے نے اپنی حقیقت ظاہر کی، تو سہارن اور سادھو نے اپنی کنواری بہن کو شہزادہ کے نکاح میں دیدیا،[۲] اور صبح کو جب اس کا لشکر نکلا تو فیروز شاہ

---

[۱] فیروز شاہی عفیف ص ۴۱ تا ۴۴ کلکتہ [۲] مرأۃ سکندری ص ۷،

اپنی نئی بیوی اور اُس کے دونوں بھائیوں کو لے کر محمد شاہ کے پاس پہنچا، اور پھر اس کے ساتھ ٹھٹھ گیا، تقدیر کا کرشمہ دیکھیے، سلطان محمد تغلق محرم ۷۵۲ھ میں بمقام ٹھٹھ وفات پا گیا، اور اسی سرزمین سیہوان کے مقام پر جیسا کہ پروفیسر محمد شفیع صاحب نے کتبات سے ثابت کیا ہے، وہ سپرد خاک ہوا، ارکان دولت کے مشورے سے یہیں سندھ کی سرزمین میں فیروز شاہ تخت سلطنت پر رونق افروز ہوا، اور لشکر کا انتظام کر کے دہلی چل پڑا، سرستی کے مقام پر ۷۵۲ھ میں اس گوجرانی کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام فتح خاں، رکھا گیا، دہلی پہونچ کر اس نے ایک محل تیار کرایا، جس کا نام گوجری محل رکھا، چنانچہ عرصہ دراز تک دہلی میں گوجری محل قائم اور مشہور رہا، اس کی مرنج و مرنجاں طبیعت کے سبب سے ملک میں ہمیشہ امن رہا، اور کبھی کوئی بدنظمی ہوئی تو فوراً اس کو دبا کر امن قائم کر دیا، محمد شاہ کے آخری عہد میں جو بدنظمی پیدا ہو گئی تھی، اس کو درست کیا، ملک کو آباد کرنے کی بے حد کوشش کی، ٹھٹھ، بھیم گڈھ (کانگڑہ) گجرات، قنوج، بنارس، بہار، ترہت، بنگالہ، خاندیس، میں بذاتِ خود جا کر بگڑے ہوئے معاملات کو سدھارا، ۳۸ سال کئی ماہ سلطنت کر کے ۷۹۰ھ میں اس نے وفات پائی، "وفاتِ فیروز" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے،[۱]

آپ نے فیروز تغلق کو پہچانا، اول تو یہ پدری نسبت سے تغلق خاندان کا تھا، جس کی مادری اصل جٹ تھی، اس کا ننہال بھٹی تھا، اور اس کی ایک بیوی گوجری تھی، اس کا لڑکا فتح خاں اسی گوجری کے بطن سے پیدا ہوا تھا، ۷۶۵ھ میں سلطان فیروز شاہ نے فتح خان کو اپنا ولی عہد بنایا، اس وقت سراپردہ سرخ اور ہاتھی عنایت کیا، خطبہ، گرز، اور سکہ اس کے نام سے جاری کیا،[۲] پھر فراش خانہ، چتر لعل، اور سامان سلطنت عنایت کئے، شاہزادہ سواری، اور علم مجلس میں

---

[۱] منتخب التواریخ ص ۲۵۵، کلکتہ۔ [۲] چنانچہ اس کے متعدد سکے گجرات ورنیکیولر سوسائٹی احمد آباد میں موجود ہیں،

بڑا ماہر تھا، بڑا متین اور صاحب وقار تھا، اس عمر میں مقدمات کا فیصلہ بڑوں کے سامنے اس عمدگی کے ساتھ کرتا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے، اگر یہ شاہزادہ زندہ رہ گیا ہوتا تو اس خاندانِ (تغلق) کی عمر کچھ بڑھ گئی ہوتی، لیکن افسوس کہ سلطان فیروز کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی، یہ شاہزادہ عمر کی پچیس بہاریں دیکھ کر ۱۲ر صفر ۷۷۶ھ میں اس خرابۂ عالم سے رخصت ہوگیا،

خان جہاں | آپ حیرت سے سنیں گے کہ سلطان فیروز شاہ کے عہد میں نائب السلطان یعنی قائم مقام سلطان کا عہدہ خان جہاں نام ایک نو مسلم امیر کو حاصل تھا، یہ امیر اصل میں تلنگانہ کا ایک ہندو نو مسلم تھا، جس نے محمد تغلق بادشاہ کے ہاتھ پر فتح تلنگانہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا، اس کا ہندوانہ نام "کنور" تھا، اسلامی نام مقبول رکھا گیا، اور بڑھتے بڑھتے مسند وزارت تک پہنچا،[۱] پہلے قوام الملک پھر خان جہاں اس کا خطاب ہوا، تمام مہمات ملکی اور بندوبست مالی کا سرانجام اس کے ہاتھ سے ہوتا تھا، اور جب بادشاہ فتوحات یا سیر و شکار کے لئے دہلی سے باہر جاتا، وہ اس زمانہ میں بادشاہ کی نیابت کرتا تھا، بلکہ یہ عہدنامہ اس کو لکھ دیا تھا، کہ جب تک قائم ہے سلطنت میرے خاندان میں اور وزارت تیری اولاد میں رہے گی،[۲] اس سے اندازہ ہوگا کہ سلاطین اسلام نے کسی نسل و نسب کو جاہ و منصب کے لئے مخصوص نہیں کیا تھا، جب ہندوستان پر ۸۰۰ھ میں تیمور کا حملہ ہوا تو تغلق خاندان کا شیرازہ بکھر گیا، اخیر جانشین محمود ۸۱۵ھ میں مر گیا، اور اسی پر تغلق خاندان کا خاتمہ ہوگیا، اور دہلی کی سلطنت سیدوں کے ہاتھ میں آئی،

سلاطین تغلق کے کارنامے | تغلق خاندان نے جس کے نونہو تعلقات نو مسلم خاندانوں سے رہے، تقریباً سو برس تک ہندوستان پر حکومت کی، اس عرصہ میں بہت اچھے اچھے کام کئے، انھوں نے مغلوں کے اچانک حملوں کا سدباب کیا، بہت سے نئے شہر آباد کئے، جن میں ایک دہلی کے پاس فیروزآباد

---

[۱] فیروز شاہی سراج عفیف، ص ۳۹۴، [۲] شمس سراج عفیف ص ۴۰۰،

اور دوسرا یورپ میں جو نیو مشہور ہیں بعض اچھے اچھے قانون جاری کئے، جابرانہ اور ایک وحشیانہ سزائیں موقوف کیں، شراب کی قطعی طور پر بندش کی گئی، خراج کی وصولی میں آسانیاں پیدا کیں، مختلف قسم کے جبریہ ٹیکس موقوف کئے گئے، حکام کے انتخاب میں بڑے غور و فکر سے کام لیا، اور اچھے لوگوں کو اہم خدمات پر مامور کیا، اور اس کا خیال رکھا کہ حاکم ایماندار اور خدا ترس ہو، اور اگر اس کے خلاف کبھی کوئی واقعہ پیش آتا، تو فوراً تحقیقات کے بعد معزول کیا جاتا، جیسا کہ فیروز شاہ کے عہد میں کئی بار ہوا، فیروز شاہ نے احتیاطاً قتل کی سزا بھی موقوف کر دی تھی، دینی مفسدوں کو جو ملک میں بدامنی کا باعث ہوئے، خارج البلد کر دیا، عام مجمعوں سے مردوں عورتوں کا خلا ملا قانون کے ذریعہ ممنوع قرار دیا، ہندوؤں پر اعتماد کرکے اُس نے دو صوبوں کی نظامت اُن کے سپرد کی، ایک سندھ اور دوسرا گرنار یعنی جونا گڑھ، اس وقت تک فوج میں صرف ترک تھے، افغانوں پر بھروسہ نہیں کیا جاتا تھا، مگر فیروز شاہ نے اُن کو فوج میں بھرتی کیا، اور اچھے اچھے عہدے اُن کے سپرد کئے، مغلوں کے خیال سے فوج کی بڑی تعداد ہر وقت رکھنی پڑتی تھی، اسی زمانہ سے یہ رواج پھر شروع ہوا، کہ فوجی عہدہ داروں کو نقد تنخواہ کے عوض بڑی بڑی جاگیریں دی گئیں، لوٹ کا مال جس کا صرف پانچواں حصہ فوج کو ملتا تھا، اس کو اس طرح بدل دیا، کہ صرف پانچواں حصہ خزانۂ شاہی میں داخل ہو، باقی سب فوج میں تقسیم کر دیا جائے، محمد تغلق کے زمانہ میں فقط دہلی میں سُتّر شفاخانے تھے، جہاں بیماروں کو دوا کے ساتھ کھانا بھی ملتا تھا، اور ایک ہزار مدرسے تھے، جہاں طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام تھا[۱]، فیروز شاہ تغلق نے اس میں اور بہت اضافہ کیا، اُس نے پچاس نہریں، تیس مدرسے، بیس خانقاہیں، ایک سو محلات، پانچ شفاخانے، ایک سو مقبرے، دس حمام، ایک سو پچاس کنوئیں، ایک سو پل جدید بنوائے،

دہلی کے قریب فیروز آباد کے نام سے شہر آباد کیا گیا تھا، اس میں عالیشان مسجدیں اور مدرسے

---

[۱] صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۹۱ مصر،

تعمیر ہوئے، ہندوستان میں سب سے پہلے گھنٹہ گھر اسی نے فیروز آباد میں تعمیر کرایا، سلطان محمد تغلق کے عہد میں سڑکیں بکثرت تھیں، ڈاک کا بڑا اچھا انتظام تھا، ڈاک مختلف قسم کی رائج تھی، ڈاک، نقارہ، ڈاک کبوتر، گھوڑوں کی ڈاک، شتر سواروں کی ڈاک وغیرہ، بڑے بڑے علماء حکماء اس کے دربار میں حاضر رہتے، امیر خسرو، بدرچاچی، مطہر کڑہ شاعر، ضیا برنی مورخ، سید منطقی، گانگو برہمن منجم، حضرت نظام الدین اولیاء، رکن عالم ملتانی، نصیر الدین چراغ دہلوی، مخدوم جہانیاں جہاں گشت جیسے مشائخ اس عہد میں موجود تھے، محکمۂ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا بھی قائم تھا، بعض سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، انہی میں دلائل فیروز شاہی کے نام سے ایک سنسکرت کتاب کا فارسی میں ترجمہ ہوا، جو حکمت طبیعی میں تھی، اس کا مترجم مشہور شاعر عزالدین خالد ثانی ہے، اس کے علاوہ فال اور شگون کی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے، فتاویٰ تاتارخانیہ، اور تفسیر تاتارخانی بھی اسی عہد کی یادگار ہیں، تاریخ فیروز شاہی عفیف، تغلق نامہ وغیرہ اسی عہد میں لکھی گئیں، فتوحات فیروز شاہی کے نام سے خود سلطان فیروز شاہ نے ایک کتاب لکھی، اور اس کو فیروز آباد کی جامع مسجد کے ہشت پہل برجوں پر کندہ کرایا،

قحط کے ایام میں محمد تغلق نے آب پاشی کی ایک اسکیم تیار کی تھی، جو نامکمل رہ گئی تھی، فیروز شاہ نے اس کی تکمیل کر کے پچاس نہریں نکالیں، جس سے کاشتکاری کو بڑا فائدہ پہنچا، اور بہت سی زمین کاشت میں آگئی، اسی سبب سے اس عہد میں غلہ کی بڑی ارزانی رہی، محمد تغلق کے عہد میں گندم ۱۲ جیتل کا ایک من، جو ۸، چنا ۴، اور فیروز کے زمانے میں گندم ۸، جو ۴، چنا ۴ جیتل کا ایک من، ایک من ۲۸ سیر کا، اور جیتل ایک پیسہ کے مساوی تھا، سلطان محمد تغلق کے عہد تک جیتل سب سے چھوٹا سکہ تھا، اس نے غریبوں کا خیال کر کے اس کے بھی چھوٹے چھوٹے حصے کر کے بنوائے، ہندوستان سے بھی اس عہد میں میل ملاپ کو بہت ترقی دی گئی، ترجمے کے لئے کچھ پنڈت مقرر کئے گئے، ہندو جوگیوں سے محمد تغلق اکثر تخلیہ میں

ملاقات کرتا تھا،

ہندوؤں کے ساتھ ازدواجی تعلقات کا سلسلہ بھی اس خاندان سے شروع ہوا، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں بہت سے ہندو خاندان مشرف باسلام ہو کر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے غیر ملک سے بھی تعلقات اچھے تھے، خلیفہ کے سفیر محمد تغلق اور فیروز شاہ کے زمانے میں متعدد بار آئے اور گئے، تجارت کو کافی فروغ ہوا، خراسان، عراق، عرب، مصر، ترکستان اور افریقہ کے تاجروں سے ملک بھرا رہتا تھا، بندرگاہوں میں غیر ملکی جہاز ہر وقت آتے جاتے رہتے، افریقہ سے فیروز شاہ کے زمانے میں ہاتھی کئی مرتبہ لائے گئے،[1] بھروچ، کھنبایت، مانگرول، ٹھٹھہ مشہور بندرگاہیں تھیں، مانگرول، کھنبایت، بھروچ، دھولکہ میں اُن کی بنائی ہوئی مسجدیں آج بھی موجود ہیں، ابن بطوطہ اس عہد کا مشہور سیاح ہے، ایک بڑی خوبی اس خاندان کی یہ ہے کہ ہندوستان کا چاندی سونا کسی صورت سے ہندوستان سے باہر جانے نہیں دیتا تھا، اس عہد میں گچ پر سونے کا کام بڑے اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا، چھتوں میں ایسی نقاشی کرتے کہ پھولوں کا چمن نظر آتا،[2]

یہ کارنامے ایسے مسلمان بادشاہوں کے ہیں جو گو باپ کی طرف سے ترک، مگر ماں کی طرف سے ہندی الاصل، اور ہندی النسل تھے، دلی کی مرکزی حکومت کے علاوہ اطراف وجوانب میں خود مختار ریاستیں جن مسلمانوں نے قائم کیں، وہ زیادہ تر ہندی تھے، ان ریاستوں میں سب سے پہلا نام سندھ کا ہے،

سندھ | سندھ محمد بن قاسم کی فتح کے بعد عرصۂ دراز تک خلیفہ کے بھیجے ہوئے والیوں کے ماتحت رہا، اور دریائے سندھ کے دونوں طرف کے حصے ایک ہی حاکم کے ماتحت تھے، اس عرصہ میں بہت

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول، تاریخ برنی، تاریخ عفیف، فتوحات فیروز شاہی ملاحظہ ہوں [2] بزم تیموریہ ص ۲۶۶ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ،

سے عرب خاندان سندھ میں آباد ہو گئے، جیسے بنو منبہ (ملتان میں) ہباری قریشی (منصورہ میں) بنو ثقیف (بھکر اور میں) ان کے علاوہ بنی تمیم، آلِ مغیرہ، عباسی، صدیقی، فاروقی، عثمانی، اشعری، بنو اسد، بنو عتبہ، سادات، وغیرہ، ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئے، صدیوں سندھ میں رہنے سہنے، شادی بیاہ کرنے سے اُن کی اصل عربی معاشرت میں فرق آ گیا، اور آہستہ آہستہ وہ مخلوط معاشرت کے خوگر ہو گئے، اور پھر خاندان کے نام سندھی تلفظ میں ایسے ہو گئے، کہ شناخت مشکل ہو گئی، مثلاً مغیرہ سے موریہ اسی لئے مورخین کو اس صوبہ کی تاریخ لکھنے میں بہت مغالطے پیش آتے ہیں[1]، خاکسار نے اپنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں اُن میں سے بہت سے مغالطوں کو دور کیا ہے،

ابتدائے عہد میں زمین کے بڑے بڑے قطعات، مثلاً صوبہ تحصیل وغیرہ ان خاندانوں کو ٹیکس وصول کرنے اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے سپرد کئے گئے، جن پر وہ نسلاً بعد نسلٍ بطور وراثت قابض رہے، مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اُن میں سے قریش کے ایک خاندان نے اپنی حکومت قائم کر لی، اس خاندان کا پہلا حاکم عمر بن عبد العزیز ہباری ہوا، جو ۲۴۰ھ میں سندھ کا خود مختار حاکم بنا، اور تیس برس حکومت کر کے وفات پا گیا، اس کے بعد اس کا لڑکا عبد اللہ تخت نشین ہوا، ۲۷۹ھ میں ایک عام بلوہ ہوا، جس میں صمہ جو بنو کندہ کا غلام تھا، سندھ پر قابض ہو گیا، گو منصورہ پر عبد اللہ کا دوبارہ قبضہ ہو گیا، معلوم ہوتا ہے کہ ملتان اس کے اقتدار سے باہر رہا۔ کیونکہ بنو سامہ کا خاندان جو عمان میں آباد تھا، اس کی ایک شاخ بنو منبہ ملتان میں بس گئی تھی، اس نے بدامنی سے فائدہ اٹھا کر ملتان پر قبضہ کر لیا، اور ۲۹۰ھ ہجری میں بلا شرکت غیرے وہ ایک بڑی طاقت در اور وسیع سلطنت ہو گئی، غرض سندھ کے دونوں حصوں پر یہی دونوں قبیلے عرصۂ دراز تک حکمراں رہے

۲۷۰ھ میں جب فاطمی حکومت مصر میں قائم ہوئی، تو عبد اللہ المہدی کی طرف سے داعی

---

[1] تحفۃ الاکرام جلد سوم ص، بمبئی،

ابوالقاسم بن فرخ کا بھائی ہیثم نامی سندھ میں ان کا پہلا داعی بن کر آیا، اور فاطمی حکومت کی دعوت میں مصروف ہوگیا۔[۱] عزیز باللہ خلیفہ (متوفی ۳۸۶ھ) کے عہد میں جلم بن شیبان یا شیبان کو فوجی مدد کے ساتھ سندھ بھیجا گیا، جس نے اچانک ۳۶۳ھ کے بعد ملتان پر قبضہ کر لیا،[۲]

یہ امر قابل ذکر ہے کہ سندھ و بلوچستان کے علاقے چونکہ بحرین و عمان اور یمن کے سواحل سے آمد و رفت اور تجارت کے ذریعہ پیوستہ تھے، اس لئے عربی سواحل کے مذہبی و سیاسی اثرات سندھ و بلوچستان کے مسلمانوں پر لازماً پڑتے رہے، اس کا نتیجہ تھا کہ سندھ کے سومرہ نام قبیلہ نے جس کی اصلیت پر پردہ پڑا ہوا ہے، غالباً ۴۰۱ھ میں اسماعیلی دعوت قبول کر لی، ۴۰۱ھ میں محمود غزنوی نے جب ملتان کی اسماعیلی سلطنت کا خاتمہ کر دیا، تو گمان غالب یہ ہے کہ یہ لوگ ملتان سے بھاگ کر منصورہ چلے آئے، اور اچانک منصورہ کو ہباری خاندان سے چھین کر، وہاں اپنی حکومت قائم کر لی، ۴۱۶ھ میں محمود غزنوی نے یہاں سے بھی اُن کو بے دخل کر دیا، اب ملک میں اُن کی کوئی مرکزی حکومت نہ رہی لیکن چھوٹے بڑے زمیندار جن کو ہندوستانی عام طور پر راے اور راجہ کہتے ہیں، متعدد تھے جن میں سے سومرہ کا خاندان سب سے زیادہ طاقتور تھا، اسی سبب سے مصر کے فاطمی امام نے اس کو سندھ کی مذہبی سرداری عطا کی، اور شیخ کا خطاب عنایت کیا، یہ خاندان سندھ میں تقریباً دو سو برس سے باجگذار کی حیثیت سے ملک کے ایک حصہ پر قابض تھا،[۳] جن میں سے اُن کے نامور اشخاص بھونردا، جو دل بیلا ہیں ہیں، سومرہ اول، سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ) کا ہم عصر ہے، اور چونکہ اُس نے سُلطان سے مقابلہ کی طاقت اپنے میں نہیں دیکھی، اس لئے اپنی جگہ پر خاموش رہا، اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے پال بن سومرہ کو جو سلطان مسعود غازی (۴۲۱ھ تا ۴۳۰ھ) کا ہم عصر تھا، دروزیوں (شام میں اسماعیلیوں کا ایک فرقہ) کے امام نے خط لکھ کر ابھارا، غالباً اُسی وقت سے

---

[۱] نزہتہ الافکار قلمی و موسم بہار جلد سوم ص ۲۴ و ص ۷۷، [۲] یمنی، [۳] موسم بہار جلد سوم د

ملک کے تمام اسماعیلی خاندان سامرہ (سومرہ) کی معیت میں انقلاب کی کوشش میں لگ گئے" اور دس برس کے بعد سلطان عبدالرشید غزنوی (۴۴۴ھ تا ۴۴۱ھ) کے عہد میں مرکزی سلطنت کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر سومرہ دوم نے بمقام تھری ریگستانی علاقے میں ۴۴۵ھ (مطابق ۱۰۵۳ء) میں ایک سلطنت قائم کی، اور سندھ کے ایک زمیندار سعد نامی کی لڑکی سے شادی کر لی، جس سے اس کا ولی عہد پیدا ہوا[۵۱] یہ خاندان روز بروز ترقی کرتا گیا، اور آہستہ آہستہ تمام سندھ اور ملتان پر قابض ہو گیا، ۵۷۱ھ میں سلطان محمد غوری نے اسماعیلیوں سے ملتان لے لیا، تب اچھ میں انھوں نے سلطنت جمائی ۵۷۴ھ میں اس نے اچھ بھی چھین لیا، اور سندھ پر علی کرماخ کو حاکم بنایا، اس وقت سے محمد تغلق کے عہد تک سندھ اور ملتان دونوں دہلی کے ماتحت رہے، اور ایک حاکم (صوبہ دار) ہمیشہ وہاں حکومت کرتا رہا، لیکن سومرہ (اسماعیلی) ایک ماتحت ... ...

... ...

کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے میں کامیاب رہے، وہ ہر وقت آزادی کی فکر میں لگے رہتے" جب کبھی اس کا موقع ملتا، آزاد ہو جاتے، اور مجبور کئے جانے پر پھر ماتحت ہو جاتے، جیسا کہ علاء الدین خلجی، ملک تغلق، سلطان محمد تغلق کے ابتدائی دور اور آخری عہد میں ہوتا رہا[۵۲] ۷۵۲ھ کے بعد اور ۷۶۳ھ کے درمیان سمہ قوم نے سومریوں سے سلطنت چھین لی، اس پوری تاریخ میں ہم کو ان ہی دو قوموں یعنی سومرہ اور سمہ سے تعلق ہے، جس پر پوری تفصیل سے "عرب و ہند کے تعلقات" میں بحث کی جا چکی ہے،

سومرہ قوم کی اصلیت | سومرہ قوم کے متعلق جس نے پانچویں صدی ہجری کے اواسط سے آٹھویں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۹) کتاب الہند بیرونی، ۵۳ تحفۃ الکرام جلد سوم ص ۲۷، بمبئی،

۵۱ تاریخ معصومی ص ۶۰ بمبئی، و تحفۃ الکرام، ۵۲ تحفۃ الکرام جلد سوم ص ۱۲۲ بمبئی و سفرنامہ

صدی کے دواسط تک سندھ پر حکومت کی، اتنا تو یقینی طور سے ثابت ہے، کہ یہ مذہبًا مسلمان اور مسلکًا اسماعیلی تھے لیکن اُن کی قومیت پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے، جو کسی طرح نہیں اُٹھتا،

اُن کے نام بیشتر ہندوانہ ہیں، اور بعض مورخین کی تصریح بھی ملتی ہے، کہ وہ ہندو تھے، یورپ کے مورخوں نے تو علانیہ لکھا ہے، کہ یہ نومسلم راجپوت تھے، مگر قیاس کے سوا انھوں نے اس کی کوئی سند پیش نہیں کی ہے، اسی سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اسماعیلی دروزی امام کا ایک خط ہے جس میں ۴۲۳ھ میں شیخ ابن سومر راجہ بل کو سندھ اور ملتان میں دوبارہ اسماعیلی حکومت کے قیام کے لئے غیرت دلائی گئی ہے، شیخ بن سومر راجہ بل کے نام سے اس کا نومسلم ہندو ہونا ظاہر ہوتا ہے، تاریخ معصومی میں جو ۱۰۱۰ھ کی تصنیف ہے، یہ لکھا ہے کہ غزنویوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سومرہ (مردم سومرہ) نے سومرہ نام ایک شخص کو اپنا افسر بنا کر حکومت قائم کرلی، اور صاد نام ایک زمیندار کی لڑکی سے شادی کی، جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام بھونگر رکھا گیا، اور وہ اس کا جانشین ہوا، اس کے بعد اس کی نسل سے چند اور بادشاہ ہوئے، لفظ صاد کا املا کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے، میں نے "عرب و ہند کے تعلقات" میں اس کو "سعد" قرار دیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو قیاس ہوتا ہے کہ نومسلم سومری راجہ نے کسی قدیم عرب مسلمان خاندان میں شادی کی، اور اس سے نسل چلی، "اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ قبیلہ ہندی عربی مخلوط نسل کا تھا، اس خاندان کے بادشاہوں کے نام معصومی کی کتاب میں حسب ذیل ملتے ہیں :-

(۱) سومرہ (۲) بھونگر (۳) دودا (۴) تاری (شہزادی کا نام) (۵) سنگھار (۶) ہمون سنگھار کی بیوہ (۷) پھتو (شاید کہ بھٹو ہو) (۸) خیرا (۹) ارمیل،

تاریخ طاہری میں جو ۱۰۳۰ھ کی تصنیف ہے، سومرہ قوم کی اصلیت کے متعلق یہ مذکور ہے،

(بقیہ حاشیہ ۴۲۰) ابن بطوطہ جلد دوم اردو،

کہ سندھ میں دلورائے ایک راجہ تھا، اس نے اپنے بھائی چھوٹا امرانی پر ظلم کیا، چھوٹا امرانی فریاد لے کر خلیفہ بغداد کی خدمت میں گیا، خلیفہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

. . . .

نے سامراہ (عراق کے شہر کا نام) کے سوعربوں اور سادات کو اس کے ساتھ کر دیا، سیدالسادات نے سندھ آکر سکونت اختیار کرلی، اور دلورائے نے اپنی لڑکی اس سے بیاہ دی، تاریخ طاہری نے دلورائے اور اس کے بھائی کے اختلاف کی وجہ یہ لکھی ہے کہ یہ چھوٹا بھائی بچپن سے اسلام کی طرف مائل تھا، اور قرآن پڑھا تھا، اور دل میں مسلمان ہو گیا تھا، وہ چھپ کر حج کو چلا، راستے میں ایک عجیب طریقہ سے فاطمہ نام ایک لڑکی سے شادی کر لی، اس کتاب میں یہ بھی مذکور ہے کہ سومرہ قوم سامرہ کے عربوں سے نکلی ہے، جو سندھ میں دوسری صدی ہجری میں قبیلہ تمیم کے ساتھ آئی تمیم عباسیہ کے زمانہ میں سندھ کے گورنر مقرر ہوئے تھے"

غرض سومرہ کی وجہ تسمیہ کو مصنف نے عراق کے "سامرا" سے نکالنے کی کوشش کی ہے لیکن سب سے پہلے یہ جاننا چاہئے، کہ شہر سامرہ جس کی عربی اصل "سر من رای" (جو اس کو دیکھے وہ خوش ہو) یہ شہر معتصم عباسی نے ۲۲۱ھ میں بسایا تھا، دوسری صدی میں اس کا نام و نشان بھی نہ تھا، پھر عباسی دور میں قبیلہ تمیم کا جو گورنر موسیٰ بن کعب تمیمی نام سے آیا تھا، وہ سفاح کے زمانہ ۱۳۲ھ ۱۳۶ھ میں یہاں آیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب کہ سامرہ کا وجود بھی نہ تھا، اس لئے سومرہ قوم کے نام کا جوڑ شہر سامرا سے پیدا کرنے کی کوشش لفظی صنعتگری کے سوا کچھ اور نہیں ہے،

تحفۃ الکرام میں سومرہ بادشاہوں کے نام حسب ذیل لکھے ہیں،

۱۔ سومرہ (۲) بھنگر بن سومرہ (۳) دودا ابن بھونگر (۴) سنگھر (۵) حفیف (یا خفیف) (۶) عمر (یا انر) (۷) دودا دوم (۸) بھتو (۹) گھنرا اول (۱۰) محمد نور (۱۱) گھنرا دوم (۱۲) دودا سوم

(۱۳) نائی (۱۴) چنیر (۱۵) بھونگر دوم (۱۶) حفیف (یا خفیف دوم) (۱۷) دودا چہارم (۱۸) عمر سومرا (۱۹) بھونگر (۲۰) ھمیر (یا امیر)

ظاہر ہے کہ ان ناموں کی ساخت تمامتر عربی ہے، عمر نام حقیقت میں اثر یا اذنار ہے، چنانچہ یہی نام ابن بطوطہ اور سراج عفیف میں ہے، حفیف اس سومرہ سردار بادشاہ کا نام تھا، جو سلطان محمود غزنوی کا معاصر تھا، چنانچہ سلطان کے درباری شاعر فرخی نے سومنات کی فتح پر جو قصیدہ دربار میں پیش کیا تھا، اس میں اس کا نام موجود ہے،

۶۲۰ھ سے ایک دو سال پہلے سلطان جلال الدین خوارزمشاہ چنگیزی مغلوں سے بھاگ کر سندھ میں بمقام ٹھٹھہ آیا، تو اس وقت کے سومری بادشاہ کا نام فرشتہ میں جنیر لکھا ہے، جو اصل میں جنیر ہی ہے، طبقات ناصری میں "ملک سنان الدین چنیر والی دیول وسندھ" کے لقب و نام سے اس کا ذکر آیا ہے، جس نے ۶۲۵ھ میں بادشاہ دہلی کی اطاعت[۵۱] قبول کی تھی، چنیر کی اصل ایک عزیز[۵۲] "چندا ایشور" (چندر چاند، اور ایشور خدا) نام کی یہ اصل ایک ہندو نسل کا پتہ دیتی ہے، اور ملک سنان الدین کا لقب اس کے اسلام کو ظاہر کرتا ہے،

ان سومری بادشاہوں کے نام معتبر معاصر حوالوں سے ثابت ہیں، بعض ناموں کی تصحیح قیاساً بھی کی جاسکتی ہے، مثلاً سومرہ نام کی اصل سوم رائے معلوم ہوتی ہے، سوم کے معنی ہندی میں چاند کے ہیں، وہ اصل میں رائے ہے جیسے لبرا جو گجراتی راجاؤں کا عربی تلفظ کا نام ہے اصل میں دلبھ رائے ہے، اسی طرح سنگھر کو سنگھ رائے اور بھونگر کو بھونگ رائے گنھرا کو گھن رائے ہفتو کو بھفتو سمجھا جائے،

فرخی نے والی منصورہ حفیف کی شکست اور فرار کی جو کیفیت اپنے قصیدہ میں لکھی ہے

---

[۵۱] حواشی تاریخ معصومی از ڈاکٹر داؤد پوتا [۵۲] عزیزی مولوی عبدالقدوس ہاشمی ندوی،

اس موقع کے چند شعر قابلِ ذکر ہیں :-

وزان حصارِ منصورہ روے کرد براند | بدان ستارہ کجا راند حیدر از خیبر
خفیف چون خبرِ خسرِ جہان بشنید | دوان گذشتہ وبجوے اندر افتاد بجر
خفیف را پئہ پیل و مال چندان بود | کہ بیش ازان نبود در ہوا ہبا ناذر

ان شعروں میں گو خفیف کو سومری نہیں کہا گیا ہے، مگر مورخین نے خفیف کو سومرہ سلاطین ہی کی فہرست میں درج کیا ہے،

ان شعروں میں اس بادشاہ کی فوج، ہاتھی، اور مال ومنال کا یہ حال لکھا ہے کہ وہ شمار میں غبار ذرہ سے بھی زیادہ تھا، اس کو کسی قدر زیادہ مبالغہ سمجھا جائے، پھر بھی وہ اہمیت رکھتا ہے،

پایۂ تخت | اس کا پتہ واضح طور سے نہیں چلتا، کہ سومرہ قوم کا اصل وطن سندھ کے کس حصہ میں تھا، تاریخ کی چھان بین سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی بڑی آبادی سندھ کے مشرقی جانب کے زیریں حصہ " میں ضلع پارکر اور تھری میں تھی، اور اسی لئے ان کا پہلا سیاسی مرکز تھری محمد نور مقام میں تبدیل ہو گیا، اور وہ ان کا عرصۂ دراز تک پایۂ تخت رہا، عمرکوٹ یا امرکوٹ (امرکوٹ) بھی عرصہ تک ان کا پایۂ تخت بنا رہا، سلطان محمود کے زمانہ میں ان کا پایۂ تخت منصورہ تھا، جس کا دوسرا نام بقول ابوالفضل بھکر ہے، سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں اچھدان کا پایۂ تخت تھا، اور آخر زمانہ میں (سنہ ۷۵۲ھ) ان کا مرکزی مقام ٹھٹھ نظر آتا ہے، اس سے اندازہ ہو جاتا ہے، کہ ان کی سلطنت کی وسعت ملتانی سرحد سے لے کر زیریں سندھ کے نصر پور بلکہ کچھ (کچ) تک تھی، جس میں مختلف انقلابوں کے بعد وہ اپنا پایۂ تخت بدلتے رہے،

اس قوم کے افراد کی تعداد کا صحیح پتہ معلوم نہیں ہو سکا، لیکن محمود بیگڑہ (گجرات) کے عہد (نویں صدی) میں سندھ کی جو فوج اس کے مقابلہ کے لئے آئی تھی، اس کی تعداد چالیس ہزار تھی، اس سے اُن کی آبادی کا ایک خفیف سا اندازہ لگا سکتے ہیں،

ان لوگوں نے سندھ پر تین سو برس سے زیادہ حکومت کی، جس میں اس قوم کی مختلف شاخوں نے حصہ لیا، ان کے بعض حکمراں چالیس برس تک برسرِ حکومت رہے، انھوں نے جس قدر گانوں شہر اور قصبے آباد کئے، اُن کی صحیح فہرست ہم تک نہیں پہونچی، لیکن تین بڑے شہروں سے ان کا تعلق معلوم ہوتا ہے، امرکوٹ (عمرکوٹ) تھری، اور ٹھٹھہ سے، ان شہروں میں انھوں نے متعدد قلعے بھی تیار کئے، جن کا ذکر تحفۃ الکرام میں موجود ہے، لیکن چونکہ محمد تغلق کے عہد تک مغلوں کی یورش بکثرت سندھ پر ہوئی، اس سبب سے ان کی اکثر عمارتیں ویران ہوگئیں، اور بہت کم آثار باقی رہے،

سمہ سندھ کی دوسری نومسلم قوم سمہ ہے، جس نے سومرویں کے بعد ملک میں طاقت حاصل کی، طبقاتِ بہادر شاہی میں ہے کہ سمہ قوم اُن لوگوں میں سے ہے، جو تمیم انصاری کے خاندان کے ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ سندھ میں ان کا وجود عربوں کے سندھ فتح کرنے سے قبل نظر آتا ہے، چنانچہ چچ نامہ میں جو سندھ کی سب سے قدیم تاریخ ہے مذکور ہے، کہ محمد بن قاسم کے پاس سمہ قوم کے کچھ لوگ آئے، اور اطاعت کے صلہ میں انعام حاصل کیا[1]، اس کے علاوہ کچھ اور کاٹھیاواڑ میں بھی ان کا خاندان تھا، اور آج بھی موجود ہے، جو ہندو مذہب رکھتا ہے، کچھ اور جام نگر کے ہندو جام سمہ خاندان سے ہیں، جونا گڈھ میں سمہ خاندان نے ۸۷۵ سے ۱۴۷۲ء تک یعنی چھ سو برس حکومت کی[2]، اُن کا مذہب بھی ہندو تھا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سمہ قوم سندھ میں اسلام سے قبل موجود تھی، مذہب ہندو تھا، اس قوم نے اسلام قبول کر لیا، مگر ان کے اسلام کی صحیح تاریخ نہیں معلوم (س) بیلائے مسلمان

[1] چچ نامہ قلمی کتب خانہ دار المصنفین اعظم گڈھ [2] تاریخ مصطفیٰ آباد (جونا گڈھ) حصہ اول ص ۴۴ بمبئی،

والی آج بھی جام کہلاتے ہیں، جام کے لفظ سے بعض لفظ پرستوں نے جام جمشید سے ان کا رشتہ جوڑا ہے جو سراسر وہم ہے،

اسلام | تاریخ طاہری کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام مخدوم زکریا ملتانیؒ کے فیض کے اثر سے یہ لوگ مسلمان ہوگئے، کیونکہ اس قوم کے امراء سے اُن کے تعلقات وابستہ تھے، اس کے بعد اُن کے خلیفہ جلال الدین بخاری اور اُن کے پوتے مخدوم جہانیان جلال الدین حسین بخاری کے ذریعہ اس قوم میں اسلام کی اشاعت ہوئی، اور یہ قوم آخر تک حضرت مخدوم کی اولاد کے ساتھ عقیدت کا نذرانہ پیش کرتی رہی، چنانچہ احمدآباد (گجرات) میں بھی قطب عالمؒ اور شاہ عالمؒ کے ساتھ اُن کے تعلقات بڑے گہرے رہے، اور اسی سبب سے جام نے اپنی لڑکی شاہ عالم صاحبؒ سے منسوب کر دی تھی[1] جن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، مگر زندہ نہ رہا، اُن کے نام بھی نومسلم ترکوں کی طرح کہیں خالص سندھی، اور کہیں اسلامی مخلوط ملتے ہیں، یہ مذہب کے لحاظ سے مسلمان اہل سُنت والجماعت سے تھے، اور اسی لئے سندھ کے جاموں کی شادیاں گجراتی سلاطین کے ساتھ ہوتی رہیں،

تاریخ طاہری میں مرقوم ہے کہ سمہ قوم کی آبادی سمندر کے کنارے تھی، جو لوگ جزیرہ نمائے کچھ میں گئے، وہاں انھوں نے اپنی حکومت قائم کی جو آج تک قائم ہے، اسی طرح کچھ سے نکل کر کاٹھیاواڑ کے شمال مغربی ساحل پر جنھوں نے قبضہ کیا، وہاں جام نگر بسا کر پایۂ تخت بنایا، اور وہ ریاست بھی آج تک موجود ہے، تیسرے گروہ نے کاٹھیاواڑ میں جوناگڈھ کو آباد کیا، جس کی حکومت گجراتی سلاطین نے ختم کر دی، اور یہ سب ہندو تھے، لیکن دریائے سندھ سے لیکر کچھ مکران تک کی آبادی نومسلم سمہ کی تھی، راے کچھ کے زیر سایہ رہتے رہتے جب طاقتور ہوگئے تو کچھ پر قبضہ کر لیا[2]، اور آہستہ آہستہ بالائے سندھ آبادی بڑھاتے گئے، سومرہ قوم کے آخری زمانہ میں یہ

---

[1] مرآۃ سکندری، ص ۴۴، [2] تحفۃ الکرام جلد سوم ببئی،

طاقت در ہوگئے تھے، اور آخری سومرہ بادشاہ جس کا پایۂ تخت ٹھٹھ تھا، محمد تغلق سے جنگ لڑتے لڑتے بے حد کمزور ہوگیا تھا، سمہ قوم کا سردار انار نامی نے اس سے فائدہ اٹھا کر انقلاب سلطنت کی کوشش کی، اور اس میں کامیاب ہوا، (۷۵۲ھ یا ۷۶۶ھ) پہلے ان کا پایۂ تخت ساموئی تھا، اور سومریوں پر فتح پانے کے بعد ٹھٹھ ہوگیا،

اُن کے حکمرانوں کی فہرست مندرجۂ ذیل ہے،

(۱) جام انار (۲) جام جونا (۳) جام تماجی (۴) جام خیر الدین (۵) جام بابھنیہ (۶) جام تماجی دوم (۷) جام صلاح الدین (۸) جام نظام الدین (۹) جام علی شیر (۱۰) جام دن، (۱۱) فتح خاں (۱۲) جام تغلق (۱۳) جام مبارک، (۱۴) جام سکندر (۱۵) جام راے دون (۱۶) جام سنجر (۱۷) جام نندا نظام الدین (۱۸) جام فیروز، جام فیروز سے شاہ بیگ ارغون والی قندھار نے ۹۲۷ھ میں سندھ کا ملک چھین لیا، اس خاندان نے ۱۹۲ برس حکومت کی،[۵]

سمہ ابتدا میں سومریوں سے جنگ کرنے میں مصروف رہے، اور جب استقلال کے ساتھ تمام حکومت ہاتھ میں آگئی، اور امن و امان قائم ہوگیا، تو ملک کو فروغ دینے میں مصروف ہوگئے، چنانچہ جام سنجر نے سب سے پہلے عدالت کی طرف توجہ کی، اور وہ تمام خرابیاں جو عدالت، قاضی، شاہد اور اس محکمہ کے عمال میں ہوتی ہیں، اُن کو دور کرنے کی بیحد کوشش کی، قاضیوں کی تنخواہیں بہت زیادہ کردیں، تاکہ رشوت کا سد باب ہو، خیر الدین کے عہد میں قافلوں اور کاروانوں کے راستوں کی حفاظت اور تجارت کو بہت فروغ ہوا، ڈاکوؤں کا قلع قمع کیا گیا، سمہ قوم سیدوں کی بڑی عزت کرتی تھی، انھوں نے مدرسے اور خانقاہیں بنائیں، بڑی بڑی مسجدوں کی بنیادیں رکھیں، ہمسایہ سلطنتوں سے اچھے تعلقات قائم رکھے، چنانچہ ملتان اور گجرات کے

---

[۵] معصومی اور عرب و ہند کے تعلقات،

سفیر ایک دوسرے کے یہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے، گجراتی بادشاہوں کے ساتھ ان کے ازدواجی تعلقات بھی قائم ہوگئے تھے جس کے باعث بعض اوقات سیاسی فائدہ بھی اٹھالیتے علماء کے بڑے قدردان تھے، محمد بن سعد جلال الدین دوانی کو سندھ میں آنے کی انھوں نے دعوت دی تھی لیکن موت نے علامۂ موصوف کی آمد کی آرزو پوری نہ ہونے دی، مولانا میر معین الدین سید ابو الغیث مولانا محمد، اثیر الدین بہری (منطقی) مخدوم عبد العزیز بہری، محدث جیسے یگانۂ روزگار فاضلوں نے سندھ میں عمریں گزار دیں، عمدۃ الملک دریا خان اور سارنگ خاں جیسے وزرا سندھ میں وزارت پر مامور رہے، کاشتکاری اور باغبانی پر بھی انھوں نے کافی توجہ کی، ارغون کے آنے سے قبل سندھ میں بکثرت باغات تھے، اُن کے لئے بڑے بڑے کنوئیں بنوائے گئے، جن کو اونٹ کھینچتے تھے، تجارت کو فروغ ہوا، ملتان، کشمیر، خراسان، اور گجرات وغیرہ دوسرے صوبوں اور ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم تھا،

جام نظام الدین کے حالات میں معصومی نے لکھا ہے کہ

"جام نظام الدین در اوائل حال طالب علم می بود، و در خوانق و مدارس می گذرانیده و بغایت متواضع و خلیق بود، و بصفات پسندیدہ و اخلاقِ حمیدہ متصف و زہد و عبادت بدرجۂ کمال داشتہ و فضیلت و حالتِ او زیادہ ازان بود کہ شمۂ ازاں تحریر تواں نمود" (ص ۷۰)

اس کی صلح پسندی کی یہ تصویر ملاحظہ ہو:-

"جام نظام الدین ہر ہفتہ باصطبل خود می رسید و دست بہ پیشانی اسپاں می کشیدہ و می گفتہ کہ اے دولت منداں غیر غزا نمی خواہم کہ سواری بہ شما واقع شود چرا کہ در حد و دار بلغ حکام اسلامند، دعا کنید کہ بے سبب شرعی بجائے نروم و کسے نیز ایں جا نیاید، مبادا

خونِ مسلمانان بے گناہ ریختہ شود، وعند اللہ سبحانہ شرمسار شوم"

اس کے زمانے میں سندھ میں احکامِ شریعت کی ترویج کا حال یہ تھا، کہ

"در زمان دولت او احیاے سنن نبوے شیوع یافتہ بود کہ مافوق آں تصور نتواں کرد، و در مساجد اقامت جماعت بہ نہجے می بود کہ خرد و کبیر محلہ در مسجد حاضر آمدہ بگذاردن نماز تنہا راضی نبودند، اگر وقتے از یکے جماعت فوت شدے بغایت نادم گردیدہ و در دو سہ روز باستغفار مشغول می بود" (ص ۷۵-۷۶)

سلاطین لنگا ملتان میں | نویں صدی ہجری کے وسط میں ملتان پایہ تخت دہلی کے ماتحت ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا، سیدوں کے آخری بادشاہ علاء الدین کے عہد میں کابل، غزنہ اور قندھار پر مغلوں کے قبضہ ہو جانے کی وجہ سے وہ ملتان پر جو قندھار کے بالمقابل واقع ہے، آئے دن یلغار کرکے لوٹ مار کرتے تھے ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) میں ایسی حالت ہو گئی کہ وہاں کوئی حاکم نہ رہا، اس لئے اہلِ شہر نے مل کر شیخ بہاء الدین کی خانقاہ کے متولی شیخ یوسف قریشی کو اپنا حاکم بنایا، ملتان، اُچھ اور ارد گرد کے مقامات میں اُن کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا گیا، ملتانیوں کی خوش قسمتی سے شیخ میں حکومت کی اعلیٰ لیاقت موجود تھی، اُن کے حسنِ انتظام سے تمام مخلوق خوش ہو گئی، ملتان کے اطراف میں ایک نومسلم قوم لنگاہ رہتی تھی، جو نسلاً راجپوت تھی، اس قوم کا سردار رائے سہرا نام قصبہ سوی کا زمیندار تھا، اس کے آباؤ اجداد حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اور اُن کے خلفاء کی تبلیغ سے اسلام لائے تھے، اُس نے شیخ یوسف کو پیغام دیا کہ سلطان بہلول لودی بادشاہ دہلی کی طرف سے ہمیشہ خطرہ لگا رہے گا، اس لئے فوری امداد کے لئے میری قوم لنگاہ کا دل ہاتھ میں لیجئے تاکہ وہ وقت پر کام آئے، شیخ نے اس کی درخواست منظور کی اور اس کی استدعا پر اُس کی لڑکی سے شادی بھی کرلی، وہ لڑکی کے بہانے کبھی کبھی آیا بھی کرتا تا ایک دفعہ اپنی پوری قوم کو ساتھ لایا، اور

شیخ سے عرض کیا، کہ میری قوم کا معائنہ کرکے میرے لائق کوئی خدمت عنایت کریں، شیخ نے قبول کیا، رائے عشاء کے وقت لڑکی سے ملنے کے بہانہ قلعہ میں داخل ہوا، اور پھر فریب سے لنگاہ قوم کو اندر لاکر قلعہ پر قبضہ کرلیا، اور شیخ یوسف کو نکال دیا، شیخ دہلی پہونچے، اور بہلول لودی سے مدد کے طالب ہوئے، شیخ نے کل گیارہ ۱۱ برس حکومت کی،

رائے سہرہ نے ملتان پر قبضہ کرکے ۸۵۸ھ مطابق ۱۴۵۴ء میں تخت سلطنت پر قدم رکھا، اور اپنا لقب قطب الدین لنگاہ مقرر کیا، یہ شخص بڑا مدبر تھا، اس انقلاب کے باوجود اس نے کسی قسم کی بدامنی نہیں ہونے دی، یہ بڑا محنتی آدمی تھا، اہل کمال کا بے حد قدردان تھا، بادشاہ کا سارا وقت ان کل پرزوں کے درست کرنے میں صرف ہوتا، جو بادشاہ گردی سے بگڑ گئے تھے، اور مغلوں کی لوٹ مار سے جو ویرانی چھا گئی تھی، اس کو دور کرنے پر توجہ مبذول کرتا رہا، سولہ ۱۶ سال سلطنت کرکے ۸۷۴ھ مطابق ۱۴۶۹ء میں دنیا سے رخصت ہوگیا،

اس کے مرنے پر اس کا بڑا لڑکا حسین لنگاہ تخت نشین ہوا، حسین جفاکش، صاحب علم اور اور اہل ہنر کا قدرداں تھا، اس نے ابتدا ہی میں قلعہ شور پھر چنیوٹ پر قبضہ کرلیا، شیخ یوسف نے بہلول لودھی کو توجہ دلائی، کہ حسین لنگاہ دھن کوٹ (سرحد پنجاب) تک آگیا ہے، چنانچہ لودی نے اپنے لڑکے باربک شاہ کو فوج لے کر ملتان بھیجا، جس کو حسین شاہ نے بآسانی شکست دیدی، اور کوٹ کرور کے حاکم کی بغاوت کو جو خود اس کا بھائی تھا، فرو کرکے انتظام سلطنت میں مشغول ہوگیا، روہیلہ قوم کا سردار ملک سہراب ملتان آیا، اور بادشاہ کا ملازم ہوگیا، بادشاہ کی عنایت دیکھ کر قوم بلوچ ملتان آ دھمکی، اور شاہی وفاداری کا یقین دلا کر جاگیریں حاصل کیں، اس سے حسین شاہ کے پاس ایک اچھی بہادر قوم کی فوج تیار ہوگئی، سمہ قوم کے دو سردار بایزید اور ابراہیم بھی سندھ چھوڑ کر دربار میں حاضر ہوئے، بایزید کو شور کوٹ، اور ابراہیم کو اچھ عنایت ہوا، دہلی

میں بہلول کے بعد سکندر لودی تخت نشین ہوا، تو تعزیت کے لئے سفیر بھیجے، اور اس طرح صلح کی بنیاد رکھ کر تحفوں کا تبادلہ کیا، سلطان محمود گجراتی سے بھی اس کے تعلقات اچھے تھے، اور سفیر آیا جایا کرتے تھے،

لنگاہ بادشاہوں کے کارنامے | ملتان کی یہ نومسلم خود مختار ریاست تقریباً ۸۰ برس قائم رہی اس کی فوجی وعسکری قوت کے ثبوت کے لئے حسب ذیل اقتباس کافی ہے، جو معصومی کی تاریخ سے ہے،

"وزاں جانب رائے زادہا لنگاہ وبلوچاں وسائر سپاہ روبرو آمدہ (۱۵۲) چوں غلبہ میرزا شاہ حسین بگوش سلطان محمود لنگاہ حاکم ملتان رسید، مردم باطراف وسرحدہا فرستاد، تا لشکر بلوچ وجٹ وسائر سپاہ را جمع سازند ودر عرض یک ماہ ہشتاد ہزار سوار وپیادہ در ملتان جمع آمدہ جمعیتے عظیم بہم رسید" (۱۵۳)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نومسلم سلطان کے پرچم کے نیچے کتنی قومیں جمع تھیں، ملتان چونکہ اس زمانہ میں ایران وخراسان وافغانستان سے آنے والی قوموں کو رہ گذر تھا اس لئے نئے نئے حملوں کا ہمیشہ نشانہ رہا، اسی وجہ سے یہاں کے بادشاہوں کو اصلاحی کاموں کے بجائے فوجی استحکام میں دولت اور دماغ کو زیادہ صرف کرنا پڑتا تھا، لیکن ان مشکلات کے باوجود جب ان بادشاہوں کو موقع ملا تو اصلاحی وتعمیری کاموں کی طرف بھی فراخ دلی سے متوجہ ہوئے، چنانچہ شیخ یوسف کے عہد میں زمینداروں کی حالت سدھارنے میں کافی کوشش کی گئی، شاہ حسین کے زمانہ میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، پنجاب کی سرحد دھن کوٹ سے دریائے سندھ کے کنارے تک اس کے حدود وسیع ہوگئے، اس کا فوجی نظام بھی قابلِ تعریف تھا، اس نے اپنی فوج میں لنگاہ، سندھی، مکرانی، بلوچی زیادہ بھرتی کئے، جس سے ان کی طاقت بڑی زبردست ہوگئی، نقد تنخواہ کے بجائے

افسروں کو بڑی بڑی جاگیریں دی جاتی تھیں، اور عام سپاہیوں کو یہ جاگیردار تنخواہیں دیتے تھے یہ بادشاہ علم کا بھی قدرداں تھا، دربار میں بڑے بڑے علماء حاضر رہتے، اور وہ انکے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا، اسی کا اثر تھا کہ وزراء اور امراء بھی علم کے بڑے قدرداں تھے، چنانچہ وزیر یار بد خاص طور پر قدردانی میں شہرۂ آفاق تھا، خراسان اور ہندوستان کے بہت سے عالم وہاں جاکر مقیم ہوگئے، شیخ جمال الدین قریشی اسی دربار سے فیضیاب تھے، مولانا فتح اللہ اور مولانا عزیز اللہ اسی عہد کے باکمال لوگ ہیں، جن کے ذریعہ ہندوستان میں معقولات کو رواج ہوا، میر عماد گرویزی مرزا شہید انھی دنوں ملتان آکر مقیم ہوئے، شیخ بہاء الدین قریشی اس عہد کے صوفیوں میں ممتاز تھے، مولانا بہلول قوت گویائی، اور شیریں زبانی میں سب پر فوقیت رکھتے تھے، قاضی محمد بھی اس عہد کے مشہور علماء میں سے تھے، مدرسے بھی ہر جگہ جاری تھے، جس میں قاضی جامی کا مدرسہ زیادہ مشہور تھا، اس کے صدر مدرس مولانا ابراہیم جامی تھے، جو ساٹھ برس تک اس مدرسہ میں تعلیم دیتے رہے، مولانا سعید الدین لاہوری بھی اسی مدرسہ کے معلم تھے، جو آخر میں صدر ہوگئے، اس عہد میں علم فقہ کا بڑا زور تھا، یہاں تک کہ دربار میں شرح وقایہ اور ہدایہ ہی کا چرچا رہتا، دوسرے ملکوں کے ساتھ بھی سلاطین ملتان کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے، چنانچہ دہلی، کشمیر، گجرات، سندھ اور خراسان سے سفیروں کی ہمیشہ آمد و رفت رہتی، سرحدی مقام ہونے کے سبب خراسان سے زیادہ گھوڑوں کی تجارت ہوتی، سلاطین کو باغ لگانے کا بھی بے حد شوق تھا، سلاطین ملتان کی یادگار میں آج بھی لنگاہ خان کا باغ موجود ہے، جو بلدیہ کے زیر انتظام ہے،[۱] اور سنا ہے کہ لنگاہ قبیلہ کے مسلمان خاندان آج بھی موجود ہیں، اور اس نسبت سے اپنے کو منسوب کرتے ہیں۔

کشمیر سندھ کے ریگستان سے نکل کر اب کشمیر کے سبزہ زار میں آئیے، ۸۱۵ھ میں کشمیر کا راجہ

---

[۱] ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد چہارم ص ۴۷۹، حیدرآباد۔

سینہ دیو تھا، جو پشت در پشت کشمیر پر حکومت کرتا آتا تھا، اس کے عہد میں ایک شخص شاہ میرنامی فقیروں کے لباس میں وارد کشمیر ہوا، جس کا باپ طاہر نو مسلم تھا، وہ اپنا نسب نامہ ارجن تک ملاتا تھا، جو مہابھارت کا مشہور ہیرو ہے، شاہ میر نے راجہ کی ملازمت کر لی، راجہ کے مرنے پر اس کا لڑکا "رنجن" راجہ ہوا، اس نے شاہ میر کو وزیر بنالیا، پھر رنجن کے مرنے پر راجہ اودن جو اس کا رشتہ دار تھا، قندھار سے آکر کشمیر پر قابض ہو گیا، ۷۴۷ھ میں وہ بھی چل بسا، اس عرصہ میں وزیر اور اس کا خاندان طاقت ور ہو گیا تھا، رانی نے چاہا کہ حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے، اس لئے وزیر سے اختیارات واپس لینے کے لئے اس کو جنگ کرنی پڑی، لیکن وہ شکست کھا کر قید ہو گئی، اور اس نو مسلم وزیر نے اس سے شادی کر لی، اور وہ شمس الدین کے نام سے کشمیر کا بادشاہ ہو گیا، محمد اعظم نے واقعات کشمیر میں جو ۱۱۴۰ھ میں لکھی گئی ہے، ایک اور روایت بیان کی ہے، کہ کشمیر کا ہندو راجہ "رنجن" دین حق کا جویا تھا، اُس نے ایک مرتبہ ایک مسلمان بزرگ بلبل شاہ کو دست بدعا اور سربسجود دیکھا، اور ان کا عقیدت مند ہو کر مع اہل و عیال، اور امراء و وزراء کے مسلمان ہو گیا، یہ واقعہ ۷۲۵ھ میں پیش آیا، اُس نے مسلمان ہو کر اپنا لقب صدر الدین اختیار کیا، اس کے خاندان میں کئی بادشاہ وارث تخت ہوئے، ۸۲۶ھ میں علی کے انتقال کرنے پر شاہی خاندان کے ایک شخص نے سلطان زین العابدین کے نام سے اپنے سر پر تاج شاہی رکھا، یہ کشمیر کا سب سے ہر دلعزیز بادشاہ ہوا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس نے نو مسلموں کو جو زبر دستی مسلمان بنائے گئے تھے، اجازت دیدی کہ جو چاہے، اپنے پرانے مذہب میں واپس آسکتا ہے، چنانچہ بعضوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا، اور اکثر نئے دین پر قائم رہے، اس کے قوانین، اس کا تدبر، اُس کی سیاست اس عہد کے لئے ایک نمونہ تھی، علم و فن، صنعت و حرفت کو اس نے بڑی ترقی دی، بہت سے نئے گانوں اور شہر آباد کئے، بہت سی نئی عمارتیں بنائیں، اُس کے انصاف کے سبب سے رعایا امن سے سوتی تھی،

کشمیر یہاں نو مسلم خود مختار بادشاہوں نے دو سو برس سے زیادہ حکومت کی، اس عرصہ میں انھوں نے ملک کو ترقی دینے میں جو کوشش کی، تاریخ زبان حال سے اوس کو آج تک سراہتی ہے انھوں نے زراعت کے لئے زمینداروں کے ساتھ جو رعایت کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا، کہ چپہ چپہ بھی زمین خالی نہ رہی، اور کاشتکار فارغ البال ہو گئے، باغوں پر بھی انھوں نے کافی توجہ دی اور بکثرت باغ لگائے، عمارتیں کافی تیار کرائیں، ڈل پر جو عمارت تیار کی گئی، وہ عجائبات میں شمار ہونے کے قابل ہے، قوانین بھی اچھے اچھے جاری کئے، دوسرے ملکوں کے سفیر بھی آتے رہتے تھے، مثلاً سمرقند، خراسان، مکہ معظمہ، مصر، گیلانی کے علاوہ ہندوستان کے بادشاہوں سے بھی مراسم دوستانہ تھے[1]،

گجرات | نو مسلم سلاطین کے سب سے نامور خاندان نے گجرات پر حکمرانی کی ہے، اُن کا نام آل مظفر تھا، اُن کی تاریخ یہ ہے: کہ ۷۳۶ھ میں فیروز شاہ تغلق گجرات میں شکار کھیل رہا تھا، کہ اچانک اپنے لشکر سے جدا ہو کر رات کے وقت تھیر ضلع ٹھاسرن پہنچا، وہاں کے پٹیل سہارن نامی نے شب باشی کا انتظام کیا، اور صبح کو حسن خدمت کے عوض میں سہارن اور اس کا بھائی سادھو دونوں کو ساتھ لے کر جب دہلی پہنچا تو سہارن کو آبداری کے عہدہ پر ممتاز کیا، فیروز شاہ کے بعد محمد شاہ نے ۷۹۳ھ میں سہارن کے لڑکے ظفر خاں کو گجرات کا ناظم بنا کر بھیجا، اس نے بدامنی کو دور کر کے چند سال میں اپنی حکومت مضبوط کر لی، ۸۰۶ھ میں اس کے لڑکے محمد شاہ تاتار خاں نے دہلی فتح کرنا چاہا لیکن راستہ ہی میں مر گیا،

۸۱۰ھ میں ظفر خاں نے مظفر شاہ کے لقب سے گجرات کا خود مختار بادشاہ بن کر دہلی سے علحدگی کا اعلان کر دیا، ۸۱۳ھ میں اس کے مرنے پر احمد شاہ اس کا پوتا بادشاہ ہوا، اس نے پٹن کو

---

[1] تاریخ فیروز شاہی و طبقات اکبری جلد سوم

چھوڑ کر احمد آباد کی بنیاد رکھی، اور اس کو پایۂ تخت بنایا، قلعہ اور محلات کے علاوہ ایک عظیم الشان جامع مسجد تیار کی، جو آج تک موجود ہے، ۸۴۶ھ میں اس کا لڑکا محمد شاہ ثانی تخت نشین ہوا، یہ بڑا فیاض تھا، اسی لئے اس کو "زر بخش" کہتے تھے، اسی نے احمد شاہ اور شیخ احمد کھٹو کے مقبرے تیار کرائے، گجرات میں ایک ہی خاندان کی حکومت پونے دو سو برس رہی، اس عرصہ میں گجرات نے ہر صورت سے ترقی کی، اُن کا پایۂ تخت احمد آباد اور چانپانیر رہا، ان بادشاہوں نے بہت سے گانوں اور شہر بسائے، سلطان پور، احمد نگر، محمود آباد، مظفر آباد (کتیانہ) دولت آباد (بڑودہ) مصطفےٰ آباد، محمد آباد (چانپانیر) احمد آباد وغیرہ اس زمانہ میں آباد ہوئے، احمد آباد میں پتھر کی عمارتیں بکثرت بنائی گئیں، خاص کر بعض مسجدیں اس کاریگری سے تیار ہوئیں کہ اس کے ایک مینار کو ہلانے سے دوسرا مینارہ بھی ہلنے لگتا ہے، میں نے اس منارہ کو خود دیکھا ہے، اسی طرح کھجوریا مسجد بھی عجائبات میں شمار کی جاتی ہے، مقبرے، مدرسے، حمام، سرائیں، بکثرت بنیں، جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔

سلاطین گجرات عالموں اور صوفیوں کی بڑی قدر کرتے تھے، یہی سبب ہے کہ دوسرے ملکوں سے بڑے بڑے محدثین اور فقہا، مشائخ اور علماے باکمال گجرات میں آکر آباد ہو گئے، اور تمام عمر توسیع علوم و فنون میں مصروف رہ کر اسی جگہ پیوند خاک ہوئے، محمود اول کے زمانہ میں قاضی اور محتسب بر ملا بادشاہ کو ٹوکتے اور ان پر احتساب کرتے، مظفر حلیم مدعی کے ساتھ عدالت میں کھڑا ہوتا، مولانا رکن الدین شکر گنج، شیخ کھٹو ہی، قطب عالم، شاہ عالم، ماہ عالم، شیخ برہانی جیسے مشائخ کبار اسی زمانے میں تھے، علامہ محمد طاہر پٹنی، شاہ وجیہ الدین گجراتی، عماد الدین طارمی، اسی زمانہ کے بہترین علماء میں سے تھے۔

اسی عہد میں بے شمار کتابیں ہر علم و فن کی تصنیف اور ترجمہ کی گئیں، زراعت کے لئے بڑی تعداد میں تالاب کھدوائے گئے، جن میں سے اکثر اب بھی موجود ہیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ مظفر شاہ ثانی

کے زمانہ میں زمین کسی جگہ خالی پڑی نہیں ملتی تھی، آم اور کھرنی کے کئی لاکھ درخت لگائے، درختوں کی کثرت سے احمد آباد کا شہر باغ ہی باغ نظر آتا تھا، احمد آباد کے پاس جو کئی کوس کا باغ لگایا تھا اُس کا نام "باغ فردوس" تھا، ایرانی طرز کی چمن بندی گجرات میں بہت عام ہوگئی تھی، عام طور پر بادشاہ سخی ہوتے تھے، اُن کی سخاوت سے خاص کر قحط کے زمانہ میں بڑا فائدہ ہوتا تھا، اکثر سلاطین گجرات کو عدل وانصاف کا بڑا خیال رہتا، ضرورت کے وقت بادشاہ خود بھی تحقیقات کرتا، غیر ممالک سے اُن کے تعلقات خوشگوار رہے، جونپور، دہلی، بنگالہ، کشمیر، ایران، روم، مصر، اور یورپ کے سفیر تحفے لیکر اُن کے دربار میں حاضر ہوتے، مصر میں جب تک عباسی خلافت قائم رہی، سفیر کئی بار آئے، اور گئے، آصف خان، افضل خان، عماد الملک، ملک شعبان، خداوند خاں جیسے لائق وزیر اسی زمانہ میں تھے، فوجی قابلیت یہاں کی خاص قوموں میں فطری تھی اس سبب سے یہاں کی فوجی قوت ہمسایہ سلطنتوں سے ہمیشہ زیادہ رہی، ہندوؤں کو فوجی اور ملکی عہدے ملتے تھے، احمد شاہ اول کے وقت میں نائب وزیر، محمد شاہ ثانی کے عہد میں وزیر مال، محمود اول کے زمانہ میں راے رایان امیر، بہادر شاہ کی فوج میں سپہ سالار اور قلعدار ہندو تھے، دکن کے بعد توپ کا استعمال بھی سب سے پہلے گجرات ہی میں ہوا، فوجی بھرتی کا قاعدہ موروثی تھا، ابتدا میں تنخواہ نقد ملتی تھی، لیکن احمد شاہ نے نصف نقد اور نصف جاگیر (زمین) مقرر کی، مظفر دوم کے عہد میں زراعت کو اس قدر ترقی ہوگئی تھی، کہ جانوروں کا چرنا مشکل ہوگیا، ناچار گانوں میں چرائی کے لئے چراگاہیں الگ بنانی پڑیں، بحری تجارت کو اسقدر ترقی ہوگئی تھی، کہ ۸۴ بندرگاہیں گجرات کے ماتحت تھیں، یہاں ہر موسم میں ملکی اور غیر ملکی جہاز کھڑے رہتے تھے، ایران، عراق، یمن، حبشہ، عرب اور مصر کے تاجر موجود تھے، بہادر شاہ کے عہد میں گجرات کا بحری بیڑہ اس قدر مضبوط تھا کہ اُس وقت ہندوستان میں کسی کے پاس

نہ تھا (مرآۃ سکندری بمبئی، تاریخ فرشتہ جلد چہارم حیدرآباد و طبقات اکبری سوم کلکتہ)

یہ کارنامے ایک خالص ہندی الاصل اور ہندوی النسل مسلمان خاندان کے ہیں؛

دکن کے بہمنی | دکن کی اب سے بڑی اور پہلی سلطنت کا نام بہمنیہ ہے، بہمنیہ کیوں کہلاتے ہیں؟ مورخوں نے اس کی کوئی معقول توجیہ اب تک پیش نہیں کی ہے، بہمنی سلاطین کے درباری موّرخوں نے اس باب میں اس خصوصیت کا اظہار کیا ہے، جو عجمی مورخوں کا خاصہ ہے، یعنی اپنے ممدوحوں کو اعلیٰ نسب اور پرانے ایرانی سلاطین کی نسل ظاہر کرکے اُن کے لئے سلطنت کا پیدایشی حق ثابت کرنا، انھوں نے لفظ بہمن کے شاعرانہ ضلع جگت اور مناسبات کی بنا پر، ان کو بہمن ابن اسفندیار کی نسل بتا کر کلاہ کیانی ان کے سروں پر رکھا، اور کبھی جام جم سے ان محفلوں کو سجایا ہے یہ اسی قسم کی لفظی غلطی ہے، جیسے سندھ اور کچھ کے جام لقب کے راجاؤں کو جمشید ایران سے نسبت دینے کی کی گئی ہے، میں نے اپنے امکان بھر تمام موجودہ تاریخوں میں ان سلاطین بہمنیہ کی اصلیت کی تلاش کی کوشش کی، مگر کامیابی نہیں ہوئی، یہاں تک کہ ایک زمانہ میں میرا رجحان یہی تھا کہ یہ نومسلم خاندان تھا، مگر اب تک دلائل اس کی تائید میں نہیں ملے ہیں، پروفیسر ہارون خاں شروانی نے مطلع کیا ہے، کہ ان کی تحقیق میں یہ بہمنی عجمی امراء میں سے تھے، میں نے ابھی تک اُن کے دلائل نہیں پڑھے، اس باب میں جو کچھ بھلا بُرا موجود ہے، وہ مورخ فرشتہ کے بیانات اور اقتباسات ہیں، مورّخ مذکور نے بھی خوب چھان بین کی، مگر افواہ اور قیاس کے سوا وہ بھی کچھ نہ کہہ سکا سلطنت بہمنیہ کے بانی کا نام قبل از سلطنت اس کے ہم عصر دہلوی مؤرخین سراج عفیف اور ضیا برنی نے ہر جگہ حسن گانگو لکھا ہے، (ملاحظہ ہو فیروز شاہی سراج عفیف مطبوعہ کلکتہ ص ۵۱۵ و ۵۲۰)

عصامی نے فتوح السلاطین میں حسن کا نام بہمن بتایا ہے کہتا ہے:-

بہ سیرت فریدوں و بہمن بنام   شدہ کنیتش ابو المظفر بدا م

میری تحقیق میں حسن کا دوسرا نام بہمن کبھی نہ تھا، بلکہ یہ وہ لقب ہے، جس کو سلطنت کے بعد اس نے اختیار کیا تھا، حالانکہ اس قسم کے فارسی ناموں کا رواج اس زمانہ میں بھی تھا، جیسا کہ خود حسن کے داماد کا نام بہرام خاں تھا، مگر صحیح یہی ہے کہ یہ لقب اُس نے سلطنت کے بعد اختیار کیا ہو، اور اس کی صحیح صورت وہی ہے، جو اس کے کتبوں اور سکوں پر ہے، اس کے سکوں اور کتبوں پر اس کے یہ خطابات کندہ ملے ہیں، جیسا کہ باغ عامہ حیدرآباد دکن کے عجائب خانہ میں ایک پتھر بھی نظر آتا ہے،

"سکندر ثانی یمین الخلافت ناصر امیر المومنین السلطان الاعظم علاء الدنیا والدین ابو المظفر بہمن شاہ السلطان"

"حسن" اس کا اصلی نام ہونا یقینی ہے، جس کی نسبت سے گلبرگہ کا حسن آباد نام رکھا گیا ہے، کانگویا گانگو اس کے نام کا دوسرا جزء بھی اس کے ہم عصر مورخین کے بیان سے ثابت ہے، اور بہمن نہیں، بلکہ بہمن شاہ کی صورت میں اس کا یہ لقب سکوں اور کتبوں میں موجود ہے، اس لئے اس کا پورا نام و لقب "حسن گانگو بہمن شاہ" تھا، جیسا کہ فرشتہ نے تینوں کو یکجا کرکے لکھا ہے،

ان میں سے گانگو اسلامی نام نہیں، پھر حسن کے ساتھ گانگو کا جوڑ کیا ہے، فرشتہ کا بیان ہے کہ گانگو پنڈت اصل میں ایک دکھنی برہمن کا نام تھا، یہ پہلا برہمن ہے، جس نے کسی مسلمان کی نوکری اختیار کی، یہ علم نجوم اور جوتش میں ماہر تھا، اُس نے دکن سے دلی آکر شہزادہ محمد تغلق کی نوکری اختیار کی، اور جاہ و منصب پیدا کیا، اسی زمانہ میں حسن نام ایک غریب و بدحال شخص دلی آکر گنگو برہمن کے پاس پہنچا، برہمن نے اسے ہل بیل دے کر دلی کے پاس کسی کھیت کے جوتنے پر نوکر رکھ لیا، حسن نے کھیت میں ہل چلایا تو ہل کسی بھاری چیز سے ٹکرایا، اُس نے اس کو نکالا، تو ایک بڑا خزانہ پایا،

حسن نے یہ پورا خزانہ جوں کا توں گنگو برہمن کے سامنے لاکر پیش کیا، برہمن کو اس کو دیانت داری ایمانداری پر بہت تعجب ہوا، اور اس کا ذکر اس نے شہزادہ محمد تغلق سے کیا، شہزادہ نے اُس کی تعریف بادشاہ وقت غیاث الدین تغلق سے کی، غیاث نے خوش ہو کر اس کو اپنے امیران صدہ میں شامل کرلیا، گانگو برہمن کو حسن کے زائچہ سے یہ معلوم ہوچکا تھا کہ یہ ایک دن بادشاہ ہوگا، چنانچہ اُس نے حسن سے یہ شرط قبول کرائی کہ جب اللہ تم کو سلطنت دے، تو میرا نام اپنے نام کا جزء بنانا، اور سرکاری دفاتر کا سارا اہتمام مجھ کو اور میری اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ سپرد کرنا، حسن نے دونوں شرطیں قبول کیں، چنانچہ اسی وقت سے اُس نے اپنا نام حسن گانگو بہمنی قرار دیا، اور سلطنت کے بعد اپنے تمام سرکاری دفاتر کا کام گنگو برہمن کے سپرد کردیا،

اب اس کے بہمن نام کی توجیہ سنئے، اُس کے مداح مورخوں نے اس بہمن کو بہمن بن اسفندیار سے ملایا ہے، جیسا کہ تحفۃ السلاطین یا فتوح السلاطین سراج التواریخ اور بہمن نامہ میں مذکور ہے، فرشتہ لکھتا ہے، کہ مجھے خود بھی بہمن سلاطین کے حسب و نسب کی بڑی تلاش تھی، اتفاقاً احمد نگر کے کتب خانہ میں اس کو ایک قلمی رسالہ اس بحث پر ملا، جس میں بہمنی سلاطین کا پورا نسب نامہ درج تھا، جو حسب ذیل ہے،

حسن بن کیکاؤس بن محمد بن علی بن حسن بن سیام بن سیمون بن سلام بن ابراہیم بن شیدور بن فرخ بن شہریار بن عاد بن سید بن ملک داؤد بن ہوشنگ بن نیک کردار بن فیروز بخت بن نوح بن صانع، اور صانع چند واسطوں سے بہرام گور کی اولاد تھا، اور بہرام گور ساسان کی نسل سے تھا، اور ساسان بہمن بن اسفندیار کی نسل سے تھا،

یہ نسب نامہ جیسا کہ اس کی ترتیب سے ظاہر ہے سراسر جعلی ہے، یہ نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی ہے، اور بے جوڑ ناموں کا بے میل سلسلہ ہے، خود فرشتہ بھی اس کی صحت کا قائل نہیں، اور اس نے اپنے اسی

نظریہ کو جو گنگو برہمن کی حکایت پر مبنی ہے، ترجیح دی ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حسن کی قومیت اور قبیلہ کے باب میں تمام مورخین خاموش ہیں لیکن فرشتہ کے قلم سے ایک جگہ یہ ایک فقرہ اس سلسلہ میں نکل گیا ہے، جو یہ ہے،

"علی شاہ خواہرزادہ مظفر خاں علائی کہ از امیران صدہ بود واز دولت آباد جہت تحصیل مال سلطانی بگلبرگہ رفتہ بود چوں آں حدود از عمال خالی دید برادران خود را کہ یکے از آنہا حسن گانگوی بود یکجا جمع کردہ (صفحہ ۲۷۱ نولکشور)

اس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظفر خاں جو سلطان علاء الدین خلجی کا مشہور سپہ سالار تھا، اس کا بھانجا علی شاہ تھا، اور اس کے بھائیوں میں سے حسن گانگو تھا،

(۱) لیکن اس فقرہ میں کسی غلطی کا ہونا مجھے نظر آتا ہے، اگر فرشتہ کو واقعاً اس کے خاندان کا علم تھا، تو اس کے نسب کی تحقیق کے موقع پر اس کا ذکر کیوں نہیں کیا،

(۲) اس کے نہ ماننے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اس کے بعد ہی یہ ہے کہ علی شاہ مع برادران قید ہو کر سزائے قتل کو پہونچے، اب اگر حسن اس کے بھائیوں میں سے ہوتا، تو وہ بھی قتل ہو چکا ہوتا، فرشتہ کا یہ بیان اس وقت اور بھی مشتبہ ہو جاتا ہے، جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ کے اس بیان کا ماخذ برنی کی فیروز شاہی ہے، لیکن اس واقعہ کے ذکر میں یہ فقرہ کہ حسن گانگو علی شاہ کا بھائی تھا، اس میں مطلقاً موجود نہیں، عبارت یہ ہے:-

"فتنہ علی شاہ کہ خواہرزادہ ظفر خان علائی کہ امیر صدہ قتلغ خاں بود ظاہر شد و علی شہ مذکور از دیوگیر بہ تحصیل در گلبرگہ رفتہ بود آنطرف را از سوار و پیادہ و مقطعان و والیان خالی دید، برادران خود را با خود یار کردہ .... سلطان علی شہ باغی غدار را با برادران دست راست دادہ و از حصار فرود آورد .... سلطان محمد علی شہ برادران او را

درغزنین فرستادو وایشاں از آنجا باز آمدند، وہر دو برادر داد بیش داخول سیاست نمودند"

(تاریخ فیروز شاہی جلد اول ص ۴۰۹، ۴۱۰)

مجھے خیال ہوا کہ فرشتہ کی عبارت میں کچھ کتابت کی غلطی ہے، "برادران خود را" کی جگہ "برادران خود را" ہوگا، اس غرض کے لئے میں نے فرشتہ مطبوعہ بمبئی کا قدیم نسخہ اور کتب خانہ ندوۃ العلماء میں ایک قلمی نسخہ دیکھا، سب میں برادران ہی لکھا پایا، اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ حسن کے ساتھ گانگو نام اور بہمن شاہ لقب کی کوئی صحیح توجیہ تک میری رسائی نہیں ہوئی، ہے، بہمن شاہ لقب اور دکھن کے برہمنوں کے اس کے ساتھ اتحاد سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس نے نسبی طور سے نہیں تو سیاسی طور سے دکھنی برہمنوں کو ضرور اپنے ساتھ ملالیا تھا، اور یہی اس کی کامیابی کا راز تھا، اور اسی کی علامت کے طور پر ان کے خوش کرنے کیلئے اس نے اپنا شاہی خطاب بہمن شاہ یعنی برہمنوں کا بادشاہ مقرر کیا تھا، جیسا کہ اس کے کتبوں اور سکوں میں کندہ ملتا ہے۔

لفظ بہمن وہی مشہور لفظ برہمن ہے، شمالی ہند میں اس کا تلفظ فارسی بہمن یا برہمن ہے، اور اس کی جمع براہمہ اور دکن میں اس کا عام تلفظ بہمن ہے، اور اس کی جمع بہامنہ بولی جاتی ہے چنانچہ فرشتہ میں لفظ کی یہ دونوں شکلیں ایک ساتھ ملتی ہیں،

"اول کسے کہ از فرقہ براہمہ در دور اسلام نوکری قبول کرد، گانگو پنڈت بود تا حال کہ سنہ ہجری است بخلاف سائر ممالک ہند خصوصاً دفتر بادشاہان دکن و نویسندگی ولایات ایشان بہ بہامنہ مرجوع است،" (ص ۲۷۰ نولکشور)

اس عبارت میں شمالی ہند کے تعلق سے براہمہ کہا گیا ہے، اور جنوبی ہند کے تعلق سے بہامنہ، بہمن شاہ یعنی برہمن شاہ ویسی ہی ترکیب ہے، جیسے کابل شاہ، ہندو شاہ، شیروان شاہ، خوارزم شاہ، جو مشہور بادشاہوں کے خاندانی نام ہیں،

یہ توبہمن شاہ کی ایک لگتی ہوئی توجیہ ہے، مگر گانگو نام گی توجیہ کا جو شروع ہی میں اس کے نام کا جزو ہے، جیسا کہ سراج عفیف اور ضیا برنی کے حوالوں سے ثابت ہے، ابھی تک حل نہ نکل سکا،

بہرحال بہمن شاہیہ اگر نسل کے ہندو نہ ہوں تاہم انھوں نے وجے نگر کے ہندو راجاؤں کی بیٹیوں کو قبول کیا تھا، مگر ان سے نسل کا چلنا ثابت نہیں ہوتا،

بہمنیہ سلطنت کے ختم ہونے پر اس کی خاک سے پانچ چھوٹی بڑی سلطنتیں پیدا ہوئیں جن میں تین نظام شاہی، عماد شاہی، اور برید شاہی ہمارے موضوع سے متعلق ہیں،

نظام شاہی | نظام شاہی سلطنت کا بانی نظام الملک بحری تھا، یہ خالص دکنی ہندو نسل سے تھا، فرشتہ کا بیان ہے کہ اس کا ہندو نام تیما بھٹ اور باپ کا نام بھیرو تھا، اس کا اسلامی نام حسن رکھا گیا، اور بعد کو بھیرو کو بحری بنا کر حسن بحری کے نام سے مشہور ہوا، (فرشتہ نمبر ۲ ص ۹۸ وطبقات اکبری نمبر ۳ ص ۷۰) فرشتہ کا بیان ہے:

"از بہامنہ معتبر دولت خانہ نظام شاہیہ شنیدم کہ پیش از سلطنت نظام شاہ بحری بچندیں سال اجداد نظام شاہیہ از براہمہ پرگنہ پاتری در قدیم الایام تعلق آباو اجداد داشتہ بودند، بتقریب سببے تغیر مکان کردہ بولایت بیجانگر رفتہ بودند، دراں حدود بسر می بردند"

اسی تعلق کی بنا پر برہان نظام شاہ نے اس پرگنہ پر قبضہ کرکے اپنے خاص گاؤں کو اپنے ہندو برہمن عزیزوں کے سپرد کر دیا تھا، فرشتہ کی شہادت ہے کہ

"برہان نظام شاہ آن پرگنہ را بقبض خویش درآوردہ موضع موروث بہ بہامنہ خویش وقرابت خود کہ رئیس کفرہ بودند بطریق انعام عنایت فرمودہ"

اس سے معلوم ہوا کہ اس کا اصل وطن موضع پاتری تھا، جہاں اس کا خاندان آباد تھا، یہ بیجانگر کے ایک برہمن کا لڑکا تھا، سلطان احمد شاہ بہمن نے اس کو ذہین، دانشمند اور حساب کتاب میں ماہر پایا، اس لئے اس کو بھی شاہزادوں کے ساتھ مکتب میں بٹھا دیا، اور فارسی کی تعلیم دلائی، پہلے وہ میر شکار کے عہدہ پر فائز ہوا، پھر نائب وزیر بنایا گیا، سلطان محمود بہمنی کے عہد میں خواجہ جہاں محمود گاواں کے مرنے کے بعد وزیر کل ہوا، اس کا لڑکا احمد باپ کی جاگیر کا انتظام کرتا تھا، نظام الملک کے مرنے پر اس نے سلطنت کو اس خوبی سے چلایا، کہ اس کی کوئی کل ڈھیلی نہ رہنے دی، محمود بہمنی کے وزیر کو شکست دے کر ۸۹۵ھ میں ایک باغ اس فتح کی یادگار میں لگایا اور اپنا نام نظام شاہ رکھا، ۹۰۰ھ میں دولت آباد کے مقابل ایک نیا شہر احمد نگر کے نام سے بسا کر اس کو بنایا، اس سے قبل جنیر اُن کی راجدھانی تھی، چند ہی سال میں یہ شہر بڑا آباد اور بارونق بن گیا، باغ نظام کو قلعہ نما تیار کرایا، اور مختلف محلوں کو رنگین کانچ کے ذریعہ دلکش تصویروں سے آراستہ کیا، دولت آباد فتح کرکے کاندیس اور بگلانہ کو مطیع کیا، ۹۱۴ھ میں اس نے وفات پائی، اس کا لڑکا برہان نظام شاہ کم سن تھا، اس لئے سارے اختیارات پر اس کے وزیر مکمل خاں کا قبضہ ہو گیا، ۹۲۲ھ میں اس نے پاتری کو جو اس کے باپ دادوں کا اصلی وطن تھا فتح کر لیا، ۹۲۰ھ میں ایک شیعہ بزرگ شاہ طاہر کے اثر سے اس نے شیعی مذہب اختیار کیا، اور اسی کو سرکاری مذہب قرار دیا، ۹۳۵ھ میں بہادر شاہ گجراتی سے جنگ میں شکست کھا کر خراج دینے کی شرط پر صلح کر لی، اس طرف سے مطمئن ہو کر اس کے وزیر کنور سین نے مرہٹوں سے لڑ کر ۳۲ قلعے چھین لئے، ۹۶۱ھ میں سلطان دنیا سے کوچ کر گیا، حسین نظام شاہ نے تخت نشیں ہو کر پہلے تو خانہ جنگی کا خاتمہ کیا، پھر پرتگیزوں کو اپنا مطیع بنایا، ۹۷۰ھ میں نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی سے عادل شاہ (بیجاپور) کا نکاح ہوا، ۹۷۲ھ میں دکنی فوجوں کے ساتھ تالی کوٹ کی جنگ میں شریک ہوا،

وجیانگر کے راجا "رام راج" کا خاتمہ کرکے جب واپس آیا، تو خود بھی دنیا سے کوچ کرگیا، نظام شاہی سلطنت کی عمر صرف ڈیڑھ سو برس رہی، اُن کا پایۂ تخت احمد نگر تھا، یہاں انھوں نے بڑے بڑے محل بنائے، ان میں ہشت محل خاص شہرت رکھتا تھا، باغ بکثرت لگائے، باغوں کی کثرت کے باعث ملک بہشت کا نمونہ معلوم ہوتا تھا، صلابت خاں اور خواجہ جہاں دکنی جیسے وزیر اسی زمانہ میں تھے، اُن کا علمی دربار بھی بڑا بارونق تھا، ملا پیر محمد، شاہ طاہر، ملا ظہوری، ملک قمی جیسے اہلِ علم اور شاعر اسی دربار سے تعلق رکھتے تھے، رعایا کا مذہب سُنی مہدوی تھا، اور حکمراں شیعہ تھے، غیر ملکیوں سے بھی اُن کے تعلقات اچھے تھے، اور ایک دوسرے کے سفیر اچھے تحفوں کے ساتھ آمدورفت رکھتے تھے، ہمایوں بادشاہ ایران سے اسی عہد میں واپس آیا، ملکی اور غیر ملکی جھگڑے البتہ اکثر ہوتے، جس نے سلطنت کو کمزور کردیا، عورتیں بھی سیاست میں حصہ لیتی تھیں دکن کی مشہور ملکہ چاند سلطانہ اسی خاندان سے تھی، اس کی فوجی طاقت بھی کسی سے کم نہ تھی، یہ سلاطین بڑے جنگجو تھے، عادل شاہی اور برار کے ساتھ ہمیشہ جنگ کرتے رہتے، احمد نظام شاہ کو کشتی کا بڑا ذوق تھا، یہی مذاق رعایا کا ہوگیا تھا، اسی کے یہاں یک کی (دو وکل) کا بڑا رواج تھا، علما تک اس سے محفوظ نہ تھے، آخر زمانہ میں ملک عنبر حبشی نے جنگ کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا، جس کو جنگ گریز پا (قزاقانہ جنگ) کہتے ہیں یعنی گوریلا وار، اس کی فوج میں مرہٹے زیادہ تھے، اسی سبب سے مرہٹوں کو اس لڑائی کی بڑی مہارت ہوگئی، سیواجی کو تو یہ طریقہ اس قدر پسند آیا کہ عمر بھر اسی طریقہ پر لڑتا رہا، صلابت خاں کے وقت میں تجارت کو بھی اچھی ترقی ہوئی، مگر جنگ اور خانہ جنگی کے سبب زراعت وصنعت پر کافی توجہ نہ ہوسکی[1]،

عماد شاہی | دکن کی دوسری سلطنت جو بہمنیہ کے ایک گوشہ میں قائم ہوئی تھی، عماد شاہی

[1] آثر نظامی شاہی، مطبوعہ دہلی، فرشتہ جلد چہارم حیدرآباد

عماد شاہی سلطنت کا بانی فتح اللہ عماد الملک ہے، یہ بیجانگر کے ایک ہندو کا لڑکا تھا، بچپن میں گرفتار ہوکر سپہ سالار خانجہاں کے غلاموں میں داخل ہوا، اس کی وفات پر سلاطین بہمن شاہی کے غلاموں میں شامل کرلیا گیا، محمود بہمن شاہ کے عہد میں خواجہ محمود گاواں وزیر کی عنایت سے اس کو عماد الملک کا خطاب ملا، اور برار کا صوبہ دار مقرر ہوا، سنہ ۸۹۰ھ میں وہ خود مختار ہوگیا، اس کے مرنے پر اس کا لڑکا علاء الدین عماد شاہ تخت کا وارث ہوا، اس نے اسماعیل عادل شاہ کی لڑکی سے شادی کرکے اپنی قوت کو ترقی دی،

برہان نظام شاہ نے اس کے دو قلعے دبائے تھے، اس کے لئے بڑی خونریز جنگ ہوئی شکست پاجانے پر خاندیس کے حاکم سے مدد کا طالب ہوا، لیکن نظام شاہ نے دونوں کی فوجوں کو شکست دی، سنہ ۹۳۴ھ میں خاندیس کے حاکم کے ذریعہ مدد کے لئے سلطان بہادر گجراتی کو بلایا، جس نے برار اور نظام شاہ دونوں کو اپنا باجگذار بنالیا، اس کے مرنے پر اس کا لڑکا دریا عماد الملک حاکم ہوا، اس نے اپنی لڑکی کی شادی حسن نظام شاہ سے کردی، عرصہ تک حکومت کرکے دنیائے فانی کو خیرباد کہا، اور اب اس کا چھوٹا کم عمر لڑکا برہان عماد شاہ مالک تخت ہوا، لیکن تفاول خاں دکنی نے برار پر قبضہ کرکے اس سلطنت کا خاتمہ کردیا، اور خود تفاول خان کو مرتضےٰ شاہ نے شکست دے کر قتل کردیا، اور برار کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، اس سلطنت کا پایۂ تخت کاویل تھا، یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی، اور ہمیشہ لڑنے بھڑنے کے سبب اس کو اس کا موقع نہیں ملا، کہ امن وامان قائم کرکے ملک کو ترقی دے، اس کی فوجی طاقت بھی بہت معمولی تھی،[1]

بریدشاہی | بہمنیہ کی تباہی کے بعد بریدشاہی خاندان دکن کی ایک چھوٹی سی سلطنت کا فرمانروا تھا، جس کا پایۂ تخت بیدر تھا، اس کا بانی قاسم برید المتوفی سنہ ۹۱۰ھ ترک تھا، مگر اس نے اپنے لڑکے کی شادی جس کا نام علی برید تھا، ساباجی ایک مرہٹہ سردار کی لڑکی سے کردی تھی، اور اسی تعلق سے چار سو مرہٹہ بہادر فوج میں

---

[1] فرشتہ جلد چہارم حیدرآباد

اس کی نوکری کی، اور سب رفتہ رفتہ مسلمان ہو گئے، اور نہی کی فوجی طاقت سے اس سلطنت کی بنیاد مستحکم ہوئی
افسوس ہے کہ کسی مؤرخ نے اس کا حال نہیں لکھا، فرشتہ نے اُن کے سات بادشاہوں میں سے صرف تین کا
حال لکھا ہے، اور معذرت کی ہے کہ ان کے حالات کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوئے، اور جو لکھا ہے وہ بھی
بزرگوں کی زبانی سُن کر،

بنگالہ ہندوستان کے مشرقی گوشہ میں بنگال ہے، بنگال کو گو بختیار خلجی نے فتح کر کے اسلامی ممالک
میں داخل کیا، اور مدت تک وہ دلی کے اسلامی مرکز سے وابستہ رہا لیکن ۷۴۲ھ میں اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا،
بنگالہ کا مشہور حکمران حاجی الیاس شمس الدین بھنگرہ کا خاندان عرصہ تک یہاں حکمران رہا، ۷۸۵ھ
میں بادشاہ کے وفات پا جانے پر اس کا لڑکا شمس الدین تخت نشین ہوا، لیکن کنس نے اس قدر اقتدار پیدا
کر لیا تھا، کہ تمام لوگ اس سے دبنے لگے تھے، اس سے اس نے یہ فائدہ اٹھایا کہ سلطان شمس الدین کے خلاف
بغاوت کر کے ۸۰۴ھ میں وہ خود تخت نشین ہوا، ابتدا میں اس نے مسلمانوں پر بڑے مظالم کئے لیکن
حضرت نور قطب عالم کے اشارے سے جب جونپور کا بادشاہ ابراہیم شرقی، بنگال کی سرحد پر نمودار ہوا، تو راجہ
کی آنکھیں کھلیں، اپنے بیٹے کو حضرت نور قطب عالم کے قدموں میں ڈال کر معافی چاہی، راجہ سات سال کے
بعد چل بسا، اس کے بعد اس کا لڑکا جیت مل جو شیخ نور کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا ۸۱۳ھ میں جلال الدین کے
نام سے تخت پر بیٹھا، اس نے عدل و انصاف کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ لوگ اس کو نوشیروان ثانی کہنے لگے، اس کے عہد
میں لوگ بڑی فارغ البال رہے، شہر پنڈوا آبادی کی کثرت سے اتنا بڑا ہو گیا کہ اس اطراف میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں
کر سکتا تھا، گوڑ میں بکثرت حوض، تالاب، سرائے، مسجدیں تیار کرائیں، اور دوبارہ گوڑ کو بڑی پیمانہ پر آباد کیا، علما کی
بڑی قدر دانی کرتا تھا، دور دور سے علما کو بلا کر آباد کیا، تبلیغ اسلام میں بھی اس نے بڑی کوشش کی، سترہ سال حکومت
کر کے ۸۳۰ھ میں وفات پا گیا اور اس کا لڑکا احمد شاہ اس کا جانشین ہوا، اس نے بھی اپنے باپ کی روش پر چل کر ملک کو
خوشحال بنانے میں کافی حصہ لیا، اس نے ۱۶ برس حکومت کی، ۸۴۶ھ میں وفات پا گیا، اور اسکے بعد پھر حاجی الیاس

کے خاندان میں حکومت چلی گئی، اس نو مسلم خاندان نے ۴۴ برس حکومت کی قلیل مدت میں اُس نے بنگالہ کو آباد کرنے اور ملک میں تمدن کو ترقی دینے میں بے حد کوشش کی[1]، بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ یہ بھی ہے کہ راجہ کے مسلمان ہو جانے سے رعایا پر بھی اثر پڑا، اور کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے،

صوبۂ متوسط صوبۂ متوسط اصل ہندوستان اور دکن کے بیچ میں پڑتا ہے، آرین حملہ آوروں نے ہندوستان کے اصلی باشندوں گونڈ اور بھیل وغیرہ کو جب شمالی ہندوستان کے حدود سے باہر نکال دیا، تو اُن کا بڑا حصہ دکن میں چلا آیا، صوبۂ متوسط میں بھی ان کی ایک آبادی قائم ہو گئی جن میں گونڈ خاص ذکر کے قابل ہیں، ان گونڈوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں موجودہ بھوپال، ہوشنگ آباد، اور ناگپور کے اطراف میں قائم تھیں، اُن کے رئیس راجہ کہلاتے تھے، ان راجاؤں میں سے غالباً کچھ مغلوں سے پہلے اور کچھ مغلوں کے زمانہ میں مسلمان ہو گئے، اُن میں سے کسی زمانہ میں سب سے بڑا راج ناگپور کے گونڈ راجہ کا تھا، اس کا سلسلہ اب تک قائم ہے، غالباً ۱۹۱۳ء میں جب ندوہ کا جلسہ ناگپور میں ہوا تھا اس خاندان کے لوگوں سے میں ملا تھا، اس وقت کے راجہ کو انگریزوں نے پاگل بنا رکھا تھا،

دوسرا خاندان ہوشنگ آباد کے مسلمان گونڈ راجہ کا ہے، جو اس وقت بھی موجود ہیں، اُن کا نام لیاقت شاہ تھا، بھوپال میں باڑی ایک مقام ہے، وہاں تیسرے مسلمان گونڈ راجہ ہیں، جو سابقہ ریاست بھوپال کے جاگیردار تھے ان سے بھوپال ہی میں ملنے کا اتفاق ہوا، اُن سے معلوم ہوا کہ اُن کے پاس شاہی فرامین موجود ہیں، مجھے ان فرامین کے دیکھنے کا خود موقع نہیں ملا، مگر بعض دوستوں کے ذریعہ ان کا حال معلوم ہوا، وہ زیادہ تر قدیم ثابت نہیں ہوئے، امیر دوست محمد خان نے بارہویں صدی ہجری کے وسط میں جب بھوپال کی ریاست قائم کی تو انہی گونڈ راجاؤں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو ملا کر یا فتح کر کے ریاست کی بنیاد ڈالی، فتح بی بی جن کا نام ریاست کی تاریخ میں بہت روشن ہے، گونڈ ہی خاندان کی تھیں، جو مسلمان ہو گئی تھیں،

ان لوگوں میں عجیب بات یہ ہے کہ ان کے راج کی گدی کی مالک عورت ہوتی ہے، اور اُن کی طرف سے اُن کے شوہر راج کرتے ہیں، دوسری عجیب رسم ان میں یہ ہے کہ ان کے ہاں شادی کے موقع پر بارات دلھن

---

[1] ریاض السلاطین کلکتہ ص ۱۱۶ و تاریخ فرشتہ جلد ۴ حیدرآباد،

کی طرف سے دودھا کے گھر آتی ہے۔ اُن کے راجاؤں کے آخر میں شاہ ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے حالات کا پتہ اب تک نہیں چل سکا۔

مغلیہ | ہندوستان کی سب سے شاندار اور ہر دلعزیز سلطنت مغلیہ ہے لیکن اس کی شان و شکوہ اور ہر دلعزیزی کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں اس کی ایک بڑی وجہ اس کا حکمران راجپوتوں سے معاشرتی میل جول ہے۔ میں اپنے نظریہ کے مطابق راجپوتوں کو اصلاً افغان سمجھتا ہوں قندھار ان راجپوتوں کا پہلا مسکن تھا یہ اسلام سے پہلے تاتار کا نہ ہندوستان آئے اور تلوار کے زور سے انھوں نے ہندوؤں کو فتح کر لیا اور ہندوستان کے زور سے ہندیوں نے ان کو اپنے میں جذب کر لیا، اسی لئے مسلم راجپوت اپنے لئے آج بھی خان ہی کا لقب اختیار کرتا ہے، اس لئے مغلوں اور راجپوتوں کا یہ ازدواجی میل جول ان ہی نہ تھا، اس مغل اور راجپوت میل جول کا بانی اکبر ہے، اُس نے خود راجپوتوں کے متعدد خاندانوں میں شادیاں کیں، اور اپنے لڑکے جہانگیر سلیم شاہ کی بھی متعدد شادیاں کیں، چنانچہ راجہ بھگوان داس کی دختر کے بطن سے یکم ربیع الثانی سنہ ۱۰۰۰ھ کو وہ شاہزادہ خرم پیدا ہوا، جس کو دنیا شاہجہاں کہتی ہے اکبر کے چچا ہندال مرزا کی لڑکی رقیہ بیگم نے جو لاولد تھی، راجہ بھگوان داس کے اس نواسے اور اکبر کے اس پوتے کو اپنے آغوش عاطفت میں لیا اور مادرانہ شفقت سے اس کی پرورش کی شاہجہاں کے مزاج میں جو لطافت و نفاست تھی عجب نہیں کہ وہ اسی ترکی نہ ہندی خون کی آمیزش کا نتیجہ ہو، جس کا نمونہ اس کے عہد کی عمارتوں اور صنعتوں میں نظر آتا ہے شاہجہاں کے بیٹے اورنگزیب نے اودے پور کی رانی سے شادی کی، اس رانی کے بطن سے شاہزادہ کام بخش پیدا ہوا، بادشاہ نے اس کو بیجاپور اور حیدرآباد کے علاقے کی حکومت حوالہ کی، ۱۱۱۸ھ میں عالمگیر کی وفات کے بعد اُس نے ان علاقوں پر اپنی خود مختار حکومت قائم کی لیکن اپنے نالائق مصاحبوں کے مشورہ سے وہ اپنے بڑے بھائی شاہ عالم سے لڑ پڑا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱۱۹ھ میں وہ لڑائی میں مارا گیا،

یہ اسلامی ہندوستان کی عظمت کی داستان کا آخری صفحہ ہے اس کے بعد جو کچھ ہے وہ نہ کہنے کے قابل ہے اور نہ سننے کے،

داستانِ عہد گل را از نظیری بشنوید | بلبلان آشفتہ تر گفتند ایں افسانہ را

تاریخ و سیاسیات کراچی | اپریل ۱۹۵۱ء

KHAN ...

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندوستان میں علمِ حدیث

اہلِ تاریخ پر روشن ہے کہ ہندوستان میں اسلام دو راستوں سے داخل ہوا، خشکی سے اور تری سے، خشکی کا راستہ درۂ خیبر کا تھا، جہاں سے ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں نے چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے آغاز سے داخل ہونا شروع کیا، لیکن ان سے صدیوں پہلے اہلِ عرب تاجر اور سوداگر کی حیثیت میں سندھ اور ملیبار سے لیکر گجرات تک بحرِ ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکے تھے، وہ اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا قرآن اور اپنے علوم بھی لائے تھے، اور اس سے سالہا سال پہلے کہ اسلام کا کوئی تیغ زن سپاہی اس سرزمین پر قدم رکھے، یہاں مسلمان عربوں اور عراقیوں کی نوآبادیاں قائم تھیں، اور مسجدیں تعمیر اور آباد تھیں، یہی مسجدیں اسلام کی ابتدائی درسگاہیں تھیں جنمیں وہ بیٹھکر قَالَ اللہُ اور قَالَ الرَّسُول کا آوازہ بلند کرتے تھے،

صحابہ اور ہندوستان حضرت عمرؓ کے عہد سے سواحلِ ہند پر عربوں کی تاخت شروع ہوتی ہے، اور یہ وہ زمانہ تھا، جب ہر کلمہ گو کے لب و دہن "اخبرنا اور حدثنا" کی خوشبو سے معطر تھے، یعنی صحابۂ کرام کا عہد تھا، اسلام کا یہ پہلا مجاہد قافلہ تھانہ پر حملہ آور ہوا تھا، جو ان دنوں بمبئی کے بجائے، بحرِ ہند کا آباد بندرگاہ تھا، اور اس کے بعد بھروچ (واقع گجرات) اس مقدس

بحری عسکر کی دوسری منزل گاہ تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں فوجوں میں دیدارِ نبوی سے مشرف ہستیوں کی کچھ تعداد یقیناً شامل ہوگی، اور اس لحاظ سے ہندوستان بھی اُن خوش قسمت ملکوں میں ہے جن کی خاک صحبت یافتگانِ نبوی کے پانوں سے لگ کر ہماری آنکھوں کا کحل الجواہر بن چکی ہے،

ہندوستان میں پہلا محدث — ۹۳ھ میں مسلمانوں نے سندھ پر حملہ کیا، اور فتح کیا، اور یہ ملک اُس وقت سے تیسری صدی ہجری کے شروع تک عربوں کے قبضہ میں رہا، ۱۵۹ھ میں خلیفہ مہدی کے حکم سے جو فوج ہندوستان کی طرف روانہ ہوئی، اس میں ربیع بن صبیح السعدی البصری بھی تھے، جن کو تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا، یہ بھی اُن بزرگوں میں تھے جنھوں نے احادیث کے منتشر اوراق کے یکجا کرنے میں سب سے پہلے حصہ لیا تھا، بلکہ صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ

قیلَ ھُوَ اول من صنّف و بوّب فی الاسلام،	کہا گیا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام میں تصنیف کی،

ابن سعد میں ہے :-

خرج غازیًا الی الھند فی البحر فمات فدفن فی جزیرۃ من جزائر البحر سنۃ ستین ومایۃ (ج ۷ ق ۲ - ص ۳۶)	وہ غزا کے لئے ہندوستان سمندر میں گئے تو وہیں انتقال کیا، اور کسی جزیرہ میں ۱۶۰ھ میں دفن ہوئے،

ہندوستان میں ایک تابعی — ہندوستان میں ایک تابعی کا نام حباب بن فضالہ ملتا ہے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالکؓ کے دیدار سے آنکھیں روشن کی تھیں، ہندوستان آنے والی فوج میں اُن کا نام لکھا گیا تھا، انھوں نے حضرت انسؓ سے جاکر

فتویٰ پوچھا تھا کہ والدین کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے جا سکتا ہوں یا نہیں، انھوں نے واپس جانے کا مشورہ دیا، معلوم نہیں واپس گئے یا ہندوستان آئے،[1]

ہندوستان کے ایک تاجر تبع تابعی

اسرائیل بن موسیٰ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، یہ ہندوستان بکثرت آتے جاتے رہتے تھے، اسی لئے نزیلِ ہند اُن کا لقب ہی ہوگیا تھا، ابنِ حبان نے ثقات میں لکھا ہے کان یسافر الی الھند، (یہ ہندوستان کا تجارتی) سفر کیا کرتے تھے،[2]

دو نومسلم سندھی محدث

ان لوگوں میں جو دوسری صدی ہجری میں حدیث و سیر کے امام تھے، ابو معشر نجیح سندھی بھی ہیں، یہ مدینہ جاکر رہے، اس لئے مدنی کہلانے لگے، یہ اپنے وقت میں فنِ مغازی و سیر کے امام تھے، بلکہ ان کا نام اس مختصر فہرست میں داخل ہے، جو مغازی و سیر کے واقعات کو سب سے پہلے قیدِ تحریر میں لائے،[3] سنہ ۱۷۰ھ میں وفات پائی، مرتے دم تک زبان میں سندھیت کا اثر باقی تھا، عربی حروف کے مخارج ٹھیک نہیں ادا کرسکتے تھے، تاہم شاگردوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا، جب انھوں نے وفات پائی تو خود خلیفہ ہارون رشید نومسلم ہندی محدث کی نمازِ جنازہ کا امام تھا،

دوسرے بزرگ رجا السندی ہیں، جو ایران پہونچ کر اسفرائینی کہلائے، فنِ حدیث میں یہ کمال پیدا کیا کہ مشہور محدث حاکم اُن کے حال میں لکھتے ہیں، رکن من ارکان الحدیث[4] (یہ حدیث کے ارکان میں سے ایک رکن ہیں) وہ نہ صرف خود محدث تھے، بلکہ اُن کے خاندان میں اور بہت سے حفاظِ حدیث پیدا ہوئے ۳۲۱ھ میں وفات پائی،

---

[1] میزان الاعتدال ذہبی جلد اول ص ۲۰۰ [2] تہذیب التہذیب ابن حجر جلد اول صفحہ ۲۶۱ [3] تاریخ علمائے ہند ص ۲۳، و ص ۱۷۹ نولکشور، [4] تہذیب التہذیب ج ۳ - ص ۲۶۷،

درۂ خیبر کے راستہ سے پہلا محدث

درۂ خیبر کے راستہ سے یہاں مسلمان پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں داخل ہوئے، سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۲ھ میں لاہور فتح کیا، سلطان مسعود کے عہد میں ایک بزرگ شیخ اسماعیل لاہور سے ہندوستان وارد ہوئے، حدیث و تفسیر کے جامع البحرین اور بڑے موثر البیان تھے، بے شمار آدمی یہاں اُن کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ۴۴۸ھ میں لاہور میں وفات پائی آثار تاریخ علماء ہند میں ہے،

"از عظمائے محدثین و مفسرین بود داول کسے است کہ علم حدیث و تفسیر بہ لاہور آورد"

دوسرا محدث صغانی

شیخ موصوف کے بعد یہاں ڈیڑھ سو برس تک اندھیرا گھپ چھایا رہتا ہے بالآخر ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی، مگر یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی،

ان کا نام حسن بن محمد صاغانی ہے، گو اُن کا خاندان ماوراء النہر اور پھر غزنین سے تعلق رکھتا تھا، مگر ان کے پدر بزرگوار نے ہندوستان میں سکونت اختیار کر لی تھی، وہ ۵۷۷ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے، اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر یمن و حجاز و عراق میں جا کر علم کی تکمیل کی، اور لغت و حدیث کے امام قرار پائے، اور بغداد میں بیٹھکر خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے نام سے مشارق الانوار نام حدیث کی کتاب تصنیف کی، اور بھی اس فن کی دوسری کتابیں لکھیں ۶۱۵ھ میں بغداد گئے، اور خلیفۂ بغداد اور سلطان غزنین و ہند کے درمیان سفارت کا فرض انجام دیا، ۶۵۰ھ میں وفات پائی،

مشارق الانوار مشکوٰۃ کی طرح حدیث کی مختلف کتابوں کا مجموعہ ہے، فرق یہ ہے کہ مشکوٰۃ کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، اور مشارق انوار کی ترتیب احادیث کے ابتدائی الفاظ پر ہے، یعنی

لہ فہرست ابن ندیم ص ۱۳۶،

مثلاً من سے شروع ہونیوالی اذا سے شروع ہونے والی صیغہ ماضی سے شروع ہونیوالی حدیثیں وغیرہ علماے محدثین نے اس کتاب کی بڑی قدر کی، اور بے شمار لوگوں نے اس کی شرحیں لکھیں، اور خود یہ کتاب مدارس کے نصاب میں داخل ہو گئی،

الغرض امام صاغانی غزنوی لاہوری تنہا محدث ہیں، اور مشارق الانوار اس دور کی تنہا خدمت حدیث ہے، جو اس عرصہ دراز میں انجام کو پہونچی لیکن چونکہ امام ممدوح کا تعلق زیادہ تر ملک عرب و عراق سے رہا، اس لئے اُن کا اثر اس ملک کے علماء پر بہت کم پڑا، اور اگر پڑا بھی تو صرف اسی قدر کہ اُن کو اپنے نصاب تعلیم کے لئے حدیث میں ایک اپنے ہم وطن کی کتاب مل گئی، اور وہ بدستور اپنے علم دانشمندی و علم دانائی میں مصروف رہے منطق و فلسفہ اور علم کلام کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور وہ بھی عقلی طریق سے، یہی سبب ہے کہ اصول فقہ جیسا ضروری علم بھی معقولات اور کلامیات کا ایک ضمیمہ ہو کر رہ گیا،[1]

علم دانائی اور دانشمندی اور حدیث سے بے توجہی

واقعہ یہ ہے کہ درۂ خیبر سے جو مسلمان قومیں وارد ہوئیں، وہ ترکستان، خراسان، اور افغانستان سے آئی تھیں، گو کہ ترکستان و خراسان تیسری صدی میں علم حدیث کا گہوارہ تھے، اور امام بخاری، امام مسلم نیشاپوری، امام ترمذی، امام نسائی، ابو داؤد سجستانی، ابن ماجہ قزوینی، انہی اطراف و دیار کی سرزمین کی خاک سے پیدا ہوئے تھے، مگر عباسی سلطنت کی کمزوری کے بعد جب ان ممالک میں خود مختار غیر عربی حکومتیں قائم ہوئیں، تو یہ ذوق گھٹتا گیا، اور آخر تاتاریوں کے سیلاب بلا کے بعد تو ہر جگہ سناٹا چھا گیا، مذہبی علوم کی ضرورت تو صرف اس لئے پیش آتی تھی کہ عہدۂ قضا کے ممتاز منصب کو حاصل کیا جائے، اور اس کے لئے صرف فقہ دانی کی ضرورت تھی، فقہ کو فارسی میں دانش کہہ سکتے ہیں،

---

[1] امام صغانی کے حالات، طبقات و تراجم کی تمام کتابوں میں ہیں،

اس لئے علم فقہ کا نام علم دانائی اور فقیہ کا دانا اور دانشمند قرار پایا، چنانچہ اس عہد سے لیکر آجتک ان اطراف میں حدیث وتفسیر کا نہیں، بلکہ علم دانائی کا رواج ہے، چنانچہ آج بھی ترکستان، خراسان وسرحد سے جو طلبہ علم دین کی طلب کے لئے ہندوستان آتے ہیں، وہ صرف ونحو کے بعد صرف فقہ کے بھوکے ہوتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ان ممالک میں فقہ اور فتاویٰ کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں، اور حدیث کی طرف اعتنا اور التفات نہ ہوا،

بہرحال ہندوستان میں درۂ خیبر کے راستہ سے جو علمار وارد ہوئے، وہ اپنے ساتھ جو علم دین یہاں لائے، وہ صرف فقہ ودانائی کی کتابوں کا پشتارہ تھا کہ اس پر حکومت کے نظام کا مدار اور وہ ملک کا قانون اور سلاطین کے تقرب کا ذریعہ تھا، چنانچہ شروع عہد سے اخیر تموری عہد تک ہندوستان میں فتاویٰ اور قانون کے مختلف مجموعے تیار ہوئے، اور جن میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت فتاویٰ عالمگیری کو حاصل ہوئی،

عہد تموری سے پہلے تک یہاں حدیث کا رواج مطلق نہ تھا چنانچہ تغلق کے عہد تک حدیث میں صرف مشارق الانوار طلبہ کے زیر درس تھی، اور جس خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آجاتی تھی، وہ امام الحدیث سمجھا جاتا تھا، حضرت نظام الدین اولیا، نے اسی مشارق کا درس مولانا کمال الدین زاہد دہلوی سے لیا تھا، اور انھوں نے مولانا برہان الدین بلخی سے لیا[1]، اور انھوں نے خود مصنف سے،

اس عہد میں اس ملک میں علم حدیث کے ساتھ لوگوں کو جو بے اعتنائی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں مسئلہ سماع کی تحقیق کے لئے علمار کی ایک مجلس منعقد ہوئی، مناظرہ کے ایک فریق شیخ نظام الدین سلطان الاولیا،

[1] تاریخ علمائے ہند نولکشور ص ۱۴۳،

تھے، اور دوسری طرف تمام علمائ تھے، شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جب میں کوئی حدیث بیان کرتا تھا، تو علماء بڑی جرات اور بے باکی سے کہتے تھے کہ اس ملک میں حدیث پر فقہی روایت مقدم سمجھی جاتی ہے، اور کبھی یہ کہتے تھے کہ چونکہ اس حدیث سے شافعی نے استدلال کیا ہے، اور وہ ہمارا مخالف ہے، اسلئے ہم اس کو نہیں مان سکتے،

لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس عظیم الشان مناظرہ میں کون سی حدیث صحیح پیش ہوئی تھی، تاکہ اس عہد کی حدیث دانی کا صحیح اندازہ ہو سکے، مورخ فرشتہ شیخ کے حال میں لکھتا ہے،

"قاضی رکن الدین ..... بشیخ کردہ گفت اے درویش! در باب سرود وسماع چہ حجت داری، شیخ بحدیث نبوی "السماع مباح لاھلہٖ متمسک" گشت قاضی گفت ترا بہ حدیث چہ کار تو مرد مقلدی، روایتے از ابوحنیفہ بیار تا بمعرض قبول افتد شیخ گفت سبحان اللہ من حدیث صحیح مصطفوی نقل می کنم، و تو از من روایت ابوحنیفہ می خواہی، شاید کہ ترا رعونت حکومت بریں می دارد، زود ازیں عہدہ معزول می شوی ..... بادشاہ چوں حدیث پیغمبر شنید، متفکر شدہ، ہیچ نہ گفت"

سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت میں مولانا شمس الدین ترک ایک محدث مصر سے ملتان اس غرض سے آئے تھے کہ ہندوستان میں علم حدیث کو رواج دیں، حدیث اور متعلقات حدیث کی چار سو کتابیں ساتھ لائے تھے، اور حدیث کی ایک شرح لکھ کر بادشاہ کے نام پیش کرنا چاہتے تھے، مگر جب ملتان تک پہونچے تو اُن کو معلوم ہوا کہ بادشاہ نماز کا پابند نہیں اور جمعہ میں نہیں آتا، اُن کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہیں سے واپس چلے گئے، اور بادشاہ کو ایک

---

[1] اس فقرہ کو حدیث کہنا شاید فرشتہ کی غلطی ہو، یہ فقرہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بطور فتوی نقل کیا ہے،

رسالہ لکھ کر بھیجا جس میں لکھا تھا،

"من از مصر خدمت بادشاہ شہر دہلی کردہ بودم وتمازبرائے خداتعالیٰ و مصطفیٰ ؑ

را مذہب علم حدیث در دہلی ثابت کنم و مسلمانان را از عمل کردن روایت دانشمنداں

بے دیانت برہانم"[1]

غرض عام طور سے دہلی کے مرکز سے سلطنت کا جتنا حصہ متعلق رہا، وہاں نویں صدی ہجری کے بیچ تک علم حدیث سے عموماً بے خبری رہی، اس کی وجہ درحقیقت خدانخواستہ مسلمانوں کی اس سے بے اعتنائی نہ تھی، بلکہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مصر و عرب اور حج کے سفر کے لئے ان دونوں خشکی کا راستہ مستعمل تھا، اور لوگ یہاں سے افغانستان ترکستان وایران وعراق ہوکر حدود عرب میں داخل ہوتے تھے، یہ راستہ اس قدر دور دراز اور پُرخطر تھا، کہ بمشکل ہی آمد و رفت ممکن تھی، شاہانِ دہلی نے اس وقت تک سمندر کے سواحل تک دخل نہیں پایا تھا، اس لئے دہلی کا مرکز علم حدیث کے سرچشمہ سے بے تعلق تھا۔

بہمنیہ اور علم حدیث بہمنیوں نے سب سے پہلے دکن میں اپنی حکومت قائم کی، اور سواحل تک ان کا کہیں کہیں گذر ہوگیا، تو اس فیض کی کچھ چنگاریاں نظر آنے لگیں، بہمنیوں میں سلطان محمود بہمن علم کا بڑا قدرداں گذرا ہے، سلاطین ہند میں سب سے پہلے اُس نے علم حدیث کی اشاعت کی طرف توجہ کی ۷۸۰ھ میں ۷۹۹ھ تک اس کا زمانہ ہے، فرشتہ سلطان کے حال میں لکھتا ہے:۔

"وجہت محدثان اخبار حضرت نبوی صلعم در شہر ہائے کلاں وظائف مقرر کردہ در تعظیم ایشاں می کوشید"

---

[1] تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۲۹۷،

مگر درحقیقت عرب اور ہندوستان کو ایک کرنے کی سعادت سلاطینِ گجرات کی قسمت میں تھی، مسلمان اس پر پہلی صدی سے لے کر آٹھویں صدی کے وسط تک کئی ناکام حملے کر چکے تھے، آخر علاء الدین خلجی نے ان تمام ناکامیوں کو اپنی کامیابی سے بدل دیا، اور اسی کے ساتھ محمد شاہ تغلق کے عہد میں دوسرا ہی گورنر ظفر خاں جب وہاں پہونچا تو اس نے مرکز کی کمزوری کو دیکھکر گجرات کی خودمختاری کا منصوبہ کر لیا، اور آخر فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں ظفر خاں نے مظفر شاہ کا خطاب اختیار کر کے گجرات کی مستقل حکومت ۸۱۰ھ میں قائم کر لی، اور ۸۱۳ھ میں وفات پا کر اپنے سعادتمند بیٹے احمد شاہ اول کے لئے جگہ خالی کر دی، یہی وہ خوش نصیب سلطان ہے، جس نے گجرات کو عرب اور ہندوستان کے بیچ میں سلسلۃ الذہب بنا دیا، اور اس طرح بحرِ عرب کے دونوں کنارے مل گئے، اور بحری راستہ کی آمد و رفت نے سالوں کا راستہ مہینوں میں طے کر دیا، اور انتظام اور پابندی کے ساتھ جہازات آنے جانے لگے، حاجیوں کے قافلے سال بسال سلاطین بیجاپور و گجرات کی نگرانی میں سمندر کے راستہ سے جانے لگے اور اسی راستہ سے علم کے مشتاق عرب کے دیار کا بھی رُخ کرنے لگے، اور اس طرح علمِ حدیث کا تخم عرب سے ہندوستان کو منتقل ہونے لگا، اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں زمین اور آب و ہوا کی موافقت سے اُس نے برگ و بار پیدا کرنا شروع کیا.. بالآخر اکبر نے دو اسلامی حکومتوں کا فصل بھی بیچ سے نکال دیا، اور گجرات فتح کر کے دہلی کو سورت اور کھنبایت کے راستہ سے سیدھے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے ملا دیا،

الغرض سفر کی آسانی اور آمد و رفت کی کثرت نے علماء ہند کو حجازی علوم سے آشنا ہونے کا موقع بہم پہونچایا، اس وقت دہلی اور سمندر کے بیچ میں گجرات، بیجاپور، اور مالوہ (منڈو) تین اسلامی ریاستیں حائل تھیں، اس کے بعد دلّی پڑتی تھی، چنانچہ بحرِ عرب کے اس کنارے کی

علمی موجیں بھی اسی ترتیب سے بحرِ ہند کے اس جانب کے سواحل تک بہ ترتیب آتی تھیں،

ایران میں صفویوں کے تعصب کا اثر

خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ایک قومی و مذہبی سانحہ نے کم ازکم ہندوستان کے لئے خیر وسعادت کا سامان پیدا کر دیا، اس زمانہ میں ایران میں صفویوں نے عروج حاصل کرکے شیعیت کو اپنا سرکاری مذہب قرار دیا، اور قزلباشوں کے تعصب نے ایران کے سبزہ زار کو علمائے سنت کے لئے گرم تنور بنا دیا، اس لئے اُن کے بڑے بڑے علماء نے ملک کو خیر باد کہہ کر عرب یا ہندستان کی راہ لی،

سب سے پہلے بزرگ جو باہر سے اس تبرک کو سینہ سے لگا کر ہندوستان وارد ہوے، وہ مولنا نورالدین احمد شیرازی تھے، یہ غالبًا وہ زمانہ تھا، جب گجرات میں اسلام کی نئی نئی سلطنت قائم ہوئی تھی، اور احمد شاہ اول (۸۱۳ھ ۔ ۸۴۴ھ) تخت نشین تھا، مولانا نورالدین میر سید شریف جرجانی کے شاگرد تھے، صحیح بخاری کی سند اُن کی اتنی عالی تھی کہ وہ حجاز دین پہنچی، تو بڑے بڑے محدثین نے اس کو شوق وذوق اور فخر کے ساتھ حاصل کیا،[1]

ہندوستان میں علم حدیث کا آغاز

علم حدیث کے ہندوستان میں فروغ کا حقیقی زمانہ نویں صدی ہجری کا خاتمہ اور دسویں صدی کا آغاز ہے، یہ وہ عہد تھا جب مصر وشام وحجاز امام الحدیث حافظ محمد بن عبدالرحمن سخاوی (المتوفی ۹۰۲ھ) کے فضل وکمال کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اور حافظ موصوف کے فیض وافادہ کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں پڑ رہی تھیں، مدینہ منورہ میں آکر اُن کے کمال نے نورٌ علیٰ نور کا مرتبہ حاصل کیا،

حافظ سخاوی کے تلامذہ

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سب سے پہلے گجرات نے اپنا طبعی حق پایا، یعنی بحرِ عرب کے اس پار کی شعاعیں سب سے پہلے یہیں آکر پڑیں اور یہاں سے وہ آگرہ کی مسجدوں اور

---

[1] النور السافر بحوالہ یادِ ایام مولانا سید عبدالحئی مرحوم،

مدرسوں کے مناروں پر جاکر عکس انداز ہوئیں،

حافظ سخاوی کے تلامذہ نے سب سے پہلے غالباً مولانا راجح بن داؤد گجراتی ہیں، ۹۰۴ھ میں وہ حافظ موصوف کے حلقہ میں داخل ہوئے، اور الفیہ حدیث کی سند حاصل کی، اس کے بعد وہ گجرات وارد ہوئے، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ۹۰۴ھ میں احمد آباد میں وفات پائی،[۵۱]

اس کے بعد مولانا وجیہ الدین محمد مالکی آئے، اُن کی بڑی قدر ہوئی، سلطان گجرات نے اون کو ملک المحدثین کا خطاب دیا، وہ یہیں کے ہو رہے، ۹۲۹ھ میں وفات پائی،[۵۲]

انہی کے ہم عصر مولانا علاء الدین احمد نہروالی (گجرات) ہیں، عرب جاکر حافظ ابن فہد اور نور الدین شیرازی سے حدیث کی سند حاصل کی آخر عمر مکہ معظمہ میں گذار دی، اور وہیں اپنا سلسلۂ درس جاری رکھا، ۹۴۹ھ میں وفات پائی،[۵۳] اُن ہی قریب العہد حافظ سخاوی کے دوسرے شاگرد جمال الدین محمد بن عمر حضرمی، مظفر شاہ حلیم سلطان گجرات کے زمانہ میں آئے، سلطان نے خود زانوے ادب اُن کے سامنے تہ کیا، اور اپنا استاد بنایا، احمد آباد گجرات میں ۹۳۱ھ میں وفات پائی،[۵۴]

دہلی کے مرکز میں پہلا محدث

لیکن وہ اصلی شخصیت جس کے پرتو سے اس سرزمین کے شمالی وجنوبی دونوں گوشوں کا منور ہونا مقدر تھا، وہ سید رفیع الدین صفوی شیرازی کی ذاتِ والاصفات تھی، یہ معقولات میں محقق دوانی کے شاگرد تھے، عرب پہنچے، اور حدیث کا فیض حافظ سخاوی سے حاصل کیا، اور شرف سعادت کا یہ سرمایہ لے کر وہ گجرات وارد ہوئے، یہ زمانہ دلی میں سلطان سکندر لودی کا تھا، اس قدر دانِ علم کے شہرہ نے سید موصوف کو بھی گجرات سے دلی کھینچا، سلطان نے حسنِ عقیدت کے ساتھ محدث موصوف کا خیر مقدم کیا، اور سلطان کی اجازت سے

---

[۵۱] الضوء اللامع جلد ۳ ص ۲۲۲ [۵۲] یادِ ایام ص ۳۴ [۵۳] ایضاً ص ۵۴،

[۵۴] ایضاً ص ۳۴،

ممدوح نے آگرہ میں سکونت اختیار کی، اور درس و تدریس کا بازار گرم کیا، مشتاق دور دور سے آئے اور اپنی اپنی قسمت کے مطابق متاعِ خیر و برکت حاصل کرتے رہے۔[1]

غالباً خالص ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روح پرور نغموں سے اُس کے محراب و در گونج اٹھے، سید موصوف نے ۹۵۴ھ میں وفات پائی، گو انھوں نے بقول مولانا عبدالحق محدث دہلوی (اخبار الاخیار) لائق اولاد نہیں پائی۔ تاہم بدایونی کی تصریح کے مطابق اپنی چند روحانی اولاد یادگار چھوڑی، جن میں قابلِ ذکر شیخ ابوالفتح تھانیسری ہیں، یہ غالباً سب سے پہلے ہندوستانی ہیں، جو محدث کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں:-

"علم حدیث در ملازمت سید رفیع الدین محدث درست گردانیدہ"

(ج ۳ - ص ۱۲۹)

شیخ ابوالفتح نے پچاس برس تک آگرہ میں اپنے استاد ہی کے محلہ میں بیٹھکر علوم عقلی و نقلی کا درس دیا، اور بے شمار اشخاص اُن کے دامنِ تربیت میں پلکر شہرۂ آفاق ہوئے، جن میں ایک خود ملا بدایونی، نیز مولانا کمال الدین حسین اور ملا عیسیٰ (شیخ کے فرزند) نامور ہوئے۔[2]

ملا عیسیٰ اکبر کے زمانہ میں آگرہ کے مفتی ہوئے، اور ملا بدایونی اکبر کے امام مقرر ہوئے مولانا کمال الدین حسین دراصل شیرازی تھے، ان کے باپ مولانا حسن شیرازی صفویوں کی دار و گیر سے بھاگ کر شیراز سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ اور وہاں سے سید رفیع الدین محدث کے قافلہ کے ساتھ سکندر لودی کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ مولانا کمال الدین حسین نے

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۶ [2] بدایونی سوم ص ۱۲۹،

بادشاہی تعلق گوارا نہ کیا، اور زہد و عبادت کے سجادہ سے باہر قدم نہیں اٹھایا[1]، سید موصوف کے ایک اور شاگرد سید جلال تھے، اور سید جلال[2] کے شاگرد میر سید محمد امروہی تھے، جو اکبر کے عہد میں ہندوستان کے میر عدل تھے،

پہلا شارح بخاری | سید ابو الفتح کے ایک دوسرے معاصر جو ہندوستان زاد تھے، سید عبد الاول حسینی تھے، اُن کے باپ جونپور کے قصبہ زید پور کے رہنے والے تھے، یہاں سے دکن چلے گئے تھے، وہیں یہ پیدا ہوئے، وہاں سے گجرات پہونچے، اور گجرات سے عرب گئے، اور وہاں کے خزانہ سے علمِ حدیث کے زر و جواہر سینہ میں بھر کر لائے، یہ سب سے پہلے ہندوستانی عالم ہیں، جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح لکھنے کی عزت حاصل کی، فیض الباری کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھی، اور فیروزآبادی کی سفر السعادۃ کا خلاصہ کیا[3]،

بخاری کا حافظ | مولانا عبد الملک عباسی گجرات کے باشندے تھے، ایک واسطہ سے حافظ سخاوی[4] کے شاگرد تھے، تقریباً ۹۷۰ھ میں وفات پائی، اُن کو صحیح بخاری پوری زبانی یاد تھی، اور اُس کے معانی و مطالب کے پورے حافظ تھے، اور اسی طرح زبانی یہ صحیح بخاری کا درس دیا کرتے تھے[5]،

حافظ ابنِ حجر کے تلامذہ | اب وہ زمانہ آیا جب مادی و روحانی دونوں سلطنتوں میں انقلاب رونما ہو چکا تھا، ہندوستان کے افق پر اب مغلِ اعظم کے اقبال کا ستارہ چمک رہا تھا، اور عرب میں حافظ سخاوی کے بجائے جن کی وفات کو پچاس برس گذر چکے تھے، اور جن کے تلامذہ خاص بھی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اب حافظ ابنِ حجر مکی (صواعق محرقہ کے مصنف) کا شہرہ تھا، جو زکریا انصاری، بلقینی، سمہودی، اور ابو الحسن بکری کے شاگرد تھے، ۹۷۳ھ میں وفات پائی،

---

[1] بدایونی سوم ص ۱۲۶، [2] تاریخ علمائے ہند ص ۸۰۳ نولکشور، [3] یاد ایام مولانا سید عبد الحی مرحوم ناظم ندوۃ العلما، و تاریخ علمائے ہند ص ۳۳۰، [4] ایضاً،

عہدِ اکبری | بادشاہ اکبر کے ابتدائی عہد میں جب بیرم خانخاں امورِ سلطنت کا متکفل تھا، اُس نے علوم و فنون کے دوسرے مشاہیر کے ساتھ حضرات محدثین کو بھی گجرات سے دلّی اور آگرہ آنے کی دعوت دی، ان میں سب سے پہلے گھر کی "دولت" یاد آئی، یعنی میر سید عبدالاول جونپوری کو باصرار تمام گجرات سے دلّی بلوایا، ۹۶۵ھ میں یہیں وفات پائی،[1]

میر کے تلامذہ میں ایک شیخ طیب محدث سندھی تھے، جنھوں نے گجرات کے قیام کے زمانہ میں شیخ سے حدیث پڑھی تھی، اور تقریباً پچاس برس تک ایلچ پورا اور برہان پور میں بیٹھکر اس فنِ شریف کی خدمت کی،[2]

اسی عہد میں شیخ عبدالمعطی مکی، جو شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری کے شاگرد تھے، یہاں آئے، اور ۹۰۳ھ میں وفات پائی، شیخ الاسلام انصاری کے دوسرے شاگرد جو مصری تھے، شہاب الدین احمد عباسی وہ بھی گجرات آئے، اور ۹۹۲ھ میں وفات پائی، ابوالحسن بکری اور ابن حجر مکی کے تلامذہ شیخ محمد بن عبداللہ فاکہی المتوفی ۹۹۲ھ، سید عبداللہ عیدروس المتوفی ۹۹۰ھ، شیخ سعید شافعی حبشی المتوفی ۹۹۱ھ گجرات وارد ہوئے،[3]

ابن حجر مکی کے ایک اور شاگرد شیخ یعقوب صرفی کشمیری ہیں، ۹۰۸ھ میں پیدا ہوئے، علومِ عقلی کا درس مولانا جامی کے شاگرد مولا محمد شاہ آنی سے لیا، اور حدیث کی سند حافظ ابن حجر مکی سے حاصل کی، عین عالمِ شباب میں ۲۶ برس کی عمر میں ۱۰۰۳ھ میں وفات پائی تفسیر قرآن مجید (ناتمام) کے علاوہ شرح صحیح بخاری اور مغازی النبوۃ دو کتابیں لکھیں،[3] شیخ احمد مجدد الف ثانی نے حدیث کا فیض انہی سے پایا،

---

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۲۳۷ و ۲۳۸، [2] یادایام ص ۱۳۱، ۱۵۳ و ۲۶۳ [3] تحفۃ الفضلا معروف بہ تاریخ علمائے صفحہ ۲۵۵ و بدایونی جلد سوم،

اس زمانہ میں کشمیر ایک اور محدث کے وجود سے مفتخر ہوا، ملا محمد شگرف محدث کشمیری حرمین جاکر ابنِ حجر مکی کے شاگرد ہوئے، اور واپس آکر اپنے وطن میں طلبہ کو درس دیا، [1]

کشمیر کے ایک اور نامور محدث کا نام حاجی (شاید حاجی محمد) ہے، اُن کے بزرگ ہمدان کے تھے، اور سید علی ہمدانی کے ساتھ کشمیر آئے تھے، حاجی کی ایک فارسی تصنیف شرح شمائل ترمذی ہے، اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور ابن حجر مکی اور میر جمال الدین محدث صاحب روضۃ الاحباب کے شاگرد مولانا صادق محدث کے تلمذ سے فیض یاب ہوئے، ۱۰۰۶ھ میں وفات پائی، ان کی شرح شمائل کا نسخہ پٹنہ کے کتب خانہ میں ہے، [2]

محدث سرہندی کا

اس عہد کے ایک نامور مولانا عبدالرحمن محدث سرہندی کا نام ملتا ہے، جن کے لئے سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی کے استاذ حدیث تھے، اس سے زیادہ کچھ اور حال معلوم نہ ہوا، [3]

ابو الحسن بکری کے تلامذہ

اسی عہد میں ایک ذاتِ گرامی مکہ معظمہ میں درس وارشاد کی مسند پر جلوہ گر نظر آتی ہے، اور جس کے فیوض کی بارش ہندوستان میں مسلسل معلوم ہوتی ہے، اُن کا نامِ نامی کتابوں میں ابو الحسن بکری مرقوم ملتا ہے، یہ مصر کے رہنے والے شافعی المذہب اور ابوبکر صدیقؓ کی نسل میں تھے، مکہ معظمہ میں سکونت پذیر تھے، [4]

حضرت ابو الحسن بکری اور علامہ ابن حجر ہیثمی مکی دونوں معاصر ہیں، اس لئے آئندہ سلسلۂ تلمذ ان بزرگوں کے دوسرے تعلقات سے مضبوط و مستحکم نظر آتا ہے،

---

[1] تاریخ علماے ہند ص ۹۰، [2] فہرست حدیث فارسی کتب خانہ پٹنہ جلد نہم فارسی ص ۱۵۱، [3] تاریخ علماے ہند ص ۱۰، [4] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں،

ابھی تک ہندوستان میں علم نبوی کی روشنی چمک چمک کر بجھ بجھ جاتی تھی،

شیخ علی متقی | لیکن دسویں صدی کے بیچ میں یک بیک ہندوستان کی قسمت چمکتی ہے، اور اُس کے اقبال کا ستارہ پورب کے اس شہر میں طلوع ہوتا ہے جس کو شاہجہان کی قدر دانی نے "شیراز ماست" کا خطاب دیا تھا، لیکن شاید اس لئے کہ اس کی نسبت کا فخر ملک کے صرف ایک ہی حصہ کو حاصل نہ ہو، بلکہ ہندوستان کے تینوں خطے پورب پچھم (پنجاب) اور دکن کو برابر حاصل رہے اس کو تینوں خطوں سے برابر کی نسبت عطا کی گئی، ہندوستان کی یہ قسمت بیدار اور ستارۂ درخشاں شیخ علی متقی کی ذات تھی، شیخ کا اصلی اور خاندانی وطن جونپور تھا، برہان پور دکن میں ۸۸۵ھ میں پیدا ہوئے، اور وہیں شیخ باجن برہان پوری سے بچپن میں بیعت کی، جوانی میں ملتان جاکر شیخ حسام الدین متقی سے علم ظاہر و باطن کی تکمیل کی، ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ شیخ کے جسمانی باپ (والد) کا نام بھی حسام الدین تھا، اور روحانی باپ (استاذ و مرشد) کا نام بھی حسام الدین ہی تھا، اور متقی کا مشہور لقب بھی شاید انہی استاد و مرشد کی نسبت سے حاصل ہوا، یہاں سے جاذبۂ توفیق نے مرکز کی طرف کھینچا، گجرات ہو کر ۹۵۳ھ میں دیارِ عرب کی طرف لنگر اٹھایا، اس وقت عمر شریف "ستر" برس کی تھی، آج مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے اس علمی ولولۂ شوق سے عبرت حاصل کرنی چاہئے، کہ ستر برس کا بڈھا جوانوں کا شوق لے کر خشکی و تری کی مصیبتوں کو برداشت کر کے علم کی تکمیل کے لئے ملک عرب کا رُخ کرتا ہے،

شیخ علی متقی نے عرب پہونچ کر حجاز کے مشہور و معروف اساتذہ اور شیوخ سے چند سال علم ظاہر و باطن کی تحصیل کی، ان شیوخ میں شیخ ابن حجر مکی، (صواعق محرقہ کے مصنف) شیخ ابوالحسن بکری اور محمد بن محمد سخاوی ہیں) محمد بن عبدالرحمن مشہور سخاوی نہیں، جو اس سے پچاس برس پہلے ۹۰۲ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پا چکے تھے) شیخ نے چند ہی سال میں اپنی فطری استعداد، روحانی ذوق

اور ربانی توفیق سے یہ مرتبہ حاصل کرلیا کہ استاد شاگرد اور شاگرد استاد کے مرتبہ میں آگئے، اور ۹۵۷ھ سے ۹۷۱ھ تک حدیث شریف کی وہ دائرۃ المعارف ترتیب دی، جو کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال کے نام سے مشہور ہے، اور ساتھ ہی ایک مختصر مجموعہ منہج العمال کے نام سے بھی لکھا، یہ وہ کتابیں ہیں جنہوں نے امام رزین اور حافظ سیوطی کے مجموعوں پر خطِ نسخ پھیر دیا،

شیخ اس درمیان میں (۹۶۱ھ تک) دو دفعہ ہندوستان (گجرات) آئے، اور سلطان محمود گجراتی نے یہ قدردانی کی کہ حقیقت میں اپنی سلطنت لاکر آپ کے قدموں میں ڈال دی،[ا] اور آپ کے اور آپکے مدرسہ اور طلبہ کے لئے وظائف کی بہت بڑی رقم مقرر کردی، ۹۷۵ھ میں شیخ نے ۹۵ برس کے سن میں وفات پائی لیکن اس حالت میں بھی کہ بدن میں جنبش کی قوت تک نہ تھی، علمی شوق و ذوق کی جو کیفیت تھی، ان کے فرزند معنوی اور شاگرد کے شاگرد شیخ عبدالحق محدث کے الفاظ میں پڑھو،

"واشتغال وے بتتبع سنن و احادیث نبوی صلعم چناں تا آخر حیات بود کہ دراں وقت بمقتضائے عادت بشری جنبیدن ممکن نہ باشد، شب و روز بہ تالیف کتب احادیث و تصحیح و مقابلۂ آں مشغول بودے"[۲]

شیخ کے آغوش تربیت میں ہندوستان کے متعدد باکمال پل کر جوان ہوئے، شیخ عبدالوہاب متقی منڈوی برہان پوری، شیخ محمد طاہر پٹنی (احمد آباد گجرات)، شاہ محمد بن فضل اللہ برہان پوری، شیخ عبداللہ و شیخ رحمت اللہ سندھی و شیخ برخوردار سندھی،

عبدالوہاب متقی | **شیخ عبدالوہاب** متقی منڈو (مالوہ) کے رہنے والے تھے، برہان پور میں پیدا ہوئے

ا اس کا تفصیلی حال ظفر الوالہ بمظفر وآلہ ص ۳۱۵ مطبوعہ لندن، اور مرآۃ احمدی ج دوم ص ۶ میں پڑھو،

۲ اخبار الاخیار ص ۲۴۲ طبع ہاشمی میرٹھ ۱۲۷۸ھ،

بیس برس تک گجرات ودکن کی سیر کی، اور یہاں کے علماء سے استفادہ کرکے عرب گئے، ۹۶۳ھ میں شیخ علی متقی کے حلقۂ صحبت میں داخل ہوئے، اور شیخ کی وفات (۹۷۵ھ) تک بارہ برس متصل جلوت وخلوت میں شیخ کے ہمراہ رہے، شیخ کی تصنیفات کا مسودہ لکھنا، اور اُن کو صاف کرنا شاگرد کا کام تھا، آخر کامل صحبت نے اُن کو بھی کامل کر دیا، یہاں تک کہ اُن کی وفات کے بعد حرمین محترمین اور مصر وشام ویمن کے علماء نے اُن کو شیخ کا جانشین تسلیم کیا، اور شیخ عبدالوہاب شیخ عبدالوہاب متقی ہو کر مشہور ہوئے،

شیخ عبدالوہاب صرف ایک دفعہ ۹۷۶ھ میں ہندوستان آئے، اور پھر اسی سال واپس گئے، ۱۰۰۱ھ میں وفات پائی، تلامذہ اور مستفیدین کا انبوہ کثیر اپنے پیچھے چھوڑا، صحاح ستہ کا درس اُن کے حلقہ میں ہوتا تھا، اور روز وشب حدیث کی تدریس یا نادر کتابوں کی تصحیح ونقل ومقابلہ کے سوا کوئی کام نہ تھا[1]،

| محمد طاہر فتنی |

مُلا محمد بن طاہر پٹن کے رہنے والے تھے، جو احمد آباد (گجرات) کے پاس اب تک آباد ہے، اسی پٹن کو معرب کرکے فتن کہتے ہیں جس کی نسبت سے وہ محمد بن طاہر فتنی کہلاتے ہیں، بوہرہ تھے، شیخ علی متقی کے ارشد تلامذہ میں تھے، مکہ معظمہ جا کر فیض حاصل کیا، اور استاد کی زندگی ہی میں دو کتابیں تصنیف کیں، مجمع البحار لغت حدیث میں اور مغنی اسماء الرجال میں، ان دونوں کتابوں میں اپنے استاد کا جس ولولۂ شوق اور غلبۂ محبت کیسا تھ ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاگرد کے دل میں استاد کی کتنی قدر ومنزلت تھی، مجمع البحار گو بظاہر حدیث کا لغت ہے مگر علمائے محدثین کے اعتراف کے مطابق وہ درحقیقت صحاح ستہ کی شرح ہے. علاوہ ازیں تذکرۃ الموضوعات، قانون الموضوعات وغیرہ کتابیں اُن کی تالیف ہیں،

ہندوستان واپس آکر بوہرہ قوم کو اہل سنت بنانے کے لئے یہ کوشش بلیغ کی، کہ اسی راہ میں

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے دیکھو اخبار الاخیار ص ۲۴۴، وما بعد ومرأۃ احمدی ج ۲ ص ۵۷،

۹۸۶ھ میں اجین کے قریب قصبہ سارنگ پور میں شہادت پائی، (مرآۃ احمدی ج۲ ص ۱۱)

متقی کے تلامذہ | شیخ عبداللہ بن سعدالدین اور شیخ رحمت اللہ بن عبداللہ یہ دونوں بزرگوار سندھ کے تھے، اُن کے والد مدینہ منورہ ہجرت کرکے گئے تھے، شیخ علی متقی کے شاگردانِ خاص اور خلفار میں تھے، ۹۷۰ھ کے پس وپیش میں ہندوستان وارد ہوئے، اور احمد آباد گجرات میں قیام پذیر ہوئے، اور مشتاقانِ حدیث کو اپنے درس وافادہ سے سیراب کیا، لیکن اخیر عمر میں دونوں بزرگ چند سال کے فصل سے اسی ضعف اور پیری کے عالم میں حجاز واپس گئے، اور وہیں وفات پائی،[۱] شیخ رحمت اللہ کے بھائی شیخ حمید سندھی تھے، جو تفسیر وحدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے، خان اعظم کوکہ کے ساتھ عرب گئے، اور وہاں مقتدائے[۲] الحدیث ہوئے،

شیخ برخوردار سندھی نے حجاز ہی میں اپنی مسندِ درس قائم کی، چنانچہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی نے اُن سے بھی فائدہ اٹھایا تھا،[۳]

شاہ محمد بن فضل اللہ کا آبائی وطن جونپور تھا، احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئے، جوان ہوکر مکہ معظمہ چلے گئے، اور تقریبًا ۱۲ برس تک شیخ علی متقی کے حلقۂ درس میں داخل رہے، پھر ہندوستان واپس آکر برہان پور میں سکونت اختیار کی، اور درس وتدریس کی محفل گرم کی، مسئلہ وحدت الوجود میں التحفۃ المرسلۃ الی النبی ایسی اہم کتاب تصنیف کی، کہ عرب وشام کے بڑے بڑے علمار شیخ عبدالغنی نابلسی اور شیخ ابراہیم کردی نے اُس کی شرحیں لکھیں، اتباعِ سنت میں ایسے کامل تھے، کہ "نائب رسول اللہ" کے لقب سے مشہور ہوئے، برہان پور میں مدرسہ قائم کیا، جس میں ہمیشہ فقہ وتفسیر وحدیث کا درس دیا کرتے تھے،

۱۰۰۵ھ میں وفات پائی،

---

[۱] اخبار الاخیار ص۲۶۴، [۲] ایضًا ص۲۶۴، [۳] اتحاف النبلاء نواب صدیق حسن خاں مرحوم ص۳۹۰

اسی عہد کے چند اور بزرگوار ذکر کے لائق ہیں، ایک سید یٰسین گجراتی جنھوں نے ہندوستان کے بعد عرب جاکر اس فیض کو حاصل کیا، بدایونی دورِ اکبری کے علماء کے حالات میں لکھتے ہیں،

"بشرف زیارت حج اسلام مشرف گشتہ وعلم حدیث آنجا حاصل کردہ اجازت یافت و باز گشتہ بہند آمد"[1]

سید ممدوح نے پنجاب کا خطہ پسند فرمایا، اور لاہور میں اپنے درس کی مسند بچھائی، اس کے بعد سر منڈا کر درویش مجرد ہو گئے،

شیخ بہلول دہلوی | شیخ عبداللہ اور شیخ رحمت اللہ جو گجرات آ گئے تھے، شیخ بہلول دہلوی نے گجرات جاکر ان کا دامن تھاما اور حدیث کا درس لیا، اور دلی واپس آکر اس فنِ شریف کی تعلیم و تدریس میں عمر بسر کردی، ملا بدایونی لکھتے ہیں،

"علم حدیث راخوب ورزیدہ......... بااہلِ دنیا کارے ندارد و بافادہ و افادۂ طلاب مشغول است"[2]

اس عہد کے دوسرے بزرگ حاجی ابراہیم محدث ہیں، عرب جاکر فیوض و برکات سے مالامال واپس آئے اور آگرہ میں زہد و ورع کے ساتھ علم حدیث کا درس دیتے تھے،

بدایونی میں ہے :۔

"در آگرہ بزہد و ورع درس علوم دینی خصوصاً علم حدیث قیام داشت"

اس فیض و برکت کا اثر یہ تھا، کہ وہ اکبر کے عہدِ حکومت میں دارالسلطنت میں بیٹھ کر امر معروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے تھے، کوئی شاہی منصب قبول نہیں کیا، دربار میں جب جاتے تھے، آدابِ شاہی کے مقررہ مراسم وسجدہ اور کورنش اور تکلفات سے آزاد رہتے تھے اور وعظ و پند

---

[1] بدایونی ج ۳ ص ۱۳۰، [2] ایضاً ص ۱۱۳

فرماتے تھے،[1]

شیخ عبدالنبی گنگوہی | شیخ عبدالنبی گنگوہی بھی اسی دور کے اہلِ کمال میں ہیں، یہ بزرگ، دادا یعنی حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے، اکبر کے زمانہ میں پورے ہندوستان کے صدرالصدور (شیخ الاسلام) تھے، پہلے تصوف زمانہ کا رنگ غالب تھا، سماع وغناسے ذوق تھا، پھر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی حاضری کا کئی دفعہ اتفاق ہوا، اور وہاں علم حدیث کا درس حاصل کیا، لوٹ کر آئے، تو وہ کچھ اور ہی چیز ہو گئے، بدایونی میں ہے،

"چند مرتبہ در مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ رفتہ علم حدیث را خواندہ و بعد از ان کہ باز گشتہ آمد

از روش آباء و اجداد کرام وسماع و غنا را منکر بود و بر روش محدثین سلوک می نمود، و

بتقویٰ طہارت و نزاہت و عبادت ظاہری اشتغال داشت"[2]

اکبران کا اس درجہ ادب کرتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے اُن کے سامنے اُن کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، دربار کے جاہ پرست، فقہاء کے رشک حسد نے شیخ کی مخالفت شروع کی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ دربارِ شاہی سے پوری جماعت کا اثر جاتا رہا۔ اور اُن کی جگہ مُلا مُبارک ناگوری اور فیضی اور ابوالفضل نے لے لی،

مُلا قاری اور اُن کے اُستاد | اکبری دور کے ایک اور فاضل محدث مولانا میر کلاں محدث اکبرآبادی ہیں، اُن کا سلسلۂ سند عرب کے بجائے عجم سے ہے، یہ میرک شاہ شیرازی کے شاگرد تھے، اور وہ اپنے باپ سید جمال الدین محدث مصنف روضۃ الاحباب کے شاگرد تھے، اور عرب جاکر اپنے فضل و کمال کی تکمیل کی تھی، اور جمال الدین کو اپنے چچا سید اصیل الدین شیرازی سے تلمذ تھا، یہ جہانگیر کے استاد مقرر ہوئے تھے، ۹۸۳ھ میں وفات پائی[3] بدایونی لکھتے ہیں:-

---

[1] بدایونی ج ۳ ص ۱۳۹ [2] ایضاً بدایونی ج ۳ ص ۸۰ [3] علمائے ہند ص ۲۰۳ و مآثر الکرام آزاد ص ۲۰۷

در حدیث آیۂ روزگار بود"[1]

مولانا میر کلاں کے شاگرد وہ فاضلِ یگانہ تھے، جو ملا علی قاری کے نام سے مشہور ہیں، مُلّا علی قاری گو رہنے والے ہرات کے تھے، مگر اس زمانہ میں ہرات تیموری ہی سلطنت کا ایک جزو تھا، اور اُن کا فضل و کمال بھی تمامتر اساتذۂ ہند کا ممنونِ احسان ہے، اور اُن کی تصنیفات نے بھی یہیں زیادہ تر شہرت حاصل کی، اس لئے یہ محدثین ہند کی فہرست سے خارج نہیں ہوسکتے۔

ملا علی قاری کے والد کا نام سلطان محمد تھا، ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی، مشکوٰۃ مولانا میر کلاں سے پڑھی، یہاں سے یہ مکہ معظمہ گئے، اور ابو الحسن بکری، سید زکریا حسینی، ابن حجر مکی، ہیثمی، شیخ عبد اللہ سندھی، قطب الدین نہروالی، (نہروالہ گجرات) مکی سے علوم حدیث کی تکمیل کی، ۱۰۱۴ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، شرح شفاء قاضی عیاض، شرح شمائل ترمذی، شرح نخبۃ الفکر (اصول حدیث) شرح ثلاثیات بخاری، تخریج احادیث شرح عقائد نسفی نور القاری شرح صحیح بخاری، شرح صحیح مسلم، شرح حصن حصین، شرح اربعین نووی شرح موطا امام محمد، سند الانام شرح مسند الامام (ابی حنیفہ) المصنوع فی معرفۃ الموضوع تذکرۃ الموضوعات وغیرہ بے شمار کتابیں اور رسالے یادگار چھوڑے،

درس بخاری لاہور میں | تاریخ میں پہلی دفعہ صحیح بخاری کے داخلِ درس ہونے کا ذکر اسی عہد میں ملتا ہے، مولانا محمد لاہور کے مفتی تھے، اور وہ حدیث شریف کا لاہور میں درس دیتے تھے، اور تقریباً نوے برس کے سن تک اس بابرکت شغل میں وہ مصروف رہے، جب صحیح بخاری اور مشکوٰۃ کا دورہ تمام ہوتا، تو اس خوشی میں وہ بہت دھوم دھام سے لوگوں کی دعوت کرتے تھے،

[1] بدایونی ج ۳ ص ۱۵۱،

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

اکبر کے آخری عہد میں وہ بزرگ ہستی نمایاں ہوئی جس نے عہدِ جہانگیری میں اپنی جہانگیری کا سکہ بٹھا دیا، اور جس نے دہلی کے شاہی دارالسلطنت کو ہمیشہ کے لئے علوم دین کا دارالسلطنت بنا دیا، اور جس کی نسبت اہلِ علم کا اعتراف ہے،

"اوّل کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود"

گو نئی تاریخ کی روشنی میں بزرگوں کا یہ پرانا مقولہ صحیح نہیں، تاہم معنوی حیثیت سے اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں، مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی ذات وہ ذات ہے جس نے ہندوستان میں رہ کر حدیث کے سربمہر خزانہ کو وقفِ عام کیا، اور دلپسند محققانہ تصنیفات کے ذریعہ سے علمائے ظاہر و باطن دونوں کی محفلوں سے تحسین و آفرین کی داد وصول کی،

شیخ عبدالحق دہلوی نسلاً ترک تھے، ۹۵۸ھ میں دہلی میں پیدائش ہوئی، اپنے والد ماجد سے علوم کی تحصیل کی، پھر مکہ معظمہ جاکر شیخ عبدالوہاب متقی کے حلقۂ درس میں بیٹھے، اور ان سے صحاحِ ستہ کا درس حاصل کیا، اور ان کے مرید بھی ہوئے، شیخ کو اپنے استاد اور پیر سے جو عقیدت تھی، اس کا اندازہ اخبارالاخیار کے صفحات سے ہو سکتا ہے، شیخ نے ہندوستان آکر دہلی میں اقامت اختیار کی، اور تقریباً سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے مشکوٰۃ کی مشہور عربی شرح لمعات اور فارسی شرح اشعۃ اللمعات ہے، نیز سیرۃ النبوی میں مدارج النبوۃ تصنیف کی، اور فیروزآبادی کی فارسی سفرالسعادۃ کی فارسی شرح ایسی لکھی، جو حافظ ابن القیم کی زادالمعاد کے لگ بھگ ہے، ۱۰۵۲ھ میں وفات پائی،

جوہرناتھ کشمیری

شیخ کے معاصر کشمیر کے ایک نومسلم ہندو محدث جوہرناتھ کاشمیری ہیں، سلطان قطب الدین کے مدرسہ میں علوم عقلیہ کی تکمیل کے بعد عرب کی طرف رُخ کیا، اور وہاں پہونچ کر ابن حجر مکی، اور ملا علی قاری ہروی سے حدیث کی سند حاصل کی، دوشالہ بنتے تھے، اور علوم دینیہ کا درس دیتے تھے

کئی نامور شاگرد پیدا ہوئے، ۱۰۲۶ھ میں وفات پائی[1]

شیخ محمد قاسم | شیخ محمد قاسم سندھی سندھ کے رہنے والے تھے، عرب جاکر اس فن میں ایسا کمال پیدا کیا کہ رئیس المحدثین کہلائے۔ وہیں انتقال کیا، ان کی اولاد برہان پور میں آباد ہوئی، اُن کے بیٹے شاہ محمد عیسیٰ جنداللہ اور اُن کے بیٹے بابا فتح محمد برہان پوری تین نسل تک علوم دینیہ اور علم حدیث کے وارث رہے،[2]

شیخ عبدالحق دہلوی کا سلسلہ | عالمگیر کے زمانہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے لائق فرزندوں اور شاگردوں کا ایک بابرکت سلسلہ پیدا ہوا جس نے اس فیض کو جاری کیا، شیخ کے فرزند مولانا نورالحق محدث دہلوی نے باپ کی علمی وراثت حاصل کی، باپ ہی سے حدیث کا درس حاصل کیا، اور تمام عمر اس فیض کو عام کرنے میں صرف کی، حضرت خواجہ محمد معصوم سے بیعت کی، صحیح بخاری کی فارسی میں تیسیر القاری کے نام سے کئی جلدوں میں شرح لکھی، جو ۱۳۰۲ھ میں مطبع علوی لکھنؤ میں ایک والی ٹونک کے شوق سے چھپ چکی ہے، انھوں نے امام مالک کی موطا کی بھی شرح لکھی ہے، جو پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں میری نظر سے گذر چکی ہے، صحیح مسلم کی بھی شرح بنام منبع العلم لکھنی شروع کی تھی، مگر ناتمام رہی، شاہجہاں کے زمانہ میں آگرہ کے قاضی تھے ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی،

شیخ نورالحق دہلوی کے ایک صاحبزادے حافظ فخرالدین ہیں، یہ بھی اپنے باپ کی متروکہ علمی دولت کے وارث ہوئے، انھوں نے فارسی میں اپنے والد کی ناتمام شرح صحیح مسلم موسوم بہ منبع العلم کی تکمیل کی، یہ شرح کتب خانہ پٹنہ میں موجود ہے، نیز حصن حصین کی بھی شرح لکھی،[3]

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۸ و اسرار الابرار، [2] ایضاً ص ۱۶۰ و اسرار الابرار ملا داؤد مشکوٰتی قلمی،
[3] حدائق الحنفیہ،

حافظ فخر الدین کے فرزند شیخ الاسلام ہیں، جو محمد شاہ کے زمانہ میں تھے، صحیح بخاری کی فارسی شرح لکھی، اور دو رسالے طرد الاوہام عن اثر الامام الہمام اور کشف الغطا عما لزم للمولی عن الاحیار لکھے حدیث اپنے باپ سے پڑھی، یہ شرح بخاری تیسیر القاری کے حاشیہ پر شرح شیخ الاسلام کے نام سے چھپی ہے،

شیخ الاسلام کے صاحبزادے سلام اللہ ہیں، انھوں نے بھی اپنے باپ ہی کی وراثت علمی پائی، یہ دہلی چھوڑ کر رام پور چلے آئے تھے، اور محدث رام پوری کے نام سے مشہور ہیں، انھوں نے موطا کی شرح محلّی ۱۲۱۵ھ میں لکھی، نیز صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور اصولِ حدیث پر عربی میں ایک رسالہ لکھا، ۱۲۲۹ھ میں وفات پائی،[۵۱] شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا یہ سلسلۂ فیض وہ ہے جو سلسلۂ نسب کے ساتھ ساتھ چلا ہے، لیکن ایک دوسرا سلسلہ یہ ہے جو صرف روحانی فیض تک محدود ہے،

شیخ دہلوی کے ایک نامور شاگرد اسی سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک اور بزرگ زادہ خواجہ خاوند معین الدین ہیں جو خواجہ خاوند محمود المعروف بحضرت ایشاں المتوفی ۱۰۵۲ھ کے فرزند تھے جنھوں نے علوم حدیث و تفسیر و فقہ و اصول میں شیخ سے کسبِ کمال کیا، اور اپنے والد بزرگوار سے خرقۂ خلافت پایا، کتاب کنز المعانی اُن کی تصنیف ہے،[۵۲]

شیخ دہلوی کے ایک اور نامور شاگرد ملا حیدر کشمیری ہیں، پہلے اپنے وطن کے علما، ملا جوہر ناتھ اور بابا قطب الدین سے علوم کی تحصیل کی، پھر دلّی آکر شیخ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور حدیث و تفسیر و فقہ کی تکمیل کی، اور واپس جاکر درس و تدریس اور ہدایت و ارشاد میں مصروف ہوئے، والیِ کشمیر نے ہر چند چاہا کہ وہ قضاء کا عہدہ قبول کریں مگر وہ راضی نہ ہوئے، ۱۰۵۶ھ میں وفات پائی،[۵۳]

---

[۵۱] خزینۃ الاصفیا، مفتی سرور لاہوری ص ۴۲۸، [۵۲] خزینۃ الاصفیا، ص ۴۳۴، [۵۳] تاریخ علمائے ہند ص ۵۴، و اسرار الابرار بہ علا، اُردو ترجمہ کاتی

ملّا حیدر کے شاگرد بابا داؤد مشکاتی کشمیری ہیں[1]، علوم عقلیہ کے ساتھ فقہ و حدیث و تفسیر کی تعلیم اُن سے حاصل کی، حدیث دانی میں یہ کمال پیدا کیا، کہ مشکوٰۃ برزبان یاد تھی، اور اسی نسبت سے مشکاتی کے لقب سے مشہور ہوئے، اسرار الابرار کشمیر کے مشائخ اور علماء کے حالات اور ملفوظات میں اُن کی ایک تصنیف ہے، اُس کا ایک قلمی نسخہ دارالمصنفین کے کتب خانہ میں ہے، اس میں کہیں کہیں صحیح بخاری اور احادیث کے حوالے نظر آتے ہیں، ۱۰۹۷ھ میں وفات پائی،[2]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند ملّا نور الحق دہلوی کے حلقۂ درس کے ایک نامور فاضل میر سید مبارک محدث بلگرامی ہیں، میر موصوف نے شیخ کے گھر میں رہ کر اور اُن کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر علم حدیث میں وہ کمال پیدا کیا کہ آزاد بلگرامی نے اُن کو قطب المحدثین قرار دیا، مآثر الکرام میں ہے:

"داز اول تا آخر ایام اقامت دہلی درخانہ شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق قدس اللہ اسرارہما، سکونت ورزیدہ و علم حدیث ازاں جناب اخذ کردہ و دریں فنِ اشرف مہارتے تامے بہم رسانید و تمام عمر در خدمتِ کلام نبوی فنا ساخت و بہ لقب محدث بلند آوازہ گشت و لہذا اوراد ریں کتاب بہ قطب المحدثین یاد کردہ"

۱۰۶۴ھ میں سند فراغ حاصل کی، اور بقیہ عمر عام علوم اور خصوصًا علم حدیث کی درس و تدریس میں بسر کی، امر معروف اور نہی عن المنکر میں ایسے سخت تھے کہ بڑے بڑے امراء ان کی ڈانٹ سے دب جاتے تھے، ۱۱۱۵ھ میں وفات پائی،[3]

میر سید مبارک کے تلامذہ میں میر عبدالجلیل بلگرامی سب سے نامور ہوئے، علم حدیث کا نور اس خانوادہ میں میر سید مبارک ہی کے مبارک قدم سے جلوہ افروز ہوا، آزاد لکھتے ہیں:-

"و علم حدیث از قطب المحدثین میر سید مبارک بلگرامی سند نمود،"

---

[1] تاریخ علمائے ہند ص ۴۵۔ و اسرار الابرار ملّا داؤد مشکاتی [2] تاریخ علمائے ہند ص۶۰ [3] مآثر الکرام جلد اوّل ص ۹۴

میر عبدالجلیل کے فضل و کمال کا ستارہ عالمگیر کے عہد میں طلوع ہوا، اور محمد شاہ کے زمانہ تک درخشان رہا، آخر میں بھکر واقع سندھ میں وقائع نویس تھے، وہاں صحیح بخاری کا ایک نسخہ ہاتھ آیا، عہدہ سے برطرفی کے بعد بھی محض اس کی نقل کی خاطر چھ مہینے اور وہاں گذارے ۱۰۷۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی،

علامہ میر عبدالجلیل کے آغوشِ تربیت میں علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے پرورش پائی، حدیث و سیر اپنے نانا میر عبدالجلیل سے حاصل کی، لکھتے ہیں، :-

"ولغت و حدیث و سیر نبوی و فنون ادب از خدمتِ قدسی منزلت جدی و استاذی حضرت علامی میر سید عبدالجلیل بلگرامی اخذ نمود"

۱۱۵۱ھ میں عرب جاکر اس تخم بارآور کی مزید سیرابی کی، اور مولانا حیات سندھی سے صحیح بخاری پڑھی، اور صحاح ستہ کی اجازت حاصل کی[۵۱]، صحیح بخاری کی ایک ناتمام شرح ضوء الدراری کے نام سے لکھی[۵۲]،

ضوء الدراری مصنف کے قلم کا اصلی نسخہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے دیکھا تھا، اس کے مقدمہ کی چند سطریں نواب صاحب نے اپنی تالیف الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ میں نقل کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے ۱۱۵۱ھ میں جب مدینہ منورہ کا سفر کیا، اور صحیح بخاری کا درس لیا، اور ساتھ ہی علامہ قسطلانی کی شرح ارشاد الساری نظر سے گذری تو روزانہ سبق کے برابر وہ قسطلانی کی تلخیص کرتے چلے گئے، لیکن اس طرح وہ کتاب الزکوٰۃ سے آگے نہ بڑھ سکے[۵۳]،

---

۵۱ مآثر الکرام جلد اوّل ص ۱۶۲،

۵۲ ابجد العلوم نواب صدیق حسن خان ص ۹۲۱،

۵۳ الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ نواب صدیق حسن خان، ص ۹۷-

استدراک واضافہ

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی

مضمون کے پہلے حصہ میں ایک نہایت اہم شخصیت نظر انداز ہوگئی، اور وہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی ہیں، جن سے ہندوستان میں سلسلۂ سہروردیہ کا آغاز ہوتا ہے۔

عام تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ شیخ بہاء الدین کے دادا کمال الدین علی شاہ قریشی مکہ معظمہ سے خوارزم گئے تھے، اور وہاں سے ملتان آکر آباد ہوئے، شیخ عین الدین بیجاپوری نے اپنے تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ شیخ بہاء الدین ھبار (صحیح ہبار) بن اسود بن مطلب بن اسد قرشی کی اولاد سے تھے، قلعہ کوٹ کرور (متصل ملتان) میں ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے، بارہ برس کے ہوئے، تو علم کی تحصیل کے لئے خراسان و بخارا کا سفر کیا، پندرہ برس کے سن میں علوم ظاہری کی تکمیل کی، اور درس و افادہ کی مجلس گرم کی، پھر جاذبۂ شوق نے حرمین کی طرف کھینچا، اور عراق ہوکر مکہ معظمہ گئے، حج ادا کیا، پھر مدینہ منورہ جاکر شیخ کمال الدین محمد محدث یمنی سے حدیث کا درس لیا، اور مدت مدید تک (فرشتہ نے ۵۲ برس تک لکھا ہے) مدینہ منورہ میں حدیث کا درس و شغل رکھا، الفاظ یہ ہیں:-

"نزد شیخ کمال الدین کہ از محدثین کبار بودہ پنجاہ و سہ سال در مدینہ منورہ بگفتن درس حدیث اشتغال داشت، کتب حدیث خواندہ واجازت حاصل نمودہ"[1]

یہاں سے بیت المقدس ہوکر وہ بغداد پہونچے، اس وقت بغداد میں مدرسہ نظامیہ زندہ تھا، اور شیخ شہاب الدین سہروردی جو اسی مدرسہ کے فاضل تھے، اور ان کے عم محترم شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی دو برس تک ۵۴۵ھ سے ۵۴۷ھ تک اس کے مدرس اعلیٰ رہ چکے تھے، اور شیخ شہاب الدین نے اپنے چچا سے کسبِ کمال کیا تھا، شیخ بہاء الدین زکریا جب بغداد پہونچے ہیں

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۴۰۴، نولکشور،

تو شیخ ابوالنجیب سہروردی کا ۵۶۳ھ میں انتقال ہو چکا تھا، اور اُن کی جگہ پر شیخ شہاب الدین سہروردی مسند آرا تھے، شیخ بہاء الدین نے شیخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت کی اور اُن کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوکر اور ظاہر و باطن سے آراستہ ہوکر ہندوستان واپس آئے، اور ملتان میں سکونت اختیار کی، یہ وہ وقت تھا جب سلطان قطب الدین ایبک کی حکومت تھی، سلطان قطب الدین نے ملتان اور اوچہ ناصر الدین قباچہ کو، اور دہلی کا تخت شمس الدین التمش کو سپرد کیا تھا، قطب الدین کی وفات کے بعد ناصر الدین قباچہ نے شریعت کی ترویج اور احکامِ دین کے اجرا میں نہایت سستی اور بے پروائی برتی تو شیخ الاسلام نے بے محابا سلطان التمش کو اُس کی اطلاع دی، اور جب ناصر الدین قباچہ نے باز پرس کی، تو فرمایا، میں نے جو کچھ کیا، خدا کے حکم سے کیا، تم سے جو کچھ ہو سکے، وہ کر گذرو، یہ کلمۂ حق سُن کر ناصر الدین کانپ اٹھا،[۱]

شیخ نے ۶۶۶ھ میں وفات پائی۔

پچھلے صفحات میں حسبِ ذیل تین بزرگوں کے تذکرے صرف دو سطروں میں تھے، یہاں تفصیل سے لکھے جاتے ہیں،

مولانا برہان الدین محمود امام صغانی کے شاگرد مولانا برہان الدین محمود دہلوی تھے، وہ امام مرغینانی صاحبِ ہدایہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے، سلطان غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آئے، اور مشارق الانوار کا درس دینا شروع کیا ۶۸۶ھ میں وفات پائی، اور دہلی حوضِ شمسی کے پورب میں دفن ہوئے، اُن کے خاص شاگرد مولانا کمال الدین زاہد دہلوی تھے،

مولانا کمال الدین زاہد دہلوی انھوں نے مشارق الانوار کی سند مولانا برہان الدین محمود سے حاصل کی، اور علمِ حدیث میں یگانۂ روزگار تھے، اور دہلی میں اس کا درس دیتے تھے، بڑے متقی اور پرہیزگار

۱؎ اخبار الاخیار ص ۴۵،

تھے، سلطان غیاث الدین بلبن نے چاہا کہ ان کو اپنا امام مقرر کرے، مگر انھوں نے قبول نہیں کیا، حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء نے حدیث ان ہی سے پڑھی تھی[۵۷]

حضرت نظام الدین سلطان الاولیار

حضرت نظام الدین سلطان الاولیار، اس عہد کے مشہور فاضل وادیب ومحدّث تھے، ادب میں مقاماتِ حریری زبانی یاد کی تھی، اور اس کے کفارہ کے طور پر دہلی آکر مولانا کمال الدین زاہد دہلوی سے مشارق الانوار کا درس حاصل کیا، اور اس کو زبانی یاد کیا، حضرت نظام الدین سلطان الاولیار کے حالات میں سب سے قدیم تذکرہ سیر الاولیار ہی، جو حضرت میر خورد دہلوی کی تصنیف ہے، اور مصنف صرف ایک دو واسطہ سے حضرت کے حالات بیان کرتا ہے، اور اُن کی بہت سی تحریری یادداشتیں اس کی نظر سے گذری ہیں، میر خورد دہلوی نے اس اصل سند کی پوری عبارت سیر الاولیار میں نقل کی ہے، جو مولانا کمال الدین نے حضرت نظام الدین کو لکھ کر دی تھی

حضرت سلطان الاولیار نہایت متبع سنت تھے، اُن کے یہاں سماع کی مجلس میں جیسا کہ سیر الاولیار اور فوائد الفواد میں ہے کہ مزامیر اور تالیاں نہیں بجائی جاتی تھیں، صرف غزلیں گائی جاتی تھیں، فقہائے احناف کے نزدیک محض گانا بھی مکروہ تھا، اور فقہائے شوافع اس کو جائز کہتے تھے، حضرت سلطان الاولیار بھی اس مسئلہ میں شافعی مسلک کو درست سمجھتے تھے، اس بنا پر اُن کے عہد کے جاہ طلب علمار نے اُن کے خلاف شورش برپا کی، اور آخر دربارِ شاہی کے اہتمام سے مجلسِ مناظرہ کی نوبت آئی حضرت سلطان الاولیار نے نفس غنا کے جواز کی جب حدیثیں پیش کیں تو علمائے احناف نے کہا کہ تم مقلد ہو تم کو حدیث سے کیا مطلب؟ اگر فقہ حنفی کی کوئی روایت ہو تو پیش کرو، حضرت سلطان الاولیار افسوس کے ساتھ فرماتے تھے، کہ وہ ملک کیونکر آباد رہیگا،

---

[۵۷] اخبار الاخیار ص۷۶،

جس میں لوگوں کی رایوں کو احادیثِ نبوی پر ترجیح دیجاتی ہو،

میر خورد دہلوی نے سیر الاولیا میں اس مناظرہ کی پوری تفصیل نقل کی ہے، مگر کہیں اس فقرہ کا حوالہ نہیں ہے جس کو فرشتہ نے حضرت کی زبانِ مبارک سے حدیث کہہ کر لکھا ہے، اور اس سے میرا وہ شک یقین سے بدل جاتا ہے، جو فرشتہ کی اس روایت پر میں نے اوپر کسی صفحہ کے حاشیہ میں کیا تھا،

حضرت سلطان الاولیا کے ملفوظات مثلاً فوائد الفوائد مصنفہ حسن دہلوی اور افضل الفوائد مصنفہ امیر خسرو دہلوی میں بکثرت حدیثیں آپ کی زبان سے مذکور ہیں، اور ان کے رموز و نکات آپ نے بیان فرمائے ہیں، آپکے خلفار میں بھی اس فن کے کاملین گذرے ہیں،

نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رح	فقہ و اصول مولانا عبد الکریم شروانی اور افتخار الدین گیلانی سے پڑھا، علمِ حدیث کی نسبت نہیں معلوم کہ کس سے پڑھا، مگر اُن کے ملفوظات میں حدیثیں

بکثرت ملتی ہیں، حضرت سلطان الاولیار کے خلیفہ تھے، وہ غنا بھی نہیں سنتے تھے، ایک دفعہ ان کے چند رفقار غنا سُن رہے تھے، حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ مجلس سے اُٹھ گئے، لوگوں نے بیٹھنے پر اصرار کیا، فرمایا "یہ خلافِ سُنت ہے" لوگوں نے کہا کہ اپنے پیر کے مسلک سے تم ہٹ گئے، فرمایا پیر کا عمل حجت نہیں ہوسکتا، کتاب و سُنت سے کوئی دلیل لاؤ، بعض اصحاب غرض نے یہ فقرہ حضرت سلطان الاولیا تک پہونچایا، فرمایا، :-

"راست می گوید"

مولانا شمس الدین یحیٰ اودھی	حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی طرح یہ بھی اودھ کے تھے، اور حضرت سلطان الاولیار کے مرید تھے، فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ کے شاگرد تھے

لہ اخبار الاخیار ص۸۰

حدیث میں مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی، اور دہلی میں درس دیتے تھے، سلطان محمد تغلق نے اُن کو کشمیر میں اشاعتِ اسلام کے لئے نامزد کیا تھا، مگر سلطان کی وفات سے تجویز ناقص رہ گئی، [۱] ۷۴۸ھ میں وفات پائی،

مولانا فخرالدین زرادی

یہ بھی دہلی کے علمائے مشاہیر اور حضرت سلطان الاولیاء کے جان نثار مریدوں میں ہیں، دہلی کے بڑے محدثین میں تھے، جب ہدایہ پڑھاتے تھے، تو اس کی حدیثوں کے مقابلہ میں صحیحین کی حدیثیں پیش کرتے تھے، اور اُن کو ترجیح دیتے تھے، مرید ہونے کے بعد درس و تدریس چھوڑ دیا تھا، سلطان محمد تغلق نے جب دکن فتح کیا تو وہاں گئے، اور وہاں سے حج کے لئے عرب گئے، عرب سے بغداد گئے، اور وہاں سے علمِ حدیث کی تکمیل کی واپسی میں جہاز تباہ ہو گیا، اور وہ درِ خوش آب پانی کی تہ میں چلا گیا، [۲]

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاری

شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری بہاری کی تعلیم کا زمانہ دہلی میں گذرا، دہلی وہ اس وقت پہونچے، جب حضرت سلطان الاولیاء رحلت فرما چکے تھے، یہ نہیں معلوم کہ انھوں نے حدیث کی کون سی کتاب پڑھی، اور کس سے پڑھی، مگر اتنا یقینی ہے کہ وہ احادیثِ نبوی کے کسی مجموعہ سے مشرف تھے، اور زیادہ قرینہ یہی ہے کہ مجموعہ مشارق الانوار ہو، اُن کے مکتوبات و تالیفات میں احادیثِ نبوی کے بکثرت حوالے اور روایتیں ہیں کبھی اصل عبارت لکھتے ہیں، اور زیادہ تر فارسی ترجمہ فوائد المریدین جو شیخ کا ایک مختصر رسالہ ہے، وہ تمام تر احادیثِ نبوی کے حوالوں سے لبریز ہے، اس کے شروع میں ایک جگہ امام ابو یعلیٰ کا حوالہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسند ابو یعلیٰ کی حدیثیں ابھی نظر سے گذری تھیں، مکتوبات میں ایک جگہ ایک حدیث کی نسبت لکھتے ہیں، کہ حدیث برادرم فخر الدین نوشتہ بود [۳]، اس فخر الدین سے میرے گمان میں مولانا فخر الدین زرادی

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۹۰ [۲] ایضاً ص ۸۳ [۳] مکتوب ہفتدہم بنام امام مظفر.

مراد ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شیخ کو حدیث کا فیض اسی نظامی جماعت سے پہنچا ہے،

مجھ سے میرے ایک معتبر بزرگ نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت حسین نوشہ توحید بہاری جو حضرت شیخ شرف الدین کے معتقد اور شیخ کے مرید وجانشین امام مظفر بلخی بہاری کے مرید تھے، اور سفر حجاز میں ان کے رفیق تھے، معدن المعانی میں لکھا ہے کہ امام نووی المتوفی ۶۷۶ھ کی شرح صحیح مسلم شیخ کے مطالعہ میں تھی،

مکتوبات دوصدی کے جامع نے جس نے ۷۶۹ھ میں اس کو جمع کیا، دیباچہ میں آپ کی نسبت لکھا ہے :-

"محی سنن نبوی مظہر آثار مصطفوی قامع دین اہل البدع، بانی دین اہل الورع"[1]

شیخ نے ۷۸۲ھ میں وفات پائی،

شیخ بھکھاری کاکوروی کاکوری لکھنؤ کے ضلع میں ایک مشہور قصبہ ہے، یہ بزرگ یہیں کے رہنے والے تھے، ۸۹۰ھ میں ولادت ہوئی، مولانا ضیاء الدین مدنی محدث، اور قاضی عبداللطیف ہراتی کے شاگرد تھے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے پوتے شیخ عبدالرزاق کے مرید تھے، ۹۱ سال کی عمر میں ۹۸۱ھ میں وفات پائی، کاکوری کے تمام مخدوم زادے انہی کی اولاد میں ہیں، حضرت شیخ اپنے وقت کے بڑے محدث تھے، ان کی حدیث کی سندیں اب تک موجود ہیں، اصول حدیث میں منبع نام ایک کتاب بھی اُن کی تصنیف ہے،[2]

کشمیر میں سلسلۂ حق مضمون کے شروع کے صفحات میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سلسلۂ تلمذ کا ذکر تھا، کشمیر میں ملا حیدر شیخ کے شاگرد تھے، جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، ملا حیدر نے اس سلسلہ کو اور پھیلایا، جن میں سے بابا داؤد مشکاتی کا حال تم پڑھ چکے، ملا کے صاحبزادوں کا ذکر نہیں آیا ہے،

---

[1] مکتوبات دوصدی ص ۳۲۲، [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۳۳،

ان میں سے ایک خواجہ محمد فاضل تھے، جو بابا داؤد مشکاتی کم ہم سبق تھے[۵۷] ملا عنایت اللہ سال محدث کشمیری ملا حیدر کے صاحبزادوں کے شاگرد ہوئے، اور اس درجہ اس فن میں انہماک اور ذوق و شوق پیدا کیا، کہ تمام عمر اسی کی خدمت میں صرف کر دی، بخاری شریف کا شروع سے آخر تک ۳۶ دفعہ درس دیا تھا، ۸۰ برس کے سن میں ۱۱۲۵ھ میں وفات پائی[۵۸]

صوبۂ بہار میں علم حدیث اور سلسلۂ حق

اوپر دور اکبری کے محدثین میں ایک نام سید لیٰسین گجراتی کا گذرا ہے، جو عرب جا کر اس سر چشمہ سے بہرہ مند ہوئے تھے، واپس آئے تو پہلے پانچ دریاؤں والی زمین (پنجاب) کو سیراب کیا، پھر تذکروں میں لکھا ہے کہ وہ اس کے بعد بنگالہ کے ملک کو چلے گئے۔ اس کے بعد اُن کا پتہ نہیں چلتا، لیکن خوش قسمتی سے پھلواری شریف سے سندِ حدیث کا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا ہے،[۵۹] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سید موصوف یہاں سے بہار گئے، اور وہاں بھی اس فیض کو جاری کیا، غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ بہار کی خانقاہ سے قال اللہ وقال الرسول کا ترانہ سمع نواز ہوا، اس سلسلۂ سند سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ المحدثین مولانا سید لیٰسین کے درس سے وہاں "حافظ الوقت" مولانا شیخ عبدالرزاق نامی ایک بزرگ نے فائدہ اٹھایا، اور ان سے شیخ الوقت مولانا عبدالنبی نے اور ان سے اُن کے صاحبزادے مولانا عبدالمقتدر محدث نے اور اُن سے اُن کے بھتیجے اور شاگرد محمد عتیق بن عبدالسمیع بہاری نے اور ان ہی کی دی ہوئی یہ سند ہے، جو پھلواری میں محفوظ ہے،

مولانا عتیق بہاری نے اس گجراتی فیض کے ساتھ دہلوی سلسبیل کو ملا کر دو آتشہ بنا لیا تھا، مولانا دور عالمگیری کے علماء میں ہیں، اس عہد میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادہ

---

۵۷ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۲؛ ۵۸ اسرار الابرار قلمی، ۵۹ (دیکھئے ص ۵۳۴)

مولانا نورالحق محدث دہلوی اوران کے شاگرد مولانا جمال الدین تھے. مولانا محمد عتیق بہاری نے سلسلۂ حق کی ان دونوں کڑیوں کو بھی ملالیا تھا،

مولانا محمد عتیق محدث بہاری کے تلامذہ میں شیخ محمد وجیہ بن شیخ امان اللہ جعفری پھلواروی ہیں، انھی کو یہ سند دی گئی تھی، اس سند میں ان کتابوں کا بھی ذکر ہے جن کی اجازت شیخ نے اپنے شاگرد کو دی تھی، ان میں حسب ذیل کتابوں کے نام ہیں، مشکوٰۃ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، مصابیح، مشارق الانوار صغانی، شمائل ترمذی، حصن حصین جزری، کتاب الاذکار نووی، مسند امام اعظم ابوحنیفہ، مسند احمد بن حنبل، موطا امام مالک. مسند امام شافعی، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، لطائف ابن حبان، جامع المسانید ابن جوزی، ان میں سے تین پہلی کتابیں یعنی مشکوٰۃ، بخاری شریف اور مسلم شریف کے سبقاً پڑھے جانے کا، اور بقیہ کتب کی اجازت کا ذکر ہے،

شیخ محمد وجیہ کے شاگرد، اُن کے صاحبزادہ ملا وحیدالحق محدث پھلواروی ہیں، انھوں نے درس و تدریس اور تحریر و تالیف سے اس فن کی اشاعت کی لیکن وہ تمامتر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیفات کے خوشہ چیں تھے، اس کے بعد ایک سو برس تک پھلواری میں معقولات کا زور شور رہا، آخر مولانا آل احمد صاحب نے عرب جاکر اس فیض کو یہاں پھر جاری کیا،

یہ سب کچھ ہو چکا تھا لیکن ہندوستان میں علمِ حدیث کی اصلی شوکت و رونق دو فاروقی خانوادوں کے ذریعہ سے حاصل ہوئی، جن میں ایک حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی ہیں

حاشیہ ص ۳۴) اس سلسلہ سند کی دستیابی کے لئے ہم اپنے محترم مخدوم حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی قادری چشتی کے ممنون ہیں، یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کو علما اور مشائخ کی تاریخ سے پوری واقفیت اور دلچسپی ہے،

مجددی خانوادہ کا پہلا علمی اتصال شیخ عبدالحق دہلوی کے سلسلہ سے ہوا مگر بہت جلد شیخ دہلوی کی جگہ شاہ ولی اللہ کے گھرانے نے لے لی، اور دونوں سرچشموں سے مل کر ہندوستان میں جو فیض پھیلا، اُس نے ملک کے چپہ چپہ کو سیراب کر دیا،

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے معقولات مولانا کمال الدین کشمیری سیالکوٹی اور علم حدیث مولانا عبدالرحمٰن سرہندی اور مولانا یعقوب کشمیری سے حاصل کیا۔ یاد ہوگا، کہ مولانا یعقوب صرفی کشمیری، شیخ ابن حجر مکی کے شاگرد تھے، اور وہ یہ فیض عرب سے ہندوستان لائے تھے، اس کے بعد وہ حرمین تشریف لے گئے، اور وہاں کے بڑے بڑے محدثین کرام کی صحبت اٹھائی۔ شیخ عبدالرحمٰن بن فہد سے جو اُن کے زمانہ کے ایک بڑے محدث تھے، حدیث مسلسل سنی اور صحاح ستہ کا اجازہ حاصل کیا،[1] ولادت ۹۷۱ھ میں اور وفات ۱۰۳۴ھ میں ہوئی،

فن حدیث میں ایک اربعین یعنی چالیس منتخب حدیثوں کا مجموعہ آپ کی تالیف ہے، جو عام طور سے چھپا ہوا ملتا ہے، اس کے علاوہ جس نے آپ کے مکتوبات کا مطالعہ کیا ہے وہ شہادت دیگا کہ آپ کا پایہ علم حدیث میں کتنا بلند تھا، لیکن حضرت مجدد الف ثانی کا اصلی کارنامہ یہ نہیں ہے کہ وہ درس حدیث کی مسند بچھا کر بیٹھے، بلکہ یہ ہے کہ انھوں نے علی الاعلان دربارِ شاہی کے بدعات و منکرات کے خلاف بغاوت کی، اور اس کی سزا (قید) خوشی خوشی برداشت کی، اہل سنت جو شاہی اثر سے شیعیت میں جذب ہو رہے تھے، اُن کو دلائل کے زور، اور دلی ہمت کی قوت سے باہر نکالا، عامیانہ تصوف جو سنت کے مسلک سے کوسوں دور ہو گیا تھا، اس کو جادۂ شریعت کے قریب لائے، اور شریعت و طریقت کی قلمی و لسانی جنگ جو پانچویں صدی کے شروع سے اب تک قائم تھی، اس کو مصالحت سے بدل دیا، اور صوفیہ اور فقہاء کی چھ سو برس کی باہمی دست و گریبانی کا

---

[1] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خان و تاریخ علمائے ہند،

خاتمہ ہوا، اور مدرسہ وخانقاہ کی باہمی آویزش انجام کو پہونچی، علماء کو صحیح تصوف سے اور صوفیہ کو مسلکِ سنت سے آشنا کیا، اور ہر ایک فرقہ نے دوسرے کو نویدِ بشارت دی کہ

للہ الحمد میانِ من واو صلح فتاد

حضرت مجدد نے اپنی تعلیم کی بنیاد اتباعِ سنت پر رکھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علم حدیث اور شمائل کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ مبذول ہوگئی، اور اُن کے بعد صوفی محدثوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہندوستان میں قائم ہوگیا،

حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی معاصر تھے، پہلے اس معاصرت نے منافرت کی صورت پیدا کی، مگر دونوں بزرگوں کی اخلاص پسندی نے ایک کو دوسرے سے آشنا کردیا، اور دونوں میں یہ اتحاد پیدا کردیا، کہ آئندہ اسلام کی علمی وروحانی خدمت کے لیے یہ دونوں خانوادے متحد ہوگئے،

سلسلۂ مجددیہ | حضرت مجدد الف ثانی کی متعدد اولادوں میں سے صرف دو آپ کی وفات کے بعد آپکے جانشین ہوئے، ایک عروۃ الوثقیٰ حضرت محمد معصوم اور دوسرے خازن الرحمۃ شیخ محمد سعید، حضرت محمد معصوم ۱۰۰۹ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۰۷۹ھ میں وفات پائی، تذکروں میں ہے کہ ۹ لاکھ آدمیوں نے آپکے دستِ مبارک پر بیعتِ توبہ کی، اور سات ہزار خلفاء مدارجِ علیا تک پہنچے، ان ہی میں ایک مولانا نور الحق محدث دہلوی خلف مولانا عبد الحق محدث دہلوی ہیں،

حضرت محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے گو اپنا درس ۱۶ برس کے سن میں خود اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں ختم کرلیا تھا، مگر جس وقت جب داراشکوہ اور عالمگیر تاج وتخت کے حصول کے لئے دست وگریباں تھے، حضرت مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے، وہاں کے علماء سے علوم حدیث کی سند لے رہے تھے، اور خود اُن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند تقسیم فرما رہے تھے

دوسرے صاحبزادہ شیخ محمد سعید سہرندی بھی متبحر فقیہ و محدث تھے، اپنے والد ماجد سے فیض حاصل کیا، اور ۱۰۷۰ھ میں وفات پائی، علم حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح پر ایک حاشیہ آپ کی یادگار ہے[1]

حضرت محمد معصوم کے صاحبزادے شیخ محمد افضل سرہندی ہیں، حرمین کی زیارت سے ممتاز تھے، کتابوں کے اتنے شائق تھے، کہ جو کچھ ملتا تھا، اس سے کتابیں خرید لیتے تھے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے اُن سے حدیث کی سند حاصل کی تھی، ۱۱۴۶ھ میں وفات پائی،[2]

اب گیارہویں صدی کا خاتمہ ہے، اتنے دنوں میں زمانہ نے ایک عظیم الشان پلٹا کھایا، ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی حکومت بد سے بدتر ہوتی گئی، اور عالمگیر کے جانشین اب ایک سے ایک کمزور تر ہو رہے تھے، اور ادھر حرمین میں درس حدیث کی مسند پر ابن حجر مکی اور اُن کے تلامذہ در تلامذہ کے بجائے کچھ اور نئے خانوادوں کے ارکان متمکن تھے، جن میں ہر ایک دوسرے سے بڑھکر پیدا ہو رہا تھا،

اس عہد میں حرمین میں دو ہندوستانی محدث مسند نشیں ملتے ہیں، عبداللہ لاہوری مکہ معظمہ میں اور ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ میں، افسوس ہے کہ پیش نظر ذخائر میں ان بزرگوں کے مزید حالات معلوم نہیں ہوتے، ان کے علاوہ دنیائے اسلام کے چند اور اعیان حدیث جلوہ افروز نظر آتے ہیں جن میں محمد بن سلیمان مغربی (مراکش) حسن عجمی (عجم) شیخ عبداللہ بن سالم البصری (عراق)، احمد نخلی، تاج الدین حنفی، شیخ احمد بن سالم بصری محمد بن علاء الدین بابلی، شیخ ابراہیم کردی، شیخ ابراہیم کردی، کردستان کے رہنے والے تھے، بغداد، شام، مصر، اور حرمین کے شیوخ سے فیض حاصل کیا تھا، اور اس عہد میں اگلے زمانہ کے بزرگوں کی سی ہمت کا نمونہ دکھایا تھا، کردی

[1] تاریخ علمائے ہند ص ۱۹۰ [2] ایضاً ص ۱۰۲

فارسی، ترکی، اور عربی چار زبانوں میں گفتگو کرتے تھے، سنہ ۱ھ میں وفات پائی، "انا علی فراقك یا ابراهیم لمحزونون" تاریخِ وفات ہے،

شیخ ابراہیم کردی کے صاحبزدے شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی ہیں، اپنے والد کے علاوہ محمد بن سلیمان مغربی، حسن عجمی، احمد نخلی، شیخ عبد اللہ بن سالم بصری، شیخ عبد اللہ لاہوری، شیخ تاج الدین حنفی سے اجازے اور سندیں حاصل کیں، یہی وہ بزرگ ہیں جن کے حلقۂ درس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جاکر شریک ہوئے تھے،

شیخ سالم بصری کے دو صاحبزادے عبد اللہ بن سالم اور احمد بن سالم نے نہایت شہرت اور حسنِ قبول پایا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں علمِ حدیث کا فروغ اور حدیث کی کتابوں کی تصحیح واشاعت کا اہم فرض انہی دو بھائیوں کی ہمتِ مردانہ سے ادا ہوا، شیخ عبد اللہ ابن سالم بصری نے بھی شیخ ابراہیم کردی سے اجازہ پایا تھا، اور اُن کے علاوہ دوسرے شیوخ سے بھی فائدہ اٹھایا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اُن کے حلقۂ درس میں بھی چند روز بیٹھے تھے، جیساکہ انھوں نے اپنے رسالہ انسان العین میں اس کی تصریح کی ہے،

شیخ احمد بن سالم بصری کعبہ کے اندر بیٹھکر بخاری شریف پڑھتے تھے، بخاری کی شرح ضیاء الساری انھوں نے لکھی ہے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے، کہ انھوں نے صحاح ستہ کے ۹ نسخے جمع کئے، اور نہایت محنت شاقہ اٹھاکر اُن کی ایسی تصحیح کی کہ اُن کے نسخے اُمہات اور اصول بن گئے، سب سے زیادہ صحیح بخاری کی تصحیح میں کوشش بلیغ کی، چنانچہ پورے بیس برس میں بخاری کی تصحیح انجام کو پہونچی، مسند ابن حنبل کی جلدیں جو منتشر تھیں، اُن کو مختلف مقامات سے یکجا کرکے اُن کی تصحیح کی، اُن کے یہ مصحح نسخے ہی وہ نسخے تھے، جن کی نقلیں اطراف و دیار میں پھیلیں، سنہ ۱۱۳۴ھ میں وفات پائی،

عبداللہ لاہوری | اوپر کے سلسلہ میں ایک بزرگ کا نام عبداللہ لاہوری محدث گذرا ہے، جو اس زمانہ میں حرمین میں حدیث کا درس دیتے تھے، چنانچہ شیخ ابو طاہر مدنی اُن سے مستفید تھے، اس کے علاوہ اُن کا کچھ اور حال نہیں معلوم ہوتا۔

ابو الحسن سندھی | اسی عہد کے ایک اور ہندوستانی محدث جو عرب کی سرزمین میں ایک پورے حلقۂ درس کے مرکز تھے شیخ ابو الحسن سندھی ہیں، مدینہ منورہ میں ایک مدرسہ دار الشفاء کے نام سے تھا، اور جواب تک کسی نہ کسی حال میں باقی ہے، میں نے اس کی زیارت کی ہے، دار الشفاء کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُس کے واقف نے یہ شرط کی ہے کہ اس میں قاضی عیاض کی کتاب الشفاء فی حقوق المصطفیٰ کا روزانہ درس دیا جائے، شیخ ابو الحسن سندھی گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں اس میں مدرس تھے، ۱۱۳۹ھ میں وفات پائی، حرم نبوی میں بیٹھ کر حدیث کی متعدد کتابوں پر شروح اور تعلیقات لکھیں، چنانچہ جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ کی شرح لکھی، موصوف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مسند ابن حنبل جو آٹھ جلدوں میں ہے، اور جس کی کسی نے اب تک شرح نہیں لکھی تھی، انھوں نے پچاس جزء میں اس کی شرح[1] لکھی، شیخ کے لائق تلامذہ میں سے دو کا تعلق ہندوستان سے ہے، حاجی عبدالولی طرخانی کشمیری اور شیخ محمد حیات سندھی۔

حاجی عبدالولی طرخانی کشمیری | وہ اصل میں طرخاں واقع ترکستان کے رہنے والے تھے، وطن سے نکل کر حرمین تشریف لے گئے، اور وہاں مدرسۂ دار الشفاء میں حدیث کی سند شیخ ابو الحسن سندھی سے حاصل کی، اور وہاں سے واپس آکر کشمیر میں شیخ الاسلام مولانا قوام الدین محمد کے یہاں قیام کیا، اور ان کو اپنی سند حدیث سے ممتاز کیا، ۱۱۶۱ھ میں چند شریروں کے ہاتھوں

---

[1] الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ میں ہر کتاب کے تحت میں ان شروح کا ذکر نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے کیا ہے

سے شہادت پائی،[1]

شیخ محمد حیات سندھی شیخ محمد حیات کا وطن سندھ میں عادل پور اور کوٹ سید موسیٰ قادری کے اطراف میں ہے، جاچڑ قبیلہ کا نام ہے، شباب کا آغاز تھا کہ جاذبۂ شوق نے دامنِ دل کھینچا، حرمین کی راہ لی، بالآخر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی، اور وہیں شادی بھی کر لی، زیادہ تر شیخ ابو الحسن سندھی مدنی سے اور کسی قدر عبداللہ بن سالم مصری مکی سے علم حدیث کی تحصیل و تکمیل کی، اور تمام عمر اس فنِ شریف کی خدمت میں صرف کر دی، مصر و روم و شام و ہند ہر جگہ اُن کے فضل و کمال کا غلغلہ بلند ہوا، اور ہر طرف سے طالب و مشتاق کا ہجوم ہوا، ۱۱۶۳ھ میں وفات پائی، ہندوستان کے اہلِ علم میں سے جن کو شیخ کے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، اُن میں حسب ذیل اصحاب قابلِ ذکر ہیں،

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی علامہ آزاد گو ہندوستان ہی میں اپنے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی کے واسطہ سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سلسلہ میں داخل ہو کر حدیث کی بعض کتابیں پڑھ چکے تھے، مگر ۱۱۵۱ھ میں وہ جب عرب گئے، تو مدینہ منورہ پہونچ کر شیخ محمد حیات سندھی کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے، اور صحیح بخاری سبقاً سبقاً پڑھی، اور حدیث کی دوسری کتابوں کی سند لی، صحیح بخاری اس اہتمام سے پڑھی کہ روزانہ جس قدر بخاری پڑھتے تھے، اسی قدر قسطلانی شرح بخاری کی تلخیص کرتے جاتے تھے، اس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، علامہ ممدوح شیخ کے بحد معترف تھے، مآثر الکرام فی تاریخ بلگرام میں ان کا حال لکھا ہے،[2]

شاہ محمد فاخر الٰہ آبادی الٰہ آباد کے اس خانوادۂ علم و تصوف کا آغاز شاہ محمد افضل الٰہ آبادی سے ہوتا ہے، یہ اصل میں سید پور کے جو غازیپور کے مشہور قصبوں میں ہے، رہنے والے تھے، جونپور میں علوم ظاہری

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۷ ؛ [2] مآثر الکرام جلد اوّل ص ۱۶۴،

کی، اور کالپی میں علوم باطن کی تعلیم پائی، نقشبندی طریقہ کے بزرگ اور سنت کے متبع تھے، ۱۰۳۶ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۱۲۴ھ میں وفات پائی، تصوف اور فارسی ادبیات کی متعدد کتابوں کے شارح ہیں، ان کے جانشین ان کے بھتیجے، اور داماد شاہ خوب اللہ ہوئے، جو اپنے عہد کے مشہور عالم و صوفی و مورخ تھے، فقہ و تصوف کے علاوہ وفیات الاعلام اُن کی سب سے اہم تصنیف ہے، جس میں علما، اور مشائخ کے تذکرے ہیں، ۱۱۴۳ھ سال وفات ہے، اُن کے صاحبزادے شاہ محمد فاخر الہ آبادی ہیں، شاعر بھی تھے، زائر تخلص تھا، اپنے بڑے بھائی شیخ محمد طاہر سے تعلیم پائی، اکیس ۲۱ برس کے سن میں اپنے پدر بزرگوار کی جگہ پر بیٹھے، اٹھائیس برس کے سن میں حج کے لئے گئے، اور مدینہ منورہ پہونچ کر شیخ محمد حیات سندھی سے حدیث کی تحصیل کی، دو حج کئے تھے، تیسرے حج کا ارادہ تھا، کہ راہ میں برہان پور میں وفات پائی ۱۱۶۴ھ تاریخ وفات ہے، قرۃ العینین فی رفع الیدین، نور السنہ اور درۃ التحقیق ان کے مشہور رسالے ہیں، شاہ صاحب ممدوح غالبًا اپنے ساتھ عرب سے صحیح مسلم کا ایک نسخہ لائے تھے، جو اُن کے مدرسہ میں موجود تھا، اس نسخہ کی نقل کتب خانہ حبیب گنج میں ہے، شاہ محمد فاخر اور آزاد بلگرامی نے شیخ محمد حیات سندھی سے مدینہ منورہ میں ایک ساتھ استفادہ کیا تھا، اس لئے مآثر الکرام میں اُن کا حال لکھا ہے[1]،

مدراس میں علم حدیث مدراس اور کرناٹک کا علاقہ اسلامی علم کے زیر سایہ بہت اخیر زمانہ میں یعنی عالمگیر کے عہد میں آیا، تاہم اس کا ساحلی حصہ مدت دراز سے عرب تاجروں کا جولانگاہ تھا، ملیبار میں اُن کی بڑی آبادی تھی، مصر اور عرب سے اُن کے براہ راست بحری تعلقات تھے، اس بنا پر یہ بآسانی قیاس میں آسکتا ہے، کہ یہاں علم حدیث مصر اور عرب کے

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے دیکھو مآثر الکرام ج دوم ص ۲۱۰ و ما بعد،

راستہ سے براہ راست داخل ہوا ہوگا، لیکن چونکہ اس دیار کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے، یا میرے پیشِ نظر نہیں ہے، اسلئے کوئی تصریحی بات نہیں کہی جاسکتی، بہرحال عالمگیر کے بعد بارھویں صدی کے بیچ میں جب نظام دکن کی ملکی وسعت کے اندر کرناٹک کا علاقہ آیا، اور ارکاٹ میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی، تو اہلِ علم نے بھی ادھر کا رُخ کیا، اس عہد کے لوگوں میں شیخ محمد اسعد حنفی مکی قابلِ ذکر ہیں، شیخ مذکور شیخ تاج الدین مکی کے شاگرد تھے، شیخ عبداللہ ابن سالم مصری مکی نے ضیاء الساری کے نام سے صحیح بخاری کی جو شرح لکھی تھی، اس کا اصلی نسخہ شیخ اسعد نے اُن کے لڑکے سے خرید لیا تھا، اور اس کو لے کر وہ مدراس آئے تھے، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے ارکاٹ میں وہ نسخہ اُن کے پاس دیکھا تھا، اس گرانقدر نسخہ کو ہندوستان آنے پر علامۂ موصوف نے شیخ کو ملامت کی، اور کہا کہ اس گرانقدر خزانہ کو اسلامی مرکز سے اتنی دور سفر میں لے آنا مناسب نہ تھا، انھوں نے کہا کہ میری محبت نے گوارا نہ کیا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے بھی اس کو اپنے سے جدا رکھوں، یہ وہ زمانہ تھا جب نظام الدولہ ناصر جنگ (والی حیدرآباد دکن) اور فوج کے افغانوں کے درمیان کشمکش جاری تھی، اور ارکاٹ میں فتنوں کا طوفان برپا تھا، اس بنا پر شیخ نے شرح بخاری کا یہ نسخہ اورنگ آباد دکن میں بھجوا دیا، اور وہ خود ناصر جنگ کی شہادت کے بعد مظفر جنگ کے ساتھ ۱۱۶۴ھ میں شہید ہوئے، میر آزاد لکھتے ہیں کہ وہ نسخہ اس وقت تک اورنگ آباد میں محفوظ ہے[۵]، اب خدا جانے وہ کہاں ہو،

شیخ محمد اسعد کے متعلق میر آزاد لکھتے ہیں،

"در منقولات خصوص حدیث و فقہ بے نظیر بود[۲]،"

آخر زمانہ میں شاہ محی الدین ویلوری المتوفی ۱۲۴۲ھ کے دم سے یہاں علمِ حدیث کی رونق ہوئی

---

[۱] الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ نواب صدیق حسن خان مرحوم ص ۹۵ [۲] مآثر الکرام آزاد جلد دوم ص ۱۹۰،

شیخ نورالدین احمد آبادی گجراتی | اسی عہد کے ایک اور قابلِ ذکر بزرگ شیخ نورالدین احمد آبادی گجراتی ہیں، ۱۰۶۳ھ میں پیدا ہوئے، فارسی اپنی ماں سے پڑھی، عقلیات اخوند احمد سے حاصل کیں، اور علومِ نقلی اور حدیث سید محمد ابو المجد محبوب عالم سے پڑھیں، مولانا کے علم و فضل کا شہرہ اطراف ملک میں پھیلا تو طلبہ جوق در جوق آنے لگے، یہ دیکھ کر شیخ الاسلام خان صدر صوبہ گجرات نے بھی ایک لاکھ سے زیادہ کے صرف سے ہدایت بخش نام ایک مدرسہ قائم کیا، ۱۱۰۲ھ میں مدرسہ کی بنیاد پڑی، ۱۱۰۹ھ میں وہ پورا ہوا، ۱۱۴۳ھ میں مولانا نے حج ادا کیا، واپس آکر ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی، تفسیر علم کلام، منطق وغیرہ کی تصنیفات کے علاوہ نور القاری کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھی،[1]

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی | ہندوستان کی یہ کیفیت تھی جب اسلام کا وہ اخترِ تابان نمودار ہوا جس کو دنیا شاہ ولی اللہ دہلوی کے نام سے جانتی ہے، مغلیہ سلطنت کا آفتاب لبِ بام تھا، مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا، جھوٹے فقراء اور مشائخ جابجا اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پُرشور تھا، فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیشِ نظر تھی، مسائلِ فقہ میں تحقیق و تدقیق سب سے بڑا مذہبی جرم تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکام و ارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے،

شاہ صاحب کا وجود اس عہد میں اہلِ ہند کے لئے ایک موہبتِ عظمیٰ اور عطیۂ کبریٰ تھا، شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم صاحب ایک عالم کامل تھے، معقولات میں میرزاہد کے بے واسطہ شاگرد تھے، شاہ صاحب نے علومِ رسمیہ کا درس اپنے والد سے لیا، اور پندرہ[15] برس کے سن میں تعلیم سے فراغت پائی، یہی وقت صبحِ سعادت کے ظہور کا تھا،

---

[1] تاریخ علمائے ہند ص ۲۴۸،

مجدّدی نسبت اب تک ایک "مردِ کامل" کی تلاش میں بے قرار تھی، شیخ افضل سرہندی مجدّدی دولت کے اس عہد میں وارث تھے، شاہ صاحب نے اُن سے حدیث پڑھی، ہندوستان میں جیسا کہ شاہ صاحب نے جزء لطیف میں لکھا ہے، مشکوٰۃ کا ایک حصہ اور صحیح بخاری اور شمائل ترمذی پڑھی، ابھی تک بطحا اور یثرب کے چشموں سے سیرابی باقی تھی، تیس برس کی عمر میں سنہ ۱۱۴۳ھ میں سرزمینِ عرب کی راہ لی، اور دو برس وہاں رہ کر شیخ ابو طاہر مدنی سے کتب حدیث کا درس لیا، اس وقت شیخ کی مجلس میں صحیح بخاری کا درس ہو رہا تھا، اس میں شریک ہوئے، صحاح ستہ اور موطا امام مالک، مسند دارمی اور کتاب الآثار امام محمد کے اطراف ان کو سنائے، اور بقیہ کتابوں کی سند اُن سے حاصل کی[1]، دو برس کے بعد سنہ ۱۱۴۵ میں ہندوستان واپس آئے، اور پورے تیس برس تک فیوض و برکات کا بادل اس علامۂ روزگار کے زبان اور قلم سے ہندوستان کی زمین پر برستا رہا، سنہ ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی،

حضرت شاہ صاحب کے کارناموں کی تفصیل کے لئے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے، لیکن ہم نہایت اختصار کے ساتھ اہلِ ہند پر اُن کے علمی و دینی احسانات کا ذکر کرتے ہیں،

۱- مغلیہ دربار پر ہمایوں سے لے کر اب تک تشیع کا رنگ غالب تھا، دربار میں ایرانی امراء کی کثرت ہمیشہ رہی، اور اس کا اثر نیچے تک درجہ بدرجہ نمایاں تھا، اور شاہ صاحب کے عہد میں تو لکھنؤ کی نوابی کے سبب سے مسلمانوں پر اور زیادہ اثر پڑ رہا تھا، علمائے اہلِ سنّت میں، اس اثر کے روکنے کی ہمّت اور جرأت نہ تھی، حضرت مجدّد الف ثانی جو اکبر اور جہانگیر کے عہد میں تھے، اُن کے مکتوبات اس غم و ماتم سے لبریز ہیں، حضرت شاہ صاحب پہلے

---

[1] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خان بحوالہ انسان العین مؤلفہ شاہ ولی اللہ دہلوی،

شخص ہیں جنھوں نے نہایت تحقیق، کدوکاوش، اور نہایت سنجیدگی اور متانت سے اس کام کو انجام دیا اور ازالۃ الخفاء عن تاریخ الخلفاء جیسی عالمانہ اور محدثانہ کتاب تالیف کی جس میں سیکڑوں، ہزاروں حدیثوں کے ذریعہ سے خلفاے راشدین کے مناقب فضائل کے وہ رموز و نکات کھولے جو اب تک نہیں کھلے تھے،

۲- عقائد و کلام کی بے سرو پا لغو تلقینات کا جن پر اب تک علم دین کا گویا مدار سمجھا جاتا تھا، بھرم کھول کر رکھدیا، اور اُن کے مقابلہ میں کتاب و سُنّت کے اسرار و مصالح منظر عام پر لائے، اور ہندوستان کے علمار کو اُن کی سات سو برس کی غلط کاریوں پر متنبہ کیا،

۳- قرآن پاک جو اصل میں اسلام کا مرکز و محور ہے، اور جو ہندوستان میں اب تک صرف تبرکِ تلاوت کے لئے مخصوص تھا، اس کے فہم و تعلیم کی طرف لوگوں کو دعوت دی، تفسیر کے اصول لکھے، قرآن کا فارسی میں مختصر لغت لکھا، قرآن پاک کے درس کا حلقہ قائم کیا اور اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی کتاب بنایا،

۴- عربی زبان کی واقفیت، قرآن وحدیث کے سمجھنے میں عام لوگوں کے لئے [illegible] تھی، اس کو دور کرنے کے لئے اپنے عہد کی علمی زبان فارسی میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا، اور موطا کی فارسی میں شرح لکھی،

۵- اب تک ہندوستان میں جو فقہ حنفی مروج تھی، وہ تمامتر فتاوی کی نقل در نقل کورانہ تقلید تھی، اور ہر وہ کتاب جس کو کسی حنفی عالم نے پہلے لکھدیا ہو، وہ استناد کے قابل سمجھی جاتی تھی، اور خاص امام ابوحنیفہ کا مسلک بن جاتی تھی، شاہ صاحب نے اس تقلیدی فقہ کی جگہ تحقیقی فقہ کا رواج دیا، ہر مسئلہ میں وہ ہر امام و مجتہد کی مختلف رایوں اور اجتہادوں اور ان کی دلیلوں اور سندوں سے واقف تھے، وہ اُن میں باہم تطبیق یا ترجیح دیتے تھے،

مجتہدین کے اختلافات کے اسباب بتائے، اجتہاد و تقلید کی تشریح کی، اور کتاب و سنت کی اتباع و پیروی کی دعوتِ عام دی،

۶۔ شاہ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں کی تکمیل کی، تالیف و تحریر کے ذریعہ کتبِ حدیث کو عام کیا، حدیث کی اولین اور صحیح ترین کتاب موطا امام مالک کی فارسی اور عربی میں مجتہدانہ دو شرحیں لکھیں، صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی، "اور الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین" ایک رسالہ لکھا، فقہ و اسرار حدیث میں حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم لکھی،

۷۔ خود ہندوستان میں حدیث کے درس و تدریس کے باقاعدہ حلقے قائم کئے، اور ان کے بعد ان کے تلامذہ نے تمام ملک میں پھیل کر اس فیض کو عام کیا،

۸۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے حسنِ نیت کا ثمرہ، اُن کو یہ دیا، کہ ان کو ایسی لائق اولادیں عطا کیں، جنھوں نے اپنے والد بزرگوار کے ناتمام کاموں کی پوری تکمیل کی، اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو پیغام نبوی کے آوازہ سے معمور کر دیا، آج ہندوستان میں جہاں بھی قال قال رسول اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ اسی خانوادۂ فضل و کمال کی خیر و برکت کی صدائے بازگشت ہے،

شاہ صاحب کی اولاد امجاد | شاہ صاحب کی چار اولادیں تھیں، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالغنیؒ، اُن میں سے شاہ عبدالغنی نے بہت پہلے انتقال کیا، اور انہی کے صاحبزادے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ہیں، ان بزرگوں نے اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد اپنا الگ الگ حلقۂ درس قائم کیا، اُن میں سے ہر ایک کے حلقۂ درس سے بے شمار علماء کامل ہو کر اٹھے جنکی تفصیل اس مضمون میں مشکل ہے تاہم صرف مشاہیر و اکابر علما کی مختصر فہرست دینی ضروری ہے،

شاہ عبدالعزیز صاحب | شاہ عبدالعزیزؒ نامور باپ کے نامور فرزند تھے، ۱۱۵۹ھ میں پیدایش ہوئی، پندرہ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت پائی، اور تمام علوم اپنے پدر بزرگوار سے پڑھے، اور اُن کے شروع کئے ہوئے کاموں کو آگے بڑھایا، درس و تدریس کا ہنگامہ برپا کیا، علم حدیث و سنت کو فروغ دیا، اور اہلِ تشیع کے رد میں تحفۂ اثنا عشریہ لکھی، قرآن کی فارسی میں تفسیر لکھی، محدثین اور کتبِ حدیث کے حال میں بستان المحدثین تالیف کی، اصولِ حدیث میں عجالۂ نافعہ نام چھوٹا سا رسالہ لکھا، ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی، اپنے بعد مشہور تلامذہ کا بڑا مجمع یادگار چھوڑا،

شاہ رفیع الدین | شاہ رفیع الدین صاحب نے اپنے پدر بزرگوار سے علم کی تحصیل کی، علم حدیث کا درس دیا، متعدد رسالے لکھے، اور سب سے بڑا کام یہ کیا، کہ اب جب کہ فارسی کے بجائے اردو زبان ملک کی زبان ہو رہی تھی، قرآن پاک کا تحت اللفظ ترجمہ اس خوبی سے کیا کہ آج بھی اس سے بہتر اور صحیح تر ترجمہ مشکل ہے، اس کارنامہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اگر شاہ صاحب جیسے مقدس عالم اس کام کو اپنے وقت میں نہ کر گئے ہوتے، تو آج ہندوستان کے علمار ترکی و مصر کے علمار کی طرح وہم کی اس قید و بند میں گرفتار ہوتے کہ آیا قرآن پاک کا دوسری زبان میں ترجمہ جائز بھی ہے یا نہیں، مگر بحمد اللہ کہ شاہ صاحب کے اس عمل خیر نے اس ہنگامہ کو ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے فرو کر دیا، شاہ صاحب کے اس ترجمہ نے لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں کو دین و ایمان کی راہ بتائی، ۱۲۴۹ھ میں یہ شمع ربانی گل ہوئی،

شاہ عبدالقادر | شاہ عبدالقادر صاحب کو فقہ و تفسیر و حدیث میں یدِ طولیٰ حاصل تھا، قرآن کی اردو میں موضح القرآن کے نام سے تفسیر لکھی، اور قرآن پاک کا ترجمہ کیا، حدیث کا درس جاری کیا، ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی،

شاہ ولی اللہ صاحب کے تلامذہ

ان تینوں صاحبزادوں کے علاوہ شاہ صاحب کے فیض درس میں جو لوگ بیٹھے، اُن کے ناموں کو یکجا کرنا بہت مشکل ہے، تاہم چند نام تلاش سے ملتے ہیں، پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں صحیح بخاری کا ایک نہایت اہم نسخہ ہے، جو شاہ صاحب کی درس گاہ میں زیرِ درس رہا ہے، اور اس پر شاہ صاحب کے دست خاص سے ایک تحریر ہے اور ایک تحریر شاہ صاحب کے اس شاگرد کی ہے، جس نے ان سے یہ نسخہ پڑھا، اس شاگرد کا نام محمد ابن پیر محمد بن شیخ ابو الفتح بلگرامی الہ آبادی ہے، اس پر مولانا پیر محمد کے ہاتھ سے جو عربی عبارت ہے اس کا عربی ترجمہ یہ ہے :-

"دلی میں جمنا کے کنارے جامع فیروزی میں چہارشنبہ کے دن بتاریخ ۸ شوال سنہ ۱۱۵۹ھ جامع صحیح امام بخاری شیخ محمد بن شیخ پیر محمد بن شیخ ابو الفتح عمری بلگرامی ثم الالہ آبادی کے ہاتھ سے تمام ہوئی، ساتھ ہی شروع سے آخر تک اس کی قرأت بھی شیخ ولی اللہ عمری کے درس میں تمام ہوئی،

پھر اس پر شاہ صاحب کے دستِ مبارک سے عربی میں بخاری تک، ان کی اپنی سند اور اجازت درج ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے درس میں کیا کیا کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، فرماتے ہیں :-

"شیخ محمد بن شیخ پیر محمد بن شیخ ابو الفتح عمری نسباً بلگرامی اصلاً، الہ آبادی مولداً نے صحیح بخاری مجھ سے پڑھی، خواجہ محمد امین پڑھتے تھے، اور وہ سنتے تھے، نیز بقیہ کتب صحاح ستہ کے اطراف مجھ سے پڑھے، اور موطا امام مالک اور مسند دارمی اور مشکوٰۃ کے کچھ حصے پڑھے، اور میں نے اُن کو، ان کی اجازت دی، میں نے یہ اجازت و سند شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے حاصل کی، اس کو والد استاد احمد بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین بن معظم بن منصور

ابن احمد بن محمود نے اپنے ہاتھ سے لکھا، جو نسباً عمری، وطناً دہلوی، عقیدۃً اشعری طریقۃً صوفی، عملاً حنفی، اور تدریساً حنفی و شافعی، اور تفسیر و حدیث و فقہ و عربیت اور کلام کا خادم ہے، سہ شنبہ ۲۳ شوال ۱۱۵۹ھ"

اس تحریر کے نیچے شاہ رفیع الدین صاحب کی یہ عبارت ہے، :۔

"ایں خط والد بزرگوار است بے شبہ کتبہ الفقیر محمد رفیع"

اس نسخہ پر ایک اور عبارت ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ کے حکم سے ۱۱۸۴ھ میں محمد نامی کسی عالم نے اس میں شروع تو آخر تک اعراب لگائے، اور کسی مصحح نسخہ سے اس کا مقابلہ کیا،[۱]

خواجہ محمد امین جن کا شاہ صاحب کی اس تحریر میں ذکر ہے، شاہ صاحب کے مخصوص شاگردوں اور مریدوں میں ہیں، شاہ صاحب کے تلامذہ میں ایک بزرگ مولانا رفیع الدین مرادآبادی ہیں، مولانا رفیع الدین نے شاہ صاحب کے علاوہ شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد مولانا خیر الدین سورتی سے بھی حدیث پڑھی، امام نووی کی اربعین کی شرح لکھی اور اپنے سفر حج کے حالات میں فارسی میں ایک رسالہ لکھا ہے[۲]

کشمیر کے ایک اور بزرگ شاہ محمد عاشق پھلتی معروف بہ بابا محمد عثمان کشمیری ابن شیخ محمد فاروق شاہ صاحب کے تلامذہ میں ہیں، حدیث اور فقہ کا درس شاہ صاحب سے حاصل کیا تھا،

شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ

شاہ ولی اللہ صاحب کے فیض کو اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحب کے ذریعہ عام کیا، بہت سے مشاہیر علماء اور علم حدیث کے ماہر ان کے حلقۂ درس سے پیدا ہوئے، جن میں قابل ذکر خود شاہ صاحب کے داماد مولانا عبدالحی

---

[۱] مولانا رفیع الدین صاحب کے حال کے لئے دیکھو تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۲ ، [۲] ایضاً،

اور بھتیجے مولانا اسماعیل شہید اور نواسے شاہ محمد یعقوب اور شاہ محمد اسحاق صاحب، اور اُن کے علاوہ حسب ذیل اصحاب ہیں،

مرزا حسن علی محدث لکھنوی، مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی، مولانا سلامت اللہ بدایونی کانپوری، مولانا رؤف احمد مجددی مصطفےٰ آبادی، مفتی صدر الدین خان دہلوی، سید قطب الہدیٰ رائے بریلوی، مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا خرم علی صاحب بلہوری وغیرہ — پھر ان میں سے ہر ایک کے سینکڑوں شاگرد پیدا ہوئے،

شاہ رفیع الدین کے تلامذہ

ایک تو خود شاہ رفیع الدین صاحب کے صاحبزادہ شاہ مخصوص اللہ المتوفی ۱۲۷۳ھ ہیں، دوسرے مولانا رشید الدین خان دہلوی المتوفی ۱۲۴۹ھ اور تیسرے شاہ ابوسعید صاحب عمری، مجددی دہلوی المتوفی ۱۲۴۹ھ،

شاہ عبدالقادر صاحب کے تلامذہ

مفتی صدر الدین خان اور مولانا فضل حق خیرآبادی،

دلی کے دو چراغ

شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد علم حدیث کے دو چراغ روشن ہوئے، ایک شاہ صاحب کے نواسہ مولانا شاہ اسحاق صاحب اور دوسرے شاہ ابوسعید صاحب کے صاحبزادہ شاہ عبدالغنی صاحب مجددی،

اس موقع پر ایک فرق سمجھ لیجئے، یہ شاہ عبدالغنی صاحب مجددی، اور اُن کے والد شاہ ابوسعید صاحب مجددی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان سے ان کا کوئی نسلی اتصال نہیں ہے،

اس خاندان کے تلامذہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے، لکھنؤ میں علم حدیث کا جو فیض پہنچا وہ بھی اس خانوادۂ علم وکمال کا رہون منت ہے،

مرزا حسن علی محدث لکھنوی | سب سے زیادہ لکھنؤ میں جن بزرگ نے اس فیض کو عام کیا، اور خود فرنگی محل تک نے اُن سے رجوع کیا، وہ مرزا حسن علی محدث لکھنوی ہیں، اس نام کے اس وقت لکھنؤ میں دو بزرگ تھے، ایک محلہ یحییٰ گنج میں رہتے تھے، اور دوسرے محمود نگر میں رہتے تھے، پہلے صغیر اور دوسرے کبیر کہلاتے تھے، یہاں مقصود یحییٰ گنج کے مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی ہیں، مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد تھے، اور لکھنؤ آکر علم حدیث کی ترویج و تدریس میں کوشاں رہے، اور سینکڑوں آدمیوں نے اُن سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، علمائے فرنگی محل نے بھی اُن سے علم حدیث کا فیض حاصل کیا، اور اسی وقت سے لکھنؤ کی درسگاہوں میں علم حدیث کا رواج ہوا، نصیرالدین حیدر کی سلطنت میں ۱۲۲۶ھ میں وفات پائی[۱] اُن کے ایک شاگرد مولانا محمد علی صدرپوری ملیح آبادی ہیں، جو اخیر میں نواب ٹونک کے ملازم ہو گئے تھے، توحید و سنت کی اشاعت اور رسوم و بدعات کے ابطال میں بڑی کوشش کی۔

مولانا حسین احمد ملیح آبادی | ان کے والد سرہند سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے ملیح آباد جا کر آباد ہوئے، مولانا کی پیدائش یہیں ہوئی، مرزا حسن علی لکھنوی، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شیخ عمر محدث مکی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، اُن کا ایک رسالہ جواز قرأت خلف الامام مشہور ہے، مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی نے اُن سے حدیث پڑھی تھی، ۱۲۷۵ھ میں وفات پائی[۲]

شاہ محمد اسحاق | اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں بڑی برکت عطا فرمائی، تمام بڑے بڑے علماء اُن کے شاگرد تھے، چند رسالے بھی اُن کی تصنیف ہیں، غدر کے بعد مکہ معظمہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے، اور وہاں بھی یہ سلسلۂ فیض جاری رہا، آخر وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی، اُن کے تلامذہ میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، نواب صدرالدین خاں دہلوی نواب قطب الدین خاں

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۴۸، [۲] ایضاً ص ۵۰۔

جنھوں نے کتب حدیث کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، مولانا سید نذیر حسین صاحب (بہاری) دہلوی مولانا عالم علی صاحب مراد آبادی، شیخ محمد صاحب تھانوی، مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی، مولانا قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی ہیں،

شاہ عبدالغنی صاحب مجددی

شاہ صاحب نے موطا اپنے والد مولانا شاہ ابوسعید صاحب سے پڑھی، مشکوٰۃ شاہ رفیع الدین صاحب کے صاحبزادے شاہ مخصوص اللہ صاحب سے، اور بقیہ کتابیں شاہ عبدالعزیز صاحب سے پڑھیں، شاہ صاحب کی مجلس درس میں وہی پڑھتے تھے، سنن ابن ماجہ پر ان کا حاشیہ ہے، جس کا نام انجاح الحاجہ ہے، چھپ چکا ہے، انگریزی تسلط کے بعد انھوں نے بھی ہجرت کی تھی، پہلے مکہ معظمہ میں رہے، پھر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرلی، اللہ تعالےٰ نے اُن دونوں بزرگوں پر یہ برکت عطا فرمائی، کہ تمام دنیاے اسلام اُن کی زیر بار احسان ہوگئی، اور جہاں بھی کوئی قال قال رسول اللہ کہتا ہے، ان دونوں بزرگوں میں سے ایک کا واسطہ ضرور ہوتا ہے، حرمین کے تمام علما نے ان کے حلقۂ درس سے فیض پایا، اور آج مدینہ منورہ میں جو سلسلہ سب سے زیادہ قلیل الوسائط لیکن کثیر البرکت ہے، وہ انہی دونوں بزرگوں خصوصًا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کا ہے،

حضرت شاہ صاحب کے اسناد و اثبات الیانع الجنی فی اسناد الشاہ عبدالغنی چھپ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا کتنا شکریہ ادا کیا جائے، کہ پچھلے سفر حج (۱۳۴۳ھ) میں شیخ عمر حمدی مغربی کے واسطہ سے اس سلسلہ کی سند اس گنہگار کو بھی عطا ہوئی،

شاہ عبدالغنی صاحب کے تلامذہ

شاہ عبدالغنی صاحب کے تلامذہ اور مستفیدین کی فہرست حد شمار سے باہر ہے لیکن ان میں سے دو صاحب سلسلہ بزرگ سب سے زیادہ مشہور و معروف ہیں، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

ان دونوں بزرگوں کے فیوض و برکات عالم آشکارا ہیں، اور آج بھی ہمارے سامنے ہیں، ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا

مولانا عبدالحیٔ بڑھانوی اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کے تلامذہ

مولانا عبدالحیٔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد اور شاگرد خاص اور مولانا شاہ اسماعیل شہید شاہ صاحب کے بھتیجے، اور مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے تھے، ان دونوں بزرگوں نے بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دی لیکن زبان و قلم سے آگے بڑھ کر اپنے زور بازو سے بھی کتاب و سنت کی اشاعت اور شرک و بدعت کے رد کی کوشش کی، بنگال سے لے کر افغانستان کی سرحد تک کا دورہ کیا، وعظ و نصیحت کی، مناظرے کئے، جمعہ و جماعت کا اہتمام کیا، رسوم کا ابطال کیا، لوگوں کو جہاد کی دعوت دی، اور ان مہمات کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری (جدِ بزرگوار مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری) نے ان ہی دونوں بزرگوں کے آغوشِ درس میں تعلیم پائی؛

مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری

مولانا سخاوت علی کچھ دنوں نواب ذوالفقار خاں رئیس باندہ کے مدرسہ میں مدرس تھے، پھر جونپور آکر درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، بہار و جونپور و اعظم گڈھ و بنارس سے بکثرت طلبہ اُن کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور اُن کے ذریعہ سے قدیم جاہلانہ رسوم کے ابطال اور مذہبی شعائر کے اجرا میں بڑی مدد ملی، مشکوٰۃ کے طرز پر مولانا نے القویم فی احادیث النبی الکریم ایک مفید کتاب لکھی، جو یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خاں (ٹونک) کے ایما سے ۱۳۰۱ھ میں مطبع صدیقی بنارس میں چھپی، حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے، اور وہیں ۱۲۷۴ھ میں وفات پائی، اُن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں، مولانا کرامت علی جونپوری، خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا رجب علی

جونپوری، مولانا محمد شریف جونپوری، ملا غلام محمد جگدیش پوری، مولوی شیخ محمد مچھلی شہری، مولانا محمد عمر غازیپوری، مولانا غلام جیلانی، غازی پوری، مولانا فیض اللہ مئوی اعظم گڈھی مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بستی، مولانا سید یعقوب صاحب دیسنوی بہاری، اور مولانا سید مصطفےٰ شیر صاحب دیسنوی بہاری مدرس مدرسہ خانقاہ[1] (شہسرام)

فرنگی محل اور علم حدیث

لکھنؤ میں فرنگی محل کا علمی مرکز عالمگیر کے عہد میں قائم ہوا، ملا قطب الدین اور ملا نظام الدین رحمہما اللہ کے عہد سے لے کر مولانا عبد الحلیم رحمۃ اللہ علیہ تک اس خانوادۂ فضل و کمال کی علمی کوششوں کا جولانگاہ منطق اور اصول کی کتابیں رہیں، اور تعجب ہے کہ اس قدر طویل زمانہ تک ہندوستان کی یہ مشرقی درسگاہ حدیث کے ترانۂ قدس سے ناآشنا رہی، بزرگوں سے جو کچھ سنا ہے، وہ یہ ہے کہ درس نظامی میں صرف مشکوٰۃ داخل تھی، اور وہی پڑھائی جاتی تھی، یہ بھی سنا ہے، کہ فرنگی محل میں صحیح بخاری کے پندرہ پارے موجود تھے، مگر وہ صرف تبرکاً رکھے رہتے تھے۔

ملا نظام الدین بہرحال فرنگی محل کی درسگاہ ایک مدت تک کتب صحاح کے درس سے خالی رہی، اور صرف کسی مختصر مجموعۂ حدیث پر قناعت کی گئی، حضرت ملا نظام الدین کی ایک تصنیف اُن کے پیر و مرشد حضرت سید عبد الرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے حال میں مناقب رزاقیہ کے نام سے ہے، اس میں ایک موقع پر یہ واقعہ درج ہے، کہ ایک دفعہ سید صاحب نے جو اُمّی تھے پوچھا کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے، لوگوں نے حنفی طریقہ سے بتایا، اس پر سید صاحب نے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے (کشف سے) کہ اگر صرف منھ اور گٹوں تک ہاتھوں کا مسح کر لیا جائے، تو کافی

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶، ۷۰)

حاضرین نے انکار کیا، ملّا صاحب اس موقع پر فرماتے ہیں:-

"اختلاف است فقہارا کہ درتیمم استیعاب ذراع یا بہ بند دست کفایت دارد حضرت امام اعظم وصاحبیہ رحمہم اللہ باوّل است، وامام شافعی بقول قدیم وجماعۃ بثانی واکثر احادیث صحاح مؤید قول امام شافعی وغیرہ است (ص ۱۹)

مولانا بحر العلوم | علمائے فرنگی محل میں سب سے پہلی ہستی جس کی تصنیفات کتب حدیث کے حوالوں سے لبریز ہیں، وہ مولانا عبد العلی بحر العلوم خلف الصدق ملا نظام الدین کی ذات ہے، مگر یہ تحقیق معلوم ہوا ہے کہ اُن کو حدیث کی کتابوں کی باقاعدہ سند حاصل نہ تھی، اور اس کا کہیں ذکر ان کے حالات وتصنیفات میں نہیں ملتا، بلکہ علوم کی فراغت کے بعد انھوں نے محدثین کی کتابیں پڑھ کر اس فیض کو از خود حاصل کیا تھا۔

متعدد طریقوں سے یہ روایت سنی ہے کہ مولانا عبد العلی (بحر العلوم) کی جب عقلی تصنیفات دلی میں مولانا شاہ عبد العزیز صاحب کی خدمت میں پہونچیں، تو حضرت شاہ صاحب نے دیکھ کر فرمایا کہ دینیات سے کورے ہیں، یہ سُن کر مولانا عبد العلی نے فقہ میں ارکانِ اربعہ لکھ کر بھیجی جس میں محققانہ مسائل پر بحث اور احادیث کے حوالے ہیں، اس کو دیکھ کر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اخاہ! ملا عبد العلی تو بحر العلوم ہیں![1] ایک کامل وقت کی زبان سے جو لفظ نکلا، وہ چاردانگ عالم میں پھیل گیا، اور اتنا مقبول ہوا کہ لوگ بحر العلوم کی شہرت کے مقابلہ میں عبد العلی نام تو بھول گئے اور زبانوں پر بحر العلوم رہ گیا۔

مولانا بحر العلوم کی دو تصنیفات ارکانِ اربعہ فقہ میں، اور فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت اصول میں ایسی کتابیں ہیں جن میں احادیث اور کتب احادیث کے حوالے بکثرت ہیں، یہاں پر دو باتیں

[1] یہ واقعہ تھوڑے تغیر کے ساتھ تذکرہ علمائے فرنگی محل میں موجود ہے، ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

قابلِ بحث ہیں، مولانا کو یہ کتابیں کہاں ملیں، اور ان میں سے اصلاً کون کون کتابیں ملیں،

پہلی بات کے متعلق یقینی ہے کہ لکھنو کے قیام کے زمانہ میں یعنی ۱۱۷۲ھ یا ۱۱۷۳ھ تک جب مولانا کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی، یہ کتابیں نہیں لکھی گئیں، اور نہ لکھنو میں تالیف پائیں فواتح الرحموت کا نام تو تاریخی ہے، جس سے ۱۱۸۰ھ نکلتے ہیں، یہ زمانہ غالباً مولانا کے شاہجہان پور یا رامپور کے قیام کا ہے، کیونکہ بوہار (بنگال) کا مدرسہ اور مکتب خانہ بہت بعد یعنی ۱۲۰۹ھ میں قائم ہوا، اور مولانا کا قیام یہاں ۱۲۰۹ھ کے بعد ہی سے ہوا، اغصانِ اربعہ وغیرہ میں لکھا ہے کہ مولانا کی اکثر تصنیفات شاہجہان پور ہی کے زمانۂ قیام میں تالیف پائی ہیں، اور یہ بھی سنا گیا ہے کہ نواب شاہجہان پور حافظ الملک رحمت خان نے ایک بڑا کتب خانہ بھی فراہم کیا تھا، اور یہ سرمایہ بعد کو رامپور میں منتقل ہوا، ان وجوہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا بحر العلوم کو اسی کتب خانہ میں کتابیں ملیں،

دوسرے سوال کا جواب کچھ زیادہ اہم نہیں، ارکانِ اربعہ میں جو کچھ ہے اُس کا ماخذ دو کتابیں ہیں، اس کی اصل بنیاد تو علامہ ابنِ ہمام کی فتح القدیر (شرح ہدایہ) ہے، فتح القدیر میں تمام کتبِ حدیث کے اقتباسات اور حوالے موجود ہیں، اور انہی کے مباحث اور حوالوں کا خلاصہ ارکانِ اربعہ ہے، اس کے علاوہ دوسرا ماخذ مختلف احادیث کا ایک مشہور مجموعہ جامع الاصول ہے، جس کا مولانا نے بارہا اس میں حوالہ دیا ہے، اور اسی سے حدیثیں نقل کی ہیں،

فواتح الرحموت کی تصنیف کے وقت مولانا کے سرمایہ میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا تھا، اس وقت ابن ہمام کی فتح القدیر اور تحریر فی الاصول کے علاوہ ابنِ حجر اور سیوطی کی کتابیں بھی ان کو مل گئی تھیں، چنانچہ ابنِ حجر عسقلانی کی فتح الباری شرحِ صحیح بخاری اور جلال الدین سیوطی کی تفسیر درمنثور اور الاتقان فی علوم القرآن کے حوالے بکثرت ان کی اس کتاب میں ہیں، معلوم

ہوتا ہے کہ سیوطی کی یہ دونوں کتابیں ہندوستان اس زمانہ میں پہونچ چکی تھیں، میر غلام علی آزاد کی تالیفات میں بھی ان دونوں کتابوں کے حوالے ہیں۔

تفسیر دُرِ منثور اور اتقان گو قرآن پاک سے متعلق ہیں، مگر اُن کی تمامتر بنیاد احادیث اور روایات پر ہے، اور ان میں نہ صرف صحاح ستہ کی حدیثیں بلکہ دوسری نادر کتبِ حدیث کی روایتیں بھی ہیں، اس بنا پر ان دونوں کتابوں میں حدیث کی تمام کتابوں سے روایتیں آگئی ہیں مولینا بحر العلوم ان ضمنی روایتوں کو نہایت خوبی کے ساتھ اپنے کام میں لاتے ہیں، اس طریقہ سے اُن کی تصنیف فواتح الرحموت میں حسبِ ذیل کتب حدیث کے نام اور حوالے ملتے ہیں، اور اُن کی روایتیں بعینہٖ درج ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابی داؤد، موطائے امام مالک، حاکم، بزار، ابن حبان، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق، بیہقی، رسالہ سیوطی فی احادیث روایا الصحابۃ عن التابعین، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شرح مشکوٰۃ فارسی بھی اُن کے مطالعہ میں تھی جس کا ذکر اسی کتاب میں جرح و تعدیل کے مسئلہ کے ضمن میں ہے، اور خبرِ واحد کے مسئلہ میں بھی شیخ کا حوالہ دیا ہے، ان کے علاوہ تفاسیر بالروایۃ، اور شروحِ حدیث میں سے حسب ذیل کتابوں کے حوالے ہیں معالم التنزیل بغوی، دُرِ منثور سیوطی، فتح الباری، حافظ ابن حجر، متاخر محدثین میں ابن ہمام (صاحبِ فتح القدیر والتحریر) اور ابن تیمیہ کے نام بھی آئے ہیں،

کتبِ حدیث اور ان کی روایتوں کے حوالے جس طرح فواتح الرحموت میں آئے ہیں، اُن سے بالیقین معلوم ہوتا ہے کہ صحیح بخاری و مسلم مولانا کے مطالعہ میں تھی، اور دیگر کتب حدیث کی روایتیں بالواسطہ اور زیادہ تر دُرِ منثور اور اتقان سے ماخوذ ہیں، اور مولانا نے اکثر خود اس واسطہ کا ذکر کر دیا ہے،

مُلّا مبین | مولانا بحر العلوم کے علاوہ فرنگی محل کے علماء متقدمین میں دو بزرگوں کے نام ہم کو اور ملے ہیں، ایک مُلّا مبین ہیں، جن کے حال میں اغصان اربعہ کے مصنف نے لکھا ہے،

"واحادیث بسیار حفظ داشت، چنانچہ ہنگام وعظ، ترجمۂ ہزاراں احادیث بزبان می آورد" (ص ۱۸)

اہل بیت کے مناقب اور اسمائے الٰہی کی شرح میں اُن کے دو رسالے ہیں، ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی،

مُلّا حیدر | مُلّا مبین کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد حیدر صاحب غالباً اس خاندان میں پہلے شخص ہیں، جنہوں نے عرب جاکر اس فن کی سند حاصل کی ۱۲۴۰ھ میں وہ حج کے لئے روانہ ہوئے، دو مہینے مکہ معظمہ میں اور کچھ مہینے مدینہ منورہ میں رہے، مکہ معظمہ میں سیّد یوسف بطاح یمنی اور شیخ مُلّا عمر مکی سے صحیحین کی تحصیل کی، اور مدینہ منورہ جاکر وہاں کے شیوخ سے تکمیل کی، اور بعد کو پھر مکہ معظمہ میں آکر قیام کیا، عرب سے واپس آکر حیدرآباد گئے، اور وہیں رہ گئے،[۱]

مولانا عبدالرزاق | تیسرے بزرگ مولانا شاہ عبدالرزاق ہیں، حدیث کی کتابیں انھوں نے اپنے خاندان سے باہر مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی، اور مرزا حسن علی مرحوم محدث لکھنوی (تلامذۂ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی) سے پڑھیں، اور پھر اپنے استادوں کے ساتھ مل کر حدیث کی تمام کتابیں شیخ محمد محسن مدنی سے اس طرح پڑھیں کہ وہ قرأت کرتے تھے، اور بہت سے علماء سماعت کرتے تھے ۱۲۵۴ھ میں فراغت حاصل کی،

مولانا شاہ عبدالرزاق مرحوم کے دونوں صاحبزادوں، مولانا عبدالباسط اور مولانا حافظ عبدالوہاب نے اپنے والد ماجد سے حدیث پڑھی،[۲]

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھو اغصان اربعہ ص ۱۸ و ما بعد ۔ [۲] ایضاً ص ۱۰۶،

مولانا عبدالحلیم | علمائے فرنگی محل میں علمِ حدیث کے درس و تدریس کا باقاعدہ نظام مولانا عبدالحلیم (والد بزرگوار مولانا عبدالحیٔ) کے زمانہ سے شروع ہوا، مولانا عبدالحلیم نے مفتی محمد یوسف مرحوم اور دیگر علمائے فرنگی محل سے علوم درسیہ کی تکمیل کی، ۱۲۶۰ھ میں نواب ذوالفقار بہادر رئیس باندا (بندیل کھنڈ) کے مدرسہ میں مدرس ہوئے، پھر اپنے استاذ مفتی محمد یوسف صاحب مرحوم فرنگی محل کی جگہ پر جونپور کے مدرسہ امامیہ حنفیہ کے مدرس ہوئے، ۱۲۷۷ھ میں نواب سالار جنگ کی طلب پر حیدرآباد گئے، اور وہاں کے مدرسہ نظامیہ کے مدرس ہوئے، ۱۲۷۹ھ میں حرمین محترمین کی زیارت کے لئے گئے، اور وہاں کے علماء اور شیوخ سے کتب حدیث کی سند حاصل کی، جن میں سب سے پہلے نام احمد بن زین دحلان شافعی کا ہے، نیز شیخ محمد جمال حنفی، محمد بن محمد الغرب الشافعی مدرس مسجد نبوی، اور مولانا شاہ عبدالغنی مجددی وغیرہ سے فیوض و برکات اور اجازت و سند حاصل کی، منطق و فلسفہ و کلام و اصول کے علاوہ حدیث و سیر و فقہ کے مسائل پر رسالے لکھے، مثلاً نور الایمان فی آثار حبیب الرحمٰن، برکات الحرمین، خیر الکلام فی مسائل الصیام، ایقاد المصابیح فی صلوٰۃ التراویح، الاسعار فی تحقیق الدعا، غایۃ الکلام فی بیان الحلال والحرام، القول الحسن فیما یتعلق بالنوافل والسنن، عمدۃ التحریر فی مسائل اللون واللباس والحریر، ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی[1]

مولانا محمد نعیم صاحب | یہ مولانا بحر العلوم کے پوتے اور مولانا عبدالحلیم صاحب کے صاحبزادے تھے، اپنے والد ہی سے تعلیم پائی، نہایت متقی اور زاہد تھے، اور بزرگانِ سلف کی زندہ یادگار تھے، تعلیم سے فراغت پاکر عرب گئے، اور وہاں سے سند پائی، حدیث و فقہ کی کتابوں کا درس دیتے تھے، تیرھویں صدی کے اخیر اور چودھویں صدی کے شروع میں درس و افادہ میں

---

[1] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۱۱۲، ۱۳۰۔

مشغول تھے، بہت سے علماء نے ظاہر و باطن میں آپ سے استفادہ کیا، منجملہ اوروں کے مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء بھی تھے۔

مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے، کہ مولانا محمد نعیم صاحب کو حدیث کی کتابوں کا اتنا شوق تھا کہ جب امام طحاوی کی شرح معانی الآثار شروع شروع چھپ کر آئی ہے، تو اس کے دام زیادہ تھے، اور مولانا کے پاس روپئے نہ تھے، تو انھوں نے اپنا ایک مملوکہ مکان خاص اس کام کے لئے بیچا، اور اس کی قیمت میں سے یہ کتاب خرید کر منگوائی رحمہ اللہ تعالیٰ،

مولانا عبدالحی | فرنگی محل میں علم حدیث کی معراج کمال مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں ہوئی، تعلیم اپنے والد مولانا عبدالحلیم سے پائی تھی، ساتھ ہی دو مرتبہ حجاز جا کر وہاں کے علماء اور شیوخ سے سندیں حاصل کیں، پہلی مرتبہ اپنے والد ماجد کے ساتھ ۱۲۷۹ھ میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۹۲ھ میں سید احمد دحلان اور شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی مہاجر مدینہ سے حاصل کیں۔

مرحوم نے گو عمر بہت کم پائی ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے؛ اسال کی عمر میں علوم کی تکمیل کی؛ اور ۱۳۰۴ھ میں وفات پائی، کل چالیس برس کی عمر ملی، مگر اسی مختصر زمانہ میں مرحوم کے درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور تحقیق و تدقیق کے آوازہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام گونج اٹھی، اطراف و دیار سے علم کے طالب آپ کے آستانہ پر جمع ہوئے، معقول و منقول کا یہ مجمع البحرین زندگی کے آخری لمحہ تک موجیں مارتا رہا، دوسرے علوم و فنون کے ساتھ تمام کتب حدیث کا درس بکمال تحقیق آپ کی درسگاہ میں ہوتا تھا، پورب اور بہار کے طلبہ زیادہ تر اس فیض سے سیراب ہوئے، حدیث اور متعلقات حدیث کی متعدد نادر کتابیں اپنے مقدمہ وحاشیہ کے ساتھ شائع کیں، حدیث اور فقہ حنفی کی جامعیت کے ساتھ بیسیوں رسالے لکھے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہر طرف ملک میں ایک نئے مسلک عدم تقلید کا چرچا تھا، اور ملک

میں جگہ جگہ علم حدیث کے حلقہ ہائے درس قائم تھے، بھوپال اور دہلی میں علمائے اہلحدیث کا مجمع تھا، رسالوں پر رسالے نکل رہے تھے، ادھر لکھنؤ میں اُن کے مقابلہ میں مولانا عبدالحیٔ رحمۃ اللہ علیہ کی ہستی تھی، نواب صدیق حسن خاں مرحوم اس زمانہ میں اہل حدیث کے امام اور مولانا عبدالحیٔ احناف کے سرگروہ تھے، طرفین نے خوب خوب دادِ تحقیق دی،

متونِ کتب میں سے مولانا نے مسند امام ابوحنیفہ، موطا امام محمد، کتاب الآثار امام محمد پر مقدمہ اور حاشیہ لکھا، اور ان کو چھپوا کر شائع کیا، متعلقات حدیث میں سے موضوعات سیوطی المقاصد الحسنہ امام سخاوی اور فتح المغیث فی اصول الحدیث اور میزان الاعتدال وغیرہ کتابیں اُن کے اشارہ سے اُن کے متوسلین اور تلامذہ نے شائع کیں،

کتابوں کے تحشیہ اور اشاعت میں مولانا کو جو اہتمام تھا، اس میں دو باتیں خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں، سب سے پہلی بات مقدمہ نگاری کی ایجاد ہے، مولانا سے پہلے کسی شارح یا محشی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، یورپ میں قلمی کتابوں کو اڈٹ کرنے کی جو اہمیت حاصل ہے، اور جس طرح وہ مختلف نسخوں کی فراہمی، مقابلہ اور تصحیح، اور ساتھ ہی مصنف اور تصنیف کے متعلق ہر قسم کے معلومات مقدمہ میں فراہم کرتے ہیں، مولانا نے علمائے یورپ کے طریق کار کے علم سے پہلے ہی اس اہم کام کی طرف توجہ کی، اور بالکل اسی طریق پر بلکہ اس سے بہتر طریقہ پر اس کام کو انجام دیا، جس کتاب کو شائع کیا، اس کے مختلف نسخوں کو فراہم اور اُن کا مقابلہ کر کے ایک صحیح نسخہ ترتیب دیا، پھر اس پر حواشی لکھے، شروع میں ایک مقدمہ لکھا جس میں ماتن، شارح اور اس کے دیگر شارحین کے حالات لکھے، اس کی کتاب اور اس فن کی دوسری کتابوں کے حالات ذکر کئے، نفس اُس فن کی جس میں یہ کتاب تھی، تاریخ لکھی،

دوسری قابلِ ذکر بات کتابوں کی صحت ہے، حیرت ہوتی ہے کہ عربی کی ضخیم کتابیں اور اُن پر باریک حاشیے، اور اُن کی تصحیح اس طرح کی جاتی تھی، کہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے، تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اُن کی خاص شائع کردہ کتابوں میں ایک نقطہ کی بھی غلطی نہیں ہے' آج جب کہ مطابع اور کتابوں کی چھپائی اور اشاعت کا یہ عالم، اور اس قدر اہتمام ہے، تاہم وہ صحت اردو کی کتابوں میں بھی نہیں ہوتی،

صحت کے معاملہ میں مولانا کے ساتھ غالبًا اُن کے معتقد مولانا خادم حسین صاحب عظیم آبادی اور مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے اہتمام کو بھی دخل تھا،

مولانا کے تلامذہ میں اس فن کے بڑے بڑے ماہرین پیدا ہوئے، جن میں قابلِ ذکر مولانا ظہیر احسن شوق نیموی صاحبِ آثار السنن، مولوی حکیم عبد الباری صاحب عظیم آبادی مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی مولانا قادر بخش سہسرامی، حافظ المحدیث مولانا عبدالغفور صاحب منصورپوری بہاری، مولانا عبدالکریم پنجابی، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری وغیرہ وہ علمائے کبار ہیں جنھوں نے ملک کے ہر گوشہ میں پہونچ کر علم و فن کی خدمت کی، میرے علم میں اس وقت مولانا کے وسیع حلقۂ تلامذہ سے صرف دو بزرگوار پچھلی بزم کی شمع یادگار ہیں، مولانا ابوالفضل محمد حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلیٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء، اور مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب قادری چشتی پھلواروی، اور کیونکر کہوں کہ اس سرگشتۂ وادیِ جہالت کو بھی، بیک واسطہ (استاذنا مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب کے واسطہ سے) اس بزم اقدس کی صفِ نعال میں جگہ حاصل ہے،

مولانا عبدالباری صاحب مرحوم

سب سے آخر میں فرنگی محل کے علم و فضل کا دائرہ جناب مولانا عبدالباری کے نقطۂ کمال میں سمٹ کر آگیا تھا، مرحوم نے فرنگی محل میں جناب مولانا عین القضاۃ صاحب شاگرد مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے کتابیں پڑھیں، اور اس کے بعد عرب جاکر علم حدیث کی تکمیل کی

اور مدینہ منورہ میں قیام فرما کر شاہ عبد الغنی مجددی کے تلامذہ میں سید محمد علی اثری اور شیخ رحمت اللہ سے سندیں حاصل کیں، مرحوم کو دراصل فقہ حنفی کے ساتھ والہانہ شغف تھا، اور اس کی نادر خفی اماموں کی اصل کتابوں کا بڑا شوق تھا، اور ساتھ ہی ایسی حدیثوں کی بھی اُن کو بڑی تلاش رہتی تھی، جن سے کسی حنفی مسلک کی تائید ہوتی ہو، مولانا کے یہاں جب جانا ہوتا، اور ملنا ہوتا، تو ان عنوانات پر گفتگو ضرور ہوتی، حدیث و فقہ کی نادر قلمی کتابوں کی بہم رسانی کا بھی انھیں شوق تھا، امام محمد کی سیر کبیر کا نسخہ جمع کرایا تھا، آثار امام محمد کے رجال کی تحقیق پر رسالہ لکھا، احادیث متواترہ یکجا کئے، ایک فن کی سینہ بسینہ روایات کا خاندانی مجموعہ بھی چھاپا، امام ابن ابی شیبہ نے مصنف میں ایک خاص باب امام ابو حنیفہ کے رد میں لکھا ہے، جو ایک رسالہ کی صورت میں چھپ بھی گیا ہے، مولانا نے ابن ابی شیبہ کے اس رد کا جواب لکھا، جو چھپ گیا ہے، اور بھی چند چھوٹے چھوٹے مختصر رسالے اس فن میں انھوں نے لکھے ہیں، جن میں سے ایک مجموعہ گیارہ رسالوں پر مشتمل ہے۔

۱۳۴۵ھ میں وفات پائی۔

(معارف اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۶ء)

ہندوستان میں علمِ حدیث کی تاریخ

کے

چند گم شدہ اوراق

معارف میں "ہندوستان میں علمِ حدیث" کے عنوان سے مضامین کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، الحمد للہ کہ اوس سے توقع سے زیادہ لوگوں نے دلچسپی لی، علماء اور تعلیم یافتہ دونوں جماعتوں نے اس کو پسند کیا، اور اُس کی تکمیل و تصحیح میں حصہ لیا، بیرون ہندوستان تک سے اس کی مزید تکمیل کی فرمایش جاری ہے،

چونکہ یہ ایک ایسا مضمون تھا جس کے معلومات اب تک کہیں یکجا نہ تھے، اور نہ کسی مصنف و مورخ نے اُس کی طرف توجہ کی تھی، مجھے خود اس کی وسعت کا اتنا علم نہ تھا، مگر جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، راستہ اور کشادہ اور فراخ معلوم ہوتا گیا، تاہم چونکہ راستہ دیکھا نہ تھا، اور نہ کسی اگلے رہرو کے نقش قدم کے وہاں نشان تھے، اس لئے ادھر اُدھر بھٹکنا ناگزیر تھا، سلسلۂ مضمون میں قدم قدم پر تحقیق کی لغزشیں تھیں، مگر خوشی کی بات ہے کہ چند اور اہلِ ذوق بھی ہم سفر بن گئے، اور اُن کے ٹوکنے سے غلط روی کی اصلاح ہوتی گئی،

ہندوستان میں علمِ حدیث کی ابتدائی تاریخ کے سراغ لگانے میں جو کوشش آغاز مضمون

میں کی گئی تھیں، مزید تلاش سے اس کے چند نئے اوراق بھی ہاتھ آئے،

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اس سلسلہ میں یہ خصوصیت کے ساتھ دکھایا گیا ہے، کہ اہلِ عرب کو علمِ حدیث اور اس کی اشاعت کے ساتھ خاص شغف رہا ہے، اس لئے جہاں ان کے فتوحات کا قدم پہنچا، وہیں قرآنِ پاک کے بعد علمِ حدیث کی درس گاہ بھی قائم ہوگئی، ہندوستان کا سب سے پہلا حصہ جو عرب فتوحات کے دائرہ میں داخل ہوا، وہ سندھ تھا، جس کا ۹۶ھ سے تقریباً ۲۵۰ھ تک براہ راست دمشق و بغداد کی خلافت سے تعلق قائم رہا، اور پھر وہاں کے دو شہروں منصورہ و دیبل میں دو مقامی اسلامی ریاستیں قائم ہوئیں، منصورہ کی اسلامی ریاست محمود غزنوی کے حملۂ سندھ تک (۴۱۶ھ تک) قائم رہی، اور اس کے بعد دیبل کی اسلامی ریاست ۷۵۲ھ تک یعنی فیروز شاہ خلجی کے زمانہ تک باقی رہی، گو اس کے بعد بھی وہ ۹۲۷ھ تک قائم رہی مگر خود مختار نہ رہی، بہر حال اس سے اندازہ ہوگا کہ پہلی صدی ہجری کے آخر سے اس وقت تک جب تک درۂ خیبر سے آنے والی قوموں نے آکر اُن کو بیدخل نہیں کر دیا، وہ اس سرزمین میں اسلام اور اسلامی علوم کے حافظ و محافظ رہے،

قاضی ابو سعید عبد الکریم سمعانی ۵۰۶ھ میں مرو (ترکستان) میں پیدا ہوئے، اور وہیں ۵۶۲ھ میں وفات پائی، علمِ حدیث کی طلب میں تمام دنیائے اسلام کی خاک چھانی، اور ہر جگہ جا کر چار ہزار استادوں سے اس فن کو حاصل کیا، ماوراء النہر اور خراسان سے بارہا گذرے، اور ان کے علاوہ عراق، شام اور عرب تک چکر لگایا، اور ہر گوشہ سے فیوض و برکات کا سرچشمہ جمع کیا، اُن کی مشہور کتاب کتاب الانساب ہے جو ۱۹۱۲ء میں گب میموریل سیریز کے سلسلہ میں عکس سے چھاپی گئی ہے، اس کتاب میں شہروں، قبیلوں اور پیشوں کی نسبتوں سے جو لوگ مشہور ہوئے اُن کے حالات ہیں، اس ضمن میں چھٹی صدی ہجری تک کے اکثر شہروں کے باکمالوں کے تذکرے ہیں، منجملہ انکے

ہندوستان بھی ہے،

ہندوستان کے شہروں میں سے سندھ، منصورہ، دیبل، اور لاہور کے نام اس میں ملتے ہیں دہلی کا نام اس لئے نظر نہیں آتا کہ اس زمانہ تک (۵۶۲ھ) دہلی اسلام کے دائرۂ حکومت میں نہیں آئی تھی،

سندھی | اس نسبت سے جو دو ابتدائی بزرگوں کے نام اس میں لکھے ہیں یعنی ابو معشر نجیح المتوفی ۱۷۰ھ اور رجا سندھی، المتوفی ۲۲۱ھ کے نام پہلے گذر چکے ہیں، البتہ رجا سندھی کی اولادوں کا ذکر رہ گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں مدت تک علم حدیث کا چرچا رہا، ابوعبداللہ محمد بن رجا، اور ابوبکر محمد بن محمد بن رجا مشہور گذرے ہیں، ابوعبداللہ نضر بن شمیل کی ابن ابراہیم بن علی دہلی، اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ کے اور ابوبکر ابراہیم بن محمد شافعی، اسحاق بن ابی حمزہ کے شاگرد تھے، بغداد اور مکہ میں درس دیتے تھے،

(۲) ابونصر فتح بن عبداللہ سندھی فقیہ، متکلم اور محدث تھے، حسن بن سفیان وغیرہ کے حلقوں میں بیٹھے تھے، ہمدان اور قزوین میں قاضی رہے،

(۳) احمد بن سندھی بن فروخ بغداد جاکر رہے، ابراہیم درقی سے روایت کی،

(۴) احمد بن سندھی بن حسن بھی بغداد ہی میں سکونت پذیر تھے، ثقہ، صدوق اور فاضل تھے[۱]

۳۷۵ھ یعنی سلطان محمود کے فتوحات سے بیس پچیس برس پہلے یہاں بیت المقدس کا عرب سیاح عالم ابوالقاسم مقدسی آیا تھا، آپ تعجب سے سنیں گے کہ وہ سندھ کے اسلامی فرقوں کے ذکر میں کہتا ہو

---

[۱] کتاب الانساب سمعانی صفحہ ۳۱۲

واکثرھم اصحاب حدیث[1]، اور اُن میں زیادہ تر اہلِ حدیث ہیں،

پھر کہتا ہے کہ یہاں کے بڑے شہر (قصبات) حنفی فقہا سے خالی نہیں ہیں، لیکن کوئی مالکی یا حنبلی نہیں[2]،

منصوری | یہ منصورہ کی طرف نسبت ہے، عربوں کے زمانہ میں یہ دوسری صدی ہجری کے شروع میں آباد ہوا، اہلِ ہند اس کو بھکر کہتے ہیں، اور اسی نام سے ہندوستان کی تاریخوں میں اس کی شہرت ہے، ۴۱۶ھ تک یہ عرب ریاست تھی اس کے بعد سلطان محمود نے اس کو فتح کیا، عرب ریاست کے زمانہ میں یہاں علم حدیث کا خاصہ چرچا تھا،

اہلِ حدیث میں ایک فرقہ ظاہریہ کہلاتا ہے، اس کے بانی امام داؤد بن علی اصفہانی المتوفی ۲۷۰ھ ہیں، یہ ہر قسم کے قیاس کے قطعاً منکر تھے، اور آیات و احادیث کے صرف ظاہری معنی پر اکتفا کرتے تھے، اس لئے ظاہری کہلائے، داؤد ظاہری کے انتقال کے سو برس بعد ابوالقاسم مقدسی سندھ آیا تھا، وہ کہتا ہے کہ یہاں داؤدی مذہب کے محدثین موجود ہیں، منجملہ اُن کے وہ منصورہ کے قاضی ابو محمد کا ذکر کرتا ہے، جن سے وہ ملا تھا، وہ داؤدی تھے، اور اپنے مذہب کے امام تھے، ان کا درس قائم تھا، اور اُن کی چند عمدہ تصنیفات تھیں[3]، اس لحاظ سے قاضی صاحب کا زمانہ چوتھی صدی کا آخر ہوگا،

منصورہ میں ایک دوسرے محدث قاضی ابوالعباس احمد بن محمد منصوری کا ذکر سمعانی نے کیا ہے، یہ بھی داؤدی مذہب کے امام تھے، عراق و فارس میں رہتے تھے، مشہور محدث اثرم کے درس میں بیٹھے تھے، اور ابو عبداللہ حاکم المتوفی ۴۰۵ھ اُن کے شاگرد تھے[4]، اس

---

[1] احسن التقاسیم صفحہ ۴۸۱ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] کتاب الانساب ورق ۵۴۳-۵۴۴-

حساب سے یہ بھی چوتھی صدی کے آخر کے ہوں گے،

ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن منصوری، حسن بن مکرم سے انھوں نے اور ان سے حاکم نے روایتیں کی ہیں[۵۱] ان کا زمانہ بھی چوتھی صدی کا آخر سمجھنا چاہئے،

قاضی ابوالعباس احمد بن محمد بن صالح یمنی منصوری کا ذکر بھی سمعانی نے کیا ہے، یہ عراق جاکر رہے تھے، انھوں نے فارس میں ابوالعباس بن اثرم سے اور بصرہ میں ابو روق ہوانی سے حدیثیں سنی تھیں، حافظ سمعانی کہتے ہیں کہ میں نے فارس میں اُن سے زیادہ لطیف مزاج کسی کو نہیں دیکھا" تو گویا یہ سمعانی کے ہم عصر تھے، یعنی چھٹی صدی ہجری کے بیچ میں تھے،[۵۲]

دیبل | یہ سندھ کا مشہور بندرگاہ تھا، یہاں سے عراق کو جہازات آیا جایا کرتے تھے، اسی شہر کا نام بعد کو ٹھٹھہ مشہور ہوا، یہاں بھی جیسا کہ پہلے گذرا، ایک اسلامی ریاست قائم تھی، یہاں بڑے بڑے محدثین پیدا ہوئے، جن میں سے سمعانی نے ان چند لوگوں کے نام لئے ہیں،

۱- ابو جعفر محمد بن ابراہیم بن عبداللہ دیبلی یہ مکہ معظمہ جاکر رہے تھے، یہ امام ابن عیینہ کی کتاب التفسیر کے، ابو عبداللہ سعید بن عبدالرحمان مخزومی کے واسطہ سے اور امام عبداللہ بن مبارک کی کتاب البر والصلہ کے ابو عبداللہ حسین بن حسن مروزی کے واسطہ سے راوی ہیں، اور عبدالحمید بن صبیح سے بھی یہ روایت کرتے ہیں، اور ان سے ابوالحسن احمد بن ابراہیم بن فراس مکی اور ابوبکر محمد بن ابراہیم بن علی روایت کرتے ہیں،[۵۳]

۲- ابراہیم بن محمد ابراہیم دیبلی، یہ ابو جعفر محمد دیبلی کے جن کا نام اوپر گذرا، بیٹے تھے، یہ موسیٰ بن ہارون اور محمد بن علی الصائغ سے روایت کیا کرتے ہیں،[۵۴]

---

[۵۱] کتاب الانساب ورق ۵۴۴- [۵۲] ایضاً [۵۳] ایضاً، ورق ۲۳۷،

[۵۴] " " " ۲۳۷،

۳۔ ابو القاسم شعیب بن محمد بن احمد دیبلی، ابو قطعان دیبلی کے نام سے ان کو شہرت ہے، یہ مصر گئے تھے، اور وہیں حدیث کا حلقۂ درس قائم کیا تھا، ابو سعید بن یونس اُن کے شاگرد تھے[لہ]

۴۔ علی بن موسیٰ دیبلی محدّث تھے،

۵۔ حلف بن محمد دیبلی، یہ علی بن موسیٰ دیبلی کے شاگرد تھے، بغداد جا کر رہے[لہ]، اور بہت سے شاگرد پیدا کئے،

۶۔ ابو العباس احمد بن عبد اللہ بن سعید دیبلی، اپنے زمانہ میں مشہور محدّث تھے، محمد بن ابراہیم دیبلی کے شاگرد تھے، اس کے علاوہ نیشاپور میں محمد بن اسحاق ابن خزیمہ سے، بصرہ میں قاضی ابو خلیفہ سے، بغداد میں جعفر بن محمد فریانی سے، اور مکہ میں فضل بن محمد جندی، اور محمد بن ابراہیم دیبلی سے، اور مصر میں علی بن عبد الرحمٰن سے، اور دمشق میں ابو الحسن احمد بن عمیر سے اور بیروت میں ابو عبد الرحمٰن مکحول سے اور نجران میں ابو عروبہ حسین بن ابی معشر سے اور تستر میں احمد بن زہیر تستری سے اور عسکر مکرم میں عبدان بن احمد سے اور نیشاپور میں ابو بکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے حدیثیں سنیں[لہ]، غور کرو کہ کبھی ہندوستانی محدّث کا یہ ذوق و شوق تھا کہ طلب علم کی راہ میں نیشاپور، تستر، عسکر مکرم، بصرہ، بغداد، دمشق، بیروت، اور مکۂ معظمہ کی خاک چھانتے پھرتے تھے،

یہ ابو العباس احمد دیبلی، اس شان کے بزرگ تھے، کہ امام حاکم نے ان کے آگے زانوئے ادب تہ کیا، سمعانی نے حاکم سے اُن کی وفات کا سال ۳۴۳ھ نقل کیا ہے[لہ]، اور اسی سے دوسرے بزرگوں کے سنین بھی معلوم ہوتے ہیں، محمد بن ابراہیم دیبلی اُن کے استاد تھے، اس لئے ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا اوائل ہوگا، اور ابراہیم بن محمد دیبلی چونکہ اُن کے بیٹے تھے، اس لئے یہ

[لہ] کتاب الانساب ورق ۲۳۷۔ [لہ] ایضاً [لہ] ایضاً، [لہ] ایضاً،

چوتھی صدی کے بیچ میں ہوں گے، بقیہ بزرگوار بھی چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے معلوم ہوتے ہیں :-

لاہور | لاہور کو سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۴ھ میں فتح کیا، سمعانی کہتے ہیں، کہ ہندوستان کے شہروں میں ایک بابرکت (کثیرۃ الخیر) شہر ہے، اس کو لوہور اور لاہور کہتے ہیں، یہاں بہت سے علما پیدا ہوئے[1]، یہ شہادت ایک ایسے شخص کی ہے جو ۵۶۲ھ میں وفات پاچکا تھا، یعنی یہ وہ زمانہ ہے جب غزنوی سلطنت کا خاتمہ ہو رہا تھا، اور غوریوں کی حکومت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا،

سمعانی نے علمائے لاہور میں سے حسب ذیل بزرگوں کے نام لئے ہیں،

۱- ابوالحسن علی بن عمر بن حکم لاہوری، ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ محدث تھے، بہت سی حدیثیں زبانی یاد تھیں، حافظ ابو علی مظفر بن الیاس بن سعید سعیدی کے شاگرد تھے، اور بغداد تک اُن کا فیض عام تھا، امام سمعانی نے لکھا ہے، کہ میں خود اُن سے نہیں ملا، مگر حافظ ابوالفضل محمد بن ناصر سلامی بغدادی کے واسطہ سے اُن کا شاگرد ہوں، ۵۲۹ھ میں لاہور میں وفات پائی،[2]

۲- ابوالفتوح عبدالصمد بن عبدالرحمٰن الاشعثی لاہوری، یہ شیخ ابوالحسن علی لاہوری کے شاگرد تھے، سمرقند میں یہ درس دیتے تھے، اور وہیں امام سمعانی نے ان سے شیخ ابوالحسن علی کی روایتیں سنیں،[3] اس لئے اُن کا زمانہ چھٹی صدی کا بیچ سمجھنا چاہئے،

۳- ابوالقاسم محمود بن خلف لاہوری فقیہ و مناظر و محدث تھے، امام ابوسعید عبدالکریم

---

[1] کتاب الانساب ورق ۲۳۶، [2] ایضاً،

[3] " " " ،

(صاحب کتاب الانساب) کے دادا امام ابو المظفر سمعانی کے شاگرد تھے، اور امام ابو سعید سمعانی نے اُن سے اسفرائن میں کچھ روایتیں سُنی تھیں، وہیں انھوں نے سکونت اختیار کر لی تھی، ۵۴۰ھ کے قریب وفات پائی [۱]

ہندی یعنی کسی خاص شہر کی نسبت کے بغیر نفس ہندوستان کی نسبت سے چھٹی صدی ہجری کے وسط تک بہت سے اہلِ علم پیدا ہوئے، سمعانی کہتے ہیں، منسوب الی بلاد الھند وفیھم کثرۃ وشھرۃ ان میں سے صرف دو صاحبوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام ایک ہیں، صرف کنیتیں دو ہیں (اور یہ دونوں ہندی غلام بن کر، امام بنے تھے، دونوں عبدالکریم سمعانی کے اُستاد اور شیخ تھے۔

۱- ابو الحسن بختیار بن عبداللہ محدث اور صوفی تھے، قاضی محمد بن اسماعیل یعقوبی (باشندہ بوشنگ) کے آزاد کردہ غلام تھے، اپنے آقا کے ساتھ عراق، حجاز، اہواز، بغداد، بصرہ، اصبہان، کوہستان اور خوزستان کا سفر کیا تھا، اور اُن میں سے ہر جگہ کے محدثین سے فیض پایا تھا، سمعانی نے فوشنج اور ہرات میں اُن سے حدیث پڑھی، ۵۴۳ھ میں وفات پائی [۲]

۲- ابو محمد بختیار بن عبداللہ، یہ سمعانی کے والد ابو بکر محمد سمعانی کے آزاد کردہ ہندی غلام تھے، اپنے آقا کے ساتھ عراق و حجاز کا سفر کیا تھا، اور خود اپنے آقا سے بہت سی حدیثیں سُنی تھیں، اُن کے علاوہ بغداد میں بڑے بڑے محدثین سے علم کا فیض پایا تھا، مرو میں سکونت اختیار کر لی تھی، اور یہیں صفر ۵۴۱ھ میں وفات پائی [۳]

اللہ اکبر! کیا زمانہ تھا کہ جہاز اور ریل کے بغیر ہندوستان سے ترکستان، ایران

---

[۱] کتاب الانساب ورق ۲۹۷، [۲] ایضاً ورق ۵۹۳،
[۳] ایضاً " " ۵۹۳

خراسان، عراق، حجاز، شام، اور مصر تک کی خاک علم کی تلاش و جستجو میں چھانتے پھرتے تھے، پھر نو مسلم غلاموں کی قسمت پر آج کے خاندانی مسلمان آقا رشک کریں، کہ اسلام کے غلام بن کر وہ کیا رتبہ پاتے تھے،

معارف

(اکتوبر ۱۹۲۹ء)

ہندوستان میں کتبِ حدیث کی نایابی

کے

بعض واقعات

ہندوستان میں حدیث کی کتابوں کی جو نایابی تھی اس کا اندازہ گذشتہ واقعات سے کسی قدر ہوا ہوگا نویں صدی ہجری تک صرف مشارق الانوار کا نسخہ ہندوستان میں نظر آتا ہے، سب سے پہلی دفعہ محمد تغلق کے عہد میں ہم کو یہ آواز سُنائی دیتی ہے، کہ شمس الدین ترک، مصر سے حدیث کی تین سو کتابیں لیکر ملتان تک اس غرض سے آئے تھے کہ ہندوستان میں مذہب حدیث رائج کریں، مگر بادشاہ کا حال سُن کر وہ ملتان ہی سے واپس چلے گئے، معلوم نہیں حدیث کی یہ تین سو کتابیں کیا تھیں، اس واقعہ کا راوی ضیاء برنی ہے، جو اس عہد کا مشہور مؤرخ ہے، مگر ظاہر ہے کہ متن حدیث کی اتنی کتابیں تو نہیں ہو سکتیں، شروحِ حدیث اور رجال کی کتابیں ملا کر بھی یہ تعداد پوری ہونی مشکل ہے، بہر حال جو بھی ہو، اس واقعہ کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اتنا بیش قیمت سرمایہ آکر ہندوستان سے واپس چلا گیا،

محمد تغلق المتوفی ۷۵۲ھ جس کے براہ راست تعلقات مصر کی عباسی خلافت سے تھے،

اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان اور خلعت اور علم بھی ملتا تھا، اور خلیفہ عباسی سے اسنے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے خلیفہ عباسی کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا[۵۱] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان مین قرآن پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا پوچھنا ہے،

الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی اللاہوری المتوفی ۶۵۰ھ کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی المتوفی ۵۱۶ھ کے نسخے دستیاب ہوتے تھے، اور یہی دو کتابیں یہاں کے علماء کے درس میں تھیں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ، موطا امام مالک صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے، اور اُن کو درس میں داخل کیا، اس کے بعد ان کا اور اُن کے سلسلہ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور فارسی میں اُن کی شرحیں لکھیں،

بہرحال شیخ عبدالحق کے ذریعہ مشکوٰۃ کے نسخے حجم کے کم ہونے کی وجہ سے عام ہوگئے اور بخاری کا نام اور حوالہ بھی کتابوں میں آنے لگا، تاہم مخصوص خاندانوں کے سوا صحیح بخاری کا نسخہ عام طور سے نہیں ملتا تھا،

سلاطین تیموریہ کے کتب خانے اپنی کتابوں کی تعداد، ندرت اور جامعیت کے لحاظ سے عجائب روزگار تھے، اُن کی تباہی کے بعد اُن کی کتابیں ہندوستان اور یورپ میں منتشر اور پراگندہ ہوگئیں، اور آج بھی کثرت کے ساتھ یہ کتابیں کتب خانوں میں اور کتب فروشوں کے پاس ملتی ہیں، ان میں تفسیر، فقہ، اصول، تصوف، کلام، فلسفہ، ریاضیات، ادب، دواوین

---

۵۱ تاریخ فرشتہ ذکر محمد تغلق

تاریخ ہر فن کی کتابیں ملتی ہیں، مگر حدیث کا کوئی نسخہ ان میں سے برآمد نہیں ہوا، میں نے اس نظر سے خاص طور سے یورپ اور ہندوستان کی مطبوعہ فہرستیں دیکھی ہیں،

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ دہلی کے حدود سلطنت سے باہر جو مستقل اسلامی حکومتیں اطراف ہند میں قائم تھیں، ان میں جن کا تعلق عرب سے تھا، وہاں کچھ نہ کچھ سراغ کتبِ حدیث کا ملتا ہے، اس سلسلہ میں صحیح بخاری کا وہ نسخہ ہے جو بنگال کی سلطنتِ سادات کی تنہا یادگار ہے، دسویں صدی ہجری کے شروع میں بنگال میں عرب سادات کی حکومت قائم تھی، جس کا ایک سربرآرا علاء الدین شاہ حسین بن سید اشرف الحسینی تھا، اس کا زمانہ ۹۰۵ھ سے ۹۲۷ھ تک ہے، محمد بن یزدان بخش معروف بہ خواجگی شروانی ایک عالم تھے، انھوں نے اپنے ہاتھ سے صحیح بخاری کا ایک نہایت عمدہ نسخہ تین جلدوں میں تیار کیا تھا، اور اس کو سلطانِ مذکور کی خدمت میں پیش کیا تھا، یہ کل نسخہ بانکی پور پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں موجود ہے، اس نسخہ کی تیسری جلد کے اخیر میں خواجگی شروانی کے ہاتھ کی ایک تحریر ہے، جس میں اس نسخہ کا پورا حال لکھا ہے اور اور سلطانِ مذکور کے سامنے اس کے پیش کرنے کا ذکر کیا ہے، یہ واقعات عربی میں ایسی عمدہ اور فصیح و بلیغ عبارت میں لکھے ہیں کہ یقین ہوتا ہے کہ وہ عربی کے بہت بڑے ادیب تھے، یہ عبارت کتب خانۂ مذکور کی فہرست کی پانچویں جلد کے ص ۱۰ میں نقل کر دی گئی ہے،

یہ نسخہ یکدالہ میں لکھا گیا تھا، جو اس زمانہ میں بنگال کا دار السلطنت تھا،

اسی طرح فتح الباری شرح صحیح بخاری کا نسخہ کم از کم احمد آباد گجرات میں بہت پہلے پہنچ گیا تھا، حافظ ابن حجر نے اپنی یہ تالیف ۸۴۲ھ میں ختم کی، اور ۸۵۲ھ میں وفات پائی، پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں فتح الباری کی تیسری جلد کا ایک ایسا نسخہ ہے جس پر سلطان ابراہیم والی بیجا پور کی مہر ہے، سلطان ابراہیم کا زمانہ ۹۸۰ھ سے ۱۰۳۵ھ تک ہے یعنی حافظ ابن حجر کی وفات

کے سو ڈیڑھ سو برس بعد یہ نسخہ ہندوستان پہونچ گیا تھا، اس پر بعد کے زمانہ میں عالمگیر کے ایک امیر قابل خاں کی مہر ہے،

کتب حدیث میں سے شمائل ترمذی کا نسخہ اکبری دور میں غالباً ہندوستان پہونچ چکا تھا، ملا عبدالنبی صدر الصدور اور ملا یعقوب صرفی کشمیری عرب سے حدیث پڑھ کر آئے تھے، شاید یہی دونوں اس کو لائے ہوں گے، کیونکہ ملا عبدالنبی نے اس شمائل کا گویا ایک خلاصہ کیا ہے، جس کا ایک قلمی نسخہ دارالمصنفین میں ہے، نیز ملا یعقوب صرفی کے بیٹے ملا کبیر حسن کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہمارے فاضل دوست مولوی حکیم حبیب الرحمٰن صاحب (ڈھاکہ) کے پاس ہے، یہ ۹۵۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اور جابجا اس پر کاتب کے حواشی ہیں، حکیم صاحب ممدوح کے پاس ایک اور عجیب نادر چیز ہے، آج تک شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے علمی خانوادہ کا آغاز انہی کی ذات سے کیا جاتا تھا، مگر حکیم صاحب کے پاس ایک دستاویز ایسی ہے جو اس آغاز کو ایک پشت اوپر تک لیجاتی ہے، یعنی علامہ ذہبی کی الکاشف جو اسماء الرجال کی ایک کتاب ہے، اس کا ایک نسخہ حکیم صاحب کی ملکیت میں ہے، جس کے پہلے صفحہ پر مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے والد ماجد مولانا سیف الدین ترک کے قلم کی عبارت تحریر ہے۔

غازیپور کے شرفاء کے ایک پرانے قصبہ سے چند سال ہوئے کہ میرے پاس وہاں کے ایک علمی خاندان کے چند متروکہ تبرکات کی فہرست آئی تھی، اس میں دوسری قلمی کتابوں کے ساتھ احادیث کی بھی چند قلمی کتابوں کی فہرست تھی، جس میں ہر کتاب کے سامنے اس کی خصوصیات بھی درج تھیں، اس میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، ابن ماجہ، شمائل ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح، کرمانی شرح بخاری، جمع بین الصحیحین حمیدی، حاشیہ مشکوٰۃ شریف علامہ سید شریف جرجانی، شرح حصن حصین ملا علی قاری، تیسیر الوصول فی احادیث الرسول، موطا

امام مالک کے نام لکھے تھے،

صحیح بخاری کی پہلی جلد کے متعلق لکھا تھا، نہایت خوشخط با اعراب، مدینہ منورہ کے چند علما کی سندین اس میں چسپاں ہیں، اور مولانا عبد الباسط صاحب قنوجی ؟ کے قلم کا حاشیہ ہے، تاریخ درج نہین، لیکن دوسری جلد کی تاریخ کتابت سنہ ۷۷۰ھ لکھی ہوئی ہے، اور اُس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس پر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، شام، خوارزم، اصفہان اور ماوراء النہر کے علما اور محدثین کے درس وسماعت میں رہ چکنے کی سندین تحریر ہیں،

صحیح مسلم کی نسبت لکھا تھا کہ وہ سنہ ۶۰۰ھ کی تحریر ہے، نسخہ نہایت پرانا اور خوشخط، شاہی کتبخانہ (کس بادشاہ کے ؟) کا ہے،

ترمذی پر تاریخ نہیں دی ہے، مگر لکھا ہے کہ یہ نسخہ نہایت پرانا لکھا ہوا ہے،

ابن ماجہ کے نسخہ کی نسبت بھی یہی تحریر ہے،

شمائل ترمذی کا نسخہ سنہ ۷۶۷ھ کا ہے،

مشکوٰۃ المصابیح کا نسخہ سنہ ۱۰۰۳ھ کا ہے،

کرمانی شرح بخاری کی تاریخ سنہ ۷۷۵ھ بتائی گئی ہے، اور لکھا ہے کہ یہ نسخہ مدینہ منورہ میں سنہ تالیف سے صرف پچیس[۲۵] برس بعد کا لکھا ہوا ہے، خوشخط ہے،

جمع بین الصحیحین حمیدی کی کتابت کا سال سنہ ۱۰۹۲ھ ہے،

حاشیہ مشکوٰۃ، میر سید شریف جرجانی کا زمانہ سنہ ۸۰۱ھ لکھا تھا،

حصن حصین خوشخط و مطلا سنہ ۱۰۰۸ھ کا لکھا ہوا اور اس کی شرح در الثمین ملا علی قاری کا زمانہ سنہ ۱۰۰۸ھ مکہ معظمہ کا نسخہ،

تیسیر الوصول کا نسخہ سنہ ۹۱۱ھ کا بتایا گیا ہے، موطا کا کوئی سنہ نہ تھا،

بہرحال رفتہ رفتہ عرب سے کتابیں ہندوستان آنے لگیں، اور اس بارۂ خاص میں سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور اُن کے بعد مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فیوض حرمین کا ممنون ہونا چاہئے، مگر اس عہد میں بھی کتب حدیث کی جو ندرت تھی، اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہو سکتا ہے،

میر عبدالجلیل بلگرامی جو عالمگیر سے محمد شاہ کے عہد تک زندہ تھے، اور ایک زمانہ میں بھکر واقع سندھ میں سرکاری عہدہ دار تھے، وہ اپنے عہدہ سے برطرفی کے بعد بھی چھ مہینے تک وہاں اس لئے پڑے رہے کہ صحیح بخاری کا ایک اچھا سا نسخہ وہاں اُن کو ہاتھ آگیا تھا، اور وہ اس کی نقل لے رہے تھے،[۵۱]

میر ممدوح کے ایک ہم وطن اور ہمعصر روح الامین خاں بلگرامی پنجاب میں شاہی عہدہ دار تھے، انھوں نے اپنے ہاتھ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم نقل کی،[۵۲]

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ایک بلگرامی شاگرد شیخ پیر محمد نے اپنے لئے مولانا ممدوح سے درس لینے کے لئے ۱۱۵۹ھ میں جامع فیروزی میں بیٹھ کر جو نسخہ نقل کیا تھا وہی نسخہ ۱۱۹۳ھ میں شاہ عالم بادشاہ کے حکم سے اعراب اور مقابلہ اور تصحیح کے بعد خزانۂ شاہی میں داخل کیا گیا، یہ متبرک نسخہ بھی پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ کی عزت ہے، اس نسخہ کے خاتمہ پر یہ تمام واقعات مولانا پیر محمد بلگرامی کے قلم سے لکھے ہیں، پھر حضرت شاہ ولی اللہ کے دست خاص سے اجازہ اور سند مکتوب ہے، اس کے بعد کوئی محمد ناصح نام عالم ہیں، اُن کے ہاتھ کی تحریر ہے،

بحمد اللہ وسبحانہ تصحیح واعراب صحیح بخاری بالحکم اقدس حضرت شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ ملکہ وسلطانہ وافاض علی العالمین برہ واحسانہ در سنہ یکہزار و یک صد و ہشتاد و چہار

---

[۵۱] مآثر الکرام آزاد بلگرامی ج اول ص ۲۶۵، [۵۲] ایضاً،

ہجری فقیر محمد ناصح عفی (؟) اللہ از اول کتاب تا آخر از نسخہ مصححہ باتمام رسانید"

سنہ ۱۹۲۴ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس[1] علی گڑھ میں ہوا تھا، اُس میں قلمی کتابوں کی نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا، اس نمائش میں حدیث کے بعض نادر نسخے فراہم ہوئے تھے، اسلامیہ اسکول اٹاوہ کے کتب خانہ سے مشکوٰۃ کا ایک نسخہ آیا تھا، جو بادشاہ عالمگیر کے مطالعہ میں رہتا تھا، اور ایک نسخہ شمائل ترمذی کا آیا تھا جس کو افراسیاب خاں نے عالمگیر کی خدمت میں بھیجا تھا، بخاری کا ایک پرانا نسخہ ایڈیٹر صاحب پیسہ اخبار لاہور نے بھیجا تھا جس پر اُس کے ایک مالک نے خریداری کا سال سنہ ۱۰۴۲ھ لکھا تھا،

---

[1] رپٹ اجلاس مذکور حصہ دوم ص۱۰، سنہ ۱۹۲۴ء (معارف فروری سنہ ۱۹۲۹ء)

رُباعی

فارسی کے اصنافِ سخن میں رُباعی گو چار مصرعوں کی مختصر نظم ہوتی ہے، مگر اس کوزہ میں سمندر بند ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا فلسفیانہ خیال، دقیق سے دقیق اخلاقی نکتہ اور پیچیدہ سے پیچیدہ صوفیانہ مسئلہ جو صفحوں اور دفتروں میں نہیں سماتا، اِن دو سطروں میں پورا کا پورا ادا ہو جاتا ہے۔

وجہ تسمیہ رُباعی عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی "چار والے" کے ہیں، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ یہ چار مصرعوں سے مرکب ہوتا ہے، اس لئے اس کو رُباعی کہتے ہیں؛ لیکن محمد بن قیس رازی نے جو سعدی کے معاصر ہیں، معجم فی معاییر اشعار العجم (ص۹۰) میں یہ لکھا ہے کہ اہل عرب اُس کو رُباعی اس لئے کہتے ہیں کہ بحر ہزج جس میں رُباعی کہی جاتی ہے چار اجزاء سے مرکب ہوتا ہے، اور اس لئے اس کا ایک مصرع عربی میں دو دو جزو کا ایک شعر ہو جاتا ہے، اور اس طرح چار مصرعوں میں چار شعر ہو جاتے ہیں، لیکن دولت شاہ کا بیان اس وجہ تسمیہ کے نسبت وہی ہے جو عام خیال ہے، یعنی یہ کہ "ظرفاء لفظ دو بیتی را نکو ندیدند گفتند کہ ایں چہار مصراع است رباعی می باید گفت"۔

رُباعی کے دوسرے نام رُباعی کا ابتدائی نام دوبیتی ہے کہ یہ دو ہم قافیہ بیتوں سے مرکب

ہوتی ہے، اور عجیب بات ہے کہ عربی میں اس کو آج تک دوبیتی ہی کہتے ہیں، اور رباعی
جو عربی نام تھا، اُس نے زبانِ عجم میں فروغ پایا، صاحبِ معجم نے ذرہ ذرہ سے فرق سے
اُس کے حسب ذیل نام بتائے ہیں،

قول : "ہرچہ ازاں جنس، بر ابیاتِ تازی (عربی) سازند، آن را قول خوانند"

غزل : "وہرچہ بر مقطعاتِ فارسی باشد آن را غزل خوانند"

ترانہ : "اہلِ دانش ملحونات ایں وزن را ترانہ نام کردند"

دوبیتی : "مجرد آن را دوبیتی خوانند، از برائے آنکہ بنا، آن ہر دو بیت بیش نیست"

رباعی : "ومستعربہ آن را رباعی خوانند از بہر آنکہ بحر ہزج در اشعار عرب مربع الاجزا
آمدہ است پس ہر بیت ازین وزن دو بیت عربی باشد"

محمد بن قیس رازی کی تصریح کے مطابق اس کا پہلا نام ترانہ رکھا گیا[1]، اور دوسرے نام
بعد کو رکھے گئے، لیکن دولت شاہ کا بیان ہے کہ پہلے اس کا نام دوبیتی رکھا گیا[2]، پھر رباعی
دوبیتی یا دوبیتی کا لفظ تو عربی میں ہمیشہ کے لئے رہ گیا[3]، مگر فارسی میں چھٹی صدی تک اس
لفظ کا استعمال رباعی کی جگہ نمایاں نظر آتا ہے، محمد بن علی راوندی نے راحۃ الصدور (سنہ ۵۹۹ھ)
میں ہر جگہ دوبیتی لکھا ہے، انوری نے سلطان سنجر کی مدح میں جو رباعیاں لکھی ہیں، اُن کو بھی
دوبیتی کہا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، کہ قدما، عربی میں رباعی کو صرف دوبیتی کہتے تھے، رباعی
نہیں کہتے تھے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ رباعی بھی کہتے تھے، چنانچہ نشوار المحاضرہ میں جو چوتھی صدی کے وسطا کی
مستند عربی تصنیف ہے، رباعیات کا لفظ موجود ہے، جیسا کہ آگے آئے گا، یا خریدۃ القصر

[1] معجم فی معائر اشعار العجم ص ۹۰ گب [2] تذکرہ دولت شاہ ص ۳۰ گب، [3] ابن خلکان ج ۲
راحۃ الصدور ص ۔۔۔

۵۶۶ھ نے بھی خریدۃ القصر میں رباعیات کا لفظ استعمال کیا ہے۔[۱]

رُباعی کی ایجاد رباعی کی ایجاد کی تاریخ نہایت مبہم ہے مگر یہ مسلّم ہے کہ بحر ہزج کا یہ وزن پہلے مستعمل نہ تھا، بعد کو رواج پایا ہے، اس کی ایجاد کی صورت اہلِ ادب یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ چند لڑکے گولی کھیل رہے تھے، ایک گولی لڑھکتی ہوئی سوراخ کے پاس آئی، اس پر خوشی کے عالم میں ایک لڑکے کے مُنہ سے بے ساختہ یہ نکلا کہ ع-

غلطان غلطاں ہمی رود تا بنِ گو،[۲]

شعرا نے اس وزن کو، بحر ہزج کی ایک قسم پاکر اُس کو قبول کر لیا، اور تین مصرع اور لگا کر اُس کو چومصرع کر دیا، یہ تو رُباعی کی ایجاد کے متعلق قدرِ مشترک تھا، مگر ایجادِ رباعی کے متعلق ہمارے سامنے دو مختلف روایتیں ہیں، ایک تو دولت شاہ سمرقندی (تالیف ۸۹۲ھ) کی جس کا بیان ہے کہ یہ بچہ صفاریہ خاندان کے بانی یعقوب صفار المتوفی ۲۹۰ھ کا لڑکا تھا، اور خود یعقوب صفار کھڑا اپنے بچہ کے کھیل کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ دفعۃً بچہ کی زبان سے یہ برجستہ مصرعہ نکلا، یعقوب کو یہ وزن پسند آیا، لیکن چونکہ اُس وقت تک یہ وزن مستعمل نہ تھا، اس لئے ابودلف عجلی اور ابن الکعب جو دربار کے شعرا تھے اُن کو بلوا کر پوچھا کہ یہ کونسا بحر ہے، انھوں نے تحقیق کرکے بتایا کہ یہ بحر ہزج کی ایک قسم ہے، اور اس پر اسی وزن کے تین اور مصرع لگا کر دو شعر پورے کر دیئے، اور دوبیتی اس کا نام رکھا،[۳]

لیکن اس سے متقدم تصنیف معجم فی معاییر اشعار العجم کے مصنف نے بڑی عبارت آرائی کے ساتھ اس واقعہ کو اس طرح لکھا ہے، کہ چند حسین و خوشرو بچے سڑک پر گولی کھیل رہے تھے،

۱؎ خریدۃ القصر، ص ۱۴۴ ۲؎ یہ متن معجم کی روایت کے مطابق ہے۔ دولت شاہ میں "لب گو" ہے، متاخرین نے اس کو "سرِ گو" کر دیا ہے، ۳؎ تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۰ گب

تماشائیوں کا ہجوم تھا، انہی میں ایک طرف ایک شاعر بھی کھڑا تھا، جو غالباً رودکی تھا کہ دفعتہً ایک بچہ کی زبان سے یہ موزوں مصرعہ نکلا، شاعر کو یہ وزن بہت پسند آیا، اور اُس نے تین مصرع اور لگا کر دوبیتی کر دیا،

رُباعی کی تاریخ صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو، اور وہ شاعر کوئی بھی رہا ہو، مگر دونوں روایتوں کا تاریخی نتیجہ یکساں ہے، یعنی یہ کہ یہ تیسری صدی ہجری کے آخر کا واقعہ ہے کیونکہ یعقوب نے سنہ ۲۹۰ھ میں اور رُودکی نے بروایتِ عام ۳۰۴ھ میں وفات پائی ہے[ے]، اس بنا پر تیسری صدی ہجری کے اواخر میں رُباعی کی صنف پیدا ہوئی،

رُباعی گو صوفیہ بلکہ شعرار کے ضمن میں تذکروں میں سب سے پہلا نام حضرت بایزید بسطامی متوفی ۲۳۴ھ کا ملتا ہے، چنانچہ مجمع الفصحار میں یہ تین رُباعیاں اُن کے نام سے ہیں،

(جلد اول ص ۶۵، ایران)

ای عشق تو کشتہ عارف و عامی را   سودای تو گم کردہ نکونامی را
ذوقِ لبِ میگونِ تو آورد برون   از صومعہ بایزید بسطامی را

ما را ہمہ رہ بکوی بدنامی باد   وز سوختگان نصیبِ ما خامی باد
ناکامی ما چو ہست کامِ دلِ دوست   کامِ دلِ ما ہمیشہ ناکامی باد

گر قربِ خدای طلبی دلجو باش   وندر پس و پیش خلق نیکو گو باش
خواہی کہ چو صبحِ صادق الوعد شوی   خورشید صفت با ہمہ کس یکرو باش

ے سمعانی نے کتاب الانساب میں رودکی کا ذکر کیا ہے، اور اس کی تاریخ وفات ۳۲۹ھ بتائی ہے،

لیکن زبان کی صفائی اور رُباعی کا وزن جو تیسری صدی کے خاتمہ تک غیر معروف تھا، اس نسبت کی صحت میں شک پیدا کرتا ہے، اور اس شک کی تائید والہ[1] داغستانی کے بیان سے ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے، کہ صاحب مجمع الفصحا نے یہ رباعیات تقی اوحدی سے نقل کی ہیں، اور اُس کی نسبت والہ داغستانی نے ریاض الشعراء میں حسب ذیل خیالات ظاہر کئے ہیں؛

"راقم حروف را اعتماد بقول وضبط تقی اوحدی نیست، چہ میر مذکور بسیار کم مایہ و کم تتبع بودہ، چنانچہ بعض رباعیات شیخ ابوسعید و بابا افضل کاشی را بنام شیخ بایزید قدس سرہٗ نقل کردہ، حال آنکہ ہیچ کس از متقدمین و مورخین و ارباب خبرت و اہل تحقیق ذکر نہ کردہ اند، کہ شیخ بایزید شعری فرمودہ، تقی اوحدی را نسیان بسیاری نیز بودہ، چنانچہ گاہ ہست کہ یک شعر را بنام سہ کس چہار کس نقل کردہ است"

(نسخۂ قلمی کتب خانہ ندوۃ العلماء در ترجمۂ حکیم سنائی)

رُباعی گو شعراء میں اگر دولت شاہ کا اعتبار کیا جائے، تو ابو دلف عجلی اور ابن الکعب جو یعقوب صفار المتوفی سنہ ۲۹۰ھ کے درباری شعراء تھے، سب سے پہلے رُباعی موزوں کی، اگر قیس رازی کی المعجم فی معاییر اشعار العجم کی روایت کا لحاظ کیا جائے، تو اُس کے گمان میں سب سے پہلے جس نے رُباعی کہی، وہ رودکی المتوفی سنہ ۳۰۴ھ ہے، (سمعانی نے اُس کی تاریخ وفات سنہ ۳۲۹ھ ثبت کی ہے[2])

دیوان رودکی کے نام سے جو مجموعۂ کلام ایران میں سنہ ۱۳۱۵ھ میں چھپا ہے، اور جس کے قلمی نسخہ کی طرف صاحب مجمع الفصحا نے اشارہ کیا ہے، اس کے آخر میں ص ۱۰۸ سے ص ۱۱۳ تک

---

[1] والہ داغستانی گو متاخر ہے، محمد شاہ کا معاصر تھا، مگر کاوش و تحقیق میں اس کا پایہ بلند ہے جیسا اس کے تذکرہ سے ظاہر ہے، [2] کتاب الانساب ص ۲۶۲ گب،

رُباعیات کا عنوان ہے۔ اُس کے تحت میں دو دو شعر کے بیس منظومات ہیں، جن میں عشقیہ، حکیمانہ، اخلاقی، اور خمریہ مضامین ہیں، مگر وزن و قافیہ کے اعتبار سے ان میں - - - - - - -

- -

صرف چھ منظومات ایسے ہیں، جو رباعی ہیں، اور بقیہ قطعے ہیں، وہ چھ رباعیاں ہیں،

با آنکہ دلم از غمِ ہجرت خوں شد — شادی بغم تو ام از غم افزوں شد
(۱)
اندیشہ کنم ہر شب و گویم یارب — ہجرانش چنین است وصالش چوں شد

٭٭٭

چشمم ز غمت بہر عقیق کہ بسفت — بر چہرہ ہزار گل ز یارم بشگفت
(۲)
رازے کہ دلم ز جان ہمی داشت نہفت — اشکم بزبانِ حال با خلق بگفت

٭٭٭

ہاں تشنہ جگر مجوی زیں باغ ثمر — بیہودہ ستانیست ایں ریاض بدر
(۳)
بیہودہ ہماں کہ باغبانت بقضاست — چوں خاک نشستہ گیر و چوں باد گذر

٭٭٭

چوں گشتہ بہ بیعت دو لب کردہ فراز — وز جان تہی قالب [illegible] سودہ باز
(۴)
بر بالینم نشستہ می گوئی بناز — کے کشتۂ ترا من و پشیمان شدہ باز

٭٭٭

اے از گل سرخ رنگ بر بودہ و بو — رنگ از پئے رخ ربودہ بو از پئے مو
(۵)
گلرنگ شود چو روی شوئی ہمہ جوی — مشکیں گردد چو مو فشانی ہمہ کو

٭٭٭

چوں کار دلم ز زلف او ماندہ گرہ — بر ہر رگِ جان صد آرزو ماندہ گرہ
امید ز گریہ بود افسوس افسوس — کا نہم شبِ وصل در گلو ماندہ گرہ (۶)

ایک اور رُباعی مجمع الفصحار کے نسخہ میں ہے۔

در منزلِ غم فگندہ مفرش مائیم — در آب دو چشم و دل بر آتش مائیم
عالم چو ستم کند ستم کش مائیم — دست خوش روزگار ناخوش مائیم (۷)

حضرت الاُستاذ نے مجمع الفصحار کے حوالہ سے چھٹی رُباعی شعرالعجم میں نقل کی ہے، اور ذوقِ شعری کی بنا پر فیصلہ فرمایا ہے، کہ "یہ صناعانہ کلام رودکی کا نہیں ہو سکتا"

(شعرالعجم جلد اول احوال رودکی۔)

اگر یہ سات رُباعیاں رودکی کی ہوں بھی تو تعجب معلوم ہوتا ہے کہ بانی فن کے ہاں اس قدر کم اس کی مثالیں ہوں۔

اصل یہ ہے کہ رودکی کا کلام جو متقدمین کی تصریح کے مطابق ہزار ہا شعروں پر مشتمل تھا، ضائع گیا، اور جو دیوان قلمی یا مطبوعہ ملتا ہے، رضا قلی خاں ہدایت صاحب مجمع الفصحا کی تحقیق کی بنا پر وہ حکیم قطران کے کلام سے مخلوط ہے جس کا زمانہ رودکی کے سو برس بعد کا ہے۔ مصنّف موصوف دیباچہ کے تیسرے صفحہ میں کہتا ہے،

"گویند حکیم رودکی چندیں ہزار بیت شعر فارسی مدوّن کردہ بود کہ اکنوں ہزار یک آن نماندہ چنانچہ رشیدی گفتہ"

شعرا درا بر شمردم سیزدہ رہ صد ہزار — ہم فزوں تر آید ار چوں کہ بر شمری

"وطرفہ تر ایں کہ درزبالِ با اشعار سے کہ بنام ابو عبداللہ جعفر بن محمد الرودکی معروف و مشہور است و در دیوان ابو منصور قطران مسطور است واز دست"

پھر رودکی کے احوال میں کہا ہے،

"رودکی اشعار بسیار داشته اما اشعار وے چیزے در میان نمانده و ہمه تحلیل رفته تا آنکه رشیدی سمرقندی در باب نظم او گوید (شعر او را برگذرا) و اکنوں قلیلے اشعار بنام وے مذکور است و در بعضے تواریخ و کتب تذکره مسطور است، چوں دیوان حکیم قطران پدید آمد، بیشتر آنها نیز دراں دیوان دریافته شد و دیوانش معروف نبوده و در مدائح وے ابونصر اندر است، گمان کرده اند، که نصر بن احمد است و شاعر رودکی است، پس ازانکه در تواریخ و آثار وقتے رفت پدید آمد که حکیم رودکی صد.... سال قبل از قطران بوده و این اشعار معروف بنام وے از قطران است الا قلیلے که دران نیز شبهه است، (ص ۲۲۷)

اصل یہ ہے کہ نصر سامانی ممدوح رودکی اور ابونصر مملان ممدوح قطران کے درمیان اختلاط ہوگیا،

بہرحال اس بیان سے ہویدا ہے کہ اگر رودکی رُباعی کا موجد ہے تو اس کے موجودہ دیوان میں رُباعیاں اتنی کم کیوں ہیں، اور بعض میں زبان کی صناعی کی جو جدت کی چیز ہے، وجہ کیا ہے اور نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے کلام کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا، اس لئے اُس کی رُباعیوں کا نشان لگانا اب محال ہے، ورنہ سمعانی کے زمانہ میں (۵۰۶ھ – ۵۶۲ھ) تک دیوان بلادِ عجم میں بکثرت ملتا تھا، انساب سمعانی میں ہے،

السائر دیوانه بلاد العجم.   جس کا دیوان عجم کے شہروں میں دائر و سائر ہے،

رُباعی گو حکیموں میں پہلا نام اور مطلق رُباعی گویوں میں دوسرا نام معلم ثانی ابونصر فارابی

المتفوفی ۳۳۹ھ کا ملتا ہے، ابن خلکان نے ایک عربی قطعہ مشتبہ طور سے اُس کی طرف منسوب کیا ہے، فارابی گو نسلاً ترک تھا، مگر اس زمانہ میں عجم و ترکستان کی عام زبان فارسی ہی تھی، اور اس کے علاوہ وہ متعدد زبانوں سے واقف تھا[۵۱]، اس لئے اس کی طرف فارسی رباعیات کا انتساب غیر متوقع نہیں ہے، شہرزوری کی تاریخ الحکماء میں ہے، صلہ فارسی،

بہرحال تذکروں اور بیاضوں میں اُس کی طرف چند رباعیات منسوب ملتی ہیں، مجموعہ منتخبات دار المصنفین میں حسب ذیل رباعیاں اُس کے نام سے درج ہیں،

اے آنکہ شما پیر و جوان دیدارید   ازرق پوشان گنبد دوّار رید
طفلے ز شما در بر ما محبوس است   او را بہ خلاص ہستی (؟) گمارید

اسرار وجود خام و ناپختہ[۵۲] بماند   وآن گوہر بس شریف ناسفتہ بماند
ہر کس ز قیاس حرفے گفتند   وآنکہ نکتہ کہ اصل بود ناگفتہ بماند

یہی دونوں رباعیاں مجمع الفصحاء میں حکیم مذکور کے حال میں (جلد اول، ص ۳۰) مندرج ہیں، صرف اس قدر تغیر ہے کہ پہلی رباعی کے دوسرے مصرع میں گنبد دوار رید کے بجائے ایں کہن دیوار ید، اور چوتھے مصرع میں ہستی کے بجائے ہستی ہے، اور دوسری رباعی کے تیسرے مصرع میں ہر کس ز قیاس کے بجائے ہر کس ز دلیل عقل چیزے گفتند

ایک اور مجموعہ (خیابان عرفان مرتبہ محمد حسن بلگرامی) میں ایک اور رباعی فارابی کے نام سے لکھی ہے:-

زاں پیش کہ از جہاں فرومانی فرد   کر کن کہ نبایدت پشیمانی خورد

---

۵۱ تاریخ مختصر الدول ابو الفرج ملطی ص ۲۹۵، بیروت۔ ۵۲ اوپر گذر چکا ہے کہ یہ رباعی کسی قدر لفظی تغیر کے ساتھ خیام کے رباعیات میں بھی شامل ہے، لفظ ناپختہ قافیہ کے لحاظ سے غلط ہے۔

امروز بکن چوں می توانی کارے　　　فردا چہ کنی چو ہیچ نتوانی کرد

فارابی صوفی حکیم تھا، اور صوفیوں کے لباس میں رہتا تھا[۱؎] نگران قرائن کے باوجود کوئی صحیح اور غیر مشکوک دلیل اُس کے رُباعی گو شاعر ہونے پر ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے بجز اس کے کہ شہرزوری نے تاریخ الحکماء میں اس کے حال میں لکھا ہے، ولہ اشعار حسنۃ حکمیۃ "اس کے اچھے حکیمانہ اشعار ہیں" اور اُس کے عربی حکیمانہ اشعار دو صفحوں میں نقل کیے ہیں؛

اس کے بعد شاعرانہ رنگ میں ابو شکور بلخی کا نام ملتا ہے جس کا شمار سامانی عہد کے شاعروں میں ہے، سنہ ۳۳۶ھ میں اُس نے ایک کتاب لکھی تھی، عوفی نے لباب الالباب (جلد دوم ص ۲۱ گب) میں اس کا ذکر کیا ہے، اور شراب کے متعلق اُس کے متعدد قطعے نقل کیے ہیں؛ اور ایک یہ رُباعی لکھی ہے،

اے گشتہ من از غم فراوان تو پست　　　شد قامت من ز درد ہجران تو شست[۲؎]
اے شستہ من از فریب و دستان تو دست　　　خود ہیچ کسے بسیرت و سان تو ہست

اسی عہد کا ایک اور حکیم شاعر عمارہ مروزی ہے جس نے سامانیہ کا آخری اور غزنویہ کا ابتدائی زمانہ پایا ہے، صاحب مجمع الفصحاء میں اس کا سال وفات سنہ ۳۶۰ھ لکھا ہے اور وصف شراب اس کا خاص موضوع ہے، عوفی نے اس کی یہ رُباعی نقل کی ہے،

آن مے بہ ست آن بت سیمین من[۳؎] نگر　　　گوئی کہ آفتاب بہ پیوست با قمر

۱؎ قفطی اور ابوالفرج ملطی میں ہے وأقام فی کنفہ مدۃ بزی اھل التصوف یعنی وہ ایک زمانہ تک سیف الدولہ کے سایۂ دولت میں اہل تصوف کے لباس میں رہا، درۃ الاخبار میں فارابی کے صوفیانہ کلمات بھی مذکور ہیں ۲؎ مجمع الفصحاء میں یہ مصرع اس طرح ہے ع شد قامت زار ہجران تو شست ۳؎ مجمع الفصحاء میں یہ لفظ "سیمینہ تن" ہے،

واں ساغرے کہ سایہ بفگند[۱] می برد   برگِ گل سپید است بگوئی باللہ[۱]

رُباعی کی بحر کے بعض قطعات بھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنوز رُباعی فن کی زنجیروں میں کسی نہیں گئی تھی، جامی نے نفحات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ سلطان سعید ابوالخیر کو عمارہ کا کوئی شعر سنایا گیا، تو وجد کا عالم طاری ہو گیا، اور اپنے مریدوں کے ساتھ وہ اُس کی قبر پر گئے،[۲]

اس زمانہ میں دیالمہ کی ایک شاخ آلِ زیار کا بادشاہ شمس المعالی قابوس بن وشمگیر دیلمی تھا، جو سنہ ۳۶۶ھ میں تخت نشیں ہوا، کمال البلاغۃ اور سیر الملوک اوس کی تصنیف ہیں، کمال البلاغۃ مصر میں چھپ گئی ہے، شمس المعالی نے بعض رُباعیاں بھی لکھی ہیں مجمع الفصحا سے یہ رُباعیاں نقل ہیں، (جلد اوّل ص ۵۳)

گل شاہ نشاط آمد و مے میر طرب   زاں زوے بدیں و می کنم عیش طلب
خواہی کہ بدیں بدانی اے ما د سبب   گل رنگ رخت دارد و می رنگ دو لب

.... ۰ ۰ ۰ ۰ ....

شش چیز وراں زلف تو دارد مسکن   پیچ و گرہ و بند و خم و تاب و شکن
شش چیز دگر از آن نصیب دلِ من   عشق و غم و درد و رنج و تیمار و حزن

غرض تصوف کا آغاز دیلمیوں کے زیر سایہ ہوا ہے، جو چوتھی پانچویں صدی میں سنہ ۳۲۰ھ سے لے کر سنہ ۴۴۸ھ یعنی سلجوقیوں کی پیدائش تک برسر عروج رہے، اس بنا پر تصوف کی حکیمانہ رباعی چوتھی صدی کے وسط میں پیدا ہو چکی تھی، نشوار المحاضرہ، جو چوتھی صدی کے اواخر کی تصنیف ہے،

---

[۱] مجمع الفصحا میں یوں ہے، جو صحیح ہے، ع وآن ساغرے کہ سایہ فگند است می رود،

[۲] مجمع الفصحا جلد اول ص ۳۵ (ایران)

اس کی شہادت سے ثابت ہے کہ اس عہد یعنی دیالمہ کے عہد میں صوفیانہ رُباعیاں مجلس سماع کو گرم کرتی تھیں، اب غزنوی دور آیا، اس کے سلاطین اور شعراء میں مختصر ہنگامی واقعات مثلاً شکریہ، معذرت، شکایت، فخر، تہنیت، عید اور دوسرے ہنگامی واقعات کی فی البدیہہ نظم میں یہ صنفِ سخن ترقی کرتی نظر آتی ہے، غزنویہ کا آغاز سنہ ۳۶۵ھ میں ہوا، اور اس کے عروج کا ستارہ سلجوقیہ کے آفتاب اقبال کی روشنی میں سنہ ۴۲۹ھ میں چھپ کر رہ گیا، غزنوی دور کے شعراء میں سے عنصری المتوفی سنہ ۴۳۱ھ کے یہاں رُباعیاں کثرت سے ہیں، مجمع الفصحا میں اس کی بیس رُباعیاں درج ہیں، مشہور کہانی کی بنا پر ایاز کی زلف کٹنے کے حُسنِ تعلیل میں اس کی رُباعی ہے،

کے عیب سر زلف بت از کاستن است | چہ جائے بغم نشستن و خاستن است
روز طرب و نشاط و مے خواستن است | کاراستن سرو بہ پیراستن است

ایک دفعہ سلطان محمود چوگان کھیلنے میں گھوڑے سے گر گیا، اس پر عنصری نے برجستہ یہ رباعی کہی،

شاہا ادبے کن فلکِ بدخو را | کاسیب رسانید رُخِ نیکو را
گر گوے خطا رفت بچوگانش زن | در اسپ خطا کرد بمن بخش اورا

سُلطان نے وہ گھوڑا اُس کو بخش دیا، اس پر شاعر نے شکریہ کی دوسری رُباعی برجستہ عرض کی،[۱]

عنصری کی رباعیات زیادہ تر انہی ہنگامی واقعات اور حسن و عشق کے مضامین کی ہیں،

---

[۱] مجمع الفصحاء، جلد اول ص ۳۶۶، ایران،

اس عہد کے مشہور ترین شاعر فردوسی کے کلام میں بھی رُباعی کی صنف پائی جاتی ہے، مشہور روایت کے مطابق عنصری، فرخی، اور عسجدی کی بزمِ انس میں فردوسی نے جب پہلے پہل قدم رکھا تھا، تو ان تینوں نے رُباعی ہی کا ایک ایک مصرعہ کہکر فردوسی کے زورِ سخن کی آزمائش کی تھی، یہ بھی کہتے ہیں کہ فردوسی نے سُلطان کے حکم سے کسی خوش رو غلام کے آغازِ خط کی تعریف میں یہ رُباعی کہی تھی،

مست است بتا چشم تو تیر بدست | بس کن کہ زتیر چشمِ مستِ تو بخست
گر پوشید عارضت زرہ عذر ش نہ | کز تیر سد ہمہ کس خاصہ بہست

غزنوی شعراء میں عسجدی المتوفی ۴۳۲ھ کی رُباعیات خاص نوعیت رکھتی ہیں، ان میں عشقِ حقیقی و مجازی کی معتدل ترکیب پائی جاتی ہے، مجمع الفصحاء میں، اس کی دس رباعیاں ہیں، جن میں سے پہلی حسبِ دستورِ زمانہ آغازِ خط کے وصف میں ہے،

برگل رقمی زمشک ناگاہ زدند | برتنگ شکر مورچگان راہ زدند
آئینہ روے دوست زنگار گرفت | از بسکہ براد سوختگان آہ زدند

در دورِ تو عقل کل کنشتی گردد | حسن ابدی شہرہ بزشتی گردد
خاکستر کشتگانت در دوزخِ عشق | پیرایۂ حورانِ بہشتی گردد

دل دوش ہزار چارہ سازی می کرد | با وعدہٴ دوست عشق بازی می کرد
تا بر کفِ پاے تو تواند مالید | دل را ہمہ شب دیدہ نمازی می کرد

۵۔ تاریخ گزیدہ مستوفی ص ۸۲۲ ۔ (گ ب)

صبح است و صبا مشک فشاں می گزرد — دریاب کہ از کوے فلاں می گزرد
برخیز چہ خسپی کہ جہاں می گزرد — بوے بستاں کہ کارواں می گزرد

در جسم پیالہ جاں روانست رواں — در روح مجسم آں روانست رواں
درآب فسردہ آتشِ پنہاں است — در درج بلور لعلِ کانست رواں

آں جسم پیالہ ہیں بجاں آبستن — ہمچوں ہستی بارغواں آبستن
نے نے غلطم پیالہ از غایتِ لطف — آبیست بآتش رواں آبستن

گرزاں کہ مرا فلک دہد مال فرہ — بکشایم ازیں کار فرو بستہ گرہ
ترکی نخرم کہ ہر کہ بپسند گوید — اے خاک توازخوں خریدار توبہ

از شرب مدام و لافِ مشرت توبہ — وز عشق بتاں سیم غبغب توبہ
در دل ہوس شراب و برلب توبہ — زیں توبہ نادرست یارب توبہ

عوفی نے لب لالباب کی پہلی جلد میں سلاطینِ غزنویہ اور امراے چغانیہ (جو غزنویہ کے زیر اثر تھے) اور امراے جرجان کی بہت سی رُباعیاں (باب اول در لطائفِ اشعار ملوک کبار) نقل کی ہیں، مگر یہ زیادہ تر ہنگامی واقعات کے ذکر و بیان میں تفریحی حیثیت رکھتی ہیں البتہ ان میں سے ایک شخص خاص ذکر کے قابل ہے اور وہ شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کا پوتا

عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن شمس المعالی قابوس امیر جرجان ہے، جو سلطان مودود بن مسعود غزنوی کا معاصر تھا، یہ ایک سخن سنج و سخن فہم امیر تھا، اوس کے اشعار تذکروں میں مذکور ہیں، مجمع الفصحا میں اس کی دس اخلاقی اور عشقیہ رُباعیاں لکھی ہیں، پہلی رباعی یہ ہے:

گر شیر شود عدو چو پیدا چہ نہفت | با شیر بہ شمشیر سخن باید گفت
کاں را کہ بگور خفت باید بے جفت | با جفت بجان خویش نتواند خفت

اس عہد کا رُباعی گو حکیم ابو علی سینا المتوفی سنہ ۴۲۳ھ ہے، اس نے متعدد حکیمانہ رباعیاں کہیں، جو تذکروں اور سفینوں میں مذکور ہیں، اُن میں سے بعض خیام کے نام سے بھی ملتی ہیں، ڈاکٹر ایتھے نے ۱۸۷۵ء میں ابن سینا کی بارہ رُباعیوں کو جمع کر کے چھپوایا ہے، مجمع الفصحا میں اُس کی یہ پانچ رُباعیاں ہیں،

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار شتافت | یک موئے ندانست ولے موے شگافت
اندر دل من ہزار خورشید بتافت | (۱) آخر بکمال ذرۂ راہ نیافت

بااین دو سہ ناداں کہ چنیں می دانند | از حمق کہ دانائے جہاں آنانند
خر باش کہ ایں جماعت از فرط خری | (۲) ہر کو نہ خراست کافرش می خوانند

کفر چو منی گزاف و آساں نبود | محکم تر ازیں ایمانِ من ایماں نبود
در دہر چو من یکے و آں ہم کافر | (۳) پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

از قعرِ گل سیاہ تا اوج زحل | کردم ہمہ مشکلاتِ گیتی را حل
بیروں جستم ز قید ہر مکر و حیل | (۴) ہر بند کشادہ شد مگر بند اجل

اے کاش بدانمی کہ من کیستمی   سرگشتہ بعالم از پے چیستمی
گر مقبلیم آسودہ و خوش زیستمی (۵)   ورنہ بہزار دیدہ بگریستمی

مجموعۂ منتخبات دار المصنفین میں ایک دو رُباعیاں اور بھی ہیں، مگر وہ بھی خیام اور محقق طوسی کے منسوبات میں ہیں، اوپر کی پانچ رُباعیوں میں دوسری، تیسری، چوتھی، خیام کے مجموعہ میں بھی ملتی ہیں،

غزنوی دور میں سلطان محمود کے زمانہ میں مشہور صوفی شاعر شیخ ابو الحسن خرقانی المتوفی سنہ ۴۲۵ھ کا ظہور ہوا، یہ پہلی مقدس ہستی ہے، جس نے رُباعیات کے پردے میں عشق حقیقی کے مضامین ظاہر کئے، ہمارے مجموعۂ منتخبات، مجمع الفصحاء، اور آتشکدہ میں اُن کی متعدد رُباعیاں ہیں، ہمارے مجموعہ میں یہ رُباعیاں شیخ کے نام سے ہیں،

تا گبر نشی با تو بتے یار نبو   در گبر شی از بہر بتے عار نبو
آن را کہ میاں بستہ بزنار نبو (۱)   آن را بمیان عاشقاں کار نبو

روزم بملال بے تو بگذشت گذشت   شب ہم بخیال بے تو بگذشت و گذشت
یک چشم زدن بے تو نہ بودم ہرگز (۲)   اکنوں مہ و سال بے تو بگذشت گذشت

سودائے سر بے سر و ساماں یک سو   اندیشۂ خاطر پریشاں یک سو
بے مہری چرخ و جور ناداں یک سو (۳)   اینہا ہمہ یک سو غم جاناں یک سو

اے بندہ بیا طرح فغاں اندازیم   افسانۂ عشق در میاں اندازیم
تا از دل ما خبر رسانند بیار (۴)   دل بر سر راہ کارواں اندازیم

مجمع الفصحا میں دو رُباعیاں اور ہیں،۔

آں دوست کہ دیدنش بیاراید چشم — بے دیدنش از گریہ نیاساید چشم
مارا ز برائے دیدنش باید چشم — (۵) گر دوست نہ بیند بچہ کار آید چشم

والہ داغستانی نے صرف پہلی رُباعی نقل کی ہے، اور اُس کی زبان کی بنا پر یہ لکھا ہے،

"در رُباعیات دیگر ایشاں نیز ہمیں سیاقت آمیختہ بزبان پہلوی است"

(در ترجمۂ ابوالحسن خرقانی)

اسرار ازل رانہ تو دانی و نہ من — ویں حرفِ معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوی من و تو — (۶) گر پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

ایک اور رُباعی اُن کی طرف منسوب ملتی ہے،

گویند مرا کہ می پرستم ہستم — گویند مرا فاسق و مستم ہستم
در ظاہرِ من نگاہ بسیار مکن — (۷) کاندر باطن چنانکہ ہستم ہستم

چھٹی رُباعی خیام کے اکثر نسخوں میں موجود ہے، اور ساتویں بھی دلینہ اور کادیانی کے نسخوں کے رو سے خیام کی ملکیت میں داخل ہے، اور پہلی رُباعی کی زبان بقیہ رُباعیوں سے الگ ہے، جو قابلِ لحاظ ہے،

نفحات الانس جامی کے تفحص سے معلوم ہوتا ہے، کہ شیخ ابوالحسن خرقانی سے پہلے شعر پسند صوفیہ اس ساز کو عربی میں چھیڑتے تھے کر اُن سے پہلے فارسی کا کوئی ترانہ خواں صوفی نظر نہیں آتا، الّا یہ کہ بایزید بسطامی کی طرف چند مشکوک رُباعیاں منسوب ہیں،

اسی زمانہ میں شیخ کا معاصر بابا طاہر ہمدانی المتوفی سنہ ۴۱۰ھ (یا بقول براؤن بقیاس روایت راحۃ الصدور قریب سنہ ۴۵۰ھ) ہے، یہ نصیری فرقہ کا درویش تھا، رے کی دہقانی بولی

میں یہ رُباعیاں کہا کرتا تھا، اُس کی رُباعیوں کا مجموعہ موجود ہے، اور چھپ بھی گیا ہے یہ پہلا مستقل مجموعہ رُباعیات کا ہے، جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے،

اُس کی دو رُباعیاں یہ ہیں، :-

نصیحت می کرم سودش نمی بو — ولے دارم کہ بہبودش نمی بو

بر آذر می نہم دودش نمی بو — بباد ش می دہم بیسرہ باد

......

مرا خوشتر ز بوے سنبل آید — نسیمے کز بنِ آں کاکل آید

سحر از بسترِ بوے گل آید — چو شو ر گرم خیالت را در آغوش

اس کے بعد سُلطان ابوسعید ابوالخیر صوفی المتوفی سنہ ۴۴۰ھ آتے ہیں، جن کی رُباعیاں عشقِ حقیقی کی تیز و تند شراب سے بھر رہی ہیں، اُن کی رُباعیوں کے بھی کئی اڈیشن مشرق و مغرب میں شائع ہو چکے ہیں،

اس سلسلہ میں ایک اور قابلِ ذکر ہستی بابا افضل الدّین افضل کاشانی (یا کاشی) کی ہے یہ ایک فاضل و حکیم صوفی تھے آذر آزاد بلگرامی، اور ہدایت طہرانی کی تصریح کے مطابق اُن کی متعدد تالیفات یادگار ہیں، کہتے ہیں کہ خواجہ نصیرالدین نے اُن کی مدح میں وہ شعر کہا ہے جس کی بنا "افضل افضل" کی تلمیح پر ہے، بابا کی اس شہرت کے باوجود کس قدر افسوس کی بات ہے، کہ ان کا زمانہ صحیح طور سے متعین نہیں، آزاد بلگرامی نے یدِ بیضا میں لکھا ہے، کہ یہ سلطان محمود غزنوی کے معاصر تھے، اور سُلطان اُن کو ایران سے اپنے ساتھ لایا تھا، اور وہ مدّت تک غزنین میں مقیم رہ کر، پھر اپنے وطن مالوف کو واپس گئے، آذر نے آتشکدہ میں لکھا ہے، کہ یہ خواجہ نصیر طوسی اور ہلاکو کے معاصر تھے، اور خواجہ نے تاتاریوں کے

برپا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت ہو،" اس سوال کو ایک عربی میں نظم کرکے بابا کے پاس بھیجا تھا، اور بابا نے اوس کا جواب دیا تھا، مگر خواجہ کی جس رُباعی کا حوالہ دیا گیا؟ وہ خیام کے مملوکات میں ہے، ہدایت نے مجمع الفصحار میں نہ صرف یہی لکھا ہے کہ یہ خواجہ نصیر کے معاصر تھے، بلکہ یہ بھی افواہ نقل کی ہے، کہ وہ خواجہ نصیر کے خالو تھے، اور دالہ داغستانی نے نقل کیا ہے، کہ خواجہ نصیر، بابا کے ہمشیرزادہ تھے،

بہرحال ان دو مختلف تصریحوں کے مطابق ان دونوں زمانوں میں دوسو برس سے زیادہ کا فصل ہوجاتا ہے، اگر وہ بقول آزاد سلطان محمود کے معاصر تھے، تو چوتھی صدی کے اواخر اور پانچویں صدی کے اوائل میں تھے، اور اگر بقول آذر و ہدایت خواجہ نصیر طوسی کے معاصر تھے، تو ساتویں صدی ہجری کے اواسط میں ان کو ماننا پڑے گا،

آزاد کی تائید میں امین رازی کی ہفت اقلیم سے ہوتی ہے، امین رازی نے عوفی[1] کے حوالہ سے نہ صرف سلطان محمود کی معاصرت لکھی ہے، بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ ایاز بابا کا شاگرد تھا، اور اسی لئے سلطان محمود جس نے بابا کو نظربند کر دیا تھا، بابا نے اُس کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھ کر ایاز کی وساطت سے سلطان کی خدمت میں گذرانا، اور قید سے رہائی پائی، معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ نصیر نے بابا کی نسبت جو کلمات کہے، اُن کی بنا پر بابا کو خواجہ کا معاصر بنایا گیا ہے،

بابا کی رُباعیات کا انتخاب سب سے زیادہ والہ داغستانی نے کیا ہے، چنانچہ پانچ صفحوں میں اُن کی رُباعیاں نقل کی ہیں،

---

[1] عوفی کی لُب الالباب میں جو شعراء کا تذکرہ ہے، مجھے یہ بیان نہیں ملا، شاید اس کی کسی اور تصنیف میں یہ ذکر ہو،

ان کے کلام میں بھی خیام کے رُباعیات کا اقتباس موجود ہے۔

۴۲۹ھ میں نیشاپور کے مطلع سے سلجوقی دور کا آفتاب طلوع ہوتا ہے، سلجوقیوں کا زمانہ اس صنفِ سخن کے اوجِ شباب کا زمانہ ہے، اس عہد میں رُباعی گوئی سلاطین، وزرا، امرا، علماء، حکماء، اور عام شعراء کا دلچسپ مشغلہ ہو جاتا ہے، اسی میں سوال وجواب ہوتے ہیں، حسن وعشق کی روداد بیان کی جاتی ہے، مناظرِ قدرت کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں، اور بادہ و ساغر کی نئی نئی تشبیہوں کے مرقعے تیار کئے جاتے ہیں، اس عہد میں ہر قسم کی عشقیہ، خمریہ، حکیمانہ اور صوفیانہ رُباعیات کے دفتر کے دفتر ملتے ہیں، اس زمانہ کے مشہور رُباعی گویوں میں سلجوقی دربار کے کاتب وادیب شاعر ندیم علی بن حسن باخرزی کا نام ہے، جو تتمیتہ الدہر اور خریدۃ القصر کے ذیل دمیتہ القصر کا مصنف ہے، جو اس عہد کے عربی شعراء کا تذکرہ ہے ۴۶۷ھ میں اپنے ایک محبوب غلام یا حریف دوست کے ہاتھ سے مارا گیا[1] یہ عربی وفارسی دونوں زبانوں کا ادیب وشاعر تھا، عربی زبان کے ساتھ فارسی دیوان بھی یادگار چھوڑا، عوفی نے لباب الالباب میں اس کے تذکرہ میں (جلد اول ص ۰۷) لکھا ہے، کہ اس نے اپنے فارسی رُباعیات کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا، جس کا نام طرب نامہ رکھا تھا، اور جو حروف معجم کی ترتیب پر مرتب ہے، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سمرقند میں بخارا میں دیکھا تھا۔"

---

[1] عوفی میں اس کا سالِ وفات ۴۶۶ھ لکھا ہے، مگر ابن خلکان میں ۴۶۷ھ ہے، عوفی نے اس کی کنیت ابوالقاسم بتائی ہے، اور ابن خلکان میں ابوالحسن ہے، میرے خیال میں عوفی کا یہ بیان صحیح ہے، کہ خود باخرزی نے اپنی کتاب کے آخر میں اپنے معاصرین کی جو تقریظیں شامل کی ہیں، اُن میں سے ایک میں اُس کو ابوالقاسم کہہ کر خطاب کیا گیا ہے،

(دمیتہ القصر ص ۳۱۲ حلب،)

(باقی صفحہ آئندہ پر)

باخرزی ایک بادہ پرست، سرخوش، امیروں اور بادشاہوں کی مجلس انس کا ندیم و مصاحب تھا، اور خود اپنی کتاب میں اوس نے اپنے جرم کا ہلکا سا اعتراف کیا ہے، بہر حال اسی کا اثر تھا، کہ اُس کی رباعیاں بھی تمامتر مست و سرخوش اور صرف عیش وطرب کی محفلوں کے موزوں ترانے ہیں، عوفی نے اس کی وہ چند رُباعیاں نقل کی ہیں، جو طرب نامہ کے مطالعہ کے بعد اس کی زبانی یاد رہ گئی تھیں،[۱]

(۱)
پیرامنِ روز تیرگوں شب دارد | زہر دو شکر سی دو کوکب دارد
بر سُرخ گل از غالیہ عقرب دارد | واز نوش دو تریاک مجرب دارد

(۲)
برگردنِ خویش بستہ، عقد گہر | واز گوش بیاویختہ حلقۂ زر
گوئی غم عشق جلوہ کردلے دلبر | زاشک و رُخ من بگردن و گوش تو در

(۳)
زاں می خواہم کہ خرمی را سبب است | نامش می زکیمیاے شادی لقب است
سُرخ است چو عناب و آب عنب است | آبے کہ بہ رُخ بر آتش آرد عجب است

(۴)
خصم تو اگر باز ندارد نہ تو چنگ | صد گونہ براے تو بر آمیزم رنگ
بنشینم اگر کار بامست وبہ ننگ | بر آتش چو کباب بر تیغ چو زنگ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۰) سیف الدین باخرزی دوسرے ہیں جو صوفی شاعر تھے، اور نجم الدین کبریٰ کے مرید تھے ۶۵۸ھ میں وفات پائی،

[۱] لب لالباب عوفی جلد ۱ صفحہ ۵۲

اے غالیہ شوریدہ بما شورۂ[1] سیم
وز غالیۂ تو سیم را رنگِ وسیم

بر رغم را نہادی اے در یتیم
دہ تاج سیہ بر سرِ ماہی شیم

.........×.........

تیسری رُباعی خیام کے بعض مجموعوں میں بھی داخل ہے، باخرزی کا ایک دوست اور عزیز و ہمدم و ہم پیالہ محمد بن ابی نصر ہے، باخرزی نے اس کی نسبت اپنے تذکرہ میں لکھا ہے، "ولہ رباعیات بالفارسیۃ واختراعات فیہا وقیقہ" فارسی کی رباعیاں نقل نہیں کی ہیں، مگر عربی اشعار نقل کئے ہیں، جو تمامتر سوز و ساز اور رنگ و مستی ہیں"[2]

عہدِ سلجوقی کے حکما، اور صوفیہ میں دو نام خاص کر قابل ذکر ہیں، ایک امام محمد غزالی المتوفی ۵۰۵ھ اور دوسرے اُن کے بھائی امام احمد غزالی المتوفی ۵۱۷ھ امام محمد غزالی کا ایک قطعہ اور تین رُباعیاں مجمع الفصحا، میں ہیں، رباعیاں حسب ذیل ہیں،

کس را پس پردہ قضا راہ نہ شد
وز سرِ قدر ہیچ کس آگاہ نہ شُد

(۱)

ہر کس ز سرِ قیاس چیزے گفتند
معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نہ شُد

با جامہ نمازی بسر خم کردیم
وز آبِ خرابات تیمم کردیم

(۲)

شاید کہ دریں میکدہ ہا دریابیم
آن یار کہ در صومعہ ہا گم کردیم

خاکِ درِ کس مشو کہ گردت خوانم
گر خود ہمہ آتشی کہ سردت خوانم

(۳)

تا تشنہ تری بخلق محتاج تری
سیر از ہمہ شو تا مرہ مرت خوانم

[1] مجمع الفصحا، میں شوریدہ کی جگہ سائیدہ اور شورہ کی سورہ ص ۴۴۳، [2] دمیۃ القصر ص ۲۶۵ حلب

پہلی اور دوسری رُباعیاں خیام کے بعض نسخوں میں بھی ہیں،

(دیکھو مطبوعات بمبئی)

امام احمد غزالی صوفی صافی تھے، مجمع الفصحار میں اُن کی تین صوفیانہ رُباعیاں ہیں۔ یہ تمام اشخاص خیام کے معاصرین تھے، اس قرن کے دوسرے رُباعی گو صوفیوں میں سب سے مشہور و معروف ہستی شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبداللہ انصاری ہروی المتوفی سنہ ۵۸۱ھ[1] کی ہے، یہ مذہباً حنبلی اور مشرباً صوفی تھے، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، جو زیادہ تر عجز و تقصیر، طلب مغفرت، نصیحت و موعظت اور مناجاتوں پر مشتمل ہیں، ابن رجب حنبلی نے طبقات الحنابلہ میں اُن کا مفصل ذکر کیا ہے، اور اُن کے بعض عربی اشعار بھی نقل کئے ہیں، منازل السائرین تصوف میں اُن کی مشہور کتاب ہے، فارسی میں اُن کی مناجاتیں بہت دلکش ہیں، اسی سلسلہ میں اُن کی رُباعیاں بھی ہیں، جن کا نمونہ یہ ہے، دوسری رُباعی مجموعۂ منتخبات دار المصنفین میں اور بقیہ تین مجمع الفصحار میں ہیں،

عیب است بزرگ برکشیدن خودرا　　ز جملہ خلق برگزیدن خودرا
(۲)
از مردمک دیدہ بباید آموخت　　دیدن ہمہ کس را نہ دیدن خودرا

⁂

عودم چو نبود، چوب بید آوردم　　روی سیہ و موی سپید آوردم
تو خود گفتی کہ نا امیدی کفر است　　فرمان تو بردم و امید آوردم

---

[1] ریاض الشعراء اور مجمع الفصحار وغیرہ تذکروں میں سنہ ۳۹۶ھ کی ولادت، اور سنہ ۴۸۱ھ کی وفات غلط لکھی ہے، ایک صدی کی کمی ہے، میں نے یہ تاریخ ابن رجب حنبلی کی طبقات الحنابلہ سے نقل کی ہے، جس نے اُن کے معاصرین اور تلامذہ سے اُن کے احوال نقل کئے ہیں،

شرط است کہ چوں مردرہ دردشوی   خاکی تر و ناچیز تر از گرد شوی
(۳)
ہر کوزمراد گم شود مرد شود   بفگن الف مراد تا مرد شوی

.......ـ.......

دی آدم دنیا بد از من کارے   وامروز ز من گرم نہ شد بازارے
(۴)
فردا م ہر دم بے خبر از اسرارے   نا آمدہ بہ بود ازین بسیارے

.......ـ.......

خیام اور عبداللہ انصاری کی بعض رُباعیاں بھی باہم مختلط ہیں،

اسی عہد کے ایک اور صوفی شاعر ہیں جن کا نام اس سلسلہ میں اب تک نہیں لیا گیا ہے اور وہ شیخ احمد بدیلی[1] سبزواری ہیں، جو ۵۶۲ھ میں سلطان تکش خوارزم شاہ کے عہد میں موجود تھے، مصنف جہان کشا نے ان کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے،

"چوں کار اہل سبزوار با ضطرار سید و طاد ھرے نہ بود شیخ احمد بدیلی کہ از ابدال زمانہ بود، و در علوم دینی و حقیقی یگانہ........، او را در حقائق اشعار است از غزل و رُباعیات و رسائل"

آخری فقرہ جہان کشا کے دوسرے نسخہ میں جو مطبوعہ نسخہ کے حاشیہ پر ہے، حسب ذیل ہے،

"و او را در حقائق اشعار و رباعیات و رسائل بسیار است"

اس کے بعد یہ ہے :۔

"و ایں رُباعی او راست"

اے جان اگر از غبار تن پاک شوی   تو روح مقدسی بر افلاک شوی

---

[1] مستوفی نے تاریخ گزیدہ نے مشائخ کے سلسلہ میں اُن کا ذکر کیا ہے، (ص ۷۰۰) اور ان کا

عرش است نشیمن تو شرمت بادا　　　　کاہی و مقیم خطہ خاک شوی

مگر یہ رُباعی بتغیر خیام کے نسخوں میں بھی موجود ہے،

حکما اور صوفیہ رُباعی کو کیوں اختیار کیا

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکما اور صوفیہ نے تمام اصنافِ سخن میں رُباعی کو کیوں اپنے لئے مخصوص کیا، اس کا جواب جہاں تک مجھے معلوم ہے، اب تک نہیں دیا گیا ہے، میں نے جہاں تک چھان بین کی، اس کے حسب ذیل نتائج سامنے آئے،

۱- اس وقت تک شاعری کے جو اصناف رواج پذیر تھے، وہ قصیدہ، مثنوی اور قطعہ تھے، قصیدہ میں تیس چالیس بلکہ اس سے بھی زیادہ شعر ہوتے تھے، اور وہ عموماً مدح و ہجو میں کام آتا تھا، شروع میں تشبیب ہوتی تھی جس میں حسن و عشق کی روداد یا مناظرِ قدرت بیان کئے جاتے تھے، مثنوی رزم و بزم کے مسلسل واقعات و حکایات کیلئے مخصوص تھی، قطعہ میں مختصر واقعات نظم ہوتے تھے، چنانچہ ابتدا میں فلسفہ کے خیالات قصیدوں اور مثنویوں میں بھی ادا کئے گئے، سب سے پہلے فلسفی شاعر حکیم ناصر خسرو المتوفی ۴۸۱ھ نے ہر قسم کے فلسفیانہ خیالات قصیدوں ہی میں ادا کئے ہیں، تاہم حکمت و تصوف کے اچھوتے خیالات ایک نئی صنفِ سخن کے طالب تھے، تاکہ حسن و عشق کی روداد اور مدح و ذم کی حکایات سے تصوف و حکمت کے حقائق ظاہری و باطنی ہر طرف سے علٰحدہ ہو جائیں،

۲- حکما اور صوفیہ پیشہ ور شاعر نہ تھے، اُن کے شب و روز کے مشاغل کچھ اور تھے، شاعری ان کا پیشہ نہ تھا، اس لئے اُن کے ذہنی خیالات کی تحریر و ترتیب کے لئے قصائد

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۶) نام احمد بن نہرلی سبزواری لکھا ہے، اور کوئی بات نہیں لکھی ہے،

وثمنوی کے طویل الاشعار اصناف سخن کار آمد نہیں ہوسکتے تھے، نہ اُن کے پاس تعلیم وتصنیف ومطالعہ یا ذکر وفکر عبادت سے اتنا وقت نکل سکتا تھا، کہ وہ قصیدہ یا ثمنوی تصنیف کرنے بیٹھتے، کبھی سانس لینے کے لئے وہ کچھ کہہ لیتے تھے، اور اتنی تھوڑی دیر میں چار مصرعے کہہ کر الگ ہوجاتے تھے، اور پھر اپنے مشاغل میں لگ جاتے تھے،

۳- قصیدہ اور ثمنوی میں مسلسل واقعات نظم ہوتے ہیں، اور غزل بحیثیت ایک مستقل صنفِ سخن کے اب تک پیدا نہیں ہوئی تھی، جس میں معنی کے لحاظ سے ہر شعر بجائے خود مستقل ہوتا ہے، کمال اسماعیل المتوفی سنہ ۶۳۶ھ نے اس طرز کا آغاز کیا، اور شیخ سعدی المتوفی سنہ ۶۹۱ھ نے اس کو کمال کو پہنچایا، اس لئے فلسفہ وحکمت کے مختصر متفرق خیالات کے لئے رُباعی کے سوا کوئی چیز اس وقت موجود نہ تھی،

۴- فارسی میں اسلام کے بعد موسیقی کا رواج سامانی درباروں میں شروع ہوچکا تھا، مگر یہ معلوم نہیں کہ فارسی میں گایا کیا جاتا تھا، قصیدہ اور ثمنوی گانے کی چیز نہ تھی، غزل پیدا نہیں ہوئی تھی، البتہ چھوٹی بحروں کے مختصر قصیدے جن کو متاخرین کی اصطلاح میں غزل کہہ لیجئے، گائے جاسکتے تھے، جس طرح کہ رودکی نے اپنی یہ نظم "بوے موے جولیاں آید ہمی" جن میں سات شعر ہیں، امیر نصر سامانی کے سامنے گائی تھی، مگر ایسی نظمیں کم ہوتی تھیں، میرا خیال ہے کہ غنا وموسیقی کے کام میں اس وقت اکثر یہی رُباعی آتی تھی، صوفیہ جو سماع کے شائق تھے، اُن کے لئے اسی سبب سے رُباعی موزوں تھی. غالباً یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں رُباعی کو ترانہ (راگ) کہتے تھے، محمد بن قیس رازی (موجود سنہ ۶۲۳ھ) کی معجم فی معاییر اشعار العجم کی حسب ذیل عبارت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے،

"وبحکم آں کہ نشد و نشی، وبادی وبانی آں وزن کودکے بود نیک موزوں و

دلبر وجوانے سخت تازہ وترآں را ترانہ نام نہاد وبایۂ فتنۂ بزرگ را سر بجہاں درداد وہمانا طالع ابداع ایں وزن برج میزان بودہ است ..... کہ خاص و عام مفتون ایں نوع شدہ اند و عالم و عامی مشغوف ایں شعر گشتہ، زاہد و فاسق را دراں نصیب و صالح و طالح را بداں رغبت کژ طبعانے کہ نظم از نثر نشناسند و از وزن و ضرب خبر ندانند بہانہ ترانہ در رقص آیند، مردہ دلانے کہ میان لحن موسیقار ونہیق حمار فرق نہ کنند واز لذت بانگ چنگ بہزار فرسنگ دور باشند بر دوبیتی جاں بدہند، بسا دختر خانہ کہ بر ہوس ترانہ در و دیوار خانۂ عصمت خود درہم شکست، بسا ستی (خاتون) کہ بر عشق دوبیتی تار و پود پیراہن عفتِ خویش برہم گسست وبتحقیق، ہیچ وزن از اوزان مُبتدع و اشعار مخترع کہ بعد از خلیل احداث کردہ اند، بدل نزدیک تر و در طبع آویزندہ تر ازیں نیست وبحکم آن کہ اربابِ صناعتِ موسیقی بریں وزن الحان لطیف ساختہ اند، وطرق لطیف تالیف کردہ وعادت چناں رفتہ است کہ ہرچہ از آں جنس بر ابیاتِ تازی باشد آن را قول خوانند وہرچہ بر مقطعات پارسی باشد آن را غزل خوانند، اہلِ دانش ملحونات ایں وزن را ترانہ نام کردند"

(ص ۸۹ و ۹۰)

۶۰۵ھ میں سلطان تکش خوارزم شاہ کے دربار میں مصنف جہاں کشا کے پردادا نے سلطان کی مدح میں ایک رُباعی پڑھی، کہتا ہے :-

"جد پدرم ایں رُباعی بداہتہ گفت"

لطفت شرفِ گوہر مکنوں ببرد ۔۔۔ جودِ کفِ تو رونق جیحوں ببرد

حکم تو بیک لحظہ اگر رائے کُنی ۔۔۔ سوداے محال از سرِ گردوں ببرد

سلطان بریں ترانہ تا شبانہ شراب[۱] نوشید"

یہ دربارِ سلطانی کی مثالیں ہیں، صوفیوں کی خانقاہوں میں رُباعی کا نغمہ اس سے بھی زیادہ پہلے سنائی دیتا ہے۔ نشوار المحاضرہ واخبار المذاکرہ جو قاضی ابو علی محسن تنوخی المتوفی ۳۸۴ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں ایک واقعہ کے ضمن میں ہے،

حضرنی ابو احمد عبد اللّٰہ	ابو احمد عبد اللہ بن عمر حارثی میرے
بن عمر الحارثی وعندی	پاس آئے، اور اس وقت ایک
صوفی یترنم بشیئ من	صوفی میرے پاس بیٹھا تھا جو کچھ باعیاں
الرباعیات[۲]،	گا رہا تھا،

یہ واقعہ ظاہر ہے کہ مصنف کے سالِ وفات ۳۸۴ھ سے پہلے کا ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ خیام بلکہ سلطان ابو سعید ابو الخیر سے بھی پہلے صوفی اور رُباعی میں مناسبت پیدا ہوگئی تھی، اور صوفیوں کی مجلس میں یہ سماع و ترنم کے کام میں آتی تھی، محمد بن علی راوندی جس نے اپنی تاریخ سلجوقیہ راحۃ الصدور ۵۹۹ھ میں لکھی ہے، امام غزالی المتوفی ۵۰۵ھ کی مجلس سماع کا ایک واقعہ ان لفظوں میں لکھا ہے،

"وقتے در سماع کہ فتوح روح وآسائش عاشقاں مجروح بود، صوفیاں را صفائے دروں ظاہر شدہ و عارفاں را حالت آمدہ مطربے بلحنے خوش وآوازے دلکش بر نوائے نے بر ادائے نائے ایں ترانہ بساختہ بود وایں

---

[۱] تاریخ جہاں کشا علاء الدین عطا ملک جوینی ص ۲۸ گب [۲] نشوار المحاضرہ قاضی تنوخی ج ۱، مطبوعہ مطبعہ امین ہندیہ مصر، مارگولیتھ،

بیت در انداختہ"

دارم سخناں تازہ وزرِ کہن   آخر بکف آرمت بزر یا بسخن

امام غزالی حاضر بود از سر وجدے گفت زر اچہ محل[1] سخن سخن،

کتاب مذکور میں رباعی کا دوسرا شعر مذکور نہیں،

خود خیام کی رباعیات خیام کے بعد چھٹی صدی میں صوفیوں کے حال وقال کی مجلسوں میں پڑھی جاتی تھیں، اخبار الحکماء قفطی میں ہے[2]،

وقد وقف متاخر الصوفیۃ	اور پچھلے صوفیوں نے اس کے اشعار
علیٰ شیءٍ من ظواھر شعرہٖ	کے کسی قدر ظاہری مطالب پر
فنقلوھا الیٰ طریقتھم و	اطلاع پائی، تو اُن کو اپنے مشرب
تحاضروا بھا فی مجالساتھم	میں ڈھال لیا، اور اپنی مجلسوں
وخلواتھم،	اور خلوتوں میں ان کو پڑھ کر ایک
	دوسرے کو سُنایا،

۵۔ رُباعی کے وزن کو موسیقی کی لَے سے کوئی خاص مناسبت نہ تھی، اس کا ایک اور ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ رُباعی کا پہلا موجد شاعر رودکی، اور پہلا رباعی گو حکیم ابو نصر فارابی دونوں موسیقی کے مشہور استاد تھے، رودکی وہی ہے جس نے

بوے جوے مولیاں آید ہمی

---

[1] راحۃ الصدور راوندی (ص ۶۴ گب)   [2] اخبار العلماء باخبار الحکماء جمال الدین قفطی تذکرہ خیام،

گا کر امیر سامانی کو بے اختیار بخارا کے سفر پر آمادہ کر دیا تھا[1]، اور فارابی وہ ہے جو ایک دفعہ اپنے نغمہ و سازسے مشہور دیلمی وزیر صاحب ابن عباد کی محفل کو مست خواب بنا کر چلا گیا تھا[2] اور جس نے ایک موقع پر سیف الدولہ حمدانی کے دربار کو محوِ حیرت بنا دیا تھا[3]، ابھی حال میں پیرس سے فارابی کی موسیقی کبیر چھپ کر شائع ہوئی ہے،

---

[1] تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی احوال رودکی، [2] درۃ الاخبار ذکر ابو نصر فارابی،
[3] ابن خلکان تذکرۂ ابو نصر فارابی،

(معارف اپریل ۱۹۳۲ء)

محمّد بن عمر الواقدی

اور

سیرت میں علمائے مستشرقین کی ایک نئی غلطی

سیرت کے مشہور راویوں میں سے ایک محمد بن عمر واقدی ہے، ۱۳۰ھ میں پیدا ہوا، اور ۲۰۷ھ میں وفات پائی، مدینہ منورہ میں پیدائش ہوئی، اور بغداد میں سکونت اختیار کی، اور قضا کا منصب حاصل کیا، ابتدائی مصنفین سیرت میں اُس کا شمار ہے، سیرت میں اُس کی ایک کتاب ہے، جس کا نام کتاب المغازی ہے، جس میں عہد نبوت کی لڑائیوں کا حال لکھا ہے، اگلے مصنفین کا یہ حال تھا کہ چونکہ وہ ہر واقعہ کو اور واقعہ کے ایک ایک جزو کو الگ الگ سلسلہ سے بیان کرتے تھے، اس لئے واقعہ کا تسلسل بیچ بیچ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، جس سے عام لوگوں کی دلچسپی کم ہوجاتی تھی، واقدی نے یہ طرز اختیار کیا کہ پورے واقعہ یا پورے غزوہ کے سارے راویوں کا نام شروع میں گنا دیا، اور ایک دلچسپ مسلسل داستان کی صورت میں پورے واقعہ یا پورے غزوہ کو بیان کردیا، اس طرز سے عام لوگ جو روایتوں کے پرپیچ عالمانہ سلسلوں میں پھنس کر اپنا لطفِ مطالعہ

نہیں کھونا چاہتے تھے، انھوں نے اسکی کتاب کو بیحد پسند کیا، اور خلفاے عباسیہ اور دیگر امرائے برامکہ کی نگاہ میں اُس نے بڑا رتبہ پیدا کیا، لیکن جس قدر امراء وسلاطین کے یہاں اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا، اسی قدر علماے زمانہ، ائمہ حدیث اور معتبر بزرگون کی مسند اعتبار سے اس کو دوری حاصل ہوتی گئی،

اس بات پر مخالف و موافق رائیں شہادتیں متفق ہیں کہ اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، اور اسی قوتِ حافظہ کی بنا پر اس کو خاص امتیاز ہے، چنانچہ اس کے کاتب محمد بن سعد نے طبقات (۵ – ۳۱۴) میں لکھا ہے،

وكان عالمًا بالمغازي و السيرة والفتوح وباختلاف الناس في الحديث والاحكام واجتماعهم على ما اجتمعوا عليه،	وہ مغازی، سیرۃ، فتوحات اور حدیث و احکام میں لوگوں کے اختلافات، اور جن امور پر اُن کا اجماع ہے، اُن کا عالم تھا،

مجاہد بن موسیٰ کا قول ہے کہ میں نے واقدی سے زیادہ قوتِ حفظ رکھنے والا نہیں دیکھا، حافظ ذہبی میزان میں اس قول کو لکھ کر کہتے ہیں،

قُلت وصدق كان الى حفظه المنتهى في الاخبار والسير والمغازي والحوادث وايام الناس والفقه وغير ذلك،	میں کہتا ہوں یہ بات سچ ہے کہ واقدی کا حافظہ تاریخ، سیر، غزوات، وقائع اور لوگوں کے حالات، اور فقہ میں انتہا کو پہونچا ہوا ہے،

مُصعب زبیری کہتے ہیں :-

واللہ ما رأینا مثل الواقدی قط

بخدا ہم نے واقدی کا مثل نہیں دیکھا،

خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں کہتے ہیں :-

هو ممن طبق الارض شرقها وغربها ذکره ولم یخف علی احد عرف اخبار الناس امره وسارت الرکبان بکتبه فی فنون العلم من المغازی والسیر و الطبقات واخبار النبی صلعم والاحداث الکائنة فی وقته وبعد وفاته۔

یہ اُن لوگوں میں سے ہے جس کی شہرت نے زمین کے مشرق و مغرب کو گھیر لیا ہے، اور جو شخص کہ تاریخ سے واقف ہے، اس سے اس کا حال چھپا نہیں ہے، مغازی اسیر اور طبقات، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، اور جو واقعات آپ کے زمانہ میں ہوئے، اور آپ کی وفات کے بعد ہوئے ان چیزوں میں اُس کی کتابوں کو لوگ ہر جگہ لئے پھرتے ہیں،

یہ واقدی کے علم وحفظ کے وہ واقعات ہیں، جن پر سب کا اتفاق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ واقدی وثوق، اعتبار، اور سند کے لحاظ سے کس رُتبہ کا آدمی ہے بعض لوگوں نے اُس کے موافق بھی شہادت دی ہے، مگر فن کے ناقدوں اور رجال کے واقف کاروں

کا بڑا حصہ جس میں امام شافعی، امام ابن حنبل، امام بخاری وغیرہ داخل ہیں، اس کو بے اعتبار جھوٹا، اور دروغ گو کہتا ہے، اور اسی لئے اس کی روایتوں کو محدثوں نے حدیث اور احکام کی کتابوں میں جگہ نہیں دی ہے اور نیز علماء کے نزدیک اس کی کتاب المغازی کو وہ حیثیت نہیں حاصل ہوئی جو محمد بن اسحاق کی سیرت کو حاصل ہوئی، بہرحال واقدی کی کتاب المغازی ایک نادر و کمیاب کتاب تھی، اور ہم علمائے مستشرقین کے ممنون ہیں، کہ انھوں نے اس کتاب کو چھاپ کر نفع عام کیا،

۱۸۵۳ء کے پس و پیش عہد میں جرمن عالم ڈاکٹر اسپرنگر کے بدولت ہندستان میں عربی کتابوں کی اشاعت کا نادر موقع بہم پہونچا، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس باب میں خاص اہمیت حاصل کی، صحابہ کے حالات میں حافظ ابن حجر کی تصنیف الاصابہ فی تمیز الصحابہ کی اشاعت سے ڈاکٹر اسپرنگر اور ایشیاٹک سوسائٹی کو خاص شہرت حاصل ہوئی، اسی کے ساتھ ڈاکٹر اسپرنگر پہلے یورپین عالم ہیں، جنھوں نے عربی ماخذوں سے "دی لائف آف محمد" ترتیب دی اور اس لئے اس نے یورپ کے علمی حلقوں میں ایک جگہ پیدا کر لی،

اے وان کریمر (A. von Kremer) جو مشہور یورپین مستشرق ہیں، اور سرکاری تعلق یعنی آسٹریا کے وکیل مطلق کنسولیٹ جنرل کی حیثیت سے اسکندریہ (مصر) میں مقیم تھے، انھوں نے واقدی کی کتاب المغازی کا واحد نایاب نسخہ دمشق کے ایک کتب خانہ میں پایا، جون ۱۸۵۳ء میں ڈاکٹر اسپرنگر نے اسکندریہ میں الفرڈ وان کریمر صاحب سے ملاقات کی، اور ان کی کتاب المغازی واقدی کا نسخہ دیکھا، اور ان کو آمادہ کیا، کہ بلیوتھیکا انڈیکا کے سلسلہ میں وہ اس کو مرتب

(اڈٹ) کرین، اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں چھپوائیں، فروری ۱۸۵۶ء میں جب وہ ہندوستان آئے، تو یہ کتاب چھپ چکی ہے، یعنی ۱۸۵۵ء میں چھپ چکی تھی، بہرحال ابن ہشام کے بعد سیرت نبوی میں یہ دوسرا ابتدائی ماخذ تھا، جو یورپ کے ہاتھ آیا، اس لئے اس کے ساتھ خاص اہتمام برتا گیا، ولہاؤسن نے ۱۸۸۲ء میں "محمد مدینہ میں" کے عنوان سے جرمنی میں اس کا ترجمہ شائع کیا، جو بڑی حد تک یورپ کے مستشرقوں میں سند اور ماخذ قرار پایا، چنانچہ ۱۹۰۵ء میں پروفیسر مارگیولیوتھ نے انگریزی میں "محمد اور ترقی اسلام" کے نام سے سیرۃ میں جو فاضلانہ کتاب تصنیف کی ہے، اور جس میں پہلی دفعہ ایک مستشرق نے سیرۃ میں احادیث کو ماخذ قرار دیا ہے، اس لئے وہ خاص اعتنار کی مستحق ہے، اس میں بھی وہ ولہاؤسن سے مستغنی نہ ہو سکے، اور کتاب المغازی کے اصل عربی نسخہ کے بجائے ولہاؤسن ہی کے ترجمہ کو انھوں نے قابل قبول سمجھا،

اتنی تمہید کے بعد اب اصل مقصد سنیے، ابھی حال میں مانچسٹر گارجین اخبار (انگلستان) میں ایک مضمون نکلا ہے، جس میں مضمون نگار نے ایسے فقرے لکھے ہیں جن سے حضور انور صلعم کی شان میں گستاخی ہوتی ہے، منجملہ ان کے ایک فقرہ یہ ہے، کہ "آپ ایسے بزدل اور ڈرپوک تھے کہ بدر میں جب خون بہتے دیکھا، تو آپ کو غش آگیا" ایک مسلمان نے مضمون نگار سے اس واقعہ کا حوالہ دریافت کیا، تو اُس نے مارگیولیوتھ کی کتاب کا حوالہ دیا، مارگیولیوتھ نے اس واقعہ کو اپنی کتاب (ص ۲۵۹) میں بے حوالہ نقل کیا ہے، اس لئے مارگیولیوتھ صاحب سے اس کا ماخذ دریافت کیا گیا، تو انھوں نے واقدی کے جرمن ترجمہ ولہاؤسن کا حوالہ دیا، اس

واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی، جناب خواجہ کمال الدین صاحب نے پچھلی ڈاک سے یہ پوری خط و کتابت میرے پاس بھیج دی ہے، اس کو پڑھ کر یورپین مستشرقین کے علمی تبحر اور فضل و کمال کی ایک اور عمدہ مثال ہاتھ آ گئی، پروفیسر مارگیولیوتھ اپنے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں،

مورخہ ۴ نومبر ۱۹۲۵ء آکسفورڈ

"جناب من! میرا خیال ہے کہ مضمون نگار نے "محمد اور ترقی اسلام" کے حسب ذیل فقرہ کا حوالہ دیا ہے، (ص ۲۵۹) "جب خون کا پہلا قطرہ بہایا گیا، تو پیغمبر اپنے جھونپڑے میں واپس آئے، اور نڈھال ہو کر غش کھا گئے؛ Fainted یہ بعینہٖ واقدی کے الفاظ ہیں، برٹش میوزیم ۱۶۱۷ء جس کا ترجمہ ولہاوسن نے "محمد مدینہ میں" کے عنوان سے برلن میں ۱۸۸۲ء میں کیا ہے، (ص ۵۴) کہ "جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، تو محمد نڈھال ہو کر غش کھا گئے (Fainted) واقدی آگے کہتا ہے "محمد بہر حال بہت جلد ہوش میں آ گئے؛" روایت کی دوسری شکل یہ ہے کہ (ص ۵۰) کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو محمد نے دعا کی، ابوبکرؓ نے تسلی دی"، صحیح مسلم مطبوعہ قاہرہ ۱۲۹۰ء جلد ۲ ص ۵۵۱، اور واقدی ص ۵۵ سے ظاہر ہے کہ یہ دعا اس بے ہوشی کے دورہ سے افاقہ کے بعد مانگی گئی تھی، میں نے واقدی کے اس فقرے کو کہ "جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، اس طرح ادا کرنے میں کہ "جب خون کا پہلا قطرہ گرایا گیا، خود واقدی کا مطلب ادا کر دیا ہے،"

خواجہ صاحب نے جب پروفیسر مارگیولیوتھ کو لکھا کہ واقدی کا حوالہ بے کار ہے کہ وہ مسلمانوں میں

معتبر نہیں تو موصوف نے یاقوت حموی کی کتاب معجم الادبار کی جلد، کا جو مہوزان کی اڈیٹر شپ میں زیر طبع ہے، اس کا حوالہ دیا کہ یاقوت نے لوگوں سے اس کی توثیق نقل کی ہے، خط کی عبارت یہ ہے:-

"مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۵ء

"جناب من!

میں فرصت کے وقت اس نقطہ پر غور کروں گا، جدھر آپ نے مجھ کو متوجہ کیا ہے، اور یہ مجھ کو اس صدمہ سے بھی نجات دلانے کے لئے تھوڑا سا وقت لے گا کہ آپ واقدی ایک مسلمان مورخ کو جو بہت سے مستند اصحاب کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہے، ایک مشہور دروغ گو کہتے ہیں، وہ ائمہ اسلام جو واقدی کو اس نظر سے دیکھتے ہیں، یعنی یہ کہ وہ ہر حیثیت سے بالکل معتبر ہے، یاقوت نے معجم الادبار کی ساتویں جلد میں جو ابھی زیر طبع ہے اُن کو گنایا ہے"

سب سے پہلے ہم کو پروفیسر مارگیولیوتھ صاحب کے اس احسان کا شکریہ ادا کرنا ہے، کہ انھوں نے واقدی کی توثیق اور معتبر ہونے کے لئے یاقوت کا حوالہ دیا ہے، دنیا جانتی ہے کہ یاقوت کا شمار ناقدین حدیث اور علمائے اصول میں نہیں ہے، وہ صرف ادب وجغرافیہ و تاریخ کا آدمی ہے، اس کو اشخاص کی جرح و تعدیل سے کیا تعلق ہے؟ ہمارے پروفیسر صاحب کو واقدی کے معتبر شمار کرانے میں خاص انہماک ہے، ۱۵ سے یا ۱۶ سے میں جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے بلاوے پر ہندوستان آئے تھے، تو لکھنؤ میں گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا تھا، لیکن اس ملاقات میں بھی دانستہ یا نادانستہ

واقدی ہی کی معتبری و نامعتبری کی بحث چھڑ گئی تھی، میں نے کہا تھا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے، جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا، تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے آپ ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں، پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ "امام شافعی کی نسبت کیا کہتے ہو، کہ وہ اس سے روایت کرتے ہیں،" میں نے کہا اگر یہ درست ہے تو نفس روایت کرنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ امام نے اس کی توثیق کی ہے، درانحالیکہ کتب نقد میں یہ عبارت تصریح ہے کہ امام موصوف اس کی تصنیفات کو جھوٹ کا انبار کہا کرتے تھے،

بہر حال اب معجم الادباء کی اڈیٹری کی تقریب سے پروفیسر صاحب کو واقدی کے مداحوں کے چند نام اور ہاتھ آئے ہیں لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ واقدی کی توثیق کے کے لئے ایک ادیب وخبرانی واخباری کی تصنیف کے حوالہ کی ضرورت نہیں، واقدی کی حمایت میں جو اقوال اُن کے اندر ہوں گے، وہ ہماری نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں، آٹھویں صدی میں یاقوت نے جو کچھ جمع کیا ہے، وہ سب آٹھ صدیوں کی جرح وتعدیل کی کتابوں میں مذکور ہے، محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر واقدی کا حامی اور مداح علامہ ابن سید الناس اندلسی المتوفی ۷۳۴ھ سے زیادہ کوئی نہیں، انھوں نے ان دونوں کے متعلق جس قدر توثیق اور استناد کے اقوال تھے، سب کو اپنی کتاب عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر کے مقدمہ میں ... یکجا کر دیا ہے، اسی طرح امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اُن کے مخالف و موافق جو کچھ کہا گیا ہے، سب جمع کر دیا ہے، اس سے کچھ زیادہ یاقوت کی متوقع جلد میں نہ ہوگا،

نفس واقعہ غش کی تحقیق کے لئے بحث کی تین منزلیں ہیں، واقدی کی حیثیت اسکی

کتاب[۲] المغازی کی حیثیت اور اصل[۳] واقعہ کی صورت،

واقدی کی حیثیت واقدی کے حافظہ اور کثرت معلومات کی شہادتیں اوپر گذر چکی ہیں، امام شاذکونی نے اس کے متعلق ایک نہایت ظریفانہ نقرہ کہا ہے کہ واقدی بہر حال بہت بڑا آدمی تھا، اگر وہ جھوٹا تھا، تب بھی بہت بڑا آدمی تھا، اور اگر سچا تھا تب بھی بہت بڑا آدمی تھا، واقدی کی ذات آج نہیں بلکہ ہمیشہ سے معرض بحث میں رہی ہے، اور اس کا سلسلہ خود اس کی زندگی میں شروع ہو چکا تھا، چھوٹے سے چھوٹا کوئی ایسا بدقسمت راوی شاید ہی ملے گا، جس کی ایک آدھ نے توثیق نہ کردی ہو، اس لئے علماے اصول کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ مخالف یا موافق دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور اُن کو باہم تول کر اس کے متعلق قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں، واقدی کا بھی یہی حال ہے چنانچہ اس کے متعلق مخالف و موافق دونوں پہلو حسب ذیل ہیں،

اُس کے موافق پہلو کا روشن حصہ یہ ہے کہ اس کے علم و حافظہ کی سب نے تعریف کی ہے، یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام مالک سے قتل سا حرہ کی نسبت دریافت کیا گیا تو امام نے فرمایا کہ دیکھو واقدی کے پاس اس کے متعلق کچھ ہے؟ لوگوں نے اس سے پوچھ کر امام مالک کو اطلاع دی تو لوگ کہتے ہیں کہ امام نے اس پر قناعت کی، اسی طرح ایک دفعہ اور امام سے کسی نے دریافت کیا، کہ خیبر کی اس یہودی عورت نے جس نے آپ کے کھانے میں زہر ملایا تھا، آپ نے کیا برتاؤ کیا، امام نے فرمایا کہ مجھکو اُس کے متعلق کوئی علم نہیں، اہل علم سے دریافت کروں گا، چنانچہ جب امام نے واقدی سے ملاقات کی، تو دریافت کیا، اور حلقہ میں آکر فرمایا کہ اہل علم نے یہ جواب دیا، دراوردی ایک ناقد حدیث ہیں، اُن سے کسی نے پوچھا کہ واقدی

کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے جواب دیا تم واقدی کو مجھ سے پوچھتے ہو، تم واقدی سے مجھ کو پوچھو، یہی جواب ابو عامر عقدی اور معن بن عیسیٰ نے بھی دیا ہے،

ان اقوال کے علاوہ میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب اور عیون الاثر میں جن علماء نے جن الفاظ میں اس کی توثیق کی ہے وہ حسب ذیل ہیں،

نام	اصل قول	ترجمہ
دراوردی	الواقدی امیرالمومنین فی الحدیث،	واقدی حدیث میں مسلمانوں کا امیر ہے،
یعقوب بن شیبہ	حدثنی بعض اصحابنا انہ ثقة،	ہمارے بعض اصحاب نے کہا کہ وہ ثقہ ہے،
مصعب زبیری	ھو ثقة مامون	وہ ثقہ اور مامون ہے،
ابن نمیر	اما حدیثہ ھٰھنا فھو مستو اما حدیث اھل المدینة فھم اعلم بہ،	اس کی حدیث یہاں تو برابر ہے لیکن اہل مدینہ کی حدیث تو وہ اس سے زیادہ واقف ہیں، (یعنی اُس کے متعلق وہ فیصلہ کریں)
ابراہیم الحربی	الواقدی امین الناس فی الاسلام،	واقدی اسلام میں لوگوں کا امین ہے،

لہ تفصیل کے لئے دیکھو کتب مذکور حالات محمد بن عمر الواقدی،

نام	اصل قول	ترجمہ
محمد بن اسحاق الصغانی	لولا انّہٗ عندی ثقۃ ما حدثت بہٖ،	اگر وہ میرے نزدیک ثقہ نہ ہوتا تو میں اس سے روایت نہ کرتا،
یزید بن ہارون	الواقدی ثقۃ،	واقدی ثقہ ہے،
عباس عنبری	ھُو احب الی من عبدالرزاق	وہ مجھے عبدالرزاق سے زیادہ پسند ہے،
ابو عبید القسم بن سلام	ثقۃ	وہ ثقہ ہے،
مسیبی	ثقۃ	وہ ثقہ ہے،

یہ واقدی کے طرفداروں کی سب سے بڑی فہرست ہے، مگر یہ دیکھو کہ کیا ان میں کوئی بھی مشہور امام ہے؟ فن نقد کے اساطینِ اعلام میں سے کسی کا نام ہے؟ بے شبہہ یہ لوگ بھی قابلِ وقعت ہیں، اور اُن سے بڑی مخالف شہادتیں اگر موجود نہ ہوتیں، تو اُن کی موافق شہادتیں بڑا درجہ رکھتیں، مگر حالت یہ ہے کہ خود ان طرفداروں میں سے بھی جو لوگ اس کی حالت سے واقف ہو گئے، انھوں نے اُس کو چھوڑ دیا، چنانچہ ابن نمیر جنھوں نے یہ کہا ہے کہ "اس کی حدیث یہاں ٹھیک ہے" انھوں نے بھی اس کو چھوڑ دیا، (تہذیب) ابنِ سعد جو واقدی کا کاتب تھا اور جس سے اس کی حمایت کی اُمید ہو سکتی ہے، دو صفحوں میں اس نے اس کا حال لکھا ہے، مگر ایک حرف بھی اُس کی توثیق اور اعتبار و استناد کے متعلق نہیں لکھا، امام شافعی فرماتے ہیں کہ "اس کی کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں، سب سے بڑے ناقدِ فن اور امامِ حدیث امام بخاری اپنی "تاریخ صغیر" میں جو اس وقت اسمار الرجال کی سب سے پرانی دستاویز ہمارے پاس ہے، واقدی کے متعلق محدثین کا یہ طرز عمل ظاہر کرتے ہیں

ہیں، (مطبوعہ الہ آباد ص ۲۲۸)

محمد بن عمر الواقدی ابوعبداللہ	محمد بن عمر الواقدی ابوعبداللہ اسلمی
الاسلمی مدنی قاضی بغداد	مدینہ کے ہیں، بغداد کے قاضی تھے،
ترکوہ،	محدثین نے اُن کو چھوڑ دیا ہے،

امام ممدوح کتاب الضعفاء الصغیر میں فرماتے ہیں، (مطبوعہ الہ آباد ص ۳۲)

متروک الحدیث	وہ متروک الحدیث ہے،

امام نسائی المتوفی ۳۰۳ھ جن کی تصنیف حدیث کی چھ معتبر کتابوں میں سے ایک ہے، اپنی تصنیف کتاب الضعفاء والمتروکین میں کہتے ہیں،

متروک الحدیث (ص ۲۲)	وہ متروک الحدیث ہے،

امام موصوف اسی کتاب میں لکھتے ہیں :- (ص ۳۵)

والکذابون المعروفون بوضع	اور وہ جھوٹے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم
الحدیث علی رسول اللہ صلی	پر حدیث گھڑ کر بیان کرنے میں مشہور
اللہ علیہ وسلم اربعۃ ابن ابی یحیی	ہیں، چار شخص ہیں، ابن ابی یحیی
بالمدینۃ والواقدی ببغداد	مدینہ میں، واقدی بغداد میں،
ومقاتل بن سلیمان بخراسان	مقاتل بن سلیمان خراسان میں،
ومحمد بن سعید بالشام،	اور محمد بن سعید شام میں،

ان متفق علیہ اماموں کے فتوے کے بعد، واقدی کے طرفداروں کی حیثیت جس قدر رہ جاتی ہے، وہ ظاہر ہے، اب آگے چلئے، رجال کی عام کتابوں تہذیب التہذیب ابن حجر، میزان الاعتدال ذہبی وغیرہ کا جائزہ لیجئے، امام بخاری کے استاد ابن مدینی کہتے ہیں،

عندہٗ عشرون الف حدیث یعنی مالہا اصل وقال فی موضع آخر لیس ھو بموضع للروایۃ وابراھیم بن یحییٰ کذاب وھو عندی احسن حالاً من الواقدی،

واقدی کے پاس ۲۰ ہزار حدیثیں ہیں یعنی ان کی کوئی اصل نہیں ہے، دوسری جگہ وہ کہتے ہیں، کہ واقدی روایت کے کسی مرتبہ میں نہیں ہے، ابراہیم بن یحییٰ بڑا جھوٹا ہے، مگر واقدی میرے نزدیک اچھا ہے،

(تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۶، ۳۶۷)

ایک اور اُن کا قول ہے،

الہیثم ابن عدی اوثق عندی من الواقدی ولا ارضاہ فی الحدیث ولا فی الانساب ولا فی شیء،

ہثیم بن عدی میرے نزدیک واقدی سے زیادہ قابلِ اعتبار ہیں، واقدی کو حدیث میں اور نہ نسبوں کے بیان میں اور نہ کسی اور چیز میں پسند کرتا ہوں

(تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۴ و ۳۶۵)

ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۱۰)

الواقدی یضع الحدیث۔

واقدی حدیث جعلی بنایا کرتا ہے،

(میزان جلد ۳ - ص ۱۱۰)

امام شافعی فرماتے ہیں،

کان بالمدینۃ سبع رجال یضعون الاسانید احدھم

مدینہ میں سات آدمی تھے جو اسناد جعلی بنایا کرتے تھے، ان میں ایک

الواقدی، (تہذیب جلد ۹ ص۳۶۵)	واقدی ہے،

اہلِ سنت کے امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں،

الواقدی کذاب،	واقدی بڑا جھوٹا ہے،
(تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۴)	
لم یزل یدافع امرالواقدی	واقدی کی طرف سے ہمیشہ مدافعت
حتی روی عن معمر عن الزھری	کی جاتی رہی، یہاں تک کہ اس نے
وعن نبہان عن ام سلمۃ انعیاً واتٍ	معمر، زہری، نبہان، اور ام سلمہ کے
انتما نجاء بشئ لاحیلۃ فیہ	مسلسل واسطے سے روایت کی تو
(تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۳ و ۳۶۴)	اب اس کی مدافعت کا کوئی حیلہ
	باقی نہیں رہا،
ھُوَ کذاب یقلب الاحادیث	وہ بڑا جھوٹا ہے، حدیثیں الٹ پلٹ
(میزان جلد ۳ ص ۱۱۰)	ڈالتا ہے،

دیکھو فن کے اماموں نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے،

قال البخاری الواقدی متروک	بخاری نے کہا واقدی متروک
الحدیث ترکہ احمد وابن المبارک	الحدیث ہے، امام احمد، عبداللہ
وابن نمیر واسماعیل بن زکریا	ابن مبارک، ابن نمیر، اور اسماعیل
(تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۴)	ابن زکریا نے اس کو چھوڑ دیا،

علی بن مدینی بغداد آئے، تو وہاں کے شیوخ کے حلقوں میں پھرے، واقدی کے حلقہ میں چلنے کی اُن کے رفیق نے سفارش کی تو ان کو مترود پایا، بالآخر بغداد کے امام احمد

ابن حنبل کو لکھ کر استصواب کیا، امام نے یہ جواب دیا.

کیف تستحل ان تکتب حدیث رجل روی عن معمر حدیث بہتاناً (تہذیب ج ۹ ص ۳۶۴)	تم اس شخص سے حدیث لکھنا کیسے جائز سمجھتے ہو جس نے معمر سے بہتان والی حدیث روایت کی،

فن نقد کے امام یحیٰ بن معین فرماتے ہیں،

ضَعیف لَیس بشیٔ کان یقلب حدیث یونس بغیرہ عن معمر لیس بثقة، (تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۴)	ضعیف ہے، وہ کچھ نہیں، وہ یونس والی حدیث دوسرے کے نام بدل دیتا تھا، وہ ثقہ نہیں ہے،
لیس بثقة لا یکتب حدیثہ (میزان جلد ۳ ص ۱۱۰)	وہ ثقہ نہیں اس کی حدیث نہ لکھی جائے،

صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک ابو داؤد کہتے ہیں،

لا اکتب حدیثہ ولا احدث عنہ ما اشک انہ کان یفتعل الحدیث، (تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۷)	میں اس کی حدیث نہیں لکھتا، اور نہ اس سے روایت کرتا، مجھے کوئی شک نہیں ہے، کہ وہ حدیث جعل بنایا کرتا تھا،

امام ترمذی کے شیخ بندار کہتے ہیں،

ما رأیت اکذب منہ، (تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۷)	میں نے اس سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا،

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں،

هو عندی ممن یضع الحدیث — میرے نزدیک وہ اُن لوگوں میں ہے، جو حدیث وضع کیا کرتے تھے،

(تهذیب ج ۹ ص ۳۶۷)

ابو زرعہ رازی، ابو بشر دولابی اور عقیلی کہتے ہیں،

متروک الحدیث، — اس کی حدیث چھوڑ دی گئی ہے،

(تهذیب ج ۹ صفحہ ۳۶۷)

ناقد حدیث ابو حاتم رازی کہتے ہیں کہ انھوں نے اور محدثین نے کیونکر اس کا امتحان لیا،

وجدنا حدیثه عن المدینین	ہم نے مدینہ والوں سے اس کی حدیث
عن شیوخ مجهولین مناکیر	نامعلوم شیوخ سے روایت کی ہوئی
قلنا یحتمل ان تکون تلك الاحادیث	منکر پائی، ہم نے کہا کہ ممکن ہے کہ
منه ویحتمل ان تکون منهم ثم	یہ اس کی کارروائی ہے، یا اس کے
نظرنا الی حدیثه من ابی ذئب	ان نامعلوم استادوں کی ہو، پھر
ومعمر فانه یضبط حدیثهم	ہم نے غور سے اس کی حدیث کو جو
فوجدنا لا قد حدث عنهما	ابن ابی ذئب اور معمر سے تھی دیکھا
بالمناکیر فعلمنا انه منه فترکنا	کیونکہ وہ ان لوگوں کی حدیثوں
حدیثه،	میں ضبط رکھتا تھا، تو پایا کہ اس
	نے ان دونوں بزرگوں سے بھی منکر
(تهذیب جلد ۹ ص ۳۶۷)	روایتیں کی ہیں، تو ہم نے جان لیا کہ یہ
	اسی کی کارروائی ہے، تو پھر ہم نے اس کی

ابوحاتم اور نسائی کا بیان ہے،

یضع الحدیث	وہ حدیث وضع کرتا تھا،

دارقطنی :-

فیہ ضعف (میزان جلد۳ ص۱۱۰)	اس میں کمزوری ہے،

جوزجانی :-

لم یکن مقنعًا (تہذیب جلد۹ ص۳۶۸)	وہ تسلی دینے والا نہیں،

ابن عدی :-

احادیثہ غیر محفوظۃ وَ	اس کی حدیثیں غیر محفوظ ہیں، اور
البلاء منہ،	آفت اسی سے ہے،

(عیون الاثر جلد ا ص۲۰)

واقدی کے متعلق اس کے معاصرین اور اُس کے قریب العہد ناقدین کی جن میں اسلام کے ناموترین علما اور ائمہ داخل ہیں، یہ رائیں ہیں، غور کرو، کیا ایسا شخص سیرت کے اہم مباحث میں کوئی قابلِ وقعت سند بن سکتا ہے، متاخرین نے اس کی نسبت جو آخری اور اختتامی فیصلہ کیا ہے، وہ بھی سُن لیجئے،

امام نووی (صحیح مسلم کے شارح)، شرح مہذب کتاب الغسل میں لکھتے ہیں،

الواقدی ضعیف باتفاقھم	واقدی بالاتفاق ضعیف ہے،

(تھذیب ج ۹ ص ۳۶۶، ۳۶۷)

امام ذہبی میزان میں کہتے ہیں :-

استقر الاجماع علی وھنِ	واقدی کے ضعیف ہونے پر اجماع

الواقدی (میزان ج ۳ صفہ ۱۱۱) ہو چکا ہے،

علامہ زرقانی مالکی سیرت کی سب سے مشرح و مبسوط کتاب شرح مواہب میں غزوۂ بدر کے بیان میں واقدی کی نسبت لکھتے ہیں،

الحافظ المتروک مع سعة علمه، (شرح الزرقانی علی المواهب اللدنیه جلد اول ص ۴۲)	حافظ ؔ باوجود اپنی وسعت علم کے متروک،

غرض بالاتفاق متروک ہے یعنی چھوڑ دیا گیا ہے، اور اس کی روایت سے پرہیز کیا جاتا ہے اس لئے وہ استناد کے قابل نہیں، ابن سیدالناس نے عیون الاثر میں محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر الواقدی دونوں کی توثیق و جرح کے اقوال یکجا کئے ہیں، اور جرح کے جوابات دینا چاہتے ہیں، چنانچہ محمد بن اسحاق کی جرح کے جوابات بہت جوش و خروش سے دیئے ہیں، مگر محمد بن عمر الواقدی کی جرح کے جوابات نہ دے سکے، اور شرمندہ ہی میں سپر ڈال دیا کہ

اما الکلام فیه فکثیر" (عیون الاثر جلد اص ۲۰)	اس پر اعتراضات بہت زیادہ ہیں،

واقدی کی کتاب کی حیثیت خود مصنف کی حیثیت متعین ہو جانے کے بعد، اس کی تصنیف کی حیثیت بھی متعین ہو جاتی ہے، ایسے غیر معتبر، دروغگو، اور جھوٹے کی روایتوں کے مجموعہ کا کیا درجۂ استناد ہو سکتا ہے، اسی لئے امام شافعی فرماتے ہیں:-

کتب الواقدی کلها کذب (تهذیب جلد ۹ ص ۳۶۶)	واقدی کی تمام کتابیں جھوٹ ہیں،

امام دارقطنی فرماتے ہیں:-

الضعف تَبَیَّنَ علٰی حدیثہ، اس کی روایت پر ضعف نمایاں ہے،

(تہذیب ج ۹ ص ۳۶۸)

واقدی کا طرزِ تصنیف بتا چکا ہوں کہ وہ راویوں کے متعدد ناموں کو یکجا کرکے پورا واقعہ بلکہ پوری کتاب قصہ کی طرح بیان کر دیتا ہے جس سے یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ یہ خاص خاص روایتیں اُس نے کہاں سے لی ہیں، اسی لئے اس کی کتابیں غیر معتبر سمجھی جاتی ہیں، اسی کتاب المغازی کو لیجئے جو وان کریمر کے جمع و تحشیہ سے کلکتہ میں چھپی تھی، کہ اس کے شروع میں ایک ہی جگہ اپنے ۲۵ شیوخ کے نام لکھدیئے ہیں، اور کہدیا کہ "ان میں سے بعض کی باتیں بعض میں مل گئی ہیں (ص ۱ و ۲-) اور اُس کے بعد بے سند مسلسل ایک کہانی کی طرح غزوات کے تمام حالات بیان کر دیئے ہیں کہیں کہیں سند الگ بھی آتی جاتی ہے، مگر منقطع بہرحال یہ ابتدائی سندیں بھی صرف اُس کے شیوخ کی ہیں، اُن کے آگے کے راویوں کا اُس نے کوئی پتہ نہیں دیا ہے اس لئے ایسی روایتوں کے مجموعہ کی، محدثین میں کیا وقعت ہوسکتی ہے، اسی لئے واقدی کی کتاب المغازی اہلِ نقد میں کوئی درجہ نہیں رکھتی، چنانچہ امام احمد ابن حنبل نے واقدی کی اس طرزِ تالیف کی بنا پر اُس کی کتاب کو غیر مسلّم ٹھہرایا ہے۔ (حاشیہ...) ابراہیم حربی واقدی کے ایک طرفدار نے یہ کہا ہے کہ "اگر یہ واقدی کا عیب ہے تو زہری اور ابن اسحاق نے بھی یہ طرز اختیار کیا ہے[۱]" مگر یہ جواب اس لئے صحیح نہیں کہ زہری اور ابن اسحاق کی شخصیت بجائے خود بلند ہے، اس کے علاوہ انھوں نے کہیں کہیں یہ طرز اختیار کیا ہے، پوری کتاب کی یہ حالت انھوں نے نہیں بنا دی ہے، اور واقدی نے اپنی ذاتی کمزوری اور بے اعتباری کے ساتھ ساتھ عموماً یہی شیوہ اختیار کر لیا، اس سے اس کی کتاب پایۂ اعتبار سے گر گئی، اور سند کے قابل نہیں رہی، پوری کتاب میں شاذ و نادر ہی اُس کے

[۱] عیون الاثر ج ۱ ص ۲۰

یہاں پوری سند موجود ہے، اگر کہیں کہیں ہو بھی تو کسی ابتدائی عینی شاہد تک تو وہ پہنچتی ہی نہیں اور جہاں پہونچتی بھی ہے تو اُس کے رواۃ ناقابلِ اعتبار ہیں، اس لئے اس کتاب کے ایسے واقعات جو دوسری معتبر کتابوں میں موجود نہ ہوں ناقابلِ تسلیم ہیں،

واقعہ کی اصلیت | اب اتنی تمہیدوں کے بعد بدر میں آپ کے ڈر کر بے ہوش ہو جانے کی روایت پر غور کیجئے، اگر یہ واقعہ بالفرض واقدی کی کتاب المغازی میں ہو بھی تو اس کی حیثیت کا اندازہ آپ مصنف اور تصنیف کی حیثیت سے لگا چکے ہوں گے، اور آپنے سمجھ لیا ہوگا کہ ایسے جھوٹے بے اعتبار جعلی حدیث بنانے والے کی روایت کا کیا درجہ ہوگا، یہ واقعہ واقدی کی جس روایت پر مبنی ہے، واقدی نے اس کا سلسلۂ سند مطلق نہیں بیان کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ اُس سے کس نے بیان کیا، اور اُس نے کس سے سُنا، اور اُس کا آخری شریک واقعہ عینی گواہ کون ہے، غرض مطلق بے سند بات ہے، اور سیرت اور حدیث کی کسی کتاب سے اس کی تصدیق و تائید نہیں ہوتی،

بہرحال اس خاص واقعہ کی تحقیق کے سلسلہ میں جب مارگیولیتھ صاحب کی کتاب "محمد اور ترقی اسلام" (محمد اینڈ دی رائز آف اسلام) اور دلہاؤسن کی "محمد مدینہ میں" کا اقتباس بغور دیکھا، اور اس کا وان کریمر کے شائع کردہ اصل عربی متن سے مقابلہ کیا، تو معلوم ہوا کہ اس دروغ بافی میں بے چارہ واقدی کا اتنا قصور نہیں، جس قدر خود دلہاؤسن صاحب اور مارگیولیتھ صاحب کا ہے، "اول ظلم در جہاں اندک بود، ہر کہ آمد بران مزید کرد"

سب سے پہلے آپ مارگیولیتھ صاحب کی روایت پڑھئے۔

"جب خون کا پہلا قطرہ گرایا گیا تو پیغمبر اپنی جھونپڑی میں واپس آیا، اور غش کھا گیا جب وہ ہوش میں آیا تو اُس نے اپنا وقت دعا کے نذر کیا، تاکہ وہ یہ دکھائے کہ وہ

بالکل ہوشیار تھا،" (ص ۲۵۹)

مارگیولیوتھ صاحب اپنے اس اختراعِ فائقہ کا ماخذ واقدی کے جرمن ترجمہ کو بتاتے ہیں، جس کا مترجم ولہاؤسن ہے، اور جس نے اس کا نام "محمد مدینہ میں" رکھا ہے،

"جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، تو محمد کو غش آگیا، .... بہرحال وہ بہت جلد ہوش میں آگئے،"

(برلن ۱۸۸۲ء ص ۵۴)

اب آیئے اور واقدی کی کتاب المغازی کھولیں، اس میں کیا ہے، اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے،:-

"پھر عتبہ نے اپنے مقابلہ کے لئے (مسلمانوں کو) پکارا، اور رسول صلعم اپنے عریشہ میں تھے، اور آپکے صحابہ اپنی صفوں میں تھے، تو آپ لیٹ گئے، تو آپ کو نیند نے چھالیا، جو آپ پر غالب آگئی تھی، اور فرمایا تم اس وقت تک نہ لڑو، جب تک میں تم کو اجازت نہ دوں، اور اگر وہ تمھارے قریب آجائیں، تو ان کو تیر مارو، اور تلوار اُس وقت تک نہ کھینچو، جب تک وہ تم پر چھا نہ جائیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا یارسول اللہ! لوگ قریب آگئے، اور انھوں نے ہم کو پالیا، تو رسول اللہ صلعم بیدار ہوئے، اور خدا نے آپ کو کافروں کو خواب میں تھوڑا کرکے دکھایا، اور بعض کو بعض کی آنکھوں میں تھوڑا کرکے دکھایا، تو رسول اللہ بے قرار ہوئے، اور دونوں ہاتھ اپنے اٹھائے تھے، اپنے رب سے موعودہ نصرت مانگ رہے تھے"

(کتاب المغازی واقدی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۵ء (وان کریمر)

ناظرین غور کریں کہ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی، واقدی تو نیند کا ذکر کرتا ہے،

ولہاؤسن اس کا ترجمہ غشی کرتے ہیں، اور مارگیولیوتھ صاحب اس سے ڈر سے غش کھاکر گرجانا (Fainted) مطلب نکالتے ہیں کیا یورپین مستشرقانہ تحریف کی اس سے بہتر کوئی مثال ہو سکتی ہے، عربی جاننے والوں کے لئے ہم واقدی کی کتاب کی اصل عبارت نقل کردیتے ہیں،

"ثم دعتبۃ عالی المبارز تم درسول اللہ صلعم فی العریش و اصحابہ علی صفوفہم فاضطجع فغشیہ نوم غلبہ وقال لا تقاتلوا حتی اذ نکم وان اکتبوکم فارموھم ولا تسلوا السیوف حتی یغشوکم، قال ابوبکر یارسول اللہ! قد دنا القوم و قد نالوا منا فاستیقظ رسول اللہ و قد اراھم اللہ ایاھم فی منامہ قلیلاً وقلل بعضھم فی اعین بعض ففزع رسول اللہ صلعم وھو رافع یدیہ ینا شد ربہ ما وعد من النصر"

ہمارے عربی خواں طلبہ غور سے اس عبارت کا ایک ایک لفظ پڑھ جائیں، اور بتائیں کہ اس میں کون لفظ ہے جس کا ترجمہ اوکسفورڈ اور جرمنی کے پروفیسروں نے ڈر کر غش کھاکر گرجانا کیا ہے، نہ تو اس میں "خون کے پہلے قطرہ کے گرنے" کا لفظ ہے نہ اس میں اس موقع پر باہر سے اندر عریشہ میں آنے" کا لفظ ہے، نہ فوجوں کے باہم مقابل آنے کا لفظ "ہے، نہ غش کھانے کا لفظ" ہے، نہ پھر ہوش میں آنے" کا لفظ ہے، کیا مستشرقانہ تنگ نگاہی کی اس سے اور زیادہ بہتر دلیل چاہئے، کیا یہ علمائے یورپ کے ناطرفدارانہ مطالعہ مشرقیات کی سب سے اچھی مثال نہیں، اور آکسفورڈ کے عربی پروفیسر کے تبحر اور فضل و کمال اور بے تعصبی کی عمدہ نمایش نہیں،

اب میں بتاتا ہوں کہ ان فضلائے روزگار کی غلطی کا کیا منشا ہے، واقدی نے اس موقع پر غشیہ نوم علیہ (نیند آپ پر چھا گئی جو آپ پر غالب آگئی تھی) غشی کا لفظ اس میں ہے، جس کے معنی عربی میں چھا جانے کے ہیں، جیسے قرآن مجید میں ہے،

واللیل اذا یغشیٰ، قسم ہے، رات کی جب وہ چھا جائے'

اوکسفورڈ اور جرمنی کے فاضلوں نے غشی کو غشی اور بیہوشی سمجھا، حالانکہ عربی کا ایک معمولی طالب العلم بھی جانتا ہے کہ جب غشی اور بے ہوشی کے معنی اس لفظ سے ادا کرنا چاہیں گے تو باب افعال کا صیغہ مجہول استعمال کیا جائے گا، یعنی "اُغشی" پھر جب اس میں مجرّد ثلاثی کے فعل معروف کے ساتھ "غشیہ" موجود ہے، اس کے بعد اس کا فاعل لفظ نوم (نیند) موجود ہے، اس کے بعد "استیقظ" نیند سے بیدار ہونا موجود ہے، پھر خواب کا دیکھنا مذکور ہے، تو پھر اس موقع پر سو جانے کے بجائے غش کھانا ترجمہ کرنا کس درجہ نادانی اور جہالت ہے، اسی کے ساتھ سونے کے وقت جنگ کا نقشہ اور تدبیر بھی آپ بتا رہے ہیں، کیا کوئی ایسی اختیاری غشی بھی ممکن ہے جس کو تھوڑی دیر روک کر کوئی جنگ کی اہم بحث کا فیصلہ بھی کرتا جائے،

نیند کے چھانے کا محاورہ قرآن میں اسی موقع پر آیا ہے،

اذ یغشیکم النّعاس امنۃ یاد کرو جب خدا اپنے امن سے

منہ، (انفال) تم پر نیند کو چھا رہا تھا،

کیا یہاں بھی ترجمہ "بیہوش کر رہا تھا" مناسب ہوگا،

اب رہی واقدی کی اصل روایت یعنی اس وقت آنحضرت صلعم کے سونے اور بیدار ہونے اور خواب میں فوج کو کم تعداد میں دیکھنے کی روایت، تو یہ سرتا پا لغو ہے، اس

موقع کے تمام واقعات احادیث اور معتبر کتب مغازی میں مذکور ہیں، لیکن ان میں نیند، بیداری اور خواب کا مطلق ذکر نہیں ہے، بلکہ اس وقت بیداری، اور عام مصروفیت کا بیان بتصریح ہے۔ یہ مشہور و معروف واقعہ کہ جب عتبہ نے مبارزت طلب کی، تو پہلے تین انصاری جوان مقابلہ کو نکلے، عتبہ نے اُن سے لڑنے سے انکار کر دیا، اور چلّا کر کہا کہ محمدؐ یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں، ہم کو اپنے برادر عم زاد سے غرض ہے" چنانچہ آنحضرت صلعم کے ارشاد کے مطابق انصار ہٹ آئے، اور آپ نے حضرت علیؓ حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ اپنے عزیزوں کو مقابلہ میں بھیجا، کہاں یہ واقعہ اور کہاں واقدی کا یہ بیان کہ" عتبہ نے مبارزت طلب کی، آنحضرت صلعم پر اُس وقت نیند چھائی جا رہی تھی، آپ سو گئے، اور پھر خواب دیکھا، اور حضرت ابوبکرؓ کے پکارنے سے پھر اُٹھے،

ابوداؤد میں اس واقعہ کی اصلی صورت موجود ہے،

عن الساعدی قال النبیؐ صلعم یوم بدر اذا اکثبوکم فارموھم بالنبل ولا تسلوا السیوف حتی یغشاکم۔ (کتاب الجہاد باب فی سل السیوف)	ساعدی سے روایت ہے کہ آپ نے بدر کے دن فرمایا جب قریش تمھارے قریب آجائیں تو اُن کو تیر مارو، اور تلوار اس وقت تک نہ کھینچو، جب تک کہ وہ تم کو چھا نہ لیں،
عن علی قال تقدم یعنی عتبة ربیعة و تبعه ابنه واخوه	حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ وہ یعنی عتبہ آگے بڑھا، اور اُس کے

[1] اس معنی کی روایت صحیح بخاری جلد ۲ غزوۂ بدر میں بھی ہے،

فنادی من یبارز فانتدب لہ شباب من الانصار فقال من انتم فاخبروہ فقال لا حاجۃ لنا فیکم انما اردنا بنی عمنا فقال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قم یا حمزۃ قم یا علی قم یا عبیدۃ قم یا حارث،

(ابوداؤد کتاب الجہاد)

پیچھے اُس کا بھائی اور اس کا بیٹا آیا، اور عتبہ نے پکارا کہ کون مقابل آتا ہے، تو چند انصاری نوجوانوں نے اس کا جواب دیا، اس نے پوچھا تم کون ہو، انھوں نے بتایا، اُس نے کہا ہم کو تمھاری ضرورت نہیں، ہم کو اپنے چچازاد بھائی چاہئیں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، اے علی تم اٹھو، اے حمزہ تم اٹھو، اے عبیدہ تم اٹھو اے حارث تم اٹھو،

کیا یہ کسی بزدل بے ہوش کے کام ہیں، پھر خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ہاتھ میں تیر لے کر مسلمانوں کی صفوں کو درست کیا، اور اُن کو برابر کیا، کیا یہ کسی بزدل اور بیہوش کا کام ہے، بدر کے ہیرو حضرت علیؓ فرماتے ہیں، کہ ہم میں سے بہادر شخص وہ سمجھا جاتا تھا، جو لڑائی میں آپ کے برابر کھڑا ہوتا تھا، کیا یہ کسی بزدل و بیہوش کا کام ہے؟ احد میں جب اکثروں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، کون کفار کے حملوں کا نشانہ اور اپنی جگہ پر قائم تھا، ؟ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ کسی بزدل کا کام ہے حنین میں جب دس ہزار صحابہ نے تھوڑی دیر کے لئے قدم پیچھے ہٹائے، تو پہاڑ کی طرح کون اپنی جگہ پر جما رہا، ؟ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم! ایک غزوہ کی واپسی میں ایک منزل پر

دوپہر کو جب تمام صحابہ مختلف درختوں کے سایہ میں آرام کر رہے تھے، اور ایک بدوی آپ ہی کی تلوار بے نیام کرکے آگے بڑھا، اورآپ سونے سے جاگ پڑے، اور اس نے پوچھا، اے محمد! تم کو اب کون مجھ سے بچا سکتا ہے، آپ نے جواب دیا، اللہ! اس نے یہ معجزانہ سکون اور طمانیت دیکھ کر تلوار نیام میں کرلی[1]، تو یہ کارنامہ کسی بزدل کا ہے؟ یہ سچ ہے کہ آپ نے اپنا ہاتھ کسی کے خون سے رنگین نہیں کیا، مگر یہ پیغمبرانہ پاکی تھی، قلب کے ضعف اور دل کی کمزوری کی علامت نہیں تھی، واقدی نے یہ روایت بنا کر حقیقت میں قرآن مجید کی اس آیت پاک کی تغیر کرنی چاہی ہے۔ جو واقعہ بدر کے تعلق سے نازل ہوئی تھی،

اذ یریکھم اللہ فی منامك	یاد کرو جب خدا نے تجھ کو تیری
قلیلاً ولو اریکھم کثیراً لفشلتم	نیند کی حالت میں اُن لوگوں کو
ولتنازعتم فی الامر،	تھوڑا کرکے دکھایا، اور اگر ان کو
(انفال)	زیادہ کرکے تجھے دکھاتا تو تم شکست
	ہو جاتے، اور لڑائی کے فیصلہ میں
	باہم اختلاف کرلیتے،

واقدی نے اپنی جہالت سے اس خواب کے موقع کو عین معرکہ کا وقت سمجھ کر اس معجزانہ خواب کی روایت تیار کرلی، حالانکہ خود اسی حالت میں موجود ہے کہ لڑائی کے متعلق فیصلہ ہو جانے سے پہلے ہی آنحضرت ؐ کو یہ تمثیلی خواب دکھایا گیا تھا جس میں اُن کی تعداد کی کثرت کو نتیجہ کے لحاظ سے کم تعداد کرکے دکھایا گیا تھا یعنی قریش کی شکست

---

[1] یہ واقعات حدیث اور مغازی کی تمام کتابوں میں موجود ہیں۔

کی یہ پیشینگوئی عالمِ رؤیا میں دکھائی گئی تھی۔

پروفیسر مارگیولیوتھ صاحب نے اسی "فرضی واقعۂ بے ہوشی" کے تذکرہ سے پہلے آنحضرتؐ کی کمزوری کے ثبوت میں ایک دو اور بے جوڑ باتوں کی تمہید کی ہے، وہ بھی سرتاپا لغو ہیں۔ پروفیسر صاحب کو واقعات کے بگاڑنے، واقعات کی غلط ترتیب دینے، اور اچھی سے اچھی بات کو بدنما صورت میں دکھانے میں یدِ طولیٰ حاصل ہے، جس کے لئے وہ عقل کے علاوہ صرف و نحو و ادب و لغت ہر فن کا خون کرنے کے لئے فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کی بدترین مثال اُن کی کتاب کے ص ۷۰ میں ہے کہ

"محمد خدیجہ کے ساتھ مل کر ہر رات کو سونے سے پہلے ایک خانگی عبادت ایک دیبی کی تعظیم میں کیا کرتے تھے"

موصوف نے اس کے لئے مسند ج ۴ ص ۲۲۲ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ مسند کی روایت محولہ میں بالکل اس کے خلاف واقعہ درج ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نہیں، بلکہ اہلِ عرب کا یہ دستور مذکور ہے کہ وہ عزیٰ کی پوجا کرکے سویا کرتے تھے، عربی جاننے والوں کے لئے اصل روایت لکھی جاتی ہے۔

حدثنی جار لخدیجة بنت	حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کے
خویلد انہ سمع النبی صلعم	ایک ہمسایہ نے مجھ سے بیان کیا کہ
وھو یقول لخدیجة اَی خدیجة و	انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ لا اعبد اللات والعزیٰ	کو سُنا کہ وہ حضرت خدیجہؓ سے
واللہ لا اَعبُدُ اللات والعُزیٰ	فرما رہے تھے کہ اے خدیجہ خدا

واللہ لا اعبد ابداً، قال فتقول	کی قسم! میں لات و عزیٰ کی پرستش
خدیجۃ خل اللات خل العزیٰ	نہیں کروں گا، خدا کی قسم نہیں
قال کانت صنمھم التی کانوا	کروں گا، حضرت خدیجہؓ کہتی تھیں
یعبدون ثم یضطجعون،	لات کو جانے دیجئے، عزیٰ کو جانے
	دیجئے، (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے)
	راوی کہتا ہے کہ یہ قریش کا وہ بت
	تھا جس کو وہ پوجتے تھے، پھر لیٹتے تھے،

اللہ اللہ یہ کتنی بڑی تحریف ہے، ایک معمولی عربی کا واقف بھی سمجھ سکتا ہے کہ "صنمھم" اور "کانوا یعبدون" اور "یضطجعون" میں جمع کی ضمیر ہے، جو اہل عرب اور قریش کی طرف پھرتی ہے، اور وہ دو یعنی (محمد صلعم اور حضرت خدیجہؓ) کی طرف نہیں پھر سکتی، انھوں نے بجائے عربی کے شاید انگریزی قاعدہ کے مطابق جمع کی ضمیر تثنیہ کی طرف پھیر کر ایک ایسی بات کہی، جو علمائے یورپ کے فضل و کمال کے دامن پر ہمیشہ داغ رہے گا،

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

افسوس کہ معارف کے مختصر صفحات اس سے زیادہ بحث کی گنجائش نہیں رکھتے، اس کیلئے سیرت کی پانچویں جلد کا جو خاص اسی موضوع پر ہوگی، ناظرین کو انتظار کرنا چاہئے،

معارف ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

پھر واقدی

امام زہری پر الزام

پروفیسر گولیم (درہم یونیورسٹی، انگلینڈ)

کا

خط بنام اڈیٹر اسلامک ریویو ووکنگ

جناب من!

میں اسلامک ریویو کا باقاعدہ اور مستقل پڑھنے والا ہوں، فاضل سید سلیمان صاحب ندوی کے مضمون سے جو واقدی پر شائع ہوا ہے، مجھے نہایت دلچسپی ہوئی، کیا میں یہ درخواست کرسکتا ہوں کہ آپ میرے اس خط کو مزید آگاہی کے لئے شائع کر دیں، جو حسب ذیل سوالات پر مشتمل ہے،

اول وہ کیا اصول ہے جس کی بنا پر واقدی کی صداقت رد کی جاتی ہے، مہربانی کرکے مجھے یہ کہنے دیجئے کہ میں مذہبی گروہوں کے اس حق کے خلاف لڑنا نہیں چاہتا کہ وہ ان تحریروں کو جو میرے نزدیک لائق قبول نہ ہوں مستند ماننے سے انکار کر دیں، بلکہ میں وہ اصول جاننا چاہتا ہوں جو کسی مصنف کے رد و قبول پر حاوی ہے، میں یقیناً جرح و

تمدن کے عظیم الشان لٹریچر اور مناولہ وغیرہ کے مسائل سے واقف ہوں، لیکن واقدی ایک مورخ تھا، دینیات کا مصنف (تھیالوجین) نہ تھا، اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ وہ بیک اور ولی نما بخاری کی موت سے ۵۰ سال پہلے وفات پاچکا تھا،

یہ بھی آپکے خیال سے دور نہ رہا ہوگا کہ وہ سندین جو واقدی کی نسبت عمدہ رائین ظاہر کرتی ہیں، وہ اُن سے جو اُس کی تنقیص کرتی ہیں، ایک نسل مقدم ہیں،

پھر آپکے فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ہم کو واقدی کو معتبر ثابت کرنے کے لئے ایک افسانہ پردازہ، ایک جغرافیہ دان، یا ایک مورخ کی شہادت منزل تک نہیں پہنچا سکتی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں پہنچا سکتی ہے، اور ہم کیوں ابتداے اسلام کے ممتاز مصنفوں، جغرافیہ دانوں اور مورخوں کے فیصلوں کو اس عجلت کے ساتھ چھوڑ دین، کیا واقدی کی تصنیف اسی طرح ان اشخاص کو اپنی راے زنی کے لئے دعوت نہیں دیتی، اور کیا اس کا فیصلہ صرف مذہبی علماء (تھیالوجینس) کی رایوں سے ہوگا،

یہ نہ سمجھئے کہ میں یہ سوالات مناظرہ کے لئے کر رہا ہوں، بلکہ زیادہ تر میں یہ سوالات اپنی زیر تالیف کتاب روایات اسلام کے چوتھے باب کے متعلق معلومات تلاش کرنے کے لئے کر رہا ہوں، میرے خیال میں ابو حاتم کا واقدی کی نسبت بُری راے ظاہر کرنا درحقیقت موضوع سے خارج ہے، پھر ابراہیم حربی نے واقدی کے طرز تحریر یعنی ہر واقعہ کی الگ الگ سند لکھے بغیر روایت کی مدافعت کی ہے، یہ ایسا طرز تحریر ہے، جو یاد رہے کہ واقدی کی وفات کی ایک نسل بعد تک کم وقعت نہ تھا، کیونکہ زہری اور ابن اسحاق ان دونوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے، آپکے فاضل مضمون نگار نے یہ جواب دیا ہے کہ زہری اور ابن اسحق کی سطح واقدی سے بلند تر ہے، لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں؟ میں جانتا ہوں کہ علماے مذہب

(تھیالوجنیس) کی نظر میں اُن کی زیادہ وقعت ہو لیکن مغازی میں اُن کی وقعت کیوں نہ زیادہ ہے؟ کیا یہ فراموش کر دیا گیا ہے کہ زہری نے خود اقرار کیا ہو کہ انھوں نے دباؤ سے مجبور ہو کر جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں،

اکرھنا علیہ ھولاء	اس پر ہم کو ان بادشاہوں
الامراء،	نے مجبور کیا،

پھر بہت سے مصنفین نے صحیحین کی حدیثیں بھی رد کر دی ہیں، اور نیز یہ کہ بخاری کی راویوں میں سے ایک ابوہریرہ بھی ہیں، جو روایت کرتے ہیں کہ چاند پھٹ گیا تھا، (شق القمر) اس بنا پر کوئی اس خیال سے باز نہیں رہ سکتا کہ کوئی قومی سبب اس کا نہیں ہے کہ واقدی کو بخاری کے فیصلہ کی بنا پر رد کر دیا جائے،

اسلام کے ایک سچے طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں نہایت مشکور رہوں گا کہ اگر سید صاحب یا کوئی دوسرا فاضل مجھ کو وہ اصول بتائے، جس کی بنا پر کسی ابتدائی مسلمان کی شہادت قبول یا رد کر دی گئی ہے،

آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ جب کسی شخص کے خود معاصرین اس کو اعلیٰ سند تسلیم کریں، تو بمشکل مناسب ہوگا کہ بعد کی نسل کے علمائے مذہب (تھیالوجنیس) کی بلا دلیل رایوں کی بنا پر اس کو جھوٹا کہہ کر بدنام کیا جائے،

آپ کا مخلص

الفرڈ گولیم

پروفیسر عربی، درہم یونیورسٹی،

انگلینڈ

الجواب

از

سید سلیمان ندوی

پروفیسر موصوف کے ان سوالات کو پڑھ کر سب سے پہلے اس بات کی خوشی ہوتی ہے، کہ ہمارے فاضل مستشرقین کی علمی تحقیق کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے، ایک زمانہ تھا کہ سیرت نبوی پر لکھنے کے لئے تنہا ابوالفدا ایک ماخذ اُن کے سامنے تھا، اس کے بعد واقدی، اور پھر ابن سعد اور ابن اسحاق کی باری آئی، یہاں تک کہ پروفیسر مارگیولیوتھ نے اس کا سب سے بڑا ماخذ حدیث کو قرار دیا، اور خصوصًا ابن حنبل کی ضخیم جلدوں کو، لیکن ابھی تک اس کی کسر تھی کہ انھوں نے کسی واقعہ کی تنقید میں اصولِ روایت سے کام نہیں لیا، مگر کیا پروفیسر گولیم کے ان سوالات سے یہ خوشخبری نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اب ہمارے ان اصول و ضوابط کو سمجھنا چاہتے ہیں، جن پر اسلام کی ابتدائی روایتوں کی تنقید کی اصلی بنیاد قائم ہے،

دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ قوم ہے جس نے واقعات و روایات کی تنقید و تصحیح کے لئے اصول و ضوابط قائم کئے، اور اس سلسلہ میں اصولِ حدیث، اسماء الرجال، علم الجرح والتعدیل، اختلاف الحدیث اور اسناد وغیرہ متعدد فنون کی بنیاد ڈالی، اسی کے ساتھ درایت کے اصول اور نقد کے قوانین بنائے، اور ان پر صدہا کتابیں لکھیں، اور وہ ہماری مشرقی درسگاہوں کے نصابِ تعلیم کا ایک جزء ہیں، اور محض عربی زبان کی ادبی واقفیت ان مشکلات کی گرہ کشائی نہیں کرسکتی،

مسلمانوں میں اس فن کے رو سے واقعات کی تنقید دو پہلوؤں سے کی جاتی ہے، جن میں

سے ایک اصول روایت اور دوسرا اصول درایت ہے، روایت کے مختصر اصول یہ ہیں کہ شروع سے آخر تک واقعہ کے ناقل اور راوی معتبر اور ثقہ ہوں، پہلا راوی یا خود واقعہ کے وقت موجود اور اُس کا عینی شاہد ہو، یا کسی شریک واقعہ اور عینی شاہد سے اُس نے خود سُنا ہو، یا اُس کے متعلق یہ تجربہ سے ثابت ہو کہ وہ ہمیشہ عینی شاہدوں سے سُن ہی کر اس قسم کی روایتیں کیا کرتا ہے، پھر یہ کہ ہر راوی یہ اقرار کرے کہ اُس نے خود دوسرے راوی یعنی اپنے پیشرو راوی سے یہ سُنا ہے یا یہ ثابت ہو کہ وہ اُس سے عمر میں کم سے کم ایک دفعہ بھی ملا ہے، یا یہ کہ وہ دونوں کم از کم ایک زمانہ میں موجود تھے، اور ایک کی دوسرے سے سماعت ممکن ہے، اوّل سے اخیر تک سند کی کڑی متصل اور ملی ہو، کہیں سے ٹوٹی نہ ہو، یعنی بیچ کا راوی کوئی نامعلوم شخص نہ ہو،

درایت کے مختصر اصول یہ ہیں کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، وہ دیگر مستند تاریخی بیانات کے مخالف تو نہیں ہے، کسی دوسری صحیح تر سند سے اس کے خلاف کوئی ایسی شہادت تو موجود نہیں ہے، جو اس کی تکذیب کرتی ہو، راوی سے مطلب سمجھنے میں تو کوئی غلطی نہیں ہوئی، راوی نے کوئی ادھوری بات تو نقل نہیں کی ہے، اسلام کے مسلّمہ حقیقتوں، اور معروف اصول کے خلاف تو نہیں ہے؛

یہ اس فن کی مختصر دفعات ہیں جن پر اسلام کی ابتدائی تاریخ و احکام کی نقل وروایت کی بنیاد قائم ہے اسلام کے ابتدائی مصنفین نے خواہ علمائے حدیث ہوں، علمائے مغازی ہوں یا علمائے تاریخ ہوں، انہی اصول کی پیروی جہاں تک زیادہ کی ہے، وہیں تک اُن کی تصنیفات امت کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول ہوئی ہیں، اسی بنا پر امام بخاری کی جامع صحیح کا، پھر امام مسلم نیشا پوری کی کتاب کا، پھر علی الترتیب اسی طرح حدیث کی دوسری

کتابوں کا درجہ ہے)

امام بخاری نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی روایت تمن کتاب میں نقل نہیں کی ہے، جس میں ہر ایک راوی نے دوسرے راوی سے اپنی ملاقات اور سماعت کا اقرار نہیں کیا ہے، امام مسلم نے ایسے راویوں کی روایتیں بھی قبول کرلی ہیں، جن کی باہمی ملاقات اور سماعت کا کوئی ثبوت نہ ہو، مگر اتنا ثابت ہو کہ وہ دونوں ایک عہد اور ایک زمانہ میں موجود تھے، اس بنا پر ایک منصف مزاج یہ یقین کرے گا کہ روایات اور وقائع کے تمام دفتر میں صحیح بخاری سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ صحیح مسلم کا درجہ صحیح بخاری کے بعد کیوں قرار دیا گیا ہے، دوسری کتابوں کے مصنفین نے اپنا اصول یہ قرار دیا ہے کہ وہ ہر اس واقعہ کو قبول کرتے ہیں جس کی نسبت علما کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ موضوع جھوٹا اور بنایا ہوا نہیں ہے، اور ہر اس راوی کو قبول کیا ہے، جس کو علماء نے جھوٹا، کاذب اور دروغ گو نہیں کہا ہے، نیچے درجہ کے مصنفین نے اس اصول کو بھی برقرار نہیں رکھا ہے، بلکہ ہر جھوٹی سچی روایت کو قبول کرکے اپنی کتاب میں بھر دیا ہے، اس لئے اسی ترتیب سے اُن کی کتابوں کے بھی اہل فن نے درجے مقرر کردیئے ہیں،

جو کتابیں مغازی اور سیرۃ پر لکھی گئی ہیں، ان میں ان اصولوں کا عموماً بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے تاہم ان اصولوں کی پابندی اور خود مصنفین کی ذاتی حیثیت کی بنا پر مغازی کی کتابوں میں سب سے اول امام زہری کی مغازی کو جگہ دی گئی تھی، اور اس کی عدم موجودگی میں اُن کے شاگردوں میں سے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کا رتبہ ہے، اور اس کے بعد انکے ہم درس محمد بن اسحاق کا درجہ ہے، اور واقدی کے لئے اس دربار میں وہی جگہ رکھی گئی ہے جو اسی کے ہم رتبہ کسی حدیث کی کتاب کے مصنف کا پایہ محدثین میں ہے،

پروفیسر صاحب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علماے اسلام کی جماعتی یا فن وار تقسیم سے ناآشنا ہیں، اور یقینا کسی بیرونی قوم کے افراد کو دوسری قوم کے مذہب، علوم اور زبانوں کی اصطلاحات کا سمجھنا اس بنا پر مشکل ہوتا ہے کہ وہ بچپن سے اس ماحول سے باہر پلے ہیں، اور اُن کی واقفیت کا ذریعہ محض کتابیں ہیں، اور ان چیزوں کے پوری طور سے سمجھنے میں اس قوم کی زبان کی محض ادبی واقفیت پوری معین نہیں ثابت ہوتی، اس لئے لامحالہ وہ شخص دوسری قوم کی اصطلاحات، خیالات اور ماحول کو اپنی قومی اصطلاحات، خیالات اور ماحول کے مطابق کرکے سمجھتا ہے، ہمارے پروفیسر صاحب نے اپنے خط میں دو قسم کے علمار کے نام لئے ہیں، ایک کو وہ تھیالوجینس یعنی علماے الٰہیات اور دوسرے کو مورخین اور اصحاب مغازی کہتے ہیں، لیکن اسلام میں یہ کوئی تقسیم نہیں ہے، اور ہمارے یہاں علماے الٰہیات، عام علمار سے کوئی الگ نہیں ہیں، یہاں پر علمار کی تقسیم تھیالوجی (الٰہیات) کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ "روایت" کی بنا پر ہے، اس لئے وہ تمام اشخاص جو کسی قسم کی نقل وروایت کرتے ہیں، ایک جنس میں داخل ہیں، اور ان کا نام "علماے نقل" ہے اور دوسرے "علماے عقل" ہیں، جن کا یہاں کوئی تعلق نہیں۔

علماے نقل یعنی وہ تمام اشخاص جو کسی حکم یا واقعہ کو نقل وروایت کرتے ہیں، اُن کے اس حکم و واقعہ کی حیثیت کی بنا پر مختلف نام ہیں، مثلاً وہ اشخاص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عہداول کے ہر قسم کے احکام و واقعات کی نقل وروایت کی خدمات انجام دیں، وہ محدث کہلاتے ہیں، اور جو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح ذاتی اور واقعات واخلاق کا ذکر کریں، وہ اصحاب سیرۃ ہیں، اور جو آپ کے صرف اخلاق وعادات کو نقل کریں، وہ اصحاب شمائل ہیں، اور جو صرف غزوات، اور اُن کے

متعلقات کو بیان کریں، وہ اصحابُ المغازی ہیں، بہر حال محدث یا صاحب سیرت، یا صاحب شمائل، یا صاحبِ المغازی، یہ کُل کے کُل گو مضامینِ متعلقہ کی حیثیت سے الگ الگ ناموں سے موسوم ہیں لیکن روایت کی حیثیت سے ان سب کا ایک ہی درجہ ہے، یعنی یہ سب اصحابِ روایت اور علمائے نقل ہیں، اور تمام اصحابِ روایت اور علمائے نقل ایک ہی ترازو کے پلہ میں تولے جائیں گے،

اس بنا پر، جو شخص بھی اسلامی روایات کا کوئی ٹکڑا بھی کسی سے نقل کرکے بیان کریگا، خواہ وہ دینی احکام و فرائض سے متعلق ہو، خواہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ذاتِ گرامی سے منسوب ہو، خواہ وہ غزوات اور لڑائیوں کے بارہ میں ہو، خواہ وہ آپ کے اخلاق و عادات سے تعلق رکھتا ہو، اس کے لئے اس بات کے ثبوت کی ضرورت ہے کہ درحقیقت ایسا ہی ہے، عقلِ انسانی میں پچھلی نسلوں یا غائب اشخاص کو اس حکم یا واقعہ کا علم صرف روایت ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اور ایک انسان کے ہاتھ میں یہی ایک ذریعہ ایک سے دوسرے تک بات کے پہنچانے کا ہے، اور تمام دنیا کے وقائع اور حوادث کے علم کا مدار صرف تاریخ پر ہے،

اسلامی اور غیر اسلامی روایات میں فن کی حیثیت سے یہی سب سے بڑا امتیاز فرق ہے کہ غیر مسلم قوموں نے اپنے انبیاء اور ہادیوں کے اقوال اور افعال کی روایتوں کی جانچ اور پڑتال کے متعلق کوئی اصول مدوّن نہیں کیا ہے، اور مسلمانوں نے اس کے لئے بہت سے اصول مدوّن اور منضبط کئے ہیں، اور اسی معیار پر غلط اور صحیح، سچی اور جھوٹی روایت کو وہ پرکھتے ہیں، مثلاً ہمارے عیسائی بھائیوں کے یہاں ان چار مشہور انجیلوں کے علاوہ اور بہت سی انجیلیں ہیں، مگر انھوں نے چار کو مسلّم مان کر بقیہ کو جعلی اور ناقابلِ تسلیم قرار دیا ہے، مگر

ہیں وہ اصول نہیں معلوم جن کی بنا پر اس جھوٹ اور سچ، صحیح اور جعلی میں فرق کیا جا سکے، لیکن مسلمانوں کے پاس اُن کے جانچنے کے لئے وہ فن ہے جس کا نام اصول ہے، اور جس کی متعدد شاخیں ہیں،

آج تنقیدی تاریخ کے فن نے یورپ میں بے انتہا ترقی کی ہے، اور ابن خلدون کے بنیادی فلسفۂ تاریخ نے یورپ جا کر عظیم الشان برگ و بار پیدا کیا ہے، اور اس امر پہ بڑا زور صرف کیا جاتا ہے کہ اس تاریخ کا فلاں واقعہ فطرت، مقتضائے عہد اور اس زمانہ کے ماحول کے لحاظ سے ممکن بھی ہے، یا نہیں، غرض درایت کے نقطۂ نظر سے کوئی پہلو جدید یورپ کے نقاد مورخین کی محققانہ نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا، لیکن یہ پہلو کہ اس واقعہ کو کس نے دیکھا؟ کس سے سُنا؟ ہم تک کس واسطہ سے پہنچا کبھی معرضِ بحث میں نہیں آتا، آج یورپین محققین اور عدالتوں نے حوادث اور واقعات میں شہادت کی حیثیت کو جو اہمیت دی ہے وہ مخفی نہیں ہے، اور شاہدوں اور گواہوں کی وقعت، پوزیشن، اخلاق؛ عینی شہادت اور سچائی کو ہر طرح سے جانچنے کی انتہائی کوششیں کی جاتی ہیں، پھر یہ کیا ظلم ہے کہ موجودہ واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں تو شاہدوں اور گواہوں کے متعلق یہ احتیاط برتی جائے، اور گذشتہ واقعات کے قبول ورد میں اس کے بالمقابل شہادت کے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور سچے اور جھوٹے میں کوئی تفریق نہ کی جائے، نہ اس کی تلاش اور جستجو کی جائے،

حدیث و روایت بھی دنیا کے ہزاروں علوم وفنون میں سے ایک فن ہے، ہر علم وفن کی طرف جو لوگ منسوب ہیں، یا جو کسی علم وفن کی آگاہی اور واقفیت کے مدعی ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ ان سب کا درجہ برابر نہیں ہوتا، بہت سے ان میں محض فن کے آشنا اور

اس علم کے محض ابجد خوان اور حرف شناس ہوتے ہیں، دوسروں کی حالت اُن سے بہتر ہوتی ہے، بعض کا درجہ بہت بلند ہوتا ہے، اور کچھ ایسے باکمال بھی ہوتے ہیں جو اس علم یا فن کے محقق، اس کو ترقی دینے والے، اس کے تمام حقائق اور اسرار کے کامل ماہر ہوتے ہیں، اس کا فیصلہ کہ اس کو اس علم یا فن میں نقص یا کمال کا کونسا درجہ حاصل ہے، اس علم وفن کے متعلق اس کے کارنامے اس کے ہم عصر و ہم پیشہ فضلا، کی رائیں اور اس زمانہ کے قبولِ عام کی نگاہیں اس کو نمایاں کردیتی ہیں، اور بالآخر ان کو اس علم وفن کا معیاری درجہ اور رتبہ حاصل ہوجاتا ہے، ہر عہد اور ہر زمانہ میں علم وفن کی ہر شاخ میں اس کی ہزاروں مثالیں گذر چکی ہیں، اور گذر رہی ہیں، گذشتہ اور موجودہ علما اور مصنفین کے اعتبار، استناد اور صحتِ نقل کا پیمانہ اسی معیار پر قائم ہے،

یہی اصول اسلامی روایات کے حاملین اور ابتدائی مسلمان مصنفین کے فرقِ مراتب اور امتیازات میں قائم ہے، جس کی بنا پر مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن حنبل، ابن ماجہ، ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، ابن ہشام، طبری، دیلمی، کلبی وغیرہ ابتدائی مسلمان مصنفین کی کتابوں میں مراتب اور درجات ہیں،

ہر علم وفن کے مسائل کے متعلق اس کے جاننے والوں اور محققوں ہی کی رائے معتبر ہوسکتی ہے، ایک عالم لغت کی رائے کیمسٹری کے کسی مسئلہ کی نسبت یا ایک جغرافیہ دان کی رائے طب کے متعلق، ایک ادیب کی رائے ما بعد الطبیعیات کے بارہ میں یا ایک محدث کی رائے، ہیئت کے کسی مسئلہ کے فیصلہ میں بالکل بے سود ہے، مسلمان علما اور حکما میں بو تمام حریری سے ریاضیات کی نسبت اور موسیٰ خوارزمی سے مقامات کی نسبت سوال بے کار ہوگا، بو علی سینا سے حدیث کی تحقیق اور امام بخاری سے طبیعیات کے مسائل حل نہیں

کئے جاسکتے، اس لئے یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ حدیث وروایت نبوی کی تحقیق میں "ایک انشاپرداز جغرافیہ داں اور محاضرات نویس کی رائے کیوں معتبر نہیں، جس طرح گبن کا کام نیوٹن سے نہیں لیا جاسکتا، اسی طرح ابن حجر کا کام یاقوت سے نہیں لیا جاسکتا، اور نہ یاقوت کا کام ابن حجر سے لیا جاسکتا ہے، اس لئے یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ "ہم کو واقدی کو معتبر ثابت کرنے کے لئے ایک انشاپرداز، ایک جغرافیہ داں اور ایک مورخ (یاقوت) مورخ نہیں سوانح نگار تھا) کی شہادت منزل تک نہیں پہونچا سکتی۔

اس کے فیصلہ کے بارہ میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ تھیالوجین (عالم الٰہیات) اور غیر تھیالوجین کے تعصب کی دیوار حائل ہے، بلکہ فن کی واقفیت اور تحقیق کی دیوار حائل ہے، کسی شہر کی جائے وقوع، اور اس کے نام کی صحت کے بارے میں ابن خردازبہ، مقدسی، مسعودی، ادریسی اور یاقوت جغرافیہ دانانِ اسلام کی جو رائے ہوگی، اس کے مقابلہ میں امام بخاری، امام مسلم، امام احمد بن حنبل، خطابی، اور ابن حجر کی رائے قابلِ تسلیم نہ ہوگی، یہ بالکل ایک کھلا ہوا مسئلہ ہے، اس لئے آپ کی یہ حیرت کہ "ہم کیوں ابتدائے اسلام کے ممتاز مصنفوں جغرافیہ دانوں، اور مورخوں کے فیصلوں کو اس عجلت کے ساتھ چھوڑ دیں، کیا واقدی کی تصنیف اسی طرح ان اشخاص کو اپنی رائے زنی کے لئے دعوت نہیں دیتی، اور کیا اس کا فیصلہ صرف مذہبی علماء (تھیالوجینس) کی رایوں سے ہوگا" دور ہو جائے گی۔

اب میں آپ کے اس سوال پر آتا ہوں کہ "وہ کیا اصول ہے جس کی بنا پر واقدی کی صداقت رد کی جاتی ہے، اور وہ اصول عرض کرنا چاہتا ہوں جو کسی مصنف کے رد وقبول پر حاوی ہے، پہلے گذر چکا ہے کہ ہر علم وفن کے فضلاء، اور محققین کے کارنامے معاصرانہ شہادتیں، اس علم وفن کے ساتھ اس کا شغف وشوق اور کاوش وتحقیق اُن کے مرتبہ اور درجہ کو متعین کر دیتی ہیں،

اور ایک ناآشنائے فن عطائی، مدعی محض، عالم، فاضل، اور محقق کامل کے متفاوت درجوں کی تعیین کردیتی ہے، یہی حال سلسلۂ روایت اور اسناد کے واقفوں، عالموں، اور محققوں کے رتبوں اور درجوں کی تعیین اور تشخیص کا ہے، امام بخاری کے سامنے بغداد میں روایات کے دس متفرق سلسلے باہم الٹ پھیر کر امتحاناً پیش کئے جاتے ہیں، وہ بہ ترتیب ان سلسلوں کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر پیش کردیتے ہیں، اور علمار کا مجمع اُن کی حیرت انگیز یادداشت اور حافظہ کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے، اس بنا پر اس فن میں امام بخاری کا جو درجہ ہوگا، وہ اس آدمی کا نہیں ہوسکتا، جس کو اپنی کسی روایت کی پوری سند بھی نہیں معلوم،

اول نفس مصنفین کو لیجئے، فضل وکمال، دیانت وتقویٰ، حفظ ویادداشت، فہم واستنباط کے لحاظ سے ان میں بہت کچھ فرق ہوتا ہے، پھر آپ کو معلوم ہے کہ کم از کم ایک دو نسل تک اسلامی روایات کا بڑا حصہ زبانی کتاب کے سبقوں کی طرح رٹ کر یاد کیا جاتا تھا، اس لئے راویوں کی قوتِ حافظہ کا امتحان بھی ضروری تھا،

اب اسلامی فنِ روایت کے اصول کی بنا پر کسی مصنف کی کتاب میں کسی واقعہ کے مستند طور سے درج ہونے اور اس کے معتبر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ

۱- مصنف خود معتبر، ثقہ، دیانت دار، اور صادق القول، اور اپنی روایتوں کے تمام سلسلوں سے واقف ہو، اور اپنے راویوں کے انتخاب میں اس نے پوری کوشش کی ہو اور کامیابی حاصل کی ہو،

۲- اس کی ہر روایت کا سلسلہ سند ہو،

۳- اس کی روایت کا ابتدائی راوی واقعہ کا عینی شاہد ہو، یا کسی عینی شاہد سے اس کے سننے کا کافی ثبوت ہو،

۴ واقعہ کے شاہد عینی سے لے کر مصنف تک ہر دور کے راوی کی کڑی موجود ہو۔

۵ ہر دور کے راوی کی نسبت یہ بھی معلوم ہو کہ وہ ثقہ، معتبر اور صادق ہو۔

۶ ہر دور کے راوی کی نسبت ثابت ہو کہ اس نے اپنے پیشرو سے سنا ہو اور یا کم از کم دونوں ایک زمانہ میں موجود تھے۔

یہ چند اصول ہیں جو ایک ایسے مختصر مضمون کی چند سطروں میں بیان کئے جا سکتے ہیں اس معیار پر ہم بخاری اور واقدی کی روایتوں کو جانچتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کے تمام معاصرین بالاتفاق اس کو ثقہ، معتبر، صادق، متدین اور روایت کے اشخاص اور رجال کا سب بڑا پرکھنے والا کہتے ہیں، اور دوسرے کے اکثر معاصرین اس کو جھوٹا، کاذب اور دروغ گو، اور روایت کے اشخاص و رجال سے اس کو نابلد محض کہتے ہیں نتیجہ ظاہر ہے۔

اب ان دونوں کے راویوں کا حال ہم دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ بخاری اپنی ہر روایت کے شروع سے اخیر تک راویوں کے نام بنام گناتے ہیں، اور ان میں سے اس کے ہر دور کا راوی اپنے زمانہ کا مشہور و معروف متدین، راست باز اور معتبر تھا، دوسری طرف واقدی کے یہاں سرے سے یہی معلوم نہیں کہ اس نے واقعہ کو کس سے سنا؟ اس نے کس سے کہا، اور اس کا شاہد عینی کون تھا؟ اس لئے ایسی حالت میں ہر منصف مزاج روایت کے دونوں مصنفوں کے بیانات کے رد و قبول کا بآسانی فیصلہ کر سکتا ہے۔

واقدی نے اگر کہیں کہیں ایک دو راویوں کے نام لکھے بھی ہیں، تو وہ غیر مشہور، نامعتبر یا مجہول ہیں، اور بخاری کا ہر راوی اپنی جگہ پر معاصرین میں مسلم الثبوت اور اہل فن کے نزدیک مستند رہا ہے، پھر نفس واقعہ اور اس کی تفصیلات کو دیکھتے ہیں، تو ثابت ہوتا ہے کہ بخاری کے بیان کی تصدیق دوسری معاصر و مماثل روایتوں کی تائید سے بھی ہوتی ہے، اور واقدی کے

خاص بیان کی تائید کسی معاصر سے نہیں ملتی، اس قسم کی متعدد مثالیں جب دو مصنفوں میں ملیں گی، تو ضرور ایک کو مستند اور دوسرے کو غیر مستند قرار دیا جائے گا، یہ اصول ہی جس کی بنا پر ایک مصنف کو قبول اور دوسرے کو رد کیا جاتا ہے"

جس طرح دوسرے علوم و فنون کے ممتاز و مستند محققین ہر زمانہ میں ہوتے رہے ہیں، اسی طرح اسلامی علم روایت کے ممتاز و مستند محققین بھی ہر دور میں گذرتے رہے ہیں، جن کا تدین، جن کی ثقاہت، جن کا علم و فضل خود اُن کے کارناموں، علمی کاوشوں، ان کی زندگیوں کے سوانح اور اُن کے معاصرین کی شہادتوں سے ثابت ہے، اور جنھوں نے اپنی پوری زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ روایتوں کی تحقیق، راویوں کی چھان بین، رجال کی تلاش و تفتیش میں بسر کیا، اور اُن کے عہد کے انسانوں نے ان کے تدین، تحقیق اور فضل و کمال پر بھروسہ کیا، اُن کی تحقیقات اور بیانات، اس عہد کے راویوں کے متعلق معیار قرار پائے،

اور چونکہ مختلف اشخاص کے متعلق اُن کے مختلف واقف کاروں کے تجربے کبھی کبھی مختلف بھی ہوتے ہیں، اس لئے راویوں کے متعلق مختلف رائیں بھی ہیں، ان راویوں کی صحت کا معیار خود ان اصحاب رائے کا فضل و کمال ہے، اور یہ اختلاف رائے، خود علم اسمار الرجال کی صداقت کی دلیل ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعی مختلف اشخاص کے ذاتی تجربوں پر قائم ہے، اگر ان میں بجائے اختلاف کے یکسانی ہوتی، تو اول تو یہ اشخاص کے متعلق نقد و تجربہ کی غیر فطری مثال ہوگی، دوسرے اس سے شبہہ پیدا ہوسکتا تھا کہ یہ ایک جعلی، بناوٹی اور متفقہ جھوٹ ہے، اس بنا پر کسی راوی کے متعلق اگر مختلف ناقدین کی مختلف رائیں ہوں، تو ان رایوں میں سے کسی ایک پہلو کی ترجیح کے لئے حسب ذیل اصول ہیں،

ا۔ معاصر ناقدین کی اکثریت کدھر ہے؟

۲- مختلف رتبوں کے ناقدوں میں سے اعلیٰ درجہ کے مستند ناقدین کس طرف ہیں،

۳- عام ناقدین کی اکثریت کس طرف مائل ہے؟

کسی راوی کے متعلق متاخر عہد کے غیر معاصر ناقد جب اپنی رائے دیتے ہیں تو اس کی بنیاد حسب ذیل چیزوں پر ہوتی ہے،

۱- راوی کی موجودہ روایات کے ذخیرہ کی نوعیت کیا ہے، اور زیادہ تر اس میں معروف یا منکر کس قسم کی باتیں ملتی ہیں؟

۲- دوسرے مستند لوگوں کے بیانات سے اس کا بیان کہاں تک موافق یا مخالف ہے؟

۳- اس مختلف فیہ راوی کے معاصر فضلار کی رائیں اس کے متعلق کیا ہیں، اور اگر وہ مختلف ہیں، تو اُن میں مشہور و معروف ناقدین کدھر ہیں، یا اُن کی کثیر تعداد کس جانب ہے،

۴- متاخر ناقد نے گو خود اس راوی کو نہیں جانچا، مگر اس کے متعلق اُس نے اپنے شیوخ کی زبان سے سُنا جو اس راوی کے معاصر تھے،

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ "واقدی کے متعلق پچاس برس بعد امام بخاری کیونکر اپنی رائے ظاہر کرسکتے" ہیں،

واقدی کے متعلق ابوحاتم رازی کی رائے موضوع سے خارج ہے، ابوحاتم [illegible] یہ ہے کہ واقدی کے ہم عصر محدثین اور فضلائے روایت نے دیکھا، کہ واقدی مدینہ کے [illegible] اور غیر معروف راوی جن کے حالات سے واقفیت نہیں اُن سے روایت کیا کرتا ہے کہ اور ایسی روایتیں کرتا ہے، جو منکر ہیں یعنی کسی ثقہ اور معتبر راوی کے بیان سے اُن کی تائید و تصدیق نہیں ہوتی، اور جن کو ہم جانتے ہیں، اب ایسی حالت میں یا اشتباہ ہوسکتا تھا کہ

ممکن ہے کہ یہ منکر اور غیر مصدقہ روایتیں خود واقدی نے گھڑ لی ہوں، اور دوسرے غیر معروف شیوخ کی طرف اُن کو منسوب کر دیا ہو، یا یہ کہ جھوٹی روایتیں انہی غیر معروف شیوخ کی ساختہ ہوں اور واقدی نادانستگی میں اُن کو لے کر بیان کیا کرتا ہے، شک کے ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کی تعیین واقدی کے ہم عصر فضلاء نے اس طرح کی کہ انھوں نے دیکھا کہ وہ معروف و مشہور اساتذہ جو اس قسم کی منکر روایتیں ہرگز نہیں کرتے، اور نہ انھوں نے کی، واقدی ان سے بھی اس قسم کی روایتیں علانیہ اُن کی طرف نسبت کر کے کیا کرتا ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ ان لغو اور غیر مصدقہ روایتوں کے گھڑنے کا کارخانہ خود اسی کے گھر میں قائم تھا،

کیا یہ موضوعِ بحث سے خارج رائے ہے،

ابراہیم حربی جنھوں نے واقدی کی حمایت کی ہے اور کہا ہے، کہ

"مفصل سند کے بغیر روایت کرنا اگر جرم ہے تو امام زہری اور محمد بن اسحاق بھی اس سے بری نہیں"

میں نے اپنے گذشتہ مضمون میں اس کے دو جواب دیئے ہیں

۱- زہری اور ابن اسحاق واقدی سے بہت زیادہ بلند ہیں، اس لئے اُن کی بلا سند بات بھی واقدی کی بے سند بات سے زیادہ وقیع ہے کہ واقدی کا جعل ساز ہونا ثابت تھا، اور وہ دونوں اس الزام سے قطعاً بری ہیں، اور خصوصاً زہری تو امام الائمہ ہیں، اور ابن اسحاق گو اُن سے بہت کم رُتبہ ہیں، تاہم واقدی سے تو اُن کا پایہ بلند ہے،

۲- زہری اور ابن اسحاق نے ایسی بے سند بات کبھی نہیں کہی، البتہ کہیں کہیں مختلف سندوں کو ایک جگہ ملا کر روایت کی ہے، بقیہ ہر جگہ انھوں نے اپنی ہر بات اور ہر روایت کی الگ الگ سندیں ذکر کی ہیں، اور واقدی نے یہ کیا ہے، کہ ایک جگہ کتاب کے آغاز میں

سو پچاس آدمیوں کے نام اکٹھا کر کے باقی پوری کتاب بلا سند ایک کہانی اور ایک قصہ کی طرح سنا دی ہے، اس لئے اُن میں عظیم الشان فرق ہے۔

علاوہ ازیں اگر زہری اور ابن اسحاق نے واقدی ہی کی طرح کوئی بے سند روایت کر دی ہے تو اس روایت کا درجہ بھی واقدی ہی کی روایت کے قریب قریب ہوگا، گو زہری اور واقدی کے ذاتی امتیاز اور فضل و کمال کا جو فرق ہے وہ اب بھی محسوس ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ مغازی کی کتابوں کا درجہ احادیث کی کتابوں سے فروتر ہے، واقدی ہی کی مغازی کی تخصیص نہیں، مغازی کی ہر کتاب احادیث کی کتاب کے مقابلہ میں کم رتبہ ہے۔

پھر آپ میری نسبت کہتے ہیں کہ آپ کے مضمون نگار نے یہ جواب دیا ہے کہ زہری اور ابن اسحاق کی سطح واقدی سے بلند ہے لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں" آپ یقیناً پوچھ سکتے ہیں، یہ سطح کا نشیب و فراز اس لئے ہے کہ امام زہری کا کوئی جھوٹ ثابت نہیں ہوا، محمد ابن اسحاق بھی اس الزام سے بری ہیں گو ان پر بے احتیاطی کے اور الزامات ثابت ہوں، اور واقدی کی نسبت اُن کے معاصرین کا بار بار کا یہ تجربہ ہے کہ وہ جھوٹی گھڑ کے اور بے احتیاطی سے روایت کیا کرتا تھا، زہری ہمیشہ راویوں سے اپنی روایتیں کرتے ہیں، جو اپنے عہد کے مشہور و معروف و ثقہ تھے، محمد بن اسحاق اُن سے کم درجہ کے اور واقدی بالکل غیر معروف اور مجہول لوگوں سے روایتیں کرتا ہے، اور اس اصول کی بنا پر کہ ہر علم و فن کے واقف کاروں اور ماہروں کے تفاوت مدارج کی نسبت ہر زمانہ کے علما فیصلہ کیا کرتے ہیں زہری اور ابن اسحاق اور واقدی کی سطح کی بلندی اور پستی کا فیصلہ بھی انہی نے کیا ہے تاہم سند کے لحاظ سے زہری کی بھی ہر قسم کی روایتیں یکساں نہیں ہیں، اور ان کی بے سند روایت بھی مستند روایت کے مقابلہ میں چھوڑ دی جائے گی، یا کم سمجھی جائے گی،

آپ کہتے ہیں کہ "میں جانتا ہوں کہ علماے مذہب (تھیا لوجینس) میں اُن کی (زہری اور ابن اسحاق کی) وقعت زیادہ ہے، لیکن مغازی میں اُن کی وقعت کیوں زیادہ ہے"، اول عرض یہ ہے کہ زہری تو بلاشبہہ ہر صنفِ روایت میں اعتبار و استناد کے بلند ترین درجہ پر ہیں، مگر ابن اسحاق کا یہ حال نہیں ہے، وہ صرف مغازی میں مقبول ہیں، احکام میں دوسرے معتبر لوگوں کے مقابلہ میں اُن کی کوئی وقعت نہیں، بہرحال آپکے اس سوال کہ "مغازی میں زہری اور ابن اسحاق کی وقعت واقدی سے کیوں زیادہ ہے"، کے متعلق کئی مرتبہ عرض کرچکا ہوں کہ اسلامی اصولِ روایت میں مغازی اور غیر مغازی کا کوئی فرق نہیں ہے، ہر وہ شخص جو آنحضرت صلعم کے متعلق کوئی بات نقل کرتا ہے، اس کو اسی مقررہ اصول پر جانچا جائے گا، خواہ وہ لڑائیوں کا حال ہو، یا اخلاق کا بیان ہو، یا کسی مذہبی حکم کا اظہار ہو، گو یہ سچ ہے کہ محدثین نے عملاً جانچ پڑتال کی وہ سختی اور شدت مغازی اور فضائل کے باب میں اتنی نہیں کی ہے، جتنی احکام کے باب میں کی ہے، اور اس کا انھوں نے علانیہ اقرار کیا ہے، اسی کا یہ نتیجہ ہے، کہ مغازی اور فضائل میں کثرت سے لوگوں نے فضول اور لغو روایتیں شامل کردی ہیں، اور فن کے ناآشناؤں میں وہ مقبول اور عوام میں دل پسند ہیں،

واقدی کی مدافعت میں تین باتیں کہی گئی ہیں،

۱- واقدی کی وفات سے ایک نسل بعد کا طریقۂ روایت یا طرزِ تحریر (یعنی حذفِ اسناد یا خلطِ اسناد کا طریقہ) قابلِ اعتراض نہ تھا،

۲- امام زہری اور ابن اسحاق نے بھی ایسا ہی کیا ہے، پھر وہ کیوں واقدی کے مقابلہ میں معتبر اور مقبول ہیں .؟

۳- امام بخاری پر بھی لوگوں نے جرحیں کی ہیں، پھر وہ کیوں غیر معتبر نہیں، اور اُن کو

اس کے بعد کیا حق رہتا ہے کہ وہ واقدی پر معترض ہوں،

گو میں اپنے سابقہ بیانات میں ضمناً ان سوالات کا جواب دے چکا ہوں مگر براہ راست بھی دینا چاہتا ہوں،

۱- یہ صحیح نہیں ہے کہ واقدی کی ایک نسل بعد تک یہ طرز تحریر قابلِ اعتراض نہ تھا، جن لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ وہ اس کے معاصر ہی تھے، اس سے ثابت ہوا کہ خود اس کے عہد میں یہ طرز ناپسندیدہ تھا، زہری اور ابنِ اسحاق کے طرزِ عمل سے اس پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اور آگے پھر لکھتا ہوں

۲- زہری نے کہیں کہیں ساری روایتوں میں دس پانچ جگہ ایسا کیا ہے، ابنِ اسحاق نے اس سے زیادہ ایسا کیا ہے لیکن واقدی نے پوری کی پوری کتاب اسی طرز پر لکھ ڈالی ہے، اس لئے اگر زہری اور ابن اسحاق کی صرف چند روایتیں جو اس طرز پر ہیں، قابلِ اعتراض ہیں، تو واقدی کی پوری کی پوری کتاب قابلِ اعتراض ہے، واقدی نے جہاں جہاں سندیں لکھی ہیں، اُن کو کہیں ایک جگہ بھی اصل خبر شاہدِ عینی تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی ہے، یہاں تک کہ زہری کی روایتوں کا بھی اس نے یہی حال کیا ہے،

زہری باوجودیکہ امام الائمہ اور تمام محدثین کے شیخ اعظم ہیں، تاہم اُن کی مرفوع و متصل روایتوں کا جو مرتبہ ہے۔ وہ اُن کے مراسیل اور بلاغات کا نہیں ہے، اور وہ بھی اسی طرح کم وقعت ہیں جس طرح دوسروں کی غیر مرفوع اور غیر متصل روایتیں، صرف اتنا فرق ہوگا کہ چونکہ زہری بذاتِ خود معتبر ہیں، اور واقدی جھوٹا، کاذب اور جعل ساز ہے، اس لئے زہری کی بے سند روایت کا اعتبار واقدی کی بے سند روایت سے زیادہ ہوگا، اور یہ وہی فرق ہے، جو ایک صادق البیان مورخ اور ایک عامی گپ ہانکنے والے مصنف میں تمام دنیا کرتی ہے۔

۳- امام بخاری پر دارقطنی وغیرہ نے بیشک اعتراضات کئے ہیں، لیکن وہ اعتراضات صرف فضل وکمال کی نمائش کے لئے محض اصطلاحی اور لفظی (ٹکنیکل) ہیں، واقعی نہیں ہیں، اسی لئے وہ اعتراضات علماء کے نزدیک نا قابلِ قبول ٹھہرے، اور ابن حجر نے مقدمہ میں ان میں سے ایک ایک اعتراض کو رد کر دیا ہے، علاوہ ازیں کسی نے یہ جرأت نہیں کی ہے کہ واقدی کی طرح بخاری کو جھوٹا اور دروغ گو کہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ بخاری کے چند راویوں کی معتبری اور نامعتبری پر بعض لوگوں کو اعتراضات ہیں، اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ ان معترضین کے نزدیک بخاری کی وہ روایتیں قابلِ اعتراض ٹھہریں گی، مگر اس سے یہ الزام نہیں آئیگا کہ بخاری کی ۷ ہزار روایتیں دفعتہً معیار سے گر جائیں، برخلاف واقدی کے کہ اس کی ہر غیر مصدق روایت پایۂ اعتبار سے ساقط اور نامعتبر ہے،

بخاری کو ضعیف ثابت کرنے کے لئے آپ نے لکھا ہے کہ اس کے راویوں میں سے ایک ابوہریرہ ہیں جنھوں نے شق القمر جیسا واقعہ نقل کیا ہے، یہ طرز استدلال تو صحیح نہیں، ورنہ دنیا کے ہر مذہب کا مجموعۂ روایت ناقابلِ تسلیم ہو جائے گا، خواہ وہ نبوت کے ستارہ کا طلوع ہو، یا کسی کی موت کے وقت دنیا جہان کا تین تک اندھیرا ہو جانا ہو، اور اس کے علاوہ سیکڑوں ہزاروں معجزات ہیں، چاند کا پھٹنا، یا پانی پر چلنا عقلاً ممکن ہے یا نہیں، اور روٹی اور مچھلی کے چند ٹکڑے، سیکڑوں انسانوں کو یک وقت سیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کی بحث کا یہ موقع نہیں، میں نے اپنی سیرت نبوی کی تیسری جلد میں اس پر پوری بحث کی ہے، اور ہیوم کے فلسفہ (معجزات) سے متفق ہوں، کہ معجزات ممکن ہیں، بشرطیکہ ان کا ثبوت قطعی شہادت سے ہو سکے، لیکن بحث اس موقع کے لئے موزوں نہیں ہے، بہرحال آپ بھی ہم سے متفق ہوں گے، کہ کسی راوی کے سچے یا جھوٹے ہونے کا یہ معیار نہیں، کہ اس نے

کسی معجزہ کی روایت کی ہے یا نہیں کی ہے، کہ اس کے وقوع اور عدمِ وقوع اور امکان اور عدمِ امکان میں ہم سب متفق نہیں ہیں،

اب میں آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ ابو ہریرہؓ نے شقِ قمر کی روایت قطعاً نہیں کی ہو اور نہ بخاری میں اُن کی یہ روایت مذکور ہے، شقِ قمر کے راوی صحابہ میں عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، جبیر بن مطعمؓ، علیؓ بن ابی طالب اور حذیفہ بن یمانؓ وغیرہ ہیں، ابو ہریرہؓ اس واقعہ کے تقریباً آٹھ برس بعد مسلمان ہو کر اپنے وطن یمن سے مدینہ آئے ہیں، اس بارہ میں اُن کا کوئی بیان بخاری میں قطعاً نہیں ہے، اور نہ کسی دوسری کتاب میں میری نظر سے گذرا ہے،

اس الزام کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ "امام زہری نے خود اقرار کیا ہے کہ انھوں نے دباؤ سے مجبور ہو کر جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں"، اور میں یہ کہنے کی ہمت نہیں پاتا، کہ انگلینڈ کی ایک بڑی یونیورسٹی کا عربی پروفیسر ایک معمولی عربی عبارت کے سمجھنے میں قصداً غلطی کرتا ہے یا اضطراراً غلطی پر مجبور ہے، خوش قسمتی سے اس نے وہ عبارت بھی نقل کردی ہے جس کے معنی اس نے یہ سمجھے ہیں کہ زہری نے خود اعتراف کیا ہے، کہ انھوں نے بادشاہوں کے دباؤ سے جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں، اصل عبارت یہ ہے:-

اکرھنا علیہ ھٰؤلاء الامراء	بادشاہوں نے ہم کو اس پر مجبور کیا،

اب ذرا سوال ہوتا ہے کہ کس امر پر مجبور کیا، ؟ اس کا مشارٌ الیہ اس منقولہ عبارت میں موجود نہیں، اس لئے جہاں سے یہ عبارت بالا نقل کی گئی ہے وہیں سے اس کا بقیہ ٹکڑا بھی نقل کر کے فقرہ کو مکمل کیا جائے،

عَنْ عَبْدُ الرَّزَّاق عن معمّر	عبد الرزاق معمر سے اور معمر زہری سے

عَنِ الزهری قال کنا نکرہ	روایت کرتے ہیں، کہ زہری کہتے ہیں
کتابَ العلم حتیٰ اکرھنا علیہ	کہ ہم لوگ علمِ حدیث، کو لکھنا ناپسند
ھٰؤلاء الامراء فرأینا ان	کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم کو بادشاہوں
لایمنعہ احد من المسلمین	نے (یعنی خلفائے بنوامیہ نے) اس کے
(ص ۱۳۵)	لکھنے پر مجبور کیا، اور اب ہم یہ سمجھتے
	ہیں، کہ کوئی مسلمان اب اس کو منع

یہی عبارت مختصر جامع بیان العلم لابن عبدالبر (ص ۳۶، مصر) تقیید العلم ابن ... ی ا ...
تہذیب التہذیب وغیرہ میں ہے، اس کا تعلق اس مسئلہ سے ہے، کہ بعض علما ... حدیث کے لکھنے
سے منع کرتے تھے، اور وہ بشدت اس سے پرہیز کرتے تھے، مگر سلاطین بنوامیہ نے فرمایش
کرکے محدثین کو مجبور کردیا کہ وہ احادیث کو اوراق میں لکھیں، اور اُن کے تحریری مجموعے ترتیب
دیں، اور آخر امام زہری کو بھی اس کی مصلحت معلوم ہوئی، اور انھوں نے اس کی تعمیل کی، چنانچہ
اُن کے ترتیب دئے ہوئے احادیث کے مجموعے ولید کے خزانہ سے اُس کے قتل کے بعد برآمد ہوئے
(ابن سعد ۲-۱-۱۳۶) غور کیجئے کہاں زہری کا یہ اقرار کہ "انھوں نے سلاطین کی فرمائش سے
احادیث کے مجموعے مرتب کئے" اور کہاں یہ اقرار کہ سلاطین کے مجبور کرنے سے انھوں نے حدیثیں
وضع کیں، اور گھڑیں" اللہ اکبر!

ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

فاضل پروفیسر کا یہ کہنا کہ "وہ سندیں جو واقدی کی نسبت عمدہ رائیں ظاہر کرتی ہیں، وہ ان سے
جو اس کی تنقیص کرتی ہیں، ایک نسل مقدم ہیں" تحقیق پر مبنی نہیں، بلکہ فقط واقدی کے ساتھ حسن ظن
پر مبنی ہے، واقدی کے موافقین اور مخالفین دونوں میں اس کے ہم عصر اور اس کے بعد کے لوگ

داخل ہیں، مزید ثبوت کے لئے ذیل میں دونوں کی ولادت اور وفات کی تاریخیں لکھدی جاتی ہیں، چونکہ واقدی کے موافقین اس کے مخالفین کے مقابلہ میں کم درجہ کے لوگ ہیں، اس لئے ان میں اکثر کی ولادت کی تاریخیں کم ازکم مجھ کو نہ مل سکیں،

۱۔ محمد بن عمر الواقدی

سنہ ۱۳۰ھ سنہ ۲۰۷ھ

۱۔ موافقین واقدی

نام	سال ولادت	سال وفات
۱ عبدالعزیز بن محمد دراوردی		سنہ ۱۸۶ھ
۲ یزید بن ہارون	سنہ ۱۱۷ھ (شاید)	سنہ ۲۰۶ھ
۳ ابو عبید قاسم بن سلام	سنہ ۱۵۷ھ	سنہ ۲۲۴ھ
۴ مصعب بن عبداللہ الزبیری	سنہ ۱۵۶ھ	سنہ ۲۳۶ھ
۵ محمد بن عبداللہ بن نمیر	.	سنہ ۲۳۴ھ
۶ محمد بن اسحاق مسیبی	.	سنہ ۲۳۶ھ
۷ عباس عنبری	.	سنہ ۲۴۶ھ
۸ یعقوب بن شیبہ	.	سنہ ۲۶۴ھ
۹ محمد بن اسحاق الصغانی	.	سنہ ۲۷۰ھ
۱۰ ابراہیم الحرانی		سنہ ۲۸۰ھ

۲۔ مخالفین واقدی

نام	سال ولادت	سال وفات
۱ امام شافعی	سنہ ۱۵۰ھ	سنہ ۲۰۴ھ

نام	سالِ ولادت	سال وفات
۲۔ یحییٰ بن معین	سنہ ۱۵۸ھ	سنہ ۲۳۳ھ
۳۔ احمد بن حنبل	سنہ ۱۶۰ھ	سنہ ۲۴۱ھ
۴ علی بن المدینی	سنہ ۱۶۱ھ	سنہ ۲۴۱ھ
۵۔ اسحاق بن راہویہ	سنہ ۱۶۱ھ	سنہ ۲۳۸ھ
۶۔ محمد بن بشار بندار	سنہ ۱۶۷ھ	سنہ ۲۵۲ھ
۷۔ ابو حاتم رازی	سنہ ۱۹۵ھ	سنہ ۲۷۷ھ
۸۔ امام بخاری	سنہ ۱۹۴ھ	سنہ ۲۵۶ھ
۹۔ جوزجانی (ابراہیم بن یعقوب)	۔	سنہ ۲۵۶ھ
۱۰۔ ابوزرعہ رازی	سنہ ۲۰۰ھ	سنہ ۲۶۴ھ
۱۱۔ ابوداؤد سجستانی	سنہ ۲۰۲ھ	سنہ ۲۷۵ھ
۱۲۔ امام نسائی	سنہ ۲۱۵ھ	سنہ ۳۰۳ھ
۱۳ ابوبشر دولابی	سنہ ۲۲۴ھ	سنہ ۳۱۰ھ
۱۴۔ ابن عدی	سنہ ۲۷۷ھ	سنہ ۳۶۵ھ
۱۵۔ دارقطنی،	سنہ ۳۰۶ھ	سنہ ۳۸۵ھ

امام بخاری کی وفات کا واقدی کی وفات کے پچاس (۵۰) برس بعد واقع ہونا، ان دونوں کی معاصرت کی نفی کی کوئی دلیل نہیں، معاصرت کا حساب دونوں کی زندگیوں کے کم وبیش ایک ساتھ ہونے سے لگایا جاتا ہے، نہ موت سے، واقدی نے سنہ ۲۰۷ھ میں وفات پائی، اور امام بخاری سنہ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے، اس لئے وہ اس وقت ۱۲ برس کے طالب العلم تھے، اور

واقدی کے ذاتی طور سے ملنے والے اور جاننے والے تمام درس گاہوں میں موجود تھے، امام بخاری نے اپنی کتاب تاریخ صغیر میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا یہی مطلب ہے، انھوں نے واقدی کے متعلق لکھا ہے (ص ۲۲۸، الہ آباد) ترکوہ یعنی لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا ہے، یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں، جو امام بخاری سے پہلے کے تھے، یا اُن کے زمانہ میں تھے، پہلی صورت میں یہ چھوڑنے والے خود واقدی کے معاصرین ہوں گے، اور دوسری صورت میں کچھ معاصر ہوں گے، اور کچھ معاصرین سے سننے والے ہوں گے، اس سے ثابت ہوا کہ بخاری کے مرنے سے واقدی کا پچاس برس پہلے مرجانا، بخاری کی واقدی سے عدم واقفیت کی دلیل نہیں ہو سکتی، خصوصًا جب کہ یہ معلوم ہوگا کہ وہ بچپن سے تحصیلِ علم میں مصروف ہو گئے تھے، اور واقدی کی وفات کے دو برس بعد ہی وہ عرب جانے کے لئے عراق پہونچ چکے تھے،

بہرحال موافقین کی ولادت کی تاریخیں چونکہ کمتر معلوم ہیں: اس لئے واقدی المتولد ۱۳۰ھ المتوفی ۲۰۷ھ کے معاصرین کا حال پورے یقین سے نہیں معلوم ہو سکتا، تاہم مخالفین کی تاریخوں کی نظیر سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۵۰ھ تک جس نے وفات پائی ہے اُس نے واقدی کا زمانہ پایا ہے، اس لحاظ سے موافقین میں سے نمبر ۱ تک یعنی عباس عنبری تک اوس کے معاصرین میں ہیں، اور تین متاخر ہیں،

مخالفین میں امام شافعی المتولد ۱۵۰ھ یحیی بن معین المتولد ۱۵۸ھ، احمد بن حنبل المتولد ۱۶۰ھ، علی بن المدینی المتولد ۱۶۱ھ اسحاق بن راہویہ المتولد ۱۶۱ھ بندار المتولد ۱۶۷ھ جیسے جلیل القدر ائمۂ فن ہیں جنھوں نے اوس کی ہم عصری کا زمانہ پایا ہے، اور کم از کم ستاون۵۷ برس سے ۴۰ برس تک اس سے اُن کی معاصرت قائم رہی ہے، واقدی کی وفات کے

وقت امام بخاری کی عمر ۱۴ برس کی تھی، جیسا کہ ابھی کہا گیا، ابو حاتم رازی کی عمر اس وقت ۱۳ برس کی، اور ابوزرعہ رازی کی عمر ۹ برس کی تھی، اور اس وقت واقدی کا چرچا درس کے اُن حلقوں میں کافی موجود ہوگا، جن میں جاکر وہ بیٹھے، بقیہ اشخاص کی رائیں ذاتی تجربہ پر نہیں، بلکہ واقدی کے مجموعوں اور اپنے ان شیوخ کی آرا پر مبنی ہیں جنھوں نے واقدی کو خود دیکھا تھا، یا واقدی کے دیکھنے والوں کو دیکھا تھا، البتہ ابو بشر دولابی، ابن عدی، اور دارقطنی کی رائیں اس کے متعلق اس کے معاصر جمہور علما اور بعد کے اکابر کے اختتامی فیصلہ پر مبنی ہیں، اس لئے واقدی کے معاملہ میں یہ اصول صحیح ہوگا کہ جب کسی شخص کے خود معاصرین اس کو اعلیٰ سند تسلیم کریں، تو مشکل مناسب ہوگا، کہ بعد کی نسل کے تھیا لوجینس کی بلا دلیل رایوں کی بنا پر اس کو جھوٹا کہکر بدنام کیا جائے،

واقدی کے مخالفین اور موافقین کی ترجیحی ترازو کا فیصلہ دو اور پاسنگ سے بھی ہو سکتا ہے، ایک ان کے فضل و کمال، جمہور اہل عصر میں، ان کے اعتبار و استناد، اور اُن کی شہرت اور عزت کی بنا پر، چنانچہ آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بحیثیت ایک سچے طالب العلم اسلام کے ان دو جماعتوں میں سے آپ سب سے زیادہ کس سے واقف ہیں، اور اسلامی لٹریچر میں کس کے نام کو اہمیت، اور کس کی رائے کو وقعت حاصل ہے، امام شافعی، امام بخاری، علی ابن مدینی، ابن حنبل، ابن معین، اور ابن راہویہ کو، یا دراوردی، زبیری ہیبی، یزید بن ہارون اور عنبری کو،

دوسرا ترجیحی معیار یہ ہے کہ واقدی کا ابتدائی زمانہ گو مدینہ میں گذرا، لیکن اس کی عمر کا بڑا حصہ بغداد میں بسر ہوا، اور وہیں اس کو شہرت حاصل ہوئی، اس بنا پر ان ائمہ کی رائے کو ترجیح حاصل ہے، جو بغداد اور عراق میں عموماً سکونت رکھتے تھے، یا اکثر آتے جاتے تھے، اس

حیثیت سے ان دونوں جماعتوں کا یہ حال ہے کہ درآ وردی مدینہ میں رہے، ۱۸۶ھ میں وفات پائی، اور بغداد آکر واقدی میں جو خاص انقلاب ہوا، اور جو اُن کی موت سے کم از کم ۲۲ برس بعد تک رہا اس کی واقفیت سے وہ قطعاً محروم رہے، اس لئے اُن کی رائے واقدی کی صرف مدنی زندگی تک محدود ہے، بقیہ میں ایک زبیری البتہ بغداد میں رہتے رہتے تھے، ابن نمیر کوفہ میں اور یزید بن ہارون واسط میں رہتے تھے، مگر مخالفین کو دیکھو کہ ان میں بیشتر اصحاب یا بغداد ہی میں رہتے تھے، یا بہت دنوں تک مدینہ اور بغداد دونوں میں رہے تھے، چنانچہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین خاص بغداد کے تھے، علی بن مدینی مدینہ اور بصرہ میں تھے، بنداربصرہ اور بغداد میں سکونت رکھتے تھے، اسحاق بن راہویہ عراق ہی میں سکونت پذیر تھے، امام شافعی مدینہ میں رہے، اور بغداد بھی آتے رہے، نتیجہ صاف ظاہر ہے؛

معارف جنوری ۱۹۲۷ء

سُنّت

خوشی کی بات ہے کہ کچھ لوگوں میں آج کل مذہبی تحقیقات کا شوق پیدا ہو رہا ہے، گو وہ ہمارے نقطۂ نظر سے آج کتنے ہی دور ہوں، مگر بہر حال اُن کا یہ شوق اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے اس قسم کی بحثوں میں پڑنا اپنے لئے تضیع وقت نہیں سمجھا، گو اس کا افسوس ہے کہ کامل تحقیق سے پہلے اپنے غور و فکر کے نتائج کو عام مسلمانوں کے سامنے پیش کر دینا ممکن ہے کہ بہتوں کی ٹھوکر کا باعث ہو، حق کی اشاعت ضروری ہے، لیکن شائع کرنیوالے پر اس کی بڑی ذمہ داری آتی ہے، کہ وہ پہلے حق کا حق ہونا اچھی طرح سمجھ لے، اردو کے ایک ادبی رسالہ[1] میں ماہ بماہ ایسے مضامین نکل رہے ہیں، جن میں اس قسم کی تحقیقات کے نمونے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں، خصوصاً ایک خاص صاحب[2] کے مضمون اور بھی زیادہ دلچسپ حقائق کا مجموعہ ہوا کرتے ہیں، جن کا سلسلہ خدا خدا کر کے اب تمام ہوا ہے، میں نے اس سلسلۂ مضمون کے بعض ٹکڑوں کو اُس وقت بھی پڑھا تھا، جب وہ پہلے پہل معارف میں چھپنے کی خاطر بھیجے گئے تھے، اور اب بھی دیکھا، پھر موصوف کے خیالات سے اکثر خطوط و مکاتیب کے ذریعہ بھی واقفیت ہوتی رہی، مگر ان تمام معلومات کے بعد بھی موصوف کی [illegible] روایات میں کوئی خاص اصول مدنظر نہیں معلوم ہوتا، میں نے ایک دفعہ انکو

---

[1] رسالۂ نگار [illegible] [2] نیاز فتحپوری،

یہاں کے ایک اور ہم خیال جج صاحب کو لکھا تھا،

گاہ بر دل زند و گاہ زند بجانہا

یا رزلفِ تو ندانم کہ چہ در سر دارد

یہی شعر اب بھی پڑھتا ہوں ہمارے دوست نے ان احکام کی ایک طویل فہرست دی ہے، جو قرآن پاک میں مذکور نہیں، اور اُن کا ماخذ صرف حدیث ہے، مجھے تو ان میں سے اکثر احکام قرآن پاک میں نظر آتے ہیں،

اصول فہم قرآن میں نے ایک سے زائد بار لکھا ہے کہ اس قسم کے مباحث میں جزئی باتوں کی تحقیق میں پڑنا بیکار ہے، ضرورت یہ ہے کہ اُن کے اصولِ کلیہ پر بحث کی جائے، جن کے اندر یہ تمام جزئیات داخل ہیں، مثلاً ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی عبارت سے کسی مفہوم و معنی کے مستنبط کرنے کے کیا اصول ہیں؟ ہمارے یہاں اصول فقہ کا بڑا حصہ انہی مباحث کی تفصیل میں ہے، اور اس میں وہ اصول بتائے گئے ہیں، جن کی بنا پر کسی عبارت سے کسی مفہوم و معنی کا استنباط کرسکتے ہیں،

مثلاً بحث یہ ہے کہ اگر قرآن میں کوئی ایسا لفظ یا محاورہ ہے، جس کے متعدد معنی ہیں یا جس کے حقیقی معنی یا مجازی معنی مراد ہونے میں شک ہو تو تعیین کیونکر ہوگی، یا یہ کہ اس کے معنی تو معلوم ہوں لیکن اس کے شمول میں شک ہو کہ کتنے افراد کو یہ شامل ہے، یا یہ بحث ہو کہ یہ حکم مطلق ہے، یا اس کے اندر کوئی استثنا یا تخصیص بھی ہے، یہ اور اسی قسم کی دوسری باتوں کے معلوم کرنے کے کیا قواعد ہیں؟

پھر یہ کہ ایک عبارت سے مطلب نکالنے کی متعدد صورتیں ہیں، ایک تو صاف صاف لفظوں سے مطلب نکلتا ہے، ایک اس کے عنوان بیان سے ظاہر ہوتا ہے، اس کے اشارات

وکنایات سے کچھ سمجھا جاتا ہے اسلئے اگر کوئی بات قرآن پاک کے لفظوں میں مذکور نہیں مگر اس کے عنوان بیان اور اشارات وکنایات سے مفہوم ہوتی ہے، تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قرآن میں نہیں۔

کیا جس طرح آج آپ کو قرآن پاک کی آیتوں کے نزول کے ماحول سے سیکڑوں برس کی دوری کے باوجود اُن کے متعلق بیسیوں نکتہ آفرینیوں کا حق حاصل ہے، یہ حق خود اس کو حاصل نہ تھا، جس پر یہ قرآن اترا، اور جس کو اُس کے تبیین اور تشریح کا حکم تھا؟

تفاوت ذہن

فرض کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ پر قرآن میں یہ حکم نازل ہوتا ہے، کہ "صبح سے شام تک روزہ رکھو" اب ایک شخص آکر پوچھتا ہے، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے بھولے سے کھا لیا کیا میرا روزہ صحیح ہوا؟ آپ نے فرمایا ہاں، بھول چوک معاف ہے، روزہ صحیح ہوا، اب سوال یہ ہے کہ آپنے جو یہ مسئلہ بتایا، اصولاً یہ قرآن کے اندر تو مذکور ہے مگر خاص روزہ کے حکم کے ساتھ مذکور نہیں، تو کیا یہ کہا جائے گا کہ یہ حکم قرآن کے اندر نہیں اور یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔

لیکن میں دوسری بات کہتا ہوں کہ دنیا میں تمام انسان ایک ہی قابلیت و ذہانت اور فہم کے نہیں ہوتے دیکھئے کہ آج آپ کو جو نکتہ آفرینیاں سوجھتی ہیں، وہ نہ پہلے کسی کو سوجھیں، اور نہ خود اس زمانہ کے بہت سے آدمیوں کو سوجھتی ہیں۔ قرآن پاک ہر آدمی پڑھتا ہے، مگر ایک صاحب علم کو اس کے لفظ لفظ سے جو حقائق ومعارف معلوم ہوتے ہیں وہ ایک عام آدمی کو نہیں معلوم ہوتے،

احادیث سے چارہ نہ تھا

جب یہ مسلم ہے، کہ افراد انسانی کی عقلیں متفاوت ہیں، اور اُن کے فہم وذہانت کے معیار مختلف ہیں۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اگر آنحضرت پر قرآن میں ایک حکم نازل ہونے کے بعد، اگر وہی یا اس سے بظاہر کسی قدر مختلف کوئی بات پیش آئے، یا کسی صحابی کو یہ شک پیدا ہو، کہ یہ واقعہ اس کلی حکم کے تحت میں ہے، یا نہیں،

تو اب وہ اپنی مشکل کے حل کے لئے کیا صورت اختیار کرتے؟ ظاہر ہے کہ یہی ممکن اور موزوں صورت ہو سکتی تھی کہ وہ صاحب وحی علیہ السلام سے آکر دریافت کرتے، پھر سوال یہ ہے کہ جب وہ آکر پوچھتے تو آنحضرت صلعم کیا کرتے، خاموش رہتے، یا قرآن پاک کی اس آیت کے بقیہ الفاظ کو جن کے سمجھنے یا جس کو اپنی صورتِ واقعہ پر منطبق کرنے میں، اُن کو شبہ پیدا ہو رہا ہے، دہرا دیتے یا یہ کرتے کہ جو گتھی اُن کے سامنے تھی، اُس کو سلجھا دیتے، اور بات صاف کر دیتے، ظاہر ہے کہ یہی آخر صورت قابلِ اختیار تھی، اب ایسی حالت میں کیا ان صحابی کے لئے یہ ناجائز قرار دیا جاتا کہ اپنی صورتِ واقعہ کو دربارِ رسالت میں اپنے سوال کو اور آپ کے جواب کو کسی دوسرے کے سامنے بیان نہ کرتے، یا اگر کسی دوسرے کو وہی صورت حال پیش آتی، تو اُس کو وہی حل نہیں بتاتے، کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس کو ناجائز اور ناروا نہیں کہہ سکتا، یہی صورت حال ہے، جس کا نام اصطلاح میں "حدیث" ہے،

اس کو کسی مثال میں دیکھئے تو واضح ہو جائے گا قرآن پاک میں ہے کہ

لا تحرموا طیبات ما احل — خدا نے تمہارے لئے پاک چیزیں حلال

اللہ لکم — کی ہیں، اس کو اپنے اوپر حرام نہ کرو،

ایک صحابی آکر پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلعم، میں چاہتا ہوں کہ شادی نہ کروں، بلکہ شادی کا جذبہ جن اسباب سے انسان میں پیدا ہوتا ہے انہی کو کاٹ ڈالوں، آپ نے فرمایا یہ جائز نہیں ہے، اس کے بعد قرآن پاک کی آیت مذکور پڑھی، جب تک اُن صحابی کی نظر نہیں پہنچی تھی، تو کیا ان صحابی کے پوچھنے اور آپ کے جواب دینے کے واقعہ کو کسی سے بیان نہ کیا جائے، اور اگر کسی تابعی کے ذہن میں وہی سوال پیدا ہوتا ہو تو کسی صحابی کیلئے یہ جائز نہ تھا کہ اس واقعہ کو اس کے سامنے دہرائے، اور اس کے شک کو دور کرے، اگر یہ جائز تھا

اور ہے تو اسی کا نام روایت حدیث ہے،

روایت سے چارہ نہیں، | روایت سے دنیا میں کسی فن کسی مذہب کسی حکومت کسی انسانی کاروبار کو کبھی بھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ ہر انسان، ہر واقعہ، ہر تجربہ اور ہر حادثہ کے وقت بذات خود موجود نہیں رہ سکتا، ایسی صورت میں غیر موجود اشخاص تک اس واقعہ، تجربہ اور حادثہ کو پہنچانے کی روایت کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی، خواہ وہ زبانی ہو، یا تحریری ہو، یا اُن لوگوں تک جو اس زمانہ کے بعد آئیں، پہنچانے کا ذریعہ روایت کے سوا کوئی دوسرا موجود نہیں ہے، دنیا کے تمام فنون، مسائل، مخترعات، اور واقعات وحوادث کی نقل، اور علم اسی طرح دنیا میں عہد بعہد پہنچا، اور پھیلا ہے، تو پھر کیا اسلام دنیا سے کوئی انوکھا واقعہ ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وفرائض و اقوال کو دوسروں تک یا آیندہ آنے والوں تک پہنچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ تلاش کیا جاتا،

آج کے یہ نئے مفسرین اور یہ جدید بانیانِ مذاہب بالفرض اپنی اُمت کے امام اور مقتدا بن جائیں، تو اُن کی ذاتی تحقیقات، کاوشیں، نکتہ آفرینیاں اُن کی اُمت کے ان افراد تک جو اُن کے حلقۂ درس سے دور ہیں، یا آج سے سینکڑوں برس بعد آئیں گے، پہنچانے کا تحریری یا زبانی روایت کے سوا، اور کیا ذریعہ ہوگا، خصوصًا اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ابھی کاغذ کی صنعت بھی اس ملک میں نہیں، لکھنے پڑھنے کا رواج بھی کم ہے، اور ڈاک تار، برقی مشین، پریس، اور چھاپہ کی ایجاد کو ابھی ہزار برس باقی ہیں،

آج دنیا میں بڑی بڑی قوموں کی تاریخیں، بڑے بڑے علماء کے خیالات، پرانے مصنفین کی تصنیفات، ہم تک کس طرح پہونچی ہیں، خود قرآن پاک ہم تک کس طرح

پہنچا ہے، اسی تحریری یا تقریری روایت کے ذریعہ سے' فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ قرآن پاک ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی روایت ہے، اور احادیث چند انسانوں کی، مگر ایسے انسان جن کا حال ہم کو معلوم ہے، اور اُن کا سلسلۂ سند ہمارے پاس محفوظ ہے، اس لئے قرآن وحدیث میں جو فرق ہو سکتا ہے، وہ وثوق اور اعتبار کی زیادتی اور کمی کا، اور قرآن وحدیث کے درمیان اس نسبت کو ہر مسلمان بلکہ ہر اہلِ حدیث تسلیم کرتا ہے،

اس لئے جس طرح دنیا میں عام روایتوں کے صحیح یا غلط ہونے کی تنقید کے اصول ہیں وہی حدیث کی بھی تنقید کے اصول ہیں، ہم سے جب کوئی بات کہی جاتی ہے، تو ہم اس کو کس طرح جانچتے ہیں، اسی طرح نہ کہ ہم دیکھتے ہیں، کہ بیان کرنے والا کیسا ہے، جس سے بیان کیا تھا، وہ کیسا تھا، جس وقت یہ واقعہ ہوا، وہ اُس میں موجود تھا یا نہیں، جس شخص سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے، اُس کے عام حالات سے یہ بات لگتی ہوئی ہے یا نہیں، یہی چیزیں ہیں جن کا نام اصولِ حدیث ہے،

اسلام کی تاریخ برباد ہو جائے گی،

اسلام کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے، کہ اس نے اپنے رسول کے ایک ایک واقعہ، ایک ایک قول، اور ایک ایک حکم کو دنیا میں محفوظ رکھا، اور اس کے لئے متعدد اصول اور فن ایجاد کئے، اگر اسلام کے اِن نئے محسنوں کے خیالات مان لئے جائیں تو یہ کارنامہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے لعنت بن جائے گا، اور صحابہ سے لے کر آج تک وہ تمام اخیار و ابرار امت جن کی زندگیوں پر آج نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کو ناز ہے، وہ سب کے سب راست بازی اور صداقت کی بارگاہ سے راندہ نکلیں گے، کیا اسلام پر احسان ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے لے کر آج تک خلفائے راشدین، تابعین، ائمہ مجتہدین علمائے خیر تمام کے تمام اپنے استنباطات، اور اجتہادات میں قرآن پاک کے بعد احادیث اور

اقوالِ نبوی کی تقلید و اتباع کرتے رہے ہیں لیکن اگر آج کے اجتہادات مان لئے جائیں تو لازم آئے گا کہ یہ سب کے سب نعوذ باللہ مشرک، انسان پرست اور کتاب اللہ کے تارک تھے، اور آج جو نئے مفسر اور نئے فقیہ بنے ہیں اُن کے اقوال و اجتہادات و استنباطات کے سننے والے موحد، سچے دیندار، اور کتاب اللہ کے سچے پیرو ثابت ہوں گے، اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن سخت ناکام رہا، اور تیرہ سو برس تک اسی طرح ناکام رہا، یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک قطعہ میں کتاب اللہ کے چند ماہرین اسرار پیدا ہوئے جنھوں نے اصل اسلام کو دنیا میں آشکارا اور وہ کام کیا جو نہ خود رسول نے کیا، نہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا، نہ عمر فاروق نے کیا، نہ عثمان غنی نے کیا، نہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کیا، نہ دوسرے صحابہ و تابعین نے کیا اور نہ دوسرے ائمہ مجتہدین سے ہو سکا، اس کے بعد کوئی بتائے، کہ قرآن کی عملی تصویر دنیا میں کبھی جلوہ گر تھی یا نہیں، اگر تھی تو وہ کب، اور اُس کی تاریخ کہاں ملے گی اور اگر نہ تھی تو قرآن سے زیادہ ناکام صحیفۂ آسمانی دنیا میں اور کون ہوگا، کیا کسی مسلمان کی غیرتِ ایمانی اس خیال کو جائز رکھتی ہے؟

احادیث کا کتنا حصہ قابلِ بحث ہو سکتا ہے

بہر حال آئیے غور کریں کہ احادیث میں کیا کیا ہے، اور اُس کے کتنے حصے پر بحث کی جا سکتی ہے: احادیث کا بڑا حصہ درحقیقت تاریخی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے حالات، سوانح، اور واقعات کی روایتیں ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کوئی قابلِ بحث چیز نہیں، یہ تاریخ کا اسی طرح حصہ ہیں، جس طرح دنیا کی اور تاریخیں ہیں، فرق یہ ہے کہ یہ تاریخ کا ایسا مستند و معتبر حصہ ہے جس سے زیادہ معتبر اور مستند حصہ دنیا میں موجود نہیں، مصر، ہندوستان، بابل، نینوی، سیریا، یونان و روم کس ملک اور کس قوم کی تاریخ ہے، جو اس استناد، اس اعتبار اس سلسلہ کے ساتھ محفوظ ہے، اور

جو تقلیدِ روایت کے اصول پر ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہر سکتی ہے،

۲- دوسرا حصہ اخلاق و حکم کا ہے، جس میں عقل و حکمت کی عمدہ عمدہ باتیں، مثلاً جھوٹ کی بُرائی، عدل کی تعریف، علم کی خوبی وغیرہ بیان کی گئی ہیں، جن کی قرآن کے علاوہ خود فطرتِ انسانی تصدیق و تائید کرتی ہے، کیا یہ رد کے قابل ہیں؟

۳- تیسری چیز عقائد ہیں،

اسلام کے ایک چھوٹے سے فرقہ کے سوا بلکہ یوں کہنا چاہیئے، کہ غالی ظاہریہ کے سوا کوئی اس کا قائل نہیں، کہ عقائد کا ثبوت قرآن کے علاوہ کسی اور طور سے ہو سکتا ہے کیونکہ عقیدہ نام ہے یقین کا، اور یقین کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ وحی اور اُس وحی کا تواتر ہے اس لئے عقائد کا مبنی صرف قرآن پاک یا احادیثِ متواترہ ہیں، ظاہر ہے، کہ احادیثِ متواترہ کا مطلق وجود نہیں، یا ایک دو سے زیادہ نہیں، ایسی حالت میں عام احادیث عقائد کا مبنی نہیں قرار پا سکتی ہیں، عموماً احادیث روایتِ احاد ہیں، اور اُن کا ایک حصہ مستفیض ہے یعنی صحابہ کے بعد ان کے راویوں کی کثرت ہوئی ہے، اس لئے یہ روایتیں صرف قرآن پاک کی آیات کی تائید میں کام آسکتی ہیں، مستقلاً اُن سے عقائد کا ثبوت حاصل نہیں کیا جا سکتا،

۴- اب رہ گئے احکام، ان کے لئے مستفیض و احاد سب کچھ کارآمد ہیں، دنیا میں تمام عملی کاروبار اسی پر چل رہا ہے، ایک آدمی تنہا آپ کو آکر اطلاع دیتا ہے، کہ فلاں شخص آپ کو بلاتا ہے، آپ بے چون و چرا اُس کے ساتھ ہو جاتے ہیں، کبھی سوال و جواب نہیں کرتے، کہ اُس نے بلایا بھی ہے، یا نہیں، ہاں اگر کسی قرینہ سے شک ہوتا ہے، تو سوال و جواب کر لیتے ہیں، یہی سب صورتیں احادیث میں بھی جاری ہیں، مثلاً اگر کوئی حدیث

کسی دوسری زیادہ معتبر روایت کے خلاف ہو، قرآن کے خلاف ہو، یا اور کوئی بات اس کے مخالف نظر آئے، تو ایسے موقع پر یقیناً صاحبِ تحقیق کو حق ہے کہ اس پر بحث کرے۔

احادیث قرآن سے ماخوذ ہیں

بہت سے علمائے محققین کی طرح میرا بھی یہ اعتقاد ہے کہ احکام و اخلاق کے متعلق صحیح احادیث میں جو کچھ ہے، وہ تمام تر قرآن سے ماخوذ و مستنبط ہے، اور چونکہ خود صاحبِ وحی کا بتائیدِ الٰہی و بشرحِ ربانی استنباط ہے، اس لیے بشرط ثبوتِ سند، وہ بھی یقینی اور واجب التعمیل ہے، قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام "تبیین" کھولنا اور واضح کر دکھانا ہے، اس موقع پر ہم کو بے شک یہ گلہ ہے، کہ ہمارے علماء اور خصوصاً علمائے متاخرین نے اس حیثیت سے قرآن پاک کی خدمت کم کی، حالانکہ صحابہ اور ائمہ مجتہدین نے اپنے اجتہادات اور استنباطات میں ہمیشہ قرآن کو سب سے اول پیشِ نظر رکھا لیکن بطورِ فن کی حیثیت سے اس کو مستقل نہیں کیا، اُن کا زمانہ تدوینِ فن کا نہ تھا، یہ بعد کے لوگوں کا کام تھا، اس کی وجہ یہ ہوئی، کہ جس طرح کتبِ فتاویٰ کی سہولت نے لوگوں کو فقہ سے اور کتبِ فقہ کی سہولت نے حدیث سے باز رکھا، اسی طرح حدیث کی سہولت اور ابواب کی تقسیم نے لوگوں کو قرآن کی طرف رجوع کرنے سے باز رکھا، کہ قرآن مجید میں ہر مسئلہ الگ الگ عنوانوں اور بابوں میں درج نہیں، اس لئے لوگوں کو تلاش میں دقت ہوتی ہے، پھر قرآن سے استنباط کر لینا ہر عامی کا کام نہیں، علماء میں سے جنہوں نے احکام القرآن پر کتابیں لکھیں، انھوں نے بھی تفسیری ترتیب کو چھوڑ کر فقہی ترتیب کو اختیار نہیں کیا، جس کی وجہ سے جو مشکل لوگوں کو قرآن کی طرف رجوع ہونے میں پہلے پیش آتی تھی، وہ پھر باقی رہی، بہرحال ضرورت ہے کہ اب عقائد القرآن اور اخلاق القرآن پر ہمارے علماء مفصل کتابیں لکھیں، آج بھی جو لوگ قرآن پاک کے ساتھ شغف کا اظہار کر رہے ہیں،

اور قرآن ہی کو صرف حجت جانتے ہیں، وہ بجائے اپنے موجودہ طرزِ عمل کے قرآن واحادیث کے باہمی تعلق وارتباط پر اس نظریہ کو سامنے رکھ کر کام کرتے، تو اسلام کے لئے کتنا بڑا عظیم الشان کارنامہ انجام دیتے، مگر افسوس ہے کہ اس کے بجائے، اور بھی تفرقے وانتشار کا باعث ہو گا جس کی مثالیں چند ہی سال میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں نظر آتی ہیں،

بہرحال اس غلط طریقہ کے سوا ایک اور خلط مبحث بھی ہو رہا ہے۔

حدیث وسنت میں فرق

آج کل لوگ عام طور سے حدیث وسنت میں فرق نہیں کرتے، اور اس کی وجہ سے بڑا مغالطہ پیش آتا ہے، حدیث تو ہر اس روایت کا نام ہے، جو ذاتِ نبوی کے تعلق سے بیان کی جائے، خواہ وہ ایک ہی زمانہ کا واقعہ ہو یا ایک ہی شخص نے بیان کیا ہو، مگر سنت دراصل عملِ متواتر کا نام ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عمل فرمایا، آپ کے بعد صحابہ نے کیا پھر تابعین نے کیا، گو یہ زبانی روایت کی حیثیت سے متواتر نہیں، مگر عملاً متواتر ہے، اسی طرح یہ بالکل ممکن ہو کہ ایک واقعہ روایت کی حیثیت سے مختلف طریقہ سے بیان کیا گیا ہو، اس لئے وہ متواتر نہ ہو مگر اس کی عام عملی کیفیت متواتر ہو، اس متواتر عملی کیفیت کا نام سنت ہے،

فرض کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی فرضیت کے بعد تمام عمر دن میں پانچ دفعہ پڑھتے رہے، آپ کے بعد تمام صحابہ کا یہی طرزِ عمل رہا، یہی تابعین کا رہا، اور یہی روئے زمین کے تمام مسلمانوں کا رہا، ان کا بھی جو بخاری ومسلم کے وجود سے پہلے تھے، اور ان کا بھی جو اس کے بعد پیدا ہوئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پانچ وقت کی نماز اصطلاحی روایت متواترہ سے ثابت ہو یا نہ ہو، لیکن عملِ متواترہ سے

بلا شک وشبہ ثابت ہے، تیرہ سو برس زائد سے آج تمام دنیا کے مسلمان جن کے عقائد، اعمال، خیالات، اخلاق، زبان، تمدن، وطنیت اور زمانہ میں بحد اختلاف اور تفاوت ہے، تاہم اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھا کرتے تھے، فلاں فلاں اوقات میں پڑھا کرتے تھے، اور فلاں فلاں ارکان کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، یہ تواتر عملی ہے، جس کا انکار مکابرہ ہے،

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان پانچ اوقات کا تعین اور اس طرح طریقۂ نماز بخاری یا مسلم یا ابوحنیفہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم کی وجہ سے مسلمانوں میں رواج پذیر ہوئی ہے، وہ عملیت ہے جو اگر بخاری یا مسلم دنیا میں نہ بھی ہوتے، تو بھی وہ اسی طرح عملاً ثابت ہوتی، ... ...

... ... مطلب اگر دنیا میں بالفرض احادیث کا ایک صفحہ بھی نہ ہوتا، تو بھی وہ اسی طرح جاری رہتی، احادیث کی تحریر وتدوین نے اس طرز عمل کی ناقابل انکار تاریخی حیثیت ثبت کردی ہے، تو کیا پھر اس بنا پر کہ اس عملی کیفیت کو دوسری یا تیسری صدی کے کسی محدث نے الفاظ وتحریر میں قلم بند کردیا، وہ تواتر حد اعتبار سے گر گیا ؟

عملی روایت میں اختلاف اس موقع پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض عملی روایات میں بھی تو اختلاف ہے، روایتوں میں ہے کہ آپ یا اصحابؓ رفع یدین کرتے تھے، بعض میں ہے کہ نہیں کرتے تھے، بعض میں ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھتے تھے، دوسری روایت میں ہے کہ ناف پر ہاتھ باندھتے تھے، ایک میں ہے کہ آمین زور سے کہتے تھے، دوسری میں ہے کہ

آہستہ کہتے تھے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں عملاً کیونکر درست ہو سکتے ہیں، میرا جواب یہ ہے کہ اس مشکل کے حل کی بھی وہی تدبیر ہے جو دنیا کے دوسرے روایتی واقعات کے حل میں اختیار کرتے ہیں۔ اگر آپ کے سامنے کسی نادیدہ واقعہ کے متعلق دو قسم کی مختلف روایتیں آتی ہیں، تو آپ کیونکر فیصلہ کرتے ہیں؟ یہی کرتے ہیں کہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں بیان کرنے والوں میں سے کون زیادہ معتبر اور ثقہ ہے؟ یا کس کا بیان دوسرے یقینی حالات و واقعات سے زیادہ قرین قیاس ہے؟ یہی صورت ان احادیث میں بھی ہے، جتنا حصہ ان عملی روایات کا ایسا ہے جو بلا کوئی اختلاف ثابت ہے، وہ یقینی اور ناقابلِ رد ہے، اور جتنا حصہ مختلف فیہ ہے اگر ان مختلف پہلوؤں میں کوئی ایک پہلو اصولاً اور قیاساً زیادہ معتبر ہے اس کو اختیار کرنا چاہئے اور اگر سب پہلو برابر ہیں، تو یہ مان لینا چاہئے کہ ان مختلف طریقوں میں جس طرح بھی کیا جائے وہ صحیح ہے۔

فرض کیجئے نماز کے متعلق پانچ اوقات کے عمومی تعین، نمازوں کی تعداد، نمازوں کی عام ہیئت، یعنی قیام، رکوع، سجود، اور بحالت قیام قرآن پڑھنے میں، اور دوسرے ارکان میں تسبیح و تہلیل کہنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اس لئے یہ عمل متواتر ہے، اور اس میں کوئی شبہہ اور شک نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بات کہ رفع یدین کیا جائے یا نہ کیا جائے، آمین زور سے کہی جائے، یا آہستہ، دو وقت کی نماز ایک وقت میں کب اور کہاں پڑھی جا سکتی ہے، اُن کے متعلق اگر اختلاف ہے تو تحقیق کرنی چاہئے کہ ان میں سے غالب پہلو کس طرف ہے، اگر آپ کو اس کا پتہ لگ سکے، تو اس کو اختیار کیجئے ورنہ یہ سمجھ لیجئے کہ دونوں طرح سے جائز ہے، اور ان میں سے جو پہلو بھی کوئی اختیار کرے"

اس پر ملامت نہیں ہے،

سنّت کی حقیقت — اس تفریق سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ سنّت اور حدیث میں عظیم الشان فرق ہے، حدیث محض روایت کی حیثیت کا اور سنّت اس کے عملی تواتر کا نام ہے، احادیث کو چھوڑ کر قرآن پاک کی بھی یہی صورت ہے، قرآن پاک کا حکم ہے، کہ نماز پڑھو "اقیموا الصلوٰۃ" اُس کی تفصیلات بھی جا بجا بتا دیں، انہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ کر بتا دیا، اور فرمایا صلّوا کما رأیتمونی" اس طرح نماز پڑھو، جس طرح تم نے مجھے پڑھتے دیکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر اسی طرح پڑھتے رہے، قرآن پاک کے الفاظ کی جو عملی تصویر آنحضرت صلی اللہ وسلم نے پیش فرمائی، وہی سنّت ہے، اور یہ گویا قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے، جس کا مرتبہ احادیث کے لفظی روایات سے بدرجہا بلند ہے، سنّت کے علاوہ اسی مفہوم کے لئے قرآن پاک، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے دوسرے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے، مثلاً سبیل اور اسوہ وغیرہ، مگران سب کے معنی چلے ہوئے راستہ اور پیروی کے ہیں، یعنی وہ راستہ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھر چلے، تمام صحابہ چلے، اور اکابر امت چلے، وہ سنّت ہے، سبیل ہے، طریق ہے، اور اسوہ ہے، اور یہی وہ مفہوم ہے، جس کے لئے امام مالک نے موطا کا لفظ ایجاد کیا، اور اپنے مجموعہ روایات کا نام رکھا، موطا کے لفظی معنی پامال اور روندے کے ہیں، یعنی وہ پامال اور روندا ہوا راستہ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ گذرے، یہی راستہ علی اسلام کا ہے، اور وہی قرآن کی صحیح عملی تفسیر ہے،

کتاب وسنّت — احادیث میں اکثر کتاب وسنت کا لفظ ساتھ آیا ہے خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبوں میں ہے، کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں

چھوڑ جاتا ہوں، کتاب اللہ اور اپنی سُنّت" اس حدیث کی تشریح میں سُنّت سے مقصود صرف لفظی روایت اور عن عن کی حدیث نہیں ہے، بلکہ آپ کا عمل متواتر اور موطا طریق ہے، جو قرآن پاک کی صحیح تفسیر و تشریح ہے،

سنّت اور بدعت آپنے دیکھا کہ سُنّت کی حقیقت کیا ہے، اور احادیث میں جس سُنّت کے اتباع کی بار بار تاکید آئی ہے، وہ کیا چیز ہے اور "علیکم بسنتی" میرا طریقہ اختیار کرو، بعض امور کے متعلق من سُنتی میرا طریقہ کہنا، بعض چیزوں کے متعلق اصبت السنۃ تم نے سُنّت کو پالیا کہنے کا کیا مفہوم ہے،

اسی سُنّت کا مقابل بدعت ہے، جس کے معنی نئی بات کے ہیں، اور ہمیشہ سنّت اور بدعت یہ دونوں لفظ مقابل اور ضدین کی حیثیت سے بولے جاتے ہیں، کیونکہ سنت کے معنی ہیں وہ طریق جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، اور بدعت کے معنی ہیں اس کو چھوڑ کر اور اس سے الگ ہو کر اپنے لئے کوئی نئی راہ عمل اختیار کرنا، اسی لئے پہلی چیز ہدایت اور دوسری ضلالت ہے

کیا سنّت عبرانی لفظ ہے؟ اردو کے اسی سابق الذکر رسالہ میں اُسی سابق الذکر مضمون نگار نے یہ دعوی کیا ہے کہ سُنّت کا لفظ عبرانی "مناۃ" سے نکلا ہے، یہودیوں نے توراۃ کو چھوڑ کر اسی قسم کے مجموعۂ روایات کو اپنا ماخذ بنالیا تھا جس کو وہ مناۃ کہتے تھے، اسی طرح مسلمانوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو اپنا ماخذ بنایا ہے، اس کا نام بھی اسی لفظ مناۃ سے لیکر سنت بنالیا ہے،

افسوس ہے کہ یہ تحقیق انیق ہر قسم کے اندرونی و بیرونی، اسلامی و افرنگی، عربی و عبرانی تحقیقات کی ٹکسال سے باہر ہے، اور ایسا دعوی کرنا اہل علم کی نگاہوں میں اپنی حقیقت کو عیاں پیش کرنا ہے،

عبرانی لفظ مسناۃ "س" سے نہیں ہے، بلکہ "ش" سے ہے، یعنی مثناۃ جو عربی میں ثنی اور اثنین اور تثنیہ کی صورت میں ہے، اس کے لفظی معنی دو کے ہیں، اور یا مکرر اور دوہرائے ہوئے کے ہیں، مثناۃ تورات کی پانچویں کتاب کا نام ہے، جس کو آج کل عربی میں "تثنیہ" کہتے ہیں، اور غلطی سے اس کا ترجمہ استثناء کر دیا گیا ہے، انگریزی میں اس کا ترجمہ ڈیوٹرو نومی (Deutranomi) ہے، جس کے لفظی معنی وہی ثنی اور مکرر کے ہیں، توراۃ کے وہ وہ قوانین جو پچھلی کتابوں میں مذکور ہیں، اس کتاب میں ان کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ مرتب اور مدون کرکے پیش کیا گیا ہے، اس لئے اس کا نام مثناۃ تثنیہ، یا ثنی اور مکرر کہا گیا، خود قرآن پاک نے اپنے اوپر مثناۃ کی جمع مثانی کا اطلاق متعدد آیتوں میں کیا ہے، غور کیجئے کہ اس مثناۃ کے لفظ کو سنت سے کیا تعلق ہے، مثناۃ کوئی ایسا لفظ نہیں، جو علمائے سلف اور لغویین عرب کو معلوم نہ ہو، لسان العرب، صحاح جوہری، مجمع البحار نفتی سب میں یہ لفظ ثنی کے تحت میں مذکور ہے، اور اس کے معنی لکھے ہیں، اور اس پر تھوڑی سی بحث کی ہے، سنت خالص عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے لفظی معنی رستے کے ہیں، لیکن بول چال میں اس کے معنی، اس طریقہ عمل کے ہیں، جس پر ہمیشہ کوئی عمل جاری رہے، قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے،

قد مضت سنة الاولین،	گذشتہ قوموں کا طریق عمل
(انفال)	گذر چکا،
الا ان تاتیھم سنة الاولین	لیکن یہ کہ گذشتہ قوموں کا
(کھف)	طریق عمل اُن کے ساتھ برتا جائے،
... قد ارسلنا	اُن لوگوں کا طریقہ عمل جن کو ہم نے

قَبْلِکَ، تم سے پہلے رسول بنایا،

(اسرائیل)

سنۃ اللہ کا لفظ قرآن مجید میں اس معنی میں کئی دفعہ آیا ہے،

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا، خدا کے طریقِ عمل میں تم تبدیلی نہ پاؤ گے،

(احزاب و فتح)

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا خدا کے طریقِ عمل میں تم تغیر نہ پاؤ گے،

(ملائکہ)

کیا اس سے بھی زیادہ ہم کو اپنی شہادت کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہے،

سنت اور بدعت کا معیار

مسلمانوں میں اختلاف کا آغاز قرنِ اول ہی سے ہوگیا تھا، لیکن غور سے دیکھئے کہ یہ اختلاف زیادہ تر نظریات و آراء کا تھا، جن کو عمل سے تعلق نہ تھا کیونکہ غیر مادی، غیر محسوس امور کے متعلق کوئی محسوس و مادی عملی شہادت پیش نہیں کی جاسکتی تھی، مثلاً یہ کہ خلافت مسلمانوں کے مشورہ سے ہے، یا نصِ الٰہی سے ہے، یہ شیعہ اور اور اہلِ سُنّت کے درمیان سب سے اہم بحث ہے، یا یہ کہ قیامت میں دیدارِ الٰہی ان ظاہری آنکھوں سے ہوگا، یا نہیں؟ یہ ایک معرکۃ الآراء اختلافی بحث معتزلہ اور اشاعرہ و ماتریدیہ کے درمیان میں ہے لیکن یہ تمام اختلافات نظریاتی حیثیت رکھتے ہیں، ان مسائل میں جن کی حیثیت عملی، مادی اور محسوس تھی، مسلمانوں میں کوئی بڑا اختلاف کبھی پیدا نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر عملی سنت سب کے پیشِ نظر تھی، اور یہ اسلام کا سب سے بڑا امتیاز تھا، رفعِ یدین، آمین بالجہر، وضعِ ید علی الصدر، قرأت

فاتحہ خلف الامام کی بحثیں اگر فریقین کا غلو اور تعصب علٰحدہ کر دیا جائے تو یہ صرف افضلیت کی بحث رہ جاتی ہے جو زیادہ اہم نہیں،

یہ ہر مذہب کا اصول کلی ہے، خصوصًا اسلام کا اور فطرۃً ایسا ہی ہونا بھی چاہئے، کہ ہر مذہب کا بہترین عہد اور دور وہ ہوتا ہے، جو خود صاحب مذہب کا مُبارک زمانہ ہوتا ہے، اس کے بعد اُس کے جانشینوں اور صحبت یافتوں کا، پھر رفتہ رفتہ اُس میں ضعف ہوتا جاتا ہے، اور اُس کے مذہب کا قوام بگڑتا جاتا ہے، اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اصل مذہب نہیں، بلکہ وہ ہے، قرآن کا یہ حکم نہیں، بلکہ وہ ہے تو اُس کا فرض ہے، کہ رسُول کے مُبارک عہد میں جو طرز عمل اُس کو نظر آتا ہے، اُس کو اصل مذہب کا معیار قرار دے، اور جو چیز اس عہد میں نظر نہیں آتی، اور بعد کو وہ شامل ہوجاتی ہے، اُس کو مذہب سے خارج یعنی بدعت قرار دے، اس اصول کی بنا پر جو بالکل واضح ہے، ہر اُس شخص کا جو اسلام کے اصلی پیکر کی جلوہ آرائی کا مُدّعی ہے، اور قرآن کی صحیح تعلیم کو آج دنیا میں پیش کرنا چاہتا ہے، یہ فرض ہے کہ وہ اس اصلیت اور اس صحیح تعلیم کے خط وخال اس عہد مبارک کی عملی زندگی میں دکھائے، اور یہ بتائے کہ آج جو غلطیاں اُس کو نظر آتی ہیں، وہ اُس وقت نہ تھیں بلکہ بعد کو اسلام میں داخل ہوگئی ہیں، مثلاً یہ بتائے کہ اس عہد مُبارک میں صرف دو وقت یا تین وقت کی نماز تھی، بعد کو جب بخاری ومسلم وابو داؤد مُرتب ہوگئیں، تو مسلمانوں میں پانچ وقتوں کی نماز کا رواج ہوا، پہلے اس طرح نماز پڑھی جاتی تھی، بعد کو اُس میں فقہاء اور محدثین نے یہ اضافہ کر دیا، اگر یہ ثابت نہیں ہوسکتا، اور یقیناً ثابت نہیں ہوسکتا، تو یہی ماننا پڑے گا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(نعوذ باللہ) اپنے زمانہ میں اپنی وحی کے سمجھنے میں غلطی کی، اور اب اُس کو ہندوستان کے عجمی اپنی معمولی صرفی ونحوی لیاقت سے درست کر رہے ہیں، کیا کوئی مسلمان بلکہ انسان بھی ایسا احمقانہ دعویٰ کر سکتا ہے؛؟

(معارف اگست ۱۹۲۹ء)

پھر بحثِ سنت

کچھ اور اختراعات و الزامات

(۱)

دوستوں کو یاد ہوگا کہ اگست ۲۹ء کے معارف میں ایک صاحب[۱] کے جواب میں "سُنّت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا گیا تھا جس میں مُدعی مذکور کے اس خیال کی تردید کی گئی تھی، کہ سنت اور زبانی روایات یا حدیث ایک چیز ہیں، اور اُس کے اس اختراع کی غلطی ظاہر کی گئی تھی، کہ مسلمانوں کا لفظ "سُنّت" یہودیوں کے لفظ "مِشناۃ" سے ماخوذ ہے، جو یہودیوں کے اُن زبانی روایات کے مجموعہ کا نام ہے، جو سنہ عیسوی سے پس و پیش زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس بعد مُرتب ہوا تھا،

اسی مضمون سنت کے چھپنے کے بعد مدعی مذکور نے پہلے خط و کتابت کے ذریعہ سے سوال و جواب کیا، اور اس کے بعد ایک طویل مضمون اپنے مُدّعا کے اثبات اور میری تردید میں چھپوایا، جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے، اس کے جواب میں انشاء اللہ

---

[۱] نیاز فتحپوری،

کوتاہی نہ ہوگی، لیکن موصوف کے مضمون کے لب ولہجہ اور طرز و انداز کے جواب کی توقع کم از کم معارف میں نہ رکھنی چاہیے،

مجھے یہ ظاہر کرنے میں خوشی ہے کہ معارف کے اس مضمونِ سنّت کو اللہ تعالیٰ نے توقع سے زیادہ کامیابی بخشی، موافقین کے علاوہ بعض مذبذب دوستوں کے شکوک بھی اس سے دور ہوئے،

مگر افسوس ہے کہ اصل مخاطب کو اس سے تشفی نہیں ہوئی، بلکہ اپنی غلطی یا غلط فہمی پر اُن کا اصرار اور بڑھ گیا، موصوف کو میرے انگریزی نہ جاننے پر تاسف ہے، یہ تاسف مجھے خود بھی ہے، مگر اُن کی تسلی کے لئے بطور اظہار واقعہ یہ امر ان پر ظاہر کر دینا ہے کہ اُن کی آرزو کے مطابق میں کم از کم اتنی انگریزی جانتا ہوں کہ انسائیکلو پیڈیا کے تاریخی و مذہبی مضامین پڑھ اور سمجھ سکوں، انھیں اس کا اطمینان رکھنا چاہئے، اور یہ بات اُن کو میری اس تصنیف (ارض القرآن) کو پڑھ کر سمجھ لینی چاہئے تھی، جس کی اچھی انھوں نے اپنے والانامہ مورخہ ۲۰ر فروری سنہ ۱۹۳۰ء میں تعریف و توصیف کی ہے، اور اپنے مضامین میں اس سے سرقہ کا "بخلوت" اعتراف بجا کیا ہے، اور ناظرین بھی اُن کے مضامین "قرآن مجید و آثار قدیمہ" اسلامک ریویو اور اشاعت اسلام میں دیکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں،

مضمون زیر بحث میں دو قسم کی بحثیں ہیں، ایک لفظی اور دوسری معنوی، دونوں بحثوں کو علحدہ کر دینا ہے تاکہ مسئلہ صاف ہو جائے،

مسنات اور سنّت | لفظی بحث یہ ہے کہ ہمارے دوست کا دعویٰ ہے کہ یہود اپنی زبانی روایات کو "مسناۃ" اور مسلمان اپنی زبانی روایات کو "سنّت" کہتے ہیں، مسلمانوں کا یہ عربی

لفظ "سنّت" یہودیوں کے عبرانی لفظ "مسناۃ" سے ماخوذ ہے، دونوں بالکل ایک لفظ ہیں، اور ہم معنی ہیں،

میں نے اگست ۱۹۲۹ء کے معارف میں مدعی کی اس تحقیق سے اختلاف کیا، اور ثابت کیا کہ اوّلاً عبرانی لفظ "مسناۃ" "س" سے نہیں بلکہ "ث" سے ہے، یعنی "ثمناۃ" اور دوم اس کے معنی عبرانی میں دوسرے، دوہرانے اور اعادہ و تکرار کے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کا اطلاق موسیٰ کی پانچویں کتاب پر ہوتا ہے، جس کو یونانی ڈیٹرونومی کہتے ہیں، جس کے معنی دوسرے اور دوسرے قانون کے ہیں، اور عبرانی میں اس کو مشنا کہا جاتا ہے، اور عربی میں ثمناۃ کہتے ہیں، اور آج کل تثنیۃ الاشتراع (دوبارہ قانون سازی) کہتے ہیں، اور اس سب کا ماخذ عبرانی میں "شنا" اور عربی میں "ثنیٰ" اور ان دونوں کے معنوں میں دونوں زبانوں میں دو، دوم اور دوہرانے کا مفہوم ہے، اور سُنّت خالص عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی راستہ اور طریق کے ہیں، اور اصطلاح میں اس کے معنی وہ طریق ہے جس پر محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تمام عمر قائم رہے، اس کے معنی زبانی روایات کے نہ لغوی ہیں نہ اصطلاحی، اس لئے عبرانی "مشناۃ" اور عربی سُنّت میں کوئی باہم مشارکت و مماثلت نہیں، اور نہ عربی سُنّت عبرانی مشناۃ سے ماخوذ ہے،

ہمارے مخاطب اوّل نے اس مضمون کو پڑھ کر ۵ دسمبر ۱۹۲۹ء کو مجھے خط لکھا کہ تمہاری تحقیق غلط ہے، ڈیوٹرونومی کے لئے مسنا (س) لفظ ہے، اور مشنا بالکل جدا گانہ لفظ ہے، میں ایک سے زائد یہودی معلمین سے اس لفظ کی تحقیقات کر چکا ہوں، اور اس کی تائید انسائیکلو پیڈیا بڑٹانیکا سے بھی مل سکے گی،

"اگر اس کے معنی آپ سُنّت سے علٰحدہ دکھائیں تو میں ہار مان لوں"

میں نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا اُس کا مطلب یہ تھا، کہ مشنا توراۃ کی پانچوں کتاب پر بھی اطلاق کیا گیا ہے، اور تالمود کے ایک حصہ کا نام بھی ہے، یہ کوئی اہم نقطۂ اختلاف نہیں ہے، بلکہ اصل چیز "مشنا" کے معنی ہیں، ساتھ ہی میں نے اطلاع دی کہ "مشنا" کے معنی تعلیم اور سکھانے کے بھی ہیں، انھوں نے اس کے ماننے سے بھی انکار کیا، اور لکھا کہ تم کو "تالمود کے معنی سے دھوکا ہوا ہے، جس کے معنی واقعًا تعلیم اور سکھانے کے ہیں، اب اس تازہ مضمون میں ہمارے دوست نے پھر اپنی پرانی تحقیق کو بہت فخر و ناز کے ساتھ دہرایا ہے، مگر صرف دہرایا ہی ہے، کوئی دلیل یا حوالہ نہیں درج فرمایا ہے،

اب نقطۂ اختلاف دو ہیں،

۱۔ کیا توراۃ کی پانچویں کتاب کو بھی عبرانی زبان میں مشنا بولتے ہیں،

۲۔ کیا سنت اور مشنا ایک ہیں،

مشنا توراۃ توراۃ کی پانچویں کتاب کو میرے "مشنا" کہنے پر پنڈت جی نے مضحکہ اڑایا ہے، اور فرمایا ہے کہ "ایک یہودی بچہ بھی اس کو سُن کر ہنس دے گا،" مگر میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ تحقیق کا راستہ مضحکہ سے بمراحل دور ہے، توراۃ کی پانچویں کتاب کا نام "قانون ثانی" اس لئے رکھا گیا ہے کہ قانون اوّل کے بعد دریائے اردن کے اس پار حضرت موسیٰؑ نے اس کو دوبارہ بیان کیا، جیسا کہ اس کتاب کے آغاز میں تحریر ہے، اس کا عبرانی نام "الوہی وبران" بھی ہے، مگر بعد کو شاید مصر کے ترجمۂ سبعینی کے وقت سے اس کا نام "مشنا توراۃ" مشہور ہوگیا، جس کے معنی "قانون دوم" کے ہیں، اسی لئے یونانی اور اس سے یورپ کی زبانوں میں اس کا نام "ڈیوٹرونومی" یعنی دوسرا قانون پڑا، اور اسی لئے پرانی

عربی میں "مثناۃ" اور نئی عربی میں اس کا نام تثنیۃ الاشتراع ہے، یعنی "دوبارہ قانون بنانا"

بہرحال ان سب کے معنوں میں دو، دوم، اور دہرانے کا مفہوم داخل ہے جس سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے، کہ توراۃ کی اس کتاب کے لئے جس مشنا کا لفظ بولا جاتا ہے، وہ "ش" سے ہے "س" یا "ث" سے نہیں، جیسا کہ مدعی کا دعوی ہے، کیونکہ دو اور دوم کے لئے جو عبرانی مادہ ہے وہ مشنا تھے،

حوالوں کے لئے سب سے پہلے "ڈکشنری آف بائبل" (مرتبہ جیمس ہسٹنگز وغیرہ) جلد اول ص ۵۹۶ مطبوعہ ۱۹۰۰ء ملاحظہ فرمایئے، جس میں لکھا ہے کہ اس کا نام ڈیوٹرونومی عبرانی الفاظ "مشنا توراۃ" کا ترجمہ ہے، جس کے معنی "نسخہ ثانیہ" کے ہیں، اس کے بعد انگریزی کی مشہور ڈکشنری ویبسٹرز انٹرنیشنل میں لفظ ڈیوٹرونومی (Deuteronomy) دیکھئے اس میں ہے،

"ڈیوٹرونومی اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ یہ موسیٰ کے قانون کا دہراؤ (یا اعادہ) ہے"

اب عبرانی لغت میں دیکھ لیجئے، کہ دہرانے اور دوسرے اور دوبارہ کرنے کیلئے لفظ مشنا ہے مسنا یا تمنی یا تمنہ نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے محقق دوست ہم کو باور کرانا چاہتے ہیں، جیسا کہ آگے تفصیل معلوم ہوگا،

میرے مضمون سنت کی اشاعت کے بعد موصوف نے ۵ دسمبر ۱۹۲۹ء کو جو خط مجھے لکھا تھا جس میں رقم فرماتے ہیں،

"تمنہ جس کے معنی ڈوٹرونومی کے سمجھے ہیں، وہ مشنا سے بالکل جدا لفظ ہے اور اس کا تلفظ مسنا ہے"

اب موصوف اپنے تازہ مضمون میں ڈوٹرونومی کے لئے ہم کو لفظ تمنی دیتے ہیں،

ع کھے یہ حکم رہے گئے وہ ارشاد رہے۔

اگر آپ کے کہنے سے توراۃ پنجم کے لئے مسنا سمجھا جائے تو تالمود کے لئے بھی تو آپنے مسنا اور مسناۃ ہی تلفظ پہلے مضمون میں لکھا ہے، اب یہ التباس کیونکر دور ہوگا،

آپ میرے قول کی تکذیب کے لئے توراۃ پنجم اور حصۂ تالمود دونوں کے درمیان فرق مسنا اور مشنا یا ثمنہ یا ثمنی لکھکر لاکھ پیدا کیجئے، سب محکہ تحقیق کے سامنے رد ہو جائے گا، دونوں لفظ قرشت والی "شں" منقوط سے ہیں "اس" غیر منقوط یا ش منقوط سے ان میں کوئی لفظ نہیں ہے" تا اور ث کا حرف تو عبرانی میں سرے سے موجود ہی نہیں، اس لئے ثمنہ یا ثمنی تو عبرانی میں ہو ہی نہیں ہو سکتا،

اب ہمارے دوست غور فرمائیں کہ کس کی تحقیق پر" ایک یہودی بچہ بھی ہنس دیگا"

درسفالیں کاسۂ رنداں بخواری منگرید

کایں حریفان خدمت جام جہاں بیں کردہ اند

مشنا، مسنا اور سنت | بہرحال یہ مسئلہ کہ مشنا، تالمود مراد ہے، یا مشنا توراۃ ایک ضمنی بحث ہی، اصل سوال یہ ہے کہ کیا عبرانی "مسناہ" اور عربی سنّت ایک چیز ہے،

اس سلسلہ میں ہم اپنے محقق دوست کی ایک دلچسپ لفظی تحریف کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں، اصل عبرانی لفظ مشنا (ش منقوط) ہے، جیسا کہ میرے ٹوکنے پر اب اس دوسرے مضمون میں انھوں نے استعمال کیا ہے، مگر پہلے مضمون میں اس کا عبرانی تلفظ "مسناۃ" بتایا تھا، اور یہ اس غرض سے تاکہ سُنّت اور مسناۃ میں س "ن" اور "ۃ" کا اشتراک ہو جائے، اور یہ دعویٰ بآسانی ثابت ہو جائے کہ سنت اور مسناۃ ایک ہیں، اور اب جب انھیں معلوم ہوا کہ عبرانی کا حرف شناس اُن کے سوا کوئی اور بھی ہے، تو مجبوراً اس کے لئے دوسرے

مضمون میں (مشناس) منقوطہ سے بولے "یا للعجب!"

میں نے اپنے سنت والے مضمون میں یہ دکھایا تھا، اور پھر باعلان دعویٰ کرتا ہوں کہ سنت اور مشنا میں کوئی لفظی یا معنوی مناسبت نہیں ہے، مشنا کے معنی اگر بقول اُن کے زبانی روایات کے ہیں، تو سنت کے معنی عربی میں طریق روش اور راستے کے ہیں، قرآن میں سُنت کا لفظ انہی معنوں میں بار بار آیا ہے، احادیث میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور لغت اور اشعار عرب میں بھی ان ہی معنوں میں یہ لفظ بولا گیا ہے، قرآن پاک میں ہے، لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَحْوِیْلاً، کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ تم خدا کی "زبانی روایتوں" میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤ گے، یا یہ معنی ہیں کہ تم خدا کے طریق اور طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے؟

احادیث میں ہے مَن سَنَّ سُنَّۃً حسنۃ فَلَہٗ اَجرُھا، کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی اچھی "زبانی روایت" کرے گا تو اس کو اس قسم کی نیکیاں ملیں گی، یا یہ معنی ہیں کہ جو شخص کوئی اچھا اور پسندیدہ راستہ یا طریقہ نکالے گا تو اس کو بھی اُس کی نیکیاں ملتی رہیں گی؛ مشہور حدیث ہے اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ نکاح میری زبانی روایت ہے، یا یہ معنی ہیں کہ نکاح میرا طریقہ ہے، اشعار عرب میں ہے:-

وَان الاُلیٰ بالطف مِن اٰل ھاشم ۔۔۔ تاسوا فسنوا للکرام التاسیا

(آل ہاشم وہ جو طف میں ہیں، انھوں نے باہم غمخواری کی، تو غم خواری کو شریفوں کا طریقہ بنا دیا)

"سنّوا" کے معنی یہاں عملی طریق و روش وطرز عمل کے ہیں، یا زبانی روایت کے، زبانی روایت کے معنی ہو بھی سکتے ہیں اور بن بھی سکتے ہیں؟

یہ تو عربی زبان کی تحقیق ہوئی، اب آئیے عبرانی زبان کی خانہ تلاشی لی جائے "مشنا" کے معنی "زبانی روایات" کے ہیں؟ اس بارہ میں میں نے پہلے جو لکھا تھا، اس کو دہرا دیتا ہوں کہ یہ وہی لفظ ہے جو عربی میں ثنی، تثنیہ، مثنیٰ وغیرہ کی صورت میں ہے، اور اس کے معنی دہرانے، دوبارہ کرنے، اور دوسرا ہونے کے ہیں، مضمون نگار کا دعویٰ ہے کہ اس کے معنی "زبانی روایات" کے ہیں، میں سوا اس کے اور کیا کہوں،

صیادئی و لا تو نخچیر مکن — چیزے کہ نخواندہ تو تفسیر مکن

ان کی تشفی کے لئے اُن کے حسب مشورہ میں سب سے پہلے یورپ کے علمی صحیفہ کو پیش کرتا ہوں جس پر، اُن کا ایمان شاید تمام دوسرے مشرقی صحیفوں سے زیادہ ہو، انسائیکلوپیڈیا طبع یازدہم کے مضمون "تالمود" کے شروع میں (جلد ۲۶، صفحہ ۳۸۰) ہے؛

"تالمود (عبرانی میں: سیکھنا سکھانا) مشتمل ہے، مشنا پر (عبرانی میں (زبانی) دہرانا (Repetition)

پھر اسی کتاب کے اسی اڈیشن (یازدہم) کی جلد ۱۳ صفحہ ۱۰۷، مضمون ہبرو (عبرانی) کے ضمن میں ہے،

"مشنا کا نام عبرانی لفظ "شنا" سے مشتق ہے، جو آرامی لفظ "ثنا" سے مطابق ہے، اور اسی لئے یہ نام کتاب کے لئے موزوں ہے، جس کے معنی زبانی قانون کے دہرانے یا سکھانے کے ہیں"

ان دونوں اقتباسوں سے ظاہر ہے کہ اس کے اصلی معنی دہرانے یا سکھانے کے ہیں، لفظ زبانی یا زبانی قانون کا اضافہ، اگر کسی نے کر دیا ہے، تو وہ لغت کی حیثیت سے نہیں، بلکہ صرف وجہ تسمیہ کی مناسبت دکھانے کے لئے خارج سے اضافہ کر دیا گیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نام

اس کا کیوں پڑا، اس کی تائید کے لئے میں لغاتِ عبرانی کا حوالہ پیش کرتا ہوں،

شناو شنہ	بدل جانا، جدا ہونا، دوبارہ کرنا، دہرانا،
شنیم	دو،
شنتیم	دوبارہ
مشنہ	دوسرا درجہ، دوسرے درجہ کا، دوچند،
مشنا	دوسرا

(لغات عبرانی مصنفہ پادری ولیم ہوپر، پرنسپل، دونٹی، کالج، شائع کردہ پنجاب رلجیس سوسائٹی الہ آباد ۱۸۸۱ء ص ۴۲) ثنہ کے معنی بھی عبرانی میں دوبارہ کرنا، دوسرا اور پھر کے ہیں، یہی لفظ عربی میں اثنین، اثنین، اثنتین، ثمنۃ، تثنیہ، ثنی، مثنیٰ، اور ثنی ہے، پہلے تمام الفاظ کے معنی دو اور دوسری کے ہیں، اور اخیر لفظ کے معنی پھیرنے کے ہیں،

مشنا اور اس کے مصدر شنا کے یہی تمام معنی عبرانی، انگریزی ڈکشنری، شائع کردہ سموال باگسٹر (لندن) ص ۲۷۲، و ۲۷۳، میں ہیں، تحقیق کے لئے کتاب مذکور کی طرف رجوع کیجئے،

انگریزی کی مشہور ڈکشنری ویبسٹر انٹرنیشنل ڈکشنری ہے، اس میں "مشنا" Mishnah کی نسبت حسب ذیل تحقیق ہے۔

"مشنا (عبرانی مشناہ) یعنی تعلیم، زبانی قانون، عبرانی لفظ شنہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی دہرانے (ری پیٹ) کے ہیں، قدیم بائبلیکل عبرانی میں اس کے معنی، سیکھنے سکھانے کے ہیں، یہ یہودیوں کے روایتی تعلیمات کو کہتے ہیں، جو ربیوں کے زیر نظر خاص طور سے تیسری صدی عیسوی میں مرتب ہوئیں، تالمود کے ایک حصہ کا نام ہے، جس کو

اُس کی بنیاد ہے؟

صاف ظاہر ہے کہ "زبانی روایات" اس کے لغوی معنی نہیں، اُس کے لغوی معنی دہرانے اور اعادہ کرنے اور دوبارہ کرنے اور دوسرے درجہ کے ہیں، اس کا اطلاق یہود اپنی زبانی روایات کی کتاب پر اس لئے کرتے ہیں، کہ وہ گذشتہ قانون کا اعادہ ہے، یا پہلے قانون پر نظرثانی ہے، یا توراۃ کے مکتوبی قانون کے بعد یہ زبانی روایات کی کتاب دوسرے درجہ پر ہے، یا قدیم عبرانی کے مطابق اُس کے معنی سیکھنے، یا سکھانے کے لے کر، اس کی کوئی مناسب وجہ تسمیہ بتائی جائے،

ثناۃ اب میرا کہنا وہی ہے، جو پہلے کہا جا چکا ہے کہ جس کو عبرانی میں مشنا یا مشناۃ کہتے ہیں، وہی عربی تلفظ میں ثناۃ ہے، جس کے معنی دو یا دہرانے کے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ عبرانی مشنا جس کا ثانی قانونی کتاب پر اطلاق ہوا ہے، اس کے لئے بھی عربی لفظ "ثناۃ" ہے، اور اُس کی جمع "مثانی" ہے، اور خود قرآن پاک نے اس کا کئی مقام پر اپنے اوپر اطلاق کیا ہے،

۱۔ ولقد اتینٰک سبعًا من المثانی — اور ہم نے اے پیغمبر! تم کو "مثانی" میں سے سات دیئے؛

۲۔ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھًا مثانی۔ — اس خدا نے اتارا بہترین کلام ایک کتاب جو باہم موافق اور "مثانی" ہے؛

ثناۃ کے معنی کتاب کے بھی عربی میں موجود ہیں؛ نیز مشناۃ تالمود کے لئے دہی لفظ عربی میں مستعمل ہے۔ لسان العرب لفظ مثنی کے تحت میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کی ایک روایت کی شرح میں ہے،

قیل وما المثناۃ قال ما استکتب — پوچھا گیا کہ ثناۃ کیا ہے کہا جو خدا کی

من غير كتاب الله كأنه جعل
ما استكتب من كتاب الله مبدأ
وهذا المثنى، قال ابو عبيد كا
سألت رجلا من اهل العلم
بالكتاب الاول قد عرفها و
قرأها عن المثناة فقال ان
الاحبار والرهبان من بني
اسرائيل من بعد موسى وضعوا
كتابا فيما بينهم على ما ارادوا
من غير كتاب الله فهو المثناة

کتاب کے سوا لکھا گیا، گویا خدا کی جو
کتاب لکھی گئی، وہ پہلی تھی، اور یہ
دوسری ہے، ابو عبیدہ نے کہا کہ میں
نے توراۃ کے ایک عالم سے جو مثناۃ
سے واقف تھا، اور اس کو پڑھ چکا
تھا پوچھا کہ مثناۃ کیا ہے؟ اوس نے جواب
دیا کہ یہودی عالموں اور درویشوں
نے حضرت موسیٰ کے بعد اپنے حسب
خواہش خدا کی کتاب کے سوا ایک اور
کتاب بنالی تھی، وہی مثناۃ ہے،

کیا عبرانی مشناۃ بعینہ یہی عربی مثناۃ نہیں ہے، اب بھی شک کی گنجایش ہے، ؟

خاتمہ

بہرحال اس سخت گیری کی پالیسی سے ہم اپنے حریف کو دق کرنا نہیں چاہتے، بلکہ یہ عرض کرتے ہیں کہ خواہ آپ توراۃ کی پانچویں کتاب مراد لیجئے، یا تالمود کی کتاب، دونوں کا ماخذ عبرانی لفظ شنا اور شنہ ہے، جس کے معنی بدلنے، دہرانے یا دوسرا ہونے، یا دوبارہ پڑھنے کے ہیں، یا سیکھنے کے ہیں، اور سوائے اخیر معنی کے الفاظ ثنہ، ثنی، تثنیہ اور ثنی اس کے مرادف ہیں، اور عربی لفظ سنت کہ جس کے لغوی معنی راستہ اور طریق کے اور اصطلاحی معنی طریق محمدی کے ہیں، اس سے ادنی سا بھی تعلق نہیں، سنت کا مادہ س، ن، ن یعنی سنن ہے، اور مثنا یا مثناۃ کا عبرانی میں ش، ن، ہ، یا الف اور عربی میں ث، ن، ی ہے، اس تفصیل کے بعد امید ہو کہ ہمارے دوست اپنی تحقیق پر مزید نظر ثانی فرما کر علم اور اسلام دونوں کو

اپنا ممنون احسان بنائیں گے، ورنہ ان کی اس تحقیق کو بقول اُن کے ایک یہودی بچہ بھی سُن کر ہنس دے گا۔"

آخر میں ایک اور بات عرض کر دوں کہ "مشنا" زبانی روایات کو بھی نہیں کہتے، بلکہ اس کتاب کا نام ہے جس میں یہود نے اپنی زبانی روایات کو جمع کیا ہے، اگر گلستان اخلاقی قصص وحکایات کے کسی مجموعہ کا نام ہے تو اُس کے یہ معنی نہیں کہ گلستان کے معنی اخلاقی قصص حکایات کے ہیں۔

دورانِ تحقیق میں فرماتے ہیں کہ

"مولانا کی یہ دلیل اور بھی پُرلطف ہو کہ سُنّت کا لفظ قرآن میں ہے، اس لئے یہ عبرانی زبان سے ماخوذ نہیں"

میں نے اگر ایسا کہا ہو تو یہ یقیناً غلط لیکن

ع سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جاست

میں نے خدمتِ والا میں یہ عرض کیا تھا کہ

"سُنّت خالص عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے لفظی معنی راستہ کے ہیں لیکن بول چال میں اس کے معنی طریقۂ عمل کے ہیں، جس پر ہمیشہ کوئی عمل جاری رہے قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے۔"

ہر صاحب بصیرت میرے استدلال کو سمجھ سکتا ہے، کہ عبرانی لفظ مشناہ (ش) عربی میں ثناۃ (ث) ہے، اور جس کے معنی دونوں زبانوں میں دوہرانے یا عادہ کے ہیں، اور اس سے الگ سُنّت کا لفظ ہے، جس کے معنی راستہ اور طریق کار کے ہیں، اور عربی میں یہ دونوں لفظ الگ الگ مستقل صورتوں میں وارد ہیں، اور خود قرآن پاک میں ہیں۔

وَلَقَدْ آتَیْنَاکَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِی ہم نے تم کو "مثانی" میں سے سات دیں،

مثانی جمع ہے، واحد کی صورت وہی مثناۃ ہے، اور سنت الگ ہے،

سُنَّةَ الْاَوَّلِیْنَ، پہلوں کا راستہ یا طریقہ یا سُنّت

اگر مثناۃ اور سُنّت ایک لفظ ہوتے تو عربی میں مثناۃ اور سُنّت دو لفظ موجود نہ ہوتے، اور قرآن ان کو دو لفظ دو تلفظوں کے ساتھ دو معنوں میں استعمال کرتا، اس سے معلوم ہوا کہ مثناۃ اور سُنّت دو الگ الگ مستقل اور مختلف المعنی لفظ ہیں، یہ ہے میرا استدلال جس کی آپ نے غلط تعبیر کی، میرے گذشتہ مضمون پر ایک نظر ڈالنے سے مضمون نگار کی غلط فہمی واضح ہو سکتی ہے،

معارف جولائی ۱۹۳۰ء

عرب و امریکہ

عام طور سے مشہور ہے کہ امریکہ کو کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں دریافت کیا ہے، یہ شہرت اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ عام متمدن پُرانی دنیا کو اس نئی دنیا سے پُوری واقفیت اُسی وقت سے ہوئی اور اسی کے بعد سے دونوں میں میل جول اور ہر قسم کے علمی و تمدنی و تجارتی تعلقات قائم ہوئے، یہانتک کہ آج نئی اور پُرانی دنیا ایک گھر کے دو آنگن بن گئے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں کہ کولمبس سے پہلے اس نئی دنیا میں پُرانی دنیا کی کسی نو وارد قوم یا اشخاص کے قدم نہیں پہونچے،

یہ مسئلہ کہ امریکہ تک کبھی عرب جہازراں پہنچ چکے تھے، گو ہندوستان میں نیا ہو، مگر مصر کے بعض ممتاز فاضلوں نے اس پر متعدد اوقات میں بحثیں کی ہیں، علامہ زکی پاشا نے سسلی کے عرب جغرافیہ نویس ادریسی المتوفی سنہ ۵۶۰ھ کی نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق کا ایک حوالہ پیش کیا تھا، جس میں بحر ظلمات میں اندلس کے چند عرب نوجوان جہازرانوں کے جہاز چلانے کا ذکر ہے، مگر ابھی تک نہ تو مصر میں اور نہ ہندوستان میں، اس مسئلہ کے تمام اطراف پر بحث کی گئی ہے، اور نہ تمام ممکن مواد یکجا فراہم کیا گیا ہے،

اس سلسلہ میں حسب ذیل باتیں تنقیح کے قابل ہیں،

۱۔ کیا عربوں نے اور زیادہ عام لفظوں میں کیا مسلمانوں نے ربع مسکون کے پُرانے

نظریہ کی تنقید کی تھی،

۲- کیا ان کو زمین کی گولائی، اور اس کے تحتانی اور فوقانی حصّوں کا علم تھا؟

۳- کیا ما وراء بحرِ ظلمات انھوں نے پہونچنے کی کوشش کی؟

۴- کیا آج کل کے نئے محققین اس نظریہ کو قبول کر سکتے ہیں؟

ذیل کی سطروں میں اُن میں سے ہر ایک مسئلہ پر اپنی تلاش و فکر کے نتیجے پیش کرتا ہوں،

ربع مسکون بطلیموس نے دو خطوں کے تقاطع سے روئے زمین کے چار برابر حصّے کئے تھے، ایک خطِ قطب جنوبی سے قطب شمالی تک فرض کیا تھا، اور دوسرا زمین کے بیچ سے آفتاب کے بالمقابل پہلے خط کو کاٹتا ہوا (اس کو خطِ استوار کہتے ہیں) وسطِ افریقہ سے گذرتا ہے، اس طرح دو خطوں کے تقاطع سے زمین کے چار فرضی حصّے ہوئے، دو شمالی اور دو جنوبی، اور خطِ استوا ان دونوں شمالی اور ان دونوں جنوبی حصّوں کے بیچ سے گذرتا ہے، بطلیموس کی رائے یہ ہے کہ انسانی آبادی رُوئے زمین کے ان چار حصّوں میں سے صرف ایک شمالی حصّے میں ہے، اسی کو اصطلاح میں رُبعِ مسکوں کہتے ہیں یعنی چوتھائی حصّہ (رُبع) جو آباد ہے، (مسکون) باقی تین چوتھائی حصّے زیادہ تر سمندروں میں غرق ہیں، اور کچھ گرمی اور سردی کی غیر معتدل شدّت کے سبب سے سکونت کے قابل نہیں،

مسلمانوں نے شروع میں بطلیموس کے اس نظریہ کو بعینہٖ تسلیم کیا، لیکن بہت جلد وہ اس پر شکوک و اعتراضات وارد کرنے لگے، بطلیموس کے حامیوں نے اس کی رائے کی صحت پر فلسفیانہ اور طبعی دلائل گھڑ کر کھڑے کئے، مگر دوسروں نے اُن کو توڑ دیا، اور ایک مدت تک یہ مناظرہ گرم رہا، بیرونی، ابن رشد، طوسی، قطب شیرازی، شریف جرجانی، برجندی، قوشجی اور چغمینی کی تصنیفات میں زمین کی ہیئت کے باب میں یہ بحثیں مذکور ہیں، یہاں مثال کیلئے

نصیر طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کے تذکرہ اور اس کی شرح توضیح التذکرہ مؤلفہ نظام عرج (تالیف ۷۱۱ھ) اور اس کے حاشیہ سے کچھ عبارتیں نقل کرتا ہوں۔

وھذا التقسیم غیر صحیح	یہ تقسیم صحیح نہیں، غلط ہے، اس لئے کہ
فاسد، ایضاً لا نا ما دانیا نھم	اُن کے دعوی کے ثبوت میں کوئی شبہہ
فی ھذا المقدار شبھۃ	بھی میں نے نہیں پایا، چہ جائے کہ کوئی
فضلاً من حجۃ فعلیٰ ھذا	دلیل ان کے پاس ہو، اس بنا پر یہ
یحتمل ان یکون فی الارباع	بالکل ممکن ہے، کہ زمین کی باقی چوتھائیوں
الباقیۃ عمارات کثیرۃ	میں بہت سی آبادیاں ہوں جن کی خبر
لم یصل الینا خبرھم لما	ہم تک اس لئے نہیں پہونچی، کہ ہمارے
بیننا وبینھم من البحار المفرقۃ	اور ان کے درمیان جدا کر دینے والے

والجبال الشاھقۃ، (نسخہ قلمی دار المصنفین) سمندر اور بڑے بڑے پہاڑ ہیں،

اسی طرح جنوبی حصہ میں آفتاب کی شدتِ گرمی کے سبب سے عدم آبادی کا جو پرانا نظریہ تھا، اس پر بھی ضرب کاری لگائی، اور کہا،

لجواز ان یکون مسکوناً	اس امکان کے سبب سے کہ وہ بھی آباد
ولا یصل الینا خبرھم للبحار	ہوں، اور ہم تک اُن کی خبر اس لئے
العظیمۃ والجبال الشامخۃ (الشاھقۃ)	نہ پہونچی ہو، کہ بڑے بڑے دریا، اور
المانعتان من ان یصل	پہاڑ بیچ میں حائل ہوں، جو اُن کے
خبرھم،	حالات ہم تک پہونچنے سے مانع ہوں

(کتاب مذکور)

آخر میں اس نظریہ کی کہ صرف ربع مسکون ہی کیوں کھلا ہوا ہے، اعتراض اور جواب کے بعد بظاہر کوئی سنجیدہ دلیل نہ پاکر کہا،

وبالجملة ليس لانكشاف	حاصل یہ کہ زمین کے شمالی چوتھائی حصہ
هذا القدر المذكور من	کے صرف کھلے ہونے کا سوائے عنایت
الارض اى الربع المسكون	الٰہی کے کوئی سبب معلوم نہیں، اور
الشمالى سبب معلوم غير	نہ کوئی دلیل اس پر ہے کیوں ایک
العناية الالهية والا لما	ہی شمالی چوتھائی حصہ آبادی اور
فضل احد الربعين الشماليين	رہنے کے لائق ہو، اور دوسرا نہ ہو،
بها اى بالعمارة والسكنى دون	حالانکہ اُس کے سب حصوں کی وضع
الآخر مع تساوى ارتفاعهما	(پوزیشن) فلکیات کی نسبت سے
بالقياس الى السماويات.	برابر ہے،
(کتاب مذکور)	

شارح نے اس عنایتِ الٰہی کے نظریہ کو بھی تسلیم نہیں کیا، اور کہا کہ ممکن ہے کہ عنایت نے دوسرے ربع شمالی میں بھی آبادی رکھی ہو،

لجواز ان يكون الربع الآخر	اس کا پورا امکان ہے کہ دوسرا چوتھائی
مسكونا معمورا ولم يصل	حصہ بھی معمور اور آباد ہو، اور وہاں کے
الينا خبره (کتاب مذکور)	رہنے والوں کا حال ہم کو معلوم نہ ہو،

اس بحث سے اندازہ ہوگا کہ اس پرانی دنیا کے علاوہ دوسری دنیا کا نظریہ مسلمانوں نے علمی استدلال کے طریقہ سے سمجھا تھا، اور یونانی نظریہ ربع مسکون کی کوئی طبعی اور فلسفیانہ

توجیہ اُن کی سمجھ میں نہیں آئی تھی نویں صدی ہجری کے وسط میں قاضی زادہ رومی نے محمود جغمینی المتوفی ۷۴۵ھ (۱۳۴۴ء) کی ملخص کی شرح میں، جس کو اس نے رصد خانہ سمرقند کے بانی سلطان الغ بیگ کے نام سے لکھا ہے، کہا ہے:-

وسائر الارباع خراب ظاهرًا	اور باقی تین چوتھائی زمین بظاہر
والا نوصل خبرھو الینا	غیر آباد ہے، کہ اگر غیر آباد ہوتی تو
غالبًا ویحتمل ان یکون بیننا	غالبًا اس کا حال ہم تک پہونچتا
وبینھم بحار مفرقة وجبال	اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور
شاهقة وبواد بعیدة تمنع	وہاں کے باشندوں کے درمیان بڑے
وصول الخبر الینا غیر ان احد	سمندر، پہاڑ، اور دور دراز صحرا
اربعین الجنوبیین قد حکی فیه	ایسے ہوں جو اُن کی خبر کو ہم تک
قلیلًا من العمارة،	پہونچنے میں حائل ہوں، لیکن یہ بیان
(ص ۴۱۱ مطبوعہ ۱۲۷۱ھ لکھنؤ)	کیا گیا ہے کہ ایک جنوبی چوتھائی
	حصہ میں تھوڑی سی آبادی ہے،

اگر ایک ہی شمالی چوتھائی آباد ہے، تو پھر یہ مسئلہ مشتبہ رہا کہ دو شمالی رُخوں میں سے کون آباد ہے، فوقانی یا تحتانی، تو چونکہ رُبع مسکون ہی کے مسئلہ کو مسلمان مشتبہ سمجھ گئے تھے، اس لئے وہ اُسکی سمت بتانے میں بھی پس و پیش کرتے تھے، اس لئے انھوں نے صحیح طور سے یہ کہا کہ نیچے اور اوپر کی بحث اس لئے فضول ہے کہ ہر ایک دوسرے کی نسبت سے نیچے اور اوپر ہے، تصریح کے شارح امام الدین لاہوری نے حاشیہ کی یہ عبارت نقل کی ہے،

ان فی تعیین هذا الربع تعسرًا	اس چوتھائی زمین کی تعیین مشکل ہے،

بل تعذر لان لو قيل هذا هو الربع الفوقاني لصدق على الآخر، (ص ۵۵)	بلکہ محال ہے کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ فوقانی رُبع ہے، تو یہ فوقانی ہونا تو دوسرے کو بھی کہہ سکتے ہیں،

اسی کی شرح میں عصمت اللہ سہارنپوری نے کہا ہے،

لان كلّ منهما الفوقاني بالنسبة الى من عليه	کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے اوپر کی نسبت سے فوقانی ہے۔

اس کے بعد تصریح کی عبارت حسب تحریر ملا عصمت اللہ حسب ذیل ہے،

والحاصل انه ليس هُنا علامة يمتاز احدهما عن الآخر ولذلك تراهم يبهمون الكلام ويقولون للمعمور احد الربعين، (باب ملا عصمت اللہ)	حاصل یہ کہ یہاں کوئی علامت ایسی نہیں ہے جس سے ایک حصہ دوسرے سے ممتاز ہو سکے، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ ہیئت اس مقام پر مشتبہ طریقے سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ دو شمالی ربعوں میں سے ایک آباد ہے'

ملا عصمت اللہ اور امام الدین بعد کے لوگ ہیں لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اگلوں کی نقل ہے۔

ابن خلدون مغربی المتوفی ۸۰۸ھ نے مقدمہ میں رُبع مسکوں کے نظریہ کی تشریح کے بعد لکھا ہے،

"اور یہیں سے حکما نے یہ اخذ کیا ہے کہ خط استوا اور جو اس کے پیچھے ہے آبادی

خالی ہے، اور ان حکماء پر یہ اعتراض کیا گیا ہے، کہ یہ مقام تو مشاہدہ اور سیاحوں کے متواتر بیانات سے ثابت ہے، کہ آباد ہے تو پھر اس دعوی پر دلیل کیسے قائم ہوگی، (یعنی دعویٰ ہی غلط ہے۔)

پھر قدیم حکماء کی طرف سے یہ بات بنائی ہے،

"بظاہر حکماء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ خطِ استوا کے نیچے آبادی بالکل محال ہے جب کہ اُن کے استدلال نے اُن کو یہاں تک پہنچایا ہے، کہ وہاں گرمی کی شدت کے سبب سے پیدائش کا فساد قوی ہے، اور اس لئے آبادی اس میں محال ہے، یا بہت کم ممکن ہے اور وہ ایسا ہی ہے، کیونکہ خطِ استوار اور جو اس کے نیچے ہے، گو اس میں آبادی ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، مگر بہت کم ہے۔"

اس مسئلہ کو اس سے بہت پہلے ابن رشد المتوفی ۵۹۵ھ نے پیش کیا اور کہا کہ خطِ استوار کے دونوں طرف جب یکساں صورت ہے تو خطِ استوار کے جنوب میں کیوں آبادی نہ ہو،

ابنِ رشد نے کہا ہے کہ خطِ استوا معتدل ہے، اور اس کے جنوب میں جو زمین ہے وہ ویسی ہے جیسی اس کے شمال میں ہے، تو جس طرح خطِ استوار کے شمال میں آبادی ہے جنوب میں بھی ہوگی،" (مقدمہ ابنِ خلدون)

ابنِ خلدون اسی خیال کی مزید تشریح اور جواب دیتے ہوئے، کہتا ہے،:-

لیکن یہ کہنا کہ خطِ استوار میں آبادی محال ہے، تو متواتر بیان اس کی تردید کرتا ہے، (مقدمہ ص ۴۳ مصر)

جو بات ابنِ رشد نے کہی وہی حسن بن احمد ہمدانی المتوفی ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء نے جزیرۃ العرب میں کہی ہے،

واما خلف خط الاستواء الی	لیکن خطِ استوار کے پیچھے جنوب تک اس
الجنوب فان طباعة تکون	کی طبعی کیفیت شمال کی طبعی کیفیت کے
علیٰ طباع شق الشمال سواء	مانند ہر چیز میں ہوگی لیکن صرف اسی
فی جمیع احواله الا قدر ما ذکرنا	قدر اختلاف ہوگا جن کو میں نے سرار الحکمۃ
فی کتاب سرائر الحکمة ما ذکرنا	میں لکھا ہے یعنی آفتاب کے نقطۂ اوج
اختلاف حالی الشمس فی	اور نقطۂ حضیض میں اختلاف ہے جو
راس اوجها ونقطة حضیضها	اثر پیدا ہوتا ہے،

(ص ۵ لیڈن)

اس کے بعد لکھا ہے کہ بحرِ اعظم کی موج و طغیانی کی شدت کے سبب ادھر جنوبی سمت (یعنی جنوبی افریقیہ) میں سمندر کی طرف سے جانے کی کسی کو ہمت نہیں پڑتی،

ہمدانی نے آفتاب کے نقطۂ اوج و حضیض کا جو فرق پیدا کیا تھا، نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ نے اس کو کمزور ثابت کیا، اور کہا،

فمن البعید ان یبلغ تاثیرها	یہ دور از قیاس ہو کہ آفتاب کی تاثیر
الی حد یصیر احد موضعین	اس حد تک پہونچ جائے، کہ وہ دو مقام
متشابهین فی الوضع مسکونا	جو وضع (پوزیشن) میں یکساں ہوں
والآخر غیر مسکون،	ان میں سے ایک آباد ہو اور دوسرا
(تقویم البلدان ابوالفداء)	غیر آباد ہو،

(ص ۵ پیرس)

ادھر علماء تو اس مناظرہ میں مصروف رہے کہ یہاں آبادی ہے یا نہیں یا عقلاً ہو سکتی ہے

یا نہیں، اور ادھر کم لکھے پڑھے سیاح اور جہازراں خطِ استوا کو پار کرکے افریقہ کی ہر سمت میں تیر گئے،

جوبی حصہ میں افریقہ کا جہاں تک تعلق ہے، عرب تاجر اور سیاح اُس کے گوشہ گوشہ سے واقف ہو چکے تھے، جہاں جہاں موجودہ زمانہ میں اہلِ یورپ پہونچے، مسافرانِ عرب کے نشانِ قدم برابر پائے، گلی عرب سیاح اور جہازراں خطِ استوا کو پار کرکے افریقہ کے ایک ایک کونے اور گوشے میں پہونچے، اور خطِ استوا سے نیچے راس الرجال الصالح (گڈ ہوپ) تک سب چھان مارا چنانچہ ابو عبداللہ البکری کی صفۃ الافریقیہ والمغرب، ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے آخری ابواب اور ابن خلدون کے مقدمہ اور تاریخ میں اُن کے حالات موجود ہیں لیکن اصلی باشندوں نے توحش اور جہالت اور حیوانیت کے سبب سے اُن کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی،

ابنِ خلدون جنوبی افریقہ کے بعض مقامات، سلا، تکرور، غانہ اور سلطنت مالی کا نام لے کر کہتا ہے،

"اور آج کے زمانہ میں یہ پوری سرزمین سوڈانی قوم کی مملکت میں شامل ہے، اور اُن کے ملک تک مراکش کے سوداگر جاتے ہیں .... اور اُن کے پیچھے جنوب میں کوئی قابلِ ذکر آبادی نہیں، ہاں کچھ آدم صورت انسان ہیں، جو انسانوں کے مقابلہ میں جانوروں سے زیادہ قریب ہیں، وہ صحراؤں اور غاروں میں رہتے ہیں اور گھاس اور غلہ بن پکائے کھاتے ہیں، اور ان میں ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں، وہ انسانوں کے شمار میں نہیں،

(مقدمہ ص ۴۵ مصر)

مشرقی افریقہ تو عربوں کا وطن ہوگیا، زنجبار پر وہ قابض تھے، اور سواحل میں مدگاسکر

(قسطنطلو) کے مقابل تک اُن کا بحری گذرگاہ تھا، مغربی افریقہ گانا (غانہ) میں اُن کی نوآبادی تھی، شمالی افریقہ تو اُن کی عظیم الشان سلطنتوں کا مرکز ہے، اور آج تک وہ اس پر قابض ہیں۔ اور جنوبی افریقہ کے حیوان نما انسانوں کا حال ابھی پڑھ چکے ہیں لیکن انھوں نے محنت کر کے ان میں سے اکثر جانوروں کو انسان بنایا، اور کچھ کو اُن کے جانشین اہلِ فرنگ نے بعد کو انسان بنایا، اور باقی آج بھی جانور ہیں، الغرض

"افریقہ کی ہر سمت میں عرب تاجر اور نوآباد پھیل گئے تھے، کانگو، زولو، کفر دریا، (الکفرہ) میں وہ آباد تھے، اور اُن کے قدیم آثار موجود ہیں، ۱۹۰۳ء میں روڈیشیا شمالی ٹرنسوال میں ایک عرب کی قبر ملی ہے جس میں مرنے والے کا نام مسلام اور تاریخ وفات ۹۵ھ کھدی ہے، اسی طرح اہلِ جرمنی نے چند سال ہوئے مشرقی افریقہ کے اندرونی علاقہ میں قدیم شہر نو کاحو میں وانگا کے قریب قدیم عربی کتابے پائے، جن کو وہ برلن عجائب خانے لے گئے،

"پرتگالیوں کی تاریخ میں ہے کہ جب اُن کے جہازات جنوبی مشرقی سواحل افریقہ گڈ ھوپ، اور نٹال کے درمیان سفر کر رہے تھے، تو انھوں نے عربوں کو پایا، جن کے جہازات سے ساحل بھرا ہوا تھا، اور کفر دریا کے ملک سے بہت سا سونا اپنے جہازوں میں لاد چکے تھے تاکہ وہ اپنے ملکوں کو لے جائیں[۱]"

مغربی افریقہ میں نائیجریا کا وسیع خطہ عربوں کی نوآبادیوں کا مرکز تھا، اور سب سے یہاں بخصوصیت کے ساتھ ہم کو مغربی افریقہ کے ایک گوشہ سے جس کو عرب غانہ اور اہلِ یورپ

---

[۱] یہ دونوں اقتباس المقتطف مصر اگست ۱۹۱۵ء کے مضمون الرحلۃ الا فریقیۃ القحبہ سے ماخوذ ہیں،

گانَا (Guinea) کہتے ہیں، بحث ہے، اور جو قدیم زمانہ سے سونے کی سرزمین ہی،

غانہ

اہلِ عرب اس سونے کی سرزمین تک بہت پہلے پہونچ چکے تھے، عربی جغرافیوں میں اس کا نام بار بار آیا ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر قوم میں اس ملک کا نام ہی سونا ہوگیا ہے، عربی میں خالص سونے کو تبر کہتے ہیں، یہی تبر اس کا عربوں میں نام ہے، چنانچہ یاقوت نے معجم البلدان میں غانہ کا حال غانہ سے زیادہ تبر میں لکھا ہے، یہ گانَا یورپ میں جاکر گنی کی صورت میں سونے کی اشرفی بن گئی،

گانَا خطِ استوا کے جنوب میں مغربی افریقہ کے اس ساحل پر واقع ہے، جہاں سے جنوبی امریکہ اور پرانی دنیا کا ایک طرح سے محاذ پڑتا ہے. اس لئے اس موقع پر اس کی خاص اہمیت ہے،

اہلِ عرب گانَا کب پہونچے، اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن قیاس ہے کہ دوسری صدی میں مصر اور نوبہ اور بجہ وغیرہ افریقی قبیلے یہاں کے سونے کا خراج مصر میں ادا کرتے تھے، اور وہاں مسلمان عمّال اور فرد دراآمد ہو چکے تھے[1] پانچویں صدی ہجری کے اندلسی جغرافیہ نویس ابو عبید عبداللہ البکری المتوفی ۴۸۷ھ (۱۰۹۴ء) نے کتاب المسالک والممالک کے حصہ کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ والمغرب میں گانَا کا، وہاں کے قبائل کا، اُن کے بادشاہ کا، اور اس کی سلطنت کا پورا حال لکھا ہے، اور وہاں کے مسلمانوں کی سکونت اور آمد ورفت کی اطلاع دی ہے، یہ حالات مصنف نے سنہ ۴۶۰ھ میں لکھے ہیں، شہر غانہ کے دو حصے تھے، ایک میں مسلمان رہتے تھے، جس میں بارہ مسجدیں تھیں، ایک جامع مسجد تھی ان مسجدوں میں امام و موذن اور علماء و فقہاء سکونت پذیر تھے، دوسرے میں بادشاہ اور اس کے اربابِ حکومت رہتے تھے، بادشاہی عمارت کے پاس بھی ایک مسجد بنی تھی جس میں وہ لوگ فریضۂ نماز ادا کرتے تھے، جو بادشاہ کے پاس آتے تھے، ملک کے دوسرے حصے میں بھی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں، بادشاہ اور اس کے قبیلہ کے لوگ اس وقت تک بت پرست

---

[1] طبری واقعات ۲۳۵ھ

تھے، لیکن مسلمانوں کی پوری عزت کرتے تھے، لیکن اسی زمانہ میں بادشاہ نے ایک مسلمان کی تبلیغ سے اسلام قبول کرلیا، وہاں ایک ایسی عرب قوم بھی آباد تھی، جو بنوامیہ کے زمانہ میں فوج کی حیثیت سے آئی تھی، اور یہیں رہ پڑی، بعد کو وہ اپنا مذہب بھی بھول گئی،[۱]

اس بیان سے معلوم ہوا کہ عرب یہاں بنوامیہ ہی کے زمانہ میں یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر یا دوسری صدی ہجری کے شروع میں پہونچ چکے تھے،

چھٹی صدی ہجری میں غرناطہ کے ابو حامد اندلسی المتوفی ۵۹۵ھ نے جو اسپین سے لیکر چین تک سیاحت کرچکا تھا، اور بغداد میں اقامت گزیں ہوگیا تھا، تحفۃ الالباب کے نام سے جغرافیہ اور عجائب عالم پر ایک کتاب لکھی ہے، اس میں وہ غانہ کے متعلق لکھتا ہے،

وبلاد هو مما يلي المغرب	ان کا ملک مراکش کے اس حصہ سے
الأعلى المتصل بطنجة ممتدا	جو طنجہ سے ملا ہے، اور بحر ظلمات
على بحر الظلمات،[۲]	(اطلانتک) کے سواحل پر پھیلا ہے،
	متصل ہے،

ابو حامد کا یہ بیان بہت مبہم ہے، مراکش شمال میں ہے، اور غانہ اس کے جنوب میں اور دونوں کے بیچ میں صحرائے افریقیہ ہے لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اس سے واقف تھا،

بہرحال اس کے زمانہ میں ان اطراف کے پانچ قبیلے مسلمان ہوچکے تھے، جن میں ایک غانہ کا قبیلہ تھا،

---

[۱] کتاب المغرب فی صفۃ افریقیہ وبلاد المغرب صفحات ۴، ۱۷۱، ۱۷۵، ۱۷۸، ۱۷۹، مطبوعہ الجزائر ۱۹۱۱ء۔ [۲] تحفۃ الالباب صفحات ۴۱ و ۴۲، پیرس،

اُن کے بادشاہوں میں سے پانچ قبیلے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے مسلمان ہو گئے

ان میں سے قریب تر غانہ ہے جس کی ریگ میں خالص سونا پیدا ہوتا ہے، اور

اُن کے یہاں سونا بہت ہے۔"

(ص ۱۴۱ و ص ۲۴۲ پیرس)

اس کے بعد ادریسی مراکشی المتوفی ۵۶۰ھ نے سسلی میں بیٹھکر شاہ سسلی کے حکم سے جغرافیہ کی مشہور کتاب نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق لکھی، اس میں غانہ کے حال میں جیسا کہ ابن خلدون نے نقل کیا ہے، لکھا ہے، کہ غانہ میں علوی سادات کی سلطنت ہے،

"گنی میں جیسا کہ کہا گیا ہے، بنی صالح نام علویوں کی سلطنت اور حکومت ہے، زجار کی کتاب کے مصنف (ادریسی) نے کہا ہے، کہ اس کے بانی کا نام صالح ابن عبداللہ بن حسن بن حسین ہے،"

ابن خلدون کہتا ہے کہ عبداللہ بن حسن کی اولاد میں صالح نام کوئی شخص معروف نہیں ہے، بہرحال ابن خلدون المتوفی ۸۰۸ھ کے زمانہ میں غانہ کا ملک سلطان مالی کے زیر حکومت تھا،[1]

مشہور سیاح ابن بطوطہ جو اسی زمانہ میں تھا، وہ اسی سلطان کے زمانہ میں غانہ پہونچا تھا، اس سلطان اور اس کی مملکت اور قوم کے حالات اُس نے اپنے سفرنامہ کے خاتمہ میں بیان کئے ہیں، یہ لوگ دیندار مسلمان تھے، اور عربی زبان افریقہ کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی سرکاری و مذہبی دونوں حیثیتوں سے رواج پذیر تھی یہیں سے ابن بطوطہ سلطان مراکش کی دعوت پر تمام دنیا کا چکر لگا کر اپنے ملک میں واپس گیا ہے،[2]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۶ مصر، ذکر اقلیم اوّل [2] سفرنامہ ابن بطوطہ آخری باب،

ابو عبید بکری اندلسی ابو حامد غرناطی، یاقوت رومی جغرافیہ کے ان تینوں مصنفوں کی کتابوں میں زمانہ میں سونے کی بڑی بڑی داستانیں ہیں، کہ کس طرح عرب تاجر مراکش اور مغرب سے اونٹوں پر لادکر نمک اور دوسرے معمولی سامان لیجاتے ہیں، اور وہاں سے سونا بھر کر واپس لاتے ہیں، اس داستان کو یہاں زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں، مگر اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ آخری نتیجہ میں یہ بات کام آئے گی،

شمالی روس اور بحر بیرنگ

جنوب سے اب شمال کا رُخ کیجئے، عرب چوتھی صدی کے شروع میں خلیفہ مقتدر باللہ کی خلافت میں انتہائی شمالی روس تک پہونچ چکے تھے، جہاں رات صرف چار گھنٹوں کی ہوتی ہے، وہاں کا بادشاہ مسلمان ہوگیا تھا، اور خلیفہ سے خواہش کی تھی کہ اس کی اور اس کی قوم کی تعلیم کے لئے کچھ لوگ بھیجے جائیں، خلیفہ نے ابن فضلان کی سرکردگی میں ایک وفد وہاں روانہ کیا، وہ آذربیجان ہوکر نہر اتل یعنی والگا طے کرکے انتہائی شمالی روس کے قدیم شہر بلغار میں پہنچا اور کچھ روز رہ کر وہاں سے واپس آیا، اس پورے سفر کی روداد اس وقت بھی مختصر طور سے معجم البلدان کے الفاظ بلغار اور روس میں درج ہے، آٹھویں صدی میں ابن بطوطہ شمالی روس کے اس سرے پر پہونچا تھا جس کے آگے شمالی قطب کی برف پوش زمین تھی، اور جہاں بقول ابن بطوطہ برف پر چلنے کے لئے کتوں کی گاڑیوں کی ضرورت تھی، اور کتے بہت بیش قیمت تھے، اس وجہ سے ابن بطوطہ آگے نہ بڑھا[۵]، یہ وہی سواری ہے جس سے آج کل کے بہادر بھی قطب شمالی کی سرزمین کو طے کرتے ہیں،

روس کے انتہائی شمال پر دریائے بیرنگ ہے، اس کا ذکر بیرونی، نصیر الدین طوسی اور قطب الدین شیرازی نے کیا ہے اور اس کا صحیح موقع بتایا ہے، بیرنگ ایشیا کی طرف آکر مجرالکاہل

---

۵ سفرنامہ ابن بطوطہ۔

میں مِل جاتا ہے، اور شمال کی طرف اسی آبنائے بیرنگ کی پتلی سی لکیر شمالی امریکہ (کناڈا) اور پُرانی دنیا کے بیچ میں حائل ہے، مسلمانوں کا علمی قدم اس سمت میں اس پتلی لکیر تک آکر رُک گیا تھا، جہاں سے شمالی امریکہ منجمد بر فستان کے پردہ میں چند قدم پر رہ گیا تھا،[۱]

انتہائی آبادی | مسلمانوں میں علمِ ہیئت اور ریاضی جغرافیہ کا علم زیادہ تر یونان سے آیا تھا، خصوصًا بطلیموس کی کتاب الجغرافیہ اور مجسطی پر انھوں نے اپنی معلومات کی بنیاد کھڑی کی، بطلیموس نے خطِ استواء کو جو افریقہ سے گذرتا تھا خشکی میں انتہائی آبادی قرار دیا، کیونکہ اس کے خیال میں گرمی کی شدت کی وجہ سے انسانی آبادی اس کے بعد ممکن نہیں تھی، اور اسی طرح طول میں انتہائی آبادی افریقہ کے پار بحرِ محیط کے چند جزائر کو قرار دیا تھا، جن کو اہلِ عرب جزائرِ خالدات کہتے ہیں، جس کا صحیح ترجمہ جزائرِ سعیدہ یا مُبارکہ ہے، جس کو بعض عرب اہلِ جغرافیہ اور اہلِ ہیئت نے اختیار کیا ہے، اور جو اصل میں لاطینی لفظ (Fortunate) کا معرب ہے، اسی یونانی لفظ کو البکری نے اپنے جغرافیہ میں قرطناتس کے نام سے لکھا ہے، اس سے مقصود جزائر کنیری (Canaria) ہیں،

عام طور سے مشرقی اہلِ ہیئت و جغرافیہ اُن کو مفقود اور پانی میں غرق سمجھتے ہیں، مگر مغربی جغرافیہ نویس اس سے پوری طرح واقف تھے، ابو عبید عبد اللہ بن عبد العزیز البکری اندلسی المتوفی ۴۸۷ھ / ۱۰۹۴ء لکھتا ہے،

"اور بحرِ محیط میں طنجہ کے مقابل اور کوہ اٹلس کے سامنے وہ جزیرے ہیں، جن کا نام قرطناتس یعنی ہمیشہ سرسبز رہنے والے (سعیدہ) جزائر سعادات (خالدات) ہیں"

---

[۱] تقویم البلدان ابو الفداء ص ۳۵ و تذکرہ نصیر طوسی تفصیل کے لئے دیکھو میری کتاب عربوں کی جہازرانی۔ ص ۱۱۳، ۱۱۶،

ان کا یہ نام اس لئے پڑا کہ ان کی پہاڑیاں قسم قسم کے میووں اور خوشبودار پھولوں سے معمور ہیں، یہ میوے اور پھول لگائے بغیر خود بخود اُگتے ہیں، اُن کی زمینیں گھاس کے بجائے معطر پھولوں سے آباد ہیں، اور وہ بلاد بربر کے مغرب میں دریائے مذکور میں متفرق طور پر واقع ہیں[۱]،

دوسری طرف انتہائی آبادی جزیرۂ طولی کو بتاتے ہیں، جس کو برطانیہ کے اطراف میں اب عام طور پر آئسلینڈ کہا جاتا ہے،

زمین گول ہے اور جذب و کشش سے قائم ہے

اس مسئلہ سے بھی اہلِ عرب واقف تھے، کہ زمین گول ہے، اور جذب و کشش کے اصول پر قائم ہے کسی بیل کے سینگ یا ستون یا پہاڑ کی پشت پر یہ گیند رکھا ہوا نہیں ہے،

ابن خرداذبہ المتوفی سنہ ۳۰۰ھ کہتا ہے :-

زمین کی شکل گول ہے جیسے گیند جو فضائے آسمانی میں اس طرح رکھا ہوا ہے جیسے انڈے کے اندر زردی، اور ہلکی ہوا، (نسیم) زمین کے چاروں طرف ہے، اور وہ چاروں طرف سے کشش کر رہی ہے، آسمان تک اسی طرح مخلوقات کے اجسام زمین پر ہیں کہ وہی نسیم اُن کے بدنوں پر جو ہلکا پن ہے، اس کو کشش کرتی ہے، اور زمین اُس کے ثقل کو کھینچتی ہے، کیونکہ زمین مثل اس پتھر کے ہے، جس کو لوہا کھینچتا ہے"، (یعنی مقناطیس[۲])

اس عبارت میں زمین کی گولائی اور جذب و کشش کے علاوہ جس حقیقت کو نسیم جیسی ہلکی پھلکی ہوا سے ادا کیا گیا ہے، آج آپ اس کو بے تکلف "ایتھر" کہتے ہیں، نویں صدی کے آخر کا عرب جہاز راں ابن ماجد مقناطیس کے بیان میں کہتا ہے،

---

[۱] المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ للبکری ص ۱۰۹ الجیریا، [۲] کتاب المسالک والممالک ص ۴ لیڈن،

وقیل انّ السّبع السّمٰوٰت و الارض معلقات بمقناطیس[1] — اور کہا گیا ہے کہ ساتوں آسمان اور زمین قدرت کے مقناطیس سے معلق ہو

جذب وکشش کے مسئلہ کو اہلِ جغرافیہ کے علاوہ دوسرے حکمائے اسلام نے بھی بیان کیا ہے، مگر اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں،

زمین کو گول تو تمام حکمائے اسلام نے تسلیم کیا، مگر مجھے اس دعوی پر وہ استدلال پیش کرنا ہے، جو اہلِ جغرافیہ کے قلم سے نکلا ہے،

ابنِ رستہ (۲۷۰ھ) تیسری صدی ہجری میں تھا، وہ زمین کے گول ہونے پر ستاروں کے طلوع وغروب اور ظہور وخفا سے اس طرح محققانہ بحث کرتا ہے،

"تمام اہلِ علم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ زمین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ خشکی وتری کی گیند کی طرح ہے، اور دلیل یہ ہے کہ سورج چاند اور کل ستاروں کا طلوع وغروب زمین کے تمام کناروں میں ایک وقت نہیں ہوتا، بلکہ مشرقی مقامات میں اُن کا طلوع، مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے، اور ان کا غروب مشرقی مقامات میں مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے، اور یہ حوادثِ فلکی سے ظاہر جو آسمان میں ہوتے ہیں، تو ایک ہی حادثہ زمین کے تمام اطراف میں مختلف مقامات میں ہوتا ہے، جیسے چندر گرہن کا اگر ایسے دو مختلف شہروں میں اُن کو رصد کیا جائے، جو ایک مشرق میں ہو، اور دوسرا مغرب میں، تو مثلاً اگر مشرقی چندر گرہن کا وقت رات کے تیسرے گھنٹہ میں ہو تو .... (ابنِ رستہ ص ۱۲)

زمین کی گولائی پر آج کل جہازوں کے اوّلاً مستول پھر آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے پورا جہاز نظر آنے سے جو استدلال کیا جاتا ہے، اس سے بھی وہ واقف تھے، مسعودی لکھتا ہے،:-

---

[1] کتاب الفوائد ص ۲ پیرس)

اور جہاز جب سمندر کے بیچ میں ہوگا تو دماوند کے پہاڑ غائب ہو جائیں گے، اور نظر نہیں آئیں گے اور جب دریا میں سو فرسخ کے قریب رہ جائے گا، تو ذرہ سا پہاڑ کا سر نظر آئے گا، اور جیسے جیسے ساحل کے نزدیک ہوتے جائیں گے، پہاڑ بڑا ہوتا جائیگا اور یہ اس بات پر دلیل ہے، کہ سمندر کا پانی گول شکل پر ہے، اور یہی بحر روم میں حال ہے، یہ شام کے پہاڑ جو انطاکیہ اور لاذقیہ اور طرابلس اور جزیرہ سایپرس کے ساحل پر ہیں، کہ جہاز میں نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں اور ساحل کے قریب آتے ہوئے آہستہ آہستہ نظر آتے ہیں،

(مروج الذہب جلد ا ص ۹۵ اپیرس)

ابوبکر ابن الفقیہ ہمدانی (سنہ ۲۹۰ھ) اپنے جغرافیہ کتاب البلدان میں لکھتا ہے:-

"کہتے ہیں کہ سمندر بھی گول ہے، اور دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تم ساحل سے بیچ سمندر میں چلے جاؤ، تو ساحل کے پہاڑ اور درخت آہستہ آہستہ تمہاری نظر سے غائب ہونے لگیں گے، پھر جب تم بیچ سمندر سے ساحل کی طرف آؤ تو وہ آہستہ آہستہ پھر دکھائی دینے لگیں گے،

(ص ۱۵۴ - لیڈن)

یہ دلیل بعینہ وہی ہے جو آج بھی زمین کی گولائی پر عام طور سے پیش کی جاتی ہے،

زمین کے فوقانی اور تحتانی حصے اور رات اور دن

ہر چند کہ یہ مسئلہ عربی علم ہیئت میں آفتاب کے دور اور حرکت کے سلسلہ میں عام طور سے مذکور ہے لیکن زمین کے تحتانی اور فوقانی حصوں کی تخصیص کے ساتھ ذکر کرنے میں بے توجہی کی گئی ہے لیکن اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمان اس مسئلہ ہی سے واقف نہ تھے۔ تیسری صدی ہجری کا مصنف ابن رستہ اپنی کتاب الاعلاق النفیسہ

کے مقدمہ میں شب و روز کے چوبیس گھنٹوں اور جاڑا گرمی میں روز و شب کے گھٹنے اور بڑھنے کا ذکر کرکے لکھتا ہے،

لان نصف الارض ابداً انها	کیونکہ نصف زمین میں ہمیشہ دن رہتا
مضئ ونصفها الاٰخر مظلم	ہے، اور دوسرے نصف میں اندھیری
يد وران عليها،	رات اور یہ شب و روز اس زمین پر
(ص ۹ لیڈن)	گردش میں ہیں،

چوتھی صدی کے آغاز کا مصنف مسعودی مروج الذہب میں اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے،

"زمین کی آبادی کا آغاز جزائر خالدات سے شمار کرتے ہیں، جو مغربی بحر اوقیانوس میں واقع ہیں، یہ چھ آباد جزیرے ہیں، اور آبادی کی انتہا چین کی انتہائی آبادی پر ہے ان دونوں کے درمیان ۱۲ گھنٹوں کی مسافت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آفتاب جب چین کے انتہائی حصہ میں ڈوبے گا تو ان جزیروں میں جن کا ذکر ابھی ہوا، اور جو مغربی بحر اوقیانوس میں واقع ہیں، دن ہوگا، اور جب ان جزیروں میں رات ہوگی، تو اقصائے چین میں دن ہوگا، اور یہ زمین کا نصف دائرہ ہے، اور وہی آبادی کا طول ہے جس سے وہ واقف ہوئے ہیں،

(ج ۱ ص ۱۸۰ پیرس)

کرۂ ارض کے دوسری جانب آبادی

رُبع مسکون کا نظریہ ٹوٹ جانے کے بعد کرۂ ارض کی دوسری جانب آبادی کا تخیل بہت قریب ہوگیا، یہ تخیل قدیم سے قدیم تیسری صدی ہجری کے عرب جغرافیہ نویسوں میں ملتا ہے،

ابن خرداذبہ المتوفی ۳۰۰ھ اپنے جغرافیہ میں لکھتا ہے :-

الا ان العمارۃ فی کرۃ الارض	کرۂ زمین میں آبادی خطِ استوار
بعد خط الاستواء اربع و	کے بعد ۲۴ درجہ تک ہے، باقی کو
عشرون درجۃ ثم الباقی	بحرِ محیط نے ڈوبا دیا ہے، تو ہم زمین
قد غمرالبحر الکبیر فنحن علی	کے شمالی ربع پر آباد ہیں، اور جنوبی
الربع الشمالی من الارض و	ربع گرمی کی شدت کے سبب سے
الربع الجنوبی خراب لشدۃ	ویران ہے، اور زمین کے دوسرے
الحرفیۃ والنصف الباقی	نصف میں جو ہمارے نیچے ہے کوئی
الذی تحتنا لا ساکن فیہ	آباد نہیں،

(ص ۵ - لیڈن)

اس اقتباس کا آخری فقرہ قابلِ التفات ہے، کہ وہ زمین کی دوسری جانب کو کم از کم خشک اور آبادی کے قابل سمجھتا ہے، گو اس کی آبادی کا اس کو کوئی علم نہیں، اس کے بعد اُسی کے ایک ہم عصر ابن رستہ (۲۹۰ھ) کے قلم سے عجیب و غریب حقیقت تراوش ہوگئی ہے، وہ غلطی کے ساتھ اس قدر تسلیم کرتا ہے،

وان الناس نزلوا فی النصف	اور آدمی نصف شمالی میں آباد ہیں
الشمالی بین القبۃ و بنات النعش	قبہ اور بنات النعش کے بیچ میں، اور
و ذالک مقسوم علی سبعۃ	وہ سات اقلیموں پر منقسم ہے، اور
اقالیم و باقی ذالک غیر مسکون	باقی حصہ غیر آباد ہے، اور نصف جنوبی
و ینزل فی النصف الجنوبی من	میں جس کو خدا چاہے اپنی مخلوقات

شاء اللّٰہ من الخلق ، سے آباد کرے ،

(الاعلاق النفیسہ ابن رستہ ص ۹۵ لیڈن)

ابن رستہ رُبع شمالی کے بجائے نصف شمالی کی آبادی کا قائل ہے ، اور جنوب کی نسبت مشتبہ ہو کر کہتا ہے " وہاں اپنی خلق میں سے جس کو چاہے بسائے " یہ پیشینگوئی انکشافِ امریکہ سے پوری ہوئی ،

بیرونی ، نصیر طوسی ، قطب الدین شیرازی اور اُن کے تلامذہ کے سوال وجواب اور ردو اعتراض سے لوگوں میں یہاں تک ہمت ہوئی کہ طوالع الانظار کے مشہور مصنف اور ابن فضل اللّٰہ العمری (مسالک الابصار فی ممالک الامصار کے مصنف) کے استاد ابو الثناء محمود بن ابی القاسم اصفہانی المتوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۸ء نے اس نظریہ کے پیش کرنے کی جرأت کی ،

لا امنع ان یکون ما انکشف	میں اس کو ممکن سمجھتا ہوں کہ ہماری
عنہ الماءُ من الارض من	طرف زمین کا جو حصہ کھلا ہے ، وہ
جھتنا منکشفاً من الجھۃ	دوسری طرف سے بھی کھلا ہو ، اور
الاُخریٰ و لا امنع الایکون	اُس کو بھی ممکن کہتا ہوں کہ اُس میں
بہ من الحیوان والنبات و	بھی وہی حیوان ، نبات ، اور معدنیات
المعادن مثل ما عندنا اوْ	ہوں جیسے ہمارے حصہ میں ہیں ، یا
من انواع و اجناس اُخری	اور دوسرے قسم کے ہوں ،

(مسالک الابصار جلد اص ۱۴ مصر)

اس سے زیادہ تصریح اور کیا ہوگی ، اسی لئے شاید ابن فضل اللّٰہ نے ربع کے بجائے نصف ارض کو مکشوف قرار دیا ،

والبحر محیط بنصف الارض
احاطة متصلة دائرة به
كالمنطقة لا يظهر منها
الا نصفها وهو ما دارت
عليه الشمس فی قوس النهار
مثل بيضة مغرقة فی ماء
انكشف منها ما انكشف انغمر ما
انغمر،
(مسالک الابصار ص ۳۰ جلد ۱)

اور پانی نصف زمین کو چاروں
طرف سے کمر بند کی طرح گھیرے
ہوئے ہے، زمین کا آدھا ہی حصہ
کھلا ہے، اور یہ وہی ہے، جس پر
آفتاب دائرۃ النہار میں پھرتا ہے
اس کی مثال اس انڈے کی ہے،
جو پانی میں ڈوبا ہو، تو اس سے
کھل جاتا ہے جو کھل جاتا ہے اور ڈوب جاتا ہے
جو ڈوب جاتا ہے،

لیکن اس سلسلہ میں صحیح بات وہ ہے، جو بیرونی نے اس سے تین سو برس پیشتر کہی تھی، کہ اس قسم کے امور استدلال نہیں، بلکہ مشاہدہ پر مبنی ہیں،

جعلوا العمارة فی احد الربعين
الشماليين لا ان ذلك موجب
امر طبيعی فمزاج الهواء واحد
لا يتباين ولكن امثاله من
المعارف موكول الی الخبر
من جانب الثقة فكان الربع
دون النصف هو ظاهر الامر
والاولی بان يوخذ به الی

اس فن کے عالموں نے دو شمالی
ربعوں میں سے ایک ربع کو آباد
مانا ہے، اس لئے نہیں کہ اس کا
کوئی طبعی سبب ہے، کیونکہ زمین کے
ہر طرف ہوا کا مزاج یکساں ہے
لیکن بات یہ ہے کہ اس قسم کے
معلومات کسی ثقہ کی خبر و اطلاع
پر مبنی ہوتی ہیں، اس لئے آباد حصہ

ابن یردخبرۂ خبر طاری،

(تقویم البلدان ابو الفداء ص ۱۱)

چوتھائی ماننا بظاہر درست ہے،
لیکن بہتر یہ ہے کہ اس نظریہ کو
اس وقت تک مانا جائے، جب
تک کسی نئی اطلاع سے اس کی
تردید نہ ہو جائے،

ان علماء کو اپنے استدلال وجواب وسوال میں مصروف رہنے دیجئے، اور آئیے دوسری طرف ان جاہل جانبازوں کی کوششوں پر ایک نگاہ ڈالیں، جو اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر بحر ظلمات کی شناوری میں مصروف ہیں،

اوراسے بحر ظلمات | عرب کے بے آب ریگستان سے، اسلامی فتوحات کا جو سیلاب چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اٹھا تھا وہ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں افریقہ ومغرب اقصیٰ اور اندلس کے صحراؤں اور میدانوں سے گذر کر بحر ظلمات کے ساحل پر آکر رکا، مگر بلند ہمت عرب کشورکشاؤں کی ہمت اب بھی اس فطری روک کے پاس آکر کم نہ ہوئی، مغرب اقصیٰ کے فاتح عقبہ نے بحر ظلمات کے پانی میں گھوڑا کھڑا کرکے کہا کہ

"خداوندا! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کے بعد بھی تیرا کوئی ملک ہے تو میں ذوالقرنین کی طرح وہاں بھی تیری توحید کی دعوت لے کر جاتا،،

(المونس فی اخبار تونس ص ۲۰)

اندلس کا فاتح طارق فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کا آقا موسیٰ اس کو روکتا ہے تو وہ جواب دیتا ہو کہ جب تک بحر محیط کی دیوار ہمارے قدم نہ روک لیگی ہم آگے بڑھتے جائیں گے[1]

[1] نفح الطیب ج ۱ ص ۱۱۳ مصر،

ماورائے بحرِ ظلمات سفر کا تخیل عربوں اور مغربی وافریقی مسلمانوں میں ذوالقرنین کے قصہ کے سلسلہ میں پیدا ہوا یہ کہانی اتنی پھیلی کہ علم ہیئت کی کتابوں تک میں درج ہے، کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نے ملک مغرب میں پہونچ کر اپنا جہاز بحرِ ظلمات کی تحقیق حال کے لئے روانہ کیا، وہ اُس پار کے ایک جہاز کو گرفتار کرکے لے آیا، جس میں ماورائے بحرِ ظلمات کے کچھ باشندے سوار تھے، ذوالقرنین نے اُن سے اُن کے ملک کا حال دریافت کیا، رصدگاہ مراغہ کا عالمِ ہیئت شارح چغمنی اس قصہ کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے :-

"یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور اُن کے درمیان میں بڑے بڑے دریا اور اونچے اونچے پہاڑ اور صحاری حائل ہوں، جو ان کی خبر ہم تک نہیں آنے دیتے، ہاں دو جنوبی ربعوں میں سے ایک میں کچھ آبادی بیان کی جاتی ہے، اور وہ جو ذوالقرنین کے زمانہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے، وہ بظاہر بے اصل معلوم ہوتا ہے۔

(مقالہ ثانیہ فی بیان الارض)

لیکن اس قسم کی کہانیوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی، چنانچہ اسپین وافریقہ کے سواحل میں مغرورین اور مغررین (فریب خوردہ) کے نام سے ایک جماعت ہی قائم ہوگئی، جو اپنے کو مصیبتوں میں ڈال کر اس بحرِ محیط کے سفر کے لئے روانہ ہوتی تھی، پھر وہ اس میں فنا ہو جاتی تھی یا کامیاب واپس آتی تھی،

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع (نویں صدی عیسوی کے آخر اور دسویں صدی عیسوی کے شروع) میں مسعودی اپنی مروج الذہب میں اس قسم کے واقعات کے لئے اپنی دوسری تصانیف کا حوالہ دیتا ہے،

وَقَدْ اَتَيْنَا عَلٰى ذِكْرِهَا فِي كِتَابِنَا	اور ہم نے اپنی کتاب اخبار الزمان میں

فی اخبار الزمان وفی اخبار	اور ان لوگوں کے حالات میں ان
من غرر وخاطر بنفسه و	واقعات کو بیان کیا ہے، جنھوں
دین نجا منهم ومن تلف	نے اپنے آپ کو فریب دیا اور اپنے
ومن شاهد وامنه و	آپ کو جان جوکھوں میں ڈالا، اور
ما رأوا	اُن سے جو بچا اور جو ہلاک ہوا، اور
	انھوں نے جو دیکھا اور مشاہدہ کیا،

اس کے بعد کتاب ہے:-

واذا منهم رجل من اهل	ایران میں اندلس کے رہنے والوں
الاندلس یقال له خشخاش	میں سے ایک شخص تھا جس کو خشخاش
وکان من فتیان قرطبة و	کہہ کر پکارا جاتا تھا وہ قرطبہ کے
احداثهم فجمع جماعة من	نوجوانوں میں سے تھا، اُس نے
احداثها ورکب بهم	قرطبہ کے اور نوجوانوں کی ایک جماعت
مراکب استعدها فی هذا	بنائی، اور اُن کو لے کر ان کشتیوں
البحر المحیط فغاب فیه مدة ثم	پر سوار ہوا، جن کو اس نے بحرِ محیط
انثنی بغنائم واسعة و	میں اس غرض کے لئے تیار رکھا تھا
خبره مشهور عند اهل	وہ ایک زمانہ تک غائب رہا، پھر
الاندلس	بہت سا مالِ غنیمت لیکر لوٹا. اس کا
(ج ۱- ص ۱۵۸ - پیرس)	واقعہ اندلس والوں میں بہت مشہور ہے

ادریسی المتوفی ۵۶۰ھ نزہۃ المشتاق میں اندلس کے جغرافیہ میں تین موقعوں

ان مغرورین یعنی فریب خوردہ جہازرانوں کا ذکر کیا ہے؛ یہ بھی لکھا ہے کہ امیر المسلمین علی بن یوسف ابن تاشقین کے امیر البحر احمد بن عمر معروف بہ رقم الآذر (نقش بط) نے بحر ظلمات کے ایک جزیرہ پر فوج کشی کی تھی، مگر کامیابی کے پہلے ہی وہ مرگیا،

ادریسی ایک موقع پر بحرِ ظلمات کے ذکر میں لکھتا ہے۔

"اس بحر ظلمات کے پیچھے جو کچھ ہے اس کو کوئی نہیں جانتا، اور نہ کسی آدمی کو صحیح واقفیت ہے، کیونکہ اُس کو عبور کرنا سخت مشکل ہے، اُس کی فضا میں بڑی تاریکی ہے، اس کی موجیں نہایت سخت اور اس کے خطرات بہت، اور اس کے جانور خطرناک اور اُس کی ہوائیں ہیجان انگیز ہیں، اس میں بہت سے جزیرے ہیں، کچھ آباد، کچھ سمندر کے اندر اور کوئی جہازراں، اس کو عرض میں قطع نہیں کرتا اور نہ اُس میں گھستا ہے، البتہ اُس کے ساحل کے طول کے کنارے کنارے اس سے لگ کر چلتا ہے"[2]

اب بحرِ ظلمات میں یہ کون سے جزیرے ہیں؟ کیا امریکن جزائر ویسٹ انڈیز نیو فاؤنڈ لینڈ، گرین لینڈ وغیرہ ہو سکتے ہیں،

لشبونہ (لسبن ساحل پرتگال) کے ذکر میں ادریسی ان فریب خوردہ جہازرانوں کا ایک دلچسپ قصہ سناتا ہے، کہتا ہے:

"اور اسی شہر لسبن میں فریب خوردہ لوگ اس نے بحرِ ظلمات میں سوار ہوئے تھے، تاکہ پتہ لگائیں کہ اس میں کیا ہے، اور کہاں جا کر ختم ہوتا ہے، شہر لسبن میں ایک پھاٹک یا گلی (درب) ہے جس کا نام فریب کھانے والوں کا درب ہے، اور اُن کا قصہ یہ ہے کہ آٹھ آدمیوں نے جو آپس میں سب چچا کے بیٹے تھے، باربرداری کا

---

[1] نزہۃ المشتاق ص ۵۵ - ۱۹۵ ، ۱۸۴، [2] ایضاً ص ۱۹۵،

ایک جہاز بنایا، اور اس میں پانی اور توشہ آتنا رکھ لیا، جو مہینوں کے لئے کافی تھا، پھر
اس جہاز میں سوار ہو کر ایک مناسب موسم میں روانہ ہوئے گیارہ دن کے بعد ایک
ایسے پانی میں پہونچے جو سخت موجوں والا تھا، وہاں کی ہوائیں مکدر تھیں، روشنی ماند
تھی، انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب ہلاکت قریب ہے، تو اپنے بادبانوں کو دوسرے ہاتھ
کی طرف پلٹ دیا، اور سمندر میں جنوب کی طرف چلتے رہے، اور بکریوں والے ایک
جزیرہ میں پہونچ گئے، وہاں بے شمار بکریاں تھیں جن کو کوئی پکڑنے والا یا چرانے والا
نہ تھا، وہ جزیرے میں اُترے، وہاں چشمہ ملا، اور جنگلی انجیر، انھوں نے ان بکریوں میں
سے کچھ کو ذبح کیا تو ان کا گوشت بہت ہی کڑوا نکلا جس کو وہ نہ کھا سکے، اور اُنکی
کھالیں لے لیں، اور جنوب کی سمت میں ۱۲ دن دور چلے، ان کو ایک جزیرہ ملا جہاں
آبادی اور کھیتی تھی، تو وہ اس جزیرہ کو دیکھنے چلے، ابھی کچھ ہی دور چلے تھے، کہ چھوٹی چھوٹی
کشتیوں نے اُن کو گھیر لیا، اور اُن کو پکڑ کر جہاز ایک ساحلی شہر کی طرف لے گئے، وہاں
ایک گھر میں جا کر اُتارا، وہاں سُرخ رنگ (اشقر) کم لیکن سیدھے بال والے لمبے قد
کے آدمی دیکھے اُن کی عورتوں میں عجیب خوبصورتی تھی تو وہ لوگ تین دن ایک گھر
میں قید رہے چوتھے دن اُن کے پاس ایک آدمی آیا، جو عربی میں باتیں کرتا تھا، اُس نے
اُن کا حال دریافت کیا، اور پوچھا کیوں آئے اور کہاں سے آئے، اور تمہارا وطن کہاں ہے،
اُنھوں نے اپنا پورا حال بتایا، اُس نے اُن سے بھلائی کا وعدہ کیا، اور بتایا کہ وہ بادشاہ
کا ترجمان ہے دوسرے دن اُن کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا، اُس نے اُن کا حال
پوچھا تو وہی بتایا، جو کل ترجمان کو بتا چکے تھے، کہ وہ اس سمندر میں اس لئے گھُسے تھے
کہ دیکھیں اس میں کیا کیا عجائبات ہیں، اور اس کے حالات کیا ہیں، اور اس کی حد

دریافت کریں، یہ سن کر بادشاہ ہنسا اور ترجمان کے ذریعہ سے ان کو بتایا کہ اس کے باپ نے اپنے غلاموں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ سمندر کے عرض میں ایک مہینہ تک چلتے رہیں، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اور وہ ناکام واپس آئے، پھر بادشاہ نے ترجمان سے کہا کہ ان سے بھلائی کا وعدہ کرے، اور بادشاہ کے ساتھ حسن ظن پیدا کرے، اس نے ایسا ہی کیا۔ پھر وہ اس قید خانہ میں لے آئے گئے، یہاں تک کہ وہ موسم آیا جب پچھوا ہوا چلتی ہے، تو ان کو ایک کشتی میں بٹھا کر اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ایک مدت تک سمندر میں چلاتے رہے، ان کا گمان ہے کہ تین دن اور تین رات وہ چلے ہوں گے، یہاں تک کہ وہ ایک خشکی میں پہنچائے گئے، وہاں ان کی مشکیں کسی گئیں، اور ساحل پر چھوڑ دیئے گئے، یہاں تک کہ دن نکلا اور روشنی ہوئی، اور ہم بندھے ہونے کے سبب سخت تکلیف اور بدحالی میں تھے، پھر ہم نے لوگوں کی آوازیں سنیں، تو چیخے تو وہ لوگ پاس آئے اور مشکیں کھولیں اور ہمارا حال دریافت کیا، ہم نے بتایا، یہ لوگ بربر تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ تم جانتے ہو، کہ تمہارے وطن کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے، انھوں نے کہا نہیں، انھوں نے کہا دو مہینوں کی مسافت۔ یہ سن کر ان فریب خوردہ جہازرانوں میں سے ایک کی زبان سے وا اسفیٰ (ہائے افسوس) نکل گیا، تو اس مقام کا نام اسفی پڑ گیا اور وہ مغرب اقصیٰ کے بندرگاہ کا نام ہے[1]،

جزئی اغلاط اور دنوں کے اندازہ سے قطع نظر کر کے کیا ہم اس مقام کو جہاں تک فریب خوردہ جہازراں پہونچے تھے، شمالی امریکہ کا کوئی گوشہ سمجھیں، اور سرخ رنگ کے انسان وہی تو نہیں، جن کا نام غلطی سے ریڈ انڈنیس (لال ہندوستانی) رکھ دیا گیا ہے، جو وہاں کے

---

[1] نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق صفۃ افریقیۃ والاندلس ص ۳، الائیڈن،

اصلی باشندے ہیں،

ابنِ خلدون المتوفی ۸۰۸ھ آٹھویں صدی میں بحرِ محیط کے ایک سفر کا حال لکھتا ہے' جس میں، اہلِ فرنگ کے چند جہاز بحرِ محیط کے کسی جزیرہ میں اتفاقاً پہونچ گئے تھے، چونکہ بحرِ محیط کے اندر یا انتہا پر جزائرِ خالدات کے علاوہ کوئی اور نام معلوم نہ تھا، اس لئے اُس کے اندر کی ہر آبادی کو اور خشکی کو جزائر خالدات کہہ دیتے تھے، چنانچہ وہ مقدمہ میں کہتا ہے :-

بحرِ محیط میں بہت سے جزیرے ہیں جن میں تین بڑے اور مشہور ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ وہ آباد ہیں، اور ہم کو خبر معلوم ہوئی ہے کہ اس صدی (آٹھویں صدی ہجری چودھویں صدی عیسوی) کے بیچ میں اہلِ فرنگ کے چند جہاز ادھر سے گذرے، اور انھوں نے وہاں لوٹ مار کی، اور وہاں کے کچھ باشندوں کو پکڑ لائے، اور مراکش کے سواحل پر اُن کو بیچا، اور وہاں سے وہ سلطان کے پاس پہونچے، جب ان لوگوں نے عربی سیکھ لی تو انھوں نے اپنے جزیرہ کا حال بتایا کہ وہ کاشت کاری کے لئے زمین سینگ سے کھودتے ہیں، اُن کے یہاں لوہا نہیں ہے، جو کھاتے ہیں، اور اُن کے مویشی بھیڑیں ہیں، اور لڑائی میں پتھر کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں، اور آفتاب کو پوجتے ہیں،

اس کے بعد ابن خلدون کہتا ہے، اور صحیح کہتا ہے۔

ولا یوقف علی مکان ھذہ	ان جزیروں کا صحیح پتہ نہیں معلوم،
الجزائر الا بالعثور لا بالقصد	اتفاقاً وہ مل جاتے ہیں، اور بالارادہ
الیھا، (ص ۴۵)	نہیں ملتے،

اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ جہاز ہوا کا رُخ جاننے اور ستاروں کی سمت معلوم کرنے اور سواحل کے بحری نقشوں کی مدد سے چلتے ہیں،

وهذا كله مفقود في البحر المحيط، (صفحہ ۴۵) — اور یہ تمام مسلمان بحرِ محیط میں مفقود ہیں،

اسی لئے جہاز اس کے بیچ میں ہو کر نہیں چلتے، کیونکہ اگر سواحل کا منظر آنکھوں سے دُور ہو جائے، تو واپس آنے کی راہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے، ساتھ ہی اس سمندر کی فضا میں اور اُس کے پانی کی سطح پر اتنے بخارات رہتے ہیں جو جہازوں کو چلنے نہیں دیتے، اور آفتاب کی روشنی پہونچنے نہیں پاتی، اسی لئے اس میں راہ پانا، اور اس کا معلوم ہونا مشکل ہے،

(مقدمہ ص ۴۵)

ان تمام قصوں کو ممکن ہے کہ دلچسپ کہانیوں ہی کی صورت میں تسلیم کیا جاتا لیکن آج کل امریکہ کے کولمبس کی دریافت کی جو تنقیدی تاریخیں لکھی جارہی ہیں انھوں نے ان کہانیوں کو سنجیدہ تاریخ بنا دینے کی سند پیدا کر دی ہے،

نئی تحقیقات امریکہ کے انکشاف کی جو تنقیدی تاریخیں وقتاً فوقتاً لکھی گئی ہیں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ نئی اور پرانی دنیا میں کولمبس سے پہلے سے تعلقات قائم تھے؛ ان تعلقات کی تعمیر میں کون کون قوموں نے حصہ لیا، اس کی دریافت تاریخی اور اثری ذریعوں سے اب تک کی گئی تھی لیکن ابھی حال میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لیو وینر (Leo Wiener) کی ایک کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کا نام "افریقیہ اور امریکہ کی دریافت" ہے؛ اس میں نہایت واضح طور سے یہ ثابت کیا گیا ہے، کہ کولمبس امریکہ کا پہلا دریافت کرنے والا ہرگز نہیں، موصوف نے امریکہ میں پرانی آنے والی قوموں کی دریافت کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے، انھوں نے امریکہ کے پرانے باشندوں کی اصلی زبان کی فیلالوجیکل تحقیقات کے ذریعہ

سے یہ پتہ لگایا ہے، کہ امریکہ کے باشندوں کی پرانی زبان وقتاً فوقتاً کن کن زبانوں سے مانوس و متاثر ہوتی رہی ہے، ڈینیر صاحب چھبیس انسانی زبانوں میں بآسانی گفتگو کر سکتے ہیں، اور امریکہ کی پرانی زبان کے بڑے ماہر ہیں، اس کتاب کا خلاصہ انگریزی رسالہ "ورلڈ ٹوڈے" فروری ۱۹۲۶ء میں چھپا تھا جس کا اعتراف المقتطف اگست ۱۹۲۶ء میں اور اردو ترجمہ معارف اگست ۱۹۲۷ء میں طبع ہوا،

ڈینیر کی تحقیقات کا حیرت انگیز نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ کی اصلی زبان میں انگریزی، فرانسیسی، ہسپانی اور پرتگالی زبانوں سے بہت پہلے جس زبان کے الفاظ ہیں، وہ عربی زبان ہے، یہ الفاظ اُن کی تحقیق کے مطابق ۱۲۹۰ء کے قریب اس میں داخل ہیں، اور کولمبس نے امریکہ کی دریافت کا شور اس کے ٹھیک دو سو برس بعد مچایا ہے، ڈینیر نے کاغذی دستاویزوں سے ثابت کیا ہے، کہ کولمبس سے پہلے بحر اوقیانوس میں تجارتی جہازرانی ہوتی تھی، مگر تاجر و سوداگر بادشاہوں کے ڈر سے اپنی ان بحری مہموں کو چھپاتے تھے۔

کولمبس کے خود ذاتی بیانات بھی حقیقت کی پردہ دری کرتے ہیں۔ وہ امریکہ کے تیسرے سفر سے واپسی کے بعد بیان کرتا ہے، کہ اسے وہاں زنگی سوڈانی باشندوں سے سابقہ پڑا، بلکہ پہلے سفر کے بعد ہی وہ کہتا ہے، کہ وہاں کے اصلی باشندوں نے اسے گنی (یعنی وہی مغربی افریقہ کے طلائی سکے جس کو ایک خاص مقدار میں تانبہ ملا کر بناتے تھے) دکھائی "گوئنیس" اس وقت کی افریقہ کی زبان میں سونے کے ان ٹکڑوں کو کہتے تھے، جن کو شکل میں سونا ساحل گنی (غانا) سے یورپ میں لایا جاتا تھا، قدرتی طور پر سونے کے یہ ٹکڑے دیکھ کر کولمبس متحیر ہو گیا، کیونکہ وہ دراصل اسی سونے، ہاتھی دانت اور قیمتی سامان کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا، اُس نے امریکہ کے باشندوں سے دریافت کیا، کہ انھوں نے ....

وہ سونا کہاں سے پایا، اس کے جواب میں انھوں نے کہا ہم نے یہ سونا کالے سوداگروں سے لیا ہے جو جنوب مشرق سے یہاں آئے تھے" کولمبس کو گمان ہوا کہ وہ سونے کی اصلی کان بتانے سے گریز کرتے ہیں، تیسرے سفر میں اُس نے پھر وہی سوال کیا، اور وہی جواب پایا، در آخر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا، کہ پرانے امریکیوں کے جواب درست تھے، ابتدائی گوئنیس جو فرانسیسی اور پرتگالی گنی ساحل سے لاتے تھے، خالص سونے کے نہیں ہوتے تھے بلکہ غانہ والے اس میں اُسی کے برابر تانبہ ملا دیتے تھے، جب کولمبس کی لائی ہوئی گوئنیس کا کیمیائی امتحان کیا گیا تو اس میں سونے اور تانبے کا وہی تناسب نکلا، جو غانہ (گنی) کے لائے ہوئے گوئنیس میں تھا،

یہ طلائی ٹکڑے دراصل افریقیہ ہی سے آئے تھے، ایسے ہی جو حبشی اس کو وہاں ملے، وہ افریقیہ ہی سے آئے ہوں گے، جہازوں کے کپتانوں کے ہر سفر سے پایا جاتا ہے، کہ ان کے لئے خلاصی حبشیوں کی موجودگی ضروری تھی، وہ بطور ترجمان استعمال کئے جاتے تھے، کولمبس بھی اُن میں سے چند کو پہلے سفر میں ساتھ لے گیا تھا، امریکہ جا کر اسے معلوم ہوا کہ ایسے حبشی وہاں پہلے سے موجود ہیں، یہی وہ لوگ تھے جن کو جنوبِ مشرق کے سیاہ سوداگر کہا گیا تھا، انہی کے ساتھ غانہ کے سکے امریکہ پہونچے تھے، اور انہی کے ساتھ عربی الفاظ، عربی پودے اور عربی تہذیب وہاں پہونچی،

پہلے آثارِ قدیمہ کے ماہروں کا یہ تنہا بیان تھا، اور اب زبانوں کے محقق بھی اُن کے ساتھ مل گئے ہیں، اور دونوں کا متفقہ دعویٰ ہے کہ امریکہ میں عربی تہذیب کا اثر کولمبس سے بہت پہلے پایا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نئی دنیا افریقی عربی تمدن سے بہت حد تک متاثر ہو چکی تھی امریکہ کی پرانی قوموں میں دو ممتاز نام ملتے ہیں "ازتک" اور "مایہ" جو افریقیہ کی عربی تہذیب کی حامل تھیں، معلوم نہیں اُن کی اصلیت کیا ہے، مگر یہ نام صحیح عربی ناموں کی تحریف معلوم

ہوتی ہے، پہلا نام ازدؔ ہے، اور دوسرا نام معاویہؔ ہے، ازدؔ کی نسبت، پہلے ہم لکھ چکے ہیں[1] کہ یہ لوگ ابتدائے اسلام میں عمانؔ سے افریقہؔ اور مڈگاسکرؔ کے بحری جہازراں تھے، اور بہادری سے اپنے جہاز بحرِ برابرہؔ میں چلایا کرتے تھے،

بہرحال رسالۂ مذکورہ نیر کی تحقیق کا خلاصہ آگے ان الفاظ میں دیتا ہے :-

"ازٹؔ اور مایہؔ کی تہذیبیں دراصل امریکہ میں افریقہ کی عربی تہذیب کی نقلیں تھیں، اور اُن کا زمانہ سنہ ۱۱۵۰ء سے سنہ ۱۲۰۰ء تک قرار دیا جاتا ہے"

ہم نے مغرورینؔ کے سفر کا جو زمانہ لکھا ہے، وہ اسی کے قریب ہوتا ہے،

"عربی تہذیب نویں صدی عیسوی میں اپنے معراج پر تھی، اور سنہ ۱۱۰۰ء میں صحرائے اعظم کو عبور کرکے افریقہ کے مغربی منڈینگو (Minenigo) کا تجارتی صوبہ قائم کرچکی تھی، اس کے مقابل میں امریکہ کا صوبہ میچوکن[2] (Michoacan) تھا، جو خلیج میکسیکو کے ساحل پر واقع تھا، عربی الفاظ کی آمیزش سب سے پہلے میچوکن میں پائی جاتی ہے، اور وہ الفاظ منڈینگو کی زبان میں ملتے ہیں، اور یہ امر خاص طور پر ذکر کے قابل ہے، کہ یہ الفاظ ایسے ہیں کہ جو ایک تجارتی کارندہ یا سیاح استعمال کرتا ہے" مثلاً جادو، ادویہ، مذہب اور نظامِ حکومت کے متعلق "یہ نتیجہ کہ منڈینگو اور میچوکن کے درمیان آمد و رفت بھی لابدی ہے، ہر طرح تازہ تحقیقات سے اس کی تائید ہوتی ہے" ازٹؔ اور مایہؔ کی تہذیبوں کا یک بیک انحطاط اس کا ایک اور ثبوت ہے، چونکہ یہ ایک طرح کی نوخیز تہذیبیں تھیں، جس وقت ان کا اپنے اصلی مرکز سے قطع تعلق ہوگیا، اُن میں تنزل آنا شروع ہوگیا، یہ امر کہ یہ تعلق صرف تجارتی تھا، اس بات سے ثابت ہوتا ہے، کہ عربی تہذیب کا اثر میچوکن میں داخل ہوکر صرف تجارتی راستوں کے آس پاس ہی

---

[1] عربوں کی جہازرانی ص ۷۶، [2] میکسیکو میں ایک ریاست بحرالکاہل (پاسفک) پر ملتی ہے -

پایا جاتا ہے، اور یہ صرف خالص عربی کا اثر تھا''

اگر مسٹر وینیر کی ان لسانی تحقیقات کے نتائج درست ہیں، تو ہم نے اُن کی تصدیق کے لیے جو مقدمات گذشتہ صفحوں میں فراہم کئے ہیں، وہ بھی قابلِ قبول ہیں،

پرانے عربوں کی امریکہ میں آبادی

اس نظریہ کو سُن کر لوگوں کا بجا سوال تھا کہ اگر یہاں کولمبس سے پہلے عربوں کی آمدورفت تھی، تو امریکہ میں اُن کے نشانات کیوں نہیں ملتے، اور اُن کی کسی نوآبادی کا پتہ یہاں کیوں نہیں لگتا، مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ عین اس وقت جب یہ سطریں زیرِ تحریر تھیں، امریکہ کے عربی اخبار الہدیٰ نے ایک نیا انکشاف دنیا کے سامنے پیش کیا، جس کی صدائے بازگشت سے دنیا گونج گئی، اور خود ہندوستان کے اردو اخبارات نے اُس کے اقتباسات دسمبر ۱۹۳۰ء میں شائع کئے، براعظم امریکہ میں وہاں کی مہذب ریاستوں اور متمدن ملکوں کے علاوہ بہت سے ایسے پہاڑی مقامات، جنگل، اور گانوں ہیں، جہاں اس براعظم کے پرانے باشندے آباد ہیں، اور جو اب تک اپنی وہی پرانی قبائلی زندگی بسر کر رہے ہیں، اور جہاں تک اب تک کسی یورپین سیاح کے قدم نہیں پہونچے ہیں، خصوصیت کے ساتھ یہ مقامات میکسیکو کے علاقہ میں زیادہ ہیں، اخبارات راوی ہیں[1]،

''ایک شامی عرب تاجر میکسیکو کے چاپاس اور ہٹاسلا کے صوبوں میں پھیری کر کے سوداگری کا مال بیچتا تھا، حال میں اتفاقاً اس کا گذر ایک کوہستانی علاقہ میں ہوا، جہاں آمدورفت جاری نہیں تھی چلتے چلتے ایک جنگل میں پہونچا، وہاں ایک

---

[1] المقطم دسمبر ۱۹۲۰ء والمسار مورخہ ۲۷ شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء، پیام کلکتہ مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۰ء،

قبیلہ دیکھا، رات ہوچکی تھی، سوداگر نے اپنی زبان میں ان جنگلی باشندوں سے شب بھر رہنے کی درخواست کی، اس کے جواب میں ایک شخص نے عربی میں کہا کہ ہم لوگ تمھاری بولی نہیں سمجھتے، عرب سوداگر اس جنگل میں عربی زبان سُن کر حیرت میں آگیا، اُس نے اُن سے عربی میں گفتگو کی، اور انھوں نے کہا کہ وہ صدیوں سے اس جنگل میں آباد ہیں، اور عربی کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں جانتے،"

سوداگر مذکور کا بیان ہے کہ یہ قبیلہ اب تک اپنے عربی رسم و رواج پر قائم ہے" [اور] نص عرب ہے، یہ خبر میکسیکو کی حکومت کو معلوم ہوئی، تو اس نے ایک کمیشن اس عرب قبیلہ [کی] تحقیقِ حال کے لئے روانہ کیا ہے۔

یہ قبیلہ چار سو برس سے زیادہ سے یہاں آباد ہے، اور دوسرے ہمسایہ قبیلوں سے الگ [تھلگ] زندگی بسر کرتا ہے۔

اس خبر سے عرب جغرافیہ نویسوں کے بیانات اندلس، اور پرتگال کے عرب "مغرورین" ([ف]ریب خوردہ جہازرانوں) کی کہانیوں کی تصدیق ہوتی ہے،

اس سلسلہ کی اخیر خبر یہ ہے کہ لبنان کے عیسائی فاضل انطون یوسف بشارہ نے جنھوں [نے] میکسیکو میں سکونت اختیار کر لی ہے، مصر کے اخباروں میں پچھلے سال یہ اطلاع شائع کی ہے" الفتح مصر مورخہ ۳۰ رجمادی الاولی ۱۳۵۲ھ ص ۲۴۶ میں چھپی ہے، کہ وہ میکسیکو میں اپنی [ز]مین واقع ریوکرسی (میکسیکو) میں کھدائی کرا رہے تھے، کہ ان کو دو معدنی ٹکڑے ملے جو [کو]لمبس کے بعد عربی سکے ثابت ہوئے، اس دریافت کا وہاں کے علمی حلقوں میں بڑا [چر]چا ہے،

| کولمبس اور امریکہ |

یہ تحقیق تو الگ رہی، مشہور یوں ہی ہے کہ کولمبس پہلا شخص ہے

جس نے اس نئی دنیا کو پرانی دنیا سے ملایا مگر اُس نے جو کچھ پایا اتفاقیہ پایا کہ ع

آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے،

کولمبس ہندوستان، اور چین کی تلاش میں تھا کہ امریکہ پہونچ گیا، کسی علمی استدلال سے وہ اس نتیجہ پر نہیں پہونچا، اور بقول ایک اطالوی عالم ہیئت اور مستشرق کرلونلینو کے کہ "کولمبس عربوں کی مقدار مسافت، اور میل کے صحیح اندازہ کے نہ جاننے کی مبارک غلطی سے امریکہ پہونچ گیا"، فاضل اطالوی عالم کی اصل عبارت عربی کا ترجمہ یہ ہے، :-

" لاطینی کتابوں کے عربی ترجموں کے ذریعہ سے مامون نے ایک درجہ فلکی کی پیمایش کا جو اندازہ نکالا تھا یعنی ۵۶ ۲/۳ میل، وہ یورپ میں کبھی مشہور ہوا، اور جس طرح یونانی اور سریانی کتابوں کے عربی ترجمہ کے ذریعہ سے یونانی میل کی مقدار نہ جاننے سے اہلِ عرب نے غلطی کی، اسی طرح چودہویں صدی اور پندرہویں صدی میں عربی میل کی صحیح مقدار نہ سمجھنے کے سبب سے اہلِ یورپ غلطیوں میں مبتلا ہوگئے، انہی میں کرسٹوفر کولمبس امریکہ کا پتہ لگانے والا بھی تھا اُس نے ایک درجہ کے ۵۶ ۲/۳ عربی میل کو لاطینی ۵۶ ۲/۳ سمجھ کر مغربی یورپ اور ایشیا کے مشرقی سواحل کی مسافت اس سے بہت کم سمجھی جو حقیقت میں ہے، اگر یہ غلطی نہ ہوتی، تو کبھی ممکن نہ تھا، کہ مغربی یورپ سے اوقیانوس میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر صرف چند دہینوں کی خوراک لے کر چین پہونچنے کا تخیل کرتا۔ آخر اس سفر سے رُک کر وہ اس غلطی کی بدولت امریکہ کے جدید

براعظم میں پہونچ گیا، جس نے ایک نئے انسانی دور ترقی کا آغاز کیا، یہ غلطی کیسی مُبارک تھی، جس نے دنیا کو عظیم الشان فوائد سے مالامال کر دیا،[1]

کولمبس اس وقت ظاہر ہوا، جب اہلِ اسپین اندلسی عربوں سے آخری لڑائی لڑ رہے تھے، اور ان کو اپنے ملک سے نکال رہے تھے اس کا زمانہ اسپین اور پرتگال میں گذرا، ایک معمولی سیّاح سے جہازراں تک پہونچا، وہ ہیئت جغرافیہ اور سفرنامہ کی کتابیں پڑھا کرتا تھا، ایک اسپینی خاتون سے شادی کی، اس ذریعہ سے اسپین کے ایک عیسائی خانقاہ کے جغرافیہ داں راہب سے ملا، پھر اس کا پیشہ یہ ہو گیا کہ وہ جہازرانوں کے لئے بحری نقشے تیار کرکے فروخت کرتا تھا، اور بحری مسافروں اور جہازرانوں سے معلومات جمع کرتا تھا، عین اسی عربی اور اسپینی لڑائی کے زمانہ میں وہ ملکۂ اسپین سے نئے جزیرہ، اور نئے بحری راستوں کے لئے مدد کا طالب ہوا، اس زمانہ میں اسپین اور پرتگال کے عیسائی موروں (مسلمان عربوں) کو نہ صرف اسپین بلکہ تمام سواحل و جزائر سے نکالنے کے لئے ہر طرف بحری بیڑے بھیج رہے تھے، سواحل بحرِ محیط سے لیکر سواحل افریقیہ سے یہاں تک کہ عرب اور ہندوستان کے سواحل تک سے عرب جہازرانوں کو لڑا لڑا کر نکال رہے تھے۔ اور اُن سے بحری نقشے حاصل کرتے تھے، وہ سونے کی کان والے افریقی ساحل تک بھی گیا تھا، جہاں افریقی اور زنگی ملّاح بکثرت پرتگالیوں کو ملتے تھے۔

---

[1] خطبات علم الفلک عند العرب ص ۲۹۳۔

بہرحال اس زمانہ مین یورپ اور خصوصًا اسپین اور پرتگال میں علم ہیئت، ہندسہ، جغرافیہ اور بحری سفر کے معلومات جو کچھ تھے، وہ عربی تصنیفات، یا اُن کے تراجم کے ذریعے تھے، جیسا کہ اس عہد کی تاریخوں میں مورخین نے بیان کیا ہے، اور اس طرح کولمبس اپنے نظریہ کی ترتیب و تکمیل میں تمام تر عربوں ہی کی تحقیقات سے مستفید ہوا،

(معارف مارچ و اپریل ۱۹۳۹ء)

اسلامی رصد خانے

رصد خانہ جس کو انگریزی میں (observatory) کہتے ہیں، نہایت قدیم چیز ہے، ایک خاص قسم کی بلند عمارت ہوتی ہے جس میں حسب موقع سیکڑوں چھوٹے بڑے آلات نصب ہوتے ہیں، جن سے ستاروں کی گردش، حرکت، طلوع، غروب، مقام، مدت گردش ستاروں کی باہمی نسبت وغیرہ دریافت ہوتی ہے، علم ہیئت (اسٹرانومی) کے تقریباً اکثر مسائل کی بنیاد انہی رصدوں کی تحقیقات و مشاہدات پر مبنی ہے، اس قسم کی چیزوں کی ابتداء دریافت کرنا جس کی ابتدا تاریخ کی تاریکی میں گم ہو، ایک بے سود کوشش ہے، اس عام قاعدے کی رو سے کہ ہر شے بتدریج ترقی کرتی ہے، یہ خیال ہوتا ہے کہ پہلے رصد کے لئے آلات نہ ہوں گے، صرف آنکھوں سے روشن ستاروں کے حالات دریافت کئے گئے ہوں گے، رفتہ رفتہ کچھ آلات ایجاد ہوئے ہوں گے، ان میں بعض آلات ایسے ہوں گے، جو بآسانی ہر جگہ منتقل نہیں ہو سکتے ہوں گے، اس لئے ان آلات کے لئے ایک خاص مکان بنایا گیا ہوگا، جس میں یہ آلات بحفاظت تمام رکھے جا سکیں؛ رفتہ رفتہ اُس نے ایک منتظم رصد خانہ کی حیثیت پیدا کر لی،

سب سے قدیم رصد خانہ جس کا تاریخ میں ذکر ہے، متون کا رصد خانہ ہے، جو ۴۳۰ء سنہ برس

قبل حضرت مسیح قائم کیا گیا تھا، اسی رصد خانہ میں سب سے پہلے مدار صیفی کی تعیین کی گئی، اور اوس آلہ کا استعمال ہوا، جس کو قائمہ (ہیلو میٹر) کہتے ہیں[۱]، اس کے بعد تیمور خارس، منالاؤس اور جس نے رصد خانے قائم کئے، لیکن مسلمانوں سے پہلے سب سے مشہور رصد خانہ اسکندریہ کا رصد خانہ ہے جس کا منتظم بطلیموس تھا، بطلیموس پہلا شخص ہے جس نے ایک منتظم رصد خانے کی بنیاد ڈالی، رصد کے بعض ضروری آلات ایجاد کئے، اور فیثا غورث کے خلاف زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیا،

یورپ میں رصد خانے کی ابتدا پندرہویں صدی سے ہوتی ہے، ابتدائی رصد خانہ والتھورس کا ہے، جو نورمبرگ میں قائم کیا گیا تھا، یہ پہلا رصد خانہ ہے، جہاں گھڑی کا استعمال ہوا،

اس کے بعد مشہور عالم ہیئت ٹائیکو براہی نے ۱۵۷۶ء میں اورمبرگ (ڈنمارک) میں رصد خانہ قائم کیا، اور اُس کے لئے بہت سے جدید آلات خود ایجاد کئے، اُس کے بعد برابر رصد خانے قائم ہوتے رہے، جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، ہندوستان میں بھی اسلام سے پہلے بعض رصد خانوں کا پتہ چلتا ہو جن میں سب سے زیادہ مشہور راجہ بکرما جیت کا رصد خانہ ہے،

مسلمانوں میں رصد خانے کی بنیاد تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے، جب مامون اعظم سریر آرائے خلافت تھا، اسلامی رصد خانے کی تاریخ سے پہلے اسلامی آلات رصد کے متعلق ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں،

---

[۱] دائرۃ المعارف ج ۸ ص ۳۰،

مسلمانوں نے آلاتِ رصد کا بنانا صابیوں سے سیکھا، صابیوں کا مشہور شہر حران اسلامی فتوحات میں شامل ہوچکا تھا، وہاں آلاتِ رصد کثرت سے بنتے تھے، عباسیہ کے زمانے میں علوم وفنون کے ساتھ آلات سازی کو بھی ترقی واشاعت ہوئی، مامون نے جب رصدخانہ قائم کرنا چاہا تو ابن خلف مروزی نے ذات الحلق در رصد کا ایک مشہور آلہ بنایا، جو چوتھی صدی تک بغداد کے بعض علماء کے پاس محفوظ تھا،[1]

علامہ ابنِ ندیم نے جو چوتھی صدی میں تھے، اپنے زمانے تک کے ماہرین آلات کے یہ نام بتائے ہیں، ابن خلف مروزی الفزاری، ابنِ خلف کا غلام علی بن عیسیٰ، علی بن عیسیٰ کے غلام احمد بن خلف اور محمد بن خلف۔ احمد بن اسحاق حرانی، ربیع بن فراس حرانی جعفیت کے غلام قطسطوس، اور علی بن احمد، محمد بن شدا دالبلدی، علی بن سرخ حرانی نطلوس کے غلام شجاع اور عجلی، عجلیہ بنت عجلی، جابر بن سنان حرانی، سنان بن جابر حرانی فراس ابن حسن علی بن احمد کا غلام حامد بن علی، ابنِ نجبہ حسین البوقی،

ان ناموں کی طویل فہرست سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں میں علمِ ہئیت کا عالمگیر شوق تھا جس میں عورت مرد، غلام آقا سب مساوی حصہ لیتے تھے، ابتدائی زمانہ میں نوشتا گر آلات رصد کے سب سے زیادہ مشہور صناع تھے، ابو حامد صاغانی المتوفی ۳۷۹ھ آلاتِ رصد کے بنانے میں کمال رکھتا تھا،

چوتھی صدی کے بعد سب سے بڑا ماہر آلات خازن مرزنی، المتوفی ۳۰۰ھ؟ تھا

[1] کتاب الفہرست ص ۲۸۴ و ۲۸۵

خازن ایک مدت تک مصر اور اندلس میں رہا ہے، اور علم نور کی اُس نے تحقیق کی ہے، آلاتِ رصد کے بیان اور ساخت میں اوس نے ایک مستقل رسالہ کتاب آلات العجیبہ الرصدیہ لکھا ہے، تیرھوین صدی عیسوی میں ابنِ راجل بھی ایک مشہور آلات ساز گذرا ہے، اور اس کی تصنیف جو آلات سازی کے متعلق ہے ۱۸۳۵ھ میں فرنچ میں ترجمہ ہوکر پیرس میں دو جلدوں میں چھپی ہے[۱]،

ابن النبدی جو ابتدائی گیارھوین صدی عیسوی میں تھا، ایک مشہور آلات رصد بنانے والا تھا، مصر کے شاہی کتب خانے کی جب فہرست مرتب کی جانے لگی تو ابوالقاسم علی وزیر مصر کے حکم سے کتب ہئیت اور آلاتِ رصد کی فہرست اسی نے مرتب کی تھی، ابن النبدی ۱۰۴۰ء میں مصر میں موجود تھا،

خلیفہ مسترشد کے زمانہ میں بدیع اسطرلابی مشہور آلات ساز تھا جس نے آلات سازی کی بدولت بے شمار دولت جمع کی تھی، ۵۳۴ھ میں اس نے وفات[۲] پائی،

اندلس کے مسلمانون نے ہئیت میں جو ترقی کی، اس کی بہت کم یادگار باقی ہے، اس لئے صرف اسی کا افسوس نہیں ہے، کہ اندلس کے مسلمان مٹا دیئے گئے، بلکہ سب سے زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اُن کی تصنیفات اور ان کی یادگاریں بھی مٹا دی گئیں، اس لئے اندلس کے آلات رصد اور رصدخانون کے متعلق بہت کم معلوم ہے،

گیارھوین صدی عیسوی کے اختتام پر زرقال اندلس کا ایک مشہور آلات ہئیت

---

[۱] اکتفاء القنوع ص ۴۴۹

[۲] فوات الوفیات کتبی جلد ۲ ص ۳۹۰،

بنانے والا تھا، جس نے مامون شاہ طلیطلہ کے لئے ایک اسطرلاب بنایا تھا، اور اشبیلیہ میں ابنِ عباد کے نام سے آلات ہیئت کے متعلق ایک کتاب تالیف کی جس کا نام عبادیہ رکھا، علم ہیئت میں اس کی بہت سی جدید تحقیقات ہیں،

مسلمانوں کی بڑی بڑی جامع مسجدوں میں ایک عہدہ موقت کا ہوتا تھا جس پر بڑے بڑے ہیئت دان مامور کئے جاتے تھے، موقت کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ نماز کے صحیح وقت مؤذن کو بتایا کرتا تھا، غرناطہ کی جامع مسجد کا موقت ابن باظہ ملی تھا، یہ آلاتِ رصد ایسے مضبوط اور خوبصورت بناتا تھا، کہ لوگ اُن کو بڑی بڑی قیمتوں میں خریدتے تھے، ابنِ باظہ نے آلاتِ سازی کا فن اپنے والد حسن سے سیکھا تھا جو اس فن میں نہایت استاد تھا، [۱]

قسطنطنیہ میں شیخ غرس الدین احمد المتوفی سنہ ۹۷۱ھ علم ہیئت کے مشہور آلات ساز تھے، تمام آلات رصد خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے، اس زمانہ تک کے علماء کا ہاتھ تلوار سے آشنا تھا، سلطان مصر اور چراکسہ مصر میں جب جنگ ہوئی تو شیخ غرس الدین اس جنگ میں شریک تھے، [۲]

ہندوستان میں علامہ تفضل حسین خان المتوفی سنہ ۱۳۱۵ھ اور اُن کے شاگرد دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین المتوفی سنہ ۱۲۴۴ھ علم ہیئت آلات رصد میں نہایت کمال رکھتے تھے، دبیر الدولہ کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین جر ثقیل اور رصد کے ہر قسم کے آلات کرہ اصطرلاب، ذات الحلقیں، ذات الحلق، ربع مجیب المزدون وغیرہ اپنے

---

[۱] الاحاطہ باخبار غرناطہ ص ۸۵، [۲] الشقائق النعمانیہ ج ۲ ص ۱۳۶

ہاتھ سے نہایت خوب بناتے تھے، اور ان کا وہ کمرہ جس میں وہ آلات رکھتے تھے، ایک رصدخانہ معلوم ہوتا تھا[1]،

ان بزرگوں کے علاوہ نصیر طوسی، علی برجندی، ابن شاطر تقی الدین، غیاث الدین جمشید، غلام حسین جونپوری وغیرہ آلات سازی میں نہایت کامل الفن استاد تھے، جن کی گو اس وقت کوئی عملی یادگار موجود نہیں ہے، مگر تاریخ اور اُن کی تصنیفات خود اس کی شاہد ہیں، مسلمانانِ اندلس کے بنائے ہوئے بعض آلات اب تک بعینہٖ یورپ میں موجود ہیں، انہی میں سے ایک وہ کرہ ہے، جو ڈریسڈن کے عجائب خانہ میں سکسونیا (جرمنی) میں محفوظ ہے،

اسی سلسلہ میں ہم کو اُن آلاتِ رصد کا بھی تذکرہ کرنا چاہئے، جن کو خاص مسلمانوں نے ایجاد کیا ہے، اور وہ پہلے مستعمل نہ تھے، ہم اس قسم کے آلات کا حال ذیل کے بیان میں لکھتے ہیں :-

لبنہ | یہ آلہ نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کی ایجاد ہے۔ اس سے میل کلی عرض البلد اور ستاروں کا بعد دریافت کیا جاتا ہے، سب سے پہلے مراغہ کی رصدگاہ میں اس کا استعمال ہوا، نمبر ایک کے نقشہ سے اس کی صورت ذہن نشین ہو جائے گی[2]،

ذات الاوتار | اس آلے کے ذریعہ سے تحویل اعتدال اور تحویل لیل دریافت کی جاتی ہے، اس آلہ کے موجد علامہ تقی الدین شامی ہیں، جو سلطان مراد کے زمانہ میں موجود تھے سدرۃ المنتہیٰ الافکار، ہیئت اور آلاتِ رصد کے بیان میں علامہ تقی الدین کی ایک لطیف تصنیف ہے،

---

[1] سیرت فریدیہ ص ۱۰۷، ۹۰-۴۲، [2] ۵۲ جامع بہادر خانی ص ۵۰۷-

ذات السمت والارتفاع | یہ ایک نصف دائرہ کا حلقہ ہوتا ہے، جس کا قطر ایک متوازیۃ السطوح اسطوانہ کی ایک سطح پر ہوتا ہے، اس آلہ سے سمت اور سمت کا ارتفاع ظاہر ہوتا ہے، علامہ تقی الدین نے سدرہ میں لکھا ہے، کہ یہ مسلمانوں کی ایجاد ہے،

شبیہ بالمناطق | یہ آلہ بہت سے مفرد آلات سے مرکب ہوتا ہے، اس سے دو ستاروں کے درمیان کا بعد دریافت ہوتا ہے، یہ آلہ بھی علامہ تقی کا نتیجۂ فکر ہے،

ربع تام | ربع تام ابن شاطر المتوفی ؁ کی ایجاد ہے، ابن شاطر دمشق میں موقت تھا، اُس نے اپنے رسالہ النفع العام میں جو آلۂ ربع تام کے بیان میں ہے یہ لکھا ہے کہ

"چونکہ میرے نزدیک اکثر آلات رصد ناقص ہیں، اس لئے میں نے یہ آلہ بنایا ہے جو تمام آلوں سے زیادہ مکمل ہے، صرف ایک آلہ سے تمام اعمال رصدی کا ہر مقام پر استخراج ہو سکتا ہے"[1]

سدس فخری | برنجی حلقہ سے بنا ہوا ایک آلہ ہوتا ہے، جس سے میل کلی اور عرض بلد دریافت ہوتا ہے، یہ آلہ فخر الدولہ کے زمانہ میں ایجاد ہوا ہے، اسی مناسبت سے اس کو سدس فخری کہتے ہیں، نمبر ۲ کے نقشہ سے اس کی صورت ظاہر ہوگی،[2]

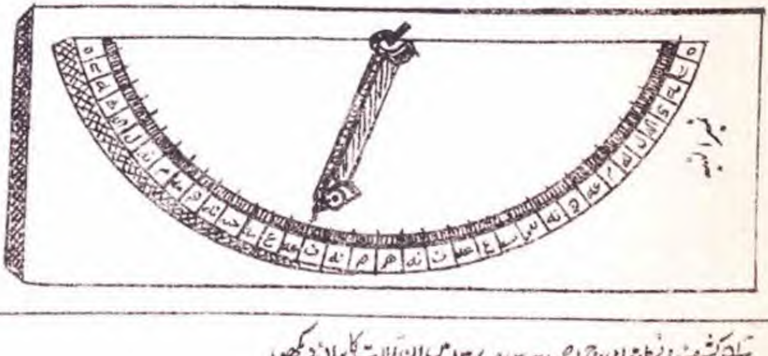

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۰۶ و ۱۳۷ میں ان آلات کا بیان دیکھو،

عصا یا اصطرلاب خطی | قدیم ہیئت کے لحاظ سے ہر ستارہ کی گردش دائرے کی شکل میں تھی، اس لئے ستاروں کے مدار جاننے کے لئے ایک گول کرہ بنایا جاتا ہے، جس پر ستاروں کے مدار اور اُن کی حرکت سے جو دائرے وغیرہ پیدا ہوتے ہیں، منقوش رہتے ہیں، بطلیموس سے پہلے یہ مدارات و دوائر مجسم کروں میں بنتے تھے، بطلیموس نے اس مقصد کو اصطرلاب میں صرف چند سطحوں سے پورا کر دیا۔

اصطرلاب یونانی لفظ ہے جس کے معنی میزان الشمس یا ترازوئے آفتاب کے ہیں، اصطر کے معنی ستارے کے ہیں، اسٹرانومی جس کے معنی علم ہیئت کے ہیں، اسی اصطر سے مشتق ہے، مسلمانوں میں اصطرلاب کا استعمال ماموں کے عہد سے شروع ہوا، سب سے پہلا اصطرلاب ابراہیم بن حبیب فرازی نے تیار کیا[۵]، ہندوستان میں اصطرلاب کا رواج ہمایوں نے دیا، ہمایوں علم ہیئت میں نہایت ماہر تھا، اُس نے ایک خاص طرز کا اصطرلاب بنایا، جس کو اصطرلاب ہمایونی کہتے ہیں، چنانچہ ندوہ کے کتب خانہ میں جو ایک قدیم اصطرلاب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے:۔

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اصطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۵۹"

بطلیموس سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک کرہ اور اصطرلاب کا کام صرف جسم یا سطح ہی سے لیا جاتا تھا، پانچویں صدی کے آخر میں شیخ شرف الدین طوسی پیدا ہوئے، جو ہندسہ و ہیئت میں امام فن تھے، شیخ موصوف کو یہ خیال پیدا ہوا، کہ کرہ مجسم اور اصطرلاب سطحی کا کام ایک خط سے بھی لیا جا سکتا ہے، اور اس خیال کی بنا پر ایک آلہ ایجاد کیا جس کا

---

[۵] ابن ندیم ص ۳۷۶۔

نام عصایا اصطرلاب خطی رکھا، جس سے اصطرلاب سطحی کے تمام کام لئے جا سکتے تھے، جیسا کہ معلوم ہے، کہ ہر ایجاد پہلے نامکمل ہوتی ہے، اس عطا میں بھی بعض غلطیاں رہ گئی تھیں جن کی اصلاح شیخ کے شاگرد رشید علامہ کمال الدین المتوفی ۶۳۹ھ نے کی لیکن عملی صورت میں اس کا محقق طوسی نے استعمال کیا[۱]

ان مذکورۂ بالا بیانات سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں نے آلات رصد کے بنانے میں کس حد تک کوشش کی، اور اس کی بڑی دلیل ان عظیم الشان رصد خانوں سے ملتی ہے، جو اسلامی ملکوں میں وقتاً و قتاً قائم ہوتے رہے، سب سے پہلا اسلامی رصد خانہ جیسا کہ عام طور سے معلوم ہے، رصد مامونی ہے،

رصد مامونی بغداد

مامون جب تخت نشین ہوا، اور تمام دنیا کے اہل کمال سمٹ کر بغداد میں جمع ہو گئے، اور بطلیموس کی مجسطی کا ترجمہ ہوا، تو مامون نے اس رصد خانے کے بنانے کا حکم دیا، بغداد کے قریب ایک مقام شماسیہ ہے، وہاں کی زمین اس رصد خانہ کے لئے منتخب کی گئی، اور ۲۱۴ھ میں یہ رصد خانہ بن کر تیار ہوا، لیکن ۲۱۸ھ میں مامون کا انتقال ہو گیا، اس کا جانشین معتصم ایک سپاہی آدمی تھا، یہاں اس کی تحقیقات کا سلسلہ صرف چند سالوں تک جاری رہا، یحیی بن ابی منصور اس رصد خانے کا افسر تھا[۲] جس کے ماتحت عباس بن سعید جوہری، سند بن علی، حبش بن عبد اللہ مروزی، عمر بن محمد مروزی وغیرہ کام کرتے تھے[۳] اس رصد خانے میں ان لوگوں نے جو تحقیقات کیں وہ زیج مامونی کے نام سے چند کتابوں میں جمع کر دی گئی ہیں، ان میں سے چند مسائل یہ ہیں:-

---

[۱] ابن خلکان ص ۵۰۵ اجلد دوم [۲] مختصر الدول ابو الفرج ملطی ص ۲۴۸، [۳] ابن ندیم ص ۲۷۲، ۲۷۵، ۲۷۶،

(۱) معدل اور منطقۃ البروج کے تقاطع سے جو زاویہ پیدا ہوتا ہے اس کو اعوجاج منطقۃ البروج کہتے ہیں، اس رصد خانہ میں اعوجاج منطقۃ البروج ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ اور ۵۲ ثانیہ دریافت کیا گیا تھا، جو موجودہ تحقیقات کے نہایت قریب ہے، موجودہ تحقیقات کے رو سے یہ زاویہ ۲۳ درجہ ۲۷ دقیقہ ہے،

(۲) وہ دو نقطے جہاں معدل النہار اور منطقۃ البروج کا تقاطع ہوتا ہے، ان کو نقطۂ اعتدال کہتے ہیں، نقطۂ اعتدال کی تحقیق سے شمسی سال کے دنوں کی تعداد تقریباً نہایت صحت کے ساتھ دریافت کی گئی،

(۳) نقطۂ اعتدال کی نسبت اگرچہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ایک جگہ پر قائم رہتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ ہر سال ۵۰ ثانیہ آگے بڑھ جاتے ہیں، اس حرکت کا نام استقبال اعتدالین ہے، اس رصد خانے میں استقبال اعتدالین بھی دریافت کیا گیا تھا،

(۴) آفتاب کے مقامات اوج اور مقدار میل اور خروج مرکز بھی یہیں تحقیق کی گئی،

(۵) ثوابت اور سیاروں کے بعض حالات بھی یہاں دریافت ہوئے،

رصد مامونی دمشق

تحقیقات رصدیہ کی تحقیق کے لئے عموماً مختلف مقامات پر چند رصد خانے بنائے جاتے ہیں تاکہ اگر کل رصد خانوں کا کسی ایک تحقیق پر اتفاق ہو جائے، تو وہ مسئلہ نہایت صحیح تسلیم کر لیا جائے، بغداد کے رصد خانے کی تصحیح کے لئے دمشق میں کوہ قاسیون کے دامن میں بھی مامون نے ایک رصد خانہ بنوایا تھا، غالباً اس کا سنہ تعمیر بھی بغداد کے رصد خانے کے موافق ہوگا (مختصر الدول ملطی ص ۲۴۴)

رصد دینوری

علامہ ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری تیسری صدی میں، ادب تاریخ، ہندسہ، جبر و مقابلہ اور ہیئت کے امام تھے، تاریخ میں الاخبار الطوال اُن کی مشہور تصنیف ہے، ہندسہ اور ادب میں بھی اُن کی بعض تصنیفات ہیں، ۲۳۵ھ میں ابو حنیفہ نے اصفہان میں ایک رصدخانہ قائم کیا، اس رصدخانہ میں ابو حنیفہ نے جو تحقیقات کی، اُس کو ایک زیج (کتاب الرصد) کی صورت میں مرتب کر دیا، بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ابو حنیفہ نے یہ زیج رکن الدین دیلمی کے نام پر لکھی تھی، لیکن یہ بالکل غلط ہے، کیونکہ دیلمیوں کا خاندان چوتھی صدی میں ۳۲۰ھ کے بعد سے شروع ہوتا ہے، اور ابو حنیفہ کا انتقال اس سے چالیس برس پہلے ۲۸۲ھ میں ہو چکا تھا،

رصد بتانی

محمد بن جابر بتانی المتوفی ۳۱۷ھ کا شمار دنیا کے ان بیس علمائے ہیئت میں ہے، جن کی نسبت یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ انھوں نے علم ہیئت کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے، اس زمانہ میں رقہ اور انطاکیہ میں دو بڑے رصدخانے تھے، بتانی نے انہی دونوں رصدخانوں میں ۲۶۴ھ سے ۳۰۶ھ تک ۴۲ برس تک ستاروں کا مطالعہ کیا ہے، بتانی نے اپنے اکتشافات کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے،

یہ کتاب لاطینی میں ترجمہ ہو کر ۱۵۳۷ء میں نورمبرگ سے شائع ہو چکی ہے، ان رصدخانوں میں بتانی نے جو جدید اکتشافات کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ بطلیموس نے جس طرح آفتاب کے نئے معادلیتیں نکالے ہیں، اسی طرح بتانی نے

چاند کے لئے بھی معادلتین ثابت کئے،

۲۔ مدار کا جو نقطہ آفتاب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اس کو نقطۃ الراس کہتے ہیں اور جو سب سے زیادہ دور ہوتا ہے اُس کو نقطۃ الذنب کہتے ہیں، بتانی نے جدید اکتشاف یہ کیا کہ یہ نقطے ایک جگہ نہیں رہتے، بلکہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں،

۳۔ قیمۃ مبادرۃ الاعتدالین کی اصلاح کی،

۴۔ دائرۂ معدل النہار پر دائرۃ البروج کی قیمت میل کی تصحیح کی،

۵۔ شمسی سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۶ منٹ کا قرار دیا ہے[1]

رصد بوزجانی

بوزجان [illegible] اور نیشاپور کے درمیان ایک چھوٹا سا شہر ہے، محمد بن محمد بوزجانی وہیں کا رہنے والا تھا، تمام مسلمان علماء ہیئت میں یہ سب سے زیادہ مشہور ہے، سنہ ۳۲۸ھ میں پیدا ہوا اور سنہ ۳۷۶ھ میں وفات پائی، ابوالوفا بوزجانی کے رصد خانہ کی نسبت ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کہاں قائم تھا، مگر یہ معلوم ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنے اور چند ساتھیوں کے ساتھ رصد خانے میں تحقیقات کرتا رہا ہے، جیسا کہ کاتب چلپی کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے،

زیج الشامل للشیخ ابی الوفاء	زیج الشامل، شیخ ابوالوفا محمد بن احمد
محمد بن احمد البوزجانی۔۔	بوزجانی کی تصنیف ہے،... جس کی
صححہ الشیخ المذکور واخذ	تصحیح شیخ موصوف نے اپنے اور چند
بارصاد متوالیۃ مع اصحابہ	ساتھیوں کے ساتھ اپنے ان متواتر

[1] [illegible] ۱۵۹

صدرات منقولہ بعد رصد	تجربوں اور رصدوں سے کی ہے،
المامون،	جن کو رصد مامون کے بعد انھوں
(جلد ۲ - ص ۱۵)	نے جاری کیا،

بوزجانی کی اس زیچ کی شرح جس کی تصحیح اس نے اپنے رصد خانے میں کی تھی، سید علاء الدین قوشی المتوفی ۸۷۹ھ کی ہے، یہ شرح قلمی مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں محفوظ ہے،۔

بوزجانی کے اس رصد خانے میں بہت اچھے آلات رصد تھے، اس نے اعوجاج منطقۃ البروج کو ایک ربع دائرہ کے ذریعہ سے دریافت کیا تھا جس کا صرف نصف قطر سات گز کا تھا، ماہتاب میں معادلۃ السرعۃ جس کی وجہ سے ماہتاب کی حرکت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، اسی رصد خانہ میں دریافت ہوا تھا،

رصد ابن اعلم

علی بن حسن جو ابن اعلم کے نام سے زیادہ مشہور ہے، چوتھی صدی میں عضد الدولہ دیلمی کے دربار کا ایک نامور مہندس تھا، عضد الدولہ کے بعد صمصام الدولہ اس کے بیٹے نے ابن اعلم کی کچھ زیادہ قدر نہ کی، اس لئے دربار کی آمدورفت چھوڑ دی تھی، ۳۷۲ھ میں حج سے واپس آتے ہوئے، اُس نے سفرِ آخرت کیا،

ابن اعلم کا رصد خانہ بغداد میں تھا، اس رصد خانہ کا زمانہ چوتھی صدی کا وسط ہونا چاہئے لیکن کاتب چلپی نے ۲۵۰ھ لکھا ہے، جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ ابن اعلم کو عضد الدولہ کے دربار سے تعلق تھا اور عضد الدولہ چوتھی صدی میں تھا، نیز ابوالفرج ملطی نے مختصر الدول میں ابن اعلم کا سنہ وفات ۳۷۰ھ لکھا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ۲۵۰ھ میں اگر ابن اعلم نے رصد خانہ قائم کیا تھا، تو ضروری ہے کہ اس کی پیدایش اس سے کم از کم پچیس

برس ادھر ہوئی ہوگی، اس بنا پر ابن الاعلم کی عمر کم از کم ڈیڑھ سو برس ماننی پڑے گی، اس لئے ممکن ہے کہ طبع یا کتابت کی غلطی سے ۳۵ھ کے بجائے ۲۵ھ ہوگیا ہو،

بطلیموس کی یہ تحقیق تھی کہ ثوابت فلک کے ایک درجہ کو سو شمسی سالوں میں طے کرتے ہیں[۱]، اور ابن الاعلم کے نزدیک ۷۰ سالوں میں[۱]، اس نے مریخ کی تقویم سب سے صحیح اور بہتر بنائی تھی،

رصد شرف الدولہ

اسلام میں دیالمہ کا خاندان نہ صرف جاہ وجلال کے لحاظ سے ممتاز ہے، بلکہ علمی حیثیت سے بھی اس کو خاص شہرت حاصل ہے، ابن الاعلم عبدالرحمن صوفی، احمد صاغانی، ویجن کوہی وغیرہ نے جو مشہور ماہرین ہیئت ہیں، دیالمہ ہی کے دامن تربیت میں پرورش پائی ہے، عضد الدولہ جو اس خاندان کا ہیرو تھا، وہ ہیئت میں عبدالرحمن صوفی کا شاگرد تھا، اور اس کو اس شاگردی پر فخر تھا، شرف الدولہ المتوفی ۳۷۹ھ نے شاہی قصر کے باغ میں ایک رصد خانہ قائم کیا، جس میں اس نے سبع سیارہ کی ترصید کی، ویجن کوہی اس رصد خانے کا افسر تھا، اس کے سوا احمد صاغانی المتوفی ۳۷۹ھ، ابراہیم بن بلال صاغانی المتوفی [illegible] بھی تحقیقات میں شریک تھے، احمد صاغانی المتوفی ۳۷۹ھ نے اس رصد خانہ میں [illegible] دو [illegible] کی تصحیح کی

رصد حاکمی

[illegible] حاکم بامر اللہ المتوفی [illegible] مصر کا مشہور خلیفہ فاطمی ہے، جو اپنے تشدد و [illegible]

---

۱ شرح چغمینی [illegible] تاریخ الحکماء شہرزوری ذکر ابن اعلم،

لحاظ سے تمام دنیا کے تاریخی سلاطین میں عجیب غریب بادشاہ ہے، حاکم بامر اللہ نے مصر میں جبل مقطم کی چوٹی پر ایک بہت بڑا رصد خانہ بنوایا تھا، اس رصد خانہ کا مہتمم ابن یونس مصری تھا، ابن یونس ہیئت و ہندسہ کا کامل الفن استاد تھا،

سنہ ۳۹۹ھ میں اُس نے وفات پائی،

ابن یونس نے اس رصد خانے کے اکتشافات و تحقیقات کو الزیج الکبیر الحاکمی کے نام سے ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے، یہ زیج اکثر ہیئت کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے، یہاں تک کہ کوشو کنگ[1] نے بھی سنہ ۱۲۸۰ھ میں اسے اپنی کتاب میں درج کیا ہے، یہ کتاب فرنچ ترجمہ کے ساتھ پروفیسر کوساں وی پرسفال کے زیر اہتمام پیرس میں سنہ ۱۸۰۴ء میں چھپ گئی ہے، ابن یونس نے آفتاب اور ماہتاب کے مشاہدات کثرت سے کئے ہیں، آفتاب و ماہتاب کی تقویم کے لئے ایک فرنچ زیج بھی لکھی ہے، جو التعدیل المحکم کے نام سے مشہور ہے، آفتاب و ماہتاب کے مشاہدات کی ایک جدول بھی تیار کی ہے، ان دونوں کتابوں کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہیں،[2]

رصد ملک شاہی

جلال الدین ملک شاہ سلجوقی جس کے روشن کارنامے محتاج بیان نہیں ہیں، اس نے سنہ ۴۶۷ھ میں ملک کے ماہرین ہیئت کو جمع کر کے اصفہان میں ایک رصد خانہ بنانے کا حکم دیا، اس رصد خانہ پر ملک شاہ نے بے شمار روپیہ صرف کیا، حکیم عمر بن ابراہیم خیام، محمد بیہقی، ابو المظفر بن الاسفرازی اور میمون بن نجیب الواسطی وغیرہ اس رصد خانہ کے مہتمم تھے، سنہ ۴۸۵ھ تک جو

---

[1] مشہور چینی ہیئت دان [2] اکتفاء القنوع ص ۲۴۵

ملک شاہ کا سنہ وفات ہے، یہ رصد خانہ زندہ رہا، ۴۳۷ھ سے پہلے نوروز اس وقت ہوتا تھا، جب آفتاب نصف حوت طے کر لیتا تھا، تصحیح سال کے لئے اسی سال نوروز اس دن قرار دیا گیا، جب آفتاب برج حمل میں آتا تھا، اس تغیر کی تمام جنتریوں نے اقتدار کی، اسی رصدخانہ میں خیام نے سنہ فارسی میں قاعدہ کبیسہ جاری کیا، جس سے سنہ فارسی دور شمسی کے مطابق ہو گیا، اس اصلاح شدہ سنہ کا نام جلال الدین کے انتساب سے سنہ جلالی پڑا،

اس اصلاح کی تفصیل یہ ہے کہ آفتاب کل فلک کو ۳۶۵ دن کچھ گھنٹے میں طے کرتا ہے، لیکن حساب کی آسانی کی غرض سے سال صرف ۳۶۵ دن کا قرار دے کر کسرات کو چھوڑ دیا جاتا ہے، چند سالوں میں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان سالوں کے بقیہ کسرات مل کر سال شمسی اور دور شمسی میں ایک تفاوت عظیم پیدا کر دیتے ہیں، اس تفاوت کے مٹانے کے لئے خیام نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ سال کا پہلا دن اس روز کو قرار دیا، جب آفتاب نصف النہار سے پہلے برج حمل میں آئے، اور سال کا ہر مہینہ تیس تیس روز کا لے کر ماہ اسفندار میں پانچ دن بڑھا دیئے جائیں اور ہر تیسرے یا چوتھے سال چھ دن بڑھا دیئے جائیں، اسی قاعدہ کو یورپ میں چھ سو برس کے بعد گرے گورے نے معلوم کیا، جس کے رو سے ہر چار برس کے بعد فروری میں ایک روز کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، پھر بھی گرے گورے کے قاعدۂ کبیسہ سے خیام کا قاعدۂ کبیسہ بدارج بہتر ہے، کیونکہ دس ہزار برس میں گرے گورین قاعدہ کے حساب سے سنہ شمسی اور دور شمسی میں تین دن کا فرق پڑ جاتا ہے، اور خیام کے قاعدہ سے اسی مدت میں صرف دو روز کا تفاوت ہوتا ہے،

رصد بیرونی

ابوریحان محمد بن احمد بیرونی پانچویں صدی کا مشہور عالم ہیئت اس رصدخانہ کا بانی

لے ابن اثیر ج ۱۰ ص ۳۷، اصفہانی اور محمد بیہقی کا نام تاریخ الحکما، وشہرزوری سے لیا گیا ہے،

تھا، ابوریحان سنہ ۳۶۲ھ میں پیدا ہوا تھا، اور سنہ ۴۳۰ھ یا سنہ ۴۴۰ھ میں وفات پائی، ابن سینا اور بیرونی ہمعصر تھے، ان دونوں میں جو تحریری مناظرات اور مراسلات ہوئے ہیں، ان کا کچھ حصہ اب تک برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، گو بیرونی کی کوئی کتاب ہیئت و نجوم کے بیان سے خالی نہیں، لیکن اس فن میں اس کی سب سے مشہور کتاب قانون مسعودی ہے، جو سنہ ۴۲۱ھ میں سلطان مسعود سلطان محمود کے بیٹے کے نام سے لکھی گئی ہے، یہ کتاب سنہ ۱۸۷۸ء میں پروفیسر سخاؤ کے اہتمام سے لیپزگ میں چھپ گئی ہے، پروفیسر سخاؤ نے قانون کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ہے، اور یہ ترجمہ بھی سنہ ۱۸۷۹ء میں لندن سے شائع ہو چکا ہے،

بیرونی نے کتاب الہند میں جو اُس نے ہندوستان میں رہ کر خاص ہندوستان کے علوم و فنون پر لکھی ہے، ہندوؤں کے نجوم و ہیئت پر مفصل بحث کی ہے، الآثار الباقیہ، کتاب الارشاد، الجماہر فی الجواہر، الجوانب المعبیۃ، مقالید الہیئت وغیرہ اس کی بقیہ تصنیفات ہیں جن میں اُس نے ہیئت و نجوم، جغرافیہ، تاریخ اور فلسفہ کو نہایت تحقیق سے لکھا ہے۔[1]

بیرونی کے رصدخانہ کے متعلق مزید حالات نہیں معلوم، کاتب چلپی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "بیرونی نے ایک رصدخانہ قائم کیا تھا" بیرونی کو سلاطین غزنہ کے دربار سے تعلق تھا، اور سلاطین غزنہ میں سلطان مسعود کو علم ہیئت سے ایک خاص شغف تھا،[2] اس لئے ممکن ہے، کہ غزنہ و ہرات کے نواح ہی میں کہیں رصدخانہ ہو، بیرونی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے دنیا کے بڑے بڑے شہروں کے طول بلد کی جدولیں تیار کیں،

---

[1] اکتفاء القنوع صفحہ ۲۴۴،

[2] تاریخ الحکماء شہرزوری ذکر بیرونی،

رصد علاء الدولہ

چوتھی صدی کی ابتدا میں جب طوائف الملوکی شروع ہو چکی تھی، علاؤ الدولہ کاکویہ اصفہان کا بادشاہ تھا، اسی زمانہ میں شیخ ابن سینا شمس الدولہ شاہ ہمدانی سے بخیدہ ہو کر اصفہان چلا آیا، اور علاء الدولہ کے اصرار سے عہدۂ وزارت قبول کر لیا، علاء الدولہ سیف و قلم دونوں کا مالک تھا، ہفتہ میں ایک دن شب جمعہ کو ایک علمی دربار منعقد کرتا تھا، جس میں علماء و ارباب عمائم علمی مباحث پر گفتگو کرتے تھے، شیخ اس مجلس کی شمع محفل تھا،

ان ہی مجالس میں ایک مرتبہ موجودہ تقویموں میں جو نقائص تھے، ان کا ذکر آیا، علاء الدولہ نے شیخ سے تعمیر رصد خانہ کی درخواست کی، اور اس کے جملہ ضروری سامان و آلات کے لئے خزانہ سے روپیہ دلوایا، اور علامہ ابو عبید جو شیخ کے تلامذۂ رشید میں تھے، اس کے مہتمم مقرر ہوئے، شیخ نے اس رصد خانہ میں آٹھ برس تک رصد کی، اور تقویم میں قدما کی بہت سی غلطیاں نکالیں،[1] شمس عطارد اور زہرہ کے افلاک کی ترتیب میں اختلاف تھا، شیخ نے آفتاب کے چہرہ پر دو سیاہ تل کی طرح زہرہ اور عطارد کا مشاہدہ کیا، جس سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوئی ہیں،

۱۔ زہرہ اور عطارد آفتاب سے نیچے ہیں،

۲۔ زہرہ اور عطارد میں بذاتہ روشنی نہیں ہے، ورنہ سیاہ نظر نہ آتے،

۳۔ چاند کی طرح زہرہ اور عطارد بھی ہلال بدر، اور محاق ہوتے ہیں، کیونکہ

---

[1] تاریخ الحکما شہرزوری، ذکر ابن سینا

یہ سیاہی بتدریج پیدا ہوتی ہوگی،

شیخ کے علمی تذکروں کے لئے ایک دفتر چاہئے، اس لئے ہم صرف شہرزوری کی اس عبارت پر اکتفار کرتے ہیں،

واوردالشیخ فی الھیئۃ اشیأ لم یسبق الیھا،	شیخ نے علم ہیئت میں بہت سے ایسے مسائل ایجاد کئے، جو قدمار کو معلوم نہ تھے،

رصد کوشیار

کوشیار بن لبان پانچویں صدی کے وسط میں تھا، ۴۵۹ھ میں اوس نے رصید کی، اپنی تحقیقات رصدی کو اُس نے دو کتابوں میں جمع کر دیا ہے، پہلی کتاب "زیچ کوشیار" کے نام سے مشہور ہے، اصل کتاب عربی زبان میں تھی، محمد ابن ابی طالب تبریزی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، کوشیار کی دوسری تصنیف "زیچ الجامع والبالغ" ہے، جس میں اُس نے افلاک و کواکب کے حرکات کو ہندسہ وحساب کی مدد سے ثابت کیا ہے،

کوشیار کے متعلق کوئی مزید حال نہیں معلوم، واقعات بالا کا تذکرہ کاتب چلپی نے "زیچ" کے بیان میں کیا ہے، ابن خلکان نے ایک موقع پر کوشیار کا نام اس طرح لیا ہے، "کوشیار بن لبان بن باشہری الجیلی مصنف زیچ"[1]

رصد ابن زرقال

ابن زرقال اندلس کا مشہور مہندس تھا، اس کا زمانہ، تحقیق ۴۹۸ھ (۱۰۸۰ء) ہے،

---

[1] شرح چغمینی، صفحہ ۲۳، ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۱،

مامون شاہ طلیطلہ کے لئے اُس نے ایک اصطرلاب مامونیہ کے نام سے بنایا تھا، طلیطلہ سے یہ معتمد بن عباد شاہ اشبیلیہ کے دربار میں چلاآیا، اور یہاں "العبادیہ" کے نام سے ایک جدید آلہ اُس نے بنایا تھا۔[1]

ابن زرقال نے علم رصد کی بے انتہا خدمت کی، صرف آفتاب کے نقطۂ اوج دریافت کرنے کے لئے چارسو دو مشاہدات کئے، زرقال ہمیشہ اپنے بنائے ہوئے آلات رصد استعمال کرتا تھا، معدل النہار کے سالانہ استقبال کا پچاس ثانیہ ہونا پہلے اسی نے دریافت کیا تھا جو تحقیقات حال کے بالکل مطابق ہے،

ابن زرقال کا رصدخانہ غالباً طلیطلہ میں واقع تھا،

رصد مامونی مصر

افضل شہنشاہ بن امیر الجیوش المتوفی ۵۱۵ھ خلیفہ فاطمی آمر باحکام اللہ کا وزیر تھا، اسلامی سلطنتوں میں قاعدہ تھا کہ سلطنت کی طرف سے بہت سے علمائے ہیئت اس کام کے لئے مقرر رہتے تھے کہ وہ ابتدائے سال میں نہایت صحت کے ساتھ پورے سال کی تقویم (جنتری) تیار کرتے تھے، ۵۰۰ھ کے آنے پر افضل شہنشاہ کے پاس تقریباً سو تقویمیں پیش کی گئیں لیکن مصر کی تقویموں اور شام سے جو تقویمیں بن کر آئی تھیں ان میں سخت اختلاف تھا جسکی اصل وجہ یہ تھی کہ شامی تقویمیں بغداد کی رصد مامونی کے مطابق تیار کی گئی تھیں، اور مصر کی تقویموں کی بنا رصد حاکمی پر تھی، اس بنا پر افضل کو ایک جدید رصدخانہ کی تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی،

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۱،

اس رصد خانہ کا مہتمم ابو سعید بن قرقہ متولی سلاح خانجات وضاعات قرار پایا، جو رصد سازی میں نہایت کمال رکھتا تھا، ۵۱۳ھ سے اس رصد خانہ کی تعمیر شروع ہوئی، مسجد قبلۃ الکبیر جس کی تعمیر میں نوے ہزار روپیہ صرف ہو چکے تھے، رصد خانہ کے لئے تجویز کی گئی اور آلات رصد بنا کر یہاں نصب کئے گئے، یہاں جو ...... تیار کیا گیا تھا، اس کا قطر دس ہاتھ اور دور تیس ہاتھ کا تھا، پرکار بھی نہایت خوبصورت بنا تھا، اکثر آلات رصد بہت اچھے تھے لیکن بد قسمتی سے ۵۱۵ھ میں افضل قتل کیا گیا، اور رصد خانہ کا کام ناتمام رہ گیا، افضل کے بعد مامون بطائحی وزیر مصر ہوا، اس نے رصد خانہ کا کام پھر جاری کیا، رصد خانہ قریب قریب تیار ہو گیا تھا اور آفتاب اور بعض سیاروں کا مشاہدہ بھی کیا گیا تھا، کہ ۵۱۹ھ میں مامون وفات پا گیا، اور رصد خانہ کا کام بالکل بند ہو گیا، اس رصد خانہ کے مشہور مہندس، منجم، اور صناع یہ تھے، شیخ ابو جعفر بن خدائی قاضی ابن ابی العیش خطیب ابو الحسن علی شیخ ابو النجا ساعاتی، ابو محمد عبدالکریم صقلی مہندس، ابن حلبی، ابن الہیثمی، ابو نصر ابن ذیاب قلعی،[1]

رصد مسترشد باللہ

مسترشد باللہ عباسی کے زمانہ حکومت میں جو ۵۲۹ھ ہجری میں تمام ہوتا ہے، ایک رصد خانہ بغداد میں تیار ہوا تھا، اس رصد خانہ کی تعمیر ۵۲۴ھ میں شروع ہوئی تھی، سلاطین سلجوقی کے شاہی محل میں یہ رصد خانہ واقع تھا، بدیع اصطرلابی

---

[1] مقریزی ج ا ص ۱۲۶

المتوفی ۴۴۳ھ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کا مہتمم تھا، اسطرلابی ایک باکمال مہندس تھا، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ رصد خانہ بہت کچھ بہتر ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ اتمام کو نہ پہنچا،[۱]

رصد نہاد شروانی

فریدالدین ابوالحسن علی بن عبدالکریم شروانی جو نہاد کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، یہ رصدگاہ اُن کی طرف منسوب ہے، علامہ شروانی حکمائے متاخرین میں ایک مشہور فاضل تھے، علم ہیئت میں اُن کو خاص مہارت تھی، رصد و مشاہدۂ کواکب میں مدت دراز تک مصروف رہے ہیں، آلہ ذات الشعبتین کے ذریعہ سے تیس برس تک صرف تاروں کی حرکت کا مطالعہ کیا، اور اپنے مشاہدات و تحقیقات کی بنا پر بہت سی زیجیں تصنیف کیں جن میں سے پانچ کے نام یہ ہیں، المغنی، المحکم، المستوفی، المعدول، العلائی، علامہ شروانی کا زمانہ ترصید ۵۲۱ھ یزدگردی ہے، جو سنہ ہجری کے قریب قریب ہے، کیونکہ سنہ ہجری اور سنہ یزدگردی میں صرف ۳۶۲۵ دن کا فرق ہے،

علامہ کی مصنفہ زیجیں اس پایہ کی ہیں، کہ متاخرین نے اُن کو اپنی تصنیفات کا ماخذ قرار دیا، محمد بن ابی بکر فارسی نے ملک مظفر یوسف بن عمر شاہ یمن کے نام سے جو زیج لکھی اس کی تحقیقات کا سرمایہ علامہ شروانی کی تصنیفات ہیں،

رصد مراغہ

اس رصد خانہ کا ظاہری بانی گو ہلاکو ہے لیکن درحقیقت یہ رصد خانہ طوسی کا کارنامہ ہے،

---

[۱] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۲۵۴،

اور اس رصد خانہ کی تمامتر تحقیقات علمائے اسلام کی دماغی محنت کے نتائج ہیں، بعض مورخین نے آخر وقت میں ہلاکو کا مسلمان ہونا بھی لکھا ہے، اس لئے اسلامی رصد خانوں کے دربار میں رصد مراغہ کو بھی جگہ ملنی چاہئے،

تحقیقاتِ علمی جن اسلامی رصد خانوں کی ممنون احسان ہے، اُن میں مراغہ کا رصد خانہ خاص وقعت رکھتا ہے، چونکہ مراغہ کا وسیع میدان اس رصد خانہ کے لئے انتخاب کیا گیا تھا، اس لئے یہ رصد مراغہ کے نام سے مشہور ہے، علامہ طوسی زیج ایلخانی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں، کہ اس رصد خانہ کی تعمیر اس شان سے شروع ہوئی، کہ دور دور سے علماء بلائے گئے، مویدین عرضی دمشق سے نجم الدین دبیران قزوین سے فخر الدین مراغی موصل سے فخر الدین اخلاطی تھیفلس سے آئے، جمادی الاولی ۶۵۷ھ سے اس کی تعمیر شروع ہوئی، اور چند سال تک کام جاری رہا۔ بغداد، شام، موصل، اور خراسان کی غارت شدہ کتابوں سے رصد خانہ سجایا گیا، تاتاری فتوحات کا مورخ وصّاف اس رصد خانہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے،

"چونکہ ہلاکو از فتوحات فارغ شد، طوسی برائے بنائے رصدے تحریک کرد، ہلاکو حکم داد ہر چند کہ کافی مصارف باشد از خزانہ دادہ شود، بحکم فرمان مویدالدین از دمشق و فخر الدین اخلاطی از تھیفلس احضار کردہ، دور مراغہ از طرف شمالی بر سر پشتۂ رفیع رصد خانہ بنا فرمود، در کمال آراستگی در ۶۵۹ھ ہجری ...... و تماثیل و تشکلات افلاک وتدویرات و حوامل و دوائر متوہمہ و معرفت استوار و تقادیم منقورہ و منازل او و مراتب بروج دوازدہ گانہ بر بیاتے ساختہ شد کہ ہر روز عند الطلوع پر تو نیر اعظم از ثقبۂ بالائے بر سطح عتبہ می افتاد درج و دقائق

حرکت آفتاب وکیفیت ارتفاع درفصول اربعہ درساعات ازانجا معلوم می شد
وشکل کرۂ زمین وجزائر وبحار واقالیم سبع وطول ایام وعرض وارتفاع قطب شمالی
وصورت ودضع اسامی بلدان چناں روشن نماند، کہ گوئی کتابیست در ممالک
ومسالک وزیچ خانی (طوسی) بنام بادشاہ تصنیف کردہ چند جدول وبکات
حسابے کہ در دیگر زیجات متقدمین چوں کوشیار وعلائی وشاہی وغیرہ، بنود افزود"
محقق طوسی، مویدالدین عرضی اور فخرالدین وغیرہ علمائے اسلام نے اس رصدخانہ
میں جو تحقیقاتیں کیں، اُن میں سے چند مسائل یہ ہیں،

۱- ابن الاعلم کی اس تحقیق کی تائید کی، کہ ثوابت ستر شمسی سالوں میں ایک درجہ طے کرتے ہیں، (شرح چغمنی ص ۲۳)

۲- شمسی سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۹ منٹ کا ہوتا ہے، (برجندی ص۱۸۹)

۳- قمری مہینہ،

رصد ابن الحماد

علامہ ابوالعباس احمد بن اسحاق تمیمی، جو ابن کماد کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، ٹونس کے ایک باکمال مہندس تھے، کاتب چلپی نے لکھا ہے کہ انھوں نے بھی ترصید کی تھی، ابن کماد نے ابن ہاشم اشبیلی کی زیچ کی اصلاح کی ہے، اس اصلاح میں صرف ۶۰۹ ہجری تک کی تقویم کا تذکرہ کیا ہے، جس سے بظاہر قیاس ہوتا ہے کہ ابن کماد کا زمانہ ساتویں صدی کا اخیر تھا،

رصد ابن شاطر

علی ابنِ ابراہیم جو تاریخ میں ابنِ شاطر کے نام سے مشہور ہے، مسلمان علماے علماے ہیئت میں ایک خاص امتیاز رکھتا تھا، دمشق اس کا وطن تھا، ۷۷۷ھ میں وفات پائی،

ابنِ شاطر کا رصد خانہ شام (کسی خاص شہر کا نام معلوم نہیں) میں واقع تھا، ابنِ شاطر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے بطلیموس کی غلامی سے آزاد ہو کر علمی تحقیقات کی، اور علمِ ہیئت کے قواعد و اصول خود ایجاد کئے، جس میں بطلیموس کے اغلاط کی تصحیح کی، ستاروں کی تحقیقِ مقامات کے لئے ایک خاص کتاب لکھی، ابنِ شاطر نے اپنے رصد خانہ سے جو زیچ تیار کی، وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ بڑے بڑے علماء نے اس کو اپنی تصنیفات کا ماخذ قرار دیا،

رصد تقی الدینؒ

علامہ تقی الدین بن معروف شامی علمائے ہیئت میں ایک باکمال ہندس تھے، جن کا ذکر اس مضمون میں اس سے پہلے بھی آچکا ہے، علامۂ موصوف کو حکومتِ عثمانیہ کے دربار سے تعلق تھا، سعد الدین آفندی سلطان مراد کے خاص ارکانِ دولت میں تھا، علامہ تقی الدین نے سدرۃ المنتہی الافکار جو اُن کی ایک ممتاز تصنیف ہے، اسی کے نام سے لکھی، ہے اور اُن کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا رصد خانہ بھی سعد الدین آفندی ہی کے حکم سے قائم کیا تھا،

رصد شمس الدین

شمس الدین محمد ملخیا جہ واکمنوہی مسلمان علمائے ہیئت میں ایک خاص وقعت کا حامل ہے،

چالیس برس تک اس نے رصد خانہ میں ترصید کی، اور بہت سے اصلاح کردہ آلات سے اُس نے اپنی تحقیقات میں کام لیا، اپنے رصد خانہ کے متعلق فارسی زبان میں ایک مختصر زیچ بھی لکھی شمس الدین کا زمانہ ترصید معلوم نہیں لیکن اس نے اپنی تصنیفات میں محقق طوسی کی زیچ کا تذکرہ کیا ہے، جس سے اتنا یقینی ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی سے پہلے نہ تھا،

رصد الغ بیگ

مسلمانوں میں علم ہیئت کی عام ترقی کی، اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ سلاطین اسلام تک اس فن میں کمال رکھتے تھے، الغ بیگ شاہرخ مرزا کا بیٹا، اور تیمور کا پوتا تھا سمرقند اس کی حکومت کا پایۂ تخت تھا، الغ بیگ فن ہیئت میں قاضی زادہ رومی کا شاگرد تھا ۸۲۳ھ میں جس رصد خانہ کی بنیاد الغ بیگ نے سمرقند میں ڈالی تھی، اسلامی رصد خانوں میں وہ سب سے زیادہ کامیاب رصد خانہ تھا، اس رصد خانہ کے مہتمم مولانا غیاث الدین جمشید مقرر کئے گئے تھے لیکن افسوس ہے کہ رصد خانہ ان کی سرپرستی میں زیادہ نہ رہ سکا، اور انھوں نے وفات پائی، مولانا غیاث الدین کے بعد قاضی زادہ نے اس کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لیا لیکن یہ آفتاب بھی رصد خانہ کے اہتمام سے پہلے غروب ہو گیا، آخر میں علی ابن محمد قوشجی کے ذریعہ یہ رصد خانہ انجام کو پہنچا[1]

الغ بیگ چونکہ بادشاہ وقت ہونے کے ساتھ علم ہیئت کا خود ایک بڑا ماہر استاد تھا

---

[1] حدائق الشفائیہ ص ۱۰۶

اس لئے اس رصدخانہ کے آلات بہت بہتر اور کثیر التعداد تھے، اس رصدخانہ کے ربع دائرہ کی نسبت مشہور ہے کہ اس قدر بلند تھا کہ اس کا نصف قطر قسطنطنیہ کی جامع اباصوفیا کے برابر تھا، اس رصدخانہ کی پربادشدہ عمارت بابر کے زمانہ تک باقی تھی، بابر تزک میں سمرقند کی عمارات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے،

"درسمرقند یک عمارت دیگر در دامنۂ پشتۂ کوہک رصد است کہ آلۂ زیچ نوشتن است، سہ اسانہ است، الغ بیگ ازاین رصد زیچ گورگانی را نوشتہ کہ در عالم حالا این زیچ معمول است و بزیچ دیگر عمل نہ کنند، ازیں پیشتر زیچ ایلخانی معمول بود کہ خواجہ نصیر در زمان ہلاکو مراغہ رصد بستہ نوشتہ بود"

بابر کی شہادت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ مرزا الغ بیگ نے اس رصدخانہ میں جو زیچ طیار کی تھی، وہ اس قدر صحیح اور مکمل تھی، جس نے محقق نصیر طوسی کی زیچ کو منسوخ کر دیا، مرزا الغ بیگ کی زیچ کی ایک قلمی شرح میری نظر سے گذری، ہے جس سے ثابت ہوتا ہے، کہ الغ بیگ کی یہ تصنیف اسلامی ہیئت کا بہترین مجموعہ ہے، اس رصد کی بعض تحقیقات یہ ہیں،

(۱) قمری مہینہ کی مقدار زمانہ ۲۹ درجہ، ۳۱ دقیقہ، ۵۰ ثانیہ، ۳۴ ثالثہ، ۴۴ رابعہ، ۳۰ خامسہ ہے، (بہادر خانی ص ۵۸۵)

(۲) عطارد کی غایت تعدیل ۲۳ درجہ، ۲۶ دقیقہ، ۳۰ ثانیہ ہے، (بہادر خانی ص ۵۹۶)

(۳) میل کلی جو بازبالاقطاب لاربعہ کی ایک قوس کا نام ہے، ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ، ۷ ثانیہ ہے، (تصریح ص ۲۳)

(۴) منجمان فارس دنیا کی ابتدائے آبادی کو جزائر خالدات سے اور منجمان ہند گنگ دژ سے شروع کرتے تھے، لیکن الغ بیگ نے قرار دیا، کہ چونکہ زمین کروی ہے، اسلئے ابتدائے آبادی ہرجگہ فرض کی جاسکتی ہے، (بہادرخانی ص ۶۶۸)

رصد فیروزشاہی

فیروزشاہ بہمنی درحقیقت دکن کا مامون اعظم یا الغ بیگ تھا، جو تیغ وقلم دونوں کا مالک تھا، ایک طرف تو وہ تخت شاہی کو جلوے دے رہا تھا، اور دوسری طرف مسند نشین تدریس تھا، جس طرح اُس کو حکومت کے لحاظ سے خاندان بہمنی میں ہونے کا فخر تھا اسی طرح علمی حیثیت سے اس کو یہ فخر بھی حاصل تھا، کہ وہ علامہ تفتازانی کے سلسلۂ تلمذ میں داخل تھا، گو فیروزشاہ کو اکثر علوم میں کمال حاصل تھا، لیکن فلسفہ اور اصول فقہ سے اس کو خاص مناسبت تھی، ہفتہ میں شنبہ، دوشنبہ، چہارشنبہ، تین دن طلبہ کو درس دیتا تھا، ریاضیات میں زاہدی شرح تذکرہ، علم کلام میں شرح مقاصد، فن بلاغت میں مطول پڑھاتا تھا، فضل اللہ انجو شاگرد علامہ تفتازانی کا شاگرد تھا،

دولت آباد دکن میں فیروزشاہ نے ایک رصدخانہ کی تعمیر کی ابتدا کی تھی، حکیم علی حسن، سید محمد کازرونی، اور دیگر علمار کے اہتمام ومشورہ سے یہ رصدخانہ انجام پارہا تھا، کہ حکیم علی حسن

کا انتقال ہوگیا، اور یہ رصدخانہ ناتمام رہ گیا[1]

رصد شاہجہانی

تیموری خاندان کا بانی دوم ہمایوں ہندوستان کا ایک امن پسند شاہنشاہ تھا، اور جس رتبہ کا وہ شہنشاہ تھا، اسی رتبہ کا استاد ہئیت بھی تھا، دور دور سے لوگ اُس سے فن ہئیت سیکھنے کو آتے تھے، نورالدین سیقدری اس سے ہئیت سیکھنے کو ہندوستان آئے تھے، اور ہمایوں خود علامہ الیاس اردبیلی کا شاگرد تھا،

فن ہئیت سے اس کو ایک خاص شغف تھا، اور اسی شوق میں جان بھی دی، ایک مرتبہ اپنے کتب خانہ کی چھت پر شام کو طلوعِ مریخ کا مشاہدہ کرنے گیا تھا کہ چھت سے اُترتے وقت زینہ سے گر گیا، جس کی چوٹ سے جاں بر نہ ہوسکا،

ہمایوں نے کرۂ ارض وکرات عناصر و افلاک مع کواکب مختلف ...... رنگ سے رنگ کر مجسم صورت میں بنائے تھے، جس میں اصول تنجیم کے لحاظ سے ہر کمرہ ایک خاص رنگ کا تھا، ہفتہ کے ہر روز میں وہ ایک ایک کمرہ میں نشست کرتا تھا، اور اُس دن وہ اُس کے مصاحبین اسی کمرے کے رنگ کے کپڑے پہن کر آتے تھے ہمایوں نے اصطرلاب کی بھی اصلاح کی تھی، شاہجہاں ہمایوں کی نسل سے تھا، اور فن تعمیر میں اس کو خاص مہارت تھی، اس لئے ناممکن ہے کہ کسی رصدخانہ کی تعمیر کا

---

[1] روضۃ الاولیاء آزاد بلگرامی ص ۳۲،

اس کو خیال نہ ہو،

شاہجہاں نے علامہ محمود جونپوری کو ایک رصد خانہ قائم کرنے کا حکم دیا تھا، علامہ نے اس کے لئے ایک قطعۂ زمین کا بھی انتخاب کیا تھا، لیکن کثرتِ مصارف کی بناء پر تمام نہ ہو سکا[۱]،

رصد محمد شاہی

تیموری سلاطین میں محمد شاہ اخیر شخص ہے جس میں کوئی قوت نہ تھی، مگر اس میں بھی یہ ذوق تھا کہ اس کے حکم سے راجہ سوائی سنگھ والی جے پور نے ۱۱۲۷ھ میں دہلی میں رصد خانہ بنوایا تھا[۲]، یہ سب سے پہلا مشرقی رصد خانہ ہے جس نے مغربی تحقیقات کی تائید کی، مرزا خیر اللہ مہندس اور صدہا علماء اس رصد خانہ کے مہتمم تحقیقات تھے، اس رصد خانہ میں جو جدید تحقیقاتیں ہوئیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ قمری مہینہ کی مقدار زمانہ ۲۹ درجہ ۳۹ دقیقہ، ۵ ثانیہ، ۴ ثالثہ، ۴۲ رابعہ، ۳۴ خامسہ ہے،

۲۔ زہرہ اور عطارد میں نور بالذات نہیں ہے، بلکہ وہ آفتاب سے نور کا استفادہ کرتے ہیں، اور ان میں ہلال و بدر و محاق ہوتا ہے، (مگر ہم یہ پہلے لکھ آئے ہیں کہ ابن سینا کی بھی یہی تحقیق ہے)

۳۔ زحل کروی نہیں ہے، بلکہ اہلیلجی ہے،

۴۔ مشتری کے گرد چار چاند ہیں،

---

[۱] تجلی نور تاریخ جونپور [۲] زیچ محمد شاہی، مقدمہ

۵۔ ہم جنکو ثوابت کہتے ہیں اُن میں بعض سیارات بھی ہیں،

۶۔ آفتاب کے داغ (جن کا سب سے پہلے ابن رشد قائل ہوا تھا، وہ حرکت وضعی کرتے ہیں،

۷۔ شمس اور کل حوائل کا مدار خارج المرکز بیضوی ہے[1]،

ان رصد خانوں کے علاوہ اور بعض رصد خانے ہیں، جن کے حالات سے بجز نام کے ہم کو واقفیت نہیں ہے، اس لئے ہم نے اُن کو قلم انداز کردیا ہے آیندہ معلومات نے اگر امداد کی تو ان کے حالات بھی ہدیۂ ناظرین ہوں گے[2]....

---

[1] ان تمام تحقیقات کے لئے جامع بہادر خانی ص ۹، ۵ و ۲۸۶ و ۸۹۶ و ۵ دیکھنا چاہئے،

[2] اس تمام مضمون میں جس رصد کے متعلق حوالہ درج نہ ہو اس کے لئے کشف الظنون لفظ رصد اور لفظ زیج دیکھو،

(الندوہ مارچ و مئی ۱۹۰۹ء)

کتب خانۂ اسکندریہ

منجملہ اُن افسوسناک غلطیوں کے، جو تاریخِ اسلام کی نسبت یورپ نے کی ہیں، اور منجملہ اُن غلط الزامات کے جو یورپ نے مسلمانوں پر قائم کئے ہیں، ایک یہ ہے کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کا عظیم الشان بطلیموسی کتب خانہ برباد کر دیا، جس کی کتابوں سے چھ مہینے تک مصر کے تمام حمام گرم رہے، یورپ کو ان مقدمات سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ صحابہؓ نہایت وحشی تھے، علم کے سخت ترین دشمن تھے، جن کی نگاہ میں علوم و فنون کی قدر ہیمۂ آتش سے زیادہ نہ تھی، (معاذ اللہ)

اس جھوٹ اور مفتریانہ حکایت کی پردہ دری، اصولِ روایت کے رو سے حضرۃ الاستاذ نے ایک مدت پہلے ایک رسالہ کی صورت میں کر دی ہے، جو اردو، انگریزی اور عربی تینوں زبانوں میں شائع ہو چکا ہے، اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے، کہ اس فرضی قصہ کے مسلمان راوی صرف عبد اللطیف بغدادی، مقریزی اور حاجی خلیفہ بتائے جاتے ہیں، ان میں سے مقریزی کی روایت کا یہ حال ہے کہ وہ حرف بحرف عبد اللطیف بغدادی سے منقول ہے، حاجی خلیفہ نے اولاً تو کتب خانہ اسکندریہ کا مطلق نام تک بھی نہیں لیا ہے،

بلکہ عام کتب خانہ کا لفظ لکھا ہے، ثانیاً وہ خود اس کو ضعیف روایت سمجھتا ہے، جیسا کہ اس کے لفظ "یُرْوٰی" یعنی "بیان کیا جاتا ہے" سے سمجھا جاتا ہے، عبد اللطیف ۶۲۹ھ نے مصر میں اپنے چشم دید واقعات کو ایک رسالہ کی صورت میں جمع کیا ہے، اس نے اس رسالہ میں کتب خانۂ اسکندریہ کے جلانے کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی ہے لیکن وہ بھی اس روایت کو ایک عامیانہ روایت سمجھتا ہے، جیسا کہ اس کے لفظ یذ کو یعنی بیان کیا جاتا ہے" سے مفہوم ہوتا ہے، نیز اس نے اس روایت کے تحت میں اور ضمنی باتیں بھی ذکر کی ہیں، وہ بھی کتب خانۂ اسکندریہ کی طرح بازاری گپیں ہیں،

اس امر کی سب سے بڑی دلیل کہ مسلمانوں نے اس کتب خانہ کو نہیں جلایا ہے، یہ ہے کہ کتب مغازی و فتوح مصر جن میں ایک ایک جزئی امر کا ذکر ہے، اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی مذکور نہیں، حضرۃ الاستاذ نے اس تفصیل کے بعد ان تمام روایات کا سرچشمہ ابو الفرج ملطی کو قرار دیا ہے، جو ایک متعصب عیسائی پادری تھا، ابو الفرج نے سریانی میں ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی، اور خود اس نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا، جو مختصر الدول کے نام سے مشہور ہے، اسی مختصر الدول میں سب سے پہلے ذکر آیا ہے کہ کتب خانۂ اسکندریہ کو مسلمانوں نے جلایا، لیکن اصل سریانی میں اس کا مطلق ذکر نہیں ہے،

مصر میں جرجی زیدان ایک عیسائی مورخ ہے، اور عربی کے مشہور رسالہ الہلال کا اڈیٹر ہے، اس نے چند جلدوں میں تمدن اسلامی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، تین سال ہوئے کہ میں نے اردو اور عربی زبان میں جرجی زیدان اور اس کی تمدن اسلامی

کی اصلی حقیقت کھولی تھی، اور اُس کے مکانذ تدلیسات اور ابلہ فریبی کو ظاہر کیا تھا، آج ہم پھر کتب خانہ اسکندریہ کے سلسلۂ سخن میں اس کی تمدن اسلامی کا ذکر کرتے ہیں،

جرجی زیدان نے تمدن اسلامی کی تیسری جلد عربوں کے علوم و فنون کی تاریخ میں لکھی ہے، جس میں اُس نے نہایت ناکمل طور سے علوم اسلامیہ کے ماخذ، ابتدا، اور اُن کی ترقیوں کا ذکر کیا ہے، اس جلد کا نصف سے زائد حصہ حضرۃ الاستاذ کے مضمون "تراجم" سے ماخوذ ہے، جو رسائل شبلی کے ضمن میں چھپ چکا ہے، یہ جلد اردو زبان میں "علوم عرب" کے نام سے چھپی ہے، جس میں مترجم نے نہایت مبالغہ کے ساتھ علامہ جرجی زیدان کے اس علمی احسان کا تمام دنیاے اسلام کی طرف سے شکریہ ادا کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہم اس احسان نما ظلم کے اداے شکر کے لئے تیار نہیں ہیں،

اس تیسری جلد میں جرجی زیدان نے کتب خانہ اسکندریہ کا ایک عنوان قائم ہے، جس میں حضرۃ الاستاذ کے چند دلائل کی تردید کر کے اپنی آخری تحقیق کا یہ نتیجہ پیش کیا ہے، کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کو مسلمانوں نے ہی جلایا ہے، اور اس واقعہ کا اول راوی عیسائی ابو الفرج نہیں ہے، بلکہ مسلمان جلال الدین قفطی ہے،

اس سے پہلے کہ ہم اصل مسئلہ کی تحقیق کریں، یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کی اصل ماہیت کیا ہے، اسکندریہ جو اب مصر کا ایک آباد شہر ہے بطلیموسیوں کی سلطنت کا دارا تھا، جو مصر میں اسکندر کے جانشین تھے، اس خاندان کا پہلا بادشاہ بطلیموس سوطر تھا، علم دوست بادشاہ تھا، اس نے ۲۸۵ ق م میں وفات پائی، اسی کے حکم سے اسکندریہ میں ایک کتب خانہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی، جس میں یونانی کتابوں کے علاوہ ان کتابوں کے تراجم کا بھی ذخیرہ تھا، جو اسکندر یونانی کے حملۂ فارس کے وقت یونانیوں کے ہاتھ لگی تھیں،

سوطر کے جانشینوں میں بطلیموس فلا دلف (۲۴۷ء ق م) نے اس کتب خانہ کا حد سے زیادہ اہتمام کیا، اس کے بعد دیگر شاہان بطلیموس بھی اس میں برابر اضافہ کرتے رہے، اسلامی مورخین کے بیان کے مطابق پینتالیس ہزار ایکسو بیس کتابوں سے یہ کتب خانہ معمور تھا،[۱] یورپین تاریخوں کی شہادت کی بنا پر یہ کتب خانہ، لاکھ کتابوں کا خزانہ تھا، اس کی پہلی مرتبہ بربادی جولیس سیزر کے ہاتھ سے ہوئی، سیزر نے جب اسکندریہ کا محاصرہ کیا، تو اس کتب خانہ کا بہت بڑا حصہ جل گیا، لیکن شاہ پرگاسیس نے کلیوپیٹرا کو جو مصر کی آخری بطلیموسی شاہزادی تھی، اپنا کتب خانہ اسکندریہ کے کتب خانہ کے لئے دیدیا، اس طرح سے دوبارہ یہ کتب خانہ آباد ہوا، یہ کتب خانہ سیرابیس میں رکھا گیا تھا، جو بت پرست مصری، قوام کا ہیکل تھا، ۳۹۱ء میں عیسائی بادشاہ تھوڈوسیس کے حکم سے تھیافلیس نے جو اسکندریہ کا ایک متعصب پیٹریارک تھا، اس ہیکل کو ڈھا کر کنیسہ بنا دیا، جس کے ساتھ یہ کتب خانہ بھی برباد کر دیا گیا،[۲]

اسکندریہ کے کتب خانہ کی بربادی کی یہ حقیقت ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے فتح مصر سے کتنی مدت پہلے یہ کتب خانہ ہمارے متعصب معترضوں کے ہم مذہبوں کے ہاتھوں برباد ہو چکا تھا، لیکن ان معترضوں کو اپنے دامن کا یہ سیاہ داغ عہد ظلمت میں تو نظر نہیں آیا، اب عہد بعہد روشنی میں نظر آنے لگا ہے، اور چاہتے ہیں کہ یہ داغ اُن کے دامن سے مٹ جائے، مگر نہیں مٹ رہا ہے، ہمارے معترضوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ جس قدر یہ روشنی بڑھتی جائیگی، اس قسم کے سیکڑوں کے داغ اُن کو اپنے دامن پر نظر آتے جائیں گے،

انہی معترضوں کی صف میں ہمارا دوست جرجی زیدان بھی ہے، وہ اپنے دعوی کے ثبوت میں حسب ذیل دلائل رکھتا ہے،

---

[۱] قفطی مطبوعہ مصر ص ۲۳۲، [۲] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا لفظ اسکندریہ،

۱۔ ابتدائے اسلام میں مسلمان سوائے قرآن کے تمام کتابوں کو مٹا دینا چاہتے تھے، صحابہ اس بات کے خواہشمند تھے کہ دنیا کی تمام کتابیں مٹادی جائیں، صرف قرآن کافی ہے،

۲۔ اس واقعہ کا اول راوی عیسائی ابوالفرج نہیں مسلمان قفطی ہے، بلکہ ابوالفرج کی عبارت بعینہٖ قفطی سے ماخوذ ہے،

۳۔ قفطی ابوالفرج ملطی اور بغدادی نے اس واقعہ کو مسلمانوں کی طرف منسوب کیا ہے،

۴۔ تاریخ اسلام میں کتب خانہ اسکندریہ کے علاوہ فارس کے کتب خانوں کے برباد کردینے کا بھی ذکر ہے، جیسا کہ ابن خلدون اور حاجی خلیفہ میں مذکور ہے؛ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں ہی نے اسکندریہ کا کتب خانہ بھی جلایا ہوگا،

۵۔ مسلمانوں نے اپنے ہی فرقوں کے کتب خانے جلائے، جیسا کہ گبن صاحب نے رومن امپائر جلد سوم میں لکھا ہے کہ سلطان محمود نے ۴۲۰ھ میں جب رے کو فتح کیا تو باطنیوں کو قتل کرڈالا، معتزلہ کو جلاوطن کردیا، اور فلسفہ کی کتابیں جلادیں،

۶۔ مسلمانوں کو کتابوں کے برباد کرنے کا ایسا شوق تھا، کہ وہ خود اپنی کتابیں آپ برباد کردیتے تھے، جیسا کہ احمد ابن ابی الحواری، سفیان ثوری اور ابو عمر کی نسبت مشہور ہے؛

ان دلائل سستہ کے بعد جرجی زیدان یہ عجیب و غریب نتیجہ نکالتا ہے کہ

"ابتدائے اسلام میں عربوں کے علوم قدیمہ کی جس قدر کتابیں دستیاب ہوئیں انھوں نے ان سب کو برباد کردیا"

پہلا دعوی کہ صحابہ قرآن کے سوا تمام دنیا کی کتابیں مٹا دینا چاہتے تھے جرجی زیدان کے نزدیک ایسا بدیہی تھا کہ اس کے لئے اس نے کسی دلیل کے پیش کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی،

اس کے ثبوت میں وہ کتب خانہ اسکندریہ کو پیش کرے گا، یا کتب خانہ فارس کا نام لے گا، جو کتب خانہ اسکندریہ کی طرح ایک بے بنیاد واقعہ ہے، اس کا ذکر آٹھ نو سو برس کے بعد عربی تاریخوں میں صرف مقدمہ ابن خلدون اور حاجی خلیفہ کی ایک ضمنی بحث میں آگیا ہے، اگر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا قرآن مجید کے ساتھ شغف جو فضائل علم کے بیان سے پُر ہے، کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا باعث ہوا تو پھر رومی اور شامی عیسائیوں کا انجیل کے ساتھ شغف جس میں علم کی فضیلت کی نسبت ایک حرف بھی مذکور نہیں کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا کتنا بڑا سبب ہو سکتا ہے،

دوسرا دعوی اگر صحیح بھی ہو کہ اس واقعہ کا اول راوی عیسائی ابوالفرج نہیں ہے تو اس انکار سے اصل واقعہ کے ثبوت پر کیا اثر پڑا، اصلی جواب اس کا آگے آتا ہے،

جرجی زیدان کہتا ہے کہ "جمال الدین قفطی، ابوالفرج ملطی اور عبداللطیف بغدادی نے اس واقعہ کو مسلمانوں کی طرف منسوب کیا ہے، ان تین ناموں پر ایک نام ہم اور بڑھاتے ہیں، مقریزی نے بھی اس روایت کو لیا ہے لیکن سب سے پہلے جاننا چاہئے کہ کیسے نام کے لوگ ہیں،

۱۔ عبداللطیف بغدادی ولادت ۵۵۷ھ وفات ۶۲۹ھ، مصنف کتاب افادہ،

۲۔ قاضی اکرم جمال الدین قفطی ولادت ۵۶۸ھ وفات ۶۴۶ھ مصنف اخبار الحکما،

۳۔ ابوالفرج بن العبری ملطی ولادت ۶۲۳ھ وفات ۶۸۵ھ مصنف مختصر الدول،

۴۔ تقی الدین مقریزی، ولادت ۷۶۶ھ وفات ۸۴۵ھ مصنف خطط مصر،

ان میں سب سے پہلا شخص بغدادی ہے، اور آخری شخص مقریزی ہے، بغدادی کی وفات ۶۲۹ھ میں ہوئی، اور مقریزی نے ۸۴۵ھ میں وفات پائی ہے، اس سے اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے، کہ یہ ساتویں صدی کی روایت ہے، اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رکھو کہ

اس چھ سَو برس کے اثنا میں سیکڑوں اسلامی اور غیر اسلامی تاریخیں تصنیف ہوئیں لیکن کسی نے اس واقعہ کی نسبت مسلمانوں کی طرف نہیں کی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس جرم کا کا مسلمانوں کی طرف انتساب کسی صحیح ماخذ پر مبنی نہیں ہے۔

مقریزی کی شہادت بھی کوئی نئی شہادت نہیں ہے، بلکہ وہ بعینہٖ بغدادی کی عبارت کی نقل ہے، اور دونوں نے اس واقعہ کو "بیان کیا جاتا ہے" کے مجہول صیغہ کے ساتھ نقل کیا ہے[۵] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بغدادی اور مقریزی اس واقعہ کو محقق نہیں سمجھے۔

اب قفطی اور ابوالفرج رہ جاتے ہیں، یہ دونوں ہم عصر تھے، ابوالفرج ۲۱ برس کے سن میں تب مقرر ہوا قفطی کی وفات کے وقت اس کی عمر ۲۳ برس کی تھی، اس واقعہ کے متعلق دونوں کی عبارت بعینہٖ ایک ہے، ممکن ہو کہ مختصر الدول ابوالفرج کی ابتدائی اور اخبار الحکماء قفطی کی آخری تصنیف ہو، اور موخر الذکر کا ماخذ اول الذکر ہو، اس بنا پر ابوالفرج کا عربی ترجمہ مشرق میں اس واقعہ کا مشتہر قرار پائیگا، اور لاطینی ترجمہ مغرب میں، اس سے یہ عجیب راز بھی منکشف ہوتا ہے کہ تاریخ الحکماء للقفطی میں یہ واقعہ عیسائیت کی راہ سے آیا ہے،

یحییٰ نحوی کا فتح اسکندریہ کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس آنا، یحییٰ کا حضرت عمرو بن العاصؓ سے کتب خانہ کے جلانے کی اجازت طلب کرنا، حضرت عمرو بن العاصؓ کا حضرت عمرؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دینا، حضرت عمرؓ کا کتبخانہ کے جلانے کا حکم دینا، حضرت عمرو بن العاصؓ کا کتابوں کو حماموں میں تقسیم کرنا، اور اُن کا چھ مہینے تک جلتے رہنا، یہ تمام تفصیل قفطی اور ابوالفرج کی تاریخوں کے سوا اور کہیں مذکور نہیں، اور عجیب تر یہ ہے کہ ان دونوں کی عبارتیں حرف بحرف ایک ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک اصل ہے، اور دوسری نقل، اگر ابوالفرج کو قفطی کا ماخذ تسلیم کر لیا جائے، تو مسئلہ طے ہو جاتا ہے کہ ابوالفرج

---

[۵] مقریزی جلد اول ص ۱۵۹،

ایک متعصب عیسائی مورخ ہو وہی اس قصہ کا موجد ہے، اور قفطی اس کا ناقل ہے، اگر ابوالفرج
ماخذ قفطی کی تاریخ ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے، کہ قفطی نے اس واقعہ کو کہاں سے لیا تو
اُس وقت حل ہو جاتا ہے جب ہم ابن ندیم کی کتاب الفہرست[۱] میں کتب خانہ اسکندریہ
کا ذکر پاتے ہیں، اور اسی کو قفطی نے اپنی تاریخ میں لفظ بلفظ نقل کر دیا ہے، ابن ندیم نے
آگے چل کر تصریح کی ہے، کہ یہ اسحاق راہب کی تاریخ سے ماخوذ ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ قفطی نے کتب خانہ اسکندریہ کے دوسرے تفصیلی واقعات جن میں مسلمانوں کے ہاتھ سے
اُس کی بربادی کا واقعہ بھی شامل ہے، اسحاق راہب کی کتاب سے لیا ہے، اگر یہ صحیح ہے
تو سمجھنا چاہیئے کہ مسلمانوں میں یہ روایت عیسائیت کی راہ سے آئی ہے، اس حالت میں
گو اس قصہ کا موجد عیسائی بشپ (ابوالفرج ملطی) نہیں قرار پاتا، مگر عیسائی راہب (اسحاق)
تو قرار پاتا ہے، جو مذہبًا عیسائی بشپ کا بھائی ہے،

جرجی زیدان اگرچہ تسلیم کرتا ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کے واقعہ کیلئے قفطی کا ماخذ اسحاق
راہب کی تاریخ ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اس کے جلانے کی روایت قفطی نے کسی
اسلامی تاریخ سے لی ہوگی، لکھتا ہے :-

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتبخانہ کے حالات تو اوس نے (قفطی نے)، اسحاق راہب
کی تاریخ سے نقل کئے ہیں، لیکن اس کے جلانے کا واقعہ کسی اور کتاب سے لیا ہوگا

یہ ایک عجیب ادعا ہے جب نصف واقعہ اسحاق کی کتاب سے ماخوذ ہے، تو اس کا
زیادہ امکان ہو کہ دوسرے واقعات بھی اُس نے اسی کتاب سے لئے ہوں،
ایک اور امر جس کی وجہ سے قفطی کی شہادت ضعیف ہو جاتی ہے، یہ ہے کہ یحییٰ نحوی "
کتب خانہ اسکندریہ کے جو حالات قفطی نے لکھے ہیں، وہ ابن ندیم کے صفحہ ۲۵ سے تقریبًا

---

[۱] فہرست ابن ندیم ص ۲۴۰، ۳۳۹،

حرف بحرف ملتے جلتے ہیں، لیکن جہاں سے کتب خانہ کے جلانے کی حکایت شروع ہوتی ہے، اس کا ایک حرف بھی ابن ندیم میں نہیں ملتا،

چوتھے نمبر میں جرجی زیدان یہ عجیب دلیل پیش کرتا ہے کہ مسلمانوں نے فارس[1] کا کتب خانہ جلا دیا، جب وہ اپنے ہی فرقوں کے کتب خانے جلا دیا کرتے تھے، تو یقیناً انھوں نے اسکندریہ کا کتب خانہ بھی جلا دیا ہوگا، اگر یہ دلیل صحیح ہے تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ رومیوں نے ارشمیدس کی کتابیں جو پندرہ اونٹوں پر بار ہوتی تھیں، جلا دیں[2] جولیس سیزر رومی نے اسکندریہ کا شاہی کتب خانہ جلا دیا، اس لئے کہ یورپ کی یہ عظیم الشان حکومت علم کی سخت دشمن تھی، خود افلاطون نے سقراط کے پاس جاتے وقت اپنی ادبی تصنیفات جلا دیں، ابراہیم نصرانی کی موت کے وقت اسکے عیسائی اعزہ نے اسکی مملوکہ فلسفہ کی تصنیفات جلا دیں[3] ہسپانیہ کے عیسائیوں نے جب میکسیکو پر حملہ کیا، تو انبار در انبار کتابیں جلا دیں، عیسائی پادری ٹارکوئی میڈا نے پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں سلیمنکا میں علوم مشرقیہ کی چھ ہزار کتابوں میں آگ لگا دی، اسپین کے ایک متعصب پادری زنیز نے غرناطہ میں عربی زبان کے دس ہزار قلمی نسخوں کا ڈھیر لگا کر آگ لگا دی، طرابلس الشام میں جب انگریزوں نے صلیبی جنگ میں فتح پائی، تو وہاں کے کتب خانہ کو جس میں تقریباً تیس لاکھ کتابیں تھیں، نہایت وحشیانہ طور پر برباد کر دیا، عیسائیوں نے فتح اندلس کے موقع پر ایک نہیں متعدد کتب خانے برباد کر دیئے، فرفوریس کی تصنیفات کے تمام نسخے شہنشاہ تھوڈوسیس نے جلوا دیئے، (یہ تھوڈوسیس وہی ہے، جو تاریخی تحقیقات کے رو سے کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا باعث ہے) اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ عیسائیوں ہی نے اسکندریہ کا کتب خانہ بھی جلایا ہوگا،

اس سے مسلمانوں کی براءت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ فتوح ومغازی کی سیکڑوں

---

[1] اس پر تنقید آئندہ ہوگی [2] قفطی ص ۱۴ [3] ایضاً ص ۴۹،

کتابوں میں سے ایک میں بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں ہے لیکن جرجی زیدان نہایت بے باکی کے ساتھ اس کا رد کرتا ہے، کہ فتوح و مغازی کے مصنفوں نے اپنی کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر ضرور کیا ہوگا لیکن جب مسلمانوں میں تمدن آیا، اور وہ تحصیل علم میں مشغول ہوئے اور ان کو کتابوں کی قدر معلوم ہوئی، تو انھوں نے خلیفۂ دوم کے عہد کے اس واقعہ کو دوُر از عقل سمجھ کر حذف کر دیا۔

جرجی زیدان مسلمان مورخین پر ایک نیا الزام قائم کرتا ہے، حالانکہ اُن کے متعلق تمام دنیا کا اتفاق ہے کہ ثقاہت وصحت روایت میں دنیا کی کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کیا یہ قرین عقل ہے کہ مختلف ملکوں کے مسلمان مورخین اپنی کتابوں سے کسی واقعہ کے حذف کرنے پر اتفاق کرلیں گے، غالبًا ہمارا دوست یہ سمجھتا ہے کہ جس طرح انجیل کی آیات کی تحریف کے لئے عیسائی علماء کی مجلس منعقد ہوتی تھی، اسی طرح کتبخانہ اسکندریہ کے واقعہ کی تحریف کے لئے دنیا کی کسی گوشہ میں ان مسلمان مورخین کی بھی کوئی مجلس منعقد ہوئی ہوگی لیکن ہم اپنے دوست کو بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ اس داغ سے پاک ہے،

مسلمان اس سے برأت کے لئے یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ ابو الفرج کی عربی تاریخ درحقیقت اُس کی سریانی تاریخ کا ترجمہ اور خلاصہ ہے، اور اس سریانی تاریخ میں اس واقعہ کا مطلق ذکر نہیں، جو ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ واقعہ اس کی عربی تاریخ میں کسی نے بعد میں بڑھا دیا ہے، جرجی زیدان اس کا بھی رد کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ غلط ہے کہ اس کی عربی تاریخ اس کی سُریانی تاریخ کا ترجمہ اور خلاصہ ہے لیکن ہم حیران ہیں کہ اس امر میں ہم جرجی زیدان کو غلط گو سمجھیں، یا اُس کے استاذ فانڈیک

کے لائق فرزند اڈورڈ امریکی کو جو اپنی فہرست میں صاف صاف لکھتا ہے کہ ابوالفرج نے پہلے اس کتاب کو سُریانی زبان میں لکھا، اور پھر اس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ عربی میں منتقل کیا،[1]

یہ ہیں جرجی زیدان کے وہ دلائل جن کی بنا پر وہ مسلمانوں کو علم کا دشمن قرار دیتا ہے،

اب ایک اور امر کی طرف ہم ناظرین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں، کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کے واقعہ کے سلسلہ میں جن موافق اور مخالف اشخاص نے قلم اٹھایا ہے انھوں نے ایک استدلال کی طرف توجہ نہیں کی، ہم اوپر لکھ آئے ہیں، جن عربی مورخین مثلاً قفطی، ابوالفرج ملطی وغیرہ نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہ سب کے سب آخری چھٹی صدی یا ابتدائی ساتویں صدی کے مورخین ہیں، بغدادی اور قفطی صلاح الدین کے دربار سے متعلق تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس واقعہ کو بڑی شہرت حاصل تھی، اور یہ وہ زمانہ ہے جب تمام دنیا کے مسیحی صلیبی جنگ کے جوش سے بھرے ہوئے مسلمانوں کے خلاف سیکڑوں افترائات مشہور کر رکھے تھے، ہو سکتا ہے، ان ہی بازاری گپوں کو ایک دو مورخوں نے اپنی کتابوں میں بھی جگہ دے دی ہو،

اب تک جو بحث تھی، وہ اس بات کی تھی کہ اسلامی تاریخیں اس واقعہ کے بیان سے خاموش ہیں، اب ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ محققینِ یورپ جو اکثر عیسائی ہوں گے، اس واقعہ کے بارہ میں کیا خیال رکھتے ہیں،

اور سب سے پہلے اس واقعہ کی تردید مشہور مورخ گبن مصنف تاریخ روینہ الکبریٰ نے کی، وہ ابوالفرج کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے؛:-

---

[1] اکتفاء القنوع، ص ۸۰،

"میں اس واقعہ کی اصلیت اور اس کے نتائج دونوں کے انکار کی طرف بہت زیادہ مائل ہوں[۵]، واقعہ بلاشبہ عجیب ہے، مورخ (ابو الفرج) خود کہتا ہے، "پڑھو اور تعجب کرو" اور ایک اجنبی (ابو الفرج) کی شہادت جو اس نے چھٹی صدی کے اختتام پر میڈیا کے حدود میں لکھی ہے، نہایت ہی کمزور ہوجاتی ہے، جب کہ اس کے قبل کے دو مورخ اس واقعہ کے متعلق خاموش ہیں، یہ دونوں مورخ عیسائی ہیں، اور مصر کے باشندے ہیں، ان میں سے پہلا پیاٹریارک یوٹیچیس ہے جس نے فتح اسکندریہ کا حال مفصل طور پر لکھا ہے، نیز عمر کے یہ سخت احکام، اسلام کے صحیح اور سچے اصول کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، وہ صاف کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابیں جو جنگ میں دستیاب ہوئی ہیں، جلائی نہ جائیں، نیز ناپاک سائنس، تاریخ، شاعری، طب، اور فلسفہ کی کتابوں کو بھی مسلمان اپنے کام میں جائز طریقہ سے لاسکتے ہیں،

۲ - موسیو رینان فرانسیسی نے "اسلام اور علم" پر جو مشہور لکچر دیا تھا، اور جو ۱۸۸۳ء میں پیرس میں چھپ چکا ہے، اس میں موسیو موصوف نے کتب خانہ اسکندریہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے،

"اگرچہ کہا جاتا ہے کہ عمرو بن عاص نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلا دیا، لیکن یہ کذب صریح ہے، کتب خانہ مذکور اس مدتوں پہلے جل چکا تھا،

---

[۵] تاریخ رومن امپائر فتح اسکندریہ ص ۹۱۲، طبع جدید،

۲۔ مشہور علمی مورخ ڈریپر لکھتا ہے :۔

"اس کتب خانہ کی آدھی کتابیں تو جولیس سیزر نے جلا دی تھیں، اور باقی اسکندریہ کے پادریوں نے اپنے اہتمام میں ضائع کرا دیں .... اگر بالفرض یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اس وحشیانہ بربادی کے بعد بھی یہ عظیم الشان کتب خانہ بچ رہا، تو ہزار سال کی فرسودگی، اور شاید تصرف بیجا کے اثر کا مقابلہ کرنے کے بعد اس کی تعداد کتب بہت کم رہ گئی ہوگی، اس کے علاوہ .... ایک ادنی درجہ کا غریب نحوی (یحیی) اس عظیم الشان کتب خانہ کے قائم رکھنے اور چلانے کے مصارف کا کیونکر متکفل ہو سکتا تھا، جس پر بطلیموسیوں کے شاہانہ محاصل کا ایک بیش قرار حصہ صرف ہوا کرتا تھا، کتب خانہ کے جلنے کی جو مدت (چھ مہینے) بتائی گئی ہے، اس سے کتابوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، جھلی کے کاغذ سے زیادہ برے ایندھن کا ہونا ممکن نہیں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ سکندریہ کے حماموں نے دوسرا ایندھن چھوڑ کر چرمی اوراق جلانے پسند کئے ہوں، جن کی آنچ جیسی تیز ہو سکتی ہے، وہ تو ظاہر ہے، البتہ چراند کے ہر جگہ پھیل جانے میں شک نہ تھا،[1]

یہی محقق دوسری جگہ لکھتا ہے، :۔

"اس طرح وہ عظیم الشان اور قدیم کتب خانہ جس کو تاجداران سلسلۂ بطلیموسیہ نے جمع کیا تھا، اور جو سیزر کی آتش زنی سے بچ رہا تھا، اس جاہل (تھافلیس) اور متعصب پادری کے ہاتھوں سے برباد ہو گیا (ص ۵۰)

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس ڈریپر، ترجمہ مولانا ظفر علی خاں ص ۱۴۹-۱۴۷

جرمن عالم مسٹر کریل نے بھی اورنٹیل کانفرنس منعقدہ ۱۸۷۳ء میں ایک خاص مضمون میں پر زور دلائل کے ساتھ اس واقعہ کی تردید کی ہے[1]

۵۔ ڈاکٹر گستاولی بان مصنف تمدن عرب لکھتا ہے،

"کتب خانۂ اسکندریہ کے جلانے کا الزام عمر پر لگایا جاتا ہے، اس کی نسبت میں اسی قدر کہوں گا کہ اس قسم کا وحشیانہ فعل عربوں کے اوضاع واطوار کے اس قدر خلاف تھا کہ تعجب ہوتا ہے کہ اس قسم کی مہمل کہانی رائج رہے، اور قبول کی جائے، ہمارے زمانہ میں اس واقعہ کی تردید ایسے عمدہ طور پر ہو گئی ہے کہ اس سے زیادہ بحث کی ضرورت نہیں، نہایت آسانی کے ساتھ اور بہت ہی صاف اور صریح حوالوں کے ذریعہ سے ثابت ہو سکتا ہے کہ عربوں سے بہت پہلے خود عیسائیوں نے اسکندریہ کے بت پرستوں کے کتب خانہ کو اسی اہتمام کے ساتھ برباد کر دیا تھا جس اہتمام کے ساتھ انھوں نے اُن کی مورتیں توڑ ڈالی تھیں، اور اسی وجہ سے عربوں کے زمانہ میں کتابیں باقی ہی نہ تھیں، جو جلائی جاتیں،

ڈاکٹر لیبان اسی باب میں ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

"اس وقت عیسائی شہنشاہ تھوڈوسیس نے نہ کہ حضرت عمرؓ نے جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں، بت پرستوں کی تمام عبادتگاہوں کو، اور دیوتاؤں کی مورتوں اور کتابوں کو نیست و نابود کر دیا[2]

---

[1] مضمون کتب خانہ اسکندریہ مندرجہ رسائل شبلی مطبوعہ،

[2] تمدن عرب لیبان مترجمہ شمس العلما، سید علی بلگرامی ص ۲۰۳ — ۱۰۲،

۶۔ موسیو سیدیو اپنی مشہور تصنیف تاریخ عرب میں لکھتے ہیں،:۔

"بعض مورخین نے لکھا ہے کہ "عمرو بن عاص نے حضرت عمرؓ سے مشورہ کیا کہ سراپین کا مشہور کتب خانہ جو اسکندریہ میں ہے، اس کو کیا کیا جائے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اس کے جلانے کا حکم دے دیا، کہ اگر یہ کتابیں قرآن کے مخالف ہیں تو مضر ہیں، اور اگر موافق ہیں تو ہم کو ان کی ضرورت نہیں" لیکن یہ روایت صحت سے دور ہے، کیونکہ یہ ایک وحشیانہ فعل ہے، جو اطمینان اور سکون کی حالت میں صادر ہوا، (یعنی فتنہ، فتح کے مٹ جانے کے بعد جیسا کہ اس واقعہ کے راویوں نے بیان کیا ہے،) علاوہ اس کے یہ قول کہ قرآن کے موافق ہونے پر وہ کتابیں بے فائدہ ہیں" بالکل ایک احمقانہ قول ہے، جس کی نسبت اس مشہور خلیفہ کی طرف نہیں کی جا سکتی، جس کی دانائی کو تمام دنیا کی قوموں نے تسلیم کر لیا ہے، اسی لئے اس واقعہ کو اس کے معاصر مورخین میں سے کسی نے [illegible] کیا، اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان کتابوں کے جلانے کا حکم حضرت عمرؓ نے دیا تھا تو ان کی مقدار بہت کم ہو گی، کیونکہ بہت بڑا حصہ شہنشاہ تھیوڈسیس کے عہد میں سنہ ۳۹۰ء میں جل چکا تھا[1]

۷۔ مولفین چیمبرس انسائیکلوپیڈیا لکھتے ہیں،:۔

"جب جولیس سیزر نے شہر اسکندریہ کا محاصرہ کیا تو کتب خانہ کا بہت بڑا حصہ جل گیا، لیکن شاہ برکاسیس نے ملکہ کلوپیٹرا کو اپنا کتب خانہ دے کر کتبخانہ اسکندریہ کو پھر اپنی پہلی صورت پر آباد کر دیا، یہ کتب خانہ تھیوڈسیس اعظم

---

[1] تاریخ عرب سید یو مترجمہ علی مبارک پاشا مصر ص ۱۸۱۔

کے زمانہ تک رہا، جب اس شہنشاہ نے تمام ملک میں بُت پرستوں کے عبادت خانوں کے منہدم کردینے کا حکم دیا، تواُن کے ساتھ سراپیس کا ہیکل بھی جہاں یہ کتب خانہ تھا، منہدم کردیا گیا، اور ۳۹۱ء میں کتب خانہ میں آگ لگادی، یہ کتب خانہ عربوں نے نہیں جلایا، جیساکہ ان پر جھوٹ الزام لگایا جاتا ہے، مگر اکثر یہ قصہ نہایت بیہودہ طور سے مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے[1]۔

۸۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے محققین بھی اس واقعہ کو قصہ اور کہانی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے، فتح اسکندریہ کے ذکر کے بعد وہ ظرافت کے پیرایہ میں کہتے ہیں،

"یہ کہانی ابوالفرج کی زبانی بیان کی گئی ہے، کہ.....عمرو بنؓ عاص نے حضرت عمرؓ کے حکم سے سراپیم کے کتب خانہ کو برباد کردیا، اوران کو پبلک حماموں میں جو بہت کثرت سے اسکندریہ میں موجود تھے، تقسیم کردیا، ان کتابوں کی چھ مہینہ تک یہ خدمت تھی کہ وہ آگ کے لئے رسد تیار رکھیں[2]۔"

۹۔ جارج وائٹ اور جیمس اہلویلر اپنی تصنیف "جرائم اہل یورپ" میں لکھتے ہیں:۔

"اہل یورپ (روم) نے بت پرستوں کو پامال کردیا، اوران کی سخت خونریزی کی شہنشاہ تھیوڈوسیس نے بت پرستوں کے بت وغیرہ توڑ دیے، اسکندریہ کا بیٹر پارک اٹھا، اوراپنے پیروں کو لے کر سراپیس کے ہیکل میں آیا، اس کو برباد کردیا، اورجب بت پرستوں کے تمام معابد برباد کرچکا، توکتب خانہ میں گیا، اورتمام کتابیں جلادیں، یہاں تک کہ تمام الماریاں خالی ہوگئیں، اورکسی کو وہاں سکے بعد حسرت وافسوس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا، جس شخص نے اس کتب خانہ

---

[1] چیمبرس انسائیکلو پیڈیا، جلد اوّل ص ۱۳۱ [2] برٹانیکا انسائیکلو پیڈیا، جلد اوّل ص ۵۹۔

جلایا، وہ پیٹر یارک تھیافلس ہے، جس نے شہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم سے اسکندریہ میں مسلمانوں کے داخل ہونے سے بہت پہلے برباد کر دیا تھا، اور یہ معلوم ہو کہ مذہب اسلام میں کتابوں کا جلانا ممنوع ہے،

۱۰- ڈیلون: اپنی تصنیف "خرافات اہل یورپ" میں لکھتا ہے:-

"وہ دونوں کتب خانے جن کو بطلیموسیوں نے اسکندریہ میں قائم کیا تھا، سیزر کی فوج کے ہاتھ سے جو اُس نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا تھا، جل گئے" لیکن اس جرم کی مکافات میں وہ کتب خانہ جس کو یومنیز شاہ پرگامیس نے قائم کیا تھا، مارک انٹونی کی وساطت سے ملکہ کلیوپیٹرا کو ہدیۃً دیا گیا، لیکن زمانہ جہالت نے فیصلہ کر دیا تھا کہ عظیم الشان کتب خانہ چند صدی بھی باقی رہے، پیٹر یارک تھیافلس نے اُن کو جلا دیا،

(۱۱) جان مبارک اپنی تصنیف "دعوا ہائے کاذبہ" میں کہتا ہے،:-

"اہل یورپ نے کتب خانہ اسکندریہ کو جلایا، اور مسلمانوں ہی نے علم یورپ میں پہونچایا،

(۱۲) مسٹر ہسلی اسٹیفونس اپنی تصنیف "خیال اور مذہب" میں لکھتے ہیں:-

"کتب خانہ اسکندریہ جاہلوں کے ہاتھ سے برباد ہو گیا، اور اس عظیم الشان کتب خانہ کی بربادی سے علم برباد ہو گیا، اور یورپ جہالت کی تاریکیوں میں اُس وقت تک بھٹکتا رہا۔ جب تک مسلمانوں نے اپنے علوم وفنون کی روشنی سے اس کو منور نہیں کیا،

(۱۳) بٹنس اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے،

"جولیس سیزر نے جب شہر اسکندریہ فتح کیا، تو پہلا کتب خانہ جل گیا، اور وہ دوسرا کتب خانہ جو اس کے بعد قائم کیا گیا تھا، باقی رہ گیا، اس کتب خانے میں ان کتابوں کا بھی اضافہ ہوا، جو مارک انٹونی کی وساطت سے ملکہ کلیوپیٹرا کو ہدیۃً دی گئی تھیں، جس سے یہ کتب خانہ پہلے برباد شدہ کتب خانہ سے بڑا ہو گیا، اور سنہ ۳۹۰ء تک قائم رہا۔ جب کہ اہل یورپ نے بت پرستوں پر مظالم کئے، اور اُن کے ہیکل منہدم کر دیئے، جن میں سراپیس کا ہیکل بھی تھا، تو کتب خانے کو جلا دیا"

۱۴۔ جارج اپنی تصنیف "تریاق خرافات" میں دو جگہ لکھتا ہے:۔

"خبر ہے کتب خانہ اسکندریہ کیا ہوا؟ جواب دو کہ یورپ کی وحشی قوموں نے اس کو تھیوڈوسیس کے حکم سے سنہ ۳۹۰ء میں جلا دیا، یہ خاموش کتابیں زبانِ حال سے اس الزام کی تکذیب کر رہی ہیں، جو رومیہ میں گڑھا گیا کہ مسلمانوں نے عمر کے حکم سے اس کو جلا دیا، عمر کی طرف یہ جھوٹا انتساب بالکل بہتان اور افتراء ہے"

۱۵۔ جارج وایٹ اور جیمس اہولیر اپنی تصنیف "جرائم اہل یورپ" میں ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

"تھیوڈوسیس نے فرفوریس کی تمام علمی کتابیں جلا دیں، اور ان تمام کتابوں کے برباد کر دینے کا حکم دیا، جو مذہب کے مخالف ہوں، (پھر کہتا ہے) اور جس نے کتب خانۂ اسکندریہ جلایا وہ تھیافلیس ہے، نہ مسلمان، کیونکہ مذہب اسلام میں کتابوں کا جلانا ممنوع ہے، علاوہ بریں تمام قدیم مؤرخین جو اسلام کے ابتدائی

عہد میں تھے، انھوں نے کتب خانہ اسکندریہ کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے،

باوجود اس کے انھوں نے نہایت جھوٹی چھوٹی باتوں کو بیان کیا ہے،

۱۶ - بشپ جوزف اپنی کتاب تاریخ شام میں عام روایت کے بیان کرنے کے بعد ان الفاظ میں اپنی تحقیق ظاہر کرتا ہے[1]،

"اس قصہ کے بہت سے عیسائی، اور بعض مسلمان مورخین نے روایت کی ہے لیکن محققین اس کو صحیح نہیں سمجھتے"

۱۷ - اس سلسلہ کی سب سے مقدم اور سب سے بڑی شہادت، اسپین کے مورخ اور دسس کی عینی شہادت ہے، جس کا زمانہ پانچویں صدی عیسوی کا ہے اشہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم سے تھیافلیس جب کتب خانہ کو برباد کر چکا تھا، اوس کے بیس برس کے بعد اردوسیس نے کتب خانہ کی عمارت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ بیان کرتا ہے کہ "میں نے اس وقت کتب خانہ میں صرف خالی الماریاں دیکھی تھیں، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے مدتوں پہلے یہ علمی یادگار ین خود عیسائیوں کے تعصب مذہبی کی نذر ہو چکی تھیں ان شہادتوں کے بعد جو خود اہل یورپ کی زبانوں سے نکلی ہیں، اس امر میں کچھ شبہہ نہیں رہتا کہ مسلمان اس الزام سے بالکل بری ہیں، جو بعض کوتاہ نظر متعصب اہل یورپ ان پر لگانا چاہتے ہیں، حضرۃ الاستاذ نے اپنے مضمون کے خاتمہ پر لکھا تھا کہ امید ہے کہ وہ دن بھی آئے، جب زیادہ غور و تحقیق کے بعد تمام یورپ متفق ہو کر علانیہ کہدے کہ

ع ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

لیکن ہم کہتے ہیں کہ اب وہ زمانہ آگیا جب زیادہ غور و تحقیق کے بعد تمام یورپ متفق

---

[1] نمبر ۹ سے کر ۱۶ نمبر تک کے حوالوں کے لئے دیکھئے رسالہ المقتبس، ج ۴ ص ۵، ۶، ۷،

ہو کر علانیہ کہہ اٹھا،

ع ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

(الندوہ اگست ۱۹۱۰ء)

(۲)

کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق نفیاً اور اثباتاً ہر پہلو سے اس قدر بحثیں ہو چکی ہیں کہ بظاہر اب کوئی نیا پہلو بحث کا نظر نہیں آتا، لیکن ایک انگریز اہل قلم نے اس مسئلہ کے ایک ایسے پہلو پر قلم اٹھایا ہے جس کی طرف کسی مخالف یا موافق کی نظر اب تک نہیں اٹھی ہے، کتب خانہ اسکندریہ کی جو داستان تصنیف ہوئی ہے، اس کے ہیرو کا نام یحییٰ نحوی ہے، یحییٰ نحوی ہی حضرت عمرو بن العاصؓ کی خدمت میں آتا ہے، وہی ان سے کتب خانہ کی تاریخ بیان کرتا ہے،

حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت عمرؓ بن خطاب سے اس کتب خانہ کے بارے میں حکم چاہتے ہیں، حضرت عمرؓ اس کے جلا دینے کا حکم دیدیتے ہیں، اور اسکندریہ کا یہ قدیم اور نایاب کتب خانہ اسکندریہ کے حماموں میں چھ مہینے تک آگ سلگانے کے کام میں آتا ہے، اب تک اس قصہ کی تردید و تکذیب میں جن یورپین اور مسلمان مورخین نے جو دلائل قائم کئے ہیں، اُن سب میں یہ مسلّم تھا کہ یحییٰ نحوی اس عہد میں موجود تھا، اور وہی اس قصہ کا ہیرو قرار پاتا ہے، لیکن مسٹر بٹلر نے اپنی تصنیف "فتح مصر" میں جہاں

اسکندریہ کا ذکر کیا ہے وہاں کتب خانۂ اسکندریہ کے متعلق ثابت کیا ہے کہ عربوں کی فتح سے پہلے یہ کتب خانہ برباد ہو چکا تھا، اور سب سے بڑی دلیل یہ قائم کی ہے کہ اس روایت کے (جس میں عربوں کے ہاتھ سے کتب خانہ کا برباد ہونا بیان کیا گیا ہے) وضعی اور جعلی ہونے پر سب سے زیادہ قطعی شہادت یہ ہے کہ اس روایت کا ہیرو یعنی یحییٰ نحوی کا اس عہد میں وجود تاریخی اسناد کے بالکل مخالف ہے۔ اگر وہ اس عہد میں موجود ہوتا تو اس کی عمر ۱۳۰ برس سے بہت زیادہ تسلیم کرنی پڑے گی،

مسٹر ٹیلر نے ۲۵ رجون ۱۹۱۱ء کے ٹائمز میں اس مضمون کی خوب دھجی اُڑائی ہے، لکھا ہے کہ

"نہایت تعجب کی بات ہے کہ لوگ پھر اس واقعہ کو از سر نو دہرا رہے ہیں، کہ عمر نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلا دیا۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ اس قسم کے مضامین ٹائمز جیسے رفیع اخبار میں شائع ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ مضمون نگار نے اس مسئلہ پر علمی اور تاریخی پہلوؤں سے غور نہیں کیا ہے، اور اگر کرتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ جن چیزوں کو وہ جدید دلائل سمجھ رہا ہے وہ اس موضوع کی پیش پا افتادہ باتیں ہیں، جن پر اس مسئلہ کی تحقیق میں اعتماد نہیں کیا جاسکتا،

میں نے اپنی تصنیف "فتح مصر" میں اس بحث کے متعلق ایک خاص باب قائم کیا ہے۔ جس میں واضح دلائل سے حسب ذیل نتائج منتج کئے گئے ہیں،

۱۔ کتب خانۂ اسکندریہ کے جلانے کا واقعہ فتحِ مصر کے پانچسو برس کے بعد یورپ میں
تصنیفات میں شائع کیا گیا ہے، اس کی اشاعت کرنے والے عبداللطیف بغدادی
جمال الدین قفطی، ابو الفدا، اور مقریزی ہیں، اور اس میں بھی شک نہیں کہ ابوالفرج
نے اپنی روایت عبداللطیف سے حاصل کی ہے، یہ تحقیق کوئی جدید نہیں ہے، بلکہ
پہلے سے مشہور، معروف، اور متداول ہے،

۲۔ اس واقعہ کے متعلقات جو بیان ہوتے ہیں،

۳۔ اس واقعہ کا ہیرو یوحنا (یحیٰی) فیلیونوس ہے، اور عربوں کے مصر فتح کرنے
سے پہلے مر چکا تھا،

۴۔ اسکندریہ میں دو عظیم بالشان کتب خانے تھے، ایک عجائب خانہ کا کتبخانہ
اور دوسرا سیراپیم کا کتب خانہ، اس واقعہ میں جس کتب خانہ کا نام لیا جاتا ہے
وہ انہی دونوں کتب خانوں میں سے کوئی ایک ہوگا، لیکن پہلا کتب خانہ جولیس
سیزر کے معرکہ میں مسلمانوں کے فتح مصر سے چار سو برس پہلے برباد ہو چکا تھا،
دوسرے کتب خانہ کے متعلق تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو ۳۹۱ء میں وہ
دوسری جگہ منتقل ہو گیا تھا، یا اسی سنہ میں وہ تلف ہو گیا، اس بنا پر
۶۴۲ء میں یعنی مسلمانوں کے مصر فتح کرنے کے وقت اسکندریہ میں کسی کتب خانہ
کا وجود نہ تھا، پانچویں، چھٹی، اور ساتویں صدی کی تصنیفات میں اسکندریہ
کے کسی کتب خانہ کا ذکر نہیں ہے،

(۵) اگر کتب خانہ فتح اسکندریہ کے وقت وہاں موجود تھا، تو اس کو
اس زمانہ صلح میں جو اسکندریہ کو مسلمانوں کے سپرد کر دینے سے پہلے رومیوں

کو از روے معاہدہ دوسری جگہ منتقل کرنا آسان تھا، کیونکہ معاہدہ کی ایک دفعہ یہ بھی کہ بیش قیمت چیزیں، رومی اپنے ساتھ لیجا سکتے ہیں، دریا کا راستہ اس زمانہ میں بالکل کھلا ہوا تھا،

۷۔ اگر بالفرض یہ کتب خانہ دوسری جگہ منتقل ہوتا، یا برباد کر دیا جاتا، تو اُس زمانہ کا مشہور مؤرخ نیکیو اس واقعہ کے ذکر سے خاموش نہ رہتا،

ان وجوہ کی بنا پر اڈیٹر الہلال نے کوئی ایسی بات نہیں کی، جو نئی ہو، بلکہ یہ وہی پرانی اور پرہی بات ہے، اور مضمون نگار نے آپ کے اخبار کے کالموں میں اپنی جہالت کے ثبوت کے علاوہ کوئی تاریخی دلیل نہیں پیش کی، جس سے واقعہ کا ثبوت ہو،

مسٹر بٹلر کی تحقیقات جہاں تک پہنچی ہے، اُن میں یحییٰ نحوی کے زمانۂ وجود کے علاوہ اور تمام باتیں اس سے پہلے بدلائل بار بار ثابت کی جا چکی ہیں، ہم مسٹر بٹلر کے اُن دلائل سے واقف نہیں ہیں، جن سے انھوں نے زمانۂ فتح مصر میں یحییٰ کے موجود نہ رہنے پر استدلال کیا ہے، یحییٰ کا جن عربی تصنیفات میں ذکر ہے، وہ سب ایک ایک کر کے نظر کے سامنے تھیں، اور متعدد بار پڑھی بھی جا چکی تھیں، لیکن کبھی یحییٰ کے زمانۂ وجود کی تحقیق کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا، لیکن مسٹر بٹلر کے مضمون کے بعد ابن الندیم کی الفہرست میں وہ عبارت بغور پڑھی جو یحییٰ کے متعلق ہے، تو معلوم ہوا کہ چوتھی صدی کے مؤرخ ابن الندیم کو بھی عربوں کے فتح مصر کے وقت یحییٰ کے وجود پر اعتراض تھا،

(الندوہ دسمبر ۱۹۱۱ء)

اسلامی ہندوستان کا عہد آخر اور علوم جدیدہ

مسلمانوں کے ذوق طلب اور لیلائے علم کے ساتھ اُن کے عشق کی داستان سیکڑوں بار دہرائی جا چکی ہے، دمشق، بغداد، مصر اور اسپین میں جو کچھ ہوا، اُس کا ایک ایک حرف بھی سنایا جا چکا ہے۔ ابتدائی صدیوں میں ایران و مصر و یونان کے علوم و فنون کے جو تراجم عربی زبان میں منتقل کیے گیے، وہ بھی نظر کے سامنے ہیں۔ لیکن منکرین کی زبانوں پر ہمارے دعوے کے ثبوت کے لیے ابتک "ھل من مزید" کی صدا بلند ہے۔

دنیا کی تمام قوموں کو اپنے اپنے عروج و ترقی کے زمانوں میں اس قسم کے کارناموں کے انجام دینے کا دعوی ہے، اور بجا دعوی ہے، لیکن یہ شرف مسلمانوں ہی کو حاصل ہے کہ اُن کا یہ شوق علاوہ ولولۂ علمی اور جذبات فطری کے درحقیقت اُن کی قومیت کے شیرازہ بند اور ان کے وجود کے مکونِ اعظم کے اشارۂ فرمان کا ایک طرب انگیز منظر تھا۔ داعیِ اسلام علیہ السلام نے کہا،

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن	حکمت کی بات ایک مومن کی گم شدہ
حیث وجدھا فھو احق بھا	دولت ہے، جہاں پائے وہ اسکا مستحق ہے

ہم نے عرب سے نکل کر، جب مصر و شام میں قدم رکھا، سریانیوں، قبطیوں، اور رومیوں اور یونانیوں کے پاس یہ دولت نظر آئی۔ ہم بڑھے اور بڑھ کر، اپنی دولت

ان سے چھین لی، عراق و فارس کی طرف گذر ہوا، تو کسریٰ کے خزانوں میں بھی کچھ گم شدہ جواہر ریزے نظر آئے، ان کو بھی اٹھا کر جیب و آستین میں رکھ لیا، ہندوستان کی طرف قدم بڑھا، تو پنڈتوں کی پوتھیاں نظر آئیں، ان بوڑھے پرہتوں نے ہرچند چاہا کہ ان ملیچھ لٹیروں کو ایسی گراں بہا دولت نہ دی جائے، لیکن ہم نے کبھی سمجھا بجھا کر، کبھی پھسلا بہلا کر کچھ پتر کچھ پتے لے ہی لیے،

اب ہمارے انحطاط عمر کا زمانہ تھا، قویٰ میں اضمحلال اور دورۂ خون میں سکون آچلا تھا، ایک ہزار برس کی جد و جہد اور سعی و محنت سے ہم تھک کر چور ہوگئے تھے کہ نوجوان سرمایہ داروں کا سامنا ہوگیا، جن کی رگ رگ میں آغاز شباب کی لہر تھی، جن کے بند بند میں شہزوروں کی قوت تھی، ان کے ساز و سامان و متاع پر نگاہ پڑی تو نیا اور اپنے سے بہتر اور گرانقدر قیمت پایا، اس قصہ پر تین صدی سے زیادہ گذرنے کو آئی، لوگوں نے یہ داستان فراموش کردی ہوگی، لیکن ہم کو یاد ہے کہ بایں ہمہ پیری و ناتوانی، اگرہم ان سے کچھ چھین نہ سکے تو نوچ کھسوٹ میں کچھ مال اُن سے ضرور ہاتھ آیا، یہ یورپ کی نوخیز قومیں تھیں، جن کا تانتا ہندوستان کے سواحل پر سولھویں صدی سے لگتا شروع ہوگیا تھا، اندرونِ ہندوستان میں اہل یورپ کی آمد، سترہویں صدی کا واقعہ ہے، شہنشاہ اکبر ان دنوں فرمان روا تھا، ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے انجیل بالکل نئی چیز تھی، اکبر کے حکم سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، ہندوستان میں یورپین زبانوں کی تاریخ تراجم کا یہ سب سے پہلا صفحہ تھا، خانخانان جو دربار اکبری کا ہفت زبان بلبل تھا، اس کو فرنگی زبان سیکھنے کا فرمان ملا، عبد الباقی خان مآثر رحیمی میں لکھتا ہے:-

چوں اکثر بنادر ہندوستان در تصرف مسیحیہ است... و مکاتبات و مراسلات در میانہ سلاطین افرنجیہ و خوانین ہندوستان بسیار واقع می شود، بادشاہ ظل اللہ اکبر شاہ این سپہ سالار (عبدالرحیم خانخاناں) را بہ فراگرفتن زبان عیسوی و بہم رسانیدن سواد و خط این قوم فرمان داد، بہ اندک اختلاط و صحبتے کہ با خاصانِ آں قوم کہ در پائے تخت بادشاہی بودند و تجار و متردّدین ایشاں نمود بہ دستور تتبع آن خط و زبان آں قوم کرد کہ بے شائبہ ریا بہتر از آں قوم می داند۔

جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد میں اہل یورپ کا علمی حیثیت سے کوئی پایہ نہ تھا، ہندوستان میں اُن کی شہرت اور ناموری کا ذریعہ صرف تین چیزیں تھیں، جہاز رانی و تجارت اور جرّاحی انقلاباتِ روزگار سے صرف تیس چالیس سال میں ہندوستاں کی زمیں و آسمان بدل گئی، تمام ممالک میں سیاسی اضطرابات پیدا ہوگئے، نادر شاہ اور احمد شاہ نے پنجاب سے دلی تک اور مرہٹوں نے دکن سے پنجاب تک ایک خاک سی اڑادی تھی۔ ابھی یہ شعلے فرو بھی نہ ہونے پائے تھے کہ سکھوں نے سر اٹھایا، بادشاہ گردی نے تیموریوں کی فرماں روائی کا رہا سہا ساکھ بھی اٹھا دیا تھا، صوبہ داریوں نے بڑھ بڑھ کر بادشاہیوں کا دعوی کیا، ان تمام شورشوں، ان تمام ہنگاموں اور ان تمام فتنوں کے باوجود جب ذرہ بھی فراغ خاطر نصیب ہوا، نئے استادوں سے سیکھنے میں ہندوستان نے تامل نہ کیا، بحری، فوجی اور انتظامی حیثیت سے جس حد تک تعلیم حاصل کی گئی تھی، وہ لاہور، میسور، حیدرآباد اور پونہ کی گذشتہ سیاسی تاریخ میں مدفون ہے اور اس سے ہم کو اس وقت بحث نہیں،

اس مضمون میں ہم کو صرف علمی حیثیت کا مرقع کھینچنا ہے،

اس سلسلہ میں علاً سب سے پہلا کام ۱۱۲۷ھ میں دلی میں جدید طرز پر ایک رصد خانہ کا قیام ہے، محمد شاہ کے حکم اور راجہ سوائی سنگھ والیِ جے پور کے اہتمام سے یہ رصد خانہ قائم ہوا تھا، اس رصد خانہ کی تعمیر پر بیس لاکھ صرف ہوئے تھے، مرزا خیر اللہ مہندس اور دیگر علمائے ہند و ایران کے علاوہ متعدد یورپین ماہرین علم ہیئت، اس کی تعمیر و تنظیم میں شریک تھے۔ بہت سے آلات اس میں یورپ سے منگوا کر نصب کیے گئے تھے۔

مشرق کا یہ سب سے پہلا رصد خانہ تھا، جس نے یورپ کی جدید تحقیقات کی تصدیق کی، اس رصد خانہ کی تحقیقات کا مجموعہ زیچ محمد شاہی کے نام سے فارسی میں موجود ہے، اور رامپور کی اورنیٹل لائبریری میں ہماری نظر سے گذری، "مسلمان اور ہیئت" کے عنوان سے الندوہ میں ہم نے جو مضمون لکھا تھا، اس میں اس رصد خانہ کی چند تحقیقات کی تفصیل کی ہے، یہاں جامع بہادر خانی کی اس عبادت کو پیش کرتے ہیں:

> "در رصد محمد شاہی ہم در ارصاد فرنگ ثابت شدہ است کہ زہرہ و عطارد نیز اکتساب نور از شمس می کنند و حوالی احتراق آنہا را ہلالیت عارض می شود (صفحہ ۰)

جدید ہیئت کے مطابق بعض سیارات کے گرد چاندوں کا گردش کرنا، زحل کا بیلجی الشکل ہونا، آفتاب کے چہرہ پر داغ ہونا، بعض ثوابت کا حقیقت میں سیارہ ہونا بھی، اس رصد خانہ سے ثابت ہوا،

علم ہیئت اور ہندسہ کے آلات شروع شروع ہندوستان میں یورپ سے آئے تھے، بعض علمائے ہند نے جب ان کو دیکھا تو بہ نہایت پسند کیا، سرسید کے نانا خواجہ فرید جو اکبر ثانی شاہ دہلی کے وزیر تھے انھوں نے "فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" فن پرکار سازی پر فارسی میں ایک رسالہ لکھا ہے، اس کے دیباچہ میں آلۂ پرکار کی واقفیت کی نہایت دلچسپ تاریخ بیان کی ہے، لکھتے ہیں۔

کتب ریاضی کے کسی حاشیہ میں میری نظر سے گذرا تھا کہ آلاتِ ریاضی میں سے ایک آلہ تھا، جس کو پرکار متناسبہ کہتے ہیں، اس سے اکثر اعمالِ نجومی اور بعض اشکال ہندسی اور مسائل حسابی آسانی سے حل ہو جاتے تھے، مگر چونکہ وہ آلہ مفقود ہے اس لیے اب اس کا علم اور عمل بھی باقی نہیں رہا،

اس کے سوا میں نے اپنے بعض اساتذہ سے بھی ایسا ہی سنا تھا، اس لیے اوس آلہ کے دیکھنے کا مجھے کمال اشتیاق تھا، جس ریاضی دان سے ذکر کرتا وہ لاعلمی بیان کرتا، اور اکثر کہتے تھے، کہ اس معمولی پرکار کے سوا جو دائرہ کھینچنے اور خطوط کے ناپنے میں استعمال ہوتا ہے، اور کوئی پرکار نہیں، جب ۱۲۱۹ھ میں میرا لکھنؤ جانا ہوا، وہاں جنرل مارٹین اور مسٹر گور اوسلی سے ملاقات ہوئی، . . . . ان کے پاس میں نے لوہے اور پیتل کا بنا ہوا ایک عجیب آلہ دیکھا، میں نے اس کا حال پوچھا، انھوں نے کہا یہ پرکار تقسیم ہے، اس سے خطوط، دوائر، سطوح اور اجسام مختلفہ کی تقسیم آسانی سے ہو جاتی ہے،

یہ آلہ جنرل مارٹین کا تھا، میں نے ان سے مستعار لے لیا، اور مجھے یقین ہو گیا کہ

پر کار متناسبہ یہی ہے، چونکہ مسٹر گوراوسلی نے اس آلہ سے چاروں مذکورۂ بالا عمل میرے سامنے کیے تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ دیکھیں اس سے کوئی عمل نجومی بھی استخراج ہوتا ہے یا نہیں، آخر جب اُس سے کوئی عمل نہ ہو سکا، تو میں نے سمجھا کہ یہ پرکار متناسبہ نہیں ہے، مگر چند روز غور کرنے کے بعد میں نے اسی اصول کے مطابق اس کے بنانے کا طریقہ ذہن نشین کر کے ویسا ہی ایک پرکار چاندی کا تیار کیا

مسٹر گوراوسلی نے اس کو مجھ سے لیکر نواب سعادت علی خاں کی خدمت میں پیش کیا، اور نہایت تعجب ظاہر کیا، کہ اکثر لوگ اس پرکار کے عمل سے بھی واقف نہیں ہیں، چہ جائے کہ ایسا پرکار خود بنا لیتا کہ ولایت میں بھی ہر شخص نہیں بنا سکتا، سر گوراوسلی نے کہا کہ مجھکو صرف اس قدر معلوم ہے کہ پرکاروں کے گنج میں ایک آلہ ایسا بھی ہے، جس سے یہ پرکار تیار ہوتا ہے، مگر میں یہ نہیں جانتا کہ کس طرح تیار ہوتا ہے، تم نے بغیر آلہ کے یہ پرکار کیونکر بنا لیا؟

چونکہ میں نے کبھی گنج پرکار دیکھا نہ تھا، میں نے اس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا، سر گوراوسلی نے اپنے بکس میں سے گنج نکال کر وہ آلہ مجھکو دکھایا، اس پر بہت سے ہندسے اور خطوط کندہ تھے، مینے ان کا حال پوچھا، انھوں نے دو تین عمل کر کے دکھائے، اور کہا کہ میں اس سے زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں نے سنا ہے کہ اس سے بہت سے اعمال ہندسی اور حسابی اور اکثر اعمال نجومی ہو سکتے ہیں، مگر میں بلکہ ہندسوں کے سوا کوئی انگریز نہیں جانتا، وہ گنج چونکہ نہایت عمدہ اور نفیس تھا، گو میرا جی بہت للچایا، مگر مستغنا

مانگنا مناسب نہ جانا،

اس کے بعد میں نے کئی پرکار تقسیم پیتل کے تیار کر کے اور انگریزی ہندسوں کے بجائے فارسی ہندسے کندہ کر کے اپنے دوستوں کو دیئے، چند روز کے بعد جب میرا کلکتہ جانا ہوا، وہاں جاکر میں نے ایک گنج پرکار خریدا، جس میں وہ آلہ مطلوبہ بھی تھا، میں نے نہایت کوشش اور فکر و غور سے اس کے اعمال دریافت کیئے، اور عمل استخراج ظل اور اکثر اعمال ہندسی اور نجومی نکالے، اور مجھکو یقین ہو گیا کہ پرکار متناسبہ جو کبھی عرب و عجم میں مروج تھا، وہ یہی ہے، اور اب یورپ کے سوا کہیں رواج نہیں رہا،

یہ ایک ضمنی اور سرسری واقعہ تھا، لیکن کس قدر سرتاپا عبرت اور حسرت تھا، خواجہ نے اس جملہ معترضہ کے بعد پرکار کے فوائد و اعمال پر فارسی میں رسالہ لکھا جسکا قلمی نسخہ علی گڑھ کی کالج لائبریری میں موجود ہے،

اسی زمانہ کے قریب یعنی ۱۲۵۳ھ میں دلی میں جدید علوم کے واقف کار دو اور بزرگوار بھی تھے، میر امان دہلوی اور غلام محی الدین دہلوی دونوں حیدرآباد میں رہتے تھے، اور انگریزی زبان سے کتابوں کے اردو فارسی میں ترجمے کرتے تھے دلی جب مٹی تو اس خمیر سے دو اور گھروندے تیار ہوئے، لکھنؤ اور حیدرآباد۔ ان کے علاوہ انگریزوں کی نوخیز حکومت کا مرکز کلکتہ تھا، ان میں سے ہر مقام میں اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کام انجام پایا ہے،

لکھنؤ | لکھنؤ کا سایۂ اقبال اگرچہ دیرپا نہ تھا، تاہم جب تک بھی رہا، بڑے بڑے ارباب فن اور اصحاب کمال کا مرجع رہا، حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر

علماء ہی سرافراز تھے، اور انگریزوں سے برابری کے دعوی کے ساتھ ملتے تھے، اس لئے ان کی صحبت سے متاثر ہونے کا موقع ان کو زیادہ ملتا تھا، بادشاہ اودھ کی طرف سے لندن میں ایک سفیر رہتا تھا، یہ بھی گروہ علماء ہی سے منتخب ہوتا تھا، مولوی محمد اسمٰعیل اور مولوی محمد حسین اتنگ اسی بناپر لندنی کہلاتے ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل لندنی کا ہیئت میں ایک رسالہ ہے، ندوہ کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس میں امریکہ کا ذکر اور یورپ کے علمی اکتشافات کا تذکرہ ہے،

مولوی محمد حسین کا ایک عربی خط ہے، اور خط کیا درحقیقت رسالہ ہے، یہ رسالہ ہے، یہ رسالہ نہایت خوشخط ندوہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس رسالہ میں اپنے ایک دوست کے سامنے یورپ کے عجائبات کا نہایت عمدہ نقشہ کھینچا ہے، پہلے یورپ کا جغرافیہ لکھا ہے، پھر وہاں کی علمی ذوق وشوق کی کیفیت، مطابع کے فوائد اور منافع لکھے ہیں، تصنیفات کی کثرت دکھائی ہے، بتایا ہے کہ مشرقی زبانوں کے ساتھ بھی ان کو کس قدر اعتنا ہے، پھر ان کے علوم وفنون پر ایک مختصر ریویو کیا ہے، بعض مصنفین کا تذکرہ کیا ہے، جارج سیل کے ترجمۂ قرآن پر حیرت ظاہر کی ہے، بتایا ہے کہ الٰہیات کو انھوں نے بیہودہ اور بیکار سمجھ کر علم سے خارج کر دیا ہے، اور منطق بقدر کفایت سیکھتے ہیں، اس کے بعد ان کے بعض اختراعات کا تذکرہ ہے، اور آخر میں جدید علم ہیئت میں یورپ کے اکتشافات کی تفصیل ہے،

یہ رسالہ مجھے اس قدر پسند آیا تھا کہ اس کی اصل عربی مع اردو ترجمہ کے مشہور عربی رسالہ البیان ۱۳۲۱ھ میں جو کبھی میری اڈیٹری میں لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا، چھپوا دی تھی، اور ناظرین نے اس کو بڑے شوق سے پڑھا تھا،

اس زمانہ کے مشاہیر علماء میں لکھنؤ میں تفضیل حسین خان تھے، جو علامہ کے خطاب سے مخاطب تھے۔ علامۂ ممدوح کو یورپ کی متعدد مردہ اور زندہ زبانوں پر عبور تھا، علم ہیئت میں اس عہد میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، چونکہ بڑے بڑے مناصب پر ہمیشہ ممتاز رہے، اس لیے عقلائے فرنگ سے شب و روز کی صحبتیں رہتی تھیں، جدید علوم کی طرف شوق و توجہ پیدا ہونے کا یہی سبب ہے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد میں مولوی عبدالرب، کمال الدین حیدر، اور مفتی اسمٰعیل بن وجیہ مرادآبادی نہایت مشہور ماہر فن تھے، لکھنؤ میں جو یورپین علماء تھے، اُن سے صحبت رہتی تھی، ۱۲۴۶ھ میں نصیر الدین حیدر کا عہد اور مہدی علی خان کی وزارت تھی، کہ لکھنؤ میں ایک رصدخانہ کے قیام کا خواب دیکھا گیا، ہربرٹ نام ایک انگریز عالم ۱۶۰۰ ماہوار پر اس کا مہتمم قرار پایا، خورشید منزل کے پاس جنرل مکلاؤڈ کی بنائی ہوئی ایک کوٹھی تھی، اس مقصد کے لیے اسی مقام کا انتخاب ہوا، رصدخانہ ابھی زیر تعمیر ہی تھا، کہ ہربرٹ کا انتقال ہو گیا، جب محمد علی شاہ کا زمانہ آیا تو نئے سرے سے اس کام کا خیال آیا، بادشاہ نے بھی اس غرض کے لیے بڑی فیاضی سے روپیہ دیا، چار لاکھ روپیہ صرف اس کی عمارت پر صرف ہوا، خطوط و دوائر کے کھینچنے کے لیے پچاس ہزار کا پتھر مرزاپور سے منگوایا گیا تھا، اور ایک لاکھ روپیہ کے آلات لندن سے آئے تھے رصدخانہ کا اہتمام کرنل ولکاکس کے متعلق تھے۔ دس برس میں تعمیر تکمیل کو پہنچی، رصدخانہ کا نظام بالکل گرین وچ کے مشہور رصدخانہ کے مطابق تھا، کل انیس ۱۹ لاکھ اس رصدخانہ پر صرف ہوا تھا،

اس رصدخانہ میں کرنل ولکاکس وغیرہ انگریز علماء کے علاوہ مولوی عبدالرب

کمال الدین حیدر، اور مفتی اسماعیل مرادآبادی بھی شریک کار تھے، ۱۸۴۹ء میں واجد علی شاہ کے زمانہ میں ولکاکس کا انتقال ہوگیا، رصدخانہ صرف اس کے دم سے زندہ تھا، ایک بہت بڑا نادر کتب خانہ اس رصدخانہ میں موجود تھا، وہ سب اٹھ کر علی نقی خاں کے محل میں جو ان دنوں وزارت کرتے تھے۔ چلا آیا،[1]

شاہان اودھ کی طرف سے لکھنؤ میں ایک دارالترجمہ بھی قائم تھا، جس میں جدید علوم وفنون کی کتابیں ترجمہ ہوکر اور مطبع سلطانی میں چھپ کر، شائع ہوتی تھیں۔ سید کمال الدین حیدر جن کا ذکر اوپر گذرچکا ہے، ان کا اصل نام محمد میر حسنی تھا، انھوں نے جدید علوم پر انیس[19] رسالوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا، ان انیس[19] رسالوں میں سے حسبِ ذیل رسائل کا حال معلوم ہے،

(۱) رسالہ ہیئت، مصنفہ ڈاکٹر ولسن، (۲)، رسالہ دیگر ہیئت، مصنفہ ڈاکٹر برنکلی، (۳)، رسالہ علوم طبیعیہ (فزیکس) (۴) رسالہ قوتِ مقناطیسی (الکٹریسٹی) (۵)، رسالہ علم الکیمیا، (کیمسٹری)، مصنفہ پارکس (۶) رسالہ علم المناظر (ادپٹکس) (۷)، رسالہ علم الماء (ہیڈروسٹکس) (۸) رسالہ علم الھوا، (۹)، رسالہ علم الحرارۃ (۱۰) رسالہ مقاصد العلوم مصنفہ لارڈ بروگھم،

اخیر رسالہ دفتر تاریخ بھوپال کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہ رسالہ ۱۸۴۱ء میں مطبع سلطانی میں طبع ہوا تھا، رسالہ کا موضوع مختلف علوم کے فوائد اور ان کے مقاصد اور مواضع بحث کی تشریح ہے، اصل انگریزی رسالہ کا عنوان یہ ہے،

---

[1] یہ تمام تفصیل قیصر التواریخ میں جو شاہان اودھ کے حال میں ہے مذکور ہے،

A treatise on the objects advantagsand pleasure of Zience by Lord Brougham

مترجم نے مقدمہ میں لکھا ہے،

حسب الحکم ابو الفتح معین الدین سلطان الزمان نوشیروان عادل محمد علی شاہ بادشاہ غازی حسب فرمایش محکمۂ اجلاس جنرل کامٹی کمیٹی، اسکول بک سوسائٹی کے، عاصی سراپا معاصی سید کمال الدین حیدر عرف محمد میر الحسنی الحسینی نے زبان اردو میں ترجمہ کیا، اور صاحب عالی شان مہتمم رصدخانہ سلطانی سے اس کا مقابلہ کیا،

رسالہ ایک مقدمہ اور پانچ فصلوں پر منقسم ہے،

مقدمہ میں مقصد علم اور فوائد علم کا بیان ہے،

پہلی فصل میں علم ریاضی کا بیان ہے،

دوسری فصل میں علم ریاضی اور علم طبیعی کی حقیقتوں کے اختلاف کا بیان ہے

تیسری فصل میں علم طبیعی کا بیان ہے،

چوتھی فصل میں علم طبیعی جو عالم حیوانات اور نباتات سے متعلق ہو، اسکا بیان ہو،

پانچویں فصل میں فوائد اور مقاصد علم کا بیان ہو،

رسالہ میں علم کے جو فوائد بیان کیے گیے ہیں، اُن کا مقصد یہ ہے کہ کس علم کے جاننے سے انسان کیا کر سکتا ہے،

۱۲۶۵ء کا ایک رسالہ مطبع نظامی لکھنو کا چھپا ہوا میری نظر سے گذرا ہے، رسالہ کا نام کشاف عالم اور مصنف کا نام حکیم الہند ہے، رسالہ کا موضوع جدید

جغرافیہ ہے، حکیم الہند نے نہایت ناز و غرور کے ساتھ اہل ملک کے سامنے اپنی یہ تالیف پیش کی ہے، رسالہ کے خاتمہ میں حکیم الہند نے اپنے فضل و کمال اور ابنائے عصر کی ناقدر دانی پر بہت گریہ و ماتم کیا ہے، اور ارادہ کیا ہے کہ انگلش طرز حکومت پر ایک رسالہ لکھ کر پبلک کے سامنے پیش کرے، آخر میں اپنی تصنیفات و ایجادات کا بھی ذکر کیا ہے، رسالہ کی زبان فارسی ہے، لکھتے ہیں:۔

> تالیفات حکیم الہند اوّل در نفس انسانی، دوّم در بیان کیفیات شمس و قمر عطارد و مشتری جملہ سیارات ہر طریق حکمائے فرنگ و قدیم یونان، سوّم در بیان زمین و آب و ہوا و زلزلہ و ژالہ و مد و جزر و باران و برق، چہارم جر اثقال (میکنکس) پنجم در علم حساب"

صفحات بالا اور آیندہ واقعات سے بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں زیادہ تر فن ہیئت کی طرف لوگوں کو توجہ تھی، لکھنؤ میں قدیم و جدید فنون ہیئت و ریاضی پر سب سے زیادہ ضخیم و محقق کتاب ایک ہندو نو مسلمان کی ہے، اس زمانہ مین شرفائے ہنود عربی و فارسی پر کامل دستگاہ رکھتے تھے، راجہ رتن سنگھ محمدی نے لکھنؤ کے دربار میں حدائق النجوم کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو اب بھی علمائے ہند میں فلکیات پر مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے، اس کتاب میں مصنف نے جدید و قدیم معلومات پہلو بہ پہلو لکھے ہیں، انگریزی جوان ہو کر پڑھی، اور کتاب کے تمام مصارف خود اپنی ذات سے ادا کیے، مولوی کرامت حسین جونپوری ماخذ علوم میں لکھتے ہیں:۔

> خصوصاً کتاب حدائق النجوم۔ فارسی مین مولفہ راجہ رتن سنگھ علیہ الرحمہ کی

بہت مفید ہے، اس مرحوم نے انگریزی زبان سیکھ کر علم حاصل کیا، اور عربی میں استعداد کامل رکھتا تھا، اور سب خرچ اپنی ذات سے کیا، بڑا آدمی ہو، تو ایسا ہو"

دہلی کے شہزادہ سلیمان جاہ لکھنؤ میں آکر رہ گئے تھے، نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں مراداباد کے مولوی رستم علی سنبھلی نے زیچ سلیمان جاہی لکھ کر پیش کی، ایک انگریز نے فن زراعت پر ایک رسالہ اردو میں لکھا، اس کا مطبوعہ نسخہ میں نے دیکھا ہے،

حیدر آباد لکھنؤ کے بعد اس عہد میں مسلمانوں کا دوسرا مرکز حیدر آباد تھا، جہاں سیاسی فتنوں سے کسی قدر فراغ حال نصیب تھا، ۱۲۴۰ھ میں نظام الملک میر فرخندہ علی خان فتح جنگ فرمان روائے حیدر آباد تھے۔ اس زمانہ میں حیدر آباد میں نواب محمد فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامراء ایک نہایت ذی علم امیر تھے۔ ریاضیات اور خصوصاً ہیئت سے ان کو غایت درجہ شغف تھا، ایک بڑے کمرے میں آلات ہیئت اس قدر انھوں نے جمع کیے تھے، کہ پورا رصد خانہ معلوم ہوتا تھا،

شمس الامراء کی علم دوستی نے بہت سے ماہرین فن کو ان کے سایۂ دامن میں جمع کر دیا تھا، ۱۲۳۱ھ میں شمس الہندسہ کے نام سے انھوں نے علم ہندسہ پر ایک کتاب لکھی، میر شجاعت حیدر آبادی نے شمس الامراء کے حکم سے کیمسٹری کی ایک کتاب انگریزی سے ترجمہ کی۔ ریورنڈ چارلس (۱۸۱۸ء) کا انگریزی میں مختلف علوم پر چھ رسالوں کا ایک سلسلہ تھا، نواب شمس الامراء کے اہتمام سے ۱۲۵۳ھ میں میر امان دہلوی، مولوی غلام محی الدین دہلوی، مسٹر جونس (انگریز) اور موسیو ٹنڈوسی (فرنچ) نے پورے سلسلہ کا اردو میں ترجمہ کیا، اور رسالہ شمسیہ

اس کا نام رکھا، اس سلسلہ کا تاریخی نام "تالیف نواب شمس الامرا" قرار پایا، یہ سلسلہ چھوٹی تقطیع کی چھ جلدوں میں حسب ذیل علوم پر منقسم ہے،

جلد اوّل، جرثقیل، ہیولی، اس کے انقسامات، کشش، انجماد، کشش ثقل، مرکز ثقل، کلیات حرکت جلد دوم، علم ہئیت جلد سوم علم آب، جلد چہارم علم ہوا، جلد پنجم علم الانظار، جلد ششم علم دوربین،

مقدمہ میں تصریح کی ہے، کہ قدیم اصطلاحات جہاں نہیں مل سکے ہیں، اپنی طرف سے فارسی وعربی اصطلاحات وضع کیے گیے ہیں، اور بدرجۂ مجبوری انگریزی اصطلاحات باقی رکھے گیے ہیں،

کلکتہ | کلکتہ برطانوی قوت کے نشوونما کا پرورش گاہ تھا، عموماً جو انگریز یہاں آتے تھے، وہ اردو فارسی اکثر لازمی طور سے سیکھتے تھے، جس ملک پر ان کو حکومت کرنی تھی، وہ جدید علم وآداب سے بے خبر تھا، اس بنا پر ان کو ضرورت پیش آئی کہ کلکتہ میں اس قسم کے علما مجتمع کیے جائیں، جو اس ضرورت کو پورا کرسکیں، دلی کے بعض شعرا اور نثر نویسوں سے جس طرح اردو کے مختلف قصے لکھوائے گئے، عربی وفارسی زبانوں کے ماہرین سے بھی اسی قسم کے کام لیے گئے،

سب سے پہلے تو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کا ذکر کرنا ہے جس کے ذریعہ سے ملک میں قدیم عربی اور فارسی تصنیفات کا ذوق پیدا ہو، ایک چیز جس کی تاسیس کے ہم مدت سے مشتاق ہیں، لیکن میسر نہیں آتی، وہ باسانی قائم ہوسکی، یعنی ایک مجلس اشاعۃ العلوم مولانا محمد وجیہ، مولوی سید کرامت حسین جونپوری، مولوی کبیر الدین احمد وغیرہ اس کے نہتم وممبر تھے، ان کے علاوہ تقریباً ۹۰ آدمی گورنمنٹ عہدہ دار، زمیندار، تجار

اور علماء اس کے ارکان اور ارباب اعانت تھے، مطبع منظر العجائب سے مختلف کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں،

مولوی سید کرامت حسین، جونپور کے باشندہ اور امام باڑہ ہگلی کے متولی تھے، مولوی صاحب ممدوح نے جدید علوم کی کامل واقفیت حاصل کی، اور یہ کہنا بلا مبالغہ صحیح ہے کہ اردو زبان میں جدید علم کلام کے بانی اور واضع اول ہونے کا فخر ان ہی کو حاصل ہے، ان کی ایک نہایت قابل قدر تصنیف مآخذ علوم ہے، دوسری تصنیف اسی کا ضمیمہ ہے، ضمیمہ کے خاتمہ میں مولوی صاحب لکھتے ہیں،

"بہت برس ہوئے کہ حکمائے فرنگ نے واقعی وحقیقی طبیعی وریاضی کے علموں کو تجربیات ومشاہدات پر رکھا ہے، نظریات کو تابع مشاہدات وتجربیات کیا، حقیقت کی دریافت کے لیے یہ بہت اچھا طریقہ ہے، اور پڑھنے والے آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں، مگر اس کے واسطے بڑے کارخانے اور قیمتی قیمتی بہت اسباب والات چاہیے اور طلاب علم استطاعت وبضاعت نہیں رکھتے، اگر امراء ان کی تائید فرمائیں، جیسے امراے فرنگ ہر طرح سے مدد فرماتے ہیں، تو دے سب علموں میں پورے نکلیں گے،

آگے چل کر وہ ایک دار الاشاعہ قائم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، لکھتے ہیں،

توطالب العلم فی الجملہ استطاعت رکھتا ہو، اس زبان (انگریزی) کو سیکھ کے علم حاصل کرکے اپنی زبانوں میں ترجمہ کرکے چھپوا کے مشتہر کرے، اور سر دست جو لوگ اشاعت علوم کا دم بھرتے ہیں، ان کو چاہیے کہ طبعی وریاضی کی کتابوں کو جو عربی وفارسی وہندی (اردو) میں ترجمہ ہو کر چھپی ہیں، ان کے مالکوں سے

اذن دے کے اگر ضروری ہو نئے سرے سے چھپوا کے مشتہر کریں، مثلاً ہیئت میں رسالہ مفتاح الافلاک مع نقشہ اردو میں اگرچہ چھاپیں سوال و جواب کی صورت کو بدل دیں، تو بہت ہی مختصر ہوگا، خصوصاً کتاب حدائق النجوم فارسی میں مولفہ راجہ رتن سنگھ علیہ الرحمہ، کی بہت ہی مفید ہے، اس مرحوم نے انگریزی زبان سیکھ کے علم حاصل کیا، اور عربی میں استعداد کامل رکھتا تھا۔"

ان فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید علوم پر کچھ اور کتابیں بھی ترتیب پائی تھیں، آخر میں ہم ایک اور کتاب کا ذکر کرتے ہیں، جن کا نام جامع بہادر خانی ہے، یہ فارسی زبان میں فل اسکیپ سائز پر ۷۰۴ صفحہ کی ایک ضخیم کتاب ہے، اور ریاضیات کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، یہ ۱۸۳۳ء میں یہ کتاب اختتام کو پہنچی ہے، اور کلکتہ کے مطابع میں خود مصنف کے اہتمام سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، مصنف کا نام غلام حسین جونپوری ہے، مصنف نے اختتام الدولہ مبارز الملک راجہ خان بہادر خان نصرت جنگ خلف مہاراجہ مزجیت سنگھ بہادر کے دربار میں یہ کتاب لکھ کر پیش کی تھی، بہادر خان غالباً ٹکاری کا راجہ تھا، جو صوبہ بہار میں اب تک ایک ہندو ریاست ہے،

کتاب پانچ خزینوں پر منقسم ہے، خزینۂ اول در علم ہندسہ، خزینۂ دوم در علم ابصار، خزینۂ سوم در علم حساب، خزینۂ چہارم در منتخبات فنون ثلثہ، مقدمۂ خزینۂ پنجم در علم ہیئت، اجرام علویہ و بسائط سفلیہ خزینۂ ششم در تبیین موامرات زیچ و تقویم

یہ کتاب درحقیقت جدید و قدیم فنون ریاضی پر ایک بسیط محاکمہ ہے، اور اس قدر محقق ہے کہ اس کا ایک صفحہ بھی استناد سے گرنے

نہیں پایا، حکماے فرنگ کی تحقیقات سے اس قدر واقف ہے کہ شاید آج بھی کوئی مسلمان اس سے بہتر جاننے کا دعوی نہیں کرسکتا، یہ کوششیں گو اس راہ میں نہایت خفیف تھیں، لیکن انگریزی تعلیم کی پنجاہ سالہ اشاعت کے بعد بھی اس سے بہتر ہم کچھ نہ کرسکے،

(معارف فروری ۱۹۱۷ء)

رومن کیتھولک تاریخ کی چند من گھڑت کہانیاں

بنگال سنتے ہیں کہ مسلمانوں کا صوبہ ہے، مگر وہاں کی تعلیم گاہوں سے وقتاً فوقتاً مسلمان اور تاریخِ اسلام کے متعلق ایسی ہنگامہ خیز اطلاعیں آتی ہیں کہ ہم کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ واقعی بنگال میں مسلمانوں کی کوئی قوت ہے بھی یا نہیں،

ابھی اکبر کی دین الٰہی والی کتاب کا ہنگامہ فرو نہیں ہوا تھا کہ معلوم ہوا کہ کلکتہ کے ایک مشنری کالج (سینٹ زویر کالج) کے ہائی اسکول سکشن میں ایک کتاب "کیتھولک چرچ ہسٹری" طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہے، جس میں ایک باب اسلام کے سخت خلاف ہے، کتاب مذکور کے اس باب کا خلاصہ میں نے پڑھا، تعجب ہوا، کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو مذہبی رواداری ہی کے خلاف نہیں، بلکہ علم اور واقفیت کے بھی خلاف ہے، عیسائیوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیا ہے کہ انھوں نے تلوار کے زور سے اپنے مذہب کو پھیلایا ہے، یہ واقعہ صحیح ہو، یا غلط، مگر بہرحال انھوں نے جھوٹ اور فریب سے اپنے مذہب کو کبھی نہ پھیلایا، جیسا کہ اس زمانہ کی مشنریوں کی تبلیغی کوششوں میں نظر آتا ہے، اس کتاب کے اس باب کا حاصل بھی یہی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلایا ہے، ممکن ہے بعض صورتوں میں یہ واقعہ صحیح ہو، جس طرح جرمنی کے باب میں یہ واقعہ صحیح ہے کہ وہاں عیسائیت تلوار کی نوک سے

پھیلائی گئی ہے،

اس باب میں پیغمبر اسلام علیہ السلام اور خلفا کے بھی مختصر واقعات ہیں، دنیا اس کتاب کے مصنف کی اس تحقیق کو سن کر حیران رہ جائے گی، کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدۂ ماجدہ یہودیہ تھیں، حضرت آمنہ بنت وہب کو جو قریش کی سیدہ تھیں، یہودی نسل یا مذہب بتانا ایک ایسا جھوٹ ہے، جس کی مثال مشکل سے مل سکے گی

۲۔ اس کتاب کا یہ بیان کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے تیسویں سال میں نبوت کا دعوی کیا، مشنری جہالت کا آئینہ ہے، دنیا جانتی ہے، کہ حضور کی نبوت اس کے دس برس بعد کا واقعہ ہے، جب عمر شریف چالیس سال کی تھی، اور شباب کا عہد اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا،

۳۔ آپ کی ولادت کا سال سنہ ۵۸۰ء[1] بتا کر ہجرت کا سال سنہ ۶۲۲ء بتانا بھی تاریخ کا خون کرنا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہجرت کا واقعہ آپ کی عمر کے بیالیسویں سال میں آیا، حالانکہ آپ کی عمر اس واقعہ کے وقت باتفاق عام ۵۳ سال کی تھی، کیونکہ چالیسویں سال آپ کو نبوت ملی، اور اس کے بعد تیرہ سال مکہ میں رہ کر، قریش کے ہر قسم کے ظلم وستم سہے، تب مدینہ کو ہجرت فرمائی، اور اس کتاب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ملنے کے بعد جب بت پرستی کے خلاف آپ نے وعظ شروع کیا، تو بت پرست قریشیوں کے غیظ وغضب کو دیکھ کر آپ فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ چل دیئے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے،

[1] ولادت کی صحیح تاریخ اپریل ۵۷۱ء ہے اور ہجرت کی ستمبر ۶۲۲ء ہے، "س"

۴۔ مصنف کا یہ بیان بھی تحقیق سے خالی ہے کہ قرآن پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی وفات کے بعد جمع کیا گیا، کوئی کتاب جس کی سطرین یکجا اور آیات مرتب نہ ہوں، نہ پڑھنے میں آسکتی ہے، اور نہ اُس کی تلاوت کیجا سکتی ہے، حالانکہ ہر ایک کو معلوم ہے، کہ قرآن پاک کا ہر حصّہ اس وقت بھی ہر مسلمان نماز میں پڑھتا تھا، اور ہر روز اس کی تلاوت کرتا تھا، ہان یہ صحیح ہے کہ کاغذ پر اس کی تمام آیتیں اور سورتیں یکجا ترتیب کے ساتھ بشکل کتاب حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں لکھی گئیں،

۵۔ اس کتاب کا بیان ہے کہ جب آپ سے درخواست کی جاتی تھی کہ آپ کوئی ما فوق الفطرۃ نشانات اپنے دعوی کی تائید میں پیش کریں، تو آپ جواب دیتے کہ "مجھے اللہ تعالے نے معجزات دکھانے کے لیے نہین بھیجا ہے بلکہ دعوت دینے اور لڑنے کے لیے بھیجا ہے" اس بیان کی صداقت کے لیے مصنف نے قرآن کی سورہ ۱۳ آیہ ۷، کا حوالہ دیا ہے، میرا چیلنج ہے، کہ اس معنی کی کوئی آیت قرآن پاک میں نہیں ہے، قرآن کی تیرھویں سورہ رعد ہے، اور اس کی جس تیرھویں آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ شاید حسب ذیل ہے،

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ	اور کافر کہتے ہیں، کہ اس پر اسکے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہین اتری (اے محمد) آپ تو خبردار کرنے والے ہیں، اور ہر قوم کیلئے ایک رہنما ہے،

اس آیت میں کوئی لفظ ایسا نہین، جو معجزہ نہ دکھانے کے واقعہ کو ظاہر کرے اور یہ کہے کہ آپ "لڑنے" کو بھیجے گئے ہیں، خیال ہوتا ہے کہ شاید قرآن پاک کے

کسی ترجمہ میں منذر کا ترجمہ خبردار اور ہشیار کرنے والے کے بجاے ڈرانے والا یا ڈر سنانے والا کیا گیا ہے، اور اس سے لڑنے کا مفہوم حاصل کیا گیا ہے، ایسے لوگوں کی اطلاع کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ منذر عربی زبان مین وقت سے پہلے آنے والی مصیبت کو بیان کرکے اوس سے بچنے کی تدبیر کے لیے تیار کرنے والے کو کہتے ہیں، جیسے ڈاکٹر کسی مریض کو دیکھ کر آیندہ خطرات سے اس کو ہشیار اور متنبہ کرے، کہ اگر اپنی حالت کی درستی کے لیے کوشش نہ کروگے، تو تم کو فلان فلاں بیماریاں لاحق ہو جائیں گی، اس انذار کو جنگ اور لڑائی سے کوئی تعلق نہین، یہ تنبیہ اس عذاب الٰہی کے مقابلہ میں ہے، جو دوسری دنیا میں اسلام کے پیغام کے نہ ماننے اور اس پر عمل نہ کرنے سے پیش آنے والا ہے، قرآن کی بہت سی آیتوں میں یہ لفظ آیا ہے، اور ان ہی معنوں میں آیا ہے، جیسے سورۂ زمر میں ہے، فرشتے قیامت میں کہیں گے،

اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (زمر - ۸)	کیا تمھارے پاس تمھارے میں سے رسول تم کو تمھارے پروردگار کے حکم کو پڑھ کر سنانے اور اس تمھارے دن کی ملاقات سے ڈرانے والے اور ہشیار کرنے نہین آئے

کیا قیامت کا میدان لڑائی کا میدان ہے، دوسری جگہ ہے،

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا (نازعات ۲)	آپ اسکو ڈرا سنانے والے ہیں، جو قیامت سے ڈرتا ہے،

دیکھیے اس میں ٹھیک وہی لفظ منذر ہے جو پہلی آیت میں ہے،

سورہ یٰسین میں ہے،

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ	اور برابر ہے ان کے لیے ان کو
أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا	ہشیار کریا نہ کر وہ ایمان نہیں لائیں گے
يُؤْمِنُونَ إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ	تم اسی کو ہشیار کر سکتے ہو،
اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَٰنَ	جو نصیحت کی پیروی کرتا، اور بن
بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ	دیکھے رحمت والے خدا سے ڈرتا
وَأَجْرٍ كَرِيمٍ	ہے، تو اس کو گناہوں کی معافی
(یٰسین - ۱)	اور نیک، مزدوری کی خوشخبری سنادے،

کیا یہ "انذار" اعلان جنگ ہے، اور کیا اسی کو اعلان جنگ ہے، جو نصیحت کو ماننا اور اللہ تعالے سے ڈرتا ہے، یہ کیسا حماقت کا خیال ہے،

قرآن کہتا ہے،

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا	اور (دنیا کی) کوئی قوم ایسی نہیں
فِيهَا نَذِيرٌ	جس میں ایک ڈر سنانے والا
(فاطر - ۱۰)	نہیں آیا،

کیا ہر قوم میں آنے والا اور ہشیار کرنے والا پیغمبر ہے، جو قوموں کو ان کے اعمال بد کی پاداش سے ہشیار اور باخبر کر کے ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرتا ہے، یا وہ جنگ کا الٹی میٹم دینے والا ہوتا ہے، ایک اور آیت ہے،

انما انت منذر من یخشاها	اے پیغمبر! تم کو اس کو جو قیامت سے

ڈرتا ہو، ہشیار کرنے والے ہو، (نازعات - ۲)

یہاں صاف تصریح ہے، کہ عربی میں لفظ انذار کا مفہوم ہشیار و باخبر کرنا اور عملِ بد کی پاداش سے متنبہ کرنا ہے، نہ کہ لڑائی اور جنگ جوئی،

اب یہ کہنا ہے کہ اس آیت میں بے شبہہ عجائب و غرائب اور خوارقِ عادات کے مانگنے والے کو خوارق اور معجزات کے بجائے اسلام کی تعلیم و ہدایت کی صداقت میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور عجائب پرستی کو عامیانہ جذبہ کے بجائے عقل و خرد کو کام میں لانے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، مگر اس سے اس کا انکار نہیں نکلتا، کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ معجزات دکھانے سے انکار کیا ہے۔ قرآن خود معجزہ ہے اور اس میں متعدد معجزوں کا بیان مذکور ہے، جن میں ایک شق القمر کا معجزہ بھی ہے، جو سورۂ قمر میں ہے، اسی طرح بدر اور خندق کے معجزوں اور روم کی فتح کی پیشین گوئی کا ذکر بھی ہے،

اس آیت میں معجزوں کے دکھانے سے جو پہلوتہی ظاہر کی گئی ہے، اس کے وہی معنی ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ان فقروں کے ہیں، جن میں معجزوں کے دکھانے سے انھوں نے انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ "اس قوم کو یونس کے معجزہ کے سوا اب کوئی اور معجزہ نہیں دکھایا جائے گا" تفصیل منظور ہو تو میری کتاب سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں اس کو پڑھیں،

اتفاق[1] سے انجیل کا ایک نسخہ اس وقت مل گیا ہے، اس سے یہ دو درس بالفعل نقل کر دیئے جاتے ہیں،

---

[1] یہ مضمون بحالت سفر لکھا گیا ہے،

اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں، اس نے جواب دے کر ان سے کہا اس زمانہ کے برے اور زناکار لوگ نشان چاہتے ہیں مگر یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا، (متی ۱۲-۹)

مرقس میں ہے،

پھر فریسی نکل کر اوس سے بحث کرنے لگے، اور آزمانے کے لیے اوس سے کوئی آسمانی نشان طلب کیا، اوس نے اپنی روح میں آہ کھینچ کر کہا، اوس زمانہ کے لوگ کیوں نشانی طلب کرتے ہیں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا، اور وہ ان کو چھوڑ کر پھر کشتی میں بیٹھ گیا، (۸-۱۱)

اس انجیل میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں سے بھری ہوتی ہے، آزمائشی اور فرمائشی معجزوں کے جواب میں انکار کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ انبیا علیہم السلام سے تائیدی معجزے گو بکثرت ہوتے ہیں، مگر تحدی معجزہ کے دکھانے سے وہ انکار کرتے ہیں، کہ قانون الٰہی کے مطابق ایسے معجزوں کے ظہور کے بعد نافرمان امت کی ہلاکت یقینی ہے، اس لیے وقت مقرر سے پہلے یہ فرمایش پوری نہیں کیجا سکتی، "ٹال دی جاتی ہے"، کیا عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس انکار کی توجیہ اس سے بہتر کر سکتے ہیں،

کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب میں آخرت کو صرف مادی شکل میں پیش کیا گیا ہے، اور اس کے روحانی تخیل سے خالی ہے، یہ بھی معترض کی بے خبری ہے، اول تو یہ عرض ہے کہ کیا انجیل میں قیامت کے بعد جنت میں اپنے ساتھیوں کے پہلو میں افشردۂ انگور خواہ وہ شربت ہو، یا شراب، پینے کا ذکر نہیں، (متی ۲۶-۲۹)

اور کیا "دوزخ کی آگ" کا منظر انجیل میں جابجا نہیں دکھایا گیا ہے (لوقا ۱۲-۵ و ۱۶-۲۴ متی ۲۳-۳۳)

تفصیل منظور ہو تو میری کتاب سیرۃ نبوی کی چوتھی جلد میں دوزخ اور جنت کا بیان پڑھیں، اس میں بائبل کے اکثر حوالے لکھے ہیں، جن کو روشن خیال عیسائی چھپاتے ہیں جہنم کے عذاب کا ذکر (متی ۲۳-۳۳) میں ہے،

فریسی یہودی جو قیامت کو مانتے تھے، وہ جنت و دوزخ کو سراسر مادی اور عیسائی اس کو سراسر روحانی فرشتوں کی سی زندگی بتاتے ہیں، اسلام میں جنت و دوزخ کے تصور میں مادی و روحانی دونوں منظروں کی جامعیت ہے بہشت باغ و بہار بھی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی اور دیدار کے روح پرور جمال کا نظارہ گاہ بھی، جیسا کہ قرآن کہتا ہے،

ورضوان من اللہ اکبر	اور اللہ کی خوشنودی آخرت کی
(توبہ - ۹)	سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے،

(تفصیل میری مذکورۂ بالا کتاب کی چوتھی جلد میں ہے)

زیر اعتراض باب کا آخری حصہ اس بیان میں ہے کہ اسلام کی اشاعت صرف تلوار کے زور سے ہوئی ہے، یہ بالکل ٹھیک ہے، انہی معنوں میں جن معنوں میں آج بھی عیسائی یورپ، اپنی عیسائی تہذیب کی اشاعت توپ و تفنگ اور ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کے ذریعہ سے کر رہا ہے، جس کے زیر سایہ عیسائی سامان عیش و مسرت اور مشنری صلح پسندوں کا غول ملکوں میں داخل ہوتا ہے، اور ان پڑھ جنگلیوں کو بے خبری کی حالت میں عیسائی بناتا ہے، افریقہ کے نگرو اگر عیسائیت کے بجائے اسلام کو قبول کرتے ہیں، تو اس سے ہمارے عیسائی دوستوں کو فکر مند ہونے کی کیا بات ہے،

اسلام کی تلوار ابی سینیا میں کبھی نہیں چمکی، پھر وہاں مسلمانوں کی تعداد کہاں سے آئی، جزائر ملایا و سیام میں کبھی اسلام نے کوئی لشکر نہیں بھیجا، پھر یہ کروروں مسلمان ان جزیروں میں کہاں سے آباد ہو گئے، فلپائن اور مدگاسکر وغیرہ جزیروں میں اسلام کس کشور کشا جلاد کے خوف کا نتیجہ ہے، چین میں مسلمانوں کی حکومت کبھی نہیں ہوئی، پھر وہاں کروروں مسلمان کس تلوار کے زور سے مسلمان بنائے گئے، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ان کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی تین چار کرور سے زیادہ نہ تھی، جیسا کہ پہلی مردم شماری میں درج ہے، مگر سو برس کے عرصہ میں ان کا بے تلوار کے دس کرور کے قریب ہو جانا کس مادی ہیبت کا نتیجہ ہے، پھر آج یورپ کے مختلف ملکوں اور گوشوں میں اسلام کی نمو داری جب کہ اس کی ہر تلوار زنگ آلود ہو چکی ہے، کس اعجاز کا کرشمہ ہے، افریقہ کے ریگستان کے ہر ٹکڑے میں آج عیسائیت تلوار کے زور سے قائم ہے، تاہم روحانی مفتوحوں کی بڑی تعداد عیسائیت کے بجائے اسلام کے آغوش میں آتی ہے، کیونکہ اسلام افریقہ کو ایمان کی تازگی کے ساتھ حکومت کی آزادی بھی بخشتا ہے، لیکن عیسائیت تثلیث کی بت پرستی کے ساتھ یورپ کا غلام بناتی ہے، رومن کیتھولک چرچ کی تاریخ میں یہ بھی لکھا تھا کہ رومن کیتھولک چرچ انسانوں کو پوپوں کا معتقد بنایا کرتا تھا، اسلام نے آکر انسانوں کو صرف ایک خدا کا معتقد بنایا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہودیوں نے حضرت مریم صدیقہؑ پر جو اخلاقی تہمت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو الزامات لگائے تھے، اسلام ہی ہے، جس نے ان معصوموں کی عصمت کی گواہی دیکر، کروروں بندگانِ خدا کے

دلوں میں ان کی سچائی اور صداقت کا سکہ بٹھایا، اور عیسائیوں نے ان کو انسانوں کے بجائے جو دیوتا کی شکل عطا کی تھی، اس کو مٹا کر مقدس انسانوں اور محبوب بندگان الٰہی کی صورت میں جلوہ گر کیا،

مصنف کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تیغ زن سپاہیوں سے بڑی شکایت ہے لیکن کارلائل کی زبان میں پوچھا جا سکتا ہے کہ ان تیغ زن سپاہیوں کو تو تنہا کس تلوار کے زور سے مسلمان بنایا، ایسے تیغ زن سپاہیوں اور بہادروں کو جن میں سے کسی نے ایران کا تخت الٹ دیا، کسی نے قیصر سے مصر و شام اور شمالی افریقہ کا علاقہ چھین لیا۔ اور کسی نے خراسان و ترکستان کی سرزمینوں کو روند ڈالا،

مشنریوں نے اسلام کے خلاف جو یہ خیال پھیلا رکھا ہے، کہ وہ کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ وہ صرف عیسوی اور یہودی مذہب کا مجموعہ ہے، کوئی نیا اعتراض نہیں یہ تو پیغمبر اسلام کے عہد میں بھی کفار نے کہا تھا،

لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے، کہ بجائے خود اسلام کا دعویٰ بھی یہی ہے، کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو کچھ انبیا علیہم السلام سے کہا گیا تھا، اور جس کو ان کے پیرووں نے بھلا دیا تھا، اسلام کے ذریعہ سے وہی پیغام پھر دنیا میں بھیجا گیا، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے معترضوں سے یہ کہا تھا، کہ میں تورات کے قانون کو مٹانے کے لیے نہیں، بلکہ اس کو پورا کرنے کے لیے آیا ہوں، اور جب تک دنیا قائم ہے، تورات کا ایک نقطہ نہیں بدل سکتا، اسی طرح قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ تورات اور انجیل کا مصدق

مصدقا لما بین یدیہ (بقرہ ۱۰۵) اگلی کتابوں کو سچا بتانے والا،

اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ دینِ الٰہی ایک ہی ہے، جو آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یکساں پیغمبروں کے ذریعہ بھیجا جاتا رہا، اور قرآنِ پاک میں جو کچھ ہے، وہی اگلی کتابوں میں بھی تھا، چنانچہ وہ اپنی نسبت آپ گواہی دیتا ہے،

تورات اور انجیل کے ذکر کے بعد ہے،

وانزلنا الیک الکتاب	اور ہم نے تیری طرف قرآن اتارا،
بالحق مصدقا لما بین یدیہ	حق کے ساتھ جو اپنے سے پہلے کی کتابوں
من الکتاب ومھیمنا علیہ	کی تصدیق کرتا ہے اور ان کتابوں
(مائدہ ۸-۷)	پر مہیمن ہے،

لفظ مہیمن کا ترجمہ محافظ، مشتمل، اور جامع بھی کیا گیا ہے،

سورۂ شعراء میں ہے۔

وانہ لفی زبر الاولین	اور یہ مضمون (جو قرآن میں ہے)
	اگلوں کی کتابوں میں (بھی) ہے،

ایک سورہ میں ہے،

ان ھذا لفی الصحف	یہ مضمون اگلے صحیفوں میں ہے اور
الاولیٰ صحف ابراھیم و	ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں
موسیٰ (اعلیٰ-۲)	

سورۂ شوریٰ میں ہے،

شرع لکم من الدین	اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر
ما وصی بہ نوحا والذی	کیا، جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا،

اوحینا الیک وما وصّینا بہ	اور جس کو ہم نے تمھارے پاس
ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ	وحی کیا، اور جس کا ہم نے ابراہیم اور
(شوریٰ - ۲)	عیسیٰ کو حکم دیا تھا،

اب جس بات کا قرآن خود دعویٰ کر رہا ہو، اور جو اوس کے متفقہ اور متحدہ صداقت کی دلیل ہے، اوس کو اعتراض کے موقع پر پیش کرنا کہاں تک صحیح ہے، اسلام کا عقیدہ یہی ہے، کہ تمام انبیاءؑ ایک ہی دعوت، ایک ہی تعلیم، اور ایک ہی شریعت لیکر آئے۔ مگر ان کے متبعوں نے اس کو کھو دیا، اور بگاڑ دیا، اب وہی چیز قرآن کے قالب میں آخری بار آئی ہے، اب اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے "وانا لہ لحافظون"

اب جہانتک عقائد حقہ، تعلیمات صحیحہ اور انبیاء کے صحیح واقعات وقصص کا تعلق ہے، قرآن پاک اور توراۃ اور انجیل کی یکسانی بالکل کھلی بات ہے، لیکن جہاں ان کتابوں کی تحریفات اور انسانی آمیزشوں کا تعلق ہے، قرآن سب سے الگ اور ان سب سے ممتاز ہے، تثلیث کا عقیدہ اور ان عقائد کے ذکر سے جن کو پالوس نے دین عیسوی میں شامل کیا ہے، قرآن پاک بری ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے قصوں کے ان عناصر کی جو توراۃ میں بری طرح آج مذکور ہیں قرآن نے علانیہ تردید کی ہے، اور انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو دنیا میں دوبارہ ظاہر کیا ہے، اگر قرآن موجودہ انجیل اور موجودہ توراۃ کا مجموعہ ہوتا، تو یہ امتیاز کیوں نظر آتا۔

مقصود یہ ہے کہ خدا، انبیاء، قیامت، جزا و سزا اور قصص انبیاء کی حد تک قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کا اتحاد، قرآن پاک کی صداقت کی دلیل ہے،

نہ کہ بطلان کی، کہ یہ سب چشمے ایک ہی ربانی سرچشمہ سے نکلے ہیں،

اور اگر مقصود یہ ہے کہ اگلی کتابوں کی کوئی بات پچھلی کتاب میں دہرائی نہ جائے تو اس نقص سے عیسائیوں کی موجودہ انجیل بھی خالی نہیں، وہ بھی یہودی کتب واسفار کے اقوال کی تکرار سے معمور ہے، حضرت عیسیٰؑ کا آخری فقرہ ایلی ایلی لما سبقتنی، (مرقس ۱۵-۳۴، متی ۲۷-۴۶) زبور ۲۲ میں مذکور ہے، اور حضرت داؤدؑ کی دعا کا ٹکڑا ہے، خدا کے باپ اور حضرت عیسیٰؑ کے بیٹے ہونے کا دعوی بھی زبور ۱-۷ کی نقل ہے، جس میں حضرت داؤد نے خدا کو مجازاً باپ اور اپنے کو بیٹا کہا ہے، انجیل کی بہت سی جو بصورت تمثیلیں بھی عہد قدیم کے صحیفوں میں ملتی ہیں، اور ان کے علاوہ مصری اور یونانی میتھالوجی بلکہ بودھ تک کے فقرے بھی موجودہ انجیل کے نسخوں میں مذکور ہیں، مصر کے ایک فاضل نے التطبیق بین الدیانۃ الوثنیہ والدیانۃ المسیحیہ میں ان سب کو پوری تفصیل سے جمع کر دیا ہے،

(معارف ماہ اگست ۱۹۴۵ء)

مرزا بیدلؔ کیا عظیم آبادی نہ تھے؟

مرزا عبدالقادر بیدل ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۱۳۳ھ میں دلی میں وفات پائی، ان کو طاہر نصرآبادی نے اپنے تذکرہ میں جس کو اس نے ۱۰۹۳ھ میں بیدل کی زندگی میں ایران میں بیٹھ کر ترتیب دیا، لاہوری لکھا ہے،

بندرابن خوش گو جس نے بیدلؔ سے ان کی آخر زندگی میں دلی میں بارہا ملاقاتیں کی ہیں، ان کو "اکبرآبادی الوطن" لکھا ہے، میر غلام علی آزاد نے جو بیدلؔ کی وفات کے وقت ۱۷ برس کے تھے۔ اور جن کے سامنے خوشگو کا بیان موجود تھا[۱]، اپنے تینوں تذکروں یدبیضا، سروآزاد، دور خزانہ عامرہ، میں ان کی جائے پیدائش تصریح کے ساتھ پٹنہ عظیم آباد لکھی ہے، سب سے عجیب بیان مجموعۂ نغز کے مصنف پر قدرت اللہ قاسم کا ہے، جس نے اپنا تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں ختم کیا ہے، اس نے بیدل کو بخاری المولد بتایا ہے، علی قلی ہدایت نے جس کا تذکرہ ریاض العارفین ۱۲۶۰ھ میں ترتیب پایا ہے، ان کو دہلوی لکھا ہے،

ان بیانات پر نظر ڈالنے سے بیدلؔ کے مولد و منشا کی تعیین میں بڑا اختلاف

---

[۱] اورنٹیل لائبریری پٹنہ میں سفینۂ خوش گو کا جو نسخہ ہے، وہ آزاد بلگرامی کی ملک میں رہ چکا ہے، اس پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔

نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیدل اپنی زندگی کے مختلف حصوں میں مختلف شہروں میں اقامت پذیر رہے، اس لیے ہر ایک نے ایک مقام کی طرف انھیں منسوب کر دیا، بخاری المولد کا کہنا البتہ صحیح نہیں ہے کہ وہ ان کے آباء واجداد کا مولد ہو تو، مگر ان کا تو قطعاً نہیں نصرابادی کے اس بیان کی کہ بیدل لاہوری تھے، خوش گو نے اپنے سفینہ میں اسی زمانہ میں تردید کر دی تھی، لیکن خود خوش گو کا یہ بیان کہ بیدل اکبرابادی الوطن تھے، اس تصریح سے خالی ہے، کہ اکبرآباد ان کی جائے پیدائش بھی تھی، ہو سکتا ہے کہ ان بزرگوں نے ترکستان چھوڑنے کے بعد اکبرآباد کو وطن بنایا ہو، لیکن پیدائش وہاں نہیں ہوئی ہے، کیونکہ ہر موطن کا مولد ہونا ضروری نہیں ہے، ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ بیدل کا مولد و منشا صوبہ بہار تھا، جس کا دار الحکومت عظیم آباد پٹنہ تھا، اور یہ اس دعوی کی شہادت میں اولاً میر غلام علی آزاد جیسے محقق کا بیان ہے، جس نے تین تین جگہ اس کی تصریح کی ہے، ثانیاً خود بیدل کے اشارات ہیں جن سے قیاس میں یہی آتا ہے کہ اون کا مولد و منشا یا کم از کم ان کی طفولیت اور آغاز شباب کا زمانہ بہار ہی میں گذرا ہے، چنانچہ میر غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں:-

"اصلش از قوم ارلاس[1] در بلدۂ پٹنہ متولد شد بہ ہندوستان نشو و نما یافت"

سرو آزاد میں ہے،

"از نژاد او قوم ارلاس است، در بلدۂ عظیم آباد پٹنہ از نہاں خانۂ عدم بشہرستان وجود خرامید و در ہندوستان نشو و نما یافت"

خزانۂ عامرہ کی عبارت یہ ہے،

---

[1] ایک ترک قبیلہ،

"اصلش از گروه ارلاس در بلدهٔ عظیم آباد پٹنہ از شبستان عدم بہ صبح کدهٔ ہستی
در رسید و در بلاد ہندوستان نشو و نما یافت و در بنگالہ بیشتر بسر می کرد"

عبد الوہاب افتخار نے بھی اپنے تذکرہ بے نظیر میں اپنے استاد آزاد کی تقلید میں ان کو عظیم آبادی کہا ہے،

. . . . . بیدل کی کچھ جوانی کا اور بڑھاپے کا بڑا حصہ دہلی میں گذرا اور وہیں وفات بھی پائی، اس لیے اگر کسی نے انھیں دہلوی کہا تو اعتراض کا موقع نہیں ہے، بیدل بطریق سیاحت لاہور بھی جاتے رہے ہوں، جیسا کہ بابا حسن ابدال ان کا جانا خود چہار عنصر میں ہے، جس کے راستہ میں لاہور پڑتا ہے، لاہور کا آخری سفر اپنی وفات سے دو سال پہلے کیا تھا، ۱۱۳۱ھ میں جب سادات بارہہ نے فرخ سیر کے ساتھ زیادتی کی، تو بیدل نے اس کی تاریخ "سادات بوے نمک حرامی کردند" کہی، اور اس کی شہرت ہوئی، تو بیدل نے دہلی سے بھاگ کر لاہور عبد الصمد خاں ناظم لاہور کے یہاں پناہ لی، اور سال دو سال کے فتنہ کے فرو ہونے کے بعد پھر دہلی لوٹ آئے، اور وہیں ۱۱۳۳ھ میں وفات پاکر، اپنے گھر کے صحن میں مدفون ہوئے، اس بنا پر اگر ایران میں ان کے قیام لاہور کی خبر پہنچی، اور وہاں کسی نے ان کو لاہوری لکھدیا، تو مغالطہ ہو سکتا تھا،

ایک ورق قبل

اصل اختلاف بیان خوش گو اور میر غلام علی آزاد کے درمیان ہے اور دونوں مصنفوں کا زمانہ بھی قریب ہے، یعنی بیدل کی وفات کے وقت خوش گو ادھیڑ ہوں گے تو آزاد نوخیز، اس لیے ان دونوں کے بیانات میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ یہ مان لیا جائے، کہ خوش گو کے بیان کے مطابق بیدل اکبرآبادی الوطن اور آزاد کے بیان کے مطابق عظیم آبادی المولد تھے،

یہ بات کہ پٹنہ اُن کی جائے پیدائش تھی، یا نہ تھی، خواہ مشتبہ ہی ہو، لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں، کہ انھوں نے اپنا ایک اچھا خاصہ زمانہ پورب کے شہروں اور قصبوں میں گذارا، چنانچہ معتبر راوی خوش گو اپنے سفینہ میں رقم طراز ہے:-

پس آنحضرت بطریق سیاحی رو بہ مشرق نہاد، عزیمت فرمودہ مدتے درحدود ممالکِ بنگ[1] و بہار و اڑیسہ بآزادگی و بے تعینی بسر بردہ و دشت دبیاباں پیمودہ عجائب قدرتِ الٰہی تماشا نمودہ اکثر از خصوصیات آں ہنگام در چہار عنصر نگاشتہ قلم راست رقم اوست وہم دراں ایام بسیارے نعمت درویشی نیز نصیب او گردید از انجا بتکلیف پیر کامگار بہ ہندوستان رسیدہ چندے بہ بلدۂ اکبر اباد اقامت ورزید وباز بدار الخلافہ شاہجہان اباد رسیدہ کنج عزلت گزید"

خوش گو کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ بیدل ایک مدت تک پورب میں رہے، اس لیے ان کا عظیم آبادی مشتہر ہونا بے اصل نہیں ہے، اب ہم اون کی کتاب چہار عنصر سے ان شہروں کا پتہ لگاتے ہیں، جہاں جہاں اون کا قیام رہا یا اون کی آمد و رفت رہی، اس سلسلہ میں خود ان کے کچھ ذاتی حالات بھی زیر قلم آئیں گے،

بیدل صوفی منش تھے اور مشائخ اور بزرگوں کی ملاقات کے مشتاق رہتے تھے، ان کی تصنیفات میں چہار عنصر[2] اون کے صوفیانہ ذوق و شوق اور نکتہ شناسی اور بزرگوں کی ملاقاتوں اور باتوں کے تذکروں سے معمور ہے، بیدل کے والد قادری المشرب تھے، وہ حضرت قطب ربانی شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ تعالےٰ کی روحانیت سے

---

[1] بنگال [2] کتاب مذکور نولکشور لکھنؤ میں چھپی ہے،

فیض یاب تھے، اور عجب نہیں کہ انھوں نے اپنے بیٹے کا نام عبدالقادر اسی مناسبت سے رکھا ہو، بیدل لکھتے ہیں :-

"تلقین والد شریف فقیر از روح مقدس حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ بوساطت آن ذات تقدس آیات بود" (ص ۳۰۱)

بیدل کے چچا مرزا قلندر بھی اسی چشمہ سے فیضیاب تھے۔

مرزا قلندر رعم من از نسبت ہم حرنگیش کلاہ مباہات بر عرش عزت می سود ، آوازہ سلسلۂ قادریہ از رسائی قدرتش مشتہر گردوں کمندے و پایہ مدارج سلوک باستقامت ہمتش مفتخر سربلندی (ص ۳۰۱)

بیدل کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا، باپ کا انتقال تو اون کے بچپن میں ہوچکا تھا، مگر چچا کا سایہ مدت تک اُن کے سر پر رہا، اور ان ہی کی تربیت میں یہ پل کر جوان ہوے، اس لیے سپاہیانہ اور صوفیانہ ذوق ترکہ میں پایا، بیدل نے اپنے چچا کی شہ زوری اور پُرخوری (ص ۳۳۳) اور اپنی شہ سواری (ص ۳۳۴) کے اور خوش گو نے اپنے سفینہ میں بیدل کی پُرخوری کے واقعات لکھے ہیں، جوانی میں اپنے صوفیانہ ورع وتقوی کی پردہ داری کے لیے سپاہیانہ ملازمت کا پیشہ اختیار کیا،

ناچار تتبع سنت آباد گردیدہ طریقہ سپاہ گزیدہ تا طبیعت ہیچ خورسند از آفات تعین ورع چندے در سایۂ تیغ امان داشتہ باشد درجم غرور تقوی بسر داری این وضع دامن ناموس بے تعیینی نخراشد (ص ۴۳۰)

بیدل کو بچپن سے تعویذ وعملیات کا شوق تھا، اور اسی راہ سے وہ تصوف کے کوچہ سے آشنا ہوئے، اور گو وہ موروثی طور سے قادری تھے، مگر اپنے علوم

و معارف کے لحاظ سے ان پر نقشبندیت اور مجددیت کے اثرات غالب معلوم ہوتے ہیں، وہ اپنی نظم ونثر میں جو نکتے بیان اور جن حقیقتوں کو ظاہر کرتے ہیں، وہ تمامتر وحدتِ شہود، ظہورِ اسمار وصفات، تعین، بے تعینی، فنا، تجرد، استغنا کے مضامین ہیں، جو ان کے اشعار و نکات میں جابجا آتے رہتے ہیں،

بہر حال سپاہیانہ طور سے مختلف صوبوں میں ملازمت کے خیال سے یا تجرد کے عالم میں بزرگوں سے ملاقات کے شوق میں وہ مختلف شہروں میں پھرتے رہے ہیں، ان کی مسافرت کا مغربی سلسلہ چار عنصر کے تفحص سے باباحسن ابدال کے قصبہ پر جو پشاور کے قریب واقع ہے، ختم ہوتا ہے، یہاں اُن کے فیض تلقین سے ایک جوگی جو وحدتِ شہود کے مسلک میں اُن کا ہم عقیدہ تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قائل ہو کر اسلام لایا، اور ان کی سیاحت کا مشرقی نقطہ اڑیسہ کا شہر کٹک ہے، جہاں اوس زمانہ میں مولانا یعقوب چرخی کے پوتے خان دوران سید محمود صوبہ دار تھے، (ص ۳۴۹)

بیدل کے سفر کے مقامات میں مغرب میں باباحسن ابدال اور پورب میں اڑیسہ کے علاوہ زیادہ تر یوپی اور بہار کے شہر اور قصبے ہیں، متھرا اور بندرابن میں کئی سال رہے ہیں، اکبرآباد آئے گیے ہیں، اور بہار کے مختلف شہروں میں اون کی آمد ورفت رہی ہے، مگر ان تمام مقامات پر استقصار کی نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ بچپن سے جوانی تک ان کا تعلق زیادہ تر بہار سے رہا، اور جوانی سے بڑھاپے تک اور اخیر زمانہ دہلی میں گذرا،

اوپر گذر چکا ہے کہ ان کے والد اور چچا قادری المشرب صوفی تھے، مگر یہ فیض

ان کو بہار ہی میں ایک شیخ وقت سے حاصل ہوا، بیدلؔ نے عنصر اول میں اپنی ظاہری وباطنی ابتدائی تعلیم کا حال اس طرح بیان کیا ہے،

وہ بچہ ہی تھے کہ ان کے والد نے وفات پائی، ماں نے اپنے بچہ کو چھٹے سال چھٹے مہینے (رجب میں) پڑھانے کے لیے بٹھایا، دسویں برس کی عمر میں قرآن پاک ختم کر کے فارسی نظم ونثر اور عربی صرف ونحو کی کتابیں تمام کیں، اور یہی ان کی رسمی تعلیم کی آخری حد ہے، اس کے بعد جو کچھ پایا وہ معلم فطرت کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔"

(ص ۳۰۰ وص ۳۰۱)

اس ظاہری تعلیم کے اختتام کے بعد ہی، وہ صوبہ بہار کے ایک بزرگ شاہ کمالؔ قدس سرہٗ کی خدمت میں پہنچ گئے، جو ان کے والد اور چچا کے پیر تھے، (ص ۳۰۱)

اکنوں از کمال تعلیمی اساتذۂ معنوی کہ بہ جمال توجہ شان نسخہ آراے تفاصیل حقائق است سطرے چندمی نگارد وذکر صحبت فیض منقبت ایشاں از مغتنمات توفیق بیاں می شمارد، استفادۂ صحبت صافی گوہر دریاے یقین رونق انجمن شرع مبین، ہادی عالم فیض، توفیق خضر، سرچشمۂ رمز تحقیق، آئینہ حقائق تمثال، مولانا شیخ کمال کہ تلقین والد شریف فقیر از روح مقدس حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ بوساطت آن ذات تقدس آیات بود، مرزا قلندر عم من از نسبت ہم مرنگیش کلاہ مباہات بر عرش عزت می سود، آوازۂ سلسلۂ قادریہ از رسائی قدر تش مشتہر گردوں کمندے دپایۂ مدارج سلوک باستقامت ہمتش مفتخر، سربلندی حقیقت اخلاق از آئینۂ سمایش چوں نور از آفتاب روشن ومعنی عظمت از نسخہ سراپایش چوں رفعت از افلاک مبرہن ہم در آداب قواعد شریعت

نسق زمانہ وہم در علوم ارشاد طریقت استاد یگانہ . . . . در
ممالک بہار بہ یمن ہدایت پناہ جمعے از وادی ضلالت درگذشتند و موصول سر
منزل توفیق صلاح گشتند . . . . . . (ص ۳۰۳)

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ بیدلؔ کے والد بزرگوار جو بیدلؔ کے بچپن ہی مین جب وہ چھ برس کے بھی نہ تھے، وفات پاچکے تھے، اور ان کے والد حضرت شاہ کمال بہاری کے صحبت پروردہ تھے، اور ان کے چچا مرزا قلندر بھی جو بعد کو اپنے یتیم بھتیجے کے ولی تھے، ان ہی بزرگ کے خوشہ چین تھے،

یہ بزرگ کہاں رہتے تھے، بیدلؔ کے بیان سے صاف معلوم نہین ہوتا، مگر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرائے بنارس بہار میں ایک مقام تھا، یہاں ان کا قیام تھا،

"سرائے بنارس کہ موضعے است از نواح ممالک بہار (ص ۳۰۷)

سرائے بنارس نام کا کوئی مقام مجھے ابھی تک معلوم نہین ہوا،
آگے چل کر لکھتے ہیں،

"مرزا قلندر را چندے در قصبہ رانی ساگر کہ بہ یمن توطن مولانا شیخ کمال
افتخار مدینۃ الاولیا داشت اتفاق اقامت بود . . . . . . از بنارس تا رانی
ساگر فرسخے بیش نبود" (ص ۳۰۷)

یہاں چھپا ہوا بنارس ہے، مگر غالباً صحیح سرائے بنارس ہے، جس کا ذکر پہلے گذرا، مرزا قلندر رانی ساگر جاکر شیخ کے پاس ہفتوں مقیم رہتے تھے، (ص ۳۰۴)
رانی ساگر میں خوشنما تالاب تھا (۳۰۳)
بیدلؔ شیخ کمال کی صحبتوں سے آغاز شباب ہی سے مانوس تھے، اور چچا کے ساتھ

اس بارگاہ اقدس میں پہنچتے تھے اور ان کے معارف و حقائق سے بہرہ مند ہوتے تھے،(۳۱۵)

رانی ساگر صوبہ بہار میں آرہ شاہ آباد سے اٹھارہ میل اور پٹنہ سے پچاس ساٹھ میل پچھم اب بھی آباد ہے، اور تالاب بھی موجود ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں بیدل کے باپ اور چچا نے تلقین کا فیض پایا، اور بیدل کے دل و دماغ نے وہاں سے آبیاری پائی، اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ بیدل کا مولد اگر پٹنہ نہ بھی ہو تو ان کا منشا یعنی ان کی ابتدائی نشو و نما کی جگہ بہار ہی کا کوئی مقام ہے،

شاہ کمال صاحب قدس سرہٗ سے ایک اور ملاقات کا ذکر، بہار کے قصبہ آرہ میں جو اب ضلع ہے، بیدل نے کیا ہے،

درایامے کہ قصبہ آرہ اقامت کدۂ امر اتفاقی بود، اوہم اُفسر زمین بسہیل

قدمش رائحۂ سعادت می اندوخت (ص ۳۱۹)

دوسرے حلقۂ شوق کے ساتھ مرزا قلندر بھی شاہ صاحب کے ہمرکاب تھے،

خصوص مرزا قلندر کہ در ہر بن موے زبانے داشت مرہون ستایش

کمالش و در ہر جنبش نفس بیانی مصروف تذکرۂ احوالش (ص ۳۱۹)

سنہ ۱۰۶۸ میں جس سال شاہ شجاع نے شاہجہان کی بیماری کے زمانہ میں بنگال اور بہار میں اپنی سلطنت کا علم کھڑا کیا، بیدل پٹنہ میں یا پٹنہ کے پاس ہی کہیں مقیم تھے، اُس زمانہ میں اس ملک کی جو کیفیت تھی، اور آس پاس کے راجے اور زمیندار جس طرح ملک میں ہنگامہ برپا کر رہے تھے، اور اس سے ملک میں جو بدامنی پیدا ہو رہی تھی، اور راستے جیسے خطرناک ہو گئے تھے، اس کا پورا حال عنصر چہارم میں کئی صفحوں میں لکھا ہے، اور صوبہ بہار و پٹنہ کا حال جس طریقہ سے

لکھا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اس صوبہ سے پوری طرح آشنا تھے، اور یہاں کے نہ صرف شہروں بلکہ گانوں سے بھی واقف تھے، بلکہ کہیں کہیں جاکر رہے بھی تھے۔ لکھتے ہیں :۔

سالے کہ شاہ شجاع بن شاہ جہان بیماری پدر را سکۂ مضمون سلطنت اندیشیدہ از خطۂ بنگالہ تا سرحد ممالک بہار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و از انجملہ تسخیر نواح ترہت کہ شمالی حدود پٹنہ ملکے است عظیم و کوہستانی مشتمل بر چندیں عقبات (ص ۵۵۱)

شاہ شجاع کی طرف سے بیدل کے چچا مرزا قلندر کے ایک عزیز مرزا عبد اللطیف ترہٹ میں فوج کے افسر تھے، (ص ۵۵۱)۔ بیدل بھی ترہت میں کہیں رہ نورد تھے۔ ایک مقام پر پہنچے، جس کا نام چاند چور بتایا ہے، اور وہاں کے عجائبات خیالی کا ایک واقعہ حوالۂ قلم کیا ہے، (ص ۵۵۴) اور آخر وہ کسی طرح

بہ سواد دامن پٹنہ رسید (ص ۵۵۴)

ایک اور موقع پر پٹنہ کا ذکر کرتے ہیں

در بلدہ پٹنہ وفاق معارف اتفاق مرزا ظریف (ص ۵۵۵)

پٹنہ سے پچاس ساٹھ کوس دریائے گنگا کے اوس طرف مظفر پور اور موتی ہاری کے بیچ میں نہسی نام ایک قصبہ تھا، جو اب بھی ہے۔ اس قصبہ میں بیدل کے چچا مرزا قلندر بھی سکونت پذیر تھے، اور بیدل ان کے ساتھ تھے (ص ۵۶۶) سنہ ۱۰۷۰ھ میں جب شاہ شجاع کا ہنگامہ سرد پڑ رہا تھا،

مرزا قلندر نے اسی نہسی کے راستہ سے بنگال کا رخ کیا، اور اپنا سامان و اسباب یہیں چھوڑ دیا، (ص ۵۶۶)

نہسی میں اس وقت کوئی بزرگ خواجہ شاہ محمد تھے، ان کے تابعوں میں جان محمد تھے، ان ہی کے پڑوس میں مرزا قلندر کی سکونت تھی (ص ۵۶۶)

اسی بدامنی کے زمانہ میں بیدل کو اس قصبہ میں جانے کی ضرورت پیش آئی (ص ۵۶۶) جمعیت کے بجائے تنہا ایک ملازم کو لیکر پاپیادہ چل پڑے پیادہ چلنے کی عادت نہ تھی، راہ میں بیحد تکلیف ہوئی، گنگا سے پار اتر کر تین کوس ہی گئے تھے، کہ تھک گئے، کسی طرح جمنا پور تک پہنچے، پھر تین کوس اور چلے تھے، کہ بالکل بے بس ہو کر، پڑ گیے، اتنے میں دیکھا کہ ایک پیر مرد ایک گھوڑی پر سوار سامنے آئے، قریب آکر بڑی گرم جوشی سے سلام کیا، اور اس تباہ حالی کے ساتھ سفر کا سبب دریافت کیا، بیدل کے وہ پرانے ملنے والے تھے، مگر بیدل ان کو پہچان نہ سکے، انھوں نے کہا:-

من جان محمدم از تابعان خواجہ شاہ محمد کہ در نہسی با مرزا قلندر ش نسبت ہمسایگی دیوار بدیوار است (ص ۵۶۶)

انھوں نے بڑے اصرار کے ساتھ بیدل کو اپنی گھوڑی پر سوار کیا، اور خود پیادہ ساتھ ہوے، اور دونوں نہسی کی طرف چلے،

"ہنگام نماز عصر محل تردد بسواد معمورۂ نہسی رسید پیرواشت تخمیر بر دروازۂ خواجہ شاہ محمد ایستادہ بود" (ص ۵۶۶)

لوگوں کو بیدل کی آمد کی خبر ہوئی، تو سب خوش ہوئے،

فرداے آں کہ پسران خواجہ برسم قدیم صحبت فقیر دریافتند (ص ۵۶۹)

ان لفظوں کو پھر پڑھئے کہ خواجہ صاحب کے لڑکوں نے رسم قدیم کے مطابق بیدل سے ملاقات کی، اور صحبت رہی، رقعات بیدل کے آخر میں ایک رقعہ بہار کے کسی بزرگ کے نام کا ہے، جس کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے،

نعیم عیش صوبہ بہار مبارکباد قبلۂ آرزو دے بے دلاں ہرچند عبودیت قدیم

بہیچ جاے ازاداے خدمات سر برنمی آرد"

ان اقتباسات اور حالات سے ظاہر ہو گا، کہ بیدل کو صوبہ بہار سے بھی موروثی تعلق تھا، اور اگر اس کو عظیم آبادی کہنے میں تامل ہو تو بہاری کہنے میں مطلق تامل نہیں، اور اکثر قصباتی لوگ بہاری کے بجاے عظیم آبادی ہی کہلاتے ہیں،

آخر میں عظیم آباد پٹنہ کے شرفا کی زبان پر بیدل کے متوطن عظیم آباد ہونے کی جو کہانی سینہ بہ سینہ نقل ہوتی چلی آئی ہے، ہم اس کو ذکر کرتے ہیں، شاد عظیم آبادی اپنی تاریخ صوبہ بہار میں جس کو انھوں نے ۱۸۹۰ء میں لکھا ہے، لکھتے ہیں:-

مرزا عبدالقادر متخلص بیدل خاص عظیم آباد پٹنہ کے متوطن تھے، نا قدردانی ابناے روزگار کے سبب سے وطن کو چھوڑ کر عہد دولت شاہجہاں میں دلی گئے، اور وہاں نہایت معزز و مکرم ہوئے۔ ۔ ۔ اگلے لوگوں سے سنا ہے کہ مرزا محلہ پٹن ڈیوی میں رہتے تھے، لیکن کسی تاریخ میں نہیں دیکھا" (ص ۲۲۰)

چہار عنصر میں میری تلاش میں دو دفعہ اکبر آباد کا ذکر آیا ہے،

در بلدۂ اکبرآباد منظور ابرار امیر کامگار کہ بدلیل سعادت ازلی اوقات گرامی مصروف خدمت فقرا داشت و در احترامیکہ لائق حال

این طائفہ است ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہ حکم حسن اعتقاد فقیر را نیز از زین فرقہ تصور فرمودہ (ص ۴۹۲)

دوسرا موقع

تابستانی در گوشۂ از زدایای اکبرآباد گرمی ہاے صحبت تنہائیم با ساہ عافیتے بر داختہ بود" (ص ۵۴۹
مگر ان کے ان فقروں میں سے کسی سے بھی وطن نہیں آتی

معارف
اگست ۱۹۴۶ء

حکیم سنائی کے سنینِ عمر

شیخ ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی کے متعلق اتنا بالاتفاق ثابت ہے کہ انھوں نے سلطان بہرام شاہ غزنوی (۵۱۲ھ - ۵۴۷ھ[۱]) اور سلطان سنجر سلجوقی (۵۱۱ھ - ۵۵۲ھ) کا زمانہ پایا ہے، لیکن ان کی عمر کے سنین میں بیحد اختلاف ہے۔

نظامی عروضی جس نے تقریباً ۵۵۰ھ میں اپنی کتاب چہار مقالہ لکھی ہے، اس نے سنائی کا نام غزنوی سلاطین (آل ناصر) کے شعراء میں سب سے آخر میں لیا ہے (ص ۴۰، گب) عوفی نے لباب الالباب (۶۱۸ھ) میں حسب دستور کوئی تاریخ و سنہ درج نہیں کیا ہے، حمد اللہ قزوینی نے گزیدہ میں جو ۷۳۰ھ میں لکھی گئی ہے، دو جگہ ان کا ذکر کیا ہے، ایک مشائخ کے سلسلہ میں اور دوسرے شعراء کے ضمن میں۔ پہلے موقع پر لکھا ہے:

"معاصر شیخ ابوسعید ابوالخیر بود" (ص ۷۸۴، گب)

"شیخ ابوسعید ابوالخیر کی وفات ۴۴۰ھ میں ہوئی ہے، اس بنا پر سنائی کی تاریخِ زندگی بھی اسی کے پس و پیش ہونی چاہیے، لیکن دوسری جگہ اس میں لکھا ہے:

"تا زمان سلطان بہرام شاہ (غزنوی) در حیات بود۔" (ص ۸۱۴، گب)

بہرام شاہ غزنوی کی سلطنت کا زمانہ ۵۱۲ھ سے ۵۴۷ھ تک ہے، اس لحاظ سے انکی تاریخ وفات اسی عہد کے درمیان ہونی چاہیے۔

مولانا جامی نے نفحات میں نقل کیا ہے کہ سنائی نے سلطان محمود کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا،

---

[۱] بہرام شاہ کی وفات کا سال گزیدہ میں ۵۴۴ھ ہے، طبقات ناصری میں ۵۵۲ھ ہے، یادگاری میں ۵۴۷ھ ہے، برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات (ص ۵۴۹ ج ۲) میں ۵۴۸ھ ہے۔ مگر زیادہ تر مورخین ۵۴۷ھ ہی لکھتے ہیں۔

سلطان محمود نے ۴۲۱ھ میں وفات پائی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنائی کی ولادت چوتھی صدی کے اواخر میں ہوئی ہوگی، اور پانچویں صدی کے شروع میں اس قابل ہوں گے کہ سلاطین کیلئے مدحیہ قصیدے کہہ سکیں، مگر خود اسی نفحات میں مولانا نے ان کا ایک ہی سال وفات (گو بقول بعض) لکھ کر نقل کیا ہے، اور وہ ۵۲۵ھ ہے، اور یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہوسکتیں، ورنہ ان کی عمر شاید سوا سو برس سے زیادہ کی ماننی پڑے گی،

حکیم موصوف کے سال وفات میں بھی اختلاف ہے، جن کی تفصیل آگے آئے گی، ان مشکلات کے حل کی صورت یہ ہے کہ پہلے سنائی کی مشہور مثنوی حدیقہ کی تصنیف کی تاریخ متعین کیجائے،

حدیقہ کا سال تصنیف حکیم سنائی نے اپنی مثنوی حدیقہ کے آخر میں اپنی اس کتاب کی تصنیف کا سال لکھا ہے، مگر عجیب تر یہ ہے، کہ اس کے قلمی اور مطبوعہ دونوں قسم کے نسخوں میں یہ تاریخی شعر کئی طرح پر ہے، اکثر نسخوں میں تو یہ ہے:

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام   پانصد و بست و پنج گشتہ تمام

اس سے تصنیف کی تاریخ ۵۲۴ھ سے ۵۲۵ھ تک معلوم ہوتی ہے، لیکن یہی شعر لکھنؤ کے شاہی کتب خانہ کے ایک نسخہ میں (دیکھو اسپرنگر کی فہرست) نیز شرح حدیقہ کے قلمی نسخہ (انڈیا آفس لائبریری) اور بعض دوسرے قلمی نسخوں میں اس طرح ہے۔

پانصد و سی و چار رفتہ ز عام   پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۵۳۴ھ میں شروع اور ۵۳۵ھ میں تمام ہوئی،

لیکن نولکشور لکھنؤ کے مطبوعہ نسخہ میں اور ایک دو قلمی نسخوں میں (دیکھو فہرست میونک یونیورسٹی لائبریری) یوں ہے،

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام   پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

یہ شعر بتاتا ہے کہ حدیقہ ۵۲۵ھ میں شروع اور ۵۳۵ھ میں تمام ہوئی، یعنی دس برس میں۔

میونک یونیورسٹی کے ایک نسخہ میں اس آخری قرأت کی ایک اور تصحیف ہے۔

ماہ بست و چہار رفتہ ز عام   پانصد و بست و پنج گشتہ تمام

بوڈلین کے ایک نسخہ میں حسب معمول "پانصد و بست و چار اور پانصد و بست و پنج" ہے

لیکن دوسرے میں (نمبر ۵۳۳) ایک اور تغیر ہے،

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام   پانصد سی و چار گشتہ تمام

اس میں ۵۲۴ھ میں آغاز اور ۵۳۴ھ میں انجام بیان ہوا ہے،

بہرحال ان میں سے کوئی سا نسخہ بھی اختیار کیا جائے، اتنا تو بے شبہ ثابت ہے کہ حکیم موصوف کا زمانہ پانچویں صدی کے اواخر سے لیکر چھٹی صدی کے اواسط تک ہے، اس کے خلاف کی سب روایتیں قطعاً غلط ہیں،

اب سوال ہے کہ ان مختلف نسخوں میں سے کون صحیح ہے، تو اس کے جواب میں حسب ذیل مراتب طے کرنے ہیں،

۱۔ اکثر نسخوں میں ۵۲۴ھ۔ ۵۲۵ھ ہے،

۲۔ متعدد نسخوں میں ۵۳۴ھ۔ ۵۳۵ھ ہے،

۳۔ ایک دو نسخوں میں ۵۲۴ھ۔ ۵۳۵ھ ہے،

۴۔ ایک میں ۵۲۴ھ۔ ۵۳۴ھ ہے،

پہلے اور دوسرے نسخوں کی بنا پر تصنیف کی مدت ایک سال ہوتی ہے، اور تیسرے چوتھے کی بنا پر دس سال، یہ دس سال کی مدت تصنیف حسب ذیل وجوہ سے ناقابلِ قبول ہے،

۱۔ یہ اکثر معتبر و مستند نسخوں کے خلاف ہے۔

۲. سنائی نے ۵۲۸ھ میں اپنی مثنوی طریق التحقیق لکھی ہے، جیسا کہ اس مثنوی کے آخر میں ہے
(فہرست انڈیا آفس لائبریری)

پانصد و بست و ہشت ز آخر سال بود کیں نظم نغز یافت کمال

ظاہر ہے کہ پہلی مثنوی کے تمام ہونے کے بعد ہی سنائی نے یہ دوسری مثنوی شروع کی ہوگی، تصانیف اور خصوصاً نظمیہ اور وہ بھی ہم مضمون نظمیات کے ظاہر حال کے خلاف ہے کہ ایک کو ناتمام چھوڑ کر، دوسری کو شروع کر دیا جائے کہ ایک ہی قسم کے ذوقیات اور ایک ہی قسم کے وزن میں تغیر اور تبدل کی ضرورت قرائن کے خلاف ہے۔

۳. اس شعر کے اوپر ایک اور شعر سب نسخوں میں ہے جس میں مہینوں کا ذکر ہے، ان دونوں شعروں کو ملا کر پڑھنے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس تصنیف میں ایک سال صرف ہوا ہے، وہ شعر یہ ہیں:

شد تمام ایں کتاب در مہ دی کہ در آذر فگندم ایں را پی
پانصد و بست (سی) و چار رفتہ ز عام پانصد و بست (سی) و پنج گشتہ تمام

آغاز و انجام کے مہینوں کا یہ حساب اسی وقت پیش کیا جاتا ہے جب حساب سال کے اندر یا سال کے قریب ہو، اس قرینہ سے اس قرأت کی تصدیق ہوتی ہے جس سے تصنیف کی مدت ایک سال ثابت ہوتی ہے، ایک سال کے آذر سے لیکر دوسرے سال کے دی تک ٹھیک ایک سال ہوتا ہے، اس لیے اکثر نسخوں کے مطابق یہ تصریح نکلتی ہے کہ ماہ آذر ۵۲۴ھ سے شروع ہو کر ماہ دی ۵۳۵ھ میں تمام ہوئی، اور یا بعض نسخوں کے مطابق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماہ آذر ۵۳۴ھ سے تصنیف کا آغاز اور ماہ دی ۵۳۵ھ میں اس کا انجام ہوا،

اگر یہ مدت دس گیارہ برس ہوتی (۵۲۴ھ سے ۵۳۵ھ یا ۵۳۴ھ تک) تو آغاز و انجام کے

نہینوں کا پیش کرنا بے سود ہو جاتا ہے،

۴۔ شعرا، اس قسم کی تاریخ کا اظہار فخریہ کرتے ہیں، ایک سال میں (یعنی ۵۲۴ھ۔ ۵۲۵ھ یا ۵۳۴ھ۔ ۵۳۵ھ)، اس کتاب کا تصنیف پانا تو وجہ افتخار بن سکتا ہے، مگر دس گیارہ برس کی محنت شاقہ میں تصنیف پانا سنائی کیا کسی معمولی شاعر کے لیے بھی افتخار کی وجہ نہیں ہو سکتی۔

ان قرائن کی بنا پر ۵۲۴ھ ۵۳۵ھ کا نسخہ ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحیح وہی نسخہ ہے جس سے اس کی تصنیف کی مدت ایک سال ثابت ہو، اب اگر ۵۲۴ھ۔ ۵۲۵ھ کا نسخہ صحیح ہے تو ثابت ہو گا کہ حدیقہ پہلے اور طریق التحقیق ۵۲۸ھ میں بعد میں لکھی گئی اور اگر دوسرا نسخہ ۵۳۴ھ ۵۳۵ھ صحیح ہو تو معلوم ہو گا کہ طریق التحقیق ۵۲۸ھ میں پہلے اور حدیقہ ۵۳۴ھ۔ ۵۳۵ھ میں بعد کو نظم ہوئی۔

اب ان دونوں نسخوں میں سے جن میں سے ایک میں "بست وچار وبست پنج" اور دوسرے میں "سی وچار وسی وپنج ہے، پہلا نسخہ میرے خیال میں صحیح تر ہے، کیونکہ حدیقہ کے اکثر و بیشتر نسخوں میں بست وچار وبست وپنج ہی مذکور ہے،

چنانچہ ہندوستان اور یورپ کے جن کتبخانوں کے نسخوں کا حال معلوم ہو سکا ہے، ان میں علی العموم یہی تاریخ ہے، بمبئی کے نسخہ مطبوعہ ۱۸۵۹ء میں جو ایرانیوں نے چھاپا ہے، یہی ہے، حاجی خلیفہ چلپی کے سامنے جو نسخہ تھا، اس میں بھی یہی تھا، کشف الظنون میں ہے،

"فرغ من نظمہ سنۃ اربع وعشرین وخمس مایۃ۔"

مولانا جامی کے پیش نظر نسخہ میں بھی یہی تھا، نفحات میں ہے:

"تاریخ تمامی حدیقہ چنانچہ خود بنظم آوردہ سنۃ خمس وعشرین وخمسمائۃ بودہ است"

اس بنا پر اسی نسخہ "بست وچار وبست وپنج" کو صحیح تر ماننا چاہیے اور یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ

لہ وسیع النظر پروفیسر شیرانی کا تنقید شعر العجم ذکر سنائی میں "بست وچار وسی وپنج" کے نسخہ کو بلا دلیل تسلیم کرکے یہ نتیجہ نکالنا کہ سنائی حدیقہ کی تصنیف میں دس برس مصروف رہے یعنی ۵۲۴ھ سے ۵۳۵ھ تک، درست نہیں معلوم ہوتا، شاید ان کے پیش نظر صرف نولکشوری نسخہ تھا
"ص"

سنائی نے حدیقہ ماہ آذر ۵۲۴ھ میں شروع اور ایک سال بعد ہی ۵۲۵ھ میں تمام کی،

تاریخ ولادت | حکیم سنائی کی تاریخ ولادت عموماً اگلے تذکروں میں مذکور نہیں، مگر بعض متاخرین نے ۴۳۷ھ ولادت کی تاریخ لکھی ہے، چنانچہ ریو نے تذکرۃ الافکار کے حوالہ سے یہی تاریخ نقل کی ہے، (فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ج ۲ ص ۵۵۰) شیر خاں لودی نے صاحب مجمل فصیحی کی روایت سے اپنے تذکرہ مراۃ الخیال (ص ۴۲ طبع کلکتہ) میں، اور آزاد بلگرامی نے ید بیضا میں بھی یہی تاریخ ولادت درج کی ہے، مگر میرے نزدیک یہ قطعاً غلط ہے، یہ معلوم ہوچکا ہے کہ حدیقہ اکثر و بیشتر نسخوں کے مطابق ۵۲۴ھ۔ ۵۲۵ھ میں لکھی گئی ہے، اور اگر بعض دوسرے نسخوں کا اعتبار کیا جائے، تو ۵۳۴ھ۔ ۵۳۵ھ میں تالیف ہوئی، حدیقہ کے تقریباً وسط میں ہے،

پاے بر پائے آمد از غم شصت | لاجرم دست می زنم بر دست
(باب الضعف والشیب)

عمر دادم بجملگی برباد | بر من آمد ز شصت صد بیداد
(فی تبدیل الحال)

ان دونوں شعروں سے ثابت ہے کہ حدیقہ کی تصنیف کے وقت سنائی کی عمر ساٹھ سال تھی، اب اگر ۵۲۴ھ کو وقت تصنیف مانا جائے تو ولادت کا سال ۴۶۴ھ نکلے گا، اور اگر ۵۳۴ھ مانا جائے تو ۴۷۴ھ ہوگا۔

تاریخ وفات | سنائی کے سال وفات کے متعلق چار روایتیں ہیں

۱۔ شیر خاں لودی نے مجمل فصیحی کی روایت سے لکھا ہے کہ سنائی ۴۳۷ھ میں پیدا ہوئے اور باسٹھ ۶۲ برس کی عمر پائی، اس حساب (۴۳۷ + ۶۲ = ۴۹۹ھ) سے ۴۹۹ھ میں واقع ہوئی ہے،

جو سراپا غلط ہے، کہ یہ حدیقہ و طریق التحقیق کی تصنیف سے اور بہرام شاہ و سنجر کی تخت نشینی سے پہلے کا واقعہ ہوگا، جو ہر طرح شائبۂ صحت سے خالی ہے۔

۲۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں بعض کا قول نقل کیا ہے کہ ۵۲۵ھ میں جب سال حدیقہ کی تصنیف ختم ہوئی، مصنف کی زندگی کا بھی خاتمہ ہوا۔

بعد کے اکثر لوگوں نے اس بعض کے قول کی بے تحقیق تقلید کی ہے۔

۳۔ تقی الدین کاشانی نے اپنے تذکرہ خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار میں جو ۹۷۹ھ ۹۹۳ھ کی تالیف ہے، اور جس کے ابواب کا خلاصہ ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنی فہرست کتب خانۂ شاہ اودھ میں دیدیا ہے، سنائی کی وفات کا سال ۵۴۵ھ نقل کیا ہے، (ص ۵۵۰)

(فہرست مذکور ص ۵۵۰)

۴۔ دولت شاہ سمرقندی نے تذکرہ میں اپنی مشہور بے احتیاطی کے ساتھ سنائی کا سال ۵۷۶ھ لکھا ہے۔

اگرچہ ان میں سے کوئی بھی قدیم ترین اور قریب ترین شہادت نہیں ہے، تاہم محققین حال نے متعدد وجوہ کی بنا پر تقی کاشانی کی روایت یعنی ۵۴۵ھ کے سال وفات کو معتبر قرار دیا ہے۔

میرے نزدیک تو دولت شاہ کی ۵۷۶ھ والی روایت اس لیے قبول کے قابل نہیں کہ جب ۴۶۴ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور ۵۲۵ھ میں حدیقہ کی تصنیف کے وقت وہ ساٹھ سال کے تھے تو ۵۷۶ھ میں ان کی عمر ایک سو گیارہ برس کی قرار پاتی ہے، اور یہ طویل عمر ثبوت کی محتاج ہے، اور اس لیے بھی اس قدر متاخر تاریخ نہیں مانی جاسکتی، کہ سنائی کی تصنیفات میں صرف بہرام شاہ اور سنجر دو بادشاہوں کے نام آتے ہیں۔

اور جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ بہرام شاہ غزنوی نے ۵۴۷ھ میں اور سنجر سلجوقی نے ۵۵۲ھ میں وفات پائی ہے۔ اور ان کے بعد دوسرے سلاطین دونوں خانوادوں میں تخت نشین ہوئے ہیں، اور اگر وہ دوسروں کا زمانہ بھی پاتے تو ان کے نام کے قصائد بھی سنائی کے کلام میں مل سکتے۔

حکیم کے کلیات میں غزنویہ اور سلجوقیہ کے صرف ایک ایک بادشاہ کے نام کے قصیدے ہیں، غزنویہ میں سلطان بہرام شاہ کے نام کے اور سلجوقیہ میں سنجر کے۔

سلطان ہمہ مشرق بہرام شہ آنکو ... بہرام سپہرش نسزد بندۂ در بر

خسرو خسرو نشاں بہرام شاہ سلطان حق ... آنکہ بہرام فلک در سطوتش حیران نماند

آفتاب دادہ دین سنجر کہ او رہ ایزراں ... اول القاب نوشیروان ثانی آمدست

ان دونوں بادشاہوں کے زمانے بہت لمبے ہوئے ہیں، بہرام شاہ کا عہد ۵۱۲ھ سے ۵۴۷ھ تک، اور سنجر کا ۵۱۱ھ سے ۵۵۲ھ تک، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ سنائی نے اول تو درباروں تک دیر میں رسائی پائی ہے۔ اور پھر ایک ایک بادشاہ سے زیادہ اپنا مربی نہیں پایا۔

پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ سنائی نے ۵۴۵ھ کی وفات کی صورت میں اپنے مربی و محسن بہرام شاہ کو ۵۴۷ھ اور سنجر کو ۵۵۲ھ میں مرتے ہوئے سنا، لیکن ان کے اس سانحہ پر غم وحسرت کے دو قطرے بھی نہ بہائے، یہ تعجب خیز ہے، درانحالیکہ معزی شاعر کے سنجر کے ہاتھ سے اتفاقیہ مارے جانے پر وہ آنسو کے چند قطرے گراتے ہیں، اس معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ان بادشاہوں کی وفات کے وقت شاعر زندہ ہی نہ تھا۔

۵۲۵ھ کی تاریخ وفات بھی کئی وجوہ سے ناقابل اعتبار ہے۔

۱۔ سنائی نے اپنی دوسری مثنوی طریق التحقیق جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، ۵۲۸ھ میں لکھی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ ۵۲۸ھ تک تو یقیناً زندہ تھے۔

۲۔ حدیقہ کے بعض نسخوں میں اس کا ۵۲۴ھ سے لیکر ۵۳۵ھ تک اور بعض کے رو سے ۵۳۴ھ سے ۵۳۵ھ تک تصنیف ہونا پایا جاتا ہے،

۳۔ سنائی نے امیر معزی شاعر کے مرثیہ میں جس نے ۵۴۲ھ میں سلطان سنجر سلجوقی کے اتفاقی تیر سے زخم کھا کر وفات پائی ہے،[1] چند قطعے لکھے ہیں جن میں ایک کو آذر نے اپنے آتشکدہ میں درج کیا ہے، (ص ۱۵۳ بمبئی)

گر زہرہ بچرخ دو دم آید نشگفت است   در ماتم طبع طرب افزاے معزی
از حسرت درہاے تمیش چو یتیماں   بنشست عطارد بعزای معزی

اور دوسرے کو مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے حواشی چہار مقالہ میں نقل کیا ہے[2]

تا چند معزاے معزی کر خدا لیش   زینجا بفلک برد قباے ملکی داد
چو تیر فلک بود قرینش سرہ آورد   پیکان ملک برد، بہ تیر فلکی داد

اس سے معلوم ہوا کہ ۵۴۲ھ تک سنائی کی وفات نہیں ہوئی تھی اور ۵۴۶ھ میں وہ وفات پا چکے تھے، ورنہ اپنے محسن و مربی بہرام شاہ کا مرثیہ ضرور کہتے۔ اب ان دونوں تاریخوں کے بیچ میں ان کی وفات کا سال ہوگا، اور یہ وہی ۵۴۵ھ ہے جس میں کاشانی نے ان کی وفات بیان کی ہے۔

ان تفصیلات کا نتیجہ یہ ہے کہ حکیم سنائی کی ولادت کا سال ۴۶۴ھ یا ۴۶۵ھ اور وفات کا سال ۵۴۵ھ قبول کیا جائے، اس حساب سے ان کی پوری عمر اسّی اکیاسی

---

[1] لباب الالباب عوفی ج ۲ ص ۰، اگب و آتشکدہ آذر ص ۱۵۳ بمبئی و فہرست مخطوطات انڈیا آفس، (حدیقہ سنائی ص ۱، ۵) [3] حواشی چہار مقالہ ص ۱۵۱ اگب۔

برس کی ہوگی، اور اگر ۵۳۳ھ کو حدیقہ کا سالِ تصنیف مانا جائے تو دس گیارہ برس عمر اور کم ہوجائیگی،

اس تفصیل سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مستوفی قزوینی صاحب گزیدہ کا ان کو سلطان ابوسعید ابوالخیر متوفی ۴۴۰ھ کا معاصر بتانا قطعاً غلط ہے، نیز حضرت جامی کا یہ فرمانا کہ انھوں نے سلطان محمود المتوفی ۴۲۱ھ کی مدح لکھی تھی، درست نہیں۔ اسی لیے دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں اس مدح مذکور کا سلطان محمود کے بجائے سلطان ابواسحاق ابراہیم غزنوی (۴۵۱ھ – ۴۹۲ھ) کی شان میں ہونا ظاہر کیا ہے، جو قرین قیاس ہوسکتا ہے، مگر اس نام کا کوئی قصیدہ شاعر کے مطبوعہ کلیات میں مجھے نظر نہیں آیا، لیکن چونکہ یہ شاید منتخب ہے اسلیے پورے استناد سے نہیں کہا جاسکتا،

(معارف مارچ ۱۹۳۳ء)

حجاز کے کتب خانے

حجاز اسلام کا مرکز ہے، اس لیے یہ توقع بیجا نہیں کہ وہ علوم اسلامیہ کا بھی مرکز ہوگا، اسلام کی دو ابتدائی صدیاں اس توقع کے عین مطابق تھیں، یہی سرزمین ہے جہاں اسلام کی پہلی کتاب (قرآن مجید) وحی کے دستِ ترتیب سے مرتب ہوئی، یہیں احادیث کا پہلا مجموعہ عمرو بن حزم کے ہاتھ سے مرتب ہوا، یہیں مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام و قضایا امام مالک نے فراہم کیے، یہیں فقہ اور اصول فقہ اور احکام القرآن کی پہلی کتابیں امام شافعی نے تالیف کیں، یہیں حدیث کی پہلی صحیح کتاب امام بخاری نے مدینہ منورہ میں بیٹھ کر لکھی، اس عہد میں حجاز کا گوشہ گوشہ قال اللہ و قال الرسول کے ترانوں سے گونج رہا تھا،

حجاز نے بنی امیہ کے دمشق الشام کا کامیاب مقابلہ کیا، اور اس کے سامنے دمشق کا چراغ نہ جل سکا، مگر عراق کے کوفہ و بصرہ نے آہستہ آہستہ اس کی مرکزیت کو صدمہ پہنچانا شروع کیا، اور آخر کار تیسری صدی میں بغداد نے اسکی قوت کو سلب کرکے سیاسی اور علمی دونوں حیثیتوں سے اس کو عجم کا تخت بنا دیا، اس وقت سے جو اس کے قویٰ مضمحل ہوکر سوئے تو اب تک نہ جاگے۔

تاہم اس کی مذہبی مرکزیت جو خانہ کعبہ اور مسجد و مدفن نبوی کے باعث دنیائے اسلام میں اس کو حاصل تھی، چونکہ وہ اسلام کے ارکان میں داخل تھی، اس لیے ملوک و سلاطین

اور علماء و فضلاء کے توجہات کو اپنی طرف برابر کھینچتی رہی، صدیاں گذریں، دنیا بدل گئی، سلطنتیں بنیں اور مٹ گئیں، قومیں ابھریں اور فنا ہوئیں، تاہم ہر اسلامی سلطنت نے جو منصۂ وجود پر آئی، اس کی مذہبی خدمت گذاری اپنا فرض سمجھا،

ملوک اور سلاطین اسلام نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی جو خدمتیں کیں جس طرح وہاں سونے چاندی کی نہریں بنائیں، زاویے قائم کیے، مدرسے بنوائے، علماء اور ائمہ کو جاگیریں دیں، اہل خدمت کو وظیفے دیے، اس بنجر زمین میں اپنے ملک کی پیداوار بھیجکر جس طرح اس کو سرسبز و شاداب رکھا، وہاں کے سنگستان میں جو یادگاریں اور مسجدیں بنائیں، جو مسافر خانے قائم کیے، جو نہریں کھدوائیں، جو شفا خانے تعمیر کیے اور رفاہ عام کے جو کام انجام دیے، ان کی کچھ مٹی مٹی یادگاریں کھنڈروں اور ویرانوں کی صورت میں اب بھی باقی ہیں، لیکن تاریخ کے اوراق میں ان کی زندگی اب بھی بجنسہ محفوظ ہے،

ان ہی یادگاروں کے ضمن میں کتب خانے بھی داخل ہیں، ہر عہد میں ملوک و سلاطین اور علماء و فضلاء نے اس میں سینکڑوں کتب خانے قائم کیے، مگر باد صرصر کے جھونکے انکے اوراق کو یکے بادیگرے منتشر و پریشان کرتے رہے، اس وقت حجاز کی سرزمین میں جو کچھ یادگاریں ہیں، وہ قسطنطنیہ کی مرحوم ٹرکی کے آثار منکور ہیں، اور خدا جانے اب کس مپرسی کے عالم میں ان کی زندگی کب تک ہے،

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

اس وقت تاریخ کا پچھلا صفحہ دہرانا مقصود نہیں ہے، یہ دکھانا نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں کیا ہوا، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ اس وقت کیا ہے؟

ہندوستان کے مسافر کو عرب کا پہلا ساحل جدہ ملتا ہے، جدہ کی گذشتہ علمی یادگار کا مجھکو علم نہیں، سردست اس وقت اس شہر میں علم کے ایک شائق رئیس شیخ محمد حسین نصیف کا وجود ہے، جن کا خاندان ایک مدت سے جدہ میں شرفائے مکہ کا وکیل تھا، مگر پچھلے دونوں ڈ اس امتیاز سے محروم ہو چکا تھا، شیخ نصیف سلفی العقیدہ ہیں اور اسی سبب سے اس عہد حکومت میں ان کو خاص رسوخ اور اعتبار حاصل ہے۔

جدہ کے گذشتہ سفر اور موجودہ سفر میں بھی ان کی عنایات کا میں ممنون رہا، موصوف کی ذات جدہ میں ہمارے موضوع بحث کے لحاظ سے تنہا ذات ہے، حجاز کے اس دروازہ میں ان ہی شیخ نصیف کا پہلا ذاتی اور شخصی کتب خانہ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، شیخ محمد نصیف کے کتب خانہ کا بڑا حصہ مطبوعہ کتابوں پر مشتمل ہے، مگر اسی کے ساتھ قلمی یادگاروں سے بھی و خالی نہیں، مجھکو متعدد دفعہ اس کتب خانے کے دیکھنے کا موقع ملا ہے، کتب خانہ میں تین چا ہزار کتابیں ہوں گی جو الماریوں میں ترتیب سے رکھی ہیں، قلمی نوادر میں اس کتب خانہ کی چند کتابیں ذکر کے قابل ہیں، جن میں سے علامہ ابن حزم اندلسی کی محلی ہے، جو فقہ اسلامی کی انسائیکلوپیڈیا سمجھی جاتی ہے، اور ہر عہد میں وہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، یہ کتاب فقہی فرقہ آرائیوں اور تعصبات سے بلند ہو کر محض اسلامی فقہ واحکام پر لکھی گئی ہے، نسخہ کے بعض اجزا ناتمام ہیں، اس کتب خانہ کی دوسری نادر کتاب حمیدی کی الجمع بین الصحیحین کی پہلی جلد ہے، یعنی بخاری و مسلم میں جو حدیثیں مکرر ہیں، ان کو حذف کر کے صحیحین کی کی بقیہ روایتیں یکجا کر دی گئی ہیں، امام حمیدی نے ان حدیثوں کو مسند کی طرز پر یعنی راوی اول کے ناموں کی ترتیب پر ان کو مرتب کیا ہے، مثلاً سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وہ روایتیں ہیں جو بخاری اور مسلم میں آئی ہیں، اسی طرح عقائد میں حضرت امام احمد بن حنبل کے بعض

رسائل ہیں۔

مکہ معظمہ میں بالفعل دو سرکاری اور تین پرائیوٹ کتب خانے ہیں، دونوں سرکاری کتبخانے حرم کے دو مختلف پہلوؤں میں ہیں، باب السلام کے قریب اور باب الزیادہ کی سمت میں جو محکمۂ دارالقضا ہے، اسی سے لگا ہوا ایک دروازہ ہے، جو باب المدرسہ کہلاتا ہے۔ ایک راستہ اوپر جاتا ہے، آگے زینہ ہے، زینہ کی دونوں سمتوں میں دو چھتیں ہیں، یہ سلطان محمود کی تعمیر ہیں، ایک طرف کتب خانہ ہے اور دوسری طرف مدرسہ محمودیہ ہے، مدرسہ تو مٹ کر عمارت شخصی تصرف میں آچکی ہے، اور اس میں حاجی کرایہ سے ٹھہرتے ہیں، ہمارے مخدوم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اسی عمارت میں مکہ میں امسال فروکش تھے،

کتب خانہ قائم ہے، صدر دروازہ میں اوپر ترکی کے چند شعر ہیں، جن میں بنا کی تاریخ اور بانی کا نام نامی ہے۔ غالباً سلطان عبد المجید خاں کا نام ہے، حرم کی متفرق کتابیں اس میں یکجا کر دی گئیں، اور کچھ قسطنطنیہ سے سلطان نے بھجوائیں، بالفعل اس کتب خانہ میں میرے اندازہ کے مطابق پانچ چھ ہزار کتابیں ہوں گی، ان میں مطبوعہ اور قلمی کتابیں ہیں، یہ کتابیں مصاحف، تفاسیر، احادیث، فقہ، تصوف، ادب، تاریخ، تجوید و قرأت، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی غرض ہر علم و فن کی ہیں، اور ترتیب سے کھلی الماریوں میں چنی ہیں،

کتب خانہ کے موجودہ ناظر داغستان کے ایک عالم ہیں، جنھوں نے مصر میں تعلیم پائی ہے، کتب خانہ کی ایک پرانی فہرست ہے، جو ایک ضخیم جلد میں ہے اور شکستہ ہو رہی ہے۔ داغستانی صاحب نے نہایت محنت اور جانفشانی سے اس کی ایک نئی فہرست ترتیب دی ہے اور ہنوز وہ تمام نہیں ہوئی، کچھ حصہ زیر ترتیب ہے، شاید کہ اب تمام ہو گئی ہو۔

قلمی کتابوں میں سینکڑوں کتابیں ایسی ہیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہیں، نادر کتابیں بھی اس میں متعدد ہیں، جن میں سے ایک فرقہ ماتریدیہ کے امام ابو منصور ماتریدی کی تفسیر تاویلات القرآن ہے، یہ نسخہ نہایت باریک فارسی خط میں، بہت بڑی تقطیع پر ایک ضخیم جلد میں ہے؛ امام موصوف نے متکلمانہ حیثیت سے قرآن پاک کی تفسیر املا کی تھی، اور ایک شاگرد نے اس کو جمع کرکے تاویلات القرآن نام رکھا ہے،

اس کتب خانہ میں ایک اور دوسری تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآی والسور کی متعدد جلدیں ہیں، اس کے مصنف امام برہان الدین ابراہیم بقاعی ہیں، اس تفسیر کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیتوں اور سورتوں کا باہم ربط اور نسق بیان کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک اور خصوصیت اس میں ایسی پائی جاتی ہے جو کسی اور قدیم تفسیر میں نظر نہیں آئی یعنی یہ کہ جہاں جہاں یہود و نصاریٰ کا تعلق ہے، عام مفسرین کی طرح اسرائیلیات اور یہودیوں کی بیہودہ روایتیں نہیں درج کی ہیں، بلکہ خود توراۃ اور انجیل کی عربی متعلقہ عبارتیں نقل کی ہیں، امام بقاعی نے یہ تصنیف ۱۴ برس میں تمام کی ہے، ۸۶۱ھ میں شروع کی اور ۸۷۵ھ میں ختم کی،

مکہ کے قیام کے زمانہ میں ایک ہندوستانی مہاجر عالم صاحب جو بالفعل سلطان ابن سعود کے مخالف ہیں، اور روایتوں کے بیان کرنے میں نہایت بے احتیاط ہیں، انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ نجدیوں نے مکہ معظمہ کے داخلہ کے وقت اس کتب خانہ سے ساٹھ آدمیوں پر یا ساٹھ اونٹوں پر لاد کر کتابیں نجد بھجوا دیں، اور فلسفہ و منطق اور امام غزالی کی سب تصنیفات جلا ڈالیں، میں اس کتب خانہ کو پہلے دیکھ چکا تھا تاہم ان کے اس کہنے پر میں نے جاکر دوبارہ کتب خانہ کا جائزہ لیا، تو اس میں فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضیات،

تصوف حتی کہ رمل وجفر کی کتابیں بھی موجود پائیں، امام غزالی کی تصنیفات بھی موجود تھیں، اور ساٹھ آدمیوں یا اونٹوں پر اگر کتابیں منتقل کیجاتیں تو کتب خانہ کی الماریاں خالی ہوتیں، میں نے اسی پر بس نہیں کیا، ناظر صاحب سے دریافت کیا، انھوں نے ہنس کر نئی اور پرانی فہرستیں سامنے رکھ دیں، میں نے اپنی تحقیق یہیں ختم نہیں کی، قاضی ابن بلیہد صاحب جو قاضی القضاۃ ہیں، اور جن سے ان چیزوں کا تعلق ہے، ان سے جاکر پوچھا کہ یہ افواہ اس میں کہاں تک صداقت ہے، انھوں نے نہایت غصہ سے اس کی تردید کی، اور کہا کہ اہل نجد کو کتابوں کی حاجت نہیں، ہمارے ملک میں سب کتابیں موجود ہیں،

ہندوستان میں ابھی انڈین مسلم حجاز کانفرنس کی ایک تجویز میں یہ کہا گیا ہے کہ نجدیوں نے فقہ وتصوف وغیرہ کی کتابیں جلا ڈالیں، اور وفد خدام الحرمین کی رپورٹ میں اسی سرکاری کتب خانہ کے ذکر میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کو عینی شہادت ملی ہے، کہ شہدا کے مقام پر جو مکہ معظمہ سے دو تین میل پر ہے، اس کتب خانہ کی فقہ وتصوف اور فلسفہ ومنطق وغیرہ کی کتابیں جلا ڈالی ہیں، یہ قطعاً غلط اور کذب محض ہے، اور کتب خانہ آج بھی ان کتابوں کا وجود وفد مذکور کی سنی ہوئی عینی شہادت کی تکذیب کرنے کو تیار ہے، اور ہندوستان میں بھی سیکڑوں اس کے دیکھنے والے موجود ہوں گے،

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ
عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (مائدہ)

کسی قوم کی عداوت تمھارے اس جرم کے
ارتکاب کی باعث نہ ہو کہ تم اسکے ساتھ
انصاف نہ کرو (ہر حال میں) انصاف کرو
یہ پرہیزگاری کے بہت قریب ہے

یہ جملہ معترضہ تھا، جو اس لیے لکھا گیا، تاکہ اسلام کا کوئی آیندہ مخالف مورخ اس واقعہ کو دوسرا کتب خانہ اسکندریہ نہ بنالے۔

حرم کا دوسرا عمومی کتب خانہ شروانیہ کے نام سے موسوم ہے، یہ کتبخانہ محمد رشدی پاشا شروانی زادہ جو کسی زمانہ میں حجاز کے والی تھے، ان کا وقف کیا ہوا ہے، باب ام ہانی کے پاس سڑک کے رخ ایک چھوٹا سا کمرہ حرم سے ملاکر بنایا گیا ہے، اس کی کھڑکیاں حرم کی سمت میں کھلتی ہیں، یہ نہایت چھوٹا کتب خانہ ہے، چند سو کتابیں ہوں گی، جو زیادہ تر مطبوعہ ہیں، کچھ قلمی بھی ہیں، عربی کے علاوہ ترکی، فارسی، اردو کی بھی کچھ کتابیں اس میں موجود ہیں، فارسی کتابوں میں ایک بہاری مہاجر عالم کے قلم سے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا ایک نسخہ نظر آیا، عربی کتابوں کی فہرست پوری دیکھی، حدیث اور علوم القرآن کے متعلق بعض رسائل کے نام اس میں ملے، بالفعل اس کتب خانہ کو ایک ریڈنگ روم بنادیا گیا ہے، جس میں اخبارات و رسائل آتے ہیں، اور لوگ شام کو انکو پڑھنے جاتے ہیں،

مکہ معظمہ کے چار غیر سرکاری کتب خانوں میں سے تین ہندوستان کے شرمندۂ احسان ہیں، ایک مدرسہ صولتیہ کا کتب خانہ ہے، اس کتب خانہ کی صرف فہرست میں نے دیکھی، مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا خاصا مجموعہ ہے، زیادہ تر ہندوستان اور مصر کی مطبوعہ کتابیں ہیں، کچھ یورپ کے مطبوعات ہیں، درسی کتابیں زیادہ ہیں، جو ایک مدرسہ کے مناسب حال ہیں، اس فہرست میں کوئی نادر کتاب نظر سے نہیں گذری،

دوسرے کتب خانہ کا نام فیضیہ ہے، یہ ایک ہندوستانی عالم کی ذاتی ملکیت ہے، کتب خانہ جاکر نہیں دیکھا، موصوف نے کتب خانہ کی فہرست میرے پاس بھجوادی تھی، جس کو میں نے شروع سے آخر تک مطالعہ کیا، مطبوعات کا مجموعہ ہے، کچھ قلمی کتابیں بھی ہیں، جن میں مکہ معظمہ کی دو تاریخیں قابل تذکرہ ہیں، العقد الثمین فی تاریخ علماء البلد الامین جو علامہ فاسی (المتوفی ۸۳۲ھ) کی تصنیف ہے، اور جس میں مکہ معظمہ کے علما، حکام، قضاۃ،

اور رجال کے حالات ہیں، دوسری کتاب شفاء الغرام فی اخبار البلد الحرام ہے، اسی مصنف کی ہے، اور جس میں شہر مکہ معظمہ کی تاریخ ہے،

تیسرا کتب خانہ بیت دہلوی کی ملکیت ہے، اور جس کو ہمارے دوست اور کرم فرما مولانا عبدالوہاب صاحب نے اپنے شوق سے جمع کیا ہے، یہ علم کے شائق اور نوادر کتب کے عاشق ہیں اور خود بھی علم و آگاہی رکھتے ہیں، اور مجھے مسرت ہے کہ میرے اور موصوف کے درمیان پہلے ہی سے تعلقات غائبانہ خط وکتابت سے قائم تھے، اب یہ "شنیدہ دیدہ" ہو کر اور بھی زیادہ مستحکم ہوگئے، یہ کتب خانہ ابھی اپنے نوجوان اور فاضل مالک کے زیر سایہ نشو ونما پا رہا ہے، اس کتب خانہ میں متعدد نادر کتابیں ہیں، از انجملہ امام حمیدی کی الجمع بین الصحیحین کی، جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، دوسری جلد ہے، میری نگاہ میں شیخ نصیف کے کتب خانہ میں اس کی پہلی جلد اور اس میں دوسری جلد ایک ہی نسخہ کی دو متفرق جلدیں ہیں، عجب نہیں کہ دونوں صاحب ایک ایک جلد دوسرے سے نقل کرا کر اپنا اپنا نسخہ مکمل کرالیں، اسی موضوع پر امام اشبیلی کی اسی نام کی الجمع بین الصحیحین کی پہلی جلد ہے، حمیدی نے مسند کے طرق پر جمع کیا ہے، اور اشبیلی نے فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے،

امام ابن جوزی نے جامع المسانید کے نام سے تمام مسند حدیثیں یکجا کی تھیں، حاجی خلیفہ نے اس کا نام جامع المسانید والالقاب لکھا ہے، اور لکھا ہے کہ "یہ بہت بڑی کتاب ہے"۔ اس کتب خانہ میں اس کتاب کی چوتھی جلد ہے،

فن سیرۃ میں زرقانی کے بعد حافظ سیوطی کے شاگرد شیخ محمد بن یوسف دمشقی صالحی شامی

کی تصنیف سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد سب سے مبسوط کتاب ہے، مصنف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ تین سو کتابوں سے اس نے یہ کتاب تالیف کی ہے، سات سو کے قریب اس میں باب ہیں، شروع میں مصنف نے پوری فہرست دیدی ہے، غالباً یہ ۸ جلدوں میں تمام ہوئی ہے، اس کتب خانہ میں یہ کتاب تمام وکمال موجود ہے، حاجی خلیفہ نے اس کے ذکر میں لکھا ہے کہ "متاخرین کی تصانیف میں یہ کتاب سب سے بہتر اور سب سے مبسوط ہے"، مولانا شبلی مرحوم، سیرت کی تصنیف کے زمانہ میں اس کے جویا تھے، اور خیال آتا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ اس کے بعض اجزا، حیدرآباد کے کسی کتب خانہ میں ہیں، میں نے یہ کتاب جابجا سے دیکھی، شاگرد میں اپنے استاد کا پورا اثر تو پایا یعنی شامی بھی اپنے استاد سیوطی کی طرح حاطب اللیل ہیں، اور ہر قسم کی روایتیں اس میں جمع کردی ہیں، سیرۃ شامی کے نام سے یہ کتاب مشہور ہے، حلبی کی سیرت جو چھپ کر متداول ہوچکی ہے، وہ عیون الاثر لابن سید الناس اور اسی کتاب کی ملخص ہے۔

چوتھا ذاتی کتبخانہ قازان کے عالم ملا مراد کا ہے، مجھے رات کے وقت اسکے سرسری دیکھنے کا موقع ملا۔

مدینہ منورہ کو اللہ تعالیٰ نے جو فضیلتیں عطا کی ہیں، اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ یہاں ابتک نوادر کتب کا انبار پڑا ہے، اور یہ سب کے سب ترکوں کے علمی فیض وجود کی یادگاریں ہیں، جنگ عظیم کے زمانہ میں ترکوں نے عرب میں اپنا جنگی مرکز مدینہ منورہ کو بنایا تھا، شریف حسین نے جب بغاوت کی اور عرب کی حالت متزلزل نظر آئی تو ترکوں نے حجرۂ مطہرہ میں جو یادگار تھے اور شہر کے کتب خانوں میں جو نادر کتابیں تھیں

وہ شام منتقل کر دیں، اتفاق سے شام بھی ہاتھ سے نکلنے لگا تو حجرۂ مطہرہ کی یادگاریں اور ان نادر کتابوں میں سے بھی نادر کتابیں چھانٹ کر قسطنطنیہ بھجوا دی گئیں، باقی کتابیں وہیں پڑی رہیں، سو اتفاق سے اسی اثنا میں سیلاب آیا جسکا اثر اس مکان میں بھی پہنچا، جس میں یہ کتابیں پڑی تھیں، چنانچہ مدینہ کے کتب خانوں میں سے سیدنا عثمان کے کتب خانہ کو اس سے زیادہ نقصان پہنچا، عرب اور شام کے تسلط کے بعد جب فیصل شام کے بادشاہ تھے، اور امیر علی مدینہ کے حاکم مقرر ہوئے تو کتب خانہ والوں نے امیر علی سے کہہ سن کر شام سے کتابیں واپس منگائیں، اس خرابی بصرہ کے بعد جو کتابیں بچ گئی ہیں وہی اب مدینہ منورہ کی علمی بزم کی رونق اور زینت ہیں۔

گذشتہ لڑائی میں امیر علی نے حفاظت کی غرض سے شہر کے کتب خانوں کی کل کتابیں عارف حکمت بے شیخ الاسلام کے کتب خانہ میں وہیں کے ناظر ابراہیم حمدی بے کی نگرانی میں یکجا کر دی تھیں، حمدی بے ایک نہایت بیدار، محتاط اور کام کرنے والے ترکی عالم ہیں، انھوں نے ہر کتب خانہ کی کتابیں گن گن کر علیحدہ رکھوائیں، اور ہر ایک کی علیحدہ فہرست بنائی، اور امن و امان کے بعد ہر ایک سے واپسی کے دستخط لے کر ہر کتب خانہ کے متولی کو کتابیں فہرست کے مطابق واپس کر دیں، اسی محنت اور دلچسپی کو دیکھ کر اس عہد حکومت میں ان کو مدینہ کے تمام کتب خانوں کا نگراں مقرر کر دیا گیا ہے، اس کتب شماری اور فہرست سے ہم کو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ کے ان کتب خانوں کی کتابوں کا حال بھی معلوم ہو گیا جن کو ہم نے جا کر خود نہیں دیکھا، حمدی بے کی تحقیق اور شمار کے مطابق اس وقت چھوٹے بڑے ذاتی اور موقوفہ مدینہ میں چودہ (١٤) کتب خانے ہیں، اور ہر ایک کی کتابوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

نام	تعداد کتب	نام	تعداد کتب
۱۔ کتب خانہ روضۂ مطہرہ	۱۳۳۲	۸۔ کتب خانہ عرفانیہ	۱۲۷۴
۲۔ کتب خانہ امین پاشا	۱۱۴۵	۹۔ کتب خانہ سیدنا عثمان	۱۴۵۷
۳۔ کتب خانہ مدرسۃ الشفا	۱۴۷۲	۱۰۔ کتب خانہ شیخ وزیر تونسی (دارالضیافہ)	تقریباً ۳۰۰
۴۔ کتب خانہ شیخ محمد معصوم	۳۷۵۰	۱۱۔ کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے	۱۷۰۰۰
۵۔ کتب خانہ حسین آغا (قریب بقیع)	نامعلوم	۱۲۔ کتب خانہ سانہ کزلی	۸۳۲
۶۔ کتب خانہ مدرسہ قرہ باش	۱۵۵۹	۱۳۔ کتب خانہ مدرسہ ازبک	۷۳۲
۷۔ کتب خانہ محمودیہ (سلطان محمود)	۵۲۱۰	۱۴۔ کتب خانۂ ثروت	۵۱۳

بعض اور مقامات بھی ہیں جہاں موقوفہ کتابیں ہیں، لیکن ان کی تعداد ۵۰۰ یا ۵۰۰ سے کم ہے، مثلاً

۱۵۔ کتب خانۂ کیلی ناظر تقریباً ۵۰۰

۱۶۔ کتب خانہ کہربا (متعلقہ محکمۂ برقیات یادگار سلطان عبدالحمید) ۱۱۱

۱۷۔ کتب خانہ عبدالحمید بخاری ۱۳۲

۱۸۔ کتب خانۂ بہائیہ (بہاء الدین قازانی) ۱۲۴

یہ سب موقوفہ کتب خانہ ہیں۔ ان کے علاوہ چند شخصی کتب خانے بھی ہیں، جو لوگوں کی ذاتی ملکیت ہیں:

۱۔ کتب خانۂ شیاطلی (شیاط مصر کے ایک گاؤں کا نام ہے)	۲۵۰۰	۴۔ کتب خانۂ صافیہ	۱۰۰۰
۲۔ کتب خانۂ سادات مدینہ بخاری	تقریباً ۱۰۰۰	۵۔ کتب خانۂ حمدیہ (حمدی بے)	۱۰۰۰
۳۔ کتب خانۂ جمال الدین	۱۰۰۰	۶۔ کتب خانۂ یوسف معصوم	۱۰۰۰

(معارف اکتوبر ۱۹۲۶ء)

(۲)

مکہ معظمہ کے کتب خانۂ حرم کی نایاب کتابوں کی کوئی فہرست منتخب کرنے کی فرصت نہ مل سکی کہ صبح سے شام تک موتمر کے جھمیلوں میں رہنا پڑتا تھا، ہر روز ارادہ کرتا تھا کہ آج نہیں تو کل یہ کام کرلوں گا، مگر ہر روز بروز دگر افتاد، آخر روانگی کا دن آگیا، اور یہ کام نہ ہوسکا، مجھے افسوس ہے لیکن الحمد للہ کہ مدینہ جا کر اس کی پوری تلافی ہوگئی،

مدینہ منورہ میں وسعت، انتظام، صفائی، باقاعدگی، حفاظت اور مختلف فنون کی کتابوں کی حیثیت سے شیخ الاسلام عارف حکمت بے کا کتب خانہ بے نظیر ہے، یہ کتب خانہ مسجد نبوی سے متصل باب جبرئیل کے قریب قبلہ کی سمت میں واقع ہے، کتبخانہ کی عمارت جس زمین پر بنائی گئی ہے، وہ مکان حضرت جعفر صادقؓ کا ہے، اسی سے متصل یعنی اس کے اور مسجد نبویؐ کے بیچ میں ایک مکان ہے جو اب سبیل ہے، اس پر دیار عشرہ مبشرہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات عشرہ مبشرہ کے گھر تھے، مگر یہ صحیح نہیں، یہ درحقیقت وہ مجلس تھی، جہاں حضرت عمرؓ صحابہ کو بلا کر مشورے کیا کرتے تھے، اسی کتب خانے کے بالمقابل حضرت ابوایوب انصاریؓ کا وہ گھر ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر مہمان اترے تھے،

کتب خانہ کی عمارت دو منزلہ ہے، مسجد نبوی کی سمت ایک وسیع کمرہ جو کتب خانہ کا اصل مقام ہے، اسی ایک کمرے میں تمام کتابیں ہیں، کتابیں لکڑی کی الماریوں میں ہیں،

الماریوں میں شیشے لگے ہیں، زمین پر قالین کا فرش ہے، بیچ میں ایک میز ہے، جس پر زمین کا ایک کرہ رکھا ہوا ہے۔ اسی کمرے کی دوسری سمت میں دو کمرے ایک دوسرے کے بازو میں ہیں، ان میں کتب خانہ کے ایک دو ملازم رہتے ہیں۔

کتب خانہ کے کمرہ کی باہر والی دیوار پر عربی، فارسی، ترکی کے مختلف قطعات اور رباعیاں نہایت خوشخط وصلیوں پر لکھی ہوئی آویزاں ہیں، قدیم ترکی سلطنت، حجاز ریلوے اور مسجد نبوی کے نقشے بھی آویزاں ہیں، قطعات میں بعض قطعے خود شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے طبع زاد ہیں منجملہ ان عربی، فارسی اور ترکی منظومات کے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان میں ایک اردو نعتیہ غزل بھی کاغذ پر خوشخط لکھی ہوئی، شیشہ میں جڑی ہوئی آویزاں تھی، نیچے اردو کے اس خوش نصیب شاعر کا نام دیکھ اور بھی تعجب ہوا، کہ یہ دکن کا ہندو نام اور اسلام دل صوفی شاعر مہاراجہ کشن پرشاد شاد (سابق مدار المہام دولت آصفیہ حیدر آباد دکن) تھے، مطلع اور مقطع یہ ہے:

یہی کہتے ہیں مدح خوانِ محمدؐ	جو شانِ خدا ہے وہ شانِ محمدؐ
شفاعت تری شاد کیونکر نہ ہوگی	کہ دل سے ہے تو مدح خوانِ محمدؐ

یہ پوری غزل میرے روزنامہ میں لکھی ہوئی ہے۔

کتب خانہ کے واقف عارف حکمت بے تیرہویں صدی کے مشہور ترک علما میں تھے، مدینہ منورہ میں یہ قاضی ہو کر آئے تھے، ۱۲۷۰ھ میں اس کی بنیاد ڈالی،

انھوں نے یہ زمین خریدی، اس پر یہ مختصر سی مگر نہایت صاف اور نکھری ہوئی عمارت بنوائی، کتابوں کے بڑے شائق اور عاشق تھے، اپنی جائداد اور دولت کا بڑا حصہ انھوں نے ان پر صرف کیا، اور معقول ذخیرہ فراہم کیا تھا، یہ کتابیں اسی عمارت میں رکھیں، پھر مقدونیہ اور ایشیائے کوچک میں اپنی جائداد اس کتب خانہ کی بقا و ترقی کے لیے وقف کی، اسی جائداد کی آمدنی اس کتب خانہ پر صرف ہوتی تھی، بلقان کی لڑائی کے بعد مقدونیہ وغیرہ کی جائداد ملکیت سے نکل گئی، پھر بھی ایشیائے کوچک کے منافع سے ابتک کام چل رہا تھا، عرب کی علیحدگی کے بعد بھی ٹرکی کے صیغۂ اوقاف سے اس کی آمدنی برابر وصول ہوتی تھی، مگر اب دو سال سے جب سے انگورہ کی حکومت نے صیغۂ اوقاف کو صیغۂ مال میں داخل کر دیا ہے یہ آمدنی موقوف ہے، کتب خانہ میں اس وقت ایک ناظر اعلیٰ شیخ عبدالقادر حوار ہیں، وہ اس وقت مدینہ منورہ میں نہ تھے، کہیں سیر و سیاحت میں ہیں، ان کے نیچے شیخ ابراہیم حمدی خربوطی ہیں، یہی اس وقت اس کتب خانہ میں عملاً سب کام کر رہے ہیں، ان کے نیچے عمر آفندی ہیں، یہ سب کے سب ترک ہیں، یا ترکی الاصل ہیں، مکان کی صفائی، الماریوں کی ترتیب، فہرست کی خوش خطی، ہر چیز سے ترکی خوش سلیقگی ظاہر ہوتی ہے۔

اس کتب خانہ کا عربی حکومت سے نہ پہلے کوئی تعلق تھا، اور نہ اب ہے، دو سال سے ٹرکی سے اس کی آمدنی بند ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ غیور ترک کس طرح فقر و فاقہ کے ساتھ شب و روز اپنے فرائض میں مشغول ہیں، یہ کتب خانہ اس مرکز اسلام میں ترکوں کی علمی قدر دانی کی ایک زندہ یادگار ہے، انگورہ کی حکومت کو زیبا نہیں کہ اس یادگار کو اپنے تغافل سے مٹنے دے، ہم نے ترکی کے مشیر سفارت محمود ندیم بے سے جدہ میں یہ تحریک کی تھی، کہ وہ حکومت کو متوجہ کریں، کہ کتب خانہ کی آمدنی صیغۂ مال سے اس کو

بدستور ملتی رہے،

کتب خانہ میں عربی، فارسی، ترکی کی کتابیں ہیں، زیادہ تر حصہ عربی کتابوں کا ہے، جلدوں کی تعداد مجھے سترہ ہزار بتائی گئی، ہر کتاب عمدہ جلد بندھی ہوئی، صاف ستھری اور خوش خط ہے، اکثر کتابیں غیر مطبوعہ اور قلمی ہیں، اور مختلف علوم و فنون سے متعلق ہیں، اکثر کتابوں کی زیارت کی، اور پوری فہرست استیعاب کے ساتھ دیکھی، ہر علم و فن میں مجھکو نایاب کتابیں معلوم ہوئیں، اُن کے نام لکھ لیے۔

علوم القرآن

(۱) برہان القرآن لمافیہ من الحجۃ والبرہان للامام محمود بن حمزۃ الکرمانی (۲) البرہان الکاشف عن اعجاز القرآن للامام عبد الواحد بن الخطیب زملکانی (۳) تاویلات القرآن فی بیان اصول السنۃ واصول التوحید للامام ابی منصور الماتریدی جمع الشیخ علاء الدین محمد بن احمد السمرقندی (۴) التعریف والاعلام فیما ابہم فی القرآن من الاسماء والاعلام للشیخ عبد الرحمن بن الخطیب عبد اللہ الخثعمی السہیلی (۵) الجامع لاحکام القرآن للامام قرطبی (قرآن پاک کی جمع و ترتیب کی تاریخ اور اس کے فضائل اور وجوہ اعجاز اور احکام فقہی پر مختصر بحث) (۶) الدر المصون فی علوم الکتاب المکنون للشیخ شہاب الدین احمد بن یوسف المعروف بالسمین (کشاف کی طرز کی ایک بے مثل ادبی و نحوی لغوی تفسیر، جو میرے نزدیک بعض وجوہ سے زمخشری کی کشاف سے بہتر ہے) (۷) رسالہ فی اعجاز القرآن للعلامہ قاسم بن فیرہ الشاطبی (۸) رسالہ فی اعجاز القرآن للامام المطرزی (۹) قید الاوابد من الفوائد والعوائد و الزوائد مما یتعلق بالقرآن المجید للعلامہ عبد الملک بن حسین العصامی (مصنف کے ہاتھ کا)

(۱۰) القول الصحیح فی تعیین الذبیح لتقی الدین السبکی (۱۱) مشکل اعراب القرآن و ذکر علله وصعبه ونادره للشیخ محمد کی بن ابی طالب حموش الاندلسی النحوی (۵۸۹ھ کا لکھا ہوا نسخہ) (۱۲) مشکلات القرآن لمحمد بن عبد التوقانی (مصنف کے ہاتھ کا ۶۶۶ھ کا لکھا ہوا نسخہ) (۱۳) معانی الآیات المتشابہات الی الآیات المحکمات للشیخ ابی عبداللہ محمد شمس الدین المعروف بابن اللبنا، (ابن اللبان المصری کی ایک کتاب حافظ وہبہ نے اس موضوع پر قسطنطنیہ سے شائع کی تھی) (۱۴) ملاک التاویل بذوی الالحاد والتعطیل (۱۵) الناسخ والمنسوخ للشیخ ہبۃ اللہ ابن سلامہ بن علی المقری النحوی (۱۶) نفائس المرجان فی جمع قصص القرآن للعلامہ صفی الدین الموصلی (۱۷) مجموعہ کلام الشافعی فی احکام القرآن للامام ابی بکر البیہقی (۱۸) مختصر من کلام المقعد المقیم فی علوم القرآن للامام ابن الجوزی۔

۲۔ کتبِ حدیث

۱۹۔ تسہیل السبیل الی کشف الالباس عما دار من الاحادیث بین الناس للعلامہ محمد غرس الدین الخلیلی المدنی (۲۰) تصحیح عمدۃ الاحکام عن سید الانام للامام تقی الدین عبد الغنی المقدسی الحنبلی للشیخ بدر الدین محمد الزرکشی (۲۱) تصحیفات المحدثین للحافظ ابی احمد الحسن بن عبداللہ العسکری (۲۲) تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الشنیعہ الموضوعہ للشیخ علی بن محمد بن عراق الکنانی (۲۳) تنویر الحوالک علی موطا امام مالک للسیوطی (۲۴) الجمع بین الصحیحین للحمیدی (۲۵) جمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد للامام محمد بن سلیمان المغربی (الجزء الاول الی الغزوات) (۲۶) الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج للسیوطی،

(۲۷) فتح المتعال فی مدح النعال للحافظ احمد بن محمد المقری التلمسانی (۲۸) فضل الخیل للامام شرف الدین عبد المومن الدمیاطی (۲۹) کتاب الزہد الکبیر للامام ابی بکر احمد بن الحسین البیہقی (۶۲۶ھ کا نسخہ) (۳۰) کتاب الیقین لابی بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی الدنیا القرشی (۳۱) الکواکب الدراری فی شرح صحیح البخاری للکرمانی (۳۲) مسند الفردوس للحافظ زین الدین شہردار بن شیرویہ الدیلمی (۳۳) مصباح الزجاجہ علی سنن ابن ماجہ للسیوطی (۳۴) معجم حافظ احمد بن محمد الاصفہانی السلفی (۳۵) ملخص موطا الامام مالک للعلامہ ابی الحسن علی ابن محمد بن خلف القابسی المعافری (۳۶) ما ورد فی حیات الانبیاء و بعد وفاتہم علیہم السلام لابی بکر البیہقی (۳۷) نجاح القاری فی شرح صحیح البخاری لمحمد یوسف زادہ (۳۸) وسیلۃ الطالب الی نیل المطالب للعلامہ یحییٰ بن ابی بکر الحنفی۔

۳۔ توحید و عقائد

(۳۹) الارشاد فی عقائد اہل السنۃ من العباد للامام الحرمین (۴۰) اسرار التنزیل وانوار التاویل للرازی (۴۱) انوار القوامیہ فی الاسرار الکلامیہ للرازی (۴۲) اثبات عذاب القبر لابی بکر البیہقی (۴۳) التنبیہ علی الاسباب التی اوجبت الاختلاف بین المسلمین فی آرائہم و مذاہبہم لابی محمد عبد اللہ بن السید البطلیوسی (۴۴) الفریدۃ الشمسیہ للعلامۃ الآمدی (۴۵) التجرید فی کلمۃ التوحید للامام احمد الغزالی (۴۶) رسالۃ فی علم اللہ تعالےٰ للآمدی (۴ ورق) (۴۷) رسالہ فی علم التوحید للامام محمد بن حسن بن فورک (۱۲ ورق) (۴۸) شرح عقیدۃ الامام الطحاوی للعلامہ عمر بن اسحاق الہندی (۷۴۶ھ کا نسخہ) ہندوستان کے لیے یہ قابل فخر اور قدیم یادگار چیز ہوگی۔

(۴۹) شرح عقیدۃ الامام ابی منصور الماتریدی للسبکی (۲۱ ورق)

۴۔ کتب مغازی وسیر

(۵۰) الفیۃ السیر النبویہ للحافظ عبد الرحیم العراقی (۵۱) خیر البشر بخیر البشر للشیخ محمد بن ظفر الصقلی (مصنف سلسلی کا باشندہ تھا) (۵۲) سبل الہدیٰ والرشاد فی سیر خیر العباد و اعلام نبوتہ واحوالہ فی المبدء والمعاد للعلامہ یوسف الدمشقی الصالحی جزء ۳ و ۴ (۵۳) عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر لابن سید الناس (۵۴) نور النبراس علی سیرۃ ابن سید الناس للعلامہ برہان الدین ابراہیم بن محمد بن خلیل سبط ابی العجمی۔

۵۔ اصول حدیث ورجال ومتعلقات حدیث

(۵۵) معرفۃ علوم الحدیث للامام محمد بن عبد اللہ الحاکم النیسابوری (۵۶) التقصی فی معرفۃ شیوخ الامام مالک لابن عبد البر (۵۷) اختصار علوم الحدیث للحافظ عماد الدین ابن کثیر (۵۸) ذکر اسماء من اتفق البخاری ومسلم علی تصحیح الروایۃ عنہ من الصحابۃ للحافظ ابی الفتح محمد بن ابی الفوارس (۵۹) شواہد التوضیح والتصحیح لمشکلات الجامع الصحیح للبخاری للحافظ ابی عبد اللہ بن مالک الطائی (۶۰) منتخب الاسماء والانساب والکنی والالقاب للحافظ الذہبی (۶۱) مقدمۃ الکاشف المصطلح عن حقائق السنن للامام الطیبی (۶۲) النکت علی بن الصلاح لبدر الدین الزرکشی (۶۳) الہدایۃ والارشاد فی معرفۃ الثقۃ و السداد الذین اخرج لہم البخاری فی جامعہ للشیخ احمد الکلاباذی (۶۴) معجم شیوخ البخاری ومسلم و ابی داؤد والترمذی والنسائی والقزوینی (۶۵) التقریب والتیسیر لمعرفۃ سنن البشیر النذیر للامام النووی۔

۶۔ تاریخ واخبار

(۶۶) انباء الغمر بانباء العمر للحافظ ابن حجر العسقلانی (۶۷) انباء نجباء الابناء لمحمد بن ظفر الصقلی (مصنف سسلی کا باشندہ تھا) (۶۸) اخبار المستفید باخبار خالد بن ولید شیخ الاسلام رضی الدین بن محمد حنبلی۔ (۶۹) البدر الطالع من الضوء اللامع لاہل القرآن التاسع لاحمد بن محمد بن عبد السلام تلمیذ امام سخاوی (۷۰) تاریخ ابی الحارث ایبک من ملوک الہند لحسن نظامی نیشاپوری (اس میں ابو المظفر محمد بن سام کا ذکر ہے) (۷۱) تاریخ مدینۃ اصفہان للحافظ احمد بن عبد اللہ الاصبہانی (۷۲) تاریخ جزری لشمس الدین محمد الجزری (۷۳) تاریخ امام بقاعی (۸۵۵ھ سے ۸۷۰ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے) (۷۴) تاریخ سلاطین گجرات از سلطنت ظفر خاں تا سلطنت محمود خاں (۷۵) تحفۃ الکبار فی اسفار البحار حاجی خلیفہ چلپی (ترکوں کے بحری فتوحات کی تاریخ) (۷۶) تفریج الہموم وتعزیۃ الغموم فی الرحلۃ الی بلاد الروم لمصطفی بن کمال الدین البکیری الخلوتی (۱۱۳۵ھ کا سفرنامہ ہے) (۷۷) التعریف بما انست الہجرۃ من معالم دار الہجرۃ للمطری (مدینہ منورہ کی مستند تاریخ) (۷۸) تاریخ دولۃ الاکراد الایوبیہ (۷۹) تیمور نامۂ ہاتفی (۸۰) رحلۃ العلامہ عیاشی لابی سالم عبد اللہ بن ابی بکر العاش المغربی (۱۰۵۹ھ کا سفرنامہ مراکش سے عرب تک) (۸۱) رسالہ فی من نسب الی امہ من الشعراء لمحمد بن حبیب بروایۃ عثمان بن جنی (۸۲) کتاب الاصنام لابی المنذر ہشام بن محمد الکلبی (طبع کے بعد بھی نہیں ملتی)
(۸۳) الزبد والضرب فی تاریخ حلب لمحمد بن ابراہیم بن الحنبلی الحنفی
(۸۴) رسالۃ ایمان العرب لابی اسحاق ابراہیم بن عبد اللہ النجیری (یہ رسالہ اب مطبع سلفیہ مصر میں چھپ گیا ہے)

(۸۵) سفارت نامہ چین (سلطان سلیم بن بایزید کے عہد حکومت میں فارسی میں لکھی گئی) (۸۶) سکردان السلطان لابی العباس احمد بن یحیی التلمسانی الشہیر بابن ابی عجلۃ الدمشقی (۸۷) سیاحت نامہ للعلامہ محمد خلیل بن محمد السرہندی الاحمدی الفاروقی (فارسی میں اس ہندوستانی عالم نے بانی کتب خانہ احمد عارف بے کے لیے لکھی، اس میں لاہور اور کل پنجاب کا مختصر حال ہے)

(۸۸) سیر البلاد لخادم العظیم آبادی (پٹنہ کے ایک عالم امام بخش خادم نے ۱۲۴۳ھ میں ایران، عراق وجزائر عرب کا سفرنامہ لکھا، اس میں مولف کے اردو کلام کا نمونہ بھی ہے)

(۸۹) سیر الملوک منسوب بہ نظام الملک وزیر سلجوق (۹۰) سنی الوفاۃ من بدء الہجرۃ الی آخر القرن العاشر لابی الفلاح عبد الحئی بن احمد بن محمد العکبری الصالحی المعروف بابن العماد الحنبلی (۹۱) شذرات الذہب فی اخبار من ذہب فی التراجم

(۹۲) شفاء الغرام باخبار البلد الحرام لتقی الدین محمد بن احمد بن علی الحسینی الفاسی المکی

(۹۳) صفوۃ الزمان فی من تولی علی مصر من امیر و سلطان للعلامہ مصطفی الصفدی القلعاری الشافعی

(۹۴) ضوء القبس فی مناقب ابی حنیفۃ والشافعی واحمد و مالک بن انس (۹۵) الطالع السعید الجامع لاسماء نجباء الصعید لابی الفضل جعفر بن ثعلب الادفوی (۹۶) طبقات الحکماء لمحمد بن الخطیب الزوزنی (۹۷) طبقات الشافعیۃ الصغری للسبکی

(۹۸) طبقات الشافعیہ لابن قاضی شہبۃ الاسدی (۹۹) طبقات الشافعیۃ لابی الحسن الاسنوی

(۱۰۰) طبقات الشعراء لمحمد بن سلام الجمحی (شعرائے عرب کے حال میں سب سے پہلی کتاب یورپ میں چھپ چکی ہے اور اب مصر میں بھی چھپ گئی ہے، مگر یہ نسخہ بہت پرانا اور لائق اعتماد ہے)

(۱۰۱) طبقات القراء للقاسم بن فیرۃ الشاطبی (۱۰۲) طبقات المفسرین لہ

(۱۰۳) طبقات المحدثین وطبقات علماء الوضع وطبقات المورخین وطبقات علماء الاصول (چند اوراق میں مختصر سا رسالہ)

(۱۰۴) ظفرنامہ فی وقائع امیر تیمور (فارسی) (۱۰۵) عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات واخبار الامم الماضیہ والقرون الخالیہ عمر بن احمد الشہیر والدہ بالصفدی نقلہ من الکتب، (۱۰۶) العقد المذہب فی طبقات حملۃ المذہب لابی حفص عمر بن علی الاندلسی الشہیر بابن الملقن المصری (۱۰۷) عقود الجمان وتذییل وفیات الاعیان لابن خلکان للامام الزرکشی (۱۰۸) فتوح مصر لمحمد بن اسحاق الاموی (۱۰۹) الفہرست لابن الندیم (یورپ میں چھپ چکی ہے، مگر رجوع واعتماد کے لیے اس کا ذکر کر دیا ہے) (۱۱۰) القبس الحاوی لغرر ضوء السخاوی (مختصر الضوء اللامع) لزین الدین عمر بن احمد الاثری الحلبی (۱۱۱) قرۃ العیون فی اخبار الیمن المیمون لعبد الرحمن بن علی الشیبانی الشہیر بابن الربیع الزبیدی (۱۱۲) قلائد عقود الدرر والعقیان فی مناقب الامام ابی حنیفۃ النعمان لابی القاسم بن عبد العلیم الحنفی الیمنی (۱۱۳) کفایۃ المحتاج لمعرفۃ من لیس فی الدیباج لاحمد بابا بن احمد التنبکتی (۱۱۴) الکواکب السائرہ بمناقب اعیان المائۃ العاشرہ لنجم الدین محمد بن بدر الدین الغزی العامری القرشی الدمشقی (۱۱۵) الکواکب الدریہ فی السیرۃ النوریہ (سلطان نور الدین شہید کی سوانح عمری) (۱۱۶) کتاب اسماء الصحابہ لابی حاتم محمد بن حبان (۱۱۷) کتاب الزیارات لابی بکر بن علی الہروی (مصنف نے جن مقامات کی زیارت کی ان کا حال) (۱۱۸) اللباب فی معرفۃ الانساب لابن اثیر الشیبانی (سمعانی کا خلاصہ) (۱۱۹) لالہ استان فی تراجم المشائخ للعلامۃ البہاری؟ (۱۲۰) لب التواریخ (فارسی) للامیر یحییٰ بن عبد اللطیف القزوینی (۱۲۱) مجموعہ تواریخ ملوک الفرس لابی شجاع بن ملک شاہ (۱۲۲) مطلع السعدین ومجمع البحرین فی وقائع وحوادث سنہ ۸۷۵ھ لکمال الدین عبد الرزاق بن جلال الدین السمرقندی (حزان) (۱۲۳) مختصر ریاض النفوس فی طبقات فقہاء مدینۃ القیروان وافریقیہ وما یلیہا للشیخ ابی بکر عبد اللہ بن محمد المالکی للعلامہ یحییٰ بن ابراہیم المالکی۔

(١٢٤) محذوات القصور فی تاریخ اہل العصور لابن القطامی الحجری المصری (١٢٥) المعجم فی آثار ملوک العجم لفضل اللہ بن عبد اللہ (١٢٦) الذیل علی الروضتین فی اخبار الدولتین لابی محمد عبد الرحمن ابن اسمٰعیل الشہیر بابی شامہ المقدسی (١٢٧) مرآۃ الممالک للسید علی کاتبی رومی (سفرنامہ) (١٢٨) المستفاد من فعالات الاجواد لابی محسن بن علی التنوخی (١٢٩) المرقاۃ الوفیہ فی طبقات الحنفیہ للمجد الفیروزآبادی (١٣٠) معجم المشائخ للسید مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) بخط مؤلف، (١٣١) مناقب الامام الاعظم لمحمد بن محمد الکردری (١٣٢) منتخب الدرر الکامنہ للحافظ السیوطی۔ (١٣٣) منتخب طبقات الشافعیہ لابن الصلاح لابی زکریا یحییٰ بن شرف النحوی (١٣٤) المنتخب من "المؤتلف والمختلف فی اسماء الشعراء والقابہم للشیخ الآمدی" لابراہیم احمدی۔ (١٣٥) نزہۃ المشتاق فی علماء العراق لابی البرکات محمد الرحبی (١٣٦) ہفت اقلیم امین رازی (١٣٧) ہفت کشور فخر الدین بن اسیری الہروی (١٣٨) وصایائے نظام الملک الوزیر

٦۔ کتبِ ادب و دواوین

(١٣٩) اجوبۃ عن الاعتراضات فی شرح شعر المعری لابی محمد عبد اللہ بن السید البطلیوسی (١٤٠) الایضاح شرح مقامات الحریری لابی الفتح ناصر بن ابی المکارم عبد اللہ المطرزی (١٤١) الاحتیال بما فی شعر ابی العتاہیۃ من الامثال للشیخ یوسف بن عبد اللہ النمیری القرطبی ابن عبد البر، (١٤٢) تسلیۃ الفواد فی قصائد آزاد بلگرامی (١٤٣) لتشبیہات لابی اسحاق البغدادی المکی (کس چیز کو کس چیز سے تشبیہ دیجاتی ہے) ٦٤٦ھ کا نسخہ (١٤٤) ترجمۃ المتنبی لابی منصور الثعالبی (١٤٥) الندلی فی التلی لہٗ (١٤٦) التحسین والتقبیح لہٗ (١٤٧) جزء فیما وجد من کلام ابن الخشاب ستدراکاً علی الحریری فی مقاماتہ للشیخ عبد اللہ احمد بن الخشاب البغدادی۔

(۱۴۸) جملة من شرح المفضليات (۱۴۹) حدائق السحر فی دقائق الشعر لرشید الدین الوطواط (فارسی)
(۱۵۰) دمیة القصر وعصرة اہل العصر لعلی بن الحسن الباخرزی (۱۵۱) الدیوان الثامن لآزاد بلگرامی (سات دیوان ہندوستان میں ہیں) (۱۵۲) دیباجہ شرح الحماسہ لاحمد المرزوقی الاصبہانی
(۱۵۳) رسالة الصاحب بن عباد فی مساوی شعر المتنبی (۱۵۴) رسالة وقصائد لابی عثمان الجاحظ (۱۵۵) شرح ارجوزة ابی نواس لابی الفتح عثمان بن جنی (۱۵۶) شرح دیوان ابی تمام لابی بکر محمد بن یحییٰ الصولی (۱۵۷) شرح دیوان ابی فراس الحمدانی
(۱۵۸) الشرح المختصر علی الحماسہ للخطیب التبریزی (۱۵۹) شرح دیوان ذیة بن العجاج
(۱۶۰) شرح دیوان زہیر احمد بن یحییٰ بن زید ثعلب النحوی (۱۶۱) شرح دیوان المتنبی لابی العباس احمد بن علی بن یعقوب الازدی المہلبی (۱۶۲) شرح مختارات المتنبی کلاہما للمعری المسمی باعجاز احمد (۱۶۳) شرح المعلقات السبع لابی جعفر احمد بن محمد بن اسمٰعیل المعروف بابن النحاس (۱۶۴) شرح المعلقات السبع للخطیب التبریزی (۱۶۵) شرح مقامات الحریری لابی البقاء العکبری (۱۶۶) شرح مقصورہ ابن درید لمحمد بن احمد السبتی المعروف بابن ہشام اللخمی (۱۶۷) شرح بعض دیوان ابی فراس الحمدانی لابن خالویہ (۱۶۸) ضرام السقط فی شرح سقط الزند للقاسم بن الحسن الخوارزمی صدر الافاضل (۱۶۹) عنوان المرقصات والمطربات لنور الدین علی بن موسیٰ الوزیر الغرناطی الاندلسی (۱۷۰) فرائد الخرائد فی الامثال والحکم لابی یعقوب یوسف بن طاہر النحوی تلمیذ المیدانی نذب کتاب استاذہ (۱۷۱) الفلک الدائر علی المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر لابی المعالی القاسم بن ہبة اللہ المعروف بابی حدید المدائینی (۱۷۲) کتاب الخیل لابی عبیدة معمر بن المثنی التیمی نہایت عتیق نسخہ (۱۷۳) کتاب المبہج فی اسماء شعراء الحماسہ لابی الفتح عثمان بن جنی (اس میں

شعراء کے حالات نہیں، بلکہ شعرائے حماسہ کے ناموں کے اشتقاقات اور معانی لکھے ہیں)

(۱۷۴) الملتقط من المتنبی لابی الحسن الواحدی ملائم محمود بن عمر الزمخشری (۱۷۵) شرح لامیۃ العجم لابن الانباری (۱۷۶) مناظرات الوطواط مع الزمخشری (ایک ورق)

(۱۷۷) مختارات الحماسہ للشیخ محمد الحلبی (۱۷۸) مختارات المتنبی (۱۷۹) النجدیات الف بیت فی النسیب لمحمد بن ابی العباس احمد الابیوردی (۱۸۰) نزول الغیث وھو اعتراضات ومناقشات مع الصفدی فی شرحہ علی لامیۃ العجم للعلامہ بدر الدین محمد بن ابی بکر المخزومی الدمیاطی (۱۸۱) نصرۃ الثائر علی المثل السائر للعلامہ صلاح الدین الصفدی (۱۸۲) امالی ہبۃ اللہ السجزی (جزآن)

کتب خانہ میں قدامت کے اعتبار سے جس کی تاریخ معلوم ہے، سب سے پرانی کتاب غالباً حضرت ابن عباسؓ کی روایات تفسیر جو تفسیر ابن عباسؓ کے نام سے چھپی ہوئی ملتی ہو ان کے آخری چند اوراق ہیں، یہ سورۂ فلق اور والناس وغیرہ آخری سورتیں ہیں، ختم پر اس کی کتابت کی تاریخ سہ شنبہ ۱۲ رجب ۳۱۶ھ مرقوم ہے، یہ ہرن کی کھال کے کاغذ پر لکھی ہوئی ہے، ہرن کی کھال کو اس قدر پتلا اور چکنا کیا گیا ہے کہ موٹا کاغذ معلوم ہوتا ہے، قرآن مجید کا ایک چھوٹی تقطیع کا نسخہ ہے جو پورا شتر مرغ کی کھال کے کاغذ پر ہے، ابتدائی اوراق ضائع ہوگئے ہیں، تو وہ ہرن کی کھال پر لکھ کر لگا دیے گئے ہیں، شتر مرغ کی کھال کا کاغذ نہایت باریک ہے، اس کا خط کوفی ہے، اور اعراب اور شاید نقطوں سے بھی خالی ہے، کسی نے بعد کو سیاہی سے اس پر اعراب اور نقطے لگا کر اس کی خوبی کو برباد کیا ہے، سال تاریخ اس پر نہیں ہے، مگر کسی نے پہلے صفحہ پر لکھ دیا ہے کہ بخط عثمان رضی اللہ عنہ یا نہ ہو، مگر اعراب اور نقطوں کے نہ ہونے کے سبب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعراب اور نقطوں کی ایجاد

کے پہلے لکھا گیا ہو، اعراب اور نقطے حجاج کے زمانہ سنہ میں لگائے گئے ہیں،

ابو ہلال عسکری کی کتاب الاوائل کا نسخہ ۳۹۵ھ کا لکھا ہوا ہے، ابن ابی عون اسحاق بغدادی کی کتاب التشبیہات ۳۲۲ھ کی ہے، اسی طرح محمد بن سلام الجمحی المتوفی ۲۳۱ھ کی طبقات الشعراء کا نسخہ بھی نہایت پرانا ہے،

یہ اس مضمون کا تیسرا نمبر ہے، شاید ناظرین محض کتابوں کے ناموں کو دیکھ دیکھکر گھبرا گئے ہوں اگر انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے بزرگوں کا یہی اندوختہ ہے جو ان کے علمی کارناموں کی یادگار رہے، یورپ کے علمائے مستشرقین کی نگاہوں میں ان کی یہ وقعت ہے کہ وہ اس کا ایک ایک ورق سونے کے تول سے خریدتے ہیں، اور ہمارے اسلاف نے بھی ان سفینوں کو اپنے سینوں سے لگاکر رکھا تھا، اور اب ان ہی کے اخلاف کو یہ بھی خبر نہیں کہ یہ جواہر ریزے اب کہاں کہاں بکھرے ہیں اور ضرورت ہو تو کہاں سے دستیاب ہوسکتے ہیں، اسی مضمون میں کتابوں کے ناموں کی تفصیل سے یہی مقصود ہے کہ ہمارے علما، اور شائقین علم کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت ہماری مقدس سرزمین کے خزانہ میں کیا کیا نایاب گوہر ہیں،

شیخ الاسلام کے کتب خانے کے بعد دوسرا قابل ذکر کتبخانہ کتب خانہ محمودیہ ہے، سلطان محمود عثمانی نے اپنے زمانۂ حکومت میں جو کارنامے انجام دیے اُن میں ایک قابل ذکر کارنامہ مدرسہ محمودیہ ہے، یہ مدرسہ مسجد نبوی سے متصل باب السلام کے راستہ میں داہنی طرف واقع ہے، یہ مسجد مبارک سے اس قدر ملا ہوا ہے کہ اس کے اوپر کے کمروں کی کھڑکیاں مسجد نبوی کے صحن میں کھلتی ہیں، ان کمروں میں بیٹھیے تو مسجد کا صحن بالکل نگاہ کے سامنے ہو جاتا ہے، اس کی دیوار اس سمت میں جس پر "خوخہ ابی بکر رضی اللہ عنہ" (یعنی حضرت ابو بکرؓ کے گھر سے مسجد نبوی میں آنے کا دروازہ جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت

ہیں فرمایا تھا کہ "ابوبکر کی کھڑکی کے علاوہ سب کھڑکیوں کو بند کر دو" مسجد نبوی ہی کی آخری دیوار ہو گئی ہے۔

مدرسہ کے صدر دروازہ کے اوپر اب تک سپید پتھر میں کھدا ہوا یہ کتبہ لگا ہے:

"مدرسۃ جلالۃ الحضرت سلطان محمود"

سلطان محمود نے اس کے لیے شام میں جائداد وقف کی تھی، جس کی آمدنی سالانہ حج کے موقع پر شامی محمل کے ساتھ اخیر اخیر تک آیا کرتی تھی، مگر اس بڑی جنگ کے بعد جب سے فرانس نے شام پر قبضہ کیا ہے، دوسرے اوقاف کے ساتھ یہ وقف بھی فرنچ دست برد میں ہے، مدرسہ بالکل ویران ہے، دو منزلہ عمارت تھی، طلبہ کے رہنے کے الگ کمرے تھے، درس کے الگ، مگر اب ایک طرف کی چھت گر گئی ہے، درس و تدریس کا سلسلہ بند ہے، اس کے موجودہ متولی زین العابدین قندیلی ہیں، قندیلی کے معنی یہ ہیں کہ ان کا خاندان مسجد نبوی کی قندیلوں کی نگرانی اور روشنی کا مہتمم تھا،

اس مدرسہ کے پھاٹک میں نے ہمیشہ بند پائے، قندیلی صاحب سے جب میں نے اس کے دیکھنے کا شوق ظاہر کیا، تو دوسرے دن اس کا وقت مقرر کیا، اندر گیا تو دیکھا کہ اس پر ایک ویرانی سی چھائی ہے، متولی صاحب نے اندر چند حاجیوں کو غالباً کرایہ پر جگہ دے رکھی ہے، اوپر کی منزل میں مسجد مبارک کی سمت کے کمرہ میں کتب خانہ تھا، کتب خانہ کھولا گیا، تو معلوم ہوا کہ شاید مدت سے یہاں کسی کا گذر بھی نہیں ہوا ہے، تمام گرد پڑی تھی، دیواروں سے لگی ہوئی الماریاں اور الماریوں میں بے ترتیب کتابیں رکھی ہوئی تھیں،

ٹرکی نے جنگ عظیم میں مدینہ منورہ کے جن کتب خانوں کو وہاں سے شام منتقل کر دیا تھا، ان میں سے ایک یہ بھی تھا، وہاں یہ کتابیں قشلہ حمیدیہ میں رکھی گئی تھیں، ترکوں نے جب شام

خالی کیا، تو نادر کتابیں چن کر قسطنطنیہ منتقل کر دیں، اور بقیہ کتابیں وہیں پڑی رہیں، اسی اثنا میں وہاں نہر میں سیلاب آیا، جس سے کتابوں کو نقصان پہنچا، ملک میں جب تسلط ہوا، اور شریف علی مدینہ کے امیر مقرر ہوئے تو متولیوں نے ان سے کہہ سنکر کتابیں واپس منگوائیں اسی طرح اس کتب خانہ کی کتابیں واپس آئیں، جن میں ایک صندوق ایسا ہے جس کی کتابیں سیلاب کے پانی سے اس طرح برباد ہوگئی ہیں کہ ورق سے ورق الگ نہیں ہو سکتا،

اس وقت اس کتب خانہ میں پانچ ہزار کے قریب کتابیں ہیں، جو الماریوں میں ترتیب سے فنوار رکھی ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ کتب خانہ کو کسی واقف کار نے ترتیب نہیں دیا ہے، اس لیے کہیں کی کتابیں کہیں رکھ دی گئی ہیں، بعض کتابیں تو تلاش کرنے پر ملیں بھی نہیں، قلمی کتابوں کے ساتھ مطبوعہ کتابیں بھی یہاں ہیں، کتابوں کی فہرست بھی ہے، جو کتابیں قسطنطنیہ چلی گئی ہیں، ان پر حرف "غ" یعنی غائب کا اشارہ بنا دیا گیا ہے۔

بہر حال یہ تو ظاہری حالت کا نقشہ ہے، کتابوں کو جب میں نے ہاتھ لگایا تو خوشی سے اچھل پڑا کہ حدیث و تفسیر کا اتنا نایاب ذخیرہ ابتک میری نگاہوں نے نہیں دیکھا تھا، بہت سی کتابیں جن کو صرف ایک نظر دیکھنے کی تمنا تھی وہ یہاں آج پوری ہوگئی، حسرت رہی کہ بہت سی کتابیں جن کا ایک ہی نسخہ یہاں تھا، وہاں قسطنطنیہ چلا گیا، یا اگر دو نسخے تھے تو کامل چلا گیا اور ناقص یہاں رہ گیا، کاش ترک اتنا ایثار کرتے کہ ان کتابوں کو مرکز اسلام پر دوبارہ جمع کر دیتے کہ تمام دنیائے اسلام ان سے متمتع ہو سکتی،

آج پہلا دن تھا کہ میری آنکھوں نے دلائل النبوۃ امام بیہقی، معرفۃ اصول الحدیث امام حاکم، شرح سنن ابی داؤد لابن ارسلان شرح بخاری لکرمانی شرح بخاری لابن بطال، تمہید شرح موطا

لابن عبد البر، البیان لاحکام القرآن للموزعی الیمنی، زاد المسیر فی علم التفسیر لابن جوزی، تفسیر ابن ابی حاتم، نزہتہ المحکم، شرح صحیح مسلم وغیرہ کتابیں دیکھیں اور خدا کا شکر ادا کیا۔

ذیل میں ہم کتب خانہ محمودیہ کی نادر قلمی کتابوں کی منتخب فہرست درج کرتے ہیں، ان میں دو چار مطبوعہ کتابوں کے نام بھی ہیں، مگر ان کی ندرت اور کمیابی کی وجہ سے ذکر کر دی ہیں:

۱۔ تفسیر

۱۔ تفسیر خطیب شربینی ۶ جلد

۲۔ تفسیر امام عمر نسفی ۴ "

۳۔ تفسیر ابی الحسن البکری الصوفی

۴۔ تفسیر قرطبی

۵۔ تفسیر البیان لاحکام القرآن لجمال الدین محمد بن علی ابن الخطیب المعروف بابن نور الدین الموزعی الیمنی ۸۲۵ھ میں تالیف ہوئی،

۶۔ تفسیر البقاعی ۵ جلد

۷۔ زاد المسیر فی علم التفسیر لابن الجوزی

۸۔ تفسیر ابن کثیر (چھپ چکی ہے)

۹۔ ابن حبان (چھپ چکی ہے)

۱۰۔ تفسیر الوسیط للواحدی النیسابوری

۱۱۔ کشف البیان للامام الثعلبی ۹ جلد

۱۲۔ تفسیر احکام القرآن للرازی الحنفی (چھپ گئی)

۱۳۔ تفسیر ابن ابی حاتم تیسری جلد

۱۴۔ تفسیر المنتخب من البیان فی اعراب القرآن لابن یعیش النحوی جزء اول

۱۵۔ تفسیر معنی القرآن لعلی الطبری

۱۶۔ تفسیر لمحمد بن سہیل الدمیاطی بسندہ عن ابن عباسؓ

۱۷۔ تفسیر الثمرات فی احکام القرآن کامل

۱۸۔ تفسیر ابن جریر طبری (چھپ چکی ہے)

۱۹۔ جواہر الدرر فی التفسیر بالخبر والاثر

۲۰۔ ذکر آیات القرآن المتشابہات لزکریا الانصاری

۲۱۔ تفسیر التبیان فی اعراب القرآن للعکبری

۲۔ متعلقاتِ تفسیر

۲۲۔ البرہان فی علوم القرآن للزرکشی

۲۳- تفسیر مشکل القرآن

۲۴- بدیع القرآن للشیخ زکی الدین ابن ابی اصبع

۲۵- نواسخ القرآن لابن الجوزی

۲۶- غرر البیان فی مبہمات القرآن

۲۷- اعراب القرآن العظیم

۲۸- تاویل مشکل القرآن

۲۹- غریب القرآن للمرزوقی

۳۰- التبیان فی آداب حملۃ القرآن للنووی

۳۱- طیبۃ النشر لقراء العشر لابن الجوزی

۳- احادیث

۳۲- شرح بخاری للکرمانی

۳۳- التکملہ شرح ترمذی للعراقی وہو تکملۃ علی الشرح الحافظ ابن سید الناس

۳۴- حیات المہجہ علی سنن الترمذی

۳۵- شرح ترمذی للبغوی حصہ ثانی

۳۶- سنن کبیر للبیہقی

۳۷- مختصر سنن کبیر للبیہقی بخط تلمیذ مصنف

۳۸- شرح صحیح بخاری لابن بطال

۳۹- شرح صحیح مسلم للقاضی عیاض

۴۰- نزہۃ الحکم وبہجۃ المفہم شرح صحیح مسلم

۴۱- المطالب العالیہ الزوائد المسانید الثمانیہ للعسقلانی

۴۲- مسند ابی بکر بن ابی شیبہ

۴۳- تخریج احادیث الشفا لعبد العزیز الزبیدی

۴۴- شرح الشفا للدلجی

۴۵- معتمد ذوی العقول مع جامع الاصول فی احادیث الرسول لابن بریلہ

۴۶- مجمع الزوائد لنور الدین الہیثمی ۵ جلد

۴۷- تمہید شرح موطا لابن عبد البر

۴۸- تنویر الحوالک شرح موطا مالک للسیوطی

۴۹- فتح الرحمٰن شرح موطا امام محمد

۵۰- مصنف ابن ابی شیبہ ۲ جلدیں

۵۱- الافصاح عن معانی الصحاح لابن ہبیرہ جلد ۱-۲-۳-۴

۵۲- مستدرک حاکم جلد چھپ چکی

۵۳- الثانی من تلخیص المستدرک للذہبی

۵۴- دلائل النبوۃ للبیہقی

۵۵- الاستذکار لابن عبد البر

۵۶- کتاب العمدہ للامام القشیری

۵۷- عمدۃ الاحکام للمقدسی

۵۸- کتاب الاطراف المعتلی باطراف مسند امام احمد للعسقلانی

۵۹- کتاب التقییدات

۶۰- مختصر امتاع الاسماع باحادیث اتفق علی تخریجہا الستۃ الائمۃ لیحیی بن محمد الکرمانی

۶۱- معجم ابن عساکر

۶۲- کتاب الاباطیل والمناکیر والصحاح والمشاہیر

۶۳- بدر التمام من احادیث سید الانام

(۶۴) الناسخ والمنسوخ من الحدیث

(۶۵) جواہر اللآلی لابی المعالی مع نزہۃ الخواطر فی ذکر الحفاظ والاکابر

۶۶- تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف

۶۷- موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان

۶۸- الغریب المصنف لابی عبید

۶۹- تنقیح المفہوم فی الحدیث

۷۰- دلائل النبوۃ لابی نعیم چھپا ہے
مگر جابجا سے ناقص ہے۔

۷۱- التنقیح لالفاظ الجامع الصحیح لبدر الدین
الزرکشی

۷۲- کتاب الام امام شافعی (چھپ چکی ہے)

۷۳- موضوعات ابن جوزی

۷۴- جزء من اطراف المزی

۷۵- شرح سنن ابی داؤد لابن رسلان

۴- اصول حدیث ورجال

۷۶- معرفۃ اصول الحدیث للحاکم

۷۷- کتاب النسبۃ الی المواضع والبلدان لجمال الدین

۷۸- تہذیب الاسماء واللغات نووی

۷۹- مختصر اسماء الضعفاء والواضعین لابن الجوزی

۸۰- الاکتساب من کتاب الانساب مختصر السمعانی

۸۱- مغانی الاخیار فی اسامی رجال معانی الآثار
او۳ للعینی

۸۲- الانساب للسمعانی (عکسی چھپی ہے)

۸۳- تہذیب الکمال للمزی جلد ۱ و ۳ و ۴ و
۵ و ۶ و ۹ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۳

۸۴- اسماء رجال مسند

۸۵- ثقات ابن حبان

۸۶- لب الالباب فی تحریر الانساب للعکبری
ماجاء فی جامع المسانید لابن الجوزی

۸۷- المؤتلف والمختلف للدارقطنی

۸۸- کشف النقاب عن جرح فی الصحیحین
من الاصحاب

۵۔ تاریخ و سیر

۸۹۔ عیون الاثر فی فنون المغازی و الشمائل والسیر

۹۰۔ سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، جلد ۱و۳و۵و۶و۷، ۸و۹

۹۱۔ الدرر الکامنہ فی اعیان المایۃ الثامنہ للعسقلانی ۲ جلد

۹۲۔ کتاب الہدی لابن القیم (شاید زاد المعاد ہے)

۹۳۔ السیرۃ لابن ہشام (چھپی ہوئی مگر پھر بھی نادر ہے)

۹۴۔ تاریخ مدینۃ السخاوی جزء ثالث

۹۵۔ تاریخ الخطیب جزء ۳۳

۹۶۔ تاریخ مکہ لازرقی (چھپی ہے)

۹۷۔ المسجد المسبوک الزبرجد المحبوک فی تاریخ دولۃ الاسلام والملوک

۹۸۔ تاریخ مدینۃ السلام جزء اول

۹۹۔ انساب الاشراف جزء

۱۰۰۔ طبقات وسطی للسبکی (کبری چھپی ہے)

۱۰۱۔ تلقیح ابن الجوزی

۱۰۲۔ طبقات المفسرین للامام شمس الدین الداؤدی

۱۰۳۔ مختصر الطبقات

۱۰۴۔ طبقات ابن سعد کی آخر جلد اور ایک ٹکڑا (چھپا ہے پھر بھی نادر ہے)

۱۰۵۔ طبقات الحنابلہ جزء ۴

۱۰۶۔ اعلام الاخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار للکفوی

۱۰۷۔ کتاب الاعلام فیما یجب علی الانام من معرفۃ النبی علیہ السلام لابن الفرج القرطبی۔

مکتب خانہ سیدنا عثمانؓ: یہ کتب خانہ حضرت عثمان ذی النورینؓ کے نام نامی کے ساتھ اس لیے منسوب ہے کہ یہ آپ کے مسکن مبارک میں قائم ہے۔ مسجد نبویؐ میں باب جبرئیل کے نام سے جو دروازہ ہے، اُدھر سے نکلیے تو قبلہ کی سمت "دیار عشرہ مبشرہ" کا جو کتبہ لگا ہوا ہے، اسی کے مقابل کے ایک مکان پر "مشہد سیدنا عثمان" یعنی حضرت عثمانؓ کی شہادت گاہ" مرقوم ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ اپنے گھر ہی کے بالا خانہ میں

شہید کیے گئے تھے، اس بنا پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا گھر بہت بڑا تھا جس کی ایک حد مسجد نبوی کی سمت وہ مقام تھا جو آپ کا مشہد ہے، اور دوسری طرف گلی میں دور تک چلا گیا ہے، اور جو اب کئی گھروں کی صورت میں بٹ گیا ہے، جس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف مالکوں کے قبضہ اور تصرف میں رہا ہے۔

امیر جوبان نے ایک زمانہ میں اس کا ایک حصہ لے کر مسافر خانہ بنا دیا تھا جس کا نام رباط العجم ہے، اسی کے ایک بازو میں کہا جاتا ہے کہ سلطان نورالدین شہید کا مزار ہے، جس کا دروازہ آجکل بند کر دیا گیا ہے، سلطان عبدالحمید خاں اول نے اس مکان کا باقی حصہ خرید کر وقف کر دیا تھا، اس مکان کے دروازہ پر سلطان کے نام کا کتبہ لگا ہے، اوپر کتبہ میں والدۂ سلطانی کا تذکرہ ہے، کتبہ کے اشعار ترکی میں ہیں، اس لیے پوری طرح مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

یہ مکان بھی اندر سے بے مرمت پڑا ہے، اس وقت بخاری حجاج یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، میرے جانے کی خبر متولی صاحب کو پہلے معلوم ہو چکی تھی، ابراہیم حمدی بے خربوطلی نے ان کو مطلع کر دیا تھا، اس لیے کتب خانہ کے سامنے جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا، کتب خانہ مکان کی چھت پر ایک کمرہ میں تھا، کتب خانہ کا دروازہ جب کھولا گیا تو اس کے اندر اس قدر گرد تھی کہ ہم بیٹھ نہیں سکتے تھے، برادر عزیز ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ندوی بی، ایس، سی اس وقت ہمارے ساتھ تھے، اور کتابوں کی تلاش میں مدد دے رہے تھے، تمام کتابیں کچھ الماریوں میں، کچھ زمین پر، کچھ طاقوں میں اس طرح بے ترتیب پڑی تھیں، اور اس طرح گرد آلود تھیں کہ اہل شہر کی ناقدری اور متولی کی غفلت پر افسوس آتا تھا۔

کتابوں کی کوئی فہرست بھی نہ تھی، بہزار دقت ایک ایک کتاب کو اٹھا اٹھا کر اور جھاڑ جھاڑ کر دیکھنا شروع کیا، یہ دیکھ کر کس قدر تعجب ہوا کہ اس کتب خانہ کا نہایت قدیم تعلق اندلس، مراکش اور دیار مغرب کے مختلف شہروں سے ثابت ہوا، اکثر نسخے وہیں کے تھے اور ان ہی اطراف کے مصنفین کے تھے، چونکہ وہاں مالکی مذہب کا رواج تھا، اور ہے، اس لیے مالکی مذہب کی کتابیں بیشتر تھیں، قرآن پاک کے اکثر نسخے مغربی خط میں تھے، جو کوفی خط کے قریب ہے، سب سے زیادہ جس منظر کو دیکھ کر دل پاش پاش ہوا، وہ ایک الماری کے نیچے ہرن کی کھال پر لکھے ہوئے قرآن کے متعدد نسخوں کے منتشر اوراق تھے، ہندوستان کے کسی کتب خانہ میں اگر اس قرآن کا ایک ورق بھی ہوتا تو کتابوں کے شایق دور دور سے اس کو دیکھنے کو آتے

ان کتابوں میں جو مجھکو نادر معلوم ہوئیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱- الاستذکار شرح موطا مالک لابن عبدالبر
۲- المسالک علی موطا مالک للشیخ ادریس الفاسی
۳- المنتقیٰ شرح موطا مالک للباجی
۴- شرح بخاری للکرمانی
۵- التنقیح علی الجامع الصحیح للزرکشی
۶- مسند القضاعی فی الحدیث
۷- سنن کبریٰ للبیہقی (ناقص)
۸- معجم کبیر للطبرانی
۹- تفسیر ثعالبی
۱۰- کتاب الوقف والابتداء لابن العربی
۱۱- کتاب الناسخ والمنسوخ
۱۲- الاکتفاء فی السیرۃ للکلاعی
۱۳- تاریخ فتوح مصر لابن عبدالحکیم
۱۴- مشارع الاشواق الی مصارع العشاق لابن النحاس
۱۵- اجابۃ الداعی الی شرح غریب اکتفاء الکلاعی
۱۶- جزء من تبصرۃ اللخمی فی الفقہ
۱۷- کتاب الکافی لابن عبدالبر
۱۸- شرح ابن حاجب علی الزدادی فی الفقہ

شرح مدونۂ امام مالک لابی الحسن الصغیر ۲۱۔ بہجۃ النفوس لابن ابی جمرہ

شرح تنقیح للقاضی ابی محمد بن عبد الوہاب البغدادی

گیارہویں کتاب کتاب الناسخ والمنسوخ ایک خاص حیثیت سے نہایت قابل قدر ہے، مصنف (نام معلوم نہیں) نے لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب تفسیر کی ۹۵ کتابوں سے لیکر مرتب کی ہے، ساتھ ہی اس کا سال تصنیف ۸۳۰ھ ہے، اور یہ اس جزیرہ میں بیٹھکر لکھی گئی ہے، جس کے نام کو ہر مشرقی حاجی نہایت درد اور مصیبت کے ساتھ لیتا ہے، یعنی جزیرۂ کمران (کامران) کیا یہ جزیرہ کبھی اسلامی علوم کا مرکز بھی رہا ہے؟ اب تو یہاں چند ہزار بدوی یمنی و حبشی عربوں کے سوا اور کچھ نہیں، مصنف نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جزیرہ اسوقت یمن کا حصہ ہے۔

فسبحان مقلب الایام واللیالی

(معارف اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۶ء)

کتب خانۂ عارف حکمت بے | یہ تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں عارف حکمت بک ٹرکی کے شیخ الاسلام تھے، وہ کتابوں کے بڑے شائق تھے، اور ان کا بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا، ۱۲۷۰ھ میں انھوں نے یہ تمام ذخیرہ سرزمین پاک یثرب میں استفادۂ عام کے لیے وقف کر دیا، اس کتب خانہ میں گیارہ بارہ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں، جن میں زیادہ تر قلمی کتابیں تھیں، سات سو خاص شعرائے عرب کے دواوین ہیں، یہ کتب خانہ باب جبرئیل کے قریب ایک خوبصورت عالیشان عمارت میں قائم ہے، کتب خانہ کے اخراجات کے لیے یعنی کتب خانہ کے بانی نے ایک وقف بھی چھوڑا ہے، جس سے اس وقت اس کے اخراجات چلتے ہیں، ملازمین کتب خانہ میں سے ناظم اور محافظ اول کی سات سات سو قرش تنخواہیں ہیں، محافظ دوم کی چھ سو، اور محافظ سوم کی ۵۰۰ قرش تنخواہ ہے، علاوہ ازیں محافظ چہارم

جلد ساز، دربان، بہشتی اور جاروب کش وغیرہ ملازمین کتب خانہ ہیں،

اس کتب خانہ کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مطبوعہ کتابوں سے زیادہ نایاب، نادر قلمی کتابیں ہیں، اگرچہ ان میں کی اکثر کتابیں طبع ہو چکی ہیں، تاہم کتابت میں خاص امتیاز رکھنے کے ساتھ بعض مخصوص تاریخی اہمیت رکھتی ہیں جس کی تفصیل پر ذیل کی فہرست سے قدرے روشنی پڑے گی،

(۱) ایک مجلد قرآن مجید شتر مرغ کے چمڑے پر بہترین اندلسی خط میں لکھا ہوا ہے جسے ۴۸۴ھ میں عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن مرزوق بن احمد بن مکانس بطلیموسی نے مریہ (اندلس) میں لکھا تھا،

(۲) اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک تفسیر قرآن ۳۱۰ھ کی لکھی ہوئی کتب خانہ میں محفوظ ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کے چند اجزاء ضائع ہو گئے ہیں،

(۳) نویں صدی کے مشہور عالم جلال الدین سیوطی کی ایک کتاب محاضرات و محاورات خود انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے،

(۴) ایک کتاب افعال ابن القوطیہ بھی نوادر میں ہے، جو ۴۷۹ھ کی لکھی ہوئی ہے،

(۵) ابو اسحاق بن ابی عون البغدادی کی ایک تصنیف کتاب التشبیہات ہے اس کا ایک نسخہ مشرقی خط میں لکھا ہوا اس کتب خانہ میں بھی ہے، جس کا سنہ کتابت ۴۶۶ھ ہے۔

(۶) ملا شاہی کا فارسی دیوان بھی اس کتب خانہ میں قلمی موجود ہے، یہ دیوان بہترین خط ابیض میں لکھا ہوا ہے،

(۷) رضی الدین محمد بن ابراہیم حنبلی کی کتاب کتاب الزہر و العزب فی تاریخ حلب

بھی یہاں قلمی موجود ہے۔

(۸) محمد بن سلام الجمحی کی طبقات القراء۔

(۹) جمال الدین ابو عبید اللہ بن احمد المطری کی کتاب التعریف بما انست الہجرۃ من معالم دار الہجرۃ بھی وہاں موجود ہے، کتاب التعریف میں فضائلِ مدینہ منورہ، فضائلِ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، مدینہ منورہ کی دیگر مسجدوں وادی مدینہ اور وادی عقیق کے حالات اور حرم کے حدود وغیرہ بیان کیے گئے ہیں،

(۱۰) اسی طرح سید محمد کبریت المدنی کی کتاب الجواہر الثمینہ مکتوبہ ۱۰۴۷ھ اور ان کی کتاب نصر من اللہ فتح قریب کا قلمی نسخہ، جس میں فضلائے مدینہ کے تراجم ہیں موجود ہیں،

(۱۱) اسی طرح علامہ ابو الحسن علی بن یحیٰی بن عیسیٰ بن جزلۃ الطبیب البغدادی کی تقویم البلدان فی تدابیر الانسان کا ایک قلمی نسخہ اور

(۱۲) یحیٰی بن ابی بکر العامری کی غربال الزمان المفتتح بسید ولد عدنان کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے، عامری کی یہ تصنیف امام اسعد یافعی کی مختصر یا ملخص ہے، جس میں بہ ترتیب سنین ۸۷۵ھ تک کے تاریخی واقعات اور اس زمانہ تک کے مشاہیر کے تراجم بیان کیے گئے ہیں، ان کتابوں کے علاوہ

(۱۳) الراعی الشہیر بابن حذاء بردی المتوفی ۱۱۹۵ھ کی البرق المتالق فی محاسن جلق

(۱۴) نویں صدی کے لبودی دمشقی کی النجوم الزاہر فی معرفۃ الاواخر

(۱۵) کتاب محذرات القصور فی تاریخ اہل العصور لابن قطری البحیری،

المورخ المصری المتوفی ۸۹۵ھ اور کتاب ایمان العرب لابی اسحاق النجیری الکاتب کا ایک ایک قلمی نسخہ اس کتب خانہ میں موجود ہے۔

افسوس ہے کہ بانی کتب خانہ کی آخری عمر کی تمام جمع کردہ کتابیں ضائع ہوگئیں کیونکہ ان کا انتقال ایک دوسری جگہ ہوا، اور وہ تمام کتابیں جو ان کے پاس تھیں ناقدر دانوں کے ہاتھوں نہایت سستے داموں فروخت ہوگئیں۔ ان ہی کتابوں میں عربی علم ادب کی مشہور کتاب کتاب الاغانی بھی تھی۔ یہ وہی نسخہ ہے جو مطبوعہ صورت میں ارباب علم و ادب تک پہنچا۔

کتب خانہ عارف حکمت بک کے لیے یہ سخت قابل تاسف امر ہے کہ اس کی فہرست ابتک شائع نہیں ہوئی کہ ارباب ذوق مستفید ہوسکیں۔ شاید حجاز کا جدید انقلاب حکومت اس کتب خانہ کو راس آئے۔ اور علم دوست سلطان ابن سعود کی توجہ اس کتب خانہ کی طرف بھی منعطف ہوجائے۔

سفرِ گجرات

کی

چند یادگاریں

جولائی ۱۹۳۳ء میں بڑودہ کی مجلس سیرت کے سلسلہ میں مجھے گجرات کے سفر کا اتفاق ہوا، اس خطہ کو ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں چند خصوصیتیں حاصل ہیں، اول یہ کہ عرب اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا، دوسرے یہ کہ عرب سے جو علماء دریا کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوتے تھے، وہ پہلے یہیں اترتے تھے، موقع ملتا تو آگے بڑھتے ورنہ یہیں سے لوٹ جاتے تھے، ہندوستان سے جو علماء عرب جانا چاہتے تھے، وہ اسی راستہ سے سفر کرتے تھے، اس صوبہ کے سیکڑوں دیہات حرمین محترمین کے مصارف کے لئے وقف تھے، دوسرے ملکوں سے جو نادر اور تحفہ چیزیں یہاں آتی تھیں، وہ پہلے یہیں پہونچتی تھیں، حج کے لئے ہر سال ہزاروں علماء امراء اور عام مسلمان اسی راہ سے منزل مقصود کی طرف روانہ ہوتے تھے،

اخیر زمانہ میں سلطان عالمگیر اور سیواجی کی سیاسی کشمکش کا میدان جنگ یہی خطہ تھا، اور اس لئے سلطانی لشکر کا پڑاؤ اکثر یہاں رہتا تھا، اور اس تعلق سے یہ صوبہ کبھی

پورے ہندوستان کا دارالسلطنت بنجاتا تھا، اور ہر قسم کے اہلِ کمال ادھر کا رُخ کرتے تھے،

دکن و گجرات کے علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے، اور جو ہے وہ ہندوؤں کی کثرت، زور و قوت، اور سیلابِ تمدّن میں غوق ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان کے علمی و مذہبی و سیاسی مرکز یعنی ہندوستانِ خاص سے وہ بہت دور ہے، اس لیے یہاں کے دیہاتوں اور قصبوں میں مسلمانوں کی حالت قابلِ رحم تھی، سلطان عالمگیر کی دوربین نگاہوں سے ان وجوہ واسباب کا نتیجہ چھپا نہ تھا، سلطان نے اس پورے علاقہ میں علماء صوفیہ، اور مذہبی معلّمین کی قطار در قطار آبادکر دی، موذن خطیب، امام اور ملا (جو جانور شرعی طور سے ذبح کرتے تھے) موروثی مقرر کر دیئے، اور ان سب کے لئے وظائف اور سرکاری اوقاف معین کئے، جو آج تک اُن کے اخلاف کے قبضہ میں ہیں، وہاں کے دیہاتوں میں آج تک ان ہی ملاؤں کی اولاد اپنے اس فرض کو ادا کر رہی ہے یہاں تک کہ کوئی ہندو بھی اگر جانور ذبح کرانا چاہتا ہے، تو یہ خون انہی کے ہاتھوں سے گرتا ہے، یہاں اب بھی ایسے سیکڑوں، ہزاروں شریف خاندان آباد ہیں، جو انہی مذہبی فرائض کے لئے یہاں آباد کئے گئے تھے، اور اُن کو اس کے لئے سرکاری اوقاف دیے گئے تھے جن پر وہ آج تک قابض ہیں، اور انہی کے بدولت آج انگریزی سرکار میں بھی ان کو عزت اور وقار حاصل ہے، اور مسلمانوں کی کچھ ممتاز صورتیں وہاں نظر آتی ہیں،

بھڑوچ | جس کے کنارے دریائے نربدا بہتا ہے، اور جو آگے چل کر بحرِ عرب میں مل جاتا ہے، عربوں کے خشکی و تجارتی آمد و رفت کا مرکز تھا، عرب اس کو بروص کہتے ہیں، ۱۵ھ میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں جب اسلام کے ملکی

فتوحات کا شباب تھا، ان کے جنگی جہاز اس کے ساحل پر آ کر لگے تھے، سفر کے اثنا میں جب میں بھڑوچ پہونچا، اور نربدا کے کنارے آکر کھڑا ہوا، تو تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو چھتیس برس پہلے کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کر دیں اور گو میں شاعر نہیں، تاہم جذبات کے تلاطم نے موزوں ترانہ کی شکل اختیار کر لی۔

نربدا! اے نربدا! اے جادۂ بحرِ عرب! — گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحرِ عرب
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز — تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا، مرا پہلا جہاز
تو گذشتہ کاروانوں کا نشانِ راہ ہے — ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
رشتۂ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار — تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہے اس کی یادگار
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو — چار صدیوں تک رہا، اسلام کا دمساز تو
آج کس کو یاد ہے وہ داستانِ باستان — تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کارواں
تو ہے دریائی پری یا شاہدِ عالم ہے تو — اس سمندر کے گلے کی شہ رگِ اعظم ہے تو
تیرا ہر قطرہ حیاتِ نو کا اک سرشار جام — اس تنِ آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام
اے بھڑوچ! اے خاتمِ انگشتِ رودِ نربدا — عہدِ ماضی کی تری عزت رہی باقی سدا
توتیائے چشمِ ظاہر آج تیری خاک ہے — ذرہ ذرہ پہ ترے خورشیدِ ذی لولاک ہے
یادگارِ عہدِ خیر القرن ہے تیری زمیں — مطلعِ انوارِ ذی النورین ہے تیری جبیں
چشمِ عبرت کی نگاہیں جب تری جانب اٹھیں — تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطریں بن گئیں

یہ ترانہ تال سُر اور زیر و بم سے خالی ہے، اس لئے اہلِ وجد و سماع اس پر کان نہ دھریں

بھڑوچ کا ایک پرانا خاندان

بھڑوچ میں عہد عالمگیری کی یادگار ایک خاندان ہے، جو یہاں مسندِ قضا پر متمکن تھا، اس خاندان کے موجودہ چشم و چراغ جناب قاضی نور الدین شیرازی صاحب

ہیں، لبِ دریا اُن کا فضیلت کدہ یادگار زمانہ ہے، ایک موروثی کتب خانہ اُن کے اسبابِ زینت میں ہے، افسوس ہے کہ اس وقت قاضی صاحب موجود نہ تھے، اس لئے میں کتب خانہ کی سیر نہ کرسکا، مگر میرے ایک عزیز نے اُن کا کتب خانہ دیکھا ہے، اس کے حسبِ ذیل نوادر کا حال مجھ سے بیان کیا،

اس خاندان کے چند نوادر کتب

(۱) شرح مثنوی مولانا روم (؟) جلد پنجم آخر میں ہے،

"ذوالقعدہ سنہ ۱۰۹۰ ہجری میں بسنت رائے نے قصبہ مجھرہٹہ سرکار خیرآباد میں تحریر کیا"

(۲) حدائق السحر فی دقائق الشعر مؤلفہ محمد بن محمد بن عبدالجلیل العمری المعروف بہ رشید وطواط آخر میں ہے،

"تم الکتاب بعون الملک الوھاب وحسن توفیقہ علی ید العبد الضعیف محمد الحافظ الھروی، تحریراً فی یوم الاثنین ثانی عشر من ربیع الاول سنۃ ۸۶۲ اثنین وستین وثمانمایۃ الھجریۃ النبویۃ بدارالسلطنۃ شیراز بزمان قید،"

(۳) المحیط للسرخسی جلد ثانی جمع الامام الھمام مولانا رضی الدین محمد بن محمد بن محمد سرخسی الحنفی، آخر میں ہے، :-

"کان الفراغ من کتابتہ فی یوم الرابع ذوالقعدۃ سنۃ ۹۰۹ھ کاتب علی بن علی بن رمضان العبادی الشافعی الازھری"

---

[1] یہ کتاب ایران میں چھپی ہے، اور ملتی ہے،

(۴) گلستان، متوسط تقطیع اور معمولی خط نسخ،

مصنف کے اصل نسخہ سے یاقوت مستعصمی نے اور اس نسخہ سے بحکم جہانگیر سید جلال الدین بخاری نے اور اس سے سید محمد بن سید زین العابدین بن سید احمد حسن رضوی نے ۱۲۱۹ھ میں نقل کیا،

(۵) مخازن المعروف جلد ثانی، شرح مشکوٰۃ فارسی، از کتاب الزکوٰۃ تا کتاب البیوع دوسری، تیسری اور چوتھی جلد ہے،

صفحۂ اوّل مطلا ہے، تقطیع کلاں، اس پر خواص خاں غلام فرخ سیر بادشاہ غازی کی مہر ۱۲۲۵ھ ہے، ابو معروف حسین ۱۱۱۲ھ بھی تحریر ہے،

مدرسہ دارالارشاد احمد آباد میں بھی رہ چکی ہے،

(۶) کتاب الخلاصہ (خلاصۃ الفتاوی) مؤلفہ طاہر بن احمد بن عبدالرشید البخاری ناقص از وسط تقطیع کلاں مختلف مسخ شدہ مہریں ہیں، آخر میں ہے،

"تم کتاب الخلاصۃ من املاء الشیخ محمد بن محمد بن نصر الملد عوا بحافظ البخاری علی ید افقر عباد لا محمد الملد عوا صفی الدین بن محمد الخلیلی ولد ابن حسین بن علی بن محمد بن احمد فی دولۃ الملک محمد بن مراد بن سلیم بن سلیمان بن سلیم بن بایزید بن شھور سنۃ ثلاث بعد الالف سنۃ ۱۳۰۳ھ نقل من نسخۃ تاریخھا یوم الجمعۃ العشرین من شھر ربیع الاول سنۃ ثلاث وتسعین سنۃ مایۃ،

(۷) مجمع البحرین "ترجمہ" اپنکھت پرم ہنس" از اتھربن وید، فارسی، شاہ سرمد نے

سنہ ۱۱۳۶ھ میں سنسکرت سے ترجمہ کیا، کاتب نند رام ولد انت رام، خط فارسی نستعلیق ۱۳×۸ تقطیع صفحات ۲۰۸

ہندوستان کی سب سے پرانی مسجدیں

قاضی صاحب کے عزیز خاص جن کو حکومت برطانیہ سے سردار صاحب کا خطاب حاصل ہے، وہ موجود تھے، اُن کا دولت کدہ بھی گذشتہ جاہ و جلال کا کہنہ مرقع تھا، موصوف نے اپنے خاندان کے پرانے ہتھیاروں کی سیر کرائی، اُن کی عمارت کے سلسلہ میں ایک چھوٹی سی معمولی مسجد ہے، جس پر سنہ ۳۰۴ھ کا کتبہ لگا ہے؛

هذه العمارة القديمة في شهور سنة ۳۳۲ھ

اس کتبہ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ بعد کو لگایا گیا ہے، بہرحال اس کی کوئی تاریخی سند اگر موجود ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس صوبہ کے اسلامی فتوحات سے پہلے کی یادگار ہے، یا یوں کہئے کہ محمود غزنوی کے حملۂ گجرات سے چند سال بعد کی ہے، جو بہرحال کوئی مستقل فتح نہ تھی،

اس کے بعد اس شہر میں اسلام کی ایک اور قدیم یادگار روہالہ کی سنگی جامع مسجد ہے، اس جامع مسجد کی اصل تعمیر کا کتبہ سنہ ۵۴۵ھ ہے، بعد کو محمد تغلق کے عہد میں سنہ ۷۲۱ھ میں دروازہ کے اوپر ایک گنبد کا اضافہ کیا گیا ہے، گنبد سنگ خارا سے بنایا گیا ہے، اور اس پر حسب ذیل کتبہ لگا ہے:

"در عہد دولت سلطان عالم غیاث الدین والدنیا، محمد تغلق هفت صد و بست و یک"

غالبًا ان مسجدوں سے زیادہ پرانی کوئی دوسری مسجد ہندوستان میں نہ ہوگی؛

انکلشور کا مسلم خاندان

بھڑوچ سے قریب ہی ایک پرانا قصبہ انکلشور نام ہے، جو سورت کے سفر میں کبھی بیچ کی ایک منزل تھا، یہاں بھی عہد شاہی کی یادگار ایک خاندان آباد ہے،

خاندان کے بانی شاہ عبدالعلیم صاحب ہیں، جو اکبر کے معاصر تھے، سنہ ۱۰۰۵ھ میں انھوں نے وفات پائی ہے، اُن کی خانقاہ و مسجد یہیں واقع ہے، خاندان کے موجودہ جانشین کا نام سید حیدر علی غلام علی انعام دار ہے، موصوف کے پاس خاندان کی پرانی آیدو کی سند پرانی کتابوں کی ایک الماری ہے، اس میں چند عربی کی اور باقی فارسی تصوف کی کتابیں ہیں، گجراتی اُردو میں بھی بعض کتابیں نظر آئیں،

اس خاندان کے چند نوادر کتب

عربی کتابوں میں سب سے نادر چیز یہاں قدیم طب کی ایک کتاب تقویم الادویہ ہے، اس کا سالِ کتابت سنہ [illegible]ھ ہے، نسخہ بخطِ عرب خیرۂ خرما سے لکھا ہوا ہے، اور اب تک اچھی حالت میں ہے،

حقہ کی تاریخ

یہاں ایک مجموعہ میں ایک صفحہ پر چند واقعات کی تاریخیں لکھی ہوئی نظر نظر پڑیں، جن میں سب سے اہم ہندوستان میں حقہ کے رواج کی تاریخ ہے، یہ تاریخ "ناخوشی بنما" کے الفاظ سے نکالی گئی جس سے سنہ ۱۰۲۹ھ نکلتے ہیں، چونکہ یہ چیز گجرات ہی کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے، اس لئے عجب نہیں کہ تاریخی بیان صحیح ہو، سنہ ۱۰۲۹ھ جہانگیر کا عہد ہے،

بنائے سورت کی تاریخ

گجرات کا دوسرا مشہور دریا جو بحرِ عرب سے جا کر ملتا ہے، دریائے تاپتی ہے، اس کے کنارے پر شہر سورت آباد ہے، اور دوسرے کنارے پر راندھیر پہلے بحرِ عرب میں جانے والے جہازوں کا بندرگاہ راندھیر تھا، مغلوں کے شروع عہد میں اس کے بجائے سورت کی آبادی بڑھی، اور وہ ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ بنا، اس قلمی یادداشت میں اس بندرگاہ کی آبادی کی تاریخ ۹۳۷ھ نظر آئی، تاریخ کا مصرع یہ تھا،

ع :- باد آباد بندر سورت

راندھیر جس کو پہلے رانیر کہتے تھے، اسلام کے قدیم فتوحات میں ہے، اس یادداشت میں اس نسخ کی تاریخ ایک قدیم مسجد کے کتبہ سے حسب ذیل بتائی گئی تھی،

بنا کرد مسجد بجاے کنشت ، برا یوانش انا فتحنا نوشت
۵۹۱ھ

راندھیر کی پرانی مسجد | چند دوستوں کی دعوت پر راندھیر جانے کا بھی اتفاق ہوا، یہ دولت مند و دیندار مسلمان تاجروں کا مسکن ہے، اور دعوی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس قصبہ میں جس قدر خوبصورت اور عمدہ اہتمام کے ساتھ مسجدیں دیکھنے میں آئیں پورے ہندوستان میں کہیں نہیں آئیں، ان مسجدوں میں سے ایک قدیم مسجد جونا دوارہ ہے، یادداشت مذکور میں اس مسجد کی بنا کی تاریخ یہ لکھی تھی،

گر کسے پرسد ز تو تاریخ ازین معبد شریف ، گو مسمی مسجد اعلیٰ و دربا ب شریف
۹۵۵ھ

گجراتی ہندوی کی بعض کتابیں بھی اس خاندان کے ذخیرہ میں دکھائی دیں جن میں سے درج ذیل کتابیں ذکر کے قابل ہیں،

لغت عربی و ہندی | عربی اور ہندی یا ہندوستانی کا ایک لغت ملا، جس کے شروع کے چند شعر یہ ہیں :-

اللہ خدا ہے کرتار	الخالق آفرید سرجن ہار
الدنیا کہتی سنسار	الاحمق نادان گنوار
الجنّت بہشت سرگ	السقر دوزخ مرگ
الیوم روز دِس	الشعر موے کیس
اللیل شب رات	القول گفت بات

السبیل راہ باٹ   السبع ہفت سات
الاسم نام ناؤن   الموضع دیہہ گاون
الظل سایہ چھانوں   المقام جانگیہ ٹھانوں
الراس سر سیس   العشرین بست بیس
العین چشم آنکھ   اللحیہ ریش داڑھ
الاذن گوش کان   الورق برگ پان
الطعام خوردن کھان   السہم تیر بان

آخری حصہ :-

الفرح خوشی بلاس   القنوط ناامید نراس
الفخذ ران تہی جانگ   الجسم تن ہے آنگ
المورد اب خورا درارہا   السمر افسانہ پواڑا
الکدر تیرہ گدلا   النعیم نابینا اندلا

مُصنف اور تصنیف کا زمانہ مذکور نہ تھا،
اسی قسم کا ایک عربی لغت برادر عزیز سید نجیب اشرف ندوی کی ملکیت میں ہے مگر وہ اُس کے علاوہ ہے، اس کے ابتدائی شعریہ ہیں،

الالہ پرستیدہ پوجا   المعلوم دانستہ بوجھیا
المجد ستودہ کھانیا   المعروف شناختہ بجھانیہ
الرسول فرستادہ بھیجیا   الواضح روشن تتجیا
الآل دودمان کنبہ   التقود خوشہ بونیا

معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ گجرات میں عرب اور ایرانی کثرت سے آیا کرتے تھے، اس لئے ان کو ہندی سے آشنا کرنے کے لئے اس قسم کے لغت یہاں لکھے گئے ہیں،

رسالہ فقیری چار پیر چودہ خانوادہ

اس رسالہ کا آغاز ان لفظوں سے ہے،

" بدانکہ بوجھ تون یہ رسالہ فقیری حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا ہے، بوجھے دیکھے وگرنہ تو فقیری نہ کرے،

سوال اگر تیرے پوچھے کہ اول فقیری کیا ہے، و آخر فقیری کیا ہے، اور خانہ یعنی گھر فقیری کیا ہے، اور کیلی فقیری کیا ہے، اور لقمہ فقیری کیا ہے،

اسی قسم کے سوال وجواب پر رسالہ کے اکیس صفحے ختم ہوئے ہیں، تصنیف و مصنف کے ذکر سے پوری خاموشی ہے،

رسالہ فقہ ہندی

یہ فقہی مسئلوں کے بیان میں ایک نظم ہے، آغاز کے اشعار یہ ہیں،

حمد و ثنا سب کوں خالق کل جہاں لائق حمد ثنا ہے کے اوذکو نہ جان

ختم شریعت ال وہی بھیجا پاک رسول جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول

یا رب اپنے کرم سوں بجد بہیا دے و نبی محمد مصطفیٰ تسوں ہوں خوشنود

بھیجو ان کی آل پر اور اصحاب تمام تس بھیجو احباب پر بہت درود سلام

لیے مسئلے دین کے عہد رکھے اپنا فقہ ہندی زبان سو بوجو کرو یقین

مطلب مسئلے پوچھنا جو کچھ ہو ہزار بار عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

اس کے بعد فقہی ابواب ہیں، اور ان کے تحت میں ہر قسم کے مسائل ہیں، خاتمہ میں تصنیف کا سال ۱۰۸۸ھ بعہد اورنگزیب عالمگیر صاف بتایا گیا ہے، خاتمہ یہ ہے،

فقہ ہندی کوں مومناں گرز زبان پر یاد مسائل او دین کے کبھی نہ ہوے فساد

سنہ ہزار پچھتر ہجری ماہ رمضان تمام | اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اس فقہی نظم میں خاص چیز نظم کا وزن ہے، جو عربی فارسی کے بجائے ہندی وزن کی پیروی میں ہے، اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پرانے لوگوں کے زمانہ میں ہندی کس کو کہتے تھے،

داستان حضرت ماہ رمضان | اس نظم میں ماہ رمضان کی فضیلتوں کا ذکر ہے مصنف کا نام بدیع الدین ہے، شروع کے شعر حسب ذیل ہیں،

سرنامہ از نام سبحاں لکھوں | کہ دل کی ورق پر سجل کر لکھوں
زباں کو ہے جوہر اسی کو ثنا | اسی کی سو قدرت ہو جگ میں عیاں
کریم و رحیم و وہ غفار ہے | کرم عاصیاں پر کرنہار ہے
ز ہر چیز اس کی صنعت کا بیاں | کہ پیدا کیا جن نے ارض و سما

آخر میں لکھا ہے

کرو اُس کی سب نعمتوں پر شکر | مصیبت کے اوپر حکم ہے صبر
کہ تا عاقبت تیری ہووے بھلی | کہ شادی و غم جگ میں جا چلی
بدیع الدین تعریف عمل کی کرو | کہ جھوٹا کہ کی جس میں تو قع دھرو

اس نظم کی خصوصیت خاص فارسی آمیز ترکیبیں اور قافیوں میں صرف صوتی ہم آہنگی عربی الفاظ حکم اور صبر وغیرہ کو اس طرح باندھا ہے، جس طرح ہندی میں بولے جاتے تھے،

داستان قیامت | اس نظم کا شروع ان اشعار سے ہے،

سخن ہے مرا جوں گل بوستاں | نصیحت کی باتوں سنو داستاں
بباسی مسلماں کہاتے ہیں دوست | کہ کھاتے ہیں سب گائے بکری کا گوشت

لباس شریعت کریں تن مینن — شریعت کی باتاں نہ کچھ من مینن
بڑی ریش تسبیح خوش پیرہن — بھری دل میں کئیں بھانت کے مکر و فن

آخری شعر میں اس نظم کا سال ۱۱۰۰ھ (؟) بتایا گیا ہے،

سنہ ایکہزار دستوتر نے سو — لکھی یہ حکایت کتابوں کی رو
بتاریخ نوزدہ دریں ماہ پیر — باتمام آن شد، مدد دستگر

فقہ مبین | یہ نظم فقہ کے مسائل میں ہے آغاز اس طرح ہوتا ہے،

بنام پاک رب العلمین سوں — شروع کرتا ہوں فقہ مبیں سوں
بحق مفخر و مقبولِ مرسل — سبھی عقدہ فقہ کے مجھ پہ کر حل
مسائل فقہ کے ہیں اصل ایماں — جو نیں بوجے سو وہ کیوں کہوے مسلماں

اس کے بعد اپنے تمام ۸۴ ماخذوں کا نظم میں ذکر کیا ہے، پہلے ایمان کے مسائل پھر طہارت، وضو غسل وغیرہ اس کے آخر میں بدعت کا رد اور حقّے کی بڑائی ہے۔ آخر میں ہے،

یقیں فقہ المبیں کوں کرتے مختوم — بحقِ دین پناہ آلِ معصوم
صد و شصت تا دو والف ہجرہ ۱۱۶۲ — بتاریخ ہمایوں گشت تمت
اگھیارہ سو میں اسی اور دو — سنہ ہجری نبیوں کے تبایو

رسالہ کے آخر میں خاتمہ کی عبارت ہے،

"نسخۂ قوت دین فقہ المبیں تصنیف حضرت شاہ یقین رحمۃ اللہ علیہ"

اس سے مصنف کا نام شاہ یقین، کتاب کا نام قوت دین المبین" اور تصنیف کا سال ۱۱۶۲ھ معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی کتخدائی | کسی رسم شادی کی تعریف و توصیف میں ہے، رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

ثنا، وہ ہے درگاہ یزداں — وہ خالق سب کا ہو کیا جن و انساں
ثنا و حمد کے لائق سدا ہے — سزاوار خدائی کا خدا ہے

. . . . — . . . .

محمد اشرف اولادِ آدم — حبیب و سرورِ و سردارِ عالم
شہِ آدم محمد سرورِ دیں — کہ ختم الانبیاء ہیں رہبرِ دیں
ہوا جس شان میں لولاک وارد — دیکھو محبوب کا رتبہ ہے شاہد

اس کے بعد خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی مدح اور امامین علیہما السلام کی تعریف میں چند شعر ہیں، اس کے بعد نکاح کا قصہ شروع ہوتا ہے،

شروع کرتا ہوں اب شادی کی تعریف — نزاکت سیں لکھوں میں اسکی توصیف
مہیا کیا سامان اظہر — لباس و زیور و لولو و گوہر

اُس کے بعد ان سرخیوں کے ماتحت چند باب ہیں، در وصفِ الطعام، در وصفِ المحل، در وصفِ بروئن برات، در وصفِ شہر گشت، در وصفِ نکاح خوانی، در بیانِ خلوت،

خاتمہ اس پر ہوتا ہے،

سخن کو مختصر کاں تک لکھے گا — یہ ہے طومار آخر کوں تھکے گا،
بعشرت عیش بادا سازداری — مری یو مثنوی ہے یادگاری
شب بست و دوم از ماہ رجب — کہ شادی ہور شہر گشت ہی شب
سنہ ہجری دراں وقت بود موجود — ہزار و یک صد و تسعین و یک بود

آخر شعر سے تصنیف کا سال ۱۱۹۱ھ معلوم ہوتا ہے، وزن سے حرفوں کا گرنا،

اس وقت معیوب نہ ہوگا،

وفات نامہ حضرت نبیؐ | آغاز

بنا اوّل کروں حمد خدا میں | زباں اوپر آپس کی ابتدا میں
کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت | بنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت

بیچ کا ایک شعر ہے جس میں زبان کا نام دکھنی بتایا گیا ہے،

مجھے توفیق دے یارب کہ بولوں | بنا ہجر نبی دکھنی میں کھولوں

تصنیف کا سال معلوم نہیں، کتابت کا سال ۱۲۵۱ھ ہے،

قصہ بانو | اس مثنوی میں ایک قصہ بیان ہوا ہے جس کے متعلق شاعر کا دعویٰ ہے کہ یہ قصہ پہلے فارسی میں تھا، اور اب دکھنی میں اس کو نظم کیا جاتا ہے،

عزیزاں روایت سنوں کان دھر | اوّل فارسی تھی یہ دکھنی دگر
اتھا گوڈرہ ایک شہر کا جو نام | ہمیشہ فتح کا اتھا واں مقام
سنیچر ایک دن اس جمعہ مسجد منے | اتھے خرد بزرگ او ساریچ جنے
دُستے ہیں مُسافر نیا آن کر | سلام علیک کہہ کے بیٹھا نگر
پوچھے سب نے اُس کو تو کاں سوں آیا | شہر ہے دور ہے نام محمد حیا
لگا بولنے کوں اوپوں سُن کے بات | زلیخا کا قصہ دونوں کے سنگات
نگر ساری مجلس نے سُن کر کلام | لگے بولنے آفریں سب تمام

فتح شاعر کا تخلص ہے آخر میں ہے،

فتح مختصر کر تو اپنی زباں | کہاں یک تو لکھے گا اس کا بیاں

زمانہ معلوم نہیں، تاہم اس کے بعض الفاظ خاص لحاظ کے قابل ہیں، "تھا" اور "تھے" کی

جگہ "اتھا"، اور "تھے" اور کی جگہ او تین کی جگہ تنے کہاں کی جگہ کان وہ کی جگہ "او"

قصۂ سوداگر عجم | یہ نظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت کے بیان میں ہے، آغاز اس طرح ہے،

ثنا اور حمد مولا کی صبح و شام کرتا ہوں ، درود اں مصطفٰےؐ اور دل جاں سیں میں پڑھتا ہوں
درود اں حمد کے پیچھوں حکایت اک کہوں نادر عزیزاں تم سنوں اسکوں کہوں اں کو تمیں حاضر

آخر میں تاریخ ہے،

گیارہ سو اور چھبیس برس گذری تھے حضرت کے تبھی تصنیف میں آئے خوارق پیر حضرت کے
تو جبہ رحمت اللہ پر کرو تم اسے شہ پیراں صفائی باطنی ہوئے اُسے اے حضرت میراں

خالق باری | ہمارے فارسی و ہندی ادبیات میں خالق باری کی تاریخ ایک معما ہے، اُس کی تصنیف کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشہور ہے، لیکن محققین کو ہمیشہ سے اس میں شک ہے، تعجب کی بات ہو کہ اس کا کوئی قدیم نسخہ اب تک نہیں ملا ہے، اس کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ نظر آیا لیکن وہ بھی قدیم نہیں، رسالہ تاریخ سے گو معرا ہے، مگر اس کے نستعلیق خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سوا سو برس سے زیادہ عمر کا نہیں،

خالق باری کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں ایک لفظ ملتا ہے، جو بدا یا بڑا پڑھا جاتا ہے،

ع واحد ایک بڑا کرتار

مسلم یونیورسٹی کے سلسلۂ تصنیفات خسرو میں جو نسخہ چھپا ہے، اس میں یہ لفظ "بدا" چھاپا گیا ہے، اور اس کے نیچے "ع" لکھا گیا ہے لیکن عربی میں بدا کرتار کے معنی میں میرے پندار میں نہیں آیا ہے، معلوم نہیں فاضل محشی کے پاس جو عربی اور سنسکرت دونوں کے

فاضل ہیں، اس کی سند کیا ہے، موجودہ نسخہ میں یہ لفظ بڑا الکھا گیا ہے لیکن یہ بھی مہمل ہی بعض مطبوعہ نسخوں میں خدا چھپا ہے، اور شاید یہ صحیح ہو،

زیر بیان نسخہ میں اوّل تو کچھ اشعار زیادہ معلوم ہوئے، دوسرے یہ کہ افعال اور ضمائر میں قدامتِ زبان کی جھلک دکھائی دی، یہ تین شعر نئے معلوم ہوئے، جو مطبوعہ نسخہ میں مجھے نہیں ملے،

چوں بہ پرسی خربوزہ کیت جو کا بھائی ہی؛ درخسر یہ پرسی جوکا باپ جن دی جائی ہی؛

ریختہ اندر گوش خود سیماب دی بورا بھتیا ; پنبہ پچک روئی گالا (کذا) جسم تن آمد۔ کیا

واں نہالی بستر و بالیں تکیہ لے جوان ; غلط بالا۔ لیٹ اوپر اُس بچھاؤ۔ گستر آن

حسب ذیل شعر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے قلمی نسخہ سے مطبوعہ کے تتمہ نمبر ۱۸۴ میں اس طرح چھپا ہے

عطسہ چھینک ،شاخ سینگ ،کفش گر ہے کفش دوز

گازرو خیاط ہے، دھوبی و درزی جامہ دوز

پہلے مصرع کا وزن صحیح نہیں معلوم ہوتا، فاعلاتن کا دوسرا اور تیسرا رکن کم ہے، پیشِ نظر نسخہ میں یہ غلطی نہیں. پھر دوسرے مصرع میں قافیہ دوز مکرر ہے، جو درست بھی نہیں اور جامہ دوز تو خیاط، اور درزی کے تقابل کے بعد بے معنی سا ہے پیشِ نظر نسخہ میں یہ شعر یوں ہے،

عطسہ چھینک و شاخ سینگ و کفش گر ہے کفش دوز

گازرو خیاط ہے دھوبی و درزی، دیس روز

اسی کے بعد تتمہ نسخہ مطبوعہ نمبر ۱۸۵ میں ہے،

وانکہ بے بخت ست بھاگ بخت بھاگ ; فارسی آمد سرود و ہندوی گویند راگ

اس کا پہلا مصرع شروع میں غلط ہے، دوسرا رکن ٹوٹتا ہے، اور تیسرا رکن غائب ہے، چار بار فاعلاتن کے بجائے تین ہی بار ہے، پیشِ نظر نسخہ میں یہ غلطیاں نہیں،

آنکہ بدبخت است، بھاگا، بخت درفرس است بھاگ
فارسی آمد سرود وہند وی گویند راگ

مطبوعہ نسخہ میں ہے:-

ع "طعم سواد، وطعام خورشش جو کہیے کھانا

پیشِ نظر نسخہ میں طُعم کی جگہ "مزہ" ہے، جو زیادہ بامزہ ہے،

مطبوعہ میں ہے:-

دُر و مرد ارید موتی جانیے　　　　ہم صدف سیپی، سمندر مانیے

پیشِ نظر قلمی نسخہ میں دوسرا مصرع یوں ہے

"ہم نُبدرا نی گلے بیچھانیے،

اس قسم کے اختلافات اور بھی ملیں گے لیکن اہم چیز ضمیر کا معاملہ ہے مطبوعہ نسخوں میں لوگوں نے زمانۂ مابعد کی ضمیریں کر دی ہیں، مثلاً "قدیم توں" کی جگہ جدید "تو" بہت پرانی زبان میں متکلم "ہوں" تھا، جواب بھی ہونا سے واحد متکلم کا صیغہ ہے، حضرت خواجہ فرید شکر گنج ۵۸۴ھ میں پیدا ہوئے، اور ۶۶۴ھ میں وفات پائی، اور امیر خسرو نے جن کی طرف یہ خالق باری منسوب ہے ۷۲۵ھ میں وفات پائی ہے، غرض دونوں کا زمانہ کچھ ہی آگے پیچھے ہے، حضرت خواجہ شکر گنج کا جو فقرہ میں نے اپنے مضمون ہندوستان میں ہندوستانی کے عنوان سے شائع کیا ہے، اس میں واحد متکلم اور واحد مخاطب کی ضمیریں "ہوں" اور "توں" استعمال ہوئی ہیں، بعینہ یہی دونوں ضمیریں پیشِ نظر نسخہ میں ہیں، مثلاً

خواہم گفت کہوں گا ہوں | خواہم کرد کروں گا ہوں
خواہی آمد آوے گا توں | خواہی نشست بیٹھے گا توں
خواہم دید دیکھوں گا ہوں | خواہی دید دیکھے گا توں
خواہم داد دیوں گا ہوں | خواہی داد دیوے گا توں
خواہم دوید دوڑے گا ہوں | خواہی دوید دوڑے گا توں

مطبوعہ نسخہ میں "ہوں" کی جگہ "میں" اور "توں" کی جگہ "تین" ہے،

سفر گجرات کی کچھ اور باتیں بھی بیان کرنی تھیں، مگر دیکھتا ہوں کہ قلمی سفر بھی خاصہ طویل ہو گیا ہے، ہم سفر ناظرین کے ملال راہ کا اندیشہ ہے، اس لئے قلم کی باگ یہیں روک لیجاتی ہے،

(معارف ستمبر ۱۹۳۶ء)

انڈیا آفس لائبریری میں اُردو کا خزانہ

اس وقت میں معارف کے ناظرین سے سات ہزار میل دور ہوں، بار بار جی چاہا کہ اس عجائبتانِ عالم سے اُن کے لائق کوئی تحفہ بھیجوں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ۲۶ر فروری سے (یعنی جس دن سے ہمارا وفد انگلستان کے ساحل پر اترا، آج ۲۷ر اپریل تک شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا جو آمد و رفت اور ملاقات سے خالی ہو، لندن چھوڑ کر کبھی پیرس اور کبھی اور کہیں جانا پڑتا ہے، اور اب انگلستان کے دوسرے شہروں کا دورہ شروع ہوتا ہے، کل رات کو اڈنبرا، وہاں سے منچسٹر، ۳ر مئی کو کیمبرج اور واپسی کے بعد کو پیرس، غرض

ع ایک چکر ہے میرے پانوں میں زنجیر نہیں

گو میری مصروفیت وفد کے دوسرے ارکانِ محترم محمد علی و سید حسین صاحب سے بہت کم ہے، پھر بھی آتنی کہ اپنا وعدہ پورا نہ کرسکا، جس کی معافی چاہتا ہوں، اس دوران میں اس ایوانِ حکومت میں جس کا نام انڈیا آفس ہے، تین چار دفعہ جانے کا اتفاق ہوا، اس عمارت میں جہاں سیکڑوں حقیقی

دمجازی زیارت گاہیں ہیں، ایک زیارت گاہ کا نام انڈیا آفس لائبریری ہے، یہ لائبریری اسی عمارت کے ایک گوشہ میں واقع ہے، اور ہندوستان کی علمی تاریخ کا مُرقع ہے، ایک گول ریڈنگ روم (مطالعہ کا کمرہ) ہے، اس کے ایک پہلو میں کتب خانہ ہے، دوسرے پہلو میں کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں، جو کتب خانہ کے مہتموں کے دفتر ہیں، مسٹر سٹوری جو پہلے علی گڈھ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے، وہ یہاں اسسٹنٹ لائبریرین ہیں، ڈاکٹر آرنلڈ جو کسی زمانہ میں علی گڈھ کے گذشتہ علمی دور کے ایک ممبر تھے، وہ گو لائبریری سے تعلق نہیں رکھتے، لیکن انڈیا آفس سے متعلق ہیں، ان دونوں بزرگوں کا ممنون ہوں کہ انھوں نے لائبریری کے دیکھنے میں ہر طرح مدد دی،

اس لائبریری میں عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، گجراتی، ہندی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، عربی اور فارسی کی بعض نادر قلمی کتابیں نظر سے گذریں، قطعات کا ایک نادر مجموعہ یہاں دیکھا، جو کبھی ممتاز محل بیگم کی ملک تھا، یہ وہی ممتاز محل ہیں جو شاہجہاں کی چہیتی ہوی تھیں، اور جن کے غیر فانی نام کو تاج محل ہمیشہ زندہ رکھے گا،

تصویروں کا ایک مرقع مجھے دکھایا گیا، جو دارا شکوہ کی ملکیت میں تھا اس میں شاہزادہ کے مختلف زمانوں بچپن تعلیم، جوانی کی تصویریں ہیں، کوفی خط میں لکھا ہوا قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھا، جو نہایت عتیق ہے، یہ نسخہ قدیم عربی خط کے مطابق زیر و زبر اور نقطوں سے خالی ہے، مجھے ہندوستان میں تاریخ شیرشاہی کی تلاش تھی، یہاں اس کے متعدد نسخے دیکھے، مگر افسوس کہ کتاب کی نوعیت کی نسبت ذہن میں جو خیال تھا، وہ صحیح نہیں نکلا،

اس وقت سرسری طور سے کتب خانہ کی اردو کتابوں کے ذخیرہ[1] کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، انڈیا آفس لائبریری تقریباً اسی وقت سے قائم ہے، جب سے اردو نے اپنی ترقی کا آغاز

[1] انگلستان میں اردو کتابوں کے ذخیرہ کے متعلق یہ پہلی اطلاع ہندوستان میں شائع ہوئی "سلیمان"

کیا ہے، اور اگلے انگریزوں کو چونکہ اپنی نئی حکومت کی تازہ ترین زبان سے غیر معمولی دلچسپی تھی، اس لئے اس لائبریری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اردو کی قدیم ترین کتابیں جو ہندوستان میں ناپید ہیں، وہ یہاں موجود ہیں، اردو کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ایک جلد میں جو ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہی چھپی ہے، اس فہرست کو بلوم ہارٹ صاحب (" - J - Blum hart) نے مرتب کیا ہے، یہ اردو کے فاضل ہیں، اور کسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی رہ چکے ہیں، قلمی کتابوں کی فہرست بھی اُن کے زیر تحریر ہے، مسٹر اسٹوری نے اُس کا مسودہ خاص طور سے منگوا کر دکھایا، مگر چونکہ بلوم ہارٹ صاحب خود موجود نہ تھے، اس لئے اون کے بلا اجازت اس مسودہ سے فائدہ نہ اٹھا سکا،

بہرحال مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی، اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ اللہ اللہ ہماری زبان بھی اتنی ترقی پا چکی ہے کہ تین سو صفحوں میں اس کی فہرست تمام ہوئی ہے، یہ فہرست سنہ ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے، اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس میں شامل نہیں ہیں، اس فہرست کو دیکھ کر یہ تعجب ہوا کہ اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن گئی تھی، دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہلِ قلم کا برابر کا ساجھا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا تھا، بلکہ جب صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دنیا میں موجود تھا،

بہرحال اردو کتابوں کی یہ فہرست جو صرف مطبوعہ کتابوں پر مشتمل ہے، چھ عنوانوں پر بٹی ہے، علوم و فنون ۱، تاریخ و جغرافیہ ۲، ادبیات ۳، کتب تعلیمی ۴، الہیات ۵، متفرقات ۶، ہر ایک عنوان کے تحت میں حسب ذیل تقسیمات ہیں:-

۱۔علوم و فنون

۱۔ زراعت ونباتات
۲۔ صنعت وحرفت
۳۔ ہیئت ونجوم،
۴۔ علم الطبخ
۵۔ نیرنگ وطلسمات
۶۔ علم المنزل وقواعدصحت
۷۔ نقشہ کشی
۸۔ اخلاق
۹۔ ورزش وسپہ گری،
۱۰۔ قانون
۱۱۔ انگریزی قانون،
۱۲۔ ہندو قانون
۱۳۔ اسلامی قانون،
۱۴۔ منطق وفلسفہ،
۱۵۔ طب تشریح.
۱۶۔ علم الحرب،
۱۷۔ موسیقی
۱۸۔ لغت
۱۹۔ علم السنہ
۲۰۔ طبعیات
۲۱۔ معاشیات
۲۲۔ علم المعانی والبیان،
۲۳۔ اجتماعیات،
۲۴۔ طب حیوانات (بیطاری)

۲۔تاریخ وجغرافیہ

۱۔ عام سوانح عمریاں
۲۔ سوانح محمد صلی اللہ علیہ وسلم
۳۔ سوانح ائمہ کرام،
۴۔ حالات قبائل وفرق،
۵۔ علم الانساب،
۶۔ جغرافیہ وتقویم البلدان،
(ٹاپوگرافی)
۷۔ عام تاریخ،
۸۔ مقامی تاریخ،
۹۔ سفرنامہ

۳- ادبیات

۱- دواوین،
۲- ڈراما
۳- خطوط و مکاتیب،
۴- انتقاداتِ ادبیہ
۵- شاعری
۶- عام شاعری
۷- تذکرۂ شعرا،
۸- مذہبی شاعری،
۹- مذہبی ہندو شاعری،
۱۰- مذہبی اسلامی شاعری
۱۱- محاورات و امثال
۱۲- قصص و افسانہ
۱۳- قصص منظومہ
۱۴- قصص منثورہ،

۴- تعلیمی کتابیں

۱- قواعد
۲- قواعد عربی
۳- قواعد برگسنا (پشتو)
۴- قواعد انگریزی
۵- قواعد ہندی
۶- قواعد ہندوستانی (اردو)
۷- قواعد کشمیری
۸- قواعد فارسی
۹- علم الخط،
۱۰- ریاضیات
۱۱- علم جبر و مقابلہ،
۱۲- علم الحساب
۱۳- علم حساب الکلیات والجزئیات
۱۴- اقلیدس،
۱۵- علم المساحت،
۱۶- علم وزن و پیمایش
۱۷- علم المخروطات والاشکال،
۱۸- علم المثلثات
۱۹- ابتدائی تعلیمی کتابیں، (ریڈرس)
۲۰- انتخابات،

۵ - الٰہیات

۱ - برہمنی اور لا مذہبی،
۲ - بودھی
۳ - عیسائی
۴ - بائبل
۵ - بائبل لٹریچر
۶ - تاریخ کلیسا
۷ - تعلیمات
۸ - ادعیہ و مزامیر
۹ - قصص
۱۰ - مناظرہ و موازنہ ادیان
۱۱ - ہندو مذہب
۱۲ - جینی مذہب،
۱۳ - اسلام
۱۴ - عبادات،
۱۵ - عقائد،
۱۶ - قرآنیات
۱۷ - حدیث
۱۸ - سکھ مذہب،

۶ - متفرقات

۱ - تعلیمات
۲ - تعلیم النسواں
۳ - تعلیم الصبیان،
۴ - مجموعہ ہائے تقریر و مضامین،
۵ - رسائل موقت الشیوع،
۶ - روداد مجالس،

ذیل میں ان چھ عنوانوں میں سے چند کتابوں کے نام، مصنف کے نام، اور تاریخ طبع، اور مقام طبع لکھے جاتے ہیں، اس انتخاب میں قصداً صرف وہی کتابیں لی ہیں، جو غدر سے پہلے یا اس کے بعد کسی قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں قصص و منظومات کو ہاتھ نہیں لگایا ہے، کہ ہر شخص جانتا ہے کہ اردو میں ان کا بڑا ذخیرہ ہے، صرف علمی کتابیں لی ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علوم جدیدہ کی مختلف شاخوں میں

کس تیزی سے اردو اس وقت تک ترقی کر رہی تھی، جب تک وہ سارے ملک کی متحارزبان تھی، اور نفاقِ قومی سے ناآشنا تھی،

فنِ زراعت

۱- چاے لگانے کی کتاب ۱۷صفحہ مطبوعہ لاہور، ۱۸۵۴ء

۲- گنگا کی نہر مترجمہ سداسکھ لال از انگریزی ص ۲۴ ۱۸۵۴ء مطبوعہ آگرہ

۳- کھیت کرم مُصنفہ کالی رائے، تین حصے دہلی ۱۸۴۶ء و ۱۸۴۹ء و ۱۸۵۰ء

۴- پندنامہ کاشتکاری مصنفہ موتی لال آگرہ ۱۸۵۲ء

۵- علم الفلاحت رابرٹ اسکاٹ برن صفحہ ۲۵۲ علی گڑھ ۱۸۶۵ء

۶- علم الفلاحت میجر کاربرٹ الہ آباد، ۱۸۶۹ء

۷- ریشم کا کیڑا موتی لال لاہور ۱۸۵۳ء

۸- تجربۂ تخم غلام نبی میرٹھ ۱۸۶۵ء

۹- توصیف زراعت، کلب حسین خان، آگرہ ۱۸۴۸ء

سائنٹفک کتابیں

۱- بحر الحکمت (اسٹیم انجن کا بیان) ریورنڈ پارکن ۱۸۴۷ء لکھنو،

۲- بخار کی کل " انیشوری لال ۱۸۵۵ء بنارس،

۳- نور النواظر احمد علی کانپور ۱۸۵۴ء

۴- علمِ تعبیر کالی پرشاد، اور سید علی ۱۸۶۳ء پٹنہ

۵- قانونِ انطباع (چھاپہ) ستیل سنگھ، دہلی ۱۸۶۴ء،

نجوم ہیئت

۱- خلاصۂ نظام نظام آسمانی   پنڈت وانسی وہیرا   آگرہ ۱۸۵۲ء

۲- مفتاح الافلاک   عبدالسلام کلکتہ ۱۸۳۳ء صفحہ ۲۷۲

۳- نظامِ آسمانی   (انگریزی مع ترجمۂ ہندوستانی) کلکتہ ۱۸۳۶ء

۴- مختصر احوال نظامِ آسمانی   ۱۸۴۰ء   آگرہ

۵- مختصر دقائق النجوم، بڑے صاحب گھاٹے، مدراس ۱۸۴۰ء

۶- اصول علم ہیئت   رام چندر دہلی، ۱۸۴۰ء   صفحہ ۳۲۵،

۷- علم ہیئت،   مترجمہ لفٹنٹ میلس   لکھنؤ ۱۸۳۲ء

جغرافیہ

۱- ترجمہ مراصد الاطلاع (عربی) در اردو - عبدالمومن ۱۸۶۱-۶۲ء
پورٹ بلیر ۳ جلد

۲- فتح گڈھ نامہ (احوال ضلع فتح گڈھ) کالی رائے دہلی ۱۸۴۹ء ص ۲۰۴،

۳- علم جغرافیہ   مترجمۂ میر غلام علی کلکتہ   ۱۸۵۱ء صفحہ ۲۲۰،

۴- جغرافیۂ عالم   دہلی ۱۸۵۳ء   ص ۱۰۹،

۵- خلاصۂ علم الارض   (مع انگریزی) کلکتہ ۱۸۲۴ء

۶- خلاصۃ الجغرافیہ   آگرہ ۱۸۵۴ء

۷- مرآۃ الاقالیم کلکتہ   ۱۸۳۶ء   ص ۱۴۰،

۸۔ مختصر بیان جغرافیۂ ہند، پنڈت چنتامنی کانپور ۱۸۶۶ء

۹۔ جغرافیہ کا پہلا رسالہ، مترجم از انگریزی، میر غلام علی مدراس، ۱۸۵۲ء

۱۰۔ جغرافیہ ہند از انگریزی، پنڈت سوار وپ نرائن و سیوا روپ نرائن
دہلی۔ ۱۸۴۸ء صفحہ ۱۲۲،

طبیّات

۱۔ عجائب روزگار، رام چندر، دہلی، ۱۸۴۷ء

۲۔ بجلی کی ڈاک، جے ڈبلو بیل آگرہ، ۱۸۵۴ء

۳۔ ہوا کا بیان، بدری لال، بنارس، ۱۸۵۴ء

۴۔ علم حکمت (میکینکس) چارلس فنک، کلکتہ ۱۸۴۳ء ص ۳۰۱،

۵۔ معدنیات، جواہر لال آگرہ، ۱۸۵۵ء

۶۔ خلاصۃ الصنائع (ترجمہ از انگریزی) بھولاناتھ آگرہ ۱۸۵۳ء ص ۱۱۲،

۷۔ مرآۃ العلوم، ہری ورمن لال، بنارس، ۱۸۴۹ء

۸۔ رسالہ مقناطیس، ترجمہ از انگریزی، سید کمال الدین دہلی ۱۸۵۰ء ص ۲۶۱،

۹۔ تحصیل فی جرّ ثقیل، سید احمد خان آگرہ ۱۸۴۴ء

۱۰۔ اصول علم طبیعی ترجمہ از انگریزی، اجودھیا پرشاد و سیوا پرشاد
دہلی ۱۸۴۰ء ص ۱۶۹،

۱۱۔ اصول جرّ ثقیل، محمد احسن بنارس، ۱۸۵۴ء

۱۲۔ اصول قواعد مائیات، ترجمہ انگریزی، اجودھیا پرشاد دہلی ۱۸۵۰ء
صفحہ ۲۶۴

۱۳- مقاصد العلوم ترجمۂ انگریزی، سید محمد میر ۱۸۴۱ء، کلکتہ،

۱۴- دائرۂ علم (نیچرل فلاسفی) محمد کرم بخش، لکھنؤ ۱۸۶۶ء

معاشیات (پولٹیکل اکانومی)

۱- ترجمۂ معاشیات مل، وزیر علی دہلی ۱۸۴۴ء صفحہ ۴۱۸،

۲- اصول علم انتظام مدن، ترجمۂ انگریزی، (ہرم نرائن، دہلی ۱۸۴۶ء)

۳- اصول سیاست مدن، دھرم سمہا، علی گڑھ ۱۸۶۹ء

۴- علم انتظام مدن، ترجمۂ انگریزی ناسو ویلیم سینیر، علی گڑھ ۱۸۶۴ء

علم معاشرت

۱- اقبال فرنگ، بیان عادات وآداب واحوال فرنگ، نواب اقبال الدولہ بہادر، کلکتہ ۱۸۳۴ء

۲- دستور عمل امورات شادی وغمی، چراغ شاہ ملتانی ۱۸۶۸ء

۳- اشتہار کمیٹی، درباب تخفیف مصارف شادی آگرہ ۱۸۶۸ء

۴- ترمیم ضوابط شادی، آگرہ ۱۸۶۸ء

۵- ضوابط شادی آرہ ۱۸۶۸ء ایضاً پٹنہ ۱۸۶۷ء

منطق

۱- ترجمۂ شمسیہ، مولوی سید محمد، دہلی ۱۸۴۴ء،

۲۔ میزان العلوم، سید عبد العلی پٹنہ، ۱۸۶۹ء

۳۔ خلاصۃ المنطق، دیوی پرشاد، بدایوں ۱۸۶۹ء

لائبریری کے بند ہونے کا وقت آگیا، اس لئے مجبوراً یہ فہرست تمام ہوتی ہے، ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ اس تمام ذخیرہ کا ایک سرسری جائزہ ناظرین معارف کے پیش کر سکتا،

۲۷ر اپریل ۱۹۲۰ء

البرٹ ہال مینشن، لندن،

(معارف ماہ جون ۱۹۲۰ء)

کتبخانۂ حمیدیہ بھوپال

ایک زمانہ تھا کہ بھوپال مشرقی علوم و فنون کا مرکز تھا، سیکڑوں فضلا رہتے تھے، طلبہ کا ہجوم تھا، نوادر کتب کا ذخیرہ تھا، دنیائے اسلام سے ہر روز نادر اور قلمی کتابوں کے تحفے بھوپال میں پہونچتے تھے، اگر اس وقت ریاست کا کوئی پبلک کتبخانہ ہوتا، تو اس وقت وہ رام پور، ٹونک اور حیدرآباد کی برابری کرتا، مگر افسوس ہے کہ اُس وقت کے کتب خانے امرا کی ذاتی ملکیت اور نشان امارت کے طور پر تقسیم ہو کر فنا ہو گئے، اور اب اُن کا ایک نسخہ بھی بھوپال میں موجود نہیں

بھوپال کے امرا میں سے ایک نواب فوجدار محمد خان کی کتابیں بھوپال میں رہ گئیں، اور ان کی کچھ یادگاریں باقی ہیں، غالب کے دیوان کا مکمل اردو نسخہ اسی کتب خانہ سے برآمد ہوا، ابن تیمیہ کی الرد علی المنطقیین کا نایاب نسخہ جو اب کتبخانہ آصفیہ کا مایۂ ناز ہے، وہ بھوپال ہی کی ملکیت تھا، اور اب بھی بڑے بڑے کتب خانوں میں بھوپال کی یادگاریں ملیں گی جن کو تقدیر نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے،

ریاست بھوپال میں اصلاحات کا دور سرکار عالیہ نواب سلطان جہان بیگم مرحومہ کے عہد سے شروع ہوا، انہی میں سے ایک پبلک کتبخانہ کا قیام ہے، جو سرکار مرحومہ کے

سب سے چھوٹے صاحبزادہ اور والی بھوپال نواب حمید اللہ خان بہادر کی طرف منسوب ہو کر حمیدیہ کہلاتا ہے، اس کی عمارت شاہجہاں آباد کے خاتمہ پر ایک نہایت عمدہ پُرفضا موقع پر بڑی عمارت وسیع بلند اور شاندار ہے، مقام بھی پُرسکون اور مطالعہ کے لئے موزوں ہے،

میری آمد و رفت بھوپال میں ۱۹۱۰ء سے ہے، اس وقت تو اُس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، اور معلوم بھی نہیں کہ وہ اس وقت تھا بھی یا نہیں مگر ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب مولانا شبلی مرحوم کی وفات کے بعد سرکار عالیہ مرحومہ کی طلبی پر حاضری ہوئی، تو اس وقت اس کتب خانہ کی حالت نہایت معمولی تھی، اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً جاتا رہا، مگر دیکھا تو انگریزی کتابوں کی طرف توجہ زیادہ تھی گوشہال صاحب ایک دیسی عیسائی اس کتبخانہ کے ناظم تھے، ظاہر ہے کہ ایک اسلامی اور مشرقی کتب خانہ کی خصوصیتوں اور ضرورتوں سے اُن کو کیا واقفیت ہوگی، گو اس وقت بھی کہنے کو مشرقی صیغہ موجود تھا، البرامکہ کے مشہور مصنف مولوی عبدالرزاق صاحب یہیں بیٹھ کر سرکار عالیہ مرحومہ کے اخیر زمانہ میں تاریخ اسلام کی تالیف و ترتیب میں مصروف رہتے تھے،

اس وقت یک کتابیں جو کچھ تھیں مطبوعہ تھیں، قلمی کتابیں گویا نہیں تھیں، افسوس ہوتا تھا کہ ایک مشہور اسلامی ریاست جس کی نیک نامی کی شہرت چار دانگ عالم میں ہے، وہ اس حیثیت سے تہی مایہ ہو،

سب سے اخیر جولائی ۱۹۲۳ء میں کئی سال کے بعد وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ اعلیٰ حضرت سکندر صولت بہادر کی فرماں روائی کے عہد میں یہ دوسری بار بھوپال کی حاضری تھی، خیال آیا کہ اس علمی سیرگاہ کی پھر زیارت کر لی جائے،

اس دفعہ جو کتب خانہ گیا تو اس کا رنگ بدلا پایا، کتابیں بھی زیادہ تھیں، اور سلیقہ

سے تھیں، اور سب سے زیادہ یہ کہ بعض پرانے شاہی فرامین اور مغل شہزادیوں کی مشقی وصلیاں اور قطعات بھی نظر آئے،

بابر کا فرمان بھوپال | بابر کا وہ پُرانا فرمان جس کو ۱۹۱۴ء میں دیکھ چکا تھا، اب بھی موجود تھا، یہ چھوٹی تقطیع کے معمولی کاغذ پر خط نستعلیق میں تحریر ہے، اس میں بابر نے ہمایون کو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے یہ نصیحت کی ہے، کہ وہ ہندؤں کا دل اپنے ہاتھ میں لے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ گائے کی قربانی بند کرے،

میں اس فرمان کو پہلے بھی جعلی سمجھتا تھا، اور اب بھی سمجھتا ہوں، اس پر چند سال کے عرصہ میں بہت سے اربابِ تحقیق نے مختلف خیالات ظاہر کئے ہیں، مسلمان فضلاء نے مذہبی تعلق سے قطعِ نظر صرف علمی اور فنی حیثیت سے بھی اس کو بالکل غیر معتبر ٹھہرایا ہے، ابھی ایک سال ہوا ہوگا کہ بعض روزانہ انگریزی اخبارات میں وصیت نامہ کی روشنی میں مسلمان سلاطین کی بے تعصبی کو بہت کچھ سراہا گیا تھا،

میرے قیاس میں یہ دستاویز مغل حکمرانوں کے اخیر عہد میں تصنیف ہوئی ہے، جب حکومت پر راجپوت راجاؤں کا اثر و اقتدار کافی مضبوط تھا، اور اُن کے مشورہ سے بادشاہ وقت کی طرف سے ایک فرمان اسی مضمون کا تمام ممالکِ محروسہ میں جاری ہوا تھا،

نورجہان کا نوشتہ | کتب خانہ میں دو نہایت نادر وصلیاں ہیں، یہ دونوں دو مشہور مغل بیگموں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں، ایک نورجہان بیگم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اور خطاطی کا بہترین نمونہ ہے، عبارت حسب ذیل ہے،

باعثِ انبساطِ شہنشاہی

بربیت مہ نور

از عدل شہنشاہی معمور جہاں باشد

وز نور جہانگیری پُر نور جہاں باشد

نمیقۂ نورجہاں سنہ ۱۰۲۹ھ

معلوم ہوتا ہے کہ نورجہاں نے یہ وصلی لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی تھی،

زیب النساء کا نوشتہ

عالمگیر اورنگ زیب کی فاضل بیٹی زیب النساء کے علمی کمالات کا ذکر تاریخ کے اوراق میں رہ گیا ہے، اس کے نام سے علمائے وقت نے جو کتابیں تصنیف کی تھیں، اُن میں سے صرف ایک کا سُراغ مل سکا ہے، باقی کے صرف نام ہی نام اب تک سُنتے ہیں،

بیگم کو خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا، چنانچہ نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی، مورخین کے اس متفقہ بیان کی تصدیق کتب خانۂ حمیدیہ کی ایک وصلی سے ہوتی ہے، یہ وصلی بیگم نے عالمگیر کی خدمت میں اس وقت پیش کی تھی، جب اوس نے سنہ ۱۱۱۱ھ میں مرہٹوں کے دارالحکومت ستارہ کو فتح کیا تھا، اس وصلی میں ایک شعر ہے، جس میں ستارہ کی فتح کی ایک نہایت عمدہ تاریخ کہی گئی ہے،

از معجزۂ شق القمر عیاں شُد

اعجازِ خسروی ہے "شق ستارہ" آمد

فتح ستارہ

زیب النساء

بیگم کے اُستاد مُلا سعیدا اسے اشرف عہدِ شاہجہانی کے مشہور خطاط آقا عبدالرشید دیلمی کے شاگرد تھے، شاید بیگم کو یہ فیض یہیں سے پہونچا،

کتابیں | کتب خانہ کی قلمی فہرستیں موجود تھیں، سرسری نظر سے جو کتابیں یادداشت کے قابل نظر آئیں وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ اُستاد عبداللہ بن سالم بصری | یہ بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شیخ ابو طاہر مدنی کے شیخ اور علوم حدیث میں یکتائے روزگار تھے، ۱۳۴ھ میں وفات پائی، مصنف نے اس رسالہ میں اپنے اسانید جمع کئے ہیں، رسالہ کی کتابت ۱۲۶۹ھ میں ہوئی ہے، اس رسالہ کو الامداد بمعرفۃ علو الاسناد، شیخ سالم بن عبداللہ بن سالم بصری ثم مکی سے ملاکر دیکھنا چاہئے، شاید وہی ہو؛

۲۔ العلل المتناھیہ فی الاحادیث الواھیہ | محدث ابن جوزی کی نہایت اہم تصنیف ہے اس میں ضعیف و موضوع احادیث پر تبصرہ کیا گیا ہے، نسخہ نیا ہے ۱۲۹۹ھ میں نقل ہوا ہے،

۳۔ تفسیر وجیز واحدی | واحدی نیشاپوری المتوفی ۴۶۸ھ کی مختصر عربی تفسیر، مصنف کی بڑی، اوسط اور چھوٹی تین تفسیریں بسیط، وسیط، اور وجیز کے ناموں سے ہیں، یہ وجیز کا نسخہ ہے۔ اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی، اس کتاب کا عمدہ نسخہ رامپور میں ہے، جو ۹۷۷ھ میں چمپانیر واقع گجرات میں لکھا گیا ہے،

۴۔ تیسیر البیان فی تفسیر احکام القرآن | مصنف کا نام محمد بن علی بن ابراہیم یمنی ہے، اس کا ایک نسخہ کتبخانۂ محمودیہ مدینہ منورہ میں نظر سے گذرا، دوسرا نسخہ کتبخانۂ آصفیہ حیدرآباد میں ہے، تیسرا نسخہ یہاں نظر آیا ۸۶۸ھ میں یہ کتاب لکھی گئی ہے؛ بھوپال کا نسخہ ۱۰۵۱ھ کا ہے،

۵۔ صحیح بخاری | جلد اول کا ایک نہایت عمدہ مطلا نسخہ جس پر اکبر بادشاہ اور محمد شاہ کی نظر

ثبت ہیں،

۶- الدیباج علی مسلم بن الحجاج سیوطی	صحیح مسلم کی شرح ہے،
۷- التنقیح علی الجامع الصحیح	بدرالدین زرکشی کی شرح بخاری ہے، اس کتاب کے اور بھی نسخے نظر سے

گذرے، مگر یہ نسخہ زیادہ قدیم معلوم ہوا، ۸۵۷ھ کی کتابت ہے اور مصنف کی وفات ۷۹۴ھ میں ہوئی ہے،

۸- الکواکب الدراری علی صحیح البخاری	صحیح بخاری کی شرح ہے، مصنف کا نام شمس الدین محمد بن یوسف کرمانی المتوفی ۷۹۶ھ ہے، شرح کا ممتاز پہلو یہ ہے کہ اس میں

احادیث کے لغات اور نحو سے خاص طور سے بحث کی گئی ہے، ۷۷۵ھ میں تکمیل کو پہونچی،

۹- ابن ابی شیبہ	اس کتاب کے متفرق اجزاء مختلف کتب خانوں میں نظر سے گذرے

مگر کامل کہیں نہیں دیکھی، یہاں بھی کامل نہیں ہے، یہاں کے نسخہ پر نام مسند ابن ابی شیبہ لکھا ہے،

۱۰- طبقات الفقہاء ابن کمال پاشا	حنفی فقہاء کے حالات میں جو چند کتابیں لکھی گئی ہیں ان

میں ایک آخر کتاب یہ ہے، مصنف کا نام شمس الدین احمد بن سلیمان بن کمال پاشا ہے، سلطان سلیم کے عہد میں مشہور ترکی عالم تھے، ۹۴۰ھ میں وفات پائی، کتاب گو مختصر ہے، مگر ابن قتلوبغا کی تاج التراجم کے بعد کے لئے یہ مفید ہے، اس کا کوئی اور نسخہ نظر سے نہیں گذرا،

۱۱- فتاوی واقعات المفتین	مصنف کا نام عبدالقادر بن یوسف ہے،
۱۲- فتاوی اکبر شاہی	مصنف کا نام عتیق اللہ ہے،
۱۳- ارشاد	شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف میں سے یہ رسالہ یہیں نظر آیا، یہ اصول حدیث میں ہے،
۱۴- عجائب البلدان	فارسی،
۱۵- تاریخ افغانی	شیر شاہ سوری کے حالات میں عبداللطیف بیجاپوری کی تصنیف،
۱۶- تاریخ ناصر شاہی	مانڈو (مالوہ) کے سلطان ناصر الدین خلجی کے حالات،

۱۷- رقعات عالمگیری | رقعات کا یہ نسخہ دوسرے نسخوں سے الگ معلوم ہوا، اس کے مُرتّب کا نام آل محمد صالح ہے اس میں پہلا خط شاہ ایران کے نام ہے، عبارت یہ ہے،

"نامۂ اورنگ زیب بہ اورنگ آرائے ولایت طہران،

آغاز یہ ہے :-

"حمدے کہ طائرانِ ریاض ملکوت"

۱۸- کلیات انوری کا ایک عمدہ نسخہ مع غزلیات و رباعیات،

اور بھی کچھ نادر کتابیں ہوں گی جو سرسری نظر میں رہ گئی ہوں گی،

کتب خانۂ حمیدیہ کا موجودہ ذخیرہ بہرحال ترقی و تکمیل کا بہت زیادہ محتاج ہے اس وقت بھی صرف بھوپال میں اتنی کتابیں ہیں جن کو اگر ایک جگہ جمع ہی کر دیا جائے تو بہت کافی ہو سکتا ہے، وہاں کے ایک تاجر کتب قلمی کے پاس سیکڑوں کتابیں ہیں، اگر سال میں تین ہزار روپیہ بھی قلمی کتابوں کی خریداری پر صرف کیا جائے تو بھوپال کا کتب خانہ بھی چند برسوں میں دوسری ریاستوں کے کتب خانوں کا مقابلہ کرنے لگے، مگر ابھی تو جو کچھ ہے، وہ آغاز ہے اسلاف کا سرمایہ ہندوستان سے یورپ کو بہا جا رہا ہے، ہمارے امراء کی تھوڑی سی قدردانی کا ہاتھ اس سیلاب کو روک سکتا ہے، کیا سرکار بھوپال کی توجہ ادھر مبذول ہو سکتی ہے؟

معارف ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

علوم القرآن

مسلمانوں کے حریف اگر ان کے تمام ابواب فضائل و مناقب کی صحت روایت سے انکار کر دیں، تو ایک باب یقیناً ایسا رہ جائے گا، جس کے انکار کی وہ کبھی جرأت نہ کر سکیں گے، ہمارا اشارہ اس سے مسلمانوں کی اس شدید جدوجہد اور سعی و محنت کی طرف ہے جو انھوں نے اپنی کتاب الٰہی کی تشریح و توضیح، تحقیق و تدقیق اور فہم و تفہیم میں صرف کی، دنیا میں متعدد قومیں ہیں، جن کے پاس حسب ادعا و زعم کتب الٰہی محفوظ ہیں، لیکن مسلمانوں نے اپنی کتاب الٰہی کے لیے جو خدمتیں انجام دیں اور اس سے متعلق جو ذخیرۂ علوم و تصنیفات فراہم کر دیا، کیا اس کا ایک حصہ بھی دوسری قومیں پیش کر سکتی ہیں، بلاشبہ بحیثیت ترجمہ مسیحی قوم کا کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی، لیکن ان تراجم سے کیا فائدہ جنھوں نے خود اصل کو گم کر دیا ہو؟

مسلمانوں نے قرآن مجید کے ساتھ جو اعتنا کیا، اور اس کے متعلق جو خدمتیں انجام دیں، ان کی ہم حسب ذیل جلی تقسیم کر سکتے ہیں،

(۱) تشریح مسائل عامہ متعلقہ قرآن، مثلاً کیفیت نزول، کتابت قرآن،

قرأت وتجوید قرآن۔

(۲) تدوین علوم متعلقہ قرآن، مثلاً علم الامثال، علم الاعراب، علم المجاز۔

(۳) تفسیر معانی والفاظ قرآن، مثلاً کتب تفاسیر عامہ،

ان تینوں میں سے ہر ایک اس لائق ہے کہ اگر اس کی تفصیل کی جائے تو خود اس کے متعدد شعبے نکل سکتے ہیں لیکن بخوف تطویل ہم صرف ضروری اور مایحتاج امور پر اکتفا کریں گے۔

مسائل متعلقہ قرآن ان سے وہ مسائل مراد ہیں جو اختصار مباحث کی بنا پر مستقل فن نہیں بن سکتے، اور اس لیے ان کے متعلق مستقل کتابیں نہیں لکھی گئیں، اس عنوان کے تحت میں حسب ذیل مسائل علما نے بیان کیے ہیں:۔

(۱) معرفت کیفیت نزول القرآن و بدء و انتہائے نزول (قرآن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح نازل ہوتا تھا۔ اور سب سے اول اور سب سے آخر کون سی آیت یا سورت نازل ہوئی؟)

(۲) معرفت آیات و سور مکیہ و مدنیہ (مکہ میں کون کون آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں، اور مدینہ میں کون؟)

(۳) معرفت اوقات و ازمنہ نزول (یہ آیتیں اور سورتیں کس وقت نازل ہوئیں؟)

(۴) معرفت مقامات و اماکن نزول (کہاں اور کس مقام پر نازل ہوئیں؟)

(۵) معرفت جمع و ترتیب قرآن (قرآن کس طرح جمع و مرتب ہوا؟)

(۶) معرفت تعداد سور و آیات و کلمات قرآن (قرآن میں کتنی سورتیں، کتنی آیتیں، اور کتنے حروف ہیں؟)

(۷) معرفت مجمل ومبین ومقید ومطلق وعام وخاص ومنطوق ومفہوم ومحکم و متشابہ قرآن۔

(۸) معرفت اقسام ودلائل قرآن

(۹) معرفت طرق مخاطبات قرآن

(۱۰) معرفت حصر وتخصیص وایجاز واطناب قرآن وقس علیٰ ذلک

<u>علوم متعلقہ قرآن</u> علمائے اسلام نے قرآن مجید کے متعلق جو خدمات انجام دی ہیں، اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کے ہر پہلو کے متعلق اتنے علوم مدون اور اس قدر کتابیں تصنیف کی ہیں، کہ ان کا حصر بھی مشکل ہے، کشف الظنون اور فہرست ابن ندیم میں سیکڑوں علوم وتصنیفات متعلقہ قرآن کا ذکر ہے، جو آج بالکل ناپید ہیں، تاہم تلاش وجستجو سے جن علوم وتصنیفات کا پتہ ملتا ہے، وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) رسوم القرآن (۲) تجوید القرآن (۳) اعراب القرآن (۴) مصادر القرآن (۵) افراد القرآن وجمعہ، (۶) مفردات القرآن (۷) غرائب القرآن (۸) معانی القرآن (۹) اعجاز القرآن (۱۰) مجاز القرآن (۱۱) تشبیہ القرآن (۱۲) امثال القرآن (۱۳) امثلۃ القرآن (۱۴) بدائع القرآن (۱۵) اسباب النزول (۱۶) مبہمات القرآن (۱۷) متشابہ القرآن (۱۸) اقسام القرآن (۱۹) مناسبۃ الآیات والسور، (۲۰) مطالع قرآن، ومقاطعہ وفواتح السور (۲۱) اعلام القرآن (۲۲) ناسخ القرآن ومنسوخہ (۲۳) مشکلات القرآن (۲۴) حجج القرآن (۲۵) احکام القرآن (۲۶) جواہر القرآن (۲۷) نجوم القرآن،

ان تمام علوم کے متعلق دو قسم کی تصنیفات ہیں، ایک وہ جن میں ان تمام علوم ومسائل سے ایک ہی کتاب کے مختلف ابواب میں بحث کی گئی ہے اور باختصار

وہ ان تمام مباحث پر مشتمل ہیں، اس صنفِ تصنیفات کو ہم "جوامع القرآن" کہہ سکتے ہیں۔ دوسری قسم اُن تصنیفات کی ہے، جن میں ایک ایک علم اور ایک ایک بحث سے مستقلاً بحث ہے، اور وہ صرف ایک ہی علم یا بحث کے مختلف انواع مسائل، نکات اور فوائد کو جامع ہیں۔

جوامع علوم القرآن | دنیا میں ہر شے اپنی بسیط اور سادہ حالت سے شروع ہوتی ہے، اور پھر رفتہ رفتہ ایک شاندار ترکیبی حالت تک پہنچ جاتی ہے، علوم قرآن کے متعلق بھی ابتدائی کوششیں انفرادی علوم و مسائل سے شروع ہوئیں اور ایک مدت کے بعد وہ تکمیل کو پہونچیں، یہی سبب ہے کہ علوم قرآن کے متعلق منفرد تصانیف دوسری صدی میں موجود ہو گئی تھیں، لیکن تصنیفات کا سراغ ہم کو سب سے پہلے پانچویں صدی میں ملتا ہے، ہم جامع علوم قرآن کا پہلا مصنف علی بن ابراہیم الحوفی المتوفی ۴۳۰ھ کو جانتے ہیں، جن کی تصنیف کا نام علوم القرآن ہے، اس کے بعد شیخ مکی بن ابی طالب المتوفی ۴۳۷ھ کی "البدایہ الی بلوغ النہایہ" کا نام لینا چاہیے، مصنف نے یہ کتاب ۷۰ جز میں معانی وانواع علوم قرآن پر لکھی ہے، تیسری تصنیف موسس فن بلاغت امام عبدالقاہر جرجانی المتوفی ۴۷۱ھ کے تلمیذ رشید ابو عامر فضل بن اسماعیل جرجانی کی البیان فی علوم القرآن ہے، اس کے بعد ابو موسیٰ محمد بن ابی بکر اصفہانی المتوفی ۵۸۱ھ کی مجموع المغیث فی علم القرآن والحدیث، یہ پہلا شخص ہے جس نے علوم قرآن و حدیث پر یکجا کتاب لکھی، علامہ ابن جوزی المتوفی ۵۹۷ھ کی "فنون الافنان فی علوم القرآن"، بھی اس فن کی ایک بسوط تصنیف ہے، بدیع الدین۔۔

بکر بن عبدالوہاب القزوینی الموجود ۶۲۵ھ کی الجامع المحرّر الحادی اپنے عنوان کے لحاظ سے ایک قابل قدر کتاب معلوم ہوتی ہے، اسی موضوع پر جمال القراء وکمال الاقراء علم الدین ابوالحسن علی بن محمد سخاوی المتوفی ۶۴۳ھ کی بھی تصنیف ہے، جو قرأت وقف وابتدار، ناسخ ومنسوخ وغیرہ مباحث قرآن پر مشتمل ہے۔ محمد بن عبدالرحمٰن بن شامہ المتوفی ۶۶۵ھ کی المرشد الوجیز فی علوم متعلق بالقرآن العزیز بھی اس فن میں ایک کتاب ہے، لیکن ان تمام تصنیفات سے بہتر بدرالدین محمد بن بہادر زرکشی المتوفی ۷۹۴ھ کی "البرہان فی علوم القرآن" ہے جس میں ۴۷ مختلف حیثیات سے قرآن مجید کے متعلق مباحث ہیں، اس کے بعد قاضی جلال الدین بلیقی المتوفی ۸۲۴ھ کی مواقع العلوم من مواقع النجوم ہے، اس کتاب میں چھ فصول کے تحت میں قرآن مجید کے مختلف پچاس مباحث وفنون ہیں، ۸۵۶ھ میں محی الدین محمد بن سلیمان کافیجی نے "التیسیر فی علوم التفسیر" کے نام سے ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا، سب سے آخر میں لیکن اس باب میں سب سے جامع اور بہتر جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی "الاتقان فی علوم القرآن" ہے جس میں ۸۰ ابواب کے تحت میں علوم قرآن کے متعلق ۳۰۰ سے زائد مباحث ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر حسب عادت سیوطی نے موضوع وضعیف احادیث وروایات کو اس میں جگہ نہ دی ہوتی، تو کتب خانۂ اسلام کی یہ ایک بے نظیر کتاب ہوتی،

یہ تصانیف جیسا ہم نے پہلے لکھا ہے، جوامع علوم قرآن پر مشتمل ہیں، آئندہ سطور میں ہم ایک ایک فن کا ذکر کرتے ہیں جس میں بہ ترتیب (۱) کتابت وقرأت

قرآن (۲) الفاظ قرآن (۳) معانی قرآن (۴) مقدمات مقاصد قرآن اور (۵) مقاصد قرآن پر گفتگو ہوگی۔

رسوم القرآن | نزول قرآن کے بعد قرآن کے متعلق سب سے پہلا کام یہ تھا، کہ قلم سے اس کو لکھا جائے، اور زبان سے ادا کیا جائے۔ پہلی قسم کا نام "رسوم القرآن" ہے جس میں قرآن مجید کے اصول کتابت اور طریقۂ تحریر سے بحث ہوتی ہے، یہ ممکن تھا کہ جس طرح عربی زبان کی تمام کتابیں لکھی جاتی ہیں، اسی طرح قرآن بھی لکھا جاتا، اور عہد بہ عہد عربی خط میں جو تبدیلیاں ہوئیں، ان سے کتابت قرآن میں بھی کام لیا جاتا لیکن مسلمانوں نے حفظ قرآن کے لیے ضروری سمجھا کہ جو لفظ عہدِ قدیم نبوی میں جس طرح لکھدیا گیا ہے، اسی طرح باقی رکھا جائے، تاکہ مسلمان نہ صرف یہ دعویٰ کر سکیں کہ الفاظ قرآن محفوظ ہیں، بلکہ یہ بھی دعویٰ کر سکیں، کہ خط ورسوم قرآن بھی محفوظ ہیں،

علمائے مسلمانوں نے اس فن کو عہد نبوت سے اس وقت تک باقی رکھا ہے، اور خط نسخ میں تنوع کے باوجود قرآن مجید کو اسی رسم خط میں لکھا جس میں صحابہؓ نے اس کو عام مسلمانوں کے سپرد کیا تھا، تدوین فن کے لحاظ سے اس باب میں سب سے پہلی تصنیف معلومات موجودہ ...... کے مطابق ابو عمرو عثمان بن سعید الدانی المتوفی ۴۴۴ھ کی تصنیف "الاقتصاد فی رسم المصحف" اور "المقنع فی رسم المصحف" ہے، المقنع میں باختصار مصاحف بلاد اسلامیہ کے مختلف و متفق خطوط کا اور قرآن میں زیر و زبر اور نقطہ لگانے کی کیفیت کا بیان ہے، علمائے اسلام نے اس تصنیف کی بڑی قدر کی، ابو محمد قاسم بن فیرہ شاطبی المتوفی ۵۹۰ھ نے بنظر تسہیل حفظ اس کو

ایک قصیدۂ رائیہ میں نظم کر دیا، اس رسالہ کا نام "عقیلہ اتراب القصائد" ہے،
برہان الدین ابراہیم بن عمر جعبری المتوفی ۷۳۲ھ نے اس قصیدہ کی بنام "جمیلۃ
ارباب المراصد" علم الدین علی بن محمد سخاوی المتوفی ۶۴۳ھ نے بنام "الوسیلہ
الی کشف العقیلہ"، شہاب الدین احمد بن محمد بن جبارہ المرادی المقدسی المتوفی
۷۲۸ھ، محمد بن قفال شاطبی تلمیذ سخاوی اور احمد بن محمد بن شیرازی کازرونی نے
۹۵۸ھ میں اور ابوالبقا علی بن القاصح المقری المتوفی ۸۰۱ھ نے بنام "تلخیص الفوائد"
اور نورالدین علی بن سلطان ہروی المتوفی ۱۰۱۴ھ نے بنام "الہبات السنیۃ العلیہ
علی ابیات الشاطبیہ الرائیہ فی الرسم" اس کی مبسوط و مختصر شرحیں لکھیں،

متاخرین میں خطیب الروم ۹۵۹ھ کی "رسوخ اللسان فی حروف القرآن"
اور ابوالعباس مراکشی کی عنوان الدلیل فی مرسوم خط التنزیل کارآمد رسائل ہیں،
ہندوستان میں مولانا بحرالعلوم المتوفی ۱۲۲۵ھ ہجری کا مختصر فارسی رسالہ "رسم مصحف"
اکثر قرآن کے حاشیوں پر چھپا ہے،

تجوید القرآن یعنی قرآن مجید کا صحیح مخارج حروف و تلفظ سے حسن ترتیل کے ساتھ
ادا کرنا، تجوید کو قرآن کے ساتھ وہی نسبت ہے جو نشید و غنا کو زبور کے ساتھ،
تاہم یہود و مسیحی اس کو کوئی فن نہ بنا سکے، اور مسلمانوں نے اس کو بھی ایک فن بنا دیا
ہے، سینکڑوں ماہر اور امام اس فن کے ازمنۂ مختلفہ میں ممالک اسلام میں پیدا ہوئے۔
اور اب تک موجود ہیں، ممالک عربیہ میں عموماً اور ہندوستان میں کہیں کہیں
باقاعدہ اس کی درسگاہیں ہیں، جہاں مدونہ قواعد اور اصول تجوید کے مطابق اساتذۂ
فن اب تک خلفاً عن سلف تعلیم دیتے چلے آئے ہیں۔

تدوین فن کی حیثیت سے اس فن کے سب سے پہلے مصنف موسیٰ بن عبید اللہ خاقانی بغدادی المتوفی ۳۲۵ھ ہیں، اس کے بعد مکی بن ابی طالب قیسی المتوفی ۴۳۷ھ کی کتاب رعایہ لتجوید القرأۃ تصنیف ہوئی۔ اس فن کی مقبول ترین تصنیف محمد بن محمد جزری المتوفی ۸۳۳ھ کی مقدمہ جزریہ منظومہ ہے،

بڑے بڑے علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں، مثلاً زین الدین ازہری المتوفی ۸۰۰ھ، خالد بن عبد اللہ ازہری المتوفی ۹۰۵ھ، ابو العباس احمد بن محمد قسطلانی المتوفی ۹۲۳ھ، شیخ الاسلام زکریا انصاری المتوفی ۹۲۶ھ، شمس الدین دلجی شارح شفا المتوفی ۹۴۷ھ، مولیٰ عصام الدین طاشکبری زادہ المتوفی ۹۶۸ھ، رضی الدین ابن الحنبلی الحلبی المتوفی ۹۷۱ھ، برہان الدین جعبری ۷۳۲ھ کی عقود الجمان فی تجوید القرآن بھی اسی فن کی تصنیف ہے[۱]،

قرات القرآن | الفاظ قرآن باوجود بقائے معنی مختلف وجوہ حرکات واوقاف وادغام وامالہ وفصل ووصل کے ساتھ پڑھے جا سکتے ہیں، اور یہ تمام طرق متواتر صحابہ سے مروی ہیں، ان وجوہ وحرکات وطرق مختلفہ سے یا ان میں سے کسی ایک سے بحیثیت روایت وسماعت بحث کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کس طرح سُنا یا گیا ہے، اور صحابہ نے کس طرح پڑھا ہے، علم قرات القرآن ہے، صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں اس فن کے سات مشہور امام گذرے ہیں، تابعین میں عبد اللہ بن عامر یحصبی قاری شام المتوفی ۱۱۸ھ، عبد اللہ بن کثیر قاری مکہ المتوفی ۱۲۰ھ، عاصم بن بہدلہ قاری کوفہ المتوفی ۱۲۷ھ اور تبع تابعین

[۱] الہلال کلکتہ ۱۱ فروری ۱۹۱۳ء

میں حمزہ بن حبیب التیمی قاری کوفہ المتوفی ۱۵۴ھ، نافع بن عبدالرحمن لیثی قاری مدینہ المتوفی ۱۶۹ھ، علی بن حمزہ کسائی قاری کوفہ المتوفی ۱۸۹ھ اور ابوعمر بن العلاء المازنی قاری بصرہ المتوفی ۱۵۴ھ: ان سب میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول قرأت نافع ہے، جس کی تمام بلاد اسلامیہ میں تقلید کی جاتی ہے۔

نافع نے ستر قراء تابعین سے قرأت حاصل کی تھی،

اس فن کے مصنف اول حسب تحقیق علامہ جزری، ابوعبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ ہیں، "شاطبیہ" سے (جو اس فن کی مقبول ترین تصنیف ہے) پہلے ابوعلی حسن بن احمد فارسی نحوی المتوفی ۳۷۷ھ کی "الحجۃ فی القرات" عبیداللہ بن محمد اسدی المتوفی ۳۸۷ھ کی "المفصح فی القرآت" ابوعمر عثمان بن سعید الدانی المتوفی ۴۴۴ھ کی "کتاب التیسیر" "جامع البیان فی القرات السبع" اور "المحتوی فی القرات الشواذ" اور ابوطاہر اسماعیل بن خلف المتوفی ۴۵۵ھ کی "عنوان فی القراءۃ" اور "الاکتفاء فی القراءۃ" قابل ذکر تصنیفات ہیں، اواسط قرن سادس میں امام القراءۃ قاسم بن فیرہ شاطبی اندلسی المتوفی ۵۹۰ھ نے قصیدۂ لامیہ شاطبیہ تصنیف کیا جس کی شعاع شہرت کے سامنے اس سے پہلے کی تمام تصنیفات چھپ گئیں "شاطبیہ" کے بعد قراء کبار نے مستقل تصانیف کے بجائے اس کی شرح کافی سمجھی، جن میں مشہور اشخاص علم الدین علی بن محمد سخاوی المتوفی ۶۴۳ھ، برہان الدین ابواسحاق ابراہیم بن عمر جعبری المتوفی ۶۴۳ھ، ابوالخیر محمد بن محمد جزری المتوفی ۸۳۳ھ اور ابن القاصح صاحب سراج القاری ہیں، علامہ جزری شارح شاطبیہ ہونے کے علاوہ "النشر فی القرات العشر" اور "تحبیر التیسیر فی القرات العشر" کے مصنف بھی ہیں، علی نوری سفاقسی کی تصنیف "غیث النفع فی القرات السبع" بھی اس فن میں ایک متداول

کتاب ہے،

علل القرات | جس طرح علم القرأۃ میں روایۃً وسماعاً الفاظ قرآن کے مختلف اوصاف واحوال سماعیہ کا بیان ہوتا ہے، علل القرات میں انہی چیزوں سے اصولاً اور عقلاً بحث ہوتی ہے، کہ از روئے اصول صرف ونحو وقواعد ومحاورات زبان عربی ان کو کیونکر ہونا چاہیے، ان مباحث پر گفتگو کا سب سے زیادہ حق اہلِ ادب اور علمائے نحو کو ہے، اسی لیے اس فن کا واضع ومدون یہی طبقہ ہے، مثلاً ابو العباس احمد بن محمد نحوی سلیمان بن عبداللہ نحوی المتوفی ۴۹۳ھ، ابو الحسن علی بن حسین الباقولی الموجود ۵۳۵ھ،

معرفۃ الوقف والابتدار | انسان کسی حالت میں سانس کی آمد ورفت کو روک نہیں سکتا، اس لیے ضرور ہے کہ کسی طویل عبارت کو پڑھتے وقت سانس کئی کئی بار ٹوٹ جائے، ان سکنات تنفس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بے موقع نہ ہوں، ورنہ عبارت کا سلسلۂ اتصال ٹوٹ جائے گا، اور اکثر عبارتوں کا سمجھنا مشکل ہو جائے گا، علمائے اسلام نے اسی غرض کے لیے علم الوقف والابتدار وضع کیا، اور قرآن میں جابجا علاماتِ وقف کے نشان لگائے، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ تلاوت قرآن میں کہاں وقف کرنا چاہیے یعنی ٹھہرنا چاہیے اور کہاں سانس توڑ کر دوسری آیت سے تلاوت کی ابتدا کرنی چاہیے، یہ فن گو علم التجوید اور علم القراۃ کا ایک جزو ہے، لیکن اس کی اہمیت کے لیے قرار نے اس کو مستقل فن قرار دیا اور اس میں منفرد ومخصوص تصنیفات کیں،

ابوبکر محمد عیسیٰ مغربی نے ان تمام اوقاف کو ایک رسالہ میں بنام "وقوف النبی صلعم فی القران" جمع کر دیا ہے، مکی بن ابی طالب المتوفی ۳۰۹ھ نے صرف اس موضوع پر ایک رسالہ "الوقف علی کلا وبلی فی القرآن" لکھا کہ قرآن میں لفظ "کلا" اور "بلی" پر

وقف کرنا چاہیے، یا نہیں، ان کے علاوہ "کتاب الوقف والابتداء" کے نام سے مشہور ائمۂ نحو وادب مثلاً قدمار میں یحییٰ بن زیاد الفرار المتوفی ۲۰۷ھ، ابوالعباس احمد بن یحییٰ ثعلب نحوی، المتوفی ۲۹۱ھ، مکی بن ابی طالب المتوفی ۳۰۹ھ، ابواسحاق ابراہیم الزجاج نحوی المتوفی ۳۱۰ھ، ابوبکر بن محمد بن قاسم ابن الانباری نحوی ۳۲۷ھ ابوجعفر النحاس بغدادی نحوی المتوفی ۳۲۸ھ اور متاخرین میں محسن عثمانی اور سجاوندی نے مستقل کتابیں تالیف کیں،

الفاظ قرآن مفردات القرآن اسلام جب تک جزیرۂ عرب میں محدود تھا، قرآن کے حل لغات وتفسیر الفاظ کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن غیر عربوں میں اشاعت قرآن کے لیے ضروری تھا، کہ الفاظ ولغات قرآن کی تشریح کی جائے اور اُن کی ڈکشنری ترتیب دی جائے، بعض علمائے ادب نے تمام الفاظ کا احاطہ کیا، اور ان کا نام مفردات القرآن رکھا، مثلاً مفردات القرآن امام راغب اصفہانی الموجود ۵۰۰ھ، مفردات القرآن محی الدین محمد بن علی وزان حنفی، لیکن اکثر علمائے ادب نے بجائے احاطۂ الفاظ صرف مشکل لغات پر اکتفا کی، اور اس کو غریب القرآن کے نام سے موسوم کیا۔

غریب القرآن فن غریب القرآن پر نہایت کثرت سے علمائے نحو وادب نے تصنیفات کیں، اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب غریب القرآن ابوعبیدہ معمر بن مثنی نحوی المتوفی ۲۰۹ھ کی ہے۔ اس کے بعد حسب ذیل کتابیں لکھی گئیں، غریب القرآن احمد بن محمد بن یزداد طبری نحوی الموجود ۳۰۴ھ، غریب القرآن ابن درید لغوی المتوفی ۳۲۱ھ، غریب القرآن عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ المتوفی ۳۲۲ھ غریب القرآن ابوبکر محمد بن قاسم بن الانباری المتوفی ۳۲۷ھ، غریب القرآن ابوعمر محمد عمر الزاہد تلمیذ ثعلب

المتوفی ۳۴۵ھ، الاشارہ فی غریب القرآن ابوبکر محمد بن حسن نقاش نحوی بغدادی المتوفی ۳۵۱ھ، غریب القرآن قاضی احمد بن کامل المتوفی ۳۵۰ھ، غریب القرآن ابوبکر محمد بن عزیزی سجستانی تلمیذ ابن درید، غریب القرآن والحدیث ابوعبید احمد بن محمد ہروی المتوفی ۴۰۱ھ، مشکل غریب القرآن مکی بن ابی طالب قیسی المتوفی ۴۳۷ھ، کتاب اللغت المستدرک علی الہروی ابی موسیٰ محمد بن ابی بکر اصفہانی المتوفی ۵۸۱ھ، تحفۃ الاریب فیما فی القرآن من الغریب، ابوحیان محمد بن یوسف اندلسی المتوفی ۷۴۵ھ،

غریب القرآن کی تدوین میں سب سے زیادہ کاوش اور تلاش ابن درید اور عزیزی نے کی، ان دونوں استاد اور شاگرد نے تدوین و ترتیب غریب القرآن میں پورے پندرہ برس صرف کیے،

مصادر القرآن | بعض ائمہ لغت نے قرآن کے اسمائے جامدہ کو چھوڑ کر صرف مشتقات کی طرف توجہ، اور مصادر قرآن کی تحقیق و تشریح کی، اس قسم کی پہلی تصنیف یحییٰ بن زیاد الفراء المتوفی ۲۰۷ھ کی مصادر القرآن ہے، اس کے بعد ابراہیم بن الیزیدی المتوفی ۲۲۵ھ نے مصادر القرآن لکھی، ابوجعفر احمد بن علی جعفر المتوفی ۵۴۴ھ نے تاج المصادر کے نام سے قرآن و حدیث دونوں کے مصادر یکجا جمع کر دیئے،

الواحد والتثنیہ والجمع فی القرآن | ہم نے جیسا پہلے بیان کیا ہے کہ جس طرح تمدن اجتماعی میں نئے نئے تکلفات اور مختلف ضرورتوں کے سامان ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور وہ پھیلتے جاتے ہیں، بعینہ یہی حال تمدن علمی کا بھی ہے، کہ ہر شے میں ذرہ ذرہ سی مناسبت سے نئے نئے شعبے پیدا ہوتے رہتے ہیں، ہر تثنیہ اور جمع کی اصلی صورت

واحد ہے، اور واحد و مفرد اسماء کی تشریح مفردات و غریب قرآن میں گو ہوتی رہتی ہے، لیکن چونکہ تثنیہ اور جمع بنانے کے مختلف قواعد و اصول ہیں، بعض جمعیں بلاقاعدہ ہوتی ہیں، بعض جمعوں کے مفرد نہیں ہوتے، ان وجوہ سے علماء نے اس موضوع پر بھی مستقل رسائل لکھے، جن میں سے سب سے پہلی تصنیف یحییٰ ابن زیاد الفراء المتوفی ۲۰۷ھ کی کتاب الجمع والتثنیہ فی القرآن اور دوسری اخفش اوسط سعید بن سعدہ نحوی المتوفی ۲۱۵ھ کی الواحد والجمع یا الافراد والجمع فی القرآن ہے،

معربات القرآن | ہر زبان میں دوسری زبانوں کے اختلاط و تعلقات سیاسی و تجارتی کی بنا پر کچھ الفاظ آجاتے اور تھوڑے سے تغیر کے بعد وہ اصل زبان کے الفاظ قرار پاجاتے ہیں، عربی زبان میں بھی اس قسم کے الفاظ ہیں، اور قرآن مجید نے ان کو استعمال کیا ہے، کلام پاک کے متعلق مباحث میں علمائے متقدمین میں سے تو متعدد علماء مثلاً ثعالبی، ابن فارس، ابن جزری، ابن جریر طبری (فی اول التفسیر) وغیرہ نے ان کا ایک باب علیحدہ قرار دے کر ان کی تحقیق کی ہے، لیکن متاخرین میں جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے "المذہب فیما وقع فی القرآن من المعرب" ایک مستقل رسالہ تالیف کیا ہے، تاج الدین سبکی المتوفی ۷۷۱ھ اور ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ نے ان الفاظ معربہ کو نظم کر دیا ہے،

الوجوہ والنظائر فی القرآن | قرآن مجید میں اکثر ایک لفظ متعدد مقامات میں مختلف معنی میں آیا ہے، اہل بلاغت ایسے لفظ کو "مشترک" کہتے ہیں، لیکن علوم قرآن میں ان کو "نظائر" کہتے ہیں، اور بعض الفاظ ایسے ہیں، جو متعدد مقامات پر بعینہ مستعمل ہوئے ہیں، اور ہر جگہ ان سے ایک ہی معنی مراد ہیں، علمائے قرآن ان کو وجوہ کہتے ہیں،

وجوہ ونظائر کی واقفیت فہم معانی قرآن کے لیے نہایت ضروری ہے، تاکہ معنی سمجھنے میں اشتباہ نہ ہو، اس بناپر علمائے اسلام نے مستقل تصنیفات میں وجوہ ونظائر کی توضیح وتحقیق ضروری سمجھی، اس فن کی بنا اس قدر قدیم ہے، کہ حضرت ابن عباسؓ سے ان کے دو شاگرد عکرمہ اور علی بن ابی طلحہ نے ان سے اس فن کی روایتیں کی ہیں، اور بلحاظ تصنیف سب سے پہلے مقاتل بن سلیمان مفسر المتوفی ۱۵۰ھ کی تالیف الوجوہ والنظائر کا نام منقول ہے،

ان کے علاوہ احمد بن فارس لغوی المتوفی ۳۷۵ھ، ابو الفرج بن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ، ابو الحسین محمد بن عبد الصمد مصری دامغانی، ابو القاسم محمود نیساپوری الموجود ۵۵۳ھ کی الوجوہ والنظائر فی القرآن کے نام سے تصنیفات ہیں۔ جلال الدین سیوطی کا رسالہ "معرک القرآن فی مشترک القرآن" بھی اسی فن میں ہے،

اعراب القرآن | تمام سامی زبانوں میں سے صرف بابلی اور عربی دو زبانوں میں اجزائے کلام کے باہمی ارتباط وتعلق کے اظہار کے لیے اعراب (یعنی آخر حرف میں زیر زبر پیش) کا استعمال ہوتا ہے ان میں اعراب کے ذریعہ سے عربی زبان میں فاعل، مفعول، مضاف، مضاف الیہ، حال، تمیز، وغیرہ کا امتیاز ہوتا ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ فہم معنی کے لیے واقفیت اعراب کی کس قدر ضرورت ہے، علمائے اسلام نے یہ ضرورت بھی پوری کر دی اور قرآن مجید کے اعراب پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں، جن میں عموماً ایک ایک سورہ کو بہ ترتیب لے کر، ان کے اعراب کی تحقیق کی گئی ہے،

اعراب القرآن ابو حاتم سہل بن محمد سجستانی المتوفی ۲۴۸ھ، اعراب القرآن

ابومروان عبدالملک بن حبیب قرطبی المتوفی ۲۳۹ھ، اعراب القرآن ابوالعباس مبرد المتوفی ۲۸۶ھ، اعراب القرآن ثعلب نحوی المتوفی ۲۹۱ھ، اعراب القرآن ابوجعفر احمد بن محمد النحاس المتوفی ۳۲۸ھ، اعراب القرآن حسین بن احمد خالویہ نحوی المتوفی ۳۷۰ھ (اس میں سورۂ طارق سے آخری تیس سورتوں کے اعراب بیان کیے گیے ہیں) غریب اعراب القرآن احمد بن فارس زکریا لغوی المتوفی ۳۷۵ھ، اعراب القرآن علی بن ابراہیم حوفی المتوفی ۴۳۰ھ (یہ کتاب دس جلدوں میں ہے) مشکل اعراب القرآن مکی بن ابی طالب قیسی المتوفی ۴۳۷ھ (۲ جزء) ابوطاہر اسمٰعیل بن خلف صقلی نحوی المتوفی ۴۵۵ھ (نو جلدوں میں) اعراب القرآن ابوزکریا خطیب تبریزی المتوفی ۵۰۲ھ (چار جلدوں میں) اعراب القرآن قوام السنہ ابوالقاسم اسماعیل الطلیحی الاصفہانی المتوفی ۵۳۵ھ، اعراب القرآن ابوالبقاء عبداللہ العکری المتوفی ۶۱۶ھ اس فن کی مقبول و مشہور کتابیں ہیں، ان کے علاوہ اس فن کی یہ کتابیں بھی قابل ذکر ہیں، اعراب القرآن موفق الدین عبداللطیف بغدادی المتوفی ۶۲۹ھ (صرف اعراب سورۂ فاتحہ) الکتاب الفرید فی اعراب القرآن المجید حسین بن ابی العز الہمدانی المتوفی ۶۴۳ھ، المجید فی اعراب الکتاب المجید برہان الدین ابراہیم بن محمد سفاقی المتوفی ۷۴۲ھ (مخلوط با عراب تفسیر) اعراب القرآن احمد بن یوسف السمین المصری المتوفی ۷۵۶ھ، تحفۃ الاقران فیما قرئ بالتثلیث من حروف القرآن احمد ابن یوسف بن مالک الرعینی الاندلسی المتوفی ۷۷۹ھ (اس کتاب میں ان الفاظ کا بیان ہے جن کو مختلف معانی کے لحاظ سے جوزبر زیر پیش تینوں حرکات کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے)

علوم القرآن
معانی بیان بدیع قرآن
معانی القرآن

الفاظ کے بعد قرآن مجید کے محاسن معنوی کی بحث ہے، کہ قرآن مجید کن معانی پر مشتمل ہے؟ وہ معانی کن طرق سے ادا ہوئے ہیں، کن معانی کو کن مختلف صلات و حروف و ابط معانی سے ادا اور ان میں کیا اثر پیدا کرتے ہیں، الفاظ کی تقدیم و تاخیر تعریف و تنکیر، اطلاق و تقیید، وغیرہ سے معانی میں کیوں کر اثر پیدا ہوتا ہے، ان تمام امور کی واقفیت کے بغیر فہم مطالب قرآن غیر ممکن ہے، اسی لیے علماے ادب نے جن کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کا سب سے زیادہ حق تھا، ان مباحث پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں، جن میں سے حسب ذیل تصنیفات و مصنفین کے نام ہم کو معلوم ہیں،

معانی القرآن یونس بن حبیب النحوی المتوفی ۱۸۲ھ، معانی القرآن علی بن حمزہ کسائی المتوفی ۱۸۹ھ، معانی القرآن محمد بن مستنیر قطرب نحوی المتوفی ۲۰۶ھ، معانی القرآن ابوالحی بن زیاد الفرار المتوفی ۲۰۷ھ، معانی القرآن ابو عبیدہ معمر نحوی المتوفی ۲۰۹ھ، معانی القرآن اسماعیل بن اسحاق ازدی المتوفی ۲۰۲ھ، تفسیر معانی القرآن سعید بن مسعدہ اخفش المتوفی ۲۲۱ھ، معانی القرآن تعلب نحوی المتوفی ۲۹۱ھ، معانی القرآن محمد بن احمد بن کیسان نحوی المتوفی ۲۹۹ھ، معانی القرآن ابو محمد سلمہ بن عاصم نحوی المتوفی ۳۱۰ھ، معانی القرآن ابو اسحاق ابراہیم الزجاج المتوفی ۳۱۱ھ، معانی القرآن ابو عبداللہ محمد بن احمد نحوی المتوفی ۳۲۰ھ، معانی القرآن ابوالحسن عبداللہ ابن محمد نحوی المتوفی ۳۲۵ھ، معانی القرآن ابو جعفر نحاس نحوی المتوفی ۳۳۸ھ، معانی القرآن ابو عبید قاسم بن سلام المتوفی ۳۲۸ھ، الموضح فی معانی القرآن ابوبکر نقاش نحوی المتوفی ۳۵۰ھ، موجز التاویل عن معجز التنزیل احمد بن کامل بن شجرہ المتوفی ۳۵۰ھ

ایجاز البیان فی معانی القرآن نجم الدین ابو القاسم محمود نیسا پوری المتوفی ۵۵۳ھ۔

اعجاز القرآن | انبیائے خدا کی طرف سے جو کتابیں نازل ہوئیں، وہ اپنے معانی، مقاصد، ارشادات اور ہدایات کی بنا پر ہر زمانہ میں معجز رہی ہیں، لیکن یہ قرآن مجید کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے معانی وارشادات کے ساتھ اپنے الفاظ، ترکیب کلام، ادائے مقصود اور تعبیر مفہوم میں بھی اعجاز رکھتا ہے، یہی سبب ہے کہ صحف قدیمہ گو اپنے معانی کے لحاظ سے اب تک باقی ہوں، لیکن وہ اپنے الفاظ و ترکیب الہامی کے لحاظ سے مدت ہوئی کہ دنیا سے مفقود ہو چکی ہیں، مگر قرآن مجید جس طرح اپنے معانی، تعلیمات اور ہدایات کے لحاظ سے غیر فانی ہے، اسی طرح اپنے الفاظ و عبارات الہامیہ کے لحاظ سے بھی غیر فانی ہے قال اللہ تعالیٰ انا لہ لحٰفظون۔

حقیقت اعجاز بیان، اسباب اعجاز کی تشریح، انواع اعجاز کی تقسیم و تحلیل، محاسن عبارات قرآن کی تفصیل، نکات و وجوہ بلاغت و فصاحت قرآن کی توضیح، علمائے اسلام نے اس خوبی اور عمدگی سے کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے، اور اس کے متعلق اس کثرت سے لٹریچر انھوں نے فراہم کر دیا ہے، کہ اس کا احاطہ بھی دشوار ہے، اس فن کی پہلی کتاب جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا، امام ابوالحسن علی بن حسین رمانی المتوفی ۳۸۰ھ کی "النکت فی الاعجاز" ہے، اور دوسری امام سلیمان احمد بن محمد خطابی المتوفی ۳۸۸ھ کی اعجاز القرآن اور تیسری شریف ابو عبداللہ محمد بن زید ابن علی الواسطی المتوفی ۳۰۶ھ کی اعجاز القرآن، چوتھی قاضی ابوبکر باقلانی المتوفی ۴۰۳ھ کی اعجاز القران ہے، شیخ عبدالقاہر جرجانی المتوفی ۴۷۱ھ نے "المعتضد" کے نام سے شریف ابو عبداللہ کی کتاب کی شرح لکھی، شیخ کی اس کے علاوہ اعجاز القرآن

پر ایک دوسری تصنیف بھی ہے۔

متاخرین میں زین المشائخ محمد بن ابی القاسم البقالی الخوارزمی المتوفی ۵۶۲ھ کی التنبیہ علی اعجاز القرآن، ابو اسحاق ابراہیم بن احمد الجزری الخزرجی کی ایجاز البرہان فی اعجاز القرآن، امام فخر الدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ کی اعجاز القرآن، زکی الدین ابن ابی الاصبع تیردانی المتوفی ۶۵۴ھ کی البرہان فی اعجاز القرآن، ابوبکر محمد بن محمد ابن سراقہ المتوفی ۶۶۲ھ کی اعجاز القرآن، کمال الدین محمد بن علی زملکانی شافعی المتوفی ۷۲۷ھ کی البرہان فی اعجاز القرآن الکبیر اور المجید فی اعجاز القران المجید الصغیر، اس فن کی نادر تصنیفات ہیں،

یہ تصنیفات عموماً قرآن مجید کے ان طرق بلاغت و وجوہ فصاحت و انواع محاسن پر مشتمل ہیں، جو حد اعجاز تک پہنچ گئے ہیں، ضرورت تھی کہ قرآن مجید کے عام محاسن کلام پر بھی گفتگو کی جائے، چنانچہ مجاز قرآن، تشبیہ قرآن، امثال قرآن، اقسام قرآن اور بدائع قرآن بیان کو مستقل فن قرار دے کر علٰحدہ علٰحدہ بیسیوں کتابیں لکھی گئیں۔

مجاز القرآن | فطرت انسانی ہے کہ وہ پامال، عامیانہ اور کثیر الاستعمال چیزوں کو ناپسند اور مخصوص الاستعمال تو ایجاد اشیاء کو پسند کرتا ہے، اسی بنا پر عام اور متبذل ترکیبیں اور الفاظ فصحاء کی زبان میں متروک ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر ہر متکلم معانی کے لیے خود الفاظ گڑھ کر اس کا استعمال شروع کر دے تو ہر شخص کی زبان کے لیے ایک نئی ڈکشنری کی حاجت ہوگی، اور دنیا میں باہمی فہم و تفہیم کا سد باب ہو جائے گا، کیونکہ الفاظ سے معانی تک انتقال ذہن فقط ملک یا قوم کے متفق علیہ وضع عام کا نتیجہ ہے، اس بنا پر ایک طرف یہ ضروری ہے کہ وضع عام سے بالکل کنارہ کشی نہ کی جائے،

دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے، کہ اس سے ابتذال نہ پیدا ہونے پائے، اُس کی صورت یہ ہے کہ تعبیر معنی کے لیے ان غیر مبتذل، غیر عامیانہ الفاظ کا استعمال کیا جائے، جن کا اُن معانی کے لیے وضع عام نہ ہو، لیکن ان الفاظ کے معانیِ موضوعہ اور اُن معانی میں جن کو ہم ادا کرنا چاہتے ہیں، ایک خاص قسم کی مناسبت و مشابہت ضروری ہے تاکہ جب ہم ان الفاظ کا استعمال کریں اور ہمارا مخاطب ان کے عام موضوع معنی سمجھے، اور جب وہ ان کو کلام کے مقصود اور موقع و محل کے موافق نہ پائے، تو فوراً اس کا ذہن ان معانی کو چھوڑ کر ان کے مناسب و مشابہ معنی کی طرف منتقل ہو جائے، اور متکلم کا مقصود اس کے جدید، غیر مبتذل اور غیر عامی الفاظ و ترکیب کے ذریعہ سے سمجھ جائے۔

قرآن مجید میں جس کا حسن عبارت، خوبی کلام، اور جدتِ ترکیب حد اعجاز تک پہنچا ہوا ہے، بے انتہا مجازات ہیں، جو اکثر کتب سماویہ کی خصوصیت خاص ہے، فن معانی القرآن میں گو علماء نے ایک حد تک اس کے مباحث سے تعرض کیا تھا، لیکن ان کی اہمیت ایک مستقل فن کی طالب تھی، اس بنا پر مصنفینِ اسلام نے مجاز القرآن کے نام سے مستقل تصنیفات شروع کیں، اس سلسلہ کی پہلی کڑی ابوعبیدہ معمر بن مثنی نحوی المتوفی ۲۰۹ھ کی "مجاز القرآن" ہے، سلطان العلماء عزالدین بن عبد السلام المتوفی ۶۶۰ھ کی "الاشارہ الی الایجاز فی بعض انواع المجاز"، اس فن کی بہترین تصنیف ہے، جس میں نہایت استیعاب کے ساتھ قرآن کی آیات کا استقصا اور ان کے معنی کی تشریح کی گئی ہے، اس کے بعد علامہ ابن قیم بن جوزیہ کی تصنیف "الایجاز فی المجاز" ہے، جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے سلطان

العلماء کی الاشارہ کا بنام "مجاز الفرسان الی مجاز القرآن" اختصار کیا ہے،

تشبیہ القرآن | سیکڑوں معانی اور مطالب ایسے ہیں، جو عام نظروں سے پوشیدہ ہیں، اور جن کی تشریح و توضیح کے لیے ایک دفتر درکار ہوتا ہے، لیکن سب سے آسان، مختصر اور بہتر صورت اس کی یہ ہے کہ ان کو بذریعہ تشبیہ ادا کیا جائے، یعنی ان کو ایسے معانی و مطالب کے مماثل و مشابہ قرار دیا جائے جو عام طور سے معلوم، اور نظروں کے سامنے ہیں، کہ مخاطب ان ظاہر اور واضح معانی سے بواسطۂ مماثلت و مشابہت ان مخفی، پیچیدہ اور دیر فہم معانی و مطالب تک پہنچ جائے۔

مذہب چونکہ ماورائے مادہ سے بحث کرتا ہے، اس لیے بیشتر مواقع پر اس کو تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے، قرآن مجید کے تشبیہات پر عام کتب بیان اور نیز فن معانی القرآن فی اعجاز القرآن اور فن مجاز القرآن میں ان پر کامل بحثیں موجود ہیں، اور الجمان فی تشابیہ القرآن لابی القاسم عبداللہ بن باقیا البغدادی المتوفی ۴۸۵ھ اس فن پر ایک مستقل کتاب بھی ہے۔

امثال القرآن | جو اغراض تشبیہ سے مطلوب ہیں، بعینہ وہی امثال سے مقصود ہیں۔ انبیائے مذاہب اور حکمائے اخلاق نے تمام طرق استدلال سے زیادہ ان امثال سے کام لیا ہے، کہ یہ استدلالات منطق سے زیادہ موثر اور عام فہم ہیں، اس لیے قرآن مجید میں بھی نہایت کثرت سے امثال ہیں، تفسیر کے ضمن میں مفسرین نے ان امثال کی جو تشریح کی ہے، ان کے علاوہ ابوعبدالرحمن محمد بن حسین سلمی نیساپوری المتوفی ۴۰۲ھ، ابوالحسن علی بن محمد ماوردی المتوفی ۴۵۰ھ اور شمس الدین ابن القیم المتوفی ۷۵۱ھ نے "امثال القرآن" کے نام سے مستقل کتابیں لکھی ہیں،

امثلۃ القرآن حکماء کے چھوٹے چھوٹے مقولے اور بلغاء کے بلیغ فقرے لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں، اور وہی تقریباً انشاپردازی اور ادب کی جان ہوتے ہیں، اور پھر وہ لٹریچر میں اس طرح سرایت کر جاتے ہیں، کہ اُن سے سیکڑوں محاورے اور تلمیحات پیدا ہو جاتے ہیں، قرآن مجید اس ایجاز اور اعجاز کا کامل ترین نمونہ ہے، اس کی سیکڑوں چھوٹی چھوٹی آیتیں اور حکیمانہ فقرے عربی علم ادب کے جزء بن گئے ہیں۔ جن کے بغیر عبارت میں بلندی اور کلام میں لطف و تسیر پیدا نہیں ہو سکتی، علمائے ادب عربی نے قرآن مجید کی اس قسم کی تمام آیتیں الگ کر دی ہیں، ثعالبی المتوفی ۴۳۰ھ نے کتاب الایجاز والاعجاز میں، قاضی ماوردی المتوفی ۴۵۰ھ نے امثال القرآن میں، جعفر بن شمس الخلافہ نے کتاب الآداب میں، جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۰ھ نے الاتقان میں مستقل ابواب میں قرآن مجید کی ضرب الامثال کو جمع کر دیا ہے۔

بدائع القرآن کلام کے محاسن معنوی کے بعد اس کے محاسن لفظی کا درجہ ہے، جن کو عام طور سے "صنائع و بدائع" کہتے ہیں، زور بلاغت و فصاحت کے ساتھ اگر یہ چیز کلام میں پیدا ہو جائے، تو عجیب لطف دے جاتی ہے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ تمام علوم و فنون اسلامیہ کے بانی و واضع۔۔۔ اول عموماً ارباب خلوت و محراب اور بوریا نشینانِ کلبۂ فقر ہیں، لیکن علم بدیع کا مخترع اول ایک عباسی شہزادہ ابن المعتز المتوفی ۲۹۶ھ ہے، اس نے ۱۷ بدائع اپنی تصنیف کتاب البدیع میں جمع کئے ہیں، قدامہ بن جعفر نے جو ابن المعتز کا معاصر تھا، نقد الشعر میں اس کو بیس تک پہونچایا، ابو ہلال عسکری المتوفی ۳۹۵ھ نے کتاب الصناعتین میں سات کا اور اضافہ کیا، ابن رشیق قیروانی المتوفی ۴۵۶ھ نے کتاب العمدہ میں پینسٹھ بدائع شمار

کرائے، شرف الدین احمد بن یوسف تیفاشی نے ۷۰ تک پہنچایا، عبدالعظیم بن ابی الاصبع المتوفی ۶۵۶ھ نے کتاب التحریر کے نام سے خاص قرآن مجید کے بدائع کی کتاب لکھی، جس میں بدائع کی تعداد ۱۰۰ تک پہنچا دی۔[1]

علوم القرآن کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات اس جلد کے ابتدائی نمبروں میں شروع ہوا تھا، جس کا آخری نمبر ۲۵ فروری ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں نکلا تھا، ان نمبروں میں قرآن حکیم کے متعلق بیس[2] علوم کا تذکرہ ہو چکا ہے، آخری عنوان الفاظ القرآن تھا، اس کا بقیہ حصہ آج سے پھر شروع کیا جاتا ہے۔

۲۱۔ ہجاء القرآن: عجائب قدرت الٰہی کا ایک نمونہ یہ ہے، کہ دنیا میں تقریباً پانچ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں، جو باوجود اختلاف شدید حروف ہجا کی آوازیں (باستثنائے چند حروف) بالکل متحد و مشترک ہیں، لیکن یہ اتحاد و اشتراک، ان کے الفاظ کے اتحاد و اشتراک پر ذرہ بھی موثر نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ ۳۲ یا ۳۳ حروف ہیں جو کم و بیش دنیا کی پانچ ہزار زبانوں کے لیے ہمیشہ جدید اور غیر مشترک الفاظ کا ذخیرہ فراہم رکھتے ہیں،

عربی زبان تمام السنۂ سامیہ سے زیادہ حروف رکھتی ہے، عبری جو باعتبار ادبیات و علوم تمام سامی زبانوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے، اس کی بنیاد صرف ان ۲۲ حروف پر ہے۔

ا ب ج د (گ) ہ و ز ح ط ی، ک ل م ن، س ع ف، (پ) ص ق ر ش ت، ان کا مجموعہ ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت ہے۔ عربی زبان میں ۶ حرف

---

[1] الہلال کلکتہ ۲۵ فروری ۱۹۱۴ء۔

زیادہ ہیں۔ ث، خ ذ، ض ظ غ، جن کا مجموعہ ثخذ اور ضظغ ہے،

اس تفصیل سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ عربی زبان میں حروفِ ہجا کی یہ تبعیت عبری کی ترتیب کیا تھی؟ یعنی دراصل اس طرح تھی، اب ج د، ہ و ز ح ط ی، ک ل م ن، س ع ف ص ق ر ش ت، ث خ ذ ض ظ غ، بعد از اسلام سب سے اول جس چیز کو عربی زبان حیطۂ تحریر میں لائی، وہ قرآن مجید ہے، کسی چیز کو لکھنے کے لیے حروفِ ہجا کی ترتیب و تحسین کوئی ضروری شے نہیں، لیکن اس کے پڑھنے کے لیے یقیناً سب سے اول حروف ہجا کی اور پھر ان کو بحسن و صحت پڑھ سکنے کے لیے حروف ہجا کی ترتیب صحیح و آسان کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ سب سے پہلے مسلمانوں نے حروف ہجا کو آسان ترین و بہترین ترتیب میں مبدل کیا، اور تمام ہم شکل و متحد الصورت حروف کو یکجا کر دیا، مثلاً

اب ت ث، ج ح خ، د ذ، ر ز، س ش، ص ض، ط ظ، ع غ، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی حروف ہجا کے تلفظ کی ایک اور مصیبت تھی، عبری میں جو السنۂ سامیہ کی مہذب ترین شاخ تھی، تلفظ کی صورت یہ تھی،

الف، بیتھ، گیمل، دالتھ، ہے، واؤ، زین، حیتھ، طیتھ، یود، کاف، لامید، مم، نن، سن، عین، فے، صدے، قف، ریش، شین، تاو،

قرآن مجید کے لیے حروف ہجا کی تہذیب و ترتیب میں اس اختلاف تلفظ کو بھی دفع کیا گیا، اور حتی الامکان ایک متحد و متساوی الصوت تلفظ وضع کیا گیا، مثلاً الف، بے، تے، ثے، الخ یا الف، با، تا، ثا، الخ

غرض یہ مباحث ایسے تھے، جو مسئلۂ تدوین علوم قرآنیہ میں سب سے اوّل

بحث و ترتیب کے لائق تھے، چنانچہ دوسری اور تیسری صدی کے علماء نے ان مباحث پر بھی منفرد مخصوص کتابیں لکھیں، جن کا نام عموماً "ہجاء المصحف" ہے، ابن ندیم جو چوتھی صدی کا مصنف ہے، اس نے اس موضوع پر متعدد تصنیفات کا ذکر کیا ہے، جیسے ہجاء المصحف، یحییٰ بن حارث، ہجاء المصحف ابن قتیبہ، ہجاء المصحف احمد بن ابراہیم الوراق وغیر ذالک،

۲۲۔ النقط والشکل فی القرآن عربی زبان میں ابتداءً حروف ہجا میں نقطے نہیں ہوتے تھے، اس لیے اکثر اہل عجم کی نظر میں حروف باہم متشابہ معلوم ہوتے تھے اور وہ ان کو صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے۔ حجاج بن یوسف ثقفی کے تمام اوراق عمل میں سیاہی کے سوا اور کچھ نہیں، اگر ان میں کچھ اجالا ہے، تو یہی ہے کہ اس نے قرآن کو اس مشکل سے نجات دی،

اس نے چند علماء کی مدد سے نقطے ایجاد کرائے، اس پر بھی غلطی رفع نہ ہوئی، تو قرآن کے الفاظ پر شکل یعنی زبر، زیر، پیش لگائے، اکثر عربی کتابوں میں تم نے "اعجام" اور حروف "معجم" پڑھا ہوگا، اس کے اصلی معنی یہ ہیں، کہ "لفظ عربی کو عجمی بنانا" چونکہ یہ نقطے عجمیوں کی خاطر ایجاد کیے گئے تھے، اس لیے حروف ہجا پر نقطے لگانا گویا "اعجام ہونا تھا، یعنی عربی لفظ کو عجمی بنانا تھا۔

چونکہ یہ علامات بالکل نئی تھیں، اس لیے ان کے قواعد و اصول کے لیے مستقل تصنیفات کی ضرورت تھی، علمائے اسلام نے یہ ضرورت بھی باحسن وجوہ پوری کی، اور حسب ذیل کتابیں یادگار چھوڑیں،

کتاب النقط والشکل خلیل بن احمد (واضع علم عروض) المتوفی ۱۷۰ھ کتاب النقط

والشکل محمد بن عیسٰی، کتاب النقط والشکل یحیٰی ابن مبارک یزیدی النحوی المتوفی ۲۰۲ھ، کتاب النقط والشکل ابو حاتم سجستانی المتوفی ۲۴۸ھ (یہ کتاب جداول ودوائر پر مشتمل ہے) کتاب النقط والشکل ابن قتیبہ دینوری المتوفی ۲۷۶ھ۔

۲۳۔ اجزاء القرآن | ہر کتاب تحصیل فوائد اور تسہیل مطالب کی غرض سے مختلف ابواب وفصول پر منقسم ہوتی ہے، صحف الٰہیہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں، تورات مختلف پرق (فرق) یعنی منازل اور مختلف اصحاح یعنی سور پر منقسم ہے، قرآن مجید کی اصلی تقسیم معنوی تو سورتوں پر ہے، لیکن لوگوں نے تلاوت کی آسانی کے لیے مختلف اجزاء پر اس کو منقسم کر دیا ہے، ان تقسیمات کا مبنیٰ صرف الفاظ وعبارات کی متساوی تقسیم ہے کہ پڑھنے والوں اور حوالہ دینے والوں کو سہولت وآسانی ہو۔

قرون اولیٰ کے عباد وزہاد علی العموم قرآن کی کامل تلاوت ایک ہفتہ میں ختم کر دیتے تھے۔ اس مناسبت سے قرآن کی سب سے پہلی تقسیم یہ ہوئی کہ سات ٹکڑوں پر منقسم کیا گیا، جن میں سے ہر ایک کو "حزب" (ٹکڑا) یا "منزل" کہتے ہیں، کہ تلاوت قرآن کا مسافر ہر روز وہاں اپنے سفر الی اللہ کی ایک منزل ختم کرتا ہے۔

تلاوت کا اس سے زیادہ سہل طریقہ یہ ہے کہ ہر مہینے میں ایک بار ختم کیا جائے، اس بنا پر لوگوں نے قرآن کو تیس روز کے حساب سے برابر برابر تیس حصوں پر تقسیم کر دیا، جن کا نام "پارہ یا جزء" ہے۔

پھر ہر پارہ دو برابر حصوں میں منقسم ہوتا ہے، جن کو "نصف" کہتے ہیں، نصف کے بھی دو ٹکڑے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا ایک ایک ربع ہے، لیکن اصطلاحاً ایک ٹکڑے کو ربع، دو ٹکڑے کو نصف، تین ٹکڑے کو ثلث اور چاروں ٹکڑوں کو ملا کر

ایک "پارہ" کہتے ہیں؛

بار قرآن مجید کے ان مختلف اجزاء و اقسام کی تعیین کہ کہاں سے شروع ہوتے ہیں، کہاں ختم ہوتے ہیں، کہاں تک نصف ہے، کہاں ربع ہے، کہاں ثلث ہے، محتاجِ تالیف و ترتیب تھی، اس لیے دوسری اور تیسری صدی کے علمائے نحو و ادب نے اس احتیاج سے بھی قرآن کو مستغنی کر دیا، اجزاء القرآن ابوبکر بن عیاش الموجود ۱۲۷ھ (یہ کتاب ۳۰ پاروں میں تقسیم ہے) اجزاء القرآن حمید بن قیس الہلالی، اسباع القرآن (۷ منازل کی تفصیل) حمزہ زیات المتوفی ۱۵۶ھ، اجزاء القرآن سلیمان بن عیسیٰ، اجزاء القرآن کسائی نحوی المتوفی ۱۸۰ھ، اجزاء القرآن ابوعمر الدوری الموجود ۲۰۲ھ،

۲۴- مقطوع القرآن و موصولہ | کسی ایسی کتاب کے لیے جو متنوع المعانی اور مختلف المطالب ہو، اس کو پڑھتے وقت نہایت ضروری ہے، کہ عبارت کا جوڑ توڑ اور ختم و شروع ایسے فقرہ پر کیا جائے، جس سے عبارت بے ربط اور معنی مختلط نہ ہوں، اسی کا نام قطع و وصل ہے، قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بلکہ صحیح طور پر مطالب سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے، کہ قرآن مجید کی مقطوعات و موصولات سے واقفیت ہو، حسب ذیل کتابیں اسی واقفیت کا ذریعہ ہیں، مقطوع القرآن و موصولہ عبداللہ عامر یحصبی قاری شام المتوفی ۱۱۸ھ، مقطوع القرآن و موصولہ حمزہ بن حبیب الزیات قاری بصرہ المتوفی ۱۵۶ھ، مقطوع القرآن و موصولہ علی بن حمزہ کسائی قاری کوفہ المتوفی ۱۸۰ھ،

۲۵- عدد آی القرآن | جس طرح عام کتابوں کی ہر فصل و باب کی ترکیب فقروں سے ہوتی ہے، اسی طرح قرآن مجید کی ہر سورت آیتوں سے مرکب ہوتی ہے، "آیۃ"

عربی میں (اور اُدہ عبری میں) لغت، نشان وعلامت کے مرادف ہے، لیکن اصطلاحاً عبری میں تورات کے ایک حرف کو بھی اُدہ کہتے ہیں، کہ وہ اپنے مدلول علیہ کے لیے صرف ایک قسم کا نشان اور علامت ہے، لیکن عربی کی اصطلاح اس سے زیادہ وسیع قرار دی گئی ہے اور وہ قرآن کے پورے ایک فقرہ پر حاوی ہے،

آیت یا فقرہ کس کو کہتے ہیں، کسی کلام مسلسل کے اس مختصر ٹکڑے کو جو ادائے مطلب اور تفہیم معنی میں مستقل ہو، اس تعریف کے رو سے ممکن ہے کہ کلام کا ایک ٹکڑا جس کو ہم ادائے مطلب کے لیے مستقل سمجھتے ہوں تم نہ سمجھتے ہو، پس یہ بالکل ممکن ہے کہ اگر ایک فریق کے نزدیک سورہ فاتحہ کے سات ٹکڑے ہوں، یعنی سات آیتیں، تو دوسروں کے ہاں چھ یا آٹھ ہوں، اسی پر پورے قرآن مجید کی تمام آیات کی تعداد کو قیاس کر لو،

قرآن مجید کے تحفظ وصحت کی اخیر حد یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کے ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت کا شمار کر لیا ہے، حروف اور الفاظ کی تعداد میں تو زیادتی اور کمی نہیں ہوسکتی، لیکن اوپر کی تفصیل کے مطابق آیات کی تعداد میں اختلافِ رائے ممکن ہے، چنانچہ "علم عدد آیِ القرآن" کا موضوع یہی مسئلہ ہے،

علم القرأۃ کی تفصیل میں اوپر گذر چکا ہے کہ فنون قرآن کے لیے قرون اولیٰ میں پانچ مشہور اسکول (درسگاہ) تھے: مکہ معظمہ، مدینۂ مبارکہ، بصرہ، کوفہ، شام، ان میں سے ہر اسکول نے اپنی تحقیق ورائے کے مطابق آیاتِ قرآنیہ کی تعداد وشمار پر مستقل رسائل ترتیب دیئے ہیں،

مکہ معظمہ | کتاب العدد عطار بن یسار الفقیہ، کتاب العدد فزائی، کتاب حروف القرآن خلف البزاز ۔

مدینہ مبارکہ | کتاب العدد نافع قاری مدینہ المتوفی ۱۶۹ھ، کتاب العدد عیسیٰ المدنی، کتاب العدد اسماعیل بن ابی کثیر القاری ۔

کوفہ | کتاب العدد حمزۃ الزیات قاری کوفہ المتوفی ۱۵۶ھ، کتاب العدد خلف النحوی الکوفی، کتاب العدد محمد بن عیسیٰ الکوفی، کتاب العدد علی بن حمزہ الکسائی النحوی قاری کوفہ المتوفی ۱۸۹ھ ۔

بصرہ | کتاب العدد ابن معافا، کتاب العدد عاصم الجحدری، کتاب العدد حسن بن حسن بصری، عدد ای القرآن محمد بن مستنیر قطرب المتوفی ۲۰۶ھ ۔

شام | کتاب العدد یحییٰ بن حارث الذماری، کتاب العدد خالد بن معدان، (کتاب اختلاف العدد وکیع الفقیہ)

یہ قدماء کی تصنیفات ہیں، متاخرین میں موصلی (نام نہیں معلوم) کی ذات الرشد اور ابو معشر عبد الکریم بن عبد الصمد الطبری المتوفی ۴۷۸ھ کی تعداد الای القرآن وغیرہ اسی فن کی کتابیں ہیں[1]۔

احکام القرآن | مسلمانوں نے اپنے صحیفہ آسمانی کی جن جن حیثیتوں سے خدمت کی، لفظی، معنوی، نحوی، ادبی، لغوی، فقہی، کلامی، اخلاقی، روحانی، غرض مختلف پہلوؤں اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے جو تصنیفات، کتابیں، اور رسالے لکھے، ان کی کثرت، ضخامت اور تعداد اس قابل ہے، کہ ان کو خود ایک مستقل کتب خانہ کا خطاب دیا جائے۔

---

[1] الہلال ۸ جولائی ۱۹۱۳ء

الہلال اور البلاغ مرحوم کلکتہ کے متعدد نمبروں، (۱۱ فروری تا ۸ جولائی ۱۹۱۴ء) میں میرے مضامین شائع ہو چکے ہیں، اور ان کا عنوان علوم القرآن ہے، افسوس ہے، کہ یہ سلسلہ ناتمام رہا، اور آج گویا اسی سلسلہ کا ایک اور نمبر ہدیۂ ناظرین ہے،

اسلام کی شریعت کی اصل اور اساس اس کا صحیفۂ الٰہی ہے، یہی ان کے دین اور دنیا کی ہر ضرورت کا مرجع اور مآب ہے، اور وہی ان کے ہر عقیدہ، ہر حکم مفروض، اور ہر نکتۂ اخلاقی و تمدنی کی بنیاد ہے، احادیث اور فقہ میں جو کچھ ہے، وہ اسی کی آیتوں کی تشریح و توضیح، بیان و تفصیل اور استنباط و اجتہاد ہے، کچھ اور نہیں، ظاہر بین سمجھتے ہیں، کہ بعض احادیث صحیحہ میں قرآن کے مخالف یا قرآن کے ماوراء احکام ہیں، یہ فکر کا قصور، غور کی کمی، اور بصیرت کا نقص ہے، اسی لیے ائمۂ اسلام اور علمائے اعلام نے ابتداء سے قرآن مجید کے ساتھ اس حیثیت سے اعتنا کیا ہے، صحابۂ کرام میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ اس باب میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، احادیث میں بکثرت ایسے واقعات مذکور ہیں، کہ صحابہ اور صحابیات نے قرآن پاک کی آیتوں سے ایسے باریک اور دقیق قانونی اور فقہی نکتے پیدا کیے، جہاں تک عام اہلِ فہم کی رسائی ناممکن ہے، شام و عراق کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ اور فوج کے سپاہیوں میں جو زیادہ تر صحابۂ کرام تھے، یہ بحث پیش آتی ہے، کہ ممالک مفتوحہ کی یہ زمینیں عہد نبوی کے مفتوحات کی طرح مجاہدین میں تقسیم کر دی جائیں، یا وہ سلطنت و خلافت کی ملک قرار پائیں، اور ان کا حاصل بطور وظائف کے تمام مسلمانوں کو ملے، عام مجاہدین کا مطالبہ تھا کہ عہد نبوی کی پیروی کی جائے، اور یہ زمینیں صرف ان سپاہیوں میں

تقسیم کر دی جائیں، جو ان لڑائیوں میں شریک تھے، حضرت عمرؓ کا دعویٰ تھا، کہ ان زمینوں پر صرف انہی سپاہیوں کا حق نہیں، جنھوں نے ان ممالک کے فتح کرنے میں لڑائیاں لڑیں، بلکہ یہ خلافت و سلطنت کی ملکیت بن کر تمام موجودہ اور آیندہ نسلوں کی ملکیت ہیں، سپاہیوں کے سامنے مدینہ اور خیبر وغیرہ کی نظیریں تھیں، مگر یہ نکتہ ان سے پوشیدہ رہا، کہ چونکہ اس عہد میں مہاجرین عموماً اور بعض انصار بالکل تہی دست اور مفلس ہو گئے تھے، اس لیے اسلام کی پہلی دولت ان کی شخصی ملکیتوں میں دے دی گئی، اور اب چونکہ خدا کے فضل سے مسلمان بے نیاز ہو چکے تھے اس لیے اب اس کی حاجت نہ تھی، نیز حضرت عمرؓ یہ مصلحت پیش نظر رکھتے تھے کہ عراق و شام کے متمدن ممالک جن کے پیچھے مجوس و ترک اور رومیوں کی سلطنتیں ہیں جن کے مقابلہ اور مدافعت کے لیے ہمیشہ ایک مستقل فوج کی ضرورت پڑے گی اور یہاں اندرون سلطنت میں یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کی امداد کی حاجت ہوگی، اگر یہ صرف ان مجاہدین کی شخصی ملکیتیں قرار دے دی جائیں تو اتنی بڑی سلطنت کی بیرونی و اندرونی ضرورتیں کیونکر پوری ہوں گی، یہ مقدمہ اہل شوریٰ صحابہ کی عدالت میں پیش ہوتا ہے، اور وہاں بھی کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہوتا، آخر حضرت عمرؓ کا فہم قرآن کام کرتا ہے، اور وہ سب کے سامنے فرماتے ہیں، صاحبو! اللہ تعالیٰ نے ان فتوحات کا مصرف خود بتا دیا ہے،

ما افاء اللّٰہ علی رسولہ من	خدا نے اپنے رسول کو ان گانے والوں پر جو فتح دی
اھل القری فللّٰہ وللرسول و	تو وہ خدا، رسول، قرابت داروں، یتیموں،
لذی القربی، والیتامیٰ والمساکین	مسکینوں اور مسافر کا حصہ ہے، تاکہ یہ جائداد

وابن السبیل کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (حشر) تم میں سے صرف دولت مندوں کے ہاتھوں میں پھرا کرے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کا حق بتایا، پھر انصار کا حق جتایا، اور پھر آخر میں فرماتا ہے،

والذین جاء وا من بعدھم، (حشر) اور ان مسلمانوں کا حصہ ہے، جو ان لوگوں کے بعد آئے،

آپ نے فرمایا اگر یہ زمینیں آج صرف ان لڑنے والے سپاہیوں کو دیدی جائیں، تو بتاؤ آیندہ آنے والے مسلمانوں کا حصہ کہاں رہے گا؟ تمام صحابہؓ نے اس استدلال کو سُن کر سر اطاعت خم کر دیا، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں اس واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ استدلال صرف خدا کی توفیق سے تھا،

حضرت عائشہؓ کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اسلام میں متعہ جائز ہے یا نہیں، روایتیں مختلف تھیں، صحابہ میں حضرت ابن عباسؓ کو اس کے جواز پر اصرار تھا، قرآن پاک کی کوئی صریح آیت موجود نہ تھی، حضرت ام المومنینؓ نے لوگوں سے کہا تمہارے درمیان قرآن کا فیصلہ ہے، خدا فرماتا ہے؛

الا علیٰ ازواجھم اوما ملکت ایمانھم، مسلمانوں کی صرف دو قسم کی عورتیں حلال ہیں، ایک بیویاں، دوسری باندیاں؛

بتاؤ یہ متوعہ عورتیں ان دو صفتوں میں سے کس میں داخل ہیں؟ بیویاں نہیں ہیں، کہ ان کے لیے ترکہ اور وراثت نہیں، اور باندیاں تو ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہیں، اور

ان دو کے بعد کوئی تیسری قسم حلال نہیں[1]، کتنا اچھا استدلال ہے،

فاطمہ بنت قیسؓ ایک صحابیہ ہیں، جو یہ روایت کرتی ہیں، کہ جن عورتوں کو ان کے شوہر تین طلاقیں دیدیں۔ ان کے شوہروں پر پھر ان کو نان نفقہ اور رہنے کا مکان دینا واجب نہیں، ان کی یہ روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے فیصلوں اور قرآن کی اس آیت کے خلاف ہے،

یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ واتقوا اللہ ربکم لا تخرجوھن من بیوتھن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ وتلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ۔ (طلاق۔۱)	اے نبی! جب تم لوگ (یعنی مسلمان) عورتوں کو طلاق دو تو ان کو عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کے دن گنو اور اپنے پروردگار اللہ سے ڈرو، ان عورتوں کو ان کے گھروں سے (جن میں وہ رہتی تھیں) نہ نکالو، لیکن جب وہ کھلی بدکاری کریں، یہ خدا کی حدیں ہیں، اور جس نے خدا کی حدوں سے تجاوز کیا، اس نے اپنے اوپر ظلم کیا،

لوگوں نے جب فاطمہؓ کی اس روایت کے ماننے میں پس وپیش کیا تو انھوں نے کہا اے لوگو! میرے تمہارے درمیان قرآن کا فیصلہ ہے، اس گھروں سے نہ نکالنے کی حکم والی آیت کے بعد ہی یہ حکم ہے، جس میں گھروں سے علیحدہ نہ کرنے کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے،

لا تدری لعل اللہ یحدث	تجھے معلوم نہیں شاید خدا کوئی نئی بات

[1] مستدرک، حاکم۔

بعد ذالک امرا ۔۔۔ پیدا کرے۔

یہ کنایہ ہے میاں بیوی کے دوبارہ ملاپ سے، تین طلاقوں کے بعد میل ملاپ کی کوئی صورت نہیں، اس لیے لامحالہ یہ حکم اُن عورتوں سے متعلق ہے جن کو ایک یا دو یعنی رجعی طلاقیں دی گئی ہوں، کہ اُن کے لیے ایک جگہ رہنے سہنے میں دوبارہ میل کا امکان ہے، بتاؤ تین طلاقوں کے بعد نئی بات کیا پیدا ہوگی،[1] غور کیجیے کتنا لطیف استدلال ہے،

یہ صحابۂ کرام کے عہد کی چند مثالیں ہیں، اس سے اندازہ کیجیے کہ اگر نکتہ رس اور دقیقہ شناس طبیعتیں اس طرز پر غور و فکر کریں تو اسلامی قانون کا کتنا حصہ کتاب پاک کی روشنی میں منور نظر آئے، چونکہ قرآن پاک میں فقہ کے ابواب و فصول نہیں ہیں، اور حدیث کی کتابیں احکام کے ابواب پر مرتب ہیں، اور ان سے زیادہ بہتر اور آسان ترتیب اور جزئیات کی توضیح کے ساتھ فقہ کی کتابوں کی ہے، اس لیے آسان اور سہولت طلب طبیعتیں ہر معاملہ کے پیش آنے کے وقت سب سے اول فقہ و فتاویٰ کی کتابوں کی طرف رجوع کرتی ہیں، اور اُن کے بعد کتب حدیث کی طرف، اور سب سے آخر میں قرآن پاک کی طرف، حالانکہ حضرت معاذ بن جبلؓ والی حدیث کے مطابق اُس کی ترتیب الٹی ہونی چاہیے، پہلے قرآن، پھر حدیث، پھر فقہ و فتاویٰ، اس کم بینی،

---

[1] ابوداؤد کتاب الطلاق۔

کسلمندی اور سہولت پسندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف قرآن پاک کے مطالب میں غور و خوض کا مادّہ روز بروز کم ہوتا جارہا ہے، اور دوسری طرف زمانہ کے جدید ضروریات اور نئے سوالات کی جواب دہی سے ہم عاجز ہوتے جارہے ہیں،

اسلام کے عہدِ کمال میں ائمۂ مجتہدین اور عُلماے اسلام نے قرآن مجید کے فقہی اور قانونی پہلوؤں پر غور و فکر سے پہلوتہی نہیں کی، بلکہ پُوری نکتہ سنجی کے ساتھ اس فرض کو ادا کیا ہے، تحریر و فن کی حیثیت سے سب سے پہلے امام شافعی نے اس موضوع پر کتاب لکھی، اور اس کے بعد فقہ اسلامی کے چاروں ارکان مالکی، شافعی، حنفی اور حنبلی نے اس بحث پر کتابیں لکھیں، چنانچہ کشف الظنون کے حوالہ سے حسب ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے،

عدد	کتاب کا نام	مصنف کا نام	سالِ وفات
۱	احکام القرآن	امام شافعی	۲۰۴ھ
۲	"	ابوالحسن علی بن حجر سعدی	۲۴۴ھ
۳	"	قاضی ابو اسحاق اسماعیل بن اسحاق ازدی بصری	۲۸۲ھ
۴	"	ابوالحسن علی بن موسیٰ بن یزداد قمی حنفی	۳۰۵ھ
۵	"	امام ابوجعفر احمد طحاوی حنفی	۳۲۱ھ
۶	"	ابومحمد قاسم بن اصبغ قرطبی مالکی	۳۴۰ھ
۷	"	ابوبکر جصاص رازی حنفی	۳۷۰ھ

عدد	کتاب کا نام	مصنف کا نام	سال وفات
۸	احکام القرآن	ابوبکر احمد بن حسین بیہقی	۴۵۸ھ
۹	مختصر احکام القرآن	ابومحمد کی بن ابی طالب قیسی	۴۳۷ھ
۱۰	احکام القرآن	امام ابوالحسن کیا الہراسی شافعی بغدادی	۵۰۴ھ
۱۱	"	قاضی ابوبکر ابن العربی اندلسی مالکی	۵۴۳ھ
۱۲	"	عبدالمنعم بن محمد بن فرس الغرناطی	۵۹۷ھ
۱۳	تلخیص احکام القرآن	جمال الدین احمد بن السراج القونوی حنفی	۷۷۰ھ

ہندوستان میں بھی اس فہرست میں ایک نیا اضافہ کیا گیا ہے، اور وہ مولانا احمد امیٹھوی کی، جو مُلاّ جیون کے نام سے مشہور ہیں، اور جو اصول فقہ میں نورالانوار کے مصنف ہیں، تصنیف تفسیرات احمدیہ ہے، جس میں ملاّ صاحب نے احکامی آیتوں کی تفسیر کی ہے،

احکام القرآن کی کتابوں کی اس طویل فہرست میں سے افسوس ہے کہ اب بہت سے نوادر ناپید ہو چکے ہیں، یا گمنامی کے گوشوں میں پڑے ہیں، تاہم اس وقت اس سلسلہ کی تین کتابیں چھپ چکی ہیں، تفسیرات احمدیہ ہندوستان کے مطبعوں میں چھپی ہے، اور ملتی ہے، اس کے علاوہ قاضی ابوبکر ابن العربی اشبیلی مالکی کی احکام القرآن مولای عبدالحفیظ سابق سلطان مراکش کے خرچ سے ۱۳۳۱ھ میں مصر سے دو جلدوں میں چھپ کر شائع ہوئی ہے، اور

اس کے بعد سلطان رشاد سابق سلطان ترکی کے عہد حکومت میں ۱۳۲۵ھ ابوبکر جصاص رازی حنفی کی احکام القرآن تین جلدوں میں قسطنطنیہ سے شائع ہوئی ہے۔

ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے یہ امر بخوبی روشن ہوجاتا ہے کہ کتب فقہ میں جو احکام مذکور ہیں، اُن کا ماخذ قرآن مجید کی کون کون آیتیں ہیں، اور ائمہ مجتہدین نے اُن سے کس کس طرح استخراج کیا ہے، خصوصاً ابوبکر جصاص رازی حنفی المتوفی ۳۷۰ھ کی تصنیف نہ صرف قدامت کے لحاظ سے بلکہ دوسری حیثیتوں سے بھی نہایت عجیب چیز ہے، اور فقہ حنفی کے لیے طحاوی کے بعد یہ دوسری نعمت ہے، جو عالم وجود میں آئی ہے، یہ وہی ابوبکر رازی ہیں، اور یہی اُن کی تصنیف ہے، جس کا ذکر امام رازی اپنی تفسیر میں بار بار کرتے ہیں، اور شافعی المذہب ہونے کے باعث ان کے حنفی استدلالات پر وہ ہر جگہ حملے کرتے ہیں، ابوبکر رازی، امام ابوداؤد یعنی سنن ابی داؤد کے مصنف کے بیک واسطہ شاگرد ہیں، اور ایک ہی واسطہ سے ابوداؤد سے احادیث کی روایت کرتے ہیں،

امام موصوف قرآن مجید کی اس آیت

ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شیءٍ — اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جس میں ہر شے کا بیان ہے،

کی تفسیر میں لکھتے ہیں، -

یعنی بہ واللہ اعلم تبیان کل ... اس سے مراد اور خدا بہتر جانتا ہے،

شیٔ من امور الدین بالنص ... امور دین سے ہر شئے کا بیان ہے، یا ذہ صریح

والدلالۃ فما من حادثۃ	الفاظ میں مذکور ہیں، یا اشاروں سے سمجھا
جلیلۃ ولا دقیقۃ الا وللہ	جائے تو کوئی چھوٹا یا بڑا ایسا مسئلہ نہیں
فیھا حکم قد بینہ فی الکتاب —	— ہے جس میں خدا کا فیصلہ نہ ہو، جس کو
نصاً او دلیلاً فما بینہ النبی صلی اللہ	اس نے اپنی کتاب میں صریح الفاظ میں
علیہ وسلم فانما صدر عن الکتاب	یا اشارات میں ظاہر کر دیا ہے، اور جو
بقولہ تعالیٰ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا ہے
	وہ بھی کتاب ہی سے ماخوذ ہے، جیسا کہ خدا
(جلد ۳ ص ۱۸۹)	فرماتا ہے،

اس کے بعد وہ آیتیں ہیں، جن سے سنت کی شرعیت اور رسول کی اطاعت ثابت ہوتی ہے، اور اسی طرح اجماع و قیاس کے جواز پر قرآن کی آیتوں سے استدلال کیا ہے،

حال میں ایک عالم محمد عبدالعزیز الحکیم نے ۱۳۲۵ھ میں اس موضوع پر الفتوحات الربانیہ فی الاوامر والنواہی نام ایک کتاب دو جلدوں میں عربی میں لکھی ہے، پہلی جلد میں قرآن کے اوامر ہیں، اور دوسری جلد میں اس کے نواہی ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ قدماء کی تصنیفات کی بربادی و تباہی اور نئی ضرورتوں

کے وجود سے اس سلسلہ میں ابھی کام کی سخت ضرورت ہے، یہی صورت ہے جس سے ہم نئے فتنوں کا دروازہ بند کر سکتے ہیں؛

(معارف، اپریل ۱۹۲۶ء)

اسماء القرآن

عام مسلمانوں کو قرآن مجید کے ناموں کی تحقیق نہیں معلوم، اس لیے ایک نو آریہ کو یہ کہنے کی جسارت ہوئی، کہ قرآن لفظ قر اور آن سے مرکب ہے، قر، قرات کا امر ہے، جس کے معنی پڑھ کے ہیں، اور آن کے معنی اب کے ہیں، دونوں لفظوں کے مرکب معنی یہ ہوئے، "پڑھ تو اب" آریہ محققین کی اس تحقیق کی داد ہمارے عربی مدارس کے میزان خواں طلبہ دیں گے،

نام کی ضرورت | مسئلۂ وجہ تسمیہ کے رو سے دنیا میں ہر چیز کے نام ہوتے ہیں، اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ایک شئے دوسری شئے سے ممتاز ہو جائے، تمام انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے باہم مشترک اور غیر ممتاز ہیں، لیکن زید کے نام نے زید کو، خالد کے نام نے خالد کو، اور بکر کے نام نے بکر کو بالکل ایک دوسرے سے ممتاز اور الگ کر دیا، تمام کتابیں، کتاب ہونے کی حیثیت سے ایک ہیں، لیکن تورات کے نام نے تورات میں، انجیل کے نام نے انجیل میں اور زبور کے نام نے زبور میں باہمی امتیاز پیدا کر دیا ہے، اگر اعلام کے ذریعہ سے

اشیاء میں یہ باہمی امتیاز نہ ہوتا، تو انسان کو بات سمجھنا مشکل ہو جاتا، مخاطب کو یہ معلوم نہ ہو سکتا، کہ متکلم کس امر کے متعلق گفتگو کر رہا ہے، اس نتیجہ کی بنا پر ضروری تھا کہ قرآن مجید کا کوئی نام رکھا جاتا،

نام کا تناسب مسئلۂ وجوہ تسمیہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس شے کا نام رکھا جائے، اُس نام کو اس شے سے کوئی خاص مناسبت ہو، گو اسم اور مسمی کا یہ باہمی تناسب عقلاً ضروری نہیں؛ کیونکہ نام سے اصلی غرض محض امتیاز ہے، اور وہ ہر طرح حاصل ہے، لیکن عقل اس تناسب کو مستحسن ضرور سمجھتی ہے، کیونکہ اس سے ایک فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے، کہ مناسبت قرینہ پر مخاطب کا ذہن متکلم کی زبان سے نام سنتے ہی مسمّی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اس تناسب باہمی کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے، کہ اس قسم کے نام نہایت اختصار کے ساتھ اپنے مسمیات کے تمام مطالب اور غرض وغایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، گویا وہ عنوان کتاب ہیں، جو اپنے اندرونی مطالب کو ایک لفظ میں ادا کر رہے ہیں، فن بلاغت میں دو کتابیں ہیں: ایک کا نام اسرار البلاغۃ (رازہائے بلاغت) اور دوسرے کا نام مطول (دراز تر) ہے، تم خود فیصلہ کر سکتے ہو، کہ فن بلاغت کی تصنیف کے لیے ان میں سے کون سا نام بہتر ہے اور کیوں بہتر ہے؟

علمائے اسلام کے چند افراد کی رائے ہے، جن میں امام شافعی بھی داخل ہیں کہ "قرآن مجید" کا نام قرآن کسی مناسبت سے نہیں؛ اور نہ یہ کسی مناسب

لفظ سے مشتق ہے، بلکہ قرآن کا نام، قرآن اسی طرح ہے، جس طرح انجیل اور تورات کا خدا نے انجیل اور تورات نام رکھ دیا ہے، اس رائے کی اصلی غلطی تو اس وقت ظاہر ہوگی، جب ہم یہ دکھلائیں گے، کہ قرآن مجید کا نام کس مناسبت سے قرآن رکھا گیا ہے، پہلے ہم اس کی تردید کرنا چاہتے ہیں، کہ تورات وانجیل وغیرہ کا نام بغیر کسی مناسبت کے تورات اور انجیل رکھا گیا ہے،

دیگر صحف انبیاء کے نام | انجیل یونانی لفظ ہے، اصل یونانی لفظ .... ہے جس کے لفظی معنی بشارت اور مژدہ کے ہیں، عیسائیوں کے خیال کے مطابق انجیل کا نام مژدہ اس لیے ہے، کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کی بادشاہت کا مژدہ سناتے تھے، مسلمان کہتے ہیں، انجیل مژدہ اس لیے ہے کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کی آمد آمد کی بشارت ہے، قرآن باواز بلند کہہ رہا ہے:

اذ قال عیسی بن مریم یا	یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے بنی اسرائیل
بنی اسرائیل انی رسول اللہ	سے کہا، کہ میں تمہاری طرف خدا کا قاصد
الیکم مصدقاً لما بین یدی	ہوں، میرے سامنے جو تورات ہے، اس کی
من التوراۃ ومبشرا برسول	میں تصدیق کر رہا ہوں، اور ایک ایسے
یاتی من بعدی اسمہ احمد	رسول کی بشارت دے رہا ہوں جو میرے
(الصف)	بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا،

تورات عبرانی لفظ (............) ہے، تورات کے اصلی معنی

احکام، اوامر اور قوانین کے ہیں، چونکہ توراۃ سرتاپا قانون ہے، اس لیے اُس کا نام توراۃ ہوا، لفظ زبور عبرانی ہے، یا حبشی الاصل ہے، اصلی لفظ مزمور یا زمور ہے، عربی زبان میں زمور کی میم ب سے بدل گئی ہے، زمور گیت کو کہتے ہیں، زبور جن کو مزامیر داؤد کہتے ہیں، چونکہ وہ حضرت داؤدؑ کی مناجاتوں کا مجموعہ ہے، اس بنا پر اس کا نام زبور رکھا گیا ہے؛

الہامی کتابوں کے نام بھی الہامی ہونے چاہئیں ہاں قرآن مجید اور دیگر صحف انبیاء کے ناموں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دیگر صحف کے ناموں کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ہے، کہ ان کتابوں کے الہامی ہونے کے ساتھ ان کے نام بھی الہامی ہیں، حالانکہ ایک الہامی کتاب کے لیے ضروری ہے، کہ اس کے متعلق تمام چیزیں الہامی ہوں، دیگر صحف انبیاءؑ کے ناموں کے الہامی ہونے کا دعویٰ اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ان کتابوں میں ان کا نام کہیں مذکور نہیں ہوا ہے، اور کتابوں کے باہر وہ کسی الہام کا دعویٰ نہیں کر سکتے، انجیل کا نام بے شک ایک دو موقعوں پر انجیل میں آیا ہے، مگر کس طرح؟ عربی انجیل میں اس کا نام تبشیر، بشریٰ اور بشارت ہے، انگریزی میں گاسپل ہے، یونانی میں انگلیان ہے، فارسی میں مژدہ ہے، اُردو میں خوشخبری ہے، اسی طرح دنیا کی اور زبانوں میں انجیل مختلف ناموں سے مشہور ہے، انجیل کی اصلی زبان کا نسخہ ناپید ہے، اس لیے یہ نہیں بتایا جا سکتا، کہ انجیل کا اصلی نام کیا تھا،

جس کے یہ ترجمے ہیں، یہ نقص صرف صحفِ بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ وید وغیرہ میں بھی پیدا ہے۔

لیکن قرآن مجید نہایت بلند آواز سے پکارتا ہے، کہ میرا نام قرآن ہے، اور ایک بار نہیں ساٹھ بار قرآن مجید نے پکار پکار کر کہا ہے، کہ میرا نام قرآن ہے، قرآن کے جو اور نام ہیں، ان کو بھی خود قرآن ہی نے ہم کو بتایا ہے، اس واقعہ کا نتیجہ کوئی معمولی نتیجہ نہیں ہے، اگر کسی دور میں عیسائیت روئے زمین سے فنا ہوجائے یا یہودیت مٹ جائے، یا آریہ نہ باقی رہیں، تو دنیا کو کون بتائے گا، یہ حضرت موسیٰؑ کی کتاب تورات ہے، وہ حضرت داؤدؑ کی کتاب زبور ہے، یہ حضرت عیسیٰؑ کا صحیفۂ انجیل ہے، یہ آریوں کی الہامی کتاب وید ہے، لیکن مسلمان روئے زمین سے فنا ہوجائیں، معدوم ہوجائیں تو بھی قرآن کا صفحہ صفحہ پکارے گا، کہ میں قرآن ہوں، مسلمان تمام دنیا میں پھیلے ہیں، مسلمان مختلف ممالک میں بیسیوں مختلف زبانیں بولتے ہیں، مسلمانوں نے اور زیادہ تر غیر مسلمانوں نے اکثر مہذب زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے کیے، مگر ہر جگہ اور ہر مقام پر اس کا نام قرآن رہا، ان واقعات سے متعدد نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) جس طرح قرآن کے الفاظ و معانی الہامی ہیں، اس کے نام بھی الہامی ہیں،

(۲) جس طرح قرآن کو بلا تحریف و تبدیل بلا زیادت و نقص دائمی وجود عطا ہوا ہے، اسی طرح اس کے نام بھی دائم الوجود ہیں،

(۴) قرآن اپنے ثبوت میں اپنے پیرووں کا محتاج نہیں ہے۔

کثرت اسمائے قرآن مجید قرآن مجید کے کثیر التعداد نام ہیں، خاص نام کے علاوہ قرآن مجید کے عام نام حسب تحقیق علامہ ابو المعالی شاید ۵۵ ہیں، اور یہ تمام نام خود قرآن مجید نے اپنے بتائے ہیں، اور نیز قرآن کا لفظ بھی قرآن مجید میں نہایت تکرار کے ساتھ آیا ہے، یہ کثرت اسماء اور یہ تکرار لفظ قرآن ایک لطیف خطابی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے، دنیا میں قاعدہ ہے، کہ لوگ جس چیز کو محبوب رکھتے ہیں، اس کے ایک نام پر ان کو قناعت نہیں ہوتی، بلکہ محبت اور پیار سے وہ اس کو سیکڑوں ناموں سے یاد کرتے ہیں، اس کے ایک ایک نام کو بیسیوں بار دہراتے ہیں، ہر قوم اور ہر شخص کی زبان اور استعمال اس دعوے کے لیے شاہد عدل ہے، جس قوم میں جو چیز زیادہ محبوب ہوتی ہے، جس چیز کی زیادہ احتیاج ہوتی ہے، اس کے لیے اس کی زبان میں کثرت سے الفاظ ہوتے ہیں، جس شخص کو جو چیز زیادہ پیاری ہوتی ہے، زیادہ محبوب ہوتی ہے، اس کا نام بار بار لیتا ہے، خدا نے قرآن مجید میں جس کثرت اور جس تکرار سے قرآن مجید کے نام لیے ہیں، کیا اس سے بھی یہی نتیجہ نہیں مستنبط ہوتا،

قرآن مجید کے عام نام قرآن مجید نے اپنے جو عام نام بتائے ہیں، درحقیقت وہ اس کے عام صفات ہیں، مثلاً خدا نے قرآن میں جا بجا اس کو ان ناموں سے یاد کیا ہے، کلام اللہ (خدا کا کلام) نور (روشنی) ہدیٰ (ہدایت) رحمۃ (رحمت)

شفاء (شفا) موعظۃ (نصیحت) ذکر (یاد) ذکر مبارک (مبارک ذکر) حکمۃ: (دانائی) حکمۃ بالغۃ (دل تک پہنچنے والی دانائی) مہیمن (گواہ) مصدق (گزشتہ صحف انبیاء کو سچا کرنے والا یا گذشتہ صحف انبیاء کو سچ کہنے والا) صراط مستقیم (راہِ راست) قیم (کفیل یا نگراں) قول فصل (قول فیصل یا حق و باطل کا فیصلہ کرنے والی کتاب) النباء العظیم (خبر عظیم الشان) احسن الحدیث (سخن بہترین) روح (روح یا زندگی یا حیات) الوحی (الہامی کتاب) بصائر (دلائل بینائی) بیان (تفصیل کرنے والا، تفسیر و توضیح کرنے والا) علم (دانش) حق (سچا، راست) ہادی (رہ نما، رہبر) تذکرہ (نصیحت) العروۃ الوثقیٰ (مضبوط وسیلہ) صدق (سچائی، راستی) منادی (پکارنے والا، آواز دینے والا) بشری (خوش خبری) بشیر (خوش خبری دینے والا) نذیر (ڈرانے والا) بلاغ (پیغام) صحف (صحیفہ) احسن القصص (بہترین قصہ) کتاب (مجموعہ) کتاب مبارک (بابرکت کتاب) کتاب اللہ (خدا کی کتاب) کتاب منیر (نور بخشنے والی کتاب) الکتاب المبین، (ظاہر کرنے والی کتاب) الکتاب الحکیم (دانائی والی کتاب) کتاب عزیز، (پیاری کتاب، بڑی کتاب[۱])

یہ صفات جو قرآن مجید کے نام کا کام دیتے ہیں، قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں وارد ہوئے ہیں، لغوی حیثیت سے یہ تمام الفاظ عربی ہیں، جن کے

[۱] الاتقان سیوطی، فصل اسمائے قرآن۔

معنی ظاہر ہیں، ان اسمار کو قرآن مجید کے ساتھ کیا مناسبت ہے، اس کا بھی بیان کرنا ضروری نہیں، معنی پر ایک نظر ڈال کر، ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے، کہ ان میں سے ہر ایک نام کس وضاحت اور کس خوبصورتی اور کس اختصار کے ساتھ قرآن مجید کے صفات، قرآن مجید کے محاسن قرآن مجید کی غرض و غایت، قرآن مجید کے مقصود کی طرف اشارہ کر رہا ہے،

قرآن مجید کے مخصوص نام | قرآن مجید کے مخصوص نام سے وہ نام مراد ہیں، جن کا اطلاق استعمال میں قرآن مجید کے سوا کسی اور پر نہیں ہوتا، اس قسم کے تین نام ہیں، فرقان مصحف اور قرآن، فرقان قرآن کا مشہور نام ہے، اس سے زیادہ مصحف اور ان دونوں سے مشہور تر قرآن ہے۔

فرقان | قرآن مجید نے دو جگہ اپنے کو فرقان کے لفظ سے یاد کیا ہے،

تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہٖ	پاک ہے وہ ذات جس نے فرقان کو اپنے بندہ پر نازل کیا،

یہ آیت سورہ توبہ میں واقع ہے، دوسری آیت آل عمران میں ہے،

وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس وانزل الفرقان	اور تورات اور انجیل کو اس نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا اور فرقان کو نازل کیا،

قرآن مجید نے تورات کو بھی فرقان کے نام سے یاد کیا ہے،

ولقد اٰتینا موسیٰ وھارون الفرقان۔ (انبیاء)
اور بے شک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان دیا۔

فرقان کس زبان کا لفظ ہے؟ اور اس کے کیا معنی ہیں، جارج سیل صاحب مترجم قرآن[1] کی بہت سے عبرانی علماء کی شہادتوں کی بنا پر رائے ہے کہ فرقان عبرانی سے ماخوذ ہے، یہود اپنی مذہبی کتاب کے اجزاء اور حصوں کو فرقہ اور فرق کہتے تھے، اسی لفظ سے اسلام نے اپنی مذہبی کتاب کے لیے فرقان کا لفظ اخذ کیا ہے،

ہم کو سیل صاحب کی اس رائے کے تسلیم کرنے میں کچھ عذر نہیں، لیکن پہلے وہ ہماری دو باتوں کا جواب دیں، فرقہ اور فرق یہود، توراۃ کے ایک جزء یا ایک باب کو کہتے ہیں، اگر فرقان فرقہ یا فرق سے ماخوذ ہوتا، تو زیادہ سے زیادہ وہ سورہ کے مقام پر بولا جاتا، لیکن اسلام کل قرآن مجید کو فرقان کہتا ہے، امر ثانی یہ ہے کہ جس طرح عبرانی میں فرقہ اور فرق حصہ اور ٹکڑے کے معنی میں ہے، جس کی مناسبت سے یہود اجزائے توراۃ کو فرقہ اور فرق کہتے ہیں، بعینہٖ اسی طرح یہ دونوں لفظ عربی زبان میں بھی اسی معنی میں آتے ہیں، خود قرآن مجید نے ان دونوں لفظوں کا انہی معنوں میں استعمال کیا ہے،

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین (توبہ)
پس کیوں نہیں ایک گروہ (قوم کے) ہر حصہ سے ہو، جس میں ایک جماعت ہو، کہ وہ

---

[1] دیباچہ انگریزی ترجمہ قرآن سیل باب ۳،

مذہب میں سمجھ حاصل کرے۔

فکان کل فرق کالطود العظیم، ہر حصہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح تھا،

(شعراء)

ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوتا ہے، کہ یہ دونوں لفظ اسی معنی میں عربی زبان میں مستعمل ہیں، ایسی حالت میں اسلام کو کیا ضرورت تھی، کہ وہ ان دو مستعمل لفظ یعنی "فرقہ" اور فرق کو چھوڑ کر ان سے ایک دوسرا غیر مستعمل لفظ یعنی "فرقان" پیدا کرے،

بعض علمائے اسلام کہتے ہیں، کہ قرآن کے معنی حصہ کرنے اور تقسیم کرنے ہیں، چونکہ قرآن مجید منزل، پارہ، سورہ، رکوع اور آیت پر منقسم ہے اس لیے اس کو فرقان کہتے ہیں، ہم اس کا انکار نہیں کرتے، کہ فرقان کے یہ معنی نہیں ہیں، لیکن ہم اس کو کچھ زیادہ مناسب وجہ نہیں سمجھتے،

ہمارا اعتقاد ہے، کہ قرآن اپنے ہر معنی کی تفصیل آپ کرتا ہے، اس لیے فرقان کے معنی بھی ہم کو خود فرقان میں ڈھونڈنا چاہیے، یہ ظاہر ہے کہ فرقان مصدر ہے، اب اس کے مشتق معنی قرآن مجید میں دیکھو،

فالفارقات فرقا۔ (مرسلات) قسم ہے اُن چیزوں کی جو حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی ہیں،

اس آیت سے فارق کے معنی فیصلہ کن یا ممیز کے ثابت ہوتے ہیں، فرقان

کے معنی کی توضیح کے لیے سورۂ انفال کی یہ آیت پڑھو،

ان کنتم آمنتم باللہ وما	اگر تم ایمان لائے ہو خدا پر اور اس چیز پر جو
انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان	ہم نے اپنے بندے پر اس دن اتارا جو دن
(انفال - ۵)	حق و باطل میں فیصلہ کرنے کا تھا،

اس آیت میں جنگ کو "یوم الفرقان" سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ درحقیقت اس جنگ نے حق و باطل اور کفر و اسلام کا فیصلہ کر دیا، ان آیات سے ثابت ہو گیا، کہ فرقان کے معنی فیصلہ کرنے یا حق و باطل میں تمیز دینے کے ہیں، فرقان مصدر ہے، عربی زبان میں مصدر اکثر اسم فاعل کے معنی بھی دیتا ہے، یہ آیت دیکھو،

یا ایھا الذین آمنوا ان تتقوا	ایمان والو! اگر خدا سے ڈرو گے تو وہ
اللہ یجعل لکم فرقانا۔ (انفال-۴)	تمہارے لیے فرقان بنا رہے گا،

اس آیت پاک میں فرقان جو مصدر ہے " فارق " کے معنی میں ہے، جو اسم فاعل ہے، اس بنا پر یہاں فرقان کے معنی فیصلہ کن یا حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی قوت اور ممیز یا قوت ممیزہ کے ہیں، اب دیکھو آیت کے معنی کس قدر صحیح اور درست ہیں،

یا ایھا الذین آمنوا ان تتقوا	مسلمانو! اگر خدا سے ڈرو گے تو وہ تم کو
اللہ یجعل لکم فرقانا۔ (انفال-۴)	ضمیر فیصلہ یا قوتِ ممیزہ عطا کرے گا،

فرقان، اس موخرالذکر معنی میں قرآن میں کئی جگہ آیا ہے،

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ (بقرہ - ۶)

اور یاد کر جب ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) اور قوت فیصلہ دی،

ظاہر ہے، کہ یہاں فرقان سے مراد تورات نہیں ہے، کیونکہ تورات کی تعبیر تو لفظ کتاب سے ہو چکی، اس لئے لامحالہ یہاں فرقان کے دوسرے معنی لینے ہوں گے۔ اور یہ وہی معنی ہیں، جن کو ہم ضمیر، فیصلہ، روح تمیز، قوت تمیز بین الحق والباطل سے ادا کرتے ہیں،

ان تمام آیات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ فرقان کے معنی فیصلہ کرنے یا فیصلہ کرنے والے کے ہیں، جب کسی کتاب کو فرقان کہا جائے گا، تو اس کے معنی حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی کتاب کے ہوں گے، اس تحقیق کے بعد اس سوال کا جواب دینا ہے کہ تمام قرآن مجید میں فرقان کا تورات اور قرآن کے سوا کسی دوسرے نبی کے صحیفہ پر کیوں نہیں اطلاق ہوا؟ واقعہ یہ ہے کہ قرآن اور تورات کے سوا عموماً تمام صحف انبیاءؑ صرف اخلاقی اور روحانی احکام پر مشتمل ہیں، تورات اور قرآن مجید میں اخلاق اور روحانیت کے علاوہ قانون اور لا کا بھی ذکر ہے، حق و باطل میں فیصلہ کرنا قانون اور لا کا فرض ہے، یہی وجہ ہے کہ فرقان کا نام خدا نے صرف اُن صحیفوں کو عطا کیا ہے، جو قانون پر مشتمل ہوں، لیکن چونکہ قرآن میں قانون کے ساتھ اخلاقی احکام بھی بکثرت ہیں، اور تورات

میں بھی قانون کے ساتھ ساتھ کسی قدر اخلاق کی تعلیم ہے، اس لیے تورات اور قرآن کو فرقان کے ساتھ ہدی اور ضیاء بھی خدا نے فرمایا ہے، تورات کے متعلق ہے،

ولقد اٰتینا موسیٰ وھارون الفرقان وضیاء (انبیاء-۳) اور بے شک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ اور روشنی دی،

فیصلہ سے مراد قانون اور روشنی سے مراد اخلاقی اور روحانی احکام ہیں، دوسری آیت قرآن کی شان میں ہے،

شھر رمضان الذی انزل فیه القراٰن ھدی للناس وبینٰت من الھدیٰ والفرقان (بقرہ-۲۳) ماہ رمضان جس میں لوگوں کی ہدایت کے لیے قرآن اتارا گیا، اس حال میں کہ وہ نشانیاں ہیں، ہدایت اور فیصلہ کی،

ہدی سے مراد اخلاقی و روحانی تعلیمات اور فرقان سے قانون ہے، یہاں پر ایک نکتہ اور سمجھنے کے لائق ہے، تورات کی تعریف میں فرقان یعنی قانون کا لفظ پہلے آیا، اور ضیا یعنی روشنی کا لفظ بعد کو آیا، اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے، کہ تورات کا مقصود اول قانون اور مقصود ثانی اخلاق ہے، لیکن قرآن کی تعریف میں پہلے دو بار ہدی یعنی ہدایت کا لفظ آیا، اور آخر میں اس کو فرقان یعنی قانون کہا گیا، اس سے کنایۃً یہ بات مفہوم ہوتی ہے، کہ روحانیت اور اخلاق قرآن کا مقصد اولین اور قانون و ملک داری اس کا مقصد دوم ہے،

مصحف قرآن مجید کو مصحف بھی کہتے ہیں، لیکن یہ نام قرآن مجید میں نہیں آیا ہے، اس لیے یہ قرآن کا الہامی نام نہیں ہے، روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب قرآن کاغذ پر مجموعی طور سے لکھا گیا، تو حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ اس کے لیے کوئی مناسب نام تلاش کرو، بعض لوگوں کی رائے ہوئی، کہ اس کا نام سفر رکھا جائے، لیکن اکثر لوگوں نے اس کو ناپسند کیا، ناپسندیدگی کی وجہ یہ تھی، کہ یہود بھی اپنی مذہبی کتاب کو سفر کہتے ہیں، سفر کتاب کو کہتے ہیں، اس کی جمع اسفار ہے، یہودی اور عیسائی اب تک اجزائے تورات کو اسفار بحالت جمع اور سفر بحالتِ مفرد کہتے ہیں، صحابہؓ میں سے وہ لوگ جنھوں نے حبشہ کا سفر کیا تھا، انھوں نے اہلِ حبشہ کو، اپنی مذہبی کتاب کو مصحف کہتے سُنا تھا، اس لیے (باختلافِ روایات) ان حضرات نے عموماً یا ان میں حضرت عبداللہؓ ابن مسعود نے یا سالم غلام ابوحذیفہ نے کہا کہ اس کا نام مصحف رکھا جائے، لوگوں نے پسند کیا، اور اس وقت سے قرآن مجید کو مصحف کہا جانے لگا، لفظ مصحف کے حبشی الاصل ہونے پر اس وقت بھی شہادت موجود ہے، مسٹر آرنلڈ اپنی کتاب سوار السبیل فی معرفۃ المعرب والدخیل میں لکھتے ہیں. کہ مصحف حبشی لفظ ہے، اس کی اصل حبشی زبان میں مصحف ہے، مصحف حبشی زبان میں کتاب کو کہتے ہیں،

لیکن ہمارے نزدیک صحابہؓ کا قرآن مجید کو مصحف کہنا صرف اہل حبشہ

کی تقلید و متابعت پر مبنی تھا، ورنہ ظاہر ہے، کہ جب انھوں نے یہود کے تشابہ سے بچنے کے لیے قرآن کا نام سفر نہیں رکھا، تو اہلِ حبشہ کی تقلید میں جو عیسائی تھے، قرآن کو مصحف کیوں کہتے، بلکہ اصلی وجہ یہ ہے، کہ مصحف، صحاف کا صیغۂ مفعول ہے، اصحاف صحیفہ سے ماخوذ ہے، صحیفہ چند اوراق کو کہتے ہیں، اصحاف کے معنی اوراق بندی یعنی منتشر اوراق کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کرنے کے ہیں، اس بنا پر مصحف اُن منتشر اوراق کو کہتے ہیں، جو مرتب کرکے کسی کتاب کی صورت میں جمع کر دیے جائیں، عربی زبان کا مستند لغوی ابن مکرم مصنف لسان العرب لکھتا ہے،[1]

المصحف الجامع للصحف المكتوبة	مصحف اس کو کہتے ہیں، جو لکھے ہوئے
بين الدفتين ـ	اوراق کو دو دفتیوں میں جمع کرنے،

یہی مصنف آگے چل کر مصحف کے متعلق مشہور نحوی فرار کی رائے نقل کرتا ہے،

قال مصحف من الصحف ای	مصحف، صحف سے ماخوذ ہے یعنی اس کے
جمعت فيه الصحف ـ	اوراق جمع کیے گئے،

مشہور لغوی ازہری کی تحقیق ہے،

---

[1] لسان العرب جلد ۱۲ ص ۸۸

وانما سمی المصحف مصحفا لانه — مصحف کا مصحف اس لیے نام ہے کہ اس کی
اصحف ای جعل جامعًا للصحف — اوراق بندی کی گئی، یعنی دو دفتیوں میں
المکتوبة بین الدفتین[1] — لکھے ہوئے اوراق کا جامع ہے،

ان ائمہ لغت کی شہادت سے مصحف کے معنی بالکل واضح ہو گئے، قرآن مجید عہدِ رسالت میں تحریری حیثیت سے اجزاء اور اوراق میں یک جا مرتب نہ تھا، اس لیے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جب قرآن اجزاء اور اوراق میں تحریری حیثیت سے مرتب ہو کر کتاب کی صورت میں آیا، تو مقتضائے واقعہ کے لحاظ سے اس کے لیے مصحف سے زیادہ موزوں نام نہیں ہو سکتا تھا، اب یہ عقیدہ بھی نہایت آسانی سے حل ہو سکتا ہے، کہ قرآن میں، قرآن کا نام مصحف کیوں نہیں آیا، حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا عہدِ رسالت میں نزول ہو رہا تھا، وہ اس وقت مصحف نہ تھا، یعنی مرتب کتاب نہ تھا، اور نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ عہدِ رسالت میں قرآن کی وحی ختم نہیں ہو سکی تھی، اس بنا پر ... قرآن کا نام، قرآن میں مصحف مذکور ہونا خلافِ واقعہ تھا، ہاں قرآن اس وقت صحف (اوراق) تھا، اس لیے قرآن نے اپنے کو صحف کے نام سے یاد کیا ہے،

کلّا انہا تذکرة فمن شاء ذکرہ — ہرگز نہیں، یہ نصیحت ہے، جو چاہے اس کو
فی صحف مکرمة مرفوعة مطہرة — (عبس) — یاد رکھے (یہ نصیحت) ایسے صحف میں ہے

[1] لسان العرب جلد ۱۲ ص ۸۸

جو بزرگ، بلند اور پاک ہیں،

قرآن | قرآن کا مشہور تر اور حقیقی نام قرآن ہے، اور خود قرآن کہتا ہے کہ میں قرآن ہوں،

انه لقرآن کریم (واقعہ) بے شک یہ کتاب بزرگ قرآن ہے،

بل هو قرآن مجید (بروج) بلکہ یہ کتاب قرآن مجید ہے

ان هذا القرآن یهدی للتی بے شک یہ قرآن اس بات کی ہدایت کرتا

هی اقوم (اسرائیل-۱) ہے، جو بات بہت سیدھی ہے،

واوحی الی هذا القرآن (انعام) اور وحی کیا گیا میری طرف یہ قرآن،

وان هذا القرآن یقص (نمل) بے شبہ یہ قرآن بیان کرتا ہے،

اسی طرح قرآن مجید میں ساٹھ مرتبہ قرآن کا بلفظہ قرآن ذکر ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا اصلی نام قرآن ہے، اس کے بعد یہ تحقیق طلب امر ہے، کہ قرآن کس زبان کا لفظ ہے، اس کا کیا تلفظ ہے، اس کے کیا معنی ہیں، جارج سیل صاحب ہم کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ قرآن عبرانی لفظ ہے، یہود پہلے یحیایانی کی کتاب کو قرایا مقرا کہتے تھے، اور پھر مجموعۂ تورات کو قراہ یا مقرا کہنے لگے، قرآن اسی قراہ یا مقراہ سے بنا یا گیا ہے[۱]، ہم کہتے

---

[۱] دیباچہ ترجمہ انگریزی قرآن مع نوٹ نمبر ا باب ۳

۹۸۳۹

ہیں، کہ قراہ یا مقراہ کے عبرانی میں "پڑھنے" کے معنی ہیں جس کے مقابل اور ہم جنس عربی میں لفظ "قرآت" ہے، اس بنا پر کلام مجید کا نام اگر عبرانی قراہ سے ماخوذ ہوتا، تو اس کا نام قرآن نہ ہوتا، قرارۃ ہوتا، گو اس میں شک نہیں کہ بعض علمائے اسلام بھی قرآن کو قرء کا مصدر کہتے ہیں، جس کے معنی پڑھنے کے ہیں، لیکن یہاں بحث معنی سے نہیں ہے لفظ سے ہے،

عربی زبان کے ائمۂ لغت لفظ قرآن کی تحقیق میں مختلف الآرا ہیں، سب سے پہلا اختلاف یہ ہے کہ قرآن کا صحیح تلفظ قُرآن بروزن فعلان ہے، یا قران بروزن فعال ہے، جو گروہ شق ثانی کا طرف دار ہے اس کی بھی دو جماعتیں ہیں، امام شافعی کہتے ہیں کہ صحیح قرارت قُران بروزن فعال ہے، اور نیز قران کسی مصدر یا اصل سے مشتق نہیں ہے، بلکہ خدا نے یوں ہی ایک لفظ کلام مجید کے نام کے لیے وضع کر دیا ہے، اس لیے سوائے نام ہونے کی حیثیت کے اور سوائے علمیت کے قرآن کے کوئی اور لغوی معنی نہیں جس کی مناسبت سے قران کا قرآن نام رکھا گیا ہو، فراء اور امام اشعری امام شافعی کے ساتھ یہاں تک تو شریک ہیں، کہ صحیح لفظ قران بلا ہمزہ ہے، لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے، کہ اس لفظ کی از روئے لغت کوئی اصل نہیں، یا بجز علمیت اس کے کوئی اور مناسب معنی نہیں، اسی کے ساتھ فراء اور امام اشعری کی یہ بھی رائے ہے کہ قرآن میں نون اصلی نہیں ہے، یہاں پہنچ کر فراء اور اشعری میں ایک اور اختلاف شروع

ہوتا ہے،

امام اشعری کہتے ہیں، قران، قرن سے مشتق ہے، قرن کے لغوی معنی "ملانے" کے ہیں، چونکہ قرآن، سور، آیات اور حروف وغیرہ کو باہم ملاتا ہے، اس لیے اس کا نام قرآن رکھا گیا، فرار کی رائے ہے، قرآن قرائن سے ماخوذ ہے۔ قرائن قرینہ کی جمع ہے، قرینہ کے معنی "دلیل اور شبیہ" کے ہیں، چونکہ قرآن کی ہر آیت دوسری آیت کی مفسر اور دلیل ہے، اور نیز قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کے اکثر مشابہ ہے، اس لیے اس کو قرآن کہتے ہیں،

امام شافعی کی رائے جمہور ائمہ لغت کے خلاف ہے، اس لیے قابل تسلیم نہیں، تمام کتب لغت میں قرآن کے معنی اور تحقیق موجود ہے، جس سے اس قول کی پوری تردید ہوتی ہے، امام اشعری کی تحقیق اولاً صرف اسی حالت میں صحیح ہو سکتی ہے، جب قرآن کا صحیح تلفظ قُران ہو، حالانکہ قراءت مشہورہ میں صحیح روایت قرآن ہے، اور زجاج نحوی کی تحقیق کی بنا پر جس قراءت میں لفظ قران ہے، وہ بھی دراصل قرآن ہے، ہمزہ تخفیفاً ساقط کر کے اس کی حرکت ماقبل کو منتقل کر دی گئی ہے، ثانیاً حروف، آیات، اور سورۃ کے اجتماع اور اتصال کی بنا پر قرآن کو قران کہنا کوئی مستحسن اور قبول خاطر وجہ نہیں ہے، فرار کی رائے قطعی غلط ہے، اگر اس کی رائے کا اعتبار کیا جائے، تو اس کی تعلیل کی بنا پر صحیح لفظ قران ہوگا، جو عام متواتر روایت کے خلاف ہے، اسی بنا پر

زجاج نے فراء کی اس تحقیق کی ہنسی اڑائی ہے،

ان چند اشخاص کے علاوہ تمام ائمۂ لغت قراۃ اور مفسرین قرآن بروزن فعلان پڑھتے ہیں، اور اس امر پر بھی ان کا تقریباً اتفاق عام ہے، کہ قران، نقصان، غفران وغیرہ کی طرح مصدر ہے، زجاج اور ان کے بعض ہم زمانوں کی رائے ہے، کہ قران صیغۂ وصف ہے، لیکن بہرحال یہ کوئی جوہری اختلاف نہیں ہے، جو لوگ اس کو مصدر سمجھتے ہیں، وہ بھی معنی اس کو صیغۂ وصف مانتے ہیں، لیکن اشکال یہ ہے، کہ ازروئے لغت قرآن دو لفظوں سے ماخوذ ہو سکتا ہے، پہلا قرء، قراءۃ و قرآناً ہے، اس کے معنی پڑھنے کے ہیں، دوسرا قرء، قرءاً و قرآناً ہے، جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں، ارباب علم نے دونوں راہیں اختیار کی ہیں، اور لفظ قرآن کی تحقیق کے متعلق درحقیقت یہی دونوں راہیں درست ہیں[۱]

(۱) پہلے معنی کے طرفدار قدما میں حضرت[۲] ابن عباسؓ اور متاخرین میں[۳] لحیان (ایک مشہور لغوی) اور چند اشخاص ہیں، ان کے نزدیک یہاں مصدر وصف مفعول کے معنی میں ہے، یعنی قرآن مفرد کے معنی میں ہے، اس بنا پر اس گروہ کی تحقیق میں قرآن کو قرآن اس لیے کہتے ہیں، کہ وہ بار بار پڑھا

---

[۱] ان مختلف اقوال کے لیے دیکھو، اتقان فصل ۱۷، اور تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۸۳ [۲] ابن جریر طبری ج ۲۹ ص ۱۰۲ [۳] اتقان فصل مذکور۔

جاتا ہے، اور اسی کی تلاوت کی جاتی ہے، دیگر صحیفوں کو تلاوت کا شرف حاصل نہیں ہے، اس تحقیق کے رو سے اُردو یا انگریزی میں لفظ قران کا مناسب ترجمہ ریڈر ہوسکتا ہے جس کے بعد علومِ عالیہ کی تحصیل جو مقصود بالذات ہے شروع ہوجاتی ہے،

صحفِ سابقہ کو اپنی پرائمر ہونے کا خود اقرار ہے، حضرت عیسیٰؑ انجیل کے متعلق کہتے ہیں۔

میری اور بہت سی باتیں ہیں، کہ تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے ہو، لیکن وہ یعنی سچائی کی رُوح آوے تمہیں ساری کی راہ بتادے گی،

(یوحنا ۱۶، ۱۲، ۱۳ اُردو انجیل مطبوعہ لندن)

اسلام کہتا ہے وہ سچائی کی رُوح میں ہوں، میں عیسیٰؑ کی اُدھوری باتیں اور ان کی پرائمری کورس کو مکمل کرنے آیا ہوں،

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ (مائدہ)	آج میں نے تمہارا مذہب مکمل کر دیا، اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں، اور تمہارے لیے مذہب کی رو سے اسلام کو پسند کیا،

(۲) قرآن کو دوسرے معنی یعنی جمع کرنے کے معنی میں لینے پر جمہور مفسرین اور ماہرینِ لغت کا اتفاق ہے، اور درحقیقت یہی صحیح بھی ہے،

ذهب اکثرون الی انه (ای القرآن) مشتق من القرء وهو الجمع (تفسیر فتح البیان جلد ۱ ص ۳۳)	اکثر لوگ اس بات کی طرف گئے ہیں، کہ قرآن قرء سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں؛

اس عام جماعت کے علاوہ ہم مزید تحقیق کے لیے قدمائے مفسرین و اہلِ لغت کے اقوال بھی سنداً پیش کرتے ہیں،

ان قتادة وجه معنی القرآن الی الجمع (تفسیر طبری ج ۲۹ ص ۱۰۲)	حضرت قتادہ نے قرآن کے معنی توجیہ جمع کرنے کے ساتھ کی ہے،
قال ابو اسحاق الزجاج فی تفسیر...... معنی القرآن الجمع (تاج العروس ج ۱ ص ۱۰۳)	ابو اسحاق زجاج نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔
قال الزجاج وابو عبیدة انه ماخوذ من القرء وهو الجمع، (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۸۳)	زجاج اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ قرآن قرء سے ماخوذ ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں،
(قال ابن الاثیر) الاصل فی هذه اللفظة۔ (نہایہ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۶۳)	ابن اثیر نے کہا ہے کہ قرآن کے اصل معنی جمع کرنے کے ہیں،
قال الراغب (وهو الاصفهانی) ... وانما سمی قرانا لکونه جمع	راغب اصفہانی نے لکھا ہے: قرآن کو قران اس لیے کہتے ہیں، کہ اس نے جمع

(اتقان ص ۱۱۹ کلکتہ) [illegible] کیا ہے [illegible]

جاہلی شاعر عمرو بن کلثوم کا شعر ہے [illegible]

ذراعی عیطل ادماء بکر [illegible]

[illegible] ہجان اللون لم تقرء جنینا

(وہ تمہیں) [illegible] اونٹنی کی طرح ہاتھ (دکھلائیگی) جو گندم گوں، پہلوٹی، صاف رنگ ہو اور جس نے اپنے پیٹ میں کوئی بچہ نہیں جمع کیا، [illegible]

سنان بن الفحل طائی کہتا ہے، [illegible]

ولکنی نصبت لھم جبینی وآلۃ فارس حتی قریت[1] [illegible]

لیکن میں نے اپنی پیشانی کو اور سوار کے ہتھیار کو ان کے لیے نشانہ بنایا، یہاں تک کہ پانی جمع کر لیا، [illegible]

مفسرین کے اقوال، ائمہ لغت کی تصریحات اور شعرائے جاہلیت کے استعمال سے گو قرآن کے معنی بالکل واضح ہو گئے، لیکن قرآن مجید اپنے معنی کی توضیح میں غیر کا محتاج نہیں، وہ اپنے معنی کی توضیح آپ کرتا ہے۔

خدائے پاک فرماتا ہے، [illegible]

ان علینا جمعہ وقرآنہ (قیامہ) بیشک اس کا اکٹھا اور جمع کرنا ہم پر ہے۔

---

[1] قرأت اور قریت دونوں جائز ہے، [illegible]

اس تفصیل کے بعد کہ قرآن کے معنی جمع کے ہیں، اور نیز جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ قرآن یا مصدر بمعنی وصف ہے، یا خود صیغہ وصف ہے، یہ ثابت ہو گیا۔ کہ قرآن کے معنی جامع (جمع کرنے والا) کے ہیں، اب آخری مرحلہ یہ ہے کہ قرآن کو جامع کیوں کہتے ہیں، علمائے اسلام نے اس سوال کے تین جواب دیئے ہیں،

ابو اسحاق النحوی یسمی کلام اللہ تعالیٰ الذی انزلہ علی نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم کتابا وقرآنا وفرقانا ومعنی القرآن جمع القرآن، وسمی قرآنا لانہ یجمع السور فیضمھا۔ (لسان العرب ج ۱ ص ۱۲۳)

ابو اسحاق نحوی: خدا کا وہ کلام جس کو اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا، اس کا نام قران اور فرقان رکھا گیا ہے قرآن کے معنی جمع کے ہیں، اور قران اس لیے نام رکھا گیا ہے کہ وہ سورتوں کو باہم جمع کرتا ہے، اور ملاتا ہے

(۲) ابن الاثیر وسمی القرآن لانہ جمع القصص والامر والنھی والوعد والوعید۔ (نہایہ ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۶۳)

ابن اثیر: قرآن کا نام قرآن اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ قصص امر و نہی، وعدہ وعید سب کا جامع ہے۔

یہ دونوں جواب تسمیہ قرآن کے مناسب وجوہ نہیں ہیں، کسی بلند رتبہ

کتاب کے لیے فصول وابواب یا وعدہ وعید وامر ونہی کی جامعیت کوئی فضیلت نہیں رکھتی، بلکہ اصلی اور حقیقی وجہ قرآن کو جامع کہنے کی بقول امام راغب یہ ہے:

(۳) قال الراغب انما سمی قرآنا لکونہ جمع ثمرات الکتب السالفۃ المنزلۃ۔ (اتقان کلکتہ ص ۱۱۹)

قرآن کا اس لیے قرآن نام ہے کہ وہ تمام گذشتہ منزل من اللہ کتابوں کے نتائج کا جامع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا قرآن یعنی جامع سے بہتر نام نہیں ہو سکتا، مذہب اسلام دنیا کا کامل مذہب ہے، اس لیے اس کی کتاب کو جامع ہونا چاہیے، تورات قانون ہے، انجیل اخلاق ہے، اور زبور حمد وثنا اور مناجات ہے، لیکن قرآن قانون بھی ہے، قرآن اخلاق بھی ہے، قرآن ادعیہ ومناجات بھی ہے، قرآن تمام دنیا کی صحیح مذہبی کتابوں کا خلاصہ ہے، قرآن تمام صحف آسمانی کی روح ہے، قرآن انسان کی ہر قسم کی حاجتوں کا سامان ہے، قرآن ہر قسم کی ضروریات کا کفیل ہے، قرآن دین ودنیا کی ہر راہ کا مشعل ہے، قرآن عقائد، عبادات، معاملات، روحانیت، اخلاق، قانون، تمدن، معاشرت، سیاست، غرض ہر قسم اور ہر نوع کی تعلیمات اور ان کے اصول وفروع کا جامع ہے، کیا اس جامعیت میں دنیا کی کوئی مذہبی کتاب اس کا مقابلہ کر سکتی ہے، اور اگر نہیں کر سکتی تو ایسی حالت میں قرآن کا قرآن سے بڑھ کر کوئی جامع نام دوسرا نہیں ہو سکتا۔

(الندوہ اگست ۱۹۱۱ء)

مکررات القرآن

یعنی

قرآن مجید میں مکرر آیتیں کیوں ہیں

ایک دن نواب صدیق حسن خاں کی تفسیر دیکھ رہا تھا، کہ اس عبارت پر نظر پڑی،

وقد نبغت فی هذا الزمان اس زمانہ میں ایک فرقہ پیدا ہوا ہے، جو اپنی طائفة تفسیر القرآن برایها رائے سے قرآن کی تفسیر کرتا ہے، اور مکرر وتحذف منه الآیات آیتوں کو قرآن سے خارج سمجھتا ہے، اس المتوابیات تسمی بالنیفریة فرقہ کا نام نیفریہ (نیچری) ہے۔

کیا ہندوستان میں کوئی ایسا فرقہ بھی ہے، جو مکرر آیتوں کو خارج از قرآن سمجھتا ہو،

مخالفین اسلام کا قرآن مجید کے اسلوب بلاغت پر ایک اعتراض یہ ہے، کہ قرآن مجید میں ایک ہی قصہ مکرر سہ کرر بیان ہوتا ہے، ایک ہی آیت بار بار آتی ہے، ایک ہی بات سو سو دفعہ دُہرائی جاتی ہے، اس بار بار کی

تکرار سے کیا حاصل؟ اس سے کلام کا لطف جاتا رہتا ہے، اور کلام بدمزہ ہو جاتا ہے، پوری کتاب میں ایک بات کو ایک دفعہ کہدینا کافی ہے، قرآن مجید میں حضرت آدمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ کے قصے ہر جگہ بیان کیے گئے ہیں، سورۂ الرحمٰن میں فبای آلاء ربکما تکذبان اور سورۂ المرسلات میں ویلٌ یومئذٍ للمکذبین، ایک ایک آیت کے بعد ہے، اور بعض جگہ بالکل بے جوڑ ہے، لیکن یہ اعتراض کوئی نیا اعتراض نہیں، علمائے اسلام نے اس کے متعدد وجوہات دیے ہیں، علامہ کرمانی المتوفی ۵۰۶ھ نے ایک مستقل رسالہ اس باب میں لکھا ہے، جس میں انھوں نے اپنا نظریہ یہ قرار دیا ہے، کہ قرآن میں کوئی مکرر بات نہیں، جہاں جہاں قرآن مجید میں بظاہر ایک ہی معنی مکرر معلوم ہوتے ہیں، وہاں یہ ثابت کیا ہے، کہ ہر جگہ مختلف معنی مراد ہیں، اس لیے یہ اعتراض ہی غلط ہے، کہ قرآن مجید میں ایک ہی بات بار بار آئی ہے،

مثنوی میں مولانا رومؒ نے اس اعتراض کا ایک اور جواب دیا ہے، جو گو شاعرانہ استدلال ہے، مگر نہایت لطیف ہے، وہ کہتے ہیں ہم روزانہ دن رات ایک ہی کھانا کھاتے ہیں، اور ایک ہی قسم کا پانی پیتے ہیں، لیکن ہم کو کبھی اس بات کی شکایت نہیں ہوتی، کہ بار بار ہم ایک ہی کھانا اور ایک ہی قسم کا پانی کیوں پیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے، کہ جب ہم کھانا کھاتے یا پانی پیتے ہیں، تو ہم کو ایک نئی بھوک اور نئی پیاس معلوم ہوتی ہے، اس لیے ہر وقت

کے پانی میں ہم کو ایک نیا لطف ملتا ہے، اور ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ تو وہی پانی ہے جو ہم بار بار پی چکے، اب اس میں کیا مزہ رہا، اسی طرح جو لوگ تشنۂ ایمان ہیں اور جن کو سرچشمۂ ایمان کی تلاش ہے، ان کو ہر آیت میں ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے، اور ایک نئی لذت ملتی ہے، اس لیے ان کو تکرار بدمزہ نہیں معلوم ہوتی۔

غرر و درر میں شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ (المتوفی ۴۳۶ھ) نے اور فوز الکبیر میں شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی تکرارات قرآن پر مفصل بحثیں کی ہیں، لیکن اصل یہ ہے، کہ قرآن مجید میں جو تکراریں ہیں، وہ مختلف قسم کی ہیں، اور ان بزرگوں نے جو جوابات دیئے ہیں، وہ صرف خاص خاص قسم کی تکراروں کے متعلق ہیں، اس لیے اول ہم یہ بتانا چاہتے ہیں، کہ قرآن مجید میں کس کس قسم کی تکرار ہے۔

قرآن مجید کو غور سے شروع سے آخر تک پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس میں دو قسم کی تکرار ہے، لفظی تکرار اور معنوی تکرار۔

۱۔ معنوی تکرار سے یہ مقصود ہے کہ ایک ہی مفہوم اور ایک ہی معنی کو خاص الفاظ کی پابندی کے بغیر بار بار کہنا، قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ یا نماز کی تاکید مختلف الفاظ میں جا بجا آئی ہے، لیکن ان معنوں کے ادا کرنے کے لیے کوئی خاص عبارت نہیں اختیار کی گئی ہے، بلکہ مختلف طرز اور مختلف طریقوں سے ایک ہی مفہوم کو ادا کیا گیا ہے،

۲۔ لفظی تکرار سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی مفہوم کو کسی خاص عبارت

اور الفاظ کے ساتھ بار بار ادا کرنا مثلاً سورۂ رحمٰن میں فبای آلاء ربکما تکذبان کی تکرار، شریف مرتضیٰ کا جواب اسی تکرار سے متعلق ہے، ہم پہلے معنوی تکرار کو بیان کرتے ہیں،

معنوی تکرار عموماً چند موقعوں پر ہے، بعض خاص خاص قصوں کی تکرار مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کا قصہ اور بعض خاص خاص فرائض اور عقائد کی تکرار مثلاً نماز، توحید و معاد کا بیان، خدا کے صفات و احسانات اور مظاہر قدرت کا ذکر،

تکرار قصص قرآن مجید میں جو قصے مذکور ہیں، وہ دو قسم کے ہیں، بعض قصے ایسے ہیں، جن کا بیان قرآن مجید میں دہرا دہرا کر آتا ہے، مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے قصے، اور بعض قصے ایسے ہیں، جن کا ذکر کہیں ایک موقع پر آگیا ہے، اور دوسری مرتبہ بالکل نہیں ہوا، مثلاً ذوالقرنین، اصحاب کہف، حضرت یوسفؑ، حضرت یونسؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت طالوتؑ وغیرہ کے قصے (صلوات اللہ علیہم اجمعین)۔

جن انبیاء علیہم السلام کے قصے بار بار آئے ہیں، وہ صرف چار ہیں، حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ،

اس کے متعلق دو باتیں قابل غور ہیں، اولاً یہ کہ انہی چار انبیاء کے قصے دہرائے گئے ہیں، ثانیاً یہ کہ ان کے دہرانے کی ضرورت کیا ہے؟

سب سے پہلے ہم کو اس پر غور کرنا چاہیئے، کہ قرآن مجید میں اس کثرت سے

قصّے کیوں مذکور ہیں، اصل یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، کہ وہ غیروں کے حالات اور سرگذشت سے بالطبع نصیحت حاصل کرتا اور متاثر ہوتا ہے، اس بنا پر قرآن مجید اور تمام کتب سماوی میں جابجا قصّے مذکور ہیں جن سے یہ ثابت ہے کہ قومیں خدا کی نافرمانی سے کس قدر مبتلائے آلام ہوتی ہیں، اور نیک نفس قوموں کو خدا کس قدر عروج و راحت عطا کرتا ہے، لیکن چونکہ اس قسم کے قصے جب تک بار بار کان میں نہ ڈالے جائیں، ان سے صحیح عبرت اور کامل اثر نہیں حاصل ہوتا، اس لیے قرآن مجید میں ایسے عبرتناک قصّے بار بار دُہرائے جاتے ہیں۔

ایک بڑی وجہ ان قصوں کے تکرار کی یہ ہے، کہ جس طرح ایک دلیل مختلف دعووں پر اثر کرتی ہے، ایک قصہ سے مختلف نتائج مستنبط ہوتے ہیں، اور متعدد موقعوں پر ان سے استشہاد پیش کیا جاتا ہے، اس لیے ہر جگہ ان قصوں کے اعادہ سے مختلف نتائج پیدا ہوتے ہیں، مثلاً حضرت موسیٰؑ کا قصہ قرآن میں بار بار آیا ہے، مگر غور کرو، ہر جگہ ایک جدید نتیجہ کی طرف اس سے اشارہ کیا گیا ہے، کہیں تو اظہار قدرت کے موقع پر حضرت موسیٰؑ کا قصہ بیان کیا گیا ہے، کہیں بنی اسرائیل پر خدا نے اپنے احسانات کے اظہار کے موقع پر اس قصہ کا ذکر کیا ہے، کہیں نافرمان قوموں کی ہلاکت پر اس قصہ سے استشہاد کیا گیا ہے، کہیں اس سے بنی اسرائیل کی شرارت اور کفرانِ نعمت

ثابت کیا گیا ہے، کہیں اس قصہ کے ذریعہ سچے نبی اور جھوٹے لوگوں میں فرق بتایا گیا ہے، کہیں اس سے خدا نے حضرت موسیؑ پر اظہار احسان کیا ہے، کہیں اس سے فرعون کے کفر، غرور اور نخوت کا تذکرہ مقصود ہے، کہیں اس سے انسان کی فطری کمزوری کا اظہار کیا گیا ہے، حضرت آدمؑ کے قصہ سے خدا کے احسانات، انسان کی کمزوری، نفس امارہ کی شرارت، نوع انسان کی عظمت، غرور کی مذمت، مختلف باتوں پر استدلال ہو سکتا ہے۔

غرضکہ تم اس سے نتیجہ نکال سکتے ہو کہ صرف ایک قصہ سے کس قدر مختلف نتیجے پیدا ہو سکتے ہیں، قرآن مجید میں جو ایک ہی قصہ کی بار بار تکرار ہوتی ہے، دراصل ہر جگہ اس قصہ سے ایک جدید نتیجہ کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے اس لیے وہ تکرار غیر مفید نہیں ہوتی۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہاں پہنچ کر، یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ تمام انبیاء میں سے صرف چند خاص انبیاء حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کے واقعات کا اعادہ کیوں بار بار ہوتا ہے، اس کا حقیقی جواب یہ ہے، کہ قرآن مجید کے اصلی مخاطب صرف چار تھے، عموماً عام انسان اور خصوصاً مشرکین عرب، یہود اور نصاریٰ، عام نوع انسان کی عبرت اور تاثیر کے لیے حضرت آدمؑ کے قصے کی تکرار کی جاتی ہے، اور مشرکین عرب چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے بے انتہا گرویدہ اور معتقد تھے، اس لیے

ان کے لیے حضرت ابراہیمؑ کے واقعات سے اور یہودیوں کے لیے حضرت موسیٰؑ اور نصاریٰ کے لیے حضرت عیسیٰؑ کے قصوں سے استدلال پیش کیا جاتا ہے، اور ان ہی چار انبیاءؑ کے نام اور قصے بار بار آتے ہیں، اور چونکہ عرب میں خصوصاً مدینہ میں یہودی زیادہ تر آباد تھے، اس لیے حضرت موسیٰؑ کا نام سب سے زیادہ آیا ہے، ان کے بعد مشرکین کا درجہ ہے، جن کو حضرت ابراہیمؑ سے تعلق ہے اور آخر میں عیسائی ہیں، چنانچہ اسکی تصدیق ذیل کی تفصیل سے ہوگی،

۱۔ حضرت موسیٰؑ کا نام قرآن مجید میں ۱۳۵ مرتبہ آیا ہے،

۲۔ حضرت ابراہیمؑ کا نام قرآن مجید میں ۶۶ مرتبہ آیا ہے،

۳۔ حضرت عیسیٰؑ کا نام قرآن مجید میں ۲۴ مرتبہ آیا ہے،

فرائض و عقائد کی تکرار: اکثر فرائض اور عقائد کا بیان نہایت تکرار کے ساتھ آتا ہے، اور یہ دراصل وہی چیزیں ہیں، جو منتہائے اسلام ہیں، اور وہ حسبِ ذیل ہیں،

ایمان، نماز، زکوٰۃ، توحید، صفاتِ خدا، تاکید یادِ خدا، اظہار قدرتِ خدا، مذمت شرک، قیامت، حشر، جزا، سزا، ذکر موت، ذکرِ دوزخ و جنت، مذمت دنیا، اخلاق و عملِ صالح،

یہی بیانات ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں ہر جگہ بار بار آتا ہے خصوصاً ان میں ایمان، نماز، توحید و مذمتِ شرک، دوزخ و جنت کا ذکر نہایت

کثرت سے ہے، جن کا اندازہ ذیل کے بیان سے ہوگا،

۱۔ مدح توحید و مذمت شرک و کفر کا ذکر قرآن مجید میں ۲۵۰ مرتبہ سے زیادہ آیا ہے
۲۔ ایمان کا ذکر اور حکم کا قرآن مجید میں ۳۰۰ مرتبہ آیا ہے
۳۔ بہشت کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً ۱۹۵ مرتبہ آیا ہے،
۴۔ دوزخ کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً ۲۰۰ مرتبہ آیا ہے،
۵۔ نماز کا ذکر اور حکم قرآن مجید میں ۱۰۰ مرتبہ سے زیادہ آیا ہے،

شاہ ولی اللہ صاحب نے ان مذکورۂ بالا فرائض و عقائد کے متعلق الفوزالکبیر میں ایک بہت دلچسپ بحث لکھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے قرآن مجید میں جن امور کا ذکر کیا ہے، وہ دو طرح کے ہیں،

اول وہ امور ہیں، جو محض قانونی اور تشریعی حکم رکھتے ہیں، اور جن سے مقصد صرف یہ ہے کہ مخاطب کو ان کا علم ہو جائے، مثلاً طلاق، خلع، ظہار، ایلاء، وراثت، سزائے سرقہ، قصاص، شہادت، سزائے زنا وغیرہ،

دوم وہ امور، جو قانونی اور تشریعی نہیں، بلکہ وہ ایسے عقائد یا اعمال ہیں، جن کے متعلق خدا یہ چاہتا ہے، کہ وہ انسان پر چھا جائیں، انسان میں سما جائیں، انسان بالکل ان میں رنگ جائے، ان کا سخت معتقد یا پابند ہو جائے، خدا انہی چیزوں کو بار بار کہتا ہے، اور ۱۰۰، ۱۰۰ دفعہ دہراتا ہے تاکہ مخاطب

اس قدر متاثر ہو جائے، کہ ہل نہ سکے، ایمان، نماز، یا زکوٰۃ، توحید، حشر، جزا، سزا وغیرہ جن کا ذکر قرآن مجید میں ہر جگہ ہے، وہ اسی قسم کے امور ہیں، جن کی تکرار سے مقصود یہ ہے کہ یہ چیزیں نفس پر بالکل چھا جائیں،

اس کی صحیح مثال یہ ہے کہ اگر ہم خیام اور حافظ کو غور سے پڑھیں، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس رندی و عاشقی کے صرف چند مضامین ہیں، جن کو وہ الٹ پھیر کر ہمیشہ باندھا کرتے ہیں، لیکن جب ہمارے سامنے کوئی شعر اُن کا آجاتا ہے، تو ہم اس سے ایک نیا لطف حاصل کرتے ہیں، قرآن مجید کی بار بار تلاوت کرنے کا اسلام نے جو حکم دیا ہے، اس کا بھی یہی راز ہے،

حاشیہ شاہ صاحبؒ کی اصلی عبارت یہ ہے۔

اگر پرسند مطالب فنون خمسہ چرا در قرآن عظیم مکرر گفتہ شد چرا یک بار اکتفا نہ رفت گویم انچہ خواہم کہ سامع را افادہ نمایم دو قسم می باشند یک تعلیم مالا یعلم بود، پس مخاطب حکمے را نمی دانست و ذہن او ادراک (یعنی معلوم امر کا بتانا) آں نہ کردہ بود باستماع ایں کلام آں مجہول معلوم شود، وآں نادانستہ، دانستہ گردد و دیگر آنکہ مقصود استحضار صورت آں علم در مدرکہ او باشد تا از آں لذت فراواں گیرد و قوائے قلبیہ وادراکیہ دراں علم فانی شوند و رنگ ایں علم بر ہمہ قوی غالب آید، چنانکہ معنی شعری راکہ ما آں را دانستہ ایم مکرر می گوید، و ہر بار لذتے می یابیم و بریں لذت تکرار آں

دوست می داریم۔۔۔۔۔ لہذا در شریعت بہ تکرار تلاوت امر فرمودند۔

(فوز الکبیر مطبوعہ کلکتہ ص ۸۶، ۸۷)

یہ جواب حرف بحرف صحیح ہے، اور اس پر کسی اضافہ کی گنجائش نہیں،

لفظی تکرار | قرآن مجید میں لفظی تکرار بھی بہت ہے، ایک ایک آیت ایک ہی سورہ میں بیسیوں مرتبہ آتی ہے، ایک ہی آیت میں ایک ایک لفظ یکے بعد دیگرے دُہرا دیا جاتا ہے،

پہلے ہم الفاظ کی تکرار کو بیان کرتے ہیں، اس قسم کی تکرار ہر زبان میں موجود ہے اور اس کو اصطلاح نحو میں تاکید کہتے ہیں، ہم ہمیشہ بولتے ہیں، دیکھو دیکھو، نہیں نہیں، زید زید، اس دوسرے لفظ سے مقصود صرف کلام پر زور ڈالنا ہوتا ہے، قرآن مجید کی جن آیتوں میں اس قسم کی تکرار ہے، وہ محض تاکید کے لیے ہے، اس تکرار کی چند مثالیں یہ ہیں،

اولیٰ لك فاولیٰ ثم اولیٰ لك فاولیٰ۔ (قیامہ) — ہلاکت ہو تمہارے لیے ہلاکت پھر ہلاکت ہو تمہارے لیے پھر ہلاکت۔

کلا سوف تعلمون ثم کلا سوف تعلمون (تکاثر) — ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لوگے، پھر ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لوگے۔

عربی اشعار میں بھی اس قسم کی تکرار کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں، خنسا کہتی ہے،

ا ر دت لنفسی بعض الامور ...... فاولی لنفسی اولی لہا

میں نے اپنے لیے بعض چیزوں کا ارادہ کیا ...... تو ہلاکت ہو میرے نفس کے لیے ہلاکت

فرار نے اس قسم کی تاکید کی مثالیں بہت سی پیش کی ہیں، جن کو ہم غرر درر سے نقل کرتے ہیں،

کائن وکم عندی لہم من صنیعۃ ...... ایادی ثنوھا علیّ واوجبوا

ان لوگوں کے کتنے اور کتنے احسان ہم پر ہیں، ایسے احسانات جن کو دوبارہ انھوں نے کیے ...

دیکھو اس مصرع میں الفاظ کی کتنی تکرار ہے،

کم نعمۃ کانت لکم کم کم وکم

کتنے تمہارے احسانات ہیں، کتنے کتنے اور کتنے

ایک عربی شاعر کہتا ہے،

نعق الغراب ببین لبنی غدوۃ ...... کم کم وکم لفراق لبنی تنعق

کوّے نے صبح کو لبنی کے فراق کی آواز دی ...... اے کوّے تو لبنی کے فراق کی کتنی کتنی اور کتنی آواز دیگا،

حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے تاکیدی الفاظ کی تکرار عربی زبان میں کثرت سے ہے، اور قرآن مجید میں بھی یہ اسلوب جابجا استعمال کیا گیا ہے،

اب صرف ایک بات بیان کرنی رہ گئی، قرآن مجید کی ایک ہی سورہ میں ایک ایک آیت کی تکرار بار بار کی جاتی ہے، سورۂ رحمٰن میں "فبای آلاء ربکما تکذبان"[1] ۳۱ مرتبہ، ایک ایک آیت کے بعد آیا ہے،

---

[1] تم خدا کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

سورۂ مرسلات میں "ویل یومئذ للمکذبین"[۱] ایک دو آیت کے بعد گیارہ مرتبہ ہے، سورۂ قمر میں بھی اسی قسم کی تکرار ہے،

اس کا جواب مختلف پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے،

(۱) قرآن مجید میں ہر جگہ موثر اسلوب اختیار کیا گیا ہے، جب ہمارا مقصود یہ ہوتا ہے، کہ مخاطب کو ہر طرح سے متاثر کر دیں، تو ایک ایک جملے کو بار بار کہتے ہیں، اور مخاطب پر اس کا اثر پڑتا ہے، مثلاً ایک شخص پر تم نے کثرت سے احسانات کیے، وہ اپنے طرزِ عمل سے ان احسانات کا انکار کرتا ہے، تو تم اس کو اس طرح سمجھاتے ہو، تم ہمارے کن کن احسانات کا انکار کروگے، کیا ہم نے تم پر یہ احسان نہیں کیا، کہ تم کو رہنے کو گھر دیا، کیا یہ احسان نہیں، کہ تم کو روپیے دیدیے، یہ احسان نہیں، کہ تم کو پڑھایا،

قرآن مجید میں فبای آلاء ربکما تکذبان کی تکرار بھی اسی قسم کی ہے، دیکھو۔

ولمن خاف مقام ربہ جنتان	جو اپنے خدا سے ڈرا اس کو دو جنتیں ملیں گی،
فبای آلاء ربکما تکذبان، ذواتا	تم اپنے خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کروگے،
افنان، فبای آلاء ربکما تکذبان	ان جنتوں میں ہری شاخیں ہوں گی، تم
فیھما عینٰن تجریان، فبای	اپنے خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کروگے،
آلاء ربکما تکذبان، فیھما	ان میں دو نہریں بھی جاری ہوں گی، تم اپنے

[۱] اس دن (انبیاء کے) تکذیب کرنے والوں پر افسوس ہے،

من کل فاکھۃ زوجٰن، فبای　　خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کروگے، ان میں
آلاء ربکما تکذبان،　　ہر میوہ دو دو قسم کا ہوگا، تم اپنے خدا کی کن
(رحمٰن)　　کن نعمتوں کا انکار کروگے،

دوسری جگہ خدا قیامت اور عذاب کا حال بیان فرماتا ہے، اور اُس وقت منکرین کی افسوسناک حالت سے عبرت دلاتا ہے،

کانھا جملت صفر، ویل یومئذ　　دوزخ کے شعلے زرد اونٹوں کی طرح ہونگے،
للمکذبین: ھذا یوم لا ینطقون　　اس دن جھٹلانے والوں پر افسوس ہے،
ولا یوذن لھم فیعتذرون، ویل　　یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ بول سکیں گے،
یومئذ للمکذبین، ھذا یوم　　اور نہ ان کو اجازت دی جائے گی، کہ عذر
الفصل جمعنکم والاولین، فان　　کریں، اس دن جھٹلانے والوں پر افسوس
کان لکم کید فکیدون، ویل　　ہے، یہ فیصلہ کا دن ہے تم کو اور تمہارے
یومئذ للمکذبین،　　اسلاف کو جمع کردیا ہے، اگر تم کوئی تدبیر
　　کرسکتے ہو تو مجھ سے کرو، اس دن جھٹلانے
(مرسلات-۱)　　والوں پر افسوس ہے،

تم دیکھتے ہو کہ یہ طرز تکرار کس قدر موثر ہے،

(۲) مولانا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے، کہ عربی کے قصائد اور غزلوں میں ردیف نہیں ہوتی، اور نہ عرب میں دیگر اصناف سخن مخمس وغیرہ مستعمل ہیں، جن میں

ایک مصرع بار بار آتا ہے، قرآن مجید نے عرب کے لٹریچر پر چونکہ بہت سے اصنافِ سخن کا اضافہ کیا ہے، اس لیے سورۃ الرحمٰن وغیرہ میں جو ایک ہی آیت بار بار آتی ہے اس کو گویا غزل مردف سمجھنا چاہیے، جس میں ایک ہی لفظ ہر شعر کے آخر میں آتا ہے،

(۳) شریف مرتضیٰ نے تکرار آیات کا بہت اچھا جواب دیا ہے، وہ یہ ہے، کہ عرب کے اصناف سخن میں ایک قسم یہ بھی ہے، کہ قصیدہ میں ایک ہی مصرع کو بار بار کہنا، قرآن مجید گو نثر ہے لیکن اس میں چونکہ عرب کے تمام اصنافِ کلام موجود ہیں، اس لیے بعض سوروں میں صنف تکرار بھی اختیار کی گئی ہے، اس صنف کی مثالیں شعرائے عرب کے یہاں بہت ملتی ہیں، شریف مرتضیٰ نے چند مثالیں دی ہیں، ہم اور بھی بہت سی مثالیں پیش کرتے ہیں،

مہلہل بن ربیعہ ایک مشہور جاہلی شاعر ہے، وہ کلیب کے مرثیہ میں لکھتا ہے،

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا خاف المغار من المغیر
الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا طرد الیتیم من الجزور
الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا ما ضیم جیران المجیر
الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا رجف العضاۃ من الدبور
الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا خرجت مخباۃ الخدور

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا ما اعلنت نجوی الامور

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا ضاقت رحیبات الصدور

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا ما خار جار المستجیر

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا طالت مقاساۃ الامور

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا هبت ریاح الزمهریر

اسی طرح سے بیس مرتبہ ایک ہی قصیدہ میں ایک مصرع کو دہرایا گیا ہے، دوسری جگہ مہلہل کہتا ہے،

ذهب الصلح او تردوا کلیبا — وتحلوا علی الحکومۃ حلا

ذهب الصلح او تردوا کلیبا — اوتنذوقوا السیوف وردا ونهلا

اسی قصیدہ میں چھ مرتبہ یہی مصرع بار بار آیا ہے، مہلہل کہتا ہے،

علی ان لیس یوفی من کلیب — اذا قودوا الیک فلا تقاد

علی ان لیس یوفی من کلیب — لاعطاء الطرائف والتلاد

اس قصیدہ میں سترہ مرتبہ ایک ہی مصرع کی مہلہل نے تکرار کی ہے۔

حارث بن عبادہ جاہلی اپنے بیٹے کے مرثیہ میں کہتا ہے،

قربا مربط النعامۃ منی — لقحت حرب وائل عن حیال

قربا مربط النعامۃ منی — لیس دون اللقاء من اعتذال

حارث نے اس مرثیہ میں ایک ہی مصرع کو چھ الیس بار دہرایا ہے،

مہلہل اس مرثیہ کے جواب میں کہتا ہے :-

قربا مربط المشہر منی   کل تشعر واشقر ذی بال

قربا مربط المشہر منی   فکلیب اتنا منی قذ الی

اس قصیدہ میں بھی ایک مصرع چالیس دفعہ دہرایا گیا ہے، لیلیٰ خیلیہ جو امیر معاویہؓ کے زمانے کی ایک مشہور شاعرہ عورت ہے، توبہ کے مرثیہ میں کہتی ہے :-

لنعم الفتی یا توب کنت اذا التفت   صدور العوالی واستشال آسوافل

ونعم الفتی یا توب کنت ولم تکن   لتسبق یوما کنت فیہ تجادل

اس مرثیہ میں لیلیٰ ... دو چار مصرعوں کو لے کر پورے قصیدہ میں ان کو دہراتی گئی ہے، عمرہ بنت نعمان اپنے شوہر کے مرثیہ میں کہتی ہے،

وحدثنی اصحابہ ان مالکا   اقام ونادی صحبہ برحیل

وحدثنی اصحابہ ان مالکا   ضروب بنصل الیف غیر نکول[1]

پھر بار بار اسی مصرع کو دہراتی چلی گئی ہے،

اس قسم کی لفظی اور معنوی تکرار صرف قرآن مجید ہی میں نہیں ہے، بلکہ تورات میں بھی موجود ہے، حضرت موسیٰؑ کا قصہ تورات میں مختلف نتائج کے لیے بیسیوں

---

[1] یہ تمام مذکورۂ بالا اشعار حرب بکر و تغلب میں ہے،

جگہ آیا ہے، لفظی تکرار بھی کثرت سے ہے، ایک مقام پر ہے،

تم میری سنتوں کی محافظت کرو، اور میرے مقدس سے ڈرو، میں خداوند ہوں، اور تم بھان متی اور جادوگروں پر التفات نہ کرو، اور ان کے طالب نہ ہو، کہ ان کے سبب سے ناپاک ہوجاؤ گے، میں[۵] خداوند تمہارا خدا ہوں، تو اس کے لیے جس کا سر سپید ہو، اٹھ کھڑا ہو، اور بوڑھے مرد کو عزت دے، اور اپنے خدا سے ڈر، میں خداوند ہوں، اگر کوئی مسافر تیری زمین پر تیرے ساتھ سکونت کرے تو اس کو مت ستا، بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے، اور ایسا پیار کرو جیسا آپ کو کرتا ہے، اس لیے کہ تم مصر کی زمین پہ پردیسی تھے، میں خداوند تمہارا خداوند ہوں تم انصاف کرنے میں، پیمائش کرنے میں، تولنے میں، ناپنے میں، بے انصافی نہ کرو، چاہیے کہ تمہاری ترازو پورے پیمانے پوری دس سیریاں ہوں، میں خداوند تمہارا خداوند ہوں[۵]، جو تم کو زمین مصر سے نکال لایا سو تم میری ساری شریعتوں اور ساری عدالتوں کی حفاظت کرو اور ان پر عمل کرو، میں خداوند ہوں!!

(احبار باب ۱۹)

---

[۵] میں خداوند تمہارا خدا ہوں، اس فقرہ کی تکرار احبار باب ۱۸، ۱۹ میں بہت جگہ ہے، میں نے صرف آخری حصہ لیا ہے،

آخر میں ایک بات کہنی اور باقی رہ گئی، دشمنانِ اسلام کا یہ بھی اعتراض ہے، کہ سورۂ الرحمٰن میں بعض جگہ "فبای آلاء ربکما تکذبان" کی تکرار بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے، مثلاً

یرسل علیکما شواظ من نار و نحاس فلا تنتصران، فبای آلاء ربکما تکذبان، فاذا انشقت السمآء فکانت وردۃ کالدھان فبای آلاء ربکما تکذبان، فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جآن، فبای آلاء ربکما تکذبان، یعرف المجرمون بسیماھم فیوخذ بالنواصی والاقدام فبای آلاء ربکما تکذبان، ھذہ جھنم التی یکذب بھا المجرمون یطوفون بینھا وبین حمیم آن، فبای آلاء ربکما تکذبان ـ (رحمٰن-۲)	تم پر آگ پگھلے ہوئے تانبے کا شعلہ بھیجا جائے گا، اور تم اپنے کو نہ روک سکو گے، تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے، جب آسمان پھٹ جائے گا، تو سرخ مثل تیل کے ہو جائے گا، تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے، اس دن کسی انسان اور جن کا گناہ نہ پوچھا جائے گا، تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے، گنہگار اپنی علامت سے پہچان لیے جائیں گے، تو سر کے بال اور پانوں پکڑ کر (ڈالے جائیں گے) تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے، یہی وہ جہنم ہے گنہگار انکار کرتے تھے، اس آگ اور گرم پانی کے درمیان طواف کرو۔ تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے۔

ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں جہنم و دوزخ کے حالات بیان کیے گئے ہیں، یہ عذاب ہے، نعمت نہیں، اس لیے اس کے بعد یہ کہنا کہ تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے، ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے،

جمہور مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے، کہ جہنم و دوزخ گو خود نعمت نہیں ہیں، لیکن جہنم و دوزخ کے حالات بیان کر کے انسان کو عبرت دلانا ایک نعمت ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ جواب کس قدر رکیک و بارد ہے، ہمارے نزدیک اس کا اصلی جواب یہ ہے، کہ جہنم و دوزخ گو خاص خاص گنہگار افراد انسان کے لیے نعمت نہیں ہے، لیکن عام نوع انسان کے لیے خدا کا دوزخ کو پیدا کرنا بھی ایک عظیم الشان نعمت ہے، جس کے خوف سے مجرم انسان صالح ہو جاتا ہے۔

اس کا دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ اس سورہ میں قرآن مجید نے جس صنف کلام کا استعمال کیا ہے، اس میں یہ بھی اجازت ہے، کہ گو اس مکرر مصرع کو جو ہر شعر میں آتا ہے، دوسرے مصرع سے تعلق نہ ہو) بلکہ پہلے مصرعوں سے تعلق ہوتا ہے) مگر پھر بھی اس کو دہرا دیتے ہیں، مہلہل کے مذکورہ بالا قصیدہ کے دو شعر سند میں پیش ہیں:

قربا مربط المشهر منی — لیت شعری و ذالک انعم حال

مشہر (گھوڑے کا نام) اصطبل میرے قریب لاؤ، کاش میں جانتا اور یہ بہتر حالت ہے۔

قریبا مربط المشہر منی — من یکون الفداۃ رہن العوالی

شہر کا اصطبل میرے قریب لاؤ — کہ کل کون نیزوں کی نذر ہوگا

دیکھو ان دو شعروں میں پہلے مصرع کو، دوسرے مصرع سے تعلق نہیں، اور نہ تیسرے مصرع کو چوتھے مصرع سے تعلق ہے بلکہ دوسرے مصرع کو چوتھے مصرع سے تعلق ہے، مگر پھر بھی مکرر مصرع کو مہلہل نے ان دونوں شعروں میں دہرادیا ہے،

قرآن مجید میں بھی اس موقع پر گو دوزخ و جہنم کے ذکر کو فبای آلاء ربکما تکذبان سے تعلق نہیں، بلکہ اس کے ماقبل اور مابعد سے تعلق ہے، مگر پھر بھی اس کو دہرادیا گیا ہے، تاکہ سلسلۂ تکرار ٹوٹنے نہ پائے،

علوم قرآن دراصل ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اس قسم کے نکتے صرف اس دریا کے چند حباب ہیں۔

(الندوہ، جنوری ۱۹۰۹ء)

ارضِ حرم
اور
اس کے احکام و مصالح
(قرآن مجید کی نظر میں)

جزیرۂ عرب کے متعلق اسلام کے جو احکام ہیں، اُن کا ماخذ قرآن مجید کی وہ چند آیتیں ہیں، جو سورۂ توبہ میں واقع ہیں، چونکہ خلافتِ فاروقی کے بعد جب سارا عرب اور عراق و شام اسلامی عَلم کے نیچے آچکا تھا اور غیر مسلم قوتیں اس سرزمینِ اقدس سے معدوم ہو چکی تھیں، اسلام پر کبھی کوئی وقت ایسا نہیں آیا، جب جزیرۂ عرب اور ارض حرم کے تقدس اور حرمت کے خلاف اس پر کسی غیر مسلم سلطنت کے استیلا کا خطرہ بھی کسی مسلمان کے دل میں گذرا ہو، اس لیے ان آیاتِ پاک کی تفسیر کبھی اس نقطۂ نگاہ سے نہیں ہوئی، جو اب ہر مسلمان کے پیشِ نظر ہے، اور اب معلوم ہوتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے عرب، عراق اور شام کے غیر مسلم تصرف سے باہر لانے کے لیے جو کوششیں کیں، اور مسلمانوں نے جو قربانیاں کیں، وہ درحقیقت ان ہی آیاتِ پاک کی عملی تفسیر تھی،

لیکن چونکہ مفسرین کے عہد میں یہ منظر کبھی خواب و خیال میں بھی نظر سے نہیں گذرا تھا، کہ سرزمین حرم کی کبھی وہی حالت عود کر آئے گی جو ظہور اسلام سے پہلے تھی، جب عرب کا شیرازہ منتشر تھا، ملک کا کوئی متحدہ نظام نہ تھا، قطعہ قطعہ پر قبائل اور شیوخ کی فرماں روائیاں تھیں، کفر و شرک کا استیلا تھا، یمن سے لے کر عراق و شام تک مجوسیوں اور رومی عیسائیوں کی طاقت بالا د حکمراں تھی، اور ٹھیک آج کی طرح اس عہد میں بھی یمن، حضر موت، بحرین اور عمان پر ایران کے مجوسی مسلط تھے، عراق میں امیر فیصل کی جگہ آل منذر کا خاندان مجوسیوں کی حکمبرداری میں اور حدود شام میں امیر عبداللہ کے بجائے آل غسان رومیوں کے زیر حمایت تھے، اور شام کے بقیہ حصوں پر رومی عیسائیوں کی براہ راست حکومت تھی، عین اُس وقت جب جزیرۂ عرب کا یہ نقشہ تھا، سورۂ توبہ کی یہ آیتیں اُتریں، (۶-۲)

یا ایھا الذین آمنوا انما	اے ایمان والو! وہ جو خدا کا شریک ٹھہراتے
المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد	ہیں، وہ نجس اور گندے ہیں، تو وہ اب کے
الحرام بعد عامھم ھذا وان	سال کے بعد حرمت والی مسجد کے قریب
خفتم عیلۃً فسوف یغنیکم اللہ	نہ آنے پائیں، اور اگر تم ان کی آمد و رفت
من فضلہ ان شاء ان اللہ علیم	کے رک جانے کے باعث نقر و فاقہ سے
حکیم، قاتلوا الذین لا یؤمنون	ڈرتے ہو، تو ایسا خیال نہ کرو، خدا نے اگر

باللّٰہ ولا بالیوم الآخر ولا [illegible] چاہا تو وہ تم کو اپنے فضل وکرم سے غنی کردیگا،
یحرمون ما حرم اللّٰہ ورسولہ [illegible] بیشک خدا اپنے (اپنے حکم کی مصلحتوں کو)
ولا یدینون دین الحق من [illegible] جاننے والا اور حکمت والا ہے، تم اُن میں سے
الذین اوتوا الکتٰب حتی یعطوا [illegible] اُن لوگوں سے لڑو جن کو کتاب دی گئی ہے
الجزیۃ عن ید وھم صٰغرون [illegible] اور وہ خدا پر اور قیامت پر یقین نہیں رکھتے
[illegible] اور نہ اس کو حرام کرتے ہیں جس کو خدا اور
[illegible] اس کے رسول نے حرام کیا، اور نہ وہ سچے
[illegible] مذہب کی پیروی کرتے ہیں، اور یہ لڑائی
[illegible] اُن سے اس وقت تک جاری رکھو جب تک
[illegible] وہ مطیع ہو کر جزیہ (خراج اطاعت) نہ
ادا کریں، (توبہ ۴)

ان آیتوں میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں،

(۱) اہل شرک مسجد حرام کے قریب نہ ہونے پائیں،

(۲) اگر تم کو فقر وفاقہ کا خوف ہے، تو خدا تم کو اپنے فضل وکرم سے غنی کردیگا۔

(۳) اُن اہل کتاب سے جو دین حق کے پیرو نہیں، اس وقت تک لڑو جب تک کہ وہ جزیہ دے کر اطاعت نہ قبول کریں، ان آیتوں کی ترتیب، باہمی ربط، اور سیاق وسباق سے یہ بالکل عیاں ہے، کہ یہ تینوں باتیں باہم ایک

دوسرے سے متعلق اور مربوط ہیں، اور اسی تعلق اور ربط کا اقتضا یہ ہے کہ ہم قرآن پاک کے ان الفاظ کا وہ منشا سمجھیں، جس سے اس تعلق و ربط کی کڑیاں زیادہ وابستہ ہو کر نظر آئیں، فقہاء نے پہلی آیت سے یہ حکم قرآنی اخذ کیا ہے، کہ مشرک مسجد حرام کے اندر داخل نہ ہوں، اس اتفاق تام کے بعد یہ اختلاف رونما ہو گیا ہے، کہ کس قسم کا داخلہ ممنوع ہے، امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ غلبہ اور استیلا پا کر کوئی مشرک مسجد حرام کے اندر حاکمانہ داخل نہیں ہو سکتا، امام شافعی اور جمہور فقہائے اسلام کا مذہب یہ ہے کہ، مشرک کا ہر قسم کا داخلہ مسجد حرام میں ناجائز ہے، خواہ وہ حاکمانہ ہو یا محکومانہ، امام ابو حنیفہ کی طرف اس آیت کی تشریح میں یہ ایک اور امر کی بھی نسبت کی گئی ہے کہ وہ اس آیت کا منشا صرف اسی قدر خیال کرتے ہیں، کہ آیندہ سے مشرک خانہ کعبہ کا حج نہ کرنے پائیں،

الغرض فقہاء نے اس آیت کا منشا یہ متعین کیا ہے، کہ اس میں مشرکین کو مسجد حرام کے اندر داخل ہونے سے روکا گیا ہے، یا اس میں مراسم حج ادا کرنے سے باز رہنے کی ہدایت کی گئی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر اس آیت کا صرف اسی قدر مدعا ہوتا، تو بجائے اس طریقہ ادا کے کہ فلا تقربوا المسجد الحرام، (تو اس حرمت والی مسجد کے قریب نہ ہونے پائیں) یا صاف اور سیدھے طریقہ سے یہی کیوں نہ کہدیا گیا کہ فلا یدخلوا المسجد الحرام (کہ مسجد حرام کے اندر داخل

نہ ہونے پائیں) فلا یقربوا المسجد الحرام (مسجد حرام کا آیندہ حج نہ کرنے پادیں) اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مسجد حرام کے اس قرب و نزدیکی سے مشرکین کو روکنے اور باز رکھنے کا مدعا اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جو بعض فقہاء نے قرار دیا ہے، بالکل کھلی ہوئی بات ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے داخل ہونے یا حج کرنے کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ ان سب سے زیادہ وسیع، عام اور ہمہ گیر لفظ "قرب و نزدیکی" کا استعمال کیا ہے، مسجد حرام کے قرب و نزدیکی سے جب وہ روک دیئے گئے، تو اس کے اندر ان کا داخلہ یا اس کا حج خود بخود مسدود ہو جائے گا، اور اس پر غلبہ اور تسلط اور تولیت اور قیام و سکونت تو بدرجۂ اولیٰ منع ہوگی، الغرض قرآن پاک کے الفاظ اس باب میں خاص نہیں، بلکہ عام ہیں، اور وہ ہر قسم کے قرب و نزدیکی کے منع کو حاوی ہیں،

اگر قرآن پاک کے ان الفاظ کا مقصد خاص ہوتا، یعنی صرف عدم دخول یا عدم استیلاء یا عدم حج تک محدود ہو، تو اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے دو باتیں ذکر فرمائی ہیں، ایک یہ کہ "کفار کے اس انسداد اور روک دینے سے اگر تمہیں اپنے افلاس اور غربت کا ڈر ہے تو خدا تم کو غنی کر دے گا" اور دوسری یہ کہ "اہل کتاب سے جو دینِ حق کے پیرو نہیں جب تک جزیہ نہ دیں لڑائی جاری رکھو"، ان دونوں باتوں کا محض مشرکین کے مسجد میں داخل ہونے یا حج کرنے کی ممانعت سے کیا ربط و تعلق ہوگا، کیا مشرک اگر خانہ کعبہ میں داخل نہ ہونے

پائیں گے، اوران کو حج کی اجازت نہ ہوگی، تو مسلمان غریب ہو جائیں گے، اور اہلِ کتاب سے مقاتلہ جاری ہو جائے گا،

ایک اور بات اس موقع پر غور کے قابل ہے، یہ آیتیں سورۂ براءت کے ساتھ فتحِ مکہ کے بعد ۹ھ میں اُتری ہیں، جیساکہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، اوراس سورہ کے مضامین سے ظاہر ہے کہ اس وقت یمن سے عراق اور شام کے حدود تک اسلام کی طاقت اور حکومت قائم ہو چکی تھی، مشرکین عام طور سے مسلمان ہو چکے تھے، اور جو باقی تھے اُن سے اسلام کے سوا کوئی اور شے مطلوب نہ تھی، ایسی حالت میں ان کو صرف حرم کے اندر داخلہ سے یا حج سے روکنے کے کوئی معنی نہیں، اسی طرح ملک میں عیسائیوں یا یہودیوں کی جہاں کہیں بھی آبادی تھی، وہ فاتح مسلمانوں کی محکومی بہ دل اختیار کر چکی تھی، ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ مشرکین کو اگر وہ ہوں تو صرف حرم کعبہ کے داخلہ سے یا حج سے ممانعت نہیں کی گئی ہے، بلکہ مسجد حرام کے قرب سے ان کو باز رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، مقصود یہ ہے کہ غیر مسلم بیت الحرام کے قرب وجوار میں مقام نہ کریں، کیونکہ ان کو بیت خلیل کی ہمسائیگی اور ہم جواری کا شرف حاصل کرنے کا کوئی استحقاق نہیں ہے، جیساکہ اسی سورہ میں بتصریح مذکور ہے،

ماکان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ شٰھدین علیٰ انفسھم بالکفر (توبہ) مشرکوں کو کوئی حق نہیں، کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں، درانحالیکہ وہ خود اپنے اوپر کفر

اولئك حبطت اعمالهم وفي النار ... کی گواہی دے رہے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے
هم خلدون ٥ انما يعمر مسٰجد ... کام برباد ہوگئے۔ اور وہ ہمیشہ دوزخ میں
الله من آمن بالله واليوم الآخر ... رہیں گے، اللہ کی مسجدوں کو وہی آباد کرتا
واقام الصلوٰة واتى الزكوٰة ولم ... ہے جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان لایا اور نماز
يخش الا الله ... کھڑی کی، اور زکوٰۃ دی، اور سوا خدا اور کسی
... (توبہ-۳) ... سے نہ ڈرا ...

یہ یاد رہے کہ خدا نے عام مساجد کی تولیت کا حق اہلِ ایمان کو عطا فرمایا ہے، اسلام میں مقدس مسجدیں صرف تین ہیں، جو تین انبیاء کی یادگاریں ہیں، مسجد حرام جو حضرت ابراہیمؑ کی یادگار ہے، بیت المقدس جو حضرت سلیمانؑ کی تعمیر ہے، اور مدینہ کی مسجد نبوی جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نشانی ہے، ان تینوں مسجدوں کی تولیت اور آبادی صرف اُن کا حق ہے، جو خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر خدا کے سوا اور کسی کے خوف سے اُن کے دل مرعوب نہیں،

اس سورہ کے نزول کے وقت مکہ فتح اور تمام عرب مسخر اور بُت پرست مشرکین کا استیصال ہو چکا تھا، اب جو کچھ باقی رہ گئے تھے، وہ اہلِ کتاب مشرکین تھے، جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا نام لے کر بھی خدا کے احکام کی توہین کرتے تھے، اور بندوں کو خدا کا ہمسر قرار دیتے تھے، اس لیے آیت پاک،

انما المشرکون نجس فلا یقربوا ۔ خدا کے شریک ٹھہرانے والے نجس ہیں،
المسجد الحرام ۔ (توبہ ۔ ۴) ۔ تو وہ اس حرمت والی مسجد کے قریب نہ ہوں،
کی تعمیم میں ہر قسم کے مشرک، شریک اور داخل ہیں، لیکن صورت واقعہ کے لحاظ سے مسجد حرام کے قریب بسنے والے یہود ونصاریٰ خصوصیت کے ساتھ داخل ہیں۔

اس تفصیل کے بعد اس آیت کا ربط و تعلق مابعد کی آیتوں سے بالکل واضح اور روشن ہو جاتا ہے، عرب کی تجارت تمامتر یہودیوں کے ہاتھ میں تھی، اور ان کے مہاجنی کاروبار کا جال تمام ملک میں پھیلا تھا، ملک میں غلہ اور سامان شام کے نبطی اور یہودی لاتے تھے، اور یہی یہاں کے بیوپاری تھے۔ یہودیوں کی تجارتی کوٹھیاں جو قلعوں کا مقابلہ کرتی تھیں، ہر جگہ قائم تھیں، اور جزیرۂ عرب کے صوبہ شام میں رومی عیسائیوں کی اور صوبۂ عراق میں مجوسی ایرانیوں کی فرماں روائی تھی، جن کو اسلام نے مشابہ اہل کتاب قرار دیا ہے،

آیت میں "قرب" کا لفظ خدا نے استعمال فرمایا ہے، یعنی یہ کہ ہر قسم کے مشرک مسجد حرام کے قریب نہ رہیں، قرب اور بعد کے الفاظ اضافی ہیں، یعنی ایک ہی حیثیت سے اسکو قریب بھی کہہ سکتے ہیں ہے، اور دوسری حیثیت سے اس کو بعید بھی کہہ سکتے ہیں، اس بنا پر جب خدا نے یہ حکم دیا کہ مشرک مسجد حرام کے قریب نہ رہیں، تو ضرور ہے کہ اس قرب و بعد کی تعیین کر دی جائے، اسی لیے شارع ؑ نے

اس قرب کی تعیین "جزیرۃ العرب" کے لفظ سے کر دی، اور فرمادیا کہ جزیرۃ العرب میں اہلِ شرک کو سکونت کی اجازت نہ دی جائے، اس بنار پر احادیثِ صحیحہ اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب (جزیرۂ عرب سے اہلِ شرک کو نکال دو) اور لا تبقی فیہا دینان (اس جزیرہ میں دو دین نہ ہوں) اور لا یبقی فیہا قبلتان (اس میں عبادت کے دو مرکز نہ ہوں) حقیقت میں آیتِ بالا کی شرح اور تفسیر ہے اور حکم مذکور کا اجراء اور تنفیذ ہے،

اب اوپر کی لکھی ہوئی سورۂ توبہ کی تینوں آیتوں کو ملا کر دیکھیے اور ایک بار بغور ان پر نظر ڈالیے،

یاایها الذین آمنوا انما المشرکون	اے ایمان والو! جو شرک میں مبتلا ہیں، وہ
نجس فلا یقربوا المسجد الحرام	نجس اور گندہ ہیں، تو وہ اس سال کے بعد
بعد عامہم ہذا وان خفتم عیلۃ	مسجد حرام کے قریب نہ ہوں، اگر تم کو (ان
فسوف یغنیکم اللہ من فضلہ	کی آمد و رفت کے رک جانے سے) فقر و فاقہ
ان شاء ان اللہ علیم حکیم قاتلوا	کا خوف ہو، تو خدا تم کو اپنے فضل سے انشاء اللہ
الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم	غنی کر دے گا، بیشک خدا اپنے حکم کی مصلحتوں
الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ	(کا) جاننے والا اور حکمت والا ہے، تم ان میں
ورسولہ ولا یدینون دین الحق	سے جن کو کتاب الٰہی دی جا چکی تھی، ان سے
من الذین اوتوا الکتٰب حتی یعطوا	لڑو، جو خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتے،

الجزیۃ عن ید وھم صاغرون [illegible] اور نہ ان کو حرام کہتے ہیں، جس کو خدا اور
[illegible] اس کے رسول نے حرام کیا، اور نہ وہ دینِ حق
کی پیروی کرتے ہیں، اور یہ لڑائی ان سے
[illegible] اس وقت تک رکھو جب تک وہ محکوم ہو کر
(توبہ ۔ ۴) [illegible] جزیہ نہ دیں، [illegible]

ظاہر ہو گیا کہ ہر قسم کے مشرکین سے اور خصوصاً اہلِ کتاب مشرکین سے مسجد حرام کا قرب و جوار پاک ہونا چاہیے اور جزیرۂ عرب میں ان کی آمد و رفت اور سکونت مسدود ہونی چاہیے، مسجد حرام کے قرب و جوار میں اہلِ شرک میں سے جو لوگ آمد و رفت رکھتے تھے، اور سکونت کرتے تھے، وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جو مصالحانہ تجارتی کاروبار کے ذریعہ سے آتے جاتے تھے۔ دوسرے وہ تھے جو جزیرۂ عرب کے حدود میں فوجی اور شاہانہ قوت و اقتدار رکھتے تھے، اسلام نے ان دونوں کے لیے اپنے مقدس شہروں کے دروازے بند کر دیئے۔ ابھی گذر چکا ہے کہ اس ملک کا تمام کاروبار، لین دین، تجارت اور بیوپار یہودیوں اور نبطیوں کے ہاتھ میں تھا، اس لیے لامحالہ مسلمانوں کو اپنی مالی اور اقتصادی قوت کے زوال اور اشیاء کی آمد و رفت کے انسداد اور باہر سے غلہ کی آمد بند ہو جانے کا خطرہ ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے اُن مصالحانہ تجارتی ذرائع کے بند ہو جانے سے جو خطرہ لاحق ہوا، اس کو اس تسلی سے جس میں آیندہ کی عظیم الشان پیشنگوئی چھپی تھی رفع

کردیا، کہ اگر تم کو اس آمد ورفت کے بند ہو جانے سے فقر وفاقہ کا خیال ہے تو خدا اپنی دولت سے مالا مال کردے گا، یعنی تم کو سرزمین کی وسیع حکومت اور تجارت سپرد کردے گا،

تیسری آیت میں جس مقاتلہ کا ذکر ہے، وہ اس سرزمین اقدس کی غیر مسلم قوتوں کے مقابلہ میں ہے، جو عراق وشام کے صوبوں میں جو جزیرۂ عرب کے آخری حدود تھے۔ فوجی اور شاہانہ اختیارات رکھتی تھیں، اور اُن سے اس وقت تک جنگ جاری رکھنے کا حکم تھا جب تک وہ جزیہ دے کر اسلام کی اطاعت نہ قبول کریں،

اس کے بعد کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کے شرک کا ثبوت دیا ہے، کہ اُن میں سے ایک نے عزیر کو اور دوسرے نے عیسیٰ کو خدا کا شریک و شبیہ ٹھہرایا ہے، اور اُن کے اس ارادۂ فاسد کا اظہار ہے، کہ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ وہ اسلام کی قوت کو کسی طرح شکست کرسکیں، چنانچہ فرمایا:

وقالت الیھود عزیر ن ابن اللہ	اور یہود نے کہا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ
وقالت النصاریٰ المسیح ابن	نے کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے، یہ اُن کے منہ
اللہ ذٰلک قولھم بافواھھم	کی باتیں ہیں (جن کو سچائی سے تعلق نہیں)
یضاھئون قول الذین کفروا	یہ اُن کافروں کے قول کی نقل ہے، جو اُن کے
من قبل قاتلھم اللہ انّی یوفکون	پہلے تھے، خدا ان کو غارت کرے، کہ کدھر

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا لا الٰہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔

(توبہ۔۴)

بھٹکائے جارہے ہیں، انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے اپنے دین کے عالموں کو اور مسیح ابن مریم کو خدا بنالیا ہے، حالانکہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک خدا کو پوجیں، کوئی خدا نہیں، مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جس کو وہ خدا کا شریک بناتے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور (اسلام) کو منہ سے پھونک مار کر بجھادیں، اور خدا کو منظور ہے کہ وہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کے رہے، اگرچہ ان کافروں کو دل سے یہ بات ناپسند ہو، وہی خدا ہے جس نے اپنے (محمدؐ) کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے، تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غلبہ عطا کرے، گو مشرکوں کو برا کیوں نہ لگے۔

ان آیات بالا میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے شرک اور نور اسلام کے بجھانے کے لیے ان کی جن کوششوں کا حوالہ دیا تھا، وہ بعینہ آج تک قائم ہیں، اہل کتاب کی اس مذہبی بد اعتقادی کو جس کی بنا پر مساجد الٰہی کی تولیت کا استحقاق

اُن سے چھن جاتا ہے، اُن کی مالی اور تجارتی بے ایمانیوں کو خدا نے ظاہر کیا ہے، اور اس کے بعد حرمت کے چار مہینوں کا ذکر ہے، جن میں سرزمین عرب میں لڑنا ناجائز ہے، اور اس کے بعد رومیوں کی لڑائی یعنی غزوۂ تبوک کا ذکر ہے جس سے شام کی لڑائیوں کا آغاز ہوتا ہے، اور چند سال کے بعد بیت المقدس کی کنجی مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، اور تیسری مسجد کی تولیت کا فخر بھی ان کو عطا ہوتا ہے۔

سلسلۂ واقعات کی یہ کڑیاں ہمارے دعوے کی تائید اور شہادت ہیں، کہ اس حکم کے نزول کے بعد عرب کے مشرکین پر فوج کشی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ اب ان کا کوئی جتھا باقی نہیں رہا تھا، بلکہ اول شام کے عیسائی رومیوں سے مقابلہ کیا گیا، جو سرزمین حرم کے پاس ہونے کے باعث نور اسلام کے بجھانے میں سب سے پیش پیش تھے، چنانچہ قرآن مجید نے بھی اس کے بعد اسی جنگ کا تذکرہ کیا ہے، اور منافقین اور بعض سچے مسلمان اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے، ان کو سخت لعنت ملامت کی ہے، آخر میں ارشاد فرمایا،

يا ايها الذين آمنوا قاتلوا	اے ایمان والو! جو کفار تمہارے قریب ہیں،
الذين يلونكم من الكفار (توبہ۔۱۶)	ان سے جنگ کرو،

غزوۂ تبوک کے قرینہ سے یہ صاف ظاہر ہے، کہ اس قریب، متصل اور ہم سرحد کفار سے مقصود عراق و شام کی غیر مسلم حکومتیں ہیں، جو بقیہ ارض عرب پر کسی استحقاق کے بغیر قابض تھیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکم کی تعمیل

کے لیے غزوات کا رُخ ادھر ہی موڑ دیا، اور غزوۂ تبوک کے بعد مرض الموت میں غزوۂ موتہ کے لیے فوج کی آراستگی کا حکم دیا، اور چونکہ یہ مہم تمام نہیں ہوئی تھی؛ اس لیے وفات کے وقت اپنے چار جانشینوں کو وصیت فرمائی کہ جزیرۂ عرب نامسلمنوں سے پاک کیا جائے، بنابریں حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی اس محاذ جنگ کو قائم رکھا، بلکہ اس کو عراق تک وسعت دیدی، اور حضرت فاروق اعظمؓ نے اس مہم کو انجام تک پہنچایا۔ یہاں تک کہ جزیرۂ عرب اپنے پورے حدود میں آزاد ہوگیا، اور وہ صرف دینِ حق کا مسکن اور حضرت ابراہیمؑ کی بشارت کا مستحق ہوگیا، اور اس وقت یمن اور خیبر وغیرہ کے نصاریٰ اور یہود کو خالص عرب کے صوبوں سے ہٹا کر عراق و شام میں آباد کیا گیا،

اس تشریح سے یہ بھی واضح ہوگیا، کہ کامل جزیرۂ عرب اور اس کے مختلف حصوں کے کیا احکام ہیں، کامل جزیرۂ عرب کے لیے یہ حکم ہے، کہ وہ غیر مسلم کے استیلاء، تسلط اور فرمانروائی سے آزاد ہو کہ اس سے زیادہ سرزمین حرم کے اصلی قرب و اتصال کی تولیت اور داخلہ کی جس سے اہلِ شرک کو روکا گیا ہے، اور کیا صورت ہوسکتی ہے، اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فتح مکہ تک غزوات کا سلسلہ قائم رہا، کہ یہ سرزمین بُت پرست اہلِ شرک کے قرب، تولیت اور استیلاء سے آزاد ہو، اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء عراق اور شام کے اہلِ شرک سے نبرد آزما ہوئے، تاکہ ان مقاماتِ مقدسہ کو اہلِ کتاب یا مشابہ اہلِ کتاب مشرکین کے قرب، تولیت اور استیلاء سے پاک و صاف کیا جائے۔

(۲) آیت پاک میں اس قرب کی ممانعت میں مسجد حرام کا لفظ خاص طور سے مذکور

ہے، اور اسی کی بقائے حرمت کی خاطر اس کے آس پاس کی زمینوں کے دروازے بھی اہلِ شرک پر بند کیے گئے ہیں۔ اس لیے اس مسجد حرام کے اندر کسی غیر مسلم کا داخلہ قطعاً ممنوع اور ناجائز ہوگا، ورنہ صریح نص کی مخالفت لازم آئے گی۔

(۳) آیت مذکورہ کی تشریح میں جو صحیح حدیثیں اخرجوا المشرکین کی آئی ہیں، ان میں جزیرۃ العرب کا لفظ صریح طور سے واقع ہے، اور اسی کے مطابق حضرت عمرؓ نے یمن اور خیبر سے غیر مسلموں کو خارج کر کے ان کو عراق اور شام میں جگہ دی، جو ان کا اصلی وطن تھا، اس لیے یہ ثابت ہوا کہ خالص عرب یعنی حجاز، یمن، حضرموت، عمان، بحرین، نجد، یمامہ وغیرہ عربی صوبوں میں غیر مسلم کی مستقل سکونت نہیں ہو سکتی، البتہ ان کا عارضی قیام ہو سکتا ہے، چنانچہ اسی اصول کے مطابق اس آیت کے نزول کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر خلفاء کے درباروں میں جن کا مرکز مدینہ منورہ تھا ہمیشہ غیر مسلم سفرائے سلطنت اور امراء آیا کرتے تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کے وہاں قیام کی مدت مقرر کر دی، یعنی تین دن جو مہمان داری کی جائز مدت ہے، چنانچہ عبدالرزاق میں یہ حدیث بسند موجود ہے۔

(۴) جزیرۃ العرب کی لغوی وسعت میں اگرچہ عراق و شام کے صوبے داخل ہیں، تاہم خالص عرب کے حدود سے وہ یقیناً باہر ہیں، اور قرآنِ پاک نے ان اہلِ کتاب کو جو وہاں سکونت پذیر تھے، اسلام کی حکومت اور استیلاء کے تسلیم کر لینے کے بعد ان کو وہاں سے نکالنے کا حکم نہیں دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ نے اُن

صوبوں کے حدود میں اور ان صوبوں کے اندر اہلِ کتاب مشرکین کو جگہ دی اور وہاں آباد کیا، اس لیے جزیرہ کے اُن صوبوں میں ان کو اسلام کے زیرِ سایہ اقامت اور سکونت کی اجازت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو بیان فرماتے وقت اپنی صفات ان الفاظ میں بیان فرمائی ہیں،

ان اللہ علیم حکیم   بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے،

یعنی ان احکام کے جاری کرنے میں جو مصلحتیں اور فائدے ہیں، ان کو وہ خوب جانتا ہے اور اس کی حکمت اور دانائی ہی اس کی مقتضی ہے کہ وہ ان احکام کو نافذ کرے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے بیان میں "خانۂ کعبہ" کو بیت نہیں کہا جیسا کہ دوسرے موقع پر کہا ہے، "کعبہ" نہیں کہا جیسا کہ ایک اور مقام پر مذکور ہے، غرض اس کے متعدد اسماء اور صفات میں سے اس خاص موقع پر "مسجد حرام" یعنی "حرمت والی مسجد" کے نام سے اس کو تعبیر فرمایا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس کی "حرمت" ہی اس حکم کی بنا اور مصلحت ہے، اسی طرح نامسلموں کو جن سے اس حرمت والی مسجد اور اس کے اطراف کو پاک و صاف کرنا مطلوب ہے، لفظ "مشرکین" سے ادا فرمایا ہے، جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کے شرک کی آلودگی ہی ان کے منع قرب اور عدم دخول کی علت اور باعث ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم الٰہی کی تشریح میں یہ الفاظ فرمائے کہ

اخرجوا المشرکین من جزیرۃ   مشرکوں کو جزیرہ عرب سے نکال دو

العرب،

یا یہ فرمایا،

لا تبقی دینان (جزیرۂ عرب میں دو دین (ایک حق اور ایک باطل) باقی نہ رہیں۔

اور یا یہ ارشاد ہوا۔

لا یبقی قبلتان (دو قبلے (یعنی عبادتوں کے دو مرکز) باقی نہ رہیں

یہ تمام مختلف الفاظ اور عبارات ایک ہی حقیقت کی تعبیر اور ایک ہی کنہ کی ترجمانی ہے،

(۱) اسلام نے اپنے کسی حکم میں اس مصلحت کو نظر انداز نہیں کیا ہے کہ وہ ایک اجتماعی دین ہے، اس کی عمارت کی پانچ بنیادیں توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اسکی اسی وحدت اور اجتماع کے پہلو کو نمایاں کرتی ہیں، توحید یہی ہے، کہ صرف ایک قادر ہستی کا اعتراف کیا جائے، نمازوں کی جماعت اور اوقات معین بھی اسی لیے مشروع ہیں، کہ مسلمان سیکڑوں اور ہزاروں کی کثرت کے باوجود، ایک ہوکر منظر عام پر آئیں، اور ایک ہی معین وقت میں تمام رُوئے زمین کے اہل ایمان خدا کے سامنے جھکے نظر آئیں، روزہ کے اوقات اور ایام کی تعیین اور ماہ رمضان کی تخصیص بھی اسی لیے ہے کہ زمین کے جس گوشہ میں بھی مسلمان ہوں، وہ سب ایک ہی وقت، ایک ہی حالت، اور ایک ہی کیفیت میں جلوہ گر ہوں، زکوٰۃ کی ایک خاص مقدار معین کی گئی اور اس کی مشروع

صُورت یہ رکھی گئی، کہ وہ ایک ہی جگہ (بیت المال میں) جمع ہوکر مقررہ مصارف میں خرچ ہو، حج کے خاص مہینہ، خاص طریقے، خاص لباس، خاص مقام کی تعیین اسی لیے ہے کہ اس سطحِ ارضی کے تمام کلمہ گو، ایک ہی رنگ روپ، ایک ہی شکل وصُورت ایک ہی طریق انداز سے ایک مرکز ربانی کے گرد جمع ہوکر، وحدتِ اسلامی کے مجسم پیکر بن جائیں۔ احادیث صحیحہ میں مسلمانوں کی وحدت اور اجتماع کے جو احکام ہیں، وہ بھی اسی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔

ید اللّٰہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ فی النار۔ (ترمذی)	خدا کا ہاتھ مسلمانوں کی اجتماعی ہیئت (جماعت) پر ہے، جو اس سے علیحدہ ہوا، وہ دوزخ میں علیحدہ ہوا،
المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً۔ (مشکوٰۃ)	ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے دیوار کی طرح ہے، جس کی اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر اس کو مضبوط کرتی ہے،

اسی وحدت اور اجتماع کی دیوار ہے جو نمازوں کی جماعتوں میں اور جہادوں کی صفوں میں سیسہ پگھلائی ہوئی دیواروں کے مانند مستحکم، متحد اور مجتمع ہوکر، خدا کی نگاہوں میں محبوب اور عزیز ہوتی ہے،

ان اللّٰہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص (صف)	بیشک اللہ ان سے محبت کرتا ہے، جو اس کی راہ میں صف باندھ کر اس طرح لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیواریں۔

اسلام کے اسی وحدت اور اجتماع کا اقتضا تھا کہ ان لاکھوں، کروروں دلوں اور چہروں کے لیے جو زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوں، سطح ارضی کا کوئی گوشہ مخصوص کر دیا جائے، جدھر سب کے رخ ہوں، وہ جہاں کہیں ہوں، دن میں پانچ دفعہ ادھر پھیر جائیں، تاکہ دنیا میں ہر روز یہ اعلان ہوتا رہے کہ خلق الہی کی اتنی تعداد جسمانی وطن، مقام اور مسکن کے اختلاف کے باوجود اپنا ایک ہی روحانی وطن، مقام اور مسکن سے تعلق رکھتی ہے، اسی لیے حکم ہوا،

فول وجهك شطر المسجد الحرام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره (بقرہ ۱۷)	تو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر (اور اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو، اسی کی طرف اپنا چہرہ پھیرو،

اس مرکزی جہت کا نام قبلہ ہے، یہ مرکزی جہت اور قبلہ وہ بیت الہی قرار پایا، جو دنیا میں خدا کا پہلا گھر تھا،

واذ جعلنا البيت مثابة للناس وامنا۔	یاد کرو، کہ ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا،

نہ صرف اسی قدر بلکہ سطح ارض پر بسنے والے تمام مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور ان کی اجتماعی وحدت اور ان کے مصالح کے قیام کا اس کو ذریعہ اور نشان بنایا۔

جعل الله الكعبة البيت الحرام قياما للناس۔ (مائدہ ۱۳)	خدا نے کعبہ یعنی اس مقدس گھر کو لوگوں کے لیے ٹھہراؤ بنایا،

اب ضرورت تھی، کہ مومنین کا یہ مرکز، یہ مرجع، یہ نقطۂ اجتماع، یہ نشانِ وحدت، بیگانہ خیالات، اجنبی رسوم و آداب اور غیروں کے اختلاط اور امتزاج اور میل جول کے گرد و غبار سے پاک ہو، تاکہ ہدایت کا جو چشمہ یہاں سے بہہ کر نکلے، وہ ہر قسم کی آلائشوں سے مبرا اور ہر قسم کی گندگیوں سے منزہ اور ہر طرح کی نجاستوں سے صاف ہو، اسی لیے حکم ہوا کہ "مبتلایانِ شرک" نجس اور ناپاک ہیں، تو وہ اس حرمت والی مسجد کے قریب نہ ہوں،

کسی خاص گوشۂ ارضی کو بیگانہ خیالات و عقائد اور آداب و رسوم کے شر و فساد اور تاریکی و گمراہی سے محفوظ رکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے، کہ اس گوشہ کو خاص خیالات و عقائد اور آداب و رسوم کی جماعت کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور دوسری جماعتوں کو وہاں کے قرب و اتصال، آمد و رفت، اور قیام و سکونت سے روک دیا جائے، کہ بیگانہ خیالات و عقائد، اجنبی آداب و رسوم کی سرایت اور نفوذ صرف اجنبی قوموں اور بیگانہ اشخاص کے میل جول، امتزاج اور صحبت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے دنیا کے دائمی مذہب کے لیے جس کے بعد کوئی نیا مذہب اس کو نہ دیا جائے گا، یہ ضرور تھا، کہ اس کے قیام و بقا اور تحفظ کے لیے ایک ایسا خطۂ اقدس مخصوص کر دیا جائے، جہاں وہ تنہا حکمراں اور آباد ہو، تاکہ اگر کبھی وہ دنیا میں بے وطن ہو جائے، تو اس سرزمین میں اس کا وطن رہے، یا اگر کبھی اس کی مشعلیں زمین کے دوسرے خطوں میں بجھ جائیں، تو روشنی کا ایک منارہ کم از کم ایک گوشۂ خاکی میں قائم رہے، جہاں سے

اس کی بجھی ہوئی مشعلوں کو دوبارہ روشنی مل سکے، یا اگر کبھی اس کی ہدایت کی بیرونی نہریں خشک یا مکدر ہو جائیں، تو اس کا ایک سرچشمہ باقی ہو، جہاں سے دوبارہ اسکو زندگی اور حیات مل سکے، یہی تفسیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی،

لا تبقی فیہا قبلتان جزیرۂ عرب میں عبادت کے دو مرکز باقی نہ ہوں،

لا یترك فیہا دینان جزیرۂ عرب میں دو دین چھوڑے نہ جائیں،

لامحالہ اگر کسی قوم کو یا افراد کو مستقل قیام کی اجازت دی جائے گی، تو لامحالہ وہ وہاں اپنی عبادت گاہیں تعمیر کریں گے، اپنے خیالات کی تبلیغ کریں گے، اپنے تمدن اور آداب و اخلاق کی اشاعت کریں گے، اور یہی شے مسجد حرام کی عظمت، تقدس اور حرمت کو بے بنیاد کرے گی، اسلام سے پہلے عراق میں مجوسی اور شام میں عیسائی حکومت تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ وسط عرب میں مزدکی اور عیسائی مذہب نشوونما پا رہے تھے، قوموں کے استیلاء اور تسلط کا آغاز اسی قرب و اتصال سے ہوتا ہے، دنیا کی تاریخ میں اس کے کس قدر بے شمار نظائر ہیں، خصوصاً یورپ کی اس برتری اور ترقی کے عہد میں مشرق کے کس قدر ممالک ہیں جن کے تسلط اور استیلاء کا آغاز اسی قرب و اتصال سے ہوا ہے، پہلے بحری آمد و رفت ہوئی، پھر عارضی سیاحتیں ہوئیں، پھر تجارتی تعلقات ہوئے، مستقل کوٹھیاں تعمیر ہوئیں، آئندہ یہی کوٹھیاں سیاسی سازش گاہوں کی صورت میں بدل گئیں، اور آخر وہ فوجی اور جنگی قلعوں کی حیثیت میں منتقل ہو گئیں، مراکش سے لے کر مصر تک، خلیج بنگال سے لے کر

بحر ہند تک، اور خلیج عجم سے لے کر بحر حبشہ اور بحر عرب تک، کیا یہی نقشہ خال نہیں نظر آتا، تو اسلام نے اگر ان مفاسد کے سدباب کے لیے تسلط اور استیلاء کے ذرائع و وسائل یعنی قرب و اتصال کو ممنوع قرار دیا، تو دنیا کے تاریخی تجربہ کے لحاظ سے غلط نہیں کیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

آں کس است اہلِ بشارت کہ اشارت داند

معارف نومبر ۱۹۲۳ء

سرزمینِ حرم صرف خدا کے عبادت گذاروں[۲] کا مسکن ہے

ارضِ حرم کی نسبت گذشتہ مباحث میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ وہ اسلام کا دینی اور مذہبی مرکز ہے، اس کا گوشہ گوشہ اسلام کا معبد اور مسلمانوں کا مشہد ہے، ارضِ حرم جس دن ارضِ حرم بنی، اسی دن اس کی یہ خصوصیت عیاں کر دی گئی ہے، کہ وہ صرف رکوع اور سجود کا آستانہ اور اعتکاف و طواف کا مقام ہے اور انہی بندگان حق کا مسکن ہے جن کی زندگیاں راہِ خداپرستی میں وقف ہیں اور جو حیاتِ ابدی کے طالب اور جویاں ہیں، خانۂ حرم کے معماروں کو جب وہ اس کی تعمیر سے فارغ ہو چکے، اس کے مالک کا حکم پہنچا۔

ان طھرا بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود۔ (بقرہ)

تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک کرو،

معلوم ہوا کہ ارضِ حرم کی تعمیر کا خاص مقصد یہ ہے کہ توحید کے پرستاروں کا یہ وہ مقام ہو، جہاں خدائے واحد کی پرستش کے سوا کوئی عمل مطلوب نہ ہو، اس کے سوا دنیا کے اور جتنے کام ہیں، وہ اس کی پاکی اور طہارت کے منافی ہیں، اس کی طہارت اور پاکی، اس کی عظمت اور تقدس صرف اسی میں ہے، کہ وہ عبادت الٰہی کا مرکز، توحید پرستی کا معبد، رکوع اور سجود کی چوکھٹ اور اعتکاف و طواف کی خانقاہ ہو،

حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے نام پر جب اس گھر کو بنایا اور اس کی پاسبانی کے لیے اپنی سب سے پیاری اور عزیز اولاد حضرت اسماعیلؑ کو قربان کیا تو ساتھ ہی مقصدِ الٰہی کے مطابق اپنی غرض بھی ظاہر کر دی۔

واذ قال ابراهیم رب اجعل هذا	اور جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار اس
البلد امنًا واجنبنی وبنی ان نعبد	شہر کو امن دینے والا بنا اور مجھ کو اور میری نسل
الاصنام رب انهن اضللن کثیرا	کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کو پوجیں، میرے
من الناس فمن تبعنی فانه منی ومن	پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو
عصانی فانك غفور رحیم، ربنا	گمراہ کیا ہے، تو جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے
انی اسکنت من ذریتی بواد غیر	ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا
ذی زرع عند بیتك المحرم ربنا	مہربان ہے، ہمارے پروردگار! میں نے اپنی
لیقیموا الصلوٰۃ [illegible]	اولاد میں سے بعض کو تیرے مقدس گھر کے پاس
[illegible]	بن کھیتی کے میدان میں اس لیے لاکر بسایا ہے،
[illegible]	ہمارے پروردگار! تاکہ وہ نماز کھڑی کیا کریں،
[illegible] (ابراہیم ۔ ۶)	(یعنی تیری عبادت کریں)

اس شہر کے سب سے پہلے آباد کار نے یہ ظاہر کر دیا کہ اس کی بنا صرف توحید پرستی کے لیے ہے، یہ باطل پرستیوں کا کبھی گہوارہ نہ بنے اس مقدس گھر کے سایہ میں جو لوگ بھی کبھی آباد ہوں، ان کی سکونت کی غرض صرف یہی ہونی چاہیے، کہ وہ اقامتِ صلوٰۃ یعنی

عبادتِ الٰہی کے لیے اپنی حیات کو قربان کردیں، یہ وہ ناپاک سازشوں اور چالبازیوں دنیاوی سیاستوں، اور ملعون ہوسناکیوں، تخت و تاج اور باج و خراج، فوج و عسکر اور تیغ و خنجر کی جگہ نہیں، وہ صرف ایک ہی بادشاہی کا دارالسلطنت اور ایک ہی سپہ سالار کا لشکر گاہ ہے، وہاں کا تاجدار صرف خدائے قدوس ہے اور وہاں کا سریر آرا صرف ربِّ دو عالم ہے، وہ انسانی بادشاہیوں اور خوں ریزیوں کی سرزمین نہیں، وہ قدسیوں کا مسکن، حق جویوں کا مامن اور سچے فرزندانِ ابراہیم کا وطن ہے۔

اور یہ بھی ذہن نشین رہے، کہ ابراہیمؑ کے اصلی جانشین وہ نہیں ہیں، جو صرف صلبی اور نسبی حیثیت سے ابراہیم کی جسمانی اولاد ہیں۔ بلکہ وہ ہیں، جو ابراہیم کی پیروی اور اطاعت کرکے ان کی معنوی اور روحانی اولاد بننے کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے صاف کہہ دیا،

فمن تبعني فانه منّي (ابراہیم) جو میری پیروی کرے وہی مجھ سے ہے،

وہ تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ پس ابراہیمؑ کی اولاد جس کو اس ارضِ حرم میں اس کی جانشینی کا حق حاصل ہے، وہی ہے جو یہاں کی سکونت کے لیے ابراہیمؑ کی اطاعت اور پیروی کی مالکانہ سند اپنے پاس رکھتی ہے، اسی بنا پر یہ سرزمین نہ کسی نسلِ خاص کی ملکیت ہے، نہ کسی قومِ واحد کی مملوکہ ہے، نہ کسی خاندانِ خاص کی جائداد ہے، بلکہ یہ اُن تمام انسانوں کی ملکیت اور جائداد ہے، جو بت شکن ابراہیم کی پیرو اور مطیع ہے، وہ لوگ جو پشتہا پشت اور صدیوں سے اس میں مستقل سکونت رکھتے ہوں،

ان کا اس سرزمین پر استحقاق ایک ذرہ اُن سے زیادہ نہیں، جنھوں نے ابھی ابھی اسکے حدود میں قدم رکھا ہے، بلکہ وہ جو تیرہ صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ توحید کے پرستار چلے آتے ہیں، ان کا حق بھی اس ذلیل ترین ہستی کے حق سے سرِ مُو زیادہ نہیں، جس کی زبان ابھی چند لمحے گذرے کہ کلمۂ توحید سے مشرف ہوئی ہے، غرض عرب، عجم، ترکی و تاتاری، بنی ہاشم اور بنی امیہ، بنی فاطمہ اور آلِ معاویہ، مکی اور آفاقی، اس کے حقوق میں سب یکساں، مساوی اور برابر ہیں۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامیؔ ۔ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اس گھر اور اس سرزمین کے مالک نے اس کی آبادی اور سکونت کے استحقاق کے لیے صرف ایک ہی حق کو تسلیم کیا ہے، اور وہ ابراہیمؑ کی اطاعت کیشی اور پیروی ہے، جو اس سند سے سرفراز ہے، وہ اس کی تولیت کا حق دار ہے، اور جو اس سے محروم ہے، وہ اس کے حق سے بھی محروم ہے،

ان الذین کفروا ویصدون عن	بیشک وہ جو کافر ہیں، اور جو راہِ الٰہی سے اور
سبیل اللہ والمسجد الحرام الذی	اس مسجدِ حرام سے روکتے ہیں، جس کو ہم نے تمام
جعلناہ للناس سواء ن العاکف	انسانوں کے لیے بنایا ہے، اور جس میں وہاں کے
فیہ والباد۔ (حج ۳)	رہنے والے اور باہر کے دونوں کے حق برابر ہیں۔

اس اعلانِ الٰہی کے بعد کون ہے جو سرزمینِ حرم کی تولیت کا اس لیے مدعی ہو کہ وہ عرب ہے، اس لیے مدعی ہو کہ وہ ہاشمی ہے، اس لیے مدعی ہو کہ وہ آلِ اشراف

ہے اس لیے مدعی ہو کہ وہ صدیوں سے وہاں سکونت پذیر ہے، اس لیے مدعی ہو کہ سالہا سال سے اس کا خاندان وہاں حکمران ہے، اور کون ہے جو وہاں سے باہر دوسرے ملکوں کے رہنے والے مسلمانوں کے حق کو اس دلیل سے رد کر دے، کہ وہ عرب کی قوم نہیں، وہ سادات اور شرفاء کے خاندان سے نہیں، وہ اس ملک کے باشندے نہیں، اس سرزمین کا مالک صرف ایک ہے، اور وہ خدا، اور اس کے تمام پرستارانِ حق اور کلمہ گو اس سرزمین کے حال و مستقبل کے حقوق میں یکساں اور مساوی ہیں، وہ آلِ ابراہیم کی اس تمام نسل کا مسکن اور وطن ہے جو آج دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں پھیلی اور بکھری ہے، اسی بنا پر شریعت اسلام نے اس شہر کی پوری زمین کو وقف قرار دیا ہے، نہ اس کا کوئی حصہ کسی کی ذاتی ملکیت ہے، نہ وہ فروخت ہو سکتی ہے، نہ وہاں کرایہ پر کوئی مکان چلایا جا سکتا ہے، اور آج وہاں شخصی تصرفات کے جو نشانات ہیں، وہ شریعتِ محمدیہ کے رو سے ناجائز اور ناروا ہیں۔

وہ دار الامن ہے آدم کی اولاد فرشتوں کے طعنوں کے باوجود، اپنی سفاکیوں اور خونریزیوں سے خدا کی زمین کو نجس و ناپاک کرتی رہتی ہے، خدا نے سطح ارضی کے ایک گوشہ کو اپنا نشیمن بنایا، اور اس کو اپنا گھر کہہ کر پکارا، کہ وہ اس خون سے لتھڑی ہوئی دنیا کا ایک ایسا ٹکڑا ہو، جو انسانی ظلم و ستم سے محفوظ، اور سفاکانہ خونریزیوں سے پاک ہو، جہاں انسانی خون کا ایک قطرہ بھی اس کے دامنِ عصمت کا داغ ہو، سطح ارضی کا یہ گوشہ سرزمینِ حرم ہے، جہاں مجرم سے مجرم انسان کا بھی خون گرانا ممنوع، جہاں حلال سے

حلال جانور کا شکار بھی گناہ، جہاں شاخوں اور درختوں کا کاٹنا بھی حرام، اور جہاں سبزہ اور روئیدگی کو چھیلنا بھی جرم ہے وہ صرف امن و امان کا وطن اور سکون و سلام کا مسکن ہے، ہر ذی روح وغیر ذی رُوح اُس کے سایہ میں مامون اور محفوظ ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی،

رب اجعل هذا البلد آمناً (بقرہ) — میرے پروردگار اس شہر کو امن دینے والا بنا،

لبوں کی جنبش سے پہلے یہ دعا، بارگاہِ الٰہی میں قبول اور استجابت سے مشرف ہو چکی تھی، کہ دم تکوین اس کے ناصیۂ تقدیر میں یہ شرف مقدر ہو چکا تھا،

واذ جعلنا البيت مثابة للناس وامنا۔ (بقرہ) — اور جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا۔

خدائے عزیز نے اس شہر کے امن و امان کی قسم کھائی،

والتين والزيتون وطور سينين وهذا البلد الامين۔ (تین) — قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینا کی اور اس امن والے شہر کی،

قریش پر اپنا یہ احسان ظاہر فرمایا،

فليعبدوا رب هذا البيت الذي اطعمهم من جوع وآمنهم من خوف۔ (ایلاف) — تو چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کو پوجیں جس نے ان کو (اس خشک اور بنجر زمین) بھوک سے بچا کر کھانا دیا، اور خوف سے محفوظ رکھ کر ان کو امن بخشا۔

الم یروا انا جعلنا حرماً آمناً ۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے امن والا حرم بنایا،
ویتخطف الناس من حولھم ۔ حالانکہ اس کے آس پاس کی بدامنی کا یہ حال
(عنکبوت) ہے کہ لوگ اچک لیے جاتے ہیں،

اس کے دارالامن بنانے کے لیے بارگاہِ خداوندی سے یہ منشور جاری ہوا۔

من دخلہ کان آمناً جس نے اس کے اندر قدم رکھ دیا، وہ مامون
(بقرہ) ہوگیا۔

اس نکتہ کو غور کرو، کہ مدینہ آنے کے چند سال بعد ہی اسلام اس قدر طاقتور ہوگیا تھا، کہ وہ جب چاہتا تلواروں کے سایہ میں ارضِ حرم میں داخل ہو جاتا، مہاجرین کے قلوب اپنے وطن کے دیدار کے لیے بیقرار تھے۔ انصار کی تلواریں ساکنانِ حرم (قریش) سے انتقام کے لیے بےتاب تھیں، عام مسلمان مسجد ابراہیمی کے شوقِ زیارت کے لیے بےچین تھے لیکن ان حالات کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ پاک میں اُن سب سے بالاتر ایک حقیقت تھی، اور وہ یہ کہ وہ دارالامن ہے، تلواروں کی دھاروں، نیزوں کی انیوں اور تیروں کے پیکانوں سے اس سرزمین کے "جسم اقدس" کو مجروح نہیں کیا جاسکتا، وہ قتل وغنیمت اور خونریزی سے گو وہ حق کے لیے ہو مغلوب نہیں کیا جا سکتا، وہ امن وصلح کا گھر ہے، اور وہ صرف امن وصلح ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے، آپ پرجوش مسلمانوں کے جذبات کے خلاف حدیبیہ میں دب کر صلح فرماتے ہیں، اور فوجوں کی فاتح تلواروں کو، اس کے حدود کے اندر

فاتحانہ داخلہ کی اجازت نہیں دیتے اور فرماتے ہیں قریش جو بات بھی ایسی پیش کریں گے جس میں خانۂ الٰہی کی حرمت ہو گی میں اس کو قبول کر دوں گا، دوسرے سال سینکڑوں مسلمانوں کے جلو میں اس طرح ادائے عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہوتے ہیں، کہ انسانی قتل و خونریزی کے تمام اسلحہ مکہ سے باہر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوتا ہے، دس ہزار مجاہدین کے دستے قدسیوں کے پیکر میں قسم قسم کے پھریروں اور نشانوں کے سایہ میں دم بدم شہر سے قریب ہوتے جاتے ہیں، انصار کی تلواریں انتقام کے جوش میں بار بار نیام سے باہر ہو رہی ہیں، اُن کے علمبردار عبادہؓ کی زبان پر یہ ترانہ ہے:

اليوم يوم الملحمة اليوم تستحل الكعبة۔ آج گھمسان کا دن ہے: آج کعبہ خونریزی کے لیے حلال کر دیا جائے گا،

حضورؐ کے سمعِ اقدس تک یہ آواز پہنچتی ہے، حکم ہوتا ہے کہ "عبادہؓ نے غلط کہا: آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے" اور اس قصور میں فوج کا علم عبادہؓ سے لے کر ان کے بیٹے کو دیدیا، آگے بڑھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ مبارک میں تلواروں کی چمک نمایاں ہوئی، معلوم ہوا کہ سیف اللہ خالدؓ کی تلوار نیام سے نکل آئی ہے، اُن سے بازپرس کی گئی، تو ظاہر ہوا کہ قریش کے ایک دستہ نے تیروں کی بارش سے دو مسلمانوں کو جامِ شہادت پلا دیا، آپؐ نے سُن کر فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی"، بعض شدید مجرموں نے حرم کی سرزمین میں جا کر پناہ لی، حکم ہوا کہ وہ جہاں بھی ہوں قتل کیے جائیں، یہی وہ

ساعت تھی جس میں فرزند اسماعیل اور جانشین ابراہیم کے لیے سرزمین حرم میں قتل جائز قرار دیا گیا،

لا أقسم بهذا البلد وانت حل بهذا البلد (بلد) نہیں! اس شہر کی قسم کھاتا ہوں اور اے پیغمبر تو اس شہر میں حلال ہے،

قرآن مجید نے اس حلت کی حد کی تعیین بھی کر دی،

فلا تقاتلوهم عند المسجد الحرام حتى يقاتلوكم فيه فان قاتلوكم فاقتلوهم۔ (بقرہ) تو قریش سے حرمت والی مسجد کے پاس نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ تم سے اس میں نہ لڑیں، تو اگر وہ تم کو وہاں قتل کرنا چاہیں، تو تم ان کو بھی قتل کرو

عین اس وقت جب آپ کے لیے اس سند جواز پر عمل کا وقت تھا، فرمایا:

وانه لم يحل القتال فيه لاحد قبلي ولم يحل لي الا ساعة من نهار فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة (حدیث) میرے پہلے کسی کے لیے اس زمین میں لڑنا حلال نہیں ہوا، اور میرے لیے بھی حلال نہیں ہوا، لیکن ایک گھڑی دن کے لیے تو اب وہ خدا کے محترم بنانے سے قیامت تک کے لیے محترم ہے،

اب ان گنہگار انسانوں کے حق میں کیا فیصلہ ہے، جنھوں نے مسجد حرام کے امن و امان کو ہر قسم کے آلات قتل سے زخمی اور مجروح کیا اور معصوم سرزمین کو انواع و اقسام کے قتل و خونریزی سے ناپاک و نجس کیا،

یہاں ظالم سزا یاب ہوگا ارضِ حرم کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص اس کے

امن وامان اور صلح وسلام کے خرمن میں آگ لگائے گا وہ اس میں خاک ہو جائے گا، اور جو مفسد اس کے حدود میں ظلم وستم گاری کو آشکارا کرے گا، وہ خود دوسروں کے ظلم وستم گاری کا نشانہ بن جائے گا، گھر کے مالک کا اعلانِ عام ہے:

ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم۔ (حج-۳) اور جو اس میں منحرف ہو کر ظلم کا ارادہ کرے گا ہم اس کو دردناک عذاب چکھائیں گے۔

ہمارے سامنے تاریخ کی زبانِ حال اس پیشینگوئی کی شہادتِ تصدیق کے لیے کافی ہے، جب کبھی لوگوں نے اس سرزمین کو اپنے دنیاوی جاہ وجلال کا مرکز بنانا چاہا، اور اس کے امن وامان کی بارگاہ کو خطرہ میں ڈالا، خواہ وہ باہر کے حملہ آور ہوں، یا اندر کے مدعی ہوں، اصحاب الفیل کا کیا حشر ہوا، یزید اور اس کے خاندان کا چند سال میں استیصال ہو گیا، حضرت ابن زبیرؓ کو ناکامی ہوئی، مدینہ منورہ بھی حرم ہے، آپ نے فرمایا کہ "جس طرح ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا، میں مدینہ کو حرم بناتا ہوں،" اس لیے مدینہ کے مدعیوں کا بھی حشر یہی ہے، یزیدیوں کی بربادی ہوئی، واقعۂ حرہ میں انصار زادوں کو ناکامی ہوئی، نفس زکیہ اور دوسرے سادات ناکام رہے، کیونکہ ان مدعیوں نے حرم کے امن وامان کو خاک وخون میں لتھڑ دیا، شریف حسین اور اس کی اولاد کی ناکامی تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے،

سرزمین حرم دارالسلطنت نہیں بن سکتی

تم نے ایک ایک کرکے پڑھا کہ ارضِ حرم صرف عبادت گذاری کا گھر ہے، وہ تمام دنیائے اسلام کی ملکیت ہے،

وہ دارالامن ہے، یہاں ظالم سرا پا ب ہوگا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ سرزمین دنیاوی شاہیوں اور فوج کشیوں کے لیے نہیں ہے، یہ بغاوتوں اور فسادوں کا مقام نہیں ہے، یہ سازشوں اور چال بازیوں کی کمین گاہ نہیں ہے، اور اس کو یقین جانو! کہ ملک کا دار السلطنت جس کی تعمیر فتنوں اور ہنگاموں سے اور جس کی بنا خونریزی اور سفاکیوں سے ہوتی ہے، ارضِ اقدس کو اس سے پاک اور مبرا ہونا چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ صدیق، عمر فاروقؓ، عثمانؓ غنی، ان میں سے کون تھا، جو اپنے آبائی وطن کا شیدا نہ تھا، تاہم کسی نے بھی اس ملک کو سیاست کا بازیچہ نہیں بنایا، اور ملک کا دار الخلافہ مدینہ منورہ ہی کو باقی رکھا حضرت عثمانؓ کے فتنہ نے یہ بھی ظاہر کر دیا، کہ حرم ابراہیمی کی طرح، حرم محمدی بھی سیاست گاہِ اقوام بننے کے لائق نہیں، چنانچہ حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی بنا پر دار الخلافہ کو مدینہ منورہ سے کوفہ میں منتقل کر دیا، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جب ان کے برخلاف مکہ کو دنیاوی سیاسی مرکز بنایا، تو نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، اب بھی غور کرو کہ اگر شریف حسین کی حکومت پر اندر سے یا باہر سے کوئی دوسری سلطنت حملہ آور ہو، تو خانۂ کعبہ کی توہین اور بربادی کے سوا اور کیا صورتِ حال ہو سکتی ہے، ہر دار السلطنت فسق و فجور، نمائش و تمدن، فتنہ و فساد، دنیا داری اور گنہ گاری کا مرکز اور مرجع ہوتا ہے، پھر کیا اے مسلمانو! ارضِ حرم میں بھی یہی منظر دیکھنا چاہتے ہو! فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(معارف، نومبر و دسمبر ۱۹۲۳ء)

پیغام امن

یعنی محبت الٰہی اور مذہب اسلام

اسلام دُنیا میں خدا کا آخری پیغام ہے۔ وہ دُنیا میں مذہب کی تکمیل ہے، وہ اپنے پیغمبر کے الفاظ میں دینِ الٰہی کی عمارت کا آخری پتھر ہے، وہ فطرت ہے اور فطرت کے مطابق ہے، وہ دُنیا میں اس وقت صلح و امن کا جھنڈا اُڑاتا آیا، جب دنیا خاک و خون میں لتھڑی ہوئی تھی، وہ اُس خدا کا منادی ہے، جو رحم مجسم، عدل مجسم، نیکی محض، خیرِ کل اور امن و امان ہے، وہ ظلم و ستم، بے اطمینانی و اضطراب، شک و شبہ کے طوفانوں سے بھاگ کر امن و شادی کے طلبگاروں کو ایک ہی پناہ کی جگہ بتاتا ہے، ففروا الی اللہ (۵۱:۵۰) ہر طرف سے بھاگ کر اللہ کی طرف جاؤ۔

مخالفین کی نکتہ چینی: اس حقیقت کے باوجود یہ کس قدر افسوسناک ہے کہ ....

.... منجملہ ان اعتراضات کے جو نہایت فخر و غرور اور طعن و طنز کے ساتھ مسیحی مبلغین اور یورپین مستشرقین اسلام پر کیا کرتے ہیں، ایک یہ ہے کہ اسلام نے خدا کا جو تخیل اپنے پیروؤں کے سامنے پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک جبار، قہار، پُرغضب، صاحبِ جلال و جبروت شاہنشاہ ہے، جس سے ہمیشہ بندوں کو ڈرتے اور کانپتے

رہنا چاہیے، اور اسی کا اثر اس کے تمام احکام میں نمایاں ہے، برخلاف اس کے عیسائی مذہب اس کو محبت، پیار، رحمت اور شفقت کے پیکر میں جلوہ گر کرتا ہے، اور اسی لیے اس کو "باپ" کے نام سے پکارتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی نصیحتوں میں نرمی اور رحم وکرم کا جذبہ غالب ہے۔

مستشرقین اسی اعتراض کو اسی صورت میں پیش کرتے ہیں، کہ چونکہ اسلام ایک جنگجو مذہب ہے اس لیے اس کے تخیل میں خدا کی جباری وقہاری اور غیظ وغضب کا تصور سب سے زیادہ ہے، اور اسلام کی یہی کمی تھی جس کو تصوف نے آکر پورا کیا، اور بجائے اس کے کہ فقہا، کی طرح خدا کی اطاعت کا مبنیٰ خشیت اور خوفِ الٰہی کو قرار دیا جائے، انھوں نے خدا کے عشق ومحبت کو قرار دیا۔

ناآشنایانِ اسلام کو، اسلام کے متعلق بحث وکاوش کرتے ہوئے یہ نکتہ ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے، کہ وہ محض تخیلی اور خیال آرائی کا مذہب نہیں ہے، بلکہ وہ اس عملی دنیا کا عملی مذہب ہے، دنیا میں کروروں انسان ہیں، ہر انسان کے پیچھے ہزاروں کام ہیں، اور انسان کے ہر کام کا تعلق دوسرے انسان سے ہے، ان دونوں انسانوں میں کوئی باہمی تعلق ایسا ہونا چاہیے، جو ایک کو دوسرے سے پیوستہ کردے، ایک کو دوسرے کی طرف جھکا دے، اور ایک کا رشتہ دوسرے کے ساتھ جوڑ دے، اس تعلق اس پیوستگی اور اس رشتہ کو جو چیز پیدا کرتی اور قائم رکھتی ہے، وہ محبت اور خوف کا جذبہ ہے، اسی کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ وہ نفع کی طرف رغبت اور ضرر سے نفرت ہے،

غرض انسان کی تمام تحریکات کا سرِ بنیاد محبت و خوف اور رغبت نفع و نفرت ضرر ہے، خدا اور اس کے صفات کے متعلق انسان کے جو خیالات اور تصورات ہیں، وہ بھی اسی اصول کے ماتحت ہیں، وحشی اقوام کے مذہبی خیالات پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ مناظر اور موجوداتِ فطرت کی پرستش اسی اصول کے مطابق کرتی ہیں، بعض چیزوں سے وہ ڈرتی ہیں، تو وہ اُن کی پوجا کرتی ہیں، کہ اُن کے ضرر سے محفوظ رہیں، بعض دوسری اشیاء کے لطف وکرم کی متوقع ہوتی ہیں، کہ وہ اُن کے منافع سے بہرہ اندوز ہوسکیں،

اب عام انسانی معاملات اور کاروبار پر غور کرو، کہ انسان کی موجودہ فطرت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ دُنیا کا یہ نظام صرف محبت اور رغبت کے جذبات سے چل سکے، اگر ایک دن بھی دنیا کے بازاروں، سلطنتوں کے دفاتر اور قوموں اور جماعتوں کی مجلسوں اور سوسائٹیوں میں تنہا اس پر عمل ہو، تو نظامِ عالم درہم و برہم ہوجائے، اور اطاعت و فرماں بری کا جس پر تنظیم اور ضابطہ داری (ڈسپلن) کا دار و مدار ہے، خاتمہ ہوجائے، اسی طرح اگر صرف نفرت و عداوت اور خوف و خشیت تمام تر عالم کے کاروبار میں دخیل ہوجائے، تو یہ دنیا جہنم کا طبقہ بن جائے، اور دلوں کی شگفتگی اور انبساط جو ہماری سرگرمیوں اور ولولوں کا مایۂ حیات ہے، دفعۃً فنا ہوجائے، اس لیے دنیا کا نظام ان دوگونہ جذبات کے بغیر کبھی قائم نہیں رہ سکتا، اور انسان اپنے ہر عمل میں ان دونوں کے سہارے کا محتاج ہے،

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب قائم تھے، اُن میں افراط و تفریط پیدا ہوگئی تھی،

اور صراطِ مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے، یہودی مذہب کی بنا سرتاپا خوف خشیت اور سخت گیری پر تھی، اس کا خدا، فوجوں کا سپہ سالار، اور باپ کا بدلہ تیسری پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا۔ "یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر شاذونادر کہیں نظر آئے گا، اس کے برعکس عیسائیت تمام تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور ہے، اس کے "اکلوتے بیٹے کا باپ" تمام انسانوں کا باپ ہے، وہ اپنے "فرزندوں" کے جرم و خطا سے غضبناک نہیں، بلکہ پشیمان اور متاسف ہوتا ہے،

اس افراط و تفریط کا نتیجہ یہ ہے کہ یہودیت ایک خشک اور بے لذت مذہب بن گیا، اور عیسائیت اس قدر تر ہے کہ تردامنی اس کے نزدیک عیب نہیں رہی، ایک گنہگار عورت کو یہودیت سنگسار کرنے کا حکم دیتی ہے لیکن عیسائیت صرف اسی قدر کہتی ہے کہ "جو گنہگار نہ ہو، وہ اس عورت کو پتھر مارے اور اے عورت! جا پھر ایسا نہ کرنا"، مگر اسلام ان میں تفریق کرتا ہے، مجبور و مجنون و مدہوش وغیرہ مستثنیٰ ہیں، بے شوہر عورت اور بن بیوی کے مرد کو کوڑے مارے جائیں، شوہر والی عورت اور بیوی والا مرد سنگسار ہوگا، یہودی مذہب کسی باز پرس کے بغیر ہر حال میں مرد کو طلاق کی اجازت دیتا ہے، مذہب عیسوی کسی حال میں طلاق کا فتویٰ جاری نہیں کرتا، اسلام اس کے متعلق تفصیلی احکام رکھتا ہے، غرض یہی حال اسلام کا تمام دیگر مسائل میں ہے، کہ وہ عیسائیت اور یہودیت کے درمیان ہمیشہ بیچ کی راہ اختیار

کرتا ہے،

یہی حال اعتقادیات کا ہے، وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج، اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے، اور نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ، یا محمد صلعم کا باپ سمجھتا ہے، اور تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے متصف کرتا ہے، وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے، کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے، اور رحمان و کریم بھی ہے، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے، اور غفور و رحیم بھی ہے، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے، اور پیار بھی کرتا ہے، بگاڑتا بھی ہے اور نوازتا بھی ہے، نفع اور نقصان دونوں اسی کے ہاتھ میں ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے،

کسی حسین اور محبوب چیز کی نسبت اگر اس کے عاشقوں اور محبت کرنے والوں سے پوچھا جائے، کہ اس کی کون سی ادا تم کو پسند آئی، اس کے کس حصہ میں تم کو حسن و جمال کا منظر نظر آتا ہے، اس کے کس حسن و خوبی نے تم کو فریفتہ کیا ہے، تو یقیناً پوری جماعت کا ایک ہی جواب نہ ہوگا، کوئی کسی حصہ کا نام لے گا، کوئی کسی ادا کی تعریف کرے گا، کوئی کسی خوبی کا اپنے کو شیدا بتائے گا، اسی طرح دنیا میں جو پیغمبر آئے، وہ کئی قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے خدا کے صرف جلال و کبریائی کا جلوہ تھا، اور اس لیے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ، دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے، اور وہ لوگوں کو اسی خمخانۂ عشق

کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ہستی آئی جو برزخ کبریٰ، مجمع کمال، اور جامع مستی و ہشیاری تھی، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف آپؐ کی آنکھیں خوف الٰہی سے اشک آلود رہتی تھیں، دوسری طرف آپؐ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم سے مسرور تھا، کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر لوگوں کو نظر آجاتے۔ چنانچہ جب راتوں کو آپؐ شوق و ولولہ کے عالم میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبانِ مبارک پر ہوتیں، آیتیں گذرتی جاتیں، جب کوئی خوف و خشیت کی آیت آتی پناہ مانگتے۔ اور جب کوئی مہر و محبت اور رحم و بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا مانگتے[1]۔

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ خوف و خشیت اور رحم و محبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے، اسی لیے کہا گیا ہے، کہ الایمان بین الخوف والرجاء "ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے"، کہ تنہا خوف، خدا کے رحم و کرم سے ناامید بنا دیتا ہے، اور محض رحم و کرم پر بھروسہ لوگوں کو خود سر اور گستاخ بنا دیتا ہے، جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں ہم کو تم کو اور سب کو نظر آتا ہے، اور مذہبی حیثیت سے عملاً اس کے نتائج کا مشاہدہ یہودیوں اور عیسائیوں

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۹۳

میں کیا جا سکتا ہے، ایک ناامید محض اور دوسرا سرتاپا امید ہے

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا، اور اپنے کو "فرزند الٰہی" کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا، اور حضرت عیسیٰؑ کے جوڑ پر، حضرت عزیرؑ کو "فرزند الٰہی" کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا،

نحن ابناء اللّٰہ واحباؤہ (مائدہ)	ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا،

قل فلم یعذبکم بذنوبکم بل انتم بشر ممن خلق۔ (مائدہ)	اگر ایسا ہے تو خدا تم کو تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے، اس لیے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں، بلکہ تم بھی انہی انسانوں میں سے ہو، جن کو اس نے پیدا کیا،

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا،

یا ایھا الذین ھادوا ان زعمتم انکم اولیآءُ للّٰہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین۔ (جمعہ-۲)	اے وہ جو یہودی ہو، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو، کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو، تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی

تمنا کیوں نہیں کرتے۔

اسلام رحمتِ الٰہی کے تنگ دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے، ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی، کہ "خدایا! مجھ کو اور محمد کو مغفرت عطا کر۔" آپؐ نے فرمایا "خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا"[1] ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی، کہ خدایا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر، آپؐ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا "یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ"[2]

اسلام کے متعلق عیسائیوں نے جو یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے، کہ اس کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے مبرا ہے، اس غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ اسلام عیسائیت کی اس اصطلاح اور طرزِ ادا کو سخت ناپسند کرتا ہے، جس کے ذریعہ سے وہ خدا کے ان اوصاف کو نمایاں کرتی ہے۔ یعنی باپ اور بیٹے کا لفظ کہ اس سے گمراہی پھیلتی ہے، یہ گمراہی کچھ عیسائیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اور دوسرے فرقے بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں،

اصل یہ ہے کہ خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو یہ فرقے اپنی بولی میں نمایاں کرنا چاہتے ہیں، یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی رشتوں کے ذریعہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب [2] ابوداؤد کتاب الادب،

سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض کوتاہ اندیش فرقوں نے اس طریقۂ ادا کو خالق ومخلوق کے ربط وتعلق کو ظاہر کرنے کے لیے بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، دوسروں نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا، اس لیے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا، اور دیبیاں انسانوں کی مائیں بنیں، خاص ہندوستان کی خاک میں زن وشوہر کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے، جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پراثر منظر اور ناقابلِ شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں، اس لیے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق ومخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن وشوہر کی اصطلاح سے ادا کیا جاتا ہے، سداسہاگ نقرا اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

دیکھو! یہ تمام فرقے جنھوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا، وہ کس قدر راہ سے بھٹک گئے، اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام کو بلکہ خواص تک کو گمراہ کردیا، اور لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہوگیے، اسی لیے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا، ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی اور خدا کے لیے ان الفاظ کا استعمال اس نے ضلالت اور گمراہی قرار دیا، لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کو اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے، اس کا

انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے، اور ان سے بھی زیادہ کا طالب ہے۔

فاذکروا اللہ کذکرکم آباءکم، او اشد ذکرا۔ (بقرہ۔ ۲۰)

تو خدا کو اس طرح یاد کرو، جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

بہرحال رحم و محبت کے اس جسمانی طریقۂ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا، کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں جانتا، کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں، ان کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں، اس لیے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور، کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہوسکتا، اور نہ اس کے لیے ان کے لغت کا کوئی ایسا لفظ ل سکتا ہے جو اصل غیر مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے، جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو، انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے، اور اس طرح ان اَن دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے،

اس "اَن دیکھی ہستی" کی ذات و صفات کے متعلق جس کو تم خدا کہتے ہو،

ہر مذہب میں ایک تخیل ہے، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا، کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیرووں کے گرد وپیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے، لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے، کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک ومنزہ کر دے، جہاں تک بنی نوع انسان کے لیے ممکن ہے، خدا کے متعلق، ماں، باپ اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے، کہ اس تخیل کے معتقد ناممکن ہے کہ خالص توحید کے صراطِ مستقیم پر قائم رہ سکیں، اس لیے اسلام نے یہ کیا، کہ ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے الفاظ کو خالق ومخلوق کے اظہار ربط وتعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا، بلکہ ان کا استعمال بھی شرک وکفر قرار دیا، تاہم چونکہ حقائق روحانی کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرنا ہے، اس لیے اس نے جسمانی ومادی رشتہ کے ان جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق ومخلوق کے تعلقات مابین کے اظہار کے لیے مستعار لے لیا، جن کا اظہار دوسرے مذاہب نے ان رشتوں کے ذریعہ کرنا چاہا تھا، اور اس طرح خالق ومخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کیے بغیر ربط وتعلق کا اظہار اس نے کیا، اور انسانوں کو استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں، ان سے ان کو محفوظ رکھا،

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں، جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے،

اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے، تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کیے گئے ہیں، ہر قوم نے اس علم اور نام کے لیے اسی وصف کو پسند کیا ہے، جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی۔

اسلام نے خالق کے لیے جو نام اور علم اختیار کیا ہے، وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے، اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے، کہ یہ ولاہ سے نکلا ہے، ولاہ اور ولہ کے اصل معنی عربی میں اس "غم، محبت اور تعلق خاطر" کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد کو مطلق "عشق و محبت" کے معنی پیدا ہو گئے، اس لیے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں، جس کے عشق و محبت میں کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشان ہیں، حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے۔ اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں "من موہن" "یعنی دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے، وہ "رحمان" اور "رحیم" ہے، ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں، یعنی "رحم والا"، مہربان، لطف و کرم والا" اور پھر یہی اوصاف قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں ہیں جن کے پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے،

کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لیے کوئی دلیل مطلوب ہے، لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں خدا کا دوسرا علم یہی لفظ "رحمان" ہے، جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفتِ مبالغہ کا لفظ ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بیسیوں اوصافی نام ہیں، احادیث میں اس کے ننانوے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آگئے ہیں، لیکن استقصا کرو، تو معلوم ہوگا، کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے، جن میں اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف الودود (سورۂ ذات البروج) آیا ہے، جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں، کہ وہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق و پیار ہے، اس کے سوا خدا کا ایک اور نام الولی ہے، جس کے لفظی معنی یار اور دوست کے ہیں، خدا کا ایک اور نام قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے، وہ الرؤف ہے، رؤف کا لفظ "رافت" سے نکلا ہے، رافت کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں، جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کے لیے قرآن مجید میں ایک اور نام حنان آیا ہے، جو حن سے مشتق ہے "حن اور حنین" اس سوز دل اور محبت کو کہتے ہیں، جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور استعارانہ معانی کو ظاہر کرتے ہیں، جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے اختیار کیے ہیں۔

ان کے علاوہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں اللہ تعالیٰ کے جو اسماء اور صفات مذکور ہیں، ان کو بھی اس موقع پر پیش نظر رکھنا چاہیے، اس کا نام غفار (بخشش کرنیوالا) غفور (بخشنے والا) سلام (امن و سلامتی) ہے کہ وہ سراپا اپنے بے پناہ بندوں کے لیے امن اور سلامتی ہے، پھر وہ مومن (امن دینے والا) ہے، وہ العدل یعنی سرتاپا انصاف ہے، العفو (معاف کرنے والا) ہے، الوہاب (عطا کرنے والا) الحلیم (بُردبار) الصبور (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) التواب (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) البر (نیک اور مجسم خیر) اور المقسط (منصف اور عادل) ہے۔ توراۃ کے اسفار اور انجیل کے صحیفوں کا ایک ایک ورق ڈھونڈو کیا اللہ تعالیٰ کے لیے یہ پُر محبت، یہ سراپا مہر و کرم اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی، اسلام اللہ تعالیٰ کے لیے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا مگر اس لطف و احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے وہ بے بہرہ نہیں، جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایۂ روحانی سمجھتے ہیں، مگر بات یہ ہے کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک و کفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسان کو بچانا چاہتا ہے، جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معانی کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اس لیے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتۂ حقیقت کو ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں۔

اسلام متکلمِ ازل کا آخری پیغام ہے، اس لیے ضرورت تھی، کہ وہ اس قسم کی لغزشوں سے پاک اور مبرا ہو، حقائق روحانی کی تعبیر کے لیے یقیناً مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی مذہب کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو ان استعمالات کی غلطیوں اور غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ، ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کر دیا ہے، قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور ذولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بایں ہمہ وہ انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہتا، کہ وہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لیے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اب (باپ) کے بجائے "رب" کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے،

اب اور رب، ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو، تو معلوم ہوگا، کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل، اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے، اب یعنی باپ کا تعلق، اپنے بیٹے سے ایک خاص کیفیت اور مدت سے لے کر، ایک محدود عرصہ تک رہتا ہے، اس کے وجود میں اس کو یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے مگر اس کے قیام و بقا، زندگی، ضروریاتِ زندگی، سامانِ حیات، نشو و نما اور ارتقار کسی چیز میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی، عہد طفلی تک شاید کچھ اور واسطہ ہو، اس کے بعد تو بچہ اپنے والدین

سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو، کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے، اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے، کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے، کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے؟

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے، جو آغاز سے انجام تک قائم رہتا ہے، جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارۂ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر موجودات کا ہاتھ تھامے رہتا ہے، وہ ذرہ ہو یا پتھر، قطرۂ آب ہو، یا قطرۂ خون، مضغۂ گوشت ہو یا منبت استخوان، شکم مادر میں ہو، یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، کوئی آن کوئی لمحہ، رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے استغنا اور بے نیازی نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے، اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں، جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے،

اب ہم کو ان آیتوں اور حدیثوں کو آپ کے سامنے پیش کرنا ہے، جن سے روشن ہو کہ اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے،

اور وہ خمخانۂ الست کی سرشاری کی یاد بھکے ہوئے انسانوں کو کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت "حبِ الٰہی" ہے، اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبانِ الٰہی نے شہادت دی،

والذین آمنوا اشد حباللّٰہ (بقرہ)　　وہ جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں،

اس نشۂ محبت کے سامنے باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان، مال، خاندان رشتہ کو قربان اور نثار ہو جانا چاہیے، ارشاد ہوتا ہے،

ان کان آباءکم وابناءکم و　　اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، اخوانکم وازواجکم وعشیرتکم　　تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو واموال اقترفتموھا وتجارۃ　　تم نے کمائی اور وہ سوداگری جس کے مندا تخشون کسادھا ومسٰکن ترضونھا　　پڑجانے کا تم کو اندیشہ ہے، خدا اور اس کے احب الیکم من اللّٰہ ورسولہ　　رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی　　محبوب اور پیارا ہے، تو اس وقت تک انتظار یاتی اللّٰہ بامرہ (توبہ)　　کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی، تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے، چنانچہ جو لوگ کہ راہِ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے، اُن کو پکار کر سنا دیا گیا،

یا ایھا الذین آمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ ۔ مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا، تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا، جن کو وہ پیار کرنے گا، اور وہ اس کو پیار کریں گے۔ (مائدہ - ۸)

ایک نبی حضرت مسیح نے کہا درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے، تم کو رید کی محبت کا دعویٰ ہے، مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو کون تمہارے دعوی کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعوی دار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں، مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی، اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے،

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران) اگر تم کو خدا سے محبت ہے، تو میری پیروی کرو، کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔

طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے،

ان اللہ یحب المحسنین (مائدہ) خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،

ان اللہ یحب التوابین (بقرہ)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
ان اللہ یحب المتوکلین (آل عمران)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
ان اللہ یحب المقسطین (مائدہ)	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔
ان اللہ یحب المتقین (توبہ)	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔
ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ (صف)	خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں۔
واللہ یحب الصابرین (آل عمران)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
واللہ یحب المتطہرین (توبہ)	اور خدا پاک وصاف لوگوں کو پیار کرتا ہے،

دنیا کے عیش ومسرت، باغ وبہار، شادی وخوشی میں اگر کوئی خیال کا نٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش وسرور کو مکدر اور منغص بنا کر، بے فکری کی بہشت کو فکر وغم کی جہنم بنا دیتا ہے، تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے، پہلے کا نام حزن وغم ہے، اور دوسرے کا نام خوف ودہشت ہے، غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں، جو انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہے ہیں لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ وشیدا ہیں، ان کو بشارت ہے کہ ان کا چمنستانِ عیش اس خارزار سے پاک ہوگا،

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون (یونس)	ہاں خدا کے دوستوں کو نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے،

۔۔۔ محبت کا جو جذبہ بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے، اس کا نام رحم اور رحمت ہے، اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے، اس کی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے، اس کا نام رحمان و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے، وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو، اسی لیے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے، مجرم سے مجرم اور گنہ گار سے گنہ گار کو وہ نوازنے کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار ہے، گنہگاروں اور مجرموں کو وہ اپنے بندے کہہ کر تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے،

قل یا عبادی الذین اسرفوا	اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا
علیٰ انفسہم لا تقنطوا من	دے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، کہ
رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب	وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اللہ
جمیعاً انہ ہو الغفور الرحیم	یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے، کہ وہ
(زمر)	بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے،

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بشارت سناتے ہیں، تو کہتے ہیں،

ولا تکن من القانطین	ناامیدوں میں سے نہ ہو،

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے، کہ مرتبۂ خلت محبت سے مافوق ہے، جواب دیا۔

ومایقنط من رحمۃ ربہ الا القوم	اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا

الضالون۔ کوئی اور مایوس نہیں ہوتا،

خدا پر بندوں کی جانب سے کوئی پابندی عائد نہیں، مگر اس نے خود اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں، منجملہ ان کے ایک رحمت ہے، خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، وہ گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، وہ بدکاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، وہ قاہر ہے، وہ جبار ہے، وہ منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور ہے، رحمان و رحیم ہے، رؤف و عفو ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود بخود عائد کر لی ہے، اور اپنے اوپر اس کو فرض گردان لیا ہے۔

کتب علی نفسہ الرحمۃ۔ اللہ نے از خود اپنے اوپر مہربانی کرنے کو لازم کر لیا ہے۔ (انعام)

خاص قاصد کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ، اور تسلی کا یہ پیام دو کہ اس کا باب رحمت ہر وقت کھلا ہے،

واذا جاءك الذين يؤمنون بآيتنا فقل سلامٌ عليكم كتب ربكم على نفسه الرحمة انه من عمل منكم سوءً بجهالة ثم تاب من بعده واصلح فانه غفورٌ رحيم۔

اے پیغمبر! جب تیرے پاس وہ آئیں، جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں، تو ان کو کہہ کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے، کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی

برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور

نیک بنے تو بے شک وہ بخشنے والا اور رحم

کرنے والا ہے۔ (انعام)

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں، ورحمتی وسعت کل شئی (اعراف) اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہے۔

بخاری وترمذی وغیرہ صحیح حدیثوں میں ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا، تو اس نے اپنے دستِ خاص سے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کرلی، ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ" اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے، تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا، اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا" یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے۔

بارگاہِ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے، کہ" اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہوگے اور مجھ سے آس لگائے رہوگے، میں تمہیں بخشتا رہوں گا، خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی چاہو، تو میں معاف کردوں خواہ تم میں کچھ ہی عیب ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے

بھری ہو، پھر تم ہمارے پاس آؤ، اور میرا کسی کو شریک نہ بناتے ہو، تو میں بھی تمہارے پاس پوری زمین بھر مغفرت لے کر تمہارے پاس آؤں،" کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے،

حضرت ابوایوب صحابی کی وفات کا وقت جب قریب آیا، تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا اور مخلوق پیدا کرتا، جو گناہ کرتی کہ وہ اس کو بخشتا، یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لیے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے، کہ نکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں، مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے،

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں، جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں، اولادوں میں میل ملاپ اور رسم و محبت ہے، اور جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے یہ مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرمایۂ محبت کا کتنا حصہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کیے، ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے وہ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں، باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں[1]" اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں۔ اور کس نے گنہگار انسانوں کے

---

[1] یہ حدیثیں دوسری صحیح کتابوں میں بھی ہیں، مگر پیش نظر اس وقت جامع ترمذی ابواب الدعوات ہے،

مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے، کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہ نے تنگ آکر کہا "خداوندا! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر، کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے" رحمۃ للعلمین کو صحابہ کی یہ بات ناپسند آئی، فرمایا "اس پر لعنت نہ کرو، کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے"

ابن ماجہ میں ہے کہ مدینہ میں ایک غریب مسلمان نے وفات پائی، اس کا غم کس نے کیا ہوگا؟ ہاں اس دل نے جو دنیا کا غمخوار بن کر آیا تھا، اس کے فراق ظاہری سے چہرۂ مبارک پر اندوہ وملال کے آثار تھے، صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے، فرمایا "ہاں کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت تھی" اس غریب میں اس محبت کا اثر یہ تھا، کہ وہ ہمیشہ زور زور سے قرآن پڑھا کرتا تھا، صحیحین میں حضرت عائشہ رضی سے روایت ہے، کہ آپ نے ایک صاحب کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا تھا، وہ جب نماز پڑھاتے تھے، تو ہر نماز میں ہر سورہ کے آخر میں قل ہو اللہ ضرور پڑھتے تھے، جب سفر سے یہ جماعت لوٹ کر آئی، تو خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اس نے یہ واقعہ عرض کیا، فرمایا ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، لوگوں نے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: کہ یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت بیان ہے، تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے، فرمایا "ان کو بشارت دو کہ وہ رحم والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے"

یہ بشارت اسلام کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے، اس قسم کا دوسرا واقعہ ایک اور انصاری کا ہے، وہ قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے، وہ ہر رکعت میں پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے۔ پھر دوسری سورہ پڑھتے تھے، ان کے مقتدیوں نے ان پر اعتراض کیا، انھوں نے کہا، تمہاری امامت چھوڑنے کو تیار ہوں، مگر اس سورہ کا ہر رکعت میں پڑھنا نہیں چھوڑ سکتا، بالآخر یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، آپؐ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی، عرض کی یا رسول اللہ! اس میں رحم والے کی صفت ہے جو مجھے محبوب ہے، فرمایا یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی۔

(بخاری کتاب الصلوٰۃ)

المرء مع من احب | صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے، کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا، کہ "یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی،" فرمایا "تم نے اس کے لیے کیا سامان رکھا ہے"! نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا، نہ روزوں کا، اور نہ صدقات و خیرات کا بڑا ذخیرہ ہے، جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسول کی محبت کا ہے اور بس" فرمایا "تو انسان جس سے محبت کرے گا، وہ اسی کے ساتھ رہے گا، صحابہؓ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا، جب خدا کسی بندے کو چاہتا ہے تو فرشتۂ خاص جبریل سے اس کا تذکرہ کرتا ہے، کہ میں فلاں بندے کو پیار کرتا ہوں،

تو جبریل بھی اس کو پیار کرتے ہیں، اور آسمان میں پکار دیتے ہیں، کہ خدا اس بندہ کو پیار کرتا ہے، تم بھی پیار کرو، تو آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں، اور پھر زمین میں اس کو ہر دل عزیزی اور حسن قبول حاصل ہوتا ہے،

ترمذی میں ہے، کہ حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں، کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرا بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو اس قدر ڈھونڈتا ہے، کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، یہاں تک کہ میں اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے، وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے"

امام بزار نے مسند میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت نقل کی ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے، یہ وہ لوگ ہیں، جن کو خدا سے محبت ہے، اور جن کو خدا پیار کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے ہیں، اور بری باتوں سے روکتے ہیں" الخ

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ آپؐ نے فرمایا "لوگو! خدا سے محبت کرو، کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے، اور خدا کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو، اور میری محبت کے سبب میرے اہل بیت سے محبت کرو،

جو کچھ اسلام کی تعلیم تھی، وہ پیغمبر اسلام کی عملی زندگی تھی،

- عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب "حبیب خدا" ہے، دیکھو کہ حبیب و محبوب میں خلت اور محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں، آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں میں اور خلوت کی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے اور کیا مانگتے تھے، کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے، امام احمد اور بزار نے مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں، اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبت الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے، انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے، لیکن محبوبِ خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں، دعا فرماتے تھے، خداوندا! [illegible]

اسئلك حبك وحب من يحبك و [illegible] — میں تیری محبت مانگتا ہوں، اور جو تجھ سے
حب عمل يقربني الى حبك [illegible] — محبت کرتا ہے اس کی محبت اور اس کام کی
(احمد، ترمذی، حاکم) [illegible] — محبت جو تیری محبت سے قریب کر دے،
اللهم اجعل حبك احب الي من [illegible] — الٰہی! تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے
نفسي واهلي ومن الماء البارد [illegible] — اہل وعیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ
(ترمذی، حاکم) [illegible] — میری نظر میں محبوب بنا [illegible]

[illegible] عرب میں ٹھنڈا پانی، دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے، لیکن حضورؐ کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں سیر ہوتی تھی، وہ صرف محبت الٰہی ہی کا زلال خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا، عام انسان روٹی

سے جیتے ہیں، مگر ایک عاشق الٰہی (مسیحؑ) کا قول ہے کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا"، پھر وہ کون روٹی ہے، جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا، حضورؐ دعا فرماتے ہیں۔

اللھم ارزقنی حبک وحب من ینفعنی من حبک۔ (ترمذی) خداوندا! تو مجھے اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہے مجھے روزی کر۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے، مگر جانتے ہو کہ اس راہ کی آخری منزل کیا ہے۔ صحیحین میں ہے،

من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما۔ یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے، تمام ماسوا کی محبتیں ہیچ ہوجائیں،

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں، کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور ان سے اسی طرح محبت کریں، اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے، اس لیے وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ اسلام محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے محروم ہے، لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، کہ یہ نہیں بلکہ اسلام کی بلندیٔ نظر اور محبت کا علوے معیار ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار کو پست تر اور فروتر سمجھتا ہے، قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جاچکی ہے،

واذکروا اللہ کذکرکم آباءکم او اشد ذکرا۔ تم خدا کو اس طرح یاد کرو، جس طرح اپنے باپ

ذکراً (بقرہ - ۲۵) ... یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بہت زیادہ)

احادیث سے ہمارا یہ دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے، جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے، اپنی جان بچا رہا ہے، بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے، اسی حال میں ایک عورت آتی ہے، اس میدانِ حشر میں اس کا بچہ گم ہو گیا ہے، محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے، کہ جو بچہ بھی اس کو سامنے نظر آجاتا ہے، بچہ کے جوشِ محبت میں اس کو چھاتی سے لگا لیتی ہے، اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے: رحمۃ للعلمینؐ کی نظر پڑتی ہے، صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں "کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے" لوگوں نے عرض کی "ہرگز نہیں" فرمایا "تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے بہت زیادہ محبت ہے" (صحیح بخاری باب رحمۃ الولد)

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے، اور عرض کرتی ہے "یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے، کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے" فرمایا "ہاں! بے شک اس سے زیادہ ہے"۔ بولی "تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کریگی"۔ یہ سن کر فرطِ اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا "خدا اس بندہ کو عذاب دیتا ہے، جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے" (سنن نسائی باب ایرجی من الرحمۃ)

آپؐ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی چادر میں ایک پرند کو مع اس کے

بچوں کو باندھ کر لاتے ہیں، اور واقعہ عرض کرتے ہیں کہ "یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پہ منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً آکر میرے ہاتھ پر بچوں پر گر پڑی" ارشاد ہوا "کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اُس ذات کی جس نے حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے، (مشکوٰۃ، بحوالہ ابوداؤد باب رحمۃ اللہ)

ربانی خم خانۂ عشق کا آخری ہوشمند سرشار، ریاض محبت کی بہار جاوداں کا آخری نغمہ خواں، عندلیب، نظارۂ جمال حقیقت کا پہلا مشتاق، مستور ازل کے چہرۂ زیر نقاب کا پہلا بندکشا زندگی کے آخری گھنٹوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے جل رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلانِ خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جاں نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضورؐ کی طرف لگی ہیں، نبوت کے آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعۃً لب مبارک وا ہوتے ہیں، تو یہ آواز آتی ہے، لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برارت کرتا ہوں، کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، میرا پیار صرف ایک ہی ہے، وہی جس نے ابراہیم کو اپنا پیارا بنایا" یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالت نزع میں زبانِ مبارک پر یہ کلمہ تھا " خداوندا! "بہترین رفیق"

(صحیح بخاری وفات)

پروفیسر نکلسن ایک دفعہ غور سے ان صفحات کو پڑھ لیں، یہ سچ ہے کہ اسلام رحمتِ الٰہی کے ساتھ غضبِ الٰہی کا بھی معتقد ہے، مگر یہ جانتے ہو کہ اسلام کے عقیدہ میں اس کی رحمت و غضب کا باہمی توازن کیا ہے، خدا فرماتا ہے،

رحمتی سبقت غضبی (بخاری)　　میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے،

صلائے عام | اے ربانی عشق و محبت کے طلبگارو! اگر واقعی تمہارے دل فانی محبت سے ہٹ کر کسی باقی کی محبت کے خواہش مند ہیں، اگر درحقیقت تمہیں ازلی وابدی محبوب کی تلاش ہے، اگر دراصل تمہارا جسم نہیں، بلکہ تمہاری روح کسی کی محبت کی سرشاری کے لیے بے تاب ہے تو آؤ، کہ یہ دولت صرف اسلام کے آستانہ پر بٹتی ہے، اور اسی کے خزانہ سے ملتی ہے،

اس نے اس کے حصول کا طریقہ بھی بتا دیا ہے،

ان الذین آمنوا وعملوا الصلحت سیجعل　　جو لوگ ایمان لائے، اور نیک کام کیے، عنقریب

لھم الرحمان ودا (مریم)　　خدا ان کے لیے محبت پیدا کر دے گا۔

پس "ایمان" اور "عمل صالح" یہی دو چیزیں ہیں، جن سے محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے، یا محبت الٰہی کے وجود کے اسباب ہیں، ہمارا ایمان مستحکم ہو اور اعمال نیک ہوں تو اس دولت کے ہم مستحق قرار پائیں،

(معارف ۲۳ جولائی ۱۹۲۳ء)

القرآن والفلسفۃ الجدیدہ

اسلام سے پہلے تمام اہل مذاہب کا یہ مسلمہ اصول تھا، کہ مذہب میں عقل کو کیا دخل، سیکڑوں علماء اور موجدین صرف اس لیے قتل کیے گئے، کہ اُن کی علمی کوشش کے نتائج مذہبی تعلیمات کے مخالف تھے، وہ لوگ بھی شہید نہ کیے گئے۔ اور نگاہ حقارت سے نہ دیکھے گئے، جن کے علمی خیالات یا علمی ایجادیں گو تعلیمات مذہبی کی مخالف نہ تھیں، مگر وہ ایسی چیزیں تھیں، جن کا پتہ اُن کی مذہبی کتابوں سے نہیں ملتا تھا۔

اسلام دنیا میں پہلا مذہب ہے، جس نے اپنے مسائل کی بنیاد عقل پر رکھی، قرآن مجید کی طرز تعلیم دیکھو، کہ اس نے اپنے پیروؤں کو جہاں کسی مسئلہ کی تلقین کرنی چاہی ہے، اس کے ساتھ اس کی دلیل بھی بیان کر دی۔ بے تتبع سے ایسی بہت سی حدیثیں اور آیتیں مل سکتی ہیں، جن میں یہ صاف صاف کہا گیا ہے، کہ مذہب کو عقل سے ماننا چاہیے۔

لیہلک من ھلک عن بینۃ ویحییٰ من حی عن بینۃ (انفال)	چاہیے کہ مرے تو وہ بھی دلیل سے اور جیے تو وہ بھی دلیل سے۔
لا تقف ما لیس لک بہ علم،	جس بات کو تم جانتے اس کے پیچھے نہ ہولیا کرو
قد جاءکم بصائر من ربکم (انعام)	خدا کی طرف سے دلیلیں تمہارے پاس آئیں،

افلا یتدبرون القرآن	کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے،
عن[۱] عائشۃ عن جدامۃ امۃ بنت وھب الاسدیۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ھممت ان انھکم عن الغیل فنظرت فاذا فارس والروم یغیلون ولا یضر اولادھم۔	حضرت عائشہؓ ایک صحابیہ سے روایت کرتی ہیں، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے یہ چاہا تھا کہ تم لوگوں کو زمانۂ حمل میں مقاربت کرنے سے روک دوں مگر میں نے جب رومیوں اور فارسیوں کو دیکھا کہ وہ ایسا کرتے ہیں اور اُن کی اولاد کو اس سے ضرر نہیں پہنچا اس لیے نہیں روکا،

اس حدیث سے اس بات پر بخوبی روشنی پڑتی ہے کہ احکام اسلام تمامتر عقلی مصالح پر مبنی ہیں، اسلام کے متعلق یہ آج کوئی جدید خیال نہیں ہے جو زمانۂ حال کے مقتضائے مذاق کے موافق پیدا ہوگیا ہو، بلکہ یہ خیال اُس وقت سے ہے جب سے اسلام کی زندگی شروع ہوتی ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب، حجۃ اللہ[۲] البالغہ میں ان لوگوں کا جواب دیتے ہوئے کہ احکام اسلام کے لیے عقلی مصالح جب سلف نے نہیں مدون کیے، تو اب کیونکر کیا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں،

---

[۱] شرح معانی الآثار للامام الطحاوی جلد ثانی ص ۲۷، اور بخاری جلد اول

[۲] حجۃ اللہ البالغہ ص ۷ مطبوعہ مصر،

قلنا لا یضر ناغد مرتب دین	ہم کہتے ہیں کہ سلف کا اس علم کو نہ مدون کرنا
السلف ایاہ بعد ما مھد النبی	کچھ ہمیں مضر نہیں ہے جبکہ خود رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اصولہ و	صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اصول و فروع
فروعہ واقتفی اثرہ فقھاء	ممہد فرما دیے ہیں اور آپ کے بعد فقہائے
الصحابۃ کامیری المومنین عمر	صحابہ نے بھی اس کی تقلید کی جیسے امیر المومنین
وعلی وزید وابن عباس وعائشہ	حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ اور جیسے حضرت زید بن ثابتؓ
وغیرھم رضی اللہ عنھم بحثوا عنہ	اور حضرت عائشہؓ وغیرہم نے اس پر بحثیں کی ہیں،
وابرزوا وجوھاً منہ ثم لم یزل	اور بہت سی باتیں ظاہر کیں، پھر اس کے
علماء الدین وسلاک سبیل الیقین	بعد بھی ہمیشہ علما رحسب استعداد علمی اس کو
یظھرون ما یحتاجون مما جمع اللہ	ظاہر کرتے رہے،
فی صدورھم۔	

صحابہؓ کے بعد جب پہلی صدی کا آفتاب ڈوب رہا تھا، مسلمانوں کے ایک فرقہ نے اپنی علمی زندگی کا مقصد ہی تطابقِ عقل و نقل قرار دیا تھا، اس کے بعد بھی علماء نے اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں تالیف کیں، خاص اسی خیال کو مدنظر رکھ کر ائمۂ دین نے قرآن کی تفسیریں کیں، غالباً اس موضوع پر سب سے پہلے جو تفسیر لکھی گئی ہے، وہ ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر ہے جس کا ذکر تفسیر کبیر رازی میں بار بار آتا ہے، اور اکثر جگہ بلا قصد امام کے قلم سے اس کی تعریف نکل جاتی ہے، مدت سے اس تفسیر کا

ایک نسخہ بھی صفحۂ عالم پر موجود نہیں ہے، تفسیر کشف الاسرار اور شیخ محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ شاگرد امام غزالی کی تفسیر بھی اسی عنوان کے ذیل میں ہے، مگر یہ دونوں کتابیں تکلفاتِ تاویل سے بالکل لبریز ہیں،

اس باب میں سب سے لطیف تصنیف امام رازی کی تفسیر کبیر ہے، گو اس کے صفحات بھی تطابق عقل ونقل سے زیادہ اشاعرہ اور معتزلہ کی خانہ جنگیوں کی نذر ہیں، مگر خیر جو کچھ بھی اس تطابق کے متعلق لکھا ہے، فلسفۂ قدیم کے مقابلہ میں بہت ہی پاکیزہ لکھا ہے،

اب جب سے دنیا میں علومِ جدیدہ کا زور ہے، مسلمانوں میں غلغلہ برپا ہے، کہ قرآن کو سائنس کے حملہ سے بچایا جائے، سائنس نے مذہب کے ارکان متزلزل کر دیئے، اس کا جواب حضرت الاستاذ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی بیش بہا تالیف الکلام میں دیا ہے، ہم اس موقع پر اس کا اقتباس دیتے ہیں۔

"اب دیکھنا چاہیے کہ سائنس کو مذہب سے کیا تعلق ہے، سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتا ہے، مذہب کو ان سے مطلق سروکار نہیں، عناصر کس قدر ہیں، پانی کن چیزوں سے مرکب ہے، ہوا کا کیا وزن ہے؟ نور کی کیا رفتار ہے، زمین کے کتنے طبقات ہیں، یہ اور اس قسم کے مسائل، سائنس کے مسائل ہیں، مذہب کو ان سے کچھ سروکار نہیں، مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہے، وہ یہ ہیں، خدا موجود ہے یا نہیں، مرنے کے بعد اور کسی قسم کی زندگی ہے یا نہیں۔ خیر وشر یا نیکی و بدی کوئی چیز ہے

یا نہیں، ان میں سے کون سی چیز ہے، جس کو سائنس ہاتھ لگا سکتا ہے"[1]

قرآن میں جو مباحث ہیں، وہ اخلاقی، تمدنی اور سیاسی ہیں، یا وہ امور ہیں جن کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ اخلاق پر پڑتا ہے، اور ان کو سائنس سے تعلق نہیں،

ہاں ضمنی طور سے قرآن پاک میں سائنس کے جو مسائل آگئے ہیں، وہ خدا کے اظہارِ قدرت اور لطافتِ صنعت کے موقع پر ہیں، ہم ذیل میں نمبروار ان فلسفیانہ مباحث پر غور کرتے ہیں، کہ آیا وہ واقعی فلسفۂ جدیدہ کے مخالف ہیں،

۱۔ علم طبقات الارض (جیالوجی) کے ماہرین بیان کرتے ہیں، کہ موجودہ کائنات سے پہلے کوئی چیز موجود نہ تھی، انسان تھا نہ حیوان، نہ چاند تھا نہ سورج، دنیا کی کل کائنات ایتھر (ایتھر) تھی یعنی ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے ذرات جو ہوا سے بھی زیادہ لطیف ہیں، مدتوں کے بعد قدرت نے ان میں قانون قوتِ جذب و دفع (ٹراکشن) پیدا کیا۔ اور اس طرح جامد (سولڈ) سائل (لکوئیڈ) ہوائی (گیس) اجسام بنا کر سب سے پہلے اجرام سماوی (ہیولی باڈیز) کی تکوین کی، قرآن اس مسئلہ پر یوں روشنی ڈالتا ہے،

ثم استوی الی السماء وھی دخان	پھر خدا نے اجرام سماویہ کی طرف توجہ کی،
فقال لھا وللارض ایتیا طوعًا	اس حال میں کہ وہ دھواں تھے، تو کہا ان سے
او کرھًا قالتا اتینا طائعین۔	اور زمین سے کہ آؤ (ہستی میں) بخوشی یا بجبر
(فصلت۔۲)	بولے کہ ہم بخوشی آئے،

---

[1] الکلام ص ۸۔

کس دلآویز مکالمہ کی صورت میں نبی اے پاک نے ابتدائے آفرینش کا حال بیان کیا ہے، اور ایتھر کے بیان کرنے کے لیے (دھواں) دخان سے بڑھ کر اور کیا لفظ ہو سکتا ہے،

۲۔ علمائے طبقات الارض یہ بھی تسلیم کرتے ہیں، کہ عالم پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے، جس میں تمام کائنات ایک گرم اور روشن کرہ کی شکل میں تھی، پھر جتنے کرے عالم میں ہوئے اسی بڑے کرے سے ٹوٹ ٹوٹ کر بنے ہیں، ہماری یہ زمین بھی جس پر ہم آباد ہیں، اسی عظیم الشان کرہ کا ایک ٹکڑا تھی، جو اپنے کرہ سے ٹوٹ کر بنی ہے، جس وقت یہ زمین علیحدہ ہوئی تھی، اسی گرم اور روشن کرہ کی طرح یہ بھی گرم تھی، مگر رفتہ رفتہ سرد ہوتی گئی، اور پھر اس قابل ہوئی کہ اس پر آبادی ہو سکے، قرآن اس کا فلسفہ یوں ظاہر کرتا ہے،

اولم یری الذین کفروا ان السموٰت	کیا کفار نہیں جانتے کہ آسمان و زمین پہلے ایک
والارض کانتا رتقاً ففتقنٰھما،	گولا (کرہ) تھی، تو ہیں نے ان کو علیحدہ کیا،

چونکہ پہلے فلسفہ کا بہت کم صحیح حصہ دنیا کے سامنے موجود تھا، عموماً حکما کا خیال تھا، کہ آسمان میں خرق والتیام محال ہے، اس بنا پر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں عجیب عجیب باتیں لکھی ہیں،

بعضوں کا خیال ہے کہ آسمان اور زمین کے پھاڑنے کے یہ معنی ہیں کہ آسمان پھاڑ کر پانی برسایا، اور زمین پھاڑ کر سبزیاں اگائیں، ابومسلم اصفہانی کہتا ہے کہ

فتق مرادف ہے فطور کا، فطور پھاڑنے کو بھی کہتے ہیں، اور فطور کا ایجاد سے بھی استعارہ ہے، اس لیے فتق بھی یہاں ایجاد سے استعارہ ہے، اس لیے یہاں پھاڑنے کے معنی ہی نہیں، بلکہ ایجاد کے معنی ہیں، امام رازی اس آیت کے یہ معنی قرار دیتے ہیں، کہ یہ ظاہر ہے کہ آسمان و زمین پہلے معدوم محض تھے، اور فلسفۂ الٰہی کا یہ مسئلہ ہے کہ اشیائے معدوم محض میں آپس میں امتیاز نہیں ہوتا، تو اب اس آیت کے یہ معنی ہوئے کہ آسمان و زمین سب آپس میں حالت عدم میں گڈمڈ تھے، تو میں نے ان کو جب پیدا کیا تو وہ ایک دوسرے سے ممتاز ہو گئے۔

مگر یہ ظاہر ہے کہ ان مطالب میں تکلف برتا گیا ہے، پہلی تاویل کے موافق اوّل یہ کہ یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، کہ آسمان و زمین پہلے ایک کرہ تھا، دوسرے یہ کون تسلیم کرے گا، کہ پانی برستے وقت آسمان یا اجرام سماویہ میں شگاف پڑ جاتا ہے، ابومسلم کا قول بھی صحیح نہیں ہے، اول ہم یہی تسلیم نہیں کرتے کہ فطور ایجاد کے معنی میں مجازاً استعمال ہوتا ہے، بلکہ یہ لفظ ایجاد اور شق دونوں معنوں میں مشترک ہے، جیسا کہ کتب لغت کی شہادت ہماری تائید کرتی ہے، اس لیے فتق کو فطور کا مرادف مان کر ایجاد کے معنی میں قرار دینا صحیح نہیں ہے، دوسرے کچھ دیر کے لیے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے، کہ فطور ایجاد کے معنی میں بطور استعارہ کے مستعمل ہوتا ہے، تو یہ کس علم کا اصول ہے، کہ جب دو مرادف لفظوں میں سے ایک مجازاً دوسرے معنی میں مستعمل ہو جائے، تو دوسرے کا بھی اس معنی میں استعمال صحیح ہو،

امام رازی کی تاویل بھی ہمارے خیال میں درست نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ عدمات آپس میں ممتاز نہیں ہوتے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ آپس میں مخلوط بھی ہوں، کیونکہ معدومات امتیاز اور خلط دونوں سے پاک ہیں، اس لیے یہ کسی طور پر صحیح نہیں ہو سکتا کہ "آسمان اور زمین دونوں ایک کرہ تھے، تو ہیں نے ان کو الگ کیا"۔

ہم نے آیت کے جو معنی قرار دیے ہیں، وہی رائے بجنسہ حضرت ابن عباسؓ اور عظیم المرتبت تابعین کرام کی بھی ہے، جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سلف قرآن کے کس قدر صحیح معنی سمجھتے تھے، گو اس زمانہ کے حکما، اس رائے کو ایک سخت غلطی تصور کرتے ہوں گے، مگر سلف کا ایمان دیکھو کہ ہزار دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، اگر قرآن جس کا ناطق ہے وہ اسی پر یقین رکھتے تھے۔

احدھا ھو قول الحسن وقتادۃ وسعید بن جبیر ورواية عن عکرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنهم ان المعنی کانتا شیئا واحدا ملتزقین ففصل اللہ بینهما ورفع السماء الی حیث هی واقر الارض	حضرت حسنؒ، قتادہؒ، سعید بن جبیرؒ کا یہ قول ہے، جس کو عکرمہ نے اور عکرمہ حضرت ابن عباسؓ نے روایت کرتے ہیں، کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ آسمان اور زمین ایک چیز تھی، آپس میں ملی ہوئی تو پھر خدا نے ان دونوں کو علیحدہ کیا، اور آسمان کو بلند کیا، اور زمین کو اپنی جگہ پر رکھا۔

یہ مسلمہ مسئلہ ہے جو بطور مشاہدہ کے ثابت ہوچکا ہے کہ ہمارا ماہتاب بھی ہماری زمین کی طرح ذاتی روشنی نہیں رکھتا، بلکہ وہ اپنی روشنی آفتاب سے حاصل کرتا ہے، اور چونکہ جسم شفاف کا یہ اصول ہے، کہ وہ نور کے جتنے اجزاء حاصل کرتے ہیں، اتنے ہی اجزاء وہ بھی نشر کرتے ہیں، اس لیے ہمارا چاند آفتاب سے روشنی کے جتنے ذرات لیتا اتنے ہی وہ اپنے مقابل جسم کو دیتا بھی ہے، اس وجہ سے ہمارا چاند جب ہماری زمین کے سامنے ہوتا ہے، تو ہمیں روشن نظر آتا ہے، ورنہ وہ دراصل آفتاب کی طرح ذاتی روشنی نہیں رکھتا، قرآن اس مسئلہ پر یوں روشنی ڈالتا ہے:

وجعل الشمس ضیاءً والقمر نوراً۔ خدا نے آفتاب کو ضیاء (ذاتی روشنی) اور چاند کو نور (غیر ذاتی روشنی) بخشا۔

علماء لکھتے ہیں کہ ضیاء اور نور دو چیزیں ہیں، ذاتی روشنی کو ضیاء اور مستفاد کو نور کہتے ہیں[1]۔

۴۔ فلسفۂ جدیدہ نے ثابت کیا ہے کہ اجزائے مادہ فنا نہیں ہوتے، اور تم جس کو فنا کہتے ہو، وہ دراصل تفرق اجزاء ہے، ہم جب کہتے ہیں کہ فلاں چیز فنا ہوگئی، تو وہ دراصل فنا نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنی پہلی نوعی صورت کو چھوڑ کر دوسری صورت اختیار کرلیتی ہے، ہم نے جب پانی گرم کیا، اور اس کی حرارت درجۂ صفر سے ۱۰۱

[1] حاشیہ شرح چغمینی ص، شرح مواقف،

درجہ تک پہنچ جائے گی، تو پانی جوش سے اُڑ جائے گا، تو کیا واقعی اس کا پانی بیرونی فنا ہوگیا؟ نہیں بلکہ حرارت نے جو قوت دفع کو بڑھانے والی اور قوت اتصال کو کم کرنے والی ہے، اس کے اجزاء کو منتشر کر کے اس کو ہوا بنادیا، ایک آدمی مرگیا، اور وہ زیر زمین دفن کر دیا گیا، مدت کے بعد اگر ہم اس کی قبر کھودیں گے، تو اس کے جسم کا ایک عضو بھی نہ پائیں گے، تو کیا اس کے اجزاء معدوم محض ہوگئے؟ نہیں بلکہ منتشر ہوگئے، کچھ مٹی میں مل گئے، کچھ بخارات بن کر اڑ گئے، قرآن اس نکتہ کو یوں ادا کرتا ہے،

قد علمنا ما تنقص الارض منهم وعندنا کتاب حفیظ (ق)

زمین نے جو کچھ ان کے اجزاء کم کر دیئے ہیں، ہم ان کو جانتے ہیں اور ہمارے پاس محفوظ کتاب ہے،

پھر دوسری جگہ یوں فرماتا ہے،

فجعلناهم احادیث ومزقناهم کل ممزق (سبا - ۲)

ہم نے ان کو قصہ کہانی بنادیا، اور ہم نے ان کو چاک کر ڈالا

خدا نے موت کو اس آیت میں تمزق یعنی انتشار اجزاء سے تعبیر کیا،

۵۔ ہر زمانہ کے فلسفی اس پر متفق رہے ہیں، کہ عالم میں ایک عادی قانون جاری ہے جس کی وجہ سے عالم کے ہر واقعہ کی کڑی دوسرے سے لگی ہوئی ہے، واقعات میں آپس میں ایک ایسا زبردست سلسلہ علل و معلول پایا جاتا ہے، جو دنیا کے

برباد ہوئے بغیر ٹوٹ نہیں سکتا۔[1] قرآن اس کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے،

ولن تجد لسنة الله تبديلا — خدا کے قانون میں تبدیلی نہ پاؤ گے،

لن تجد لسنة الله تحويلا — تم خدا کے قانون میں تغیر نہ پاؤ گے۔

ان فی خلق السموٰت والارض — آسمان و زمین کی پیدائش اور شب و روز

واختلاف اللیل والنہار لآیات — کے انقلاب میں ان عقلمندوں کے لیے

لاولی الالباب الذین یذکرون — بہت سی دلیلیں ہیں، جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے

الله قیاما وقعودا وعلی جنوبھم — سوتے یاد کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کی

ویتفکرون فی خلق السموٰت — ساخت پر غور کرتے ہیں، اور کہتے ہیں،

والارض ربنا ما خلقت ھذا — خدایا! تو نے یہ چیزیں بے کار نہیں پیدا

باطلا (آل عمران) — کیں،

خود خدا نے پاک سبزہ اگنے کی علت پانی کو ٹھہراتا ہے، گو یہ علت خود اسی کے حکم سے کام کر رہی ہے،

وانزل من السماء ماء فاخرج بہ — خدا نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے

من الثمرات رزقا لکم۔ — ذریعہ سے تمہاری معیشت کے لیے پھل پیدا کیا۔

۶۔ علوم جدیدہ کے مطابق اگر زمین اور ہلکی ہو جاتی تو آفتاب کی قوت کشش سے

---

[1] خدا کی قدرت سے اس کا توڑنا باہر نہیں ہے پر اس کی عادت نہیں کہ توڑ دے، نیز یہ تمام علل و معلول کا اس قدر مناسب سلسلہ اسی کی کامل قدرت کا کرشمہ ہے،

کھنچ کر زمین آفتاب سے جاملتی، یا آفتاب سے قریب ہو جاتی، اور یہ دونوں خوفناک صورتیں ایسی تھیں کہ جن کی وجہ سے انسان کبھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے بڑے بڑے پہاڑوں کا زمین میں اضافہ کر کے زمین میں ثقل کو جو کشش کا ایک نتیجہ ہے زیادہ کر دیا، قرآن اس کو یوں بتاتا ہے،

والقینا فیھا رواسی — ہم نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں۔

فجعلنا فی الارض رواسی ان — تو زمین میں ہم نے پہاڑوں کے کھونٹے نصب

تمید بھم — کر دیئے تاکہ وہ ان کو لے کر مائل نہ ہو جائے (حرکت نہ کر جائے)

۷۔ فلاسفۂ حال بڑے زور سے یہ دعویٰ کرتے ہیں، کہ احساسات و ادراکات (فیلنگ) سے صرف انسان ہی فیضیاب نہیں ہے بلکہ حیوانات بھی اس فیض سے محروم نہیں ہیں، حیوان بھی ہماری طرح ادراک و شعور رکھتے ہیں، اور نفع و نقصان کو خوب سمجھتے ہیں، وہ بھی مقدمات کو ترتیب دے کر ایک نتیجہ پیدا کرتے ہیں، بلکہ بعض حیوان کے حاسے انسان سے زیادہ مدرک اور تیز ہیں، چیونٹی ہم سے زیادہ قوت شامہ رکھتی ہے، چیل کی قوت باصرہ انسان سے بدرجہا زیادہ ہے، کتے کی قوت سامعہ ہم سے قوی ہے، وہ اکثر زمین پر کان رکھ کر ذرات ارض کے صدمہ کو محسوس کر کے دور کی آوازیں سُن لیتا ہے، بعض حیوانات ایسی ایسی صنعتیں کرتے ہیں، جو ہرگز کسی بے عقل کے بس کا کام نہیں، ذرا مکڑے کے جالے کو غور کرو، اس کے باریک

تار کیونکر تیار ہو گئے، اور پھر اس جالے کی وقت صنعت کو دیکھو، اسی طرح ہر جانور کے اعمال پر نگاہ غور ڈالو تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کا کوئی کام بدسلیقگی پر دال نہیں ہوتا بلکہ ان کی بعض صنعتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کی مثال ہم انسان نہیں بنا سکتے، شہد کی مکھیاں متمدن انسان کی طرح اپنا ایک بادشاہ منتخب کرتی ہیں جس کی اطاعت اپنا فرض جانتی ہیں، ناتوان حیوانات درندوں سے کیوں ڈرتے ہیں، اگر ہماری طرح مقدمات ترتیب دے کر یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ یہ ان کو تکلیف پہنچائے گا، اور جو تکلیف پہنچائے اس سے ڈرنا چاہیے، اس لیے اس سے ڈرنا چاہیے۔

ان وجوہ سے فلاسفہ عالی کا یہ دعویٰ کرنا کہ حیوان بھی ہماری طرح ادراک وشعور کا جوہر رکھتے ہیں، بیجا نہیں، قرآن پاک اس مسئلہ کی یوں وضاحت کرتا ہے،

انّ اللہ یُسبّح لہ من فی السمٰوٰت ہر جاندار جو آسمان اور زمین میں ہے اور

ومن فی الارض والطیر صافات صف بصف اڑنے والے پرند، خدا کی تسبیح

کل قد علم صلاتہ وتسبیحہ واللہ کرتے ہیں، ہر ایک اپنی تسبیح ونماز جانتا ہے،

علیم بما یفعلون اور خدا ان کے اعمال سے واقف ہے۔

وما من دابۃ فی الارض ولا طائر نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین پر اور نہ کوئی

یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم پرندہ جو اپنے بازوؤں پر اڑتا ہے لیکن وہ لوگ

بھی تمہاری طرح ہیں،

علمائے ہیئت (اسٹرانومی) کہتے ہیں، کہ آفتاب اپنے محور (ایکسیس) پر گردش

کرتا ہے، الشمس والقمر بحسبان سے بھی یہ اشارہ ہوتا ہے، کہ آفتاب ٹھیک چکی کی طرح اپنے دورے پورے کر رہا ہے، قرآن مجید کی ایک دوسری آیت بھی اس پر دال ہے،

والشمس تجری لمستقر لها ذلك	آفتاب اپنی جگہ پر حرکت کر رہا ہے، یہ ایک
تقدیر العزیز العلیم ۔ (یٰسین۔۳)	باقدرت دانا کا اندازہ ہے،

۹۔ علم نباتات (بوٹانی) کے علماء کو اس پر بڑا ناز ہے کہ مدتوں کی جانفشانی کے بعد انھوں نے یہ معلوم کیا ہے، کہ انسان کی طرح نباتات بھی ایک قسم کا ادراک رکھتے ہیں، ان کے جوڑے ہیں، یہاں تک ان کا دعویٰ ہے کہ وہ تمام باتیں اُن میں موجود ہیں، جو ایک ذی روح میں ہونا چاہئیں، وہ ہماری طرح اپنی جڑوں کی مدد سے گردوپیش کے مادہ (میٹر) سے اپنی غذا کھاتے ہیں اور اپنے باریک ریشوں کے ذریعہ سے عرق، حیوانی خون کی طرح اپنے تمام اعضا میں پہنچاتے ہیں، اپنی پتیوں کی وساطت سے ہماری طرح ہوا میں سانس لیتے ہیں، بعض درخت ایسے بھی ہیں، جو صرف ہاتھ لگ جانے سے مرجھا جاتے ہیں، ایسے درخت بھی ہیں، جن کے اوپر کا سر کاٹ دیا جائے، تو وہ مقتول الراس انسان کی طرح اپنی زندگی کے دن ختم کرلیں گے ایسے درختوں کو انگریزی میں پام کہتے ہیں: (جیسے کھجور، تاڑ، ناریل) بعض بعض درخت ایسے بھی دریافت ہوئے ہیں، کہ جب تک ان کے نر و مادہ میں ایک خاص اتصال نہ پیدا کیا جائے، وہ بارآور نہیں ہوتے، چنانچہ عرب میں خرما کے درخت

جب تک آپس میں نر و مادہ سے ملائے نہیں جاتے، کھجوریں نہیں ہوتیں، ایسی زوجیت اور درختوں میں بھی پائی گئی ہے، قرآن اس مسئلہ کو یوں ظاہر کرتا ہے،

سبحان الذی خلق الازواج کلھا	پاک ہے وہ خدا جس نے ہر چیز کو جوڑا پیدا
مما تنبت الارض ومن انفسھم	کیا ہے، پودوں اور درختوں کو اور خود تم کو
ومما لا یعلمون۔ (یٰسین۔ ۳)	اور ان چیزوں کو جن کو تم نہیں جانتے۔

۱۰۔ تحقیقاتِ جدیدہ کے پہلے بار بار یہ شبہہ دلوں میں پیدا ہوتا تھا کہ خدا تو اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے،

الذی خلق لکم ما فی الارض	وہ خدا جس نے دنیا کی تمام چیزیں تمہارے
جمیعًا	نفع کے لیے پیدا کیں،

اور حال یہ ہے کہ دنیا کی بہت سی چیزیں انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر ہیں، مگر تحقیق جدید نے دنیا کے بہت سے راز فاش کر دیئے، اور بتایا کہ ہم کیونکر خدا کے خلیفہ بن کر ان کو مسخر کر سکتے ہیں، اس نے ہوا کو تھاما، بجلی کو پکڑا، بے جان چیزوں سے وہ کام لیا، جو جاندار نہیں کر سکتے، یہ دھوپ جس کی نسبت ہم خیال کرتے ہیں، کہ بجز اس کے کہ اشیاء میں نشو و نما کی قوت پیدا کرے، اور موسم سرما میں غربا کے لیے آتشدان بنے یا ہماری آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت پیدا کرے، ہمارے اور کس کام آسکتی ہے؟ مگر امریکہ میں دھوپ کی حرارت کو مجتمع کرکے وہ کام نکالے جاتے ہیں، جو کوئلے یا گیس سے نکل سکتے ہیں، اور اس کے بل پر

ان پیشِ نظر انجنوں کی طرح، دھوپ کے انجن چلائے جاتے ہیں۔

اگر انسان کی اَن تھک کوششیں یوں ہی جاری رہیں، تو قریب ہے کہ انسان فطرت کے بہت سے اور پوشیدہ اسرار جان لے اور پھر اسے معلوم ہو جائے گا، کہ اسلام کی آسمانی کتاب صحیفۂ فطرت کے کہاں تک مطابق ہے۔

حکمت و شرع دریں جا بہم آمیختہ اند   نمک باده، دریں میکده یار افتاد است

عقل را نیست سرِ عربده اینجا با نقل   پنبہ را آتشی اینجا بشرار افتاد است

(الندوہ، جولائی ۱۹۰۶ء)

مسئلۂ ارتقا اور قرآنِ مجید

مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا موجود ہے، جو مسئلۂ ارتقار کو نہ صرف صحیح سمجھتا ہے، بلکہ اس مسئلہ کی صحت کا اسکو اس درجہ اعتقاد ہے، کہ وہ کہتا ہے کہ جب قرآن مجید مسئلۂ ارتقار کا منکر ہے، تو یہ کون مانے گا، کہ قرآن پاک جدید فلسفہ کے بالکل مطابق ہے، یورپ کے کل علمائے طبیعیات بھی اس گروہ کے ہم زبان ہیں، یہ ایک دوسری بحث ہے کہ قرآن مجید کی صحت کا معیار فلسفیانہ تحقیقات قرار دی جا سکتی ہیں یا نہیں، لیکن اس اصول کو مان کر، اس شبہ کو رفع کرنے کے صرف دو طریقے ہو سکتے ہیں،

(۱) مسئلۂ ارتقا خود ثابت نہیں،

(۲) اگر مسئلۂ ارتقار ثابت ہے تو قرآن مجید اس کا منکر نہیں،

ہم مذکورۂ بالا شبہ کے رفع کرنے کے لیے علی الترتیب دونوں طریقوں سے کام لیتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مسئلۂ ارتقار گو بجائے خود نہایت صحیح ہو، مگر اس کے جو دلائل ہمارے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، وہ اس درجہ کمزور ہیں، کہ مسئلۂ ارتقا کا مخالف بجائے اس کے کہ ان کی تردید کی زحمت اٹھائے، صرف ان دلائل کو

منظر عام پر پیش کر دینا ہی اپنی کامیابی سمجھتا ہے، ناظرین خود دیکھ لیں، کہ یہ دلیلیں مسئلہ ارتقاء کی صحت کا کہاں تک یقین دلاتی ہیں،

ڈارون نے "ڈیسنٹ آف مین فام" اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے اس مسئلہ کے ثبوت کے دہ دلائل لکھے ہیں، جن کے اعتماد پر وہ یہ کہتا ہے کہ دنیا کی تمام مخلوق اصل فطرت میں ایک تھی جس سے ترقی کر کے یہ مختلف نوعیں پیدا ہوئیں، اور انسان اس فطری رفتار کا آخری مرحلہ ہے، ہم ان تمام دلائل کو ترتیب وار ذکر کرتے ہیں،

(۱) جسمانی مشابہت، انسان کا جسم حیوانات کے جسم کے بالکل مشابہ ہے، پٹھے، اعصاب، اعضائے داخلی، دماغ، انسان کے یہ سب اعضاء اور حیوانات مثلاً بندر، چمگادڑ، گاد بجری کے بالکل مشابہ ہیں،

(۲) تشابہ امراض، انسان جس قسم کے وبائی اور متعدی امراض میں مبتلا ہوتا ہے، عموماً اور حیوانات بھی ان میں مبتلا ہوتے ہیں، مثلاً چیچک، ہیضہ، وغیرہ متعدی بیماریاں جیوانوں میں بھی پیدا ہوتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان حیوانات کے بالکل مشابہ ہے، خصوصاً بندر سے، یہ سن کر تعجب ہوگا، کہ انسان کی طرح بندروں کو بھی زکام، بخار، مرگی، آنتوں کی سوزش ہوتی ہے۔ اور ان امراض میں جو دوائیں انسان کو مفید ہیں، وہی بندروں کو بھی مفید پڑتی ہیں،

(۳) تشابہ ذوق، بندروں کا ذوق بالکل انسانوں کی طرح ہے، چائے، قہوہ،

اشیائے مسکرات بندروں کے مرغوبِ طبع ہیں، اوران مسکرات سے انہیں بھی انسانوں کی طرح نشہ ہوتا ہے، یہ اتحاد ذوق اتحادِ فطرت کی خبر دیتا ہے،

(۴) تشابہ طبعی، انسان اوران تمام حیوانات میں جو دودھ دیتے ہیں، بہت سے طبعی اور فطری اشتراکات بھی ہیں مثلاً قانون تناسل، حمل، وضع حمل وغیرہ، میں،

(۵) تشابہ جنین، مسئلہ ارتقاء کے مثبت دلائل میں تشابہ جنین کی دلیل سب سے زیادہ مستحکم سمجھی جاتی ہے، تشابہ جنین کی تفصیل یہ ہے کہ انسان اورکل حیوانات کی پیدائش دراصل نہایت چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے ہوتی ہے، یہ کیڑے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں، کہ ان کا قطر ایک رتی کے ایک سو بیسویں حصہ سے زائد نہیں ہوتا، اس حالت میں بھی انسانی جنین کے کیڑے حیوانی جنین کے کیڑوں کے بالکل مشابہ ہوتے ہیں، جنین انسان اپنے ابتدائی مراحل میں اُن حیوانات کے بالکل مشابہ ہوتا ہے جن کی پیٹھ میں ریڑھ کی ہڈیاں ہوتی ہیں، یہاں پہنچ کر انسان اورعام حیوانات کے جنین میں امتیاز شروع ہوتا ہے، اور ہاتھ پانوں یا پرندوں کے بازو یعنی اطراف کے اعضا کی تکوین ہوتی ہے، مگر ابتدائً انسان اورحیوان کے اعضائے اطراف میں بھی ایک ذرہ اختلاف نہیں ہوتا، مگر پھر اختلاف شروع ہوجاتا ہے، انسان کا جنین کتے سے اپنے آخری مراحل میں ممتاز ہوتا ہے، اورسب کے بعد بندر سے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ انسان اورتمام حیوانات پہلے ایک تھے، مگر ترقی کے مختلف مدارج نے مختلف نوعیں پیدا کردیں،

(۶) غیر مفید اعضاء مسئلۂ ارتقاء کی بحث میں یہ بھی ایک غزوۃ الوثقیٰ دلیل ہے، کوئی حیوان خواہ وہ انسان ہو، یا کتا، بعض غیر مفید اعضاء سے خالی نہیں، مثلاً مردوں کی چھاتی کے نشان، کان کا ظاہری حصہ، سر کی کھال کے عضلات، کان کے عضلات وغیرہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اعضاء انسان کے پچھلے تاریک عہد کی یادگار ہیں، جن سے گو اس وقت انسان کو کوئی فائدہ نہیں، مگر یہ پہلے مفید ہوں گے، مثلاً جلد اور کان کے عضلات سے انسان کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا، نہ کان کے عضلات اس وقت کان کو ہلا سکتے ہیں، اور نہ جلد کے عضلات جلد میں کوئی حرکت پیدا کر سکتے ہیں، مگر جب انسان حیوان ہوگا، تو یہ عضلات کان اور جلد کو حرکت دیتے تھے۔ اور اب تک یہ غیر مفید عضلات انسان کے پاس بطور وراثت کے موجود ہیں،

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر مسئلۂ ارتقاء کے اعتقاد کے لیے ہم سے اصرار کیا جاتا ہے، ہر ایک دلیل کو غور سے پڑھو، اور دیکھو کہ کیا قلب کو اس سے اطمینان پیدا ہوتا ہے، اور شکوک و شبہات کے حملوں سے یہ محفوظ ہے، افسوس ہے کہو گے، کہ "نہیں" پھر ایسے غلط مسئلہ کی قرآن کیونکر تائید کر سکتا ہے، لیکن بعض ہمارے نوجوان دوستوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ یورپ کی ہر آواز کو وحی سمجھتے ہیں، حالانکہ خود ڈارون اپنی تھیوری کو جس کو ۱۸۵۹ء میں اس نے ظاہر کیا تھا، ایک ظنی مسئلہ کہتا ہے،

اب ہم مسئلہ کے دوسرے پہلو کی طرف رخ کرتے ہیں، کہ اگر مسئلۂ ارتقاء صحیح

بھی ہو، تو قرآن اس کا منکر نہیں، بعض آیاتِ کریمہ کے مفہوم ایسے پائے جاتے ہیں، جن سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے،

"مسئلۂ ارتقاء اور حکمائے اسلام" کے مضمون سے لوگ یہ جان چکے ہیں، کہ بعض حکمائے اسلام بھی مسئلۂ ارتقاء کے قائل تھے، لیکن یہ سُن کر حیرت ہوگی، کہ امام راغب اصفہانی نے بھی جو پانچویں صدی کے ایک مشہور متکلم ہیں، اپنی رائے اسی کے قریب قریب ظاہر کی ہے، اور زیادہ حیرت اس سے ہوتی ہے، کہ انھوں نے اپنے اس خیال کو قرآن مجید سے مطابق کرنا چاہا ہے، گو وہ ٹھیک ٹھیک مسئلۂ ارتقاء تک نہیں پہنچے ہیں، مگر ان کی تحقیق میں اس مسئلہ کا شائبہ ضرور ہے، ان کی اصل عبارت ہم ان کی تصنیف تفصیل النشاتین سے نقل کرتے ہیں،

الباب الخامس	پانچواں باب
فی تکوین الانسان شیئاً فشیئاً	انسان کے تدریجاً پیدا کرنے میں یہانتک
حتیٰ یصیر انساناً کاملاً الانسان	کہ وہ انسان کامل ہو جائے، انسان پہلے
یکون اولاً جماداً میتاً قال اللّٰہ	مردہ جماد ہوتا ہے، خدائے پاک فرماتا ہے،
تعالیٰ "وکنتم امواتاً فاحیاکم"	"تم مُردہ تھے تو خدا نے تم کو زندہ کیا، اور
وذالک حیث کان تراباً وطیناً	یہ اس طرح کہ وہ خاک، مٹی، ٹھیکری تھا،
وصلصالاً ونحوھا ثم یصیر	پھر نبات ہوتا ہے، خدائے پاک فرماتا ہے

نباتاً نامیاً کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ
"واللہ انبتکم من الارض نباتاً"
وذالک حیث ماکان نطفۃ
ومضغۃ ونحوھا ثم یصیر حیواناً
وذالک حیث ما یتبع بطبعہ لبعض
ماینفعہ ویحترز من بعض مایضرہ
ثم یصیر انساناً مختصاً بالافعال
الانسانیۃ وقد نبہ اللہ تعالیٰ
علیٰ ذالک فی مواضع نحو قولہ
تعالیٰ "یا ایھا الناس ان کنتم
فی ریب من البعث فانا خلقناکم
من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ
ثم من مضغۃ مخلقۃ وغیر مخلقۃ"[1]

"خدا نے تم کو زمین سے پیدا کیا،
اور یہ اس طرح کہ انسان نطفہ اور
گوشت کی بوٹی تھا، پھر حیوان ہوتا ہے
اور یہ اس طرح کہ وہ مفید چیزوں کا اتباع
کرتا ہے، اور مضر چیزوں سے بچتا ہے، پھر
وہ انسان ہوتا ہے، جو افعال انسانیہ کے
ساتھ مختص ہوتا ہے، خدا نے بہت سی جگہوں
پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً خدا
فرماتا ہے "اے لوگو! اگر قیامت میں تم کو
شک ہو (تو یاد رکھو) کہ میں نے تم کو خاک سے
پیدا کیا ہے، پھر نطفہ سے، پھر بستہ خون سے
پھر کامل اور غیر کامل گوشت کے لوتھڑوں
سے"

لیکن امام موصوف نے چونکہ بہت اختصار سے بحث کی ہے، بلکہ ناکافی بحث کی ہے، اس لیے ہم خود اس پر تفصیلاً بحث کرنا چاہتے ہیں، اور یہ دکھانا چاہتے ہیں، کہ مسئلۂ ارتقاء بالفرض اگر ناممکن الانکار ہے، تو قرآن اس کا

---

[1] تفصیل النشاتین وتحصیل السعادتین ص ۲۰۲

مخالف نہیں ہے،

مسئلہ ارتقاء کا پہلا حکم یہ ہے کہ انسان دفعۃً نہیں پیدا ہوا، بلکہ چند مرحلوں میں انسان اپنی اس آخری منزل تک پہنچا ہے، جماد سے نبات ہوا، نبات سے حیوان، حیوان سے انسان، قرآن مجید کی بہت سی آیتیں انسان کے چند دوروں میں پیدا ہونے کو ظاہر کرتی ہیں، سب سے بین آیت ہے،

مالکم لا ترجون للہ وقارا وقد خلقکم اطوارا۔ (نوح)	تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی عزت کا اعتقاد نہیں کرتے حالانکہ خدا نے تم کو چند دوروں میں پیدا کیا،

اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ قرآن مجید اس کا ناطق ہے کہ انسان چند دوروں میں پیدا ہوا ہے، قدیم مفسرین ان دوروں کو یوں بتاتے ہیں، کہ انسان پہلے ایک ناپاک شے تھا، پھر گوشت بنا، روح پھنکی، انسان بنا، ہم ان دوروں کا اور اس مطلب کا انکار نہیں کرتے گفتگو یہ ہے کہ جو معنی ہم قرار دیتے ہیں، وہ بھی صحیح ہو سکتا ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ صحیح ہو سکتا ہے اور یہی ہمارا مقصد ہے، کہ قرآن اس ارتقاء کا انکار نہیں کرتا۔

مسئلہ ارتقاء کا دوسرا قانون یہ ہے کہ انسان کی ترقی جماد سے شروع ہوتی ہے، یعنی انسان پہلے جماد تھا، خدا نے قرآن مجید میں بیسیوں جگہ کہا ہے، کہ "تم مٹی تھے" "ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا" اور "انسان کی پیدائش

مٹی سے شروع کی"

الذی احسن کل شیئ خلقہ وبدء — ایسا خدا جس نے اپنی ہر مخلوق کو خوبصورت
خلق الانسان من طین — بنایا، اور جس نے انسان کی پیدائش مٹی
(سجدہ) — (جماد) سے شروع کی،

اس آیت سے صرف اتنا ہی نہیں معلوم ہوا، کہ انسان پہلے جماد تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ انسانی پیدائش کی ابتدا بھی یہیں سے ہے، دوسری جگہ خدا فرماتا ہے۔

وکیف تکفرون باللہ وکنتم — تم خدا کا کیونکر انکار کرتے ہو، حالانکہ تم مردہ
امواتاً فاحیاکم۔ (بقرہ) — تھے، تو خدا نے تم کو زندہ کیا،

مردہ سے کنایہ جماد ہے اور زندگی سے اشارہ اس بات کی طرف ہے، کہ تم کو نمو بخشا، حرکت یعنی ایک درجہ اوپر بڑھایا، نبات بنایا، یہ مسئلہ ارتقاء کا دوسرا زینہ ہے، کہ انسان جماد سے نبات بنا، گویا اب اس نے ترقی کی دوسری منزل میں قدم رکھا، اس منزل کی طرف قرآن مجید نے بالکل تصریحی طور سے اشارہ کیا ہے،

واللہ انبتکم من الارض نباتا — خدا نے تم کو زمین سے اگایا، پھر زمین میں
ثم یعیدکم فیھا ویخرجکم اخراجا — لے جائے گا۔ اور زمین ہی سے
(نوح) — اٹھائے گا،

اس آیت پاک سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان پہلے نبات تھا، اسی دور کی طرف قرآن مجید میں دوسری جگہ اشارہ ہے،

هو اعلم بکم اذ انشأکم من الارض۔ — وہ تمہارا حال خوب جانتا ہے، اس نے زمین سے تم کو پیدا کیا تھا،

موسیو ڈارون کی تھیوری کے رو سے ذی روح مخلوقات پانی میں پیدا ہوئی، اور یہیں بڑھی ہیں، غیر ذی روح انواع نے حیات حاصل کی، قرآن مجید اس کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے،

وجعلنا من الماء کل شئ حی افلا یومنون — ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا، وہ نہیں یقین کرتے،

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی پانی سے پیدا ہوئی ہے، اور یہیں سے ذی روح مخلوقات کا سلسلہ شروع ہوا ہے، ممکن ہے کہ بقول مفسرین مجازاً پانی سے مراد نطفہ ہو لیکن ہم نے آیت کا جو مطلب قرار دیا ہے، وہ بھی صحیح ہو سکتا ہے، بلکہ ہمارا پہلو کسی قدر راجح ہے، کیونکہ زندہ ایک ایسا عام لفظ ہے، جس کے تحت میں حشرات الارض اور نباتات داخل ہیں، حالانکہ نباتات اور بعض حشرات الارض نطفہ سے تو نہیں پیدا ہوتے، لیکن پانی سے ضرور پیدا ہوتے ہیں،

آگے چلو انسان حیوان تھا، پھر انسان بنا،

ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ — اور ہم نے انسان کو خالص مٹی سے پیدا کیا،

من طین ثم جعلناہ نطفۃ فی	پھر اس کو ایک محفوظ مقام میں نطفہ بنایا،
قرار مکین ثم خلقنا النطفۃ	پھر نطفہ کو جما ہوا خون بنایا، پھر اس جمے
علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ	ہوئے خون کو گوشت کی بوٹی بنایا، پھر
فخلقنا المضغۃ عظاماً فکسونا	گوشت کی بوٹی کو ہڈی بنایا، اور ہڈیوں
العظام لحماً ثم انشاناہ خلقاً	کو گوشت پہنایا، پھر اس کو ایک دوسری
آخر فتبارک اللہ احسن الخالقین	مخلوق بنایا، پس برکت والا ہے وہ خدا
(مومنون:۱)	جو بہترین خالق ہے۔

اس آیت پاک میں اجمالاً خلقت انسانی کے مدارج ذکر کیے گئے ہیں، انسان کی ابتدائی پیدائش مٹی سے بنائی گئی ہے، پھر بیچ کے منازل چھوڑ کر، اس منزل کا ذکر کیا گیا ہے، جہاں سے حیوانیت کی ابتدا ہے، اس میں جس نطفہ اور گوشت پوست کا ذکر کیا گیا ہے، وہ درجۂ انسانیت سے پہلے کی حیوانیت کا ذکر ہے، حیوانیت کے لیے گوشت پوست ہڈی جو لوازم تھے، ان کا تذکرہ کیا، یہی درجۂ حیوانیت ہے، جس کے بعد خدا نے فرمایا کہ پھر میں نے اس کو ایک دوسری مخلوق بنایا یعنی انسان!

مسئلۂ ارتقاء کے حامی یہ بھی کہتے ہیں، کہ جنین انسان رحم میں درجۂ حیوانیت میں بھی حیوانیت کی کئی شکلیں بدلتا ہے، جیسا کہ تم ابتدا میں پڑھ آئے ہو، قرآن مجید اس نکتہ کو اس طرح ادا کرتا ہے،

یخلقکم فی بطون امھاتکم خلقا من بعد خلق فی ظلمت ثلاث۔ (زمر)	وہ تمہیں تین تاریکیوں[1] کے اندر بطن مادر میں ایک خلقت کے بعد دوسری خلقت پیدا کرتا ہے،

اس مسئلہ کے طے ہونے کے بعد ایک دوسری بحث حضرت آدمؑ کی ہے، مسئلہ ارتقاء کے مخالفین کا عام خیال ہے، کہ حضرت آدمؑ اور مسئلہ ارتقاء کی صحت دو متناقض چیزیں ہیں، جو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے جو شخص کہ عقل و نقل میں تطبیق دینا چاہتا ہے، وہ کہہ سکتا ہے کہ اس تدریجی ترقی کے رو سے جو سب سے پہلا انسان ہوا، وہی ابوالبشر آدم تھا،

خاتمۂ بحث پر فلاسفۂ حال کو مخاطب کر کے ہم پھر کہتے ہیں، کہ اگر مسئلہ ارتقا صحیح ہے تو قرآن اس کا منکر نہیں، بلکہ ہم مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ قرآن مجید کبھی صحیح علوم کے مخالف نہیں ہو سکتا،

علماء کی خدمت میں گذارش ہے کہ ہم نے مذکورۂ بالا آیتوں کے جو معنی قرار دیے ہیں، ان کا مقصد صرف فلسفیانہ مذاق والوں کو خاموش کر دینا ہے، گو مفسرین ان آیتوں کے اور معنی سمجھے ہیں، اور مجھے ان کی بھی صحت سے انکار نہیں لیکن عقل و نقل کی تطبیق کی غرض سے ہم نے جو معنی لیے ہیں، وہ بھی غلط نہیں، قرآن مجید کے الفاظ دونوں معانی کے محتمل ہیں،

(الندوہ، جنوری ۱۹۰۶ء)

---

[1] تین تاریکیوں سے مراد شکم، رحم، اور وہ جھلی ہے جس پر جنین لپٹا ہوتا ہے،

ایمان بالغیب

قرآن مجید میں اتقا سے صادق کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے، کہ ایمان بالغیب ہو،

ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ۔ (بقرہ۔۱)

قرآن پاک ان پرہیز گاروں کی ہدایت کرتا ہے، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں[۱] اور نماز[۲] پڑھتے ہیں،

سب سے پہلے ہم کو یومنون بالغیب (وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں) کی تفسیر کے لیے غیب کے معنی پر غور کرنا چاہیے، مفسرین اس کی توضیح میں نہایت مختلف الاقوال ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے،

۱۔ غیب سے مراد خدا ہے کیونکہ وہ نظروں سے غائب ہے،

۲۔ غیب سے مراد قضا وقدر ہے،

۳۔ غیب سے مقصد قرآن مجید ہے، اور قرآن مجید میں جو غیب کی باتیں بتائی گئی ہیں،

۴۔ غیب دل کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ متقی وہ ہیں، جو دل سے ایمان لائے

ہیں۔

۵۔ اسلام کے وہ احکام جو بظاہر خلافِ عقل معلوم ہوتے ہیں، وہ غیب ہے کیونکہ ان کی حقیقت انسان کی عقل سے غائب اور مخفی ہے،

۶۔ اسلام کا ایک فرقہ کہتا ہے کہ غیب سے مراد مہدی ہیں، جو ابھی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں،

۷۔ امام ابومسلم اصفہانی کہتے ہیں، غیب مصدر بمعنی فاعل ہے، اور ترکیب میں حال ہے، یعنی متقی وہ لوگ ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے بھی ایمان کا اعتراف کرتے ہیں، اور پیچھے بھی، یعنی وہ منافق نہیں ہیں، جن کی نسبت آگے چل کر خدا خود فرماتا ہے، کہ مسلمانوں کے سامنے تو وہ ایمان کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں، اور ان کے پیچھے اپنے لوگوں میں بیٹھ کر انکار کرتے ہیں،

۸۔ جمہور مفسرین کہتے ہیں، غیب سے مطلب بن دیکھے ہوئے، یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو خدا یا رسول پر بن دیکھے ایمان لاتے ہیں،

۹۔ اکثر صحابہؓ سے مروی ہے کہ غیب سے مراد جنت، دوزخ، حشر، نشر، حیات بعد الموت، عذاب قبر، میزان، صراط وغیرہ ہے،

لیکن ان اقوال پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ غیب سے قضا و قدر، قرآن مجید، دل، مہدی مراد لینا تاویل کی حدود سے نکل جاتا ہے، اصفہانی کی تفسیر میں بھی تکلف ہے، بقیہ اقوال کم و بیش تفاوت کے ساتھ

متحد المقصد ہیں، اور ایک ہی خیال ہے، جو مختلف تعبیروں سے ادا کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر مذہب میں دو قسم کی باتیں پائی جاتی ہیں،

(۱) اول وہ جن کا تجربہ یا مشاہدہ حواس سے ممکن ہے، اور برابر ہوتا رہتا ہے، یا یہ کہو کہ جن کا تعلق طبیعیات یا مادیات سے رہے،

(۲) دوم وہ امور جن کا تجربہ یا مشاہدہ ہمارے موجودہ حواس کے دسترس سے باہر ہے، یا یہ کہو، کہ جن کا تعلق مابعد الطبیعیات یا روحانیات سے ہے،

قرآن مجید کی اصطلاح میں مذہب کی اسی دوسری قسم کو غیب کہتے ہیں، یہاں پر یہ نکتہ بھی خاص غور کے قابل ہے کہ ایمان بالغیب کو قرآن مجید نے کیوں اتنے شد ومد سے بیان کیا ہے؟

اصل یہ ہے کہ ہر شخص کو جو اپنے مذہب کو صحیح اور حق سمجھتا ہے، اپنے مذہب کے روحانی اور مادی دونوں اجزا پر ایمان کامل ہے، لیکن مذہب کے پہلے ٹکڑے کا یعنی وہ امور جن کا ہم تجربہ یا مشاہدہ کر سکتے ہیں، ان کی صحت کا اذعان اور یقین (ایمان) ہم صرف اپنے حواس کے مشاہدہ کے ساتھ کر لیتے ہیں، اس لیے انکی صحت پر یقین رکھنا اور ایمان لانا ہماری قوتِ ایمانی کے کمال پر دال نہیں ہے بلکہ وہ صرف ہماری ظاہر پرستی کا ایک اثر اور نتیجہ ہے، لیکن مذہب کے اس دوسرے حصہ کی صحت پر یقین رکھنا اور ایمان لانا جس کو قرآن مجید غیب اور تم روحانیات کہتے ہو، البتہ کمالِ ایمان کی ایک روشن دلیل ہے،

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا، کہ مذہب کے اس دوسرے جزء کا وجود کیا اسی مادی عالم میں ہے، جہاں ہم رہتے ہیں، اور اگر یہ صحیح ہے تو ہمارے حواس اس کا مشاہدہ کیوں نہیں کرتے، اس کا جواب ہم تفصیل سے دینا چاہتے ہیں، ..

تمام مذاہب میں عموماً بعض ایسے امور کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، جن کا احساس انسان کے ظاہری حواس سے بالاتر ہے، مثلاً جنت، دوزخ، عذابِ قبر، شیاطین، قوائے روحانی، فرشتے، روح وغیرہ، قرآن مجید کی اصطلاح میں ان چیزوں کو غیب کہتے ہیں اور ہم زیادہ وسعت دیکر اس کو عالم غیب کہتے ہیں کیونکہ بظاہر یہ چیزیں ہمارے حواس کے مادی عالم سے ماورا، ایک دوسرے عالم میں معلوم ہوتی ہیں، قرآن مجید میں ہے،

هو عالم الغیب والشهادة۔ خدا غیب اور شہادت (حاضر) دونوں کی خبر رکھنے والا ہے،

اس آیت کا بظاہر یہ مطلب، مفہوم ہوتا ہے، کہ جو انسان کے سامنے حاضر ہے، اور انسان سے غائب ہے، دونوں باتوں کو خدا جانتا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ انسان کے سامنے جو چیز حاضر ہے، اور جو چیز حاضر ہوسکتی ہے، اس میں ہر مادی شے داخل ہے، اس لیے شہادت میں وہ امور داخل ہیں، جن کا ہم احساس اور مشاہدہ کر سکتے ہیں، اور جو مذہب کا پہلا جزء ہیں، اور غیب نے وہی امور مراد ہیں، جو عام حواس سے بالاتر ہیں، اس لیے قرآن مجید کی اصطلاح میں عالم شہادت مادیات اور عالمِ غیب روحانیات کو کہتے ہیں، اور خدا ان دونوں عالموں کے

ایک ایک ذرّے سے خبر رکھتا ہے،

عالمِ شہادت چونکہ ہمارے موجودہ حواس اور مشاہدات کے تحت داخل ہے، اس لیے حکمائے سفسطیہ کے سوا کوئی اور اس کے وجود کا منکر نہیں ہے، عالمِ غیب کے تسلیم کرنے میں قدیم فلسفہ کو تو تامل نہیں ہے، مگر جدید فلسفہ کو البتہ تامل ہوگا، کیونکہ ظاہر ہے کہ افلاطون اس مادی عالم کے سوا ایک اور روحانی عالم کا قائل ہے، جس کو وہ عالمِ مثل کہتا تھا، اور اب افلاطون کے انتساب سے اس کو مثل افلاطونیہ کہتے ہیں، اس لیے پلاٹونزم عالمِ غیب کا کسی طرح انکار نہیں کر سکتا، ارسطو گو عالمِ مثل کا قائل نہ تھا، مگر وہ تدبیر عالم کے لیے ان روحانی قوتوں کا قائل تھا، جس کو اصطلاحِ فلسفہ میں عقول عشرہ کہتے ہیں، اور وہ ہر وجود کے لیے ایک روحانی نفس کا قائل تھا، جس کی تعداد غیر منتہی حد تک پہنچ جاتی ہے، تدبیر افلاک کے لیے وہ اٹھارہ روحانی نفوس مانتا تھا، اور فلسفۂ ارسطو کے دلدادہ اب تک تسلیم کرتے ہیں، یہ نفوس اور عقول ہمارے مشاہدہ اور حواسِ موجودہ کے اقتدار سے خارج ہیں، اس لیے وہ عالمِ غیب کی کائنات ہیں،

امام غزالی اسی عالمِ غیب کو وجودِ عقلی و خیالی وغیرہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، امام رازی اور عبدالکریم شہرستانی اور تمام حکمائے اسلام اس کو عالمِ عقلی کہتے ہیں، شیخ الاشراق، افلاطون کے اتباع سے اس کو عالمِ مثل کہتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب اسی عالم کو، عالمِ مثال کہتے ہیں، غرض یہ ایک مفہوم ہے، جس کی علمار

مختلف تعبیریں کرتے ہیں، علامہ ابن تیمیہ نے کتاب العقل والنقل میں عالم عقلی کا انکار کیا ہے، اور امام رازی اور شہرستانی پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں لیکن علامہ ابن تیمیہ کے سارے اعتراضات صرف ایک لفظی گرفت تک محدود ہیں، چونکہ اُن کا اعتراض یہ ہے، کہ فلاسفہ عالم عقلی، ان اشیاء کو کہتے ہیں، جن کا وجود محض عقل میں ہوتا ہے، جس طرح عالم ذہنی ان اشیاء کو کہتے ہیں، جن کا وجود ذہن میں ہوتا ہے، اس لیے اگر جنت، دوزخ، ملائکہ، قوائے روحانی نفوس وغیرہ کا وجود عالم عقلی میں ہے، تو لازم یہ آتا ہے، کہ عقل سے خارج ان کا وجود نہ ہو، اور یہ بالکل تصریحات اسلام کے خلاف ہے، لیکن یہ اعتراض صرف ایک لفظی اصطلاح کی بنا پر ہے، کہ اس کو عالم عقلی نہ کہنا چاہیے، ورنہ اصل واقعہ سے علامہ ابن تیمیہ بھی انکار نہیں کرتے، آگے چل کر ہم علامۂ موصوف کی ایک عبارت نقل کریں گے، جس سے یہ مسئلہ اور زیادہ واضح ہو جائے گا۔

افلاطون اور شیخ الاشراق نے عالم غیب (جس کو وہ عالم مثل کہتے ہیں) کے وجود پر یہ دلیل قائم کی ہے، کہ ہم خواب میں اپنے کو چلتے پھرتے اور دنیا کے سارے کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، اپنے مردہ احباب سے ملاقات کرتے ہیں، کبھی کبھی ہم مستقبل کے امور کا بھی مطالعہ کر لیتے ہیں، بیداری کی حالت میں بھی کبھی کبھی جب ہم محو خیال ہو جاتے ہیں، تو اس موجودہ دنیا سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ جب ہم سوچتے ہیں، تو ہمارے چھوٹے سے ذہن میں دریا، پہاڑ، آسمان، زمین ساری

دنیا کا نقشہ سما جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ باتیں اس مادی عالم میں نہیں ہوتیں، اور نہ اس چھوٹے سے ظرف ذہن میں تمام دنیا سما سکتی ہے، اس لیے یہ تسلیم کر لینے سے چارہ نہیں، کہ اس مادی عالم کے سوا ایک اور عالم بھی ہے، جہاں ہمارا نفس کبھی کبھی اس عالم سے گھبرا کر سیر کو نکل جاتا ہے،

شاہ صاحب نے عقلی طور سے عالم غیب (جس کو وہ عالم مثال کہتے ہیں) کے وجود پر کوئی دلیل نہیں قائم کی ہے، ان کی تقریر کا ماحصل یہ ہے، کہ قرآن مجید اور احادیث صحاح میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جو ہمارے حواس سے بالاتر ہیں اور کسی طرح ان کا وجود اس عالم میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا، مثلاً یہ کہ گنہگار مردوں پر عذاب ہوتا ہے، سانپ، بچھو، فرشتے ان کو تکلیف دیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں عجیب و غریب چیزیں دیکھیں، انبیاء فرشتوں سے ملتے ہیں، ان کو دیکھتے ہیں، ان سے باتیں کرتے ہیں، نماز استسقار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوزخ و جنت پیش کی گئی، اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو دیکھا ان کے سوا اس قسم کی اور بیسیوں باتیں ہیں، جو قرآن مجید اور صحیح احادیث سے ثابت ہیں، اس لیے ان چیزوں کے وجود کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں،

۱۔ یہ چیزیں واقعی ہیں، لیکن اس مادی عالم میں نہیں، بلکہ دوسرے عالم میں،

۲۔ واقع میں ایسا نہیں ہے، بلکہ پراگندگیِ حواس سے ہم کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں۔

۳۔ صرف تمثیل کے طور پر، ان باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان سے ان کے ظاہری معنی

مراد نہیں ہیں،

یہ کہہ کر شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں پہلی شق اختیار کرتا ہوں، اور یہی شق محدثین کے مذاق کے موافق ہے، تیسری شق کے معتقدین کو میں اہل حق نہیں سمجھتا، دوسری شق کی نسبت شاہ صاحب نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، لیکن اصل یہ ہے کہ اسرار شریعت کو تشویش حواس کا نتیجہ یا محض تمثیل سمجھنا قرآن مجید اور احادیث صحیح کا بلطائف الحیل انکار کرنا ہے ورنہ یہ چیزیں واقعۃً موجود ہیں، اور ہم ان کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، علامہ ابن تیمیہ نے کتاب العقل والنقل میں لکھا ہے،

اما ما اخبرت بہ الرسل صلوات اللہ علیھم من الغیب فھو امور موجودۃ ثابتۃ اکمل واعظم مما نشاھدہ نحن فی ھذہ الدار وتلک امور محسوسۃ تشاھد و تحس ولکن بعد الموت وفی الدار الآخرۃ ویمکن ان یشھدھا فی ھذہ الدار من یخصہ اللہ بذالک۔	لیکن انبیاء نے غیب کی جن باتوں سے خبر دی ہے، وہ ایسے امور ہیں، جو موجود ہیں، اور ثابت ہیں، زیادہ کامل اور زیادہ عظیم الشان ان چیزوں سے جن کا ہم اس دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں، اور ایسے امور ہیں، جو محسوس ہوتے ہیں، اور ان کا مشاہدہ اور احساس ہوتا ہے، لیکن مرنے کے بعد اور آخرت میں اور اس عالم میں بھی ان لوگوں کے لیے ان کا مشاہدہ ممکن ہے، جن کو خدا اس شرف سے ممتاز کرے۔

اس بیان پر یہ اعتراض ہوگا، کہ اس سے یہ لازم آتا ہے، کہ عالم غیب کا

عام طور پر مشاہدہ ہوسکے، لیکن اس کا احساس اور مشاہدہ نہیں ہوتا، اس لیے مذہب نے جن خلاف مشاہدہ اور حواس سے بالاتر امور کا ذکر کیا ہے، وہ خود موجود نہیں ہیں، کیونکہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، کہ انبیاء کو نظر آئے، اور عام انسانوں کو نظر نہ آئے، اس اعتراض کے دفع کرنے کے لیے اور اصل واقعہ سمجھنے کے لیے چند مقامات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) ہمارے ذرائع علم صرف حواس ہیں،

ہمارے ادراکات، علوم، تصورات صرف حواس سے حاصل ہوتے ہیں، اگر ہمارے پاس حاسۂ سمع نہ ہو، تو ہم کچھ نہ سن سکیں، اور نہ تو آواز کا کوئی تصور ہمارے ذہن میں آسکے، اور نہ نغمہ وترنم اور بدآوازی میں کوئی فرق پیدا کرسکیں، اسی طرح اگر آنکھیں نہ ہوں، اور حاسۂ بصارت معدوم ہو، تو ہم کچھ نہ دیکھ سکیں، اور نہ خوش رنگ و بدرنگ میں کوئی تمیز پیدا کرسکیں، اور اگر حاسۂ ذوق جاتا رہے تو ہم مزے کا علم نہیں حاصل کرسکتے، اور اگر حاسۂ شم نہ رہے، تو ہم بو کا تصور نہیں کرسکتے، اور اگر کسی انسان کے یہ تمام حواس خلقۃً معدوم ہیں، تو وہ دنیا میں آکر کسی چیز کا علم حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ ہمارے علوم کے ذرائع محض حواس ہیں، ان ہی حواس کے ذریعہ سے ہم خاص خاص جزئی چیزوں کا علم حاصل کرتے ہیں، جو ذہن میں آکر قضایائے کلیہ کی حیثیت پیدا کرلیتی ہیں، اور جب ذرائع علم مسدود ہوجائیں گے، تو ہمارے ذہن میں نہ جزئی اور نہ کلی کسی قسم

کا کوئی تصور نہیں آسکتا، اس لیے اگر کسی انسان سے کوئی حاسہ معدوم ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں، کہ اس حاسہ کے ذریعہ سے جو چیزیں معلوم کی جاتی ہیں، ان کا علم اور تصور اس وقت تک اس کے ذہن سے معدوم ہوگا، جب تک کوئی دوسرا اس کو نہ بتائے، اور اس وقت بھی اس کا تصور ناقص ہوگا،

(۲) حواس کی کوئی تحدید نہیں کی جاسکتی،

عام طور پر یہ خیال ہے، کہ حواس ظاہری پانچ ہیں، باصرہ، سامعہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ اسی طرح حواس باطنی بھی پانچ ہیں، حس مشترک، خیال، واہمہ، متخیلہ، حافظہ، لیکن دراصل حواس کے صرف انہی پانچ میں محدود ہونے پر استقرار کے سوا کوئی دلیل نہیں قائم کی جاسکتی، چونکہ عام طور پر انسان کے موجودہ عام حواس صرف یہی پانچ قسم کے ہیں، اس لیے ہم سمجھتے ہیں، کہ ان کے سوا اور کسی حاسہ کا وجود نہیں ہوسکتا، حالانکہ خود فلسفۂ جدیدہ حواس خمسہ کی تحدید کو قبول نہیں کرتا، بعض جانوروں میں ایسے حاسے پائے گئے ہیں جو حواس خمسہ سے زائد ہیں، بعض قسم کے کتوں میں ایک ایسا حاسہ دریافت ہوا ہے، جس سے وہ ہمیشہ اپنے مالک کو پہچان لیتے ہیں، چاہے وہ کسی حالت، کسی ہیئت، اور کسی لباس میں ہو، اور وہ کسی طرح چھپانے کے لیے اپنا رنگ بدلے، اکثر علمائے طبیعیت کی یہ رائے ہے، کہ ان کتوں کا یہ احساس کسی خاص حاسہ کے ذریعہ سے پیدا ہوا ہے، جو عام انسانوں اور حیوانوں میں موجود نہیں ہے، ہم خود جب کسی

چیز کو اٹھاتے ہو، تو اس کا ثقل یا ہلکا پن محسوس کرتے ہو، یہ وزن تم نے کس حاسہ سے دریافت کیا، ممکن ہے کہ قوت لامسہ کہو، لیکن اس احساس میں اگر قوت لامسہ کو دخل ہوتا تو چاہیے کہ ہات لگنے کے ساتھ ہی ہم کو شے کا وزن معلوم ہو جائے، حالانکہ جب تک ہم اٹھاتے نہیں ہم کو وزن کا احساس نہیں ہوتا، ہم اشیاء کے طول و عرض اور مقدار کا احساس کرتے ہیں، کس حاسہ سے؟ ممکن ہے کہ قوت باصرہ کہو، لیکن یہ ثابت ہے کہ قوت باصرہ صرف رنگ اور روشنی کا احساس کرتی ہے، اور چونکہ ہم جزئی مقدار اور جزئی وزن کا احساس کرتے ہیں، اس لیے کسی زائد حاسہ کا وجود ضرور ہے، کیونکہ جزئی اور خاص خاص چیزوں کا ادراک بغیر کسی حاسہ کے نہیں ہو سکتا،

ممکن ہے، کہ انبیاءؑ میں جو نوع انسان کی ایک خاص صنف ہے، عام اصناف انسان سے کوئی زائد حاسہ موجود ہو جس سے وہ عالم غیب کا مشاہدہ کر سکتے ہوں،

پہلے مقدمہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ جو حاسہ ہم سے معدوم ہو گا، اس حاسہ سے جو تصورات اور علوم متعلق ہوں گے، ہم ان کا کسی طرح احساس یا ادراک نہیں کر سکتے، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ زائد حاسہ جو عالم غیب کے لیے ضروری ہے ہم میں بالفعل موجود نہیں ہے، اس لیے ہم خود عالم غیب کا اس وقت تک نہ احساس کر سکتے ہیں، اور نہ مشاہدہ کر سکتے ہیں، جب تک وہ زائد حاسہ ہم نہ حاصل کر لیں،

اور جس طرح نوع انسانی کی بعض اصناف نے بعض خاص خاص اوصاف

یں ممتاز ہوتے ہیں، اور اسی طرح دوسرے مقدمہ کی بنا پر، یہ ممکن ہے کہ انبیاءؑ میں جو نوع انسان کی ایک خاص صنف ہے، معمولی حواس سے کوئی زائد حاسہ ہو۔ جس سے وہ عالم غیب کا مشاہدہ کرسکتے ہوں، اس لیے جس طرح ایک معدوم البصارت نابینا رنگوں کے متعلق آنکھ والوں کی تکذیب نہیں کرسکتا، اور نہ اس کے متعلق وہ اس سے زیادہ جان سکتا ہے، جو آنکھ والوں سے اس نے سنا ہے، اسی طرح عام انسان انبیاءؑ کی تکذیب کی جرأت نہیں کرسکتے، اور نہ اس سے زیادہ وہ عالمِ غیب کے متعلق کچھ کہہ سکتے ہیں، جو انھوں نے انبیاء سے سنا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو کسی زائد حاسہ کے تسلیم کرنے میں تامل ہو، اس لیے حسب ذیل مقدمات سے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے،

(۱) افراد انسان میں حواس متفاوت ہیں،

ایک انسان جس قدر دیکھ سکتا ہے، دوسرا انسان اس سے زیادہ دیکھ سکتا اور سن سکتا ہے، جو لوگ کم نظر ہوتے ہیں وہ کم دیکھتے ہیں، لیکن دوسرا شخص جو تیز نظر ہوتا ہے، وہ ان سے زیادہ دیکھتا ہے، بعض انسان دور کی چیزیں نہیں دیکھ سکتے لیکن ایسے انسان بھی موجود ہیں، جو دور سے دور اور باریک سے باریک چیزوں کو نہایت آسانی سے دیکھ سکتے ہیں، ضعیف القویٰ انسان کے حواس کمزور ہوتے ہیں، بچے اور بوڑھے زیادہ نہیں دیکھ سکتے، جوان بہت زیادہ دیکھتے ہیں،

یہ تفاوت اور کمی و بیشی تمام حواس میں ممکن ہے، بلکہ موجود ہے، زرقا، عرب میں ایک ایسی عورت تھی، جو تین منزل کی مسافت سے چیزوں کو دیکھ لیتی تھی، چیونٹیوں میں قوت شامہ، کبوتروں میں قوت باصرہ، کتے میں قوت تمیز، معمولی قوت سے بہت زیادہ ہوتی ہے، شہد کی مکھیوں میں ایک عجیب و غریب قوت دریافت ہوئی ہے، جس سے عام انسان اور حیوان محروم ہیں، اگر شہد کی مکھیوں کو کسی ایسی محفوظ چیز میں بند کردیں، جس سے باہر کی کوئی چیز نہ معلوم ہوسکے، اور ان کو سیکڑوں میل دور پیچ در پیچ راستوں سے لے جائیں، اور وہاں اُن کو کھول دیں، تو وہ نہایت آسانی سے اپنے اصلی مرکز پر واپس آجاتی ہیں،

خود انسان کے حواس کس قدر متفاوت اور مختلف الدرجہ ہیں، ایک انسان دور سے ایک آواز سُنتا ہے، دور کی ایک چیز اس کو نظر آتی ہے، دور کی نہایت نازک خوشبو وہ محسوس کرلیتا ہے، لیکن کمزور حواس کے انسان ان کا مُطلق احساس نہیں کرسکتے، لیکن اگر کسی وجہ سے ان کے حواس زیادہ قوی اور تیز ہوسکیں، تو وہ بھی اسی طرح دیکھ سکتے ہیں، سُن سکتے ہیں، سونگھ سکتے ہیں،

(۲) ہمارے حواس کی قوت بڑھ سکتی ہے،

مقدمۂ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کم نظر انسان جس قدر دیکھ سکتا ہے اگر اس کی قوتِ بصارت تیز ہوجائے، تو اور زیادہ دیکھ سکتا ہے، بلکہ بصارت کی جس حد تک قوت بڑھتی جائے گی، اس کا احساس بڑھتا جائے گا، ہمارے

ہاتھ میں پانی کا گلاس ہے، اور ہم اس کو پینا چاہتے ہیں، اس میں گرد و غبار کا ہم کو ایک ذرہ نظر نہیں آتا، لیکن اگر ہم خوردبین اٹھالیں، تو گرد تو گرد ہمیں ایک ایک قطرے میں سیکڑوں کیڑے نظر آئیں گے، ذرہ ذرہ میں ہم کو کیڑوں کی بستی کی بستی نظر آئے گی، خالی آنکھوں سے ہمیں صرف آفتاب، ماہتاب اور معمولی ستارے نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ بطلیموس اور ارسطو کو ثوابت کی حرکت تک معلوم نہ ہوئی، اور اس وقت تک صرف تین سو ثوابت دریافت ہوئے تھے، مسلمانوں نے جب آلات ایجاد کیے، تو چند ستارے اور دریافت ہوئے، اور اب ارجلنڈر کی تحقیق کے موافق صرف ساتویں درجہ کے ستارے تیرہ ہزار ہیں؛ اور آٹھویں درجہ کے چالیس ہزار اور نویں درجہ کے ایک لاکھ بیالیس ہزار ہیں، اور تمام ستارے جو ہرشل کی دوربین سے نظر آتے ہیں، دو کرور تک ہیں، اور چنانچہ دوربینوں کی طاقت جتنی بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر قوت بصارت میں ترقی ہورہی ہے، واشنگٹن کی دوربین سے آسمان کے ایک خاص حصہ میں ۶۳ ستارے نظر آتے تھے، جب سیکی کی دوربین ایجاد ہوئی، تو اسی حصہ میں ایک سو اکسٹھ ستارے دریافت ہوئے، اس کے بعد واکیلسٹف کی دوربین سے اسی خاص حصہ میں ایک سو بہتر ستارے نظر آئے؛ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ٹیلسکوپ اور میکرسکوپ وغیرہ کی جتنی قوت بڑھتی جائے گی، قوت بصارت میں حیرت انگیز ترقی ہوتی جائے گی؛ آلات سمع کی ایجاد اور ترقی کا بھی یہی حال ہے،

(۳) اس لیے ممکن ہے کہ انبیاءؑ کی قوت حواس عام افراد انسان کی قوتِ حواس سے بالاتر ہو، اور وہ عالم غیب کے وہ اسرار دیکھتے ہوں، جو معمولی حواس سے نظر نہیں آسکتے، اور جس طرح ایک کمزور بصارت کا انسان ایک تیز نظر انسان کے محسوسات کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتا، کہ جو کچھ تم کو محسوس ہوتا ہے، اور تم دیکھ رہے ہو وہ اس لیے غلط اور ناقابل اعتبار ہیں، کہ ہم نہیں دیکھتے، اسی طرح ہم انبیاءؑ کے محسوسات غیب کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے، کہ وہ اس لیے غلط ہیں، کہ ہم ان کا مشاہدہ نہیں کرتے، اس لیے ممکن ہے کہ موت کے بعد یا بعض لوگوں کو خود زندگی میں جب مادی حجابات اور کثافتوں سے روح پاک ہو جائے، اور قوائے حواس زیادہ تیز ہو جائیں، تو ان کا مشاہدہ ہو سکے،

اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ عالم غیب کی جن باتوں کا مشاہدہ انبیاءؑ کرتے ہیں، اور جن کی وہ اپنے پیرووں کو اطلاع دیتے ہیں، وہ بالکل ممکن ہے، اور کوئی خلاف امر نہیں ہے، کہ وہ ان کا اپنے ان ظاہری حواس سے مشاہدہ کرتے ہوں، اور ہم ان کا بالفعل مشاہدہ نہیں کر سکتے، اور خود ان انبیاءؑ کی اخلاقی زندگی اور اپنے محسوسات و معتقدات پر غیر معمولی استحکام اور استقلال اس بات کی دلیل ہے، کہ جو وہ کہتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں،

یہاں پر ایک اور امر بھی لحاظ کے قابل ہے، جس طرح انسان کے ظاہری حواس متفاوت اور کم و بیش ہیں، اسی طرح انسان کے باطنی حواس بھی کم و بیش اور

مختلف المدارج ہیں، ایک شخص ذراسی بات بہت دیر میں سمجھتا ہے، اور دوسرا مشکل سے مشکل مسئلہ نہایت آسانی سے اور بہت جلد سمجھ جاتا ہے، مشق و غور سے باطنی قویٰ میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہتی ہے، ایک جاہل آدمی کے سامنے مثلاً اقلیدس کا یہ مسئلہ کہ مثلث کے تینوں زاویے مل کر، دو زاویہ قائمہ کے برابر ہوتے ہیں، پیش کیا جائے، تو وہ اس سے انکار کردے گا، لیکن ایک ماہر اقلیدس اس مسئلہ کو بلا دلیل مان لے گا، مکسائل جو ایک بہت بڑا ریاضی داں تھا وہ مشکل سے مشکل حساب کو ایک نظر دیکھ کر حل کر دیتا تھا، اسحاق نیوٹن نے علم ہیئت کے بعض ایسے مقدمات ترتیب دیے ہیں، جو صحیح ہیں، اور اب تک سمجھ میں نہیں آتے، محقق طوسی نے اقلیدس کے تمام اشکال پر، خود اپنی طرف سے بیسیوں دلائل قائم کر دیئے، علاف جو علم کلام کا موجد اور واصل جو اصولِ فقہ کا موجد ابن حیان جو علم کیمیا کا مجدد ہے، کیا اُن کے باطنی حواس معمولی انسان سے بہتر نہیں تھے۔ اور انھوں نے ایسے مسائل اور نتائج نہیں مستنبط کیے، جن کو معمولی فہم و دماغ کا آدمی نہیں سمجھ سکتا،

اسی طرح انبیاءؑ نے اخلاقی، روحانی اور علم غیب کے وہ اسرار و مکنونات دریافت کیے، جو معمولی انسانوں کے دسترس اور قوت سے بالاتر ہیں، اس لیے ہم کو انبیاءؑ کی تصدیق کرنی چاہیے، اور عالم کی جن باتوں کی وہ ہمیں اطلاع دیتے ہیں، ہم کو ان پر ایمان لانا چاہیے، لیکن یہاں پر ایک اور غلطی بھی ہے، وہ یہ ہے کہ اس

خوش اعتقادی اور ممکن خیال کو اس قدر وسعت دی جاتی ہے، کہ ہر واقعہ اس کے اندر داخل کر دیا جاتا ہے، اس لیے سب سے پہلے خلاف مشاہدہ اور روحانی واقعات کے لیے ہم کو یہ تحقیق کرنا چاہیے، کہ ان واقعات کی جو شخص خبر دیتا ہے اس کی اخلاقی حالت کیسی تھی، وہ جھوٹ کبھی نہیں بولتا، اور نیز ان واقعات کی صحت پر خود اس کے اعتقاد کو کس قدر استحکام تھا، اور تیسرے یہ کہ جس سلسلہ سے ان واقعات کی خبر ہم تک پہنچی ہے، وہ سلسلہ کس قدر مضبوط اور غیر متہم ہے، ان منازل کے طے کرنے کے بعد مادہ پرستوں کے عالم غیب سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے،

میٹریلسٹ اب خود یورپ میں اسپریچولسٹ کے مقابلہ میں شکست کھا رہے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ ہماری جدید جماعت بھی اپنی موجودہ غلطی سے متنبہ ہو۔

ربنا اهد قومی فانهم لا یعلمون

(الندوہ، دسمبر ۱۹۰۸ء)

قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات

آغاز

آج مدارس اور خانقاہوں میں غوغا ہے کہ سائنس نے مذہب کے ایوان میں تزلزل ڈال دیا ہے، لیکن شاید یہ خبر نہ ہو کہ نہ صرف سائنس اور علوم عقلی کی موجوں نے زورقِ ایمان کو تلاطم میں مبتلا کر رکھا ہے، بلکہ یورپ کا ہر علم و فن منافعِ عامہ کے ساتھ کچھ نہ کچھ اپنی تہ میں زہر کی آمیزش ضرور رکھتا ہے، تاریخ اب سے پہلے ایک معصوم علم تھا لیکن اب وہ ہر قسم کے جرائم کا مجموعہ ہوگئی ہے۔

تاریخ کی اب دو قسمیں ہوگئی ہیں، جدید تاریخ (ماڈرن ہسٹری) اور قدیم تاریخ (اینشنٹ ہسٹری) قرآن مجید میں جن اشخاص اور قوموں کا ذکر ہے، ان کا تعلق زیادہ تر دنیا کی قدیم تاریخ سے ہے، قدیم تاریخ کا ابتدائی حصہ عموماً افسانہ مذہبی (میتھالوجی) سمجھا جاتا ہے، قرآن میں قومِ نوحؑ، عادؑ، ثمودؑ، کے متعلق جو واقعات عبرت انگیز مذکور ہیں، عموماً اب انکو یورپین علمائے تاریخ میتھالوجی اور افسانہ کہن سمجھتے ہیں، ہم نے اس موضوع پر ارض القرآن کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں بدلائل تاریخ و آثار اقوام کی حقیقت و اصلیت اور قرآن میں، ان کے متعلق جو کچھ

مذکور ہے، یورپ کے مسلم تحقیقات اور علم الآثار سے اس کا ثبوت بہم پہنچایا ہے،

اس مضمون میں اسی قسم کے ایک اور سلسلۂ اعتراضات کی طرف ہم کو توجہ کرنا ہے، یورپ کے علمائے مشرقیات اور مسیحیت کے حامیانِ دین نے قرآن مجید کے متعلق ایک عجیب وغریب اصول موضوعہ بنالیا ہے جن کے مطابق قرآن مجید کا کوئی نقطہ بھی اپنی جگہ پر صحیح نہیں، اصول مذکورہ یہ ہے، کہ قرآن کا ہر واقعۂ تاریخی یا تو کسی دوسری مذہبی کتاب میں مذکور ہے، یا وہ اس سے خاموش ہے، صورت اوّل میں قرآن کا سرقہ ثابت اور وہ حکایت اس سے ماخوذ اور اگر وہ بدقسمتی سے تنہا قرآن کی روایت ہو تو وہ افسانہ محض اور میتھالوجی، لیکن اس اصول کے مطابق تو دنیا کی کوئی مذہبی تاریخ جملہ ایراد سے محفوظ نہیں،

نہ من دل زدہ از دستِ تو خونیں جگرم | از غمِ عشق تو پُرخوں جگرے نیست کہ نیست

ان ہی اصنافِ اعتراضات میں سے قرآن مجید کی تاریخی غلطیوں (نعوذ باللہ) کا مسئلہ بھی ہے، ان غلطیوں کا مدار زیادہ تر چند ناموں کا توراۃ وانجیل اور قرآن میں اختلاف ہے، سب سے پہلا سوال یہ ہے، کہ ان اختلافات کے موقع پر توراۃ وانجیل کو صحت کا معیار قرار دیا گیا ہے، حالانکہ تاریخ جس بلند آہنگی سے اس دعویٰ کی تکذیب کرتی ہے، شاید کسی اور صحیفۂ آسمانی کو وہ عزت نصیب نہ ہو، بہرحال حریف کے مسلّمات کو مان کر بھی کیا اسلام کی صفِ دفاعی میں ان لوگوں سے کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے،

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آزر مذکور ہے،

اذقال ابراھیمُ لابیہ آزر　　ابراہیمؑ نے جب اپنے باپ آزر سے کہا،

بائبل میں تارح اور ترح مذکور ہے، اس اختلاف نے بہت سے علمی جاہلوں کے لیے اعتراض کا موقع پیدا کر دیا ہے، سب سے اول یہ جاننا چاہیے کہ توراۃ اور قرآن میں کم از کم دو ہزار برس کا فصل ہے، اصل توراۃ کی زبان عبری تھی یہودیوں کے سیاسی انقلابات کے ساتھ ان کے مذہب کی زبان بھی بدلتی رہی، موجودہ عبرانی توراۃ اصل عبری نہیں، آرامی یا یونانی کا ترجمہ ہے، ان حالات کے ساتھ اس فصل زمانہ کے باوجود اس اختلاف اسنہ کے الٹ پھیر میں اگر نام مختلف قوموں اور زبانوں میں کچھ سے کچھ ہو جائیں، تو کیا کوئی محلِ اعتراض ہے، انگریزی بائبل کے ناموں کا تلفظ بالکل یونانی اور لاطینی ہے، جو اصل عبرانی سے بمراحل دُور ہے، لیکن کیا یہ اختلاف حرف گیری کا مرکز بن سکتا ہے،

حکمائے اسلام پر ابھی دس صدیاں بھی نہیں گذری ہیں، عربی تصنیفات کے تراجم کے ذریعہ سے ان کا نام مدت تک یورپ کے ایک ایک طالب العلم کی زبان پر رہا ہے، ابو علی بن سینا، ابوالقاسم زہراوی، ابن رشد، ابن ھیثم کو ہم سب جانتے ہیں، لیکن اوسنا، ابقاسیس اور مس، الہزین کو ہم میں سے کون جانتا ہے؟ اور یہ کون تسلیم کرے گا، کہ یہ مشرقی فلاسفر کے عربی نام ہیں،

مسیحؑ یورپ کا خدا ہے، تاہم اس کا جو نام یورپ کی زبانوں میں مستعمل ہے، وہ

اصل سے کہاں تک مطابق ہے، اصل عبری نام ایشوع ہے، جو مخفف ہوکر "یشوع" ہوگیا ہے، یونانی میں یونانی طریق تلفظ پر "جیسوس" ہوگیا، لاطینی میں یہ صرف "جیزس" رہ گیا، اور اب تمام یورپ میں یہی حضرت مسیحؑ کا نام ہے، اکبر کے زمانہ میں جب پرتگالی پادریوں نے انجیل کا فارسی میں ترجمہ کیا تو جیزس ژزو ہوگیا، ع

اے نام تو ژزو کرستو

یہ مغربی انقلابات ہیں، عرب میں یہی نام عیسیٰ کی شکل میں بدل گیا تھا، سوال یہ ہے کہ یسوع جیسیوس، جیزس ژزو، اور پھر عیسیٰ کیا ایک ہی چیز ہے، اور ایک ہی شخصیت کے نام ہیں، مسیح کے استاد کا نام عبرانی میں یحنّا، لاطینی میں جان اور عربی میں یحییٰ ہے، کیا یحییٰ، یوحنا اور جان تین چیزیں ہیں، اسی طرح تمام عبرانی پیغمبروں کے ناموں کا مختلف زبانوں میں یہی حال ہے،

اس اعتراض سے ہمارے مفسرین بھی واقف تھے، امام طبری، قاضی بیضاوی، زمخشری اور رازی نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں، ان جوابات کا تمامتر دارمدار سدّی اور مجاھد کے اقوال ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے،

۱۔ آزر، حضرت ابراہیمؑ کے باپ تارح کا دوسرا نام تھا جس طرح حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام اسرائیل تھا،

۲۔ آزر تارح کا نام نہیں لقب یا وصف تھا،

۴۔ آزر، تارح کے بت کا نام تھا،

ان جوابات کا دوسرا اور تیسرا نمبر تقریباً صحیح ہے، تارح بابل کا باشندہ تھا، ایرانی مذہب، ایرانی زبان، ایرانی حکومت اسی بابل کی یادگار ہے، اور خود اہل عجم کو اس کا دعویٰ ہے، آزر قدیم ایرانی زبان میں آگ کو کہتے ہیں، آگ ستارۂ مریخ کا مظہر ہے، اس بنا پر مریخ کو بھی آزر کہتے ہیں، آگ اور ستارۂ مریخ ایرانیوں کا مسجود ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ بابل کے قدیم بت پرستوں میں بھی اس کی پرستش جاری ہوگی، اور اسی سے منتقل ہو کر، آذرگسپ ایک فرشتہ موکل کا نام قرار پایا، عجب نہیں، اگر قدیم بابل میں موبد یعنی پرستار آتشخانہ کا آزر کے انتساب سے کوئی نام یا لقب قرار پایا ہو اور عربی میں آکر وہ صرف آزر رہ گیا ہو،

بہر حال یہ قیاس ہے، اب اس کے متعلق ایک اور تازہ تحقیق پیش نظر ہے، اصل عبرانی توراۃ میں یہ نام "ترح" ہے، ترگوم (توراۃ کے آرامی ترجمہ میں) تارح اور تاراج ہے، تالمود میں جو یہودیوں کے ہاں حدیث کا درجہ رکھتی ہے، زاراح[1] ہے، بائبل کا ایک نہایت قدیم ترجمہ عربی میں اصل عبرانی سے پندرھویں صدی میں روما میں ہوا تھا، اس کے بعد یہی ترجمہ دوبارہ انگلینڈ سے شائع ہوا، اس ترجمہ میں لوقا کی انجیل میں (نسب نامۂ مسیح) تارا ہے، ہر زبان میں اجنبی الفاظ کو

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور جوئش انسائیکلوپیڈیا لفظ ابراہیم،

اپنے ذخیرۂ لغت میں ضم کرنے کے لیے اس کو صورۃً اور وزناً اپنے الفاظ کے مطابق کرنا پڑتا ہے، اسی کا نام تعریب و تفریس وغیرہ ہے، اُردو میں انگریزی کے سیکڑوں الفاظ مستعمل ہیں، ان میں سے کن میں اب انگریزی لب ولہجہ باقی ہے، عربی زبان میں فارسی، یونانی، لاطینی وغیرہ کے ہزاروں الفاظ آکر مل گیے ہیں، مگر اس اختلاط اور دفع بیگانگی کے لیے اپنی اصلی ہیئت چھوڑ کر ان کو پہلے ٹھیٹھ عرب بن جانا پڑا ہے، موسیٰ دراصل موشے ہے، عیسیٰ یشوع ہے، یحیٰی یوحنا ہے، ایوب اوب ہے، یونس یوناہ ہے، اسی طرح زاراح اور زارا عربی وزن و تلفظ میں آزر ہوگیا ہے،

آزر کے متعلق قرآن مجید میں مذکور ہے، کہ وہ بُت پرست تھا، تفسیروں میں ہے کہ بُت تراشی اس کا پیشہ تھا، حضرت ابراہیمؑ نے جس بت خانہ کو ویران کیا تھا، وہ خود آزر کا تھا، لیکن توراۃ کی سفر تکوین میں بلکہ موسیٰ کی پانچوں کتابوں میں سے کسی میں بھی، جہاں آزر کا ذکر ہے، ان واقعات کا مطلق ذکر نہیں، اس بنا پر کوتاہ نظروں کے لیے اعتراض کا موقع ہے۔

سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ قرآن مجید میں صرف اسی قدر مذکور ہے، کہ آزر اور آزر کا خاندان بت پرست تھا، آزر کی بت تراشی کا ذکر قرآن میں مطلق نہیں ہے اس واقعہ کے متعلق قرآن کی حسب ذیل آیتیں ہیں،

اذ قال ابراھیم لابیہ آزر | جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ

أتتخذ اصناماً الهة (انعام) — کیاتم بتوں کو خدا ٹھہراتے ہو۔

اس آیت میں صرف آزر کا ذکر ہے لیکن دوسری آیتوں میں خاندان کا ذکر بھی ہے،

اذ قال ابراهيم لابيه وقومه ما هذه التماثيل التى انتم عاكفون۔ (انبیاء ۶)	جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا، کیا یہ مورتیں ہیں جن کو تم گھیرے بیٹھے رہتے ہو،

ایک اور آیت میں یہ تصریح ہے،

وابراهيم اذ قال لقومه اعبدوا الله واتقوه ذالكم خير لكم ان كنتم تعلمون انما تعبدون من دون الله اوثانا وتخلقون افكا۔ (عنکبوت)	اور ابراہیمؑ جب اس نے اپنی قوم سے کہا، خدا کو پوجو، اور اس سے ڈرا کرو، اگر تم کو علم ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، تم خدا کو چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہو، اور جھوٹی بات گھڑتے ہو۔

اس امر کا ثبوت کہ آزر اور آزر کی قوم بت پرست تھی، دو طریقہ سے بہم پہنچایا جا سکتا ہے، توراۃ کے دوسرے صحیفوں میں جو معترضین کے نزدیک صحت میں، موسیٰ کی پانچ کتابوں کے برابر ہے، اور بائبل یعنی کتب الٰہی کا جزء رہے، مذکور ہو، دوسری صورت یہ ہے، کہ جس ملک میں یہ سکونت پذیر تھے، وہاں کی مذہبی تاریخ سند میں پیش کی جائے،

آزر کا خاندان نہر (فرات) پار (یشوع ۲۴-۲) کلدانیوں کے ملک (اورکسیدم) میں رہتا تھا، (تکوین ۱۱-۱) کلدانی ستارہ پرست تھے، ستاروں کے نام کا ہیکل بناتے تھے، ان میں ستاروں کے خیالی بت نصب کرتے تھے، ان پر نذریں چڑھائی جاتی تھیں، قربانیاں کی جاتی تھیں، دانیال کے زمانہ میں جو غالباً مسیح سے چھ سو برس پہلے تھے، اور جب کلدانیوں میں بنوخذ ندر (بخت نصر) کا خاندان فرماں روا تھا، اسی قسم کی پرستش جاری تھی، سونے کے بُت ہوتے تھے۔ ان کو لوگ سجدہ کرتے تھے، (دانیال ۳-۱۱) علم آلاثار کی روشنی نے اس ملک کے تمام مذہبی رسوم، بتوں کے نام، پرستش گاہیں، ایک ایک چیز آئینہ کردی ہے، جس کو زیادہ تفصیل منظور ہو، وہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجس اینڈ اتھکس میں لفظ بیلونیا (بابل) دیکھے،

حران و بابل میں اور خود اسی خاندان میں حضرت ابراہیمؑ کے بعد بھی بت پرستی کا اس قدر رواج تھا، کہ حضرت ابراہیمؑ کے بھائی کا گھرانا بت پوجتا تھا، حضرت یعقوبؑ جو حضرت ابراہیمؑ کی دوسری پشت میں تھے، یعنی پوتے تھے، جب کنعان (شام) کے ملک سے حران (بابل) میں اپنے خاندان میں اپنے ماموں کی لڑکی سے بیاہ کرنے گئے، تو یہ بُت ایسی نادر چیز تھی، کہ صاحبزادی جب بیاہ کر گھر سے رخصت ہوئیں تو باپ کے بُت بھی چپکے سے چُرا لائیں، (تکوین ۳۱-۳۲-۳۴) ایسی بیش قیمت چیز کے ہاتھ سے چلے جانے پر باپ سے صبر نہ ہو سکا، بیٹی اور داماد کے تعاقب میں گھارے کر دوڑے، آخر صلح ہوئی، حضرت یعقوبؑ کو بیت ایل کے قریب پہنچ کر

جب ان بتوں کا حال معلوم ہوا، تو ان سب کو خیمہ کے باہر پھینکوا دیا۔ (تکوین ۳۵-۲)

اب ان دور دور کے استدلالات کو چھوڑ کر، ہم خود تورات کے اس سفر کا حوالہ دیتے ہیں، جو حضرت موسیٰؑ کے خلیفۂ اول یوشع کا نتیجۂ الہام ہے حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد سکیم کے مقام میں بنی اسرائیل کے سامنے جو سب سے پہلا خطبۂ خلافت انھوں نے دیا ہے، اس میں وہ کہتے ہیں،

تمہارے باپ دادے تارح (آزر) ابراہیم کا باپ اور ناحور (حضرت ابراہیمؑ کے دادا کا نام) قدیم زمانہ میں نہر (فرات) کے پار رہتے تھے، اور غیر معبودوں کی بندگی کرتے تھے۔ (۲۴-۲:۲)

کیا ہمارے دوستوں کو اس مقدمہ میں اس سے بھی واضح تر شہادت مطلوب ہے،

تفسیر کی کتابوں میں آزر کے متعلق مذکور ہے، کہ وہ بت بنا کر بیچا کرتا تھا، ایک دفعہ وہ حضرت ابراہیمؑ کو دکان میں بٹھا کر کسی ضرورت سے باہر گیا، اتنے میں ایک گاہک آیا، حضرت ابراہیمؑ نے اس کو توحید کی دعوت دی، اور بت پرستی کے معائب بیان کیے، اور دکان میں جتنے بت اور دیوتاؤں کے مجسمے بنے ہوئے رکھے تھے، سب توڑ پھوڑ کر رکھ دیئے، یہ واقعہ اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ تالمود میں مذکور ہے، قرآن مجید میں صرف حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی کا ذکر ہے

تالمود کی تفصیل جزئیات سے وہ خالی ہے، اور اس لیے ہم کو اس کے لیے مزید ثبوت پہنچانے کی ضرورت نہیں،

مریم بنت عمران، اخت ہارون | مریم، قرآن مجید کے دیگر مقدس ناموں کی طرح عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی "ستارۂ سحر" کے ہیں، بائبل میں یہ دو عورتوں کا نام ہے، حضرت موسیٰؑ اور ہارون بن عمران کی بہن کا نام بھی مریم تھا، اور حضرت عیسیٰؑ کی ماں کا نام بھی مریم ہے، پرستارانِ مریم کا بیان ہے، کہ قرآن نے ان دونوں شخصیتوں کو ایک سمجھ کر دونوں کے نام و نسب باہم مختلط کر دیئے ہیں، قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کی ماں مریم کو عمران کی بیٹی اور ہارون کی بہن قرار دیا ہے، جیسا کہ اس کی حسب ذیل آیتیں ظاہر کرتی ہیں،

مریم بنت عمران التی احصنت فرجها۔ (تحریم)	عمران کی بیٹی مریم جو پاک دامن اور عفیف تھی،
اذ قالت امرءة عمران انی نذرت لك ما فی بطنی محررا (آل عمران)	عمران کی بیوی نے جب کہا کہ جو کچھ میرے شکم میں ہے، میں خدا کے نام پر اس کو چڑھاتی ہوں،
یا اخت هارون ما کان ابوك امرا سوء وما کانت امك بغیا۔	اے ہارونؑ کی بہن تیرا باپ برا اور تیری ماں بدکردار تو نہ تھی،

تحقیقی جواب تو الگ ہے، لیکن ہم اپنے معترضین سے دست بستہ عرض کریں گے، کہ خدا را جو جی چاہے، کہیے مگر اسلام پر دو کو ایک اور ایک کو دو"

کہنے کا الزام تو نہ قائم کیجئے، اس لا انجل فلسفہ اعداد کو اپنے ہی تک محدود رکھیے، تو بہتر ہے، مؤرخین اسلام میں ایک مصنف کا نام حمزہ ہے، جس کی تاریخ ملوک الارض ہے، یورپ کا مایۂ ناز مشرقی محقق دی ہاربیلاٹ جانتے ہو، اس کو کیا سمجھتا ہے، حمزہ ابن عبدالمطلب سید الشہداء

بہر سوئے متاعِ عقل و دانش ابتر افتادہ است

بہ غارت برد باز آں چشم پُر فن کاردانے را

ہم کو یہ تسلیم ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کی بہن کا نام بھی مریم تھا، اور ان کے باپ کا نام عمران (عبری عمرام تھا)[1] لیکن یہ کیونکر معلوم ہو سکا، کہ حضرت مسیحؑ کی ماں مریم کے باپ کا نام عمران اور ان کے بھائی کا نام ہارون نہ تھا، حضرت مریمؑ کے خاندانی حالات کے متعلق انجیلوں میں ایک حرف مذکور نہیں[2]، ان کے متعلق صرف اسی قدر معلوم ہے، کہ ''وہ خداوند کی ماں'' تھیں، پھر وہ کونسی شہادتیں ہیں جن کی بنا پر قرآن مجید کے دعوے کی تردید کی جاتی ہے، اگر مسیح سے ۳۰۰ برس پہلے ایک مقدونیہ کا الگزنڈر تھا، جس کے باپ کا نام فلیپ تھا، تو کیا اس واقعہ سے اس کی تکذیب کرنا چاہتے ہو، کہ بیسویں صدی کے لندن میں اب کوئی الگزنڈر نامی شخص ایسا نہیں ہو سکتا، جس کے باپ کا نام فلیپ ہو، تاریخ میں ایسے بیسیوں

---

[1] توراۃ سفر العدد ۲۶-۵۹ [2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا آرٹیکل میری۔

خاندانوں کا ہم پتہ دے سکتے ہیں، جو گذشتہ تاریخی اور مذہبی اکابر کے نام تبرکاً استعمال کرتے ہیں،

اسلام پر آج جتنے اعتراضات کیے جاتے ہیں، عجیب بات یہ ہے، کہ گو الفاظ کسی قدر بدل جائیں، تعبیر اور طرزِ ادا میں کتنا ہی فرق آجائے، لیکن مفہوم اور مغزِ سخن کے لحاظ سے وہ وہی ہیں، جو تیرہ صدی پہلے خود انہی کے برادرانِ ملت کی زبانی بارہا دہرایا جا چکا ہے، چھٹی صدی مسیحی میں نجران جو یمن کا ایک ضلع ہے خالص عیسائی آبادی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہ رضؓ بن شعبہ کو وہاں دعوتِ اسلام کے لیے بھیجا تھا، وہ بیان کرتے ہیں،

بعثنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم	مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران بھیجا،
الی نجران فقالوا لی الستم تقرؤن	ان لوگوں نے کہا کہ تم لوگ یہ آیت نہیں پڑھتے،
یا اخت ہارون وقد کان بین	کہ "اے ہارون کی بہن" اور حضرت موسیٰؑ و
موسیٰ و عیسیٰ ما کان فلم ادر ما اجیبھم	عیسیٰؑ کے درمیان کتنا زمانہ حائل ہے، میں
فرجعت الی النبی صلی اللہ علیہ	نہ سمجھ سکا کہ اُن کو کیا جواب دوں، جب
وسلم فاخبرتہ فقال الا اخبرتھم	لوٹ کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ان کا
انھم کانوا یسمون بانبیائھم و	اعتراض عرض کیا، فرمایا تم نے یہ نہیں کہا کہ یہ
الصالحین قبلھم[1]۔	لوگ اپنے پیغمبروں اور گذشتہ بزرگوں کے نام پر

[1] صحیح ترمذی تفسیر سورۂ مریم۔

نام رکھا کرتے تھے،

اور آج بھی ہم یہی جواب دیتے ہیں' اور یہی کافی ہے'

مزید تفصیل کے لیے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں، کہ قرآن اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہے، اس نے ہر جگہ حضرت عیسیٰؑ کا نام حضرت موسیٰؑ کے بعد اور انجیل کا ذکر توراۃ کے بعد کیا ہے، سورۂ مائدہ کے پانچویں رکوع میں بتصریح اس نے بتایا ہے، کہ حضرت موسیٰؑ کے ایک مدت کے بعد حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے، ثم قفینا علی آثارھم بعیسی بن مریم' اسی قسم کی تصریح سورۂ صف سے بھی سمجھی جاتی ہے،

اس عام بحث و نزاع کے بعد' اب ہم اعتراض کے الگ الگ ٹکڑوں پر گفتگو کرتے ہیں،

مریم بنت عمران | قرآن مجید نے سورۂ مریم اور سورۂ تحریم' دو مقام پر حضرت مریمؑ کے باپ کا نام عمران بتایا ہے' یہ واقعہ ہے' اس واقعہ کے خلاف تمام عالم امکان میں کیا شہادت موجود ہے، کیا دنیا کی عظیم الشان لائبریریوں' دیلیح کتب خانوں' غیر محدود کتابوں اور لامتناہی اوراق کا ایک حرف بھی اس کی تردید کے لیے پیدا ہے، سعدیؒ کا دعویٰ جھوٹا نہیں،

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست کتب خانۂ چند ملت بشست

اناجیل' اعمال' خطوط' عیسائیت کے بے پایاں دفتر کے یہی تین اصول ہیں'

لیکن ان میں یہ کہیں مذکور ہے، کہ مریم کے باپ کا نام کیا تھا، بلکہ ہم اور آگے بڑھتے ہیں، کیا ان میں یہ بھی مذکور ہے، کہ ان کا باپ کون تھا، ہمارے چیلنج کا ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے، کیا ان میں یہ بھی مذکور ہے، کہ ان کا کوئی باپ بھی تھا، اور حق بھی یہ ہے کہ "خداوند کی ماں"، کا کوئی باپ نہ ہو،

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مصنفین لکھتے ہیں:

"پہلی صدی مسیحی کی کسی تاریخی یادداشت میں ان کے والدین کے متعلق کچھ مذکور نہیں ہے"

ان حالات کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ لوگ اپنی اولاد کا نام عموماً والدین کے نام سے کسی تناسب کی بنا پر رکھتے ہیں، تو اگر بیٹی کا نام مریم تھا، تو قرینہ دلالت کرتا ہے، کہ گذشتہ مقدس مریم کے باپ عمران کی مناسبت سے ان مریم کے باپ کا نام بھی عمران ہو، اور عجب نہیں کہ اسی تاریخی تناسب کی بنا پر حضرت مریمؑ کے باپ عمران نے اپنی بیٹی کا نام مریم رکھا ہو،

اختِ ہارون | گذشتہ نبوت نام کی طرح، اس نام کے متعلق بھی ہماری تحدی اور چیلنج کا صور اسی زور اور شدت کے ساتھ بلند ہے، اگر قرآن میں اس موقع پر "اخت" سے واقعاً بہن مراد ہے، تو تمام انجیل میں اس کے خلاف ایک حرف بھی موجود نہیں ہے، لیکن اصل یہ ہے، کہ "یہاں "اخت" سے بہن کا رشتہ مراد نہیں ہے" چنانچہ آل عمران میں حضرت مریمؑ کی جو دعا مذکور ہے کہ "خداوند میرے شکم میں

جو اولاد ہے، اس کو تیری خدمت کے لیے نذر کرتی ہوں، جب وضع حمل ہوا تو لڑکی (مریم) پیدا ہوئی، بولیں کہ خداوندا لڑکی پیدا ہوئی، اور لڑکی لڑکے کے برابر نہیں"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے کوئی بھائی نہ تھا، ورنہ وہی قربان گاہ پر نذر کیا جاتا، اصل یہ ہے کہ "اخت ہارون" کی حقیقت سمجھنے میں لوگوں نے غلطیاں کی ہیں، استعمالِ عرب کے مطابق "ہارون" سے مراد خاندان و قبیلہ ہارون ہے، بکر، سعد، وائل، اسد، نزار سے مقصود اشخاص نہیں، قبائل و خاندان ہیں، قبائل کی طرف عموماً اہلِ عرب جب "اخ" یا "اخت" کا لفظ مضاف کرتے ہیں، تو اس سے مقصود اس قبیلہ کا ایک فرد ہوتا ہے، یا اخا قریش جب عرب بولے گا تو شخص قریش کا بھائی مراد نہ ہوگا، بلکہ قبیلۂ قریش کے ایک ممبر کو خطاب سمجھا جائے گا، حدیث میں ہے "ابن اخت القوم منہم قبیلہ کی بہن کے بیٹے کا شمار اسی قبیلہ میں ہوگا" وہ کون طرفۃ العجائب عورت ہوگی جو کل قبیلہ کے قبیلہ کی بہن ہو، اس سے مقصود قبیلہ کی ایک عورت ہے اور بس! یہ استعمال عرب میں اس قدر شائع و ذائع ہے، کہ ذی روح سے نکل کر غیر ذی روح تک کے لیے استعمال ہوتا ہے، مثلاً اخا العلم اخا الجہل وغیرہ،

لوقا کی انجیل (۱-۳۶) میں ہے کہ الزبتھ حضرت یحییٰؑ کی ماں اور حضرت مریمؑ رشتہ دار تھیں، (۵) میں ہے کہ وہ ہارون کی بیٹی تھیں، اس سے واضح ہوگا، کہ حضرت مریمؑ بھی خاندان ہارون سے تھیں دیکھو انجیل کی اس اصطلاح میں بھی بیٹی سے حقیقی بیٹی مراد نہیں، ورنہ کہا جا سکتا ہے کہ انجیل مریمؑ اور حضرت ہارونؑ کو ہم عہد قرار دیتی ہے (معارف اگست و ستمبر ۱۹۱۶ء)

اساطیر الاوّلین

یورپ جس طرح علم کا مخزن ہے، وہ جہل کا بھی مرکز ہے، جس ذرہ سے اس کو اپنے ادعا میں کچھ بھی فائدہ کی توقع ہوتی ہے، اس کو وہ پتھر کی چٹان نظر آتا ہے اور جس پتھر کی چٹان سے اس کے شیشۂ ادعا کو ذرہ بھی ٹھیس لگنے کا خطرہ ہوتا ہے وہ اس کو ذرہ سے بھی کم نظر آتا ہے، اس کے نزدیک صحتِ واقعہ کا معیار دلائل کا ضعف وقوت نہیں ہے، بلکہ یہ ہے، کہ اس واقعہ کی تسلیم وانکار سے اس پر یا اس کے حریف پر کیا فوائد اور نقصانات مترتب ہوں گے۔

سر ولیم میور کو ینابیع القرآن (سورسز آف قرآن) کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے اس ثبوت سے ایک خوشی محسوس ہوتی ہے، "کہ قرآن مختلف ادیان و مذاہب کے خیالات واعتقادات کا مجموعہ ہے"۔ لیکن اس واقعہ کو اگر ہم یوں دہراتے ہیں، کہ اوقاتِ مختلفہ میں دنیا کے ہر گوشہ میں خدا کا ایک منادی اور داعی آیا و ان من امۃ الا خلا فیہا نذیر، اور قرآن ان تمام منادیوں اور دعوتوں کا مجموعہ ہے۔ وانہ لفی زبر الاولین۔ تو ہم دفعۃً دیکھتے ہیں کہ یورپین نصرانی کا سُرخ و سفید چہرہ زرد پڑ جاتا ہے کہ کہیں اس چٹان سے اس کے نازک شیشۂ اعتقاد کو

ٹھیس نہ لگ جائے،

مشہور مؤرخ گبن نے ایک موقع پر لکھا تھا:

"محمدؐ کا مذہب شک و شبہ سے پاک ہے، اور قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک شاندار شہادت ہے، پیغمبرؐ نے بتوں کی، آدمیوں کی، ستاروں کی، اور سیاروں کی پرستش اس دلیل سے رد کر دی: کہ جو طلوع ہوگا، وہ غروب ہوگا، اور جو پیدا ہوگا وہ مرے گا، اور جو حادث ہوگا، وہ فانی ہوگا، ...... عقل کے اصولِ اول یعنی توحید کی تائید میں محمدؐ کی آواز بلند ہوئی، اور اس کے پیرو مراکش سے ہندوستان تک موحدین کے لقب سے ممتاز ہیں اور بت پرستی کا خوف اب محمدؐ کے پیرووں سے بالکل دور ہے"[۵] (خلاصہ)

ہمارے ایک نصرانی دوست اولیفنٹ سمیٹن ایم، اے (________) جنھوں نے تاریخ زوالِ روم کی تصحیح و تحشیہ کی تکلیف اٹھائی ہے، حقیقت و صداقت کے اس چٹان کو دیکھ کر کانپ اٹھے، اور چاہا کہ اس اساسِ محکم اور بنیادِ غیر متزلزل کو آلاتِ جہل و افترا سے منہدم کر دیں، وانّیٰ لھم التناوش من مکان بعید۔

ہمارا یورپین نصرانی محقق گبن کے ان منصفانہ الفاظ سے بے تاب ہو کر اس موقع پر حسب ذیل حاشیہ لکھتا ہے:

---

۵ تاریخ زوال روم، ج ۵ ص ۲۳۶

گبن کا بیان محمد (صلعم) کے نظام مذہب اور اس کی جدت کی نسبت نہایت مہربانہ ہے، حالانکہ محمد (صلعم) نے تو سادگی سے ایک نظام میں ان امور کو جمع کر دیا، جو اس کے چاروں طرف دماغوں میں پھیلے ہوئے تھے، قریش خود محمد (صلعم) کو الزام دیتے تھے، کہ ان کی تمام تعلیمات ایک کتاب سے ماخوذ ہیں، جس کا نام "اساطیر الاولین" ہے، جس کا چند مقامات میں قرآن میں بھی ذکر آیا ہے، اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حشر و نشر کے واقعات پر مشتمل ہے"۔

اس غریب نصرانی کو کیا معلوم کہ اس کے قلم سے جو حرف نکل رہا ہے، وہ جہل و نامعلومی کا ایک دفتر ہے،

قرآن میں بے شک لفظ "اساطیر الاولین" متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن تم کو کس نے بتایا کہ یہ ایک کتاب کا نام ہے؟ اگر یہ استدلال صحیح ہے، کہ قرآن میں کسی لفظ کا متعدد بار استعمال اس بات کی دلیل ہے، کہ وہ کسی قدیم کتاب کا نام ہے، تو خود لفظ اسلام، رسول اللہ، اور صلوٰۃ کو کسی قدیم کتاب کا نام کیوں نہیں قرار دیتے، کہ لفظ اساطیر سے زیادہ تو یہ الفاظ قرآن میں بار بار آئے ہیں،

اساطیر الاولین کی لفظی تشریح "اساطیر الاولین" دو لفظوں سے مرکب ہے، اساطیر اور اولین،

اساطیر اسطور کی جمع ہے، جس کے معنی داستان اور قصہ کے ہیں، "اولین" اول کی جمع ہے، جس کے معنی گذشتہ پہلے اور اگلے کے ہیں، دونوں لفظوں کے

مرکب معنی ہیں، اگلوں کے قصے، پہلوں کی کہانیاں، گذشتہ اقوام واشخاص کی داستانیں،

قال الراغب اسطر الاولون فی الکتاب من القصص و الاحادیث قال الجوھری الاساطیر الاباطیل الترھات قال السدی اساجیع اولین، قال ابن عباس احادیث الاولین وقال قتادہ کذب الاولین وباطلھم	امام راغب اصفہانی اساطیر کے معنے لکھتے ہیں۔ پہلوں نے کتابوں میں جو قصے کہانیاں لکھیں، امام لغت جوہری کہتا ہے اساطیر کے معنی "بیہودہ اور خرافات باتیں" سدی کہتا ہے کہ اس کے معنی "اگلوں کے قوافی" ہیں، ابن عباسؓ فرماتے ہیں اگلوں کی باتیں اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ "اگلوں کے جھوٹ اور کذب" اس کے معنی ہیں۔

اور تعجب ہے کہ اسطور جو اساطیر کا واحد ہے کوئی ایسا لفظ نہیں، جس سے ایک یورپین محقق ناآشنا ہو، کیا اس نے اسی لفظ کو انہی معانی کے ساتھ لاطینی اور جرمن میں ہسٹوری (History انگریزی میں ہسٹری اور اسٹوری Story) کی صورت میں نہیں پڑھا ہے، اور اگر پڑھا ہے اور یقیناً پڑھا ہے، تو کیا تعصب وعداوت ہے کہ قرآن کے اس لفظ کو اس معنی میں نہیں لیتے۔

اساطیر الاولین کی معنوی تشریح انسان کی فطرت یہ ہے کہ واقعاتِ ماضیہ کی تاریخ، اقوامِ فانیہ کی سرگذشت اور اشخاصِ گذشتہ کی داستانِ زندگی سے نہایت

دلچسپی لیتا ہے اور اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ دنیا میں جس کثرت سے تاریخ اقوام اور سرگذشت اشخاص کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، کسی دوسرے علم وفن کی کتابیں نہیں پڑھی جاتی ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں بغرض اعتبار و استبصار نہایت کثرت سے اقوام ماضیہ کے اخبار تاریخی، اشخاص گذشتہ کے واقعات زندگی اور ممالک فانیہ کے حالات بقاء و فنا بیان ہوئے ہیں، کفار و ملحدین جو چشم بصیرت اور گوش اعتبار سے محروم تھے، کہتے تھے کہ قرآن میں قصص پارینہ اور افسانہائے کہنہ کے سوا اور کیا دھرا ہے؟ قیامت، معاد، اور حالات ماورائے مادہ کو بعید از عقل سمجھ کر ان کو "داستان کہن" کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ بہ ترتیب قرآن سب سے پہلی آیت جس میں "اساطیر الاولین" کا لفظ ہے، سورۂ انعام کی آیت ہے، جس کی شان نزول میں مذکور ہے،

قال ابن عباس حضر عند رسول	ابن عباسؓ فرماتے ہیں، (شدید ترین کفار
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو سفیان	مکہ) ابوسفیان، ولید، نضر، عقبہ، عتبہ،
والولید بن المغیرۃ والنضر ابن	شیبہ، امیہ، ابی اور حارث آنحضرت
الحارث وعقبۃ وعتبۃ وشیبۃ	صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپؐ کا
ابناء ربیعۃ وامیۃ وابی ابناء	کلام سنا، لوگوں نے نضر سے پوچھا، کہ محمدؐ
خلف والحارث بن عامر فاستمعوا	کیا کہتا ہے، اس نے جواب دیا، کہ یہ تو ہیں

الی حدیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا للنضر مایقول محمد فقال لا ادری مایقول الا انی اراہ یحرک شفتیہ یتکلم باساطیر الاولین کالذی کنت احدثکم بہ عن اخبار القرون الاولی قال ابوسفیان انی لاراہ بعض مایقول حقاً فقال ابوجھل کلا۔ فانزل اللہ تعالیٰ تلک الآیہ۔	نہیں جانتا، کہ وہ کیا کہتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ لب ہلاتا ہے، اور اگلوں کے قصے کہتا ہے، جس طرح میں تم کو گزشتوں کے قصے بیان کیا کرتا تھا، ابوسفیان نے کہا کہ محمدؐ جو کہتا ہے اس میں سے بعض باتیں تو سچی معلوم ہوتی ہیں، ابوجہل نے کہا ہرگز نہیں"۔ اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی،

خود ان آیات پر غور کرنا چاہیے جن میں یہ الفاظ آئے ہیں،

اساطیر الاولین کے مواقع قرآن مجید میں یہ لفظ نو۹ جگہ آیا ہے، لیکن ہر جگہ ان معانی کے سوا جو ہم نے بیان کیے ہیں، کوئی اور معنی نہیں بن سکتے، چہ جائیکہ کسی کتاب کے نام کی طرف اشارہ ہو، ہم ان تمام آیتوں کو نقل کرتے ہیں،

(۱) یقول الذین کفروا ان ھذا الا اساطیر الاولین۔	(۱) کافر کہتے ہیں، کہ یہ (قرآن) تو صرف اگلوں کی کہانی ہے،
(۲) واذا تتلی علیھم آیاتنا قالوا	(۲) جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی

قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل ھذا ان ھذا الا اساطیر الاولین۔

جاتی ہیں، تو کہتے ہیں، ہم سن چکے، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی ایسا کہہ سکتے، یہ تو صرف اگلوں کی کہانی ہے،

(۳) واذا قیل لھم ماذا انزل ربکم قالوا اساطیر الاولین۔

(۳) ان منافقین سے جب پوچھا جاتا ہے، کہ تمہارے خدا نے کیا نازل کیا تو کہتے ہیں، وہی اگلوں کی کہانیاں،

(۴) قالوا اذا متنا وکنا ترابا وعظاما انا لمبعوثون لقد وعدنا نحن و اباءنا ھذا من قبل ان ھذا الا اساطیر الاولین۔

(۴) حیرت سے کہتے ہیں، کہ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مرکر صرف مٹی اور ہڈی رہ جائیں گے، تو کیا ہم پھر اٹھائے جائیں گے، یہ تو ہم سے اور اس سے پہلے ہمارے بزرگوں سے بھی کہا گیا تھا، یہ کچھ نہیں، یہ خیالات تو صرف پرانے لوگوں کی قصہ کہانی کی باتیں ہیں،

(۵) قال الذین کفروا ان ھذا الا افک افتراہ واعانہ علیہ قوم آخرون وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ و اصیلا ۔ (فرقان - ۱)

(۵) کافر کہتے ہیں، کہ یہ قرآن اختراع ہے، خدا کی طرف سے نہیں، محمدؐ نے خود گڑھا ہے، اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کو مدد دی ہے، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں، کہ یہ تو پہلوں کی کہانی ہے، جس کو محمدؐ نے لکھا لیا ہے، اور صبح و شام اس کو

پڑھ کر سنایا جاتا ہے،

(۶) وقال الذین کفروا ءاذا کنا ترابا وءاباؤنا ائنا لمخرجون لقد وعدنا ھذا نحن وءاباؤنا من قبل ان ھذا الا اساطیر الاولین۔

(۶) کافر کہتے ہیں، کہ کیا جب ہم اور ہمارے اسلاف مٹی ہو جائیں گے، ہم پھر قبر سے نکالے جائیں گے؟ یہ تو ہم سے اور ہم سے پہلوں سے بھی وعدے کیے گئے تھے کچھ نہیں یہ تو صرف اگلوں کی کہانی ہے،

(۷) والذی قال لوالدیه اف لکما اتعداننی ان اخرج وقد خلت القرون من قبلی وھما یستغیثان اللہ ویلك آمن ان وعد اللہ حق فیقول ما ھذا الا اساطیر الاولین اولئك الذین حق علیھم القول

(احقاف - ۲)

(۷) جس کافر بیٹے نے اپنے مسلمان ماں باپ کو جھڑک کر کہا کیا تم دونوں اس کا مجھ سے وعدہ کرتے ہو، کہ قبر سے اٹھایا جاؤں گا، مجھ سے پہلے کتنی قومیں گذر گئیں (اور ان کا نشان بھی نہیں) اس کے ماں باپ نے اس کو خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ اے بدبخت ایمان لا! خدا کا وعدہ سچا ہے، بیٹا کہتا ہے کہ یہ صرف پرانے لوگوں کی کہانی ہے، یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا کا عذاب واجب ہو چکا۔

(۸) ولا تطع کل حلاف مھین ھماز مشاء بنمیم، مناع للخیر معتد اثیم عتل

(۸) تو ان کی اطاعت نہ کر جو ذلیل ہیں، اور قسمیں بہت کھایا کرتے ہیں، جو عیب جو

بعد ذالک زنیم، ان کان ذا مال وبنین اذا تتلی علیہ اٰیاتنا قال اساطیر الاولین۔	اور غماز ہیں، جو اس لیے کہ صاحب فرزند و مال ہیں نیکی سے لوگوں کو روکتے ہیں، جو حد سے متجاوز ہیں، جو گنہگار ہیں، اور جو بدنہاد و بداصل ہیں، ان کو جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو (بے پروائی سے) کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کی کہانیاں ہیں،
(ن - ۱)	
(۹) وما یکذب بہ الا کل معتد اثیم اذا تتلی علیہ اٰیاتنا قال اساطیر الاولین۔	(۹) قرآن کی تکذیب وہی کرتے ہیں، جو ظالم اور گنہ گار ہیں، ان کو جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو کہتے ہیں، کہ اگلوں کی کہانیاں ہیں۔

خلاصہ: قرآن مجید کی ان آیاتِ کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ اساطیر کسی کتابِ دینی کا نام نہیں ہے، جس سے قرآن ماخوذ ہو، بلکہ کفار کا اس سے مقصود کہیں تو یہ ہے کہ اس میں قصے اور کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں، اور کہیں یہ مقصود ہے کہ قیامت، معاد اور حیات مابعد الموت کچھ معقول بات نہیں، صرف اگلوں کی بیہودہ کہانی ہے، جس پر پرانے لوگ اپنی بیوقوفی سے یقین رکھتے تھے۔

بدقسمتی دیکھو کہ یہ بعینہٖ وہی اعتقاد فاسد ہے، جو کبھی کفار کا تھا، اور آج ان مسلمان متفرنجین کا ہے، جو قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتے۔ جو خدا کے

ظہور وجلال کے منکر ہیں، جو اعمال کے مواخذہ سے بے پروا ہیں، مرنے والو! کیا موت تمہیں کبھی نہ آئے گی، ہاں! ایک بار آئے گی، جس کے بعد تم کو زندہ چھوڑ کر کبھی نہ آئے گی،

قد خسر الذین کذبوا بلقآء اللہ	جو قیامت کے منکر ہیں، وہ یقیناً نقصان
حتیٰ اذا جآءتھم الساعۃ بغتۃ	اٹھائیں گے، جب ناگہاں وہ گھڑی آ جائیگی
قالوا یا حسرتنا علیٰ ما فرطنا فیھا وھم	تو حسرت سے کہیں گے اس گھڑی کی نسبت
یحملون اوزارھم علیٰ ظھورھم الا	ہماری سست اعتقادی پر افسوس (خاموش!
سآء ما یزرون وما الحیٰوۃ الدنیا	کہ اب افسوس و حسرت کا وقت نہیں) آج
الا لعب ولھو، وللدار الاخرۃ	ان کی پشت گناہ کے بوجھ سے گراں ہے، کیا
خیر للذین یتقون افلا تعقلون۔	برا بوجھ ہے، مغرورو! تم جس دنیا کی زندگی پر
	مغرور ہو! اس میں لہو و لعب کے سوا اور کیا
	دھرا ہے، دار آخرت نیک لوگوں کے لیے
	بہترین محلِ اقامت ہے، نادانو! کیا نہیں سمجھ
(انعام - ۹)	سکتے؟

(الہلال کلکتہ، ۱۵ اپریل ۱۹۱۴ء)

تذکار نزول القرآن
اُسوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن

یاایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ (بقرہ)	مسلمانو! تم پر روزے اسی طرح لکھے گئے، جس طرح تم سے پہلی امتوں اور قوموں پر اس سے پہلے لکھے گئے تھے، تاکہ تقویٰ تم میں پیدا ہو،
شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینات من الھدی والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ ومن کان مریضاً او علی سفر فعدۃ من ایام اخر یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر	ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا، جو لوگوں کے لیے سرتاپا ہدایت ہے، جو ہدایت وتمیز حق وباطل کی نشانی ہے، پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود رہے، وہ روزہ رکھے، اور جو مریض یا مسافر ہو، وہ ان کے بدلے دوسرے دنوں میں پھر روزے رکھ لے۔ خدا آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا،

ولتکملوا العدۃ ولتکبروا اللہ	تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو، اور
علی ما ھدٰکم ولعلکم تشکرون۔	روزے اس لیے فرض ہوئے کہ تم اس عطائے
(بقرہ ۲۳)	ہدایت پر خدا کی بڑائی کرو اور شکر بجالاؤ۔

مکّہ سے تین میل کی مسافت پر کوہ حرار واقع ہے، آج سے ۱۳۴۴ برس پہلے ماہ رمضان میں جب سخت گرمی کے دن تھے[1] اور شدتِ حرارت سے ریگستانِ بطحار کا ذرہ ذرہ تنور بن رہا تھا، اسی کوہ حرار کے ایک تیرہ وتاریک غار میں مادیاتِ عالم سے ایک کنارہ کش انسان سر بزانو تھا،

وہ بھوکا تھا، لیکن بھوکا نہ تھا، کہ اس کے پاس کھانے کی وہ چیز تھی، جس کو کھا کر پھر انسان کبھی بھوکا نہیں ہوتا، وہ پیاسا تھا، لیکن پیاسا نہ تھا، کہ اس کے پاس پینے کی وہ چیز تھی، جس کو پی کر، پھر انسان کبھی پیاسا نہیں ہوتا، وہ تین تین، چار چار دن کھانا پینا چھوڑ دیتا تھا[2]، اس کے جان نثار بھی اس کی محبت میں کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے، لیکن وہ ان کو منع کرتا تھا، کہ

ایکم مثلی ابیت یطعمنی ربی	تم میں کون میری طرح ہے، میں بھوکا ہوتا

---

(۱) رمضان کے معنی شدتِ حرارت کے ہیں، اس سے اور دیگر اسمائے مشہورہ کے قرینے سے مستنبط ہوتا ہے، کہ عرب میں قبل اسلام ناقص طور سے شمسی مہینے جاری تھے، اس لیے رمضان گرمی کا مہینہ ہوگا، (۲) صوم وصال،

ویسقینی۔ ہوں، تو میرا آقا مجھ کو کھلاتا ہے، میں پیاسا

(رواہ البخاری ومسلم فی صحیحہما) ہوتا ہوں تو میرا آقا مجھکو پلاتا ہے۔

کوہِ حرا کا مقدس عزلت نشین اسی طرح بھوکا پیاسا سر بزانو تھا کہ ایک نور[۱] بے کیف نے تیرہ و تار غار کو روشن کر دیا، وہ نور بے کیف کیا تھا، ہدایت و فرقان کا ایک آفتاب تھا، جو مطلعِ خطیرۃ القدس سے طلوع ہو کر اس کے سینہ میں غروب[۲] ہو گیا، فانہ نزلہ علی قلبک۔ (بقرہ) اور پھر اس کے سینہ سے نکل کر تمام عالم کو اس کی شعاعوں نے روشن کر دیا، وما ارسلناک الا رحمۃ للعلمین (بقرہ)

صیام رمضان | وہ آفتاب جس کا مطلع خطیرۃ القدس تھا، وہ آفتاب جس کا مغرب سینۂ نبوی تھا، وہ آفتاب جس نے عالم کو منور کیا، قرآن مجید تھا، جو ماہِ مقدس کی شبِ مبارک میں آسمان سے زمین پر نازل ہونا شروع ہوا، وہ کون سا ماہ مقدس تھا، جس میں خدا کا کلام بندوں کو پہنچنا شروع ہوا؟ وہ ماہ رمضان تھا،

شھر رمضان الذی انزل فیہ رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن اترا،
القرآن ھدی للناس وبینات جو لوگوں کے لیے سرتا پا ہدایت ہے، جو ہدایت
من الھدی والفرقان۔ و تمیز حق و باطل کی نشانی ہے،

پس ان ایام میں ہماری بھوک، ہماری پیاس، ہمارا مادیاتِ عالم سے اجتناب

۱؎ وحی قرآن۔ ۲؎ نزول قرآن کی ابتدا رمضان میں ہوئی، کما سیاتی،

اس یادگار میں ہے، کہ ہم تک جو خدا کا پیغام لایا، وہ ان دنوں بھوکا اور پیاسا تھا،
اور وہ تمام لذاتِ مادی سے مجتنب تھا،[۱]

فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ۔ ... پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود ہو، وہ
(بقرہ ۲۳) روزے رکھے۔

یاایھا الذین آمنوا کتب علیکم ... مسلمانو! تم پر روزہ اسی طرح لکھا گیا ہے،
الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم۔ جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا تھا،

پس رمضان کی حقیقت کیا ہے، وہ ماہِ مقدس جس میں داعیٔ اسلام حسبِ

۱؎ یہ اس کا حال تھا، جو کوہ فاران (کوہ حرا) کی چوٹی سے جلوہ گر ہوا تھا۔ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) لیکن وہ جو سینا سے آیا (موسیٰ علیہ السلام) وہ بھی تورات لینے کے لیے جب پہاڑ پر چڑھا تھا، وہاں چالیس روز بدلی کے درمیان خداوند کے حضور رہا تھا (خروج ۳۴-۱۸) اسی طرح وہ بھی جو کوہ سعیر (کوہ زیتون) سے طلوع ہوا تھا، (مسیح علیہ السلام) اس سے پہلے کہ وہ خدا کی منادی شروع کرے، جنگل میں چالیس روز دن رات بھوکا اور پیاسا رہا تھا، (متی ۴-۲) پس ضرور تھا کہ وہ جو کوہ فاران سے جلوہ گر ہونے والا تھا، وہ بھی اس سے پہلے کہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ وہ آئے، اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہو، وہ خداوند کے حضور بھوکا اور پیاسا رہے، تاکہ جو لکھا گیا ہے، وہ پورا ہو:

⁂ ⁂ ⁂

اتباعِ نوامیسِ نبوت، تحملِ نزولِ قرآن کے لیے عالم کی مادی ضرورتوں سے مستغنی رہا، اور اس لیے ضروری ہوا، کہ پیروانِ ملتِ اسلامیہ اور متبعین طریقتِ محمدیہ ان ایام میں ضروریاتِ مادیۂ عالم سے مستغنی رہیں، کہ اس توفیق و ہدایت کا شکریہ و ممنونیت اور اظہارِ اطاعت و عبودیت ہو جو ان کو اس ماہ مقدس میں عطا ہوئی،

شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن، هدی للناس وبینات من الهدیٰ والفرقان، فمن شهد منکم الشهر فلیصمه و من کان مریضاً او علیٰ سفر فعدة من ایام اُخر، یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدة ولتکبروا الله علی ما هداکم ولعلکم تشکرون۔ (بقرہ)	ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا، جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے، جو ہدایت و تمیز حق و باطل کی نشانی ہے، پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود ہو وہ روزے رکھے، جو بیمار یا مسافر ہو، وہ اُن کے بدلے اور دنوں میں روزے رکھ لے، خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو، اور روزے کیوں فرض ہوئے؟ اس لیے کہ تم خدا کی ہدایت پر اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو،

ان آیات میں صاف بتا دیا گیا، کہ مفروضیتِ صیامِ رمضان صرف اس لیے ہے کہ ہم اس عطائے ناموس فرقان و ھدی (قرآن) پر خدا کا شکر بجالائیں، اور اس کے نام کی تقدیس کریں، پس کون مسلم ہے جو خدا کے اس احسانِ اکبر اور نعمتِ عظمیٰ کے شکر

کے لیے تیار، اور اس کی تقدیس کے لیے آمادہ نہیں؟ اس کی تقدیس و تمجید میں خود کو فراموش کردو، اس کے کلام کی عظمت کو یاد کرو، جس نے تم جیسی زار و نزار کمزور قوم کو اپنی تسلی سے قوی کیا، جو پھر کبھی کمزور نہ ہوگی، جس نے ۱۳۴۴ برس ہوئے کہ توحید کی آگ تمہارے سینوں میں روشن کی، جو پھر کبھی نہیں بجھیگی، جس نے تمہارے سر پہ تاجِ خیر الامم رکھا، جو کبھی نہیں اتر سکتا۔

شبِ قدر | وہ کون سی شب مبارک تھی، جس میں خدا کا کلام روح پر در ایک انسان کے منہ میں ڈالا گیا، وہ لیلۃ القدر یعنی عزت و حرمت کی رات تھی، بیشک وہ عزت و حرمت کی رات تھی، وہ رات تھی جو ہزار مہینہ سے بہتر تھی، کہ اس میں خداوند گویا ہوا، وہ فرشتوں کی آمد کی رات تھی، کہ آسمان کی باتیں زمین والوں کو سنائیں، وہ امن و سلامتی کی رات تھی، کہ اس میں دنیا کے لیے امن و سلامتی کا پیغام اترا۔

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر وما	ہم نے قرآن کو عزت و حرمت والی رات میں
ادرٰک ما لیلۃ القدر، لیلۃ	نازل کیا، اور اے مخاطب تمہیں کس نے بتایا کہ عزت
القدر خیر من الف شھر تنزل	و حرمت والی رات کیا ہے؟ وہ رات جو ہزار
الملٰئکۃ والروح فیھا باذن	مہینہ سے بہتر ہے، جس میں ارواحِ مقدسہ
ربھم من کل امر سلام ھی حتی	اور فرشتے حکم خدا سے احکام لے کر نازل ہوتے
مطلع الفجر۔ (القدر)	ہیں، اس رات میں طلوع صبح تک سلامتی ہے،

وہ شب کیا عجیب شب تھی، دنیا عصیان و ناحق شناسی کی تاریکی میں مبتلا

تھی، دیو یا طلسم کا تمام عالم پر استیلا تھا، توحید کا چہرۂ نورانی، کفر و شرک کی ظلمت میں محجوب تھا، نیکیاں بدیوں سے شکست کھا چکی تھیں، دنیا کی تمام متمدن اور زبردست قومیں قوتِ الٰہی سے بغاوت کا اعلان کر چکی تھیں، ایک نحیف و ضعیف قوم بحر احمر کے کنارے کے ریگستانوں پر غفلت و جہالت کے بستروں پر پڑی سو رہی تھی، لیکن اس ظلمت کدۂ عالم میں صرف ایک گوشہ تھا، جو روشن تھا، وہ گوشہ غار حراء کا گوشہ تھا، اس بغاوت و طغیان عالم میں ایک شے تھی، جو قوتِ الٰہی کے آگے اطاعت و تسلیم کے ساتھ سر بسجود تھی، وہ عزلت نشینِ حراءؑ کی جبینِ مبارک تھی، اور ایک ہی قلب تھا جو بیدار تھا، اور وہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا قلبِ اقدس تھا،

یہ کیا عجیب و غریب شب تھی۔ جب کہ قوموں کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا، جب جبابرۂ عالم کی تنبیہ و تادیب کے لیے ایک نحیف و ضعیف قوم کا انتخاب ہو رہا تھا، جب نیکیوں کا لشکر دوبارہ مقابلہ کے لیے آراستہ کیا جا رہا تھا، اور اُس کی سر عسکری کے لیے وہ وجودِ اقدس منتخب ہو رہا تھا، جو حراء کے غیر مصنوع حجرہ میں بیدار اور سر بسجود تھا، اور رحمت کے محافظ فرشتے اس کے گرد صف بستہ تھے،

انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین فیھا یفرق کل	ہم نے اس کتاب مبین کو ایک مبارک شب میں اتارا کہ ہمیں انسانوں کو ڈرانا تھا وہ

امراً حکیم، امراً من عندنا انا کنا مرسلین، رحمة من ربك انه هو السمیع العلیم۔	مبارک شب جس میں ہر راز حکمت امور کا ہمارے حکم سے فیصلہ کیا جاتا ہے، انسانوں کے پاس اپنی رحمت سے ایک رہنما بھیجنا تھا، کیونکہ ہم پکارنے والوں کی دعائیں سنتے ہیں، اور دنیا کے ذرہ ذرہ کا حال جانتے ہیں،

پس یہ وہ شب ہے، جس میں اقوام عالم کی قسمتوں کا فیصلہ ہو، یہ وہ شب ہے، جس میں برکات ربانی کی ہم پر سب سے پہلی بارش ہوئی، یہ وہ شب ہے جب اس سینہ میں جو خزینۂ نبوت تھا، کلام الٰہی کے اسرار سب سے پہلے منکشف ہوئے، اور آسمانی رحمتوں نے زمین میں نزول کیا، پس ہر مسلم کا فرض ہے، کہ وہ اس لیلۃ مبارکہ میں رحمتوں کا طالب ہو، اور اس رحمان و رحیم ہستی کے آگے سر نیاز خم کرے، جبین پر معاصی کو زمین پر عجز و خاکساری سے رکھے، اور بصد خضوع و خشوع دست تضرع دراز کرے، کہ خدایا ۔

اٰمن الرسول بما انزل الیه من ربه والمومنون کل اٰمن بالله وملٰئکته وکتبه ورسله، لا نفرق بین احد من رسله وقالوا: سمعنا واطعنا غفرانك ربنا	رسول جو کچھ اس پر نازل ہوا، اس پر ایمان لایا، اور اہل ایمان بھی، ایمان لائے، سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اور پکار اٹھے، اے پروردگار! تیری باتیں سنیں

والیک المصیر لا یکلف اللّٰہ نفساً	تیری اطاعت کا عہد کیا، اب تیری مغفرت
الا وسعھا، لھا ما کسبت وعلیہا	کے طالب ہیں، اور تو ہی ہمارا مرجع ہے،
ما اکتسبت ربنا لا تواخذنا	کسی کو تو اس کی قوت سے زیادہ حکم نہیں
ان نسینا او اخطأنا ربنا ولا تحمل	دیتا، اور خیر و شر سب انسان کی کمائی ہے
علینا اصراً کما حملتہ علی الذین	، پس اے پروردگار! اگر ہم سے بھول ہو،
من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا	یا کوئی خطا ہو، تو مواخذہ نہ کر، پروردگار!
طاقۃ لنا بہ واعف عنا	ہم سے پہلوں کی طرح ہم کو گرانبار نہ بنا،
واغفر لنا وارحمنا انت مولانا	پروردگار! ہماری طاقت سے زیادہ
فانصرنا علی القوم الکافرین۔	ہم کو بوجھ نہ دے، ہمیں معاف کر، ہمارے
	گناہ بخش، ہم پیارے ہمارے آقا! رحم فرما،
(بقرہ - ۴۰)	اور کفار پر ہمیں غلبہ نصیب کر،

اعتکاف، مسلمان ان ایام میں مساجد کے گوشوں میں عزلت نشین (معتکف) ہوتے ہیں، کہ غارِ حرا کا گوشہ نشین بھی ان دنوں عزلت نشین تھا، مسلمان ایامِ اعتکاف میں اس متکلمِ ازلی کے سوا جو ان راتوں میں معتکفِ حرا سے گویا ہوا تھا، کسی سے نہیں بولتے کہ ایسا ہی اس نے بھی کیا تھا، جس کے منہ میں اس متکلمِ ازلی نے اپنی بولی ڈالی، جب وہ حرا کے ایک گوشہ میں سربزانو معتکف تھا،

پس ہر مسلم آبادی میں چند نفوسِ مسلم کے لیے ضروری ہے کہ اواخرِ عشرۂ رمضان

میں مسجد کے ایک گوشہ میں شب و روز محویت اتباع نبوی، تلاوت کتاب عزیز، تفکر خلق سماوات و ارض، ذکر نعم الٰہی، تذکر اسمائے حسنیٰ اور تحمید و تسلیم و ادائے صلوٰت میں اس طرح بسر کریں، کہ ان اوقات محدودہ کا کوئی لمحہ تذکر و تفکر سے خالی نہ ہو تا کہ ان اشخاص مقدسہ کا جلوہ اس کی آنکھوں میں پھر جائے،

الذین یذکرون اللّٰہ قیاماً و قعوداً و علی جنوبھم (آل عمران)	جو ہمیشہ اٹھتے، بیٹھتے لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں،
الذین اذا ذکروا بھا خرّوا سجداً و سبّحوا بحمد ربھم وھم لا یستکبرون، تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً وطمعاً (سجدہ)	وہ جو قرآن کی آیتیں جب ان کو یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے ہیں، ان کے پہلو راتوں کو بستر سے الگ رہتے ہیں، اور وہ امید و بیم کے ساتھ خدا سے دعائیں کرتے ہیں،
رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللّٰہ	جن کو خرید و فروخت وغیرہ دنیاوی اشغال ذکر خدا سے غافل نہیں کرتے۔

اسماعیل و ابراہیم (علیہما السلام) کی سب سے پہلی مسجد جن اغراض کے لیے تعمیر ہوئی تھی، ان میں ایک غرض یہ بھی تھی، کہ وہ عزلت گزینان عبادت گذار کا مسکن ہو،

وعھدنا الی ابراھیم واسمٰعیل ان طھرا بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود۔	ہم نے ابراہیم و اسماعیل سے عہد لیا، کہ وہ میرے گھر کو طواف، اعتکاف، رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیں،

پس اے فرزندانِ اسماعیل و ابراہیم! اپنے باپ کے عہد کو یاد کرو، اور جس گھر کو رکوع و سجود کے لیے پاک رکھتے ہو، اسے اعتکاف کے لیے بھی پاک رکھو، کہ تمہارے باپ اسماعیل و ابراہیم کا عہد خداوند کے حضور جھوٹا نہ ہو،

قیام رمضان | کیا عجیب وہ جوش محویت ہے، جب مسلمان دن بھر کی بھوک اور پیاس کے بعد رات کو خدا کی یاد کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، اللہ اللہ! وہ تکلیف جو راحت قلبی کا باعث ہو، معتکفِ حرا بھی اسی طرح خدا کی یاد کے لیے رات بھر کھڑا رہتا تھا، یہاں تک کہ اس کے پاؤں میں ورم آجاتا تھا، کہ خدا کی ہدایت کا شکریہ بجا لائے،

پس شب کو جب عالم سنسان ہے، اور دُنیا کا ذرہ ذرہ خاموش اور محو خواب شیریں ہے، آؤ شیفتگان سنت محمدیہ! کہ ماہِ مقدس آیا، ہم اپنے بستروں کو خالی کریں، خدا کی تقدیس میں مشغول ہوں اور اس کی حمد و ثنا کریں، جس نے اس ظلمتکدہ عالم میں صرف ہم کو ایک ایسا چراغ دیا، جس سے ہمارے قلوب منور ہو گئے۔

سبحان ذی الملک والملکوت	تقدیس ہو حکومت و شہنشاہی والے کی،
سبحان ذی العزۃ والعظمۃ والھیبۃ والقدرۃ والکبریاء	تقدیس ہو عزت و عظمت، ہیبت قدرت، کبریائی اور جبروت والے کی،

والجبروت سبحان الملک والحیّ — تقدیس ہو اس زندہ بادشاہ کی جو
الذی لا ینام ولا یموت. — نہ کبھی سوتا ہے، اور نہ کبھی مرتا،
ابداً ابداً سبوح قدوس — پاک، قدوس، ہمارا آقا، اور تمام
ربنا رب الملائکۃ والروح، — فرشتوں اور روحوں کا آقا،

حقیقتِ صوم

ہم نے مقالہ سابقہ میں بتایا ہے کہ ماہِ صیام کی اصل حقیقت نزولِ قرآن کی یادگار اور حاملِ قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ اور سنتِ مستحسنہ کی اتباع وتقلید ہے، کہ ان ایام میں آپؐ اسی طرح غارِ حرا میں قیام فرماتے تھے، اور اسی اثنائے قیام میں وہ نامۂ خیر وبرکت اور دستورِ ہدایت وقرآن ہمیں عنایت ہوا، جس سے ہم نے جسم کی زندگی اور روح کی تسلی پائی، پس یہ یوم اکبر یعنی نزولِ قرآن جو لیلۃ القدر ہے، اسلام کی عید اکبر ہے، اور حق ہے کہ تمام بندگانِ اسلام اور شیفتگانِ اسوۂ محمدیہ ان ایامِ مقدسہ میں وہ زندگی بسر کریں، جو قرآن کا مطلوب تھا اور حاملِ قرآن کا نمونہ ہو،

قرآن مجید نے حکم صیام کے موقع پر جیسا کہ آیاتِ سر عنوان مقالۂ سابقہ میں مذکور ہے، ہم کو صوم کے تین نتائج کی اطلاع دی ہے،

لعلکم تتقون ۔ تاکہ تم متقی ہو،

لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم ۔ تاکہ تم اس عطائے ہدایت پر خدا کی تکبیر و تقدیس کرو،

ولعلکم تشکرون — تاکہ تم اس نزول خیر و برکت اور اس عطائے فرقان پر خدا کا شکر بجالاؤ۔

اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ صوم کی حقیقت تین اجزاء سے مرکب ہے، اتقا، تکبیر و تقدیس، اور حمد و شکر، پس جس طرح حقیقتِ مرکبہ کا وجود عین اجزاء کا وجود ہے، کہ بغیر وجود اجزاء حقیقت معدوم اسی طرح صوم بغیر وجود اجزائے ثلاثہ مذکورہ معدوم و مفقود ہے،

اعمالِ انسانیہ کا وجودِ حقیقی ان کے نتائج و آثار کا وجود ہے، اگر نتائج و آثار وجود پذیر نہ ہوئے، تو یہ نہ کہو کہ ان اعمال کا وجود تھا، اگر ہم دوڑتے ہیں، کہ مسافت قطع اور منزل قریب ہو، لیکن ہم بھٹک کر دوسرے راستہ پر جا پڑتے ہیں، جس سے ہماری مسافت دور تر اور منزل بعید تر ہوتی جاتی ہے، تو ہماری سعی لاحاصل اور ہماری تگاپو عبث ہے، اگر ایک طبیب مریض کے لیے ایک دوا تجویز کرتا ہے، لیکن جس فائدہ کے مترتب ہونے کی امید کرتا ہے، وہ مترتب نہیں ہوتا، تو یہ سمجھنا چاہیے کہ دوا کا استعمال صحیح نہیں کیا گیا۔

پس صیام جو ہمارا علاجِ روحانی ہے، اگر اس سے شفائے روحانی نہ حاصل ہو، تو حقیقت میں وہ صیام نہیں فاقہ ہے، اور ایسے صائم اور روزہ دار جن کے صوم میں اتقاء، تقدیس، اور شکر کے عناصر ثلثہ نہیں، وہ فاقہ کش ہیں، جن کی بھوک پیاس ایک پھول ہے، جس میں رنگ و بو نہیں، ایک گوہر ہے، جس میں

آب نہیں، ایک آئینہ ہے، جس میں جوہر نہیں، اور ایک جسم ہے جس میں روح نہیں، اور کون نہیں جانتا، کہ ایک گل بے رنگ و بو، ایک گوہر بے آب، ایک آئینہ بے جوہر، ایک جسم بے روح بے حقیقت ہستیاں ہیں، جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جہاں فرمایا ہے۔

رب صائم لیس لہ من صیامہ الا الجوع ورب قائم لیس لہ من قیامہ الا السہر۔ (رواہ ابن ماجہ)

کتنے روزہ دار ہیں، جن کو روزہ سے بجز گرسنگی کچھ حاصل نہیں، اور کتنے تہجد گذار ہیں، جن کی نماز تہجد سے بیداری کے سوا کچھ فائدہ نہیں،

یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے جسم نے روزہ رکھا، لیکن دل نے روزہ نہیں رکھا، ان کی زبان پیاسی تھی، لیکن دل پیاسا نہ تھا، پس رحمت کا کوثر ان کے لیے نہیں کہ پیاسے نہ تھے۔

ہمارے اوقاتِ زندگی کی سب سے بڑی اور طویل تقسیم خود ہماری عمر ہے، اس کے ہر لحظہ میں ایمان باللہ بما جاء الرسول، ہر دن میں پانچ بار سجدۂ نیاز، ہر ہفتہ میں نماز جمعہ، ہر سال میں صیام رمضان و زکوٰۃ اور ساری عمر میں ایک بار زیارت مسجد خلیل اور ادائے نماز ابراہیمی فرض ہے،

ہمارے سالانہ فرض دو ہیں، ایک جسمانی اور ایک مالی، فریضۂ مالی (زکوٰۃ)

محدود باوقات مخصوصہ نہیں ہے، لیکن فریضۂ جسمانی محدود بہ اوقات ہے تاکہ پہلے سے خدا کی مسکین مخلوق ہر ساعت اور ہر حالت میں متمتع ہوتی رہے، اور دوسرے سے وہ تمام یکرنگی اور اظہار اجتماع و وحدت قلوب واجسام متصور ہے، جو ہر روز مساجد میں اور ہر سال ہر شہر کے کوچہ و بازار اور گھروں میں اور عمر میں ایک بار کوہ فاران کے دامن میں نظر آتی ہے:

پس ہمارے سال کا ایک مہینہ ہماری زندگی کا ایک ایسا حصہ ہونا چاہیے جو تنزہ جسم اور طہارت قلب کا کامل نمونہ ہو، تاکہ ہمارا کامل سال منزہ اور طاہر ہو، اور اس طرح ہماری کامل زندگی منزہ اور طاہر ہو، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفرلہ ماتقدم من ذنبہ:	جس نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب (نیکی) کے ساتھ رکھے، اس کے اگلے گناہ معاف ہوئے،
(رواہ البخاری)	

گناہوں کی معافی اور مغفرت کا حصول، تمام اعمال انسانیہ کا مقصود وحید اور تمام نیکیوں اور برکتوں کی اساس کا ہے، لیکن کیا جس نے حصول مغفرت اور گناہوں کی معافی کی امید دلائی، اس نے یہ نہیں بتایا ہے، کہ وہ مشروط بہ ایمان واحتساب ہے:

ایمان واحتساب کیا شے ہے؟ حقیقت صوم کے وہی عناصر ثلثہ ہیں،

جن کی طرف کتاب عزیز نے اشارہ کیا ہے، یعنی اتقا، تقدیس و تکبیر اور حمد و شکر، اتقا کے لغوی معنی کسی چیز سے بچنے کے ہیں، لیکن اسلام کی اصطلاح میں اتقا کے کیا معنی ہیں؟ تمام دنیاوی آلائشوں سے، تمام انسانی کمزوریوں سے، تمام جسمانی خواہشوں سے اور تمام انسانی نجاستوں سے جسم و روح کا محفوظ رکھنا، یہی حقیقت و ماہیت صوم ہے، جس کے ساتھ دل سے تقدیس و تکبیر کی صدائے غیر محسوس اور زبان سے حمد و شکر کی آواز بلند ہونی چاہیے تاکہ معتکفِ غار حرا کے اسوۂ حسنہ کا کامل اتباع ہو،

تم سمجھتے ہو کہ آلودگی گناہ، آلائش ہوی اور ارتکاب عصیان و نجاسات نفسانی ناقضِ صوم نہیں، ممکن ہے کہ جسم کا روزہ نہ ٹوٹتا ہو لیکن دل کا روزہ تو ضرور ٹوٹ جاتا ہے، اور جب دل ٹوٹتا ہو، تو جسم میں کیا رکھا ہے،

الصائم فی عبادۃ من حین یصبح	روزہ دار صبح سے شام تک عبادت خدا میں
الی ان یمسی ما لم یغتب فاذا	ہے، جب تک کسی کی برائی نہ کرے، اور جب
اغتاب خرق صومہ (رواہ الدیلمی)	وہ برائی کرتا ہے، تو اپنے روزہ کو پھاڑ ڈالتا ہے،

تم سمجھتے ہو، کہ بغاوت نفس، اطاعتِ ہوی اور عمل شر منافیِ صوم نہیں، لیکن میں تمہیں سچا سمجھوں یا اس کو (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) جو کہتا ہے،

لیس الصیام من الاکل والشرب	روزہ کھانے پینے سے پرہیز کا نام
انما الصیام من اللغو والرفث	نہیں ہے، بلکہ لغو و عمل شر سے پرہیز کا نام

(رواہ الحاکم فی المستدرک والبیہقی فی السنن) ہے؛

کیا تم یہ سمجھتے ہو، کہ قول زور، عملِ بد، اور طغیانِ قلب مضر صحتِ صوم نہیں لیکن میں کیا کروں کہ مخبر صادق کی وہ آواز سنتا ہوں جس کی میں تکذیب نہیں کرسکتا۔

من لم یدع قول الزور والجہل جو حالت صوم میں کذب وزور اور جہالت والعمل بہ فلاحاجۃ للّٰہ ان یدع کے کام کو نہیں چھوڑتا، تو خدا کو کوئی ضرورت طعامہ وشرابہ نہیں کہ روزہ دار اس کے لیے اپنا کھانا پینا

(رواہ البخاری والترمذی والنسائی وابن چھوڑ دے۔

ماجۃ واللفظ لہ)

پس اچھی طرح سمجھ لو کہ صوم کی حقیقت کیا ہے، وہ ایک حالتِ ملکوتی کے ظہور کا نام ہے، صائم کا جسم انسان ہوتا ہے لیکن اس کی روح فرشتوں کی زندگی بسر کرتی ہے، جو نہ کھاتے اور نہ پیتے ہیں، وہ تمام مادیاتِ عالم سے پاک اور ضروریات دنیاوی سے منزہ ہیں، ان کی زندگی کا فقط ایک مقصد ہوتا ہے، اطاعتِ اوامر الٰہی اس لیے صائم نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، وہ مادیات سے پاک اور ضروریاتِ دنیاوی سے منزہ رہنے کی جہاں تک اس کی خلقت وفطرت اجازت دیتی ہے، کوشش کرتا ہے،

صائم مجسم نیکی ہے، وہ کسی کی غیبت نہیں کرتا، وہ کسی کو برا نہیں کہتا، وہ کسی سے جہالت نہیں کرتا، وہ بدی کا بدلہ نیکی سے دیتا ہے، وہ اس کا امتثالِ امر کرتا

ہے، جو کہتا ہے (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)

اذا کان یوم صوم احدکم فلا	تم میں سے جب کسی کے روزے کا دن ہو، تو نہ
یرفث ولا یصخب فان سابہ	بدگوئی کرے، نہ شور وغل کرے، اگر کوئی اسے
احد او قاتلہ فلیقل انی امرء	برا کہے یا اس سے آمادۂ شمشیر زنی ہو، تو
صائم۔	کہدے کہ میں روزے سے ہوں،

اللہ اکبر وہ ہستیاں کہاں ہیں، جو تلوار کا وار روزہ کی سپر پر روکتی ہیں، روزہ سپر ہے، بے شبہ سپر ہے، وہ آخرت میں حملۂ جہنم سے بچاتا ہے، اور دنیا میں بغاوتِ نفس سے بچاتا ہے، طغیان ہونے سے بچاتا ہے، اور خبثِ عمل سے بچاتا ہے، کیونکہ روزہ کی جزا خود خدا ہے اور وہ خیرِ محض اور نیکیٔ خالص ہے،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	حدیث قدسی ہے کہ خدا نے فرمایا انسان کا تمام
وسلم، قال اللہ تعالیٰ کل عمل ابن آدم	عمل اسکے لیے ہے لیکن روزہ میرے لیے ہے،
لہ الا الصیام فانہ لی، وانا اجزی	میں اس کی جزا ہوں اور روزہ سپر ہے۔
بہ والصیام جنۃ (رواہ البخاری)	

پس مبارک ہے وہ جو اس سپر کو لیکر کارزار اعمال میں آتا ہے کہ وہ حملۂ نفس سے زخمی نہ ہوگا، مبارک ہے وہ جو ان ایام میں بھوکا رہتا ہے کہ وہ آسودہ ہوگا، مبارک ہے وہ جو ان ایام میں پیاسا رہتا ہے، کہ وہ سیراب ہوگا۔

سبوح قدوس ربنا ورب الملئکۃ والروح۔ (الہلال ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء)

روزہ

روزہ، رمضان المبارک، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت

روزہ اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے، آج جب یہ رسالہ ناظرین کے ہاتھوں میں ہوگا، تمام دنیائے اسلام صرف خدا کے نام پر بھوکی اور پیاسی ہوگی،

روزہ کی ابتدائی تاریخ نامعلوم ہے، اور اس کی حقیقت کے متعلق بھی دانایانِ فرنگ نے کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا ہے، ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصول معاشرت) میں چند وحشی قبائل کی تمثیل اور استقرار کی بنا پر لکھتا ہے، کہ "روزہ کی ابتداء اصل میں اس طرح ہوئی ہوگی، کہ لوگ وحشت کے زمانے میں خود بھوکے رہتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے، کہ ہمارے بدلے ہمارا کھانا اس طرح ہمارے مردوں کو پہنچ جاتا ہے" الحمد للہ کہ ہم کو اس خیال کی غلطی ثابت کرنے کے لیے کسی مزید کوشش کی ضرورت نہیں، یورپ میں اس نظریہ کا عدم قبول خود اس کی بے بنیادی کی دلیل ہے[1]،

بہر حال دیگر مذاہب میں روزہ کی ابتداء اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں،

لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا و غایت کی تشریح میں اپنے پیرودں کی وکالت کا محتاج نہیں، وہ بآواز بلند مدعی ہے،

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ (بقرہ ۲۳)	مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا، جس طرح تم سے پہلے قوموں پر فرض کیا گیا، تاکہ تم پرہیزگار ہو،
شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینٰت من الھدیٰ والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ ومن کان مریضا او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اُخر یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدۃ ولتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم ولعلکم تشکرون،	ماہ رمضان وہ مہینہ ہے، جس میں قرآن اتارا گیا، جو انسانوں کے لیے سرتاپا ہدایت ہے اور ہدایت کی نشانیاں ہیں، جو اس رمضان کو پائے چاہیے کہ وہ اس میں روزہ رکھے، اور اگر کوئی بیمار ہو، یا مسافر ہو تو اس کے بدلے وہ دوسرے دنوں میں روزہ رکھ لے، خدا آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور یہ روزہ اس لیے فرض ہوا تاکہ تم خدا کی اس عطائے ہدایت پر اس کی بڑائی کرو اور شکر بجالاؤ۔

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام بیان کیے گئے، بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ماہیت، روزہ پر اعتراض کا جواب، یہ تمام امور مفصل

بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں،

روزہ کی تاریخ | قرآن نے گذشتہ آیت میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ تمام مذاہب کے مجموعۂ احکام کا ایک حصہ رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبر امیؐ جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ مفروض عبادت رہا ہے، اگر یہ دعویٰ تمامتر صحت پر مبنی ہے، تو اس کے مافوق ذرائعِ علم اور اعلیٰ ترین انسان ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے، اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) پر لکھتا ہے۔

> روزوں کے اصول وطرق گو باختلاف آب وہوا، قومیت تہذیب اور حالات گردوپیش بہت زیادہ مختلف ہیں، لیکن بمشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں، جس کے نظام مذہبی میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو"

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

> گو کہ روزہ بحیثیت ایک مذہبی رسم کے تقریباً ہر جگہ موجود ہے۔

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن برت یعنی روزہ کی بندش سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہویں تاریخ کو برہمنوں پر اکادشی کا روزہ ہے، اس حساب سے سال میں چوبیس[۲۴] روزے ہوئے، بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہیں، ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں، یعنی چالیس

دن اکل و شرب سے احتراز کرتے ہیں، ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں سب سے زیادہ روزہ کے سخت شرائط ہیں، چالیس چالیس دن تک کا ان کے ہاں روزہ ہوتا ہے، گجرات و دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں، قدیم مصریوں کے یہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے، یونان میں صرف عورتیں تھسموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھیں، پارسی مذہب میں عام پیروؤں پر عملاً روزہ فرض نہیں، لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے یہاں موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لیے تو پنج سالہ روزہ ضروری تھا۔[1]

یہودیوں میں بھی روزہ فریضۂ الٰہی ہے، حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر چالیس دن بھوکے اور پیاسے گذارے، (خروج ۳۴-۲۸) یہودی قانون کی رُو سے سال میں روزے کے لیے متعدد تاریخیں مخصوص ہیں، ساتویں مہینہ کا دسواں دن، عام مفروض روزہ کی تاریخ ہے[2]، اس کے علاوہ اور روزوں کے احکام تورات کے مختلف صحیفوں میں بہ تصریح مذکور ہیں[3]، عیسائی مذہب میں بھی آکر ہم کو روزہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے،

---

[1] ان تمام حوالوں کے لیے دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱۰ ص ۱۹۳، ۱۹۴ طبع یازدہم۔

[2] دیکھو تورات سفر الاحبار ۱۶-۲۹، ۲۳، ۲۴، ۲۷، ۳۲، سفر العدد ۲۹، ۱۱۷۔

[3] اول سموایل ۷، ۶، یرمیا ۳۶-۶۔

حضرت عیسٰیؑ نے چالیس دن جنگل میں روزہ رکھا۔ (متی ۴۔ ۲) حضرت یحییٰؑ جو حضرت عیسٰیؑ کے گویا استاد تھے، وہ بھی روزہ رکھتے تھے، اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی،[1] اسی آیت میں مذکور ہے، کہ یہودیوں نے آکر حضرت عیسٰیؑ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد روزہ کیوں نہیں رکھتے" اس سے مقصود یہودیوں کے رسمی اور مبتدع روزے ہیں، حضرت عیسٰیؑ خود اپنے شاگردوں کو خطاب کرکے کہتے ہیں:

"پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکاروں کے مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں، کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تم روزہ رکھو، اپنے سر میں تیل لگاؤ، اور منہ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہیں، بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھکو آشکارا بدلہ دے" (متی ۶۔ ۶۔ ۷)

ایک دوسرے مقام پر شاگرد حضرت عیسٰیؑ سے پوچھتے ہیں، کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں، آپ اس کے جواب میں فرماتے ہیں،

"یہ جنس سوائے دعا، نماز اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی"

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت۔

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم۔ — مسلمانو! تم پر روزہ اسی طرح لکھا گیا جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا،

---

[1] مرقس ۱۸۔

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے،

روزہ کی حقیقت | انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کی جائے، تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے، وہ مختلف اغراض کا پابند ہے، اس کے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں، اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے، اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی، اس لیے اصل میں ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں، ضرورت اور غرض اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے، تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے،

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں کا اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے، ہمارے دل میں آرزوؤں کا ایک مدفن ہے، تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے، خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے، لیکن کیا خوشنما کپڑوں، عالیشان عمارتوں، لذیذ غذاؤں، تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے، فرزند و عیال، زر و مال، خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کے کسی لمحہ کو بھی یاس انگیز ساعت کا انتظار رہے گا، بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی ہے، اور زندہ رہے ہیں، قارون دم بھر میں ابراہیم ادھم بن گیے اور جیتے رہے،

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی و تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو لفظوں میں محدود ہو کر رہ جائے اور وہ "مایۂ قوت و غذا" ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، بقائے روح اور تحفظ جان، سدِ رمق پر موقوف ہے، اور سدِ رمق اکل و شرب پر موقوف ہے، اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد و منشا یہی قوت و غذا اور اکل و شرب کا سرمایہ ہے، اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ میں عالم ملکوت اور عالم ناسوت کے دو باشندوں میں اگر فصل و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے، تو صرف یہی ایک چیز تمام فصول و امتیازات کو محیط ہوگی،

اسی بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں جو زمانہ کے کسی دور میں بھی پیدا ہوئے ہیں، مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لیے اکل و شرب سے امتناع سب سے پہلی شرط قرار دی گئی ہے، جس سے اصل مقصود یہ تھا کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کر دے، اور آخر یہ کہ قوت و غذا کی طلب و حرص سے بھی بے نیازی کے لیے متواتر کوشش جاری رکھے، کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم نفسانی صرف اسی ایک قوت کے نتائجِ مابعد ہیں، اگر یہ طلب و ضرورت فنا ہو جائے، تو ہم کو دفعۃً عالمِ ناسوت میں عالمِ ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے، لیکن جب تک انسان، انسان ہے، اس کو غذا سے قطعی بے نیاز ہونا ناممکن ہے، اس بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے، اس مدت کے

اندر انسان کو تمام انسانی ضروریات جن سے استغنا کسی زمانہ تک ممکن نہیں ہے، مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لیے ملأ اعلیٰ کی مخلوقاتِ مقدسہ میں داخل ہو جانا چاہیے، اور چونکہ ان مخلوقات کا محض خدائے پاک کی اطاعت و عبادت فرضِ زندگی ہے اس لیے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے،

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ تقویٰ سے بے نقاب کر دیا ہے، اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی، اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت میں شریک کر لیا ہے،

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔　مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

لیکن آگے چل کر قرآن پاک روزۂ اسلام کی دو اور مخصوص حقیقتوں کو واضح کرتا ہے،

لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم ولعلکم تشکرون۔　تاکہ خدا کی اس عطائے ہدایت پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو،

اس مفہوم کی توضیح کے لیے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا،

رمضان اور لیلۃ القدر | یہ مادی عالم جس طرح نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور سلسلۂ علل و اسباب قائم کر رکھا ہے جس یقین کے ساتھ تم دعویٰ کر سکتے ہو، کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے،

اسی یقین کے ساتھ طبِ روحانی کا واقف کار کہتا ہے، کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضانِ نبوت کے قبول کے لیے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے، دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے، معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے دعویٰ کو کس طرح پیش کرتا ہے، انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرت الی اللہ کرتا ہے، پھر کیونکر منکرین دعوت ناکام و خاسر اور اہلِ ایمان کامیاب اور مفلح ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک درجہ اور مرتبہ منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور پذیر ہوتا ہے، قرآن مجید میں جا بجا تیرہ[۱۳] مقامات پر سنۃ اللہ کا جو لفظ آیا ہے حقیقت میں اس سے زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

۵۔ فلسفۂ تاریخ سیاسی واقعات کی تکرار اور بار بار کے اعادۂ حوادث سے جس طرح اصولی نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے، بعینہٖ اسی طرح تاریخِ نبوت اپنے بار بار کے اعادۂ واقعات سے اصولی قانون ہمارے لیے قرار دیتی ہے،

پیغمبر دنیا میں ناسوت و ملکوت کی ایک مجموعی قوت اور متحد وجود ہوتا ہے وہ اپنے کمالِ انسانیت کو پہنچ کر جب فیضانِ نبوت کے قبول و استعداد کا انتظار کرتا ہے، تو ایک مدت تک کے لیے عالمِ انسانی سے بلند ہو کر، ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے، اس مقام پر پہنچ کر وہ انسانیت کی تمام ممکن الاحتراز ضروریات سے پاک ہو جاتا ہے، اور پھر اسی ساعت سے اس کے دل و ذہن میں وحیِ الٰہی کا

سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے، کوہ سینا کا پُرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰؑ) جب تورات لینے کو جاتا ہے، تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے[۱]، کوہِ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰؑ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز و شب جنگل میں بھوکا اور پیاسا رہا[۲]، فاران کا آتشیں شریعت لانے والا پیغمبر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نزولِ قرآن سے پہلے حراء کے غار میں ایک ماہ کامل "متحنث" رہتا ہے، اور بالآخر اسی اثناء میں ناموسِ اکبر "اقرء باسم ربک الذی خلق" کا مژدۂ جانفزا لیکر نمودار ہوتا ہے[۳]،

یہ واقعہ کس ماہِ مبارک کا تھا؟

شھر رمضان الذی انزل فیه القرآن، — رمضان وہ مہینہ ہے، جس میں قرآن اُترا۔

یہ کس شبِ اقدس کی داستان ہے،

انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ (دخان) — ہم نے قرآن کو ایک مبارک شب میں اتارا،

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر (القدر) — ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔

ان آیات کے استقصاء سے یہ بخوبی ثابت ہوگیا کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن نے سب سے پہلی بار دنیا میں نزول کیا، اور پیغمبر امی علیہ الصلوٰۃ والسلام

---

[۱] خروج ۳۴-۲۱ [۲] متی ۴-۲ [۳] صحیح بخاری حدیث بدء الوحی،

کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لیے سب سے پہلی بار دستور نامۂ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا، قرآن کا حامل اور اس وحی الٰہی کا مہبط آخر میں ان دنوں ایک غار کے پردے میں یکہ و تنہا بھوکا اور پیاسا سربزانو تھا، اس بنا پر اس ماہ مقدس میں بھوکا پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ میں یکہ و تنہا رہنا (اعتکاف) شب نزول وحی میں بیدار و سربسجود رہنا (عبادت لیلۃ القدر) تمام پیروان محمدی کے لیے لازم و فرض تھا۔ اسی لیے اس نے کہا،

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی　　اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو، تو میری پیروی
یحببکم اللہ　　کرو، خدا تمہیں پیار کرے گا،

اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے، اور روزوں کے لیے رمضان کی تخصیص کس بنا پر ہے،

ہم نے پہلے بیان کیا تھا، کہ حصول تقویٰ کے علاوہ جو تمام مذاہب کے روزوں کی مشترک بنیاد ہے، اسلامی روزوں کے دو اور اساس ہیں، تکبیر اور شکر، خدائے پاک روزوں کی غایت تقویٰ کے علاوہ حسب ذیل بیان فرمائی ہے۔

لتکبروا اللہ علیٰ ماھدٰیکم و　　روزہ اس لیے فرض ہوا کہ تم اس عطائے
لعلکم تشکرون۔　　ہدایت پر خدا کی بڑائی کرو، اور شکر ادا کرو۔

اس بنا پر دیگر مذاہب سے زائد اسلامی روزہ کی یہ بھی غایت ہے، کہ اس ماہ مقدس میں بقدر امکان ان ہی حالات و جذبات میں متکیف ہوں جن میں وہ حامل

قرآن منکشف ہوا، کہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگاری تاریخ ہو، یہ جذبات وحالات جن کو مبلغ قرآن کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس محسن اعظم کی اس عطائے ہدایت پر بڑائی اور شکر گذاری ہے،

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب

علم فطرت شناسی کے اکثر مدعی جو عام عبادت و پرستش کی غرض وغایت یہ قرار دیتے ہیں، کہ وحشی انسان کا تخیل یہ ہے، کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی اسی قدر سمجھتے ہیں، کہ خدا کی طلب وخوشنودی کے لیے جسمانی زحمت کشی ہے، ان غلط فہمیوں کے لیے دیگر مذاہب میں لغزش گاہیں موجود ہیں، اس وقت ہم کو روزہ سے بحث ہے جوگیوں اور جینیوں میں روزہ کی متعذر الامکان مدت اسی معنی کی طرف اشارہ کرسکتی ہے، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لیے "نفس کو دکھ دینے" کی اصطلاح جاری ہے، تورات میں روزہ کے مفہوم کے لیے اکثر یہی فقرہ مستعمل ہے :-

> اور یہ تمہارے لیے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم میں سے ہر ایک، خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو، خواہ پردیسی جس کی بود و باش تم میں ہے اپنی جان کو دکھ دے۔" (احبار ۱۶-۲۹)

سفر العدد، آیت ۲۹-۷ میں ہے :

> اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی، اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور کچھ کام نہ کرو،

یہ اصطلاح تورات کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ صوم ہے، صوم کے لغوی معنی، احتراز و اجتناب کے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے، کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، خدا نے قرآن پاک میں جہاں مسلمانوں کو روزہ کا حکم دیا ہے، وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیئے ہیں،

یرید اللّٰہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر،	خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا۔

قرآن کا عام قانون ہے،

لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعھا۔ (بقرہ)	خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے،

یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔ (اعراف)	اور وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، اور گندہ چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اس طوق و زنجیر کو جو ان کے گلے میں پڑی تھی، ان کو ان سے علیحدہ کرتا ہے۔

اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا، اور اس میں جو سہولتیں پیدا

گیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ سب سے اوّل یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، اُن میں اکثر روزہ پیرووں کی خاص جماعت کے لیے مفروض تھا، مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لیے کوئی روزہ ضروری نہیں، پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لیے روزہ ہے، یونانیوں میں صرف عورتوں کے لیے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی مذہبی چیز ہے، تو تمام پیروان مذہب کے لیے یکساں ہونا چاہیے، اسلام میں پیشوا غیر پیشوا، عورت مرد کی کوئی تخصیص نہیں، اس نے اپنے تمام پیرووں کو عام حکم دیا، اور اس میں کسی جنس کی کوئی تفریق نہیں کی:-

فمن شهد منكم الشهر فليصمه: اس مہینہ میں جو زندہ موجود ہو، روزہ رکھے،

۲۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی، اُن میں تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر گرمی یا سردی کے موسم میں روزے پڑتے تو یا وہ ہمیشہ کے لیے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لیے آرام دہ ہو جاتے، اسلام کے روزوں کی تاریخیں ہر ملک میں ہر موسم میں آتی ہیں، اور اس بنا پر اُن کی سختی و نرمی ہر عہد میں بدلتی رہتی ہے۔

۳۔ جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید و حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص اور استثنا نظر سے نہیں گذرا، تورات میں تو یقیناً مذکور نہیں، لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ

ہر قسم کے معذور و مجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا، بچے مستثنیٰ ہیں، عورتیں ایام حمل و رضاعت اور دیگر مخصوص ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں، بڈھے، بیمار، مسافر مستثنیٰ ہیں، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرۃً قادر نہیں مستثنیٰ ہیں،

فمن کان منکم مریضاً او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اخر وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین [illegible] (بقرہ)

اگر تم میں کوئی بیمار ہو، یا مسافر وہ رمضان کے بعد اور دنوں میں روزہ رکھ لے، اور وہ لوگ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہوں ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔

ترمذی میں ہے، [illegible]

عن انس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ وضع من الحامل والمرضع الصوم۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ کا بار اتار لیا۔

۴۔ اور مذہبوں میں روزہ کے شرائط نہایت غیر معتدل تھے، یا تو مسلسل چالیس چالیس روز کا فاقہ تھا، یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے ایک مخصوص مدت کے اندر کھانا پینا اور حیوانی اغراض سے اعتدال کے ساتھ روک دیا۔

۵۔ اسلام سے پہلے روزہ کی مدت نہایت غیر معتدل تھی، جینیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ

رکھتے تھے، یہودیوں کے یہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صرف
صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا،

ثم اتموا الصیام الی اللیل — پھر روزہ کو رات تک پورا کرو،

۶۔ یہودیوں کے ہاں یہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے تھے،
پھر نہیں کھاتے تھے، عرب میں رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے کھا لیتے،
سو جانے کے بعد کھانا پھر ناجائز تھا، ابتدائے اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا، ایک دفعہ
رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا تھا، ان کی
بیوی کھانا پکا رہی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک چکا، تو ان کی
بیوی کھانا لے کر آئیں، وہ سو چکے تھے، اس لیے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے
روز پھر روزہ کا دن تھا، ان کو غش آ گیا، اس پر یہ آیت اتری

وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔ — اس وقت تک کھاؤ پیو، جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے۔

۷۔ ایام جاہلیت میں دستور تھا کہ ایام صیام میں میاں بیوی پوری مدت
تک علیحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ ممانعت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر
مرتکب خیانت ہو جاتے تھے، اسلام نے صرف وقت صوم تک یہ ممانعت محدود
کر دی۔

احل لکم لیلۃ الصیام الرفث روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت
علیٰ نساءکم ھن لباس لکم وانتم تمہارے لیے حلال کی گئی، وہ تمہاری
لباس لھن علم اللہ انکم کنتم تختانون پوشاک ہیں، اور تم ان کی، خدا جانتا تھا کہ
انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم فالاٰن تم خیانت نفس کرتے تھے اس نے معاف کیا،
باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم اب بیویوں سے میل جول کرو، اور خدا نے تمہارے
مقدر میں جو کچھ رکھا ہے اس کی تلاش کرو۔

بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام میں مغفور ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے، یا کوئی اور امر ناقض صوم اس سے سرزد ہو، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عن ابی ھریرۃ: من اکل او شرب حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے جو بھول کر کھائے
ناسیا فلا یفطر فانما ھو رزق اللہ یا پیئے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، یہ تو خدا کی
(ترمذی) روزی تھی۔

۹۔ اسی طرح وہ افعال جو گو منافیِ صوم ہیں، لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوئے بلکہ مجبوراً اس سے صادر ہوئے اس سے بھی نقضِ صوم نہیں ہوتا۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر خدا نے فرمایا: جس کو قے ہوگئی یا غیر ارادی
لا یفطر من قاء ولا من احتلم غسل ہوئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔

۱۰۔ سر میں تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، بدن میں پچھنا اور نشتر لگانا پہلے منافیِ صوم تھا۔

اسلام نے یہ سختی کم کردی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرورت ہوئی، کہ صریح الفاظ میں ان کے متعلق عام احکام دے دیں۔

احکام اسلام کی عام آسانیاں اور سہولتوں کے لیے اس تعلیم الٰہی سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے؟

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا	خدا کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کسی بات
لھا ما اکتسبت وعلیھا ما اکتسبت	کی تکلیف نہیں دیتا، انسان کا نتیجہ عمل خیر ہو
ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا	یا شر، اسی کے نفع ونقصان کے لیے ہے، خداوندا!
ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ	اگر ہم سے بھول چوک ہو تو ہم سے پرسش نہ کرنا۔
علی الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا	خداوندا! ان سختیوں کا بوجھ ہم پر نہ ڈالنا
ما لا طاقۃ لنا بہ واعف عنا	جو ہم سے پہلوں پر تو ڈال چکا، خداوندا جسکی
واغفر لنا وارحمنا انت مولانا	طاقت ہم میں نہ ہو، وہ بوجھ ہم پر نہ ڈالنا ہم سے
فانصرنا علی القوم الکافرین۔	درگذر کر، ہمارے گناہ معاف کر، ہم پر رحم
	فرما، تو ہی ہمارا آقا ہے، اور اپنے منکروں پر
(بقرہ - ۴۰)	ہمیں فتح عطا فرما۔

(معارف، جولائی ۱۹۱۶ء)

ایامِ صیام پر نظرِ ثانی[1]

ایک غیر مولوی کا جواب تمام ہوچکا، جس کو پڑھ کر آپ کو حیرت ہوئی ہوگی، کہ وہ ایک "عربی حرف شناس تعلیم یافتہ ہوکر" کیونکر پرانے طرز کا مسلمان باقی رہ سکا، مگر ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم کہیں مخصوص و محدود نہیں، گو اس "غیر مولوی" نے کسی "عراقی خانساماں" سے عربی نہیں سیکھی، تاہم شملہ اور نئی دلی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں موصوف نے جو عربی پڑھی ہے، وہ نتائج کے لحاظ سے مقبول احمد صاحب کے فارن ڈیپارٹمنٹ کی "عراقی عربی" سے زیادہ نتیجہ خیز ہے،

اس بحث میں ہمارے نزدیک اصل میں تین بحثیں ہیں،

---

[1] ایک رٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر مقبول احمد صاحب نے جو کسی سرکاری خدمت کے سلسلہ میں کچھ دنوں عراق میں رہے تھے، اس لیے عربی کی شد بد سے بھی واقف ہوگئے تھے انھوں نے نگار میں ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا تھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ صرف تین وقت کی نمازیں اور صرف چند دن کے روزے فرض ہیں، تیس روزے فرض نہیں ہیں، نماز والے مضمون کا جواب راقم نے لکھا تھا اور روزہ والے مضمون کا غلام احمد پرویز اور سید صاحب نے ان دونوں کے مضمون جنوری ۳۲ء کے پرچے میں شائع ہوئے تھے یہ سید صاحب کا وہی مضمون ہے۔ (معین الدین)

۱۔ کیا جمع قلت کا جو قاعدہ مدعی نے سمجھا ہے، وہ صحیح ہے؟

۲۔ کیا قرآن میں مہینہ بھر کے روزہ کا ذکر نہیں؟

۳۔ کیا احادیث میں ۲۹۔ ۳۰ روزوں کا ذکر نہیں؟

جمع قلت کے قواعد | یہ بالکل صحیح ہے کہ عربی میں جمع کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک جمع قلت جس کا اطلاق تین سے دس تک پر ہوتا ہے، دوسری جمع کثرت جس کا اطلاق گیارہ سے مافوق پر ہوتا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ ایام جمع قلت ہے لیکن قاعدہ صرف اسی قدر نہیں ہے، کہ اگر اسی قدر ہو تو حسب ذیل آیتوں میں وہ کون بے وقوف ہوگا جو ایام سے صرف تین سے لے دونوں تک (حسب علم مقبول احمد) یا دس تک (حسب قواعد نحو) سمجھے گا۔

تلک الایام نداولہا بین الناس۔ یہ دن ہیں، جن کو ہم لوگوں کے درمیان (آل عمران) دست بدست الٹتے ہیں

کیا اشخاص اور قوموں کی صدیاں اور سالہا سال جن میں ہزاروں دن (ایام) داخل ہیں، صرف نو یا دس دنوں میں محدود ہیں۔؟

قیامت میں نیکوکاروں سے کہا جائے گا،

کلوا واشربوا ھنیئا بما اسلفتم فی خوش خوش کھاؤ پیو، ان کے بدلے میں جو تم الایام الخالیہ، (حاقہ) گذشتہ دنوں (ایام) میں کرتے تھے۔

کیا یہ "ایام خالیہ" ہر جنتی کے دس ہی دن ہوں گے، خواہ اس کی عمر سو ہی

برس کی کیوں ہوئی ہو، یہ کیسی نادانی کا دعویٰ ہے، قرآن پاک میں ایک اور جگہ ہے،

وذکرھم بایام اللہ۔ (ابراہیم) : اور ان کو اللہ کے دنوں (ایام) کی یاد دلاؤ۔

اللہ کے دن سے مقصود وہ دن ہے جب اللہ تعالیٰ کی کسی عجیب قدرت کا اظہار ہوا ہو، تو کیا تاریخ میں اس قسم کے صرف تین سے دس تک دن گذرے ہیں، یا ان کی تعداد سینکڑوں ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

امید ہے کہ "عراقی خانساماں کا فاضل شاگرد" ان آیتوں پر نگاہ رکھ کر ابھی جمع قلت کے قواعد کو سمجھے گا،

آگے چلیے معرفہ کو چھوڑ کر تنکیر پر آئیے، یمن سے شام تک کی مسافت اب بھی موجود ہے، سبا کے عہد میں یہ پورا راستہ باغ و بہار بنا ہوا تھا، جو آخر ان کی بداعمالیوں کے سبب سے ویران ہو گیا، یہ راستہ پاپیادہ یا اونٹوں پر بہرحال ایک مہینہ سے کم کا نہ ہوگا، مگر اس کے متعلق قرآن پاک میں ہے،

سیروا فیھا لیالی وایاما امنین۔ (سبا ۱) چلو ان میں راتوں اور دنوں (ایام) بے خوف و خطر۔

کیا اللہ تعالیٰ کا یہ اظہار احسان تین دنوں کے سفر میں سے صرف دس دن کے سفر کے ساتھ محدود ہے؟ پھر قاعدہ کیا ہے؟ قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی لفظ کی دو جمعیں آتی ہوں، ایک قلت کی اور دوسری کثرت کی، تو عموماً کمی دکھانے کے لیے جمع قلت اور کثرت دکھلانے کے لیے جمع کثرت لائیں گے، لیکن یہ قاعدہ ان الفاظ

کے لیے نہیں، جن کی ایک ہی جمع آتی ہو، ان الفاظ کے لیے یہ قلت و کثرت کی سرے سے کوئی تخصیص و تحدید ہی نہیں، ورنہ لازم آئے گا کہ عربی میں دس سے زیادہ دنوں کے لیے ہم کوئی لفظ ہی نہ بول سکیں، مثال یہ ہے کہ سیف (تلوار) کی جمع سیوف بھی آتی ہے، جو جمع کثرت ہے، اور اسیاف بھی آتی ہے، جو جمع قلت ہے، تو اکثر جہاں کمی دکھانی ہوگی، وہاں اسیاف اور جہاں کثرت دکھانی ہوگی، وہاں سیوف بولیں گے۔

مگر بایں ہمہ یہ قاعدہ بھی کلیہ نہیں، جاہلی شاعر فخریہ کہتا ہے۔

واسیافنا یقطرن من نجدۃ دما ۔۔۔ اور ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے،

ظاہر ہے کہ یہاں تلواروں کی قلت مراد نہیں ہوسکتی، اسی طرح عمرو بن کلثوم تغلبی (سبعہ معلقہ) فخریہ کہتا ہے

وایام لنا غر طوال ۔۔۔ اور ہمارے لیے روشن اور لمبے دن ہیں،

کیا اس سے مراد چند ہی دن ہوں گے، چند لگا کر دیکھو، کہ پھر شاعر کا فخر باقی رہتا ہے،

اسی طرح لفظ قرء (حیض یا طہر) اس کی جمع قلت اقراء آتی ہے، اور جمع کثرت قروء، اب قاعدہ کے مطابق ثلٰثۃ (تین) کے ساتھ اقراء آنا چاہیے، نہ کہ قروء مگر قرآن پاک میں تین کے ساتھ قروء آیا ہے، کیونکہ رسمی قواعد پر عبارت کی شستگی اور توازن الفاظ کو فوقیت اور ترجیح حاصل ہے،

الغرض اس قاعدہ کا اگر تعلق بھی ہے، تو صرف ان الفاظ سے جن کی دونوں

قسموں کی جمعیں آتی ہیں، ورنہ وہ الفاظ جن کی ایک ہی قسم کی جمع آتی ہے، صرف جمع قلت یا صرف جمع کثرت، ان میں یہ فرق کبھی ملحوظ نہیں ہوتا، مثلاً دیکھو کہ رجل (پانوں) کی جمع صرف ایک آتی ہے، اور وہ ارجل ہے، جو جمع قلت ہے، مگر اس کا اطلاق دس اور دس سے ہزارہا زیادہ پانووں پر بھی ہوتا ہے، ورنہ لازم آئے گا، کہ وضو میں پانوں دھونے کا حکم صرف دس پانووں تک محدود ہو،

وارجلکم الی الکعبین۔ اور اپنے پانووں کو ٹخنوں تک،

اور اس کے برخلاف لفظ رُجل (مرد) کہ اس کی جمع صرف رجال آتی ہے، جو جمع کثرت ہے، تو اب چاہیے کہ ہم ثلثۃ رجال اور عشرۃ رجال نہ بول سکیں، کہ اس کا اطلاق دس سے زیادہ پر ہوگا، تین سے دس پر نہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ سرے سے یہ قاعدہ ہی نہیں، ورنہ چاہیے کہ ایسے الفاظ جن کی صرف جمع قلت آتی ہے، ان کے لیے دس سے زیادہ بول ہی نہ سکیں، اور جن کی صرف جمع کثرت آتی ہے، ان کی دس یا دس سے کم کی جمع بھی نہ بول سکیں، بھلا ایسی حماقت کا قاعدہ کسی زبان میں بھی ہو سکتا ہے،

اب ہم سند کے طور پر نحو کی سب سے مستند اور مشہور کتاب رضی شرح کافیہ پیش کرتے ہیں، مبحث جمع مکسر کے آخر میں ہے،

واعلم انہ اذا لم یات للاسم الابناء جمع القلۃ کارجل او الاجمع اور جاننا چاہیے کہ جب کسی اسم کی صرف جمع قلت آئے، جیسے رجل (پانوں) کی ارجل یا

الکثرۃ کرجال فی الرجل وکذا کل	صرف جمع کثرت آئے جیسے رجل (مرد) کی
جمع تکسیر للرباعی الاصلی حروفہ و	رجال اور نیز ہر وہ جمع مکسر جو ایسے چارحرفی
کما یجمع الا جمعہ کاجادل و	لفظ کی ہو، جس کے چاروں حروف اصلی ہوں،
مصانع فھو مشترک بین القلۃ	اور نیز وہ لفظ جس کی جمع صرف اجادل اور
والکثرۃ، وقد یستعار احدھما	مصانع کے وزن پر آتی ہے، تو وہ قلت اور
للآخر مع وجود ذالک الآخر	کثرت میں یکساں (مشترک) بولے جاتے ہیں،
کقولہ تعالیٰ ثلثۃ قروء مع وجود	اور کبھی دوسری جمع (قلت یا کثرت) موجود
اقراء۔	ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے موقع پر
	مستعار بولتے ہیں، جیسے قرآن میں ثلثۃ قروء
(رضی جلد دوم ص ۱۵۵ مطبع نولکشور ۱۲۸۶ء)	ہے، حالانکہ اس کی جمع قلت اقراء موجود تھی،

امید ہے کہ ہمارے فاضل دوست کی عراقی سیاحت، رضی کی اس عبارت کے سمجھنے میں پوری مدد دے گی، اور عربی قواعد کی ناواقفیت سے جو احمقانہ قاعدہ تصنیف کیا گیا ہے، اور جس کی بنا پر قرآن کے مفہوم میں بھی ترمیم کی جرأت کی گئی ہے، اس کی اصلیت پوری طرح سمجھ میں آجائے گی۔

اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ ایام کے سوا یوم کی کوئی دوسری جمع آتی ہی نہیں، اس لیے اس میں کثرت وقلت کا سوال ہی لغو ہے، گو کہ اتنی واقفیت عربی کے ہر حرف شناس کو ہے، کہ وہ اس کو بے تامل تسلیم کرلے، کہ یوم کی جمع سوائے ایام

کے دوسری نہیں، مگر چونکہ ہمارا مخاطب وہ ہے، جس کو اہلِ زبان سے تلثین ایاما سننے کی بھی توقع تھی، حالانکہ اگر کسی اہلِ زبان سے سنتا بھی تو غلط ہوتا؛ اس لیے اس کی تشفی کے لیے عربی کے کسی مشہور لغت کو پیش کرنا ضروری ہے، چنانچہ لسان العرب اس موقع پر پیش ہے،

الیوم معروف مقدارہ من طلوع الشمس الی غروبھا والجمع ایام لا یکسر الا علی ذالك ..... ولم یستعملوا فیہ جمع الکثرۃ۔ (ج ۱۶ ص ۱۳۷، مصر)	یوم کے معنی مشہور ہیں، اس کی مدت آفتاب نکلنے سے اس کے ڈوبنے تک ہے اور جمع ایام ہے، اس لفظ (یوم) کی جمع کسر نہیں آتی، لیکن اسی وزن (ایام) پر ..... اس یوم میں اہلِ عرب نے جمع کثرت نہیں استعمال کی ہے،

اب تو غالباً ایاماً معدودات کی جمع قلت کا معاملہ حل ہو گیا ہوگا، کہ دس دن ہوں یا دس سے صدہا زیادہ، ہر حال میں ایام ہی بولیں گے، اور اس سے دس تک کی تخصیص سمجھنا قطعی ناممکن ہے،

سوال ہو سکتا ہے، کہ روزہ کے حکم میں قرآن نے پہلے ابہام کے ساتھ "کچھ دنوں" کا روزہ کہا اور پھر اس کے بعد ماہ رمضان کہہ کر، مہینہ بھر کی تخصیص بعد کو کیوں کی، تو اس کا جواب یہ ہے، کہ روزہ یوں بھی سخت حکم ہے، اور اہلِ عرب کے لیے وہ اور بھی نہایت سخت تھا، اس لیے مہینہ بھر کا یک بیک حکم ان پر نہایت گراں گذرتا، اس لیے بلاغت کا اقتضا یہ تھا، کہ پہلے دنوں کا ابہام رکھا جائے، چنانچہ

فرمایا گیا۔

ایاماً معدودات (بقرہ ۲) کچھ گنے ہوئے دنوں میں روزے فرض کیے گیے،

مگر دیکھیے کہ تنکیر کے ابہام کے باوجود معدودٰ (گنے ہوئے دنوں) کہنے سے اتنا ابھی ثابت ہے، کہ وہ کتنے ہی دن بھی ہوں، مگر وہ گنے ہوئے اور مقرر و متعین دن ہیں، اب یہ سمجھنا چاہیے، کہ "کچھ دن" اضافی الفاظ میں سے ہے، یعنی چند دن یا کچھ دن میں تنکیر کی وجہ سے جو قلت معلوم ہوتی ہے، وہ قلت کسی نسبت کے مقابلہ میں ہے، مثلاً اگر ایک شخص نے کسی مسئلہ پر، ایک ہزار صفحوں کی کتاب لکھی ہے، تو اس کے مقابلہ میں اس کے حریف نے اگر پچاس صفحوں کا بھی رسالہ لکھا، تو وہ چند ہی صفحے کہلائیں گے، الغرض "ایاما معدودات" میں تنکیر کی وجہ سے جو قلت سمجھی جاتی ہے، وہ چار یا پانچ یا دس تک کی ہی ضروری نہیں، بلکہ صرف اس قدر ہے، کہ وہ دوسرے کے مقابلہ کے لحاظ سے نسبتہً کم ہے،

اب غور کیجئے کہ سال کے تین سو ساٹھ دنوں کے مقابلہ میں اگر تیس یا انتیس دنوں کے روزے ہوں تو وہ چند دن نہ کہلائیں گے، تو کیا کہلائیں گے، یا ایں ہمہ معدود ہونے کی وجہ سے وہ دن اپنی تعداد میں متعین ضرور ہیں، گوابھی یہ تعیین مبہم ہے،

انگریزی داں اصحاب اس متعین تنکیر کے مفہوم کو انگریزی ترجمہ، A certain number of Day. میں سمجھیں، کہ تنکیر کے باوجود اس کے اندر یہ بات موجود ہے، کہ وہ تعداد متعین ہے، گوابھی معلوم نہیں،

کہ وہ تعداد کیا ہے؟

کیا قرآن میں مہینہ بھر کے روزہ حکم نہیں؟	قرآن پاک میں اس کے بعد روزہ کی چند آسانیوں کا ذکر کر کے ماہ رمضان کی اہمیت دکھا کر اس مہینہ کو

روزوں میں گذارنے کی تاکید اس طرح کی گئی ہے، جس سے وہ پہلا ابہام جاتا رہا، اور تعداد متعین ہوگئی، فرمایا:

شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن هدی للناس وبینات من الهدی والفرقان فمن شهد منکم الشهر فلیصمه (بقرہ)	رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن لوگوں کی رہنمائی اور حق و باطل کی تمیز کی روشن دلیلیں بناکر اتارا گیا، تو جو کوئی اس مہینہ میں موجود رہے، تو چاہیے کہ وہ اس مہینہ بھر روزہ رکھے۔

بعض لوگوں کا فلیصمه کا ترجمہ "اس مہینہ میں روزہ رکھے"، کرنا ہمارے نادان دوست کی لغزش کا باعث ہوا ہے، اور اسی سے ان کو شبہ ہوا ہے، کہ رمضان میں چند روز بھی روزے رکھ لیں، تو یہ کہنا صحیح ہوگیا، کہ رمضان میں روزے رکھے، حالانکہ جن صاحبوں نے ایسا ترجمہ کیا ہے، انھوں نے حاشا یہ سمجھ کر نہیں کیا ہے، کہ بعد کے آنے والے ان کے الفاظ سے یہ غلط معنی سمجھیں گے، کیونکہ ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہیں آسکتا تھا، کہ اس سے کوئی رمضان کے چند دنوں کے روزے مراد لے گا۔

عربی میں قاعدہ یہ ہے، کہ فعل مستمر کا جو مفعول فیہ (ظرف زمانی مفعول) ہوتا ہے، وہ اپنے فعل کا اپنے ظرف زمانی میں پورا استیعاب چاہتا ہے، اور یہی وہ فرق ہے، جو مطلق ظرف جار زمانی اور ظرف زمانی مفعول میں امتیاز پیدا کرتا ہے، مثال کے لیے ان دو لفظوں پر غور کرو،

ظرف زمانی جار — یقوم فی اللیل — رات میں کھڑا ہوتا ہے

ظرف زمانی مفعول — یقوم اللیل — رات بھر کھڑا رہتا ہے،

اب اسی پر فعل صوم کو قیاس کرو،

ظرف زمانی جار — فلیصم فی الشھر — مہینہ میں روزہ رکھے

ظرف زمانی مفعول — فلیصم الشھر — مہینہ بھر روزہ رکھے

انگریزی خواں اس فرق کو ان دو ترجموں سے سمجھیں،

Fast in the same month

Fast the same month

ہر زبان کا اداشناس اس فرق کو پوری طرح محسوس کر سکتا ہے، اب غور کیجیے کہ قرآن میں روزہ کا حکم فی الشھر (مہینہ میں) کر کے نہیں ہے، بلکہ الشھر (مہینہ بھر) کر کے ہے، کیا اب بھی کسی کو اس میں شک ہو سکتا ہے، کہ قرآن میں مہینہ بھر کے روزے کا ذکر نہیں، قرآن نے انتیس ۲۹ اور تیس ۳۰ دنوں کے بجائے مہینہ کا لفظ اس لیے اختیار کیا، کہ قمری مہینہ میں دنوں کی تخصیص رویتِ ہلال کے بغیر نہیں ہو سکتی،

اس لیے مہینہ کا لفظ استعمال کیا، تاکہ بہترین اختصار کے ساتھ انتیس دنوں کا مہینہ ہو، یا تیس دنوں کا مہینہ ہو، ہر ایک پر مہینہ کا لفظ صادق آسکتا ہے،

اب کوئی بتائے، کہ ہم اس "فاضل اجل" کے فضل و کمال اور عقل و دانش کے خلاف کیونکر مظاہرہ کریں، جو کہتا ہے، کہ قرآن میں مہینہ بھر روزہ رکھنے کا حکم مذکور نہیں ہے۔

ہم نے اوپر جو قاعدہ بیان کیا ہے، گو زبان کا ہر ذوق شناس اس کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، تاہم مزید تشفی کے لیے ہم "ناقد بصیر" کو اصول فقہ میں بحث حروف جار پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں، مثلاً کشف الاسرار بزدوی جلد دوم ص ۱۰۵ قسطنطنیہ، التقریر والتحبیر علی البزدوی جلد دوم ص ۰۰ قسطنطنیہ والتوضیح والتلویح ص ۲۲۳، قسطنطنیہ: ان سب میں یہ مذکور ہے، کہ مفعول فیہ زمانی میں عموم واستیعاب واستغراق ہوتا ہے، نحو میں تھوڑی تفصیل مذکور ہے، جو حسب ذیل ہے،

ظرف الزمان علی ضربین، ما یصلح جوابا لکم وھو ما یکون محدوداً سواء کان معرفۃ او نکرۃ، فاذا کان کذا استغرقہ الفعل الناصب لہ ان امکن کما اذا قیل لک کم سرت فقلت شھرا، استغرق السیر جمیع الشھر	ظرف زمان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو کتنے کے جواب میں آتا ہے، اور وہ گنا ہوا ہوتا ہے، عام اس سے کہ وہ معرفہ ہو، یا نکرہ، تو جب ظرف زماں ایسا ہو، تو وہ فعل جو اس ظرف کو نصب دے رہا ہے، اگر ممکن ہوگا، تو اس پورے زمانہ کو محیط ہوگا، جیسے اگر تم سے کہا جائے

یله ولیهاره الا ان تقصد المبالغة — کہ تم کتنے دن چلے، توتم نے جواب دیا، کہ
والنجوم وکن اذا قلت شهر — "ایک مہینہ" تو تمہاری چال پورے مہینے کو
رمضان، فان لم یکن استغراق — (مع دن) اور رات کے گھیرے گی، لیکن یہ کہ تم
الجمیع استغراق ما امکن، کما تقول — (بطور واقعہ کے نہیں بلکہ) مبالغہ اور مجاز کے
ثم اتی جواب کم صمت اوکم سرت — طور پر پورا مہینہ کہدو، تو پہلا (یعنی روزہ)
فالاول یعم جمیع ایامه والثانی — مہینہ کے دنوں سے متعلق ہوگا کہ روزے
جمیع لیالیه — اسلام میں دن ہی میں رکھے جاتے ہیں)
اور دوسرا (یعنی چلنا) مہینہ کی راتوں سے مخصوص
(رضی جلد اول ص ۱۶۲) — ہوگا، (کہ عرب میں راتوں ہی کے چلنے کا رواج ہے)

اب غور سے قرآن پاک کی آیت مذکورہ پر ایک تامل کی نگاہ ڈالو کہ وہ گنتی کے دنوں کو بتانے کے لیے ہے یا نہیں، اور وہ کتنے دنوں کے روزے کے جواب میں ہے، یا نہیں، اگر ایسا ہے، تو اس کا ترجمہ، "رمضان بھر کا روزہ ہوگا" یا "رمضان میں روزہ" ظاہر ہے کہ مہینہ کے جتنے دن جو شخص پاتا جائے گا، اتنے دن بھر کا روزہ اس پر فرض ہوتا چلا جائے گا، اسی لیے فرضیتِ روزہ کے آغاز میں جس طرح قرآن نے:

ایاماً معدودات — کچھ گنے ہوئے دنوں میں

کہا، اسی طرح آخر میں یہ کہا،

ولتکملوا العدة — اور تاکہ گنتی کو پورا کرو،

تو اگر سرے سے قرآن نے روزوں کی گنتی ہی مقرر نہیں کی، تو اس گنتی اور شمار پر اتنا زور ہی وہ کیوں دیتا، اس سے ثابت ہوا، کہ فلیصمہ کا ترجمہ یہ ہے، کہ "وہ اس مہینہ (رمضان) بھر روزہ رکھے" نہ یہ کہ اس مہینہ میں روزہ رکھے یا صرف روزہ رکھے۔

اب بحث یہ آئی کہ مہینہ بھر کے روزوں کا ذکر مان بھی لیا جائے، تو تیس اور انتیس ۲۹ دنوں کے روزوں کا تو ذکر نہیں آیا؟ آپ اس اعتراض پر ہنستے ہوں گے کہ کیا کوئی اتنا بیوقوف بھی ہو سکتا ہے، جو مہینہ بھر اور تیس انتیس دنوں کو دو چیزیں سمجھتا ہے، تو ہم اپنے ناظرین کو تسکین دیں گے، کہ ہاں ہم کو خوش قسمتی سے ایسے ہی عقلمندوں سے واسطہ پڑا ہے اس لیے ہم کو ایسی حدیثیں نہیں، جن میں مہینہ بھر روزوں کا ذکر ہو پیش کرنی ہیں، بلکہ ایسی حدیثیں پیش کرنی ہیں، جن میں تیس انتیس دنوں کے روزوں کا ذکر ہے، اور مجبوراً ہم کو اپنے "عقلمند حریف" کی خاطر یہ بھی کرگذرنا ہے، کیونکہ اس کا دعویٰ ہے، کہ ایسی کوئی حدیث اس کی نظر سے نہیں گذری جس میں انتیس یا تیس روزوں کا ذکر ہو،

تیس انتیس دنوں کے روزے حدیثوں میں

۱۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے رمضان کا ذکر کیا، تو فرمایا روزہ رکھنا شروع نہ کرو، جب تک پہلی کا چاند (ہلال) نہ دیکھو، اور نہ روزہ ختم کرو، جب تک پہلی کا چاند نہ دیکھ لو، اور اگر بادل ہوں تو اندازہ کرلو۔ (بخاری، صوم)

اب ایک مہینہ کی پہلی کے چاند سے شروع ہوکر، دوسرے مہینہ کی پہلی کے چاند پر رمضان کے روزے ختم نہ ہوئے، تو دوستو! حساب لگاکر، اپنے حریف دوست کو بتاؤ کہ کے روزے ہوئے۔

۲۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ مہینہ انتیس ۲۹ دنوں کا بھی ہوتا ہے، تو روزے نہ رکھو، یہاں تک کہ اس کو (پہلی کے چاند کو) دیکھو، تو اگر بادل چھائے ہوں تو گنتی تیس ۳۰ پوری کرلو۔ (بخاری، صوم)

دیکھ لیجیے کہ ابن عمرؓ کی روایت میں تیس ۳۰ روزوں کا ذکر ہے، یا نہیں،

۳۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب پہلی کا چاند (ہلال) دیکھو، تو روزہ شروع کرو، اور جب اس کو دیکھو تو روزہ ختم کرو، (مسلم، صوم)

حساب لگائیے، کہ ایک پہلی کے چاند سے دوسری پہلی کے چاند تک کے دن ہوتے ہیں، کبھی تیس ۳۰ اور کبھی انتیس ۲۹،

۴۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ پہلی کا چاند دیکھ کر روزہ شروع کرو، اور اس کو دیکھ کر ختم کرو، اور اگر ابر آجائے، تو تیس ۳۰ گنو۔ (مسلم، صوم)

۵۔ ایک تابعی امیر معاویہؓ کے زمانہ میں شام گئے، وہاں جمعہ کی رات کو چاند نکلا، اور آخر مہینہ میں وہ مدینہ آئے، تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان سے چاند کا حال پوچھا کہ تم نے کب دیکھا، انھوں نے کہا جمعہ کی رات کو، پوچھا کیا تم نے

خود دیکھا، کہا ہاں، میں نے بھی دیکھا، اور سب لوگوں نے دیکھا، اور سب نے روزہ رکھا، اور معاویہؓ نے بھی روزہ رکھا، ابن عباسؓ نے فرمایا ہم نے تو سنیچر کی رات کو دیکھا تو ہم لوگ روزے رکھتے جائیں گے، یہاں تک کہ تیس ۳۰ پورے ہو جائیں۔ (مسلم صوم)

۶۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے سوا پورے مہینہ کا روزہ کبھی نہیں رکھا (بخاری صوم)

یعنی رمضان میں پورے مہینہ کا روزہ رکھتے تھے، شہراً کاملاً

۷۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مہینہ پورا روزہ نہیں رکھا، لیکن رمضان کا پورا مہینہ روزہ میں گذارتے تھے۔ (بخاری، صوم) استکمل شہر رمضان،

۸۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ آپ نے فرمایا پہلی کا چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور اسی کو دیکھ کر ختم کرو، اور اگر بادل چھا جائے تو تیس پورے کرو، (ترمذی، صوم)

۹۔ عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں، کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تیس کے بجائے انتیس ۲۹ دن کے روزے زیادہ رکھے، (ترمذی وابوداؤد، صوم)

۱۰۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے دنوں کے گننے میں بڑا اہتمام کرتے تھے، پھر اتنا ہی اہتمام رمضان کا چاند دیکھنے میں فرماتے تھے، تو اگر مطلع غبار آلود ہوتا تو تیس ۳۰ پورے کرتے۔ (ابوداؤد، صوم)

۱۱۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ آپ نے فرمایا کہ مہینہ سے ایک دو دن

پہلے روزہ نہ رکھو لیکن یہ کہ تمہاری عادت کے روزے کے دن ہوں اور رمضان کا روزہ نہ رکھو، یہاں تک کہ پہلی کا چاند دیکھ لو، اور روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ اس کو دیکھ لو، پھر اگر شوال کی پہلی کے چاند کے درمیان ابر حائل ہو جائے، تو تیس کی گنتی پوری کرو، اور پھر روزہ نہ رکھو، اور مہینہ انتیس ۲۹ کا بھی ہوتا ہے، (ابو داؤد، صوم)

۱۲۔ حذیفہ ابن یمان صحابی سے روایت ہے، کہ آپ نے فرمایا کہ مہینہ (رمضان) سے پہلے روزہ شروع نہ کرو، یہاں تک کہ پہلی (رمضان) کا چاند دیکھو، یا (شعبان کی) گنتی پوری کرو پھر روزہ رکھو اور روزہ نہ توڑو، یہاں تک کہ پہلی (شوال) کا چاند دیکھو یا رمضان کی گنتی پوری کرو، (نسائی صوم)

۱۳۔ ربعی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب پہلی کا چاند دیکھو، تو روزہ رکھو، اور جب پھر اس کو دیکھو تو روزہ ختم کرو، اور اگر ابر ہو تو شعبان کو تیس ۳۰ پورا کرو، لیکن یہ کہ پہلی کا چاند اس سے پہلے دیکھ لو، پھر رمضان کے تیس روزے رکھو، لیکن یہ کہ اس سے پہلے ہی تم پہلی کا چاند دیکھ لو۔ (نسائی۔ صوم)

ابھی حدیث کی اور بہت سی کتابیں باقی ہیں، استقصا مقصود نہیں، صرف مضمون نگار کو یہ دکھانا تھا، کہ اس کا یہ کہنا کہ انتیس تیس روزوں کا ذکر، کتب حدیث میں اس کی نظر سے نہیں گذرا، کہاں تک سچ ہے؟ اور اگر سچ ہے، تو در حقیقت اس کی نظر سے حدیث کی کتابیں گذریں ہی نہیں،

چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش | اس "محقق" نے ان حدیثوں کے اردو ترجموں کی کتابو

میں ہلال کا ترجمہ چاند دیکھ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے، کہ رمضان کے آخری عشرہ میں چاند جب پچھلی پہر نکلے، تب اس چاند کو دیکھ کر، کھانا پینا، بند کر کے روزہ شروع کرنا چاہیے، مگر اس برخود غلط فاضل کو اپنی اس مضحکہ انگیز تحقیق پر بشرطیکہ ذرہ بھی عقل سلیم ہو، یہ سن کر خود ہنسی آئے گی، کہ ان حدیثوں میں سے کسی میں بھی چاند یعنی قمر کا لفظ نہیں، بلکہ ہلال کا لفظ ہے، جس کا اطلاق پہلی کے چاند پر یا زیادہ سے زیادہ تیسری تک کے سر شام کے چاند پر ہوتا ہے، پچھلی کے چاند پر نہیں، جو آخر شب میں پورا ہو کر نظر آتا ہے، اگر اس کے خلاف وہ لب کشائی کی ہمت کرتا ہے، تو حقیقت میں وہ فن لغت سے مذاق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس لیے ہمارے بازیگر محقق کا ان حدیثوں میں ہلال دیکھ کر روزہ رکھنے کا مطلب یہ سمجھنا کہ اکیسویں کی شب کو پچھلی کا چاند دیکھ کر روزہ شروع کیا جائے، جہالت نہیں جنون ہے،

اصل میں روزہ رکھنے سے مقصود ماہ صیام کے روزوں کا آغاز کرنا ہے، اگر وہ یہ سمجھ سکتا، تو اس کو اس مضحکہ انگیز غلطی میں مبتلا نہ ہونا پڑتا، کہ پچھلی پہر اٹھ کر، چاند جس وقت دیکھو، روزہ شروع کر دو۔

ان حدیثوں کے اردو ترجموں میں بعد کا ٹکڑا یہ ہے، کہ اور چاند دیکھ کر افطار کرو" یہ بیچارہ عراقی عربی کا حرف شناس افطار کے ایک ہی معنی جانتا تھا، کہ "دن بھر کا روزہ توڑنا"، اب اس کو یہ دقت پیش آئی، کہ روزہ تو بہر حال آغاز شب میں توڑا جائے گا،

مگر قمری مہینہ کے آخری عشرہ کی ابتدائی راتوں میں تو کوئی چاند ہی سرے سے نظر نہیں آتا، تو اس کو مجبوراً یہ مشکل یوں حل کرنی پڑی، کہ اس حدیث میں جو اس کے علم میں صرف ابوہریرہؓ سے منقول ہے، غلطی ہوئی ہے، ان کو چاند کی جگہ ستارہ کہنا چاہیے تھا، مگر جناب والا! یہ غلطی ایک ابوہریرہؓ ہی سے نہیں ہوئی ہے، بلکہ کم سے کم دس بارہ صحابیوں سے ہوئی ہے، کیا ایسی متفقہ غلطی آج تک کسی نے سنی ہے؟ تمام صحابہ نے بالاتفاق ہلال کا لفظ استعمال کیا ہے، چاند (قمر) کا نہیں، ستاروں (نجوم) کا نہیں، اب کون بیوقوف کہہ سکتا ہے کہ نعوذ باللہ یہ صحابہؓ ایسے کم عقل اور یہ اہلِ زبان ایسے نادان تھے، کہ ہلال (پہلی کے چاند) اور مطلق چاند اور ستاروں میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے تھے۔ اور ایسے عملی حسی مشاہدہ میں جو ہر سال انتیس تیس دن اُن کے سامنے گذرتا تھا، (بلکہ نوافلِ صیام کو ملا کر تعداد اور زیادہ بڑھ جائے گی) مگر پھر بھی اس کے بیان کرنے میں ایسی فاش غلطی کرتے تھے، کہ ستارہ کی جگہ اُن میں ہر شخص غلطی سے چاند ہی نہیں بلکہ ہلال بول دیتا تھا، اور اسی پر عمل کر دیتا تھا،

درحقیقت اس عراقی عربی کے حرف شناس سے جس طرح ہلال دیکھ کر، روزہ شروع کرنے کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی ویسی ہی ہلال دیکھ کر، روزہ ختم کرنے کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی، اور بالآخر اس کو اس دلدل میں پھنسنا پڑا، افطار جس طرح ہر دن روزے توڑنے کو کہتے ہیں، اسی طرح پورے ماہِ صیام کے روزہ کے ختم کرنے کو بھی کہتے ہیں اسی لیے روزوں کے بعد کی عید کو عید الفطر کہتے ہیں، یعنی "روزہ ختم کرنے کی خوشی کا دن"،

ان حدیثوں میں ہلال (پہلی کا چاند) دیکھ کر روزہ ختم کرنے کا جو بیان ہے اس سے مقصود ماہ صیام کو ختم کرنے کے ہیں،

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ پہلی کا چاند (یکم رمضان کی شب کا چاند) دیکھ کر رمضان کے روزے صبح سے شروع کرو، اور پھر دوسری پہلی (یعنی یکم شوال کی رات) کا چاند دیکھ کر رمضان کے روزے ختم کرو،

اگر مضمون نگار کی عقل کے مطابق، ان حدیثوں کا مطلب یہ سمجھا جائے، کہ (ہر روز کے روزہ کو ہلال دیکھ کر شروع اور ہلال دیکھ کر ختم کرو، تو قباحت یہ لازم آئے گی، کہ اس محقق کو اواخر رمضان کے بجائے جیسا کہ وہ ثابت کرنا چاہتا ہے صرف پہلی یا حد سے حد دوسری اور تیسری رمضان کے روزے ماننے پڑیں گے، جن میں ہلال (نیا چاند) نظر آسکتا ہے، مگر اس پر بھی ان دنوں میں ہلال دیکھ کر روزہ توڑنے کا مطلب تو بنایا جا سکتا ہے، مگر ہلال دیکھ کر روزے رکھنے کا مطلب تو بدرستی ہوش و حواس قیامت تک نہیں بن سکتا، الا یہ کہ کوئی ہمارے محقق کی طرح ہلال کے معنی ستاروں کے سمجھے، یا اس پورے چاند کے سمجھے، جو قمری مہینوں کی آخری راتوں میں نکلا کرتا ہے، مگر ایسا سمجھنا کیا عقل و ہوش اور علم و دانش سے محرومی کا اعلان نہیں ہے؟

پھر اس جہالت کا ماتم کس طرح کیا جائے، کہ ایسی بے بنیاد اور حد درجہ نادانی اور کم علمی کی باتیں کہی جاتی ہیں، اور ان کا نام تحقیقات بلکہ مرعوب کن لفظ

محدیث پرتھیسس" رکھا جاتا ہے، اور اردو کے ایک ایسے پرچہ میں جو علم کی خدمت کا بھی مدعی ہے، شائع ہوتا ہے، اور مذہب کو عقل و دانش کے معیار پر پرکھنے والے نوجوان اس کو پڑھتے ہیں، اور پسند کرتے ہیں، ہم نہیں جانتے کہ اس حادثہ علمی پر اس "مجنون محقق" کا ماتم کریں، یا اپنے زود فریب نوجوانوں کا، جو ہر فضول گو کو محقق، اور ہر مشکل نویس کو فلسفی اور ہر پریشان نگار کو انشاء پرداز سمجھتے ہیں، اور سر نیاز جھکا دیتے ہیں۔

تواتر عمل کا انکار حماقت ہے۔ جو بات ہم کو سب سے پہلے کہنی چاہیے تھی، وہ آخر میں کہتے ہیں، آج اسلام کے عملیات کی تحقیق کی جارہی ہے، کہ وہ کہاں تک اصول اسلام سے ثابت ہیں، اور اس تحقیق میں یہ بھلا دیا جاتا ہے، کہ اسلام تخیلی نہیں، بلکہ سرتاپا عملی مذہب ہے، جس دن سے نماز پنجگانہ کا حکم ہوا ہے، اس دن سے لیکر آج تک نماز پنجگانہ اسی طرح اور انہی اوقات میں پڑھی جارہی ہے، جن میں اس دن پڑھی گئی، جب اس کا حکم پہلے دن نازل ہوا، علیٰ ہذا رمضان کے روزے اسی طرح اور انہی دنوں میں رکھے جاتے ہیں، جس طرح اس سال رکھے گئے، جس سال یہ حکم نازل ہوا، اس وقت سے لے کر، آج تک تیرہ صدیاں اس حکم پر اس طرح گذریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی عہد حیات سے لے کر خلفائے راشدین کے زمانۂ خلافت تک اور پھر تابعین و تبع تابعین سے لے کر، اس ۱۳۵۰ھ کے رمضان تک ہر ملک، ہر شہر، ہر قریہ کے مسلمانوں نے اور مسلمانوں کے ہر فرقہ نے

بلا اختلاف رمضان کے پورے ماہ کے روزوں کی فرضیت کو سمجھا؛ اور عمل کیا، اب آج کسی گوشہ سے ایک گمنام اٹھتا ہے، اور "بڑی تحقیق" کے بعد کہتا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی غلطی میں مبتلا رہے، خلفا بھی غلط سمجھے؛ عام صحابہؓ بھی حقیقت سے ناواقف رہے، ائمہ مجتہدین، محدثین، فقہا، علما بھی سارے کے سارے دھوکے میں رہے، اور تمام مسلمان بھی اب تک اس نادانی میں مبتلا رہے، اور ہیں، اور تیرہ سو صدیاں اسی نادانی اور جہالت میں گذر گئیں، اور اب اس حکم کی اصل حقیقت عراق کے جنگی سفر میں، ایک نومسلم عیسائی پادری کی باعنی ملاقاتوں میں مجھ پر منکشف ہوئی، تو ایسے گمراہ کو صرف گمراہ کہنے پر قناعت کرنا لغت کی بے بسی کا اظہار ہے۔

سیرۃ نبویؐ کی تدلیس | مضمون نگار نے ہماری سیرۃ نبویؐ جلد دوم کے حوالہ سے لکھا ہے، کہ مولانا شبلی مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ "اصل میں تین ہی روزے فرض تھے" مگر مدعی کے فریب کا حال اسی سیرت کی اصل عبارت سے معلوم ہو سکتا ہے۔

"اہل عرب روزہ کے بہت کم خوگر تھے، اول اول روزہ ان پر شاق ہوا، اس لیے نہایت تدریج کے ساتھ روزہ کی تکمیل کی گئی، اول اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے، تو سال میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا، پھر روزے کی فرضیت نازل ہوئی، تو یہ اختیار رہا کہ جو شخص چاہے، روزہ رکھے،

اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلادے، رفتہ رفتہ جب
لوگ روزے کے خوگر ہو چلے، تو یہ آیت اتری،

فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ ، جو رمضان کا مہینہ پائے وہ ضرور (اس کو)
(بقرہ) روزہ رکھے۔

اب بالتعیین روزہ فرض ہوگیا، اور فدیہ کی اجازت جاتی رہی،
ہر شخص سمجھ سکتا ہے، کہ سال میں تین روزوں کے رکھنے کا حکم رمضان کے
روزوں سے قبل کا بیان ہے، رمضان کے روزوں سے اس تعداد کا کوئی تعلق
نہیں،

ع جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے

(معارف جنوری ۱۹۳۲ء)

لفظ صلوٰۃ قرآن شریف میں

ہم نے اگست کے شذرات میں "غیر مذہبی عربی تعلیم" کے فتنہ سے مسلمانوں کو ہشیار کیا تھا، آج اس کی متعدد پیش نظر مثالوں میں سے ایک مثال آپ کے سامنے ہے، مولوی نعیم الرحمٰن صاحب ایم، اے لکچرار عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی، عربی کے لائق گریجویٹ ہیں، عربی سے بعض تاریخی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرچکے ہیں، اب حال میں آپ نے مسئلہ "صلوٰۃ" کے متعلق داد تحقیق دی ہے، نماز کا بعض لوگوں پر سخت ہونا، خود قرآن شریف کی شہادت ہے اب اس کی سختی کو کم کرنے کے لیے مختلف تجویزیں سوچی جارہی ہیں، بعض اصحاب تو نماز کے اوقات کو کم کرنا چاہتے ہیں بعض رکعات کی تخفیف کے خواستگار ہیں، بعض ارکان کی تقلیل کے خواہش مند ہیں، اور ان سب کا استدلال قرآن پاک سے ہے،

یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا۔

مولانا نعیم الرحمٰن صاحب ایم، اے کی رائے ہے کہ نماز کی مخصوص صورت صرف مسجدوں میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کے لیے ہے، علیحدہ اور منفرد اشخاص کے لیے یہ مخصوص صورت واجب نہیں، بلکہ محض دل سے "یادِ خدا کر لینا" کافی ہے، کاش یہ بھی ہوتا،

سو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ گمراہیاں اور غلطیاں کیوں پیش آرہی ہیں، اس لیے آرہی ہیں، کہ کتاب کے ساتھ "سنت"، کو نہیں لیا جاتا، یہی غلطی گذشتہ معتزلہ نے بھی کی، اور اب موجودہ معتزلہ بھی کر رہے ہیں، تاہم گذشتہ معتزلہ اس قدر دلیر نہ تھے، کہ وہ سنتِ متواترہ اور عمل متواتر کی تغلیط یا تکذیب کریں، مگر اب دنیا اس دقیانوسی زمانہ سے علم وفہم میں بہت کچھ ترقی کر چکی ہے،

سوال یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف الفاظِ قرآنی القا ہوئے، یا ان کے معانی بھی القا ہوئے، اگر پہلی صورت ہے، تو نعوذ باللہ اس عہد کے اصحابِ علم خود حاملِ وحیؐ سے زیادہ عالم بلکہ پیغمبر بننے کے مستحق ہیں، اور اگر دوسری صورت ہے، تو حاملِ وحیؐ نے ان معانی کی تعلیم اپنے پیرووں کو دی ہے یا نہیں، اگر نہیں دی تو،

بلّغ ما انزل الیک　　جو تجھ پر اتارا گیا، اس کو دوسروں تک پہونچاؤ۔

کا فریضہ کیوں کر ادا ہوا، اور

یعلّمھم الکتاب　　وہ قرآن ان امیوں کو سکھاتے ہیں،

کس کی شان میں ہوگا، اور

لتبینہ　　تاکہ تم لوگوں کے لیے اس کی تشریح کردو،

کا کس کو حکم ہوگا،

اور اگر آپ نے اس کے معانی ومطالب اور تشریحات اپنے پیرووں کو بتائے،

تو وہ کیا ہوئے، اور کہاں ہیں، اور کیوں کر مٹ گئے، اور کب مٹ گئے، اور "وانا لہ لحافظون" [illegible] ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے کا وعدہ کیا ہوا، یہ حفاظت لفظی، معنوی، اور تشریحی ہر حیثیت سے تھی، اب اس تسلیم سے چارہ نہیں، کہ وہ عملی حیثیت سے تواتر عمل اہل اسلام اور علمی حیثیت سے صحائف سنت اور کتب حدیث میں موجود ہیں، ان صحائف و کتب احادیث و روایات پر اصولاً بحث کرنے کی گنجائش ہر وقت حاصل ہے، مگر ان سے قطع نظر کرنا کسی طرح ممکن نہیں، بنا بریں قرآن پاک کی کسی آیت کریمہ کی تفسیر و تشریح کرتے وقت الفاظ اگر کئی معنی کو محتمل ہوں تو عمل تواتر اور روایت صحیح یہی دو چیزیں ہیں، جو ان کے اصلی معنی کی تعیین کریں گی، اگر یہ سر رشتہ ہاتھ میں نہ ہو، تو پھر صحت و خطا کا معیار کیا رہ جائے گا،

اس مختصر تمہید کے بعد عرض ہے کہ قرآن پاک میں "اقامت صلوٰۃ" (نماز کھڑی کرنے کا) جو صحیح مفہوم ہے، اس کو ہمارے دوست مولوی زبید احمد صاحب نے نہایت خوبی سے لکھا ہے، اور بیان کیا ہے، لیکن وہی ایک آیت اُن کے استقصاء سے رہ گئی ہے، جو میری تحقیق میں اقامت صلوٰۃ کے مفہوم کو بالکل روشن کر دیتی ہے، اور کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں چھوڑتی ہے، ہمارے مکرم پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب سے بخلوص عرض ہے کہ وہ بھی اس پر غور فرمائیں،

"اقامت صلوٰۃ" سے مطلق نماز کے معنی مقصود ہیں، خواہ وہ مسجد میں ہو،

یا غیر مسجد میں، یا ضرور ہے، کہ اس کے معنی "مسجد میں نماز با جماعت" کے ہوں، یہ اگر دوسرے معنی مراد ہیں، تو چاہیے کہ غیر مسجد میں نماز با جماعت نہ ہو سکے، جس طرح غیر گرجا میں عیسائیوں کی نماز اور غیر بت خانہ میں بت پرستوں کی پوجا اور غیر آتشکدہ میں پارسیوں کی عبادت نہیں ہو سکتی؟ کیا ایسا کہنا اصول اسلام کا براہ راست تمسخر نہیں ہے، اور اگر صرف نماز مراد ہے، خواہ وہ کہیں ہو تو پھر "صلوٰۃ" بمعنی مسجد کی "مناسبت" اقامت صلوٰۃ" میں کیا رہ جاتی ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کے معنی صرف "نماز با جماعت" کے ہیں، خواہ وہ مسجد میں ہو یا غیر مسجد میں، تو پھر اقامت صلوٰۃ کے معنی "اقامت مسجد" کے نہیں، بلکہ "اقامت جماعت" کے لینے ہوں گے اور صلوٰۃ بمعنی مسجد نہیں، بلکہ بمعنی جماعت ہوگا، کیا آرامی یا عبرانی زبان میں "صلوٰۃ" جماعت کے معنی میں کہیں آیا ہے، جس آیت کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، وہ حسب ذیل ہے:

واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ	اور جب اے رسول! تو ان (مسلمان مجاہدین)
فلتقم طائفۃ منھم معک	میں ہو، اور ان کے لیے نماز کو کھڑی کرے، تو
ولیاخذوا اسلحتھم، فاذا سجدوا	ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو، اور اپنے ہتھیاروں
فلیکونوا من ورائکم ولتات	کو لیے رہے، اور جب وہ سجدہ کرے، تو تم لوگوں
طائفۃ اخری لم یصلوا فلیصلوا	کے پیچھے ہو جائے اور دوسرا گروہ جس نے نماز
معک۔	نہیں پڑھی وہ آئے اور تیرے ساتھ نماز پڑھے،
فاذا قضیتم الصلوٰۃ فاذکروا اللہ	پھر جب تم نماز ختم کر چکو تو اللہ کو کھڑے

قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبکم فاذا اطمأننتم فاقیموا الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً۔ (نساء)

بیٹھے سوتے یاد کرو، اور جب تم کو اطمینان ہو جائے، تو نماز کھڑی کرو، بے شک نماز مسلمانوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے،

آیت کے ابتدائی حصّہ میں "اقامتِ صلوٰۃ" کا حکم ہے، یہ میدان جنگ کا واقعہ ہے، دشمن باقاعدہ نماز کا موقع نہیں دے رہا ہے، اب بتایئے کیا یہاں اس میدانِ جنگ میں نماز چھوڑ کر مسجد کی تعمیر کا حکم ہے، یا میدان جنگ چھوڑ کر مسجد میں جاکر پہلے دوڑ کر نماز پڑھ آنے کا حکم ہے یا محض نماز باجماعت کا حکم ہے، آگے چلیے، ایک ایک رکعت نماز پڑھ لینے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق حکم ہے، کہ پھر علیحدہ علیحدہ اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جس طرح موقع ملے یاد الٰہی کرلو، پھر جب اطمینان ہو تو نماز کھڑی کرو، اطمینان کے بعد ہی یعنی اسی سفر میں میدان جنگ کے اندر اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا، اب یہاں مسجد کہاں سے آئی، کیا ہر صحرا اور جنگل اور پہاڑ اور سمندر میں جہاں جہاں مسلمان فوج جائے، ہر منزل میں، دن میں پانچ وقت مسجد بنائی جائے، اور نماز پڑھی جائے،

حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ۔

سب نمازوں کی نگہداشت کرو اور خصوصاً بیچ کی نماز کی،

اس آیت پاک کا ترجمہ آپ یہ کرتے ہیں کہ "تمام مسجدوں کی حفاظت کرو اور خصوصاً بیچ کی یعنی مرکزی مسجد (خانہ کعبہ) کی، بہت خوب! لیکن آیت اتنی ہی تو

نہیں ہے، بلکہ پوری آیت یوں ہے،

حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ	سب نمازوں کی نگہداشت کرو، خصوصاً
الوسطیٰ وقوموا للہ قانتین	بیچ کی نماز کی (یعنی عصر کی نماز) اور خدا کے
فان خفتم فرجالاً اورکباناً فاذا	سامنے خضوع وخشوع کے ساتھ کھڑے
امنتم فاذکروا اللہ کما علمکم مالم	ہو، پھر اگر کوئی ڈر ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر،
تکونوا تعلمون،	(جس طرح ہو سکے) اور جب ڈر جاتا رہے، تو
	اس طرح خدا کو یاد کرو، جس طرح تم کو اس نے
(بقرہ ۳۲)	بتایا جو تم نہیں جانتے تھے،

اگر آپ کا ترجمہ اختیار کیا جائے، تو معنی یہ ہوں گے،

"سب مسجدوں کی حفاظت کرو، خصوصاً مرکزی مسجد کی، اور خدا کے سامنے خضوع اور خشوع کے ساتھ کھڑے ہوں، اگر ڈر ہو تو پیادہ اور سوار (جس طرح ہو سکے) اور جب خوف جاتا رہے، تو اس طرح خدا کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا جو نہیں جانتے تھے"

اس حالت میں اول آیت (حفاظت مسجد) کا آیت کے بعد کے حصوں سے کیا تعلق رہے گا، یعنی یہ کہ "اول تو کوشش کرو کہ مسجدوں میں جاکر، خصوصاً خانہ کعبہ میں جاکر، نماز با جماعت ادا کرو" اور اگر اس ارادہ کی تکمیل میں جان کا خوف ہو تو خیر پیادہ ہو کر، اور اگر اس میں ڈر ہو تو سوار ہی ہو کر نماز پڑھ لو، اور جب ڈر جاتا رہے،

تو پھر اسی طرح پڑھو، جس طرح خدا نے بتایا ہے، یہ سفر اور جنگ کا حکم ہے، جیساکہ "خوف" اور "امن" کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں، اس کا تعلق مسجد کی نماز باجماعت سے نہیں، بلکہ نماز کی شکل وصورت یعنی ارکان سے ہے، یہ آیت غزوۂ خندق کے موقع کی ہے، جب صحابہؓ کی اور خود حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عصر کی نماز قضا ہوگئی تھی، اسی لیے اس نماز عصر کا خاص طور سے ذکر ہے، مطلب تو یہ ہے کہ نماز ہر حال میں ادا کی جائے، خواہ صلح ہو یا جنگ، امن ہو یا خوف، اگر حالتِ جنگ ہو یا میدانِ جنگ میں دشمن کے حملہ کا خوف ہو تو پیادہ ہوکر پڑھو، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو سواری پر پڑھو، پھر جب یہ حالت جاتی رہے، تو جس طرح نماز کا طریقہ تم کو بتایا گیا ہے، اس طرح پڑھو،

اس کے سوا دوسرے معنی ہو نہیں سکتے، جنگ میں پیادہ ہوکر پڑھنے یا سوار ہوکر پڑھنے کی اجازت دینا اور بحالتِ امن اس طرح نماز پڑھنے کا حکم دینا جس طرح اس نے (یعنی خدا نے بتایا)، نماز کی صورت و شکل اور ارکان سے اس کا تعلق ہوگا "مسجدوں کی نماز باجماعت" سے نہیں، چونکہ ہمارے دوست مولوی زبید احمد صاحب نے بتفصیل اس رائے کی تغلیط کی ہے، اس لیے مجھے زیادہ کہنے کی حاجت نہیں، صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں، جو مطلب قرآن پاک کی آیتوں کا ہمارے مکرم پروفیسر نعیم الرحمن لینا چاہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، نے وہی سمجھا کہ نہیں، اگر نہیں سمجھا تو وہی مطلب ہوا کہ حاملِ وحی اور

اس کے پیر و خدا کے مراد و مفہوم سے واقف نہ ہوئے اور بالآخر یہ عقدہ کشائی چودہ سو برس کے بعد ایک عجمی نے کی، اور اگر واقف تھے، تو کیا تمام عمر میں ایک دن بھی، ایک دن کے پانچ وقتوں میں سے ایک وقت بھی ہزاروں صحابہ میں سے کسی ایک نے بھی اس پر عمل کیا۔

مولوی زبید احمد صاحب اپنے دلائل کا ترکش خالی کرنے کے لیے گھبرا رہے ہوں گے، اس لیے میں زیادہ ان کو روکنا نہیں چاہتا، ناظرین ذرا ان کی تیر اندازی کی داد دیں، یہ مولویوں مولویوں کی لڑائی نہیں، گریجویٹ گریجویٹ کی جنگ ہے، اس لیے براہ عنایت "مولوی صاحبان" اپنی تکفیر و تفسیق کے بانے الگ رکھیں، وہ اس میں دخل نہ دیں۔

(معارف اکتوبر ۱۹۲۷ء)

خلیل اللہ کی بشریت

حضرات انبیائے کرامؑ کے اوصافِ غالبہ

انبیاءؑ کے اوصاف کمالی "خلیل اللہ" کے لغوی معنی "خدا کے دوست" کے ہیں، اور یہ حضرت ابراہیمؑ کا لقب ہے، لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں، کہ دوسرے انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کے دوست نہ تھے، کیا کوئی پیغمبر ایسا بھی ہو سکتا ہے، جو خدا کا دوست نہ ہو، پھر صرف حضرت ابراہیمؑ ہی خلیل اللہ کیوں ہوں،

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب کلیم اللہ مشہور ہے، جس کے معنی ہیں "خدا سے باتیں کرنے والا"، "جس نے خدا سے باتیں کیں"، لیکن کیا کوئی پیغمبر ایسا بھی ہے، جس سے خدا نے کسی نہ کسی طرح باتیں نہ کی ہوں، پھر حضرت موسیٰؑ ہی کلیم اللہ کیوں کہلائیں،

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کہتے ہیں، حالانکہ تمام انبیاءؑ اور نہ صرف انبیاءؑ بلکہ ہر انسان کی روح خدا ہی کی روح ہے، پھر حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کیوں کہیے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ تخصیص شاہد و مبشر و نذیر و داعی الی اللہ و سراج منیر کہے تو ایسا کہنا کیونکر درست ہوگا، درانحالیکہ

ہر نبی شہادت دینے والا، نیکو کاروں کو بشارت سنانے والا، گنہگاروں کو تنبیہ کرنے والا، خدا کی طرف پکارنے والا، اور روشنی بخشنے والا، چراغ بن کر آیا،

عام لوگوں کو یہ شبہ اس لیے پیش آتا ہے، کہ وہ زبان کے ایک نکتہ سے پہلو تہی کرتے ہیں، وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے صرف اسی وصف سے ملقّب کیا جاتا ہے، جو وصف اس میں بمرتبۂ کمال ہوتا ہے، باتیں ہر شخص کرتا ہے، اس لیے لغت کے لحاظ سے ہر شخص ابوالکلام ہے، مگر استعمال میں ابوالکلام اسی کو کہیں گے جس میں کلام کی خوبی و برجستگی یا طول بوجہ کمال ہو،

آنکھیں اور ہاتھ کس انسان کے پاس نہیں، اس لیے اولی الایدی والابصار (ہاتھوں اور آنکھوں والے) سبھی ہیں، مگر قرآن پاک نے اس کو خاص طور سے انبیائے کرام کا وصف قرار دیا، اور فرمایا،

واذکر عبادنا ابراھیم واسحاق ویعقوب اولی الایدی والابصار، (ص ۴)	اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو، جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے۔

ہاتھ عمل کے لیے اور بصارت علم کے لیے ہے، اس سے مقصود انسان کی عملی اور علمی قوتوں کا کمال ہے، چونکہ حضرات انبیاءؑ کی عملی اور علمی دونوں قوتیں مرتبۂ کمال پر ہوتی ہیں، اس لیے تمام انسانی طبقوں میں "اولی الایدی والابصار" (ہاتھوں اور آنکھوں والے) کے لقب کے وہی مستحق قرار پائے،

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء علیہم السلام کو مختلف اوصاف

کا ملہ سے یاد فرمایا، حضرت ابراہیمؑ کی نسبت فرمایا:

واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً (نساء ۱۸) اور خدا نے ابراہیمؑ کو دوست بنایا،

حضرت موسیٰؑ کی نسبت ارشاد ہوا،

وکلّم اللہ موسیٰ تکلیما (نساء ۲۳) اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے بہت سی باتیں کیں،

حضرت اسماعیلؑ کو فرمایا،

انہ کان صادق الوعد (مریم ۴) اسماعیل وعدہ کے سچے تھے،

حضرت ایوبؑ کے متعلق ارشاد باری ہے،

وانا وجدناہ صابراً (ص) ہم نے اس کو صابر پایا،

غور کیجیے کہ انبیاءؑ میں کون نہیں جس سے خدا نے دوستی نہیں کی، یا خدا نے اس سے باتیں نہ کیں، یا وہ وعدہ کا سچا نہ تھا، یا حق کی راہ میں وہ صابر نہ ٹھہرا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دوستی کے وصف سے صرف حضرت ابراہیمؑ کو، ہم کلامی کے وصف سے صرف حضرت موسیٰؑ کو، صدقِ وعدہ کے وصف سے صرف حضرت اسماعیلؑ کو، اور صبر کے وصف سے صرف حضرت ایوبؑ کو ممتاز فرمایا، حالانکہ خود قرآن کہتا ہے کہ

واصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل۔ (احقاف۔ ۵) (اے رسول) آپ بھی ویسے ہی صبر کیجیے جیسے ہمت والے رسولوں نے کیا ہے۔

مگر اس عموم کے باوجود تمام انبیاءؑ میں سے مخصوص طور پر صرف حضرت ایوبؑ ہی کو

صابر کہہ کر یاد فرمایا گیا، جس کے یہ معنی نہیں، کہ نعوذ باللہ دوسرے انبیاءؑ اس صبر کے وصف سے معرا تھے،

بات یہ ہے کہ گو ہر شخص کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کی استعدادیں ملتی ہیں، مگر ان میں سے ایک ہی دو استعدادوں کا کمال نصیب ہوتا ہے، بالقوی استعدادوں کی فعلیت زمانہ کے اقتضا، حالات کی مناسبت، وقت کی ضرورت اور پیش آمدہ واقعات کے مطالبہ کی بنا پر ہوتی ہے، جہاد کا حکم ہر پیغمبر کو ہوا، مگر ہر ایک کی زندگی میں اس کے مناسب حالات پیش نہیں آئے، اس لیے حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگیوں میں جہاد کے جو مناظر پیش آئے، وہ دوسرے پیغمبروں کو پیش نہیں آئے،

غرض کسی شخص میں کسی وصف کا موجود ہونا اور بات ہے، اور اس وصف کے عملی ظہور کے مواقع پیش آنا، اور ان کے مطابق اس وصف کا مرتبۂ کمال ظاہر ہونا اور بات ہے، انبیاءؑ کا کسی وصفِ خاص سے ملقب اور ممتاز ہونا پہلے اوصاف کی بنا پر نہیں بلکہ دوسرے اوصاف کی بنا پر ہوتا ہے، اسی لیے حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ حضرت عیسیٰ روح اللہؑ، حضرت اسماعیل صادق الوعد اور حضرت ایوبؑ صابر ٹھہرے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے نسلاً بعد نسلٍ دوستی کا جو وعدہ فرمایا اور جس کی علامت کے طور پر ان کی اولاد در اولاد کو نبوت و برکت سے سرفراز فرمایا، یہ دوستی کا کمال کسی اور نبی کو عنایت نہیں ہوا، حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر جس طرح ہم کلامی کا شرف بخشا گیا

وہ کسی اور نبی کے حصہ میں نہیں آیا، حضرت عیسیٰؑ کو روحِ الٰہی کا فیضان جس کمال کے ساتھ ملا، وہ کسی اور نبی کو نہیں دیا گیا، چنانچہ فرمایا،

تلک الرسل فضّلنا بعضھم علٰی بعض منھم من کلّم اللہ ورفع بعضھم درجات وآتینا عیسی ابن مریم البینٰت وایدناہ بروح القدس، (بقرہ-۳۳)	یہ پیغمبران میں سے بعض کو بعض پر ہم نے برتری دی، ان میں سے کوئی تو ایسے ہیں جن سے خود اللہ تعالٰی نے کلام کیا، اور بعض کے درجے بلند کیے، اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی،

اس آیت پاک میں تین پیغمبروں کا وصف امتیاز بیان کیا گیا، پہلے حضرت موسیٰؑ کا کہ ان کو کلیمیت ملی، اور سب سے آخر میں حضرت عیسیٰ کا کہ ان کو معجزات اور روح القدس کی تائید بخشی گئی، اور دونوں کے بیچ میں ایک پیغمبر کا ذکر آتا ہے، جس کو درجوں اور مرتبوں کی بلندی ملی، یہ بیچ کے پیغمبر ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کی شریعت وسطا اور صراط مستقیم اور موسویت اور عیسویت کے بیچ میں معتدل ہے، اس لیے آپ کا ذکر بھی ان دونوں کے بیچ میں ہے،

ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درجوں اور مرتبوں کی جو بلندی ملی، اس کی تفصیل اور تشریح جتنی بھی کی جائے، کم ہے، اور قرآن پاک میں جا بجا اس کی تشریح ہے، منجملہ اس کے ایک یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کلیمیت اور حضرت عیسیٰؑ کو تائید بروح القدس کی جو فضیلت عطا ہوئی، وہ شخصی فضیلتیں ہیں، اور ہمارے رسول کو

جن درجوں اور مرتبوں کی فضیلت عطا ہوئی، وہ شخصی کے علاوہ دینی و عمومی ہیں، آپ کو جو بالذات فضیلت بھی عطا کی گئی، مثلاً خاتمیت، وہ بھی آپ کی کتاب، آپ کی شریعت اور آپ کی امت کو مشتمل ہے، آپ کے دین کو عموم بخشا گیا، آپ کو نبی الامم اور نبی الانبیاء دونوں بنایا گیا، آپ کے دین پر دین الٰہی کے ہر گوشہ کی تکمیل کی گئی، آپ کی کتاب کو خاتم الکتب اور ناسخ الکتب بتایا گیا، اور قیامت تک کے لیے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا، اور آپ کی امت کو آخر الامم کا لقب ملا، ع

ہر چند وصفت می کنم لیکن ازاں بالاتری

بایں ہمہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے ہم کلامی کا شرف نہیں بخشا یا روح القدس کی تائید عطا نہیں ہوئی، یہ دونوں باتیں آپ کو بھی ملیں، لیکن یہ باتیں آپ کا وصف امتیازی نہیں بتائی گئیں، بلکہ اور دوسری دوسری باتوں کو آپ کا وصفِ امتیازی ٹھہرایا گیا، مثلاً فرمایا۔

انا ارسلناک شاھداً ومبشراً ونذیراً۔ (فتح۔۱)	ہم نے تجھکو گواہ اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا،
یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھداً ومبشراً ونذیراً وداعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیرا۔ (احزاب۔۶)	اے پیغمبر! ہم نے تجھکو گواہ اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور خدا کی طرف سے پکارنے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا

یہ آپ کے منجملہ دیگر امتیازی صفات کے چند امتیازی صفات ہیں، جن کا یہ منشا نہیں، کہ ان صفات سے دیگر انبیاء علیہم السلام خالی تھے، بلکہ یہ ہے کہ ان اوصافِ کمالیہ کا یہ اجتماع ان کی ذات میں اس درجہ کمال میں نہ تھا، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں تھا، چنانچہ پورے قرآن میں کسی خاص پیغمبر کے یہ اوصاف بہ تخصیص نام لے کر سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں قرار دیے گئے، کیونکہ مقام مدح میں وہی اوصاف بیان کیے جاتے ہیں، جو کسی موصوف کے اوصافِ امتیازی اور کمالی ہوتے ہیں، جن کو اوصافِ غالبہ کہتے ہیں،

اسی نکتہ کو مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ تحذیر الناس میں یوں بیان فرماتے ہیں:

مگر کوئی ملقب ہوتا ہے تو اپنے اوصافِ غالبہ کے ساتھ ملقب ہوتا ہے، مرزا جانجاناں صاحب اور شاہ غلام علی صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب، چاروں صاحب جامع بین العلم والفقر تھے، پر مرزا صاحب اور شاہ غلام علی صاحب تو فقیری میں مشہور ہوئے، اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب علم میں، وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کے علم پہ انکی فقیری غالب تھی، اور ان کی فقیری پر ان کا علم، اگرچہ ان کے علم سے ان کا علم یا ان کی فقیری سے ان کی فقیری کم نہ ہو، سو انبیاء میں علم عمل سے

غالب ہوتا ہے، اگرچہ ان کا علم اور ہمت اور قوت اور ان کے علم اور ہمت اور قوت سے غالب ہو، بہرحال علم میں انبیاء اوروں سے ممتاز ہوئے ہیں (ص ۵۰)

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

نبوت کمالات علمی میں سے ہے اور آپ جامع العلوم ہیں اور انبیاء باقی جامع نہیں، (ص ۵۰)

غرض یہ ہے کہ مقام مدح میں خاص خاص انبیاء علیہم السلام کے وہی اوصاف گنائے جاتے ہیں، جن میں ان کو دوسروں پر امتیاز اور فضیلت حاصل ہو، اسی بناپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں جو شاہد و مبشر و نذیر و داعی الی اللہ وسراج منیر کے الفاظ باطلاق آئے ہیں، ان کا یہی مقصد ہے کہ آپ میں یہ اوصاف مجتمعاً ایسے مرتبۂ کمال پر تھے جو کسی اور نبی میں نہ تھے،

اوصافِ کمالی کے علم کے طریقے | انبیاء علیہم السلام کے یہ امتیازی اوصاف دو طریقوں سے معلوم ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ بنص صریح ان کا اظہار ہو، جیسے حضرت موسیٰؑ کے لیے کلیمیت، حضرت عیسیٰؑ کے لیے تائید بروح القدس یا حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے صدق وعد اور حضرت ایوبؑ کے لیے صبر، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لفظوں میں اس وصف کی تصریح نہ ہو، مگر ان کی زندگی کے عملی کارناموں میں وہ وصف علانیہ نظر آتا ہو، جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام میں نذیریت کا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام میں مبشریت کا کمال،

نذیریت کے کمال کے یہ معنی ہیں کہ اس میں خدا کی قہاری و جباری کے اوصاف کا ظہور زیادہ ہو، اور کمال مبشریت کے یہ معنی ہیں، کہ خدا کے فضل وکرم اور رحمت عام کا رنگ زیادہ نمایاں ہو، جیسا کہ خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "مبشر" وغیرہ کہہ کر فرمایا تو وہیں اس کی تصریح فرمائی،

وبشر المومنین بان لھم من اللہ فضلاً کبیراً۔ (احزاب - ۶)	اور ایمان والوں کو خوش خبری سنا دیجئے کہ ان کے لیے خدا کی طرف سے بڑی مہربانی (فضل) ہے،

۱، کمال نذیریت میں اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب کا پہلو، اس کے فضل وکرم سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے، جیسے نوح علیہ السلام اپنی ہزار سالہ تبلیغ کی ناکامی سے جب مایوس ہوئے، تو ان کا نمایاں پہلو یہ ہے، کہ خدا کی بارگاہ میں کفار کی پوری نسل کی بربادی و ہلاکت کی دعا مانگی، عرض کی،

رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیاراً، انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً، رب اغفر لی ولوالدی ولمن دخل بیتی مومناً وللمومنین و للمومنات ولا تزد الظلمین	اے میرے پروردگار! تو زمین پر کافروں میں سے کوئی گھر بسانے والا مت چھوڑ، بیشک اگر تو ان کو چھوڑے گا، تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے، اور ان کی اولاد جو ہوگی وہ بھی بدکار اور سخت کافر، اے میرے رب! مجھے اور میرے والدین کو اور جو میرے گھر میں باایمان

الا تبارًا۔ — آئے، اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بخش دے، اور ظالموں کو نہ بڑھا، مگر تباہی

(نوح - ۲) — میں۔

اس آیت میں نذیریت اور تبشیریت دونوں کے جلوے ہیں، اگر غور کیجیے کہ نذیریت کا غلبہ تبشیریت سے کتنا زیادہ ہے، اہل ایمان کے لیے صرف مغفرت کی دعاء کے ساتھ ساتھ پورے روئے زمین کے کافروں اور ان کی پوری نسل کی ہلاکت کی دعا کی ہے، اور پھر انہی کی کامل تباہی و بربادی کی خواہش پر دعاء کا خاتمہ ہے، اور آخر ساری قوم تباہ و برباد ہوگئی،

حضرت موسیٰؑ اہل فرعون کے حق میں یہ دعاء مانگ کر اپنی نذیریت کی شان کا کمال ظاہر فرماتے ہیں،

ربنا انك اتیت فرعون وملاہ	ہمارے پروردگار! تونے فرعون اور اس کے
زینۃ واموالا فی الحیٰوۃ الدنیا	درباریوں کو شان وشوکت اور دولت دنیا
ربنا لیضلوا عن سبیلك ربنا	میں دی ہے، اے ہمارے پروردگار! تاکہ تیرے
اطمس علیٰ اموالھم واشدد علی	راستے سے بہکادیں، اے ہمارے پروردگار!
قلوبھم فلا یومنوا حتی یروا العذاب	ان کی دولت کو مٹادے، اور ان کے دلوں کو
الالیم۔	سخت کردے، تو وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ
(یونس ۱۰)	دردناک عذاب دیکھ لیں،۔

اس کے بالمقابل حضرت عیسٰی علیہ السلام کی صفتِ تبشیر کا کمال ملاحظہ ہو، کہ اللہ تعالیٰ ان سے ان لوگوں کی نسبت جب دریافت کرے گا جو ان کے بعد شرک میں مبتلا ہوئے تو موقع پاکر عرض کرتے ہیں؛ اور اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت سے اپیل کرتے ہیں،

ما قلت لهم الا ما امرتني به ان	میں نے ان سے وہی کہا جو تو نے حکم دیا،
اعبدوا الله ربي وربكم وكنت	کہ میرے اور اپنے رب کو پوجو، اور جب تک
عليهم شهيدا ما دمت فيهم	میں اُن کے درمیان تھا، ان کو دیکھتا
فلما توفيتني كنت انت الرقيب	بھالتا تھا، اور جب تو نے مجھے وفات دی
عليهم وانت على كل شئ شهيد	تو ہی ان کا نگہبان تھا، اور تو ہر چیز کی خبر
ان تعذبهم فانهم عبادك	رکھتا ہے، اگر تو ان کو عذاب دے، تو یہ
وان تغفر لهم فانك انت	تیرے بندے ہیں، اگر تو ان کو معاف کردے
العزيز الحكيم۔ (مائدہ۔ ۱۶)	تو تو قدرت اور حکمت والا ہے،

اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی کی یہ تحریک ان کے حق میں ہے، جن کی نسبت حضرت عیسیٰؑ خود ہی نذیری فرما چکے ہیں،

انه من يشرك بالله فقد حرم	بے شک جو کسی کو خدا کا شریک بنائے گا
الله عليه الجنة ومأواه النار۔	تو اللہ تعالیٰ نے جنت اس پر حرام کردی ہے
(مائدہ ۱۰۔)	اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے،

مگر بایں ہمہ ان کی بخشش کے لیے بھی رحمت الٰہی کی سلسلہ جنبانی فرماتے ہیں، ظہور محمدی کی بشارت کا پیغام لے کر بھی وہ آئے اور کہا،

مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد، — اس رسول کی بشارت لے کر آیا ہوں، جو میرے بعد آئے گا، اور جس کا نام احمد ہے،

حضرت ابراہیمؑ کی بشیریت | اس سے زیادہ جمال بشارت حضرت ابراہیمؑ کے روئے اقدس میں ہے، وہ مجسم خیر و برکت بن کر آئے؛ نبیوں اور رسولوں کے مورث قرار پائے، اسماعیلؑ و اسحاقؑ کے خاندانوں کی برکتیں انہی کے ذریعہ اتریں اور آدم کے سارے گھرانوں کو ان کے ذریعہ ہدایت کی روشنی ملی؛ نبی المرسلین رحمۃ للعٰلمین علیہ السلام کے ظہور کی دعا انھوں نے کی،

دعائے خلیل و نوید مسیحا

اور دونوں مبشر!

نمرود کی آگ حضرت ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور ندا آتی ہے، کہ سلامتی ہو ابراہیمؑ کی، سلاماً علیٰ ابراہیم، بت پرست باپ کو سمجھاتے ہیں نہیں مانتا اور کفر پر اڑا رہتا ہے، تو اس کو خدا کا ڈر ہلکے لفظوں میں سناتے ہیں،

یاابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمٰن فتکون للشیطٰن ولیا۔ — اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمت والے خدا کی طرف سے کوئی عذاب نہ چھوئے،

(مریم - ۳) تو تو شیطان کا ساتھی بنے)

باپ نے یہ سن کر بیٹے کو سزا کی دھمکی دی، اور گھر سے نکل جانے کا حکم دیا، بیٹا اب بھی باپ کی خیر خواہی میں مصروف ہے، سلام کرتا ہے، اور اپنے خدا سے اس کے گناہوں کی معافی کے لیے دعاء کا وعدہ کرتا ہے،

قال سلام علیک ساستغفر لك	ابراہیم نے کہا تم پر سلامتی ہو، میں تمہارے لیے
ربی انه کان بی حفیا واعتزلکم وما	اپنے رب سے دعاء مانگوں گا، کہ تمہارے گناہ
تدعون من دون الله وادعوا	معاف فرمائے، وہ مجھ پر مہربان ہے، اور میں
ربی عسیٰ ان لا اکون بدعاء ربی	تم سے اور تمہارے معبودوں سے الگ ہوتا ہوں
شقیا۔	اور اپنے رب سے دعاء کرتا ہوں اور امید ہے کہ
(مریم - ۳)	میں اس دعاء میں بے نصیب نہ رہوں گا،

حضرت ابراہیمؑ نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی،

ربنا اغفر لی ولوالدی وللمؤمنین	اے ہمارے پروردگار! مجھے اور میرے ماں
یوم یقوم الحساب	باپ اور ایمان والوں کو اس دن بخش دے،
(ابراہیم - ۶)	جب حساب کتاب قائم ہو،

یہ بشارت کی پے در پے التجا کافر باپ کے حق میں ہے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو مشرکوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت آئی، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس فعل کی توجیہ فرمائی،

وماكان استغفار ابراهيم لابيه	اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کی مغفرت کی دعا
الا عن موعدة وعدها اياه	مانگنا نہ تھا، مگر وعدہ کے سبب سے جو اس نے
فلما تبين له انه عدو الله تبرأ	اس سے کیا تھا، پھر جب ابراہیمؑ پر ثابت ہوگیا
منه ان ابراهيم لاواه حليم۔	کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، تو وہ اس سے الگ
(توبہ۔ ۱۴)	ہوگیا، بیشک ابراہیم بڑا نرم دل اور بردبار تھا،

اس آیتِ پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا اس توقع میں تھی، کہ ان کا باپ مسلمان ہوکر رحمتِ الٰہی کا مستحق ٹھہرے، لیکن ان کی یہ توقع درست نہیں نکلی، دوسری بات یہ کہ حضرت ابراہیمؑ چونکہ کمال بشیریت سے ممتاز تھے۔ اس لیے خدا نے ان کی نرم دلی اور بردباری کی تعریف فرمائی،

اس طرح حضرت لوطؑ کی قوم کی تباہی کی خبر جب مہمان فرشتوں نے ان کو سنائی تو ان کو بڑا صدمہ ہوا، اور بارگاہِ الٰہی میں اس کی طرف سے عرض معروض کرنے لگے، تو خدا نے پھر ان کی نرم دلی اور بردباری اور حق ظاہر ہونے کے بعد ان کے رجوعِ حق کی مدح فرمائی،

فلما ذهب عن ابراهيم الروع و	توجب ابراہیمؑ سے خوف جاتا رہا، اس کو،
جاءته البشرى يجادلنا فى قوم	(اولاد کی) بشارت مل چکی، ہم سے لوط کی قوم
لوط ان ابراهيم لحليم اواه منيب	کے بارے میں جھگڑنے لگا، بے شک ابراہیم
يا ابراهيم اعرض عن هذا الخ	بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والا تھا،

قد جاء امر ربک وانهم آتیهم عذاب غیر مردود۔ (ھود۔ ۷)

(خدا نے فرمایا) اے ابراہیم! اس خیال کو چھوڑ دے، تیرے رب کا حکم آچکا اور لوط کی قوم کو وہ عذاب آنے ہی والا ہے، جو واپس نہ ہوگا

حضرت ابراہیمؑ قوم لوط کی طرف سے کیونکر جناب باری سے جھگڑنے لگے، ایک دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ حضرت لوطؑ کو پیش کر کے رحمتِ الٰہی کے خواستگار ہوئے۔

ولما جاءت رسلنا ابراھیم بالبشریٰ قالوا انا مھلکوا اھل ھذہ القریۃ ان اھلھا کانوا ظٰلمین قال ان فیھا لوطاً قالوا نحن اعلم بمن فیھا لننجینہ واھلہ الا امرأتہ کانت من الغابرین۔ (عنکبوت۔ ۴)

جب ہمارے فرستادے ابراہیمؑ کے پاس (اولاد کی) بشارت لے کر آئے، انھوں نے بیان کیا کہ ہم اس آبادی کے رہنے والوں کو ہلاک کرنے آئے ہیں، بے شک وہ ظالم ہیں، ابراہیمؑ نے کہا اس گانوں میں لوط ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم کو خوب معلوم ہے (جو اس میں ہیں) ہم ان کو اور ان کے گھر والوں کو بچا لیں گے، لیکن ان کی بیوی وہ تو رہ جانے والوں میں سے ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اسی عرض معروض کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت بارگاہِ الٰہی سے ان کو یہ خوش خبری سنائی گئی اور ہمیشہ کے لیے یہ قانونِ الٰہی قرار

پایا، کہ ایک کی بُرائی کا بوجھ دوسرے پر لادا نہ جائے۔

ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ وابراہیم الذی وفّی الا تزر وازرۃ وزر اخری وان لیس للانسان الا ماسعیٰ، (نجم۔۳)	کیا انہیں بتایا نہیں گیا، جو موسیٰ کے اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں ہے، جس نے پورا حق ادا کیا، کہ کوئی شخص دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور یہ کہ انسان کے لیے نہیں ہے بلکہ وہی جو کہ اس نے کوشش کی،

سورۂ انعام کے آخر میں حضرت ابراہیمؑ کے تعلق سے یہ آیت پھر آتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوتا ہے، کہ کہدے کہ ہم تو ابراہیمؑ کے دین کے پیرو ہیں، جس کا مسلک یہ تھا،

قل اننی ھدانی ربی الی صراط مستقیم دینا قیما ملۃ ابراہیم حنیفا وماکان من المشرکین قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین۔ قل اغیر اللہ ابغی ربا وھو رب کل شئی ولا تکسب کل نفس الا	کہدے کہ مجھے میرے رب نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، سیدھا دین ابراہیم کا دین جو موحد تھا، اور مشرکوں میں سے نہ تھا، کہدے کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا عالم کے پروردگار اللہ کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے، اور میں مسلمانوں کا پہلا ہوں، کہدے کہ کیا خدا کے سوا کسی اور کو پروردگار چاہوں، حالانکہ

علیھا ولا تزر وازرۃ وزر اُخری ۔ وہی تو ہر شے کا رب ہے، اور ہر جان کی کمائی اسی پر ہے، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا،
(انعام - ۲۰)

یہ سب وہی باتیں ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے میں تھیں، اور ان کا اعادہ پھر صحیفۂ محمدیؐ میں کیا جارہا ہے،

میرا خیال ہے کہ تورات کا صحیفۂ پیدائش ہی حضرت ابراہیمؑ کے اس عرض معروض کی پوری تفصیل ہے، جو انھوں نے حضرت لوطؑ کی قوم کے بارہ میں بارگاہِ الٰہی میں پیش کی۔ ابراہام ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا، تب ابراہام نزدیک جا کے بولا، کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا، شاید پچاس صادق اس شہر میں ہوں، کیا تو اسے ہلاک کرے گا، اور ان پچاس صادقوں کی خاطر جو اس کے درمیان ہیں، اس مقام کو نہ چھوڑے گا، ایسا کرنا تجھے بعید ہے، کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا، اور خداوند نے کہا کہ اگر میں سدوم (قوم لوط کا شہر) میں شہر کے درمیان پچاس صادق پاؤں تو میں... ان کے واسطہ تمام مکان کو چھوڑوں گا تب ابراہام نے جواب دیا، اور کہا اب دیکھ میں نے خداوند سے بولنے میں جرأت کی، اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں، شاید پچاس صادق سے پانچ کم ہوں، کیا ان پانچ کے واسطے تو تمام شہر کو نیست کرے گا، اس نے کہا اگر میں وہاں پینتالیس پاؤں تو نیست نہ کروں گا، پھر اس نے اس سے کہا، کہ شاید وہاں چالیس پائے جائیں، تب اس نے

کہا کہ میں ان چالیس[۱] کے واسطے نہ کروں گا، پھر اس نے کہا، میں منت کرتا ہوں کہ اگر خداوند خفا نہ ہوں تو میں پھر کہوں شاید وہاں تیس[۳] پائے جائیں، وہ بولا اگر میں وہاں تیس[۳] پاؤں تو میں یہ نہ کروں گا، دیکھ میں نے خداوند سے بات کرنے میں جرأت کی، شاید وہاں بیس[۲] پائے جائیں، وہ بولا میں بیس[۲] کے واسطے بھی اسے نیست نہ کروں گا، تب اس نے کہا میں منت کرتا ہوں کہ خداوند خفا نہ ہوں، تب میں فقط اب کی بار پھر کہوں شاید وہاں دس[۱] پائے جائیں، وہ بولا میں دس[۱] کے واسطے بھی اسے نیست نہ کروں گا، جب خداوند ابراہام سے باتیں کر چکا، تو چلا گیا اور ابراہام اپنے مقام کو پھرا"۔

(باب ۸۔ ۲۳ سے ۳۲ تک)

تورات کے اس بیان سے اس جدال کی پوری تفصیل معلوم ہوتی ہے، جو وہ بار بار سدوم کے گنہگاروں کو بچانے کے لیے بارگاہ الٰہی میں پیش کرتے تھے۔ اور اس نرم دلی، بردباری اور رجوعِ حق کی تصدیق ہوتی ہے، جس سے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کو متصف کیا ہے، اور ان آیاتِ الٰہی کی تصدیق ہوتی ہے، جن کو قرآن نے صحیفۂ ابراہیمی کے حوالہ سے پیش کیا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کی اس شانِ بشریت کا اظہار ہوتا ہے، جو جمال الٰہی کا پرتو تھی،

حضرت ابراہیمؑ جب کعبہ کی تعمیر سے فراغت پاتے ہیں، اور اپنی اولاد کو اس کی پاسبانی کے لیے بارگاہ الٰہی میں پیش کرتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں، کہ اس

بے آب ودانہ سنجر زمین میں خداوندا اس کو تیرے گھر کی پاسبانی اور تیرے دین کی حفاظت کی خاطر بساتا ہوں، خداوندا! ان کو روزی دینا، ان میں اپنا رسول بھیجنا، ان کو بتوں کی پوجا سے بچانا،

واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا	اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے پروردگار!
بلداً آمنا واجنبنی وبنی ان	اس شہر کو امن والا بنا، اور مجھے اور میری
نعبد الاصنام رب انھن اضللن	اولاد کو تو اس سے بچا، کہ وہ بتوں کو پوجیں
کثیرا من الناس فمن تبعنی فانہ منی	خداوندا! ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ
ومن عصانی فانک غفور رحیم۔	کیا، تو جو میری پیروی کرے وہی مجھ سے ہے
	اور جس نے میری نافرمانی کی تو بیشک تو بخشنے
(ابراہیم - ۶)	والا رحمت والا ہے،

یہ خدا کی بخشش رحمت کی تحریک کن کے لیے ہو رہی ہے، ان کے لیے جو بت پرست ہو کر ان کی نافرمانی کریں۔

یہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی بشیری شان،

صحابہؓ میں ان کے جلوے اوپر کی سطروں میں انبیا علیہم السلام کی نذیریت اور بشیریت کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ میری نہیں بلکہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان حق ترجمان سے ادا ہوئی ہے، غزوۂ بدر میں جب کفار قریش گرفتار ہو کر آئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا، حضرت عبداللہ بن رضؓ

رواحہ نے کہا کہ ان کو آگ میں جلادیا جائے، اور حضرت عمرؓ نے کہا ان کو قتل کر دیا جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کے خاندان اور قوم کے ہیں، ان پر رحم فرمائیے، آپ نے ان دونوں فریق کے مشورہ کو سن کر فرمایا کہ ایک فریق اپنے پہلے بھائیوں نوحؑ اور موسیٰؑ کی طرح ہے، نوحؑ نے کہا "پروردگار! زمین پر کافروں میں سے کسی گھر بسانے والے کو مت چھوڑ"، اور موسیٰؑ نے کہا، ہمارے پروردگار ان کی دولت میٹ دے، اور ان کے دلوں کو سخت کر دے" اور دوسرا فریق ابراہیم کی طرح ہے، ابراہیمؑ نے کہا "جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا اور رحم والا ہے" اور عیسیٰؑ کی طرح ہے کہ عیسیٰؑ نے کہا کہ اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو معاف کر دے، تو تو قدرت والا اور حکمت والا ہے (مستدرک حاکم ۳ ص ۲۱ و ۲۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت عمرؓ کو، حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی نذیری شان اور حضرت ابوبکرؓ کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی بشیری شان کی مثال ظاہر فرمایا، اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ بشیریت اور نذیریت کے کمال سے کیا منشا ہے۔

عام طور سے ہر نبی نذیر اور بشیر ہے | اس بیان سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اس مضمون کا منشا نعوذ باللہ یہ ہے کہ کوئی نبی صرف مبشر یا کوئی نذیر صرف اس معنی میں ہوتا ہے، کہ ایک صرف بشارت سناتا ہے، اور دوسرا صرف انذار کرتا ہے، بلکہ یہ منشا ہے کہ کسی نبی

میں عام وصف انذار کے ساتھ مبشریت کا کمال ہوتا ہے، اور کسی میں مبشریت کے عام وصف کے ساتھ نذیریت کا کمال ہوتا ہے، ورنہ خود اللہ تعالیٰ نے بلا استثنا تمام پیغمبروں کو بشیر و نذیر ایک ساتھ فرمایا ہے، لیکن اس بشیریت و نذیریت کے معنی واضح بھی فرما دیئے ہیں، جو عام وصف بشیر و نذیر کی حقیقت ہیں، فرمایا،

و ما نرسل المرسلین الا مبشرین و منذرین،	اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو لیکن بشارت سنانے والے اور ڈر سنانے والے بنا کر،

یہ بشارت کیا ہوتی ہے، اور یہ ڈر سنانا (انذار) کیسے ہوتا ہے، آیتِ بالا کے ساتھ ہی اس بشارت اور انذار کی یہ تشریح ہے،

فمن آمن و اصلح فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون والذین کذبوا بایٰتنا یمسهم العذاب بما کانوا یفسقون۔	تو جو ایمان لایا اور اچھے کام کیے، تو ان کو نہ ڈر ہوگا اور نہ غم اور جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کو ان کی نافرمانی کے سبب سے عذاب چھوئے گا،

لیکن بشیریت یا نذیریت کے اوصافِ غالبہ جن پیغمبروں کو ملتے ہیں، ان کی بشیریت اور نذیریت کی شان اس سے بہت بلند ہوتی ہے، جس کی مثالیں ایک طرف حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ میں، دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ میں نظر آتی ہیں، اور دونوں کا مجموعہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں صلوٰت اللہ علیہم اجمعین!

یہ جمال اور جلال کے پرتو ہیں | کسی نبی میں شانِ نذیری کا غلبہ اور کسی نبی میں شانِ بشیری کا کمال باہم ایک دوسرے پر ترجیح کا سبب نہیں، انبیاء علیہم السلام کے یہ دونوں اوصاف اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان جلال وجمال کے مظہر ہیں، کسی میں جلالی شان کی چمک زیادہ ہوتی ہے، اور کسی میں جمالی شان کی، جب اور جس زمانہ میں حکمتِ الٰہی کا اقتضا جلال یا جمال میں سے جس شان کمال کا اظہار ہوتا ہے، وہ اس وقت کے پیغمبروں میں ظاہر فرماتا ہے، دونوں اس کی شانیں ہیں، اور دونوں اس کے اسمائے حسنیٰ:

الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون۔

(معارف اپریل ومئی ۱۹۳۷ء)

ذبح عظیم

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے جس اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا خدا کی طرف سے خواب میں حکم ہوا تھا، یہود کہتے ہیں، کہ وہ حضرت اسحاقؑ تھے، لیکن مسلمانوں کے نزدیک حضرت اسماعیلؑ تھے، اور اسی لیے ذبیح اللہ مسلمانوں میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا لقب مشہور ہے، اس کے لغوی معنی ہیں خدا کا ذبح کیا ہوا، یا خدا کی راہ میں ذبح کیا ہوا۔ اس لقب کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت ہے،

یا بنی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری (صافات - ۳)	(حضرت ابراہیمؑ نے کہا) میرے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کررہا ہوں، تیری رائے کیا ہے؟

حضرت اسماعیلؑ نے جواب میں کہا،

یا ابت افعل ما تومر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین۔ (ایضاً)	اے میرے باپ! جو تجھے کہا جاتا ہے وہ کر گذر، خدا نے چاہا تو مجھے تو ثابت قدم رہنے والوں میں پائے گا،

مقدس باپ نے اپنے بیٹے کے اس صبر و ثبات کو دیکھا، تو ان کو لے کر قربان گاہ

کو روانہ ہو گئے، جو اُن کی جائے قیام سے کئی دن کی مسافت پر تھی، وہاں پہنچ کر بیٹے کو لیکر اور آگے بڑھے اور بیٹے کو پیشانی کے بل گرا کر چھری ان کی گردن پر رکھدی، آواز آئی، اے ابراہیم!

قد صدقت الرویا انا کذالک | تو نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم اسی طرح
نجزی المحسنین۔ (صافات۔۳) | نیکو کاروں کو جزائے خیر دیتے ہیں،

طفیانِ نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل | سر زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

ابھی یہ منظر آنکھوں سے دور نہیں ہونے پایا تھا، کہ ندا آئی،

وفدیناہ بذبح عظیم | اور ہم نے اس کو (اسمٰعیل کو) ایک بڑی قربانی
(ایضاً) | دے کر چھڑایا۔

اس آیت میں یہ ذکر ہے، کہ خدا فرماتا ہے، کہ میں نے ایک دوسری بڑی قربانی کا فدیہ دیکر اسماعیل کو ان کی اس قربانی سے نجات بخشی، اب سوال یہ ہے، کہ وہ بڑی قربانی کیا تھی، جس کو حضرت اسماعیلؑ کی اس قربانی اور فدیہ اور بدلہ قرار دیا گیا، مفسرین کی عام روایتیں یہ ہیں، کہ جنت کا ایک مینڈھا لاکر حضرت ابراہیمؑ کے سامنے کر دیا گیا، کہ وہ حضرت اسماعیلؑ کی جگہ قربانی کیا جائے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا، اور اس مینڈھے کو حضرت اسماعیلؑ کی جگہ قربانی کیا، مگر یہ روایتیں اسرائیلیات سے زیادہ نہیں، اور ان سب کا ماخذ تورات ہے،

"تب ابراہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا

دیکھا، جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے ہیں، تب ابراہام نے
جاکر اس مینڈھے کو لیا، اور اس کو اپنے بیٹے کے بدلہ میں سوختنی
قربانی کے لیے چڑھایا۔" (پیدائش ۲۲-۱۳)

لیکن قرآن پاک میں اس مینڈھے کا ذکر نہیں، بلکہ اس کے بجائے "ایک بڑی قربانی"، کہا گیا ہے، اگر یہ بڑی قربانی مینڈھے یا بکرے ہی کی صورت میں ہوتی، تو قرآن اس کو "ایک بڑی قربانی" کیوں کہتا،

ہمارے مفسرین نے اس کے یہ جوابات دیے ہیں

۱۔ چونکہ یہ قربانی کا مینڈھا جنت سے لایا گیا تھا اس لیے اس کو بڑی قربانی کا لقب ملا،

۲۔ یہ وہی مینڈھا تھا جس کو ہابیل نے قربان کیا تھا، اور جس کو خدا نے قبول فرمایا تھا، تو چونکہ خدا اس کو قبول کر چکا تھا، اس لیے اس کو بڑی قربانی فرمایا

۳۔ ان روایات میں سب سے بہتر جواب حسن بصریؒ کا ہے، فرمایا کہ اس بڑی قربانی سے مقصود وہ خاص جانور نہیں، جو حضرت ابراہیمؑ کے سامنے قربانی کے لیے پیش ہوا، بلکہ وہ مطلق قربانی ہے، جو اس کے بدلہ میں پوری ملت کے لیے قیامت تک حضرت ابراہیمؑ کی یادگار سنت قرار پائی،

جسمانی یادگار کی حیثیت سے اس میں شک نہیں، کہ ابراہیمی ملت میں عید قربان یا عید اضحیٰ کا سالانہ جشن اور اس میں غریبوں اور مسکینوں کے کھلانے اور دوستوں

ضیافت اور خوشی کے اظہار کے لیے کسی جانور کی قربانی اس واقعہ کی یادگار رہے، اسلام میں دو ہی تہوار ہیں، عید اور بقرعید، بقرعید ملتِ ابراہیمی کا جشن ہے، یعنی اس واقعہ کی یادگار ہے، جس کی بنا پر ملت ابراہیمی کی تاسیس اور مکہ میں خانۂ الٰہی کی تعمیر ہوئی، اور وہ تعمیرِ ملتِ ابراہیم کا قبلہ قرار پائی، اور عید ملتِ محمدی کا جشن ہے، یعنی نزولِ قرآن کی یادگار جس سے پردۂ عالم میں ملت محمدی کا ظہور ہوا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا، شریعت میں خواب کی دو قسمیں ہیں، ایک کا نام رویائے تمثیلی اور اور دوسرے کا نام رویائے حقیقی ہے، رویائے حقیقی میں اصل حقیقت بے پردہ نظر آتی ہے، اور وہی مقصود ہوتی ہے، جیسے کسی نے خواب میں دیکھا، کہ فلاں شخص مرگیا ہے، اور وہ واقعی مرگیا تھا، یہ رویائے حقیقی ہے، رویائے تمثیلی یہ ہے کہ مقصود اس واقعہ سے ملتی جلتی کوئی متشابہ چیز ہو، جیسے حضرت یوسفؑ نے قحط کو سوکھی بالوں اور دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا، امام خطابی معالم السنن میں کہتے ہیں،

وبعض الرویا، مثل یضرب	بعض خواب تمثیلی ہوتے ہیں، جس کو اس مثالی
یتناول علی الوجه الذی یجب	صورت میں اس لیے بیان کیا جاتا ہے، کہ
ان یصرف الیه معنی التعبیر فی	اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے، جس طریقہ
مثله وبعض الرویاء لا یحتاج	پر ایسے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے، اور
الی ذالک بل یاتی کالمشاهدة،	بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے

(فتح الباری جلد ۱۲ ص ۴۰۲) بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں،

اس بنا پر ہم کو غور کرنا ہے، کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو اپنے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا، تو یہ خواب تمثیلی تھا، یا حقیقی تھا، اس گرہ کے کھلنے سے "وفدیناہ بذبح عظیم" کے معنی بھی کھل جائیں گے،

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو جو خواب میں دکھایا تھا وہ تمثیلی تھا، یعنی یہ کہ وہ اپنے بیٹے کو قربانی کر رہے ہیں، اس کے معنی یہ تھے کہ وہ اس کو ہمیشہ کے لیے خدا کی راہ میں خانۂ کعبہ کی خدمت گذاری اور دین حنیف کی تبلیغ کے لیے خدا کی راہ میں قربان کر دیں، حضرت ابراہیمؑ نے فداکاری کے سچے جوش میں اس خواب کو حقیقی سمجھا اور چلے اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کی راہ میں واقعی جسمانی طور سے قربانی کرنے، مکہ کے پاس پہنچ کر بیٹے کو قربان گاہ پر چڑھا کر چاہا ہی تھا، کہ اس کے گلے پر چھری پھیر دیں کہ بارگاہ قدس سے ندا آئی قد صدقت الرویاء (اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا)، اور اب خداوند حق نے حضرت ابراہیمؑ کو وحی سے مطلع فرمایا کہ یہ خواب حقیقی نہیں بلکہ تمثیلی تھا، اور حضرت اسماعیلؑ کی جسمانی قربانی نہیں، بلکہ روحانی قربانی مقصود ہے، اور یہ جانور کی جسمانی قربانی اس روحانی قربانی کی تمثیل ہے، اب غور کیجیے تو معلوم ہوگا، کہ وہ "ذبح عظیم" جس کو دیکر حضرت اسماعیلؑ جسمانی قربانی سے بچ جاتے ہیں، وہ اُن کی روحانی قربانی ہے،

روحانی قربانی جسمانی قربانی کے مقابلہ میں یقیناً ذبح عظیم ہے، جسمانی قربانی کی تکلیف تو ایک لمحہ کی بات ہے، مگر روحانی قربانی تو کسی امر حق کی خاطر ساری زندگی کی جیتے جی کی قربانی ہے، جس میں مرکر نہیں، بلکہ جی کر حق کی راہ میں ہر تکلیف اور مصیبت کو انگیز کرنا اور ہر وقت موت کے لیے آمادہ رہنا ہے،

حضرت اسماعیلؑ نے اس کی خاطر ملک شام کے سبزہ زار کو چھوڑا، وہاں کے عیش و آرام کو خیرباد کہا، عزیز و اقارب کو ترک کیا، اور ایک لق و دق صحرا میں تن تنہا رہنا گوارا کیا، وہاں خدا کے نام کا ایک گھر بنایا، اور اس کو آنے جانے والے مسافروں اور سوداگری کے قافلوں کے لیے مرکزی گذرگاہ ٹھہرایا، اور اس طرح دین حق کی تبلیغ، اور خانۂ خدا کی پاسبانی کے لیے نہ صرف اپنی زندگی تک بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور تک جو ربنا وابعث فیھم کی ابراہیمی دعا کی قبولیت کا زمانہ تھا، اپنی پوری نسل کو ایسے صحرائے بے آب و دانہ میں گذار دینے کا حکم دیا، یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی جو حضرت اسماعیلؑ کی جسمانی قربانی کی تمثیل میں حضرت ابراہیمؑ کو دکھائی گئی، اور آج کے دن تک یہ روحانی قربانی ملت ابراہیمی کی حقیقت اور نسل اسماعیلی کی شریعت ہے، اور جانور کی جسمانی قربانی اس حقیقت کا مجاز ہے، اور اسلام میں جہاد اس مجاز کی حقیقت ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا، کہ وہ ذبح عظیم کا ذریعہ جس کے بدلہ میں حضرت اسماعیلؑ کی جسمانی قربانی معاف کی گئی، ان کی وہ روحانی قربانی ہے، جو نسلاً بعد نسلٍ

ان پر فرض ہوئی، اور اس کی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوئی، اور اسی لیے یہ ہر سال بجشنِ قربانی ہیں حضرت اسماعیلؑ کے جسمانی اور روحانی فرزندوں پر واجب ہے،

جہاد اور شہادت جن کی فضیلتوں میں اسلام کا سارا دفتر لبریز ہے، وہ اسی "ذبحِ عظیم" کی تفسیریں ہیں، جو مسلمان اس ذبحِ عظیم کا منظر پیش کرتا ہے، بارگاہِ قدس سے وہ بقائے دوام حیاتِ جاوید اور "بل ھم احیاء" کے سرخ خلعت سے سرفراز ہوتا ہے، جنت کے دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں، اور خداوند تعالیٰ اپنے پاس کی روزی سے اس کو سیر فرماتا ہے،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(معارف مارچ ۱۹۳۷ء)

قربانی کا اقتصادی پہلو

عید اضحٰی جس کے معنی جشنِ قربانی کے ہیں، حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے تاریخی واقعہ کی یادگار ہے، اس وقت کے جو سامی بادشاہ عراق، شام اور مصر پر حکمران تھے، وہ اپنے نمرودی و فرعونی کبر و نخوت میں مبتلا تھے، ہر جگہ آسمان کے ستاروں اور زمین کے بادشاہوں کی پوجا ہو رہی تھی، ضرورت تھی کہ ان نمرودوں اور فرعونوں کی جابر و ظالم سلطنتوں کے حدود سے آزاد کسی سرزمین میں اس پیامِ حق کے لیے جو حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ دنیا میں آیا تھا، کوئی مرکز قائم کیا جائے، جو ہر قسم کی دنیاوی سرسبزی و شادابی سے پاک ہو کر سلاطین کی حرص و آز کے ہاتھوں سے وہ ہمیشہ محفوظ رہے۔

انتخاب کی نظر عرب کی اس شور اور بنجر زمین پر پڑی جس کا نام حجاز ہے، جو بحر احمر کے کنارے شام اور یمن کے دو زرخیز علاقوں کے بیچ میں آمد و رفت کا راستہ اور تجارت کے قافلوں کا گذرگاہ تھا، تاہم چونکہ وہ ہر قسم کی روئیدگی اور سیرابی سے مبرا تھا، اس لیے اس میں کوئی مستقل آبادی نہ تھی، لیکن سوداگروں کی آمد و رفت سے وہ تبلیغ کا اہم مرکز ہو سکتا تھا، اس لیے زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی قسمت

ہیں ازل سے جو عزت مقدر ہو چکی تھی، حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں اس کے ظہور کا وقت آیا،

حجاز دعوتِ حق کا مرکز قرار پایا، اور خانۂ کعبہ کی تعمیر اور تطہیر کا حکم آیا، اور اس کی پاسبانی کے لیے حضرت ابراہیمؑ کو اپنی سب سے پیاری اور اکلوتی اولاد حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا منظر خواب میں دکھایا گیا، اس جسمانی قربانی کے خواب کی تعبیر روحانی قربانی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے مردہ پہنچکر اپنے خواب کی جسمانی تکمیل کرنی چاہی تو ندا آئی اے ابراہیم! تم اپنے خواب کو پورا کر چکے! اور اب اس خواب کی تعبیر وہ "ذبح عظیم" یعنی عظیم الشان قربانی ہے، جو اپنی جان کو راہِ حق میں دیکر اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں لٹا کر ادا کر سکتے ہو، اس رمز کی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی ہے، جو ہر حاجی پر ہر سال فرض ہے، ہر مسلمان پر جس میں استطاعت ہو واجب ہے،

اس خواب کی حقیقی تعبیر کی تکمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو شام کے مرغزار سے لاکر حجاز کے بے آب ودانہ اور شور زمین میں خانۂ خدا کے پاس آباد کیا، تاکہ حق کا پیغام اور توحید کی دعوت سلاطینِ زمانہ کی جابرانہ تعدی سے محفوظ رہ کر آخری پیغامِ الٰہی کے ظہور کے لیے تیار رہے،

اس بے آب وگیاہ، بنجر اور شور زمین میں کسی انسانی آبادی کی بقا، کسی مادی اقتصادی انتظام کے بغیر ناممکن تھی، اور ہے، اور اس کے لیے قدرتِ الٰہی نے دو

انتظام کیے، حج اور قربانی، حج کو علاوہ اپنے روحانی فیوض وبرکات کے اقوام عالم کی تجارتی نمائش گاہ یا عالمگیر تجارتی میلہ ٹھہرایا، اشہرِ حرم کے مامون زمانہ میں عرب کے سارے گوشوں سے تاجر اور سوداگر آتے اور مکہ کے میدان میں قیام کرکے سال بھر کی روزی پیدا کرتے۔

اسی نکتہ کو سامنے رکھ کر حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کے معنی سمجھیے،

واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا بلدا آمنا وارزق اھلہ من الثمرات۔ (بقرہ۔ ۱۵)	اور جب ابراہیمؑ نے کہا اے میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بنا اور یہاں کے رہنے والوں کو کچھ پھلوں میں سے روزی کر،
ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون۔ (ابراہیم۔ ۶)	اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد بن کھیتی کے میدان میں تیرے عزت والے گھر کے پاس اس لیے بسائی ہے، کہ نماز کو قائم کریں، تو انسانوں کے کچھ دلوں کو ان کی طرف مائل کر، اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے تاکہ وہ شکر گذار ہوں،

حج کی تجارتی گرم بازاری اور حاجیوں کی آمد و رفت سب اسی لیے ہے، تاکہ اس کے ذریعہ اس ویرانہ کی روحانی وجسمانی و مالی آبادی ہو، اسلام آیا تو لوگوں نے سمجھا کہ روحانی مقصد سے حج کے مالی منافع دور کر دیئے گئے مگر خدا نے تصریح

کی، کہ ایسا نہیں ہے، فرمایا۔

لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم۔ تمہارے لیے یہ گناہ نہیں کہ (حج میں) خدا کی روزی کو تلاش کرو،

اسی لیے خدا کی روزی تلاش کرنے والے حاجیوں کے لیے راستوں کے امن کا حکم دیا گیا، فرمایا۔

یا ایہا الذین آمنوا لا تحلوا شعائر اللہ ولا الشھر الحرام ولا الھدی ولا القلائد ولا آمین البیت الحرام یبتغون فضلاً من ربھم ورضواناً۔

اے ایمان والو! اللہ کے شعائر کی بے توقیری نہ کرو، اور نہ حرمت والے (حج) مہینے کی اور نہ حج کی قربانی کی اور نہ قربانی کے جانوروں کے پٹوں کی اور نہ ان کی جو عزت والے گھر (کعبہ) کے قصد سے نکلے ہوں، اپنے پروردگار کے فضل (تجارت) اور اس کی رضامندی کی تلاش میں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کے اغراض میں ایک اہم غرض اس کا تجارتی اور اقتصادی پہلو ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے، کہ حضرت ابراہیمؑ کو اس اعلان کا حکم ہوا تھا،

واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلی کل ضامر یاتین من

اور لوگوں میں حج کو پکار دے، وہ پیادہ اور ہر دبلی پتلی سواریوں پر ہر دور دراز راستے

کل فج عمیق لیشھدوا منافع لھم — سے تیرے پاس آئیں گے، تاکہ اپنے (دینی و
ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات — دنیاوی) منافع کے مقاموں پر حاضر ہوں،
علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام — اور چند مقررہ دنوں میں اللہ کا نام جانوروں
فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر — پر لیں، جو ہم نے ان کو روزی کیے، تو ان جانوروں
(حج - ۴) — کے گوشت میں سے کچھ کھاؤ اور بدحال فقیروں
کو کھلاؤ۔

ان آیتوں میں اس کی تصریح ہے، کہ حج کے مقاصد میں سے ایک خاص مقصد یہ ہے کہ لوگ تجارتی و مالی منافع کے مقاموں پر اکٹھے ہوں، اور باہم مبادلہ اور خرید و فروخت سے اقتصادی فائدے اٹھائیں، اسی لیے متعدد مفسروں نے آیت میں منافع سے مراد تجارت لی ہے، اور کسی نے مغفرت، مگر اکثروں نے ان دونوں کو شامل کیا ہے،

آیت میں اس بات کی بھی تصریح ہے، کہ قربانی سے مقصود یہ ہے کہ جانوروں کی جو نعمت انسانوں کو ملی ہے، اس کا شکریہ ادا کریں، اور اس مسرت اور جشن کے موقع پر خود اس کا گوشت کھائیں، اور فقیروں اور مسکینوں کو کھلائیں، کہ وہ بھی اس خوشی میں شریک ہو سکیں، قربانی کا یہ مقصد نہیں، کہ نفس جانور کی خون ریزی خدا کو محبوب ہے، یا اس کا گوشت اس کو پسند ہے، فرمایا:

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا — اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت

ولکن ینالہ التقویٰ منکم ۔ ۔ (اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج میں قربانی کی غرض ایک تو یہ ہے کہ اس جشن میں دعوت کا سامان ہو، دوسری غرض یہ ہے کہ بدحال فقیروں کو کھلایا جائے، اس لیے قربانی کے اتنے حصے کے علاوہ جو ذاتی صرف میں آئے، بقیہ کل گوشت پوست سب فقیروں کو ہدیہ ہے،

دولت کا سرچشمہ تین چیزیں ہیں، زراعت، صنعت، اور مویشی کی پرورش، عربوں کے پاس نہ زراعت تھی اور نہ صنعت، اس لیے دوسری قوموں کے تجارتی سامانوں کی دلالی کے بعد جو چیز ان کی دولت کا سرمایہ ہے، وہ جانوروں کی پرورش ہے، اور یہی ان کی سب سے بڑی دولت ہے،

بے مایہ عربوں کو بیت حرام کی پاسبانی کی اُجرت اور ان کی اقتصادی امداد کا ذریعہ یا تو خیرات ہوسکتی تھی، جو حد درجہ ان کی دنائت اور پست حالی کو ہر حال میں بڑھاتی، جس طرح وہ آج کل خلافِ شریعت خیرات لے لے کر تمام دنیا کی نگاہوں میں عربوں کی عزت کو بٹہ لگا رہے ہیں، یا کوئی دوسری صورت ہوتی۔

اسلام نے دوسری صورت نکالی، اور وہ ان کی پرورش کے لیے تجارت حاجیوں کا کرایہ مکان، حاجیوں کی خدمت کی مزدوری، حاجیوں کی سواری کی اُجرت اور دوسرے ذریعے مقرر کیے ہیں، انہی میں سے ایک قربانی بھی ہے۔

پہلے زمانہ میں پانچ لاکھ حاجیوں کا تخمینہ ہوتا تھا، اور اب ایک لاکھ[1] ہے، ہر حاجی کم از کم ایک دنبہ یا بکرا قربانی کرتا ہے، بعض اونٹ کرتے ہیں، جس کی گو قیمت زیادہ ہوتی ہے، مگر اس میں شرکت بھی ہوتی ہے، بہر حال اوسطاً ایک لاکھ دنبہ رکھ لیجئے، ایک دنبہ کی قیمت اوسطاً چار روپیے ہوتی ہے، تو اس طرح اہل بادیہ عرب کو ہر سال حج میں کم از کم چار لاکھ روپیے تقسیم ہوتے ہیں۔

غیر حاجی مسلمان ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی جو قربانی کرتے ہیں، اس کا روپیہ بھی ہر ملک کے دیہاتی مسلمانوں کو پہنچتا ہے، ہندوستان میں گو اکثر قربانی کے جانور قصائیوں کے ذریعہ خریدے جاتے ہیں، مگر شاید مسلمانوں سے زیادہ ہندو مویشی کی پرورش کرتے ہیں، اور وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر یہ قصور کس کا ہے؟

جانور کا گوشت، پوست، ہڈی سب کی قیمت بازار میں ہے، اور ان سب کا نفع زکوٰۃ کی طرح مستحقین کے لیے مخصوص ہے، اگر عرب یا حجاز کی حکومت اس کا مناسب انتظام نہیں کرتی، اور اس کا نفع حاصل کر کے غریبوں کو نہیں دیتی، تو یہ قصور اسلام کا نہیں مسلمانوں کا ہے، اس کے لیے اسلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں،

---

[1] یہ مضمون ۱۹۳۷ء کا لکھا ہوا ہے جبکہ کسی وجہ سے حاجیوں کی تعداد پہلے سے کم ہوگئی تھی اب ۱۹۷۰ء میں حاجیوں کی تعداد بارہ تیرہ لاکھ تک پہنچ گئی ہے اسی کے ساتھ مویشی کی قیمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ مجموعی قربانیوں کی قیمت ایک کروڑ تک پہنچ جاتی ہوگی۔

مسلمانوں میں اصلاح کی ضرورت ہے

ممالک عرب کے باہر دوسرے اسلامی ملکوں کا حال ہم کو نہیں معلوم مگر ان کو ہندوستان پر قیاس کیا جا سکتا ہے، ہندوستان میں آٹھ کروڑ مسلمان ہیں،[1] ۸ لاکھ قربانیاں ہوتی ہوں گی، اور آٹھ لاکھ قربانیوں کی قیمت اگر آٹھ ہی لاکھ کم و بیش رکھی جائے،[2] تو یہ آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ عربی مدرسوں، مکتبوں، قومی اداروں، اور شہر و دیہات کے غریبوں میں بانٹے جاتے ہیں، اگر ہر سال ان آٹھ لاکھ روپیوں کے جمع و خرچ کا ٹھیک انتظام نہیں کیا جاتا ہے، تو یہ مسلمانوں کا قصور ہے، پھر بھی یہ معلوم ہے کہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے کئی مہینوں کے اخراجات اسی قربانی کی مد سے پورے ہوتے ہیں۔

اب جشن قربانی کے اظہار کے لیے کوئی ایسا طریقہ جس میں جشن کا اظہار ہو، باہم دوستوں کی سادہ دعوت اور ہدیہ کا انتظام ہو، اور پھر غریبوں اور مسکینوں اور قومی ضرورتوں کا فنڈ بھی اس سے قائم ہو، اور فدیناہ بذبح عظیم کا مصداق بھی ہو، قربانی کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

آج کل کی مہذب سلطنتوں میں ٹیکس کے دو طریقے ہیں، ایک براہ راست

---

[1] اب پاکستان کے قیام کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے چھ کروڑ تک ہے، لیکن

[2] مویشیوں کی قیمت اب اس تخمینہ سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

ٹیکس جیسے انکم ٹیکس، دوسرا بواسطہ ٹیکس، جس طرح ہم اس سلطنت میں ہر چیز پر ہر وقت ٹیکس ادا کر رہے ہیں، مگر یہ دیکھا گیا ہے، کہ براہ راست ٹیکس ہمیشہ گراں گذرتا ہے، اور بواسطہ ٹیکس کبھی معلوم بھی نہیں ہوتا، یہی سبب ہے، کہ جتنے لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اس سے زیادہ لوگ قربانی دیتے ہیں، اسلام نے ان دونوں ٹیکسوں سے کام لیا ہے، زکوٰۃ براہ راست انکم ٹیکس ہے، اور قربانی بواسطہ ٹیکس ہے، اور اس کی ادائی کا راز اسی قربانی کے پُر پیچ رمز میں ہے، اگر کوئی اس دینی راز کے نفسیاتی فلسفہ کو کھو کر اس کو نقد روپیہ سے بدلنا چاہے تو وہ دیکھے گا، کہ چند ہی سال میں یہ منتر بے اثر اور عید اضحیٰ کا فلسفہ باطل ہو جائے گا، اور وہ روز جشن نہیں بلکہ تحصیل وصول کا ناگوار دن بن جائے گا۔

الغرض قربانی بہت سے نفسیاتی، روحانی اور مادی، اقتصادی فوائد پر مبنی ہے، اور اس میں جو کمی نظر آتی ہے، وہ مسلمانوں کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان خود اپنی اصلاح کریں، اسلام کی اصلاح نہیں، کہ وہ ہر اصلاح سے ہمیشہ کے لیے پاک و بلند ہے۔

(معارف مارچ ۱۹۳۶ء)

سود
اور
صحفِ انبیاءؑ

سود جس کو انگریزی میں انٹرسٹ کہتے ہیں، عرب اس کو ربا کہتے ہیں، عربی میں ربا کے معنی زیادتی اور اضافہ کے ہیں، اسی مناسبت سے قرض کے اصل راس المال سے جو زیادہ وصول کیا جائے، اس کو ربا کہتے ہیں، جوازِ سود کی کوشش میں اسلام کے ایک نادان دوست کی مضحکہ خیز تحقیق یہ ہے کہ قرن اول میں چونکہ قرآن مجید پر اعراب نہ تھا، اس لیے مسلمانوں نے بجائے رُبا کے رِبا پڑھا ورنہ اصلی لفظ رُبا تھا، جو فارسی مصدر رُبودن سے مشتق ہے، جس کے معنی چھیننے اور جھپٹنے کے ہیں، اس بنا پر اصل قرآن مجید نے سود کو حرام نہیں کیا ہے، جیسا کہ عام مسلمان سمجھتے ہیں؛ بلکہ اس مال کو حرام کیا ہے، جو چھین جھپٹ کر حاصل کیا جائے،

ہم اس تحقیق کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں،

صیاد نہ تو نخچیر مکن   چیزے کہ نہ خواندۂ تو تفسیر مکن

ایک دوسرے مضمون نگار کا جوازِ سود پر بڑا استدلال یہ ہے،

"ہمارا سب سے بڑا استدلال یہ ہے کہ سود بہت پہلے زمانہ سے تمام قوموں میں رائج ہے، برابر قومیں یکے بعد دیگرے سود لیتی رہیں، اور اس

زمانے میں ان کے لیے بہت سے انبیاءؑ اور رسول مبعوث ہوئے، مگر
کسی نے سود کو ناجائز قرار نہیں دیا، یہی وجہ ہے، کہ مسلمانوں کے سوا
اور قومیں جیسے یہود و نصاری سود علانیہ لیتی ہیں ....“
اور چونکہ ان کے مذہب نے ہر قسم کے نفع اٹھانے کی اجازت دی
ہے، اس لیے وہ کوشش کرتے ہیں۔“ (اودھ اخبار، جولائی ۱۹۰۹ء)

اس بنا پر سوال یہ ہے کہ کیا درحقیقت گذشتہ قوموں میں جو انبیاء اور رسول مبعوث ہوئے، اُن میں سے کسی نے سود کو ناجائز قرار نہیں دیا۔؟ حالانکہ بلاشک یہودی اور اور عیسائی قوموں کی موجودہ سود خواری کو دیکھ کر، ایک کوتاہ نظر شخص یہی نتیجہ نکالے گا کہ گذشتہ انبیاءؑ نے سود کو ناجائز نہیں قرار دیا، لیکن جب اس مقدمہ پر نظر کی جائے کہ کسی قوم کے اعمال و افعال سے اُس کے مذہبی احکام کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، تو یقیناً ہم کو صحفِ انبیاءؑ کی طرف توجہ کرنی پڑے گی، گو مسلمان موجودہ صحفِ انبیاءؑ کو تحریف و مسخ سے بہت کم محفوظ مانتے ہیں، تاہم اگر یہ ثابت ہو جائے، کہ حرمتِ سود پر تمام کتبِ سماوی بالاجماع متفق ہیں، اور اکثر انبیاءؑ نے سود کو ناجائز قرار دیا ہے، تو یہ بالکل واضح ہو جائے، کہ قرآن مجید صحفِ ماسبق کی تصدیق کرتا ہے، جیسا کہ اس نے بار بار اس کا دعویٰ کیا ہے، سود کا رواج دنیا میں اور ہزاروں برائیوں کی طرح نہایت ابتدا سے ہے، اہلِ مصر، کلدانی اور فنیشین کے بعد سب سے قدیم متمدن یونانی قوم ہے، یونان میں سود کا رواج تھا، لیکن اس سے جو اخلاقی نقصانات

پیدا ہوتے ہیں، اُن سے بھی لوگ واقف تھے، یونان کا ارسطو گو نبی نہ تھا، لیکن قوم کا فلاسفر اور مصلح تھا، اُس نے ایک عام اصول قائم کر دیا،

روپیہ، روپیہ کو نہیں پیدا کرتا۔[1]

یونان کے بعد روم کا درجہ ہے، روم میں سود کا نہایت عام رواج تھا، اور ہم کو نہیں معلوم کہ روم میں کسی حکیم یا مصلح قوم نے اس ناجائز منافع کے مٹانے کی کوشش کی، یا نہ کی، لیکن ہم اس سے واقف ہیں، کہ اس ظالمانہ طریقِ معاش سے مہاجنوں کے سوا اور تمام لوگ نالاں تھے، گو مفتوحہ اقوام سے چھین چھین کر خاص رومیہ میں دولت کا بہت کچھ حصہ جمع ہو گیا تھا، لیکن دارالحکومت کے علاوہ تمام صوبہ مفلس تھا، رومیہ میں یہ ممکن تھا، کہ چار یا پانچ فی صدی روپیہ مل جائے، لیکن اور صوبوں میں بارہ فی صدی سے کم پر روپیہ نہیں مل سکتا تھا، اس لیے مہاجن رومیہ سے ادنیٰ شرح سود پر روپیے لیتے تھے اور صوبوں میں گرانقدر منافع پر لوگوں کو دیتے تھے، اگر قرض دار میعاد پر اصل مع سود ادا نہ کر دیتا، تو مہاجن نہایت بری طرح روپیہ وصول کرتے تھے[2]،

ایشیا کے بعض شہروں نے کسی جنگ کے موقع پر [illegible] میں ایک بڑی رقم [illegible]

---

[1] واکرس پولیٹیکل اکانمی بیان "یوژری لاز"۔ [2] ترجمہ عربی ہسٹری آف دی سویلزیشن مؤلفہ مسیو شاؤل سینابوس ص ۲۵۴، و ۲۵۵۔

قرض لی، چودہ سال کے بعد ۸۶ء میں سود اصل سے چھ گنا زیادہ ہوگیا، مہاجنوں نے اس سختی سے روپیہ کی وصولی شروع کی، کہ قرضداروں کو مجبوراً اپنی عزیز اولاد کو بیچ کر قرض ادا کرنا پڑا، اس واقعہ کے چند ہی سال بعد بروٹس نے جو ایک مشہور رواقی حکیم اسٹوئیشین تھا، اس نے قبرص میں شہر سلامینہ کے لیے ۴۸ روپیہ فی صدی سود پر ایک رقم قرض لی، کچھ مدت کے بعد جب اصل رقم مع سود کا تقاضا کیا گیا، تو شہر سلامینہ اتنی بڑی کثیر رقم ادا نہ کرسکا، آخر قرض خواہوں نے فوجی طاقت سے سلامینہ کے پارلیمنٹ ہاؤس کا محاصرہ کرلیا، اور یہ محاصرہ اتنا طویل ہوگیا، کہ پارلیمنٹ کے پانچ ممبر بھوک سے مرگئے،[1]

تورات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو قرضدار وقت پر اصل مع سود کے ادا نہیں کرسکتے تھے، قرض خواہ ان کی تمام جائداد و املاک پر قبضہ کرلیتے تھے، اور ان کو غلام بنالیتے تھے انگلینڈ میں بھی لوگ سودی کاروبار کرتے تھے، لیکن حکومت کی طرف سے اس کی اجازت نہ تھی، گورنمنٹ نے ۱۵۴۶ء میں یہ قاعدہ جاری کیا، کہ دس فی صدی تک سود لیا جاسکتا ہے، ایڈورڈ ششم کے عہد میں یہ حکم پھر منسوخ ہوگیا، بلکہ الزبتھ نے اپنے عہد میں سودی معاملہ کو جائز کردیا، اور رفتہ رفتہ پانچ فی صدی شرح سود قائم ہوگئی،[2]

---

[1] ترجمہ عربی ہسٹری آف دی سویلیزیشن مولفہ مسیو شاڈل سینابو کرص ۲۵۴، ۲۵۵ [2] دائرۃ المعارف لاروس

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ موجودہ ایشائی سلطنتیں، یورپ کے پنجوں میں صرف اس لیے گرفتار ہیں، کہ ان کو یورپین بنکوں کے سود سے کبھی نجات نہیں مل سکتی، اس لیے یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے، کہ یورپ کے بنک محض ایشیا کے سود پر جیتے ہیں، ہندوستان کے اکثر اہل وجاہت صرف اس لیے برباد ہو رہے کہ وہ قرضوں کا سود نہیں ادا کر سکتے،

ان تمام مذکورۂ بالا واقعات واسباب کی بنا پر ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ سود سے حسب ذیل خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، جن سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں،

(۱) پولیٹکل اکانمی کے رو سے بجائے اس کے کہ روپیہ ملک میں پھیل کر عام سرسبزی اور خوش حالی پیدا کرے، صرف چند اشخاص تک محدود ہو جاتا ہے،

(۲) اس سے قوم میں کاہلی اور سستی کا مادہ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ بجائے اس کے کہ وہ خود کسب معاش کے لیے کوشش اور محنت کرے صرف انکا روپیہ جو اس نے قرض دیا ہے ہر جگہ کام کر رہا ہے،

(۳) سود سے اخلاقی حالت کو نہایت سخت نقصان پہنچتا ہے، مہر ومحبت اور رحم وشفقت کی روح معدوم ہو جاتی ہے، انسان سنگ دل اور بے رحم ہو جاتا ہے

(۴) انسان بلا استحقاق روپیہ حاصل کرتا ہے، جو درحقیقت ظلم ہے، اسی لیے قرآن مجید میں جہاں خدائے پاک نے سود کی ممانعت کی یہ فرمایا ہے،

لا تظلمون ولا تظلمون، — نہ تم کسی دوسرے پر ظلم کرو، نہ تم پر کوئی دوسرا ظلم کرے،

اِن تمام وجوہ کی بنا پر یہ کیونکر ہو سکتا تھا، کہ جس چیز سے اخلاقی روح کو اس قدر صدمہ پہنچے، انبیاء (علیہم السلام) اپنے پیرووں کو اس سے باز رہنے کا حکم نہ فرمانے، چنانچہ ہم تورات، زبور، اور انجیل کے حوالوں سے یہ ثابت کر دیں گے، کہ تمام دیگر انبیا علیہم السلام نے بھی سود کی سخت ممانعت کی ہے،

تورات سب سے پہلے اولیں کتب آسمانی تورات میں حضرت موسیٰؑ کی معرفت یہ کہا گیا،

اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے، کچھ قرض دیوے تو اس پر بہت تقاضا مت کر، اور اس سے سود مت لے اور اگر تو اپنے ہمسایہ کے کپڑے گرو لیوے، تو چاہیے کہ تو سورج ڈوبتے ہوئے اسے پہنچا دے۔[۱]

اور احبار میں حسب ذیل حکم دیا گیا،

اور اگر تمہارا بھائی تمہارے بیچ میں محتاج اور تہی دست ہو جائے، تو اُس کی دست گیری کر، خواہ وہ اجنبی ہو، خواہ مہمان، تاکہ وہ تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے، تو اس سے سود اور نفع مت لے، اور اپنے خدا سے ڈر تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے، تو اسے سودی روپیہ قرض مت دے، نہ اسے نفع کے لیے کھانا کھلا، میں

---

[۱] خروج باب، درس - ۲۵ - ۲۶

خداوند تمہارا خدا ہوں، جو تم کو زمین مصر سے نکال لایا، تاکہ تمہیں کنعان کی زمین دوں، اور تمہارا خدا ہوں[1]۔

استثنا میں ان الفاظ میں یہ حکم دہرایا گیا،

اور تو اپنے بھائی کو سودی روپیے اور سودی طعام یا اور کوئی چیز سودی عاریت اور قرض مت دیجیو، تو مسافر کو سودی قرض دے سکتا ہے، پر اپنے بھائی کو سودی قرض مت دیجیو، تاکہ خداوند تیرا خدا اس سرزمین میں جس کا تو وارث ہونے جارہا ہے، جس کام میں تو دست انداز ہو تجھے برکت دیوے[2]۔

مذکورۂ بالا عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ شریعت موسوی میں خود بنی اسرائیل سے سود لینا یقینی ناجائز تھا، مگر غیر قوم (مسافر) سے بنی اسرائیل سود لے سکتے تھے، مگر احبار کے جو درس ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، (خواہ اجنبی ہو یا مہمان) ان سے ہر قسم کے سود لینے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، لیکن یہودیوں نے ان احکام پر بہت کم عمل کیا، وہ عام طریقہ سے سود لیتے تھے، اور نہایت سختی سے وصول کرتے تھے، اگر وقت پر قرضدار سود مع اصل نہ ادا کر دیتا، تو اس کی تمام جائیداد ضبط کر لیتے تھے، اور اس کے تمام خاندان کو نہایت ذلت سے غلام بنا لیتے تھے، چنانچہ ان واقعات

---

[1] احبار باب ۲۵ درس ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸۔ [2] استثنا باب ۲۳ درس ۱۹، ۲۰۔

کو دیکھ کر نحمیا نبی نے ان کو حسب ذیل عبارت میں سود لینے سے روکا:

اور کتنے کہتے تھے، کہ ہم نے اپنے کھیتوں اور انگورستانوں کو گرو رکھ کر روپیہ قرض لیا ہے، کہ بادشاہ کے لیے مالگذاری ادا کریں، اور ہمارے جسم تو ہمارے بھائیوں کے جسم ہیں، اور ہمارے بال بچے ان کے بال بچوں کے مانند ہیں، اور دیکھیے ضرور ہے کہ ہم اپنے بیٹے اور بیٹیاں غلامی میں بیچیں، اور ہماری بیٹیوں میں سے کتنی لونڈیاں ہوئیں، اور ہم لاچار اور زیر دست ہیں، کیونکہ ہمارے کھیت اور انگورستان اور لوگوں کے ہیں، جب میں نے ان کی فریاد اور یہ باتیں سنیں، تو میں بہت رنجیدہ ہوا، اور میں نے اپنے من میں بچارا اور رئیسوں اور شحنوں سے جھگڑا کیا، اور انہیں کہا تم سود خور ہو کے ہر ایک اپنے اپنے بھائی پر ظلم کرتے ہو، اور میں نے ایک بڑی جماعت کو ان کے برخلاف پیدا کیا، ..... میں بھی اور بھائی میرے اور جوان میرے ان کو نقدی اور اناج قرض دے چکے ہیں سو آؤ سود کے سب ہم یہ قرض بخشیں گے؛ ان کے کھیت اور ان کے باغ انگور کے اور زیتون اور ان کے مکان اور سواں حصہ نقدی کا اور اناج اور دیں، اور تیل کا، جو تم نے ان سے سود خوری کر کے لیا ہے، انہیں آج پھیر دیجیے۔[1]

---

[1] کتاب نحمیا باب ۵ عدد ۴ تا ۱۳

اس کے بعد یہودیوں میں پھر سود رائج ہوا، جس نے حزقیال نبی نے ذیل کے فقرات میں یہودیوں کو رد کیا،

بلکہ اگر کوئی آدمی ٹھیک ہوگا، اور وہ کرتا ہے، جو شریعت میں ہے، اور ٹھیک ہے، ..... اور اس نے سود پر نہیں دیا، اور نہ نفع لیا، اور اپنا ہاتھ ناانصافی سے اٹھایا، اور انسانوں کے درمیان عدل جاری کیا، اور میری شریعتوں پر چلا، ...... وہ یقیناً جیے گا، میرا خدا کہتا ہے[1] (ترجمہ انگریزی ایزیکیل)

اس ناجائز معاملہ کے متعلق پھر آگے چل کر مرقوم ہے،

اور وہ جوان فرائض میں سے کوئی انجام نہیں دیتا .... اور سود پر دیا، اور نفع لیا، کیا وہ زندہ رہیگا؟ نہیں زندہ رہے گا، اس نے تمام ناپاکیاں کی ہیں، وہ یقیناً مر جائے گا، اس کا خون اس کی گردن پر ہوگا۔ (ترجمہ انگریزی حزقیال، باب ۱۸ عدد ۱۱ تا ۱۳)

پھر اسی اصحاح میں چند فقروں کے بعد ہے،

جس نے فقیر سے اپنا ہاتھ اٹھالیا، اور جس نے نہ سود لیا، اور نہ نفع لیا، بلکہ میری شریعت جاری کی، اور میرے احکام پر چلا، وہ اپنے باپ کے گناہ سے نہ مرے گا، وہ یقینی زندہ رہے گا" (عدد ۱۷)

---

[1] حزقیال باب ۱۸ عدد ۷، ۸، ۹

ان منقولہ فقروں سے بالکل صاف ظاہر ہوجاتا ہے، کہ یہودیوں کے تمام انبیاء نے سود کو ناجائز قرار دیا، اور اپنے صحیفوں میں بطور حکم واجب کے اس کی ممانعت لکھدی،

زبور | سود کے متعلق زبور میں حضرت داؤدؑ کی معرفت کہا گیا۔

"اے خدا! تیرے خیمے میں کون رہے گا، تیرے کوہ مقدس پر کون سکونت کرے گا، وہ جو سیدھی چال چلتا ہے، اور صداقت کے کام کرتا ہے اور اپنے دل سے سچ بولتا ہے، وہ جو اپنی زبان سے چغلی نہیں کھاتا، اور اپنے ہمسایہ سے بدی نہیں کرتا، اور اپنے پڑوسی پر عیب نہیں لگاتا، وہ جس کی نظر میں نکما آدمی خوار ہے، پر وہ انہیں جو خداوند سے ڈرتے ہیں، عزت دیتا ہے، وہ جو اپنے ضرر پر قسم کھاتا ہے اور بدلتا نہیں، وہ جو سود کے لیے قرض نہیں دیتا، اور بے گناہوں کے ستانے کے لیے رشوت نہیں لیتا، وہ جو یہ کرتا ہے، کبھی نہیں ٹلے گا"[1]

انجیل | موجودہ انجیل میں چونکہ چند نصائح کے سوا احکام گویا بالکل نہیں ہیں، اس لیے سود کی حرمت کے متعلق اس میں کوئی فقرہ درج نہیں ہے، بلکہ حضرت عیسیٰؑ کی ایک تمثیل سے جس میں سود کا بیان آگیا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں بھی سود رائج ہوگیا تھا،

"...... اس کے خاوند نے جواب دے کے اس سے کہا اے شریر اور

---

[1] زبور سام ۱۵،

۔ سست نوکر تو نے جانا کہ میں کاٹتا ہوں، جو نہیں بویا، اور جمع کرتا ہوں، جو نہیں چھینٹا بس تجھے مناسب تھا، کہ میرا نقد صرافوں کو دیتا، کہ میں اسے سود سمیت پاتا۔ (متی باب ۲۵ درس ۲۶-۲۷)

لیکن پولوس (پال) کے خطوط سے جو عیسائیوں کے نزدیک تقریباً انجیل کا درجہ رکھتے ہیں، سود کی حرمت ثابت ہوتی ہے، پولوس نے تمطاؤس (ٹیموتھی) کے نام جو پہلا خط لکھا ہے، اس میں حسب ذیل نقرہ ہے،

"اسی طرح مددگار بھی معتبر ہوئے، نہ کہ دو زبان یا شرابی یا ناروا نفع لینے والے"

تورات، زبور اور پال کے اس حکم کی بنا پر عیسائی بھی سود کو ناجائز سمجھتے ہیں، عیسائیوں کے لاہوت ادبی (فقہ) نے سود کی حلت و حرمت کی حسب ذیل تشریح کی ہے،

فقراء سے سود لینا یا اس قسم کے مال پر سود لینا جو بعینہٖ استعمال کیا جاتا ہے، اور وہ پہلے ہی استعمال سے صرف ہو جاتا ہے، (مثلاً آٹا) قطعاً حرام ہے، نیز ارباب ثروت سے اگر حد انصاف سے زیادہ سود لیا جائے، تو وہ بھی حرام ہے۔ لیکن مندرجۂ ذیل پانچ صورتیں، حرمت ربا سے مستثنیٰ ہیں، گو ان مستثنیٰ صورتوں کا بیان علمائے لاہوت کے اجتہاد کے سوا کتب مقدس میں کہیں مذکور نہیں،

(۱) قرض دینے سے قرض خواہ پر کسی خطرہ کا خوف ہو،

(۲) قرض میں جو مال دیا گیا ہو، وہ اس قسم کا ہو، کہ قرض خواہ اس کو اپنے پاس رکھ کر کسی فائدہ میں لگا سکتا ہو۔

(۳) اصل راس المال (قرض) کے ڈوب جانے کا خوف ہو،

(۴) وقت معین پر قرضدار روپیہ نہ ادا کرے،

(۵) ملکی قانون کی بنا پر سود کی کوئی ایسی مقدار مقرر کر دی جائے جو حد انصاف سے خارج نہ ہو،

تین پہلی صورتوں پر تمام علمائے لاہوت کا اتفاق ہے، لیکن چوتھی اور پانچویں صورتوں میں بعض علمائے لاہوت نے اختلاف کیا، لیکن فتویٰ اکثر رائے پر ہوا،[1]

قرآن مجید | عرب میں یہودی قومیں کثرت سے آباد تھیں، اور وہ عام طریقہ سے نہایت سختی کے ساتھ سود لیتی تھیں جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے،

فبظلم من الذین هادوا حرمنا	جو لوگ یہودی ہیں، ان پر بوجہ اس کے
علیهم طیبٰت احلت لهم وبصدهم	کہ وہ ظلم کرتے ہیں اور خدا کے راستے سے
عن سبیل الله کثیرا واخذهم	لوگوں کو بہت روکتے ہیں، اور سود لیتے ہیں،
الربوا وقد نهوا عنه۔	ہم نے ان کے لیے وہ پاک چیزیں جو ان کے
	لیے حلال تھیں، حرام کر دیں، حالانکہ وہ
(نساء-۲۲)	اس سے روکے گئے تھے،

---

[1] دائرۃ المعارف ج ۸ ص ۱۰۵،

یہودیوں کے اثر سے عرب میں بھی سود کا رواج پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب اس قسم کا کاروبار کیا کرتے تھے[1]، جب یہ لوگ ایمان لائے، تو ان آیتوں میں خدا نے اس ناجائز منافع سے روکا،

الذین یاکلون الربوا لا یقومون	جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ (قیامت میں)
الا کما یقوم الذی یتخبطه الشیطن	اس شخص کی طرح اٹھیں گے، جس کو شیطان
من المس ذالک بانهم قالوا	نے جنون سے مخبوط کر دیا ہے، اور یہ اس لیے
انما البیع مثل الربوا واحل الله	کیا کہ انھوں نے کہا کہ بیع بھی ربا ہی کے مثل
البیع وحرم الربوا فمن جاءه موعظة	ہے اور خدا نے بیع کو جائز کیا، اور سود کو حرام
من ربه فانتهی فله ما سلف	کیا، تو جس کو خدا کی نصیحت پہنچی، اور وہ سود
	سے رک گیا، اس کو صرف راس المال لینا
(بقرہ ۳۸ - ۳۸)	چاہیے

سورۂ بقرہ میں پھر دوسری جگہ ارشاد ہوا،

یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله	مسلمانو! لوگوں کے ذمہ تمہارا جو سود باقی
وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم	رہ گیا ہے، اگر تم ایمان والے ہو تو چھوڑ دو،
مومنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب	اور اگر ایسا نہ کرو، تو خدا اور رسول سے جنگ
من الله ورسوله وان تبتم فلکم	کے لیے تیار ہو جاؤ، اور اگر تم باز آؤ، تو صرف

[1] تفسیر ابن جریر طبری ج ۳ ص ۶۳ و ۶۵

رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون۔ (بقرہ۔ ۳۸) — راس المال تمہارا ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ تم پر کوئی ظلم کرے،

جو لوگ اصل راس المال سے دوگنا اور چوگنا سود وصول کرتے تھے، اُن کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی۔

یاایہا الذین آمنوا لا تاکلوا الربٰوا اضعافا مضاعفۃ واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ (آل عمران۔ ۱۴) — مسلمانو! دوگنہ سہ گونہ سود نہ کھاؤ، اور خدا سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو،

اکثر لوگ اس خیال سے سود لیتے ہیں، کہ ان کی دولت و ثروت میں اضافہ ہو، لیکن خدا کے نزدیک بحیثیت طہارت اور روحانیت کے اس میں کچھ ترقی نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ اس آیت پاک کا مفہوم ہے،

وما آتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ۔ (روم۔ ۴) — اور جو تم نے سود دیا، کہ وہ لوگوں کے مال میں بڑھتا رہے تو وہ خدا کے نزدیک نہیں بڑھتا۔

تصریحات بالا سے اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے، کہ یہودی، عیسائی، مسلمان، اور بعض دیگر فرقوں میں متفقاً سود حرام ہے، اور تمام انبیاؑ نے بالاجماع اس ناجائز کسب معاش سے لوگوں کو روکا ہے، کیا ایسی متفق علیہ ناجائز شے کے حلال کرنے کی جرأت کی جاسکتی ہے،

(الندوہ جون ۱۹۰۹ء)

قیامت

مسلمانوں کا عقیدہ ہے، کہ دنیا کی موجودہ حرکت ایک دن فنا ہو جائے گی، ہر قسم کی زندگی وحیات معدوم ہو جائے گی، نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا، آفتاب ماہتاب، زمین، پہاڑ، ہر چیز منتشر اور پراگندہ ہو جائے گی، اور ایک متنفس بھی روئے زمین پر باقی نہ رہے گا، اس کے بعد دنیا کا ایک دوسرا دور آئے گا، تمام مخلوق زندہ ہوگی، اور اپنے اعمال کی سزا وجزا پائے گی،

قیامت سے ہماری مراد دورِ اول ہے، دورِ ثانی حشر ونشر ہے،

قرآن مجید میں قیامت کا بار بار ذکر آیا ہے، اور خدا نے ہر جگہ اس کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے، چنانچہ استقصا سے قرآن مجید میں قیامت کے حسبِ ذیل نام آئے ہیں،

(۱) یوم القیامہ — اٹھنے کا دن

(۲) الساعۃ — گھڑی

(۳) القارعہ — کھڑکھڑانے والی، متنبہ کرنے والی،

(۴) الغاشیہ — ڈھانکنے والی، چھا جانے والی،

(۵) الطامۃ الکبریٰ ۔ مصیبتِ عظیم

(۶) النبأ العظیم ۔ بڑی خبر

(۷) الیوم الحق ۔ روزِ حق

(۸) الحاقہ ۔ ضرور آنے والی ساعۃ

(۹) الوعد ۔ وعدہ

(۱۰) الواقعہ ۔ واقع ہونے والی،

(۱۱) امر اللہ ۔ خدا کا حکم

(۱۲) یوم الآزفۃ ۔ قریب کا دن

(۱۳) یوم معلوم ۔ روزِ معین

(۱۴) الصاخۃ ۔ بہرا کرنے والی

(۱۵) الوقت المعلوم ۔ وقتِ مقرر

(۱۶) الیوم الآخر ۔ آخر دن

لیکن یہ تمام نام جیسا کہ ترجمہ سے معلوم ہو سکتا ہے، درحقیقت قیامت کے اصلی اور موضوع لہ نام نہیں ہیں، بلکہ قیامت کے مختلف صفات کے لحاظ سے خدا نے اس کو مختلف اوصاف سے بیان کیا ہے۔

عقائد کے اکثر مسائل ایسے ہیں، جن کے ثبوت اور طرز ثبوت میں اسلام کے مختلف فرقے مختلف الرائے ہیں، لیکن ابن حزم نے ملل میں لکھا ہے، کہ "قیامت کے

اعتقاد پر کل فرقہائے اسلامیہ کا اتفاق ہے، لیکن یورپ، یونان، اور ہندوستان کے اکثر حکمار کو قیامت و فنائے عالم سے انکار ہے، آریوں میں پر لے اور عیسائیوں کے ہاں بادشاہت کے دن کا اعتقاد مسلمانوں کی قیامت کے مرادف ہے،

فلاسفۂ ہندوستان کا مدار انکار صرف مسئلۂ تناسخ پر ہے، جس میں نفوس وارواح کا ابد تک کے لیے جسمانی ہیکل میں مقید ہونا تسلیم کیا گیا ہے، مسئلۂ تناسخ کے اثبات پر جتنے دلائل پیش کیے گئے ہیں، وہ اس قدر کمزور اور بے بنیاد ہیں، کہ جن کے ابطال کے لیے کسی مزید کوشش کی ضرورت نہیں، ابطالِ تناسخ پر جو دلائل اسلام میں موجود ہیں، اُن کو چھوڑ کر یہ دلائل یہ ہے،

(۱) گائے، بیل، بکری، اونٹ، خچر، گھوڑا، ان تمام انواع کا وجود نوعِ انسانی کی طرح براہِ راست اور مستقل ہے، یا یہ تمام انواع مجرم و بدکردار انسانوں کی متغیر صورتیں ہیں، صورت اول دعوائے تناسخ کے منافی ہے، اور دوسری صورت میں لازم آتا ہے، کہ انسان پر ایک ایسا دور بھی گذرا ہے، جب وہ دنیا کا تنہا باشندہ تھا، اور اس وقت اس کی صورتِ معاش و طرزِ زندگی، اس موجودہ صورتِ معاش و طرزِ زندگی کے خلاف ہوگی، جس میں ہم بالکل مختلف انواع کے وجود کے محتاج ہیں، اور اس نتیجہ کو کوئی عاقل تسلیم نہ کرے گا، نیز انسان کا وجود حیوان سے پہلے ہونا، فلسفۂ حال کے خلاف ہے،

(۲) مدعیانِ تناسخ کا بیان ہے، کہ جب ایک مجرم انسان، انسانی قالب میں

گنہ گار رہتا ہے، تو اس کو اس کے گناہ کے مناسب، جانور کی صورت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، تاکہ بعد تحصیل کمال اس کو ترقی دی جائے، لیکن اس کو کون تسلیم کرے گا، کہ جب ایک انسان، انسانی قالب میں کمالاتِ انسانی حاصل نہ کر سکا، تو حیوانی قالب میں جو انسانی قالب سے ناقص تر ہے، وہ کیونکر ترقی کر سکتا ہے،

(۳) تمام اہلِ مذاہب کا اتفاق ہے، کہ نفسانی کمالات کا تمامتر دارومدار عقائد و اخلاق پر ہے، اس بنا پر تناسخ کے رُو سے لازم آتا ہے، کہ حیوانات سے بھی جو مجرم انسان کی ترقی کے حیوانی قالب میں، عقائد و اخلاق کا صدور ہو، لیکن عقائد و اخلاق جو خالق اور مخلوق کے درجات و حقوق کی رعایت کا نام ہے، تجربہ نے حیوانات سے اُن کا صدور اب تک ثابت نہیں کیا،

(۴) مدعیانِ تناسخ دنیا کے موجودہ نظام کے قدم کے قائل ہیں، اور ہر مذہب کی کوشش یہ ہے، کہ تمام انسان نیک کردار، متقی اور روحانی ہو جائیں، اس بنا پر اگر یہ فرض کر لیا جائے، کہ تمام نفوس انسانی متقی اور نیک کردار ہو جائیں، تو دنیا کا یہ تنوع جو انسان کے مدارجِ ترقی ہیں اور جس پر نظامِ عالم قائم ہے، فوراً درہم برہم ہو جائے۔

(۵) حامیانِ تناسخ کا بیان ہے، کہ انسان جب بدکار ہوتا ہے، اور بداخلاقیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، تو جس قسم کی بداخلاقی اس میں پائی جائے گی، اسی قسم کے حیوان کی صورت میں وہ دوسرا جنم لے گا، مثلاً ایک انسان خوشامدی ہے، اس کو کتے یا بلی کا

جنم ملے گا، دوسرا چور ہے وہ چوہے کی صورت میں پیدا ہوگا، تیسرا ظالم اور ستمگر ہے، وہ بھیڑیے کی شکل میں نمودار ہوگا، اس بنا پر اس وقت یہ بڑی مشکل ہوگی، کہ اگر ایک انسان بیک وقت ہر قسم کی بداخلاقیوں کا جامع ہو، یعنی وہ چور بھی ہو، خوشامدی بھی ہو، ظالم اور ستمگر بھی ہو، اور بہت سے دوسرے متضاد اوصاف سے متصف ہو، تو پھر اس کی دوسری پیدائش کے لیے اسی قسم کا متضاد الاخلاق اور جامع الاوصاف عجیب الخلقت جانور پیدا کرنا ہوگا۔

(۶) ایک انسان خوشامدی ہے، اس کو بلی کا جنم ملا، تاکہ وہ کمال روحانی حاصل کرے، یہ کتنا عجیب مضحکہ خیز امر ہے، کہ انسان ہوکر تو وہ خوشامدی رہا، کیا وہ بلی بن کر آزاد رائے، آزاد خیال اور حامی حق ہوگا۔

ان وجوہ کی بنا پر یہ بالکل ظاہر ہے، کہ تناسخ کے پیچ در پیچ سلسلوں کے اعتماد پر فنائے عالم اور قیامت کے اعتقاد کا انکار نہیں کیا جاسکتا، یونان کا حکیم انکار قیامت پر اس طرح دلیل قائم کرتا ہے، ہیولی صورت جسمیہ سے الگ نہیں ہوسکتا، ہیولیٰ قدیم ہے، اس لیے صورت بھی قدیم ہے، جب صورت اور ہیولیٰ دونوں قدیم ہیں، تو جسم جو ان دونوں کی ترکیب سے پیدا ہوا ہے، وہ بھی قدیم ہوگا، جسم ایک حقیقت ہے، اور ہر حقیقت کے لیے جنس ضروری شے ہے، اور جنس کا وجود بغیر نوع کے نہیں ہوسکتا، اور نوع کا وجود افراد کے وجود سے الگ نہیں ہوتا، اس لیے تمام اجناس و انواع بالذات اور ان کے افراد علی سبیل البدلیت قدیم اور ناقابل فنا ہیں،

یہ دلیل کس قدر کمزور ہے، اوّلاً ان مسلسل غلط لوازم کو کون تسلیم کرے گا، ثانیاً اس دلیل سے صرف اسقدر ثابت ہوتا ہے، کہ دنیا میں کوئی حقیقت ہمیشہ رہے گی، اور حقیقت کے لیے کوئی جنس اور جنس کے لیے کوئی نوع اور نوع کے لیے کچھ افراد ضروری الوجود اور قدیم ہیں، اور یہ ایک ایسا نتیجہ ہے، جو ہمارے دعویٰ کے منافی نہیں (جیسا کہ ہم آگے چل کر ثابت کریں گے) ممکن ہے کہ قیامت میں عالم غیر زندہ یا دہ کا توفت ہو، جس کے ضمن میں حقیقت جنس نوع، افراد کا وجود متحقق ہوگا، بہر حال یونانیوں کی اس دلیل سے تمام انواعِ موجودہ کی قدامت نہیں ثابت ہوتی ہے، جو اعتقاد قیامت کے خلاف ہو،

یورپ کے ملحدین و مادہ پرست بھی قیامت کے منکر ہیں، لیکن ان کا یہ انکار درحقیقت اس خیال کا نتیجہ ہے، کہ مادہ قدیم ہے، اور تورات عالم کو فنا نہیں، لیکن یہ سمجھنے کا مقام ہے، اول تو عدم فنائے مادہ کی بحث خود محتاج دلیل ہے، ثانیاً قیامت کا اعتقاد اس بات کا مستلزم نہیں، کہ فنائے مادہ تسلیم کر لیا جائے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا،

علامہ تفتازانی نے شرح مقاصد میں لکھا ہے، کہ قیامت کے متعلق متکلمینِ اسلام میں تین فرقے ہیں،

(۱) ایک فرقہ کا خیال ہے، کہ قیامت میں تمام اجسام فنا ہو جائیں گے، اور مادہ کا ایک ذرہ بھی موجود نہ رہے گا،

(۲) دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ قیامت میں صرف اجسام کی زندگی اور حیات معدوم ہو جائے گی، اور اجزا منتشر و متفرق ہو جائیں گے، ذرات مادہ کا غیر منتظم حالت میں عالم میں وجود باقی رہے گا،

(۳) امام الحرمین اور اُن کے پیرو، اس مسئلہ میں ساکت ہیں،

پہلا فرقہ اپنے دعویٰ پر حسب ذیل آیتوں سے استدلال پیش کرتا ہے،

الف، ھوالاول والآخر وہی اول اور وہی آخر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ خدا ہی کا وجود اول اور آخر ہے،

ب، کل شیٔ ھالك الا وجھہ، خدا کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے،

ج، کما بدانا اول خلق نعیدہ، جس طرح میں نے پہلی پیدائش شروع کی، اسی طرح میں پھر دوبارہ بناؤں گا،

خدا نے اول پیدائش کی، پیدائش ثانی کے ساتھ جو قیامت کے بعد ہوگی، تشبیہ دی، پہلی پیدائش عدم محض سے ہوئی، اس لیے اس تشبیہ سے لازم آتا ہے، کہ دوسری پیدائش بھی عدم محض سے ہوگی، جس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت ہونے پر ہر چیز معدوم محض ہو جائے گی۔

د، کل من علیھا فان زمین پر جو چیز ہے، وہ سب فنا ہو جائے گی،

لیکن یہ نہایت کمزور استدلالات ہیں، امام رازی نے محصل میں ان تمام دلائل

کی دھجیاں اُڑادی ہیں، خدا کے اول و آخر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا، کہ قیامت میں ایک ایک ذرہ عالم کا فنا ہوجائے گا، بلکہ اس آیت کے صرف معنی یہ ہیں، کہ خدا کا غیر متغیر وجود ازل میں بھی تھا، اور ابد میں بھی رہے گا، دوسری دلیل کہ خدا کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، اس سے بھی فنائے عالم کا ثبوت لازم نہیں ہوتا، ہلاک کے معنی فنائے محض کے نہیں ہیں، بلکہ بطلانِ حیات اور موت کے ہیں، اور یہ صحیح ہے، کہ خدا کے سوا ہر چیز مرنے والی ہے،

تیسری دلیل کی صحت اس بات پر موقوف ہے، کہ یہ تسلیم کرلیا جائے، کہ مشبہ کو مشبہ بہ کے ساتھ ہر حالت میں اشتراک ہوتا ہے، اور یہ بالکل فن بلاغت کے قواعد کے خلاف ہے، ہم بہادر انسان کو شیر سے، قطرۂ شبنم کو موتی سے، چہرہ کو آفتاب سے تشبیہ دیتے ہیں، لیکن وجہ شبہ کے سوا، اکثر وجوہ سے مشبہ اور مشبہ بہ کی حالتوں میں اختلاف ہے، اس آیت میں صرف منکرین معاد کے سوال کا جواب دیا گیا ہے، جن کا یہ قول تھا، کہ جب ہماری ہڈیاں سڑ گل جائیں گی، ہمارے جسم کا ایک ایک ذرہ منتشر و پراگندہ ہوجائے گا، تو خدا ہم کو کس طرح زندہ کرے گا، خدا نے ان کا جواب دیا ہے، کہ جس طرح خدا نے تم کو پہلے بنایا، دوبارہ بھی تم کو بنا سکتا ہے،

چوتھی آیت سے استدلال یہ ہے، کہ زمین پر جو چیز ہے، وہ سب فنا ہوجائیگی، لیکن اس آیت سے بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی، کہ وہ تمام چیزیں فنا ہوجائیں گی، مطلق فنا کے معنی صرف عدم حیات کے ہیں، اور یہ بالکل صحیح ہے، کہ انسان، جانور

پرند، درخت، زمین پر جتنی چیزیں ہیں، وہ سب معدوم الحیات ہو جائیں گی، اس کے علاوہ یہ آیت خود زمین کی معدومیت وفنا سے خاموش ہے، بلکہ اس کے بقا کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

امام الحرمین نے اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا ہے، علامہ تفتازانی بھی ان کے ہم زبان ہیں، لیکن اس سکوت پر بغیر کچھ بولے رہا نہیں جاتا، قرآن مجید نے قیامت کے متعلق جہاں ذکر آیا ہے یہ تصریح کردی ہے، کہ قیامت میں صرف تفرقِ اجزاء اور نظامِ عالم کا فساد ہوگا، مادہ کی غیر منتظم حالت باقی رہے گی، چنانچہ امام رازی نے محصل میں، امام غزالی نے رسائل میں، ابن تیمیہ نے کتاب العقل میں اس کی تصریح کردی ہے۔

ہم کو اس سے انکار نہیں ہے، کہ قدامتِ عالم اور عدمِ فنائے مادہ معتقداتِ اسلام کے خلاف ہے اور قدامتِ مادہ کا دعویٰ نہایت کمزور و بے بنیاد ہے، لیکن ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں، کہ قیامت کے متعلق قرآن مجید کی تعلیم فنائے محض وعدم صرف کی نہیں ہے، بلکہ یہ تعلیم ہے، کہ موجودہ نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا، چاند، ستارے، زمین، پہاڑ، سب منتشر ہو جائیں گے، زندگی معدوم ہو جائے گی، یہ اعتقاد قدامتِ مادہ کے خیال کو مستلزم نہیں ہے، ممکن ہے کہ مادہ ازل میں حادث شے ہو، قرآن مجید میں جابجا اس کی تصریح ہے، کہ قیامت صرف تفرقِ اجزاء اور فسادِ نظام کا نام ہے، چنانچہ قرآن مجید میں جہاں جہاں قیامت کا ذکر ہے، اس کا صاف اشارہ

موجود ہے، ذیل میں اس کے ثبوت میں ہم آیتیں نقل کرتے ہیں،

القارعۃ ما القارعۃ وما ادراک	متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے، متنبہ کرنے والی
ما القارعۃ یوم یکون الناس	اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنیوالی
کالفراش المبثوث وتکون الجبال	یہ وہ دن ہے، جب لوگ پریشان پروانوں
کالعهن المنفوش - (القارعۃ)	کی طرح اور پہاڑ، روئی کے گالوں کی طرح ہونگے،
اذا زلزلت الارض زلزالها، و	جب زمین خوب ہلائی جائے گی، اور زمین
اخرجت الارض اثقالها وقال	اپنا بوجھ نکالے گی، اور انسان کہے گا کہ زمین
الانسان مالها یومئذ تحدث	کو کیا ہوا، اس دن زمین اپنی حالت بیان
اخبارها - (زلزال)	کرے گی،
اذا السماء انشقت واذنت لربها	جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور وہ اپنے
وحقت واذا الارض مدت	مالک کی فرماں برداری کریں گے اور وہ
والقت ما فیها وتخلت	فرماں برداری کے لائق ہیں، جب زمین پھیلائی
	جائے گی، اور جو کچھ اس میں ہے، وہ ڈال دیگی
(انشقاق)	اور وہ خالی ہو جائے گی،
اذا السماء انفطرت واذا الکواکب	جب آسمان پھٹ جائیں گے، جب
انتثرت واذا البحار فجرت واذا	تارے بکھر جائیں گے، جب دریا چلائے
القبور بعثرت علمت نفس ما	جائیں گے قبر کے لوگ زندہ کئے جائیں گے،

قدمت واخرت،	روحوں نے جو پہلے اور پیچھے بھیجا ہے، اُس وقت
(انفطار)	جان لیں گی،
اذا الشمس کورت واذا النجوم انکدرت	جب آفتاب اندھیرا کیا جائے گا، جب ستارے
واذا الجبال سیرت واذا البحار سجرت	تاریک ہو جائیں گے، جب پہاڑ چلائے
(تکویر)	جائیں گے، جب دریا جوش دیا جائے گا،
انما توعدون لواقع فاذا النجوم طمست	جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، وہ یقیناً
واذا السماء فرجت واذا الجبال نسفت	ہونے والا ہے، جب ستارے ماند کر دیے
	جائیں گے، جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے
(مرسلات)	جائیں گے۔
فاذا برق البصر وخسف القمر	جب نگاہ ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب
وجمع الشمس والقمر،	بے نور ہو جائے گا، اور آفتاب و ماہتاب
(سورہ قیامہ)	اکٹھا کر دیے جائیں گے۔
یوم تکون السماء کالمھل وتکون	جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح
الجبال کالعھن	ہو جائے گا، جب پہاڑ روئی کے گالوں
(معارج)	کی طرح ہو جائیں گے
فاذا نفخ فی الصور نفخة واحدة	جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی،
وحملت الارض والجبال فدکتا	جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے،

دکۃ فیومئذٍ وقعت الواقعۃ	اور دونوں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے،
وانشقت السماء فهی یومئذ واهیۃ	اس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور
	آسمان پھٹ جائے گا، اور اس دن کمزور
(الحاقۃ)	ہو جائے گا،
یوم ترجف الارض والجبال و	جب پہاڑ اور زمین میں لرزہ ہوگا، اور
کانت الجبال کثیبا مهیلا۔ (مزمل-۲)	پہاڑ پگھلا ہوا ٹیلہ ہو جائے گا،
فکیف تتقون ان کفرتم یوما یجعل	کیونکر متقی ہو سکتے ہو، جب اس دن کا
الولدان شیبا السماء منفطر بہ	انکار کرتے ہو، جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا
وکان وعد اللہ مفعولا۔	آسمان اس دن پھٹ جائے گا اور خدا
(مزمل)	کا وعدہ پورا ہو جائے گا،
یوم تبدل الارض غیر الارض	جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی،
واذا انشقت السماء فکانت وردۃ	جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور سرخ
کالدهان۔ (رحمن)	تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے،
اذا وقعت الواقعۃ لیس لوقعتها	جب ہونے والی بات ہو جائے گی جس کے
کاذبۃ خافضۃ رافعۃ اذا	ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیر و زبر کر دینے
رجت الارض رجا وبست الجبال	والی، جب زمین خوب ہلائی جائے گی، اور
بسا فکانت هباء منبثا۔ (واقعہ)	پہاڑ پراگندہ کیے جائیں گے اس وقت

[illegible] — وہ پریشان ذرات کی طرح ہو جائیں گے،

وفتحت السماء فکانت ابوابا — اور آسمان کھول دیئے جائیں گے، اور وہ دروازے دروازے ہو جائیں گے،

وسیرت الجبال فکانت سرابا — اور پہاڑ چلائے جائیں گے، تو وہ سراب ہو جائیں گے۔

(نبا)

ان آیات سے قیامت کے معنی بالکل ظاہر ہو گئے، جن کے مطابق قرآن مجید کی تعلیم اور ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ نظام عالم کا ایک آخری دن ہوگا، جس میں دنیا کا موجودہ انتظام باطل ہو جائے گا، باشندگان زمین کی زندگی معدوم ہو جائے گی، نظام عالم کا مرکز آفتاب تاریک ہو جائے گا، ستارے پراگندہ اور منتشر ہو جائیں گے، ان کی روشنی مٹ جائے گی، زمین میں ایک سخت زلزلہ آئے گا، پہاڑ تصادم سے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، دریا میں جوش پیدا ہوگا، عالم میں ایک شدید انقلاب ہو جائے گا،

اس سے پہلے ہم قیامت کے متعلق ہندوستان و یونان کے اکثر حکماء کا خیال ظاہر کر چکے ہیں، اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں، کہ قدیم حکمائے یونان اور فلسفۂ جدیدہ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟ راغب پاشا نے سفینہ میں لکھا ہے: کہ سقراط نے بالکل اسلامی اعتقاد کے مطابق قدیم فلسفہ کے موافق قیامت کا سبب یہ بتایا ہے کہ زمین پانی پر ہے، پانی ہوا پر ہے، ہوا آگ پر ہے، آگ کی گرمی روز بروز آس پاس کی ہوا میں اثر کرتی جائے گی، گرم ہوا کی حرارت سے پانی میں گرمی بڑھتی جائے گی،

پانی میں جوش وخروش پیدا ہوگا، جس سے زمین کا غیر معمولی حرارت سے متاثر ہو جانا یقینی ہے، آفتاب کی حرارت زمین کی اس گرمی کو اور زیادہ بڑھا دے گی، جو گرم اجزاء زمین سے اٹھ کر اوپر جاتے ہیں، اور اوپر سے پھر نیچے آتے ہیں، وہ زمین کی گرمی میں دو چند سہ چند اضافہ کر دیں گے، ان تمام باتوں کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ ہوگا کہ زندگی برباد ہو جائے گی، پہاڑ پگھل جائیں گے، دریا میں غلیان پیدا ہوگا۔

یہ قدیم خیال تھا، لیکن فلسفۂ جدیدہ نے جو نظام شمسی تسلیم کیا ہے، اس میں موجودہ نظامِ عالم کا وجود صرف اس بات پر موقوف رکھا ہے، کہ مادہ کی حرارت ہمیشہ باقی رہے، اگر یہ ثابت ہو جائے، کہ مادہ کی حرارت گھٹتی جاتی ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ فسادِ عالم یا قیامت ہے۔

جیالوجی کے قاعدہ سے اس کی تفصیل یہ ہے، کہ ابتداء میں ذرات مادہ میں نہایت شدید حرکت و کشش تھی، حرکت نے حرارت پیدا کی، اور خود فطری حرارت بھی اس میں اس قدر تھی، کہ یہ بالکل پگھلا ہوا مادہ تھا، مدت کے بعد قلت حرارت اور کشش نے باہمی کسر و انکسار کے بعد ترکیب پیدا کی، ترکیب سے ذرات کی حرارت اندر بند ہو گئی، اس پر مزید حرکت و کشش نے التہاب و شعلہ کی حالت پیدا کی، یہ مرکب شے نہایت گرم کرہ کی شکل میں تھی، جو اپنے مرکز پر نہایت جلد جلد دوری حرکت کر رہی تھی، اور یہ قاعدہ ہے، کہ جو شے مرکز پر دوری حرکت کرتی ہے، وہ اپنے مرکز سے بھاگنا چاہتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اس گرم شعلہ نما کرہ سے اور بہت سے کرے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے، جن کا نام

اب چاند، زمین، مریخ، مشتری، نیپچون وغیرہ ہے، باہمی کشش کی بنا پر ایک دوسرے کی گرد حرکت کرتے ہیں لیکن وہ فطری گرم التہابی حالت روز بروز کم ہوتی گئی، زمین جس پر ہم آباد ہیں، یہ بھی موجودہ آفتاب کی طرح نہایت گرم اور مشتعل تھی، رفتہ رفتہ اس کی خارجی حرارت کم ہوتی گئی، اور قابلِ آبادی بنی، لیکن پھر بھی اب بھی اس میں اتنی حرارت موجود ہے، کہ اگر یہ کچھ زیادہ دور تک کھودی جائے، تو پگھلا ہوا مادہ اور زمین کی ابتدائی گرم حالت کے مشابہ حالت پائی جائے گی، زمین میں آتش فشاں پہاڑ، اور غیر معمولی حرارت کا موجود ہونا اس کی شہادت ہے۔

علمائے علوم جدیدہ کے آخری محقق کی رائے ہے کہ آفتاب میں جو غیر معمولی حرارت ہے، اور جس سے تمام نظام عالم قائم ہے، وہ زمین کی حرارت کی طرح روز بروز کم ہوتی جاتی ہے، اور ایک وقت ایسا آنے والا ہے، جب آفتاب کی یہ حرارت گرمی، روشنی معدوم ہو جائیگی، جس سے تمام نظام عالم برباد ہو جائے گا، اور زندگی معدوم ہو جائے گی، بعض علمائے یورپ نے حساب لگا کر وہ مدت بھی مقرر کر دی ہے، جب یہ موجودہ طلسم باطل ہو جائیگا اور آفتاب، ماہتاب، ستارے، زمین، پہاڑ، تصادم اور ٹکر کھا کر ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، اس وقت خدا کا یہ کلام سچا ہوگا۔

اذا السماء انفطرت واذا الکواکب انتثرت واذا البحار فجرت واذا القبور بعثرت علمت نفس ما قدمت واخرت۔ (انفطار)	جب آسمان پھٹ جائیگا، جب ستارے منتشر و پراگندہ ہو جائیں گے، جب دریا بہائے جائیں گے، جب قبروں سے لوگ اٹھائے جائیں گے، اس وقت ہر جان نے جو پہلے اور پیچھے بھیجا ہے، وہ جان لیگی۔ (الندوہ، ستمبر ۱۹۰۶ء)

تحریمِ شراب

اسلام جن انسانی مصالح کا جامع ہے، اُن کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس نے انسان پر تمام مضرت رساں اشیاء کو حرام کر دیا ہے، جو انسان کے قویٰ اور دل و دماغ کو برباد کر دیتی ہیں، شراب جو انسان کے جسمانی اور دماغی قویٰ کے لیے زہرِ قاتل ہے، اسلام نے اپنے پیروؤں کو ہمیشہ کے لیے اس کے استعمال سے روک دیا ہے۔

شراب کا رواج قبل از اسلام عرب میں نہایت کثرت سے تھا، ہر قوم کا لٹریچر اس کے اخلاق و عادات کا آئینہ ہوتا ہے، شعرائے عرب کے مقدمات مدح کا جزءِ اعظم شراب ہوتا تھا، شراب پی کر مے خانہ میں مدہوش پڑا رہنا، اپنی ہر قسم کی جائداد اور مال و دولت کو بیچ کر شراب خریدنا، اور پینا اور پلانا ایک عربی شاعر کے لیے مدح کی انتہا ہے، عجم کے متعلق یہ کہنا واقعہ ہے کہ اگر اُن کی شاعری سے شراب کا عنصر الگ کر دیا جائے، تو ان کی شاعری بالکل بدمزہ ہو جائے، حتیٰ کہ عجمی شعرائے تصوف کے کلام میں بھی ساری مستی شراب کی ہے، شراب کا موجد بھی عجم کا شاہنشاہ جمشید تسلیم کیا گیا ہے، ان واقعات کا نتیجہ یہ تھا کہ ان ملکوں میں شراب نہایت کثرت سے پی جاتی تھی، اور ازاں بعد دنیا میں شراب سب سے بہتر نعمت

سمجھی جاتی تھی، شاید اس کا سبب یہ ہو، کہ ان ممالک میں اسلام سے پہلے جو مذاہب رائج تھے، اُن میں شراب حرام نہ تھی،

توراۃ میں شراب کی حرمت کے متعلق کوئی حکم موجود نہیں ہے، بلکہ جابجا کی عبارتوں سے ثابت ہوتا ہے، کہ اُس زمانے میں شراب حلال تھی، اور عام طور سے لوگ پیتے تھے، چنانچہ توراۃ پیدائش باب ۹ درس ۲۰ و ۲۱ میں لکھا ہے،

"اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا، اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا، اور وہ شراب پی کر نشہ میں آیا،"

انجیل بھی اور دیگر احکام کی طرح حرمتِ شراب کے حکم سے خالی ہے، لیکن لوقا کی انجیل میں جہاں حضرت یحیٰیؑ کی پیدائش کا ذکر ہے، یہ فقرہ بھی موجود ہے،:

"اور بہتیرے اس کی پیدائش سے خوش ہوں گے، کیونکہ وہ خداوند کے حضور بزرگ ہوگا، اور شراب اور کوئی نشہ کی چیز نہیں پیے گا" (باب اوّل درس ۱۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ شراب کا استعمال نبوت کے عہد اوسط میں خلافِ اتقا سمجھا جاتا تھا، لیکن قرآن مجید جو دنیا میں تکمیلِ مذہب کے لیے آیا ہے، اس نے شراب کے متعلق قطعی فیصلہ کر دیا۔

اسلام نے شراب کو نہ صرف حرام بلکہ خلافِ فطرت قرار دیا ہے، بخاری شریف میں مروی ہے، کہ اثنائے واقعاتِ معراج میں رسول اللہ صلعم کے سامنے شراب اور دودھ کے دو پیالے پیش کیے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پی لیا، اور شراب کا

پیالہ چھوڑ دیا، ناموسِ اکبر نے کہا جس خدا نے تم کو فطرت کی ہدایت کی، اس کی حمد کرتا ہوں، اگر تم شراب کا پیالہ اٹھاتے تو تمہاری تمام امت گمراہ ہو جاتی،

جس طرح اسلام اور اس کے احکام فطری ہیں، اسی طرح اس کا طریقۂ تعلیم بھی فطری ہے، اس نے اپنے متبعین کو شراب کی حرمت کا مسئلہ بالکل تدریجی طرز سے بتایا کہ عرب آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ اپنی اس قدیم اور راسخ عادت کو چھوڑ سکیں، سب سے پہلے صحابہؓ کے سوال پر مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی،

یسئلونك عن الخمر والمیسر قل فیھما	لوگ تم سے شراب اور قمار کی نسبت سوال
اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما	کرتے ہیں، کہدو کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ
اکبر من نفعھما	ہے، اور لوگوں کے لیے ان میں منفعتیں بھی ہیں،
(بقرہ)	لیکن ان کا گناہ ان کی منفعتوں سے بہت بڑھ کر ہے

اس آیت میں خدا نے شراب کی حرمت کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا، بلکہ صرف مسلمانوں کو یہ تعلیم فرمائی کہ شراب میں منافع بھی ہیں، اور مضرتیں بھی ہیں، لیکن مضرت منفعت سے زیادہ ہے، اس آیت سے تین باتوں کا ثبوت ہوتا ہے،

۱۔ شراب میں بہت سے منافع ہیں،

۲۔ شراب میں بہت سی مضرتیں ہیں،

۳۔ لیکن اس کی مضرت کا حصہ اس کی منفعت سے زیادہ ہے،

یہ تمام وہ امور ہیں جن کا ثبوت آج تحقیقاتِ جدیدہ سے ہو رہا ہے، بے شبہ

شراب سے حرارتِ غریزی میں ترقی اور قویٰ میں تازگی پیدا ہوتی ہے، لیکن جسمانی اور دماغی قویٰ کو اس سے نہایت سخت صدمہ پہنچتا ہے،

چونکہ اس آیت میں شراب کی حلت و حرمت کا کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا گیا، اس بنا پر بعض محتاط صحابہ نے پینا چھوڑ دیا، اور بعض پیتے رہے، اس کے بعد ایک واقعہ یہ پیش آیا، کہ عبدالرحمن بن عوفؓ نے چند آدمیوں کی دعوت کی، سامانِ ضیافت میں شراب بھی تھی، شراب پی کر جب لوگ نماز کو اٹھے، تو امام نے سورۂ کافرون کی آیت الٹ پلٹ کر پڑھ دی، جس سے اس آیت کے معنی بالکل بدل گئے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی،

ولا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ،   نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب بھی نہ جاؤ۔

اس آیت کا مفہوم یہ تھا کہ اوقاتِ نماز میں شراب کے استعمال سے پرہیز کرو، کچھ دن کے بعد عتبان بن مالکؓ نے سعد بن وقاصؓ اور اپنے بعض دیگر احباب کی دعوت کی، شراب پی پی کر جب لوگوں کو نشہ آیا، تو بی فخاری شروع ہوئی جس کا خاتمہ لڑائی پر ہوا، اس موقع پر اس آیت نے شراب کی حرمت کا قطعی فیصلہ کر دیا،

یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر   مسلمانو! شراب، قمار، بت، اور حصہ کے والانصاب والازلام رجس من   تیر ناپاک ہیں، شیطانی کام ہیں، ان سے عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم   پرہیز کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ، شیطان چاہتا تفلحون انما یرید الشیطان ان یوقع   ہے، کہ تم میں آپس میں شراب و قمار بازی میں

بینکم العداوۃ والبغضاء ... بغض و عداوت ڈال دے، اور خدا کی
فی الخمر والمیسر ویصدکم ... یاد اور نماز سے تم کو روک دے،
عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ ... کیا اب شراب نوشی سے
فھل انتم منتھون ... باز آؤ گے ... (۱)

قرآن مجید کو دیگر صحف انبیاء پر جو امتیاز حاصل ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے متبعین اور پیرووں کو صرف تقلیدی ایمان پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس کا ہر ایک حکم فلسفہ، عقل اور مصلحت پر مبنی ہے اسی لیے وہ اپنے ہر ایک حکم کے بعد اس کے مصالح کا بھی ذکر کرتا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تمام احکام کی مصلحت اور عقلی خوبی خود قرآن مجید نے بتلائی ہے۔ اسی اصول کی بنا پر جب قرآن مجید نے حرمت شراب کا حکم دیا، تو اس نے تحریم شراب کے مصالح و اسباب کا بھی تفصیلی طور سے ذکر کیا، شراب کو رجس[۱] یعنی روحانی و اخلاقی ناپاکی فرمایا، اور اس کی

---

[۱] عام فقہاء رجس سے نجاست حقیقی مراد لیتے ہیں، لیکن یہ ایک فاش غلطی ہے کیونکہ رجس، خمر، میسر، انصاب، ازلام سب کی خبر واقع ہے، اس بنا پر اگر رجس کے معنی نجس حقیقی کے لیے جائیں گے تو لازم آئیگا کہ میسر، انصاب، ازلام سب نجس حقیقی ہیں اور انکے چھونے سے ہاتھ کا دھونا لازم آئیگا، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں، اور اگر صرف خمر میں نجس حقیقی اور بقیہ اشیاء میں نجس مجازی مراد لیا جائے تو جمع بین الحقیقۃ والمجاز لازم آئے گا، اس لیے رجس سے مراد نجس مجازی

(باقی ص ۳۵۶ پر)

روحانی و اخلاقی ناپاکی کی دو وجہیں قرار دیں:

ا۔ شراب آپس میں بغض و عداوت پیدا کرتی ہے،

۲۔ شراب سے غفلت پیدا ہوتی ہے، اور انسان نیکیوں سے غافل ہو جاتا ہے،

(۱) پہلا سبب بالکل صاف اور ظاہر ہے، بزم شراب میں ساقی آتا ہے، ساغر کا دور چلتا ہے، فخر و مباہات کا اظہار ہوتا ہے، ناقابل اظہار اسرار کے چہرے سے نقاب اٹھتی ہے، باہمی رقابت کا تذکرہ ہوتا ہے، مستی چھا جاتی ہے، متکبرانہ اور ظریفانہ فقرے تیر و تبر بن کر منہ سے نکلتے ہیں، اور دوسروں کے دل وسینہ کو زخمی کرتے ہیں، اور بغض و عداوت کا دور شروع ہو جاتا ہے، خودکشی قتل اور دیگر جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے، اسی نتیجہ کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ کیا گیا ہے،

انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضآء فی الخمر والمیسر۔	شیطان صرف یہ چاہتا ہے، کہ تم میں آپس میں شراب و قمار میں بغض و عداوت ڈال دے،

(۲) دوسرا سبب پہلے سے زیادہ ظاہر ہے، بادۂ ناب کا ایک پیالہ پیا، آنکھوں میں خمار آیا، دل میں نشاط چھایا، دن رات کی ایک گونہ بیخودی طاری ہوئی، عقل و فراست کی شمع خاموش ہوئی، مصالح دنیا سے بےخبری ہوئی، نہ خوف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۵) یعنی روحانی ناپاکی مراد ہے، چنانچہ قرآن مجید میں نو جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ اس سے نجس مجازی مراد لیا گیا ہے، علمائے اسلام میں علمائے تشیع، امام ابو داؤد ظاہری، علامہ ابن حزم اس کے قائل ہیں۔ (سلیمان۔۱۲)

خلق رہا، نہ یادِ حق، اس کا نتیجہ دافعی یہ ہوتا ہے، کہ وہ دین و دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے، اس کے دل و دماغ بے کار ہو جاتے ہیں، علمی، اخلاقی ہر قسم کے فوائد و مصالح برباد ہو جاتے ہیں، شیشۂ شراب کے سوا اور کوئی آرزو اس کے دل میں باقی نہیں رہتی، ان اشخاص کی لائف پڑھو، شراب جن کی زندگی کا جزء بن گئی تھی، آخر شراب ان کی ترقی و نمود کے لیے موت ثابت ہوئی، اور اس نے ان کو مذہبی، علمی، قومی اور ملکی فرائض کے ادا کرنے سے تمام عمر کے لیے ان کو روک دیا، قرآن مجید میں اسی معنی کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ کیا گیا ہے،

ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ فھل انتم منتھون۔ (شیطان چاہتا ہے کہ شراب نوشی میں) تم کو یادِ خدا اور نماز سے روک دے، کیا اب تم شراب سے باز آؤ گے؟ (مائدہ ۵-۱۲)

چونکہ نماز اور ذکرِ خدا تمام نیکیوں کی اصل اور تمام اخلاق کی جان ہے، اور مذہبی تعلیم کا منشاء اصلی ہے، اس لیے اس موقع پر اسی کا خصوصیت سے تذکرہ کیا، تاکہ اس سے نیچے درجہ کی نیکیاں ضمناً خود بخود اس کے تحت میں داخل ہو جائیں، نیز ان نقصانات روحانی کے علاوہ شراب میں بہت سے جسمانی نقصانات بھی ہیں، لیکن چونکہ مذہب کا خاص رشتہ روح سے متعلق ہے، اس لیے قرآن مجید نے شراب کی جسمانی مضرات سے تعرض نہیں کیا،

بعض لوگ حیلۃً یہ کہتے ہیں، کہ "شراب اگر اتنی مقدار میں پی جائے جس سے

کہ نشہ نہ ہو، تو کیا ہرج ہے، لیکن اسلام کا حکم عام ہے،

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام - جس کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے، اسکی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے، (ترمذی ج ۲)

اور یہ بالکل صحیح ہے، جس شے کی زیادہ مقدار مضر ہو، اس کی قلیل مقدار بھی یقیناً مضر ہوگی، صرف فرق یہ ہوگا کہ اس کی مقدار کثیر کا نقصان بہت جلد اور کم مقدار کا نقصان ایک مدت میں محسوس ہوگا،

تاکید حرمت کی غرض سے اسلام نے نہ صرف شراب کا استعمال ہی حرام کیا، بلکہ اس کی تجارت بھی ناجائز قرار دی ہے، چنانچہ فقہ کی کتابوں میں کثرت سے اس کے احکام موجود ہیں،

مندرجۂ بالا امور کا ماحصل یہ ہے،

(۱) شراب خواہ تھوڑی مقدار میں ہو، یا بڑی مقدار میں مطلقاً حرام ہے،

(۲) شراب کا استعمال جسمانی اور اخلاقی ہر قسم کا نقصان پیدا کرتا ہے،

(۳) اسلام نے شراب کی تجارت ممنوع قرار دی ہے،

اب تک حرمتِ شراب کا مسئلہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن یہ امر قابلِ حیرت ہے، کہ ٹھیک اسلامی تعلیمات کے مطابق آج یورپ کے بڑے بڑے کیمسٹ اور فزیالوجسٹ شراب کی حرمت اور امتناعِ تجارت کے متعلق مضامین شائع کر رہے ہیں، چنانچہ ہمارے نوجوان جو تقلید یورپ کے نشہ میں چور

ہیں، اور جن پر مذہب کا افسوں کارگر نہیں ہوتا، تاہم ان کو شراب کے متعلق کچھ یورپ کی زبان سے بھی سنانا چاہتے ہیں۔

یورپ کے مشہور محقق چارلس ڈارون نے لکھا ہے، کہ اپنے آباء و اجداد کے متواتر اور قدیم تجربوں سے مجھکو اب یقین کامل ہوگیا ہے، کہ "انسان کی موت جس قدر مسکرات کے استعمال سے ہوئی، کسی دوسرے مرض اور آفت سے نہیں ہوئی"، کیمسٹری کی تحقیقات نے شراب کو انسان کی بدترین غذا تسلیم کیا ہے، پروفیسر کریملین جو جرمنی کی میونخ یونیورسٹی میں دماغی امراض کے پروفیسر ہیں، وہ پچیس ۲۵ سال سے تحقیقات کر رہے تھے، کہ مسکرات کا دماغ اور دیگر جسمانی قویٰ پر کیا اثر پڑتا ہے، وہ کامل تحقیقات کے بعد جس نتیجہ پر پہونچے، وہ یہ ہے کہ "شراب شایستہ قوموں کو تباہ و برباد کر رہی ہے"۔

میسو کلاڈنی ممبر فرنچ اکاڈیمی نے شراب کے نقصانات پر چند نوٹ لکھے ہیں، جن میں موصوف نے باشندگانِ فرانس کو نصیحت کی ہے، کہ وہ شراب کی کثرت کو روکیں، اور خواہش کی ہے، کہ شراب خانوں کی تعداد جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے، کیونکہ فرانس میں شراب نوشی کی کثرت جس قدر ہوتی جاتی ہے، بیماری، جنون، ضعفِ قویٰ اور خودکشی کی وبا بھی اسی نسبت سے بڑھتی جاتی ہے، چنانچہ اموات اور بیماریوں کی تفتیش اور شمار سے معلوم ہوتا ہے، کہ امراض، جنون اور خودکشی کے زیادہ تر وہی لوگ شکار ہوتے ہیں، جو شراب کے حد درجہ عادی ہوتے ہیں،

اور اس کا اثر انہی اشخاص تک محدود نہیں رہتا، بلکہ نسلاً بعد نسلٍ اس کا اثر متعدی ہوتا جاتا ہے، اسی بنا پر پارلیمنٹ کے دو ممبروں نے گورنمنٹ سے سرکاری طور پر درخواست کی ہے، کہ جنوری ۱۹۱۰ء سے فرانس میں شراب کے استعمال کی عام طور سے ممانعت کر دی جائے، گورنمنٹ نے شراب کی تجارت کی جو اجازت دی ہے، اس کا مدار محض اس بات پر ہے، کہ گورنمنٹ کے مداخل میں آمدنی کا ایک اور راستہ پیدا ہو، لیکن ایک قلیل آمدنی کے مقابلہ میں رعایا اور ان کی نسل کی عام جسمانی صحت کا خون نہیں کیا جا سکتا ہے،

ایک مشہور مضمون نگار نے لکھا ہے "اگر تم شفا خانے بند کرنا چاہتے ہو، تو شراب خانوں کو بند کر دو" درحقیقت اس معجز رقم نے اس مختصر سی عبارت میں ان تمام امراض کی فہرست ظاہر کر دی ہے، جو شراب نوشی کے نتیجہ ہیں، انہی امراض کے باعث عموماً شراب نوشوں کی عمریں نہایت چھوٹی ہوتی ہیں، ان امراض میں موت کے علاوہ شراب نوشوں میں خودکشی کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوتی ہے، اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ لوگ شراب خانوں میں سرور و نشاط بڑھانے کے لیے نہیں جاتے، بلکہ رنج والم بڑھانے کے لیے جاتے ہیں، اپنی قوت تازہ کرنے نہیں جاتے، بلکہ اپنی قوت کو کھونے جاتے ہیں، تحقیق و مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے، کہ ۱۸۹۳ء میں صرف میخواری کی کثرت سے فرانس میں دیوانوں اور مجنونوں کی تعداد ۵۹ ہزار تھی، خودکشی کی تعداد کا بھی اسی نسبت سے قیاس کر سکتے ہو،

شراب کے زہر قاتل ہونے پر اس سے زیادہ اور کیا بین ثبوت ہو سکتا ہے، کہ بہت سے مشاہیر اور اہل قلم جو شراب کے عادی تھے، دنیا کو بہت جلد ان کی شہرت اور افادات قلم سے محروم ہونا پڑا، الفرڈ ڈی میسا جو فرانس کا بہت بڑا شاعر تھا، وہ اسی تلوار کا شہید ہے، اس عزیز ملک کے علاوہ کشتگان شراب کی فہرست میں اور بہت سے نامور ملیں گے، اکثر محققین اطبا اور ڈاکٹروں نے شراب کے نقصانات نہایت وضاحت سے لکھے ہیں،

کیمسٹری کا مشہور عالم برڈلو کہتا ہے، کہ فزیالوجی اور طب کے محققین کے ساتھ میں بھی اس کی شہادت دیتا ہوں، کہ شراب انسانی زندگی کے لیے زہر قاتل اور صحت و عقل کی دشمن ہے،

ارسونقال کہتا ہے کہ اس قسم کے زہر قاتل کی خرید و فروخت کی اجازت دینا ملک اور انسانیت کا مجرم بننا ہے،

تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہوا ہے، کہ فرانس میں جو عام طور سے کمی آبادی، ضعف قویٰ، کوتاہی قامت اور کمی عمر کی شکایت ہے اس کا سبب اعظم شراب کا عام استعمال ہے،

بہت سے ایسے اشخاص ہیں، جو شراب کے نقصانات کے قائل ہیں، لیکن صرف اس لیے پیتے ہیں، کہ کم مقدار مضر نہیں، یہ صحیح ہے، لیکن جب اسی مقدار میں روزانہ استعمال کی جائے گی، تو ایک مدت کے بعد جسم میں شراب کے سمی اجزا پھیل

جائیں گے، اور نقصان پہنچائیں گے، فرق صرف اتنا ہوگا کہ زیادہ پینے والے بہت جلد اور کم پینے والے دیر میں متاثر ہوں گے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے نوجوان جو بزعم خویش نہایت اعتدال سے پیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں، کہ اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، وہ عہد پیری میں نہایت مشکل ولا علاج امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لاغری، دائمی زکام، وجع مفاصل، نقرس وغیرہ کی بیماریاں اکثر انکو لاحق ہو جاتی ہیں، جن سے ان کے جسم کا جوڑ جوڑ، بند بند اور ایک ایک ہڈی، اپنی جگہ سے کھسک جاتی ہے، اور بالآخر صحت ہمیشہ کے لیے خراب ہو جاتی ہے،"

مسکرات کی خواہ کتنی ہی کم مقدار استعمال کی جائے، اس کا زہر مخفی ہوتا ہے، جس سے استعمال کرنے والے کے تمام قویٰ رفتہ رفتہ زائل ہو جاتے ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں، کہ جو لوگ محنت و مشقت کا کام کرتے ہوں، ان کو تکان کے دفع اور قویٰ کی تازگی کے لیے رات دن میں ایک مرتبہ تھوڑی سی شراب ضرور پینی چاہیے، لیکن اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے، کہ یہ مصنوعی تازگی ان کے اعصاب کو کمزور کر دے گی، اور پھر کسی کام کے قابل نہیں رہ جائیں گے۔"

شراب کے استعمال سے معدہ اور جگر عموماً خراب ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ فالج، استسقاء، جنون، باتور، تیفوس، سرخ بادہ، زکام، پھیپھڑے کی سوزش، وغیرہ بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں، یہ امراض شراب خواروں کے علاوہ اور لوگوں کو بھی ہوتے ہیں، لیکن ان کا علاج ممکن ہوتا ہے، لیکن جب شراب خوار ان امراض

میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو اس کی زندگی خطرہ میں آجاتی ہے، اور پھر وہ اچھا نہیں ہوتا،
شراب سے جو تازگی، اعادۂ قوت اور نشاط پیدا ہوتا ہے، وہ درحقیقت الکحل کا نتیجہ ہے، اور الکحل کی نسبت ایک طبی رسالہ نے لکھا ہے، کہ وہ انسان کی بدترین ایجاد ہے، لوگ سمجھتے ہیں، کہ الکحل جسم کو تقویت بخشتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے، کہ الکحل کا کام یہ ہے کہ محنت ومشقت سے قویٰ میں جو ضعف، تکان، اور عام غفلت اور سستی پیدا ہو جاتی ہے وہ اسے دور کر دیتا ہے، قویٰ کو بیدار کر دیتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لیے ان میں جو تیزی اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے، تو انسان سمجھتا ہے، کہ وہ تازہ دم ہو گیا، اور اس کی قوتِ اصلی عود کر آئی، حالانکہ درحقیقت قویٰ میں جو غیر فطری بیداری اور مصنوعی حرکت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان کو اور زیادہ ضعیف، شست اور کمزور بنا دیتی ہے، اور دیر تک کے لیے تھکا دیتی ہے، اس کی صحیح مثال یہ ہے، کہ گھوڑا جب دوڑ کر تھک جاتا ہے، اور اس کی حرکت اور تیزی کم ہو جاتی ہے، تو کوڑا کچھ دیر کے لیے اس کو تیز اور متحرک کر دیتا ہے، اور وہ دوڑنے لگتا ہے، اور بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے، کہ گھوڑا اب پہلے سے زیادہ چاق وچوبند ہے، تو کیا سوار کو واقعی یہ سمجھنا چاہیے، کہ گھوڑے کی پہلی قوت عود کر آئی ہے، اور وہ تازہ دم ہو گیا ہے، اور اگر وہ ایسا سمجھتا ہے، تو وہ مجنون ہے، بلکہ اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا گھوڑا پہلے سے کہیں زیادہ شست، کمزور، اور تھکا ماندہ ہو گیا ہے،

الکحل کی نسبت بعض لوگ سمجھتے ہیں، کہ وہ قوتِ اشتہا کو بڑھاتا ہے، حالانکہ

وہ قوتِ ہضم کو فطری طور پر اپنے صحیح فرائض ادا کرنے سے باز رکھتا ہے، اور معدہ میں ایسے امراض پیدا کر دیتا ہے، جو رشتۂ حیات کو بہت جلد منقطع کر دیتے ہیں، وہ ناگہانی موت کا سبب بن جاتا ہے، صرع اور جنون کا محرک ہوتا ہے، پیری اور بڑھاپے کو دعوت دیتا ہے، نسل نہایت کمزور اور ناتواں پیدا ہوتی ہے، وہ اکثر بیمار، بیوقوف، مجنون، بہری، اور بہت سے اخلاقی عیوب میں مبتلا رہتی ہے، الکحل کا اثر زیادہ تر معدہ، جگر، دماغ، پھیپھڑا، گردہ، اور شرائین پر پڑتا ہے،

ان مضمون نگارانِ یورپ نے اپنے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کو تین عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) شراب انسان کے قویٰ اور اخلاق کے لیے زہر قاتل ہے،

(۲) شراب کی تھوڑی مقدار بھی مضر ہے،

(۳) شراب کی تجارت بند کر دی جائے،

ان مضامین کو غور سے پڑھو، کہ اسلام آج سے تیرہ سو برس پیشتر جس نتیجہ تک پہنچا تھا، یورپ اس نتیجہ تک آج پہنچا ہے،

یہ ہمارے لیے کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے، کہ غیر مذاہب کے اولوالعزم مصلحوں نے جن کے یہاں شراب مطلقاً ممنوع نہیں، جا بجا انسدادِ مسکرات کے لیے کمیٹیاں قائم کی ہیں، اور تا حدِ امکان انھوں نے اس میں کامیابی بھی حاصل کی ہے، لیکن مسلمان جن کے مذہب میں شراب کا ایک قطرہ بھی حرام ہے، اب تک

انھوں نے اس غرض کے لیے کوئی جماعت قائم نہیں کی،

مسلمان نوجوان جو یورپ کی ترقی سے مرعوب، اور اس کے بادۂ تقلید سے مست و سرشار ہیں۔ وہ بیدار ہوں اور اپنی حالت پر غور کریں، یورپ جیسے سرد خطہ میں جب لوگ شراب کے مفاسد سے نالاں ہیں، تو ایشیا جیسے خطہ میں جو نسبۃً گرم ہے، شراب کے استعمال کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں،

اس موقع پر حضرت حسن کا یہ زریں قول کتنا قیمتی اور نصیحت بخش ہے، کہ "مے خوارو! اگر عقل تمہارے نزدیک کوئی گراں قیمت شے ہے، تو شراب کے ایک پیالہ پر اس کو فروخت نہ کرو"۔

(الندوہ، اکتوبر ۱۹۰۹ء)

حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ ان الحکم الا للہ حکم کسی کا نہیں مگر اللہ کا،

(یوسف)

آیتِ بالا میں ارشاد خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کا ہے، اس لیے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، لیکن احکامِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی یعنی وہ احکام جو انبیا علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں، اور دوسرے تکوینی یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقاتِ عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے، اور اسی کا حکم جاری وساری ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں، جنھوں نے نمرود و فرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا، مگر ان کو بھی تکوینی احکامِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہوکر جان دینی پڑی، اور یہ شبہ ان سلاطینِ عالم کو اس لیے پیش آتا ہے، کہ وہ اپنے تشریعی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک وشبہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں، اور نہ تکوینی، زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اسی کی ہے، اور امر

تکوینی ہو یا تشریعی، اس میں اسی کا فیصلہ فیصلہ ہے، اس معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں،

ان الحکم الا للہ (یوسف) حکم نہیں مگر اللہ کا،

الا لہ الحکم وھو اسرع الحاسبین۔ ہاں اسی کے لیے حکم کرنا اور حساب (انعام ۔۸)

لہ الحکم والیہ ترجعون (قصص) اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے،

امر تکوینی و فطری میں تو انسان کی ناچاری و مجبوری ظاہر ہے، کہ وہ زمین و آسمان اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کر سکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ اس کی صفات میں تغیر کر سکتا ہے، اور نہ اس کے قواعد و قوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کر سکتا ہے، ان احکام کے آگے سب ہی سر افگندہ اور ناچار ہیں، حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا، تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا، فرمایا،

فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے،

فأت بھا من المغرب فبھت الذی تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر

کفر (بقرہ ۔۳۴) لاجواب ہو گیا۔

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں،

اللّٰھم مالک الملک توتی الملک من تشاء، اے اللہ! سلطنت کے مالک تو جس کو چاہے سلطنت دے،

اس لیے ان میں راہِ صواب پر وہی ہیں، جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام تکوینی کی طرح اس کے احکام تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں، اور جو یہ سمجھتے ہیں، کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیے دی ہے، کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں رائج اور شائع اور اس کی شریعت کے مطابق احکام کو جاری کریں،

اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے، کہ یہ مانا جاتا ہے کہ احکام کے اجراء اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرمادیئے ہیں، ان کے تتبع سے اہل علم اور مجتہدین نئے نئے احکامِ جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں،

ان احکام الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر پر مشتمل ہوں، بے شبہ اہل عقل اپنی عقل و فہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کس بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے، یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عقاب مترتب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اہلِ عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں،

اگر وہ حکم الٰہی کے مطابق نہیں ہے، تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے، اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے، اس لیے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں، جس کو خدائے عالم الغیب نے نازل فرمایا،

ان تمام مذکورۂ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضع صرف اللہ تعالی ہے۔ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے، عام طور سے فقہاء نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے،

۱۔ ان الحکم الا للّٰہ (انعام و یوسف) — حکم صرف اللہ کے لیے ہے،

۲۔ الا لہ الخلق والامر (اعراف) — ہاں اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا،

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادث عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے، سورۂ انعام اور سورۂ یوسف میں، سورۂ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے ہیں، اس کے جواب میں ہے،

ما عندی ما تستعجلون بہ ان الحکم الا للّٰہ یقص الحق وھو خیر الفاصلین (انعام - ۷)	جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں، بجز اللہ تعالی کے، اللہ تعالی واقعی بات تبلا دیتا ہے اور وہی سب سے

اچھا فیصلہ کرنے والا ہے،

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے، جب حضرت یعقوبؑ بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں، کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہو، تاکہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں، کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے، مگر ہوگا وہی جو اللہ چاہتا ہے،

وما اغنی عنکم من اللہ من شیٔ ان الحکم الا للہ علیہ توکلت وعلیہ فلیتوکل المتوکلون،	اور خدا کے حکم کو میں تم سے نہیں ٹال سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے، (بانو تواسا تدبیر ظاہری کے دل سے) اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔
(یوسف - ۸)	

دوسری آیت کا موقع یہ ہے،

ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوت والارض فی ستۃ ایام ثم استوی علی العرش یغشی اللیل النہار یطلبہ حثیثاً والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العٰلمین ۔	بے شک تمہارا رب، اللہ ہی ہے، جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آتی ہے، اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا، ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو

اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور
حاکم ہونا، بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے
ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار
(اعراف - ۷) ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و تکوین سے ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لفظ امر اور حکم، لغوی وسعت کی بنا پر امور شرعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں، لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر صرف اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے،

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے، اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کی مستقلاً طاعت کی جائے، تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے،

لا تعبد الشیطان (مریم) شیطان کی عبادت نہ کرو،

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے،

ان لا تعبدوا الشیطان۔ (یٰسین) یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو،

ظاہر ہے شیطان کی عبادت کوئی نہیں کرتا، لیکن جو شیطان کی باتوں پر عمل کرتا اور اس کے حکموں کو مانتا ہے، وہی شیطان کی عبادت کرتا ہے، اس لیے

حکم الٰہی ہے،

وقضیٰ ربک الا تعبدوا الا اللہ　　　اور تیرے پروردگار کا یہ فیصلہ ہو چکا کہ اللہ
(اسرائیل)　　　کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو،

سورۂ کہف میں ہے،

ولا یشرک فی حکمہ احدا　　　اور نہ اللہ کسی کو اپنے حکم میں شریک کرتا ہے،

سورۂ کے آخر میں ہے،

ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا　　　اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک
(کہف - ۱۲)　　　نہ کرے،

یہ عبادت ہر قسم کی اطاعت کو شامل ہے، قرآن پاک نے دوسرے موقع پر تصریح کی ہے، کہ شرک صرف یہی نہیں ہے، کہ ایک خدا کو دو خدا کہا جائے، بلکہ یہ بھی ہے کہ خدا کی اطاعت بلاواسطہ میں کسی اور کو شریک ٹھہرایا جائے، سورۂ انعام میں حلال اور حرام کھانے کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے کہ

وان الشیٰطین لیوحون الی اولیاۂم لیجادلوکم وان اطعتموھم انکم لمشرکون۔　　　اور بے شبہ شیطان اپنے دوستوں کو سکھاتے ہیں کہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم ان کی اطاعت کرلو (ان کی بات مان لو) تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ
(انعام - ۱۴)

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال

پیدا ہوگا، تو پھر اسلام میں انبیاء اور ائمۂ زمانہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، اور دوسروں کی اطاعت احکام الٰہی کی تبلیغ اور احکام الٰہی کے اجراء اور تنفیذ میں حکم الٰہی کے تحت میں ہے، ارشاد الٰہی ہے،

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و	اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اور
اولی الامر منکم۔	اولی الامر کی اطاعت کرو،

اولوالامر کی اطاعت خواہ اس سے مراد علماء ہوں یا حکام، خدا کے احکام کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجراء میں ہے، اور رسول کی اطاعت بھی احکام الٰہی کی تسلیم اور تنفیذ ہی کی خاطر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے،

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔	اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے
(نساء - ۸)	اللہ کی اطاعت کی،

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے،

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع	اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن
باذن اللہ۔	اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکام الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا، اور ان کا حکم حکم خدا سے ماخوذ و مستنبط سمجھ کر نہیں، بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجا لایا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک

میں ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے، اور ان سے جزیہ یا قتال کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے،

قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا	اہل کتاب میں سے ان سے لڑو، جو اللہ اور
بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم	قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ جس کو اللہ
اللہ ورسولہ ولا یدینون دین	اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام مانتے
الحق من الذین اوتوا الکتاب۔	ہیں، اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں،

ان آیات میں اہل کتاب پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے، وہ اسی لحاظ سے ہے، کہ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبہ انھوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے،

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا	انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور
من دون اللہ والمسیح ابن مریم	راہبوں کو رب بنا رکھا ہے، اور مریم کے بیٹے
وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا۔	مسیح کو، حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ
(توبہ - ۵)	ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں،

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے، کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے، کیونکہ ان کو یہ دعویٰ تھا، کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور سے اپنے حکموں سے اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے ان کو دوسری سورہ میں اس شرک سے باز رہنے کی دعوت دی ہے،

یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ۔ (آل عمران - ۷)

اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مانی ہوئی ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں، اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، اور نہ خدا کو چھوڑ کر ہم میں ایک دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ہے، کہ جب عدی بن حاتمؓ جو ایک عیسائی عرب امیر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپؐ نے ان کے سامنے سورۂ توبہ والی آیت مذکور پڑھی، تو عدیؓ نے کہا " وہ ان کو معبود نہیں بناتے" فرمایا کیوں نہیں، انھوں نے ان کے احکام کو مانا یہی ان کو معبود بنانا ہے، الفاظ یہ ہیں، فذالک عبادتہم ایاھم[۱] ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے، تو یہ حلال مان لیتے تھے، اور جب حرام کرتے ہیں تو حرام سمجھ لیتے ہیں[۲]۔

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، [۲] ترمذی تفسیر آیت توبہ۔

نہیں، بلکہ خدا کا ہے، اور اسی کا نام وضعِ حکم ہے، اس تحلیل اور تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے، اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکمِ خداوندی بالاستقلال کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے عرب، اور یہود و منافقین کو جو قانونِ الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیے یا عدمِ ایمان کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی رواجی عدالت میں یا عرب کاہنوں کے پاس لے جاتے تھے، زجر و توبیخ فرمایا اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک قرار دیا، چنانچہ بعض اصولی احکام عدل و انصاف اور طریق اطاعتِ احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

الم تر الی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ (نساء ۹) کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا، جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا، اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا، ایمان لا چکے ہیں، وہ چاہتے ہیں، کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے، کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اُس شے کو کہتے ہیں، کہ جس کو خدائے تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے، کل معبود من دون اللہ، اور اہلِ تفسیر نے شانِ نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں اور جادوگروں کو اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے، اس لیے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ

دے کر اطاعت کی جائے، اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے، وہ طاغوت ہے،
قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے، اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور
معبود باطل لیا گیا ہے،

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا
فسق ہے، اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الفاسقون۔ (مائدہ) — اور اللہ نے جو اتارا ہے، اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں،

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے، حدود وہ
نشانات ہیں، جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے، اور جس سے تل بھر
آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے، اور یہ حدود اللہ تعالیٰ کے بتائے
ہوئے اور اتارے ہوئے ہیں، قرآن پاک میں سورۂ بقرہ اور نساء اور طلاق میں
احکام الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے،

تلک حدود اللہ — یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں،

تلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ (طلاق) — یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں، جو ان حدود سے آگے بڑھے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا،

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے،

تلک حدود اللہ ومن یطع اللہ — یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے

ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنٰت تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا وذالک الفوز العظیم ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ نارًا خالدًا فیہا ولہ عذاب مہین۔ (نساء — ۲)

(اور جو) رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، اور اللہ کے حدود سے آگے بڑھے گا، اس کو دوزخ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کے لیے بڑی ذلت کی سزا ہے،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ ورسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے، اور ان سے انحراف اللہ ورسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے، اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالےٰ ہی کی اطاعت ہے،

قانون و شرع کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے، اور یہ حق صرف اللہ تعالےٰ کے لیے مخصوص ہے، انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرے اور بلا سند الٰہی کسی شئے کو حلال یا حرام کرے، تو اس کا نام "افترا علی اللہ" خدا پر تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب

اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال و

هذا حلال وهذا حرام لتفتروا ۔ حرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ
علی اللہ الکذب ان الذین ۔ یہ حلال ہے، اور یہ حرام تاکہ تم اللہ پر جھوٹ
یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون ۔ تہمت لگاؤ یہ (دنیا میں) چند روزہ فائدہ
متاع قلیل ولہم عذاب الیم (نحل۔۱۵) ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا، بلکہ یہ بھی پیشینگوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دنوں کا فائدہ حاصل ہو جائے گا، مگر وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت الٰہی کے مظہر تھے، اور بندوں کو احکام الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے، اور اس حیثیت سے آپؐ کا ہر حکم، حکم الٰہی ہے، لیکن حکم الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ ایک چیز کو اپنے لیے آپ نے حرام قرار دیا، تو عتاب الٰہی آیا۔
یا ایہا النبی لم تحرم ما احل اللہ ۔ اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے،
لک ۔ (تحریم) جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا،

اس سے یہ معلوم ہوا، کہ یہ استحقاق بالاستقلال نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے، کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے، مگر جب رسول نے ایسا کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ کو منع فرمادیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے، ایک یہ کہ نبی کا

ہر شرعی فعل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو، امت کے لیے تحت حکم الٰہی شرعی کا حکم رکھتا ہے، اس قاعدہ کی بنا پر آپ کے اس ترک سے امت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا، کہ نبی کو بغیر اذن الٰہی کے بھی حقِ تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اس لیے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے، کہ وہ شریعتِ الٰہی کا مبلّغ اور قانون ربانی کا شارح اور مظہر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے،

ولا یحرمون ما حرم اللّٰہ ورسولہ .. اور یہود و نصاریٰ اسے حرام نہیں کرتے،

.. (توبہ-۴) جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے،

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے، وہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلّغ تھے، جن کی اطاعت عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولی الامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے، کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں،

اسلامی علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے، اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علم عقائد اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں،

علم اصول فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے، کہ واضع قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا،

۔۔۔ علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں ؛

اعلم انہ لا حاکم سوی اللہ تعالیٰ ولا حکم الا ما حکم بہ و یتفرع علیہ ان العقل لا یحسن ولا یقبح ولا یوجب شکر المنعم وانہ لا حکم قبل ورود الشرع۔ (ص ۱۱۳ ۔ مطبوعہ مصر)	جاننا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں، اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور اسی اصل پر یہ مسئلہ متفرع ہے کہ عقل نہ کسی کو اچھا کہتی ہے اور نہ بُرا، اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے، اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں،

مقصود یہ ہے کہ احکامِ شریعت اور قانونِ شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے، اور اسی کا قانون قانون ہے، اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب، یا حرام، ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے فاعل پر ثواب یا عقاب کا حکم عائد کیا جا سکے، نہیں ہو سکتا، اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا بُرا کہہ سکتی ہے،

علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں،

الحاکم لا خلاف فی انہ رب العلمین۔ (ص ۲/۸۹)	اس میں اختلاف نہیں، کہ حکم کا واضع پروردگارِ عالم ہے۔

- قاضی بیضاوی المتوفی ۵۱۶ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسنوی واضح کرتے ہیں،

حسن و قبح اور شے کے اچھے یا بُرے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے، یا اس سے نفرت کرتی ہے، جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے، اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا برا ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہیں، کہ ایک کمال کی صفت ہے، اور دوسری نقص کی، جیسے علم اچھا ہے، اور جہل بُرا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کے رو سے فیصلہ کرتے ہیں، اس میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے، کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے، اشاعرہ (اور عام اہلِ سنت) کے نزدیک حسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے صرف شرع پر موقوف ہیں، اور معتزلہ کہتے ہیں، کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے، اور اس فیصلہ کے لیے حکم الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے، (ص ۹۰ برحاشیہ تحریر ابن ہمام)،

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، وہ یہ کہ شریعت کے فیصلے سے حکم کی

معرفت ہوتی ہے، اور عقل سے اس کی مصلحت قیاس و تجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے، اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلک حق ہے، مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں کہتے ہیں،

حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت کے موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے، اختلاف اس میں ہے، کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رو سے سمجھا جا سکتا ہے، یا صرف شرع سے، تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا، وہ اچھا ہے، اور جس کو برا فرمایا وہ برا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا بُرا ہوتا، اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے، کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں، کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، اور ہمارے نزدیک یہ ہے، کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے، کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہو،

لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے، تو کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا۔ (المقالۃ الثانیہ فی الاحکام)

بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے، کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحر العلوم نے شرح مسلّم الثبوت میں اس مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:-

اس مسئلہ پر کہ حکم صرف اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا اجماع ہے، اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے، کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون وہ حاکم عقل ہے، یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں، کہ عقل بعض احکام الٰہی کو جان سکتی ہے، چاہے شرع میں وارد ہو یا نہ ہو، اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے،

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۵۰ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے، کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے،

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے، جب نبی کی بعثت نہ ہو، یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو۔

تواشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلّف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، اور نہ ایمان واجب ہے، اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو، اس کے ساتھ حکمِ الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔ (ارشاد الفحول مصر ص ۶)

اب آخر میں ہم حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قولِ فیصل نقل کرتے ہیں، جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں، کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا، وہ درحقیقت حَسَنٌ (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتہٖ حسن ہے، یا اپنے کسی وصف یا کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ (قبیح) بُرا ہے، تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ اتصاف امر و نہی سے پہلے ہی عالمِ حقیقت میں ہو چکا تھا، اور اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں، لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا، تو یہ مذکورۂ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں تمام تر اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے، یہیں

احکام بندوں کے حق میں صرف شرع الٰہی پر مبنی ہیں"۔ (ص ۱۲)

حضرت مولانا شہیدؒ کا یہ رسالہ اصولِ فقہ درحقیقت اصولِ فقہ کی "تہذیب" ہے، اس فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرمادیا ہے، اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لیے ثابت نہیں ہے، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر اور نہی فرمایا ہے، وہ تمامتر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے، عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پالیتی ہے، تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں، کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے،

اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی، تاکہ یہ معلوم ہو جائے، کہ ہمارے ماہرینِ قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے، کہ اسلام میں وضعِ قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم آمر اور واضعِ شرع ہے، اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا، کہ یہ قانونِ شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقتِ خاص میں نازل ہوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے، کہ ایک ہیں قانون کے اصول اور کلیات، اور دوسرے ہیں اُس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی و تجربی ہی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، اُن میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا، تغیر و تبدل اور تجدد یعنی نئی نئی

صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے، جو انہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو، لیکن اس کے اصول و کلیات پرانے اور غیر تبدیل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے۔ مثال کے لیے یوں سمجھیے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص اور دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ صورتیں کہ وہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا، اور اب بندوق سے، تمنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولہ سے، اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوا کرتا ہے، لیکن یہ تغیر مسئلہ کی صورت میں فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے، تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب گاڑی، سائیکل، موٹر، ریل وغیرہ کی صورتوں میں یہ حادثے پیش آئیں تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے، تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے حالات کا حکم جو اپنے اجتہاد سے بتاتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں، جو احکام کے اصول و فروع پر پوری نگاہ رکھتے ہیں، اور آیات و احادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل و اسباب اور مصالح و مفاسد کو معلوم کرتے ہیں، اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہیں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا وضع اور مخترع نہیں،

بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے، بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں، کہ مقررہ احکامِ الٰہی کے تحت میں اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہلِ اصول کے اس مسئلہ کے کہ قیاس حکم کا صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے، کہ یہ نیا جزیہ فلاں اصول کلی کے ماتحت ہے، انہی اصولوں کی بناپر ہمارے فقہاء نے فتاوی کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جاسکتا ہے، اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں، اور اب بھی ہیں!

(معارف نومبر ۱۹۴۶ء)

آیتِ استخلاف

جماعتِ انسانی کا کوئی اہم کام بغیر کسی خاص نظام کے نہیں چل سکتا، وہ نظام جو تمام مسلمانانِ عالم کی جماعت کی تشکیل کرتا ہے، اور باوجود اختلافِ قومیت، اختلافِ زبان، اختلافِ وطن ان کو باہم دگر وابستہ اور مربوط کرتا ہے، وہ خلافت ہے، اسلام جغرافی زمینوں میں، نسلی قومیتوں میں، مصنوعی زبانوں میں، کالی اور گوری رنگتوں میں منقسم نہیں ہے وہ تمام دنیا کے اُن افراد کو جنھوں نے اس کے اصولِ زندگی اور طریقِ عمل کو اختیار کر لیا ہے، اخوت اور برادری کی ایک ہی سطح پر کھڑا کر دیتا ہے، اور اسی عالمگیر برادری کا مرکزی وہ نقطہ ہے، جس کو ہم مسلمان خلافت کہتے ہیں، مسئلہ کے صحیح پہلو کو سمجھنے کے لیے مسلمانوں کے اساسِ دین و مذہب یعنی قرآن مجید کی صرف ایک آیت پر غور کرنا کافی ہے، چنانچہ ایک مختصر تمہید کے بعد اسی آیت پاک کی طرف ہم اپنے دوستوں کو متوجہ کرتے ہیں،

خلافت کے لغوی معنی "جانشینی" کے ہیں، مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ "نوعِ انسانی" اس سطح خاکی پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے جانشین ہے، وہ تمام خیر و سعادت، وہ تمام کمالات و حسنات جن کی وہ ذاتِ اقدس منبع ہے، نوعِ انسانی کا فرض ہے،

کہ بحیثیت جانشینی کے اپنی محدود وسعت انسانی کے مطابق اپنے اندر اُن کے حصول کی کوشش کرے، تاکہ وہ اس کمال مطلق اور حسن مطلق ہستی کی صحیح جانشین ہو سکے۔

اسلام کی مقدس کتاب کا پہلا حصہ جس اصولی سبق سے شروع ہوتا ہے وہ یہی مسئلہ خلافتِ انسانی ہے، حضرت آدمؑ کا قصہ یہود و نصاریٰ دونوں میں مسلّم ہے، لیکن اسلام میں اس قصہ کی تشریح ایک اصولی اعتقاد کی حیثیت رکھتی ہے، تخلیقِ آدم کی غرض و غایت عقائد اسلامی کے مطابق صرف یہ ہے کہ وہ خداوند عالم کا اس سطحِ خاک پر خلیفہ نامزد ہوا، قرآن مجید کے ابتدائی سورہ کی یہ آیت ہے،

اذقال ربك للملئكة انى جاعل فى الارض خليفة۔ یاد کرو جب خدا نے فرشتوں سے کہا کہ ہم زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانے والے ہیں۔

بالآخر یہ خلیفہ بنایا گیا، اور آدم اس کا نام ہوا، یہی آدمؑ جو خدا کی طرف سے خلیفہ تھا، اپنے فرزندوں کے لیے پیشوا اور امام ہوا، یعنی وہ خالق کا خلیفہ اور مخلوق کا امام تھا، حضرت آدمؑ کے بعد اپنے اپنے عہد اور زمانہ میں بہ ترتیب جو انبیائے عظام (صلی اللہ علیہم وسلم) اس دنیا میں تشریف لاتے گئے، وہ خلفائے الٰہی اور ائمۂ انسانی تھے، اور قرآن پاک نے ان کو اسی نام سے بار بار یاد کیا ہے، حضرت ابراہیمؑ جو اسلام میں ایک عظیم الشان پیغمبر تسلیم کیے گئے ہیں، ان کی

نسبت قرآن مجید میں خدائے پاک کہتا ہے،

قال انی جاعلك للناس اماماً۔ (بقرہ) اے ابراہیم! میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں،

حضرت داؤدؑ جن کو مسلمان پیغمبر یقین کرتے ہیں، قرآن ان کو خلیفہ کہہ کر پکارتا ہے،

یاداؤد انا جعلناك خلیفۃ فی الارض۔ (ص) اے داؤد! میں نے تم کو زمین میں اپنا نائب یعنی خلیفہ بنایا۔

مسلمانوں کے اعتقاد میں آخری خلیفۂ الٰہی اور امام انسانی پیغمبر عرب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، آپؐ کی وفات کے بعد خلافت الٰہی کے بجائے خلافت نبوی کا سلسلہ شروع ہوا، صحیح مسلم جو اسلام میں حدیث کی دوسری مستند ترین کتاب ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت بنو اسرائیل تسوسہم الانبیاء کلما ھلك نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی ویکون خلفاء سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ خلیفۂ رسول اللہ کے خطاب سے مخاطب ہوئے، اس کے بعد یہ سلسلہ اُس وقت سے آج تک بلا انقطاع قائم ہے، قرآن مجید کی وہ آیت پاک جو اس عمارت کی بنیاد ہے، یہ ہے،

وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصلحت خدا نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے، اور عمل

ليستخلفنّهم في الارض كما استخلف
الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم
الذى ارتضىٰ لهم وليبدلنّهم من
بعد خوفهم امنا يعبدونني لا
يشركون بي شيئا ومن كفر بعد
ذالك فاولٰئك هم الفاسقون۔
(نور-۷)

... صالح کیے، (یعنی مسلمانوں) سے یہ وعدہ کیا
ہے، کہ وہ ان کو زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائیگا،
جس طرح ان کو بنایا، جو ان سے پہلے تھے،
اور ان کے اس دین کو جس کو وہ ان کے لیے
پسند کر چکا ہے، قائم و مستحکم کرے گا، اور خوف
کے بعد ان کو امن بخشے گا، کہ وہ مجھے پوجیں
اور میرا کسی کو شریک نہ بنائیں اور جو اس کے
بعد بھی کافر ہوں گے تو وہ بے شبہ مجرم ہوں گے،

ان آیاتِ پاک میں نہ صرف مسئلہ خلافت کا سرسری ذکر ہے، بلکہ اس کی حقیقت اور اس کے تمام شرائط و مصالح بھی بتا دیئے گئے ہیں، ان آیاتِ پاک میں پانچ الفاظ ہیں جن کی تشریح ہمارے مقاصد کی گرہ کشائی کر دے گی۔

(۱) استخلاف (۲) الارض (۳) تمکینِ دین (۴) تبدیل امن من بعد الخوف (۵) عبادت الٰہی و عدم اشراک۔

استخلاف استخلاف کے معنی عربی زبان میں خلیفہ بنانے اور حکمراں بنانے کے ہیں، یعنی اس ایک لفظ کے لغوی معنی کے اندر مادی و روحانی، دنیاوی و دینی دونوں قسم کی سرداری و سیادت کے معنی داخل ہیں، علاوہ لغت کے ہم یہاں بطور نمونہ کے چند مستند مفسرین کی رائیں نقل کرتے ہیں، سب سے قدیم اور مستند مفسر امام ابن جریر طبری

کی تفسیر فرماتے ہیں،

لیورثہم اللہ ارض المشرکین من العرب والعجم فیجعلہم ملوک و ساستہا۔ (ج ۱۸ ص ۱۰۹)	اللہ تعالیٰ عرب وعجم کے غیر مسلم سے ملک لیکر مسلمانوں کو اس کا وارث بنائے گا، کہ وہ اس کے بادشاہ اور اس کے منتظم کار رہوں گے۔

علامہ بغوی کی مشہور تفسیر معالم میں ہے،

لیورثہم ارض الکفار من العرب والعجم فیجعلہم ملوکہا وساستہا وسکانہا۔	خدا مسلمانوں کو کفار کی زمین کا وارث کرے گا، تو ان کو اس کا بادشاہ، منتظم اور باشندہ بنائے گا،

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں۔

لیجعلہم خلفاء متصرفین فی الارض تصرف الملوک فی ممالکہم۔	خدا مسلمانوں کو خلیفہ بنائے گا۔ جو زمین کا اسی طرح انتظام کریں گے، جس طرح بادشاہ اپنی سلطنت کا کرتے ہیں،

علامہ ابن کثیر جن کی تفسیر تمام تفسیروں میں مستند ترین تفسیر ہے، اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں،

ھذا وعد من اللہ تعالیٰ لرسولہ صلی اللہ علیہ وسلم بانہ سیجعل امتہ خلفاء الارض ای ائمۃ	خدا کا پیغمبر سے وعدہ ہے، کہ اس کے پیروں کو وہ زمین کا حکمراں، لوگوں کا امام وپیشوا اور اپنے امور کا منتظم و مدبر بنائے گا،

الناس والولاۃ علیھم وبھم تصلح	اور انہی سے ملکوں کی حالت درست ہوگی،
البلاد وتخضع لھم العباد۔	اور لوگ ان کی اطاعت کریں گے۔

ان تفسیروں کے علاوہ دیگر کتب تفسیر میں استخلاف کے یہی معنی لکھے ہیں، اس تفسیر سے جس پر تمام مسلمان علماء اور ائمہ کا اتفاق ہے، یہ واضح ہو گیا ہوگا، کہ خلیفہ دینی و دنیاوی، مادی و روحانی دونوں قوتوں کا بیک وقت رئیس و سردار ہے، کوئی روحانی خلیفہ و امام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک وہ مادی و دنیاوی طاقت کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا ہو۔

الارض | دوسرا لفظ الارض کا ہے، ارض کے لغوی معنی مطلق زمین و ملک کے ہیں، لیکن یہاں ارض پر الف لام کسی خاص چیز کو بتاتا ہے، اور وہ وہ سرزمین ہے جس کو مسلمان روزِ ازل سے مقدس جانتے ہیں، اور جس کو تورات نے "زمین مقدس" کا خطاب دیا ہے، اور جو ابراہیمؑ کی اولاد کو بطور وراثت عطا کی گئی تھی، یہود اس مقدس زمین کو صرف فلسطین میں محدود سمجھتے ہیں، کہ وہ ان کا اصلی وطن تھا، لیکن اسلام اس احاطہ میں اُس تمام سرزمین کو گھرا ہوا تسلیم کرتا ہے، جو اب تک اولاد ابراہیم کی بے شمار تعداد سے آباد ہے، اور جو ہمیشہ سے پیغمبروں کا مسکن رہا ہے، یعنی وہ سرزمین جس کو دجلہ و فرات بحر شام، بحر احمر، بحر ہند اور خلیج فارس چاروں طرف سے محیط ہے، جس میں عراق و شام و عرب واقع ہیں، چونکہ یہ قطعۂ ارض چاروں طرف سے پانیوں سے گھرا ہوا ہے، اس لیے اس کو پیغمبر اسلامؐ نے جزیرۃ العرب

کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ اس قطعہ زمین کو ہمیشہ غیر مسلم دست اندازی سے محفوظ رکھا جائے، تاکہ اسلام کی خالص زندگی ہمیشہ قائم رہے،

الغرض ارضِ خلافت کا قلب و دماغ یہی قطعۂ ارضی ہے، اور اس کی وسعت اطرافِ ملک میں حالات کے مطابق گھٹتی اور بڑھتی رہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھی، خلیفۂ اول کے عہد میں شام و عراق کے حدود تک پہنچ گئی: خلیفۂ ثانی نے اس کو ایک طرف مصر اور دوسری طرف ایران کی سرحد سے ملا دیا، خلیفۂ ثالث کے زمانہ میں ارضِ خلافت افریقہ اور ترکستان تک وسعت پذیر ہو گئی، خلیفۂ چہارم کے عہدِ خلافت میں مملکتِ اسلامی دو حصوں میں منقسم ہو گئی، عرب، عراق اور عجم حضرت علیؓ کے ہاتھ میں رہے، اور شام مصر و افریقہ امیر معاویہؓ کے قبضہ میں چلے گئے، حضرت علیؓ کی وفات کے بعد جب مسلمانوں نے امیر معاویہؓ کو خلیفہ تسلیم کیا، اور اس کے بعد بنو امیہ کے آخری زمانہ تک یعنی ۱۳۲ھ تک ارضِ خلافت اسپین سے سندھ تک، یورپ، ایشیا، افریقہ تین براعظموں میں پھیلی رہی، بنو عباسیہ جب مدعیٔ خلافت ہوئے، تو ان کی حدودِ خلافت دوسری طرف مصر سے آگے افریقہ و یورپ تک نہ پھیل سکیں

بغداد میں خلافتِ عباسیہ کی تباہی کے بعد مصر میں جب خلافتِ عباسیہ منتقل ہوئی، تو اس کی وسعت ملکی صرف مصر و شام و عرب تک محدود رہ گئی، ۹۲۳ھ میں جب خاندانِ عثمانی میں خلافت منتقل ہوئی، تو اس کی وسعت نے پھر یورپ و افریقہ و ایشیا

تینوں براعظموں کو گھیر لیا،

اس تفصیل سے یہ واضح ہوگا کہ ارضِ مقدس ہر زمانہ میں خلافت کا اصلی جزو اور دیگر ممالک خلیفۂ وقت کے جائے وقوع و جائے حکومت اور فوجی طاقت کے مطابق اس میں شامل رہے ہیں، مگر بہرحال از روئے اصول اس کی وسعت ارضی ہر زمانہ میں اس قدر رہنی چاہیے، کہ وہ اس زمانہ کی گردوپیش کی غیر مسلم سلطنتوں کے مقابلہ میں اپنی بقاو زندگی کی حفاظت کرسکے،

اس تشریح کے بعد لفظ الارض کے متعلق مستند مفسرین کی شہادتوں کو سننا چاہیے،

علامہ ابن کثیر جو از روئے صحت روایت مستند ترین مفسر ہیں ان کا بیان ہے،

ھذا وعد من اللہ تعالیٰ لرسولہ صلی اللہ علیہ وسلم بانہ سیجعل امتہ خلفاء الارض...... وقد فعلہ ...... فانہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یمت حتی فتح اللہ علیہ مکۃ و خیبر والبحرین وسائر جزیرۃ العرب وارض الیمن بکمالہا واخذ الجزیۃ من مجوس ھجر ومن بعض	خدا نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ایک وعدہ کیا تھا، کہ وہ ان کے پیرووں کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ خدا نے یہ وعدہ پورا کیا، چنانچہ آپ نے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک مکہ، خیبر اور تمام عرب اور یمن آپ کی ماتحتی میں نہ آگیا، اور ہجر (بحرین) کے مجوسیوں سے اور شام کے چند مقامات سے جزیہ نہ لے لیا، اور قیصر روم اور مصر

اطراف الشام دھا واہ ھرقل ملک الروم وصاحب واسکندریہ کے سلاطین اور عمان کے امرار
مصر واسکندریہ وملوک عمان والنجاشی ملک الحبشۃ۔ اور نجاشی شاہ حبشہ نے آپ کو ہدیہ دیا۔

علامہ زمخشری نے جو از روئے ادب و زبان بہترین مفسرین تسلیم کیے گئے ہیں، لکھتے ہیں۔

"خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا، اور مسلمانوں کو پہلے جزیرۃ العرب کا مالک بنایا اور اس کے بعد مشرقی و مغربی ممالک کو انھوں نے فتح کیا"

غرائب القرآن میں جو قرآن کا مستند لغت ہے مذکور ہے،

۔ چنانچہ خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا، اوران کو جزیرۃ العرب کا مالک اور کسریٰ کی مملکت و خزانہ کا وارث بنایا،

ابن الاعرابی کا بیان ہے، کہ

الارض کے معنی ملک عرب اور اس کے سوا اور ممالک بھی مراد ہیں،

الغرض ان تمام تصریحات سے واضح ہوگا، کہ خلافت کی ارض موعودہ کے اندر جزیرۃ العرب تو بمنزلۂ اصل کے ہے، اوراس کے علاوہ دیگر ممالک بھی اس کے اندر داخل ہیں،

تمکین دین | یہ لفظ جس آیتِ پاک میں واقع ہے، وہ حسب ذیل ہے،

ولیمکنن لہم دینہم الذی ارتضیٰ لہم۔ (اور خلافت دے کر) ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے، قوت و استحکام

دے گا۔

آیاتِ استخلاف کے اس ٹکڑہ سے یہ واضح ہوگا، کہ اس خلافت الٰہی کا مقصد یہ ہے، کہ مسلمانوں کا وہ دین جس کو خدا نے ان کے لیے پسند کیا ہے، یعنی اسلام اس کو دنیا میں قوت واستحکام بخشا جائے، کہ ظالموں اور ستم گروں کی زبردستی کے حملوں سے وہ دین اور اس کے ماننے والے ہمیشہ محفوظ رہیں، اور بخت نصر، نیرو اور چنگیز کے ظہور ثانی کا اسلام کو خطرہ نہ رہے،

مفسرین کی رائیں اس کے متعلق آگے آتی ہیں،

تبدیل امن من بعد الخوف | اسلام جب عرب میں ظہور پذیر ہوا، تو دعوتِ حق کے جواب میں اس کو ہر طرف سے تیغ وخنجر اور تیر وتبر کے زخم کھانے پڑے، ۱۳ برس کی مدّت انہی ظلم وستم کی پر درد داستانوں سے مملو ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خلافت الٰہی کی بنیاد ڈالنے کا حکم عنایت فرمایا، اور اس کا مقصد یہ قرار دیا کہ دنیا میں اسلام کے لیے امن وسلامتی قائم ہو، اس بنا پر اس آیت استخلاف کے ان الفاظ سے

ولیبدلنهم من بعد الخوف امنا	اور (اس خلافت کے ذریعہ سے) مسلمانوں کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

یہ واضح ہوتا ہے، کہ خلافت کے وجود کا دوسرا مقصد یہ ہے، کہ اس کی قوت کے زیرِ سایہ مسلمان امن وسلامتی کے ساتھ رہ سکیں، اس تفسیر کی تائید میں

حسبِ ذیل بیان نقل کرتا ہوں، جو تمام مفسروں کی متحدہ عبارت ہے،

اس سے یہ مقصود ہے کہ اسلام کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہو، مسلمان مدینہ میں مجبور کیے گئے تھے، کہ وہ ہمیشہ اپنی حفاظت کے لیے مسلح رہیں، وہ آخر اس طرز زندگی سے تھک گئے اور پیغمبر سے آکر ملتجی ہوئے تو خدا نے وعدہ کیا، کہ وہ ان کو خلافت بخشے گا، جس سے وہ امن و امان میں رہیں گے،

ایشیا و یورپ و افریقہ کی گذشتہ و موجودہ تاریخ گواہ ہے، کہ یہ خطرہ اب بھی دنیا میں اسی طرح قائم ہے جس طرح آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر تھا، اسپین، سسلی، کریٹ، مالٹا، ہرزیگونا، بوسینا، یونان، سرویا، بلگیریا، مقدونیا، سمرنا، ارض روم، آرمینیا، وغیرہ کے واقعات کیا محتاجِ بیان ہیں،

عبادت الٰہی و عدم اشتراک خدا ارشاد فرماتا ہے، کہ اس خلافت کا، اس استحکام دین کا، اس امن و امان کا مقصد کیا ہے، مقصد یہ ہے، کہ

یعبدوننی ولا یشرکون بی شیئاً　　مجھکو پوجیں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے، کہ مسلمان ایک خاص پیغامِ الٰہی لے کر دنیا میں بھیجے گئے ہیں، ان کے خاص عقائد ہیں، ان کے خاص عبادات ہیں، ان کے خاص علوم و فنون ہیں، ان کا ایک خاص تمدن اور ایک خاص اصولِ زندگی ہے، خلافت کی مادی طاقت کا اصول اسی مصلحت پر مبنی ہے، کہ مسلمان اپنی

مخصوص روحانی زندگی اور مخصوص مادی تمدن کو دنیا میں قائم اور باقی رکھ سکیں، دنیا کی گذشتہ تاریخ جس طرح مظالم اور ستم آرائیوں سے مملو رہی ہے، مستقبل کی تاریخ کے لیے کون ضمانت کر سکتا ہے، وہ ایسی ہی یا اس سے بدتر نہ ہوگی، اسی لیے دنیا کی وسیع مملکت میں انسانوں کی ایک خاص جماعت یعنی مسلمان اپنی بقا اور زندگی کے لیے عقیدۃً مجبور ہے، کہ وہ دیگر برادرانِ انسانی سے اپنے لیے ایک سایۂ امن کے طلب گار ہوں، اور یہی خلافت ہے، جو آغاز اسلام سے ابتک دنیائے اسلام میں قائم رہی ہے، اور خدا کا وعدہ ہے، کہ وہ آئندہ بھی قائم رہیگی، حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں،

فالصحابة رضی اللہ عنہم لما کانوا	صحابۂ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
اقوم الناس بعد النبی صلی اللہ	بعد احکامِ الٰہی کے سب سے زیادہ پیرو تھے،
علیہ وسلم باوامر اللہ عزوجل	اور نصرتِ الٰہی بقدر اطاعتِ الٰہی ہے، اور
واطوعہم اللہ وکان نصرہم بحسبہم	انھوں نے خدا کے کلمہ کو مشرق اور مغرب میں
واظہروا کلمۃ اللہ فی المشارق	غالب و نمایاں کیا، اور خدا نے ان کی پوری
والمغارب وایدہم تائیداً عظیماً	تائید کی، انھوں نے قوموں اور ملکوں پر
وحکموا فی سائر العباد والبلاد ولما	حکومت کی، پھر جب لوگوں نے صحابہ کے
قصر الناس بعدہم فی بعض الاوامر	بعد بعض احکام الٰہی میں کمی کی، تو ان کی ترقی
نقص ظہورہم بحسبہم ولکن قد	بھی ان کے عدم اطاعت کے بقدر کم ہوگئی،

ثبت فی الصحیحین من غیر وجه عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق لا یضرھم من خذلھم ولا من خالفھم الی یوم القیامۃ وفی روایۃ حتی یاتی امر اللہ وھم کذلک وفی روایۃ حتی یقاتلون الدجال وفی روایۃ حتی ینزل عیسیٰ بن مریم وھم ظاھرون وکل ھذہ الروایات صحیحۃ ولا تعارض بینھما۔

لیکن صحیحین میں یہ روایت متعدد طریقوں سے ثابت ہے، کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک نہ ایک گروہ قیامت تک حق پر غالب رہے گا، اور اس کو کسی کا ترک نصرت اور مخالفت نقصان نہیں پہنچائے گی، ایک روایت میں ہے، کہ اس وقت تک غالب رہے گا، جب تک خدا کا حکم آجائے (یعنی قیامت) اور اس وقت تک وہ اسی طرح غالب رہے گا، دوسری روایت میں ہے، کہ جب تک دجال سے وہ قتال نہ کرلیں گے، ایک اور روایت میں ہے، کہ جب تک عیسیٰ بن مریم نازل ہوں، وہ غالب رہیں گے، یہ تمام روایتیں صحیح ہیں، اور ان میں باہم کوئی تعارض نہیں۔

(معارف اکتوبر ۱۹۲۰ء)

قرآن پاک کا تاریخی اعجاز

دنیا کے ہر پیغمبر نے اپنی امت کے سامنے حیرت انگیز معجزے پیش کیے ہیں، حضرت نوحؑ کی دعا نے عالم کو غرقاب کر دیا، حضرت شعیبؑ اور حضرت لوطؑ کی دعاؤں نے آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں سے آگ برسائی، حضرت موسیٰؑ کے معجزہ نے فرعون کو بحر احمر کا طعمہ بنا دیا، عصائے موسیٰؑ کی کارفرمائی نے چٹانوں کی چھاتی سے پانی کا دودھ بہایا، اور بحر احمر کے دو ٹکڑے کر دیئے، دم عیسیٰؑ نے جنم کے اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو چنگا کیا، فرش موت کے سونے والوں کو جگایا، اور قبر کے مردوں کو باذن اللہ کہہ کر جلایا،

یہ واقعات دنیا میں پیش آئے، اور ختم ہو گئے، برق کا شرارہ تھا، جو دم کے دم میں چمکا، اور بجھ گیا، لیکن ایک پیغمبر ایسا بھی آیا، جس کے حیرت انگیز معجزہ نے قوموں کو ہلاک کرنے کے بجائے ان کو حیات تازہ بخشی، پتھر دلوں کو موم، عقل کے اندھوں کو بینا، اور بنی آدم کی جمعیت کو غفلت و بے ہوشی کی نیند سے جگا کر ہشیار اور کفر و شرک کی ہلاکت سے بچا کر زندہ کیا، یہ حیرت انگیز واقعہ بجلی کی چمک کی طرح دفعۃً ظاہر ہو کر غائب نہیں ہو گیا، یہ ید بیضا، عصائے موسیٰؑ اور دم عیسیٰؑ کی طرح

اپنے امکان اور وقوع میں فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلی نکتہ سنجیوں کا محتاج نہیں، یہ بروز روشن کی طرح واقعہ کی صورت میں ظاہر ہوا، اور ہزار سال تک مسند و متواتر واقعیت بن کر، دنیا اور اہل دنیا کے سامنے جلوہ گر رہا،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری دین اور آخری صحیفہ لے کر، اور نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ بن کر، اس دنیا میں تشریف لائے، آپؐ کے بعد نہ کوئی نیا دین آنے والا، نہ کوئی نئی کتاب اترنے والی، اور نہ کوئی نئی نبوت مبعوث ہونے والی تھی، اس لیے ضرورت تھی، کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح آپؐ کا خاص معجزہ وقتی اور عارضی نہ ہو، بلکہ جب تک اس دنیا میں آپؐ کی نبوت کا نور چمکتا رہے، اس کی روشنی بھی قائم رہے، چنانچہ وقتی اور عارضی معجزوں کے علاوہ آپؐ کو ایک ایسا خاص معجزہ بخشا گیا، جو قیام قیامت تک قائم اور باقی رہنے والا ہے، قرآن نے تحدی کی، کہ میں اپنے رسول و پیغمبر کی صداقت کی گواہی ہوں، جن و انس مل کر بھی چاہیں تو مجھ جیسی کتاب بلکہ مجھ جیسی کتاب کی ایک سورہ بلکہ ایک آیت بھی بنا کر پیش نہیں کر سکتے، اس اعلان پر پوری چودہ صدیاں گذر چکی ہیں، مگر اب تک فضائے بسیط کے ہر گوشہ میں اس کے جواب میں خاموشی چھائی ہے،

یہاں بھی عقل و فلسفہ کی منطقیانہ نکتہ آرائیوں سے بچ کر، تاریخ کے آئینہ میں واقعیت کا چہرہ دیکھیں، قرآن پاک دنیا کی سب سے تاریک سرزمین میں، سب سے جاہل قوم پر اترا، جو علم و تمدن سے عاری، دولت و ثروت سے خالی، سامان و اسلحہ سے

محروم اور ہر قسم کی دنیاوی اور مادی طاقت سے تہی مایہ تھی، قرآن نے تیرہ[۱۳] برس تک کبھی پہاڑوں کے غاروں سے اور کبھی پہاڑوں کی چٹانوں سے انسانیت کو آوازیں دیں، اس طویل مدت میں اس کی پکار کے جواب میں سب وشتم، سنگریزے اور پتھر، تیر وتبر اور تیغ وخنجر کی بارش ہوتی رہی، لیکن جونہی کہ چودھویں برس کا چاند طلوع ہوا، اس کی روشنی ماہ شب چہاردہم بن کر نمودار ہوئی اور چند سال کے عرصہ میں دیکھا تو عرب کا گوشہ گوشہ بقعۂ نور بن گیا،

قرآن کا سب سے بڑا تاریخی معجزہ یہ ہے کہ ۲۳ برس کی تعلیم میں ایک اَن پڑھ اور جاہل قوم کو عالم ترین اور متمدن ترین قوم بنا دیا، جس کی عظمت نے دنیائے قدیم کے دونوں بازو قیصر وکسریٰ کو توڑ دیا، چالیس برس کی مدت میں جب خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہوا، قرآن کے ماننے والوں نے جو بحر ہند کے دہانہ سے لے کر بحر انطلانتک کے ساحل تک پھیلے ہوئے تھے، دنیا کی کایا پلٹ دی، تاریکی کی جگہ نور، جہالت کے بدلہ علم، شرک وکفر کے بجائے خدا پرستی آئی، دنیا کی سب سے غریب ومفلس قوم سب سے بڑی دولت مند اور سب سے نادان وجاہل ووحشی قوم سب سے بڑی عالم وعلم پرور اور متمدن ہوگئی، دنیا کی سب سے ضعیف وکمزور قوم سب سے قوی اور سب پر غالب ہوگئی، وہ قوم جس کو دنیا میں کبھی سیاسی عزت وجاہ وجلال نصیب نہیں ہوا تھا، اس نے دنیا کی شہنشاہی کا تاج اپنے سر پر رکھا،

عرب وعجم، ترک ودیلم، حبش وزنگ، ہند وسندھ جس نے بھی قرآن کو اپنے سینہ

سے لگایا، اس نے فتح وظفر کا پرچم ہاتھ میں لیا، تخت شاہی اپنے دونوں پانوں کے نیچے بچھایا، اور حکومت کا تاج اپنے فرقِ شاہی پر رکھا، عربوں کی کیا بساط تھی، دیلم کو کون جانتا تھا، سلجوق سے کون واقف تھا، غور و خلج و تغلق کس شمار میں تھے، کرد کس گنتی میں تھے، خوارزمشاہی، اتابکی اور مصر کے بحری مالیک اور ہندوستان کے ترکی غلاموں کی حیثیت کیا تھی، اور مٹھی بھر آوارہ گرد ترک قبیلہ کا سردار عثمان خاں جس کی اولاد نے یورپ، ایشیا اور افریقہ دنیا کے تین براعظموں پر چھ سو برس تک حکومت کی، اسلام سے پہلے کیا تھا، مگر جب انھوں نے اپنی عقیدت کا سر قرآن کے آگے جھکایا، تو دنیا کی شہنشاہیوں نے ان کے آگے اپنی گردنیں جھکادیں، عربوں کا تمدن کیا تھا، افریقہ کے وحشیوں کا رتبہ کیا تھا، بربر کی بربریت کی داستانوں سے کون آگاہ نہ تھا، ترک و تاتار کی درندگی کے واقعات سے کس کے کان آشنا نہ تھے، مگر دیکھو کہ جب قرآن نے ان کے سر پر سایہ ڈالا، تو انہی کے ہاتھوں سے عظیم الشان سلطنتوں کی بنیادیں پڑیں، بڑے بڑے متمدن شہر آباد ہوئے، علوم و فنون کی درسگاہیں کھلیں، اور تمدن و تہذیب کے نقش و نگار اور آثار نمودار ہونے لگے، فلسفہ و عقل کی جلوہ آرائی ہوئی، علم و فن نے ترقی کی، بیسیوں نئے علوم اختراع ہوئے، پچھلے علوم نے رونقِ تازہ پائی، اور ان کی بری اور بحری تجارتوں نے دنیا کی منڈیوں پر قبضہ کرلیا،

ان سب سے ماوراء اور مادہ و مادیات سے ہٹ کر انسانی اخلاق و آداب نے

اسی قرآن کی تعلیم و ہدایت سے تکمیل کا درجہ پایا، عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کے سبق ازبر ہوئے، اور اہل جہاں کی آنکھوں کو وہ منظر دکھا دیا جس کو آغاز آفرینش سے آج تک انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، مغرب کی قوموں کو مشرق سے اور مشرق کی بستیوں کو مغرب سے ملا دیا، اور حسب و نسب، قومیت و وطن، پستی و بلندی، اور شاہی و گدائی کے ہر قسم کے نشیب و فراز کو مٹا کر قرآن والوں کو ایک برادری اور واحد قومیت پیدا کر دی، جس کا وطن دنیا کا ہر ملک اور جس کا مسکن دنیا کا ہر گوشہ تھا۔

باطل پرستی کے ہر طلسم کو توڑ دیا، بتوں کے ہیکل مسمار کر دیے، ستارہ پرستی کا چراغ گل کر دیا، انسانی جانوں کی قربانی موقوف کر دی، دختر کشی کی رسم کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا، عورتوں کو عزت، غلاموں کو آزادی اور غریبوں کو بشارت دی، اور نجات کے لیے صرف ایک ایمان اور عمل صالح کو ہر قسم کی ترقیوں اور سعادتوں کا زینہ بنایا، اور بتایا کہ انسانی سعادت کی شاہراہ غاروں و خلوتوں اور پہاڑوں سے ہو کر نہیں گذری ہے، بلکہ شہروں، بازاروں، مجمعوں، اور انسانی بھیڑ بھاڑ کے اندر سے گذری ہے، حق کی نصرت، انسانوں کی بھلائی، یتیموں کی سرپرستی، غریبوں کی امداد، گرتوں کی دستگیری، مظلوموں کی فریادرسی اور غلاموں کی آزادی ہی نیکیوں کی جڑیں ہیں اور اس راہ میں ہر قسم کی جد و جہد، زحمت کشی و محنت اور ایثار و قربانی اصلی نفس کشی و ریاضت ہے،

اور سب کے آخر میں اور سب سے بڑھ کر اس نے مسلمانوں کو اللہ کے ایک آستانۂ قدس کے سوا دنیاوی قوت کے ہر آستانہ سے بے نیاز کر دیا، خدائے قادر کی قدرت کے سوا، ہر قدرت سے وہ بے نیاز اور ہر قوت سے وہ بے پروا ہو گئے۔ انھوں نے فرعونوں کو دریا میں ڈھکیل دیا، نمرودوں کے تخت الٹ دیئے، ہامانیوں کی سلطنتیں چھین لیں، اور شدادیوں کی بہشت پر قبضہ کر لیا، اور یہ سب کچھ اس لیے وہ کر سکے، کہ انھوں نے ان سب جھمیلوں کے ساتھ ہر رشتۂ محبت کو توڑ کر صرف خدا سے اپنا رشتہ جوڑا تھا، ان کے ہر عمل کی غایت اللہ کی خوشنودی اور رضامندی تھی، تو اللہ بھی ان سے خوش ہوا، اور اپنی خوشنودی کا ہر خزانہ ان کے لیے کھول دیا،

قرآن نے اللہ والوں کی جماعت پیدا کی، جو اللہ ہی کے لیے کرتی اور چھوڑتی تھی، اللہ ہی کے لیے دیتی اور لیتی تھی، اور اسی کے لئے جیتی اور مرتی تھی،

مسلمانو! ربانی قوت کا یہ سرمایہ اب بھی تمہارے پاس ہے، اور اللہ کے اس خزانۂ رحمت کی کنجی اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے، ہمت کرو، اور ادب سے اس کے اوراق کو کھولو، اس کے معنوں کو سمجھو، اس کی باتوں پر یقین کرو، اور اس کے حکموں کو مانو اور عمل کرو، پھر دیکھو کہ تم کہاں سے کہاں پہنچتے ہو،

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

(معارف فروری ۱۹۲۹ء)

اسلام

دونوں جہان کی بادشاہی،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوش خبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی، تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی بے خوف و خطر کی جاسکے، اور خدا کی بادشاہی دنیا میں قائم ہو،

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لایشرکون بی شیئاً۔

خدا نے ان سے جو ایمان لائے، اور اچھے عمل کیے، یہ وعدہ کیا، کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا، جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا، جو ان سے پہلے تھے، اور ان کے لیے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے، جما دے گا، اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بدلہ امن دے گا، میری

(نور۔ ۷) بندگی کریں گے، نیز اکسی کو ساجھی نہ بنائیں گے،

اور اس کے لیے خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے، تاکہ سارا حکم اسی ایک کا ہو جائے۔

قاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ ۔ (انفال۔ ۵)	اور ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فساد نہ رہے، اور سب اللہ کا حکم ہو جائے،

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے،

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔ (بقرہ۔ ۲۵)	اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے، اور آخرت میں بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے، علم و عبادت، تندرستی، روزی، مال و دولت، فتح و نصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی خدا کے اطلاق کی تحدید ہے، دنیا کی بھلائی دنیا کی ہر وہ بھلائی ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا،

للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنۃ ولدار الآخرۃ خیر ولنعم دار المتقین۔ (نحل۔ ۴)	اور جنھوں نے نیک کام کیے، ان کے لیے دنیا میں بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے، اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے،

مقصود یہ ہے کہ نکوکاروں کے لیے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے، اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے،

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ہے، ان کو بشارت ہے،

فاٰتٰہم اللّٰہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الاٰخرۃ واللّٰہ یحب المحسنین	تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا، اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔
(اٰل عمران۔ ۱۵)	

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت، اور حکومت و سلطنت ہے، جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا، اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، خدا نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں۔

والذین ھاجروا فی اللّٰہ من بعد ما ظلموا لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ ولاجر الاٰخرۃ اکبر۔	اور جنھوں نے گھر چھوڑا اللہ کے لیے ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے،
(نحل۔ ۶)	

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے،

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے، کہ ایمان اور نیکی والوں کو

گو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتادیا گیا ہے، کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائدار ہے۔ اسی لیے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اولیں مقصد نہیں، بلکہ ثانوی مقصد ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو، ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تو دنیا تو مل جائے گی، مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

من کان یرید الحیوۃ الدنیا وزینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون اولئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیھا وباطل ما کانوا یعملون۔ (ھود۔ ۲)	جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہتا ہے، تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں، اور کمی نہیں کی جاتی، یہ وہ ہیں، جن کے لیے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں، اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا، اور ان کی کمائی اکارت گئی۔
من کان یرید حرث الآخرۃ نزد لہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نوتہ منھا ومالہ فی الآخرۃ من نصیب (شوریٰ۔۳)	جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہو، تو ہم اس کی کھیتی بڑھا دیتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو، تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں، اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں،
من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا	جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دیدیتے ہیں، جس کو جو چاہتے ہیں، پھر ہم نے

لہ جہنم یصلٰھا مذموما مدحورا ... اس کے لیے دوزخ کو بنایا ہے، وہ اس میں
ومن اراد الآخرۃ وسعیٰ لہا ... داخل ہوگا، برا ہوکر دھکیلا جاکر، اور
سعیہا وھو مومن فاولٰئک کان ... جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری
سعیہم مشکورا ... کوشش کی اور وہ ایمان والا ہو، تو ہم وہی
(بنی اسرائیل - ۲) ... ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی،

من کان یرید ثواب الدنیا	تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے، (اس کو)
فعند اللہ ثواب الدنیا والآخرۃ	معلوم ہو کہ اللہ کے پاس دنیا اور آخرت
(نساء-۱۹)	دونوں کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احمق ہے، جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ خدا کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں،

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے، وہ آخرت سے محروم ہے، لیکن جو آخرت کا طلبگار ہے، اس کے لیے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں،

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست داری ہے، یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے،

فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتاب	تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت
والحکمۃ واٰتینٰھم ملکا عظیما۔ (نساء-۸)	دی اور بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو کہتے ہیں،

یا قوم اذکروا نعمۃ اللّٰہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکًا۔ (مائدہ - ۴)

اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو، جب تم میں نبی بنائے، اور تم کو بادشاہ بنایا،

یہ نعمت کسی کے دینے لینے سے نہیں ملتی، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے؛

اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء۔ (آل عمران - ۳)

اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے چھین لے،

وہ دنیا کس کو اور چھینتا کس سے ہے، اس کے متعلق اس نے اپنا قاعدہ کلیہ بتا دیا ہے،

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔ ان فی ھذا لبلاغا لقوم عابدین۔ (انبیاء - ۷)

بے شک زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوتے ہیں، اس اعلان میں خدا کے فرماں بردار بندوں کے لیے پیام ہے۔

مسلمانوں کو جب اس نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی، تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے، فرمایا۔

ولینصرن اللّٰہ من ینصرہ ان اللّٰہ اور البتہ خدا اس کی مدد کرے گا، جو

لقوی عزیز الذین ان مکنّاهم	اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ زبردست
فی الارض اقاموا الصلوٰة و	قوت والا ہے، وہ کہ ہم اگر ان کو زمین میں
اتوا الزکوٰة وامروا بالمعروف	جمادیں، تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوٰۃ
ونھوا عن المنکر وللہ عاقبة	دیں، اچھے کاموں کو کرنے کو کہیں، اور
الامور-	برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا
(حج - ۶)	انجام خدا کے اختیار میں ہے،

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا، اور برے کاموں سے روکے گا وہ پہلے خود اچھا ہوگا، اور بُرے کاموں سے باز رہتا ہوگا، خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں، کہ خدا کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں، خدا ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجرار کی طاقت ہونی چاہیے چنانچہ اسلام میں سارے حدود اور تعزیرات اسی منشا کے مطابق ہیں، زنا کی حد میں فرمایا،

ولا تاخذکم بھما رافة فی	اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ
دین اللہ ان کنتم تومنون باللہ	کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے
والیوم الآخر۔ (نور - ۱)	اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو،

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اس کو اللہ اور رسول سے لڑائی

کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (بقرہ ـــ ۳۸)
تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے خبردار ہو جاؤ،

اسی لیے نجران کے عیسائیوں سے آپ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی، کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے، تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ (ابو داؤد باب اخذ الجزیہ)

(معارف ستمبر ۱۹۴۱ء)

جبر و قدر

قرآن مجید کے پہلے سیپارہ میں ارشاد خداوندی ہے، ختم اللّٰہ علیٰ قلوبھم الآیہ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کی، اور آنکھوں پر پردہ ہے، ان کے لیے" عذاب عظیم ہے" اگر خدا ہی نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائی ہے، اور اسی وجہ سے وہ گناہ کرتے ہیں تو ان کا کچھ قصور نہیں، یہ قصور خدا ہی کا ہے، ایسی حالت میں ان کو سکھ دکھ یا گناہ ثواب نہیں ہو سکتا۔ پھر خدا ان کو سزا و جزا کیوں دیتا ہے، کیونکہ انھوں نے گناہ یا ثواب خودمختاری سے نہیں کیا، یا اولاد سب کے یہاں ایک ہی طریقہ سے ہوتی ہے، مگر پیدا ہونے کے بعد کوئی گورا ہوتا ہے، کوئی کالا، کوئی امیر، کوئی غریب، کوئی اندھا، کوئی لولا، اس کی کیا وجہ ہے۔ (خان محمد صابر، خانقاہ ڈوگراں، شیخوپورہ، پنجاب)

۱۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ارادہ اور نیت کی آزادی بخشی ہے، وہ اپنے اسی اختیار سے خیر یا شر کو اختیار کر کے ثواب یا عذاب کا مستحق ہوتا ہے، قرآن پاک میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔ (کہف ۴)

جو چاہے ایمان دار بنے اور جو چاہے کافر بنے

۲۔ انسان جس پہلو کو اپنے اختیار سے پسند کرتا ہے، اور اس کام کو کرتا ہے، تو بار بار کرنے سے وہ کام اس پر آسان ہو جاتا ہے، اور اس کا عادی ہو جاتا ہے، خواہ وہ شر ہو، خواہ خیر ہو، اگر خیر اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے تو اس کو توفیق اور ہدایت کہتے ہیں، اور اگر شر آسان ہو جاتا ہے، تو اس کو اضلال (گمراہی) اور خذلان (عدم توفیق) کہتے ہیں،

۳۔ ان دو باتوں کے سمجھ لینے کے بعد آپ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے مہر لگانے کو جو فرمایا ہے، وہ وہی عدم توفیق ہے، یہ عدم توفیق اور مہر لگانا نتیجہ ہے انسان کے اپنے فعل کا جس کو اُس نے پہلے اختیار سے کیا، اس کا نتیجہ دل و دماغ پر مہر ہے، یعنی وہ اب احکام خداوندی اور نصائح سے مستفید ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔

۴۔ اب جس آیت کو آپ نے پیش کیا ہے، اور بھی بہت سی آیتیں اس معنی کی قرآن میں ہیں، مگر ان سب آیتوں میں کفار اور فساق اور ان کے فعل بد اور اختیار شر کا ذکر پہلے ہے اور مہر یا اضلال اور عدم توفیق کا ذکر اس کے نتیجہ کے طور پر ہے، یعنی ان کا معلول اور نتیجہ ہے، لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ مہر خداوندی یہ علت ہے، اور بندہ کا اختیار شر معلول اور نتیجہ ہے،

۵۔ یہاں غور فرمائیں، اوپر یہ ہے،

ان الذین کفروا سوآءٌ علیہم ءانذرتہم ام لم تنذرہم لا یومنون۔ (بقرہ ۲۔ ۱) — جن لوگوں نے کفر کیا، برابر ہے ان کے لیے چاہے ان کو تم ہشیار کرو یا نہ ہشیار کرو، وہ ایمان نہ لائیں گے۔

دیکھیے پہلے انھوں نے اپنے اختیار سے کفر کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق ان سے روک لی، اور پھر ان کے کفر پر اصرار اور بار بار عمل کرنے سے خیر کی توفیق ان سے سلب ہوگئی، اور شر کا کام آسان ہوگیا، یہی اللہ تعالیٰ کی مہر ہے، یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دل و دماغ پر پہلے مہر کر دیا، اور اس کے سبب سے وہ کفر پر مجبور ہو گئے، بلکہ پہلے انھوں نے کفر کا کام کیا، اور جیسے وہ کام کرتے گئے، خیر کے راستے بند ہوتے چلے گئے، یہی وہ مہر ہے، اسی سورہ بقرہ میں دو رکوع کے بعد دوسری آیت ہے،

یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا۔ — اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعہ سے بہتوں کو گمراہ بناتا ہے، اور بہتوں کو راہ دکھاتا ہے

اس کے بعد ہی فوراً ہے،

فما یضل بہ الا الفاسقین — اور اللہ تعالیٰ گمراہ نہیں کرتا، مگر ان کو جو اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑتے ہیں، (بقرہ ۔ ۳)

یہاں بھی دیکھیے "الا الفاسقین" کا فسق و فجور سبب ہے، اور اللہ تعالیٰ

کی عدم توفیق جس کو گمراہی کہا ہے، اس کے نتیجہ کے طور پر پیچھے ہے،

ایک اور آیت میں ہے،

بل طبع اللہ علیھا بکفرھم ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب سے ان

(نساء-۲۲) (قلوب) پر مہر کر دی،

دوسری آیت اور ہے،

کذالک یطبع اللہ علی کل قلب اسی طرح اللہ ہر مغرور ظالم کے

متکبر جبار (مومن-۴) دل پر مہر لگا دیتے ہیں،

یہاں بھی غرور اور ظلم اختیاری سبب ہے، اور مہر اس کا نتیجہ،

امید ہے کہ اب بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی، اور اعتراض رفع ہو کر تسکین پیدا ہوگئی ہوگی،

میں اس وقت بحالت سفر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں، اپنے مقام پر ہوتا تو تفصیل سے لکھتا، مولانا شبلی مرحوم کا ایک مضمون مقالات شبلی مذہبی جلد اول میں مسئلۂ قضا و قدر پر ہے، اس کو ضرور پڑھیں،

والسلام

(معارف ستمبر ۱۹۴۵ء)

مقالاتِ سلیمان

(حصہ سوم)

شاہ معین الدین احمد ندوی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ